اردو
قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی

مقالہ نگار

سعادت سعید

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

ابتدائیہ

اردو قصیدہ پر تحقیق اور ادبی کام میری دیرینہ تمنا کی جزوی تکمیل ہے۔
ہمارے ہاں ایسے قصیدہ نگار شعرا کی تعداد کچھ کم نہیں ہے کہ جن کے لکھے ہوئے قصائد پر (علیحدہ علیحدہ) پی ایچ ڈی کی سطح کے متعدد تحقیقی مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔ اس لئے اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ دریا ایک کوزے میں بند نہیں ہو سکتا یہ مقالہ پیش خدمت ہے۔

اردو قصائد کی تشابیب کا تنوع، گریز کی پہلوداریاں، مدح کی گلکاریاں (باوجود یکسانیت) حسن طلب اور دعا کے زاویے اتنے پھیلاؤ کے حامل ہیں کہ ان پر ہزارہا صفحات رقم کیے جانے کے باوجود بھی ہل من مزید کی صدا آتی رہے گی۔

میں نے اپنے مقالے میں اس امر کے اظہار کی کوشش کی ہے کہ یہ صنف ایران اور ہندوستان میں مسلم تہذیب و ثقافت کی شان و شوکت، بلند آہنگی اور باریک بینی کا شعری مظہر ہے۔ عجمی قصیدہ سے لے کر قدیم دکنی اور شمالی ہند کے اردو قصیدہ تک اور پھر اٹھارہویں صدی کے قصیدے سے لے کر انیسویں اور بیسویں صدی کے قصیدہ تک اسالیب اور مفاہیم کا ارتقاء دیدنی ہے۔ یہ اردو اور فارسی کی کسی اور صنف کے حصے میں نہیں آیا۔ مقالے کا تحقیقی مواد جمع کرنے کے لئے میں نے کراچی، دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ اور بمبئی کے سفر بھی کیے۔

اپنے موضوع پر اظہار خیال کے دو طریق کار تھے۔ ایک یہ کہ اردو شاعری کے مختلف دبستانوں (دکنی، دہلوی، لکھنوی اور جدید) کے حوالے سے قصیدے کی مجموعی تہذیبی اور فنی صورت حال کا مطالعہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ معروف اور کسی نہ کسی حوالے سے اہم قصیدہ نگار شعرا کی انفرادی تخلیقات میں تہذیبی و فنی عناصر کی نشاندہی ہو۔ استاد محترم جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی رہنمائی میں، میں نے دوسرے طریق کار کو اپنایا۔ مقصود اس کا صرف اور صرف یہ تھا کہ اردو قصیدہ کا ٹھوس اور سائنسی مطالعہ ممکن ہو۔

اس ٹھوس اور سائنسی مطالعہ میں بہت سی دقتیں بھی تھیں۔ ایک دقت تو یہ تھی کہ پونے بارہ سو کے قریب مذہبی اور غیر مذہبی اردو قصیدہ نگاروں کو (یہ تعداد میری محدود تحقیق کے نتیجے میں سامنے آئی ہے اگر قصیدہ نگاروں کا تفصیلی تذکرہ مرتب ہو اور مزید قصیدہ نگار تلاش کیے جائیں تو یقین ہے اس تعداد میں کئی گنا اور نئے ناموں کا اضافہ بھی ہو سکے گا) ایک مقالے میں کیسے سمیٹا جائے۔ اس کے لئے طے یہ ہوا۔ چند اہم قصیدہ نگاروں کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور باقی قصیدہ نگاروں کے حوالے ضمائم میں دے دیئے جائیں اور تمام تر قصیدہ نگاروں کا ایک اشاریہ مرتب کر دیا جائے جو مقالے کی فہرست کے ساتھ ملحق ہو۔ اگر مجھے اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیابی ہوئی ہے تو اس کا سہرا ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے سر ہے کہ جن کی مشفقانہ راہنمائی نے میری مشکلات کو آسان کیا

سعادت سعید
۱۹۸۷ء

انتساب

اپنے والد ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے نام

جن کی تحقیق اور ادبی بصیرت

میرے لئے مشعل راہ ہے

—

فہرست و اشاریہ

تمہیدی مباحث

قدیم ادوار میں مدح — اجمالی جائزہ ۲
مدح کے چند محرکات ۱۲
قصیدہ اور تہذیب ۱۷
مطلب پرستی، مبالغہ آرائی اور قصیدہ ۲۴

باب اوّل

صنفِ قصیدہ — فن و اظہار

فصل اوّل: لفظی و اصطلاحی معانی ۲۹
فصل دوم: قصیدہ کے اجزاء ۴۱
تشبیب ۴۱
گریز ۴۹
مدح ۵۲
حسنِ طلب، دعا ۵۵
فصل سوم: چند مزید معروضات ۵۷
قصیدہ میں نام اور عنوان ۵۸
قصیدہ کی قسمیں ۵۹
چند اظہاری متعلقات ۶۲
عیوبِ قصیدہ ۶۷
فصل چہارم: قصیدہ اور دیگر اصناف ۷۹
فصل پنجم قصائد اور متعلقہ تہذیبی ماحول
قصیدہ اور شاعر کی نفسیات ۸۶
قصیدہ اور ماحول ۹۰
قصیدہ اور دربار ۹۶

باب دوم :

عربی فارسی قصیدہ ۱۰۳

فصل اول : عربی قصیدہ ـــ پس منظر ۱۰۴

فصل دوم عربی قصیدہ کے ادوار ۱۰۷

دورِ جاہلی ۱۰۷

آغازِ اسلام کا دور ۱۱۴

عہدِ بنو اُمیہ ۱۱۷

عباسی دور ۱۲۰

فصل سوم : فارسی قصیدہ ـــ ایرانی اور ہندوستانی

پس منظر ۱۲۶

عربی قصائد کے فارسی قصائد پر اثرات ۱۳۰

فارسی قصیدہ ـــ اوائلی دور ۱۳۳

سامانی دور ۱۳۴

غزنوی دور

سلجوقی دور ۱۴۰

مغلیہ عہد سے قبل فارسی قصیدہ ۱۴۴

فارسی قصیدہ مغلیہ دور ۱۵۳

باب سوم :

اردو قصیدہ ـــ آغاز سے ۱۷۰۷ء تک

فصل اوّل ابتدائیہ ۱۶۱

فارسی قصیدہ ـــ بطور ماڈل ۱۶۱

اردو قصیدہ کی چند ابتدائی صورتیں

فصل دوم : جنوبی ہند کا ادبی و ثقافتی پس منظر ۱۶۶

دکن ۱۶۶

گجرات ۱۶۷

دکن کا سیاسی اور تہذیبی منظرنامہ ۱۷۰

بہمنی دور ۱۷۱
عادل شاہی دور ۱۷۴
فصل سوم : جنوبی ہند میں اردو قصیدہ ، اجمالی منظر
بہمنی دور ـــ مدحیہ رجحان ۱۷۸
قطب شاہی دور ۱۸۱
عادل شاہی دور کا قصیدہ ۱۸۴
قطب شاہی دور میں قصیدہ ۱۹۰
گجرات میں مدح کی روایت ۱۹۳
فصل چہارم : چند خصوصی مطالعے
مشتاق ۱۹۶
لطفی ۱۹۸
محمد قلی قطب شاہ ۱۹۹
غواصی ۲۰۴
علی عادل شاہ شاہی ۲۰۹
نصرتی ۲۱۴
میراں ہاشمی ۲۲۱
ولی ۲۲۴
جنوبی ہند میں اردو قصیدہ ـــ اجمالی جائزہ ۲۲۹

باب چہارم :

اردو قصیدہ اٹھارہویں صدی میں

فصلِ اوّل سیاسی ، تہذیبی اور ادبی منظر نامہ ۲۳۴
دہلی ۲۳۴
اودھ ۲۳۷
حیدر آباد ، ۲۳۹
فرخ آباد ، بنگال ، مرشد آباد ، ٹانڈہ ، سندھ ۲۴۰
انگریزی اقتدار ۲۴۰

	تہذیبی اور ادبی منظر نامہ	۲۴۳
فصل سوم :	خصوصی مطالعے	
	شاکر ناجی	۲۵۴
	عبدالحئی تاباں	۲۵۷
	سراج اورنگ آبادی	۲۵۸
	درگاہ قلی خاں درگاہ	۲۵۹
	اشرف علی فغاں	۲۶۰
	عوض علی مدعا	۲۶۲
	ظہورالدین شاہ حاتم	۲۶۳
	مرزا رفیع سودا	۲۶۵
	میر حسن	۲۸۵
	جعفر علی حسرت	۲۸۸
	بقاءاللہ بقاء	۲۹۲
	غلام حسین افسق	۲۹۴
	قیام الدین قائم	۲۹۹
	احسن الدین خاں بیاں	۳۰۵
	میر محسن تجلی	۳۰۶
	محمد روشن جوشش	۳۱۱
	لچھمی نرائن شفیق	۳۱۴
	قلندر بخش جرأت	۳۱۶
	میر تقی میر	۳۲۱
	ضمیمہ ــــ باب چہارم	۳۲۸
باب پنجم :	**انیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو قصیدہ**	۳۳۷
فصل اوّل :	سیاسی منظر نامہ	

دورِ زوال کے لکھنوی اور دہلوی دربار

تہذیبی جہت ۳۴۳
ادبی جہت ۳۴۷
خصوصی مطالعے ۳۵۱
جسونت سنگھ پروانہ ۳۵۱
انشاء اللہ خاں انشاء ۳۵۵
غلام ہمدانی مصحفی ۳۶۱
غلام علی راسخ ۳۶۹
نظیر اکبر آبادی ۳۷۰
سعادت یار خاں رنگین ۳۷۱
محمد تقی ہوس ۳۷۴
شاہ نصیر ۳۷۶
کرامت علی شہیدی ۳۷۸
نظام الدین ممنون ۳۷۹
کنور سین مضطر ۳۸۲
فقیر محمد گویا ۳۸۳
مومن خاں مومن ۳۸۴
ابراہیم ذوق ۳۸۸
امان علی سحر ۳۹۷
رائے گلاب چند ہمدم ۳۹۹
غلام محمد خبیر ۴۰۰
مہدی علی ذکی ۴۰۱
اسد اللہ خاں غالب ۴۰۴

باب ششم :
اردو قصیدہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک

فصل اوّل : سیاسی و تہذیبی ماحول ۴۱۰
فصل دوم : خصوصی مطالعے
اشرف علی ۴۱۵
نظام شاہ نظام رامپوری ۴۱۷
حکیم آغا جان عیش ۴۱۹
غلام امام شہید ۴۲۳
غلام مولیٰ قلق ۴۲۴
خواجہ ارشد علی قلق ۴۲۵
قربان علی سالک ۴۲۶
منیر شکوہ آبادی ۴۲۷
مظفر علی اسیر ۴۳۵
غلام حسنین قدر بلگرامی ۴۴۰
بال مکند صبر ۴۴۲
نیاز احمد ہوش بریلوی ۴۴۳
بہاری لعل راضی ۴۴۴
محمد حسین تمنا ۴۴۵
محمد جان شاد ۴۴۷
ظہیر احسن شوق ۴۴۸
امیر مینائی ۴۴۹
عبد الاحد شمشاد ۴۵۵
ضمیمہ ــــ باب پنجم اور ششم ۴۵۷

باب ہفتم :

عہدِ جدید میں اردو قصیدہ

فصل اوّل : اہم قصائد نگار ۴۷۴
محسن کاکوروی ۴۷۷

داغ دہلوی ۴۸۱
ضامن علی جلال ۴۸۴
کاظم حسین شیفتہ ۴۹۰
محمد کاظم حبیب کنتوری ۴۹۲
مولانا محمد حسین آزاد ۴۹۳
سرور جہاں آبادی ۴۹۵
عبد الغفور ضرغام ۴۹۶
ظہیر الدین ظہیر ۴۹۷
امیر اللہ تسلیم ۵۰۰
عبد الحیٔ بے خود ۵۰۳
شبلی نعمانی ۵۰۴
حکیم عبد الہادی وفا ۵۰۷
منور خاں گوہر ۵۰۹
الطاف حسین حالی ۵۱۰
عبد العلیم آسی ۵۱۶
محمد اسماعیل میرٹھی ۵۱۷
اکبر الہ آبادی ۵۲۳
احمد رضا بریلوی ۵۲۴
آغا جان احسن ۵۲۶
شیر خاں چابک سوار ۵۲۷
صفدر علی صفدر ۵۲۸
قادر بادشاہ ۵۳۳
ابو شرف مجددی ۵۳۴
کاظم حسین محشر ۵۳۵
سورج نرائن مہر ۵۳۶

علی حیدر نظم	۵۳۷
ریاض خیرآبادی	۵۴۱
عزیز لکھنوی	۵۴۳
عزیز صفی پوری	۵۵۰
عبد الرحمن شاطر	۵۵۱
علامہ محمد اقبال	۵۵۴
محمد ہادی، ہادی	۵۵۷
گوری پرشاد ہمدم	۵۵۸
محمد احمد بے خود	۵۶۰
اقبال سہیل	۵۶۲
جلیل مانکپوری	۵۶۳
نظام الدین نظامی	۵۶۴
علی نقی صفی	۵۶۸
وحید الدین احمد بے خود	۵۷۰
معشوق حسین اطہر	۵۷۱
مولانا ظفر علی خاں	۵۷۲
تمنا عمادی	۵۷۳ و
سرفراز احمد سہیل	۵۷۴
تجمل حسین نجم آفندی	۵۷۵(ا)
ضمیمہ ـ چند اور قصائد نگار	۵۷۹
اختتامیہ	۶۰۴
کتابیات	۶۰۷
کتابیات II	

اشاریہ قصیدہ نگاران عرب، فارسی و اردو

عربی قصیدہ نگار کہ جن کا تذکرہ مقالہ ہٰذا میں ہوا ہے۔ نام کے سامنے صفحہ نمبر درج ہے

ابن التعاویذی، صفحہ ۱۲۱
ابن الحبازیہ، ۱۲۱
ابن الحلاوی، ۱۲۱
ابن الحمید، ۱۲۱
ابن المعتز، ۱۲۱
ابن الہباریہ، ۱۲۴
ابن امیر الطرابلسی، ۱۲۱
ابن خفاجہ، ۱۲۲
ابن رومی، ۱۲۳
ابن زیدون، ۱۲۲
ابن سنان الخفاجی ۱۲۱
ابن عبداللہ، ۱۲۲
ابن عبدربہ، ۱۲۲
ابن قلاقس، ۱۲۱
ابن ہانی، ۱۲۲
ابو اسحٰق الغزی، ۱۲۱، ۱۲۴
ابو الاسود الدؤلی، ۱۱۵
ابو العلاء معری، ۱۲۱، ۱۲۴
ابو المعالی، ۱۲۱
ابو تمام، ۱۲۳
ابو خراش الہذلی، ۱۱۵
ابو داؤد الایادی، ۱۱۲
ابو دلامہ، ۱۲۱
ابو ذویب الہذلی، ۱۱۵
ابو صخر الہذلی، ۱۱۸
ابو العتاہیہ، ۱۲۱، ۱۲۳
ابو عطا سندھی، ۱۲۴
ابو عطا یعقوب الخزنوی ۱۲۳
ابو فراس ہمدانی، ۱۲۱، ۱۲۴
ابو نواس، ۱۲۱، ۱۲۲
اخطل، صفحہ ۱۱۸
اسود بن یعفر، ۱۱۲
اضبط بن قریع السعدی، ۱۱۲
اعشیٰ بن میمون، ۱۱۱
افوہ الاودی، ۱۱۲
العفیہ ابن مالک، ۱۲۲
امراء القیس، ۱۰۸، ۰
امیہ بن ابی الصلت، ۱۱۱
بحتری، ۱۲۱، ۱۲۳
بدیع الزمان ہمدانی، ۱۲۱
بشار بن برد، ۱۲۱
بشر بن ابی خازم، ۱۱۱
بوصیری، ۱۲۲، ۱۲۴
تابط شراً، ۱۱۲
تلعفری، ۱۲۱
جاحظ، ۱۲۱، ۱۲۳
جریر، ۱۱۹
جمال الدین بن مطروح، ۱۲۱
حاتم الطائی، ۱۱۲
حارث بن حلزہ، ۱۱۱
حریری، ۱۲۱
حسام الدین حاجری، ۱۲۱
حسان بن ثابت، ۱۱۵
حطیئہ، ۱۱۵
حمید بن ثور، ۱۱۵
درویش الطالوی، ۱۲۲
ذوفر بن حارث، ۱۱۸
ذوالرمۃ، ۱۱۹
راعی، ۱۱۸
زہیر، صفحہ ۱۲۱
زہیر بن ابی سلمیٰ، ۱۱۰
سناء الملک، ۱۲۱
شاطبی، ۱۲۲
شریف رضی، ۱۲۱
شنفری، ۱۱۱
صرصری ۱۲۱
صلاح الدین الابیوردی ۱۲۱، ۱۲۴
صفی الدین حلی، ۱۲۲، ۱۲۴
طرفۃ بن عبد، ۱۰۹
طرماح بن حکیم، ۱۱۹
طغرائی، ۱۲۱، ۱۲۴
طفیل الغنوی، ۱۱۲
طنطرانی، ۱۲۱، ۱۲۴
عائشہ باعونیہ، ۱۲۲
عباس بن احنف، ۱۲۱
عبداللہ بن رواحہ، ۱۱۵
عبداللہ بن شرف الدین، ۱۲۲
عبداللہ بن قیس الرقیات ۱۱۵، ۱۱۸
عبدۃ بن الطبیب، ۱۱۵
عبید بن الابرص، ۱۱۱
عدی بن زید بن حماد، ۱۱۱
عروۃ بن الورد، ۱۱۱
عزازی، ۱۲۲
علقمۃ الفحل، ۱۱۱
عمر ابن الفارض، ۱۲۱
عمر بن ربیعہ، ۱۱۸
عمرو بن کلثوم ۱۱۰
عمرو بن معدیکرب، ۱۱۵
عنترہ بن معاویہ، ۱۱۰
فرزدق، ۱۱۸
کعب بن زہیر، ۱۱۵
لبید ابن ربیعہ، ۱۱۰، ۱۱۶
لسان الدین بن الخطیب، ۱۲۲
لقیط بن یعمر الایادی،
مہیار خوارزمی، ۱۲۱، ۱۲۴
متنبی، ۱۲۱، ۱۲۳
محجن الثقفی، ۱۱۵
محمد بن احمد ارزق، ۱۲۲
مروان بن ابی حفصہ ۱۲۱
مسلم بن ولید، ۱۲۱
مطیع بن ایاس ۱۲۱، ۱۲۴
معتمد، ۱۲۲
معن بن اوس، ۱۱۸
مہلہل، ۱۱۳
نجم الدین الحصرق، ۱۲۱
نمر بن تولب، ۱۱۱
وراق، ۱۲۲
ولادۃ، ۱۲۲

فارسی قصیدہ نگار

صفحہ

آرزو، سراج الدین ۱۵۶
ابن مفرغ، ۱۳۳
ابن یمین، ۱۵۱
ابوشکور بلخی، ۱۳۵
ابوعبداللہ روزبہ لاہوری، ۱۴۰
ادیب صابر، ۱۴۳
ازرقی ہروی، ۱۴۰
اسدی طوسی، ۱۳۸
الواشی، ابوجعفر عمر بن اسحٰق ۱۴۳
امیر خسرو، ۱۴۹
انوری، ۱۳۱، ۱۴۲
اوحدی مراغی، ۱۵۱
بدر چاچ، ۱۵۰
بہاؤالدین اوشی، ۱۴۸
بہرام گور، ۱۳۳
بیدل، عبدالقادر، ۱۵۶
جامی، عبدالرحمن، ۱۵۱
جبلی، عبدالواسع، ۱۴۱
جگر، لعل شاہ کاظمی، ۱۵۶
جمال الدین اصفہانی، ۱۴۲
چندر بھان لاہوری، ۱۵۶
حافظ شیرازی، ۱۵۰
حسن سنجری، ۱۵۱
حمید الدین، قاضی، ۱۴۸
حنظلہ بادغیسی، ۱۳۳
خاقانی، افضل الدین، ۱۴۱
خیالی، عزالدین، ۱۵۶
دقیقی طوسی، ۱۳۵
رازی، عاقل خاں، ۱۵۶

صفحہ

روحانی، ۱۴۸
رودکی سمرقندی، ۱۳۵
ریزہ، تاج الدین ۱۴۸
زینتی علوی محمودی، ۱۴۰
سحاب، سید محمد، ۱۵۷
سروش اصفہانی، ۱۵۷
سعدی شیرازی، ۱۴۹
سعیدائے گیلانی، ۱۵۶
سلطان شادماں، ۱۵۶
سلمان ساوجی، ۱۵۱
سنائی غزنوی، ۱۴۱
سیادت لاہوری، ۱۵۶
سید حسن غزنوی، ۱۴۳
شہید بلخی، ۱۳۵
شہید، غلام امام، ۱۵۶
شیخ جمالی، ۱۵۱
صائب تبریزی، ۱۵۶
صبا فتح علی، ۱۵۷
ضیاء الدین سنجری، ۱۴۸
طالب آملی، ۱۵۵، ۱۵۷
ظہوری ترشیزی، ۱۵۵
ظہیر فاریابی، ۱۴۳
عالی، نعمت خاں، ۱۵۶
عباس مروزی، ۱۳۳
عبدالحی شیخ، ۱۵۶
عبدالواسع جبلی، ۱۳۱
عبید زاکانی، ۱۵۱
عرفی شیرازی، ۱۵۴
عسجدی مروزی، ۱۴۰
عطار، فرید الدین ۱۴۴

صفحہ

عطاردی، ۱۴۰
علی حزیں، ۱۵۶
عمارہ مروزی، ۱۳۶
عمعق بخارائی، ۱۴۳
عمید سنائی، ۱۴۸
عنصری، ۱۳۹
غضائری رازی، ۱۴۰
غنی کاشمیری، ۱۵۶
فرخی سیستانی، ۱۳۸
فروغی، ۱۵۷
فضل بخاری، ۱۴۸
فغانی شیرازی، ۱۵۰
فلکی شیروانی، ۱۴۳
فیروز طغرائی، ۱۵۶
فیضی فیاضی، ۱۵۴
قاآنی شیرازی، ۱۵۷
قاسم کاہی، ۱۵۶
قائم مقام، ۱۵۷
قدسی، حاجی محمد ۱۵۵
قطران تبریزی، ۱۴۰
کاتب بلخی، ۱۴۸
کسائی مروزی، ۱۳۶
کلیم، ابوطالب، ۱۵۵، ۱۵۷
کمال الدین اصفہانی، ۱۴۹
لبیبی خراسانی، ۱۴۰
مجمر اصفہانی، ۱۵۷
مجیر الدین بیلقانی ۱۴۳
محتشم کاشانی، ۱۵۵
محمد بن وصیف، ۱۳۳
مختاری غزنوی، ۱۴۴

صفحہ

مرزا غالب، ۱۵۶
مسعود رونی، ابوالفرج ۱۴۴
مسعود سعد سلمان، ۱۴۰
مسعودی غزنوی، ۱۴۰
مظہری کاشمیری، ۱۵۶
معزی، امیر ۱۳۱، ۱۴۱
منت، امیر قمر الدین ۱۵۶
منشوری غزنوی، ۱۴۰
منوچہری دامغانی، ۱۳۱، ۱۳۹
منہاج سراج، ۱۴۸
منیر لاہوری، ابوالبرکات ۱۵۶
مہمرہ شہاب الدین ۱۴۹
ناصر خسرو، ۱۴۱
ناصر علی سرہندی، ۱۵۶
ناصری، ۱۴۸
نظیری نیشاپوری، ۱۵۴
وصالی شیرازی، ۱۵۷
وطواط، رشید الدین ۱۴۳
ہاتف اصفہانی، ۱۵۷

اردو قصیدہ نگار، کہ جن کا مقالہ ہذا میں ذکر ہے، ان کے ناموں کے سامنے صفحہ نمبر درج ہے

آتش، ۱۸۶
آثم، ۵۹۵ و
آثم، حضور احمد، ۶۹ ام
آثم، محمد آثم، ۵۸۱
آرام، امیر الدین، ۵۸۶ ش
آرزو، انور حسین، ۵۹۶
آزاد، الطاف احمد، ۵۸۶
آزاد، انگیز نذر ہیڈرلی، ۶۳۰ ام
آزاد، حافظ فضل حق ۵۸۶ س
آزاد، گورسرن بل توکلی ۵۸۶ ج
آزاد، سید محمود، ۵۸۱ و ۵۸۶ د
آزاد، سید فضل حق ۵۸۶ ش
آزاد، محمد حسین، ۶۹۳ ام
آسی، عبد العلیم، ۵۱۶
آشفتہ، حاجی عبد اللہ ۵۸۹
آشفتہ، عنبر شاہ خاں، ۵۸ ام
آشفتہ، علی آشفتہ، ۵۹۹
آصف، اسد علی خاں ۵۹۰ و ۵۹۵ و
آصف، عبد الجبار، ۵۹۰
آفتاب، شاہ عالم، ۳۳۲
آفرین، قلندر بخش، ام ۶ ام
آگاہ، میر باقر، ۳۱۳
ابر، بشن نرائن در، ام ۵۸
ابو الحسن قزلی، ۳۲۸
ابو الحسن، الہ آبادی، ۵۸۶
ابو القاسم، فتح پوری ۵۸۶ ب
ابو تراب، سید ۵۸۶
ابو تراب، سونی پتی ۵۹۵ ب
ابو ذر، احمد علی احمد، ۵۹۲

ابو شرف مجددی، ام ۵۳
ابو محمد، مولوی، ۵۸۶ ب
اثر، اسرار حسین، ۵۹۸
اثر، امداد امام،
اثر، جعفر علی خاں ۵۹۸، ۶۰۳
اثر، غفار خاں، ۶۰۱، ۶۰۳
اثر مارہروی، ۵۸۵
اثر، مرزا حبیب علی خاں، ۶۱ ام
اثیم، سید ظفر مہدی، ۵۸۰
اجتبیٰ رضوی چھپروی ۵۹۵ و
احسان، احسان علی خاں، ۵۹۲
احسان، حافظ عبد الرحمن، ۶۲ ام
احسان، میر عباس علی، ۵۷ ام
احدی، میر شیخ محمد علی ۵۸۶ س
احسن، ۲۸۲
احسن، آغا جان، ۵۲۶
احسن، احسن علی، ۵۹ ام
احسن، دلو بندی، ۵۸۶ س
احسن، محمد ایوب، ۵۸۶ س
احسن، میر غلام حسن ۵۸۶ ب
احقر، بشارت حسین ۵۹۱
احقر، گوری شنکر، ۶۰۰ و
احمد، ام ۶۰
احمد حسین، رامپوری ۵۸۶
اختر، اختر النبی ۵۸۶ ط
اختر، حسن اختر لودھیانوی ۵۹۹، ۵۸۶ د
اختر، شیخ عبد الحق ۵۸۶ ب
اختر، قاضی محمد صادق، ۶۳ ام
اختر، علی اختر جونپوری، ۵۹۹

اختر، واجد علی شاہ، ۶۷ ام
اخگر، اخگر راجگیری ۵۸ ام
ادیب، سیف الحق ۵۸۶ د
ادیب، گور بخش، ۶۰ ام
ادیب، لطیف حسن، ۶۰۰
ادیب، مسعود حسن ۶۰۰ ب
ارشاد، ارشاد حسین، ۶۰۱
ارشاد، ارشاد حسین الہ آبادی ۶۰۳
ارمان، بندہ علی، ۵۸۶
ارمان، قادر بادشاہ ۵۸۳
اسد، اسد اللہ، ام ۵۹
اسد، اسد درانی، ۵۹ ام
اسد، میر امانی، ۳۲۹
اسعد، اسعد شاہجہانپوری ۵۹۹
اسلم، محمد اسماعیل، ۵۸۰
اسماعیل میرٹھی، ۵۱۷
اسیر، علی احمد، ۵۹۲
اسیر، محمد مرتضیٰ، ۵۹۹
اسیر، مظفر علی، ۳۵ ام
اشتیاق، اشتیاق حیدر، ۶۰۳
اشرف، اشرف علی، ۱۵ ام
اشہر، میر یعقوب علی، ۵۸۶
اشہری، مولانا ۵۸۶ ط س
اصغر، اصغر علی، ۶۶ ام
اصغر، اصغر علی شاہ، ۵۷۶
اصغر، اولاد اصغر، ۵۹۶
اصغر، محمد اصغر، ام ۶۰
اصلح الدین، ۲۸۲
اطہر، اطہر علی کاکوروی ۵۸۰

اطہر، معشوق حسین ۵۷۱
اظہار، اظہار حسین، ۵۹۷
اظہر، اظہر حسین محمد آبادی، ۶۰۲
اظہر، اظہر علی، ۶۰۱
اعجاز، صاحبزادہ اعجاز علی ۵۸۶ س
اعجاز، علی محمد، ۶۰۱
اعظم، ۶۰۰
اعظم، اعظم حسین ۵۹۶
اعظمی، پیام اعظمی ۶۰۲
اغلب، ۵۸۶ ب
افسر، باقر علی،
افسر، غلام اشرف، ۶۰۱ ام
افتق، ہدایت غلام حسین، ام ۲۹
افسوس، میر شیر علی ۳۴۲
افضل، ۱۹۱
افضل، خواجہ محمد افضل ۵۸۶ د
افضل، [illegible] ۵۹۵ ب
افسر، ابو سعید ۵۸۶ ص
افق، منشی دوارکا پرشاد ۵۸۳
اقبال، ۶۰۰
اقبال، اقبال سہیل ۵۶۲
اقبال، سید اختر ۶۰۰ ا
اقبال، محمد اقبال علامہ ۵۵۲
اکبر، اکبر الہ آبادی ۵۲۳
اکبر، اکبر حسین ۵۸۶ س
اکبر، اکبر داناپوری ۵۸۱
اکبری، اکبر نالقا ام ۶ ام
اکبر خاں اکبر سہارنپوری ۵۸۶ ط
اکبر وارثی میرٹھی ۵۹۵ ا

اکمال، اکمال حسن لکھنوی ۵۹۹
التجا، التجا حسین، ۴۰۲
الفت، محمد الفت، ۳۳۳
الم، الم مظفر نگری ۵۹۹
الم، محمد اسمٰعیل ۵۹۵ ا
الم، میر مہدی حسین، ۴م ۵۹
المحی حیدر آبادی، ۵۹۳
امتیاز، ۴م ۳۳
امجد، احمد حسین ۵۹۲
امداد، ۳۳۳،
امداد، امداد اصغر ماہلی ۴۰۲
امن، گوپی ناتھ ۴۰۲
امید، شاہ علی خاں، ۵۸۹
امیر، امیر مینائی، ۹ ۴م
امیر علی، منشی، ۵۸۶
امیر، نواب محمد یار خاں ۳۲۹
امین، ۵۸۶ ب
امین الدین، ۵۸۰
امین، محمد امین خاں ۵۸۶ و
اندر سنگھ، سردار ۵۸۶ ط
انسخ، عصمت اللہ ۶۵۰م
انشا، انشاء اللہ خاں ۳۵۵
انوار، ۴۰۰
انوار، ۳۳۳
انور دہلوی ۶۶ م
انیس، میر انیس ۵۸۶ ب
اوج، مرزا اوج ۵۸۶ ب
اوج، محمد یعقوب گیاوی ۵۸۶ ش
اوحد، اوحد علی کانپوری ۶۶ م
اولاد حسین لکھنوی ۵۸۶ ج
ابجاد، مرزا علی نقی ۳۲۸
ایلیا، جون ایلیا، ۴۰۲
ایما، حسین علی خاں، ۵۷ م
ایمان، شیر محمد خاں ۳۱۹
ایوب، محمد ایوب ۵۸۶ ش
بادشاہ، قادر بادشاہ ۵۳۳
بازغ، محمد عبدالحی ۵۸۶
باسط بسوانی، ۵۸۶ ش
باقی، گردھاری پرشاد ۵۸۰
بحر، امداد علی، ۶۶ م
بحری، قاضی محمود ۱۹۵
بدر آروی، امیر حسن ۵۸۶ س
بدنام، ممتاز الرحمٰن ۵۸۵
برج، برج لال کانپوری ۵۸۶
برق، سندر لال شیام ۴۰۲
برق، عبدالعزیز ۵۸۶ س
برہان، ۵۸۶ ب
برہمن، موہن رام ۵۸۶ ش
بزم، ۵۸۶ ب
بزم، عاشق حسین، ۵۸۶ و
بزم آفندی، ۵۹۶
بسمل، ۴۰۱
بشاش، دیبی پرشاد، ۶۹ م
بشیر، بشیر الدین دہلوی ۵۹۰
بشیر، بشیر النساء بیگم ۵۹۶
بشیر، ممتاز حسین، ۴۰۱
بعید، عباس حسین ۴م ۴۰
بقا، اصغر علی، ۴۰۱
بقا، بقاء اللہ، ۲۹۲
بقا، خواجہ مرتضیٰ ۵۸۶ ص
بلال، عبداللہ، ۴م ۴۰
بلبل، لطیف قتال محمد ۴م ۵۸
بلیغ، حاجی قدرت اللہ ۳۳۳
بندہ، ۵۹۵ ا
بہجت، شفق لال ۵۸۶ ص، ۶۸ م
بے تاب، محمد عباس ۶۶ م
بےخود بدایونی، ۴م ۴۰
بےخود، عبدالحی، ۵۰۳
بےخود، محمد احمد، ۵۶۰
بےخود، وحید الدین احمد ۵۷۰
بےصبر، بال مکند ۲م ۴م
بےکس جبلپوری ۵۸۳
بےنظیر شاہ ۵۹۱
بیان احسن الدین خاں ۳۵۵
بیان یزدانی، مرتضیٰ حسین ۵۸۶ ص
بیدار، میر محمدی، ۳۳۱
بیدل، محمد رضا، ۵۹۲
بیدل، معصوم علی ۴۰۲
بیمار علی بخش ۳م ۶ م
پارسا، فیض پارسا، ۶۸ م
پاسخ، مظفر علی، ۴م ۴۰
پاگل، لالہ پاگل داس
پرتو، اطہر حسین، ۴۰۱
پروانہ، جسونت سنگھ ۳۵۱
پروانہ، ضیاء الدین ۳۲۹
پروین، ام مشتاق ۵۸۶ ب
پنڈت کیفی، ۵۸۶ ش
پنہاں، ماہتاب الدولہ ۷۰م
پیارے صاحب افضل علی ۴۰۱
تاباں، عبدالحی، ۲۵۷
تابش، تابش دہلوی ۴۰۰
تاثیر، میر صادق علی ۳۳۳
تاسف، سید حسین علی ۱۶ م
تائب، حفیظ تائب ۵۷۷
تجمل، ۵۹۵ ا
تحسین، عبدالحمید بدایونی ۵۹۶
تحسین، میر عطا حسین ۳۲۹
تجلی، منتخب الدین ۵۹۰
تجلی، میر محسن ۳۰۶
تسکین، مظفر علی بیگ ۷۰ م
تسکین، مہدی تسکین ۴۰۲
تسلی، محمد قطب الدین علی، ۵۸۲
تسلیم، امیر اللہ ۵۰۰
تسلیم، انوار حسین، ۵۷۹
تسلیم، محمد عثمان، ۵۸۶ ص
تشنہ، ابراہیم تشنہ ۵۹۵ ا
تصور، علی نواز، امانت خانی ۵۸۹
تعشق، مرزا تعشق ۵۸۶
تقی، شبیر تقی، ۴۰۲
تمکین بادشاہ حسین، ۵۹۹
تمکین رضوی ۵۹۵ ب
تمنا، اسد علی، ۳۳۰
تمنا، عمادی، ۴م ۴۰، ۵۷۳ ا
تمنا، مجاور حسین، ۴۰۱
تمنا، محمد حسین، ۵۵ م
تمیز، بدر الدین، ۳ ۶م
تمیز، علی حسن، ۵۸۶ ج
تمیز، علی حسن بتاہ، ۵۸۶
تنویر، خدا بخش ۶ م
تمنا ابن حسن ۵۹۲

تنہا، محمد یحییٰ، ۵۹۵ و جنوں، ۱۹۵ حامد، حامد حسین م ۴۰ حیدر، میر حیدر مہدی ۵۸۶ ض

توفیق، جلال الدین، ۵۸۵ جودت، عبد الہادی، ۴۲م حبیب، حبیب اللہ ۵۸۶ ص حیدر، نصیر الدین، ۶۱م

توکل، ابوالحسن، ۵۹۵ جوش، احمد حسن خاں حبیب، محمد کاظم، ۹۲م حیدری، حیدر بخش ۵۸۱م

ثابت، افضل حسین، ۵۹۲ جوش، شبیر حسین، ۵۹۸ حریف، عبد اللہ حسینی ۵۸۲ حیران، میر حیدر علی، ۳۳۲

ثابت، ثابت علی شاہ، ۳۳۰ جوش، میر غلام علی ۵۸۶ ص حسام، حسام الدین، ۵۷م حیران، محمد خلیل، ۵۸۵

ثاقب، ثاقب حسین [illegible] ۵۴۶ جوشش، محمد روشن ۳۱۱ حسرت، سہروردی ۵۸۶ و حیرت، حافظ عبد الرحمن ۵۸۶ ط

ثاقب، ذاکر حسین، ۴۰۲، ۴۰۲ جوگی، حکیم اللہ یار خاں ۵۹۵ و حسرت، میر جعفر علی، ۲۸۸ حیرت، عنایت احمد ۵۸۱

ثاقب، نجم الدین احمد، ۵۹۲ جولاں، میر حسین علی خاں ۴۰م حسن عباس، ۵۹۵ ب حیرت، سروری، ۵۸۶ ش

ثروت، ثروت حسین ۴۱۱ جون، الیس وی، ۵۸۶ س حسن، محمد حسن، ۴۰۱ حیرت، محمد جان، ۵۷۹

ثریا، احمد نقی علی بہادر، ۵۸۱ جوہر، جواہر سنگھ، ۴۶م حسن محمد حسن صابری ۵۸۶ ج خادم، منشی غلام محمد ۵۸۳

ثمر، اصغر حسین، ۵۸۶ و جوہر، عبد اللہ خاں، ۵۸۲ حسن، محمد حسن شاہ، ۴۳م خادم، محمد خاں قریشی ۵۸۶ ض

ثمر، علی نقاد، ۴۰۲ جوہر، علی ہادی، ۴۰۲ حسن، میر حسن ۲۸۵ حا، ص، ۳۳۳

ثمر، محب الحسن، ۵۹۸ جوہر، معشوق علی، ۵۹۱ حفیظ، اکبر آبادی ۵۸۶ ر خاک، میر طالب حسین، ۵۷۹

جابر علی سید، ۵۹۵ ب جوہری، شاہ آیت اللہ، ۳۳۱ حفیظ، حفیظ الکریم ۵۸۶ ض خاکی، ۳۲۸

جان صاحب، میر یار علی، ۴۵م جویا، الطاف حسین ۵۸۶ حفیظ، مفتی حفیظ اللہ ۵۸۹ ض خاکی، نصیر الدین، ۴۹۱م

جاہ، راجہ جنگ بہادر، ۵۸۶ و جویا، رام بہادر ۴۰۲ حفیظ، حفیظ [illegible] ۵۹۸ خالد، احمد، ۵۷۷

جرأت، قلندر بخش، ۳۱۶ جیمل، موتی لال ۴۷م حفیظ، شیخ حفیظ، ۶۸م خالد، خالد برقی ۵۷۷

جرم، ابوالحسن خاں، ۵۹۷ جیشی، [illegible] ۵۸۶ حفیظ، عبد الحفیظ، ۴۰۲ خالد، عبد العزیز ۵۷۷

جعفر، ۴۰۰ چشتی، محرم علی، ۵۸۶ و حلیم، مولانا عبد الحلیم ۵۸۶ ض خاموش، ظہور احمد ۴۰۱

جعفر، جعفر حسین ۵۸۲ چکبست، برج نرائن ۵۸۶ ش حماد، علی حماد، ۴۰۲ خان، اشرف علی خاں، ۴۰۱م

جعفر طاہر ۵۹۵ ب حاتم، ظہور الدین شاہ، ۳۴۲ حمایت، ۳۳۳ خانہ زاد، محمد علی عسکری ۵۷م و

جعفری، ۳۳۳ حاتم، حاجی فضل حاتم ۵۷۹ حمزہ، محمد امیر حمزہ، ۴۰۰ و خاور، سلطان خاور گورگانی ۵۸۱

جگر بسوانی، ۵۹۶ حافظ، اسمعیل شیخ علی ۵۹۵ و حمزہ، محمد شمس الدین ۵۸۵ خاور، عبد اللہ خاور، ۵۷۷

جگر مرادآبادی، ۵۹۸ حافظ، محمد خلیل الدین، ۵۸۶ ض حمید باقر مرزا، م ۴۰ خاور، محمد احسن، ۵۹۱

جلال، ضامن علی، ۸۶م حافظ خلیل الدین حسن، ۵۷۶ ب حمید پانی پتی ۵۹۵ ب خاور نوری ۴۰۳

جلوہ، میراں بخش ۵۸۶ ش حافظ، حافظ لدھیانوی ۵۷۶ ض حمید، حمید بیگ ۴۰۱ خبیر، سرفراز حسین، ۴۰۲

جلیل، جلیل حسن ۵۶۳ حافظ، ممتاز علی خاں، ۵۸۶ ج حمید، عبد الحمید میرٹھی ۵۸۶ ش ۵۸۲ خبیر، غلام محمد، ۴۰۰م

جمیل، جمیل احمد سعید ۵۸۲ حالی، الطاف حسین، ۵۱۰ حیات، مولوی محمد حیات، ۶۲م خرد، محمد علی حسین، ۶۸م

جنگلی، امداد بخش ۵۸۰ حامد، ۴۰۰ حیدر، احتشام الدین، م ۵۸ خلیل، ایم لو جلیل ۵۹۵ و

جنوں، محمد عمر، ۵۷۷ حامد، حامد حسن قادری ۴۰۰ حیدر، حیدر علی خاں ۵۸۹ خلیل، مولانا خلیل الرحمن ۵۸۶ ض

خنجر، محمد عبداللہ، ۵۷۹
خوب، چھوٹو لعل، ۵۸۶ و
خورشید، بلدیو کشن، ۵۸۱
خیال، اودھیوی، ۵۷۸
خیال، برج ناتھ، لم ۳۳
خیال، سبط حسن، ۵۹۷
خیال، فخرالدین فخر ۵۸۶
داغ دہلوی، ۸۱لم
دانش، نواب غضنفر ۵۹۵
دبیر، دبیر سیتاپوری، ۵۹۹
دبیر، محمد کرم الدین، ۵۸۰
درگاہ قلی خاں درگاہ، ۲۵۹،۵
دستگیر، غلام دستگیر نادری، ۵۸۰
دل لقمان الدولہ دل، ۵۸۵
دل محمد عابد، ۳۳۱
دلاور، دانش علی، ۶۹لم
دلاور، دلاور حسین، ۵۹۸
دلاور علی دلاور، ۵۸۶ ج
دلاور، دلاور علی، ۶۷لم
دلگیر، منو خاں، ۶۹لم
دلگیر، ۵۹۵
دلگیر، بنیاد احمد، ۷۰لم
دماغ، عبدالمجید، ۴۰۱
دولہ، جہانگیر محمد خاں، ۶۴لم
ذاکر، ذاکر حسین، ۴۰۱
ذبیح، ۴۰۵
ذرہ، بالاجی ترنبک، ۳۳۰
ذکاء، رحمت اللہ ۵۹۱
ذکاء، محمد حبیب اللہ، ۶۵لم

ذکاء، محمد ذکاء، ۴۰۲
ذکاء، علی جعفر لم ۵۸
ذکی، اشارت حسین ۵۸۶ ت
ذکی، منیر آغا لکھنوی ۴۰۲
ذکی، مہدی علی ۱۶لم
ذوالفقار، ذوالفقار حسین، ۴۰۲
ذوالفقار خاں، ۵۸۶ ب
ذوالفقار، ذوالفقار خاں ۵۸۶ ض
ذوق، ابراہیم ذوق، ۳۸۸
ذہین، غلام مصطفیٰ [۵۸۱ ۵۸۶]
راحت سرودی، ۵۹۵ و
راز، شریف الحسن ۴۰۲
راز، محمد باقر، ۵۸۶ ط
راسخ، عنایت اللہ خاں [۶۰لم ۵۸۶]
راسخ، غلام علی، ۳۶۹
راسخ، مصطفیٰ حسین، ۶۵لم
راضی، جانی بہاری لعل ۶۶لم
راقم، امام الدین، ۵۸۹
راقم، بہندرا سین، ۲۸۲
رام دیال لکھنوی، ۵۸۶
رزم، جعفر مہدی [۵۹۷ ۴۰۳]
رسا، غلام مصطفیٰ [لم ۵۹ ۵۸۶ ش]
رسا، محمد حیات بخش [۵۸۲ ۵۸۶ ج]
رستمی، کمال خاں، ۱۸۵
رسوا، محمد احسن علی، ۶۵لم
رسوا، مرزا ہادی، ۵۹۲
رشک، ضمیرالدین احمد ۵۸۶ ش
رشید، عبدالرشید فاروقی [۵۸۰ ۵۸۶ ج]
رشید، مصطفیٰ مرزا، لم ۶۰

رضا، احمد رضا خاں بریلوی، لم ۵۲
رضا، رضا حسین ۴۰۱
رضا، ذکی رضا، ۴۰۲
رضا، علی رضا ۵۹۵
رضا، محمد رضا، ۳۳۳
رضا، علیم اللہ خاں لم ۶۷
رضا، مفتی محمد رضا ۵۸۶ ط
رضوان، رضوان علی خاں ۵۸۶ ت
رضوان، محمود اختر، ۵۸۱
رضوی، ابرار حسین، ۴۰۲
رضوی، ابوالظفر نازش، ۵۹۵
رضوی، محبوب النبی ۴۰۱
رضوی، محمد عادل ۵۹۵ ت
رضی، سید رضی الدین ۵۸۶ ظ
رعنا، نواب مردان علی خاں ۵۸۶ و
رفیق، رفیق حسن ۵۹۹
رکن الدین، ۵۸۶ و
رمز، رمضان علی ۴۰۱
رنج، فصیح الدین ۶۵لم
رند، محمد خاں، ۶۶لم
رنگیلے، محمد اسماعیل، ۵۸۵
رنگین سعادت یار ۳۷۱
روشن، روشن علی، ۴۰۲
روشن لکھنوی ۵۹۵ ت
رونق، پیارے لال [۵۸۰ ۵۸۶ ج]
رونق، غلام حسین ۵۶لم
ریاض، ۴۰۰
ریاض، ریاض الدین احمد لم ۴۰
ریاض، ریاض حسن ۴۰۲

ریاض، ریاض خیرآبادی ۱لم ۵
ریاض، ریاض علی بنارسی ۵۹۲
زاہدہ، زاہدہ خاتون ۵۸۹
زائر، محمد اطہر سیتاپوری ۴۰۲
زحل، ۶۶لم
زکی، مرزا محمد ۵۸۶ ب
زکی، محمد زکی لم ۶لم
زلالی، انصار حسین ۵۸۹
زماں، لم ۳۳
زوار، ۴۰۰
زوار، زوار حسین ۴۰۱
زیبا، علی حسنین، ۵۹۵
زیدی، علی جواد، ۴۰۲
ساجد، قاری ساجد علی ۵۸۶ و
ساحر، پنڈت امرناتھ لم ۵۸
ساغر، ماتا پرشاد ۵۸۶ ط
ساقی، جواہر ناتھ ۵۸۶ ط
سالک، ابوالحسن، ۵۸۶
سالک، آل نبی، ۴۰۰ ب
سالک، سالک رام ۵۸۶ ش
سالک، قربان علی، ۲۶لم
سالک، محمد حسن ۴۱۱
ساقی، مرزا محمد جان، ۵۷لم و
سائل، میر عبدالحسین ۵۸۹
سائل، آغا سائل کاشمیری ۵۷۷
سبقت، مرزا محمد، ۵۷لم
سجاد علی خاں، ۵۸۶ ج
سحر، اقبال ورما ۵۸۶ ش
سحر، امان علی ۳۹۷

سحر، امیر حسن خاں، ۵۸۶ و
سحر، دیبی پرشاد، ۵۷۹
سحر، نواب علی خاں [۴۹م، ۵۸۶]
سخا، نظیر حسین، ۵۹۱
سخن، غلام مصطفٰے، ۵۹۱م
سخن، فخرالدین حسین، ۵۷۹
سخنور، مبشر حسین، ۴۰۸
سخنور، محمد یعقوب، ۴۰۱م
سراج الدین احمد، ۵۸۶ ط
سراج اورنگ آبادی، ۵۸۱م
سراج، سراج الدین، ۵۸۹ د
سرخوش، بنے خاں، ۴۰۰ و
سردار، اودھم سنگھ ۵۸۶ ش
سرشار، پنڈت رتن ناتھ ۵۸۶
سرمد، عظمت اللہ خاں، ۵۹۱
سرمد، منظور حسین، ۴۰۳
سرو، سہارنپوری [۵۷۶ ب، ۵۹۵ ب]
سرور جہاں آبادی [۵۹۵م، ۵۸۶ ط]
سرور، مفتی غلام سرور ۵۸۶ و
سروش، اختر حسین، ۴۰۲
سروش، محمد عسکری، ۴۰۲
سعید، سعید الدین عثمانی، ۵۸۱م
سعید، سعید الدین کاکوروی، ۴۱م
سعید، غلام عباس مرزا، ۵۸۳
سعید، غلام عباس ۵۸۶ ج
سعید، محمد سعید، ۵۹۲
سفیر، باقر علی خاں ۵۹۵ و
سفیر، شائق حسین [۵۸۶ ج، ۴۰۰ و]
سفیر، کاکوروی، ۵۸۶

سکندر، خلیفہ محمد علی، ۳۳۳
سلام، خواجہ پیر، ۵۸۲
سلیم، احمد آغا، ۴۰م
سلیم، اعظم حسین، ۵۸۶ ص
سلیم، اولاد حسین، ۵۸۶
سلیم، سلیمان خاں، ۵۷۹
سلیم، فیض الحسن، ۵۸۲
سلیمان شکوہ، ۴۰م
سمجھو، غلام محمد، ۴۲م
سوار، لقا، ۴۰۱
سودا، مرزا رفیع، ۲۶۵
سوزش، عبد الغفار، ۵۸۶ س
سہا، شبیر حسین ۵۸۳
سہاگن بیگم، ۵۸۵
سہاوری، اسرار احمد ۴۰۰ آ
سہیل سرفراز احمد، ۵۷م
سیاح، داد خاں، ۴۹م
سید احمد، ۵۸۲
سید احمد حیدر آبادی، ۵۸۶ ص
سید علی میر، ۵۸۶ ص
سید محمد، ۳۲۹
سید مودودی محمد ایوب ۵۸۶ س
سیف، محمد حسین، ۴۰۱
سیماب، احمد علی، ۵۸۶
سیمابی، حاجی محمد عمر، ۵۹۰
شاد، انور علی ۴۰۰ و
شاد، پنڈت پریم سنگھ ۵۸۶ ش
شاد، رحمت اللہ، ۴۰م
شاد، سعد اللہ عظیم آبادی [۵۹۰، ۵۸۶ ط]

شاد، صوفی، ۴۰م
شاد، کشن پرشاد، ۵۵۹
شاد، محمد جان پیر و میر، ۷م
شاد، منشی قادر بخش ۵۸۶ ش
شاد، میر تقی ۵۸۶ ش
شادان، چندو لال، ۴۱م
شارب، سلطان حیدر، ۴۰۲
شاطر، بلدیو پرشاد، ۵۸۶
شاطر، عبد الرحمن، ۵۵۱
شافی الہ آبادی، ۵۸۲
شاکر ناجی، ۲۵م
شاکی، احمد حسن، ۴۴م
شاعر، آغا شاعر ۵۸۶ س
شاعر مرزا، میر ابو القاسم، ۴۹م
شاغل، ۵۹۵ و
شافعی، بادشاہ محمد دین ۵۸۶ ب
شاہ امین الدین اعلی، ۱۸۷
شاہ سید محمد شاہ، ۴۰م
شاہی، علی عادل شاہ [۱۸۹، ۲۰۹]
شائق سعید الدین، ۵۸۶
شایان، طوطا رام ۵۸۶ ش
شباب، محمد اختر یار، ۵۸۵
شبر، محمد صادق، ۴۰۲
شبلی نعمانی، ۵۰م
شبیر حیدر آبادی ۵۸۶ ض
شجاع، ابو اسحق محمد، ۴۹م
شدید، سجاد حسین، ۴۰م
شرر، علی حسن ۴۶م
شرف، شرف النساء، ۵۸۳

شرف، محمد شرف الدین، ۵۸۶ خ
شرف وقار الاعظم، ۵۸۱
شریف، ۱۸۶
شعبان علی، ۴۰۲
شعلہ، سبزواری لال، ۵۸۱
شعلہ، مومن حسین، ۴۰۲
شغلی، ۱۸۸
شفق، شفق عماد پوری، ۵۹م
شفق کرتپوری، ۵۸۶ ا
شفق، کنج بہاری لعل ۵۸۶ ض
شفق، ولی الدین ۵۹۷
شفیق جونپوری ۴۰۰ ا
شفیق لچھمی نرائن، ۳۱م
شفیق، محمد شفیق الحق ۵۹۵ ب
شفیق، ننھو صاحب، ۴۰۲
شگفتہ، مرزا سیف علی، ۴۰م
شمس الدین ۴۰م
شمشاد، عبد الاحد، ۵۵م
شمشیر علی شمشیر ۵۹۵ و
شمیم، ۵۸۶ ب
شمیم شمس الدین حیدر، ۴۰۲
شمیم، مرتضٰی خاں، نواب، ۵۹۱
شوخ، سبزواری لال، ۵۹۱
شور، جارج پیش، ۵۸۶ ش
شورش، میر غلام حسین، ۳۳۰
شوق، اسد اللہ خاں بنارسی [۵۹۲، ۴۰۰]
شوق، تہمتن جنگ ۴۹م
شوق، جگناتھ پرشاد ۵۸۶ ب و ض
شوق، رائے تفاکر پرشاد ۵۸۳

شوق، ظہیر احسن، ۲۷۸م
شوق، عبدالحق، ۵۷۷
شوق قادری، ۵۸۶ ج
شوق، محمد علی، ۳۳۰
شوقی، محمد (صادق) ۵۸۶ س
شوکت، غلام رسول، ۵۸۶ ص
شہاب، شہاب دہلوی، ۵۹۹
شہاب، محمد سیف الدین ۵۸۶ ش
شہرت، ۳۳۳
شہرت، اعجاز علی ۵۸۶ ج
شہرت، ہیرالدل، ۶۹۰م
شہیار، محی الدین، ۴۰۳
شہید، شہید حسین ۴۰۴
شہید، شہید یار جنگ ۵۸۶ ص
شہید، صبغۃ اللہ، ۴۰۴
شہید، غلام امام ۳۳۴م
شہید، محمد بخش، ۶۳۰م
شہید، مہدی علی ۵۹۴
شہیدی، کرامت علی ۳۲۸
شہید، حافظ محمد خاں ۵۸۶ ص
شہید، محمد نوح [۵۸۶ ش ۵۹۹ و]
شیدا، ۴۰۰
شیدا، عبدالرحمن بیگ ۵۸۲
شیدا، خواجہ عتیق اللہ ۴۰۰ و
شیدا، مہدی کاکوروی ۶۷۰م
شیدا، نثار حسین ۴۰۰ و
شیر (جنون)، شیر خاں ۵۷۴
شیفتہ، سرفراز علی ۶۷م
شیفتہ، عزیز اللہ ۶۳م
شیفتہ، کاظم حسین ۶۹۵م

شیفتہ، محمد مصطفی خاں ۶۹م
شیو پرشاد، منشی ۵۸۶ ص
صاحب، خجستہ ۵۷۰ و
صابر، صابر بسنانی ۵۹۳
صابر، قادر بخش ۶۹۱م
صابر، محمد ہارون ۴۰۱
صادق (ارطان)، عبدالحق ۵۸۶ ح
صادق حسین ۵۸۶ و
صادق، صادق علی، ۶۸۱م
صادق، میر مبارک، ۵۸۶
صبا، صبا اکبر آبادی ۵۹۶
صبر، بار ہولو گارڈنر ۵۸۶ ص
صبر، لبش ناتھ ۶۵م
صبر، ثنا احمد ۴۰۱
صبر دہلوی، ۵۸۳
صبر، عبدالکریم ۵۸۳ ص
صدر، لچھمن پرشاد ۵۹۰
صدر محل، نواب ۵۸۶ ج
صدق، ۳۳۳
صدق، تصدق حسین ۴۰۲
صغیر، غلام حیدر ۶۸م
صفا جونپوری ۴۰۳
صفا، ذوالفقار علی خاں ۶۱م
صفدر، صفدر علی ۵۲۸
صفی، صفی اورنگ آبادی ۴۰۲
صفی، علی نقی ۵۶۸
صغیر، امداد حسین ۶۷م
صغیر بلگرامی، فرزند احمد ۵۸۶
صل علی احمد ۵۸۶ ط
صمد، عبدالصمد ۶۷م

مصحفی، ۱۸۵
صوفی، عبداللہ سلیمی ۵۸۶ ب
صوفی منیری، ۶۸م
ضامن، ضامن علی ۵۹۹
ضامن، علی ضامن ۴۰۱
ضبط، ابو محمد ۴۰۱
ضرغام، عبدالغفور ۶۹م
ضمیر، منظور حسین ۶۸م
ضیا، بادشاہ علی ۴۰م
ضیا، ضیاء الدین ۳۳۳م
ضیا، حافظ محمد حسین ۴۰۳
ضیا، وارث علی ۶۶م
ضیغم، محمد عبداللہ خاں ۵۸۲
طالب، ۵۹۵ و
طالب، مولوی اللہ داد ۶۳م
طالب بنارسی [۵۸۶ ش ۵۸۶ ص]
طالب، دنانک پرشاد ۵۸۶ ش
طالب ملتانی، ۵۷۹
طالق، طالق سعدانی ۵۷۶ ب
طاہر، احمد سعید ۴۰۱
طاہر، ریاض الحسن ۴۰۱
طاہر، یوسف حسین ۵۸۶
طاہرہ، طاہرہ بیگم ۵۹۶
طپش، مرزا جان ۶۵م
طرار، زوار حسین ۴۰۱
طرب، ۵۹۵ و
طغرائی، فیروز الدین فیروز ۵۹۲
طیب، غلام علی ۵۹۰
طپش، رحمت علی ۵۷۰ و
ظفر، اولاد حسین ۴۰۱

ظفر، بہادر شاہ ۶۵م
ظفر ترمذی ۵۹۵ ب
ظفر شارب ۵۹۵ ب
ظفر علی خاں، ۵۷۲
ظہور، ظہور احمد ۴۰۲
ظہوری، محمد علی ۵۹۵ ب
ظہیر، ظہیر الدین ۶۹۷م
عابد نظامی ۵۹۵ ب
عابد، عابد نظامی ۵۷۷
عابدی، بدر الحسن ۵۹۸
عاجز، عارف الدین ۳۲۸
عاجز، محمد علی ۱۹۵
عارج، محمد عارج ۴۰۱
عارف، زین العابدین ۶۲م
عارف، محمد حسین ۴۰م
عاشق، عاشق لکھنوی ۴۰م
عاشق، محمد اقبال حسین ۵۸۳
عاشق، مرزا مچھو بیگ ۵۷۹
عاشق ملتانی ۵۸۶ ب
عاصی، نور محمد ۳۲۸
عاشق، یوسف دلدار صاحب ۵۸۶ ص
عاقل، ظفر الحسن ۴۰۲
عاقل، مہدی حسین ۶۷م
عاقل، میر سلطان
عالم، مرزا الطاف حسین ۵۸۶
عامر، جعفر رضا وسانی ۴۰۳
عاصی، احمد علی رامپوری ۵۸۶
عاصی، گمنشا لال [۵۷۰ و ۵۸۶ ۵۸۶ س]
عالی، میر عباس علی ۵۸۶ ب
عباس، عباس علی ۶۳م

عباس، سید غلام عباس ۵۸۶ ر
عباسی، منظور احسن ۴۰۰ ا
عبدالرحمن سید ۵۸۶ ض
عبدالرزاق بھرتپوری، ۵۸۶ ض
عبدالحق، قاضی عبدالحق ۴۰۳
عبدالحی، شیخ عبدالحی، لم ۴۰
عبدالشکور، شاہ فرید الدین ۵۹۵ و
عبدالغفور خاں منشی ۵۸۶ س
عبدالقدوس، لم ۴۰
عبدالمجید، ۵۸۶ ب
عبدہ، ۵۹۵ و
عثمان، عثمان علی ۵۸۶ تج
عدیل، محمد عسکری، ۷۰ لم
عرش، عرش گیاوی ۵۸۲
عرشی، احمد حسن ۴۳، لم
عرشی بنارسی ۴۰۰۱
عرشی، حافظ محمد عبدالحفیظ ۵۸۶ ش
عرشی، مفضل رب ۵۸۶
عرشی، مجتبیٰ حسین ۵۸۶،
عرشی، محمد محمود ۵۸۶ س
عروض، حسن کاظم ۴۰۲،
عزیز، ساحل پوری ۴۰۳،
عزیز، عبدالعزیز، ۴۹۱ لم
عزیز فیضانی ۵۹۵ و
عزیز محمد ولایت خاں ۵۵۰
عزیز، ہادی عزیز ۳۳ لم ۵
عزیز الرحمن، ۵۷۷
عشرت، خواجہ عبدالرؤف ۵۸۶ ش ۵۹۳،
عشق، جبر عزت اللہ ۴۶۱ لم

عشق، محمد حبیب اللہ [۵۸۶ تج ۵۸۶ س
عشق، میر محمد علی ۳۳۲،
عشق، عشق خاں ۱۴۲،
عشقیہ، امداد علی ۵۸۲،
عطا، شیخ عطا حسین ۴۶۵ لم
عظیم الدین احمد ڈاکٹر ۴۰۰۱ ا
عظیم، عظیم بیگ، ۳۲۹
عفو، ابراہیم، لم ۴۰
علوی، نہال احمد لم ۴۰
علی محدث لکھنوی ۵۸۶،
علیم ناصری ۵۷۶،
عنبر، منشی سنت لال ۵۸۶ ش
عنصر، ۵۹۵ و
عنقا، ناصر حسین، لم ۴۰
عیش، ۵۸۶
عیش، حکیم آغا جان ۹۱ لم
عیش، ابو محمد حائلی ۴۰۲
عیش، امتیاز حسین ۴۰۲،
عیش، مرزا علی ۳۳۰
عیش، نجابت حسین ۵۹۵،
عیش، نظام حیدر آبادی ۴۹۰، لم
عیشی، طالب علی خاں، ۴۶۱ لم
غازی، لم ۳۳
غالب، اسد اللہ خاں ام لم
غبار، صادق حسین لم ۵۸
غریب، ایم محمد دین ۵۸۶ ص
غفلت، احمد خاں، ۴۱ لم
غفور، عبدالغفور ۴۰۱
غلام احمد، لم ۳۳

غلام عباس سہارنپوری ۵۸۶ ط
غلام، غلام رسول ۵۹۵ و
غمیں، مرزا معین الدین، لم ۴ لم
غنی، آغا علی نقی ۵۸۶،
غواصی، لم ۲۰، ۱۹۲
غوثی، شاہ غوثی ۳۳۳،
غیاثی ۵۸۶ ب
غیرت، ۳۳۳
غیور لکھنوی ۵۹ لم
فاروقی، نظام الدین ۵۸۶ ض
فاضل، حیدر علی، ۵۷۰ ا
فائز، ۴۰۰
فائز، محمد حسن ۴۰۲،
فتح الدین، لم ۴۰
فتنہ، نذیر حسین ۵۹۱،
فخر بنارسی، ۴۰۰
فخر جونپوری، ۴۰۲
فدا، فدا حسین، ۴۶۵ لم
فدا، فدا علی خاں، ۴۷ لم
فدا کھیم کرنی، ۵۷۶ ب
فدوی پنجابی، ۳۲۸
فراست، فراست حسین، ۴۰۱
فرانسو، فرانسس، ۴۳ لم
فرحت، علی احمد، ۵۸۶ ش
فرحت، میر محمد حسین، ۵۷۰
فرخ، ۴۰۰
فرخ بخش ارکانی، ۳۱
فرخ، واجد علی، ۵۹۱
فروغ، امیر حسین ۵۸۶ ص

فروغ، محمد عبید اللہ، ۵۸۲
فریاد، الفت حسین، ۴۶۵ لم
فریاد، عابد علی، ۴۸۱ لم
فصیح، احسان علی ۵۸۶ ش
فضل، تفضل حسین لم ۴۰
فضل، فضل حسین، لم ۴۰
فضل، مفضل رب، ۵۸۲
فضل، فضل مولیٰ خاں
فضل نقوی، ۴۰۲
فغاں، اشرف علی ۲۴۵
فلک، لالہ جیند، ۵۸۶ ش ۵۸۶ ط]
فنا، جوزف ہینسلی، ۴۸۰ لم
فنا، ابراہیم فنا، ۴۰۰ ا
فنا، عبدالباقی ۵۸۶ و
فوق، نظیر الحسن ۴۰۱
فوق، محمد دین، لم ۵۹
فیاض، ۳۳۳
فیاض، فیاض علی ۴۰۲،
فیض، ۴۰۰
فیض الحسن سہارنپوری ۴۷ لم
فیض، شمس الدین، لم ۴ لم
قادر، ۱۸۸
قاسم، قاسم شبیر ۵۹۸،
قاسم، قاسم علی بیگ ۴۹ لم
قاسم، قدرت اللہ، ۴۰ لم
قاسم، محمد قاسم ۵۹۵،
قاسم نانوتوی ۴۹۱ لم
قائم، قیام الدین ۴۹۹،

قبول، سید علی خاں، ۴۸م
قدر، غلام حسنین، ۴۰۰م
قدرت، قمر الدین ۴۰۰ و
قدسی، جعفر جائسی، ۴۰م [۵۹۴
قدسی، عبدالقدوس، ۴۰م
قدسی، محمد نعیم الدین، ۴۰۲
قطب زاری، بازاری، ۱۹۱
قطبی، قطب الدین، ۵۸۲
قلیچ بیگ، قلیچ، ۵۹۱
قلق، ارشد علی، ۲۵م
قلق، غلام مولی ۲۲م
قلی قطب شاہ، [۱۹۱ / ۱۹۲]
قمر جلالوی، ۵۹۹
قمر، سراج الحق، ۵۹۹
قمر، قمر صدیقی ۵۸۱
قمر (جناب) قمر، ۵۸۶س
قیس، ۵۹۵ و
قیس زنگی پوری، ۴۰۳
قیس آروی، حمید الحق، ۵۷۹
قیس، علی عباد، ۴۰۱
قیس، لالہ اوجینہ، ۵۹۶
قیس، محمد ضمیر الحق، ۵۹۵
قیس، محمد عثمان، ۵۸م
قیصر، نواب احمد علی خاں ۵۸م
قیصر، شاہ امین الدین، ۵۸۰
کاظم، محمد کاظم بنارسی ۵۹۷
کافی، میر عباس علی، ۵۸م
کامل، ۴۰۰
کامل، سعید الدین، ۵۸۶
کامل، کامل شفیقی، ۴۰۲

کامل علی میاں محمد آبادی ۵۸۶
کریم، محمد قدرت، ۵۸۲
کشتہ، غلام حیدر، ۵۸۶ ط
کلامی، سید محمد رزاق، ۵۸۶
کلیم، ۵۸۳
کلیم دہلوی ۵۸۶ ش
کلیم، شبیر حسین ۵۹۵
کلیم، مولوی عبدالصمد ۵۸۶ و
کلیم، عطا حسین ۵۹۵ ب
کلیم، محمد عبادت، ۴۰۲
کمال، ۴۰۰
کمال خلف جلال ۵۸۶ س
کوثر، ۵۹۵ و
کوثر، جعفری، ۵۹۵ ب
کوکب، مرزا احمد علی ۵۸۱
کول، جواہر ناتھ ۵۸۶ ش
کول کشن، رادھے ناتھ ۵۹۲
کیسری، جگن ناتھ، ۴۰۱
کیف، حافظ عالمگیر، ۵۸۲
کیفی، برجموہن دتاتریہ ۵۸۳
کیفی دہلوی، ۵۸۶ ض
کیفی، عنایت حسین، ۴۷م
کیفی، محمد مبین، ۴۰۲
گرامی، عبدالخالق ۵۹۰
گدا، غلام محمد شاہ، ۵۸۱
گستاخ، کرامت اللہ ۵۸م
گل، اکبر علی، ۴۸م
گوہر، ۴۰۰
گوہر جعفری ۵۹۵ ب
گوہر فیض اللہ ۵۸۶ ض

گوہر، فیض محمد، ۴۰۳
گوہر، منور خاں ۵۰۹
گویا، فقیر محمد، ۳۸۳
گہر، التفات حسین ۴۰۱
گہر، ظفر مہدی ۴۰۲
لطف، ۵۸۶ ب
لطف علی لطف بریلوی ۵۸۶ و
لطف، مرزا علی لطف ۵۸۰م
لطف، لطف علی خاں ۵۸۶ ح
لطیف، شاہ لطیف ۵۸۶ و
لطفی، ۱۹۸
مانی جائسی، کلب احمد ۵۹۷
مانی، غلام علی خاں ۵۸۶ س
ماہ، میر محمد علی خاں ۳۲۳
ماہ، عظیم آبادی ۵۸۶ ض
ماہر، جمعیت شاہ ۴۸م
مائل، احمد حسین ۵۸۶ و
مائل، محمد یونس، ۴۰م
مبارز الدولہ، ۴۸م
مبارک، مبارک علی ۵۸۶ ش
مبین، محمد محسن ۴۹م
مجرم، ۳۲۳
مجروح، میر مہدی ۵۸۰
مجیب اللہ، مولوی ۵۸۰
محب، برج بھوکن لال ش ۵۸۶
محب حسین محب [۵۸۶ ط / ۵۸۶ ح
محب، محب الدین احمد، ۵۸۱
محبت خاں محبت ۵۷م
محجوب، ۵۸۶ ح
محروم تلوک چند ۵۹۷

محزوں محمد حسن، ۳۲۹
محسن، ۴۰۰
محسن کاکوروی، ۷۷م
محسن، اعظم گڑھی ۴۰۳
محسن، محمد محسن ۵۹۵
محسن، محمد صدیق ۵۸۶ س
محشر، عباس بیگ ۵۹۵
محشر، عبدالرحمن ۴۰۱
محشر، فرزند علی ۴۰۲
محشر، کاظم حسین [۵۳۵ / ۴۰۲
محشری، میر تہنیت علی ۵۸۶ ح
محضر، محمد اصغر، ۴۰۱
محمد ابراہیم خاں (مولوی) ۵۸۶ ض
محمد اسماعیل سلہٹی ۵۸۶ ط
محمد اسماعیل میر محمد ۵۹۵ ب
محمد حسین خاں، ۴۰م
محمد حسین خاں ۵۸۶ ر
محمد حسین خاں پیرزادہ ۵۸۶ ص
محمد حنیف صدیقی ۴۰م
محمد خاں غریب ۵۹۵ و
محمد خاں مرزا، ۴۸م
محمد رسول بھائی ۵۸۶ ب
محمد رسول خاں رضوی ۵۸۶
محمد شاہ، سید ۵۷۹
محمد صادق علی خاں ۵۸۶ س
محمد قاضی شیخ محمد ۴۰م
محمد عبدالجلیل نعمانی ۵۸۶
محمد عبدالحفیظ منشی ۵۸۶ س
محمد عبدالعزیز ۵۹۵ و
محمد علی شاہ ۵۸۶ س

محمد علی مراد آبادی، ۶۵م
محمد نقش بندی، ۵۸۰
محمود اسرائیل ۶۰۰و
محمود، بشیر الدین ۵۹۵ب
محمود دہلوی ۵۸۹
محمود، محمود شاہ م ۴۰
محمود، محمود علی خاں ۵۹۵
محمود، محمود علی رنگی ۵۹۵و
محوی، دین محمد ۵۹۰
مداح، م ۴۰
مدعا، میر عوض علی، ۲۶۲
مذاق، عبدالرحیم ۵۹۲
مذاق، محمد دلدار بدایونی ۶۵م
مرتضیٰ حسین موسوی، ۴۰۲
مرزا غلام احمد ۵۸۶ق
مرزا مقیم، ۱۸۵
مرغوب علی اطہر، ۵۹۳
مروت، جعفر علی ۳۳۲
مرہون، ۳۳۳
مسافر، غلام بھیک شاہ م ۴۰
مست، اشرف علی ۵۸۶ط
مسیحا، حکیم محمد علی ۴۲م
مشتاق، ۱۹۶
مشتاق، اشتیاق احمد، م ۵۹
مشتاق، مصحف حسین [۵۹۵ ۴۰۲]
مشرق منیری ۵۸۹
مشیر، مشیر حسین [۵۸۶ط ۵۹۵و]
مصحفی، غلام ہمدانی ۳۶۵
مضطر، میر بھو دیال م ۴۰

مضطر، افتخار حسین ۵۹۰
مضطر، کنور سین ۳۸۲،
مضطر، نادر علی خاں ۵۸۶و [۵۸۶ ش ۵۸۶]
مظفر، مظفر حسین ۴۰۱،
مظہر حسن مظہر ۵۸۶س ۵۸۶ب
معجز، اعجاز احمد ۴۰۱
معظم، ۱۸۸
معلی، مظفر الدین ۵۸۶ج
معین الدین، ۳۳۲
مغل، مغل بیگ ۵۸۶س
مغموم، اسمٰعیل [۵۸۶ص ۵۸۶و]
مفتون، عبدالغفار ۵۸۶ش
مفتون و سلیم، وحید الدین ۵۸۶ق
مفتون، محمد شریف، ۳۳۱
مقصد، ۵۹۵و
مکمل، رکن الدین ۵۸۶و
ملک خوشنود، ۱۸۵
ممتاز، مفضل علی، ۳۲۹
ممتاز، ممتاز حسین ۴۰۱
ممتاز الدین، ۵۸۶ر
ممنون، نظام الدین ۳۲۹
مناقی، شرف الدین ۴۰۰و
منتصر، منتصر حسین ۴۰۱
منتظر، شیو ناتھ، ۶۹م
منشی، مستیا بیگ، ۵۷۹
ملچھو بیگم لکھنوی ۵۸۶ط
منظر، جعفر حسین ۴۰۱
منور، لشیشر پرشاد ۴۰۲
منیر، منیر شکوہ آبادی ۲۲م

منیف، معین الدین ۴۰۲
موثر، محمد علی، ۴۰۲
موثر، محمد علی حباتی ۴۰۳
موجد، حشمت علی خاں ۶۲م
موجد، سرسوی ۴۰۳
موزوں، ۳۳۳
موزوں، میر فرزند علی ۵۸۶م
موسوی، ضیاء الحسن ۵۹۵ب
مول چند، ۶۸م
مولانا محمد سعید ۵۸۶ج
مومن، مومن خاں م ۳۸
مہجور، محمد بخش ۳۲۶ ۵۸م
مہر، آغا علی خاں ۵۹م
مہر، حاتم علی بیگ ۶۵م
مہر، سورج نرائن ۵۲۴
مہر، منصور علی خاں ۵۹م
مہرباں، میر عبدالقادر ۳۲۹
مہند، محمد مہند، ۴۰۱
میر، میر تقی، ۳۲۱
میراں شاہ جالندھری ۵۸۶ط
میراں ہاشمی، ۲۲۱
میرزا محمد، ۶۱م
میکش، اظہر حسین ۴۰۳
میکش، جانکی پرشاد ۵۹۳ق
میکش، سورج بھان ۵۸۰
ناجی، اصغر حسین ۵۸۶
نادر، کلب حسین ۵۸۶ب
نادر، نادر علی کاکوروی ۵۸۳
ناز، امیر علی نواز خاں ۵۸۶ق

نازاں، قنبر علی بھٹو ۴۰۲
نازش، ابوالظفر ۵۹۹
ناسخ، امام بخش ۵۹م
ناصر، سعادت علی، ۶۲م
ناصر، غلام عباس ۴۰۱
ناصر، محمد شفیع ۵۸۶و ۵۸۶ط
ناصر، ناصر حسین ۴۰۱
ناصری، مہدی حسین ۵۹۱
ناطق، ارتضیٰ حسین ۵۹۲
ناطق، علی محمد ۴۰۱
ناطق، ناطق لکھنوی ۵۹۵و
ناظر، ۴۰۰
ناظر، خوشی محمد م ۵۹
ناظم، ظہور الحسن ۵۹۲
ناظم، ناظم علی ۵۸۶
ناظم، نواب یوسف علی ۵۸۶و
نافذ، ۴۰۰
نامی، آغا حسن ۵۸۶د ۵۸۶س
نامی، شاہ محمد ۵۸۶ج
نامی، عظمت علی، ۵۸۶
نامی، غازی الدین، م ۴۰
نامی، وزیر حسین ۴۰۱
نانک، نانک چند، ۵۹۳
ناوک، محمد ناوک ۵۹۸
نایاب، منشی نبی بخش ۵۸۲
نجم آفندی، نجم حسین ۵۷۵و
نجم رضی الدین ۴۰۲
نجم، نجم الحسنین ۵۸۰
نحیف، مہدی علی خاں ۶۲م

ندا، م۳۳۲
نذر، نذر محمد، ۵۸۲
نذیر، نذیر احمد جالندھری ۴۰۲
نذیر، نذیر احمد (ڈپٹی) ۵۸۳
نزہت، امیر الدین ۵۸۶ ی
نساخ، عبدالغفور ۵۸۶ ص
نسیم، اصغر علی، ۲۰م
نسیم امروہوی ۴۰۰ ا
نسیم، فضل مہدی ۴۰۱
نسیم لکھنوی ۵۸۶ ش
نسیم، محمد عنایت مرزا، م۴۰
نشاط، گوبند سہائے ۶۸م
نشتر، ۵۹۵ ب
نصرتی، م۲۱، ۱۸۹
نصیر، ۳۳۲
نصیر خاں ۵۷م ی
نصیر شاہ نصیر ۳۷۶
نصیر، محمد نصیر الدین ۵۸۶ ش
نصیر، نصیر الدین، ۵۷۱
نطق، مقصود احمد، ۵۸۶
نظام الحق شاہ ۵۸۶ س
نظام، نظام شاہ ۱۷م
نظامی، نظام الدین م۵۶
نظر، نوبت رائے ۵۸۳
نظم طباطبائی ۵۳۷
نظمی، مہدی نظمی ۴۰۰
نظیر، اصغر حسین ۵۷۷
نظیر، ولی محمد ۳۷۰
نعیم، نعیم اللہ ۶۸م

نعیم محمد نعیم الدین ۵۸۶ ج
نفیس، نواب علی کانپوری [۴۶۶ / ۲۰م]
نکہت، نیاز علی بیگ ۹۸م
نوا، ظہور اللہ ۵۶م
نواب کلب علی خاں ۶۷م
نوح ناروی ۵۸۶ / ۴۰۰
نور، ۵۹۵ ی
نوید، ۳۳۲
نہال لکھنوی ۵۹۵ ب
نہال رضوی ۴۰۰
نیاز، نیاز احمد ۵۸۶
نیاز، محمد صبیح عالم ۳۲۹
نیر سلطان پوری ۵۹۵ ب
نیر، مرزا جہاں قدر ۵۸۶
نیساں علی عباد ۵۸۵
واسطی، فضل رسول ۶۵م
واصف، اخلاق حسین ۴۰۱
واصف محمد واصف م۵۹
واصل، مولوی محمد واصل ۵۸۶
واعظ، ۵۸۶ ض
وافر، احمد حسین ۶۶م
واقف لکھنوی ۳۳۰ / ۵۸۶ د
والہ، رحمت خاں ۶۰م
وحشت، باقر علی خاں ۶۹م
وحشت رضا علی ۵۹۷
وحید، بہادر حسین ۶۷م
وزیر خواجہ وزیر ۶۳م
وزیر حسن وزیر ۵۸۶ ص
وزیر، وزیر حسن عابدی ۴۰۲

وزیر، وزیر علی ۵۸۳
وسیم خیر آبادی ۵۸۶ ج
وسیم محمد عسکری ۵۹۰
وصیف ڈبیروی ۵۹۵ ب
وفا، عبدالہادی ۵۰۷
وفا، محمد عمر م۵۸۱
وفا، نول رائے ۳۲۸
وقار، وقار حسین ۴۰۱
ولا، محمد عبدالعزیز ۵۸۶ د / ۵۸۶ س
ولا، امیر علی ۵۸۶ ط
ولا، مرزا لطف علی خاں ۵۷م
ولایت، محمد ولایت اللہ ۵۹۳
ولی دکنی، م۲۲
ولی منشی عبدالحمید ۵۸۶ ج
ولی قلندر علی خاں ۵۸۵
وہبی شبو پرشاد ۵۸۶ ط
ہاتف عاشق حسین ۵۸۶ ب
ہادی، ۳۳۳
ہادی، محمد ہادی ۵۵۷
ہاشم، محمد ہاشم ۶۹م
ہاشمی، سید میراں ۱۸۹،
ہجر، غلام امام خاں ۴۲م
ہدایت، اشتی غلام حسین م۲۹
ہدایت، میر ہدایت علی م۴م
ہدہد، ۴۲م
ہرچند رائے ہرچند ۵۸۶ ص
ہلال، ۴۰۰
ہلال، شمیم حسین ۴۰۲
ہمت، م۳۳

نسیم امروہوی ۴۰۰ ی
ہمت، م۳۳
ہمت محمد فاضل ۵۸۶ ص
ہمدم، رائے گلاب چند ۳۹۹
ہمدم، گوری پرشاد ۵۵۸
ہمدم، مصطفیٰ حسین ۵۹۵ ب
ہنر، سعید خاں ۴۰۲
ہنر، لائق علی ۴۰۱
ہنر، محمد داؤد ۳۳۳
ہنرور، منشی ۵۸۶ ب
ہوس، محمد تقی م۳۷
ہوش، عبداللہ بیگ ۵۷۹
ہوش نیاز احمد ۳م۴م
یاس محمد عاشق [۵۸۶ ب / ۵۸۶ ط]
یاور، محمد یاور ۵۹۶
یکتا حیدر حسن ۵۸۶ د
یکدل، مولوی احمد بخش ۵۸۶ ج
یک رنگ، ۳۳۳
یوسف، محمد یوسف ۵۹۵ ی
یوسف محمد یوسف رامپوری ۵۹۱
یوسف، محمد یوسف علوی ۵۸۵
یوسف، یوسف بن یوسف ۱۶۳
یحییٰ اعظمی ۴۰۰ ب

1149 قصیدہ نگار
اردو

مدح کا تناظر

[چند تمہیدی مباحث]

قدیم ادوار میں مدح

مدح کے چند محرکات

قصیدہ اور تہذیب

: مطلب پرستی، مبالغہ آرائی اور قصیدہ

قدیم ادوار میں مدح

[اجمالی جائزہ]

معلوم انسانی تاریخ پر نظر ڈالنے سے علم ہو سکتا ہے کہ مدح کا جذبہ دیگر کئی اور جذبات کی مانند اوائلی اور قدیمی ادوار ہی سے انسانوں میں موجود تھا۔ پیشہ ورانہ مجبوریوں یا کسی اور نوع کے مصنوعی دباؤ کے تحت کی جانے والی مدح کے علاوہ دیگر انواع کی مذہبی، نیم مذہبی اور غیر مذہبی مدحیں انسان کے بے اختیار جذبوں کی تابع ہیں۔ ان میں سینۂ شمشیر سے دمِ شمشیر کے باہر ہونے کے کرشمے ملاحظہ ہو سکتے ہیں۔ کسی کی موت پر ایسی بے اختیارانہ چیخ کہ جس میں اس کی خوبیوں اور صفات کا مذکور ہو مرثیہ ٹھہرتی ہے اور کسی برتر ہستی کے لئے تشکر و استحسان اور اظہارِ عقیدت کے جذبات یا کسی زندہ انسان کی خوبیوں، صفتوں اور کارناموں وغیرہ کا بیان قصیدہ کی ذیل میں آتا ہے۔ قصیدہ کی حقیقی فنی اور صنفی ماہیت پر غور و فکر سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مدح کے مابعد الطبیعاتی، اساطیری، سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی محارک کا اجمالی جائزہ لیں۔ یہ جائزہ ہمیں اس صنف کی تخصیصی انواع کی شناخت کروانے میں ممد و معاون ہوگا

ازمنۂ قدیم میں انسان کے سامنے ایک پریشان کن اور لاینحل مسئلہ اس دنیا میں اس کی موجودگی تھا۔ بسیط و عریض کائنات کے انواع و اقسام کے مظاہر اسے اس کے نہتا تنہا اور غیر محفوظ ہونے کے شدید احساس میں مبتلا کر رہے تھے۔ انسان جاننا چاہتا تھا وہ کون ہے؟ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی تخلیق کا منشا کیا ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ دنیا میں اسے بے یار و مددگار اور تنہا کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ زمانہ کیا چیز ہے؟ مقام کیا ہے؟ اور موت کیوں ہے؟ انہی لاچاریوں نے اس "خود بیں اور خود آرا" مخلوق کو مابعد الطبیعاتی ہستیوں اور تصورات کا قائل کیا۔ انہی سوالات کے جوابوں کی تلاش اسے دیوتاؤں کے تصورات کا خالق بنا گئی

عراق، مصر، یونان، روم، ہندوستان اور ایران کے قدیم اساطیری ادوار میں انسان اور کائنات کے تعلق اور رشتے پر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم انسان بے یار و مددگار تھا۔ کائنات کی وسعتیں اسے کم مایہ اور بے حیثیت بنا رہی تھیں۔ اس کی ناتجربہ کاری کا زمانہ تھا۔ وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا۔ خوف اور دہشت کی اذیت ناک کیفیتوں سے دوچار

انسان تحفظ کی تلاش میں تھا۔ موت، بیماری اور تنہائی کے شدید کوائف نے اس کی کم مائیگی میں اضافہ کیا
فرد نے اجتماع کی ضرورت محسوس کی۔ انسان مل جل کر رہنے لگے۔ گروہ بنے، گروہ ترقی کرتے کرتے قبائل میں
منتقل ہوئے۔ گروہوں اور قبیلوں کی مخصوص سیاسی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی وحدتیں وجود میں آئیں۔
"ٹوٹم اور ٹیبو" کی گرفت مضبوط ہوئی یعنی گروہی رسوم و رواج کے نفاذ کے لئے دیوتاؤں اور پجاریوں کے اداروں
کو فوقیت حاصل ہوئی۔ بعض افعال اس خیال سے ممنوع قرار پائے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کے لئے پسندیدہ نہ تھے
دیوی دیوتاؤں یا فطرت کی ارفع قوتوں کی پرستش کو رواج ملا(۱)۔ شجاعت اور بہادری کے جوہر سے
متصف انسانوں کی قدر و منزلت میں اس لئے اضافہ ہوا کہ وہ گروہوں یا قبیلوں کو جانوروں اور انسانوں
کی بربریتوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ قبائلی سرداروں، امیروں، طاقتوروں
اور جنگجو انسانوں کو بھی پوجا جانے لگا۔ شاعروں نے ان سب کی مدح اور توصیف کے نغمے گائے۔ بعض قبائل
میں قبائلی سردار یا امیر زمین پر ماورائی ہستیوں کا قائمقام بنا۔ دیوتاؤں یا ارفع ہستیوں کو انسانوں
کی زندگی اور موت کا کنٹرولر کہا گیا۔ وہ ان کی تقدیروں کے خالق ٹھہرے۔ زمان و مکاں اور زندگی کی تخلیق بھی
انہی سے وابستہ ہوئی۔ قبائلی سماجوں میں یہ تصورات عام ہوئے کہ دیوتاؤں نے قبائلی سرداروں اور جنگجو
انسانوں کو انسانوں کی امداد کے لئے پیدا کیا ہے۔ پجاریوں کو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان رابطے کا
ذریعہ بنایا ہے۔ قبائلی سردار اور دوسرے حکمران بھی دیوتاؤں ہی کا سایہ ہیں۔ اس دور میں علم نے جس
سطح تک ترقی کی تھی اس کے مطابق وجود و عدم کی گتھیاں سلجھائی گئیں۔ سورج، چاند، ستارے، درخت،
بادل، آگ، پانی اور دیگر کئی نوع کے قدرتی مظاہر کو دیوی دیوتاؤں کے روپ میں دیکھا گیا یوں توحید
کی بجائے کثرت پسندی کے نقطۂ نظر کو فروغ ملا۔ انسان ابتدا ہی سے خوگرِ پیکر محسوس ہے دیوتا یا ماورائی
ہستیاں محسوس ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے مجرد ہی تھیں۔ کثرت الاصنام کے نقطۂ نظر کے پیچھے یہی منطق کارفرما
نظر آتی ہے۔ قدیم انسانوں کو جو چیز ارفع، ماورا، خطرناک، خالق مسائل لگی اسے ہی انہوں نے دیوتا
مان لیا۔ یوں ارضی اور غیر ارضی حکمرانوں کی مدح و ثنا انسان کی شخصی اور اجتماعی تسکین کا باعث بنی
جانوروں، درختوں، مختلف النوع حشرات الارض اور اعضائے جسمانی کی پرستش کی تفصیلات انتھروپولوجی
کے صفحات کی زینت ہیں(۲)۔ قدیم ادب میں مذہبی گیت، بھجن، پجاریوں یا حکمرانوں کی شان میں نظمیں
مذکورہ مابعد الطبیعاتی اور اساطیری حوالوں ہی سے لکھی گئی ہیں۔

عراق، مصر، یونان، روم اور ہندوستان میں اصنام پرستی کے رجحانات کے حوالے سے
لکھی گئی شاعری کے پس منظر میں مذکورہ مابعد الطبیعاتی، صفر و مناقی اور تخیلاتی تجربات کی جھلکیاں

---

(۱) ٹوٹم پرستی معاشرتی تنظیم اور جدِ امجد سے مذہبی تقدس و احترام کے مزاج کا نام ہے اسکا اصل ماخذ سر پرست روح ہے
(۲) شاخِ زریں دو جلدیں از جیمس جارج فریزر ترجمہ سید ذاکر اعجاز مجلس ترقی ادب لاہور

نظر آتی ہیں ۔ عراقی تہذیب کہ جسے سومیری تہذیب بھی کہا جاتا ہے دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے ۔ عراق ہی میں دنیا کا قدیم ترین رزمیہ یا قدیم ترین داستان "جلجامش" تخلیق ہوئی ہے ۔ اس داستان میں نہ صرف دیوی دیوتاؤں کی توصیف وتحسین پر مشتمل شاعری کا ذخیرہ موجود ہے بلکہ قبائلی سردار یا بادشاہ کی مدح میں لکھی گئی نظموں قابلِ ذکر اثاثہ بھی محفوظ ہے۔(۱) ہندوستان میں رگ وید، اتھروید، سام وید، یجروید کی صورتوں میں قدیم مذہبی ادب کا سراغ ملتا ہے ان میں بھی دیوی دیوتاؤں کی تعریف وتوصیف میں ان گنت بھجن اور نظمیں نظر آتی ہیں(۲) ابنِ حنیف کا کہنا ہے

"دنیا بھر کی عالمی تاریخ میں سومیریوں نے سب سے پہلے کس قدر
متنوع موضوعات اور اصناف پر مشتمل ادب تحریر کیا اور جو مل بھی چکا ہے
اس کا کچھ اندازہ ذیل کی ادبی اصناف اور موضوعات سے بآسانی ہو جائے گا
ان موضوعات اور اصنافِ ادب کی دنیا بھر میں سب سے پہلی تحریری مثالیں
سومیریوں کے ہاں ہی ملتی ہیں" (۳)

ابن حنیف نے اساطیر، حمد اور دعا، قصائد، حکیمانہ ادب (اقوال، پند ونصائح اور تمثیل وغیرہ) مراثی، نوحے، شہر آشوب، رزمیہ اور ادوارِ شجاعت، رومانی اور جنسی شاعری وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ سومیری افکار و موضوعات کے حوالے سے یہ بھی مرقوم کیا ہے کہ عراقیوں کے ہاں "مساوات، انصاف، آزادی اور سیاسیات کے شعور کے علاوہ علم کائنات، تخلیق کائنات، وسعتِ کائنات، فردوس، جزا و سزا، حیات بعد الممات، عالم ظلمات وغیرہ کے موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں ۔ سومیری شاعری میں دیوی دیوتاؤں کی حمدوں کے علاوہ دیوتاؤں اور بادشاہوں کی مشترکہ حمدیں بھی موجود ہیں جو قدیم عہد کے اس تصور کو تقویت دیتی ہیں کہ زمین پر بادشاہ دیوتاؤں کا قائم مقام ہوتا ہے دیوتا اَن لِل(۴)، نن اتار، اننا(۵)، اُتو(۶)، نن سنی(۷)، ہیندرسگ(۸)، نن اِستنا(۹)، نن کاسی(۱۰)، ندابا(۱۱)، نن گل(۱۲) وغیرہ کے ساتھ ساتھ جن

"ممدوح بادشاہوں کا ذکر ملتا ہے ان میں شہری ریاست اُر کے
تیسرے شاہی خاندان ۲۱۱۲ - ۲۰۰۴ ق م کے تمام بادشاہ یعنی اُرنمو ۲۱۱۲ - ۲۰۹۴ ق م

---

(۱) See Sumerian Epics and Myths: Edward Chiera Chicago 1964
(۲) The Hymns of the Rigveda 2 volumes: R Griffith: Varanasi (Bharat) 1971.
(۳) دنیا کا قدیم ترین ادب از ابن حنیف ص ۱۲۸ کاروانِ ادب ملتان (۴) ہوا کا دیوتا (۵) جنگ کا دیوتا
[illegible] (۸) اخلاقیات کا [illegible] اخلاقیات کی دیوی کا وزیر (۱۰) فنِ طب اور شفا کی دیوی (۱۱) مسکرات کی دیوی
(۱۲) عقل و دانش اور حساب کتاب کی دیوی (۱۳) انصاف کی دیوی

شولگی (۲۰۹۴/۲۰۴۷ ق م)، امار سوئین (۲۰۴۶/۲۰۳۸ ق م)، شوسن (۲۰۳۷/۲۰۲۹ ق م) اور ابی سن (۲۰۲۸/۲۰۰۴ ق م)،
اور شہری ریاست اِسن کے پہلے شاہی خاندان (۲۰۱۷/۱۷۹۴ ق م) کے ابتدائی فرمانروا
مثلاً اِشبی اِرا (۲۰۱۷/۱۹۸۵ ق م)، شو الی شو (۱۹۸۴/۱۹۷۵ ق م)، اِدن داگن (۱۹۷۴/۱۹۵۴ ق م)
اشمی داگن (۱۹۵۳/۱۹۳۵ ق م) اور لپت اِشتر (۱۹۳۴/۱۹۲۴ ق م) وغیرہ شامل ہیں
ایک حمد میں باو دیوی سے لاگاش کے شہری ریاست کے حکمران ای اناتم
(۲۴۵۰ ق م) کی حامی اور رفیق کی حیثیت سے خطاب کیا گیا ہے" (۱)

قدیم عراق میں مندروں کی حمدوں کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کی حمدیں بھی ملتی ہیں۔ شولگی بادشاہ کی حمد میں شولگی واحد متکلم کی حیثیت سے اپنی صفات کا اظہار کرتا ہے۔ اس حمد میں وہ سورما، طاقتور انسان کے روپ میں بھی جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خوفناک آنکھوں والا شیر کہتا ہے۔ چاروں کھونٹ کی فرمانروائی کا دعویدار بھی ہے اور انسانوں کے ریوڑ کا چرواہا بھی۔ اس میں اس کی عقل و دانش، ازحد نیکی، اعلیٰ اخلاق، رجحان، عوام کی محافظت، فیاضی اور بہادری کی صفات کے بیان کے ساتھ ساتھ اس تاج، عصائے شاہی، درخشاں شہ نشین، سر بفلک تخت کی بھی تعریف دکھائی دیتی ہے (۲)

"میں تمام ملکوں پر جھکا، لوگوں کو تحفظ دیا
کائنات کے چاروں کھونٹ لوگ ہم آہنگ ہو کر مرا نام لیتے ہیں
مقدس نغمے بکھیرتے ہیں
یہ کہہ کر مری سربلندی کا اعلان کرتے ہیں
(کہ) وہ جسے فرمانروائی کا اقتدار اعلیٰ سونپا گیا
اس کش نو گل سے معین (دیوتا) نے
بہادری، طاقت اور اچھی زندگی بخشی
نونم تر (آن لل دیوتا) نے زبردست قوت سے سرفراز کیا
شولگی تمام غیر ملکوں کو تباہ کرنے والا، جو تمام لوگوں کو تحفظ
دیتا ہے، کائنات کے "می" کے مطابق آن کے باا حتمام بیٹے
(چاند دیوتا) شولگی کی پرورش کی، اے ندابا تیری حمد ہو" (۳)

قدیم عراق ہو یا مصر، یونان ہو یا روم، ہندوستان ہو یا ایران دیوی دیوتاؤں،
[illegible] ادوار یا بادشاہوں [illegible] کے در یہ اشعار دستیاب ہوتے ہیں۔ بھجنوں اور

---

(۱) دنیا کا قدیم ترین ادب ص ۱۵۷/۱۵۸ (۲) [illegible] "آن دیوتا نے میرے سر پر مقدس تاج رکھا — مجھے لاجوردی ای کر میں درخشاں شہ نشیں پر اس نے مستحکم سربفلک تخت بنایا ایضاً ص ۲۲۹ (۳) ایضاً ص ۲۲۹/۲۳۵

مذہبی گیتوں کی شاعری دیوتاؤں کی حمد و ثنا سے معمور ہے بھجن اور گیت چونکہ گائے جاتے ہیں اس لئے وہ موسیقیت سے مملو الفاظ میں لکھے جاتے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کے اس دور کے بعد پیغمبروں اور اماموں نے انسانی شعور میں ابھرنے والے سوالات کے نئے انداز کے جواب مہیا کیے۔ دیوی دیوتاؤں کے زیر اثر ادوار میں شاعروں نے دیوتاؤں، بادشاہوں، جنگی سرداروں کے علاوہ پہلوانوں، پجاریوں، رشی منیوں، مخصوص اخلاقی نظاموں، دوستوں، محبوبوں، معشوقوں، ماؤں، باپوں، بہنوں، بھائیوں، جانوروں، موسموں، سمندروں، ستاروں، سورج، چاند، فلسفیوں، دانشوروں وغیرہ کی تعریف و تحسین کی طرف بھی توجہ کی قدیم شاعری میں تو مذکورہ ممدوحین کی تعریف و تحسین کے علاوہ ملتے ہی ہیں مذہبی رقصوں، مجسموں تصویروں اور قدیم عمارتوں کے کتبوں وغیرہ پر بھی حمد و ثنا کے قابل ممدوحین کے اوصاف کا عکس و اندراج میسر ہے۔

اس دور میں قبائلی اور قومی تفاخر کی شاعری کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہ شاعری شجاعت، عصبیت اور ذاتی فخر وغیرہ کے رویوں کی عکاس ہے اس میں جنگ و جدال کے قصص بھی رقم ہوئے ہیں اور قدیم جنگی شان و شوکت کی تفاصیل بھی نظر آتی ہیں۔ اساطیری دور کی تفصیلات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے والے شاعروں نے قدیم دیومالائی کرداروں کے کارناموں اور آپس کی چپقلشوں کے موثر نقشے کھینچے ہیں۔ ہندوستان میں برہما، وشنو، سوریہ، اگنی، اوشا، وایو، اندر، سوم، لکشمی، گوتیر، ورن، رودر اور گنیش وغیرہ دیوی دیوتاؤں کی مدح میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ① یونان میں زیوس، پرومیتھیس [آگ کا دیوتا] ہرمیس [عطارد] افرودیتی [وینس] اپالو [سورج] لیوتا [زیوس کی محبوبہ] ارتمیس یا ڈائینا [شکار کی دیوی] ولکن [آتش نشاں یا آگ کا دیوتا] ایروز [عشق و محبت کا دیوتا] دمیتیر [فصل اور غلہ کی دیوی] وغیرہ اور روم میں مرکری، اپالو اور کیوپڈ وغیرہ دیوی دیوتاؤں کی مدح میں بڑی عمدہ نظمیں لکھی گئی ہیں ②

قدیم شعرا جب کسی دیوی دیوتا یا دنیاوی ہستی کی توصیف و تحسین کرتے تھے تو انہیں جہاں ذاتی تسکین حاصل ہوتی تھی وہاں انہیں حکمرانوں یا دیوتاؤں کی جانب سے مادی یا روحانی انعام و اکرام کی امید بھی پیدا ہوتی تھی۔ وہ ان کی قوت، طاقت اور کارناموں کا اظہار کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ بے جا مبالغہ یا بے محل خوشامد سے بھی انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ عراقی

---

① A Epics, Myths and Legends of India: P Thomas Bombay 1961.
B: A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion, Geography History and Literature: John Dowson London 1961.
② A New Classical Dictionary of Greek and Roman: William Smith New York 1881.

یونانی، لاطینی اور ہندوستانی قدیم ڈرامائی شاعری کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں بے یار و مددگار، غیر محفوظ اور حقیقت کا متلاشی انسان یا انسانی گروہ اپنے داخلی استحکام کے لئے خارجی قوتوں کے استحکام پر انحصار کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوی دیوتاؤں یا حکمرانوں کی مدح شاعروں، مصوروں، سنگ تراشوں، فلسفیوں اور دانشوروں کی فطرت ثانیہ ٹھہری تھی۔

یونان میں ہومر اور اس سے ماقبل کے دور میں جنگی اور سماجی ہیرو کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ شجاعت، بہادری اور طاقت کے اوصاف کو بنیادی اقدار کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی ماضی کی کہانیوں اور اساطیری ہستیوں میں سے ایسے ہیروز تلاش کیے جانے لگے تھے جو بہادری، شجاعت اور طاقت میں یکتا و منفرد ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں قدیم یونانی شعرا نے ابتدائے آفرینش چاند، سورج، طوفان، مد و جزر، محبت، جرائم اور عظیم انسانوں کے ارادوں اور مصائب کے بارے میں موثر اطلاعات بہم پہنچائیں۔ مصوروں اور مجسمہ سازوں نے بھی شاعروں ہی کے مانند دیوتاؤں، شجاعت کے وصف سے متصف ہیروز کو تصویروں اور مجسموں میں محفوظ کیا قدیم یونانی شاعروں نے بادشاہوں کے عمومی خصائص، ان کے اطاعت گزار شہریوں کی خوب صورتیوں، اور اپنے آباواجداد کے مقابر کی تعریف و تحسین کے حوالے سے بھی یادگار شاعری کی ہے۔ ان کی اس نوع کی توصیفی شاعری سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ شعرا حکمرانوں کی مافوق الانسانی قوتوں اور پراسرار طاقتوں کو جاننے اور شاعرانہ لفاظی کی گرفت میں لینے کے لئے کوشاں تھے۔ ان شاعروں نے اپنے ہیروز کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی توجہ کی ہے جنہیں عام طور پر مادحین نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ وہ ان ہیروز کی عظمت اور شکوہ کو بیان کرنے کے علاوہ ان کی زندگیوں میں موجود محرومیوں، تأسفوں اور بربریتوں کو بھی پیش کر دیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں ثبوت کے طور پر ہومر کی اوڈیسی اور ایلیڈ کے بنیادی کرداروں پر گزرنے والے مصائب بھی سامنے رہنے چاہییں اور ان کرداروں کے وہ رویے بھی جن کی بدولت وہ ہیروز ہوتے ہوئے بھی عمومی انسانوں کی صفوں ہی میں شامل رہتے تھے۔ ہومر اور دیگر شعرا نے اپنے ہیروز کے حوالے سے جہاں توصیفی اور تحسینی شاعری کی ہے وہاں ان کی جنگجوئی، بے وفائی، جرائم زدگی، گناہ آلودگی، حسد اطواری اور نفرت آمیزی کو پیش کر کے اس دور کے یونان کی زندگی کو بھی مجسم کیا ہے۔ ہومر کے پاس ہیرو کے کرداری اعمال کا نیا منظر نامہ تھا۔ اس نے انسان کے خارجی اور پیشہ ورانہ اعمال کے پس پردہ متحرک انسانی جذبات کو بھی پرکھا ہے۔ ہومر کے ہیرو کا اندرونی شکوہ کانسی کے بنے ہوئے جیومیٹرک اسلوب کے قدیم مجسموں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہومر نے مذہبی گیت بھی لکھے ہیں

[ساتویں صدی ق م]

اس نے ان میں دیوتاؤں کی شان و شوکت، عظمت اور برتری کا اعتراف کیا ہے۔ اپالو کی مدح میں اس کا طویل گیت اسی زمرے میں شامل ہے۔ ہومر نے زمین کی مدح میں بھی اشعار لکھے ہیں اور اسے سب کی ماں کہا ہے۔ سیلینی، اتھینہ، کاسٹر اور پولکس وغیرہ کی حمدیں یا مدحیں بھی اس کے کلام میں شامل ہیں(۱)۔
سیفو ۶۱۰ ق م یونان کی عظیم شاعرہ تھی اس نے افرودیتی اور انیکٹوریا وغیرہ کی شان میں اوڈ (نظمیں) لکھی ہیں۔ سیفو کے محبت کے گیتوں میں عشقیہ مدح کے جو ٹکڑے اب دستیاب ہیں افرودیتی کی تعریف کرتے اس نے اسے غیر فانی اور پھولوں کے تاج سے مزین کیا ہے(۲)۔ حکمران پولی کریٹس کی مدح میں انیکریون کی نظموں کے حوالے بھی ملتے ہیں پولی کریٹس انیکریون کا مربی اور سرپرست تھا(۳) انیکریون چھٹی صدی ق م کا شاعر تھا۔ یوروپیڈیز ۴۸۵ - ۴۰۶ ق م کی کتب میں سائیکلوپس اور ہپولیٹس وغیرہ کے کورس ملتے ہیں(۴) ارسٹوفینز ۴۴۴ - ۳۸۰ ق م نے پرندوں کا کورس رقم کیا ہے(۵)۔ تیسری صدی ق م کے ایک اور یونانی شاعر تھیوکریٹس نے مچھیروں اور چرواہوں کی تعریف میں بعض عمدہ نظمیں لکھی ہیں(۶)۔ میراجی نے اس دور کی یونانی شاعری کی بعض اصناف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے

"وہ شروع سے یونانی شعرا کے زیرِ مشق دو اصنافِ سخن رہیں ایک رزمیہ نظم اور دوسرے اوڈ (ایک طرح کا قصیدہ جس میں تغزل بھی ہو) رزمیہ نظم بیانیہ شاعری کی ذیل میں آتی ہے اس لئے اس میں کسی طرح کا شخصی یا ذاتی عنصر نہیں ہوتا تھا۔ یونان کے رزمیہ شاعر ہومر کا رزمیہ کلام اس صنف کا واضح ترین نمونہ ہے۔ دوسری صنف یعنی اوڈ (قصیدہ) اپنی فنی خصوصیات کی بنا پر آئندہ چل کر مختلف قسم کی نظموں کی تخلیق کا باعث بنی۔ اوڈ (قصیدہ) سماجی اور مذہبی موقعوں پر رقص اور ساز کے ساتھ گائے جانے کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اس لئے ان قصیدوں میں یونانی شعرا ان جذبات کا اظہار کرتے تھے جو وہ ایک دوسرے کے متعلق رکھتے تھے یا ان خیالات کو نظم میں لاتے تھے جو دیوتاؤں کے متعلق ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتے تھے"(۷)

اس دور کے یونانی شعرا کے کلام میں جنگی آلات کی تفصیل بھی ملتی ہے(۸)۔ انہوں نے تیروں، ڈھالوں، تلواروں

---

(1) A Book of World Poetry (omnibus of) Page 219 To 222
(2) Ibid P 224 (3) ibid Page 230 and A Classical Dictionary of Greek and Roman P 56
(4) Alcestis and other Plays Translation Philip Vellacott Penguine classics. Page 60–61 (5) A Book of World Poetry P. 249 (6) ibid P 257 - 260

(۷) مشرق و مغرب کے نغمے از میراجی ص ۳۲۵ اکادمی پنجاب لاہور
(8) Myth and Legend in Early Greek Art By Karl Schefold Thames and Hudson London 1966

کی متاثر کن نقشہ کشی کی ہے۔ گھوڑوں اور ان کے متعلقات کے حوالے سے عمدہ شاعرانہ مرقعے بھی کھینچے ہیں۔ یہی نہیں یونانی ظروف سازوں، مجسمہ طرازوں اور مصوروں نے بھی اپنے دیوتاؤں اور جنگی ہیروؤں کو ان کی عظمتوں اور رفعتوں کی تفصیلات سمیت منقش کیا ہے۔

یونانی شاعری میں المیہ اور طربیہ ڈرامے کثرت سے ملتے ہیں ان ڈراموں میں ہیروز اور دیوتاؤں کی جی کھول کر تعریفیں کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں یونانی مراثی یا نوحوں (Alegeia) میں بھی مدحیہ حصے موجود ہیں۔ ابتدائی یونانی نوحوں میں زندہ افراد کی مدح بھی کی جاتی تھی۔ ان میں جنگ اور محبت کے متعلقات کے عمدہ نقشے بھی دستیاب ہیں۔ قدیم یونانی نوحہ نویس افیسس کا کیلنس ہے اس کی شاعری ٹکڑوں میں دستیاب ہے۔ سپارٹا سے متعلق نوحہ نویس ٹرٹیئس جنگ اور حب الوطنی کے نوحوں کے لئے مشہور ہے۔ میگرا کے اوگنیس نے جنگی بربریت کی داستانیں بھی منظوم کی ہیں۔ (X) جب ہم یونانی شعرا کے نوحوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ ان میں محبت، شکوہ اور عظمت سے پُر قصیدہ نما داستانیں بیان ہوئی ہیں۔ ہیروز کی متنوع صفات کو عمدگی سے قلمبند کیا گیا ہے۔

قدیم لاطینی شعرا میں سے ٹیٹس لوکریٹس کاروس [۹۵-۵۲ ق م] کے ہاں وینس دیوی کی شان میں خطابیہ نظمیں موجود ہیں۔ اس نے وینس کو حسن و جمال اور وقار کی ملکہ کے ناموں سے پکارا ہے اور کہا ہے "وہ انسانوں اور دیوتاؤں کے لئے مسرت آگیں ہے" (1) سیوس والیریس کیٹولس [۸۴-۵۴ ق م] کے ہاں لزبیا، سیلیا اور سیفو کی تعریف میں متعدد نظمیں موجود ہیں (2) اس نے ڈائینا کی حمد بھی لکھی ہے۔ پبلیوس ورجیلیس مارو [ورجل] [۷۰-۱۹ ق م] کے ہاں بھی چرواہوں کی توصیف توریف میں گیت نظر آتے ہیں (3) ورجل کی طویل نظم اینیڈ (Aeneid) میں جہاں روم کی تاریخ اور اس کے ہیروز کے کارہائے نمایاں رقم ہوئے ہیں وہاں مقامی باشندوں کے عمومی رویوں اور رجحانات کی تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جونو [روم کی بنیادی دیوی] ای لیوس [ہواؤں کا دیوتا]، نیپچون، وینس، جوپیٹر اور دیگر جیسے دیوی دیوتاؤں کی مدح میں بے شمار اشعار کہے گئے ہیں (4) کوئنٹس ہوریتیس فلکوس [۶۵-۸ ق م] نے اس جہاز کے حوالے سے بھی ایک خطابیہ نظم لکھی ہے جس میں ورجل ایتھنز پہنچا تھا (5) ہوریتیس نے وینس دیوی کے علاوہ اور بہت سے دیوی دیوتاؤں کی تعریف میں نظمیں لکھی ہیں (6) تیسری صدی کے لاطینی شاعر اینو نیمس نے وینس کی تعریف میں ایک طویل نظم قلمبند کی ہے (7)

---

(1) A Book of World Poetry P 307 Poem (2) ibid P 312, 313, 314 (3) ibid P 321

(4) The Aeneid Translated By T. H. Delabere-May A Bantam Classic. New York.

(5) A Book of World Poetry P 334 (6) ibid P 335 To 351 (7) ibid P 392

(X) Dictionary of World Literary Terms By Shipley. See under their names.
Poets Names in English Callinus of Ephesus —— Tyrtaeus
Eognis of Megra

قدیم مصر میں ۲۵۰۰ ق م دی بک آف دی ڈیڈ نامی کتاب مرتب ہوئی تھی ① اس میں مختلف النوع نظمیں موجود ہیں۔ ان نظموں میں قدیم عہد کی مصری تہذیب کی وافر جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مصریوں کا مذہب ان کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر اور حیات بعد الممات کے حوالے سے ان کے پر امید رویے بھی ان نظموں کے مصرعوں کی زینت بنے ہیں۔ ان میں ابدیت کے دیوتا کی حمد (Hymn) میں لکھی گئی نظم بھی محفوظ ہے اور سورج دیوتا کی ثنا پر مبنی نظم بھی۔ دیوتا را کی ثنا میں اشعار بھی اس کتاب کا حصہ ہیں ②

عبرانی زبان کے حوالے سے ہم قدیم عہد نامے کی حمدیہ شاعری تک پہنچتے ہیں۔ قدیم عہد نامے میں خدا کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی نظموں کے علاوہ اظہار تشکر کے لئے کہے گئے اشعار کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ یہی نہیں اس میں دعائیہ اور حمدیہ نظموں (Psalms) کی ایک علیحدہ کتاب بھی نظر آتی ہے۔ سلمان ابن جبرول نے کہ جس کا زمانہ ۱۰۲۱ تا ۱۰۵۸ء کا ہے عبرانی زبان میں بادشاہ کی تعریف میں متعدد نظمیں لکھی ہیں ③

پنچ تنترا نامی کتاب کہ جو سنسکرت میں دوسری صدی ق م مرتب ہوئی تھی، کے مشمولات میں بادشاہوں کے مزاجوں کی تصویر کشی کرنے والی عمدہ نظمیں دستیاب ہیں۔ اس کتاب کی ایک نظم میں بادشاہ کو سانپ جیسا موذی اور پہاڑوں جیسا طاقتور بھی دکھایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں تلوار ہے وہ بھی عورتوں، دریاؤں اور بادشاہوں کی مانند ناقابل اعتبار ہے ④۔ پہلی صدی کے شاعر امارو اور پانچویں صدی کے شاعر کالیداس نے سنسکرت میں موسموں، بارشوں اور منظروں کی تعریف و توصیف میں عمدہ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ بھرتری ہری کہ جو کالیداس کا معاصر شاعر تھا اس کے ہاں کائناتی مظاہر کی تعریف میں فکری نظمیں ملتی ہیں۔ پرانے ہندوستان کے ایک ویشنو شاعر ودیا پتی نے کہ جو گجرتھ پور (بہار) کے راجہ شیو اور اس کے باپ کا درباری تھا کرشن اور رادھا کی تعریف میں عمدہ گیت لکھے تھے میراجی نے لکھا ہے کہ ودیا پتی کے بے شمار گیتوں میں راجہ شیو کا ذکر موجود ہے ⑤

قدیم چینی شعرا کی نظموں پر مشتمل کتاب "شائی کنگ" کہ جسے ۵۰۰ ق م کے لگ بھگ کنفیوشش نے مرتب کیا تھا ایک اعتبار سے چینی لوک شاعری کا مجموعہ ہے کیونکہ ان نظموں کے خالق شعرا کے نام دستیاب نہیں ہیں۔ اس مجموعے میں جمال صبح، حسن شب، سرسبز و شاداب درختوں، خوشبوؤں میں بسی عورتوں اور فطرت کے حسین منظروں کی تعریف و توصیف میں اشعار ملتے ہیں ⑥

---

① A Book of World Poetry P 200. ② ibid P 207 ③ ibid P 173 ④ ibid P 37.

⑤ مشرق و مغرب کے نغمے ص ۶۵

⑥ A Book of World Poetry P 1

اس مجموعے کو "Book of odes"[1] بھی کہا گیا ہے ۔ اس مجموعے کی نظمیں قدیم چینی تہذیب کے اثرات سے مملو ہیں ۔ چھٹی صدی عیسوی کے ایک چینی بادشاہ چین ونتی نے لویانگ نامی شہر کی تعریف میں عمدہ نظم تحریر کی ہے ۔ لی تائیو ۷۰۱ – ۷۶۲ء نامی شاعر نے پہاڑوں کی توصیف اور توفو ۷۱۲ – ۷۷۰ء نامی شاعر نے بادشاہ کی تعریف میں چند نظمیں لکھی ہیں

قدیم جاپانی شاعری کی ایک کتاب "مانیوشو"[2] ہے یہ آٹھویں صدی میں مرتب ہوئی تھی ۔ اسمیں زندگی کے مناظر کی تعریف میں مختصر نظموں کے علاوہ ایک نظم جنت کے دریا کی مدح میں بھی ہے ۔ جاپانی شاعری کی مقبول ترین صنف ہائیکو میں زندگی اور اس کے متعلقات کے حسن و جمال اور نزاکتوں کو انتہائی باریک بینی اور عجوبہ انداز سے زیرِ بحث لایا جاتا ہے

---

(1) See A Book of World Poetry under the the title Chinese Poetry
(2) Ibid Japanese Poetry.

مدح کے چند محرکات

قدیم انسان تنہا اور کمزور تھا۔ کائنات اور اس کی پر ہیبت اور جلالی اشیا کے بارے میں اس کی کم علمی نے اسے خوف میں مبتلا کر رکھا تھا۔ لاتعداد انواع کی ذہنی اور فکری الجھنیں اس کا مقدر تھیں۔ فطرت کی غیر مسخر قوتوں نے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ اسے خوراک کی حصولی اور محفوظ مساکن کی تلاش میں دشوار ترین ماحول پر قابو حاصل کرنا اور صبر آزما مرحلوں سے گزرنا ہوتا تھا۔ اس کی کامیابیاں اور کامرانیاں اسے متکبر اور نرگسیت پسند بناتی تھیں ناکامیاں اور شکستیں اسے نامرادی، بے چارگی اور عاجزی کے کوائف سے دوچار کرتیں۔ قحط، بیماریاں، زلازل، آتش فشانوں کے بہتے لاوے، سمندری آفتوں کا خشکیوں کو اپنی لپیٹ میں لینا، آسمانی عذابوں کا بستیوں کو گھیرنا، جنگلی درندوں اور بلاؤں کے اچانک حملے اور انسانوں پر انسانی وحشیوں اور بربروں کا لپکنا قدیم انسانوں کو یہ سب کچھ مصائب زدہ کرتا تھا۔ اس عہد کا فرد اس نوع کے ماحول اور کوائف سے نجات کا طالب تھا۔ تاہنوز وہ تسخیر فطرت کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پا رہا تھا۔ وہ ہر مصیبت میں مبتلا کرنے یا مسرت بخشنے والی شے کو یا پھر پراسراریت کی حامل اشیا کو دیوتاؤں کا درجہ دے کر ان کی پرستش کرنے لگتا تھا۔ اس عمل سے اسے نفسیاتی تسکین بھی میسر آتی اور اس کے شعور و لاشعور میں فریب زدہ تحفظ کا احساس بھی بیدار ہوتا تھا۔ مدح و ثنا کا ابتدائی نفسیاتی سبب یہی ہے۔ انسان دیوتاؤں اور مذہبی شخصیتوں کی عظمتوں کو مان کر اپنی نفسیاتی الجھنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور دیگر کمزوریوں کی پردہ پوشی سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔

قدیم ادوار میں مدح یا مدحیہ ادب کو ایک اہم سیاسی ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ مدحیہ نظمیں اور اشعار بادشاہوں کی طاقت، شان و شوکت، عظمت اور برتری کے تعصب سے مزین تھے۔ ان کے وسیلوں سے قبائلی سرداروں، امراء اور مذہبی ہستیوں کے وقار، تکریم، تعظیم، افتخار اور شکوہ کی تشہیر ہوتی تھی۔ حکومتوں کے استحکامی پراپیگنڈہ کے لئے یا رائج سیاسی نظام کی عقلی اور استدلالی توصیف کے لئے مدحیہ نظموں یا قصیدوں کا استعمال خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ جنگی مقاصد، قومی سربلندی، قبائلی انتقام اور ریاستی مذاہب کی ترویج کے لئے مدحیہ نظمیں موثر ہتھیار تھیں یہ اتنی قوت اور تاثیر کی حامل ہوا کرتی تھیں کہ ان سے افراد اور قوم کے حوصلے بڑھانے کا کام لیا جاتا تھا۔ قدیم رزمیہ نظموں میں بادشاہوں اور جنگجو انسانوں کی مدح، توصیف اور تحسین سے غیر شعوری طور پر اس سیاست کی تنظیم و تعمیر ہوتی تھی جس کے وہ حامل و محافظ تھے۔ قدیم ریاستوں میں درباری شعرا کئی قسم کے مقاصد پورے کرتے تھے۔ وہ اپنی نظموں کے وسیلے سے مروجہ نظام حکومت و سیاست کو درباریوں اور شہریوں کے ذہنوں میں فکری طور پر راسخ کرنے کی کوشش

کرتے تھے۔ وہ اس نظام کو ابدی قدروں کا حامل قرار دیتے تھے۔ شاہی قوانین کو خدائی قوانین سے منسوب کر کے بادشاہوں اور حاکموں کی مطلق العنانیوں پر فکری اور جذباتی خول چڑھاتے تھے۔ بادشاہ اور حکمران اس کے عوضانے کے طور پر انہیں بیش قیمت انعامات سے نوازتے تھے یوں شاعروں کے ضمیروں میں موجود آزادیٔ اظہار کی تمنائیں دب جاتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی نئے طالع آزما شاعر بھی درباروں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یوں مروجہ نظامِ حکومت کی چیرہ دستیوں اور حکمرانوں کے مظالم خلاف آوازِ صداقت بلند کرنے کی جرأتیں خاموشیوں کی گہری اندھی قبروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی جب شاعروں سے بادشاہ یا بادشاہ سے شاعر ناراض ہو جاتے تھے تو ہجویہ شاعری کی جانب رجوع کرتے تھے۔

مدحیہ شاعری کی مزید سیاسی افادیت یہ تھی کہ اس میں حکومتوں اور حکمرانوں کا تاریخی، سیاسی اور احوالاتی ریکارڈ بھی محفوظ ہو جاتا تھا۔ کسی عہد کی مخصوص معاشرتی رسوم اور عقائد کا ذخیرہ بھی ان کے وسیلے سے قارئین تک پہنچتا ہے۔ ان میں متعلقہ ادوار کے معاشرتی رویے اور رجحانات عکس فگن نظر آتے ہیں۔ رائج علوم و فنون کی اہم جزئیات کی خبریں ملتی ہیں۔ دنیا کے مختلف سیاسی نظاموں اور رنگارنگ معاشروں میں موجود اخلاقی اور عمومی رویوں کے اثاثے بھی ان مدحیہ نظموں کے اشعار میں منعکس ہوئے ہیں۔ بوقلموں ثقافتی ماحولوں کی بھرپور عکاسی ہمارے ہاتھ آتی ہے۔ متنوع معاشرتی نظاموں کی ایسی جزئیات کا ذخیرہ میسر آتا ہے جسے شاعروں نے جذباتی، تخیلاتی اور مشاہداتی تناظر میں جمع کیا تھا۔ ان نظموں کی اہمیت یہ بھی تھی کہ ان میں بادشاہوں، امیروں اور قبائلی سرداروں کے جو مثالی کردار پیش کیے جاتے تھے بسا اوقات ان سے ممدوحین کے شعور اور رویے میں نمایاں تبدیلیاں آتی تھیں اور جب بخیلوں، ظالموں، غیر منصفوں اور عزور و تکبر کے حامل حکمرانوں کو سخی، رحمدل، عادل اور منکسر المزاج کہا جاتا تھا تو سامعین اور درباریوں کے سیاسی شعور کی تشفی بھی ہوتی تھی اور اس میں اضافہ بھی ہوتا تھا!

جب ہم تاریخ اور سماج کے تناظر میں مدح کی روایات کو پرکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ انسانی کے مختلف ادوار میں نہ صرف مدح کے اغراض و مقاصد جدا جدا تھے بلکہ شعرا کے رویے اور رجحانات بھی مختلف تھے۔ قدیم ادوار کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ اس امر کا غماز ہے کہ انسانی سماج اس عہد میں تین بڑے معاشرتی گروہوں میں منقسم تھا۔ ایک گروہ بادشاہوں اور حکمرانوں کا تھا۔ دوسرا دانشوروں، پجاریوں اور مبلغوں کا تھا اور تیسرا گروہ نچلے طبقوں یا غلاموں کا تھا۔ بادشاہوں اور امراء کو دیوتاؤں کا قائم مقام ٹھہرایا جاتا تھا۔ دانشور، پجاری یا مبلغ نچلے طبقوں اور غلاموں کے درمیان رابطے کا کام بھی سرانجام دیتے تھے اور معاشرتی، سیاسی، گروہی، قبائلی

یا ریاستی راہنما نظریات کے محافظ اور نظریہ ساز بھی ہوا کرتے تھے ۔ نچلے طبقوں کے افراد یا غلام محنت و
مشقت کے عادی تھے ۔ بالائی طبقوں کی خدمت ان کے فرائض میں شامل تھی ۔ علم، فلسفے اور دانش سے
وہ غیر متعلق ہی رہتے تھے ۔ قدیم ادوار تین بڑی اکائیوں میں منقسم تھے (۱) قبائلی (۲) مذہبی (۳) سلاطینی
قبائلی دور میں ٹوٹم اور ٹیبو کی روایات کی کارفرمائی تھی یعنی بزرگ اور سرپرست روح یا دیوتا قبائلی سماج
میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا ۔ مذہبی سماج میں روحانیت کا دور دورہ تھا آسمانی اور برتر ہستیوں کو
مرکزی حیثیت حاصل تھی ۔ سلاطینی سماج میں حکمران علی الاعلان ذاتی قوانین اور مطلق العنانیت
کے جھنڈے تلے عوام کو جمع کرتے تھے اور بسا اوقات مذہبی اور روحانی رسوم و روایات کی پرواہ بھی نہیں کرتے
تھے ۔ قبائلی سماج میں مدح کے اغراض و مقاصد میں سرپرست روح کی حمد و ثنا کو اولین اہمیت حاصل تھی ۔ مذہبی
سماج میں روحانی ہستیوں (خدا، پیغمبر، پادری، پجاری) کی مدح کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی اور
سلاطینی ادوار میں بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مدح سرائی کو فوقیت حاصل تھی ۔ مذکورہ
سماجی اکائیاں بظاہر علحدہ علحدہ ہیں لیکن تاریخ انسانی کے مختلف زمانوں میں یہ یکجا اور متحد بھی ہوئی
ہیں چنانچہ اکثر سماج یا تو قبائلی مذہبی سماج تھے یا سلاطینی مذہبی ۔ سلاطینی سماج میں قبائلی
اور مذہبی روایات کی گردشیں بھی نظر آتی ہیں اور مذہبی سماجوں میں سلاطینی اور قبائلی روایات
کے ستارے چمکتے دکھائی دیتے ہیں ۔ قدیم سماجوں کی یکجاں صورتیں ہوں یا علحدہ علحدہ امرا کا
طبقہ ہی حقیقی حکمران ہوا کرتا تھا ۔ ان کے پاس طاقت بھی ہوتی تھی اور دنیاوی اور مادی اسباب کی کثرت
بھی ۔ انہی اثاثوں کی بدولت انہیں سماج میں بلند مقام حاصل تھا ۔ غلاموں یا نچلے طبقوں کے افراد کو تعریف و
تحسین کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ بسا اوقات غلام اور نچلے طبقے کے افراد بڑے بڑے اور اہم کارنامے
سرانجام دیتے تھے لیکن مدح کے مستحق امرا یا ان کے آقا ہی ہوا کرتے تھے ۔ جدید ادوار میں
جہاں جہاں اقتدار عوام اور وسیع تر طبقوں کے ہاتھوں میں ہے وہاں عوامی کارناموں کی نثری اور
شعری مدحیں عروج پر نظر آتی ہیں ۔ قدیم عہد میں شعرا کی مدحیہ تخلیقات آقاؤں اور
امرا کے نظری و عملی مقاصد کی تفاسیر ہوا کرتی تھیں ۔ شعرا یا تو خود بالائی طبقوں سے متعلق
تھے یا پھر ان طبقوں کے عطا کردہ زر و سیم کی بدولت وہ خود بھی معاشرے میں ایک اہم
مقام حاصل کر لیتے تھے ۔ ہماری تاریخ میں (اردو ادب) قرض کی مے پینے والے جو شاعر
نظر آتے ہیں تو ان کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس دور سے تعلق رکھتے
تھے جب امرا کیا حکمران بھی فرنگیوں کے تابع ہو چکے تھے اور شاہی خزانہ سرکاری وظیفوں
کی روداد کہتا تھا ۔ قدیم درباری شعرا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ جن آقاؤں
کے وہ مدح سرا ہیں انہوں نے لاکھوں انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے ۔ وہ

بار برداری کے جانور بن چکے ہیں اور انسانوں کی بجائے اشیائے استعمال بن کر رہ گئے ہیں [ملاحظہ ہو اہرامِ مصر کی تعمیر میں معروف غلام [نظم نامہ از محمود نظامی] اور ان پر ہونے والے تشدد کا منظر نامہ] ۔ البتہ ہر دور کی طرح قدیم ادوار میں بھی شاعر اور دانشور اپنے ممدوحین کی قربتیں حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لیے حسد و رقابت کا بازار بھی گرم ہوتا تھا ۔ ذاتی چپقلش اور آپس کے معرکے [لٹھ بردار بھی] بھی دیکھنے میں آتے تھے ۔

پروفیسر کرار حسین نے اپنے ایک مضمون میں پرانے قصیدہ گو شعرا کے قصائد کے حق میں تاریخی، عقلی اور سماجی جواز پیش کیا ہے ۔ اس مرحلے پر ان کے نقطۂ نظر کا جائزہ ضروری ہے تاکہ ہم عربی، فارسی اور اردو کے مدحیہ قصائد کے لیے ہمدردانہ تنقیدی معیار تلاش کر سکیں کرار حسین لکھتے ہیں [امیر خسرو کے عہد میں]

" سلطان کی شخصیت سے قطع نظر سلطنت کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف ایک ضروری بلکہ مقدس ادارہ ہے اور سلطان اس کا نمائندہ ہے اس کی شخصی علامت ہے سلطنت نہ صرف بربریت کے خلاف، تہذیب کے چاروں طرف فساد کے خلاف، تکوین کے چاروں طرف ایک حصار ہے بلکہ وہ اس نظامِ عدل کا دنیوی نمونہ ہے جس پر خدا کی کائنات قائم ہے اسی سے شوکت اسلام وابستہ ہے

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

عقیدہ کے لیے علامت اور حقیقت کی دوئی مٹانا کوئی مشکل امر نہیں جتنے قصیدے فارسی اور اردو میں لکھے گئے ہیں تم ان میں ممدوح کے ذاتی کردار کی طرف کوئی اشارہ نہیں پاؤ گے ۔ بلکہ قصیدہ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ قصیدہ ایک سلطان کی جلالی صفت یعنی شجاعت اور اس کی جمالی صفت یعنی سخاوت کے حضور فن و شعر کی طرف سے ایک خراجِ عقیدت ہے یہ کسی سلطان کا تشخص اس کی Identity نہیں ہے بلکہ ہر سلطان کی Identification کے لیے ایک مثال یا تمثیل یا آمیج ہے" ①

کرار حسین نے اس عہد کے دربار کو ثقافتی مرکز قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے

" اس زمانے کا دربار ایک ثقافتی مرکز بھی تھا ۔ بادشاہ اور امراء

---

① امیر خسرو اور ان کا عہد رسالہ نقطہ ص ۵ - ۶ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

شعروفن کی سرپرستی کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور ساری مہذب دنیا میں شعروفن
کی قدروقیمت کے لئے یہی ایک بازار تھا۔ لوک گیت اور کہانیوں کے علاوہ باشعور
ادب کے مرکز دربار اور خانقاہ ہی تھے

درباری شاعر سلطان کے قصیدے لکھتا تھا بالکل جس طرح ملک اور قوم کے
استحکام کے لئے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا آج کل کے ادیب کا فرض ہے
اور کچھ تاریخی واقعات پر نظمیں بھی لکھتا تھا جس طرح حکومتوں کا پبلسٹی
کا محکمہ کام کرتا ہے" ①

مذکورہ حوالے سے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ صنف قصیدہ قدیم عہد کی بادشاہت [نظام بادشاہت] کے لئے ایک موثر ہتھیار تھا۔ شاعر اس صنف میں ایک طرزِ حکومت اور ایک طرزِ زندگی کو سراہتا تھا۔ اچھا شاعر امرا و یا بادشاہ کی کٹھ پتلی نہیں ہوتا تھا۔ وہ شعر کو سخن کا پردہ کرتا تھا اور اسے اپنا فن بناتا تھا وہ بادشاہوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے اور کہتے تھے وہ دنیا میں ایسے کام کریں جن سے ان کی آخرت سنورے۔ وہ بادشاہوں کو موت اور فنا کے تصورات کے حوالے سے باور کروا دیا کرتے تھے کہ انسان دنیا میں خاک کا ذرہ اور پانی کا بلبلہ ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے دنیا میں ظلم سے گریز کرے اور مستحقین تک ان کا حق پہنچائے۔

---

① امیر خسرو اور ان کا عہد رسالہ لفظ ص ۱۵

قصیدہ اور تہذیب

صنفِ قصیدہ کی ماہیت پر علمی بنیادوں کے حوالے سے تو ہمارے تذکرہ نگاروں، محققوں اور نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن محض علمی حوالے سے ہم کسی فنی مسئلے یا معاملے کے تمام تر متعلقات کی نشاندہی نہیں کر پاتے۔ اس تناظر میں اس کی احوالاتی بنیادوں تک رسائی ناگزیر ہے۔ ویسے بھی علم یا سائنس کا تعلق تجرباتی آزمائشوں سے ہوتا ہے جب کہ فن یا فنی حقیقت ہمہ جہت تخیل، پراسرار جذبے اور ترفع یافتہ خیال میں ملفوف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی فنی صنف یا ادبی مسئلے کی تمام ترجہات کو قابو میں لانے کے لئے اس کے معروضی پیمانوں پر آنکھ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے داخلی رجحانات سے معانقہ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ فنی حقیقت کی تفہیم کے لئے اس کے جوہر کی شناخت ناگزیر ہے۔ کوئی فنی حقیقت اپنی بنیادوں کے اعتبار سے اگر تحلیلاتی نہیں بھی ہے تو بھی اس کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اس کے خارجی نظام کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی صورتِ حال پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اصنافِ فن و ادب جہاں مخصوص زمانی و مکانی تقاضوں کی پیداوار ہوتی ہیں وہاں ان کا تعلق مخصوص تہذیبی معیارات سے بھی ہوتا ہے۔ اردو قصیدہ کے جوہر کی شناخت کے لئے ہمیں اس کے داخلی و خارجی فنی معیارات کے ساتھ ساتھ اس سے متعلقہ تہذیبی تقاضوں کو بھی مدِ نظر رکھنا پڑے گا۔

اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں ہے کہ اردو میں یہ صنف فارسی زبان و ادب کے وسیلے سے شامل ہوئی ہے اور فارسی ادب میں یہ عربی اثرات کے حوالے سے داخل ہوئی تھی اور خود عربی میں بھی اس پر قبل اسلام کے ادب کی گہری چھاپ موجود تھی۔ یوں ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ قصیدہ کا تہذیبی مزاج بوقلمونیت کا حامل ہے۔ اس پر قدیم جاہلی عربی تہذیب، جدید اسلامی عربی تہذیب کے اثرات کے ساتھ ساتھ قدیم ایرانی تہذیب اور جدید ایرانی تہذیب کے اثرات بھی موجود ہیں۔ یہی نہیں جب یہ ایرانی ادب کے وسیلے سے ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوا تو اس پر مقامی ہندی تہذیب نے بھی خاصا اثر ڈالا۔ ان امور پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس صنف کی دیگر احوالاتی بنیادوں اور خارجی فنی نظام کو بھی پرکھنا ہے۔

صنفِ قصیدہ کے خارجی نظام کی وضاحت میں ادبی علما نے خاصے ضخیم دفتر سیاہ کیے ہیں لیکن اس کی احوالاتی بنیادوں کی نشاندہی خال خال ہی ہوئی ہے۔ قصیدہ کا شاعر کی ہیئتی اور اس کے سماجی مقام سے کیا ربط ہے؟ اس صنف کے اخلاقی، جمالیاتی اور نفسیاتی اثرات کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ہنگامی مقصد برآری کے لئے لکھا جاتا ہے یا اس کی کوئی مستقل

اہمیت بھی ہے۔ قصیدہ کا زمان و مکاں محدود ہے یا وسیع؟ اس کی خارجی اور داخلی کلیت ترکیبی کلیت ہے یا منتشر کلیت؟ اس کی مابعد الطبیعاتی، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی اہمیت کیا ہے؟ اس تناظر میں اس کے امکانات کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ اس کے جذباتی، فکری اور فنی نظام کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ صنف عقیدہ کی نشو و نما کا ذریعہ ہے یا محض نمائش عقیدہ کا وسیلہ؟ قصیدہ کے کلاسیکی تنقیدی معیارات کس حد تک عصری ہیں اور اس کے عصری تنقیدی معیارات کس حد تک روا؟ ان سوالوں کا جواب ہمارے لئے قصیدہ فہمی کے نئے راستے بھی تلاش کر سکتا ہے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ دورِ جدید میں صنفِ قصیدہ اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ معاصر ادبی منظرنامہ شاہد ہے کہ اکا دکا نعتیہ یا منقبت کے قصائد کے علاوہ اس صنف کی زنبیل میں اور کچھ نہیں ہے۔ بادشاہ، وزیر، ریاستی نواب یا امراء کے زوال کے ساتھ قصیدے کے زوال کو بھی نتھی کیا جاتا ہے اور یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ خدا، رسول، خلفاء، آئمہ اور پیروں فقیروں سے ہمارے شعرا کی گہری وابستگی ہے۔ مگر مذہبی قصیدہ بھی آج تعداد میں اتنا کم لکھا جا رہا ہے کہ اسی پر الشاذ کالمعدوم ہی کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اس کی بنیادی وجہ جدید دور کی شاعری میں در آنے والی نئی اصناف ہیں۔ نظم معریٰ، نظم آزاد اور نثری نظم کے دائروں میں سفر کرنے والے شعرا کے لئے قدیم اظہاریاتی وسائل سے استفادہ کرنا امر محال ہے۔ ردیف و قوافی اور اوزان کی قیود سے نجات پانے والے شعرا صنائع بدائع کی پرخار وادیوں میں قدم رکھنے سے گریزاں ہیں۔ قدیم فنونِ شعری اور کلاسیکی وسائل اظہار کی افادیت عہد جدید میں ختم ہو چکی ہے۔ نئی طرز کا استعاراتی اظہار، شعور کی رو کا بہاؤ، اختلالِ حواس کی نئی تکنیکیں، دور از کار تلازماتی سلاسل، مروجہ قواعد سے منحرف لسانی شکلیں اور ان کے ساتھ سیدھے اور براہ راست اسالیب کا استعمال عہد جدید کے شعرا کو قدیم شاعرانہ معیارات سے گریزاں رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔ آج اگرچہ صنف قصیدہ اپنی مقصدیت کھو چکی ہے تاہم اس کے شاندار ماضی اور اس کی عظیم شعری روایات کو اسی نوع کی چشمِ تحسین سے دیکھا جا سکتا ہے جس نوع سے ہم ماضی کی عظیم الشان تعمیرات یا کلاسیکی معیارات کی حامل و پرجمال مصورانہ کاوشوں کو دیکھتے ہیں۔ قدیم عمارات اور پرانے مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر عہدِ نو کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں لیکن ان کی تاریخی، روایاتی اور مطالعاتی اہمیت سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ صنفِ قصیدہ پر ہمارے تمام تر مباحث اسی تناظر میں ہیں۔ یہ صنف ہمارے ادب میں ویسی ہی اہمیت کی حامل ہے جیسی فنِ تعمیر میں تاج محل، لال قلعہ یا مسجد وزیر خاں۔ نئے دور کے طرزِ تعمیر میں ان عمارات

میں استعمال ہونے والے میٹریل، صناعی اور تعمیری قواعد و ضوابط سے علاقہ نہیں رکھا گیا تاہم یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ آج کے دور میں ان کی اہمیت مکمل طور پر ختم ہو گئی ہے۔ صنفِ قصیدہ سے انصاف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اسے مذکورہ معروضات کی روشنی میں پرکھیں۔ اس مقام پر ہم ان سوالوں کے اجمالی جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس صنف کی احوالاتی بنیادیں دریافت کرنے کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے ہیں اس فصل کے تیسرے پیراگراف میں ـــ جو سوالات اٹھائے گئے ہیں ان پر ایک سوال بطور عنوان بھی قائم ہو سکتا ہے کہ کیا قصیدہ بادشاہ، امیر، قبائلی سردار، روحانی شخصیت، سماجی اخلاق کی ضرورت ہے یا شاعر کی؟ اس سوال کا جواب دیگر سوالوں کے جواب میں آسانی پیدا کرے گا

جہاں تک بادشاہوں، امیروں اور قبائلی سرداروں کا تعلق ہے ایسی اَن گنت شہادتیں موجود ہیں جن سے استنباط ہوتا ہے کہ وہ ذاتی نام و نمود یا اپنے کارناموں کو حیاتِ جاوید بخشنے کے لیئے شاعروں کو ایک ضرورت کے طور پر قبول کرتے تھے۔ عرب سرداروں کا قبیلے میں شاعر کی پیدائش پر خوشی منانا[1]، بادشاہوں کا اپنے درباروں میں "ملک الشعرا" کا منصب قائم کرنا اور امراء کا شاعروں کو اپنے حلقۂ اثر میں شامل کرنا اس امر کی دلالت ہے کہ اولین سطح پر ممدوحین کو شاعروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بسا اوقات شاعر بھی اپنے معاشی اور سماجی حالات کی دگرگونی سے تنگ آ کر عازمِ دربار ہوا کرتے تھے۔ انعام و اکرام کی بارش یا صلے کی چاٹ انہیں مداحی پر مجبور کرتی تھی۔ یوں یہ صنف شاعروں کی ضرورت بھی بن جاتی تھی۔ کئی شعرا صلے کی تمنا یا کسی اور نوع کے خارجی دباؤ کے بغیر بھی مدحیہ قصائد لکھ لیتے تھے یہ ان کی طبعی پسند ناپسند کا مسئلہ ہوتا تھا۔ جہاں تک روحانی شخصیات اور مذہبی ہستیوں کی مدح میں لکھے گئے قصائد کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ عربی، فارسی اور اردو قصیدہ گو شعرا کی غالب اکثریت کا تہذیبی مزاج مذہبی تھا ان کی قلم سے نکلنے والے مذہبی قصائد ان کی ایمانی اور اعتقاداتی ضرورتوں کے تابع تھے۔ پیر، صوفی، بزرگ، ولی، امام، خلیفہ، پیغمبر بذاتہ ایسے صفات کے حامل ہوتے ہیں کہ انہیں مدح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی وہ سلطنت کے دبدبہ سے بے نیاز ہوتے ہیں البتہ ان کی مدح و ثنا انفرادی اور اجتماعی افادیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ انفرادی سطح پر شاعر اپنے دینی، مذہبی اور صوفی ہیرو کے کردار اور سیرت کی ثنا کرتے ہوئے اپنے باطن کو بھی اعلیٰ اخلاق اقدار کے ذخائر سے مالا مال کرتا ہے اور اجتماعی سطح پر ان کے اعلیٰ اوصاف سبق آموز اور قابلِ تقلید ہوتے ہیں۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد شاعروں کی اخلاقی اور دینی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں شاعر ہر نوع کے دنیاوی عذاب سے چھٹکارے، شفایابی اور حصولِ مقام و مرتبہ کی دعائیں بھی مانگی جاتی

---

① بلوغ الارب جلد سوم محمود شکری آلوسی ص ۵۵ء، ۵۶ء (ترجمہ) مرکزی اردو بورڈ لاہور

ہیں۔ مذہبی قصائد میں مذہبی شخصیت کی عظمت کا اعتراف اگر جذباتِ صادق سے بہرہ مند ہو کر کیا جاتا ہے تو قصائد نگار و قارئین سرمدی راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اعلیٰ مذہبی قصائد علم و آگہی، شعور و عرفان اور بصیرت و ایمان کی روشنی رکھنے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ کمالات کے عمدہ نمونے بھی ہوتے ہیں۔ نعت و منقبت کے قصائد شاعروں کے دلوں، روحوں اور ضمیروں میں موجزن عشق و شعور کے دائمی جذبات کے ترجمانی ہوا کرتے ہیں۔ بلند پایہ نعتیہ، حمدیہ اور منقبتی قصائد میں لفظ و معانی اور اسلوب و شعور کی ہم آہنگی فکر خیزی کا باعث ہے۔ اس میدان میں وہی شعرا قدم رکھتے ہیں جن کے دل حرارتِ ایمانی کی آماجگاہ ہوتے ہیں۔ نعتیہ قصائد میں شاعروں کی عقیدت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ نعتیہ قصیدے لکھنے والے شعرا جہاں ایک سطح پر بوسیلۂ ممدوحؐ انسانی سماج کی حقیقی اخلاقی اور انسانی صورتوں کو منعکس کر رہے ہوتے ہیں وہاں دوسری سطح پر انفرادی ایمان کے شاہد بھی ہوتے ہیں۔ اس میدان میں کم تر درجے کے شاعر کامیاب نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کی شاعری میں فن و معانی کے اعتدال کا فقدان ہوتا ہے۔ محمد نجف علی خاں مراد آبادی کا کہنا ہے

"ایسا نہ ہو کہ محاورہ میں جو کلمات حمد و نعت و منقبت میں
لکھے جاتے ہیں وہ سلاطین اور امراء کی مدح میں لکھے جائیں اور ایسے ہی
برعکس اس کے اس باب میں تمیز شرط ہے" ①

یوں دیکھا جائے تو مذہبی قصائد شاعر کی ضرورت ٹھہرتے ہیں مذہبی شخصیت کی نہیں ان کے وسیلے سے اسے خیر و برکات سے ہمکناری بھی نصیب ہوتی ہے اور فکری اور فنی گہرائیوں کی پیرمایہ اقلیم بھی جہاں تک سماجی اخلاق کا تعلق ہے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جھوٹ، منافقت اور ریاکاری کے رجحانات تہذیبی، اخلاقی اور سماجی سانچوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے صرف ایسی مداحی کو جائز قرار دیا ہے جو ممدوح کے استحقاقی تقاضے کے تابع ہو۔ ایسی مدح جو کسی کے حقیقی کارناموں کو سراہنے کے ضمن میں ہوگی منافقت، ریاکاری اور جھوٹ کے رذیلوں سے پاک ہوگی اس نوع کی مدحیں سماجی اخلاق کی ضرورت ہوا کرتی ہیں۔ کسی تہذیب کو بالیدگی عطا کرنے میں بھی ممد ہوتی ہیں۔ اعلیٰ، ارفع اور افادیت کے حامل کارنامے سرانجام دینے والے افراد کی عظمتوں کو سلام کرنا سماج کو درست راہ دکھانا ہے۔

اس مختصر سی تمہید میں ہم نے مذکورہ بالا سوالات کے اجمالی جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں ہمارے ہاتھ یہ نتائج لگے ہیں کہ قصیدہ کا قصیدہ گو شاعر کی ہستی اور سماجی مقام

---

① احسن القواعد از محمد نجف علی خاں مراد آبادی ص ۱۹۲ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۸ء

سے گہرا رابطہ ہے۔ اس کے اخلاقی، جمالیاتی اور نفسیاتی اثرات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ حقیقی مدح پر مبنی قصائد کئی سطحوں پر قارئین اور شعرا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی راہنمائی ہوتی ہے۔ ان میں اعلیٰ سطح کا جمالیاتی حظ بیدار رہتا ہے۔ ان کی شخصیات میں کارنامے سرانجام دینے کی تمنائیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ قصائد جو جھوٹی مداحی پر مبنی ہوتے ہیں ان میں شاعرانہ خلوص کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے قصائد شاید ہنگامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جن قصائد میں ممدوحین کی حقیقی عظمتوں کو بھرپور شاعرانہ صداقت اور خلوص سے پیش کیا جاتا ہے ان کی مستقل اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا قصیدہ کا زمان و مکاں تو اس لحاظ سے محدود نہیں ہے کہ یہ دورِ جاہلی سے لے کر عصرِ حاضر تک نعتیہ اور حمدیہ قصائد کی صورت میں مسلسل لکھا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب حمد و نعت کے قصائد بھی خال خال نظر آتے ہیں۔ تاحال مذہبی قصیدہ موجود ہے البتہ دنیاوی ممدوحین کی شان میں لکھے جانے والے قصائد بادشاہوں اور ریاستی نوابوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم کہہ سکتے کہ قصیدہ کا زمان و مکاں کسی بھی صورت محدود نہیں ہے۔ قصیدے کی ہیئت میں دنیاوی یا مذہبی شخصیات کی شان میں اگر کچھ نہ بھی لکھا جائے تو بھی تعریف یا برائی کے جذبات کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ کسی کی تعریف کرنا کسی کی برائی کرنے ہی کی طرح سے انسان کا حقیقی اور فطری جذبہ ہے۔ یہ جذبہ برقرار رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تعریف یا برائی کے رجحانات مخصوص یا متعینہ سانچوں کے پابند نہ ہوں۔ دنیا کے مختلف نظریاتی اور غیر نظریاتی ممالک اپنے اپنے کارناموں کی توصیف و تحسین کے لئے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اپنی پالیسیوں پر کتابیں لکھواتے ہیں۔ پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کرتے ہیں۔ آج بھی سپاسنامے، تہنیت نامے، سہرے، تقریباتی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ سیاسی پارٹیاں شاعروں کی خدمات بھی حاصل کرتی ہیں۔ قومی لیڈروں، سیاسی شخصیتوں اور ملکی سربراہوں کی شان میں نظمیں، قطعے، غزلیں، رباعیاں، آزاد نظمیں اور معریٰ نظمیں بھی لکھی جا رہی ہیں۔ جہاں تک قصیدے کی مروجہ فارم کے حوالے سے داخلی اور خارجی کلیتوں کی ہم آہنگی کا تعلق ہے تو وہ قصائد جن میں اظہارِ خلوص، فن پر عبور اور صداقت کا حقیقی جواز ہوگا ان کی خارجی اور داخلی کلیت میں ہم آہنگی نظر آئے گی متضاد صورتوں میں انتشاری کلیت ہی کا قصیدہ رقم ہو سکے گا۔ اس کا ہر جزو علیحدہ تو ہوگا ہی باہمد گر متضاد بھی دکھائی دے گا قصائد کی مابعد الطبیعاتی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبی سطح پر اس صنف نے تسلیم و رضا کا درس دیا ہے۔ اپنی شخصیت اور ذات سے بالاتر کسی ہستی کی تعریف انسانوں میں کسرِ نفسی کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ ان کے اندر ماننے اور تسلیم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مسلم تہذیب میں تسلیم و رضا کے رجحانات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

قصائد کی تاریخی اہمیت غیر نزاعی ہے ان میں مادحین اور ممدوحین کی شخصیات کی لفظی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے تاریخی ادوار کی چند تفصیلات بھی ملتی ہیں ۔ سیاسی اعتبار سے اردو، عربی اور فارسی قصائد نے ممدوحین کے استحکام کے لئے بطور تشہیری سلاسل اعانت بھی کی ہے اور ان کے لئے مناسب راہنمائی کا سبب بھی بنے ہیں ۔ قصیدے کی تہذیبی اہمیت کا کچھ تو ذکر ہو ہی چکا ہے یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ یہ اہمیت مذہبی حوالے سے بھی ہے اور دنیاوی حوالے سے بھی ۔ مذہبی حوالے سے اس صنف نے ایمان اور عقائد کے استحکام کا کام کیا ہے اور دنیاوی حوالے سے اس میں مختلف زمانوں کے تہذیبی ماحول کے نمایاں آثار محفوظ ہیں

مذہبی قصائد کے حوالے سے یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ کیا قصیدہ عقیدے کی نشوونما کا وسیلہ ہے یا نمائش عقیدہ کا ذریعہ ۔ تو اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ وہ قصائد نگار جو خلوص سے عاری اور لاتعلق ہو کر یا دوسروں کے عقائد کو محض ترجمان کر مذہبی شخصیات کی مدح وثنا کریں گے تو ان کے ہاں عقیدہ نمائش تک ہی محدود رہے گا اور اس میں تعصب کی جھلکیاں نظر آئیں گی ۔ وہ قصیدہ جو خلوص اور انجذاب کے کوائف کے تابع ہو کر لکھا جائے گا عقیدے کی نشوونما اور اس کی توسیع میں ممد ثابت ہوگا اس کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں ہے یہ ایک عمومی اصول ہے کہ قارئین پر تاثیر میں ڈوبے اشعار کا گہرا اثر ہوتا ہے ۔

قصیدے کے کلاسیکی تنقیدی معیارات کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف میں ارتقا کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ اس کی غزلیہ ہیئت کی زنجیروں اور اجزا کی کڑیوں کی گرفت خاصی مضبوط ہے شاعر ان سے دامن چھڑا کر کسی اور ہیئت کے میدان میں تو داخل ہو سکتا ہے ۔ قصیدے سے متعلق نہیں رہ سکتا ۔ اگر تو قصیدہ موضوعاتی حوالے سے قصیدہ کہلاتا تو اس میں ارتقا کی خاصی گنجائشیں تھیں مگر ہمارے ہاں اس میں موضوع سے زیادہ ہیئت کی قدغن کو اہم جانا جاتا ہے ۔ اگر مرثیہ ہر فارم میں لکھا جا سکتا ہے تو قصیدے کو بھی یہ گنجائش حاصل ہونی چاہیے ۔ مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، سانیٹ، آزاد نظم، نظم معریٰ وغیرہ میں اگر مدحیہ مضامین بیان ہوں تو انہیں بھی قصیدہ ہی کہنا چاہیے ۔ تاہم ابھی تک اس صنف کے حوالے سے اس نوع کی گنجائش یا اجتہاد کو قبول عام کی سند نہیں ملی قصیدے کے امکان کے حوالے سے شبلی نے لکھا ہے

> "مختلف شاعرانہ مضامین کے لئے قصیدہ سب سے بڑا میدان ہے مثنوی کے لئے مسلسل طول طویل قصہ کی ضرورت ہے ۔ غزل میں چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات ادا کیے جاتے ہیں ۔ باقی ہر قسم کے مضامین جو ان دونوں قسموں کے بیچ بیچ ہیں وہ صرف قصیدہ کے ذریعے سے ادا کیے جا سکتے ہیں مثلاً کوئی دوست جدا

ہو رہا ہے کسی نے کوئی ناموری کا کام کیا ہے۔ کوئی موثر منظر نظر سے گزرا۔ کسی گروہ کے تمدن یا معاشرت کی تصویر کھینچنا ہے اس قسم کے تمام مضامین صرف قصیدہ میں عمدگی سے ادا ہو سکتے ہیں"①

شبلی نے بھی قصیدے کی ہیئت میں ترمیم کا مسئلہ پیش نظر نہیں رکھا۔ نظم آزاد اور نثری نظم کی بگٹٹ آزادیوں کے زمانے میں نوع قصیدہ کی ہیئتی پابندیاں خاصی تکلیف دہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں (دورِ قدیم میں موجود اشتیاق کے حوالے سے) زیادہ قصائد نہیں لکھے جا رہے

① شعر العجم پنجم ص ۲۴

مطلب پرستی، مبالغہ آرائی اور قصیدہ

●

قصیدہ عربی، فارسی اور اردو اصنافِ سخن میں ایک نادر، پرفخر اور شکوہ آشنا صنفِ سخن ہے۔ یہ قدیم ترین شعری صنف ہونے کے ساتھ ساتھ طویل ترین زمانی اور ادبی مسافت کے آثار سے بھی مالامال ہے۔ اس میں شاعرانہ تجربے کی بوقلموں صورتیں بھی منعکس ہیں اور معانی آفرینی کی رنگا رنگ تاثیریں بھی۔ اسالیبی شان و شوکت اور پروازِ تخیل کے اعتبار سے صنفِ قصیدہ تخصیصی مقام کی حامل ہے۔ لفظی و معنوی خصائص کے اعتبار سے اسے بجا طور پر ایک رفیع الشان صنفِ سخن کہا جاتا ہے۔ یہ صنف اتنی ہی رفیع الشان ہے جتنے اس کے ممدوح اور مخاطب رفیع الشان ہوتے ہیں۔ جس طرح کا شکوہ، وقار اور جلال ایک برگزیدہ اور برتر ہستی اور ایک شہنشاہ اور اس کے دربار کا ہوتا ہے۔ اس صنف میں اسی قسم کی جلال و جمال سے پر فضا دیکھنے میں آتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ قصیدہ بنیادی طور پر مدح کے لئے مخصوص ہے لیکن یہ کہنا کہ مشرقی شاعر ہمیشہ صلہ حاصل کرنے کے لئے قصیدہ لکھتا تھا۔ صنفِ سخن اور شاعر دونوں پر بہتان ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس صنف میں جلال و جمال کے عناصر دکھائی نہ دیتے اور اس میں محض آجر اور آجیر کا تعلق یا مطلب پرستی کا عنصر نظر آتا۔ یہ درست ہے کہ بعض قصیدہ گو شعرائے قصیدہ کو اپنی معیشت کے سہارے کے بطور استعمال کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرتے تھے کہ جب تک الفاظ و معانی کا "تاج محل" وجود میں نہیں آئے گا وہ ممدوح کے نزدیک صلہ کے مستحق نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ صنفِ قصیدہ کی معیشت طلبی کو دوم اور شعر زیبی کو اول حیثیت حاصل رہی ہے۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ ان میں مدح کا بنیادی محرک شاعر کا ایمان اور عقیدہ ہے۔ ان میں شاعر کی داخلی اور روحانی شخصیت پورے طور پر سرگرمِ عمل ہوتی ہے اس لئے مذہبی قصائد معیشت سپارگی کے عیب سے کلیتاً بری ہیں

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ قصیدہ کا ممدوح شاعرانہ مبالغہ کے تیروں کا ہدف بنتا ہے اور وہ اس کے لگائے ہوئے زخموں کو اپنی مدح کی تسکینی زبان سے چاٹ کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ بات عمومی عقل سے تعلق رکھتی ہے کہ جس مبالغہ تک معترضین کی رسائی آسانی سے ہے اسے ممدوحِ قصیدہ کیوں نہیں پا سکتا خصوصاً اس حوالے سے بھی کہ قدیم عہد میں بادشاہ اور امرا علم، تہذیب اور شعور کی بلند سطحوں سے آشنا ہوتے تھے۔ ممدوح جانتا تھا کہ

شاعر اس کی مدح میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہے لیکن فی الاصل اس کے مدِ نظر شاعر کے موضوعات، مضامین، خیالات اور اسالیبِ اظہار ہوا کرتے تھے۔ وہ شاعر کے شاعرانہ کمال کی شناخت کیا کرتا تھا بغور دیکھا جائے تو مبالغہ ہی قصیدہ کی جان ہے۔ یہی وہ کوہ ہمالہ ہے جسے سر نہ کر سکنے کی وجہ سے قدیم و جدید شاعرانہ ادوار میں ہر کوئی قصیدہ نگار نہیں بن سکا۔ عقلی طور پر بالغ اور علمی طور پر فاضل ممدوحین کی مبالغہ آرائی پر مبنی مدح ان کی باطنی ضرورت نہ تھی البتہ یہ شاعر کی حاجت ضرور تھی۔ یہ صنف ممدوح کی آزمائش نہیں مدح نگار کا امتحان ہے۔ مبالغہ کے ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی وضاحت دیکھیے

> "اگر اعتراض اس بات پر ہے کہ دورِ جاہلیت کے عربی قصیدوں میں تفاخر سے کام لیا جاتا تھا تو اعتراض میں قدرے وزن ہے۔ لیکن اس کے باوجود مبالغے کے تحت کچھ جذبات بھی موجود ہوتے تھے جو حقیقی شاعری کی شرطِ اول ہے۔ انداز بیان میں مبالغہ اور اغراق یونانی شعرا میں نیز انگریزی میں ملٹن وغیرہ کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب علم بلاغت میں اسے بعض مواقع کے لئے جائز قرار دیا ہے"[1]

یہاں یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ مدح کے حوالے سے قصائد میں دستیاب ہونے والی مبالغہ آرائی کا کیا جواز ہے؟ بیسویں صدی جس میں ہم زندہ ہیں سائنسی معراج کی صدی ہے۔ سائنس کا انحصار تجربے اور مشاہدے پر ہے۔ سائنسدانوں نے ایسے محیر العقول کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ داستان امیر حمزہ کا عمر بھی ورطۂ حیرت میں ڈوبا ہے۔ "اڑن کھٹولے"، "اڑنے والے قالین"، "الہ دین کا چراغ"، "جام جہاں نما"، "کھل جا سم سم" یہ سب کچھ سائنس آشنا صدیوں سے قبل کے انسانوں کا خواب تھا۔ آج نئے عہد کے انسانوں نے ان انسانوں کے خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ ہوائی جہاز، راکٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، وی سی آر اور کائنات کے رازہائے سربستہ کے روز افزوں انکشافات۔ آج یہ سب کچھ مبالغہ نہیں ہے حقیقت ہے۔ لیکن اگر ہم جدید سائنس فکشن پڑھیں یا سائنس کے حوالے سے بننے والی فلمیں اور ڈرامے دیکھیں تو ہمیں مبالغہ کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ گزشتہ دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر سائنس فکشن پر مبنی دو فلم سیریز کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک کا نام سکس ملین ڈالر مین ہے اور دوسری کا بائنک ویمن۔ ان میں اول الذکر کا ہیرو مرد کردار اپنے جسم میں طاقت و شعور آفریں سائنسی آلات نصب کروا کے اور اسی طرح ثانی الذکر کی ہیرو عورت کردار سائنسی ایجادات کی توانائیاں سمیٹ کر ایسے ایسے حیرت خیز کارنامے سرانجام دیتے ہیں کہ ہم جدید سائنسی داستانوں کے امیر حمزاؤں اور

---

[1] دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۶/۲ ص ۲۸۶ پنجاب یونیورسٹی لاہور

عمرعیاروں سے آشنا ہوتے ہیں ۔ یوں ہم جان سکتے ہیں کہ انسان کو مبالغے سے کسی بھی دور میں نجات نہیں مل سکتی ۔ کائنات کو مسخر کرنے کے لئے عجوبہ خواب تو دیکھنے ہی پڑیں گے ۔ جب تک انسان کے باطن میں زندگی کو تسخیر کرنے کا جذبہ موجود ہے اس کے خواب بھی زندہ ہیں ۔ وہ خواب جن کا حقیقت ہونا ضروری نہیں ہے ۔ بات مبالغہ آرائی کی ہو رہی تھی ۔ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عمل کی ہو رہی تھی ۔ اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی ہو رہی تھی کہ جھوٹ کی حدیں بھی کوسوں پیچھے رہ جائیں ۔ لیکن کیا مبالغہ صرف ہمارے قصیدوں ہی میں تھا ؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا ۔ ہماری شاعری کی دیگر اصناف کو بھی اس سے مفر نہ تھا ۔ یہ اس عہد کی طرزِ زندگی اور طرزِ تہذیب کا حصہ تھا ۔ خیال کی کمند جتنی بھی دور پھینکی جا سکے پھینکنی چاہیے ورنہ انسان معلوم کے دائروں ہی میں بند ہو کر زندگی گزار دے گا ۔ ہمارے شاعر بھی خیال کی کمندوں سے ان گنت نامعلوم خیالات کو "معلوم" کی وادیوں میں کھینچ لاتے تھے ۔ صرف یہی نہیں مبالغہ حسن پیدا کرتا تھا ۔ خیال موثر اور بات آبدار ہو جاتی تھی ۔ مبالغہ کی بدولت خیالات کی اقلیم میں رنگا رنگ رونقیں آبستی تھیں ۔ مبالغہ آرائی پر محض قصیدہ نگاروں کو معتوب ٹھہرانا بھی انصاف نہیں ہے ۔ اس دائرے میں داستان نویس بھی تھے اور خطیب بھی، تقریظ نگار بھی تھے اور تاریخ نویس بھی؛ قصیدہ نگار بھی تھے اور مرثیہ گو بھی ۔ مثنوی نویس بھی تھے اور ہجو گو بھی ! قصیدہ نگار شعرا اگر کسی ممدوح کی مدح ، مناظرِ فطرت کے بیان اور فلسفہ و حکمت کے موضوعات کے اظہار کے حوالے سے مبالغہ کا دامن تھامتے تھے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا ۔ کسی قوم کے دورِ عروج کے ممدوح تو کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی وجہ سے لائق تحسین ہوتے ہی ہیں ۔ دورِ زوال کے ممدوحین بھی بے وقوف ، نادان یا کم عقل نہیں ہوتے تھے ۔ ملکی فتوحات یا توسیع پسندانہ عزائم کی عدم موجودگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حکمران اور بادشاہ علم و فضل کی دولت سے بھی محروم ہوتے تھے ۔ دورِ زوال میں بھی [ہندوستانی مسلمان] نوابوں اور امراء کی تربیت کچھ اس طور ہوا کرتی تھی کہ وہ فنونِ حرب، فنونِ لطیفہ اور علوم معقولہ و منقولہ سے مہارت کی حد تک آگاہ ہوتے تھے ۔ یہ ممدوحین مبالغہ آرائی کو ذاتی انا کی غذا کے طور پر قبول کرنے سے زیادہ اس سے پیدا ہونے والے شعری حسن سے اثر و سرور حاصل کرتے تھے ۔ مغربی علوم کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی اردو تنقید میں اگر مشرقی شعری معیارات کا مذاق اڑایا گیا ہے تو یہ اچنبھے کی بات نہیں ہے ۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب میں انگریزی زبان اور اس کے ادب کے فروغ پاتے ہی عربی اور فارسی السنہ کے رسوخ میں کمی واقع ہوئی ۔ ان زبانوں میں موجود ادبی اور تہذیبی سرمایے اور معیارات سے ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق منقطع ہونے لگا ۔ انگریزی ادب کے اثرات کے تحت حالی نے ادبی اصلاحی تحریک کے حوالے سے مشرقی ادبی معیارات میں ترامیم و اضافہ کا علم بلند کیا ۔ واقعیت اور حقیقت پسندی پر اس شد و مد سے اصرار ہونے لگا کہ نئے قارئین اپنے

علم بیان کی ابجد تک بھول گئے۔ مبالغہ مشرقی شاعری کا موثر حربہ ہے۔ مغرب زدگی کے حوالے سے اس کا
مذاق اُڑا۔ کسی انسان کو اس کی بہادری کی وجہ سے اگر شیر کہہ کر مخاطب کیا جائے گا تو کیا اسے
ہم مبالغہ کہیں گے؟ یہ تو استعاراتی اظہار کا حصہ ہے۔ اسی طرح عرقِ انفعال یا آنسوؤں کو اگر کوئی
شاعر موتی کہہ کر تشبیہی اظہار کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو کیا ہم اسے جھوٹ سمجھ کر رد کر دیں گے؟
اگر کوئی شاعر یہ کہہ کر کہ خاک میں دفن ہونے والی حسین صورتیں لالہ و گل کی صورت میں نمایاں
ہو گئی ہیں حسن تعلیل کے مسکن کی گھنٹی بجاتا ہے تو کیا ہم اسے توہم پرست یا مجذوب قرار دے
دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ انہی امور سے تو شاعری جمال آشنا ہوتی ہے۔ اس کی تاثیر بڑھتی ہے
شاعری میں سائنسی حقائق یا معاشرتی علوم کے بیان سے ہمیں منظوم علوم کا سرمایہ تو مل سکتا ہے
لیکن یوں ہمارے جذبات شاعرانہ حسن و تخیل کے ذخائر سے محروم سرد خانوں کی زینت بن جائیں گے
البتہ ہم شاعروں سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ضرور ہیں کہ وہ غیر ضروری مبالغہ آرائی سے
گریزاں رہیں۔ جدید سائنسی شعور رکھنے والے شعرا کے ہاں بھی محض عریاں خارجی حقائق نظر نہیں
آتے۔ وہ تجربہ گاہوں سے حاصل شدہ نتائج کو منظوم نہیں کرتے۔ شاعرانہ وسائل اظہار سے کام
لے کر شاعری میں حسن و جمال و اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے
اپنی کسی تحریر میں مبالغے کو شاعری کی شریعت میں جائز قرار دے کر ایک ناگزیر حقیقت کا
اعتراف کیا ہے۔

باب اول

صنفِ قصیدہ

فن و اظہار

فصل اول: لفظی و اصطلاحی معانی

فصل دوم: قصیدہ کے اجزا

فصل سوم: چند مزید معروضات

فصل چہارم: قصیدہ اور دیگر اصناف

فصل پنجم: قصائد اور متعلقہ تہذیبی ماحول

فصل اول

لفظی و اصطلاحی معانی

لفظ قصیدہ عربی الاصل ہے اور اس کے لغوی معانی کثیر الجہات ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کی ہر عمدہ عربی لغت میں اس کے متنوع معانی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ قدیم و جدید تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے بھی اس کے لفظی معانی کی حدود میں بہت وسعت پیدا کی ہے

مشہور عربی لغت المنجد کے باب قصد میں اس لفظ کے ذیل کے معانی درج ہیں

"کسی کی طرف توجہ کرنا• کسی پر اعتماد کرنا• کسی کی طرف چلنا•
سیدھا ہو کر چلنا• کسی معاملہ میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنا•
کسی کو اس طرح نیزہ مارنا کہ خطا نہ کرے• راستہ کی استقامت•
ٹوٹا ہوا نیزہ• زیادہ مرغن گودا• خشک گوشت• لاٹھی• فربہ
اور جواں اونٹنی• چربیلا کوہان• توڑی ہوئی چیز کا ٹکڑا•" (1)

تمام اہم عربی لغات میں باب ضَرَبَ کے حوالے سے لفظ قَصَدَ کے معانی مقصد یا ارادہ کیا ہوا کے لکھے گئے ہیں اور باب کَرُمَ کے حوالے سے لفظ قَصُدَ کے معانی موٹا، گاڑھا اور غلیظ وغیرہ کے لکھے گئے ہیں

شیخ محمد غیاث الدین مولف غیاث اللغات نے قصیدہ کے لغوی معانی مغز غلیظ و سطبر کے لکھے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں

"قصیدہ در لغت بمعنی مغز سطبر و غلیظ" (2)

فرہنگ آنندراج میں اس لفظ پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لغت میں درج ہے کہ اس لفظ کا مادہ قصید اور قصد ہے

"قصید بہ دال مہملہ کا مییر نیزہ شکستہ وہ پارہ از شعر کہ نصف ابیات آں بر قافیہ ملتزمہ باشد نہ نصف دیگرے"

---

(1) المنجد عربی اردو ۔ ص ۸۰۷-۸۰۹ دار الاشاعت کراچی

(2) غیاث اللغات از شیخ محمد غیاث الدین بن جلال الدین بن شرف الدین رامپوری ص ۱م۳ در مطبع حیدری ۱۸۸۰ء

قصاید بر فتح اول و بہ کسر چہارم جمع و گوشتِ خشک و مغز فربہ یا اندک فربہ و استخواں با مغز و گوشتِ خشک و شتر مادہ فربہ پر مغز و چوب دستی و کوہانِ فربہ پر گوشت و شعر پاکیزہ و نیکو،

قصد بالفتح و دال مہملہ میانہ راہ رفتن و اعتماد کردن و آہنگ نمودن و پیوستہ و بر اتصال آوردن اشعار را و بیان واضح کردن و نیز قصدِ شکستن چوب و جز آں بہر وجہ کہ باشد یا شکستن چیزی کہ بہ نصف رسد و راستی و عدل و نیکی و نیکی کردن و نیز قصدِ مردِ میانہ نہ فربہ و لاغر" ①

فرہنگ آصفیہ کے مولف سید احمد دہلوی نے اس کے معانی کی یوں ترسیل کی ہے

"قصیدہ (ع) اسمِ مذکر:- لغوی معانی ٹھوس اور لبرا ہوا مغز یا دماغِ سطبر" ②

ابن رشیق نے اپنی کتاب العمدہ میں قصیدہ کے لفظ کا اشتقاقی مادہ قصد ہی قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں

"لان اشتقاق القصید من قصدت الی الشی کان الشاعر قصدالی عملیا" ③

شمس قیس رازی نے بھی دیگر ماہرین کی طرح قصیدہ کے لفظ کو قصد ہی سے مشتق ٹھہرایا ہے ④ صدر الدین فائز کا کہنا ہے

"اشتقاق قصیدہ از قصد است و آں توجہ و روئے نہادن است بہ چیزے جائے۔ و مقصود را از بہر آں مقصود گویند کہ مردم روئے دل بہ طلب تحصیل آں آوردہ باشند و قصیدہ فعلے باشد بہ معنی مفعول یعنی مقصودِ شاعر است با یراد معانی مختلف و ذکر اوصافِ مختلف از مدح و ہجا و غیر آں و ما در آخر قصیدہ وحدت راست" ⑤

قصیدہ کے مذکورہ لغوی معانی کے جائزہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ عربی، فارسی اور

---

① فرہنگ آنندراج ص ۳۲۵۳ کتابخانۂ خیام تہران ② فرہنگ آصفیہ جلد سوم ص ۳۸۷ مکتبہ حسن سہیل لاہور
③ العمدہ ابن رشیق جلد اول ص ۱۵۸ قاہرہ مصر ۱۳۵۳ ھ ④ المعجم فی معاییر اشعار العجم ص ۱۵۱ تہران
⑤ فائز دہلوی اور اس کا دیوان مولفہ و مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۳۰ تا ۱۲ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۶ء

اردو لغات اور نقادوں نے بالاتفاق قصیدے کو ادبی شاعری کے زمرے میں شمار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے پر مغز ہونے کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے۔ یوں قصیدہ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں منفرد اہمیت کا حامل ٹھہرا ہے۔ قصیدہ کے مذکورہ لغوی مطالب پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر بھی پہنچتے ہیں کہ اس صنف میں بھاری بھرکم اور شان و شوکت کے حامل الفاظ و اسالیب، پر مغز خیالات اور فلک رس افکار کا ہونا بھی ضروری ہے اور ان سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قصیدہ کے اشعار عمدہ، مہذب کیے ہوئے اور پاکیزہ بھی ہونے چاہییں۔

قصیدہ کے اصطلاحی معانی پر بھی ہماری لغات نے روشنی ڈالی ہے۔ غیاث اللغات میں لکھا ہے

"در اصطلاح شعرا نظمی کہ ہر دو مصرعۂ بیت اول با مصرعہائے ثانی ابیات دیگر ہم قافیہ باشد و در آں مدح یا ذم یا وعظ یا حکایت یا امثال آں بیان شود کمتر از پانزدہ بیت نہ باشد۔ وجہ تسمیہ ایں است کہ در قصیدہ معنی جلیلہ کثیرہ مندرج می گردد کہ در مذاقِ طبعِ مستقیم لذیذ آید" ①

فرہنگ آصفیہ میں درج ہے

"یہ لفظ قصد سے مشتق ہے یعنی اس قدر نظم لکھنی کہ شاعر قصیدہ کے تمام مراتب جس میں مدح و ذم، گردشِ زمانہ، حسن و عشق، بہار و گلزار و دعا وغیرہ کا بیان شامل ہے طے کر کے اپنے مقصود پر لا ڈالے۔ جن لوگوں نے ٹھوس مغز کے معنوں میں یہ لفظ لکھا ہے وہ بھی یہی دلیل لاتے ہیں۔ کہ شاعر تمام حالت کو نظم میں بھر کر پھر اپنا مقصد بیان کرتا ہے یا یوں کہو کثرت سے مضامین جلیلہ لاتا ہے۔ پس اسی وجہ سے پر مغز کہنا بے جا نہیں ہے۔ جب غزل اپنی حد سے گزر جائے تو وہ بھی قصیدہ ہی بلحاظ تعداد خیال کیا جاتا ہے۔ غزل اقل درجہ پانچ شعر کی اور زیادہ سے زیادہ اکیس شعر کی ہوتی ہے۔ قصیدہ کم سے کم پندرہ شعر کا اور زیادہ کی انتہا نہیں۔ غرض قصیدہ وہی ہے جو کسی کے واسطے بالقصد مدح یا ذم، پند و حکایت کے طور پر نظم کیا جائے

---

① غیاث اللغات ص ۳۴۱

اور اس کے اول بیت کے دونوں مصرعے، ابیات دیگر کے مصرعہائے ثانی ہم قافیہ ہوں ۔ قصیدہ میں چند امور کا خیال رکھنا واجبات میں سے ہے مثلاً تشبیب یعنی تمہید دوم حسن تخلص یا گریز یعنی تمہید سے مضمون مدح کی طرف دوڑ نا سوم تعریف ممدوح چہارم حسن طلب یعنی ایک لطف اور انداز سے اپنا مقصد بیان کرنا ۔ پنجم دعا اس میں شرطیہ ہو یا بلا شرط (۱)"

صاحب نور اللغات کا خیال ہے کہ قصیدہ

" اصطلاح میں ان اشعار کا نام ہے جن میں کسی کی ہجو، مدح یا وعظ و نصیحت یا تعریف بہار یا شکایت روزگار وغیرہ مضامین بیان کیے جائیں قصیدے کے پہلے دونوں مصرعوں اور ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیہ ہونا ضروری ہے" (۲)

قصیدہ کے اصطلاحی معانی پر ابن رشیق نے اظہار خیال کرتے ہوئے رجز کی بعض قسموں کو قصیدہ میں شامل کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں

" لان رجز ثلاثة انواع غیر المشطور والمنہوک والمقطع فیذہ داخلة فی القصید" (۳)

شمس قیس رازی کے بقول

" قصیدہ فعیلے است بمعنی مفعول یعنی مقصود شاعر است بہ ایراد معانی مختلف و اوصاف متفرق از مدح و ہجا، شکر و شکایت وغیر آں و تعادر آخر قصیدہ از برائے آں است تا دلالت کند وحدت آں" (۴) (۵)

انشا نے دریائے لطافت میں قصیدہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے

" قصیدہ بیتے چند است متضمن مدح ممدوح و ایں بیشتر است وکمتر مشتمل بر حال ابنائے روزگار ۔ و آں بر دو گونہ بود یا ابتدا بہ مدح کنند یا چیز دیگر در چند بیت پیش از مدح گفتہ شود و من بعد بر سر مدح آئند و آنرا گریز نامند و ابیات مذکورہ را بہ حسب شہرت تمہید خوانند لیکن اہل تحقیق تشبیب گویند مطلقاً خواہ آں ابیات متضمن ذکر شراب

---

(۱) فرہنگ آصفیہ جلد سوم ص ۳۸۷ (۲) نور اللغات جلد سوم ص ۴۶۹ مطبوعہ نیر پریس لکھنو

(۳) العمدہ جلد اول ص ۱۵۸ (۴) المعجم ...... ص ۱۵۱ (۵) یہی تعریف فائز دہلوی نے بیان کی ہے ملاحظہ ہو فائز دہلوی اور ان کا کلام مطبوعہ انجمن ترقی اردو سنہ ص ۲

وشاید وایامِ جوانی باشد، خواہ شامل بود احوال دیگر را و بعضے فرق کردہ اند زیراکہ تشبیب نزد آنہا ہماں است کہ در آں ایامِ شباب و صحبتِ معشوق و کیفیت شراب ذکر کنند، و ہرچہ غیر آں گفتہ شود آں را تشبیب نہ نامند۔ در قصیدہ ہم مانند غزل مطلع ضرور است و باقی ابیات در مصاریع آخرین چوں غزل رجوع بہ قافیہ نمائند و جائز است کہ در قصیدہ دو مطلع و سہ مطلع و زیادہ ازیں ہم در مدح ممدوح باشد و ایں حسن قصیدہ است۔ ①

جلال الدین ہمائی اصفہانی کا کہنا ہے قصیدہ

" ابیاتِ چند است بریک وزن و یک قافیہ مشتمل بر مقصود و مطلوبِ مشخص از قبیل مدیحہ، حماسہ، ہجاء، رثا، بث شکوی و امثال آنہا در صورت کہ بیتِ اول مصرع باشد" ②

مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں رقمطراز ہیں

" قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح و ذم کے لئے جائیں اور اس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر اپنے درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا اور اپنے بہت سے اہم ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا" ③

نجم الغنی نے اس ضمن میں رائے دی ہے کہ

"قصیدہ ان اشعار کا نام ہے جن میں کسی کی مدح یا ہجو کی جاتی ہے یا وعظ و نصیحت، پند و موعظت یا تعریفِ بہار یا شکایتِ روزگار وغیرہ کے مضامین باندھے جاتے ہیں اور ان میں معانیٔ دقیق صنائعِ لفظی و معنوی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں اور طبیعت کا خوب زور دکھایا جاتا ہے۔ اس سے شاعر کی مہارتِ سخن اور کلام پر اس کی قدرت کا پتہ چلتا ہے" ④

---

① دریائے لطافت ص ۲۳۸
② تاریخ ادبیاتِ ایران از جلال الدین ہمائی اصفہانی ص ۱۶۲ تہران ۱۳۴۰ چاپ اول
③ مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۶۵ نیا ادارہ لاہور
④ بحر الفصاحت از نجم الغنی ص ۶۷-۶۸ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ

مشہور مستشرق ڈبلیو گب نے لکھا ہے

"The Qasida — which word in Arabic means "Purpose Poem" is in form similar to Ghazal, but is much longer. Theoretically it contains, not less than thirty and not more than ninety nine couplets. It is the original Arabian form, that in which the famous Mu'allaqat and other ancient Arabic Poems are written" (1)

گب نے قصیدے کو مقصدی نظم کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اشعار تیس سے کم اور ننانوے سے زیادہ نہیں ہوتے۔ عربی اور فارسی اور اردو شاعری میں تیس اشعار سے کم کے قصائد بھی موجود ہیں اور سو سے زیادہ کے بھی۔ قصیدے میں تعداد اشعار کے مسئلہ پر علیحدہ بحث کی گئی ہے۔ گب سے ملتی جلتی رائے شپلے کی مرتبہ عالمی ادبی اصطلاحات کی لغت میں بھی درج ہے

"Qasida — A Poem (Arabic, in Persian 30 to 120 lines, Turkish often longer) usually in praise of someone. An elegy or eulogy. The two hemistichs of the opening line rhyme is repeated at the end of every line. The classical form of Arabic poetry" (2)

ہمیں مذکورہ مغربی آرا کو زیادہ اہمیت دینے کی بجائے ان بنیادی ماخذات کی جانب رجوع کرنا چاہیے جن کی مدد سے صنفِ قصیدہ کے حقیقی مزاج کی شناخت ممکن ہے۔ یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ قصیدہ ان اشعار کا نام ہے جو ایک مخصوص ہیئت میں کسی کی مدح یا ہجو، وعظ و نصیحت، پند و موعظت یا تعریف بہار یا شکایت روزگار وغیرہ میں لکھے جاتے ہیں۔ ان میں لفظی و معنوی صنعتوں کے ساتھ دقیق معانی معرضِ اظہار میں آتے ہیں۔ قصائد میں شعرا اپنی طبیعتوں کا زور دکھاتے ہیں اور یوں ان کی شاعرانہ قدرت اور فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے

(1) History of Ottoman Poetry By E.J.W. Gibb P 83
(2) Dictionary of World Literary Terms By Shipley See Qasida

بعض شعرائے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو شاعر قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔

عربی، فارسی، ترکی اور اردو قصائد کے جو معیاری ڈیزائن پڑھنے والوں کے سامنے آتے ہیں ان کی اجمالی تصویروں سے بھی قصیدہ کے مزاج کی شناخت میں آسانی ہوگی۔ عربی قصیدے کے ڈیزائن پر ابن قتیبہ نے اپنی کتاب الشعر والشعرا میں تحریر کیا ہے

"وقال ابو محمد وسمعت بعض اہل الادب یذکر ان مقصد القصید
انما ابتدا فیہا بذکر الدیار والدمن والآثار فبکی وشکا وخاطب الربع و
استوقف الرفیق لیجعل ذلک سببا الذکر اہلہا الظاعنین (عنہا)
ان کان نازلۃ العمد فی الحلول و الظعن علی خلاف ما علیہ نازلۃ
المدر لانتقالہم عن ماء الی ماء وانتجاعہم الکلا وتتبعہم مساقط
الغیث حیث کان ثم وصل ذلک بالنسیب فشکا شدۃ الوجد والم
الفراق وفرط الصبابۃ والشوق لیمیل نحوہ القلوب ولیصرف الیہ
الوجوہ ولیستدعی (بہ) اصغاء الاسماع (الیہ) لان تشبیب،
قریب من النفوس لائط بالقلوب لما جعل اللہ فی ترکیب العباد
من محبۃ الغزل والف النساء فلیس یکاد احد یخلو من ان
یکون متعلقاً منہ بسبب وضارباً فیہ بسہم حلال وحرام، فاذا علم
انہ قد) استوثق من الاصغا الیہ والاستماع لہ عقب بایجاب الحقوق
فرحل فی شعرہ وشکا النصب والسہر، وسری اللیل و حر الہجیر والفناء
الراحلۃ والبعیر فاذا علم انہ (قد) اوجب علی صاحبہ حق الرجاء
وذمامۃ التامیل، وقرر عندہ ما نالہ من المکارہ فی المسیر بدأ
و فی المدیح فبعثہ علی المکافات وہزہ للسماح وفضلہ علی الاشباہ
و صغر فی قدرہ الجزیل فا الشاعر المجید من سلک ہذہ الاسالیب
وعدل بین ہذہ الاقسام" ①

ترجمہ "ابو محمد وسمعت کا قول ہے" میں نے بعض علما کو کہتے سنا ہے کہ قصیدے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے شاعر دیار و آثار کا ذکر

---

① کتاب الشعر والشعرا ص ۱۴-۱۵ (فی مدینۃ لیدن المحروسہ) بمطبعۃ بریل ۱۹۰۲
از ابن قتیبہ

کرتا ہے پھر روتا ہے اور شکوہ کرتا ہے دیارِ حبیب کو خطاب کرتا ہے۔ دوستوں کو
ٹھہراتا ہے تاکہ گھر چھوڑ کر جانے والوں کو یاد کر سکے۔ خیموں میں رہنے والے دیہات
میں رہنے والوں سے مختلف تھے کیونکہ وہ گھاس اور پانی کی تلاش میں ادھر
ادھر پھرتے رہتے تھے اور بارش کے پانی کی تلاش میں پھرا کرتے تھے۔ پھر عاشقانہ
اشعار کہنے شروع کر دیتا ہے اور شدتِ عشق و فراق کی شکایت کرنے لگتا
ہے تاکہ لوگ اس کی طرف مائل ہوں اور اس کی بات کو کان دھر کر سنیں
کیونکہ عاشقانہ اشعار سے سب کو دلچسپی ہوتی ہے۔ غزل سے ہر ایک کو مناسبت
ہے اور عورتوں سے ہر شخص دلچسپی رکھتا ہے۔ جب وہ دیکھ لیتا ہے کہ لوگ
اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں تو حق حقوق کا ذکر کرنے لگتا ہے۔ اب وہ
آگے بڑھتا ہے اور راتوں کو جاگنے کی تھکن کی شکایت کرتا ہے۔ راتوں کو
چلنے اور اونٹوں کے دبلے کر دینے کا تذکرہ کرتا ہے۔ جب وہ دیکھ لیتا ہے اس
نے اپنی امید کا حق ثابت کر دیا اور ممدوح کو معلوم ہو گیا کہ اس نے پہنچنے میں
کافی محنت اٹھائی ہے تو تعریف شروع کر دیتا ہے اور اسے انعام دینے پر
ابھارتا ہے۔ دوسرے لوگوں پر اسے ترجیح دیتا ہے اور بڑے سے بڑے انعام
کو اس کی نگاہوں میں حقیر ٹھہراتا ہے۔ لہذا اچھا شاعر وہ ہے جو اس
اسلوب پر چلے اور ان اقسام میں اعتدال سے کام لے"

عربی قصیدہ کا مذکورہ ڈیزائن تمام تر عربی قصائد کے لئے نہیں ہے۔ اس ڈیزائن کا تعلق عربی قصیدے کے ابتدائی دور سے ہے۔ بعد کے شعرا نے اس ڈیزائن کو رد و بدل کے ساتھ اپنایا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اس ڈیزائن سے مکمل انحراف بھی کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ سامی مزاج میں موجود حقائق شناسی کے رجحان سے عربی قصیدہ گو شعرا نے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ قدیم عرب شاعر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحرائی زندگی سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ دن رات نئے تجربوں سے آشنا ہوتا تھا۔ اس کے سامنے رنگا رنگ معاملے آتے، بوقلموں وقوعات رونما ہوتے۔ وہ ان کے تجزیوں سے حقائق تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ یہ جائزہ صرف قدیم عرب شاعری کے حوالے سے نہیں ہے مجموعی سامی تہذیب کے حوالے سے بھی ہے۔ استقرائی طریق کار سے کائنات، سماج اور انسان کا مطالعہ سامی ذہن کی عمومی عادت ہے۔ عربی شاعری پر جب عجمی اثرات کا غلبہ ہونے لگا تو یہ استقرائیت قائم نہ رہ سکی۔ عربی شاعری تکلف، آورد، اغراق اور مبالغہ جیسے عناصر سے آشنا ہو کر استخراجی حسن کا عمدہ نمونہ بنی۔ یعنی بعد کے اکثر عربی شعرا نے مشاہدے پر تخیل اور خیال آفرینی کو فوقیت دی۔ یہ صورتِ حال اس زمانے سے متعلق ہے جب عربوں نے ایران فتح کر لیا تھا۔ محکوم تہذیب حاکم

تہذیب پرشب خون مارگئی

ایران میں عربی قصائد کے بنیادی اجزا کو تو اپنا یا گیا تاہم فارسی قصیدہ اپنے تہذیبی اور ثقافتی مزاج کے اعتبار سے عربی قصیدے سے بہت حد تک مختلف ہے۔ اس میں عربی قصیدہ کے معیاری ڈیزائن کی عمومی تقلید کا عمل دکھائی نہیں دیتا۔ ایرانی شعرا نے باغات کی منظر کشی کی۔ موسموں کی لفظی مصوری کی جانب دھیان دیا۔ خزاں، بہار، سردی، گرمی اور ان سے پیدا ہونے والی تخیلی کیفیات کو شدومد کے ساتھ پیش کیا۔ بعض فارسی گو شعرا نے قصائد کی تشابیب میں تصوف اور اخلاق کے مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ریگ زار، صحرا، نخلستان، مہمان نوازی، فخر، قافلے، ان کی روانگی، سفر کی مشکلات وغیرہ کے عربی قصیدے سے متعلق سلاسل فارسی قصائد میں بہت کم دستیاب ہیں۔ ڈبلیو گب کا کہنا ہے

> In Persian and Turkish literature (Qasida) it is the special form affected by the court poetry its proper subject being the eulogy of some great personage, a sultan, a vezir or Sheykh of Islam. The Ottoman Qasida consist of two parts the "Nasib" which we may translate as the "Exordium" and the Maqsad or Maqsud, literally the purpose which we may render as the Panegyric" ①

گب نے نسیب کے بارے میں کہا ہے کہ یہ قصیدہ کا خوب صورت جزو ہے اس میں عام طور پر اس موقعہ اور محل کا لحاظ رکھا جاتا ہے جس کے حوالے سے قصیدہ لکھا جاتا ہے یا پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر قصیدہ رمضان کے مہینے یا حوالے سے کسی ممدوح کے سامنے پیش کیا گیا ہے تو نسیب میں اسی مہینے یا ماحول کی مناسبت سے کوئی منظر قلمبند ہوگا۔ اگر قصیدہ کسی نئے محل کی تکمیل یا کسی شاہی باغ کی تیاری کے مرحلے پر پیش کیا جاتا ہے تو اس میں محل یا باغ کی جزئیات و متعلقات کی خوب صورت جھلکیاں اور تصویریں نظر آئیں گی۔ یا اگر ایسا نہیں ہوگا تو اس میں بہار، گرمی، خزاں یا سردی کے موسموں

---

① History of Ottoman Poetry P.85

کی رنگین فلمی تصویریں منعکس نظر آئیں گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر قصیدہ موسم بہار میں پیش ہو رہا ہے تو اس میں بہار کی تصویر کشی نظر آئے گی اور اگر برسات میں پیش ہو رہا ہے تو اس میں برسات کے نقشے ملیں گے۔ یا پھر بادشاہ یا وزیر یا دیگر کسی عہدے پر موجود ممدوح کی تلوار، گھوڑے، ہاتھی یا اس کی مہر شاہی اور مہر خاص وغیرہ کا تذکرہ ہوگا۔ نسیب یا تشبیب میں پھولوں سے متعلق موضوعات کی تفصیلیں بھی ملتی ہیں اور اخلاقی اور فلسفیانہ اپروچ کی جھلکیاں بھی۔

جہاں تک فارسی قصائد کے جزو مدح کا تعلق ہے اس میں بھی ایرانی مزاج کی آرائش پسندی اور نزاکت آفرینی کا گہرا عمل دخل ہے۔ اس میں زبان کی شان و شوکت اور نزاکتوں کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ ایران اور اس کے زیر اثر لکھے جانے والے قصائد میں حقیقت نگاری کے مقابلے میں جذبات اور تخیل کے صناعانہ اظہار کو فوقیت حاصل ہے۔ یہاں مدح میں مبالغہ آرائی کو شعری قدر کا درجہ عطا ہوتا نظر آتا ہے چند فارسی شعرا نے جن میں منوچہری، معزی اور لامعی وغیرہ شامل ہیں عربی قصیدہ کے ابتدائی ڈیزائن کی تقلید میں بھی قصائد سپرد قلم کیے ہیں۔ جوں جوں فارسی قصیدہ گو حضرات پیشہ ورانہ تقاضوں سے مجبور ہو کر قصیدہ نگاری کرتے گئے اس صنف میں تصنع اور بناوٹ کے عناصر دخیل ہوتے گئے۔ فارسی اور عربی قصیدہ نگاری پر مزید مباحث آئندہ باب کی زینت ہوں گے۔

قصیدہ کو غزل کی حدود سے خارج کرنے والا عنصر موضوعاتی تو ہے ہی اس حوالے سے ہیئتی حد بندی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہیئتی حد بندی سے میری مراد تعداد اشعار سے ہے۔ قصیدہ میں تعداد اشعار کے مسئلے نے اس لئے زیادہ اہمیت اختیار کی کہ اس کے بطن سے صنف غزل برآمد ہوئی۔ غزل سے اسے جدا کرنے کے لئے ایک پیمانہ یہ بھی ہے۔ ہمارے لئے اس امر سے انکار ممکن نہیں ہے کہ غزل اور قصیدہ مزاجی اعتبار سے مختلف اصناف ہیں۔ قصیدے کے اجزا کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں اشعار کی تعداد زیادہ ہو۔ چنانچہ عمومی رائے تو یہ ہے کہ قصیدہ میں کم از کم پندرہ اشعار اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں ہونی چاہیے شمس قیس رازی کے خیال کے مطابق قصیدہ کے اشعار کو پندرہ یا سولہ سے زیادہ ہی ہونا چاہیے ورنہ اس کے قطعہ ہو جانے کا اندیشہ ہے

شمس قیس رازی کی عبارت

ملاحظہ ہو "بداں کہ چوں ابیات متکرر شد از پانزدہ و شانزدہ در گذشت آنرا قصیدہ خوانند و ہر چہ ازاں کمتر بود آنرا قطعہ گویند" (۱)

---

(۱) المعجم ص ۱۵۱

جلال الدین ہمائی اصفہانی کا خیال ہے (ترجمہ)

"بعض فارسی شاعروں نے قصیدے کی آخری حد ۱۲۰ اشعار تک
مقرر کی ہے لیکن عرب شعرا نے پانچ پانچ سو شعروں کے بھی قصیدے لکھے
ہیں۔ بعض نے اس کے لئے اکیس اشعار کی حد مقرر کی ہے لیکن ان کی
حد اکثر محدود نہیں" (۱)

زین العابدین موتمن کا کہنا ہے (ترجمہ)

فارسی کے عام قصائد بھی تیس سے پچاس اشعار تک ہیں کبھی
تعداد زیادہ بھی ہو جاتی ہے اور کم بھی۔ شعروں کے کم یا زیادہ ہونے کا
تعلق قصیدے کے موضوع، حال کے تقاضے، حوصلہ اور توانائی پر ہے" (۲)

موید الفضلا میں لکھا ہے قصیدہ

" در اصطلاح فضلا شعر مطول را گویند و تا بیست و یک بیت
را شعر نامند چوں از آں زیادت باشد قصیدہ خوانند" (۳)

فرہنگ نو میں حسن عمید نے قصیدے کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ اس کے اشعار سولہ سے زیادہ ہوں (۴)
باقر آگاہ کے بقول

قصیدہ یتیک [تھوڑا، کتنا ہی کتنا بحوالہ قدیم اردو کی لغت از جمیل جالبی]
ابیات ہیں کہ مطلع رکھیں اور وزن و قافیہ میں متحد ہووں اور بارہ بیت
سے تجاوز کریں۔ اکثر کو اس کی حد نہیں لیکن نزدیک متاخرین کے
مستحسن یہ ہے کہ ابیات اس کی ایک سو بیس سے زیادہ نہ ہوں" (۵)

جوشش عظیم آبادی کا خیال ہے

جس طرح غزل پانچ شعر سے کم نہیں ہوتی اسی طرح قصیدہ اکیس
شعر سے کم کا نہیں ہوتا" (۶)

بحر الفصاحت میں سبحۃ المرجان کے حوالے سے بلگرامی کی رائے مندرج ہے۔ نجم الغنی کا کہنا ہے کہ بلگرامی

"قصیدے کی حد اکیس اشعار تک مقرر کی ہے تاکہ سماعت کی قوت
بے آرام نہ ہو" (۷)

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران از جلال الدین ہمائی اصفہانی ص ۱۵۱ تبریز ۱۳۳۵ ہجری شمسی (۲) تحول شعر فارسی از زین العابدین موتمن ص ۷ چاپ شوق تہران ۱۳۳۵ ہجری شمسی
(۳) موید الفضلا جلد دوم از مولانا محمد لاد ص ۸۶ نولکشور پریس لکھنو (۴) فرہنگ نو از حسن عمید ص ۲۹۲ انتشارات جاوداں تہران
(۵) مضمون رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۱ (۶) دیوان جوشش مقدمہ ص ۴۸ مرتبہ قاضی عبدالودود (۷) بحر الفصاحت ص ۶۸

نسیم اللغات میں قصیدہ کے اشعار کی تعداد ۱۷ سترہ سے زیادہ لکھی گئی ہے [1] میزان الافکار میں کہا گیا ہے کہ قصیدہ کے کم از کم اشعار بارہ یا چھبیس زیادہ سے زیادہ ستر ۔ ایک سو ستر اشعار کے قصیدے بھی دیکھنے میں آئے ہیں عربی قصیدہ گو شعرا نے اشعار کی حد مقرر نہیں کی ۔ فرانسس گلاڈون نے بھی بارہ اشعار سے زاید کی شرط رکھی ہے [2]
اردو میں شاگرد سودا اصلح الدین نے ۸۲۸ اشعار کا قصیدہ لکھا ہے شاطر مدراسی نے ۱۳۹۶ اشعار کا
اور ابھی تک ملنے والے طویل ترین اردو قصیدہ کے اشعار کی تعداد ۲۲۳۵ ہے یہ کنور حسین مضطر لکھنوی کا
لکھا ہوا ہے اس کا نام روضۃ الشہدا ہے ۔

مذکورہ بیانات میں سے بعض سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل اور قصیدہ کا فرق محض تعداد اشعار کا
فرق ہے ایسا ہرگز نہیں ہے کہ قصیدے اور غزل کا فرق موضوعاتی بھی ہے اور تکنیکی بھی ۔ قصیدہ میں موجود
بیانیہ اور مدحیہ حصص بھی اسے غزل سے جدا کرتے ہیں اور تکنیکی اجزا بھی ۔ طویل ترین اور مختصر ترین
قصائد کی موجودگی کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قصیدہ کے اشعار کی تعداد کم از کم بارہ ہونی
چاہیے اور زیادہ سے زیادہ کی حد بندی نہیں کی جا سکتی ۔ اسے موضوع کے پھیلاؤ اور شاعر کی صوابدید
پر چھوڑا جائے ۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ قصیدہ میں ہیئت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ مسدس،
مخمس، قطعہ، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی یا کسی اور غیر غزلیہ ہیئت میں لکھی گئی نظموں کو مدحیہ نظمیں
تو کہا جائے گا ۔ صنف قصیدہ کی حدود میں انہیں شامل نہیں کیا جا سکتا ۔ قصیدہ کے پہلے شعر کے دونوں
مصرعوں کا اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعوں کو ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہونا ضروری ہے ۔ عربی
شعرا مقفیٰ قصائد کو مرغوب رکھتے تھے ۔ لیکن فارسی قصیدہ نگاروں نے اس میں ردیف کو شامل کر کے
اس صنف کی مشکل پسندی میں اضافہ کیا ہے ۔ اردو میں قصیدہ چونکہ فارسی کے تعلق سے پہنچا ہے اس
لئے اس میں مقفیٰ قصائد کے ساتھ ساتھ ردیفوں کے حامل قصائد بھی کثرت سے دستیاب ہیں ۔
علاوہ ازیں قصیدہ کی خصوصی ہیئت کو بھی اردو شاعروں نے مکمل طور پر قبول کیا ہے ۔ قصیدہ کن اجزا
کا مجموعہ ہے ۔ ان اجزا کے کیا تقاضے ہیں اس پر اظہار خیال کیا جاتا ہے ۔

---

(1) نسیم اللغات ص ۸۵۵ شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی

(2) [Dissertions on the Rhetoric, Prosody and the Rhyme of The Persians. By Francis Gladwin
مطبوعہ کلکتہ
See Qasida P. 2
Reprinted, London 1801

فصل دوم

قصیدہ کے اجزا

قصیدہ کے اجزا پر اظہار خیال سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے زمانی پھیلاؤ اور مکانی تنوع کو بھی ملحوظ نظر رکھیں۔ اس صنف کا زمانی پھیلاؤ عہد جاہلیہ کی عربی شاعری سے لے کر عہد نو کی اردو شاعری پر محیط ہے۔ عرب، مصر، سپین، ایران، ترکی اور ہندوستان و پاکستان میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ یوں مکانی تبدیلیوں نے بھی اس کے مزاج کی ساخت میں اہم کردار ادا کیا۔ مذکورہ علاقوں کے تہذیبی، ثقافتی، علمی اور احوالاتی اثرات نے اسے متاثر کیا۔ عربی مزاج کی استقرائیت اور ایرانی اور ہندوستانی مزاج کی استخراجیت اور باریک بینی، ترکی مزاج کی ترکمانیت اور شکوہ وغیرہ کے اثرات صنف قصیدہ میں مجموعے کی صورت میں موجود ہیں۔ قصیدے کی ظاہری صورت کی ہیئتی مماثلت کے باوجود ہر زمانے اور ہر علاقے میں اس کی داخلی، فکری اور جذباتی صورتیں تغیر آشنا رہی ہیں۔ یہ تاریخی پھیلاؤ اور سماجی ارتقا کا ثمرہ ہے۔ یوں ہم قصیدہ کی داخلی ساخت کو جامد قرار دیتے ہوئے بھی اس میں رد و بدل کی چند گنجائشوں سے دامن نہیں بچا سکتے۔ گزشتہ صفحات میں ہم گب کا بیان تو پڑھ ہی چکے ہیں جس میں اس نے ترکی قصیدہ کے لئے صرف دو اجزا کو ضروری قرار دیا ہے ① نسیب ② مقصد[1] بعض قصائد ایسے بھی ملتے ہیں جن میں قصیدے کے تین اجزا ہی نظر آتے ہیں ① تشبیب ② گریز ③ مدح[2] عمومی خیال یہ ہے کہ قصیدہ کے چار اجزا ہوتے ہیں ① تشبیب ② گریز ③ مدح ④ دعا۔ دعا کے ساتھ حسن طلب کو جو تقاضری سمجھا جاتا ہے، اردو، فارسی اور عربی میں ایسے قصائد بھی نظر آجاتے ہیں جو محض دو اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں (گب کی تعریف کے مطابق) یہ خطابیہ قصائد کہلاتے ہیں۔ ان میں تشبیب اور گریز کے اجزا کو شامل نہیں کیا جاتا۔ جن قصائد میں تشبیب اور گریز وغیرہ کے اجزا موجود ہوتے ہیں وہ تمہیدیہ قصائد بھی کہلاتے ہیں۔ محض مدحیہ مضامین پر مشتمل قصائد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے قصائد کے لئے ضروری ہے کہ ان کی ہیئت قصیدے کی ہو۔ ذیل میں قصیدہ کے اجزا کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے

[تشبیب]

تشبیب یا تمہید : تشبیب کے لغوی معانی ایام شباب کے احوال کا تذکرہ، محبوب کی صفت اور آتش افروختن (آگ بھڑکانا) کے ہیں[3] اور تمہید کا مطلب لغت نویسوں نے فرش بچھانا لکھا ہے۔ ان

---

① History of Ottoman Poetry p84 ③ فرہنگ آصفیہ جلد اول ص ۶۲۷

② دائرۂ المعارف اسلامیہ باب قصیدہ (ص ۲۸۵) میں درج ہے کہ قصیدہ میں تین اجزا لازمی ہیں

معانی پر غور کرنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تشبیب میں شباب اور اس کے متعلقات کا تذکرہ بھی ہو سکتا ہے۔ حسن و عشق کے کوائف بھی رقم ہو سکتے ہیں۔ ان موسموں اور داخلی کیفیتوں کا بیان بھی ممکن ہے جن سے سینہ آتشکدہ بن جاتا ہے۔ تشبیب یا تمہید میں شاعر کو موضوع کے انتخاب کی مکمل آزادی ہے۔ وہ اس حصے میں بغیر کسی جھجک کے اپنے طبعی جوہر کو کھول سکتا ہے اور جذباتی جولانی کو پیش کر سکتا ہے۔

تشبیب میں عشق و محبت کے واقعات، محبوب کے رموز و احوال، سراپا و عادات کا بیان بھی کیا جاتا ہے۔ اس سے شاعر کا مقصد سامعین اور ممدوحین کے تار جذبات میں ارتعاش پیدا کرنا ہوتا ہے یہ ایک نوع کا نفسیاتی حربہ ہے جو اپنی کشش قوت کی بنا پر دلچسپی پیدا کرنے کا وسیلہ ہے۔ دنیا میں ایسے اشخاص بہت کم ہیں جو مذکورہ انواع کے موضوعات سے اظہار بیزاری کریں۔ محبت اور اس کے متعلقات سے لوگوں کی خصوصی رغبت ہوتی ہے۔ شاعر اس نزاکت سے آشنا ہیں۔ دور کیوں جائیں اپنے اردگرد ہونے والے کسی بھی مشاعرے کا جائزہ لے لیجئے اگر کوئی شاعر اس میں اپنی علمی فضیلت کا اظہار کرتا ہے یا گہرے فلسفیانہ اور باریک نفسیاتی نکات بیان کرتا ہے تو لوگ داد دینے سے گریزاں رہتے ہیں مگر وہ شاعر داد سمیٹ کر لے جاتے ہیں جو حسن و جمال اور عشق و محبت کی کیفیات کو موضوع اظہار بناتے ہیں۔

تمہید یا تشبیب میں منظر نگاری، صورت نویسی اور خیال بافی کے بعد گریز کر کے مدح ممدوح کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل کو فرش بچھانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تشبیب یا تمہید کے لطف کو دوبالا کرنے کے لئے اکثر شعرا نے ممدوح یا موقع محل کی مناسبت اور مطابقت کے حوالے سے موضوعات منتخب کیے ہیں

فارسی اور اردو تشابیب میں شاعر عام طور پر بہار اور اس کے متعلقات کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان میں زمانے کی شکایت بھی نظر آتی ہے، حسن و عشق یا حکمت و فلسفہ کے مختلف پہلو بھی منعکس دکھائی دیتے ہیں شمس قیس رازی نے نسیب اور تشبیب میں فرق ملحوظ رکھا ہے وہ لکھتے ہیں

"جماعتے از ارباب براعت گفتہ اند کہ تشبیب غزلی باشد کہ شاعر
علی الرسم آنرا مقدمۂ مقصود خویش سازد" ①

اس کی وجہ رازی نے یہ لکھی ہے

"بیشتر نفوس را باستماع احوال محب و محبوب و اوصاف مخازلت
عاشق و معشوق باشد طبع ممدوح بشنودن آں رغبت نماید و حواس
را از دیگر مقاصد باز ستاند" ② ——— و نسیب غزلی باشد

---

۱ - ۲ المعجم ص ۳۰۵

که صورت واقعه وحسب حال شاعر بود چنانکه اشعار شعرائے عرب چون
کثیر وقیس و ذریح و مجنون بنی عامر و امثال ایشان که هر یک را با زنی
تعلق قلبی بوده است و آنچه گفته اند عین واقعه صورت حال ایشان است
الا آنکه بیشتر شعرا مخلق بدین فرق التفات نه نموده اند و هر غزل که
در اول قصائد بر مقصود شعر تقدیم افتد از شرح محبت و ایام شباب و شکایت
نعاست فراق و وصف دمن و اطلال و نعت ریاح و ازهار و غیر آن
آنرا نسیب و تشبیب خوانده اند و نسیب در اصل نعت صفت جمال محبوب
و شرح احوال عشق و محبت است و حکایت حال عاشق با معشوق" (۱)

تشبیب اور نسیب کی یہ بحث محض تلاش نزاکت ہے۔ اس حوالے سے نجم الغنی کا کہنا ہے

"اہل تحقیق کے نزدیک تشبیب شباب کا حال بیان کرنے اور معشوق
کی صفت کرنے کے معانی شباب سے متعلق ہے۔ نسیب بھی غزل کہنے اور عورت کے جمال
کی صفت کرنے کے معانی میں ہے اور شاعروں کے نزدیک تشبیب اور نسیب ان ابیات
کا نام ہے جو قصیدے میں تمہید کے طور پر مدح یا ہجو سے پہلے لکھتے ہیں اور شاید
پہلے یہی عادت ہو کہ ان شعروں میں مضمون عشقیہ ہی لکھتے ہوں لیکن اب
اس کی قید نہیں تشبیب عام ہے خواہ حسن و عشق یا اسی طرح کے اشعار ہوں" (۲)

(۳) عابد علی عابد نے اس ضمن میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر شاعر قصیدے کے شروع میں عشق و محبت کے
کوائف رسمی طور پر بیان کرے اور ناز و نیاز پر مبنی تجربات اور واردات کا تذکرہ کرے تو وہ حدیث شباب
کی تظہیر کر رہا ہوگا۔ اسے ہی انہوں نے تشبیب کا نام دیا ہے۔ عابد علی عابد کے نزدیک اس قسم کی تشبیب میں
غزل کا سا خلوص اور اس کی ہمہ گیری و رمزی و ایمائی کیفیت کا ہونا ضروری نہیں۔ اگر شاعر حقیقتاً بیتے ہوئے کوائف کا
تذکرہ کرے گا ان ناز و نیاز کی واردات و تجربات کی تصویر کشی ہی کرے گا جن سے وہ خود گزرا ہے تو اس کے اشعار
کو نسیب کہا جائے گا۔ عابد علی عابد نے شمس قیس رازی کے جس استدلال کی توضیح کی ہے اس کے مطابق
تشبیب میں غزلیہ تجربات و کوائف کا اظہار نسیب ہے اور دیگر مناظر و امور کا تذکرہ تشبیب۔ رمز و ایما
خلوص، اظہار، حقیقی یاد اور عشقیہ کیفیات کے آمیزے سے تیار ہونے والی تمہید نسیبی تمہید ہے اور رسمی
عشق، روایتی خیالات اور تخیلی ناز و نیاز کے معاملات کے حوالے سے لکھی جانے والی تمہید تشبیبی تمہید ہے
اس ضمن میں نجم الغنی کا یہ موقف درست معلوم ہوتا ہے کہ شاعر تشبیب اور نسیب کو تمہیدی اشعار میں
سمجھتے ہیں

---

(۱) المعجم ص ۳۵۵ (۲) بحر الفصاحت ص ۶۹ (۳) اصول انتقاد ادبیات ص ۳۴۲-۳۴۳ مجلس ترقی ادب لاہور
از عابد علی عابد

عربی قصائد کی تشابیب میں جن موضوعات اور خیالات کو قلمبند کیا جاتا تھا یا جس نوع کی داستانِ عشق کا بیان ہوتا تھا۔ فارسی قصائد میں اسے شرفِ قبولیت نہیں ملا۔ عرب سے ایران تک آتے آتے تشبیب کی صورتوں میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عربی قصائد کی عمومی تشابیب میں شاعر ریگزاروں کے مناظر قلمبند کرتے ہیں۔ نخلستان کے اوصاف لکھتے ہیں۔ شجاعت، تفاخر، عصبیت، مہمان نوازی، سخاوت اور ان سے متعلقہ رویوں اور رجحانات کی لفظی تصویریں کھینچتے ہیں۔ قافلوں کی آمد اور روانگی، قدیم تہذیب کی یاد، جنگجو اور عشق زدہ ہیروز کی حکایات اور اسی نوع کا اور بہت کچھ ان میں سموتے ہیں۔ عربی شعرا نے تشابیب میں اپنی سیہ بختیوں، بے بسیوں اور نامرادیوں کی جگر پاش داستانیں بھی سنائی ہیں اور زمانے اور ماحول کے ہاتھوں اپنی زندگیوں کے اجیرن ہو جانے کی کتھائیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی تشابیب خالصتاً عربی مناظر سے تیار ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں موسموں کے اتار چڑھاؤ پر عمدہ بیانیے بھی دیتے ہیں۔ عربی قصیدے کی تشبیب کے ماڈل یا ڈیزائن کی تیاری کا سہرا، قیس، مجنوں، بنی عامر اور کثیر وغیرہ کے سر ہے۔

فارسی قصیدے کے لئے رودکی، سنائی، خاقانی، سعدی، عرفی اور قاآنی وغیرہ نے تشبیبی ماڈل تیار کیا ہے۔ فارسی قصیدہ نگاروں کے ہاں ایرانی موسموں، منظروں اور ماحولوں کی تفصیلی تصویر کشیاں نظر آتی ہیں۔ گل و گلزار کے مناظر کی لفظی تصویریں جوبن پر دکھائی دیتی ہیں۔ ہجومِ رنگ، سیلِ بہار، لفظی نقش و نگار بہت کچھ ان کی تمہیدوں کا حصہ بنا۔ محبوب حسین کی عشقیہ اور نجی زندگی تک شاعروں کے موضوعات میں شامل رہی۔ بادشاہوں، امرا اور سپہ سالاروں کی کشور کشائیوں اور قلعہ شکنیوں کی بابت بھی ہمیں فارسی تشبیبوں میں بہت کچھ ملتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ایران میں عربی تشبیبی ماڈل کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

قصیدے کی ابتدا کے دلچسپ، پرکشش اور موثر ہونے پر اکثر نقادوں اور شاعروں نے زور دیا ہے۔ کسی قصیدے کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ممدوح یا سامع کو مسحور کر سکے۔ ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لئے شعرا تمہیدی حصوں میں نادرہ کاری پر مبنی شعری کمالات دکھاتے ہیں اور ایسے موضوعات منتخب کرتے ہیں جن کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ ممدوح یا سامع کی مسحوری قادر الکلامی کے بغیر ممکن نہیں۔ شاعر تشبیب میں اپنی قادر الکلامی ہی کی بدولت شاعرانہ کمالات دکھا سکتا ہے

تشبیب قصیدے کا وہ جزو ہے جس میں شاعر زندگی کی ترجمانی کا منصب ادا کر سکتا ہے اپنی ذاتی اور اجتماعی صورتِ حال کو موثر انداز سے لفظوں کی زبان عطا کر سکتا ہے۔ ذہنی انتشار، قلبی بے اطمینانی، مزاجی اضطراب اور ماحول کی ہنگامہ آفرینیوں کو موثر الفاظ میں پیش کر سکتا ہے۔

تشبیبیں بہاریہ بھی ہوتی ہیں اور عشقیہ بھی۔ ان میں محفلوں کی رنگینیاں بھی بیان کی جاتی ہیں اور عیش و نشاط کے ماحول کی منظر نگاری بھی ہوتی ہے۔ مے پرستی، باغوں اور راغوں کے مناظر

زمانہ کی گردش، شاعرانہ تعلیاں، خزاں زدگی کے شکوے، صبح، دوپہر، شام اور رات کے منظرنامے، مقدر کے گلے وغیرہ بہت کچھ تشابیب کے بطون میں جمع ہے۔ یہی نہیں بعض شعرا نے فلسفیانہ، الہیاتی اور علمیاتی موضوعات کو بھی ان میں شامل کیا ہے۔ غالب، ذوق اور حکیم سنائی کے بعض قصائد کی تشابیب ان موضوعات کے حوالے سے ہیں

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے تشبیب میں موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے تاہم یہ بھی فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ ان موضوعات کا کیفیت ممدوح یا عمل مدح سے کوئی ربط و علاقہ نہیں ہوتا۔ اہل نقد و نظر کے نزدیک عمدہ تشبیب وہی ہوتی ہے جس میں ممدوح کے کوائف ذہنی و جسمانی کا خیال رکھا جاتا ہے اس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی مناسبت سے اشعار لکھے جاتے ہیں ابن رشیق نے لکھا ہے

" وقال الحاتمی: من حکم النسیب الذی یفتتح به الشاعر کلامه أن یکون ممزوجاً بما بعده من مدح أو ذم، متصلاً به غیر منفصل منه " ①

یعنی حاتمی کا کہنا ہے کہ نسیب کا مدح وذم کے اشعار سے مربوط و متصل ہونا ضروری ہے۔ انشا کے جارج سوم کے قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو اس میں ممدوح کے کلچر، زبان اور ماحول کے حوالے سے بھی متعدد اشعار دستیاب ہیں

تشبیب میں پیش کیے جانے والے خیال اور موضوع کو جتنا زیادہ تخیلاتی پھیلاؤ میسر آئے گا اتنی ہی زیادہ اس کی تاثیر ہوگی۔ جذبے کا پرخلوص اظہار، نئے تلازمات، نادر استعارے، انوکھی شاہداتی تشبیہیں وغیرہ تشبیب کے لطف میں اضافہ کا باعث ہیں۔ کوائف کی بوقلمونی، سوچ کا تنوع، جذبات کی ہمہ جہتی اور مشاہدات کی وسعت وغیرہ کے فنکارانہ اظہار سے اس کا رتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں قصیدے میں منفرد اسلوب کی تشکیل میں بھی ممد ہوتی ہیں

تشبیب کے لئے ادبی حکما کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کے اشعار کو تعداد کے اعتبار سے جزو مدح کے اشعار سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ ابن رشیق نے ایسے قصیدوں کو پر عیب قرار دیا ہے جن میں تشبیب زیادہ ہوتی ہے اور مدح کم رہ جاتی ہے

" ومن عیوب ہذا الباب أن یکثر التغزل ویقل المدیح " ②

ابن رشیق کی مذکورہ شرط خواہ کتنی ہی درست کیوں نہ ہو ہمارے خیال میں اخلاقی یا سیاسی زوال کے شکار ممدوحین جن کی تعریف محض حصول زر کے لئے کی جاتی تھی وہاں اگر شاعروں نے زور بیان منظر نگاری اور وصف نویسی پر صرف کیا ہے اور جھوٹی مداحی کے حوالے سے حصہ مدح میں تشبیب سے کم اشعار

① العمدہ ص ۱۱۱ ② ایضاً ص ۱۱۷

لکھے ہیں تو بہت درست کیا ہے۔ ان پر مذکورہ شرط کا انفاذ ان کے ضمیر کا بوجھ بن سکتا ہے ۔ اردو قصیدہ زیادہ تر ممدوحین کے دورِ زوال ہی سے متعلق ہے ۔ اس میں اگر تشبیب کے اشعار بلحاظِ تعداد مدح کے اشعار سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے ۔ البتہ مذہبی قصائد کی تشابیب کے حوالے سے اس شرط کی اہمیت مسلّمہ ہے ۔ مدحیہ قصائد میں شعرا کو لغویت اور تحسینِ ناحق کی دلدلوں میں زیادہ دیر رہنے سے روکنے کے لئے اس شرط سے گریز ضروری ہے ۔ سلیمان شکوہ کی شان میں انشاؔ نے ذیل کے مطلع کا حامل قصیدہ لکھا ہے

ے صبحدم میں نے جو لی بسترِ گل پر کروٹ
جنبشِ بادِ بہاری سے گئی آنکھ اُچٹ

اس قصیدے کی تشبیب کے اشعار مدح کے اشعار سے تعداد میں زیادہ ہیں لیکن بنظرِ انصاف دیکھیں تو شاہ سلیمان شکوہ کا دور وہ ہے جب ہندوستان میں مسلم حکومتوں پر زوال آگیا تھا ۔ انگریزوں نے بہت سے علاقے فتح کر لیے تھے اور جرأت جیسا شاعر اس عہد کے نوابوں کے بارے میں یہ رباعی کہتا ہے کہ

[رباعی] کہیے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

ایسی صورتِ حال میں انشاؔ اور اس نوع کے ادوار کے دیگر قصیدہ نگاروں کو یہ رعایت ضرور ملنی چاہیے کہ وہ تشبیب کو مدح پر فوقیت دیں ۔ ابنِ رشیق کے مذکورہ اصول کی صداقت اور مصلحت سے انکار ممکن نہیں ہے تاہم شاعروں کے ضمیر اگر مجبوریوں کے عالم میں اپنا دباؤ کچھ کم کر لیتے ہیں تو اس پر اعتراض کرنے کی بجائے ان سے اظہارِ ہمدردی کرنا چاہیے

تشبیب اور مدح کے اشعار کی تعداد میں اعتدال کو قدما نے قصیدے کا حسن قرار دیا ہے ابنِ قتیبہ کا کہنا ہے کہ ایک راجز نصر بن سیار کے پاس خراسان آیا ۔ اس نے مدح میں ایک رجز پیش کی جس کی تشبیب سو اشعار پر مشتمل تھی نصر نے کہا بخدا تو نے کوئی کلمۂ شیریں نہیں چھوڑا اور نہ کوئی لطیف معانی چھوڑے مگر تو نے میری مدح کو تشبیب سے مغلوب کر دیا اگر میری تعریف کرنی چاہیے تو اعتدال اختیار کر (۱)

بسا اوقات تشابیب میں حسن و عشق کے کوائف کی تفصیل منظوم کی جاتی ہے

---

(۱) شعر العرب جلد اول ترجمہ عبدالصمد صارم ص ۲۱

عاشقوں کے احوال کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ عورتوں اور مردوں کے معاملات عشق کا لفظی انعکاس کیا جاتا ہے۔ پرانے مکانات کے نشانات اور کھنڈرات کے حوالے سے جدائی، دوری اور ہجر کے خیالات بیان کیے جاتے ہیں۔ یادِ وصال یار کے حوالے سے آہ و زاری کا سماں پیدا کیا جاتا ہے۔ معشوق اور اس کے مسکن کے حوالے سے لذت آگیں تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ ہوا و ہوس کا نشاط انگیز بیان ہوتا ہے یا اس نوع کی دیگر تفصیلیں پڑھنے میں آتی ہیں۔ ایسے مناظر و کوائف کی وجہ سے قصیدے کی مزاجی متانت اور تہذیب میں خلل پیدا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکماء نے قصیدے میں پیش کیے جانے والے عاشقانہ خیالات کے لئے مہذب اور پروقار ہونے کی شرط عائد کی ہے۔ شعر الہند میں مندرج ہے

"تشبیب میں اگرچہ عاشقانہ اشعار اس لئے جائز کر دیئے گئے ہیں کہ وہ عموماً نشاط انگیز ہوتے ہیں اور ان کو سن کر جو انبساط و انشراح پیدا ہوتا ہے اس کے بعد مدحیہ اشعار کا اثر قلب پر زیادہ پڑتا ہے تاہم شاعر کو یہ خیال ہونا چاہیے کہ وہ خالص غزل کہنے نہیں بیٹھا جس کا جوڑ مدح و ذم کے ساتھ ملنے والا ہے۔ اس لئے اس کو عام عاشقانہ اشعار سے مختلف یعنی متین، مہذب اور باوقار ہونا چاہیے" ①

مولانا عبد السلام کی مذکورہ بالا رائے سے اختلاف ممکن نہیں۔ تاہم یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ دورِ جدید میں جب مغربی ادبیات کے زیر اثر ہمارے شاعروں کی توجہ سادگی اور سہل نگاری کی جانب ہوئی تو اکثر شاعروں کے قصائد کی تشابیب پر غزلیہ مزاج کا غلبہ ہو گیا۔ نئے عہد کے قصیدہ گو شعرائے پرانے عہد کے قصائد کی بلند آہنگ اور شان و شوکت پر مبنی تشابیب سے زیادہ استفادہ نہیں کیا۔ ان کے ہاں منظر نگاری کا انداز جدید نظم میں منظر نگاری کے انداز سے مماثل ہے۔

مذہب اور مذہبی معاملات و شخصیات کی نزاکتیں شعرا کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ مذہبی قصائد میں محتاط انداز اختیار کریں۔ شمس قیس رازی کا قول ہے کہ

"کسے را کہ خدایگان شریعت و پناہ ملت خوانند نسبت مدح او بہ شراب و مستی و صبوح لائق نہ باشد" ②

مولانا عبد السلام ندوی نے بھی لکھا ہے کہ مقدس لوگوں کی شان میں عاشقانہ اور رندانہ تشبیہیں گستاخی و بدتمیزی ہے ③ کعب بن زہیر نے اپنا قصیدہ "بانت سعاد" حضورؐ کے سامنے پیش کیا تھا اور چادر انعام میں حاصل کی تھی اس قصیدے کی تشبیب میں عاشقانہ اشعار موجود ہیں۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ قصائد میں بھی عاشقانہ تشابیب کو روا سمجھا گیا ہے۔ ہم حرف ان کے قصائد کی عاشقانہ تشابیب کی بدولت انہیں

---

① ③ شعر الہند حصہ دوم ص ۳۴۲ ② المعجم ص ۳۸۶

گستاخ اور غیر محتاط قرار نہیں دیے جا سکتے ۔ عاشقانہ تشبیبوں میں اگر تہذیب اور ترفع آمیز عناصر موجود ہیں تو مذہبی قصائد میں ان کی موجودگی پر اعتراض جائز نہیں ۔ ویسے بھی مذہبی قصائد کی گریز میں آنے والے خیالات کی بدولت عاشقانہ تشابیب کا جواز مہیا ہو جاتا ہے ۔ جب شاعر گریز میں اس قسم کی بات کرتا ہے کہ تو نے یہ کیا منظر کھینچے ہیں کہ جن کی وجہ سے ایمان میں خلل پیدا ہو رہا ہے ۔ اب اسے چھوڑ اور اس عظیم مقدس شخصیت کی تعریف کر جس نے دنیا کو تہذیب سکھائی اور اخلاق آشنا کیا " تو اس سے تشبیب میں عاشقانہ اشعار کا جواز مہیا ہو جاتا ہے ۔ ویسے بھی الاعمال بالنیات کے مصداق اگر شاعر گستاخی اور بدتمیزی کی نیت نہیں رکھتا تو اس پر الزام دھرنا مناسب نہیں ہے ۔ اس ضمن میں غالب کا یہ شعر بھی ہمارا رہنما ہے کہ

سہ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی قصائد میں نیت کی حد تک احتیاط برتنے کی ضرورت ہے ۔

جس قصیدے میں تشبیب موجود نہیں ہوتی اسے زیادہ معیاری تصور نہیں کیا جاتا ۔ یہ سر بریدہ قسم کے قصائد ہوتے ہیں

بعض شاعروں نے طویل قصائد لکھے ہیں ۔ ان میں طویل مدحیہ حصے بھی شامل ہیں اگر یہ حصے بے رنگ اور پھیکے ہوں گے تو ممدوح اور سامعین کی توجہ سے محروم رہیں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ طویل مدحیں لکھنے والے شعرا بسا اوقات مدح کے درمیان بھی تشبیب لکھنی شروع کر دیتے ہیں ۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سامع یا شاعر کی اعصابی تھکن دور ہو جائے اور قصیدے کے بوجھل پن میں بھی کچھ کمی واقع ہو ۔ ظہیر الدین بیلقانی اور فلکی شیروانی کے قصائد میں یہ انداز موجود ہے ۔ اکثر شاعر مدح لکھتے ہوئے غزلوں کا استعمال بھی کرتے ہیں ۔ بعض شاعروں نے اسے ہمت کی بات قرار دیا ہے کہ وہ معشوق سے ممدوح کی جانب سفر نہیں کرتے[۱]

سخن عشق حرام است بر آں بیہودہ گوئے + کہ چو دہ بیت غزل گفت مدیح آغازد
حبذا ہمت سعدی و غزل گفتن او + کہ ز معشوق بہ ممدوح نمی پردازد

[گریز]

ابن رشیق نے لکھا ہے کہ قصیدے کی مثال اعضا کے ارتباط و اتصال میں انسانی جسم کی سی ہے ۔ اس لئے جب ایک عضو دوسرے سے الگ یا صحت ترکیب میں اس سے مختلف ہوگا تو جسم میں ایک ایسا عیب پیدا کرے گا جو اس کے تمام حسن و جمال کو برباد کر دے گا ۔ ابن رشیق کے الفاظ یہ ہیں

"فان القصیدۃ مثلہا مثل خلق الانسان فی اتصال بعض
اعضائہ ببعض، فمتی انفصل واحد عن الآخر و باینہ فی صحت
الترکیب غادر بالجسم عاھۃ تتخوّن محاسنہ، وتعفی معالم جمالہ" ①

قصیدے کے کل کی جمالیاتی لطافت کو قائم رکھنے کے لیئے اور اس کے اجزا کو مربوط و متصل کرنے کے لیئے گریز کے اشعار بنیادی اہمیت کے حامل ہیں ۔ رشید الدین وطواط نے اسے حسن التخلص بھی کہا ہے وہ لکھتے ہیں

"این صنعت چناں بود کہ شاعر از غزل یا از معنی دیگر کہ
شعر را بداں تشبیب کردہ باشد بمدح ممدوح آید بوجہی خوب تر و
طریق پسندیدہ تر و در آں سلاست لفظ و نفاست معانی نگاہ دارد" ②

وطواط نے اس ضمن میں متنبی، عنصری اور کمال کے انداز گریز کی مثالیں دی ہیں عنصری کا یہ شعر دیکھیے

؎ کز گلستاں بباد خزاں زرد شد رواست
باید کہ سرخ ماند زر روئے خدا یگاں

گریز تمہید یا تشبیب قصائد کا انتہائی نازک اور اہم حصہ ہے اس کے ذریعے سے دو متضاد و متوازی یا مختلف النوع کیفیات کو ایسے ماہرانہ انداز سے باہمدیگر پیوست کرنا ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کا ذہن جھٹکا نہ کھائے ۔ مولوی سید احمد دہلوی نے گریز کے لغوی معانی کے ضمن میں لکھا ہے

"بھاگنا، بھاگڑ، فرار، دوری، علیحدگی، وحشت، رمیدگی،
رفتگی، اجتناب، پرہیز" ③

قصیدے کے اس حصے کو گریز اسی لیئے کہا گیا ہے کہ اس میں شاعر ایک موضوع سے علیحدگی، اجتناب اور پرہیز اختیار کرتا ہے ۔ دوری، علیحدگی اور رمیدگی کے الفاظ بھی گریز کے مزاج کو ظاہر کرتے ہیں

---

① العمدہ ص ۱۱۱، ۱۱۲ ② حدائق السحر فی دقائق الشعر ص ۳۱ بسرمایہ کتابخانۂ تہران مطبعہ مجلس
③ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص ۵۵ ۔

مولوی سید احمد دہلوی نے یہ بھی تحریر کیا ہے

" قصائد میں اشعار حالیہ یا بہاریہ کے بیان کرتے کرتے ایک
دفعہ ہی حرف فاصل کے لائے بغیر ممدوح کی مدح پر جھک پڑنا یعنی
ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی جانب دوڑ جانا گریز ہے" ①

گریز کو وہ جو آب بھی کہا گیا ہے جو دو سرکش بیلوں کو مجتمع کرتا ہے۔ اسے دو وحشیوں کے ملاپ کا وسیلہ بھی قرار دیا گیا ہے اور وہ پل بھی سمجھا گیا ہے کہ جو دریائے قصیدہ کے دو کناروں کو ملاتا ہے۔ اسے بحر الفصاحت نے تخلص بھی قرار دیا ہے②۔ تخلص ان کے نزدیک وہ مقام ہے جس پر تمہید چھوڑ کر شاعر آغاز مطلب کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے خیال میں اشارہ معقول کیا جاتا ہے۔ گریز دو مختلف موضوعات کو نزاکت اور ہمواری سے متحد کرنے کا منصب سنبھالے ہوئے ہے۔ گریز کے وسیلے سے دو غیر مربوط چیزیں بہ لطائف الحیل باہم پیوستہ ہوتی ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ شاعر پوری مناسبت سے دوسرے مضمون کی جانب رجوع کرے۔ اس میں تشبیب کے بعد کسی تقریب ممدوح کا تذکرہ چھیڑنے کا اشارہ ہوتا ہے۔ گریز تشبیب اور مدح کے درمیان منطقی ارتباط و تسلسل کی اہم کڑی ہے۔ اس کا منصب بے ربط اجزا کو سلیقے سے مربوط کرنا ہے۔ وہ قصیدہ جو گریز نہیں رکھتا مقتضب کہلاتا ہے

قدیم عربی قصائد میں گریز کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی تاہم فارسی شعرا نے اس جزو قصیدہ کی نزاکتوں کا احساس کرتے ہوئے اسے مستقل فن کا درجہ دے دیا۔ قدیم عربی شعرا تمہیدی یا تشبیبی منظر نامہ لکھنے کے بعد بڑے واشگاف انداز سے گریز کرتے تھے مثلاً وہ کہتے تھے "اسے چھوڑ دو" "اس سے باز آجاؤ" "جو کچھ پہلے کہا گیا ہے وہ محض دلچسپی پیدا کرنے کے لئے تھا" وغیرہ اس نوع کے بیانات سے گریز بے سلیقہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس نوع کی عربی گریز تشبیب اور مدح کے درمیان مناسبت رکھنے والی منطقی کڑی نہیں بنتی تھی۔ قاری اور سامع کے ذہن کو جھٹکا لگتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اجزائے قصیدہ کی وحدت مفقود ہوتی نظر آتی تھی۔ اس کی ترکیبی کلیت ضعف آشنا ہوتی تھی۔
مولانا عبدالسلام کا کہنا ہے

" متاخرین شعرائے عرب نے گریز کو لطیف صنعت بنا دیا اور
تشبیب کہتے کہتے مدح کی طرف اس حسن و خوبی سے رجوع کیا کہ بات
سے بات پیدا ہو گئی اور مدح اس کا نتیجہ بن گئی" ③

اس ضمن میں مولانا نے بحتری کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ گریز میں متنبی نے سب سے زیادہ نزاکتیں پیدا کیں

---

① فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص ۴۱۵ ② بحر الفصاحت ص ۷۱
③ شعر الہند جلد دوم ص ۳۲۸

فارسی شعرا نے کچھ تو اپنی طبعی جدتوں اور جودتوں کی بدولت اور کچھ متاخرین شعرائے عرب کی تقلید کے وسیلے سے مرحلۂ گریز خوش سلیقگی سے طے کرنے کی روایات قائم کی ہیں۔ خاقانی اور قاآنی کے قصائد میں گریز کی حسن وخوبی مسلمہ ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔ ان کی گریز کی بدولت قاری کو تشبیب اور مدح کے درمیان فاصلے کا احساس نہیں ہوتا۔

عمدہ گریز کے لئے ضروری ہے کہ ان سے معلوم ہو کہ شاعر بڑی بے تکلفی اور سہولت سے مرحلۂ مدح میں داخل ہو گیا ہے۔ گریز کا حصہ شاعر کی قدرتِ اظہار کے لئے کڑی آزمائش پر مبنی ہے۔ اگر گریز میں لطافت، نزاکت اور نفاست کی تاثیر ہوگی تو ممدوح کو مسرت حاصل ہوگی۔ گریز کا جامع اور مختصر ہونا اس کے فنی حسن کا تقاضا ہے۔ بعض شاعروں نے ایک شعر سے بھی گریز کیا ہے بعض نے اس میں ایک سے تین اشعار تک سے کام لیا ہے۔ تاہم اچھے شاعروں کے ہاں طوالت کی حامل گریز بھی دکھائی دیتی ہے۔ سودا نے آصف جاہ نظام الملک کی مدح میں لکھے گئے اپنے ایک قصیدے میں طویل مکالمے کی مدد سے بھی گریز کیا ہے

حامد علی عابد نے شمس قیس رازی کے ایک بیان سے مکمل ہم آہنگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گریز کی قبیح ترین صورت یہ ہے کہ نسیب سے مدح کی جانب یوں جائیں کہ یوں معلوم ہو کہ محبوبہ کے حاصل کرنے میں ممدوح سے استعانت چاہتے ہیں ①

یہ عیب ان قصائد کا تو ہو سکتا ہے کہ جن کے تمہیدی حصوں میں معاملاتِ حسن وعشق کا بیان کیا گیا ہو لیکن ایسے قصائد جن میں منظر نگاری اور دیگر امور کی تفاصیل ہوں ان میں گریز کے عیوب اور نوعیت کے ہوا کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اس طرح گریز کیا جائے کہ تشبیب اور مدح کے درمیانی طویل فاصلے کا احساس ہو، تکلف اور آورد کا احتمال گزرے یا پھر مرتبۂ ممدوح سے گریز کی مناسبت نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

---

① اصول انتقادِ ادبیات ص ۲۹۰

[مدح]

قصیدہ کا تیسرا اہم جزو مدح ہے۔ یہ جزو ستائش و توصیف پر مبنی ہے۔ اسے قصیدہ کی روح بھی سمجھا جاتا ہے۔ رشید الدین وطواط مدح کے بارے میں لکھتے ہیں

"ایں صنعت چناں بود کہ شاعر ممدوح را بصفتی از صفات حمیدہ بستاید۔ چنانکہ صفتی دیگر از صفات حمیدہ اورا در آں ستائش یاد کرد ستودہ او را بدو وجہ [مدح] حاصل آید" (۱)

سید احمد دہلوی نے مدح کے معانی بعفش کے بھی لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ مدح وہ نظمیہ تعریف ہے جو کوئی شاعر قصیدے کے طور پر اپنے ممدوح کے حق میں لکھتا ہے۔ (۲)

مدح میں قصیدہ گو شعرا ممدوح کے مقام اور مرتبے کی نسبت سے اس کی شان و شوکت، جاہ و جلال، مقام و مرتبت، مال و زر، شرافت اور بزرگی، شجاعت و عدل، عفت و قناعت، خدا ترسی و راست بازی، سخاوت و مروت، خلق و مہمان نوازی اور علمیت و قابلیت وغیرہ کو موضوع اظہار بناتا ہے۔ اس کی عبادت، حیا، حلم، بردباری، خودداری، حمیت، فیض و برکت، مکاشفے اور کرامات وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔ ممدوح کے ہاتھی، گھوڑے، تلوار، فوج، دیگر ہتھیار وغیرہ کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی کرم نوازیوں اور دریا دلیوں کی حکایات بھی سناتا ہے مذہبی ہستیوں کی مدائح میں مقبروں، مدفنوں اور مقامات مقدسہ وغیرہ کی تعریف بھی کی جاتی ہے

محمد نجف علی خاں رقمطراز ہیں کہ مدح میں ممدوح کی صفات

"اول ضمیر غائب سے بیان کریں بعد اس کے خطاب کر کے چند ابیات ممدوح کی تعریف میں لکھیں ——— ممدوح کے مرتبے کا لحاظ رکھیں۔ اگر ممدوح سلاطین اور امرا میں سے ہو تو اس کے مناسب الفاظ سنجیدہ لکھے جائیں اور اگر انبیاء، اولیاء، مشائخ اور علماء میں سے ہوں تو جو کلمات اور اصطلاحات ان کی شان کے لائق ہوں استعمال کیے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ محاورہ میں جو کلمات حمد و نعت و منقبت میں لکھے جاتے ہیں وہ سلاطین اور امراء کی مدح میں لکھے جائیں ایسے ہی برعکس اس کے اس باب میں تمیز شرط ہے" (۳)

---

(۱) حدایق السحر ..... ص ۳۵ (۲) فرہنگ آصفیہ ص ۲۱۲ (۳) احسن القواعد محمد نجف علی خاں مطبع مجتبائی دہلی ص ۱۹۳

مدح میں ممدوح کے کن اوصاف کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ ابنِ قدامہ نے اس حوالے سے چار ایسے بنیادی رنگ فراہم کیے ہیں جن کی باہمی آمیزش سے مدح کے کینوس پر دیگر کئی رنگ بکھر جاتے ہیں۔ ابن قدامہ عقل۔ شجاعت، عدل اور عفت کو انسان کے اساسی اوصاف کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کے بقیہ اوصاف یا تو انہی چاروں کا جزو ہیں یا پھر ان کی ترکیبی آمیزش سے ظہور پذیر ہوتے ہیں عقل علم و حلم سے بھی متعلق ہے اور حیا، سیاست اور قابلیت سے بھی۔ شجاعت کا ربط حمیت، مدافعت اور ہیبت وغیرہ سے ہے۔ عدل کی شاخوں پر نرمی، فیاضی اور مہمان نوازی کے پھول کھلتے ہیں۔ عفت کو قناعت اور پاکدامنی کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ابن قدامہ نے عقل و شجاعت کی ترکیب کے نتیجے میں صبر و وفا کے اوصاف طلوع ہوتے دیکھے ہیں۔[1]

ابن قدامہ نے اپنے اساسی اوصاف کے مذکورہ نسخے سے جہاں قارئین کو بہت سی مشکلوں سے نکالنے کی کوشش کی ہے وہاں انہیں کئی اور نوع کی الجھنوں سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی اوصاف کے بے کنار گہرے سمندر میں سے چند قطرے ہتھیلیوں پر سجا کر یہ دعویٰ کرنا کہ سب کچھ انہی قطروں میں پوشیدہ ہے ماورائی منطق کا شاخسانہ تو ہو سکتا ہے حقیقی منطق سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہر انسان منفرد ہے اور اپنی صورت و سیرت کے اعتبار سے بھی دوسرے انسانوں سے مختلف ہے۔ جدید نفسیات نے انسان کے اندر پرورش پانے والے ان گنت پراسرار، الوکھے رجحانات کی نشاندہی کی ہے۔ ابن قدامہ کے طے کردہ اساسی انسانی اوصاف زمان و مکاں کے نئے منظر ناموں میں شاید اساسی نہیں رہے۔ جدید صنعتی اور سائنسی سماج میں نئے قسم کے انسانی اوصاف اہم ٹھہرے ہیں۔ عقل کی جگہ مشین، شجاعت کی جگہ ایٹم و ہائیڈروجن بم، عدل کی جگہ نئے صنعتی تعیشات اور عفت کی جگہ لوٹ مار اور برہنگی نے لے لی ہے۔ ابن قدامہ کا خیال ہے کہ مدح میں صرف اساسی اوصاف ہی سے کام لینا چاہیے اگر تو ان کے خیال میں انسانی شخصیات کے دریا انہی کوزوں میں بند ہیں تو بھی قصیدہ نگار جزو مدح میں یکسانیت سے اپنا دامن نہیں بچا پائیں گے۔ البتہ اگر اس امر کو تسلیم کر لیا جائے کہ مدحیہ قصائد میں انفرادی شخصی خوبیوں کی بجائے ایسی مجموعی خوبیوں کا تذکرہ ہونا چاہیے جن سے کوئی نظام معاشرت یا سلطنت فیض یاب ہوتا ہے تو ہم ابن قدامہ کے اساسی اوصاف قبول کر سکتے ہیں۔ تاہم انسان کی شناخت کا اصل فارمولہ یہ ہے کہ ہر انسان الگ فطرت کا حامل ہے اور قصائد میں حقیقی شخصیت کی تصویر کشی کے لیے انفرادی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

(1) شعر الہند حصہ دوم ۳۱۴

ابن قدامہ کے کہنے کے مطابق مختلف طبقوں، رتبوں اور حیثیتوں کے حوالے سے بھی انسانی اوصاف میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدح میں ممدوحین کے طبقے، رتبے اور حیثیت کے مطابق ہی تعریف و توصیف ہونی چاہیے۔ انہوں نے میر منشی، وزیر، سپہ سالار، قاضی اور جج، معمولی متمدن پیشہ ور شہری باشندے سب کی مدح کے لئے الگ الگ اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ اوصاف مدح میں واضح، شاندار اور باوقار انداز میں ظاہر ہونے چاہییں۔ ابن قدامہ مدح میں اختصار کے قائل نہیں تھے۔ تاہم ان کا یہ کہنا ہے کہ بادشاہوں کی شان میں لکھے جانے والے قصائد میں طوالتِ بیان سے اجتناب کرنا چاہیے۔

مولانا عبدالسلام نے ابن قدامہ کے مرتب کردہ اساسی انسانی اوصاف اور ان کی ترکیب سے تیار ہونے والے دیگر اوصاف کے علاوہ بھی چند اور اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ کہہ کر کہ ابن قدامہ ان اوصاف کے بیان کو صحیح نہیں سمجھتا وہ کہتے ہیں

"ان فضائل و محاسن کے ساتھ قصائد میں ممدوح کے بعض
خارجی، اضافی اور مادی اوصاف مثلاً حسن و جمال، جاہ و جلال
اور حسب نسب وغیرہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے" (۱)

ابن رشیق نے ابن قدامہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن قدامہ کو صرف اس قدر کہنا چاہیے تھا کہ فضائل نفسانی کے ساتھ مدح کرنا زیادہ اشرف اور زیادہ صحیح ہے لیکن ان کے علاوہ اور اوصاف کا یک لخت انکار کر دینا تو میرے خیال میں کوئی شخص اس معاملہ میں ان کی تائید نہیں کر سکتا۔ اگر ان فضائلِ نفسیہ پر عرضی اور جسمانی فضائل مثلاً حسن، رونق، جسمانی طاقت، دولت مندی اور کثرتِ خاندانی کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو یہ اور بہتر ہے۔ (۲)

مذہبی قصائد کے حوالے سے تو مدح میں مبالغے، غلو اور اغراق کی انتہائی صورتوں کو سارے نقادوں نے شرفِ قبولیت بخشا ہے۔ تاہم وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اگر ممدوح برائے نام بادشاہ ہو اور حقیقی قدرت و اختیار نہ رکھتا ہو تو مدح کا ناجائز اغراق میں تبدیل ہو جانا لازمی ہے۔ ایسے موقعوں پر نکتہ سنج شاعر غالب کی طرح تشبیب کی دلپذیری کا زیادہ خیال رکھتے ہیں (۳)

عابد علی عابد نے صاحب دبیر عجم کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ مدحیہ قصائد میں کم سے کم ان صفات کا تذکرہ تو ہونا چاہیے جن سے ممدوح کو متصف ہونا چاہیے تھا۔ یہ طریق کار انتہائی موثر ہے کہ یوں ممدوح کی مدح کا منصب بھی ادا ہو جاتا ہے اور شاعر کا پیغام بھی اس تک پہنچ جاتا ہے۔

۱-۲ شعر الہند ص ۳۴۲ (۳) اصول انتقادِ ادبیات ص ۱۵۹

[حسنِ طلب، دعا]

دعا قصیدہ کا چوتھا جزو ہے۔ عابد علی عابد[1] نے مقطع اور حسنِ طلب کو بھی اس جزو میں شامل کیا ہے۔ شاعر مدح کے بعد ممدوح کے حق میں دعا مانگتا ہے۔ یہ قصیدہ کا اختتامی حصہ ہے۔ اگر شاعر کے ذہن میں کوئی مقصد ہو یا اسے کسی چیز کی طلب ہو تو وہ اس کے حوالے سے بھی اس حصے میں کچھ اشعار شامل کر دیتا ہے۔ دعا مشروط بھی ہوتی ہے اور غیر مشروط بھی۔ مشروط اس لحاظ سے کہ اس میں کوئی شرط عائد کی جاتی ہے مثلاً یہ کہ "جب تک زمین و آسماں قائم رہے اے بادشاہ ترا رتبہ بھی بلند رہے یا ترا اقبال قائم رہے" اگر دعائیہ اشعار میں اس نوع کی شرط عائد نہ کی جائے تو وہ غیر مشروط کہلاتے ہیں۔ ممدوح کی درازیِ عمر اور اس کے جاہ و جلال کے قائم رہنے کی دعا تقریباً ہر مدحیہ قصیدے میں دستیاب ہے۔

جہاں تک حسنِ طلب کا تعلق ہے یہ ضروری ہے کہ شاعر ایسا موثر پیرایہ اختیار کرے کہ ممدوح مسحور ہو کر اس کی عرضداشت کو شرفِ قبولیت بخشے۔ اس مرحلے میں کامیاب ہونے کے لئے شاعر لفظی افسوں کاری اور جادو بیانی سے کام لیتا ہے۔ حسنِ طلب کے اشعار کی عمدگی کی یہ دلیل بھی ٹھہری ہے کہ ہرچند ممدوح بخیل ہو لیکن وہ ان اشعار کی تاثیر سے بلند ہمت اور سخی ہونے پر مجبور ہو جائے شاعر کو اپنے ممدوح پر افسوں چلانا پڑتا ہے۔

قصیدے کے آخری اشعار کو قصیدے کی جان کہا گیا ہے۔ جس طرح قصیدہ کے پہلے شعر کی خوبی اس امر میں مضمر ہے کہ وہ ممدوح پر تنویمی حالت طاری کر دے اسی طرح مقطع، آخری حصہ یا شعر بھی ایسی ہی تاثیر سے مزین ہو کہ ممدوح کے حافظے کا حصہ بن جائے۔

دعا کے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہونی چاہیے، دو، تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ اشعار کی گنجائش دیکھنے میں آتی ہے۔ قصیدے کے ابتدائی عہد میں دعا میں سادگی اور براہِ راست انداز کا غلبہ تھا تاہم جب اس صنف میں صنائعی اور فنی باریکیوں پر زور دیا جانے لگا تو دعائیں بھی پر تکلف اور نزاکت آمیز ہو گئیں۔ بعض قصیدہ نگاروں نے دعا پر قصیدے کے خاتمے سے گریز کیا ہے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دعا کو ضعیف لوگوں سے مختص جانتے تھے۔ ہمارے خیال میں دعا انسان کی داخلی ضرورت ہے اس میں ضعف و توہم کا عمل دخل نہیں ہے۔ بادشاہ اور امرا قصیدے کے دعائیہ حصے کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ اس میں ان کے لئے خیر و برکات اور استحکام و اجلال کی گدائی ہوتی تھی۔ دعا کے ضمن میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اسے قصیدہ کا باقاعدہ حصہ ہونے کی بجائے مدح ہی کا ایک جزو ہونا چاہیے۔ اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ مدح ہی کے ضمن میں ایک آدھ

---

(۱) اصول انتقادِ ادبیات ص ۱۶۴،۱۵

دعائیہ شعر کہہ کر قصیدے کو ختم کیا جائے ۔ اس قسم کے دعائیہ شعر کے لئے بے ساختگی شرطِ اول ہے
ابن رشیق نے اس امر پر زور دیا تھا کہ قصیدہ کا خاتمہ بھی قصیدہ کا ایک رکن ہے
چونکہ اس کا تعلق اخیر سے ہے اس لئے اسی کی صدا کانوں اور حافظے میں رہ سکتی ہے ۔ اس کے
لئے ضروری ہے کہ خاتمہ اس قدر محکم ہو کہ اس پر اضافہ ممکن نہ ہو ۔ اور یہ بھی کہ اس کے بعد اس
سے بہتر شعر کی گنجائش نہ رہے ۔ ابن رشیق نے پہلے شعر کو خاتمہ کی کنجی قرار دیتے ہوئے
، یہ بھی لکھا ہے کہ آخری شعر اس کا قفل ہے ۔" (۲)

---

(۱) العمدہ ۱۱۸

فصل سوم

[چند مزید معروضات]

قصیدہ یا غزل کے پہلے شعر کو کہ جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوتے ہیں مطلع کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ قصیدہ کے مطلع کے لئے ضروری ہے کہ وہ اتنی متقاضیانہ کشش رکھتا ہو کہ ممدوح، قاری یا سامع اپنی دیگر تمام ذہنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر قصیدہ کے اشعار کی جانب متوجہ ہو جائے۔ رشید الدین وطواط نے اسے ایک شعری صنعت قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں

" ایں صنعت چناں باشد کہ شاعر جہد کند تا اول بیت از قصیدہ مطبوع و مصنوع و لفظ لطیف، معنیٔ غریب و بدیع آورد از کلماتی کہ بفال نیک باشد احتراز کند، چنانکہ سمع را از شنیدن آں راحت آید و طبع را از دریافتن آں نشاط افزاید "①

قصیدہ گو شاعر کو مطلع کہنے کے لئے اپنا پورا زورِ طبع صرف کرنا پڑتا ہے۔ پوری شاعرانہ مہارت اور ریاضت بھرے انہماک سے کہے گئے مطلع کو سن کر ممدوح یا سامع کی طبیعت میں مسرت و سرخوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ بے اختیار ہو جاتا ہے اس کے قلب پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اسے باقی قصیدہ سنے بنا چین نہیں آتا۔ قصیدوں میں ایک سے زیادہ مطالع بھی نظر آتے ہیں مطلع خواہ قصیدہ کی ابتدا میں آئے یا اس کے کسی اور جزو کے آغاز میں اسکا پر زور اور مطبوع و مصنوع ہونا ضروری ہے۔ جس قصیدے میں زیادہ مطلعے ہوتے ہیں انہیں ذوالمطالع یا ذات المطالع بھی کہتے ہیں۔ قصیدوں میں دو یا دو سے زیادہ مطلعوں کی کئی وجوہات ہیں ہیں۔ بنیادی وجہ تو قصیدہ کی طوالت ہے یعنی شاعر جب دیکھتا ہے کہ قصیدہ طویل ہو رہا ہے اور قوافی تنگ ہو رہے ہیں تو وہ نئے سرے سے مطلع لکھتا ہے یوں اس کے لئے استعمال شدہ قوافی کے استعمال کی گنجائش نکل آتی ہے۔ علاوہ ازیں قصیدے کی طوالت سامع یا قاری کو اکتاہٹ یا تھکن کا احساس دلا رہی ہوتی ہے اچانک نئے مطلع کی آمد سے یہ احساس زائل ہو جاتا ہے۔ قصیدہ کے درمیان غزلیں لکھنے کے رواج نے بھی ایک سے زائد مطالع کی راہ ہموار کی ہے۔ قصیدے میں نئے مطلع کے داخلے کا موضوعاتی جواز بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شاعر پہلے سے ادا کردہ موضوع کو ختم کر کے نئے موضوع کی جانب رخ کرتا ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیے کے حروف کا توافق بھی مطلع میں بلحاظ آہنگ جان پیدا کرتا ہے۔ مطلع کے بارے میں یہ بھی لازمی ہے کہ وہ لفظوں اور ترکیبوں کی پختگی، تزئین و تاثیر، لفظ و معانی اور موضوعاتی تطبیق کے اعتبار سے

---

① حدائق السحر.... ص ۳۰

قصیدہ کے دیگر اشعار سے بلند ہو۔

اگر شاعر اپنے ذہن میں سب سے پہلے آنے والے مضمون کو کسی بیت کی صورت عطا کرے اور اسی پر قصیدہ کی بنیاد رکھے تو وہ بیت القصیدہ ہے۔ عمومی رائے یہ ہے کہ قصیدہ کے سب سے عمدہ شعر کو بیت القصیدہ کہا جائے گا۔

جہاں تک اوزان و بحور کا معاملہ ہے قصیدہ کیا کسی بھی صنف شعر میں ان کا انتخاب موضوع اور اس کے کوائف کے مطابق ہی ہوا کرتا ہے عمدہ قصیدہ گو شعرا اس امر کا خصوصی خیال رکھتے تھے کہ انہوں نے جس نہج کے موضوع کو منظوم کرنا ہے وزن اور بحر اس کے لیے رکاوٹ نہ بنیں۔

[قصیدہ میں نام اور عنوان]

ہم اکثر پڑھتے یا سنتے ہیں "فلاں شاعر نے اپنے قصیدہ بائیہ میں، فلاں نے لامیہ میں فلاں نے رائیہ میں یہ لکھا ہے" یا فلاں شاعر نے اپنے قصیدہ "باب الفردوس" میں یہ بیان کیا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ کسی قصیدہ کو بائیہ، لامیہ یا رائیہ کیوں کہا گیا ہے یا اس کا خصوصی نام کیوں رکھا گیا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ جب قصیدہ کے آخر میں حرف روی اسطرح آئے کہ اس کے بعد ردیف کا امکان نہ ہو تو اس سے بھی قصیدہ موسوم ہو جاتا ہے جیسے قصیدہ جیمیہ یا نونیہ وغیرہ اس سے مراد یہ ہے کہ جیم یا نون کی روی والے قصائد۔ اسی طرح اگر قصیدہ میں روی الف ہے تو وہ الفیہ قصیدہ کہلائے گا۔

جہاں تک قصیدے کے عنوان یا لفظی نام کا تعلق ہے تو یہ رتبے کے اعتبار سے بھی رکھا جاتا ہے۔ نظمیہ عنوان کے طور پر بھی اور تاریخی نام کے طور پر بھی، مثلاً انشا کے ایک قصیدے کا نام طور الکلام ہے سودا نے بحر بے کراں، باب الجنت اور تضحیک روزگار وغیرہ کے ناموں سے قصائد لکھے ہیں۔ فارسی شعرا بھی اکثر اپنے قصائد کا نام رکھ دیا کرتے تھے مثلاً امیر خسرو نے اپنے ایک قصیدہ کا نام بحر الابرار رکھا ہے۔ عربی میں بھی قصائد کے نام رکھے جاتے تھے بانت سعاد، قصیدہ بردہ وغیرہ

بعض قصیدہ نگاروں نے اپنے قصائد پر نظمیہ عنوانات بھی دیئے ہیں مثلاً محسن کاکوروی نے اپنے مشہور لامیہ قصیدہ کا نام مدیح خیر المرسلین رکھا۔ اسماعیل میرٹھی نے جریدۂ عبرت اور عزیز لکھنوی نے شمع حرم کے عنوانات سے قصائد لکھے ہیں۔ عزیز لکھنوی نے اپنے ہر قصیدے کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا تھا مثلاً مرات الصفا، عطر عروس، آئینہ عبرت، چراغ کعبہ، زلال غدیر سبحۂ نور، الماس ریزہ، کاشف الحقائق، یاقوت احمر، عقد پروین وغیرہ،

[قصیدہ کی قسمیں]

قصیدہ کی ہیئت اپنے دامن میں رنگا رنگ موتیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ صنف ہزار سو برس سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ ان صدیوں میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو شاعروں نے بے شمار قصائد لکھے۔ قصیدہ گو شعرا مختلف مزاجوں، خیالوں اور وابستگیوں کے حامل ہی نہیں ہیں مختلف علاقوں اور زمانوں سے بھی مربوط ہیں۔ ایسے میں صنفِ قصیدہ میں تہذیبی، موضوعاتی اور لسانی تنوع کا پیدا ہو جانا امرِ لازم تھا۔ ابتدائی عربی قصائد میں دورِ آغاز کے شاعروں نے اپنے پھیلے، بکھرے اور مشاہدہ شدہ خیالات کو اس ہیئت کے بطن میں سمیٹا۔ اپنے جذبوں اور عصبیتوں کو بھی آہنگ کی زبان عطا کی۔ یوں قصیدے کی ہیئت میں طویل نظمیں وجود میں آئیں۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں مندرج ہے

> "قدیم زمانے میں ایسی نظمیں بھی کہی جاتی تھیں جنہیں یوں تو قصیدے ہی کہا جاتا تھا لیکن ان میں قصیدے کا اہم ترین حصہ یعنی مدح یا ہجو نہیں ہوتی تھی۔ ایسی مثالیں ہمیں عمر بن ابی ربیعۃ اور الطرماح کے بعض قصائد میں ملتی ہیں" (۱)

عربی، فارسی اور اردو شعر و ادب کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ قارئین کو باور کرا دے گا کہ ان السنہ کے شاعروں اور ادیبوں نے زندگی کے ان گنت گوشوں کو اپنے لفظوں کے دائرۂ اختیار میں سمیٹا ہے۔ قصیدہ بھی اس عمل سے منفک نہ رہ سکا۔ اس میں بھی رنگارنگی پیدا ہوئی، بوقلمونی آئی روایتی اور عصری موضوعات کے متنوع ذخائر جمع ہوئے۔ ہر عہد اور ہر علاقے کی تہذیبی، سماجی اور احوالاتی زندگی کی جھلکیاں اس کا حصہ بنیں۔ شاہوں، وزیروں اور امیروں کی شان میں لکھے جانے والے اشعار مدحیہ قصیدہ ٹھہرے۔ خدا کی شان میں لکھے گئے قصائد حمدیہ سے موسوم ہوئے۔ حضورؐ کی ثنا میں لکھے جانے والے قصائد قصائدِ نعتیہ کہلائے۔ چار یارؓ، اولیا، آئمہؑ اور بزرگوں وغیرہ کی شان میں لکھے گئے قصائد، قصائدِ منقبت کا نام پا گئے۔

مذکورہ السنہ کے شعرا نے اس ہیئت میں اور بھی کئی موضوعات کو جگہ دی۔ یوں اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ صنف موضوعاتی اعتبار سے کبھی بھی محدود نہیں رہی جب اس میں شعرا نے زندگی اور اس کے منظروں کی تفصیل نویسی کی تو منظریہ قصائد وجود میں آئے۔ منظریہ قصائد میں شاعر اپنے ارد گرد بکھرے ماحول اور مناظر اور ان سے جنم لینے والی کیفیات کو قلمبند کرتا ہے۔ وصفیہ،

---

(۱) دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۶/۲ ص ۲۸۷

فخریہ، اخلاقی، عرفانی، فکری اور صوفیانہ قصائد میں اشیا اور زندگی کے اوصاف، ذاتی و نسلی تفاخر، نصیحت آموز باتیں، رازہائے سربستہ کا انشراح، کائنات اور انسان کی ماہیت اور صفائی قلب اور وسعت نظر وغیرہ کے موضوعات نے راہ پائی۔ قصیدے ہی کی ہیئت میں کسی شئے، شخص یا ماحول کی برائی بھی کی گئی اور کسی مرنے والے کی تعریف بھی ہوئی۔ یوں ہجویہ، رثائیہ اور شہر آشوبیہ قصائد دیکھنے میں آئے۔ بعض شعرانے جنگی اور رجزیہ قصائد پر زور طبع صرف کیا ہے اور بعض شعرانے ایپیکل (Epical) (حماسے) قصائد پر، سید احمد دہلوی لکھتے ہیں

"قصیدہ کئی طرح کا ہوتا ہے جیسے بہاریہ جس میں گل و بلبل اور بوستان کا ذکر ہو۔ حالیہ جس میں انقلاب زمانہ کا بیان ہو۔ اور فخریہ جس میں شاعر اپنے کمال یا ہنر کی تعلی کرے" ①

زین العابدین موتمن نے فارسی قصیدے کے موضوعات میں تقاضا، مطائبہ، شکوہ، اعتذار، مناظرہ، مباحات، معارضہ، معمی، معاشقہ اور تاریخ کو شامل کیا ہے ② صاحب احسن القواعد نے لکھا ہے کہ قصیدے کو اس کے مضمون کے اعتبار سے کسی نام سے موسوم کرتے ہیں مثلاً اگر اس میں عشق کا بیان ہے تو وہ عشقیہ کہلائے گا۔ اگر شکایت آسمان کا تذکرہ ہے تو اسے حالیہ کہیں گے اور اگر دنیا کی پریشانی کا ذکر ہوگا تو وہ جہان آشوب کہلائے گا۔ ③

موضوعات کے اعتبار سے قصائد کی جو قسمیں سامنے آئی ہیں ان کے جائزے سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قصائد اپنے اپنے زمانے اور علاقے کی زندگی کے معاملات، انسان کے احوال اور ماحول کے سلاسل کے آئینہ دار رہے ہیں۔ ان میں خیال، جذبے اور فکر کی رنگا رنگ اور بوقلموں شکلیں منعکس ہوئی ہیں۔ زندگی اور کائنات کے کئی مستورہ گوشے منور ہوئے ہیں۔ قصیدہ نگار شاعروں نے احساس اور خیال کے پھیلے ہوئے گلزاروں سے رنگین، خوشبودار اور سدا بہار پھول چن کر لفظی آئینہ خانوں میں سجا دیئے ہیں۔

ہمارا موضوع چونکہ اردو قصیدہ ہے۔ اردو میں زیادہ تر مدحیہ، نعتیہ اور منقبتی قصائد لکھے گئے ہیں۔ منقبت اور نعت کے قصائد کے حوالے سے عابد علی عابد کا یہ بیان ملاحظہ ہو

اس قسم کی تخلیقات شعری میں ذوق سلیم، کلاسیکی ضبط و اعتدال اور توازن سے کام لینے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے......

---

① فرہنگ آصفیہ جلد سوم ص ۲۸۷ ② تحول شعر فارسی زین العابدین موتمن ذکر قصاید، چاپ تہران ص ۸
③ احسن القواعد ص ۱۹۲

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ تشبیب میں بیشتر اوقات ممدوح کے مقام بلند
کو ملحوظ رکھ کر شوخی سے احتراز کرنا پڑتا ہے" ①

علاوہ ازیں حمد، نعت اور منقبت کے قصائد اور قصیدہ مدحیہ کے اجزائے ترکیبی اور ہیئت میں فرق
نہیں ہونا چاہیے۔ ان میں بھی تشبیب، گریز، مدح، دعا اور حسن طلب کے اجزا موجود ہونے چاہییں
شاعر اپنے حق میں دعا مانگے اور شفا اور بخشش طلب کرے۔ مقصود اس امر سے یہ ہے کہ قصیدہ کا
موضوع خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی اس کی شان و شوکت اور جلال و جمال کے ارتفاعی مقام
کو برقرار رہنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ دورِ جدید کے اردو شعرا نے نعت اور منقبت کے قصائد میں
اسلوب کی سادگی اور خیال کے براہ راست اظہار کی وجہ سے اس صنف کے روایتی جلال اور شکوہ میں کمی
واقع ہوئی ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے قصیدے کی اقسام کا اجمالی تذکرہ ہو چکا فنی اعتبار سے اس
کی دو قسمیں ہیں

① تمہیدیہ قصیدہ : جس میں آغاز کلام تشبیب سے ہو پھر گریز اور مدح کے بعد
دعا پر ختم ہو

② خطابیہ یا مجددیہ قصیدہ: اسمیں براہ راست مدح سے اظہار خیال ہوتا ہے۔ بحر الفنی
نے اس قصیدہ کو مجددیہ بھی قرار دیا ہے ②

---

① اصول انتقاد ادبیات ص ۷۵۱م ② بحر الفصاحت ص ۸۷

چند اظہاری متعلقات

قصیدہ کی تنقید پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نقادوں نے اس کا وصف بیان کرتے ہوئے ہر وہ اصطلاح استعمال کی ہے جو زورِ بیان اور شاعرانہ کمال سے تلازماتی طور پر مربوط ہے۔ رعب اور نازک خیالی شان اور بلند پروازی، طمطراق اور آرائش اسلوب، دبدبہ اور مضمون آفرینی اور طنطنہ اور شکوہِ الفاظ یہ سب اصطلاحیں زورِ بیان اور شاعرانہ کمال ہی کی تعلق دار ہیں۔ تزئین بندش، جدت طرازی اور قدرتِ سخن یہ سب اصطلاحیں ہمیں قصیدہ کی تنقید کی حدود میں شامل نظر آتی ہیں۔ زورِ بیان کا تعلق محض لفاظی سے نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر لخت زدہ شاعر زورِ بیان کے جوہر سے متصف ہوتا۔ زورِ بیان کے لئے مشاہدے، تخیل اور جذبے سے معمور زبان کا ایک کٹھالی میں پگھلنا ضروری ہے۔ جہاں تک شاعرانہ کمال کا تعلق ہے شاعر کو صنائع بدائع کی پیچیدہ کائنات میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل، کنایہ، لف و نشر، مراعاۃ النظیر، لزوم مالا یلزم اور حسن تعلیل نہ جانے کیا کیا۔ شاعرانہ کمال شاعر کی علمی، جذباتی اور فکری ریاضتوں کا ثمرہ ہے۔ یہ تخم ہر زمیں میں نمو نہیں پاتا اس کے لئے خاص ماحول اور خاص زمین کی تیاری کی ضرورت ہوا کرتی ہے تب جا کر کہیں نازک خیالی، بلند پروازی، آرائش اسلوب، مضمون آفرینی، شکوہِ الفاظ، تزئین بندش اور جدت طرازی کے چمن کھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ قصیدہ گو شاعر زورِ بیان اور شاعرانہ کمال کو متحد الوجود کر کے گرینڈ سٹائل کی تخلیق سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ کو تمام تر اصنافِ سخن میں جاندار، پر تمکنت اور رفیع و وقیع قرار دیا گیا ہے۔

قصیدے نے عربی، فارسی اور اردو کی تمام اہم اصناف کے اثرات اپنے بطن میں سمیٹے ہیں۔ اس لئے اسے شاعر کی حقیقی امتحاں گاہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ قصیدے کے مقابلے میں ہر دوسری صنفِ سخن میں اظہارِ خیال آسان ہے لیکن مخصوص تکنیک، قواعد و ضوابط، شرائط اور ہمہ گیریت کے حوالے سے قصیدہ نگار شاعر کے لئے سفر بسا اوقات دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا اصطلاحیں محض اصطلاحیں نہیں ہیں یہ جس معیار کی راہنما ہیں اس کی تحصیل بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اسے پانے کے لئے دیدۂ بینا کے ساتھ ساتھ گرمیٔ نشاطِ تصور کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سوز نہاں کو معرضِ اظہار میں لانے کے لئے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ تب جا کر کہیں قصیدہ لافانی صنفِ سخن کے طور پر سامنے آتا ہے۔ گزشتہ ادوار میں شاعرانہ کمال کی سند قصیدہ گوئی سے حاصل کی جاتی تھی۔ غالب تو اس شخص کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے جو قصیدہ نہ کہہ سکتا ہو۔ آرائش اسلوب کے لئے لفظوں میں تصویری خیالوں کو منعکس کرنا پڑتا ہے۔ ایسی درجۂ اول کی سحر طرازی سے کام لینا ہوتا ہے کہ مانی و بہزاد کی نقاشی کا کام اس کے مقابلے میں دوم ٹھہرے۔ قصیدہ قادر الکلامی کے اظہار کے لئے بھی تھا۔ آج جب عروض ہی کی نہیں شاعرانہ جمالیات

جمالیات کی بھی تمام حدود توڑ کر ہماری شاعری نثری میدان میں داخل ہو چکی ہے۔ ممکن ہے کہ مذکورہ عریضے ہمارے نئے شعرا کے لیے ناقابلِ فہم ہوں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم و دائم ہے کہ عمدہ شاعری قادر الکلامی کی متقاضی ہے

مشرقی تنقید میں فصاحت و بلاغت کے الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں۔ فصاحت خوش کلامی اور خوش گفتاری کا ہم معنی لفظ ہے۔ جب ہم شاعری کے سیاق و سباق میں اسے استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شعر میں غیر مانوس تراکیب، ثقیل، درشت اور اشکال زدہ الفاظ نہیں ہیں۔ شیریں کلام، سہل گو اور خوش زبان شاعر کی شاعری فصیح کہلاتی ہے۔ بلیغ شاعری وہ ہے جس میں بلند پروازی اور عالی فکری کا خوش کلامی سے اظہار ہو۔ کسی بھی سطح پر حشو و زوائد نہ آنے پائے۔ خیال برمحل ہو اور الفاظ مناسب۔ چنانچہ ادبی محققوں نے قصیدے کے لیے فصاحت و بلاغت کے عنصر کو لازم و ناگزیر جانا ہے۔

قصیدے ہی کے حوالے سے ایک اصطلاح "متانت" بھی پڑھنے میں آتی ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ لفظ "سنجیدگی" کا بھی پیوند ہوتا ہے۔ متانت کے لفظی معانی مضبوطی، محکمی، استواری، سنگینی، وزن اور پختگی کے ہیں۔ متانتِ کلام سے مراد پختہ شاعری لی جاتی ہے۔ جب اس کے ساتھ سنجیدگی کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ شاعری پھکڑ بازی اور ابتذال سے پاک ہے۔ چنانچہ قصیدہ نگار شاعر کا متانت اور سنجیدگی کے جواہر سے مالامال ہونا بعید از فہم نہیں ہے۔ فصاحت و بلاغت اور متانت و سنجیدگی کے عناصر زورِ کلام اور شاعرانہ کمال کے لیے ضروری ہیں۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ کا کہنا ہے

"قصیدہ گرینڈ سٹائل رکھتا ہے۔ اس کے لئے پرشکوہ انداز عظیم الشان اسلوب، شاندار الفاظ، منقش تراکیب، چست دروبست مبالغہ اور زورِ کلام کا ہونا ضروری ہے" (1)

قصیدہ گو شاعر فی الاصل لفظی صناع ہے۔ وہ لفظ و تراکیب کے نت نئے نگینے تراشتا ہے۔ اس کی مرصع سازی سے خیال و معنی کے ہشت پہلو جلوے طشت از بام ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عمدہ قصائد میں موجود صنعت گری کا ایک زمانہ معترف ہے۔ قصیدے میں تشبیہات و استعارات کا برمحل اور آرائشی و زیبائشی استعمال اسے غزل اور دیگر اصنافِ شعر کے لہجوں سے ممیز کرتا ہے۔ گہری اور تہہ دار تشبیہیں، معانی آفریں اور شعور خیز استعارے، نادر تلمیحیں، موثر تمثیلیں اور موضوعِ اظہار سے متعلقہ علمی اصطلاحیں سب مل کر قصیدے کی شاعرانہ فضا کو زیادہ رنگین اور موثر بناتی ہیں۔

قصیدہ اگرچہ مختلف اجزا کا مجموعہ ہے تاہم عمدہ قصائد میں سب اجزا ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان میں تشبیب میں سے گریز، گریز میں سے مدح، مدح میں سے دعا اور مطلع

---

(1) مباحث از ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ، باب قصیدہ، مجلس ترقی ادب لاہور، 1965ء، ص ۵۹۲، ۵۹۳

میں سے مقطع نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو موضوعاتی تنوع کے باوجود قصائد میں داخلی تسلسل برقرار رہتا ہے۔ خیالات و کوائف کے اظہار و ابلاغ کا سلسلہ تاثیر میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ یہ تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قصیدہ ایک تخلیقی اکائی بنتا ہے یا ایک مکمل وحدت میں ڈھلتا ہے۔ یہ وحدت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر قصیدہ کے اجزا کو شاعرانہ مہارت سے تعمیر کرے۔ اس وحدت کی تحصیل کے لیے شاعر مختلف فنی حربے استعمال کرتا ہے۔ تضاد، تجانس و تشابہ، ملمع کاری اور اس نوع کے دیگر کئی حربے قصیدے کے تعمیری حسن میں معاون ہیں۔

قصیدے کے اجزا کے تناسب، توافق اور اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کا تخیل پرزور اور وسعتوں کا حامل ہو۔ اس کے پاس قوتِ بیان کا جوہر ہو اور اپنے سینے کے آتشکدے کو معرضِ اظہار میں لانے کا ہنر بھی۔ نکلسن کا کہنا ہے [ترجمہ]

"قصیدہ بلا اجزا ایک ثابت و سالم نظم نہیں ہے۔ اس کا ربط بہت سی تصاویر کے اس سلسلے سے مشابہ ہے جو ایک ہی مصور کی تخلیق ہوں یا مشرقی طرز کے استعارے میں یوں سمجھیے کہ اس کے مختلف حصے ایک ہار میں گہرِ تابدار کی صورت ہیں" ①

قصیدہ میں اشیا، انسان اور ماحول کی عمدہ عکاسی کے لیے لازمی ہے کہ شاعر کا مشاہدہ وسیع ہو۔ اس کی آنکھ مردم شناس ہو۔ ممدوح کی شخصیت اور مزاج کی تفہیم کے لیے اس کے پاس ایکسرے جیسی نظر ہونی چاہیے۔ یہی نہیں اپنے گہرے تجرباتی، علمی اور جمالیاتی خیالات کو شاعری کا درجہ عطا کرنے کے لیے شاعر کو غور و فکر پر مبنی تفحصِ الفاظ کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ جب پرندے اور مچھلیاں خوابیدہ ہوتی ہیں شاعر اپنے لفظوں کو پاکیزہ اور مہذب بنانے کے لیے جاگ رہا ہوتا ہے۔ قصیدہ گو شاعر قدرت کی جانب سے عطا ہونے والی شاعرانہ استعداد کو ریاضت، مہارت اور دیگر فنی عوامل کی بدولت نکھارتا ہے۔ یہ نکھار محنت کرنے والے قادر الکلام شعرا ہی کا حصہ ہے۔

قصیدہ اپنی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کے اعتبار سے نازک خیال ایرانی مصوروں کی مائیکروسکوپک تصویروں کی مانند بھی ہے اور ایران، ترکی اور برصغیر ہند و پاک میں موجود مسلم تعمیرات کے تمام تر حسن، پچی کاری، نقش و نگار اور تنظیم، توازن اور اعتدال وغیرہ سے متاثر بھی۔ اس میں فلسفے اور حکمت کی کائنات میں ابھرنے والے پیچ دار افکار کا عکس بھی ہے اور شاعری کے بطن میں موجود رنگوں کی قوس و قزح کی جھلکیاں بھی۔ اس میں غنائی، وصفیہ، تمثیلی اور بیانیہ شاعری

---

① A Literary History of the Arabs P. 78

کے عمدہ نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ہے

"قصیدے کا شاعر متحیر اور ششدر کر دینے والے استعجاب کی تخلیق کرتا ہے" ①

قصیدے کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر اس میں غیر تقلیدی انداز سے کسی کی مدح و ذم ہو گی یا سچا جوش اور ولولہ موجزن نظر آئے گا، صاف گوئی، بے باکی اور جرأت کے رجحانات ہوں گے اور جذبات کی عمدہ نکھری ہوئی تصویریں ہوں گی تو یہ شعر کی ایک نہایت اہم صنف ہو گی۔ عربی اور فارسی قصائد میں مذکورہ اوصاف کی کمی نہیں ہے البتہ اردو کے مدحیہ قصائد میں زیادہ تر تقلیدی انداز اختیار کیا گیا ہے برصغیر ہند و پاک میں مسلم حکمرانی کے دورِ زوال سے متعلق ہونے کی وجہ سے اسمیں وہ سچا جوش اور جذبہ ولولہ اور واقعیت شاید نظر نہ آئے جسکا تقاضا کیا گیا ہے۔ جہاں تک صاف گوئی، بے باکی اور جرأت کے رجحانات کا تعلق ہے اردو قصیدہ نگار اگر اپنے حکمران ممدوحین کی حقیقی تصویریں کھینچنے لگتے تو شاید ان کی مقصد برآری نہ ہو سکتی۔ اردو کے مدحیہ قصائد کو زورِ بیان اور شاعرانہ کمال کے معیارات کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔ جہاں تک نعت و منقبت کے اردو قصائد کا تعلق ہے، ان میں سچا جوش بھی دستیاب ہے اور ولولہ بھی' جذبات کی عمدہ اور نکھری ہوئی تصویروں کی بھی ان میں کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ مدحیہ قصائد جو خلوص نیت اور قلبی حوالے سے لکھے جاتے ہیں ان میں جذبات کی عمدہ تصویریں بھی نظر آتی ہیں اور وہ جاندار بھی ہوتے ہیں۔" احمد بن یوسف نے ابو یعقوب خریمی سے پوچھا

"یہ کیا بات ہے تیرے قصائد مدحیہ جو کاتب برامکہ منصور بن زیاد کے بارے میں ہیں تیرے مرثیوں سے بہتر اور اعلیٰ ہیں تو اس نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں تو ہم بنا بر امید شعر کہتے تھے اور اب بنا بر وفا کہتے ہیں اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے" ② (ترجمہ)

عرب، عجم اور ہند میں مسلم عروج کے ادوار میں جو عربی اور فارسی قصائد لکھے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ان ادوار میں شعرا مذہب، تصوف، سماجی علوم اور فلسفہ اور اس کے متعلقات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ مذہب اور تصوف کے حوالے سے مذہبی قصائد تو خیر لکھے ہی گئے ہیں مدحیہ قصائد کے آخر میں جو دعائیہ اشعار لکھے جاتے تھے ان میں بھی شاعر کی مذہبی شخصیت کی جلوہ نمائی ہے۔ جہاں تک مذہبی موضوعات کا تعلق ہے۔ قصائد میں خدا کی شان بھی بیان ہوئی ہے، انبیا کی مدح بھی کی گئی ہے۔ آئمہ کی سیرت نویسی اور ملائکہ کے بارے میں اظہارِ خیال ہے۔ مذہبی کتب کا تذکرہ موجود ہے احادیث کی جانب اشارے ملتے ہیں۔ تقدیر کے جور و جبر کی حکایات دستیاب ہیں۔ موت و حیات کی

---

① مباحث ص ۵۹۳ ② شعر العرب۔ ابن قتیبہ ترجمہ عبدالصمد صارم ص ۲۳

کشمکش پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ روح اور جسم کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ عبادات، مذہبی تقاریب اور رسومات کی تفصیل نویسیاں ملتی ہیں اور خیر و شر، شریعت یا قانون و فقہ کے معاملات و متعلقات بھی نظر آتے ہیں۔ اردو قصائد نگاروں کے لئے مذکورہ مذہبی موضوعات اجنبی نہ تھے۔ یہ ان کی تہذیبی زندگی کا حصہ تھے۔ یہ قصیدہ نگار یا تو خود مسلم تھے یا ان کا مسلم تہذیبی و ثقافتی ماحول سے گہرا رابطہ تھا۔ اردو قصیدہ نگار اپنے ارد گرد کے سماج میں پرورش پانے والے فکری رویوں سے بھی منفک نہیں تھے۔ جہاں تک فلسفیانہ اشارات و موضوعات کا تعلق ہے ہمارے قصیدہ نگاروں نے ان کو متروک و مردود نہیں ٹھیرایا۔ ان کے قصائد میں ان سے پہلو تہی نہیں کی گئی۔

قصیدہ نگار شعرا نے اپنے بعض قصائد میں انسان اور کائنات اور خالق کائنات کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے۔ علم کی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں تشکیل و ترکیب عالم کے مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جسم اور غیر جسم کے تضادات پر مباحث رقم کیے گئے ہیں۔ جوہر اور عرض، علت اور معلول اور مادہ اور غیر مادہ کی اصلیت اور حقیقت پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ سکون کیا ہے؟ ثبات کسے کہتے ہیں؟ عناصر اربعہ کی جزئیاتی تفصیل کیا ہے؟ وجود و شہود کے معاملات کی نزاکتیں کس نہج کی ہیں؟ فلسفیانہ معاملات کے حوالے سے لکھے گئے قصائد میں اس نوع کے سوالات کے فکری جواب موجود ہیں۔ انسان کی ماہیت، محبت و نفرت کی حقیقت، خود شناسی، خودی، زمان و مکاں، جزو کل اور نظریہ ارتقا وغیرہ کے موضوعات کو بعض قصائد نگاروں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

جہاں تک علوم دنیاوی کے قصائد میں آنے والے حوالوں کا تعلق ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے قصائد نگار شعرا نے (خصوصاً فارسی اور اردو) طب، موسیقی، رمل، جفر، نجوم، حرب، منطق، اخلاقیات، تعمیر، مصوری، سنگ تراشی، نقاشی، باغبانی اور اسی نوع کے دیگر علوم و فنون اور مختلف پیشوں سے متعلقہ الفاظ اور اصطلاحات کے استعمال پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قصائد میں ہماری تہذیبی زندگی کی جزئیات دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور زیادہ علمی سطح پر منعکس ہوئی ہیں۔

[عیوبِ قصیدہ]

صنفِ قصیدہ پر اعتراضات صرف مغرب زدہ ذہن یا مستشرقین کی جانب سے نہیں ہیں خود قصیدہ گو شعرا نے بھی اسے خصوصاً اس کے مدحیہ حصے کو نشانۂ تضحیک بنایا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو شاعروں کے ہاں ایسے اشعار خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں جن میں مدحیہ قصائد کی بری طرح تضحیک و مذمت کی گئی ہے۔ جہاں تک ابتدائی عربی شاعری کا تعلق ہے اس میں زیادہ تر ممدوح کی اہلیت اور مراتب کا خیال رکھتے ہوئے مدح کی گئی ہے۔ اس لئے معترضین بھی اس سے زیادہ خفا دکھائی نہیں دیتے۔ جاہلی عرب شعرا شخصی مدح میں عام طور پر ممدوح کے فضائلِ اخلاق اور حمیدہ اوصاف بیان کرتے تھے۔ سخاوت، شجاعت، پاکیزگی، شرافت، منصف مزاجی، امن جوئی، صلح پسندی، مہمان نوازی اور اس قسم کے دیگر اوصاف سے متصف شخصیات ممدوح ٹھہرتی تھیں۔ البتہ بعض شاعر حصولِ زر کے لئے بھی قصیدہ گوئی کرتے تھے۔ لیکن اس عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ عباسی دور کے عربی قصائد میں حکمرانوں کی خوشامد اور بخشش کا انداز بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ یہ رجحان فارسی قصائد پر بھی اثر انداز ہوا۔ یوں قصیدہ کو حصولِ مداح کا قائم مقام بھی سمجھا جانے لگا۔

امیر خسرو لکھتے ہیں

از گفتنِ مدح دل بمیرد + شعر ارچہ تر و فصیح باشد
گر دودِ نفسِ چراغِ مردہ + گر خود نفسِ مسیح باشد

ابن رشیق[1] نے قصائد کا محرک طمع بتایا ہے اور جمال الدین اصفہانی[2] مدح کہنے پر استغفار پڑھتے ہیں۔ خاقانی کا کہنا ہے شاعر خود رائی اور خودداری سے شاہوں کی مدح نہیں کرتے۔ وہ قصیدے میں مدح کو دروغِ مصلحت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انوری[3] نے بھی اپنے بعض اشعار میں مدح کی مذمت کی ہے۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میری عمر امیر و وزیر کی مدح کرتے گزر گئی لیکن میں اعمال کا ایک جریدہ بھی بیان نہ کر سکا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اب میں غزل، مدح اور ہجو کہہ کر اپنے نفس اور عقل پر ستم نہیں کرنا چاہتا۔ عرفی[5] نے قصیدے کو ہوس پیشگی کا نام دیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں

اے بسا معنیٔ روشن کہ ز حرصِ شعرا + خاکِ جولاں گہِ اسپ و خرِ اہلِ جاہ است
وی بسا نسخہ کہ در مکتبِ تشویشِ طبع + روسیاہِ ابد از مدحِ وزیر و شہ است
صلہ مشتاقِ گدا طبع ز مضمونِ بلند + گر ہمہ پائے بر افلاک نہد در چاہ است
مرجعِ معنیٔ این سست خیالاں دریاب + تا بدانی چہ قدر فطرتِ شاہ کوتاہ است
مادحِ اہلِ صفا باش کہ در علمِ یقین + وصفِ این طائفہ تفسیرِ کلام اللہ است

(تمام اشعار و حوالہ جات اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر محمود الٰہی اردو اکادمی لکھنؤ اترپردیش)

وہ یہ بھی کہتے ہیں

اے کہ تحریف سلاطین کردۂ + مشق تعلیم شیاطین کردۂ

بیدلؔ نے اہلِ صفا کو ممدوح بنانے پر زور دیا ہے کہ ان کے اوصاف اللہ کے کلام کی تفسیر ہیں۔ ان کے نزدیک بادشاہوں کے مادح شعرائے شیطانی علم کا پرچار کیا ہے۔ صرف یہی نہیں ان کے شعور میں روشن خیال اہلِ جاہ کے گدھوں اور گھوڑوں کی جولان گہوں کی مٹی ہو کر رہ گئے ہیں۔ مدحِ وزیر و شاہ ابدی روسیاہی کا باعث ہے۔

محولہ بالا فارسی شعرائے صنف قصیدہ کی مذمت نہیں کی بلکہ اس رجحان کو مطعون کیا ہے جو خوشامد اور چاپلوسی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ان میں سے اکثر شعرائے بلند پایہ مدحیہ قصائد لکھے ہیں۔ یوں وہ اپنے نقطۂ نظر اور اعمال کی تردید میں خود ہی ساعی ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جھوٹی مداحی کے مرتکب وہی شاعر ہیں جنہوں نے شکم پروری کے لئے قصائد لکھے ہیں۔ ایسے شاعر بہ حالتِ مجبوری مدحیہ اشعار لکھتے ہیں۔ وہ اسے دروغِ مصلحت آمیز جان کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ جہاں تک قصیدے کو ہوس پیشگی سے تعبیر کرنے کا تعلق ہے تو اس امر سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اسے وسیلۂ روزگار بنانے والوں کو ہوس پیشہ ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخِ فیروز شاہی میں لکھا ہے

"شاہانِ عجم کے دربار میں جہاں بادشاہت کے لئے بادشاہ زادہ، وزارت کے لئے وزیر زادہ، ملک کے لئے ملک زادہ ہونا اور شرافت کے لئے حریت لازمی شرط تھی وہاں کیومرث سے خسرو پرویز کے زمانے تک دستور تھا کہ مورخوں کے لئے وظائف اور رعایات مقرر کر دی جاتی تھیں۔ ان کی حیثیت اور مرتبہ مولویوں کی حیثیت اور مرتبے کے برابر تھا جو ان بادشاہوں کے دین و ملت کے مشائخ تھے۔ امام ثعلبی ہی نے جو ایک بے نظیر مورخ ہیں تاریخ عرائس میں لکھا ہے کہ خلفاء، سلاطین، وزراء اور امراء کے لئے یہ کہاں ممکن ہے کہ وہ مورخوں کی خدمات کے حقوق ادا کر سکیں اور ان کے کام کی قدر کر سکیں اور اپنے دل میں یہ سمجھ لیں کہ بے شمار مصاحب، شعراء مداح اور بے ہودہ گو ان کی مجلسوں میں شعبدہ بازی، دروغ بیانی، بیہودہ گوئی، بے بنیاد تعریفیں اور انتہائی بے ہودہ مبالغے کرتے ہیں اور عجیب عجیب طریقوں سے جھوٹی تعریف کر کے ان سے مال و زر وصول کرتے ہیں اور ان کی تعریف و توصیف میں یہ لوگ باب کے باب لکھ ڈالتے ہیں بلکہ پوری پوری کتابیں تصنیف کر دیتے ہیں۔ جب ان بادشاہوں کا عہدِ حکمرانی اور وزیروں اور

امیروں کا دور وزارت و امارت ختم ہوجاتا ہے تو ان جھوٹے اور خوشامدی لوگوں
کی تالیفات کا حسن کا جھوٹ اور مبالغہ آفتاب کی طرح روشن ہوتا ہے کوئی
نام بھی نہیں لیتا اور تحریفوں سے بھری ہوئی کتابیں جو وہ لکھتے ہیں کوئی نہیں
پڑھتا ۔ یہ سب کتب خانوں میں پڑی رہتی ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ بھی
نہیں کرتا " (۱)

ضیاء الدین برنی کے مندرجہ بالا بیان سے متبادر ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا غم ہے کہ مورخوں کو مسلم حکمران کم اہمیت دیتے تھے ۔ ان کے مقابلے میں شعرا اور دیگر مصاحبین پر عنایات کی زیادہ بارش کرتے تھے برنی کے مذکورہ بیان سے ذاتی غرضمندی کی بو آرہی ہے ۔ انہوں نے اپنی تاریخ میں بار بار تذکرہ کیا ہے کہ وہ ناقدریٔ زمانہ اور بے مہری حکومت کا شکار رہیں ۔ جہاں تک مسلم حکمرانوں کا تعلق ہے تاریخ شاہد ہے کہ ان کی اکثریت علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھی ۔ وہ حکمران خوشامد کے مفہوم کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتے تھے ۔ عالموں اور دانشوروں کی صحبت سے وہ فیض یاب ہوا کرتے تھے ۔ جھوٹی تعریف ان کی شان و شوکت میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی نہ ہی مبالغہ آرائی کے میووں سے سجے باغات ان کی تکریم و تعظیم میں اضافہ کر سکتے تھے ۔ وہ بادشاہ جو شعر فہمی اور شعر گوئی کے اوصاف سے متصف ہوتے تھے انہیں شعور تھا کہ شاعر خوشامدی ہیں یا اپنے فن اور زور بیان کے کرشمے دکھا رہے ہیں ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ بعض ایسے بھی مسلم حکمران گزرے ہیں جو علم و فضل اور شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خوشامد پسندی اور جھوٹی مداحی کے جال میں پھنس کر شعرا کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا کرتے ہوں ۔ لیکن ایسے حکمرانوں کا زمانۂ حکومت بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا تھا ۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں کئی مقامات پر شاعروں کے شعور کی داد بھی دی ہے ۔ اور بتایا ہے کہ بسا اوقات بادشاہ اور وزرا ان کے اشاروں پر فیصلے کیا کرتے تھے ۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب وزیر نظام الملک جنیدی نے قنوج کی خواجگی کے لئے جمال الدین فرزوق کو سلطان شمس الدین کے سامنے پیش کیا تو اس مقام پر بہروز وزیر کے پسر خواجہ عزیز نے یہ شعر پڑھا

بہ دست دوں مدہ خامہ کہ گردوں را جمال افتد + سیہ سنگے کہ در کعبہ است سازد سنگ استنجا

یہ اشارہ جمال فرزوق کی طرف تھا ۔ سلطان شمس الدین کو معلوم ہوا کہ جمال کم اصل ہے ۔ چنانچہ جب اس کے حسب نسب کی تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا حقیقت میں ایسا ہے ۔ وزیر نے سلطان سے کہا کہ اگر کم اصل ہے بھی تو اس کا خط بہت عمدہ ہے اور وہ تحریر میں نہایت ہوشیار ہے ۔ سلطان شمس الدین اس مرحلے پر وزیر سے رنجیدہ ہوا اور کہا " کم اصلوں کی ہنرمندی کی وجہ سے میری حکومت میں ان کا تقرر کرکے اسی کو رسوا کرنا ہو (۲)

---

(۱) تاریخ فیروز شاہی ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق ص ۶۱-۶۲ اردو سائنس بورڈ لاہور (۲) ایضاً ص ۹۱

یہ واقعہ ضیاءالدین برنی کے اس بیان کی تکذیب کے لئے کافی ہے جو انہوں نے دربار میں موجود شاعروں اور شاعری کے بارے میں دیا ہے۔ شاہی درباروں میں ایسے شاعر بھی ہوتے تھے جو بادشاہوں کے لئے پند و نصائح کے دفتر تحریر کرتے تھے۔ وہ خصائلِ ذمیمہ اور اوصافِ رذیلہ کی ہجا کچھ اس طور سے لکھتے تھے کہ بادشاہ اپنی اخلاقی ذمہ داریوں سے باخبر رہتے تھے اور حکمرانی جیسی عظیم الشان نعمت کا کفران نہیں ہو پاتا تھا۔ ایسے کم ہی درباری قصیدہ نگار گزرے ہوں گے جنہوں نے فسق و فجور اور بدکاری کی تلقین کی ہو یا یہ لکھا ہو کہ اچھائی اور نیکی کا راستہ برا ہے۔ (ابن طباطبا نے الفخری میں ایک ایسے شاعر کا تذکرہ کیا ہے کہ جس نے کمینہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے اس کے سوا اور کوئی شاعر کمینے کو سراہتے ہوئے نہیں سنا گیا۔ اسی طرح مستعصمی دور کے ایک شاعر نے لہو و لعب کی تعریف میں قصیدہ لکھا ہے لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں(۱) وہ بادشاہوں کے عدل و انصاف کی تعریفیں کرتے تھے۔ ظلم و تعدی اور جور و ستم کے معاملات پر کڑی تنقید سے گریزاں نہیں تھے۔ بلند کردار شخصیات اور اوصافِ حمیدہ کی مالک خداترس اور حق پرست ہستیاں ان کا آئیڈیل تھیں۔ کسی قصیدہ نگار نے دھوکا دہی اور پر عیب کرداری رویوں اور مکر و فریب کے رجحانات کی حمایت نہیں کی۔ شاہی درباروں میں قصیدہ گو شعراء نے کیا کیا خدمات سر انجام دی ہیں اسکا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ ضیاءالدین برنی کا یہ قول بھی قابلِ قبول نہیں ہے کہ شاعروں کی تعریفوں سے بھری ہوئی کتابیں کوئی نہیں پڑھتا۔ اس پر شریف مجلانی گورکانی کا یہ قول ہی کافی ہے کہ آلِ سامان اور آلِ ساسان کے پاس جو دنیا کی نعمتیں تھیں ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا صرف رودکی کی ثنا اور مدح اور باربد کی صدائے داستاں محفوظ ہے(۲)

ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی کتاب "History of Urdu Literature" میں قصیدہ کے بارے میں لکھا ہے

"The Qasida derived from Arabia through Persia is an ode or poem to gain a rich reward by praise or flattery"(۳)

انہوں نے صرف یہی کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ اس میں غزل سے زیادہ مبالغہ اور غیر حقیقی پن ہے۔ بہت سے قصیدے ممدوح کی کامرانیوں اور کامیابیوں سے غیر متعلق ہونے کے علاوہ انتہائی غلو آمیزی کے حامل ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں

"A typical Qasida could apply to every body and no body in the world"(۴)

---

(۱) الفخری ابن طباطبا ص ۲۲ - ۵۶ (۲) شعر العجم، جلد پنجم ص ۲۶

(۳) (۴) History of Urdu Literature از ڈاکٹر محمد صادق ص ۳۰، ۳۱ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن

ڈاکٹر محمد صادق نے یہ بھی کہا ہے کہ قصیدہ غزل کے سوز و گداز اور سادگی کے مقابلے میں طمطراق اور آرائشی تاثیر کا قائل ہے۔ یہ آرائشی تاثیر اوزان، رنگین الفاظ اور پرشکوہ استعاروں سے پیدا کی جاتی تھی۔ بعض نقادوں نے جن میں حالی بھی شامل ہیں ڈاکٹر صاحب کے بقول قصیدے کو شعرا اور ممدوحین کے اخلاقی زوال کی علامت بھی قرار دیا ہے البتہ شبلی نے قصیدے کے دفاع میں ایسا ہی معذرتی انداز اختیار کیا ہے جیسا کہ انگلستان میں لیمب نے کامیڈی کو دوبارہ رائج کرنے کے لئے کیا تھا (۱)

پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی قصیدے پر بہت سے اعتراضات کیے ہیں ان کا کہنا ہے
مدحیہ قصیدہ کی غرض و غایت مبالغہ آمیزی سے کسی بادشاہ یا امیر کی تعریف کرنا ہے تاکہ اسے صلہ ملے۔ مذہبی قصائد میں بھی عقیدت کا رنگ بقول پروفیسر صاحب گہرے اور پرجوش مذہبی جذبات پر حاوی دکھائی دیتا ہے مذہبی یا غیر مذہبی قصائد میں آورد ہی آورد ہے (۲)
مغربی بوطیقا کے معیارات سے متاثر چند اور آرا بھی ملاحظہ ہوں۔ ن م راشد نے اردو قصیدہ کے حوالے سے لکھا ہے

> "بے شک قصیدہ خوشامد کا جانا پہچانا طریقہ تھا۔ یہ شاعری کی انتہائی خیانت پر مبنی صنف تھی لیکن اس کی خیانت کو دیانتداری سے تسلیم کیا جاتا تھا" (۳) [ترجمہ]

راشد یہ بھی کہتے ہیں جو نظمیں قصیدے کہلاتی تھیں خلوص کی بجائے صناعی کے معیار پر پرکھی جاتی تھیں۔ ان میں خلوص کی کمی کو لفاظی اور اپنے وقت کے علوم کی نصابی علمیت سے پورا کیا جاتا تھا۔ وزیر آغا کے خیال میں اردو قصیدہ کسی داخلی دباؤ یا ضرورت کے تابع نہیں لکھا گیا اگر ایسا ہوتا تو یقیناً یہ نئے حالات اور واقعات کے باوجود زندہ رہتا۔ چونکہ یہ زندہ نہیں رہا اس لئے تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ وقتی ضرورت کے تابع تھا۔ تاریخ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی افادیت ختم ہو گئی تو شعرا نے بھی اسے ترک کر دیا ہے۔ آغا صاحب لکھتے ہیں

> "ہندوستان میں بادشاہت کا نظام ختم ہوا تو قصیدہ قریب ایک صنف کے ختم ہو گیا" (۴)

ڈاکٹر وزیر آغا قصیدے کو مصنوعی فضا کی پیداوار قرار دیتے ہوئے اس کے اسلوب کو بھی مصنوعی جانتے ہیں۔ انہوں نے بھی اسے مبالغہ آرائی اور خوشامد پسندی کے رجحانات کا علمبردار کہا ہے۔ قادر الکلامی اور علمیت کے اظہار سے مقصود یہ تھا کہ قصائد نگار حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کریں اور شاعروں کو گزر اوقات کے آسان وسائل فراہم ہوں

---

(۱) History of Urdu Literature ص ۳۰-۳۱ (۲) اردو شاعری پر ایک نظر از کلیم الدین احمد ص ۵۷ عظیم پبلشنگ ہاؤس پٹنہ
(۳) Social influence on Urdu poetry از ن م راشد۔ مضمون ترجمہ نصرت چوہدری ۱۹۶۹ (۴) اردو شاعری کا مزاج ص ۳۱۸ ناشرین لاہور

الطاف حسین حالی کا ایک شعر ہے

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر + عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

یہی نہیں انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں مطلق العنان اور خود مختار بادشاہوں کی شاعروں پر عنایات اور بخشش انہیں دریوزہ گر بنا دیتی ہے۔ شاعر کی طبعی آزادی کا جوہر مسلسل اور متواتر مداحی کے سبب زائل ہو جاتا ہے وہ بعثتی، جھوٹ اور خوشامد کا راستہ اختیار کرتا ہے حالی لکھتے ہیں " جب واقعات نبڑ جاتے ہیں اور مدح سرائی کی کرہ ہمیشہ کے لئے

شاعر کے ذمہ لگ جاتی ہے تو اس کی شاعری کا مدار صرف جھوٹی تہمتیں باندھنے پر رہ جاتا ہے پھر جب آفتاب اقبال کا دورہ جس کی عمر طبعی شخصی سلطنتوں میں اکثر سو برس سے زیادہ نہیں ہوتی ختم ہونے کو ہوتا ہے اور سلاطین و امرا میں وہ خوبیاں جن کے سبب سے جمہور انام کے شکر و سپاس و مدح و ستائش کے مستحق اور شعرا کی مداحی سے مستغنی ہوں باقی نہیں رہتیں تو ان کو شاعروں کی بعثتی کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں سوجھتی جن کو سن کر ان کا نفس موٹا ہو لہذا ان کو شاعروں کی زیادہ قدر کرنی پڑتی ہے۔ اس سے جھوٹی شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوتی ہے " (1)

مندرجہ بالا تمام آرا کا لب لباب یہ ہے کہ قصیدہ گو شعرا نے خوشامد، حصول زر، جھوٹ، مبالغہ اور مداحی پر بڑا زور صرف کیا ہے۔ وزیر آغا نے اس کی مکمل موت اور زوال کا اعلان کیا ہے۔ خوشامد اور بعثتی کے حوالے سے فی الوقت اتنا ہی عرض کرنا کافی ہے کہ اگر حقیقت میں قصیدے کا مطلب یہی ہے تو تمہید کی وجہ قصائد کا ایک جزو "جزو مدح" اس کی زد میں آتا ہے۔ خطابیہ قصائد میں زیادہ حصہ "خوشامد تا بعثتی" کے لئے وقف کیا جا سکتا ہے لیکن وہ بھی صرف ان ممدوحین کے حوالے سے جو علم و فضل، شجاعت و عظمت اور سخاوت و عدل وغیرہ وغیرہ کے اوصاف سے متصف نہ ہوں۔ اگر ممدوحین میں یہ صفات موجود ہیں تو پھر یہ بھی کہنا چاہیے کہ شاعر نے اظہار حقیقت کیا ہے۔ حالی نے اس ضمن میں سلطنتوں کے آفتاب اقبال کا تذکرہ کر کے یہ تسلیم کیا ہے کہ دور عروج کے بادشاہ حقیقی انسانی اور اخلاقی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ ایسا ہی ہو اور دور زوال میں بادشاہ انفرادی طور پر اعلیٰ اخلاق و صفات اور بلند پایہ علم و ہنر کی تحصیل سے بے بہرہ ہوں۔ انسانی نفسیات کا سرسری مطالعہ بھی یہ حقیقت منکشف کرے گا کہ ذاتی اخلاق و ہنر کی تحصیل کا تعلق عروج و زوال کے ادوار سے کچھ اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر قوموں کے عروج کے زمانوں میں بھی اخلاق باختہ اور غیر انسانی

(1) مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۱۳ نیا ادارہ لاہور

رویوں کے حامل حکمران نظر آتے ہیں اور دوسری طرف زوال کے زمانوں میں ایسی باہنر شخصیات بھی تخت نشین نظر آتی ہیں جو اخلاق اور علمی لحاظ سے پرمایہ ہیں۔ البتہ دورِ زوال کے حوالے سے بادشاہوں کی بہادری اور شجاعت کی تعریف اتفاق بھی ہو سکتی اور خوشامدانہ بھی۔ اتفاق اس حوالے سے کہ بادشاہ جبان لے کہ حکمرانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ شجاعت اور بہادری کے اوصاف سے بہرہ مند ہوں اور خوشامدانہ اس اعتبار سے کہ شاعر مال و زر کی حصول کے لیے اس کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے۔ یہاں شبلی نعمانی کا ایک اقتباس ہماری راہنمائی کرسکتا ہے وہ لکھتے ہیں

"قصیدہ کا گو صحیح استعمال نہیں کیا گیا لیکن یہ خیال غلط ہے کہ قصیدہ گوئی نے قوم میں خوشامد اور ذات پرستی پیدا کردی۔ مادح اور ممدوح دونوں جانتے تھے کہ مدح میں جو خیالات ادا کیے جاتے ہیں محض مبالغہ اور لفاظی ہے آج یورپ میں یہ عام قاعدہ ہے کہ بڑے سے بڑا معزز شخص بھی کسی عام آدمی کو خط لکھتا ہے تو خط کے اخیر میں لکھتا ہے آپ کا فرماں بردار خادم لیکن چونکہ معلوم ہے کہ یہ محض ایک رسمِ تحریر ہے اس لیے قوم میں خوشامد اور ذات پرستی کا وصف پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح قصائد میں ممدوح کو جو آسمان بلکہ قضا و قدر سے بالاتر بتاتے تھے تو ہر شخص سمجھتا تھا نری شاعری ہے اصلیت سے اس کو کچھ علاقہ نہیں"①

شبلی کی اس قسم کی منطق سے ڈاکٹر محمد صادق کو یہ شبہ گزرا کہ شبلی بھی اُسی طرح کا معذرتی انداز اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ کامیڈی کے تحفظ کے حوالے سے انگلستان میں لیمب نے کیا تھا۔ اگرچہ اردو میں مدحیہ قصیدہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے تاہم حمد، نعت اور منقبت کے قصائد آج بھی لکھے جارہے ہیں اور یورپ میں کامیڈی آج بھی پاپولر ہے چنانچہ کم از کم لیمب کا مشن تو پورا ہو ہی چکا ہے۔ اگر انگلینڈ کی مانند پاکستان یا دیگر اردو بولنے والے علاقوں میں بادشاہی نظام قائم ہوتا تو شاید مدحیہ قصائد آج بھی لکھے جارہے ہوتے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاید نہ بھی دیکھنے میں آتے کیونکہ مغربی اثرات کے تحت اب نظم کا دور شروع ہو چکا ہے۔ قصائد نویسی کی پابندیوں اور دشواریوں کی وجہ سے کوئی کوئی شاعر ہی اس صنف میں طبع آزمائی کرسکتا ہے۔ جس طرح پرانے عہد کے دیگر علوم و فنون قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں اسی طرح سے قصیدہ مدحیہ بھی عنقا ہو گیا ہے۔ دورِ جدید کو کوئی معمار کسی عمارت میں فنی باریکیاں دکھانے پر نہ تو آمادہ ہے اور نہ ہی قادر، پچی کاری اور در و دیوار کو نقش و نگار سے سجانے کا فن پرانے فنِ تعمیر کے ساتھ ہی ختم ہو چکا ہے البتہ مِنی ایچر مصوری کی نشاۃِ ثانیہ کا شہرہ ہے کہ یہ معاملہ بھی چند دنوں ہی کا لگتا ہے کہ باریک اور نازک کام کرنے کے لیے ہمارے معماروں اور مصوروں کے پاس وقت کی کمی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ قصیدہ (مدحیہ) اپنے زوال کو پہنچ چکا ہے۔ بادشاہت کا زوال اس کی کلی وجہ نہیں جزوی ہے کیونکہ قصیدے کے علاوہ مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد اور اس نوع کی دیگر اردو شعری اصناف

---

① شعرالعجم حصہ پنجم از شبلی نعمانی ص ۳۲۵

آج بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں تو کیا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ سب اصناف شہنشاہیت ہی کے استحکام کے لئے تھیں - ایسا
ہرگز نہیں ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ مغربی تعلیم کے آنے کے ساتھ ہی ہمارے شعری معیارات بھی تبدیل ہوئے ہیں - اردو
شاعری نئی اصناف سے روشناس ہوئی ہے - چنانچہ نظم معریٰ سے لے کر نثری نظم تک اس نے ایک طویل مسافت طے کی
ہے - وہ صناعیاں اور باریکیاں جو قدیم شاعری کی میراث تھیں جدید شاعروں کے وارے میں نہیں آتیں - اور قصیدہ
و دیگر تمام قدیم شعری اصناف کے مقابلے میں مشکل، باریک، نازک اور صناعی آشنا صنف سمجھی تھی - اسے لکھنا صاحب
ہمت شاعروں ہی کا کام تھا - پرانے تہذیبی اور ثقافتی ماحول کے ساتھ ساتھ پرانی طرز کے شاعروں کا بھی خاتمہ
ہو چکا ہے - صناعی دوست، باریک بیں، مبالغہ آشنا اور اسی حوالے سے "کاذب شاعر" آج کی سادگی پسند
"سطحیت دوست" "حقیقت آشنا" اور "سچی" دنیا میں کہاں دستیاب ہو سکتا ہے

ڈاکٹر مبشر حسن نے اپنی کتاب شاہراہ انقلاب میں اردو شاعری کے تصور عشق کا تجزیہ کرتے ہوئے غزل
کے اشعار میں بھی دربار پرستی اور صلہ طلبی کے عناصر ڈھونڈ لیے ہیں ان کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں ہے

> " دوسری سطح پر اشعار کے معانی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کو اس زمانے
> کے جاگیرداری نظام کے شہر کے درمیانی طبقہ کا ایسا فرد تصور کیا جائے جو نواب یا بادشاہ کے
> دربار میں حاضری دے کر وظیفہ یا تنخواہ حاصل کرتا تھا - محبوب کی تعریف کا مطلب نواب یا
> بادشاہ کی تعریف ہوتا تھا اور محبوب سے بے وفائی اور بے رخی کی شکایت کا مطلب
> ممدوح سے مودبانہ شکایت ہوتی تھی جس میں اشارتاً کہا جاتا تھا کہ شاعر کو اس کی
> قصیدہ گوئی اور شعر نگاری کا خاطر خواہ صلہ نہیں مل رہا " ①

اول سطح پر تشریح کے لئے ڈاکٹر مبشر حسن نے عشق مجازی کا پیمانہ اور تیسری سطح پر تشریح کے لئے عشق حقیقی
کا معیار سامنے رکھا ہے - صلے کی چاہت، تلاش روزگار، انعام و اکرام کی تمنا، مصاحبت کا حصول اور ہر نوع کی
طمع پرستی کے الزامات لگا کر ہمارے مذکور نوع کے "سیاست آشنا" نقادوں نے شاعروں کو حقیقی معنوں
میں بھاٹ اور دریوزہ گر دیکھنے کی کوشش کی ہے - اگر ایسے نقاد شعرا کے پیشوں کے بارے میں تحقیقات کر لیتے
تو شاید ان کے بیانات حقیقت آشنا ہوتے - شاعروں کو درباروں تک رسائی کا شوق تو ضرور ہوتا تھا لیکن
دربار کسی کسی شاعر کے روزگار کا ذریعہ یا وسیلہ بنتا تھا - معروف اور اعلیٰ شاعر درباروں میں ملک الشعرا کے
درجے تک ضرور پہنچ جایا کرتے تھے - ایسے شاعر بھی تعداد میں کچھ کم نہیں تھے جو درباری شان و شوکت کی
دنیا سے الگ رہنے پر خوش تھے - شاعروں کے مختلف پیشوں سے منسلک ہونے کے سلسلے میں ڈاکٹر
الف - د - نسیم کے ایک مضمون کا اقتباس ہمارے شکوک و شبہات دور کر سکتا ہے - وہ اپنے مضمون
دلی بارہویں صدی ہجری کے شاعرانہ ماحول میں لکھتے ہیں

---

① شاہراہ انقلاب ۔ ڈاکٹر مبشر حسن ص ۸۲

"محمد عارف عارف رفوگر تھے۔ لالہ کانشی ناتھ کسی پیشکار کے بیٹے تھے، آفتاب رائے رسوا جوہری پسر تھے۔ ٹیک چند بہار زرگر تھے، گھاسی رام خوشدل صرافی کا کام کرتے تھے۔ میر محمد سجاد سجاد طلسمات الشا اور خوش نویسی میں کامل تھے۔ میر محمد شفیع انیونی تھے، نور خاں آگاہ قصہ خوانی کے وسیلے پر گزر اوقات کرتے تھے مفاخر علی خاں بے قید شعبدہ بازی اور صحبت داری میں طاق تھے، محمد محسن مذوی نجیب زادوں میں سے تھے اور علم موسیقی میں اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ میر لطیف علی لطیف جوہر شناس تھے اور جوہروں کی دلالی کرتے تھے بنجیا ایک مخنث تھے تذکرہ ذکا میں لکھا ہے کہ اچھے شاعر تھے۔ خواجہ ہینگا سید اعلاقہ بند تھے۔ مقصود ایک بازاری سقہ تھے بازار کے اجلاف تر کے ان کا دم بھرتے تھے۔ بھن نام لقو تخلص ہینچہ بند تھے ا کا نام تحفہ تخلص قصاب تھے۔ میاں شہاب الدین ثاقب تحفہ روزگار تھے میراں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "در ہمہ چیز دست دارد و ہیچ نمی داند" مرزا غفور بیگ افسوس ماہی گیر تھے۔ عنایت اللہ حجام موتراش تھے۔ محمد امان نثار معمار تھے جامعہ مسجد دہلی ان ہی کے بزرگوں کی بنائی ہوئی ہے منیر صیقل گر تھے اگرچہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن عسرت کی وجہ سے یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ حسن بخش بخشی پارچہ فروش تھے، مدسنگھ آشفتہ آہن گر تھے۔ میر صادق علی صادق فیل بان تھے۔ شمبو ناتھ عزیز مہاجن تھے۔ محمد ہاشم شائق خیاط تھے اس کے ساتھ مرثیہ خوانی کی خدمت کو بھی ضم کر لیا تھا۔ بدر الدین مفتون بزاز تھے۔ مغل علی مغل سوداگر تھے۔ غلام ناصر جراح تھے ...... سودا نوکر پیشہ، شاکر ناجی، محمد حسین کلیم اور محتشم علی حشمت وغیرہ سپاہی پیشہ تھے۔ شاعر امرا اور خوانین میں سے بھی ہوا کرتے تھے" (۱)

اس اقتباس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ شاعروں کی کثیر تعداد آج ہی کی مانند ماضی میں بھی مختلف پیشوں سے وابستہ تھی۔ شاہ کی مصاحبت اختیار کرنے والے شعرا ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ ایسے شعرا شاعری ہی کو کل وقتی پیشہ کے طور پر اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ حصول رزق کے لیے دربار کی طرف رجوع کرنے والے شعرا

(۱) دلی بارہویں صدی ہجری کا شاعرانہ ماحول ڈاکٹر الف د نسیم ص ۵۵ - ۶۷ اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۶۱

معمولی درجے کے نہیں ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ درباروں میں بادشاہوں کے دست و بازو خواتین، ملوک، خواص اور مقربین وغیرہ ہوا کرتے تھے جنکا شمار علم و فضل، سخاوت، شجاعت، دیانت اور عمدہ اخلاق کی بدولت یکتائے روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کے سامنے شاعر کی دال تب ہی گل سکتی تھی کہ وہ اپنے فن میں یکتائے روزگار ہوتا۔ کئی حکمران خود بھی شاعر اور ادیب ہوتے تھے اور جو اس میدان کے فرد نہیں تھے ان میں سے اکثر شعر و فن شناسی میں اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں اگر کسی دربار میں پہلے سے کوئی شاعر شاہ کا مصاحب ہے تو وہ "تو گرفتار دام دربار شاہ کو دربار کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ قدیم شاعروں میں سے چند خوش قسمت شعرا ہی درباری شاعر کا منصب حاصل کر سکے تھے۔ شاعروں کو "دربار پرست" قرار دینے والے نقادوں نے ان کی پیشہ ورانہ محنتوں کی ناقدری کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ درباروں میں ملک الشعرا کے عہدے پر شاعر ہی فائز ہوتے تھے لیکن تمام تر قدیم اردو شاعری میں تصور عشق کی شرح میں دربار اور شاعروں کے تعلق کی منطق اور تعبیات کو استعمال کرنا غلطی ہی نہیں انسانوں کی مساعی جمیلہ کی توہین بھی ہے۔ علاوہ ازیں جذبۂ عشق کہ جو ہماری کلاسیکی شاعری کا بنیادی جذبہ تھا اس کی درست تفہیم سے ڈاکٹر مبشر حسن کی پہلو تہی نے ان کے بیان کی سطح کو کمتر کر دیا ہے۔

دائرۃ المعارف اسلامیہ کے باب قصیدہ میں مقالہ نگار نے قصیدے کو ایک مصنوعی اور غیر فطری صنف سخن کہا ہے[1]۔ مصنوعی کو اگر صناعانہ مہارت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ قصیدے کا عیب نہیں ہنر ہے لیکن معلوم انہوں نے غیر فطری کہنے سے کیا مراد لی ہے؟ اگر ان کی مراد یہ ہے کہ قصائد میں خوشامد اور خیالات کذب سے کام لیا جاتا ہے یا یہ شاعر کی معاشی مجبوری کا نتیجہ ہیں تو بھی بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ یہ بیان احتیاط ہی سے قبول کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ بات تو کھلی ہے کہ دور انحطاط کے بعض قصیدوں میں غیر فطری پن یا حد سے زیادہ اغراق و غلو موجود ہے لیکن ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ

> "عربی، فارسی، ترکی اور اردو ان چاروں زبانوں میں قصائد کی اچھی خاصی تعداد سچے جذبات اور صحیح شاعرانہ محرکات پر مشتمل ہے"[2]

> "اگر فاضل مقالہ نگار کو اعتراض اس بات پر ہے کہ دور جاہلیہ کے عربی قصیدوں میں تفاخر اور حریف کی ہجو میں مبالغے سے کام لیا جاتا تھا تو اعتراض میں قدرے وزن ہے لیکن اس کے باوجود مبالغے کے تحت کچھ جذبات بھی موجود ہوتے تھے جو حقیقی شاعری کی شرط اول ہے۔ انداز بیان میں مبالغہ اور اغراق یونانی شعرا میں نیز انگریزی میں ملٹن وغیرہ کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب علم البلاغت ("Rhetoric")

---

[1][2] دائرۃ المعارف اسلامیہ ص ۲۸۶ (باب قصیدہ) جلد ۱۶/۲

میں اسے بعض مواقع کے لئے جائز قرار دیا ہے" ①

علاوہ ازیں جوش اور جذبہ نہ تو عربی قصائد سے مکمل طور پر غائب ہوا تھا (کہ ان میں بھی ملک یا قوم کے لئے یا محبوب اور مناظر کے بیان کے لئے جوشیلا اور جذبیلا انداز اختیار کیا جاتا تھا) نہ ہی فارسی قصیدے سے (جہاں حسن و عشق اور بہار و گلزار کے علاوہ دیگر مظاہر فطرت کی عکاسی بھی کی جاتی تھی) کاملاً ختم ہی ہوا تھا۔ قصائد میں صوفیانہ، اخلاقی اور ایمانیاتی موضوعات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ان میں جوش، جذبے اور حقائق کا عمل دخل لازمی ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ یہ صنف غیر فطری اور کھوکھلا پن کا شکار ہے تقاضائے انصاف نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بھی مذکورہ اعتراض کے کنفیوژن کو محسوس کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں

"اگر اعتراض اس پر ہے کہ یہ صنف سالم نہیں۔ اس میں وحدت، موضوع کی بجائے کئی موضوعات آجاتے ہیں مثلاً تشبیب، مدح، تقاضا، دعا وغیرہ یعنی یہ صنف مرکب ہے تو جدید ترین شاعرانہ تجربوں کی رو سے یہ ترکیبی انداز عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ تاہم مشرقی اور مغربی ذوق کا تفاوت ایک حقیقت ہے اس میں ہم فاضل مقالہ نگار کو معذور سمجھتے ہیں" ②

صنف قصیدہ پر اعتراض کرنے والوں کے خیالات سے جن مثبت امور کی نشاندہی ہوتی ہے ان کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ قصائد میں

ا: تعریف کے مستحق بادشاہوں، وزیروں، امیروں اور رئیسوں کی مدح میں کوئی ہرج نہیں البتہ عقل اور انصاف کے اصولوں کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے

ب: حقیقت پسندانہ پر وقار رویہ بھی ہونا چاہیے اور خوشامد اور بعشتی سے پرہیز بھی مبالغہ غیر گنجائشی اور کاملاً بے سروپا بھی نہیں ہونا چاہیے

ج: مضامین محدود نہ ہوں۔ تخیل کی جولانیوں اور زبان و بیان کی قدرت کے لئے وسعتوں کا ہونا لازمی ہے

د: آمد اور غیر پیچیدہ اور غیر گنجلک اسلوب پر انحصار کرنا چاہیے

اس امر کی طرف بار بار اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عمدہ قصائد میں مدح کے جزو کے حوالے سے ممدوح کا استحقاق بھی مدنظر رہتا تھا۔ شاعر اپنے شعور اور عقل و انصاف کو بروئے کار لا کر ممدوحین کی شخصیات کو پرکھتے بھی تھے اور راستی اور صداقت کے عناصر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ان کی تشبیہوں میں

---

①② دائرۃ المعارف اسلامیہ ص ۲۸۶، جلد 16/2

مضامین کی وسعتیں قابل دید تھیں ۔ اپنے تخیل کی جولانیوں اور زبان و بیان پر قدرت کی بنیادوں پر ہی
توان شاعروں پر مبالغہ آرائی اور پر شکوہ آرائش اسلوب کا الزام لگا ۔ یہ ضرور ہے کہ آمد اور سادگی
سے قصیدہ نگاروں نے گریز ہی کیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں صنف قصیدہ کے مزاج سے لگا ہی نہیں
کھاتی تھیں ۔ جدید دور کے بعض قصیدہ نگاروں نے ان دونوں خصائص کی پیروی کی ہے ۔ قصیدے کے
مزاج کے پیش نظر صناعانہ مہارت اور شخصیاتی اوصاف نگاری کے لیے جتنا زیادہ آمد اور سادگی
سے گریز کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ قصیدہ کے حق میں بہتر ہوگا ۔ جہاں تک آمد کا تعلق ہے
شاعروں پر یہ حالت کم کم ہی طاری ہوتی ہے اور حالی نے تو آمد کی کیفیت کو شعور اور فکر ہی کا
منطقی نتیجہ قرار دیا ہے ۔ قصیدے میں شخصیاتی اوصاف نگاری کے حوالے سے شخصیت کے متعلق
علوم و فنون اور رجحانات کا تذکرہ اس امر کا متقاضی ہے کہ غزل اور نظم کی عمومی سادگی سے
اسے سروکار نہ ہو ۔ چنانچہ قصیدہ کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں فنون تغزل سے گریز ہی
بہتر ہے

[فصلِ چہارم]

قصیدہ اور دیگر اصناف

•

قصیدہ کی ہیئت اور ساخت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی کوئی بھی دوسری صنف اس سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ہیئتی اعتبار سے غزل اور قطعہ اور معنوی اعتبار سے شہر آشوب، ہجو، مرثیہ اور فخر و حماسہ وغیرہ کا قصائد سے تقابل ہو سکتا ہے۔ مثنویوں کے آغاز میں یا مدحیہ مثنویوں کی صورت میں بھی مدح کی مختلف شکلیں موجود ہیں۔ اسی طرح سے مختلف رزمیوں میں بھی جنگی ہیروز کو ممدوح بنایا جاتا تھا۔ اردو میں مذکورہ صورتوں کے علاوہ خطبے، قول، قوالی، رسالہ، گفتار نامہ، چکی نامہ، پنکھا نامہ، ڈھول نامہ، وفات نامہ، میلاد نامہ، ماں باپ نامہ، قیامت نامہ، فقر نامہ، موت نامہ، معراج نامہ، ظفر نامہ، نور نامہ، ، خواب نامہ، شمائل نامہ اور اسی نوع کے بعض دیگر ناموں میں بھی مدح و توصیف کے متنوع انداز بکھرے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں مذکور اصناف ہی کی مانند قصوں اور دوہوں میں بھی مذہبی اور غیر مذہبی مدح کے نمونے نظر آجاتے ہیں۔ کافی، چوپائی، سی حرفی وغیرہ میں بھی تحسین و توصیف اور حمد و ثنا کے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم عہد میں دلو بیدوں اور بشن پدوں میں ہندو دیوی دیوتاؤں کے اوصاف گائے جاتے تھے۔ (یہ وشنو کی تعریف میں بھی گائے گئے ہیں اور ہمارے صوفیا نے انہیں اپنے تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے معانی عطا کیے ہیں)۔ اردو میں جکری کی صورت میں ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں اور مضامین کے علاوہ کسی صوفی کا نسبی و مذہبی شجرہ توصیفی انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ جکری میں مشائخ کے حوالے سے عمدہ توصیفی خیالات ملتے ہیں۔ شبد، شلوک، بیساکھی، تکیہ، بارہ ماسہ، ریختہ، ملمع، نظم، جھولنا اور آنکھ مچولی وغیرہ میں بھی مختلف النوع مدحیہ خیالات ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ عہدِ جدید میں بھی نظم و نثر کی صورت میں معاصرین کی تعریف اور مدح کے سلاسل دستیاب ہیں۔ بعض شاعروں نے حکمرانوں کی مدح میں اشعار لکھے ہیں چنانچہ ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق وغیرہ کی تعریف میں لکھی گئی شاعری کا وسیع ذخیرہ بھی ہمارے ادبی سرمایے میں شامل ہے۔

انگریزی شاعری میں اوڈ (ode)، سانیٹ Sonnet، ہیمز Hymns، ایلیجیز (نوحے) Elegeis اور رزمیے Epic کی ہیئتوں اور اصناف میں مذہبی اور شخصیاتی مدح کی نادر صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

اردو شاعری گوناگوں اصناف سے مزین ہے ان میں سے کچھ اصناف ہیئت کے حوالے سے اپنی پہچان رکھتی ہیں اور کچھ موضوع کے حوالے سے۔ کچھ ہیئتوں کی شناخت میں موضوع اور ہیئت دونوں کی اہمیت ہے۔ قصیدہ اور مثنوی ایسی ہی اصناف کے زمرے میں شامل ہیں۔

انہیں ہم "موضوعاتی ہیئتی اصناف" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں غزل اور رباعی ایسی اصناف ہیں جنہیں ان کی ہیئت کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے یہ اصناف "ہیئتی اصناف" سے موسوم ہیں۔ مرثیہ، اور واسوخت وغیرہ اپنے مخصوص موضوعات کے اعتبار سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس لئے ایسی اصناف کو موضوعاتی اصناف کے دائرے میں رکھا جاتا ہے۔ اردو اصنافِ سخن میں صنفِ قصیدہ میں موضوع اور ہیئت کی مساوی اہمیت ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ صنف، غزل اور اس کے قطعہ بند اشعار کے مانند ہے اور موضوع کے لحاظ سے اس میں فکر، مناظر اور ماحول کا بیان بھی ہوتا ہے، شخصی اور مذہبی مدح و تحسین نویسی بھی۔ قصیدہ کی ہیئت اور موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے اس مرحلے پر صرف یہ عرض کرنا ہے کہ غزل جو قصیدے کے بطن سے نکلی ہے اور ہیئتی اعتبار سے قصیدے کے مماثل ہے مطلع، قوافی، ردیف اور مقطع کے عناصر کے حوالے سے تو قصیدے ہی کی ساخت کی ہے لیکن اس میں اکثر و بیشتر ہر شعر علیحدہ موضوع کا حامل ہوتا ہے جبکہ قصیدہ میں کم از کم اس کے اجزا کی حد تک اشعار معنوی تسلسل میں لکھے جاتے ہیں۔ یہی نہیں قصیدہ چار اجزا اور خطابیہ قصیدہ کی صورت میں دو اجزا پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس غزل اس نوع کے اجزا یا حصوں سے پاک ہوتی ہے۔ غزل و ایجاز و اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ قصیدہ میں موضوعاتی پھیلاؤ کو اہم جانا جاتا ہے۔ غزل میں اگر تسلسل سے اشعار آجائیں تو وہ قطعہ بند اشعار کا نام پاتے ہیں۔ تاہم ایسے اشعار کو بھی ہم قصیدہ نہیں کہہ سکتے۔ قصیدے کی پہچان "موضوعاتی ہیئتی" حوالے ہی سے ممکن ہے۔ ویسے بھی غزل کے لئے دھیما پن، بے ساختگی اور سادگی وغیرہ کے عناصر کا ہونا ناگزیر ہے۔ قصیدے میں اسلوب کا طنطنہ، آرائش اور علمی وزن اہم ہوتا ہے۔

جہاں تک قصیدہ اور قطعہ کے فرق کا تعلق ہے اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ قطعاتِ مدحیہ اور قصیدہ کی الگ الگ پہچان ہو سکے۔ شمس قیس رازی کا خیال ہے

"در قصائد پارسی لازم است کہ بیت مطلع مصرع باشد یعنی
قافیت ہر دو مصراع در حرف و حرکات یکسی باشد و الا قطعہ خوانند
ہر چند از بیست بیت درگزرد" (۱)

امداد امام اثر نے بھی قطعے کی یہی شناخت بتائی ہے ان کے خیال میں اس کی ہیئت تو قصیدے ہی کی سی ہوتی ہے لیکن اس میں مطلع نہیں ہوتا۔ (۲) خواجہ محمد زکریا کا خیال ہے کہ تقریباً ہر شاعر کے قطعات میں کہیں کہیں مطلع مل جاتا ہے۔ اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا مگر اس میں شک نہیں کہ مطلع کا استعمال کم رہا ہے۔ (۳)

---

(۱) المعجم ... ص ۱۷۱ (۲) کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۷۱ (۳) اردو میں قطعہ نگاری۔ از خواجہ محمد زکریا۔ ص ۵ ضیائے ادب لاہور

وہ یہ بھی لکھتے ہیں قطعہ میں اشعار کی تعداد دو سے چل کر کوئی بھی ہو سکتی ہے البتہ اچھے قطعات میں تعداد کے بارے میں معتدل رویہ ہوتا ہے۔ قطعہ قصیدے کے مقابلے میں مختلف وجود کا حامل ہے۔ بعض محققین نے قطعہ کو جزوِ قصیدہ اور بعض نے اسے خود روصنف کا درجہ عطا کیا ہے۔ اسے قصیدہ کا ٹکڑا قرار دینے کی ایک وجہ دونوں اصناف کی ظاہری شکل کی مماثلت ہے۔ ویسے بھی قطعہ چونکہ ٹکڑا ہی کو کہتے ہیں اس لیئے یاور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پس منظر میں بھی غزل ہی کی طرح قصیدہ ہی سے علیحدہ ہونے والی منطق ہو۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ قطعے نے مزاجی اور معنوی اعتبار سے قصیدے سے مختلف مقام حاصل کر لیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا قصیدے اور قطعے کے اختلافات پر رقمطراز ہیں

"قصیدہ کی طوالت، مختلف اجزا کی موجودگی اور خاص قسم کے موضوعات کی وجہ سے اس میں مختصر روزمرہ کے واقعات، پند و نصائح وغیرہ کا اظہار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ قصیدہ میں خاص قسم کے موضوعات کی وجہ سے ایک ایسی پر شوکت زبان بھی بن چکی تھی جو واقعات اور اخلاقیات کے بیان کے لیئے موزوں نہ تھی۔ چنانچہ ایسے مضامین کے بیان کے لیئے الگ صنف کی ضرورت تھی جس میں حقیقت کو واقعیت کو سامنے رکھتے ہوئے مذکورہ مضامین مختصر طور پر بیان کیے جا سکیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے لکھا ہے

لوگوں نے قطعے کو مختصر قصیدہ قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے قطعے اور قصیدے میں کئی باتوں کا فرق ہے..... دونوں کے مضامین کی روح جدا جدا ہے مثلاً قطعہ اور قصیدہ میں ایک بڑا فرق ابتدا ہی سے یہ رہا ہے کہ جہاں قصیدے میں تخیل اور مبالغہ کی رنگ آمیزی اور فرضی بلکہ خلافِ حقیقت تصویر سازی کا خاص زور رہا ہے وہاں قطعے میں واقعاتیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے اس لحاظ سے قطعہ کی اصل روح اس کی حقیقت نمائی ہے" (۱)

جہاں تک شہر آشوب کا تعلق ہے۔ وہ شہر آشوب بھی دستیاب ہیں جو قصیدے کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔ ایسے شہر آشوبوں میں قصیدے کے اجزا شامل نہیں ہوتے۔ شاعر اپنے منتخبہ موضوع پر براہ راست اظہارِ خیال کرتا ہے۔ شہر آشوبوں میں شہر، وطن یا ماحول کی خراب صورتِ حال کا تذکرہ

---

(۱) اردو میں قطعہ نگاری ص ۶

ہیئت میں لکھے جائیں تو ہم انہیں بھی خالص قصیدہ کہنے سے گریز کریں گے۔ البتہ بعض نقادوں نے انہیں رثائیہ یا رجزیہ قصائد کی صف میں شامل کیا ہے۔ اس کی وجہ ان کی اور قصیدے کی ظاہری ہیئت کی مماثلت ہے

ان کے برعکس مدحیہ موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مخمس، مثنویوں اور ترجیع بندوں کو قصیدے کے دائرے میں شامل نہیں سمجھا گیا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی ہیئتوں کا قصیدے کی ہیئت سے مختلف ہونا ہے۔ اپنی مذکورہ خصوصیات کی بنا پر ہم چند شہر آشوبوں، ہجووں اور مرثیوں کو بھی قصیدے ہی کے دائرے میں شامل سمجھ کر ان پر اظہار خیال کریں گے۔

مرثیے میں عام طور پر کسی مرنے والے کے اوصاف و اخلاق کا تذکرہ کر کے اظہار رنج و غم کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بنیادی طور پر ایک عربی الاصل صنف سخن ہے۔ اردو میں یہ امام حسینؑ کی شہادت، اہل بیت پر ٹوٹنے والے مصائب، کربلا کے واقعات کے غم انگیز بیان کے لئے وقف ہے۔ اس کی رنگارنگ ہیئتی خصوصیات ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں درج ہے

"ہر نظم خواہ کسی قسم کی ہو اگر وہ نظم رباعی یا قطعہ یا غزل یا قصیدے کی طرز پر ہوگی تو اسے مجرا یا سلام کہیں گے اور یہ التزام ضرور رکھیں گے کہ اس کے مطلع یعنی اول شعر میں لفظ مجرا یا سلام یا مجرائی ضرور لائیں گے اور اگر مستزاد کی وضع پر ہوں تو اسے نوحہ کہیں گے اور جو مسمط یا ترجیع بند یا ترکیب بند کے طور پر ہوگی تو اسے مرثیہ" ①

اردو میں ایسے مرثیے بھی لکھے گئے ہیں جن میں مختلف مشاہیر قوم یا عزیز و اقارب کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر اظہار جذبات کیا گیا ہے۔ ایسے مراثی کو شخصی کا نام دیا گیا ہے۔ مرثیے کی ہیئت کے حوالے سے فرہنگ مذکورہ میں درج بیان زیادہ صداقت نہیں رکھتا۔ مرثیے دو بیتی (جس میں تین مصرعے بند کے ہوتے ہیں اور چوتھا ٹیپ کا) غزل (عارف کا مرثیہ از مرزا غالب) مثنوی (والدہ مرحومہ کی یاد میں از اقبال) اور ترکیب بند (مرثیہ غالب از حالی) کی ہیئت میں بھی لکھے گئے ہیں۔ یہ مسدس، دوازدہ بند اور مستزاد کی ہیئتوں میں بھی موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے اردو میں سب سے پہلے سودا نے مرثیے کے لئے مسدس ② کی ہیئت استعمال کی لیکن یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ ان سے قبل دکن میں احمد نامی شاعر نے مرثیے کے لئے یہ ہیئت منتخب کی۔ کربلا اور اس کے متعلقہ موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مراثی میں، چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت اور بین وغیرہ کے اجزا کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن مرثیہ کے ان اجزائے ترکیبی کے لئے مدحیہ قصائد کے اجزائے ترکیبی جیسی پابندی نہیں ہے۔ منقبت اور نعت کے قصائد بھی رحمین ہی کے حوالے سے ہیں ان میں مرنے والوں کے لئے اظہار غم سے زیادہ ان کی مدح

---

① فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص ۳۲۵ ② دیکھئے سودا کے مرثیے کلیات سودا جلد دوم نولکشور لکھنؤ

کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب کوئی شاعر یا ادیب کسی بری، خراب یا پریشان کن تہذیبی اخلاقی، معاشرتی اور معاشی صورت حال کی تصویر کشی کرتا ہے تو اس کے تضاد کے طور پر اچھی، عمدہ اور ہموار صورت حال کی غیر محسوس توصیف و تحسین بھی قاری کو اپنی گرفت میں لے رہی ہوتی ہے۔ شہر آشوب کہنے والا شاعر اچھے زمانے، عمدہ ماحول اور اعلیٰ شخصیات کی عدم موجودگی کا براہ راست تذکرہ بھی کرتا ہے اور بری صورت حال کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی متضاد صورت حال کے ایسے مناظر کا اشارہ کناں بھی ہوتا ہے جو غیر محسوس طریقے سے قاری کے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اردو میں شاہ حاتم کا قصیدہ شہر آشوب ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ ہے اور موضوع کے اعتبار سے شہر آشوب تاہم اسے ہم حقیقی معنوں میں یا موضوعاتی ہیئتی حوالے سے قصیدے کے دائرے میں داخل نہیں کر سکتے۔

ہجو یہ قصائد کو بھی منفی مثال کے حوالے سے مدح ہی کا علمبردار جاننا چاہیے۔ یعنی شاعر جب کسی برے ماحول یا شخص کی ہجو پر آمادہ ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں اس کے تضاد کے طور عمدہ ماحول اور اعلیٰ شخصیت کے معیار بھی موجود ہوتے ہیں۔ یوں بھی یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ طنز و تعریض کے پس منظر میں "ایسا نہیں ہے" کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے کی منطق بھی کارفرما ہوتی ہے۔ طنز و تعریض کی نفسیات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق شخصی اور غیر شخصی دونوں حوالوں سے ہے۔ شخصی سطح پر شاعر اپنی ذات کے تحفظ کو فوقیت دیتے ہوئے خارجی اشخاص یا ماحول پر طعنہ زنی کرتا ہے۔ غیر شخصی حوالے سے اس کے سامنے معیارات اور اقدار کا ایک مثالی جہان ہوتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ خارجی دنیا معیار شکن اور اقدار کش ہے تو وہ طنزیہ لہجہ بھی اختیار کرتا ہے اور تلخ بھی۔ یوں سماج کے زوال آمادہ رجحانات اور اقداری شکست و ریخت کے تضاد کے طور پر شاعر کے شعور میں موجود ارتقائی رجحانات اور ثابت و سالم اقدار کے اعلیٰ نمونے بھی غیر محسوس طور پر ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ منفی مثالوں کی ترسیل سے اعلیٰ اخلاقی اور عرفانی نکات کا اشارہ کناں ہوتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا کا قصیدہ "تضحیک روزگار" ظاہری ساخت کے اعتبار سے قصیدہ ہے لیکن موضوعاتی اعتبار سے ہجو۔ اسے بھی ہم موضوعاتی ہیئتی حوالے سے قصیدہ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ہیئت کے اعتبار سے اسکا نام قصیدہ لکھا ایسے ہیئتی حوالے سے قصائد کی صف میں شامل ہونے والے شہر آشوب اور ہجویہ قصائد ان معنوں میں مدح، توصیف اور تحسین کے رجحانات سے گہرے طور پر متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں ہیئتی اعتبار سے قصائد کے زمرے میں شامل کرنے کے باوجود ان میں اجزائے قصیدہ اور روح و مزاج قصیدہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم انہیں خالص قصائد کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔

یہی حال مرثیے اور حماسے کا ہے۔ اگر مرثیے یا حماسے بھی ظاہری طور پر قصیدے میں کی

واخلاق واوصاف کے معاملات مدِنظر رہتے ہیں۔ مرثیہ اور قصیدہ صرف ہیئتی صورت ہی کے اعتبار سے نہیں مواد اور معانی کی نوعیت اور مقاصد کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مرثیے کو قصیدہ اور قصیدے کو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔

فخر و حماسہ وغیرہ کی صنف بھی عرب زبان ہی سے متعلق ہے۔ اس میں شاعر اپنے حسب و نسب کی برتری اور فوقیت کے قصیدے رقم کرتا ہے۔ آباواجداد کے اوصاف لکھتا ہے۔ ان کی نیکی، سخاوت، بہادری اور شجاعت کی داستان سناتا ہے۔ یوں وہ دیگر قبائل پر اپنی فوقیت اور برتری جتاتا ہے۔ اس صنف میں نسلی تفاخر کا اظہار اہم ہے۔ ابوتمام اور بحتری نے حماسہ کے نام سے جاہلی دور کی فخریہ اور جوشیلی شاعری کو یکجا کیا ہے۔ شاعر جنگ و جدل کے مراحل و مواقع پر حماسوں سے جوش و تشویق دلانے کا کام کیا کرتے تھے۔ حماسے فی الاصل عربی قصائد (نظم کی ایک شکل) ہی ہیں ان میں بعد میں لکھے جانے والے مدحیہ قصائد کے اجزا تلاش نہیں کرنے چاہییں۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں لکھا گیا ہے

"قدیم عرب شعرا کے قصائد کے ابیات میں ترتیب، تسلسل یا تطابق کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ ہر بیت ایک الگ اور مستقل اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے قصیدے کے ابیات کی تقدیم و تاخیر یا حذف و اضافہ سے معنی و مضمون کے تسلسل پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔"(1)

یوں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فنی اور تکنیکی اعتبار سے بلند مراتب قصائد سے فخر و حماسہ پر مشتمل دورِ جاہلیہ کے قصائد کا تقابل درست نہیں ہے۔

ہمارے بعض جدید نقاد قصیدے کی ہیئتی قیود کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ مثنویوں، مخمسوں، مسدسوں، ترکیب و ترجیع بندوں اور قطعوں وغیرہ میں موجود مدحیہ شاعری قصائد ہی کے زمرے میں شامل ہونی چاہیے۔ شمیم احمد لکھتے ہیں

ایسی تمام مدحیہ تخلیقات جو غزل کی ہیئت میں نہ ہونے کے سبب قصیدہ نہیں کہلاتیں آج تک عجیب دگرگوں حالت میں ہیں وہ اپنی صنفی شناخت کو ترس رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر ہیئت پر سے سخت گیر نظر ہٹا کر ان کے موضوع کو ذرا سی بھی اہمیت دی گئی ہوتی تو وہ آج یوں موضوع اور ہیئت کے درمیان معلق نہ رہتیں۔ بلکہ سیدھی سچی طرح قصیدہ کہلاتیں۔ اس لیے کہ ان کی قصیدیت میں اور ان تخلیقات کی

---

(1) دائرۃ المعارف اسلامیہ ص ۲۸۹ جلد 16/2

• قصیدیت میں جو غزل کی ہیئت میں ہیں معنی و مفہوم، موضوع اور اس کے برتاؤ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے" ①

شمیم احمد کی رائے اس منطق پر استوار ہے کہ جس بھی ہیئت میں مدحیہ اشعار لکھے گئے ہیں اسے قصیدہ ہی کہنا چاہیے۔ ان کے دلائل قابلِ غور ہیں۔ لیکن وہ خود ہی بیان کر چکے ہیں کہ ایسی مدحیہ شاعری جو غزل کے علاوہ کسی اور ہیئت میں ہے اس کی پہچان اس ہیئت ہی کے حوالے سے ہو رہی ہے یعنی کوئی مدحیہ مثنوی ہے کوئی مدحیہ ترجیع بند، کوئی مدحیہ مخمس ہے اور کوئی مدحیہ ترکیب بند۔ اس حوالے سے ان کی صنفی شناخت کا مسئلہ تو حل ہے البتہ انہیں قصیدہ کہنا قصیدہ جیسی رفیع الشان صنف سے ناانصافی ہے۔ ہمارے قدیم شعرا اور تذکرہ نویس اس نوع کے معاملات کی نزاکتوں کو جدید نقادوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ رہی یہ بات کہ سودا کی ہجو "تضحیکِ روزگار" کو قصیدہ کی ہیئت میں لکھے جانے کی وجہ سے قصیدہ کہا گیا ہے تو اس کا جواب بھی شمیم احمد کی اس دلیل سے دیا جا سکتا ہے کہ اگر "مثنوی در ہجوِ بخیل" کو اس لئے مثنوی کہا گیا ہے کہ وہ مثنوی کی ہیئت میں ہے تو "قصیدہ تضحیکِ روزگار" کو بھی تو قصیدہ کی ہیئت میں ہونے کی وجہ سے قصیدہ کہا گیا ہے۔ البتہ مسئلہ یوں حل کیا جا سکتا ہے کہ حقیقی قصیدہ کے لئے قصیدے کی ہیئت اور موضوع کی ہم آہنگی لازمی ہے۔ یعنی اس میں مدح و ثنا اور اس کی ہیئت کی حقیقی ساخت کے عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ اس مقالے میں ہمارے سامنے یہی معیار رہے گا۔ ہمارے نزدیک تاج محل اور عام رہائشی مکانات کے فرق کو ملحوظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اور ان دونوں کو ایک جاننا فکری مغالطہ ہے۔ ہر صنف اور ہر سانچے کا اپنا اپنا مزاج اور اپنی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلنے والی منطق سے محفوظ رہنا ناگزیر ہے

---

① اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں از شمیم احمد ص ۱۵۶ مکتبہ عالیہ لاہور

فصل پنجم [قصائد اور متعلقہ تہذیبی ماحول]

قصیدہ اور شاعر کی نفسیات

زندگی ناکامیوں اور کامیابیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ کامرانیاں احساس برتری پیدا کرتی ہیں اور ناکامیاں احساس کمتری۔ کسی میدان یا امتحان میں اگر انسان ناکام رہتا ہے تو ایک ملال اور پریشانی کی لہر اعصاب میں اتر کر اس کی سائیکی کا حصہ بننے لگتی ہے۔ اسی طرح جب وہ کوئی معرکہ مار لیتا ہے یا پھر کسی نوع کی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے تو سرشاری، خوشی اور خوشگواری کے تاثرات اس کے اسپ شعور کے لئے مہمیز ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ، وزراء، امراء، مقربین حکومت اور اسی سطح کی دیگر شخصیات برتری کے بے پایاں احساس کے زیر سایہ اپنے رجحانات متعین کرتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں ان کی تعریف و تحسین کرنے والے چاہے اپنی شخصیتوں پر بزعم خود کتنا ہی فخر کیوں نہ کرتے ہوں کمتری کے داخلی احساس کی زد پر ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قصیدہ گو شعرا کبھی بھی یہ کہہ نہ پاتے کہ قصیدہ گوئی دریوزہ گری کے مترادف ہے۔ دست طمع دراز کرنے والا برتری کے نشے میں تو سرشار ہونے سے رہا۔ ہم اس معاملے کو تھوڑا سا مشروط کر کے دیکھتے ہیں۔ وہ شاعر جو یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخصیت واقعی اس قابل ہے کہ اس کی مدح کی جائے تو انہیں بھی اس کی ان خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے جو خود ان میں موجود نہیں ہوتیں اور وہ قصیدہ گو جو یہ جان کر بھی کسی کی مدح کرتے ہیں کہ اس میں کوئی اعلیٰ صفت موجود نہیں ہے تو وہ صریحاً دریوزہ گری ہی کو اپنا رہے ہوتے ہیں۔ ہر دو مذکورہ صورتوں میں احساس برتری تلاش کرنا بے سود ہے۔ مرعوبیت یا دریوزہ گری کی نفسیات کے حوالے سے کسی شاعر میں احساس برتری کا جنم لینا کارِ محال ہے کسی شاعر نے کہا تھا

؎ اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں + ورنہ مجھ کو تو تجھ سے پیار نہیں

اس شعر میں بیان ہونے والا خیال عجیب سا لگتا ہے لیکن جب بغور دیکھا جائے تو اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ محبوب میں موجود اعلیٰ قدری صفات کی توصیف و تحسین فی الاصل شاعر کی اپنی ذات کی تکمیل کے لئے ہے۔ اس لحاظ سے بھی شاعر نے اپنی ذات کی عدم تکمیل ہی کا تذکرہ کیا ہے۔ کسی منظر، شخص یا قدر کی تعریف اور مدح میں بھی یہ حقیقت مضمر ہے کہ مادح ان سے متاثر ہوا ہے۔ متاثر ہونے کی نفسیات بھی یہی ہے کہ متاثر کن شئے، شخص یا صفت ایسی ہے جو متاثرہ فرد کے لئے فوقیت کی حامل ہے

ایڈلر کا کہنا ہے

"برتری کی امنگ کی تکمیل کی راہ میں اگر کوئی مزاحمت پیدا ہو

جائے جیسا کہ اکثر و بیشتر ہوتا ہے تو فرد کمتری محسوس کرنے لگتا ہے ۔ جب یہ صورت
حال پیدا ہو جاتی ہے تو فرد اس کی تلافی کے لیئے دوسرے طریقوں سے اپنی
برتری ثابت کرنے کی سعی کرتا ہے ۔ اگر اس کی اس تلافی کن فعلیت کو قبول عام حاصل
ہو جائے تو احساس کمتری کا دور ہو جانا ممکن ہے"①

شاہ کی مصاحبت پر اترانا یا ملک الشعرا ہو کر فخر اور برتری کے جذبات کا اظہار کرنا یا شاعری کا عظیم میدان مار کر
یہ کہنا کہ ' مستند ہے مرا فرمایا ہوا '
اسی نفسیاتی اصول کی طرف اشارہ ہے ۔

پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے رویے بھی انسانی فکر و جذبہ کا حصہ ہیں ۔ اپنے آپ سے برتر کو پسند کرنا
یا حسد اور اسی نوع کی کسی اور داخلی کیفیت کے تحت ناپسند کرنا ، اپنے آپ سے کمتر کو ناپسند کرنا یا رحم ، ہمدردی
یا اسی نوع کی کسی اور داخلی کیفیت کے تحت پسند کرنا بھی انسانی سرشت کا حصہ ہے ۔ علاوہ ازیں چاہنا اور چاہا
جانا بھی مذکورہ رویوں کا شاخسانہ ہے ۔ قصیدے کے حوالے سے ممدوح کو احساس تفاخر ملتا ہے اور مادح کو احساس
خانہ زادگی اور ہیچ مائیگی ۔ قرب سلطانی کا نشہ قصیدہ نگار کو شاہ سے دور دیگر افراد کے مقابلے میں برتری کے
احساس میں بھی مبتلا کرتا ہے ۔ یوں اس کا نفسیاتی سفر برتری اور کمتری ہر دو رویوں کے درمیان کا سفر ہے ۔ اس
کی ذات کسی سطح پر برتری آشنا ہوتی ہے ، کسی سطح پر کمتری آشنا اور کبھی یہ دونوں رویے اس میں متحد نظر آتے
ہیں ۔ مولانا الطاف حسین حالی قصیدے کے نفسیاتی سبب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں

" اکثر اوقات کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقعہ کو سن کر ہمارے دل میں مدح
وستائش یا نفرین کا جوش اٹھتا ہے ۔ کبھی کسی کے عدل و انصاف یا عالی ہمتی یا حب
وطن یا قومی ہمدردی یا کسی اور خوبی کو معلوم کر کے اس کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے
کبھی کسی نیک صفات اور ستودہ خصائل آدمی کی موت پر افسوس کرنے ، اس کی خوبیاں
یاد کرنے کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے ..... اسی طرح سے جب کوئی واقعہ ہمارے
دل کو ناگوار معلوم ہوتا ہے یا کسی سے کوئی حرکت یا کام قابل نفرین ظہور میں آتا
ہے تو اس کی برائی ظاہر کرنے کا ارادہ ہمارے نفس میں متحرک ہوتا ہے ۔ ایسے
موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ جو ملکہ اس کی طبیعت میں خدا نے ودیعت کیا
ہے ۔ اس کو معطل اور بے کار نہ چھوڑے اور اس سے جیسا کہ اس کی فطرت کا
مقتضا ہے کچھ کام لے "②

---

① عظیم علمائے نفسیات از پروفیسر عبدالمجید قریشی ص ۲۲۷ ② مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۶۱
ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

الطاف حسین حالی نے پسند اور ناپسند کو معیار بناتے ہوئے قصیدہ، مرثیہ اور ہجو کی نفسیات بیان کی ہے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ شاعر اعلیٰ اخلاق و صفات کے حامل اشخاص کی خوبیاں چمکانے کا منصب اس طرح ادا کرے کہ ان کے ہنر اور فضائل بھی قارئین کے سامنے آئیں اور اخلاق روبہ بھی۔ یہی نہیں شاعر برائیوں پر لفظی قدغن لگانے کا کام بھی کرتا ہے۔ اخلاق ذمیمہ کی کھلی مذمت کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے یوں وہ حال اور مستقبل کے افراد کو غلط روی سے باز رکھتا ہے۔ حالی نے اسی حوالے سے متوکل باللہ کے سوال کے حوالے سے ایک شاعر کا جواب بھی درج کیا ہے۔ اس کے مطابق شاعر کو نیک لوگوں کی تعریف اور برے لوگوں کی مذمت کرنی چاہیے۔ حالی نے ایک اور نفسیاتی نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ کسی مستحق شخص کی مدح اس میں یہ جذبہ پیدا کر دیتی ہے کہ وہ زیادہ مستحق ہونے کی سعی کرے یا پھر اپنے پہلے استحقاق کو قائم رکھے یہی نہیں یہ مدح قارئین اور سامعین پر بھی اثر ڈالتی ہے اور وہ اس کی تقلید میں کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی کی ہجو کی جائے تو اس میں بھی یہ خیال پوشیدہ رہنا چاہیے کہ وہ شخص مذموم افعال ترک کر دے۔ حالی زور دے کر یہ بات کہتے ہیں کہ مدح یا مذمت ایسے اسالیب میں ہونی چاہیے کہ ممدوح کی خوشامد اور مذموم کی دل سوزی کا احساس پیدا نہ ہو۔ میر تقی میر کا ایک شعر ہے

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم بادفروشِ چمن نہیں

یہ نکتہ شاعرانہ تفاخر اور عزتِ نفس کی حفاظت کے حوالے سے تو نہایت عمدہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر خود مرکزیت کے حصار میں گھرا ہوا ہے۔ خود مرکزیت کی تحویل میں ہونے کا دوسرا نام نرگسیت ہے نرگسیت زدہ شخصیات دوسرے افراد کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ تعریف و تحسین میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یوں شخصیت کا کینوس وسعت آشنا ہوتا ہے۔ کسی کے اوصاف بیان کرنے سے خود شاعر بھی ان اوصاف سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتا ہے اسی طرح جب وہ کسی کی مذمت کرتا ہے تو مذموم رجحانات سے اپنی شخصیت کو بھی محفوظ رکھنے کا پابند ہے۔ وحید الدین سلیم پانی پتی نے بھی حالی کا ہم آواز ہو کر لکھا ہے

"تعریف اور مذمت کے موجبات انسان کی فطرت میں داخل ہیں" (۱)

بہرحال ہمیں غیر مستحق افراد کی تعریفوں اور مدحوں کو اخلاقی تدریس کے حوالے سے بالائے طاق رکھنا چاہیے اخلاقی زوال کے شکار ممدوحین کی مداحی کی شاعرانہ اور تہذیبی اہمیت اپنی جگہ محمد علی ابن علی ابن طباطبا نے مشہور فارسی شاعر عسجدی کے حوالے سے ایک حکیم کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے سامنے

"اگر کسی چیز کی تعریف کی جاتی تو وہ پوچھتا کہ یہ تعریف عصامی و اکتسابی ہے یا عظامی و استخوانی، اگر اکتسابی بتائی جاتی تو وہ قدر کرتا اور اگر استخوانی بتائی جاتی تو وہ توجہ بھی نہ دیتا" (۲)

---

(۱) افاداتِ سلیم از وحید الدین سلیم پانی پتی ص ۱۷۰ کتبخانہ اعظم لاہور (۲) الفخری از محمد علی ابن علی ابن طباطبا ترجمہ ص ۵۹ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

یعنی اگر کوئی بادشاہ اپنی عقل اور ذاتی اکتساب کی بنا پر عظمت کے مدارج کو پہنچا ہے تو اس کی تعریف جائز ہے اور اگر وہ آبا واجداد اور بوسیدہ ہڈیوں کی وجہ سے تخت نشیں ہے تو اس کی مدح روا نہیں۔ یعنی اگر اس میں ذاتی اوصاف موجود نہیں ہیں تو اس کی مدح سے گریز ہی بہتر ہے۔

یہاں یہ بات بھی طے ہو جانی چاہیے کہ جو شاعری خوف اور طمع کے نتیجے میں لکھی جائے گی اس کی شاعرانہ مصدقیت (Poetic Authenticity) مشکوک ہوگی۔ شاعرانہ مصدقیت کے حوالے سے اسی مدحیہ شاعری کے مراتب بلند ہوں گے جو شاعر کی داخلی اُپج کا نتیجہ ہوگی۔ ایسی شاعری کے علاوہ مذہبی حوالوں سے لکھے جانے والے قصائد اس اعتبار سے مکمل مصدقیت کے حامل ہیں کہ ان میں شاعروں نے اپنی اپنی داخلی ایمانی صورتِ حال کو منعکس کیا ہے۔ یہ نہ تو صلے کی چاٹ کے حوالے سے لکھے گئے ہوتے ہیں اور نہ ہی خوشامدانہ مزاج کے تابع ہو کر یہ قصائد کسی خارجی طاقت یا معاشی دباؤ کے نتیجے میں وجود میں نہیں آتے۔ اس لیے ان میں ممدوحین کے استحقاقِ مرتبے پر حرف زنی ممکن نہیں۔

شاعر صرف شخصیات ہی سے متاثر نہیں ہوتے۔ مناظر، موسم اور مختلف قابلِ دید مقامات بھی انہیں مسحور کرتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ان کے دلوں میں مدح کے جذبات کروٹیں لیتے ہیں۔ وہ ان کی مناسبت سے دل کھول کر اپنے دل میں پیدا شدہ کیفیات کا اظہار کرتے ہیں۔ فارسی، عربی اور اردو شاعروں نے قصائد میں خوبصورت مقامی منظروں، عظیم الشان عمارتوں اور کیف و سرور میں ڈوبے موسموں اور باغوں کی وصف نگاری میں متنوع انداز اور اسالیب اختیار کیے ہیں۔ یہاں ہمیں قصائد میں پیش ہونے والے ماحول اور مواد کی کچھ ایسی جہتوں کا جائزہ لینا ہے جس سے ان کی رنگارنگ تہذیبی، تاریخی اور ادبی جہتوں کی اہمیت واضح ہو سکے

[قصیدہ اور ماحول]

آئندہ چند صفحات میں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ صنف قصیدہ نے اپنے متعلقہ ماحول سے کیا کچھ حاصل کیا ہے اور اس ماحول کو کیا کچھ لوٹانے کی سعی کی ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ قصیدہ نگار شعرائے جس درباری ماحول میں پرورش پائی اس میں کیا کچھ روا تھا۔ اس ضمن میں وہ واقعات بھی مندرج ہوں گے جو حالی اور شبلی نے اپنی کتب میں پیش کیے ہیں اور وہ بھی جو مختلف تواریخ کی زینت بنے ہیں۔ یوں کسی حد تک قصیدے کے تہذیبی ماحول کو بھی دائرہ تحریر میں سمیٹنا ممکن ہو گا۔ حالی نے لکھا ہے کہ اعشیٰ کو جو قدیم عرب کا نابینا شاعر تھا

"اس کے کلام میں یہ تاثیر ضرب المثل تھی کہ وہ جس کی مدح کرتا وہ عزیز و نیک نام اور جس کی ہجو کرتا ہے وہ ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے" ①

اس نے ایک عورت کہ جس کی لڑکیوں کو بر نہیں ملتے تھے کی درخواست پر ایک قصیدہ لکھا جس کی بدولت

"ان لڑکیوں کی صورت و سیرت کا چرچا تمام ملک میں پھیل گیا ....
اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض امراء نے بھاری بھاری مہر مقرر کر کے ان لڑکیوں سے شادیاں کرلیں" ②

حالی نے مشہور فارسی شاعر رودکی کے ایک قصیدے کی تاثیر کا تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ امیر نصر بن احمد سامانی نے جب ہرات فتح کیا تو اس کی عمدہ آب و ہوا سے متاثر ہو کر اپنے تخت حکومت بخارا کو بھول گیا اور وہیں قیام کرنے کا ارادہ باندھ لیا۔ لشکر کے سردار اور امراء جو بخارا میں عالیشان باغوں اور عمارتوں کے مالک تھے اور عام سپاہی جو اپنے عزیز و اقارب سے دور ہو گئے تھے اس فیصلے سے گھبرا اٹھے۔ انہوں نے رودکی سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح امیر کو بخارا کی جانب مراجعت پر مجبور کرے اس نے وہاں اپنا مشہور قصیدہ

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے

پڑھا۔ اس قصیدے کے اثر کی بابت لکھا گیا ہے کہ امیر نے یہ قصیدہ سنا۔ شراب اور راگ رنگ کی محفل کو چھوڑ کر بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر سمیت بخارا کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ واقعہ چہار مقالہ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے ③

شبلی نے شعر العجم میں ابو تمام کے اس قصیدے کا تذکرہ کیا ہے جس میں معتصم باللہ کے ایشیائے کوچک میں عموریہ فتح کرنے کا تذکرہ ہے۔ اس میں معرکۂ جنگ کی عمدہ تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ اس قصیدے کے ذریعے ہارون رشید کو یہ خبر پہنچائی گئی تھی کہ ایشیائے کوچک میں نایسس فورس بغاوت کر کے بادشاہ بن گیا ہے ہارون الرشید نے فوراً اس کے قلع قمع کے لیے لشکر تیار کیا ④

---

① تا ③ مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷ ④ شعر العجم ص ۲۲، ۲۳

شبلی نے عمر بن کلثوم کے قصیدہ مفاخرت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس قصیدہ نے بنی تغلب میں کئی سو سال تک شجاعت کا جذبہ پیدا کیے رکھا۔ عمر بن کلثوم نے اس قصیدہ میں عرب کے مشہور بادشاہ عمر بن ہند کے اپنے ہاتھوں قتل ہونے کے واقعہ کی تفصیل لکھی ہے۔ یہ قصیدہ آب زر سے لکھ کر در کعبہ پر آویزاں کیا گیا اور بقول شبلی اس نے دو سو برس تک قبیلہ تغلب میں بہادری اور شجاعت کے جوش کو برقرار رکھا۔ اس نوع کے امدادی اہمیت کے حامل قصائد کے تذکرے سے تاریخ کے صفحات معمور ہیں۔

عرب شاعر لقیط بن معبد الایادی نے اپنے ایک قصیدے میں اپنی قوم کو کسریٰ کی فوج سے ڈرایا تھا اور انہیں اپنا دفاع کرنے کے لیے جنگ پر آمادہ کیا تھا۔ اس نے ایک ایسا سردار منتخب کرنے کی تلقین بھی کی تھی جو فوج کی عمدہ قیادت کر سکتا ہو اور جنگ کی حکمت عملی وضع کرنے میں ماہر ہو۔ اس قصیدے کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے

"اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور پھر تیار ہو جاؤ کیونکہ جو تیاری کر لیتا ہے وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ اموال ازل سے مالکوں کے تابع رہے ہیں۔ پھر یکایک مالکوں پر آفت آئی۔ تم اپنے معاملات کی باگ ڈور ایسے شخص کے سپرد کیا کرو جو قوی ہو اور جنگ کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اگر آرام اور راحت کی زندگی اس کی مساعدت کرے تو وہ اترانا نہ ہو اور جب کوئی مصیبت اس پر آن پڑے تو وہ گھبرائے نہیں وہ زمانے کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہو اور کبھی تابع رہا ہو اور کبھی متبوع اور وہ کمزور ہونے کے بعد خوب قوی ہو چکا ہو۔ پختہ عمر کا تو ہو مگر نہ انتہائی بوڑھا ہو اور نہ بزدل اور کمزور" ①

الفخری میں مرقوم ہے کہ مستعصم بن عباس لہو و لعب اور گانا سننے سے بڑا شغف رکھتا تھا۔ اس کی محفلوں میں دن رات یہی شغل جاری رہتے۔ اس کے مقربین اور درباری بھی اسی کے ساتھ لذات میں گم تھے۔ عوام کی طرف سے بادشاہ کو عیش و نشاط سے باز رہنے کے لئے درخواستیں گزاری گئیں۔ در و دیوار پر تنبیہ کرنے والے اشعار آویزاں کیے گئے۔ اس عہد کے ایک شاعر نے در باب تنبیہ ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے

"اے سائل جو صرف حق کی تلاش میں ہے دعبان سے سن اس لئے کہ کچھ سوال و جواب میرے پاس بھی ہیں۔ اُف! انسانوں کا اور دین حنیف کا ضائع ہونا اور جن حوادث کا بغداد سامنا کر رہا ہے۔ بے آبروئی، قتل، سزا

① بلوغ الارب جلد چہارم ص ۷م

زنجیر ہیں اور وہ حوادث جو بچے کے سر کو سفید کر دیں" ①

اس نوع کے اشعار کے باوجود راگ رنگ کی محفلیں جاری رہیں۔ مستعصم چنگ و رباب اور مے پرستی میں گم رہا۔ ملک کی بنیادیں ہل گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ مستعصم نے والئ موصل بدر الدین لولو کو فرمائش بھیجی کہ گانے بجانے والوں کی جوکی بھیج دو۔ اسی وقت ہلاکو کا پیغامبر یہ پیغام لے کر آیا کہ منجنیق اور دوسرے آلاتِ حصار بھیج دو

قصائد میں مختلف جنگوں کے حوالے سے بھی معلومات درج ہیں۔ مامون کے بھائی معتصم نے رومی علاقہ عموریہ جب ۲۲۳ھ میں فتح کیا تو ابو تمام طائی کہ جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھا اس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا یہ بائیہ قصیدہ ہے۔ اس میں جنگ کے حوالے سے معتصم کی بہادری کی بے پناہ تعریف کی گئی ہے اس میں لکھا ہے

"تلوار کی خبر مکتوبات سے زیادہ سچی ہوتی ہے اس کی دھار جد و لعب میں حد فاصل ہے۔ اے خلیفہ خدا تجھے جزا دے کہ تو نے اصولِ دین، اسلام اور حسب کی حفاظت کے لئے بہت کچھ کیا ہے" ②

اس قصیدے میں عموریہ کی جنگ میں ہونے والی زبردست خون ریزی اور اس غصے کی مؤثر تصویر کشی ہے جو معتصم کو دشمنوں پر تھا فارسی شاعر عنصری نے فتح سومنات پر ایک طویل قصیدہ لکھا اور محمود غزنوی کے معرکوں کو قلمبند کیا۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں

تا شاہ خسرواں سفر سومنات کرد + آثار عزم را علم معجزات کرد
شطرنج ملک باخت ملک با ہزار شاہ + ہر شاہ را بہ لعب دگر شاہ مات کرد ③

قطران تبریزی نے اپنے بعض قصائد میں کہ جو ابو نصر مملان کی مدح میں ہیں اپنے ممدوح کی ان لڑائیوں کا تذکرہ کیا ہے جو اس نے ارد میر اور دار مور میں لڑی تھیں۔ اس کے قصیدہ نونیہ میں ابو نصر کے ہاتھوں امیر موغان کی شکست کا مفصل بیان ہے ④ انگریزوں کی فتح دہلی پر مبارکباد پر مشتمل غالب نے بھی ایک قصیدہ لکھا اس کا مطلع ہے

در روزگار ما نتوانند شمار یافت + خود روزگار آنچہ در ایں روزگار یافت

اردو میں بعض دکنی شعرا نے قصائد میں جنگ کے واقعات لکھے ہیں۔ دکن میں صلابت خان اور علی عادل شاہ کے معرکے اور فتح شاہی کے حوالے سے نصرتی نے علی عادل شاہ کی مدح میں ایک عمدہ قصیدہ لکھا۔ علاوہ ازیں علی عادل شاہ نے جب سیواجی کو شکست دے کر پنہالہ کا قلعہ فتح کیا تو نصرتی نے اس فتح پر بھی ایک طویل قصیدہ لکھا ⑤

شاعروں نے اپنے ادوار کے مختلف حوادث کو بھی صنفِ قصیدہ میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ قطران تبریزی کے ایک قصیدے میں ۴۳۴ھ میں تبریز میں آنے والے خوفناک اور ہلاکت آفرین زلزلے کی تفصیل ہی ہے۔ اس زلزلے میں چالیس ہزار افراد لقمۂ اجل بنے۔ قطران لکھتے ہیں

---

① الفخری ص ۵۵ - ۵۶ ② الفخری ص ۲۷۹ - ۲۸۰ ③ لمعات ناصری جلد اول ص ۱۲۴
④ تنقید شعر العجم ص ۵ - ۶ ⑤ کلیات شاہی ص ۳۵ - ۳۷

خدا به مردم شهر بتر ز بر فگند فنا + چنان به نعمت این شهر برگماشت زوال
فراز گشت نشیب و نشیب گشت فراز + رمال گشت رماد و رماد گشت رمال
دریده گشت زمین و خمیده گشت نبات + دمنده گشت بحار و رونده گشت جبال ①

اسی طرح کمال الدین اصفہانی نے اپنے قصائد میں مظالمِ مغول کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اردو میں نصرتی کے قصائد میں مرکزی ہند کی فوجوں کے مظالم کا تذکرہ ہے۔ شاہ حاتم اور سودا وغیرہ کے بعض قصائد میں اپنے ماحول کے عبرت آفریں نقشے دکھائی دیتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی نے صنفِ قصیدہ کو عظیم ہستیوں کے کارنامے اجاگر کرنے کا ایک وسیلہ بھی قرار دیا ہے② ۔ فتوحات، تعمیرات، فنونِ لطیفہ، سماجی اصلاحات کے میدان میں نمایاں کارکردگی کو شعرِ عیاں کا زمانوں کے روپ میں رکھا جاتا تھا۔ دائرۃ المعارفِ اسلامیہ میں قصائد کو تاریخی معلومات کا ایک ماخذ بھی قرار دیا گیا ہے لیکن ان تاریخی معلومات کو کہ جو قصائد سے حاصل ہوتی ہیں مکمل طور پر مستند ماننے کے لئے دیگر تاریخی استناد کا ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ قصائد سے بعض بادشاہوں کی تخت نشینی، شادی، دیگر معاملات، شاہزادوں وغیرہ کی سالگراؤں کی صحیح تاریخیں بھی مل سکتی ہیں۔ متعدد قصیدہ نگاروں نے شاہی قلعوں، محلوں، تختوں، باغوں اور مختلف تعمیروں کی عمدہ تصویر کشیاں کی ہیں۔

عباسی خلیفہ ظاہر بامر اللہ نے بغداد میں دریائے دجلہ پر ایک پل بنایا تھا۔ شاعروں نے اس پل کی تعریف میں عمدہ قصائد لکھے۔ موفق الدین القاسم کا قصیدہ بائیہ اس کی مثال ہے③ اسی طرح سلطان مسعود غزنوی نے ۴۲۸ھ میں دریائے جیحوں پر جو پل بنوایا تھا اس کے بارے میں منوچہری نے اپنے ایک قصیدے میں تفصیل مہیا کی ہے۔ سلاطین غزنی کے مسکنوں اور محلوں کی تعریف میں شاعروں نے بعض خوبصورت قصائد لکھے ہیں۔ فرخی نے اپنے ایک قصیدہ میں محمود غزنوی کے تیار کروائے ہوئے ایک باغ کی موثر تصویر کشی کی ہے، اس میں گلہائے رنگا رنگ کی کیاریاں، خوبصورت جدولیں، مصور تصویریں زیرِ بحث آئی ہیں

سہ یکے کاخ شاہانہ اندر میانش + سہ کنگرہ بر کنارہ دو پیکر
به کاخ اندروں صفہائے مصفا + در صفہا ساختہ سوئے منظر
یکے ہمچو زیبائے چینی منقش + یکے ہمچو ارژنگ مانی مصور
نگاه دیده در چند مامر مصور + شہ شرق را اندران کارہ پیکر
به یکجائے در صید در دستِ ژوبین + به یکجائے در بزم بر دستِ ساغر
ازاں کاخ فرخ چو اندر گذشتی + یکے رود آب اندرو ہمچو شکر
یمین دول شاہ محمود غازی + امین ملل خسرو بندہ پرور ④

---

① مستقبلِ شعر العجم ... ② شعر العجم حصہ پنجم ص ۲۵ ③ الغزالی ص ۳۸۶-۳۸۷ ④ اسلامی مصوری ص ۲۷/۲۸ از عبداللہ چغتائی فیروز سنز پرنٹنگ ورکس لاہور

اس قصیدے میں مصنوعی خوش نما جھیل میں تیرتی موتیوں کے آویزے والی مچھلیوں کا بھی تذکرہ ہے اور تصویر خانہ میں محمود کی تصویر کا بھی جس میں کہیں وہ برچھیاں لیے بیٹھا نظر آتا ہے اور کہیں بزمِ عیش و نشاط میں جہاں دورِ شراب عروج پر ہے۔ مسعود سعد سلمان نے اپنے ایک قصیدے میں کہ جو مسعود غزنوی کی شان میں ہے حصارِ آگرہ پر اظہارِ خیال کیا ہے (۱)

؎ حصار آگرہ پیدا شد از میانہ گرد + بسان کوہ بر و بارہا چون کہسار

مشہور فارسی شاعر بدر چاچ نے خرم آباد کے قلعے کی توصیف میں دو قصائد لکھے ہیں یہ قلعہ محمد تغلق نے ۷۴۱ھ میں بنوایا تھا ان قصائد میں سے ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائیے

؎ خرم آباد نام کرد شہ + چون ظہیر الجیوش شد معمار

شکوہ قلعہ قلعے عمارت شد + نمونہ ایست ز برج حصار قلعہ شد (۱ا)

علاء ناصر الدین محمود بہ بدر چاچ نے محل ہزار ستون کی شان میں قصیدہ لکھا (۲) تخت طاؤس پر عہد شاہجہاں میں ابو طالب کلیم کا قصیدہ خاصا مشہور ہے (۳) قلی قطب شاہ کے دیوان میں شاہی عمارات کی توصیف میں مدحیہ اشعار موجود ہیں۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں متقاقس (۴) کی تعریف میں شوقی ابو المطر کی مدح میں ابن جزی (۵) اور منصوریہ کی مدح میں نور الدین (۶) کے اشعار کا ذکر کیا ہے۔ خاقانی نے اصفہان اور تبریز کی مدح کی ہے (۷)۔ انوری نے اپنے ایک قصیدے میں بغداد کی خوشگوار فضا، عمدہ آب و ہوا اور خوب صورت منظروں کا دلکش لفظی مرقع تخلیق کیا ہے۔ اس قصیدہ کے دو اشعار ملاحظہ ہوں

؎ سواد او بمثل چون سپہر مینا رنگ + ہوائے او صفت چون نسیم جان پرور

کنار دجلہ ز ترکان سیم تن خلخ + میان رحبہ خوبان ماہ رخ کشمر (۸)

اس قصیدے میں بغداد کی جاں پرور آب و ہوا، دجلہ کے کنارے حسین ترکانِ سیم تن، سہانی صبحیں، رنگین شامیں، باغوں میں پرندوں کی مترنم آوازوں کا سحر، دریائے دجلہ کا بہاؤ، کشتیوں کی سیر اور اس نوع کے ماحول سے متعلقہ رنگینیوں کی عمدہ عکاسی نظر آتی ہے۔

ہمارے قصیدہ نگاروں نے صرف آباد شہروں ہی کی مدح سرائی نہیں کی، اجڑے شہروں اور کھنڈرات کی ویرانیوں کو بھی موضوعِ اظہار بنایا ہے۔ دورِ جاہلیہ کی عرب شاعری میں ویران کھنڈرات کا متعدد مقامات پر تذکرہ آیا ہے۔ اسلام کی آمد کے بعد قرآن میں مندرج اجڑی بستیوں کی موثر تصویریں خصوصاً عاد و ثمود اور یونس و لوط وغیرہ کی اقوام کے برباد ہونے کے نقشے کچھ اس طور سامنے آئے ہیں کہ بہت سے شاعروں نے ان سے متاثر ہو کر اپنے قصائد میں اجڑے مقامات کو بالتفصیل پیش کیا۔ ابو عبادہ ولید بن عبید البحتری کا عربی قصیدہ سینیہ ایوانِ کسریٰ کی گزشتہ زندگی اور ویرانیوں کا قصہ سناتا ہے۔ فارسی شاعر خاقانی نے ایوانِ مدائن کی (۹) ویرانیوں کی انتہائی ماہرانہ لفظی عکاسی

---

(۱) دیوان مسعود سعد سلمان مرتبہ ناصر ہیری ص ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴ مرتبہ ناصر ہیری چاپخانہ فرائض تہران ۱۳۶۲ ہجری شمسی

(۱ا) مختصر شرح قصائد بدر چاچ ص ۲۰۸ (۲) دیوان بدر چاچ ص ۳۹ (۳) دیوان ابو طالب کلیم کاشانی مرتبہ پرتو بیضائی ص ۵۳ تا ۵۵ تہران ۱۳۳۶ ہجری شمسی (۴) (۵) (۶) سفرنامہ ابن بطوطہ بالترتیب ص ۳۲، ۵۷، ۱۱۲

(۷) دیوان خاقانی ص ۱۰۳، ۲۰، ۶۲ چاپ پیروز تہران ۱۳۳۸ ہجری شمسی (۸) دیوان انوری مرتبہ سعید نفیسی ص ۱۱۱، ۱۱۲ تہران ۱۳۳۷ ہجری شمسی

(۹) دیوان خاقانی ص ۳۲۱

کی ہے۔ اس نوع کے قصائد کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں امراء القیس اور عنترہ وغیرہ کے مشہور قصائد کی خوشہ چینی کی گئی ہے خصوصاً ان اشعار میں جن کا تعلق لفظی تصویر کشی سے ہے۔

قصائد سے اور بھی کئی نوع کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض قصیدوں میں شاہی درباروں میں آنے والے غیر ملکی سفیروں کی بابت بعض معلوماتی حقائق ملتے ہیں۔ صباح الدین عبد الرحمن کا کہنا ہے کہ ۶۲۶ھ میں سلطان ایلتتمش کو خلیفہ ابوجعفر منصور المستنصر نے اس کی حکومت کے استقلال اور خود مختاری کو تسلیم کرکے خلعت بھیجا تو سلطان نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ خلعت لانے والے سفیر کا خیر مقدم کیا۔ دار السلطنت کو آراستہ کیا گیا۔ محل کی دیواروں پر نقاشی کی گئی۔ شہر میں تین قبے بنائے گئے۔ اس موقعہ پر تاج الدین ریزہ نے قصیدہ لکھا اس میں در و دیوار پر نقاشی کی جانے کا بھی ذکر تھا اور اس واقعے کا بھی۔ اسی طرح مولانا منہاج سراج کا بھی ایک قصیدہ دستیاب ہے جو انہوں نے سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں ہلاکو خان کے ایلچی کی آمد پر دربار میں پیش کیا تھا۔ عہد شاہجہان میں قیصر روم نے اپنے ایک سفیر کے ذریعے سے یہ پیغام بھجوایا کہ ہندوستان کا بادشاہ ہوکر شاہجہان کا لقب اختیار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس اعتراض پر شاہجہان کچھ پریشان سا ہوا تو ابوطالب کلیم نے فوراً ایک قصیدہ کہہ کر پیش کیا جس میں اس نے سفیر مذکور کے اعتراض کا جواب دے کر اسے لاجواب کر دیا تھا اس قصیدے میں یہ شعر بھی تھا

؎ ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکے است + شہ را خطاب شاہ جہاں مبرہن است

قصیدہ اور دربار

یہ حقیقت شبہ سے بالاتر ہے کہ صنفِ قصیدہ کی حقیقی پرورش شاہی درباروں ہی کے زیرِ سایہ ہوئی ہے۔
عرب، ایران اور ہندوستان کے اکثر و بیشتر حکمرانوں نے قصیدہ گو شعرا کی قدر افزائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شاعروں کو بلند مراتب
عطا ہوئے ان پر شاہی عنایات و نوازشات کے دروازے کھولے گئے۔ اس ضمن میں ضیاء الدین برنی کے ایک تلخ بیان کو ذہن میں
رکھنا چاہیے۔ ضیاء الدین برنی نے شاعروں کے کلام کو پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں دی اور کہا ہے کہ بادشاہوں کو شاعروں اور اس قبیل

قصیدہ اور دربار

●

یہ حقیقت شبہ سے بالاتر ہے کہ صنفِ قصیدہ کی حقیقی پرورش شاہی درباروں ہی کے زیرِ سایہ ہوئی ہے۔
عرب، ایران اور ہندوستان کے اکثر و بیشتر حکمرانوں نے قصیدہ گو شعرا کی قدر افزائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شاعروں کو بلند مراتب عطا ہوئے ان پر شاہی عنایات و نوازشات کے دروازے کھولے گئے۔ اسی ضمن میں ضیاءالدین برنی کے ایک تلخ بیان کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ضیاءالدین برنی نے شاعروں کے کلام کو پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں دی اور کہا ہے کہ بادشاہوں کو شاعروں اور اس قبیل کے دیگر افراد کو قربت بخشنے کی بجائے مورخوں پر کرم نوازی کرنی چاہیے۔ اس مقام پر یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اگر تاریخ میں شاہوں، شہزادوں اور مصاحبوں کے حوالے سے جنگوں، فتوحات، کارناموں یا انتظامی حکمت عملیوں کے تذکرے دستیاب ہیں تو شاعری میں بھی شاعر اپنے عہد کے ثقافتی، تہذیبی، سیاسی اور طبقاتی ماحول کی اونچ نیچ کو سموتے آئے ہیں۔ شاعر کی جوعلی امادیت کا تذکرہ شاید یہاں بے محل ہو اس لئے براہِ راست قصیدے پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ قصیدہ گوئی کا ملکہ بھی کسی لحاظ سے بے کار نہیں تھا۔ قصائد میں جہاں دربار اور اس سے متعلقہ ماحول کی تفصیل نویسیاں ہیں وہیں مجموعی سماجی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ خصوصاً تشابیب میں غیر محدود موضوعات کے روا ہونے کی بدولت ان میں متعلقہ ماحول، موسم، مناظر، علوم کا اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ قومی و نسلی تعصب، تصوف، فلسفہ، عقائد وغیرہ کے موضوعات، مختلف تاریخی اہمیت کے واقعات، آپ بیتیاں، جنگوں کے حالات، آباد اور ویران شہروں کی تصویریں، قلعوں اور عمارتوں کے نقوش اور سلطنتوں کی توسیع وغیرہ کے سلاسل بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ مشہور ہرم بن سنان کے بیٹے سے فرمائش کی کہ وہ زہیر کے وہ اشعار سنائے جو اس نے ان کے خاندان کے بارے میں کہے ہیں۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور شعر سنائے حضرت عمرؓ نے کہا "وہ تمہارے بارے میں خوب باتیں کہہ گیا ہے" سنان کے بیٹے نے جواب دیا "ہم نے بھی تو اسے ان اشعار کے بدلے میں عطیات سے نوازا ہے" حضرت عمرؓ نے فی الفور کہا "جو کچھ تم نے اسے دیا وہ تو معدوم ہو گیا لیکن جو کچھ اس نے تمہیں دیا وہ موجود اور قائم ہے"[1] یہ بات تو طے ہے کہ جہاں مدحیہ قصائد کی بدولت ممدوح کی شخصیت تاریخِ شعر و ادب کا حصہ بن جاتی ہے وہیں شاعر بھی اس مدح سے کچھ نہ کچھ فائدہ اور معاوضہ حاصل کرتا ہے زہیر بن ابی سلمیٰ کا شعر ہے

مدح الملوک وسعی فی مسرتھم + ثم الغنی ویدا لممدوح تنطلق

ترجمہ
[بادشاہوں کی مدح اور انہیں مسرت بہم پہنچانے کی کوشش کرنا اور پھر دولت حاصل کرنا اور ظاہر ہے کہ ممدوح کا ہاتھ کھلا رہتا ہے]

بہت سے شاعروں نے صلے کی امید سے قطع نظر ذاتی پسند اور قولی رغبت کی بنیاد پر عمدہ قصائد کہے ہیں۔ حارث بن حلزہ کے طویل قصیدے کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے اسے ۱۳۵ برس کی عمر میں فی البدیہہ کہا تھا۔ اس وقت وہ کمان کے سہارے کھڑا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی ہتھیلی کٹ گئی۔ بعض راویوں نے کمان کی جگہ نیزہ بھی بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ نیزہ

---

① بلوغ الارب جلد سوم ص ۶۱۸-۶۱۹

اس کے جسم میں پیوست ہوتا رہا مگر اس کا شعری انہماک برقرار رہا۔ اس روایت کے مفاہیم کی کیا کیا جہتیں ہیں ان پر توجہ دیے بغیر اتنا تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ بعض قصیدہ نگاروں نے شعری کیفیات میں مست و مگن ہو کر قصیدے لکھے ہیں۔ ظہیر فاریابی نے اپنا وہ قصیدہ جس کی ردیف گوہر ہے ممدوح کی فرمائش پر فی البدیہہ لکھا تھا۔ یہ فرمائش اس وقت کی گئی تھی جب ممدوح فیروزہ کی کان دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ بعض قصائد نگار کئی نشستوں میں قصیدہ تیار کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید قصیدہ کی طوالت یا موضوعاتی اور فنی غور و فکر ہے۔ یہاں اس امر سے غرض نہیں ہے کہ شاعر قصیدہ لکھنے میں کتنا وقت صرف کرتا ہے یہ بات بس حافظے میں رکھنے کی ہے کہ قصیدہ پر جو مصنوعی اور غیر فطری صنف سخن ہونے کا الزام ہے تو یہ الزام صرف قصیدہ پر ہی نہیں اور بھی بہت سی شعری اصناف پر لگایا جا سکتا ہے۔ حالی نے تو مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری کے نظریہ آورد ہی کو بنیادی اہمیت دی ہے اور لکھا ہے کہ شاعری کے لئے غور و فکر لازمی ہے۔ نظریہ آورد کی حقانیت کو مانا جائے یا نظریہ آمد کی اصل مطلب شعری کیفیات میں ڈوب کر شعر کہنے کا ہے۔ قدیم عرب شعرا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ صلے کی تمنا یا توقع میں شاعری کرنے کو معیوب جانتے تھے پھر اسی علاقے میں ایک ایسا زمانہ بھی آیا کہ اگر کسی شاعر کو اس کے قصیدے کا صلہ یا انعام نہیں ملا تو اس نے یا تو ممدوح کی ہجو لکھی یا قصیدے کو کسی اور کے نام کر دیا۔ ہندوستان میں غالب نے اپنے بعض قصائد میں ممدوح کا نام تبدیل کیا ہے اسی نوع کا ایک واقعہ نظامی بدایونی نے بھی لکھا ہے ان کے مطابق مولانا بنائی نے امیر علی شیر کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا اور بعد میں اسے یہ کہہ کر سلطان احمد مرزا کی مدح میں تبدیل کر دیا کہ میں اپنی (لڑکیاں) بغیر مہر کے نکاح میں نہیں دے سکتا امیر علی شیر بہت غصے ہوا اور اس کے قتل کا پروانہ بادشاہ سے حاصل کر لیا۔ شومئی قسمت سے وہ (۹۱۵ھ = ۱۵۱۲ء) شاہ اسماعیل کے قتل عام میں مارا گیا (۱)

یہ بھی شاید شعرا کے سر الزام ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ صلہ نہ ملنے کی صورت میں ہجو لکھتے تھے۔ سب شاعروں کا یہ وتیرہ نہیں تھا۔ قدیم عربی شاعر تو قصیدے کے بدلے میں شکریہ ہی کو صلہ جانتے تھے۔ ہجو کہنے کی اور بھی وجوہات تھیں۔ ابوالفرج اصفہانی جو کتاب الاغانی کے مصنف ہیں انہوں نے عباسی خلیفہ متقی للہ کے وزیر ابو عبداللہ بریدی کی ہجو اس بنا پر کی کہ خلیفہ نے ایک ناقابل اعتماد شخص پر اعتماد کیا (۲)۔ اسی طرح خلیفہ معتصم کے وزیر فضل بن مروان کی فرعونیت پر شاعروں نے ایسے اشعار لکھے جو ان کے آزاد ضمیر کی آگ کے مظہر ہیں۔ فضل بن مروان کے بارے میں ابن طباطبا نے لکھا ہے کہ وہ نہ علم رکھتا تھا نہ واقفیت، اس کا کردار گھٹیا تھا اور امور مملکت کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا (۳)۔ معتصم ہی کے دور کا ایک اور وزیر احمد بن عمار بن شادی ہے کہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آداب وزارت سے نابلد تھا اس کے خلاف اس کے معاصر شعرا نے ہجویہ اشعار لکھے ہیں (۴)
شاعر نا اہل اشخاص کا قصیدہ لکھنے سے انکار بھی کر دیتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے نگارستان فارس میں بیدل اور اعظم شاہ پسر عالمگیر کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک دن اعظم شاہ کے دربار میں عصری شعراء کا تذکرہ تھا۔ کسی نے بیدل کو اسی دور کا شاعر یکتا قرار دیا۔ شہزادے نے کہا کہ تعجب ہے کہ اس نے ہماری تعریف میں آج تک کچھ

---

(۱) قاموس المشاہیر جلد اول ص ۱۳۱ از نظامی بدایونی مطبع نظامی بدایوں (۲) تا (۴) الفخری ص ۲۸۲ - ۲۸۳

نہیں کیا اس سے کہو کہ ایک قصیدہ کہے تاکہ زورِ طبیعت معلوم ہو اور اس کے بموجب اس کے منصب میں اضافہ کیا جائے۔ جب بیدلؔ کو اس بات کی خبر ہوئی تو انہوں نے فوراً استعفیٰ دے دیا اور درویشی کی چادر اوڑھ لی (۱)۔ دکن میں علی عادل شاہ کے درباری شاعر نے بھی یہ کہہ کر کہ جو زبان حمد، نعت اور منقبت کے لئے وقف ہو چکی ہو اب میرے اختیار میں نہیں کہ میں اس کی مدد سے کسی شاہ کا قصیدہ لکھوں۔ یوں اس نے علی عادل شاہ کی فرمائش کو ٹھکرا دیا (۲)

مذکورہ امثلہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حقیقی شاعر کسی خارجی دباؤ اور حکم کے اسیر ہو کر شعر گوئی نہیں کرتے تھے۔ ایسے قصیدہ گو شعرا بھی گزرے ہیں جو فرمائشی قصیدہ نویسی کو معیوب ٹھہراتے تھے وہ صاف صاف کہہ دیا کرتے تھے کہ پہلے کچھ کر کے دکھاؤ" پھر اپنا قصیدہ لکھواؤ۔

ادبی اور سیاسی تاریخوں میں مندرج بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہی درباروں میں شعرا کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ عرب خلفا، شاعروں کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھاتے تھے اور انہیں گرانقدر عطیات دیتے تھے۔ سلاجقہ، مملوک سلاطین اور مغل بادشاہ بھی اس ضمن میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

عرب شاعر جریر م ۷۲۹ء کو اموی خاندان کے خلیفہ عبدالملک نے صرف ایک مدحیہ قصیدے پر سو اونٹ، اٹھارہ غلام اور ایک چاندی کا آفتابہ انعام میں دیا (۳)۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید جس کے عہدِ حکومت کا آغاز ۷۸۶ء میں ہوا مدحیہ قصائد کو مرغوب خاطر رکھتا تھا۔ فصیح و بلیغ شعرا کا تو وہ خصوصیت سے عاشق تھا۔ انہیں وہ گرانقدر انعامات سے سرفراز کرتا۔ اس کے بارے میں یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ابوالعتاہیہ کو بلا کر اس سے فرمائش کی کہ اسے (خلیفہ کو) جو دنیاوی نعمتیں حاصل ہیں ان کی صفت بیان کرے۔ ابوالعتاہیہ نے اشعار میں ان کی جی کھول کر تعریف کی (۴)۔

مامون رشید کی خلافت کا عہد فارسی شاعری کے آغاز کا عہد بھی ہے۔ مامون کی مادری زبان فارسی تھی اس نے اپنی عمر کی کچھ مدت خراساں میں بھی گزاری تھی۔ اس کے دربار میں عرب شعرا قصائد پیش کر کے گراں بہا صلے پاتے تھے۔ عباس مروزی کہ جو ایرانی شاعر تھا اس نے مامون کی مدح میں عمدہ قصیدہ لکھ کر حسب توقع صلہ پایا۔ قصیدہ کا مطلع تھا

اے رسانیدہ بدولت فرقِ خود بر فرقدین + گسترانیدہ بفضل وجود در عالم یدین (۵)

سلجوق بادشاہ بھی اپنے مادحین کو مایوس نہیں کرتے تھے ظہیر الدین فاریابی نے جب اپنا موزوں قصیدہ جس کا مطلع ہے

زلفِ سرمستش چو در مجلس پریشانی کند + جان اگر جان در نیفشاند ازو گران جانی کند

قاصدوں کے وسیلے سے سلجوقی بادشاہ رکن الدین سلیمان شاہ کی خدمت میں بھجوایا تو اس کے عوض اسے سلطان نے دو ہزار دینار، دس گھوڑے، پانچ خچر، پانچ غلام، پانچ لونڈیاں اور ہر قسم کے پچاس خلعت عطا کیے (۶)

اسی طرح سلجوق سلطان عزالدین کی خدمت میں جب حسام الدین سالار کی بیٹی نے موصل سے بہتر اشعار کا ایک قصیدہ

---

(۱) نگارستان فارس ص ۲۱۹ (۲) کلیات شاہی مرتبہ زینت ساجدہ ص ۵۷ اردو اکادمی حیدرآباد
(۳) قاموس المشاہیر جلد اول ص ۱۶۸ (۴) الفخری ص ۲۳۲ (۵) لباب الالباب از محمد عوفی ص ۲۱ کیمبرج ۱۹۰۲ (۶) سلجوق نامہ از علاؤ یحییٰ بن محمد ابن بی بی ص ۲۰ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۵ء

بھیجا تو اس کے ہر شعر کے معاوضے میں سو دینار سرخ عنایت کیے گئے۔ (۱)

آذرکی رازی کو سلطان محمود غزنوی نے ایک مختصر قصیدے کے صلہ میں ۱۲ ہزار دینار تفویض کیے۔ (۲)

صباح الدین عبدالرحمن نے مسالک الابصار کے مصنف کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے دربار میں بارہ سو علمی اور ایک ہزار عربی، فارسی اور ہندی شعرا تھے۔ ان کو سلطان خاطر خواہ تنخواہیں اور جاگیریں دیا کرتا تھا۔ شاہی دسترخوان پر یہ لوگ باری باری بلائے جاتے۔ شعرا کی باریابی سال میں کئی دفعہ ہوتی تھی۔ وہ عیدین اور رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو ضرور حاضر ہوتے اور اپنے قصائد سناتے (۳)

جہانگیر نے اپنی تزک میں جہاں ایک ہندی شاعر راجا سورج سنگھ کو انعام دینے کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے نظیری نیشاپوری کی قدر افزائی کی۔ سعیدا زرگر کو اشرفیوں سے تلوایا اور طالب آملی کو ملک الشعرا کا خطاب دے کر امتیازی خلعت سے نوازا

جان محمد قدسی نے شاہجہان کی شان میں بہت قصائد لکھے۔ شاہجہان نے ایک قصیدہ کے عوض اس کا منہ سات دفعہ جواہرات سے بھروایا۔ ۱۰۴۲ھ میں جلوس شاہی کے دن قدسی نے قصیدہ سنایا تو شاہجہان نے اسے سونے میں تلوایا۔ عبدالحمید لاہوری نے شاہجہان نامہ میں اس سونے کا وزن ایک من اٹھارہ سیر لکھا ہے۔ صوفی رقمطراز ہے کہ شاہجہان کے ایک مقرب ہندی شاعر نے بادشاہ کے نام ایک کبت کہہ کر گزرانا۔ بادشاہ نے اسے ایک ہتھنی اور دو ہزار روپیہ عطا کیا (۴)

قطب الدین ایبک نے بہاؤالدین اوشی، قاضی حمید الدین اور جمال الدین محمد کو، ایلتتمش اور رکن الدین فیروز شاہ نے تاج الدین ریزہ کو، غیاث الدین بلبن، کیقباد اور مبارک خلجی نے امیر خسرو کو، سلطان محمد تغلق نے ملک غازی، بدرالدین چاچ، سعد منطقی، عبید زاکانی کو، بابر اور ہمایوں نے شیخ جمالی کو، اکبر نے فیضی، عرفی، خواجہ حسین ہروی کو، جہانگیر نے حیا گیلانی، طالب گیلانی، ملا محمد صوفی مازندرانی، زرگر باشی کاشی، قولشورہ کاشی، طالب آملی، نظیری اور ملا شیدا کو، شاہجہان نے جان محمد قدسی، ابوطالب کلیم اور وحیدی تہرانی وغیرہ کو اور بہادر شاہ ظفر نے غالب اور ذوق وغیرہ کو ان کے قصائد کے صلے میں بیش بہا انعامات سے نوازا

وزرا اور امرا بھی بادشاہوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شعرا پر عنایات کے دروازے کھلے رکھتے تھے۔ خلیفہ مہدی بن منصور (آغاز خلافت ۱۵۸ھ) کا وزیر فیض ابی صالح نیشاپوری کہ جو پہلے نصرانی تھا بعد میں عہد بنو عباس میں مسلمان ہوا سخاوت و داد و دہش میں بے مثال تھا۔ ابن طباطبا کا کہنا ہے کہ وہ داد و دہش کے طرح طرح کے طریقے ایجاد کرتا تھا۔ ابوالاسود حمانی نے وزیر موصوف کی مدح میں کہا ہے ترجمہ "اے فیض ایک ملامت کرنے والے نے سخاوت میں تم پر طعن کیا تو میں نے اس سے کہا ملامت سمندر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی"۔

عہد شاہجہان میں منصب ہفت ہزاری پر فائز عبداللہ خان زخمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک سفر کے دوران اس کی شان میں جب قدسی نے قصیدہ پڑھا تو وہ مسند سے اٹھ کھڑا ہوا اور قدسی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود لباس شب خوابی میں ہی پالکی پر سوار ہو کر لشکر سے باہر نکل گیا اور تمام مال و اسباب اور خیمہ و خرگاہ اسے سونپ دیا۔

---

(۱) سلجوق نامہ ص ۴۲ (۲) قاموس المشاہیر جلد اول ص ۲ (۳) تمدنی جلوے از صباح الدین عبدالرحمن ص ۶۵ (۴) منتخب اللباب حصہ دوم ص ۲۴۷
(۵) الفوزی ص ۲۴۴

میاں ناصر علی سرہندی نے نواب ذوالفقار خاں سپہ سالار اورنگ زیب عالمگیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ ابھی اس نے اس کی محفل میں مطلع ہی پڑھا تھا کہ نواب نے ایک لاکھ روپیہ مع خلعت وجواہر انعام دیا اور کہا کہ دوسرا شعر نہ پڑھیے مرا خزانہ جواہر مضامین کی قیمت کے لئے کافی نہیں ہے۔ نواب نے شاعر مذکورہ کو ہاتھی پر سوار کر کے رخصت کیا۔ اس قصیدہ کا مطلع تھا

اے شانِ حیدری ز جبین تو آشکار + نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار (۱)

بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کی شاعروں پر عنایات کی تفصیل ایک الگ ضخیم مقالے کی متقاضی ہے۔ ہمیں اس مقام پر صرف اتنا ہی کہنا تھا کہ علم دوستی اور ادب پروری میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ بادشاہوں وزیروں اور امیروں کی ایک بڑی تعداد خود بھی عالموں، شاعروں اور مصنفوں کی صف میں شامل ہے۔ البتہ ایک ایسی روایت بھی تاریخ میں ملتی ہے جس کے مطابق ہارون الرشید جیسے خلیفہ کو اپنے بیٹے مامون کا شاعر ہونا معیوب معلوم ہوا۔ یہ روایت شبلی نے بیان کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ایک موقعہ پر کہ جب ہارون الرشید نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ایک ہفتے کے بعد سفر پر روانگی کے لئے تیار رہے اور ہفتہ گزر جانے پر بھی اہل لشکر کو اس کے ارادے کا ٹھیک حال معلوم نہ ہو سکا تو مامون رشید نے ارکانِ دربار کی فرمائش سے ایک قطعہ لکھ کر مامون کی خدمت میں پیش کیا جس میں اس غیر یقینی حالت کے خاتمے کی درخواست کی گئی تھی۔ ہارون نے جواب میں ایک رقعہ لکھا جس میں درج تھا کہ شاعری عالی رتبہ لوگوں کے لئے عزت کا باعث نہیں ہے۔ یہ تو عام آدمیوں کے لئے باعثِ فخر ہے (۲)

اور حیرت ہے کہ ہارون الرشید جیسے اعلیٰ ذوق کے حامل خلیفہ سے ایسا غیر مدبرانہ بیان سرزد ہوا۔ عرب تو شاعروں کی قدر افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ اگر شاعری ایسا ہی کمتر درجے کا فعل ہوتا تو دیگر بادشاہ، وزراء اور امراء اس سے گریز کرتے۔ عرب قبائلی سرداروں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک شاعر حکمرانوں کی ایک طویل فہرست گنوائی جا سکتی ہے۔ بہرحال اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے اتنا کہنا کافی ہے کہ مامون رشید نے شاعری کو اپنے لئے کبھی معیوب نہیں جانا۔ وہ شہزادگی کے زمانے میں ابونواس، ابو العتاہیہ وغیرہ جیسے عربی شعرا اور دانشوروں کی محافل میں شریک ہوتا تھا۔ شبلی نے لکھا ہے "سخنوری کے لحاظ سے مامون ایک بلند مرتبہ شاعر تھا۔ اس کے اشعار کی نازک خیالی اور مضامین کی خوبی لائق تحسین تھے۔ شبلی مامون کی زود فہمی اور نکتہ سنجی کی بھی بے حد تعریف کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ایک موقعہ پر جب عمارہ بن عقیل نے سو شعروں کا ایک مدحیہ قصیدہ اس کی خدمت میں پیش کیا تو ہر شعر پر مصرعہ ثانی شروع ہونے سے پہلے مامون بتاتا گیا کہ یہ قافیہ ہے اور اس پہلو سے بندھا ہو گا (۳)

بلند پایہ علمی اور شعری ذوق کی تحصیل بادشاہوں اور حکمران طبقوں کی تعلیم کا حصہ تھا۔ سلطان محمد تغلق خود شاعر بھی تھا اور عالم فاضل بادشاہ بھی وہ منطق، ہیئت، فلسفہ، ریاضی اور طبیعات میں مہارت رکھتا تھا۔ سعد منطقی، عبید شاعر اور نظام الدین انتشار وغیرہ سے اس کے علمی مباحثے ہوتے تھے۔ ان مباحثوں میں وہ ان ممتاز شعرا، ادبا اور اہل علم کو زچ کر دیا کرتا تھا (۴)۔ اکبر بھی کبھی کبھی شعرا کے مصرعوں میں اصلاح کر دیا کرتا تھا۔ جہانگیر کے متعلق

---

(۱) نگارستان فارس ص ۱۹۸-۱۹۹ (۲) المامون ص ۳۲ (۳) ایضاً ص ۱۹۸ (۴) تمدنی جلوے ص ۶۶

بھی یہ روایت کی جاتی ہے کہ وہ شاعری کے عمدہ ذوق سے بہرہ یاب تھا۔ اس کے سامنے شاعر احتیاط سے شعر پڑھتے تھے۔ اسے شعر میں عیب پسند نہیں تھا۔ ایک مرتبہ ایک شاعر نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا اسکا مصرعہ تھا

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے شاعر سے استفسار کیا "کیا تم عروض جانتے ہو" شاعر نے نفی میں جواب دیا۔ جہانگیر نے کہا اچھا ہوا ورنہ تمہارے قتل کا حکم ہوتا پھر مصرعہ کی تقطیع کر کے بتایا کہ اسکا دوسرا رکن یوں آتا ہے "لت بر سرت" یہ گستاخی ہے ①

جہانگیر کے ذوق شعری کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی تزک میں جگہ جگہ اشعار کو حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے وہ ایک جگہ رقمطراز ہے "انہی دنوں عنصری کا ایک نہایت سلیس اور رواں قصیدہ سننے میں آیا یہ اس نے سلطان سنجر کی مدح میں کہا تھا۔ اس قصیدہ کا تذکرہ سن کر سعید زرگر نے اسی زمین میں ایک قصیدہ جہانگیر کی مدح میں لکھا ②

عباسی خلیفہ ناصر الدین اللہ کے عہد کے ایک وزیر سید نصیر الدین ناصر مہدی علوی رازی کے متعلق ابن طباطبا نے لکھا ہے کہ ایک عجمی شاعر ابہری نے اس کی شان میں قصیدہ لکھا جسکا ایک شعر تھا

؎ صریر کلک تو در کشف مشکلات امور + کرہم چو نغمۂ داؤد در ادائے زبور

یہ قصیدہ اس نے ایک تجارتی قافلے کے مسافر کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے وزیر تک پہنچا دو لیکن اسے یہ نہ بتانا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ جب یہ قصیدہ وزیر کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اسے پسند کیا اور اس تاجر کو ایک ہزار طلائی دینار دیے اور کہا کہ یہ رقم ابہری کو دے دینا مگر اسے یہ نہ بتانا کہ یہ انعام کس نے دیا ہے ③

بادشاہ اور امرا جہاں شاعروں سے خوش ہوتے تھے اور ان کے فن کو سراہتے تھے۔ وہاں شاعری سے ان کی طبیعت منغض ہونے کے واقعات بھی تواریخ میں درج ہیں۔ سلیمان صفوی کے بارے میں مرقوم ہے کہ اس نے صائب تبریزی سے اس کی محض ایک معمولی سی شاعرانہ شوخی پر خفا ہو کر نہ تو پھر کبھی اس سے شعر سنا اور نہ ہی تا دم العمر اس سے گفتگو کی ④۔ سرخوش نے لکھا ہے کہ ملا شیدا کہ جو جہانگیر کے عہد کے آخر اور شاہجہان کے آغاز کے زمانے میں ہندوستان آیا یگانۂ روزگار تھا اس نے ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے + حسن را پروردگار عشق را پیغمبرے

یہ قصیدہ مقبول خاص و عام ہوا اور اسے موسیقی کی پوشاک بھی ملی۔ مگر شاہجہان نے اس بنا پر اس سے برہمی کا اظہار کیا کہ اس میں شراب یا ام الخبائث کو (جس کی ممانعت قرآن میں آئی ہے اور جس کی مذمت شریعت نے کی ہے) پیغمبر تک پہنچا دیا گیا ہے ⑤ شاہجہان نے حکم دیا کہ شاعر سے کہہ دو کہ وہ فوراً ہماری قلمرو سے باہر چلا جائے ملا شیدا نے اس برہمی کو محسوس کیا اور معذرت کے طور پر ایک قطعہ لکھا جس پر اس کا قصور معاف ہوا

بہر حال بادشاہ تھے کسی سے خوش یا ناخوش ہونا ان کا حق تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ شاہجہان

---

① تمدنی جلوے ص ② ایضاً ③ الفخری ص ۲۸۲ ④ مضامین عبدالماجد آزاد ص ۶۹ ⑤ کلمات الشعراء ص ۵۷ (فارسی) از محمد افضل سرخوش ناشر شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۴۲ء

اگر مذکورہ قصیدہ کو تصوف کے حوالے سے پڑھنے کی کوشش کرتا تو کوئی ایسی بات نہ تھی (۱) شاہجہان کے جد امجد اکبر بادشاہ نے دین الٰہی کو فروغ دے کر شاعروں کی ہمت اس حد تک بڑھا دی تھی کہ وہ خدا اور رسولؐ کی شان میں بھی گستاخی کرنے سے نہیں چوکتے تھے وہاں کسی شاعر کی جلا وطنی کا حکم صادر نہیں ہوتا تھا۔ ابوالفیض فیضی نے اکبر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے

شکر ایزد را کہ مداح شہ بحر و بر آم + شاعر خاص جلال الدین محمد اکبرم

جلال الدین محمد اکبر کو شہ بحر و بر کہنے والا یہ شاعر صرف یہیں تک محدود نہیں رہا نعوذ باللہ اسی قصیدے میں اس نے حضورؐ کی شان میں بھی گستاخی کی۔ یہ تو یہ قلعہ کشمیر کے دروازے پر جو قطعہ تاریخ لکھا گیا ہے اسکا ایک شعر ہے

ع شہ شاہان عالم شاہ اکبر است + تعالیٰ اللہ شانہٗ اللہ اکبر (۲)

حقیقت میں اس نوع کے مفاہیم میں الجھے ہوئے شعرا کو راہ راست پر لانے کی ضرورت تھی۔

شاعر بسا اوقات درباروں میں بے تکلف بھی ہو جایا کرتے تھے مثلاً خاقانی نے اپنے ایک قصیدے کے ایک شعر میں خاقان سے کنیز یا امرد غلام طلب کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خاقان سے اتنا بے تکلف تھا کہ اس کے سامنے اپنے جذبات کا آزادانہ اور کھلا اظہار بھی کر لیتا تھا۔ وہ شعر یہ تھا

ع وثیقہ دہ کہ در برم گیرم + یا وثاقی کہ در برش گیرم (۳)

شاعری کی کوئی بھی صنف کیوں نہ ہو اسمیں شاعروں کے تہذیبی ثقافتی اور فکری ماحول کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ قصیدہ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

---

(۱) نگارستان فارس ص ۱۹۰ (۲) ایضاً ص ۱۲۹ (۳) مضامین عبدالملک آروی

باب دوم

عربی اور فارسی قصیدہ

فصل اول : عربی قصیدہ پس منظر
فصل دوم : عربی قصیدہ کے ادوار
فصل سوم : فارسی قصیدہ
ایران اور ہندوستان میں

فصل اول عربی قصیدہ پس منظر

ظہورِ اسلام سے قبل عرب علاقہ قبائلی نظام کا تابع تھا۔ عرب آبادی دو بڑے طبقوں یمنی (قحطانی) اور حجازی (عدنانی) میں منقسم تھی۔ یمنی علاقوں میں کہلانی اور حمیری شاخوں سے وجود پذیر ہونے والے قبائل سرگرم تھے۔ حجازی علاقوں میں ربیعی اور مضری شاخوں سے جنم لینے والے قبائل کی عملداری تھی۔ عاد، ثمود، طسم، جدیس، عملیق اور عبد ضخم وغیرہ قومیں بھی انہی علاقوں میں آباد تھیں[1]۔ تاریخ اور آثار ان کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا کرنے سے قاصر ہیں البتہ قرآن میں عاد و ثمود کی تباہی کا ذکر موجود ہے۔

عرب قبیلہ فی الاصل ایک بڑے خاندان کا نام تھا۔ اسکا ہر فرد ایک دوسرے کے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں پورے طور پر شریک رہتا تھا۔ گروہ کو فرد پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ہر قبیلہ ایک سیاسی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی وحدت کا حامل تھا۔ قبائلی سردار مختارِ کل کا درجہ رکھتا تھا۔ قبیلے کے مفادات کی حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ قبائلی معیارِ اخلاق عقل سے زیادہ رسوماتی ہوا کرتا تھا۔ رسومات کے مخالف کسی عمل سے سمجھوتہ نہیں کیا جاتا تھا۔ کسی قبیلہ میں صاحب الرائے شخص کو سردار چنا جاتا تھا اور کسی میں حسب نسب کو دیکھا جاتا تھا۔ بعض قبیلے مہمانداری کرنے والے شخص کو سردار بناتے تھے اور بعض سخاوت، بہادری، صبر، حلم اور قوتِ بیان وغیرہ کے اوصاف سے متصف شخص کو منتخب کرتے تھے۔ ذاتی عقل، عفت، علم اور ادب وغیرہ کے میدانوں میں امتیاز کے باعث بھی کسی کے سر پر پیمانۂ سرداری جا بیٹھتا تھا۔ اس ضمن میں اشراف دوستی، غریب نوازی اور ساتھی پروری وغیرہ کے اوصاف کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ جب ہم عرب قبائلی سرداروں کے کرداروں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں وہ کم و بیش مذکورہ اوصاف ہی کے حامل نظر آتے ہیں۔ دور نگی دنیا کی ریت سے بھی مفر ممکن نہیں ہے بسا اوقات مختلف وجوہات کی بنا پر مذموم کردار کے حامل افراد بھی سرداری کے مرتبہ تک آ پہنچتے تھے۔ کم سن، بخیل، زانی، جابر، بے وقوف، احمق، محتاج اور تنگدست بھی صاحبِ سرداری حاصل کر لیتے تھے تاہم ایسے سردار ناپسندیدگی ہی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[2]۔

حسب نسب، زبان اور تہذیب و تمدن کے اختلافات کی وجہ سے مختلف قبائل آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ کسی چھوٹے یا بڑے سبب سے یا بلا سبب ایک قبیلہ موقع پا کر دوسرے پر چڑھائی کر دیتا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم کرتا تھا۔ اونٹ، مال و اسباب، لڑکیاں اور عورتیں سب کچھ لوٹ کر لے جاتا تھا۔ شکست خوردہ قبائل بدلہ چکانے کی فکر میں رہتے تھے۔ امن اور چین کے لمحے کمیاب تھے۔ جنگوں اور دشمنیوں سے عاجز آ کر بعض قبائل سمجھوتے بھی کر لیا کرتے تھے۔ قبائل کے درمیان طے پا جانے والے عہد و پیمان کو توڑنا عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ہماری ان معلومات کا ماخذ جاہلی ادب ہے۔ قبائلی نظام میں مفاخرت، مہمان نوازی، علم دوستی، شعرا پروری اور جنگ و جدال کے معاملات پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ جب ہم ان قبائل کی مذہبی زندگی

---

(1) عربی ادب کی تاریخ ص ۲۷ عبد الحلیم ندوی

(2) ایضاً "بلوغ الارب" جلد سوم ص ۲۱ محمود شکری آلوسی

کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے ہاں بتوں، ستاروں، سورج، آگ اور چاند وغیرہ کی پرستش کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ یہودیوں
میں عیسائیت اور یہودیت کے پیروکار بھی بڑی تعداد میں تھے۔ زندیقیت اور دہریت کا سراغ بھی ملتا ہے۔ جنوں اور بھوتوں
کی پرستش کا رواج بھی تھا۔ وحدانیت کو ماننے والے عربوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ توہم پرستی، زود اعتقادی اور رسوم و رواج کی اسیری
میں بھی یہ قبائل یکتائے روزگار تھے۔ ان کے ہاں مختلف تہوار بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے [1]

حمیر، زید الجمہور، قضاعہ، سکاسک، کہلان، ہمدان، طے، مذحج، کندہ، لخم، جزام، ربیعہ، مضر، انمار اور ایاد
وغیرہ عربوں کے مشہور قبائل تھے۔ قبائل اپنے جد اعلیٰ کے نام سے بھی موسوم ہوتے تھے اور کسی حادثے یا واقعے کی وجہ سے بھی کسی قبیلے کا نام رکھا جاتا
تھا مثلاً قبیلہ مازن کو غسان بھی کہتے تھے۔ غسان وہ چشمہ تھا جس پر یہ قبیلہ اترا تھا اسی مناسبت سے اس کا یہ نام رکھ دیا گیا [2]۔ تجارت اور ایرانی
اور رومی سرحدی ریاستوں کے وسیلے سے عربوں کا دیگر اقوام سے رابطہ قائم ہوا۔ ایرانیوں نے حیرہ کی ریاست قائم کی تھی اور رومیوں نے غسانی۔ ان
ریاستوں کے علاوہ روم، فارس، حبشہ، اسکندریہ، مصر اور ہندوستان کی عظیم الشان سلطنتوں وغیرہ سے بھی عرب ناواقف نہ تھے۔ ایران
یا فارس کے شہنشاہ کا لقب کسریٰ تھا، حبشہ کے حکمران کو نجاشی، اسکندریہ کے بادشاہ کو مقوقس، مصر کے شہنشاہ کو فرعون اور ہندوستان
کے راجاؤں کو عرب بطلیموس وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے تھے۔ عرب قبائل خطابت، الانساب، فلکیات، قیافہ، فراست، کہانت،
عرافت، طب، صرافی، استہاق، تیر اندازی، پچھا اور باراں، جہاز رانی اور حساب کتاب کے علوم سے واقف تھے۔ وہ ہتھیار سازی کے فن
سے بھی نابلد نہیں تھے۔ گھوڑوں اور اونٹوں کی بابت بھی ان کے پاس وسیع معلوماتی ذخیرہ تھا [3]

عرب قبائل میں شعرا توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جب کسی قبیلے میں کسی شاعر کی موجودگی کا علم ہوتا تو اظہار مسرت کیا
جاتا۔ ہر قبیلے میں ایک یا ایک سے زیادہ شعرا ہوتے تھے۔ ان کے ذمے اپنے قبیلے کی مدح کا کام تھا۔ یہ شاعر اپنے قصائد میں قبیلے کے شاندار کارناموں
پر فخر کرتے، دوسرے قبائل پر اپنی فضیلت اور برتری جتاتے۔ دیگر قبائل ان کے شعرا کی ناپسندیدہ باتوں کا جواب اپنے شاعروں سے ہجو
کی صورت میں دلواتے۔ بہادری، مہمان نوازی، سخاوت اور عصبیت کو معیار ٹھہرا کر قبائلی شعرا افراد کو آمادۂ کار و پیکار کرتے۔ وہ تاریخ
اور ثقافت کے روشن کارناموں کا تذکرہ کر کے قبیلے کو حیات جاودانیت عطا کرنے کا کام کرتے تھے

قدیم عرب سردار، عوام اور شعرا کو عطیات سے بھی نوازا کرتے تھے [5]۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ دور
جاہلیہ کا کوئی شاعر اگر شاعری کو ذریعہ معاش بناتا تھا تو اس کی عزت و توقیر میں کمی واقع ہو جاتی تھی۔ شاعری زیادہ تر تفریح طبع کے
لیے کی جاتی تھی یا کسی کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے۔ اس نوع کی شاعری کے عوض اگر کوئی شاعر کا شکریہ ادا کر دیا کرتا تھا تو وہ اسے ہی
اپنا معاوضہ جانتا تھا۔ اس دور میں چند ایسے بھی شاعر مل جاتے ہیں جن کی تسلی اور تشفی کے لیے شکریہ یا احسانمندی کے جذبات
کافی نہ تھے۔ نابغہ ذبیانی، زہیر بن سلمیٰ اور اعشیٰ وغیرہ نے دنیاوی ممدوحوں کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر
بہت سا مال و اسباب اکٹھا کیا۔ اعشیٰ حصول زر و دولت کے لیے عجمی درباروں میں بھی پہنچا۔ نابغہ نے شاعری کے وسیلے سے اتنا
مال کمایا کہ اس کے کھانے پینے کے برتن سونے اور چاندی کے تھے۔ اس دور میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ شاعر رشوت دے
کر ممدوحین تک رسائی حاصل کر سکے۔ اسے محمود شکری آلوسی نے قبیح فعل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "نابغہ دربان کو

---

① بلوغ الارب جلد دوم ص ۱۵ ② عربی ادب کی تاریخ ص ۲۷ ③ بلوغ الارب جلد دوم ص ۱۶۱ ④ عربی ادب کی تاریخ ص ۱۳۶

رشوت دینا اور پوشیدہ طور پر ندیموں کے ساتھ مل کر یہ چال چلنا کہ وہ نابغہ کا ذکر نعمان بن المنذر کے پاس کرتے رہیں"(1) حطیئہ
کے بارے میں...... یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی شاعری کو دریوزہ گری کے لئے وقف کیا ۔ البتہ قدیم عربی شعرا کی اکثریت شاعری کو
ذریعہ سوال بنانے سے گریز کرتی تھی ۔ یہی نہیں عام طور پر شعرا حسنِ طلب کے بارے میں بھی محتاط رویہ اختیار کرتے تھے ۔ ایسے دستِ طمع
دراز کرنے سے کنارہ کشی کرتے تھے جس سے ان کی عزت و فروتنی پر حرف زنی کا امکان ہوتا ۔ بے غرض شاعروں کو قدیم عرب قبائل
میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔ یہ عزت اس لحاظ سے دیرپا ثابت نہ ہوئی کہ آہستہ آہستہ شاعروں نے شاعری کو
کمائی کا ذریعہ اور معاش کا وسیلہ بنالیا اور وہ "شاعری کی وجہ سے لوگوں کی عزتوں کے والی بن گئے اور ان کی توہین کرنے لگ گئے"(2)
وہ شاعر جو لوگوں کے آگے غرض مندی سے جھک جاتے تھے ان کی تذلیل ہوتی تھی ۔ عربوں میں مشہور تھا کہ جو لوگ اپنا رزق دوسرے ذرائع
سے کما سکتے ہیں ان کے پاس شاعری کو دریوزہ گری کا ذریعہ بنانے کا کوئی جواز نہیں۔

جہاں تک شاعروں کی شکر مندی کا تعلق ہے آغازِ اسلام کے دور میں بھی مسلمانوں کا ان کے ساتھ عمدہ برتاؤ تھا حضورؐ نے
کعب بن زہیر کو نعتیہ اشعار پڑھنے پر اپنی چادر مبارک مرحمت فرمائی تھی ۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی ان شاعروں کو
تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جو مدح کے مستحق لوگوں کی مدح کرتے تھے ۔ اس ضمن میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت
عمرؓ نے زہیر بن ابی سلمیٰ کی تعریف اس لئے کی کہ ایک تو وہ اپنے اشعار میں وحشی اور نامانوس الفاظ لانے سے گریزاں تھا
دوسرا اس کے کلام میں لفظی پیچیدگی' ابہام اور تعقید وغیرہ کے نقائص دستیاب نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لوگوں
کی بے جا تعریف نہیں کرتا تھا بلکہ جو اوصاف حقیقتاً کسی میں ہوتے تھے صرف انہی کو شعری لباس عطا کرتا تھا"(3)

ماقبل اسلام کے جاہلی شعرا وہ تھے جنہوں نے اسلام کا زمانہ نہیں دیکھا تھا ۔ اسلام کا زمانہ دیکھنے والے
جاہلی شعرا محضرم کہلاتے تھے ۔ اسلامی شعرا وہ کہلاتے تھے جو حضورؐ، خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے زمانے میں پیدا ہوئے
عربی ادب کی تاریخ میں مولد شعرا انہیں کہا جاتا تھا جن کی لسانی قوت کا انحصار زیادہ تر صناعی پر تھا ۔ یہ عباسی دور کے
شعرا تھے ۔ قدیم عرب قصائد جن کتب میں ملتے ہیں ان کی اجمالی فہرست یہ ہے
الحماسہ (ابو تمام حبیب بن اوس (۸۰۸ تا ۸۴۲ء) کی تالیف ہے) مفضلیات (المختارات) اس میں تیس قصائد
تھے اصمعی نے بعد میں اس میں ۹۰ اور قصائد شامل کیے) جمہرت اشعار العرب (ابو زید محمد القرشی نے ۱۰۰۰ء
میں مرتب کی اس میں ۴۹ قصائد ہیں ۔ معلقات (ان میں عہد جاہلیت میں کعبے کی دیوار پر لٹکنے والے معروف شعرا کے
سات اعلیٰ قصائد شامل ہیں ان کی روایت حماد الراویہ نے ۱۵۶ھ میں کی ۔ کتاب الاغانی (یہ کتاب چوتھی صدی
ہجری کے وسط میں ابو الفرج اصفہانی نے ترتیب دی) کتاب الامالی (جو ۹۶۷ء میں ابو علی القالی نے مرتب کی اور کامل
(مبرد نے ۸۹۸ء میں ترتیب دی) ۔ ادب العرب میں لکھا ہے کہ دورِ جاہلی میں شاعروں کی کثرت کا اندازہ اس بات
سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابو تمام کو جاہلیت کی چودہ ہزار، حماد کو ستائیس ہزار اور اصمعی کو سولہ ہزار نظمیں، قطعے
اور قصیدے ازبر تھے۔

---

(1) عربی ادب کی تاریخ ص ۱۵۹ (2) بلوغ الارب ص ۱۱۶ جلد سوم (3) عربی ادب کی تاریخ ص ۲۱۵

[فصل دوم]

عربی قصیدہ کے ادوار

• دورِ جاہلی

عربی قصیدہ کا آغاز کب ہوا ؟ عربی ادب کی تواریخ میں اس معاملے پر باثبوت حتمی رائے موجود نہیں ہے۔ عربی شاعری کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سجع اور قافیہ سے رجز اور رجز سے شعر کے مقام تک پہنچی تھی۔ اس لیے عربی قصیدے کے ابتدائی آثار ہمیں تلاش کرنے چاہییں۔ اور یہ سمجھنا چاہیے عربی قصیدے کا آغاز بھی مختصر مقطعات سے ہوا۔[1] جہاں تک عربی ادب کے محفوظ قصائد کا تعلق ہے تو ان میں ربیعہ بن مہلہل کا طویل قصیدہ اولیت کا حامل ہے۔[2] یہ فی الاصل قصیدے کی ہیئت میں اس کے بھائی کلیب بن ربیعہ کا مرثیہ ہے۔ ابن قتیبہ اور ابوالفرج اصفہانی وغیرہ نے یہی روایت بیان کی ہے۔ لبید نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے

؎ والشاعرون الناطقون أراهم + سلکوا طریق مرقش ومهلهل

ترجمہ [جتنے پرگو شاعر ہیں انہیں میں دیکھتا ہوں کہ انہوں نے مرقش اور مہلہل کے راستے کی پیروی کی]

مہلہل کے رثائی قصیدہ کو کسی بھی صورت عربی قصیدے کا نقشِ اول نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ مہلہل اور اس کے مابعد کے شعرا امرؤالقیس وغیرہ کی شاعری میں متنوع موضوعات اور مضامین کی موجودگی، تشبیہات و استعارات کی گھمبیرتا اور اسلوب کی صفائی، ودلکشی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قصیدہ ان سے بہت پہلے وجود میں آ چکا تھا۔ امرؤالقیس ہی نے اپنی ایک ہجویہ نظم میں بیان کیا ہے

؎ عوجا على الطلل المحيل لأننا + نبكي الديار كما بكى ابن حذام

ترجمہ [دوستو ذرا برسوں پرانے اس کھنڈر پر رک جاؤ تاکہ ہم اس اجڑے دیار پر آنسو بہائیں جیسے ہم سے پہلے شاعر ابن حزام نے بہائے تھے]

زہیر بن ابی سلمیٰ نے بھی عربی قصیدے کے اسلوب کو پرانی اور بہ تکرار سامنے آنے والی ڈگر قرار دیا ہے۔ پروفیسر نجیب محمد بہبیتی نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ امرؤالقیس سے پہلے کا کلام تدوین کرنے والوں کے ہاتھ نہیں لگا۔

یہ تو طے ہے کہ عربی قصیدہ کے موجود نقوش ہم تک سبعہ معلقات کی صورت میں پہنچے ہیں۔ پہلا معلقہ امرؤالقیس کا دوسرا طرفہ بن عبد کا، تیسرا زہیر بن ابی سلمیٰ کا چوتھا لبید بن ربیعہ کا پانچواں عمرو بن کلثوم کا چھٹا عنترہ بن معاویہ عبسی کا اور ساتواں حارث بن حلزہ کا ہے۔ یہ معلقات جہاں مذکورہ شعرا کی جادو بیانیوں اور سحر طرازیوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں وہاں ایام جاہلیت کی زبان، تہذیب اور سماجی اطوار کے عمدہ عکاس بھی ہیں۔ ان معلقات کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ طائف کے قریب عکاظ کا میلہ لگا کرتا تھا اس میلے میں ہر سال شعرا جمع ہوتے اور اپنے اپنے قصائد سے عوام کو محظوظ کرتے۔ ان میں سے اعلیٰ درجے کے قصیدے کو آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے ان قصائد کو معلقات کا نام دیا گیا ہے۔ ان قصائد کی تشابیب کا آغاز دیکھیے

؎ قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل + بسقط اللوى بين الدخول فحومل [امرؤالقیس

ترجمہ [اے میرے دوستو ٹھہرو تاکہ ہم سب مل کر ایک دوست اور اس کی ایسی منزل کی یاد سے رو لیں جو کبھی موضع دخول اور حومل کے ریگ تودہ پر تھی]

---

① اشعر العرب از ابن قتیبہ ترجمہ عبدالصمد صارم ② ایضاً ③ تاریخ الشعراء عربی ص ۲۵، ۲۶، ۲۸

ے لخولة اطلال ببرقة ثہمد + تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الید [طرفہ بن عبد]

ترجمہ [خولہ کے کھنڈر موضع ثہمد کی پتھریلی زمین میں ایسے ظاہر ہوتے ہیں جیسے گودنے کے رہے سہے نشان ہاتھ کے ظاہر پر دکھائی دیتے ہیں]

ے امن ام اوفی دمنة لم تکلم + بحومانة الدراج فالمتثلم [زہیر بن ابی سلمی]

ترجمہ [کیا یہ ام اوفی کے گھر کے نشان ہیں جو بولتی نہیں اور متثلم میں جو موضع دراج کی سخت زمین میں واقع ہے دکھائی دیتے ہیں]

ے عفت الدیار محلها فمقامها + بمنی تأبد غولها فرجامها [لبید بن ربیعہ]

ترجمہ [وہ گھر جو موضع منیٰ میں تھے مٹ گئے اور ان کے محل اور مقام محو ہو گئے اور رجام ویران وحشتناک ہو گئے ہیں]

ے الا ہبی بصحنک فاصبحینا + ولا تبقی خمور الاندرینا [عمر بن کلثوم]

ترجمہ [اے محبوبہ اٹھ بڑا پیالہ لے کر بیدار ہو اور صبح کی شراب ہمیں پلا اور اندر کے رہنے والے شراب فروشوں کی شراب بالکل نہ رہنے دے]

ے ہل غادر الشعراء من متردم + ام ہل عرفت الدار بعد توہم [عنترہ بن معادیہ]

ترجمہ [کیا پہلے شاعروں نے پیوند لگانے کی جگہ باقی رہنے دی ہے جس سے مجھے سخن گوئی کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے ایسا نہیں بلکہ سوچ بچار کے بعد گھر کو پہچانا ہے]

ے آذنتنا ببینها اسماء + رب ثاو یمل منه الثواء [حارث بن حلزہ]

ترجمہ [اسماء نے اپنے کوچ سے ہمیں اطلاع دی اور کیوں نہ ہو بہت سے مقیم اقامت سے تنگ آ جاتے ہیں۔ اسماء سے طبیعت گھبراتی نہیں وہ رہے تو جتنا بھی رہے]

سبعہ معلقات عربی زبان کے فصیح و بلیغ ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان قصائد نے عربی قصیدے کے ماڈل کی حیثیت اختیار کی۔ ان کے ذریعے اس زبان کے قیمتی مترادفات و تراکیب کا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ ان معلقات میں تشبیب اور مدح کے حصے پختہ اور متاثر کن ہیں۔ ان قصائد میں اظہار پانے والے خیالات و کوائف ٹھوس مقامی عناصر سے معمور ہیں۔ بدوی تہذیب اور زندگی کی بھرپور عکاسی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ محبت، احترام، بہادری، سخاوت اور ان سے متعلقہ دیگر جذبات نے بھی ان قصائد میں پورے طور پر اظہار پایا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ صنف قصیدہ اپنے آغاز کے دور ہی سے اپنے بطن میں مقامی تہذیبی زندگی کے رنگا رنگ آثار سمیٹے ہوئے ہے۔ فصاحت و بلاغت کے خصائص کے اعتبار سے بھی سبعہ معلقات وسعت، گہرائی اور گیرائی کے حامل ہیں۔ ان کے لہجے شیریں، ادائیگی دلکش اور طرز بیان موثر ہے۔ عمیق اور گہرے معانی ان کے بطن میں ہیں۔ نزاکت بیان، ایجاز و اختصار، مترادفات و اضداد کا بھرپور استعمال وغیرہ بھی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ معلقات کے شعرا نے اپنے "دل سمندر" کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے خیالات کے قیمتی موتی تلاش کیے ہیں۔

۱۔ امراء القیس ملک الضلیل [آوارہ بادشاہ] امراء القیس م ۵۳۹ء جاہلی دور کی عرب شاعری کا مصدقہ عظیم شاعر ہے۔ شوکت الفاظ، مشکل پسندی، بندشوں کی عمدگی، خیال و تخیل کی بامعنی اڑانوں، مضامین نو کی ایجاد اور اسلوب کی نادرہ کاری کے اعتبار سے اس دور کا کوئی شاعر اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ اس کے قصائد اور ہجویات میں وصف اور منظر کشی کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ امراء القیس نے دور جاہلی کے قصیدے کو ایک تقلیدی ماڈل عطا کیا۔ آغاز قصیدہ میں محبوبہ کے اجڑے دیار پر ٹھہر کر آہ و زاری کرنے کے ابن خذام کے متعارف کرائے ہوئے انداز کو موثر طور پر رواج دیا۔ عورتوں کے حسن و جمال کے بیان میں انوکھی تشبیہوں اور مربوط تلازموں کا استعمال بھی اس کا رنگ خاص ہے۔ گھوڑے کے وصف کا پر تاثیر بیان اور نسیب میں نزاکت خیال اور بھرپور

ابلاغی اظہار اس کی شاعری کا امتیازی وتیرہ ہے۔ وہ سردار کا بیٹا تھا اور مسلسل سفر میں رہتا تھا۔ اس کی آوارہ خراقی کے اثرات اس کی زندگی کے متنوع تجربات سے معمور شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اس خاندانی میراث اور اس کے ذاتی احوال نے اس کی شاعری میں بقول احمد حسن زیات شوکت و سطوت، متکبرانہ تواضع و مسکنت، قلندرانہ مستی، پھر شمشیر کی حمیت، آوارگی کی ذلت و بے حیائی، زخم خوردگی کے شکوے اور نالے یکجا نظر آتے ہیں (۱)۔ محمود شکری آلوسی نے لکھا ہے کہ امراء القیس بہت میدانوں میں سبقت لے گیا ہے۔ عربوں نے اس کی ایجاد کردہ راہوں کو استحسان کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کے معاصر اور بعد کے شعراء نے ان میں اس کی تقلید کی ہے۔ مثلاً اپنے ساتھیوں کو محبوبہ کے دیار پر ٹھہرنے اور رکنے کے لئے کہنا، رقت آمیز عشقیہ اشعار کہنا اور قریب المآخذ الفاظ کا استعمال کرنا (۲)
ایچ آر گب کا کہنا ہے کہ امراء القیس ہی نے سب سے پہلے عرب اشعار کو مقررہ قواعد کے تابع بنایا اور قافیے کے اصول معین کیے اس نے قدیم عرب عقیدے میں نئے رستے تلاش کیے اور عرب شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی (۳)۔ امراء القیس نے اپنے معلقہ میں اپنی عم زاد عنیزہ بنت شرجیل کے حوالے سے بہت سے اشعار لکھے ہیں۔ اس میں اس نے اپنے گھوڑے کے شکار کی توصیف بھی کی ہے۔ اس نے ان شدائد کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جو سفر کے دوران میں بالعموم مسافروں کو پیش آتے ہیں۔ امراء القیس کی شاعری میں بدویت کے آثار پورے طور پر نمایاں ہیں۔ عریاں اور کھلا جذباتی اظہار بھی اس کا خصوصی انداز ہے

۲۔ طرفۃ بن عبد طرفۃ بن عبد امراء القیس کا معاصر ہے وہ ۵۶۹ء میں اس جرم کی پاداش میں قتل ہوا کہ اس نے عرب بادشاہ عمر بن ہند کی ہجو میں اشعار کہے۔ وہ اپنے معلقہ کی بدولت مقیدہ گوئی کی تاریخ میں بلند مقام رکھتا ہے۔ ہر قسم کے موضوعات کو بے دریغ بے باکانہ استعمال کرنا اس کی آزاد طبیعت کا خاصہ تھا۔ اس نے اپنے معلقہ میں اپنی شراب نوشی، بہادری کی توصیف کی ہے۔ نیز خولہ، ہند، سلمی وغیرہ کی توصیف میں اشعار لکھے ہیں۔ اپنی اونٹنی کا وصف بھی بیان کیا ہے۔ اس معلقہ میں طرفۃ نے کشتیوں کا مداحانہ انداز سے تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

ع کان حدوج المالکیہ غدوۃ + خلایا سفین فی النواصف من دد
عدولیۃ او من سفین ابن یامن + یجور بہا الملاح طوراً و یہتدی
یشق حباب الماء حیزومہا بہا + کما قسم الترب المفائل بالید

ترجمہ: "صبح کے وقت خولہ مالکیہ کے کجاوے ایسے دکھائی دیتے تھے گویا وہ دد کے دھاروں میں بڑی بڑی کشتیاں ہیں۔ وہ عدولی گاؤں کی کشتیاں یا ابن یامن کی ہیں جنہیں ملاح کبھی سیدھا چلاتا ہے اور کبھی ٹیڑھا۔ ان کشتیوں کے سینے پانی کی موجوں یا گہرائیوں کو ایسے چیرتے ہیں جیسے مٹی کی ڈھیریوں میں چیز چھپانے والا اپنے ہاتھوں سے مٹی کو دو حصے کر دیتا ہے"
نکلسن نے لکھا ہے کہ طرفۃ بات کہنے میں غیر محتاط تھا۔ طرفۃ کا معلقہ کسی کی مدح میں نہیں ہے۔ اس میں تشبیب کے اشعار دستور کے مطابق ہیں۔ اس کے ہاں کشتیوں کا موضوع اس کے خلیج فارس کے قیام کے زمانے کی یادگار ہے۔ وہ فکر انگیز اشعار کہنے پر قدرت رکھتا تھا اور فلسفہ عیش کوشی کا قائل تھا

---

(۱) تاریخ ادب عرب استاد احمد حسن زیات ترجمہ عبدالرحمن سورتی ص ۱۰۸ غلام علی اینڈ سنز لاہور (۲) بلوغ الارب جلد چہارم ص ۱۴۳
(۳) مقدمہ تاریخ ادبیات عرب از ایچ آر گب ترجمہ ص ۲۵۲ مجلس ترقی ادب لاہور (۴) تاریخ ادب العرب از نکلسن ص ۲۹۲ انگریزی

۱۔ زہیر زہیر بن ابی سلمی م ۶۲۲ء نے اپنے معلقہ میں بنی مرۃ کے دو سرداروں ہرم بن سنان اور حارث بن عوف کی مدح کی ہے۔ یہ قصیدہ دو عرب قبیلوں کے درمیان جھگڑے کی حالت کا عکاس ہے۔ اس میں حارث بن عوف کی تعریف اس بنا پر کی گئی ہے کہ اس کی بلند ہمتی کی وجہ سے آپس کی جنگ ٹل گئی۔ حضرت عمرؓ نے شاید اسی وجہ سے اسے اشعر الشعراء قرار دیا تھا کہ اصلاحی ذہن رکھتا تھا۔ کلام میں غیر مانوس الفاظ لانے سے گریزاں تھا۔ بدگوئی اور ہزل نویسی سے اس نے پرہیز کیا۔ زہیر کا قصیدہ واقعیت نگاری حکمت و فلسفہ کے استعمال، ضرب الامثال کے بیان کے اعتبار سے منفرد ہے ڈاکٹر عبدالحکیم ندوی کے بقول "اس نے بعض ایسے حقائق کا اظہار کیا ہے جو عام طور پر جاہلی شعرا کے بیان ناپید ہیں مثلاً جنگ کی تباہ کاریاں، اخلاق فاضلہ اور اقدار عالیہ کی تعریف و توصیف یا موت و زندگی کی حقیقت، انسان کا حال اور سب سے بڑھ کر اس حقیقت کا اظہار کہ اس کارگہ ہستی کو چلانے والی ایک ذات ہے"(۱) اس کے قصیدے "حولیات" یعنی یکسالہ کاوشوں کے نتیجے میں لکھے جاتے تھے کیا جاتا ہے وہ ایک قصیدہ چار مہینہ میں نظم کرتا تھا۔ پھر چار مہینے تک اس کی کانٹ چھانٹ کرتا۔ اس کی تصحیح کرتا اس کے بعد اسے چار مہینے تک اساتذہ فن کو دکھاتا رہتا۔(۲) یہی وجہ ہے کہ اس کی فصاحت و بلاغت مثالی ہے۔ وہ نئی نئی ترکیبوں اور تلازموں کو اشعار میں غیر تقلیدی انداز میں کھپاتا تھا

۱۔ لبید لبید بن ربیعہ م ۶۶۱ء کے قصیدے کے اشعار نازک کلامی اور شیریں گفتاری کے اثاثوں سے مالامال ہیں۔ ان کی طویل عمر کے ۹۰ سال جاہلیت کے اندھیروں میں گزرے اور ۵۵ برس اسلام کی روشنی میں۔ لبید کے معلقہ میں رومانی انداز سے کھنڈر زندگی کا وصف، یادِ محبوب، اونٹنی کی تعریف، اپنے ذاتی احوال اور قبائلی تفاخر وغیرہ کے موضوعات موجود ہیں۔ عشق، حکمت اور پند و موعظت کے معاملات وغیرہ کے اظہار میں وہ بے نظیر تھے۔ تشبیب بنانے کے ہنر سے آگاہ تھے۔ صحرا اور صحرائی مخلوق کا تذکرہ ان کی شاعری میں حقیقت پسندی کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

۱۔ عمرو بن کلثوم عمرو بن کلثوم م ۶۰۰ء۔ آزاد مزاجی، شجاعت اور غیرت و حمیت کا مرقع تھا۔ اس کا معلقہ قبائلی تفاخر کے اظہار کی بہترین مثال ہے۔ اس کی تشبیب خمریاتی ہے۔ اس میں محبوب کی سراپا نگاری بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس قصیدے میں بنی تغلب کے بعض واقعات فخریہ انداز میں رقم ہوئے ہیں۔ عمرو کا طرزِ بیان شستہ اور پاکیزہ ہے

۱۔ عنترہ عنترہ بن شداد م ۶۱۵ء کے معلقہ کا پس منظر یہ ہے کہ اس کے قبیلے کے کسی فرد نے اس کی ماں کے حبشن ہونے اور کالی رنگت رکھنے پر طعنہ دیا۔ یہ معلقہ اس طعنے کے جواب میں ہے۔ یہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے اس میں عنترہ نے دیگر عرب شعرا کی مانند اپنی شجاعت، سخاوت اور ہمت پر فخر کیا ہے۔ اس قصیدہ کی تشبیب میں اس نے اپنی چچا کی بیٹی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ نکلسن نے عنترہ کو اس کی بہادری کی بنا پر اسے عرب ادب کا ایچیلس قرار دیا ہے(۳) عنترہ جنگ و جدال کے مناظر بیان کرنے کا ماہر تھا۔ اس نے اپنے باشیہ قصیدہ میں اپنے کالے رنگ کی مناسبت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اگر لوگ میرے کالے رنگ کا طعنہ مجھے دیتے ہیں تو یہ کالا رنگ جنگ کے دن جب حسب نسب کا مذکور نہیں ہوتا۔ میرا نسب بن جاتا ہے

---

(۱) عربی ادب کی تاریخ، از ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی ص ۲۱۲ - ۲۱۳ (۲) تاریخ ادب عرب ص ۱۱۴

(۳) ایچیلیس نیم دیوتا، نیم انسان یونانی ادب کا مشہور ہیرو جس نے ہیکٹر جیسے بہادر انسان کو قتل کیا اور بعد میں اس کے بھائی پیرس کے ہاتھوں مارا گیا۔ عنترہ نے بھی بہت سے قتل کیے اور آخری عمر میں خود بھی قتل ہوا۔ ۔ عربی ادب کی تاریخ ص ۲۶۸

۱۔ حارث

حارث بن حلزہ عمدہ اور طویل قصائد کہنے میں یکتائے روزگار تھا۔ اس نے بھی دیگر جاہلی شعرا کی مانند اپنے معلقے کا آغاز تشبیب ہی سے کیا ہے۔ اس میں بنی تغلب کی ہجو بھی متعدد شعر ہیں۔ یہ ہجو واقعات کے حوالے سے ہے یہی وجہ ہے کہ یہ معلقہ وقوعات اور مقامات کے اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ عربی ادب کی تاریخ میں مذکور ہے کہ حارث کا یہ قصیدہ بندش کی چستی، پیرائیہ بیان کی صفائی، اغراض و معانی کی وضاحت اور دیگر متعدد فنون پر مشتمل ہونے کی وجہ سے "منفرد قصیدوں" میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے[1]۔ اس معلقہ سے حارث کی قادر الکلامی پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے اس نے یہ قصیدہ ایک ہی وقت میں فی البدیہہ کہہ کر دورِ جاہلی کی شاعری میں ایک عجوبہ تخلیق کیا ہے۔ یہ فخریہ قصیدہ ہے اور حارث فخر کے معاملات بیان کرنے میں ضرب المثل ہے۔

سبعہ معلقات کے شعرا کے علاوہ دورِ جاہلی کے دیگر شعرا میں الاعشیٰ قیس، عروۃ بن الورد، عبید ابن الابرص، امیۃ بن ابی الصلت، البشر بن ابی خازم، عدی بن زید بن حمار، النمر بن تولب، المرقش الاکبر، علقمۃ الفحل، الشنفری، تابط شراً، الافوہ الاودی، مہلہل، الاسود بن یعفر، ابوداؤد الایادی، لقیط بن معبد الایادی، حاتم الطائی، طفیل الغنوی، الاضبط بن قریع السعدی اور عبد قیس بن خفاف وغیرہ خاصے معروف ہیں

اعشیٰ[1]

اعشیٰ بن میمون م ۶۲۹ء قصائد میں مدح سرائی، شراب و شباب کے وصف میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کے طویل متنوع اور گہرے قصائد فنی اعتبار سے پختہ تھے۔ اس نے مختلف بادشاہوں اور امرا کی مدح سرائی کی۔ وہ قصیدہ کا صلہ طلب کرنے میں بے باک تھا۔ اس کے ممدوحین میں عرب سرحدی علاقوں پر موجود ریاستوں کے بادشاہ بھی شامل تھے۔ موسیقیت اور غنائیت سے لبریز ہونے کے سبب اس کے قصائد زبان زدِ عام تھے۔ اس کے قصائد پر ایرانی اثرات موجود ہیں اس کی وجہ ایرانی بادشاہوں اور امرا سے اسکا میل جول تھا۔ ایک طویل عرصے تک عجمیوں کے درمیان رہنے سے اس کے قصائد میں ایرانی تصورات بھی در آئے تھے۔ اعشیٰ کے اشعار کی فنی کثرت کے باعث اسے صناجۃ العرب بھی کہا گیا ہے[2]

جاہلی شعرا میں عروۃ بن الورد نے اپنے کلام میں سخاوت کے موضوع پر حکیمانہ انداز سے اظہارِ خیال کیا۔ عبید بن الابرص کا زیادہ تر کلام فرضی اور غیر معیاری ہے۔ امیہ بن ابی الصلت توحید و حکمت کے خیالات کے بیان میں مشہور رہے۔ اس کے قصیدہ کو مجمہرات میں شامل کیا گیا ہے اس کی زبان میں دیگر اقوام کی السنہ کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ اس کے مذکورہ قصیدہ میں زینب کے حوالے سے نسیبی اشعار بھی ہیں اور قبائلی تفاخر کا کھلا اظہار بھی ہوا ہے۔ لبشر بن ابی خازم ہجو اور قصیدہ ہر دو میدانوں کا صفِ اول کا شاعر تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے رشوت لے کر مشہور عرب سخی اوس بن حارثہ بن لام الطائی کی پانچ ہجویات لکھیں مگر جب وہ اوس کے ہتھے چڑھا تو پھر اسے اس کے پانچ قصیدے بھی لکھنے پڑے۔ عدی بن زید بن حمار کے قصائد کے اکثر و بیشتر اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کر لیتے تھے۔ اس کے کلام میں سرسبز و شاداب علاقوں کی منظر کشی بھی ہوئی ہے۔ النمر بن تولب کی شاعری فصیح تھی اور مدح کے باب میں لاجواب۔ المرقش الاکبر نے شاعری میں اپنی ناکامیوں کا موثر اظہار کیا ہے۔ علقمۃ الفحل کو قصیدہ نویسی میں امرا القیس کا حریف گردانا گیا ہے۔ الشنفری

---

① عربی ادب کی تاریخ ص ۲۶۸ ② ایضاً " ۲۷۲

کے قصائد میں بے گھر، بے یار و مددگار رہا در بدوؤں کی زندگی کے بھرپور نقشے موجود ہیں۔ وہ خود بھی صحالیک شعرا[1] [بے گھر] میں سے تھا۔ اسکا قصیدہ لامیۃ العرب بہت مشہور رہے۔ اس کی شاعری میں صحراؤں، بیابانوں، درندوں اور جنگلی جانوروں اور ان سے پیدا ہونے والے خطروں کا مفصل اظہار رہے۔ تابط شرا[2] بھی صحالیک شعرا میں سے تھا وہ عربوں کی قابل مدح صفات کی سچی توصیف کرتا تھا۔ اس کے قصائد اس کے ذاتی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ الافوہ الاودی[3] کے قصائد میں قیادت اور سرداری کے موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ مہلہل[4] کا اصل نام ربیعہ ہے اسے عربوں میں عمدہ اشعار کہنے والا پہلا شاعر تصور کیا جاتا تھا اس لیے اس کا نام مہلہل پڑ گیا۔ الاسود بن یعفر[5] نے اپنے قصائد میں فنا کے موضوع پر موثر انداز میں اظہار خیال کیا ہے وہ کہتا ہے "سرداروں کے فنا ہو جانے پر ان کے گھر خالی، بوسیدہ اور ختم ہو جاتے ہیں۔ ابو دواد الایادی[6] کے قصائد میں گھوڑوں کی عمدہ وصف نگاری ہے۔ لقیط بن معبد الایادی[7] نے بھی اپنے قصائد میں قبائلی سرداروں کی اہلیت نا اہلیت کے مسائل چھیڑے ہیں۔ حاتم الطائی[8] نے فنا کے موضوع پر نصیحت آموز اور دردناک پیرایے میں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ طفیل الغنوی[9] گھوڑوں کی صفات بیان کرنے میں ماہر تھا اس کے اشعار کی خوبی کی بدولت اسے "محبر" یعنی حسن آفرین کہا جاتا ہے۔ پندو نصائح کی شاعری کے حوالے سے اپنے قبیلے کا ٹھکرایا ہوا شاعر الاضبط بن قریع السعدی[10] بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔ نصیحت آموز اشعار لکھنے ہی کی بدولت عبد قیس بن خفاف[11] خاصا معروف ہے۔

دورِ جاہلی کی قصیدہ نگاری [اجمالی تبصرہ]

دورِ جاہلیہ کی عربی شاعری میں رزمیہ، مدحیہ، رثائیہ اور طربیہ عناصر بکثرت موجود ہیں۔ غزل، فخر، حماسہ، ہجو، سعدیات، سراپا یا وصف وغیرہ کے موضوعات اہم تھے۔ قدیم عرب قصائد میں جنگ، جنگی ہیروز، شجاعت اور بہادری کے رسیا افراد کے قصے رقم ہوئے ہیں۔ جاہلی شعرا واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی کے رجحان کے تابع تھے۔ سادہ اور واضح انداز میں موضوعات کا بیان انہیں مرغوب تھا۔ وہ مبالغہ آرائی کرتے ضرور تھے مگر صرف اس قدر کہ حقائق اور واقعات اس کی دھند میں پوشیدہ نہ ہونے پائیں۔ مشکل، گمبیر اور پیچیدہ فلسفیانہ موضوعات پر ان شعرا نے خال خال ہی توجہ دی۔ بعید از حقیقت تلازمے، دور از کار استعارے اور صنعت حسن تعلیل کی نزاکتیں بھی ان کے ہاں کم نظر آتی ہیں۔ قصیدہ موضوع کی ترتیب کے حوالے سے جس نوع کے تنظیمی تسلسل کا متقاضی ہے ان شعرا نے کسی حد تک اس سے بھی بے نیازی برتی ہے۔ تکلف اور آورد سے پاک اسلوب کا برتاؤ ان کا عمومی وتیرہ تھا۔ بھاری بھرکم، ثقیل الفاظ سے ممکنہ حد تک گریز، استثنائی مثالوں کے علاوہ خالص عرب لہجے اور ثقافت کا استعمال، تجنیس، تقابل اور تطابق وغیرہ کی صنعتوں سے پرہیز، موثر لسانی پیرایے اور پرتاثیر معانی آفرینی کی جانب جھکاؤ ان کے اہم شعری رجحانات تھے۔ جاہلی دور کی مدحیہ عربی شاعری کا ایک اور بنیادی وصف ایجاز و اختصار تھا۔ قدیم عربی شاعری کے حوالے سے یہ مقولہ بھی سننے میں آتا ہے کہ "الشعر دیوان العرب"

---

1 تا 11 عربی ادب کی تاریخ، ص ۳۱۵ تا ص ۳۲۴

یعنی عربی شاعری عربی زندگی اور تہذیب و ثقافت کی تفصیلی تصویروں کی حامل ہے۔ وحشیانہ انتقامی جذبے، بربریت آشنا رسوم، مخصوص قبائلی اخلاقیات اور مروجہ ماحول میں رونما ہونے والے واقعات اس دور کے عربی قصائد میں عمومی طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں
جاہلی قصائد کی تشابیب میں واکثر عشقیہ اور کبھی کبھی خمریہ موضوعات قلمبند ہوتے تھے۔ یہ حصے زیادہ تر یکسانیت کا شکار تھے۔ شاہد بازی، بہادری، شہسواری، قبائلی عصبیت پر شعرا فخر کیا کرتے تھے۔ روزمرہ زندگی کے تجربات سے حاصل ہونے والی حکیمانہ باتیں بھی ان قصائد میں نظر آجاتی تھیں۔ اونٹنی، گھوڑا، جنگلی گائے، کھنڈر، صحرا، رات، تلوار، بادل زرہ بکتر، شکار، صہبا اور ساقی وغیرہ کی وصف نگاری میں ان کے اسلوب کی تشبیہاتی جہتیں آج بھی تازہ نظر آتی ہیں۔
جاہلی دور کی عربی شاعری میں رزمیہ عناصر تو موجود ہیں تاہم ایلیڈ، اوڈیسی، مہابھارت یا شاہنامہ فردوسی جیسی کوئی طویل رزمیہ نظم دستیاب نہیں ہے۔ جس نوع کے واقعات قدیم عربی سماج کا حصہ تھے ان کے حوالے سے ایپیکل (EPICAL) نظم کی تخلیق کوئی مشکل بات نہ تھی۔ عربوں میں موجود قومی اور نسلی تفاخر بھی کسی رزمیہ نظم کی بنیاد بن سکتا تھا۔

دورِ جاہلیہ کے قصائد کی فنی ہیئت کے حوالے سے یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان میں موجود موضوعاتی تسلسل نظم کی بجائے مسلسل غزل کے مزاج کے مطابق ہے۔ اس دور کی عربی شاعری میں پندرہ اوزان کا استعمال ہے زیادہ تر قصائد صرف تین بحروں یعنی طویل، کامل اور خفیف میں کہے گئے ہیں۔ عربی قصائد نگار اس دور میں قصیدے کی بنیاد ایک ہی قافیے پر رکھتے تھے۔ عیوبِ قوافی کی وجہ سے کوئی قصیدہ ناقص قرار پاتا تھا۔ ان عیوب میں سے تین کا تذکرہ دائرۃ المعارفِ اسلامیہ میں ہے۔ اس میں مندرج ہے کہ عرب اس قصیدے کو ناقص سمجھتے تھے جس میں اکفا، اقوا اور سناد ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے

① اکفا۔ جو قوافی میں اختلافِ اعراب سے پیدا ہوتا ہے مثلاً ایک قصیدہ لامیہ کی بنیاد لام مرفوع کے قافیے پر رکھی گئی ہے مگر کسی جگہ شاعر نے لام مجرور پر مشتمل قافیہ باندھ دیا ہے

② اقوا سے مراد یہ ہے کہ کسی شعر کے قافیے میں استعمال ہونے والے لفظ کے حروف کم ہوں مثلاً محلِ تقاضا تو یہ تھا کہ شاعر لفظ 'متشرب' استعمال کرتا مگر وزن ٹوٹنے کے ڈر سے اس نے اسی مادے سے مشتق لفظ مشرب استعمال کر دیا

③ سناد سے مراد ردیف کا اختلاف ہے مثلاً شاعر نے قافیہ کی بنیاد تو یائے معروف کو بنایا جیسے قیننا وغیرہ مگر یائے لین کا استعمال کر دیا جیسے 'علینا' وغیرہ ①

عربی شعرا اور نقاد اس دور کے قصائد کو مختلف حوالوں سے مختلف ناموں سے موسوم کرتے تھے۔ نادر، عمدہ اور اعلیٰ قصیدے کو الیتیمہ، قبولِ عام کی سند پانے والے کو السموط، مدتوں کی ریاضت کے بعد وجود میں آنے والے کو الحولیات (ایک سال کی محنت کے بعد تیار کیا ہوا)۔ تنقید کے اور ہار بنائے جانے کے قابل کو المعلقات اور کانٹ چھانٹ کے بعد تیار ہونے والوں کو المنقحات اور پختگی کے حامل قصائد کو المحکمات کہا جاتا تھا ②

---

① دائرۃ المعارفِ اسلامیہ جلد ۱۶/۲ ص ۲۹۰ ② ایضاً ص ۲۹۲

آغازِ اسلام کا دور

خانہ بدوش بدوی اور قبائلی عرب علاقوں میں طلوعِ اسلام ایک عظیم واقعہ تھا۔ یہ بربریت، وحشت، حیوانی اور غیر عمرانی رجحانات کے خاتمے اور امن و سلامتی کے قیام کا تاریخی اعلان نامہ تھا۔ حضور محمد مصطفٰیؐ کی ذاتِ بابرکات نے اپنے اعمال اور قرآنی احکامات کی بدولت جنگجو، تفاخر پسند، عصبیت نواز، ہلاکت کے رسیا، لوٹ مار کرنے والے، اخلاق باختہ عرب قبائل کو صلح و آشتی، خدا خوفی، انسان دوستی، زندگی خیزی، انصاف پسندی اور اخلاق سازی کی قدریں عطا کیں۔ بکھرے ہوئے عوام گروہی اور نسلی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک نئے مذہب کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ توحید اور اس سے متعلقہ تصورات عوام کے ذہنوں میں راسخ ہونے لگے۔ انسانی جسموں نے عبادت کے نئے اطوار سیکھے۔ نفس کشی، نادار پروری اور اجتماعیت کے نئے سلاسل ایک نئی ثقافت اور ایک نئی تہذیب ابھارنے لگے۔ گھوڑا آگے بڑھانے اور پانی پینے پلانے پر ہونے والے جھگڑے ختم ہوگئے۔ انسانوں کو زندہ درگور کرنے، بادیوں دیوتاؤں اور سرداروں کی بھینٹ چڑھانے کے رجحانات واصلِ جہنم ہوئے۔ مدینہ، مکہ اور پھر آہستہ آہستہ پورا عرب دائرہ اسلام میں شامل ہوگیا۔ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر، عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر فوقیت دینے کے رجحانات کی شدید مخالفت ہوئی۔ مال و دولت یا دنیاوی جاہ و حشم کے اعتبار سے کسی کو بڑا یا عظیم ماننے کی روایات ختم ہونے لگیں۔ بڑا وہ ٹھہرا جو نیکی، انسانی اخلاق، عبادت اور علم کے اعتبار سے فضیلت رکھتا تھا۔ یتیموں، بے کسوں اور غریبوں کو سہارے دیئے جانے لگے۔ ایسی اجتماعی حکومت قائم ہوئی جس میں قرآن و سنت کو فیصلوں کی بنیاد بنایا گیا۔ عرب معاشرہ انقلابی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوا۔ اس میں ایک نیا سماجی، دینی اور انسانی تناظر نمودار ہوا۔ قدیم غیر انسانی اعمال، تصورات اور بے سروپا توہمات کی نفی ہوئی۔ بت پرستی اور اشیا پرستی کے ماحول کی بیخ کنی ہوئی۔ جنگیں اور غزوات ہوئے مگر حق کی بلندی کے لیے۔ فتوحات کے دروازے کھلے۔ ایران، عراق، شام اور روم کے بادشاہوں کے نام خدا اور اس کی برتری کو تسلیم کرنے اور حقیقی انسان اور اس کی عظمت کو سلام کرنے کے پیغام ارسال کیے گئے۔ خلفاء [ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ] نے اسلام کی نشو و نما اور اشاعت کے لیے اور غیر اسلامی حاکمیت اور موروثی بادشاہتوں کے خاتمے کے لیے مہمات بھیجیں۔ یہ دور ایک نئے نظام کے استحکام کا دور تھا جس میں پیغمبرِ اسلامؐ اور خلفائے راشدین کی توجہ آئینِ جہانداری کی تشکیل و تنفیذ کی جانب رہی۔ شاعر اور شاعری پس پردہ چلی گئی۔ شاعری سے اس کا موتیف [محرک] یعنی قبائلی تفاخر اور نسلی و نسبی کارناموں کا بیان وغیرہ چھن گیا۔ نئی شعری روایات کی تخم پاشی ہوئی۔ شاعروں کا زورِ قلم حمد و نعت کے مضامین پر صرف ہونے لگا۔ بعض نقادوں نے یہ گمراہ کن پروپیگنڈہ بھی کیا ہے کہ اس دور میں شاعروں کے خلاف تادیبی کارروائیاں کی گئیں یا اسلامی اقدار کے نفاذ سے شاعری کو نقصان پہنچا۔ مگر ایسی آرا صداقت پر مبنی نہیں ہیں۔ جو قدیم جاہلی شعرا جو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ان کے لیے قدیم شعری روایات ترک کرنا ایک حقیقی مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ انہوں نے نئے ماحول کو قبول کرکے یا تو از خود پرانے تصورات پر مبنی شاعری کو ختم کر دیا یا اپنی شاعری میں نئے موضوعات کے در وا کیے۔ حسان بن ثابت، کعب بن زہیر

اور لبید جیسے عظیم شعرا نے نئے نظام کی مدح میں قصائد لکھے۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس ممدوح بنی۔ نئی طرز کی اسلامی حکمت و موعظت، اخوت و مساوات، عدل و انصاف کے موضوعات ان کی شاعری کا حصہ بنے۔ اس میں دکھی انسانوں کی فریادیں بار پانے لگیں۔ اس دور میں ہمیں مخضرم [یعنی جنہوں نے جاہلی اور اسلامی دونوں زمانے دیکھے] اور اسلامی ہر دو طبقوں کے شعرا سرگرمِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ اسلام سے قبل کسی شاعر نے توحید کے موضوع پر اظہارِ خیال نہیں کیا تھا۔ امیہ بن ابی الصلت نے توحید کے موضوع کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اس کے اشعار مومن کے سے ہیں مگر دل کافر کا سا۔[1] قیس بن الخطیم، عامر بن الطفیل، الاعشیٰ اور النمر بن تولب العکلی وغیرہ نے اسلامی اور جاہلی دونوں زمانے دیکھے ہیں۔ مگر یہ مسلمان نہیں ہوئے تھے الاعشیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے حضورؐ کی شان میں ایک قصیدہ کہا لیکن طمع اور لالچ نے اسے مسلمان نہ ہونے دیا وہ ابوسفیان وغیرہ سے سو اونٹ لے کر حضورؐ سے ملاقات کیے بغیر ہی واپس لوٹ گیا۔

حضرت کعب بن زہیر، حضرت حسان بن ثابت، حضرت لبید ابن ربیعہ، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ، نابغہ جعدی، الحطیئہ، ابوذویب الہزلی، ابوخراش الہزلی، عبدۃ بن الطبیب، حمید بن ثور، عمرو بن معدیکرب، ابو محجن الثقفی، ابوالاسود الدئلی اور عبداللہ بن قیس الرقیات پیغمبرِ اسلامؐ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد کے شعرا ہیں۔

کعب ـ کعب بن زہیر کے مشہور قصیدے بانت سعاد کا پس منظر یہ ہے کہ زہیر کے دو بیٹے تھے ایک کا نام بجیرؓ تھا اور دوسرے کا کعبؓ۔ بجیرؓ نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن کعب [زہیر] نے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ اشعار لکھے جس پر حضورؐ نے اس کا خون مباح کر دیا۔ بجیرؓ نے یہ سوچ کر کہیں بھائی مارا ہی نہ جائے اسے لکھ بھیجا کہ حضورؐ عفو و درگزر سے بھی کام لیتے ہیں لہٰذا تائب ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ چنانچہ زہیر نے یہ قصیدہ لکھا اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اس قصیدے کی تشبیب کا رنگ ڈھنگ روایتی ہی ہے تاہم مدح کے حصے میں حضورؐ اور آپ کے صحابہ کی تعریف کی گئی ہے۔ جب زہیرؓ اپنے قصیدے بانت سعاد کے شعر نمبر ۵۳ پر پہنچے جس کا ترجمہ ہے

"بے شک رسول اللہؐ نور ہیں جن کے ذریعے ہدایت حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی تلواروں میں بے نیام شمشیر ہیں"

تو حضورؐ نے انعام میں اپنی ردائے مبارک عطا کی۔ بانت سعاد کا آغاز تشبیب اور تغزل سے ہوا ہے۔ پھر شاعر نے ناقہ کی تعریف کی ہے اور گریز کرتے ہوئے چغل خوروں سے بے زاری کا اظہار بھی کیا ہے۔ حضورؐ نے اس قصیدہ میں اصلاح بھی دی ہے۔

حسان ـ حضرت حسان بن ثابت بھی اپنے قصائد میں تشبیب کے قدیمی وتیرے پر قائم رہے۔ وہی روایتی عشق و عاشق کا تذکرہ وہی محبوبہ اور دیارِ خراب، وہی کھنڈرات اور وہی بادہ و ساغر۔ انہوں نے فتح مکہ پر جو قصیدہ لکھا اس کا مطلع ہے ؎ عفت ذات الاصابع فالجواء + الی عذراء منزلہا خلاء[2]

---

[2] دیوان حسان بن ثابت ص ۲ تجاریہ مصر

[1] عرب ادب کی تاریخ ص ۲۸۲

اس قصیدے میں بھی محبوبہ کی یاد اور ذکرِ شراب کے بعد اللہ کی اعانت سے مسلمانوں کو فتح مکہ کی صورت نصیب ہونے والی عظیم کامیابی کا بیان ہے۔ اس میں اصحاب رسولؐ کا تذکرہ بھی ہے اور دشمن اور کفار شعرا کی بدزبانیوں کا جواب بھی حضرت حسانؓ نے اپنے قصائد میں جہاں حضورؐ کے حسن سیرت کی بابت بہت کچھ لکھا ہے وہاں جمالِ صورت پر بھرپور اظہار کیا ہے۔ فراقِ حضورؐ میں ان کے مدحیہ مرثیے بھی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہادی، مہدی، بدر، نور، منبر، مصلیٰ، مسجد، وحی وغیرہ کا تذکرہ کرکے عربی شاعری اور تعتیبہ قصائد کو نئے تناظر کے الفاظ و خیالات سے نوازا ہے۔ حسان بن ثابتؓ کو حضورؐ نے ہدایت کی تھی کہ مشرکوں اور کافروں کی ہجو کیے جاؤ جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم تمہارا کلام ان کے لئے ان تیروں سے بھی زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ ہے جو تاریکی میں آن پڑتے ہیں ①

• لبید

صاحب معلقہ لبید ابن ربیعہ نے اپنے قصائد میں حمد کے اشعار بھی لکھے ہیں۔ موت و حیات کے فلسفہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نفس کشی، زندگی کا امانت ہونا، انسان کا شعلہ کی مانند جلنا بجھنا وغیرہ کے موضوعات ان کے کلام کی زینت ہیں ان کے ایک شعر کا ترجمہ ہے خدا کا شکر ہے جب تک اس نے مجھے اسلام کی قمیص نہیں پہنا دی مجھے موت نہیں آئی ② بعض محققوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد شعر گوئی ترک کردی تھی۔ یہ خیال غلط ہے انہوں نے اپنے کئی قصائد قبولِ اسلام کے بعد لکھے ہیں ③

• نابغہ

اس دور میں حضورؐ کی مدح میں نابغہ جعدی کا یہ شعر ملاحظہ ہو

سہ اتیت رسول اللہ اذ جاء بالہدیٰ + ویتلو کتابا کالمجرۃ نیرا

ترجمہ [جب رسول اللہ ہدایت لے کر آئے تو میں ان کے پاس آیا آپ کہکشاں سی روشن کتاب پڑھتے ہیں]

اس دور میں خلفاء اور صحابہ کو شاعری پر غور و فکر کرنے کی زیادہ فرصت نہیں تھی۔ ایک نئی عمارت کی تعمیر کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسلامی عمارت کی تعمیر کا! اسلامی شعرا کے ہاں مدحیہ اور فکری موضوعات میں تبدیلیاں اظہر من الشمس ہیں۔ حمد و نعت کے موضوعات قصائد کا حصہ بننے لگے۔ نئی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے آثار سے شاعری مالا مال ہوئی۔ الفاظ و تلازمات کے نئے ذخائر دریافت ہوئے۔ پند و حکمت کے حوالے سے موت، فنا، تقدیر، نفس کشی، قناعت پسندی، انسان دوستی کے تصورات نے شاعروں کو متاثر کیا۔ فنی اعتبار سے قصیدے نے اپنی پرانی صورت و ہیئت کو برقرار رکھا البتہ محدوحین کی صورتیں اور سیرتیں بدلی ہوئی نظر آئیں۔ اوزان و قوافی میں قدیم معیارات ہی کی پیروی ہوئی۔ البتہ بحرِ رجز میں طویل قصائد کہنے کا رواج ہوا۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں مرقوم ہے کہ اس عہد میں قصیدے میں چند ایک نئے موضوعات کا اضافہ ہوا ان کا تعلق ترغیب جہاد اسلامی عقائد کی اشاعت سے تھا۔ مدح میں مبالغہ آرائی اور ہجو میں فحش گوئی سے پرہیز کا رجحان دیکھنے میں آیا۔ غزل و تشبیب میں عریانیت سے بھی دامن بچایا گیا۔ عفت و پاکیزگی ملحوظِ خاطر رہی۔ منظریہ، وصفیہ اور بیانیہ شاعری میں اسلامی محرکہ آرائیوں کی توضیحیں نظر آنے لگیں۔

---

① بلوغ الارب جلد چہارم ص ۹۹
② اصل شعر یہ ہے سہ الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی + حتی کسانی من الاسلام سربالا ③ بلوغ الارب جلد چہارم ص ۹۴
④ دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۶/۲ ص ۲۹۳

عہدِ بنو امیّہ

کسی قوم کی عادتوں کو یکدم مکمل طور پر بدلنا آسان کام نہیں ہے۔ اسلام کے مستحکم ہو جانے کے باوجود قدیم عرب قبائل کے بعض افراد سرداری، امارت یا خلافت کے حصول کی تگ ودو میں مصروف ہوئے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں تصورِ خلافت واضح تھا۔ عمل، علم اور عبادت میں افضل شخص اسلام میں قیادت کا اہل ٹھہرتا ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے تک تو یہ تصور کسی نہ کسی صورت رائج رہا۔ تاہم اس دور کے بعد قیادت کے حوالے سے عربوں کی قدیم قبائلی ذہنیت کو فروغ ملا۔ کچھ لوگ سرداری کے حصول کی تگ ودو میں مصروف ہو گئے۔ امیر معاویہ نے دور رس حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے خلافت کو اپنے خاندان میں منتقل کر لیا۔ ملوکیت خلافت کے پیرہن سے آراستہ ہوئی۔ یزید نے قبائلی تعصب کی نفسیات کے حوالے سے مظالم کو عروج پر پہنچایا۔ سیدنا امام حسین میدانِ کربلا میں شہید کر دیئے گئے۔ یوں عمل، علم اور عبادت کی افضلیت کے تناظر میں خلیفہ کے انتخاب کا معاملہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھٹائی میں پڑ گیا۔ ملوکیت کے زہریلے پنجے مسلمانوں کی گردنوں میں گڑ گئے۔ خلافت پسند اور جمہوریت پسند قوتوں کی ملوکیت آفریں طاقتوں سے ٹھن گئی۔ خانہ جنگیاں اور بغاوتیں فروغ پانے لگیں۔ دشمنی خیز مباحثوں اور مناظروں نے رواج پایا۔ شام، حجاز اور عراق میں بنو امیہ، اہل بیت، ابن الزبیر کے حمایتیوں اور خوارج کے مابین کشمکش عروج پر تھی۔ تشدد، سختی اور ظلم کا دور دورہ تھا۔ بنو امیہ نے ہشیاری، دانشمندی اور جبر سے کام لے کر فضا کو اپنے حق میں سازگار بنایا۔ جمہوریت پسندی، شریعت نوازی اور حق طلبی کے معاملات پہاڑ اوجھل ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے ہونے والی علاقائی فتوحات نے بنو امیہ کے ملوکی اقتدار کو اور زیادہ مستحکم اور راسخ کیا۔ مالِ غنیمت کی کثرت سے عرب عوام خوشحال ہوئے۔ مفتوحہ بستیوں اور ملکوں کے ثقافتی اور تہذیبی اثرات کے نتیجے مسلم دار الخلافہ میں کاسموپولیٹن فضا پیدا ہونے لگی۔ ایرانی اور رومی تہذیبیں اسلامی عرب پر اپنے گہرے نقوش مرتسم کرنے لگیں۔ السنہ، خیالات و عقائد اور علم و ادب امتزاجی حالتوں کے مظہر بنے۔ یونانی علوم اور فنون کی جانب توجہ دی جانے لگی۔ یہ دور آزاد خیالی کی روایات کا حامل تھا۔

دورِ بنو امیہ کا آغاز امیر معاویہ کی خلافت ۶۶۱ء سے ہوا اور اختتام السفاح کی حکومت ۷۴۹ء میں ہوا۔ یزید (۶۸۰ تا ۶۸۳ء) معاویہ ثانی (۶۸۳ تا ۶۸۴ء) مروان (۶۸۴ تا ۶۸۵ء) عبدالملک (۶۸۵ تا ۷۰۵ء) ولید اول (۷۰۵ تا ۷۱۵ء) سلیمان (۷۱۵ تا ۷۱۷ء) عمر بن عبدالعزیز (۷۱۷ تا ۷۲۰ء) یزید ثانی (۷۲۰ تا ۷۲۴ء) ہشام (۷۲۴ تا ۷۴۳ء) ولید ثانی (۷۴۳ تا ۷۴۴ء) یزید ثالث (۷۴۴ء) ابراہیم (۷۴۴ء) اور مروان ثانی (۷۴۴ تا ۷۵۰ء)۔ بنو امیہ کا دور مسلم دنیا میں ملوکیت کے قیام و توسیع کا دور ہے۔ اس میں اسلامی سلطنت کی مزید توسیع ہوئی۔ سوڈان، کابل، ممالک افریقیہ، لیبیا، خوارزم، سمرقند، آرمینیا، صغانی، ارض روم، فرغانہ، صغد، ماوراء النہر، طالقان، اندلس، سندھ، قیساریہ، غور، قلعہ قسطنطین اور ملطیہ وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے۔ اسی دور میں سانحۂ کربلا پیش آیا۔ مختار ثقفی، عراقیوں اور قریشیوں کی بغاوتیں ہوئیں۔ ڈاکخانوں،

اور شغلخانوں کا قیام عمل میں آیا۔ واسط اور اردبیل جیسے شہر تعمیر ہوئے۔ ترمیم و تعمیر کعبہ ہوئی۔ قدرتی آفات سے ہزاروں افراد لقمۂ اجل بنے۔ بصرہ اور شام میں طاعون پھیلی، اہل سنت، خوارجی اور شیعہ تحاریک نے زور پکڑا۔ تحریک خوارج شریعت کی پابندی پر زور دیتی تھی۔ ام حکیم، عمران بن حطان اور معاذ بن جوین اسی روایت کے شاعر تھے۔ ان کے قصائد میں قرآن وسنت کے حوالوں سے مذہبی اور دینی موضوعات بھی رقم ہوئے ہیں۔ شیعہ شاعروں میں ابوالاسود دؤلی، ایمن بن خزیم اسدی، عبداللہ بن ہشام سلولی، رخیلے بنو قشیر اور کمیت بن زید اسدی مشہور رہے ہیں۔ ان شعرا کے قصائد میں حصول عدل و انصاف اور خاندان رسول سے محبت کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ اس دور کے دیگر شعرا میں عمر بن ابی ربیعہ، اخطل، فرزدق، جریر، طرماح، حندج بن حندج، ذوالرمہ، الراعی اور عبداللہ بن قیس الرقیات بہت معروف ہیں۔ ابوصخر الہذلی، زفر بن حارث، معن بن اوس اور المتوکل اللیثی وغیرہ بھی اسی عہد سے متعلق شعرا ہیں۔ مذکورہ شعرا نے عربی شاعری کی ترقی میں حصہ لیا۔ بنو امیہ کا دور مذہبی اور غیر مذہبی قصائد نویسی کے اعتبار سے پرمایہ ہے۔ اس دور کے چند اہم شعرا کے قصائد کا اجمالی جائزہ

• عمر عمر بن ربیعہ م ۷۱۹ء کے قصائد زیادہ تر غزلیہ ہیں۔ عشق بازی، دل لگی، عورتوں کی باہمی چھیڑ چھاڑ، حسن و جمال وغیرہ کے موضوعات اور اس کے افسانوی طرز بیان نے مل کر عربی قصیدے کو ایک نیا روپ تفویض کیا۔ عمر کی شاعری کے بارے میں جریر جیسے بلند پایہ شاعر کا کہنا تھا "بخدا یہی وہ شاعری ہے جس کا تمام شاعر قصد کرتے ہیں۔ لیکن اس تک پہنچ نہ سکے اور محبوب کے مکانوں اور کھنڈروں میں الجھ کر رہ گئے"[1]۔ عربی قصیدے میں عمر کی نئی طرز کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا کلام زبان زد عام ہوگیا۔ گویئے، مے نوش اور عامۃ الناس اس کے شیدائی تھے۔ اس نے قصائد میں مناظرے کو رواج دیا۔

• اخطل عیسائی شاعر اخطل (م ۷۱۳ء) قصائد کی تشابیب میں وصف شراب کے بیان اور موثر مدحیں لکھنے کے حوالے سے معروف ہے۔ اس کے طویل قصائد تنقیص الفاظ کے اعتبار سے حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ اس نے طویل غور و فکر کے بعد شعر کہنے کو اپنا وتیرہ بنایا تھا۔ عبدالملک بن مروان کی مدح اور انصار کی ہجو میں اس کے بہت سے قصائد ملتے ہیں۔ عرب نقادوں نے اس کے قصائد کو بلند پایہ قرار دیا ہے۔ فرزدق نے بھی اسے سراہا ہے[2]۔ اخطل کا دیوان بیروت سے طبع ہوا ہے[3]

• فرزدق فرزدق (م ۷۲۸ء) حضرت امام حسینؓ کی مدافعت اور حضرت علیؓ کی توصیف و تحسین میں ... معرکتہ آلارا قصیدے لکھے ہیں۔ امام زین العابدین کی مدح میں بھی اس کا ایک قصیدہ بہت مشہور رہا جس کی وجہ سے خلیفہ ہشام نے اسے جیل بھجوا دیا۔ واقعہ کربلا کے حوالے سے بھی اس نے بہت سے اشعار کہے ہیں۔ اس کے ایک شعر کا ترجمہ ہے " اگر تم حسین کا انتقام نہیں لے سکتے جس کا والد تم سب میں افضل تھا تو پھر تلوار پھینک دو اور تکلے گھمایا کرو" حضرت امام حسین کے بارے میں اس کا کہنا ہے "ترجمہ: یہ وہ شخص ہیں سرزمین بطحا ان کے پیروں کی چاپ پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ، حرم اور غیر حرم سب ہی مقامات ان کو جانتے ہیں"[4]
فرزدق کے قصائد میں قدیم جاہلی شعرا کے قصائد کی مانند تفاخر کا احساس بہت نمایاں ہے۔ وہ شاندار الفاظ اور پرشکوہ اسلوب کا مالک تھا۔ واقعات کا موثر بیان اور جرأت اظہار اس کے قصائد کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ قصائد میں وصف نگاری کے اعتبار سے بھی جدت طراز تھا۔ فرزدق نے شاعری کی بدولت بڑی عزت اور شان سے زندگی گزاری۔ اس کا دیوان پیرس سے شائع ہوا[5]

① تاریخ ادب عربی ص ۲۵۳ ② عربی ادب علی احمد رفعت ص ۱۱۰ ③ تاریخ ادب عربی ص ۲۶۱
④ دیوان اخطل مطبوعہ بیروت ⑤ دیوان فرزدق مطبوعہ پیرس

• **جریر** جریر (م ۷۲۸ء) نے بھی شاعری کو روزگار کا ذریعہ بنایا۔ وہ حجاج، عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیز کا مداح تھا۔ اس کے قصائد کی بدولت حکمرانوں میں آپس کی ٹھن بھی جاتی تھی۔ حجاج نے جریر سے کہا تھا کہ عبدالملک کے پاس نہ جاؤ بس تم حجاج کے لئے ہو گئے۔[1] اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب قصیدہ گو شعرا قبائل کی ضرورت نہیں رہے تھے امرا کی ضرورت بن گئے تھے۔ جریر اور فرزدق کے درمیان نقائضیہ قصائد کا سلسلہ بھی چلا۔ یعنی ایک شاعر جب ایک قصیدہ لکھتا تو دوسرا اس کی تردید کرتا اور یہ تردید پہلے شاعر کے قصیدہ کی زمین و بحر میں ہوتی۔ جریر قصائد میں پاکیزہ مضامین کو نزاکت احساس کے ساتھ شیریں اسلوب میں بیان کرنے پر قادر تھا۔

• **طرماح** طرماح بن حکیم (م ۷۱۸ء) نے بھی قصائد کے وسیلے سے امرا سے عطیات و انعامات حاصل کیے۔ اس کے ملحمات یعنی رزمیہ قصائد بہت مشہور ہوئے۔ بے تکلف اور آورد سے پاک قصائد اس کی خوبی تھے البتہ بعض قصائد میں اس نے غریب و نادر الفاظ بھی برتے ہیں۔[2]

• **ذوالرمہ** ذوالرمہ (م ۷۳۵ء) نے دورِ جاہلی کی شاعری کی روایات کو از سرِ نو زندہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ دورِ جاہلیہ کی شاعری ذوالرمہ پر ختم ہوئی۔

ابوالاسود دؤلی، ایمن بن خزیم اسدی، عبداللہ بن ہشام سلولی اور کمیت بن زید اسدی نے خانوادۂ حضرت علی کے حوالے سے بہت سے قصائد لکھے۔ یوں منقبت کے قصائد کی روایات کو مستحکم کیا۔ کمیت قصائد ہاشمیات کی بدولت بہت مشہور ہوا۔ ان قصائد میں بنو ہاشم کی مدح بھی کی گئی ہے اور ان کی حمایت میں عقلی دلیلوں سے کام بھی لیا گیا ہے۔ ان قصائد کی بدولت ہشام نے اس کے قتل کا حکم صادر کیا تو اس نے جان بچانے کے لئے اس کی مدح میں بھی ایک قصیدہ لکھا۔ خوارجی تحریک سے وابستہ شعرا کے قصائد میں جنگ کی ترغیب بھی ہے، جہاد کے لئے بے قراری اور موت کے برحق اور زندگی سے بیزار رہنے کے موضوعات عمومی ہیں۔ شوقِ شہادت ان کی گھٹی میں تھا۔ معاذ بن جوینی، ام حکیم اور عمران بن حطان کے قصائد انہی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

اموی دور کے قصائد اپنے عہد کے بہت سے مذہبی، غیر مذہبی اور سیاسی وقوعات کے عکاس ہیں۔ اگرچہ مسلم سلطنت کی توسیع کے معاملات پر شاعروں نے بہت کم لکھا ہے تاہم مذہب اور عقائد کے حوالے سے مختلف فرقوں کے شعرا نے اپنے اپنے فرقے کی مقتدر شخصیات سے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ مخالف فرقوں کی شخصیات پر چوٹیں بھی کی گئی ہیں۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان سرد و گرم جنگوں نے شاعروں کو بہت متاثر کیا۔ ملوکیت کے استحکام کے لئے حکمرانوں نے جاہلی دور کے قبائلی شعرا کی مانند درباری شعرا کی روایت مستحکم کی۔ بنو امیہ کے حکمرانوں نے مال و زر کے رسیا اور طماع شعرا کو اپنا طرفدار بنایا۔ شاعروں نے امرا اور حکمرانوں کی مدح میں بسا اوقات ان سے بدوی سرداروں کے شخصی اخلاق اوصاف منسوب کیے ہیں۔ اس عہد میں جاہلی دور کی طرز پر قصائد لکھنے کی روایت کو فروغ ملا۔ اموی خلفاء اور امرا کی شان میں بلند پایہ قصائد لکھے گئے۔ خلافت راشدہ کے عہد میں جس نوع کی اخلاقی اور مذہبی قدغنیں تھیں۔ اس دور میں ان کی پرواہ نہیں کی گئی۔ تشابیب میں عیش و طرب اور طاؤس و رباب کے موضوعات اس دور کی ثقافتی زندگی کے عکاس ہیں۔ مفتوحہ علاقوں کی تہذیبیں مسلم شعور پر اثر انداز ہوئیں بعض غیر اسلامی رجحانات کو فروغ ملا۔ یونان، روم اور دیگر مغربی علاقوں کے علوم سے مسلمانوں کی واقفیت نے ان کے فکر و خیالات کی کائنات میں نئی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ مذکورہ رجحانات مختلف شعرا کے قصائد میں منعکس ہیں۔ اس دور میں درباری تعلقات کے شاخسانے کے طور پر نقائض (جوابِ قصیدہ) کی صنف نے فروغ پایا۔ البتہ قصیدے کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

---

① تاریخ ادبِ عربی ص [illegible] ② ایضاً ص ۲۷۳

عباسی دور

عباسی دورِ خلافت پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران جہاں سلطنت بہت وسیع ہوئی وہاں ایک دور ایسا بھی آیا جب اسے صرف اور صرف بغداد ہی میں سمٹنا پڑا۔ سپین، ایران، روم، یونان، افغانستان اور ہندوستان وغیرہ میں خود مختار حکومتیں [مسلم] قائم ہو گئیں۔ عباسی سلطنت کا زمانہ ۷۵۰ء تا ۱۲۵۸ء تک کا ہے۔ اس عرصے کے دوران میں کچھ عرصہ تک بغداد میں علویوں کی حکومت بھی رہی۔ تختِ خلافت پر متمکن ہونے والے عباسی خلفاء کے نام ذیل میں درج ہیں۔ ان کے ناموں کے آگے ان کے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کا سن دیا گیا ہے۔

السفاح ۷۵۰ء، منصور عباسی ۷۵۴ء، مہدی ۷۷۵ء، الہادی ۷۸۵ء، ہارون ۷۸۶ء، امین ۸۰۹ء، مامون ۸۱۳ء، المعتصم ۸۳۳ء، واثق ۸۴۲ء، جعفر ۸۴۷ء، منتصر ۸۶۱ء، مستعین ۸۶۲ء، معتز ۸۶۶ء، مہتدی ۸۶۹ء، معتمد ۸۷۰ء، معتضد ۸۹۲ء، مکتفی ۹۰۲ء، مقتدر ۹۰۸ء، قاہر ۹۳۲ء، راضی ۹۳۴ء، متقی ۹۴۰ء، مستکفی ۹۴۴ء، مطیع ۹۴۶ء، طائع ۹۷۴ء، قادر ۹۹۱ء، قائم ۱۰۳۱ء، مقتدی ۱۰۷۵ء، مستظہر ۱۰۹۴ء، مسترشد ۱۱۱۸ء، راشد ۱۱۳۵ء، مقتفی ۱۱۳۶ء، مستنجد ۱۱۶۰ء، مستضی ۱۱۷۰ء، ناصر الدین ۱۱۸۰ء۔ ظاہر ۱۲۲۵ء، مستنصر ثانی ۱۲۲۶ء، مستعصم ۱۲۴۲ء — ۱۲۵۸ء میں بغداد پر ہلاکو کے حملے کے بعد عباسی خلافت کا یہ طویل عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔ بعد میں بھی اکا دکا عباسیوں نے اپنی حکومتوں کا اعلان کیا۔

سفاح اور منصور کی سخت گیریوں نے عباسی سلطنت کو محکم اور پائیدار بنیادیں مہیا کیں۔ البتہ ۷۵۶ء میں اندلس میں اموی حکومت قائم ہوئی۔ ہارون الرشید تک آتے آتے عباسی سلطنت بہت مضبوط ہو گئی لیکن بعد میں اسے مجتمع نہ رکھا جا سکا ۸۱۹ء میں یمن میں دولتِ زیادیہ قائم ہوئی ۸۲۱ء میں دولتِ طاہریہ کی بنیاد پڑی، ۸۶۸ء میں دولتِ صفاریہ کا آغاز ہوا۔ اسی سال مصر میں دولتِ طولونیہ ظہور میں آئی۔ ۹۰۹ء میں دولتِ فاطمیہ کا آغاز ہوا ۹۳۲ء میں دیلمیوں کا فارس پر قبضہ ہوا۔ محمود غزنوی سے ۱۰۳۵ء کے معرکے، سلجوقیوں کی ابتداء ۱۰۳۷ء رکن الدین کی حکومت سے ہوئی ۱۱۵۰ء میں فیروزہ کوہ میں غوریوں کا آغاز ہوا۔ قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں خود مختار حکومت قائم کی۔ یوں مسلم سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا رہی سہی کسر ہلاکو خاں نے پوری کر دی اور بغداد کو تباہ کر دیا۔ مذہب کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس عرصے کئی جھوٹے مدعیانِ نبوت پیدا ہوئے۔ حکیم مقنع نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ خلقِ قرآن کے فتنے نے سر ابھارا۔ زنادقہ کا زور و شور ہوا۔ کوفہ میں علویوں نے مظالم ڈھائے۔ قرامطیوں نے امن و امان کے مسائل پیدا کیے۔ شیعہ سنی فسادات ہوئے۔ باطنیوں نے علماء، فضلاء اور حکمرانوں کو قتل کروایا۔ امام حنبل کو کوڑے لگائے گئے۔ دیلمیوں، آرمینیوں، زنگیوں اور خاقانیوں نے بغاوتیں کیں۔ سیاسی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی حوالوں سے علماء، فضلاء، شعراء اور وزراء کو مروانے کا عمومی رواج تھا۔ عباسیوں کے زیرِ نگیں مختلف علاقوں میں زلزلوں، سیلابوں، آگوں، قحطوں، ژالہ باریوں اور آندھیوں وغیرہ نے بھی مختلف زمانوں میں خوب خوب تباہیاں مچائیں۔ عیسائیوں، یہودیوں، فرنگیوں اور رومیوں وغیرہ نے بھی عباسی خلفاء کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ خلافتِ عباسیہ کے صرف ابتدائی ساٹھ ستر سال ہی امن و آشتی کے ہیں

عباسی دور کو عربی ادب کے سنہرے زمانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فلسفہ، منطق، اخلاقیات، علم ہندسہ، جغرافیہ، نجوم، طب، خطابت، شاعری، تصوف، خطاطی، صرف و نحو، قرآنی علوم، حدیث، تاریخ، تفسیر اور موسیقی وغیرہ کے شعبوں میں ترقی کے دروازے کھلے۔ فارسی، ہندی اور یونانی علوم و فنون سے استفادہ کیا گیا۔ بصرے، کوفے، بغداد اور دمشق میں علم و ادب کے بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے۔ الفخری میں مرقوم ہے "اس خاندان نے علوم اور کلچر کی بڑی قدر کی۔ مذہب کے اصول مجروح نہیں کیے۔ خیراتی ادارے کھولے، خوشحالی کا دور دورہ کیا۔ مقامات مقدسہ اور سلطنت اور سرحدوں کے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا"[1] ابن طباطبا کی یہ رائے عباسی دور کے مستحکم زمانے کے بارے میں درست ہے۔ تاہم اسی دور میں عرب و عجم کا جھگڑا بھی چلا۔ تحریک شعوبیہ اسی کا شاخسانہ تھی۔ اس تحریک کا مقصد عجمیوں کو عربوں پر فوقیت دینا تھا۔ شامی، نبطی، مصری، یونانی، ہسپانوی اور عجمی علماء و فضلا اس میں شامل تھے۔ حکومت عباسیہ پر ایرانی اثرات اس لیے بھی مستحکم تھے کہ عجمیوں نے بنو امیہ سے بنو عباسیہ کو حکومت دلوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا علاوہ ازیں اس کی ایک بڑی وجہ عباسی دارالخلافہ کا بغداد منتقل ہونا تھا۔ بغداد ایران کے قریب تھا۔ یوں آریہ اور سامی تہذیب کا ملاپ عروج کو پہنچا۔ مذہب میں متعدد فرقوں نے ظہور پایا یہی تھا اس دور میں لباس، عمارات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی تکلفات نمایاں ہو گئے۔ خطوط میں تفصیلی القابات لکھے جانے لگے۔ خلفاء اور حکمرانوں کو غیر مروجہ خطابات سے نوازا گیا۔ اسی دور میں ایران میں فارسی شاعری کا بھی ظہور ہوا۔

جہاں تک علم و ادب و فن کی ترقی کا تعلق ہے۔ اس دور میں نحو اور زبان کے ماہرین میں سے عیسیٰ بن الثقفی، سیبویہ، علی بن حمزہ الکسائی، قطرب، الفراء، ابو عبیدہ عمر بن المثنیٰ، اصمعی اور اخفش وغیرہ نے اہم کارنامے سرانجام دیئے۔ ابن المقفع نے داستان کے میدان کو چنا اور کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ کیا۔ خلیل بن احمد نے عروضی قواعد متعین کیے۔ نوبخت نے ریاضی، نجوم اور طبابت پر کتب مرتب کیں۔ یحییٰ بن بطریق اور الکندی وغیرہ نے فلسفے میں نام پیدا کیا۔ ابن عربی نے تصوف اور جابر بن حیان نے سائنس کے میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ محمد بن السائب کلبی، محمد عبداللہ الازدی، واقدی، ابن قتیبہ، مدائنی اور ابن سعد وغیرہ نے تاریخ نویسی میں کمالات دکھائے۔ فقہ کے میدان میں امام محمد حنیفہ، امام مالک، ابو یوسف یعقوب، محمد بن حسن الشیبانی اور امام شافعی نے یادگار کارنامے سرانجام دیئے۔ ابن عقبیٰ، ابن اسحق اور ابن ہشام نے سیرت کے میدان کو اپنے اظہار کے لئے چنا۔ حماد بن سابور، المفضل الضبی اور ابو تمام وغیرہ نے قدیم جاہلی اور اسلامی دور کے قصائد یکجا کیے۔ ابو دلامہ، بشار بن برد، مروان بن ابی حفصہ، مسلم بن ولید، عباس بن احنف، ابو نواس، ابو العتاہیہ، جاحظ، ابن العمید، بدیع الزماں ہمدانی، حریری، ابو فراس ہمدانی، متنبی، بحتری، مطیع بن ایاس، ابن المعتز، ابو العلاء معری اور شریف رضی وغیرہ نے شاعری خصوصاً قصائد نویسی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ۱۰۵۵ء تا ۱۲۵۸ء کے عہد کے دوران میں عمر ابن الفارض، زہیر، ابن قلاقس، جمال الدین بن مطروح، اسناد الملک وغیرہ نے بھی شاعری میں بڑا نام پیدا کیا۔ شام سے ابن سنان الخفاجی، ابن ابیر الطرابلسی، عراق سے طغرائی، سعد بن علی الوالمعالی، ابن التعاویذی، نجم الدین الحصرمی، حسام الدین حاجری، ابن الحلاوی اور العز الفری نے عمدہ قصائد لکھے۔ فارس کے شعراء الجماخرزدی، الطنطرانی، ابن الحبارہ، ابو اسحق الغزی اور صلاح الدین اللابیوردی نے نام پیدا کیا۔ مغول شعراء میں تلعفری،

۱۔ الفخری ص ۳۳ ۳۳ الم ۳

بوصیری، الوراق، الجزازی اور صفی الدین حلی خصوصی مراتب کے حامل تھے۔ عثمانی دور کے شعرا میں محمد بن احمد الرومی، درویش انطاکی، عائشہ باعونیہ، عبداللہ بن شرف الدین، شاطبی بہت معروف ہیں۔ اندلسی عہد کے شعرا میں ابن عبدربہ، ابن ہانی، المعتمد، ابن عبداللہ، ابن زیدون، الغنیہ ابن مالک، ولادہ، ابن خفاجہ اور لسان الدین بن الخطیب کی شاعری قابلِ توجہ ہے۔ مذکورہ شعرا نے اپنے معاصر علوم و فنون سے بھرپور استفادہ کیا اور اپنی شاعری میں تاثیر پیدا کی۔

عباسی عہد کے قصائد میں اموی دور کے مقابلے میں لفظی اسالیب، معنوی و موضوعاتی نہج اور اوزان و بحور وغیرہ کے حوالے سے بعض تغیرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ شاعری میں غیر عرب الفاظ و اصطلاحات کے استعمال اور دقیق پیرائیہ اظہار کو مقبولیت ملی۔ ایرانی اثرات کے تحت نزاکت آفرینی کو رواج ملا۔ قصائد میں معنوی تسلسل کو ایک خوبی قرار دے دیا گیا۔ تخیل کی کرشمہ سازیوں اور تصورات کی جمال طرازیوں نے مل کر قصائد کو اور زیادہ پرشکوہ بنا دیا۔ حکمرانوں اور خلفاء کی مدح سرائی میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جانے لگا۔ اس عہد کے قصائد میں سیاسی و مذہبی تعصبات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ لذت پرستی اور ترکِ دنیا کے موضوعات بھی نظر آتے ہیں۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں درج ہے کہ "بحور میں مخمس و مزدوج، موالیا اور موشحات ازجال کے لیے اوزان وجود میں آئے۔ اس کے علاوہ قدیم عرب شعرا کے مروج بحور سے ہٹ کر ہلکی پھلکی بحور (جیسے مجتث اور مقتضب وغیرہ) کو ذریعہ نظم بنایا گیا۔ ابونواس اور ابوالعتاہیہ نے ایسے اوزان میں قصیدہ گوئی کی جو پہلے متداول اور مانوس نہ تھے"[1] نکلسن نے عباسی دور کی شاعری کو دورِ جدید کی شاعری کہا ہے اس کا یہ بھی خیال ہے کہ چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر اس کا فروغ دربار کے زیرِ سایہ ہوا۔ حکمرانوں نے شعرا کی قدر افزائی کی۔ شعرا قوت لایموت کے لیے خلفاء اور ان کے امراء کے دستِ نگر تھے وہ ان کی مدح میں قصائد کہتے اور کثیر انعامات سے سرفراز ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشامد یا مبالغے میں وہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے[2]

ذیل میں ان شعرا میں سے چند ایک کے اسلوبِ قصیدہ نگاری کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے اپنے قصائد میں کس نوع کی تبدیلیاں پیدا کیں یا کس حد تک روایات کی تقلید کی۔

• مطیع

مطیع بن ایاس ولید بن یزید کا مادح تھا بعد میں اس نے عباسی خلیفہ منصور کی مدح میں قصائد لکھ کر دربار میں رسائی حاصل کی۔ اس کے قصائد شراب، محبت اور عورت کے موضوعات کے علاوہ زندیقی اور لامذہبی خیالات سے بھرے پڑے ہیں

• بشار

زندیق شاعر بشار بن برد کو یکم دسمبر ۷۸۳ء کو کوڑے مار کر ہلاک کیا گیا۔ اس کا حکم خلیفہ مہدی نے دیا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے قصیدہ کا صلہ نہ ملنے پر مہدی کی ہجو کہی تھی۔ وہ نابینا شاعر تھا اور قصائد میں پردہ نشین عورتوں کی بے حرمتی کیا کرتا تھا۔ مہدی نے اس کا ایک عشقیہ قصیدہ سن کر اسے دربار میں بلا کر کہا تھا کہ آج کے بعد اگر تم نے ایک بھی عشقیہ شعر کہا تو بخدا میں تمہاری جان لے لوں گا[3] کہا جاتا ہے کہ اس نے بارہ ہزار قصائد کہے مگر دستبردِ زمانہ سے کم ہی محفوظ رہے۔ اس کے منتشر کلام کا خالدیان نے انتخاب کر کے چھپایا تھا[5] عریانیت، قافیہ کے عیوب، رکیک اور سطحی معانی وغیرہ اس کے کلام میں عموماً ہیں۔ اس نے اپنے قصائد میں کوہ و دمن اور دیار و آثار کا تذکرہ بدویانہ انداز

---

① دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۱۶/۲ ص ۲۹۴ - ۲۹۵ ② نکلسن A Literary History of the Arabs Page 290
③ تاریخ ادب عربی ص ۳۴۷ ⑤ المختار من شعر بشار مرتبہ خالدیان قاہرہ ۱۹۳۴ء

کی بجائے بشیرین زندگی سے متاثر ہو کر کیا ہے۔ اس کے قصائد کے بعض اشعار اس کے زرتشتی مذہب کی جانب راغب ہونے کے مظہر ہیں (۱)

• **ابوالعتاہیہ** م ۸۲۴ء خلیفہ مہدی کا مادح تھا۔ مہدی کی وفات کے بعد اس نے قصائد میں زہد اور موت کے موضوعات پر لکھا ابوالعتاہیہ کو عام فہم الفاظ کے استعمال میں مہارت تھی۔ اس کے قصائد پند و نصائح کے اثاثوں سے مالا مال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ایک رجزیہ قصیدہ میں چار ہزار سے زاید ضرب الامثال کو جمع کیا ہے (۲)

• **جاحظ** جاحظ کے قصائد میں بہار و خزاں کے حوالے کی عمدہ منظر کشی ملتی ہے

• **ابونواس** م ۸۱۳ء ۸۱۵ء نے اپنے قصائد کو ٹیلوں اور کوہ و دمن کی بجائے شراب، اشعار، لذت کوشی اور دیگر منظریہ بیانات سے شروع کیا ہے۔ اس نے غلمانوں کے بارے میں بھی تشبیبی اشعار کہے ہیں وہ لکھتا ہے ترجمہ [قدما کی بلاغت ٹیلوں کی تعریف پر مشتمل تھی تم اپنے توصیفی اشعار شراب کے لئے وقف کرو] (۳) اور یہ بھی کہ ترجمہ [تم لیلیٰ اور ہند کے لئے غم و خوشی کا اظہار کرنے کی بجائے محبوب کے رخسار جیسی سرخ شراب پیو] (۴)۔ مبالغہ آرائی بھی اس کے قصائد کا خصوصی وصف ہے۔ (۵) رجزیہ قصائد کہنے میں ابونواس لاجواب تھا۔ اس کے قصائد زیادہ تر مختصر اور منتخب ہیں۔ ابونواس کا دیوان احمد عبد المجید غزالی نے مرتب کیا۔

• **ابن رومی** ابن رومی م ۸۹۶ء طویل قصائد کہنے میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ طوالت کے باوجود تکرار اور معنوی نقائص سے اس کا کلام پاک تھا۔ اجزائے قصیدہ میں مثالی ہم آہنگی پیدا کرنا اس کا خاص ہنر تھا۔

• **ابوتمام** ابوتمام م ۸۴۶ء شامی شاعروں میں سربرآوردہ تھا اس کے قصائد میں عقلی دلائل، تعقیدی کنایے، تجنیس، مطابقت اور استعارے کا استعمال کثرت سے ہے

• **بحتری** بحتری م ۸۹۷ء کے قصائد میں ترنم اور موسیقیت کا ایسا سحر طرازانہ انداز دستیاب ہے کہ ابن اثیر کے بقول وہ شاعری کرنا چاہتا ہے لیکن گانے لگتا ہے۔ زیات (۵) کے کہنے کے مطابق اس کی مدحیں عمدہ تھیں۔ وہ ان میں اعتدال کو ملحوظ رکھتا تھا۔ ممدوح کی شخصیت کی بے مثال تصویر کشی کرتا تھا اس نے اپنے قصائد میں خوبصورت محلات اور عمدہ تعمیرات کی متاثر کن وصف نگاری کی ہے۔ معتز کے محل اور متوکل کے ایوان میں موجود تالاب کی یادگار لفظی عکاسی بھی اس کے حصے میں آئی ہے

• **متنبی** متنبی م ۹۶۵ء دعویٰ نبوت کرنے والا شاعر تھا۔ اس نے اپنے قصائد میں فلسفے اور شاعری کو ہم آہنگ کیا ہے رزمیہ قصائد نویسی میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ سیف الدولہ کی شان میں اس نے جو قصائد رقم کیے ہیں ان میں اس کی فتوحات اور جنگی کارناموں کا تفصیلی بیان ہے۔ فارسی میں فرخی اور اردو میں نصرتی نے جو رزمیہ قصائد لکھے ہیں ان میں متنبی کی بازگشت ہے یعنی اس کے طریق کار کو ضرور اپنایا گیا۔ عبد الوہاب عزام نے متنبی کے رزمیہ اشعار کو شاہنامہ، ایلیڈ، مہابھارت اور رامائن کی روایت ہی کا حصہ قرار دیا ہے (۶) وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رزمیہ شاعری میں متنبی سے زیادہ کسی کو قدرت حاصل نہیں متنبی نے تشبیب میں نو بہ نو عاشقانہ مضامین بھی رقم کیے ہیں۔ گریز میں بھی اس نے مہارت دکھائی ہے۔ مدح میں انوکھا پن بھی اس کی خاص خوبی ہے۔ متنبی نے عرب میں خطابیہ قصائد لکھنے کا وتیرہ بھی اپنایا۔ (۷)

• **ابوفراس** ابوفراس ہمدانی م ۹۶۸ء کے قصائد میں متانت اور شاہانہ عزت و شوکت کا انداز دستیاب ہے

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق ص ۱۵۲ ندوۃ المصنفین دہلی (۲) تاریخ ادب عربی ص ۳۲۳
(۳) صفۃ الطلول بلاغۃ القدم + فاجعل صفاتک لابنۃ الکرم (۴) لا تبک لیلی ولا تطرب الی ہند + واشرب علی الورد من حمراء کالورد
(۵) تاریخ ادب عربی ص ۳۲۵ (۶) ذکری ابی الطیب از عبد الوہاب عزام ص ۱۱۱ مطبوعہ بغداد (۷) دیکھئے دیوان متنبی
دیوان ابونواس مرتبہ احمد عبد المجید الغزالی قاہرہ

• معری ابوالعلا معری م ۱۰۵۷ء زہد و تصوف، ترکِ دنیا، مذمتِ اشیا پرستی، عقلی حوالے سے پند و وعظ کا بیان اس کے صنعت لزوم مالا یلزم میں لکھے ہوئے قصائد اللزومیات میں نمایاں ہے

• طغرائی طغرائی م ۱۱۲۰ء کے مشہور قصیدے لامیۃ العجم کی بہت شرحیں لکھی گئیں۔ وہ آلِ سلجوق کا وزیر اور صاحب علم شخصیت تھا۔ سلطان سعید بن ملک شاہ اور نظام الملک کی مدح میں اس کے قصیدے ملتے ہیں۔

اندلسی شعرا نے جہاں بہت سے امور میں عرب قصیدے کی تقلید کی ہے وہاں یہ بات بھی مدِنظر رہنی چاہیے کہ انہوں نے منظر نگاری اور بیان وصف میں منفرد کمالات دکھائے ہیں۔ سپین کے برف پوش پہاڑ، جنگل، باغات، وادیاں، سمندر، بحری بیڑے وغیرہ کی تصویر کشیاں انہیں مرغوب تھیں۔ مختلف علوم و فنون کو قصائد کی صورت میں منظوم کرنے کی روایت بھی اندلسی شعرا ہی سے متعلق ہے۔ ابن عبد اللہ نے علم عروض پر العقیدہ ابن مالک نے علم النحو پر اور اسی طرح شاطبی نے قراءات سبعہ اور مصحف مبارک کے رسم الخط پر علمی سطح کے قصائد رقم کیے ہیں۔

جب ہم ہندوستان کی جانب نگاہ دوڑاتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں کچھ عرب قصائد نگار ملتے ہیں۔ ابوعطا سندی اموی دربار کا قصیدہ گو تھا۔ ابوالعطا یعقوب الغزنوی نے نعتیہ قصائد بھی لکھے ہیں وہ محمود غزنوی کا مداح بھی تھا فارس کے عرب قصیدہ گو شعرا میں الصباخرزی، الطغرائی، ابن الہبارِیہ، ابواسحق الغزی، اور صلاح الدین الابیوردی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

دورِ مغول میں بوصیری اور صفی الدین حلی بہت مشہور قصیدہ نگار ہیں۔ بوصیری کا قصیدہ بردہ شریف معرکے کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں حلی نے بھی طویل قصائد میں اپنا مقام پیدا کیا ہے۔

عباسی دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی، حادثاتی اور علمی و ادبی حالات کی روشنی میں جب ہم قصیدہ نگاروں کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اس دور کے سارے واقعات نہ سہی اہم حالات کو قلمبند ضرور کیا گیا ہے۔ شاعر سدیف کے اشعار پر السفاح نے سلیمان بن ہشام بن عبد الملک کو قتل کر دیا۔ ایک اور شاعر کے اشعار پر ۷۰ امویوں کو کہ جو اس کے دستر خوان پر موجود تھے تہ تیغ کر دیا گیا۔ سفاح نے جب اپنے وزیر ابوسلمہ کو قتل کرایا تو اس پر بھی شاعروں نے اشعار کہے۔ کوفی شاعر ابن حبیبات نے وزیر ابوایوب سلیمان موریانی کے قتل کی داستان اشعار میں دی ہے۔ ابوالعتاہیہ نے مہدی کی موت پر ماتم کرنے والی کنیزوں کا نقشہ اپنے اشعار میں کھینچا ہے۔ ہارون الرشید نے جب یحیٰی بن عبد اللہ کو قتل کرایا تو اس پر ابوفراس بن حمدان نے اشعار لکھے عموریہ کی جنگ پر ابوتمام طائی نے معتصم کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس میں اس جنگ کے واقعات بھی درج ہیں۔ حسین بن منصور حلاج کے قتل پر بہت سے شاعروں نے اشعار لکھے ہیں

جہاں تک اس دور کے قصیدوں کے مزاج کا تعلق ہے یہ عرب میں شاعری کی تشکیلِ نو کے غماز ہیں۔ فتوحات اور ملکی توسیعات کے بعد عربوں کے لشکری اور فوجی مزاج کی آتش سرد ہونے کا زمانہ بھی یہی ہے۔ جنگجو، منتقم مزاج قبائلی تفاخر کے عادی، صحراؤں کے پروردہ شاعر امن، صلح پسندی، انفرادی عزت و تکریم کے جذبات اور شہری زندگی

کی رنگینیوں کو اپنے کلام میں پیش کرنے لگے۔ اکثر شاعروں نے جنگجو یانہ نفسیات کو بالائے طاق رکھ کر جنگی ترانوں کی بجائے شاہی اور درباری مدح سرائی کی جانب توجہ دی۔ خلیفہ، وزراء، امراء اور دیگر طاقت وحشمت کے حامل اشخاص کی جا و بے جا تعریف کی اور انعام و اکرام سے مالامال ہوئے۔ بہت سے عرب شاعروں کے سامنے اس دور میں بھی کلاسیکی قصیدہ نگاروں کی شاعری بطور ماڈل موجود تھی۔ لیکن وہ روایتی خیالات وجذبات کو بے تکلفی، زور اور مکمل فصاحت وبلاغت کے ساتھ بیان کرنے سے اس لئے قاصر تھے کہ ان کی زندگی کے اسلوب میں نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں نے اسلوبیات پر بڑا زور دیا اور موشگافیاں کیں۔ وہ تخیل کی بلند پروازی، بیان کی بلند آہنگی، نازک، باریک اور تیز دماغی کوندوں کے اظہار، لفظی شان وشوکت، اور معنوی بازیگری سے اپنی شاعری کا لوہا منوانے کی فکر میں رہے۔ ان کے ہاں اصل جنگوں کے اصل نقشے کم ہیں البتہ خیالی نقشے وافر مقدار میں موجود ہیں۔ وہ گھوڑے، تلوار اور شجاع ہیرو وغیرہ کی وصف نگاری پر قادر تھے۔ وہ ان طوفانوں، بلاؤں، مصیبتوں کا تذکرہ بھی کر سکتے تھے جنہیں انہوں نے اپنے بند کمروں میں تصوراتی آنکھوں سے دیکھا تھا زلزلے، آتش زنیاں، لوٹ مار کے ہنگامے، سیلابوں کا بیان، فرقہ بندیوں کی بدولت ہونے والی انسانی ہلاکتوں کا اظہار وہ کیوں کر کرتے وہ تو صرف ان طوفانوں کی تصویر کشی میں طاق تھے جو انہوں نے بند کمروں میں رہ کر دیکھے تھے۔ قدیم عرب شاعری میں شاعر بننے کے لئے زندگی کے تجربات کو بطور واردات قبول کرنا لازمی تھا۔ اب محض خیال بندی کی ضرورت تھی ہر کوئی شاعر بن سکتا تھا۔ قدیم عرب شاعری کے موضوعات انتقام، مہمان نوازی، ہیرو پرستی اور جمال زن ومحبوب کا بیان وغیرہ تھے اور عہد اسلامی میں ان میں توحید ورسالت کے موضوعات کا اضافہ ہوا۔ عباسی دور میں یونانی، ایرانی اور دیگر علاقوں کے عرب میں منتقل ہونے والے علمی ذخائر کی وجہ سے شاعری کی معنوی اقلیم میں وسعت پیدا ہوئی۔ عباسی عہد میں متعدد شاعروں نے قدیم عرب شاعری کی تقلید سے نجات پائی۔ محبت کے موضوع پر بہت سے قصائد پرانی طرز کی تشبیب کے بغیر لکھے گئے۔ کئی شاعروں نے ہلکے پھلکے اوزان کے استعمال سے اپنی شاعری کو شگفتہ اور فطرت کے قریب کیا۔ اب شاعروں نے ان المناکیوں سے بھی پیچھا چھڑا لیا تھا جو قدیم جاہلی ماحول اور قصائد کا حصہ تھیں۔

بہت سے عباسی قصیدہ نگاروں نے باغوں، سبزوں، پھولوں، اڑتے حسین پرندوں پر اظہار خیال کیا۔ سنہری ندیاں، حوض، ان میں جھلملاتے چاند اور سورج، شاہی محلوں کی خوبصورتیاں، شراب، ساقی، برف زار اور دیگر فطری اور ماحولی مظاہر ان کی شاعری کا حصہ بننے لگے۔ کشتیوں اور بحری بیڑوں کا تذکرہ ہوا۔ ریشمی عباؤں، نفیس جھلملاتی قباؤں کا ذکر ہوا شان وشوکت رکھنے والے شاہی نقوش قصائد میں نظر آنے لگے۔ ہارون الرشید نے ابوالعتاہیہ سے فرمائش کی کہ وہ اس کے دسترخوان پر موجود نعمتوں پر قصیدے میں اظہار خیال کرے۔ قدیم مبہم اور برہنہ اظہار کی جگہ نسبتاً آزاد اظہار رائج ہوا۔ حکیمانہ اور ضرب المثل نوعیت کی شاعری سے نجات پا کر شاعروں نے فلسفیانہ شاعری کی طرف توجہ دی۔ ابن رشیق اور دیگر محققوں نے گواہی دی کہ فتوحات اور اسلام کے پھیلاؤ کی بدولت قدیم عرب شاعری کے رنگ ڈھنگ میں تغیر و تبدل لازمی تھا اس لئے عرب شاعری تبدیل ہو گئی۔ یہی وہ شعری منظر تھا جس کے زیر اثر فارسی شاعری کا آغاز ہوا۔ مذکورہ عرب قصائد نگار شعرا نے فارسی قصیدہ گو شعرا کی راہنمائی کی۔

فصل سوم : فارسی قصیدہ ایران اور ہندوستان میں

پس منظر

ایران اور ہندوستان میں فارسی قصائد پر اظہارِ خیال سے قبل اس تناظر کی شناخت ضروری ہے جس کے زیرِ اثر اس کے منفرد اور یکتا نقوش نے جنم لیا۔ بیشتر فارسی قصائد اپنی نزاکتوں اور فنی باریکیوں میں لاثانی ہیں۔ ہر چیز اور موضوع کو اس کی کلی اور جزوی تفصیلات سمیت پہچاننا ایرانی مفکروں، شاعروں، مصوروں اور معماروں کا شیوہ رہا ہے۔ ایرانی شاعری کے پس منظر کا جائزہ ہمیں ۶۲۵ ق م سائرس کے عہد کی یاد دلاتا ہے کہ یہ روایت اس عہد میں تخلیق ہونے والے مذہبی گیتوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان گیتوں نے ایرانی شعور کو عرصۂ دراز تک متاثر کیا۔ جب عربیوں کا عجمیوں سے ملاپ ہوا اور آریاؤں کا ساميوں سے تو ایرانی شاعری میں نئے کیفیاتی و موضوعاتی اثرات کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ اسلامی اور ایرانی تہذیب کے ملاپ سے ان اثرات کی شکلیں اور زیادہ تبدیل ہوئیں۔ یوں ایرانی ثقافت نے قدیم ایرانی اور جدید سامی عرب اور اسلامی عناصر سے متحد ہو کر اپنے ارتقا کے ایک نئے باب کا سنگ بنیاد رکھا۔

عرب اور عجم کا ربط و تصادم قدیم ایران کے آریاؤں اور آل عاد ہی کے زمانے سے ہے۔ اس دور سے لے کر آغازِ اسلام تک دونوں تہذیبوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ آغازِ اسلام کے بعد یہ اثرات زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ شعوبیوں اور ایرانی نژاد وزراء نے عباسی عہد میں ایرانی عقائد، افکار و عادات وغیرہ کو عرب سماج اور شاہی درباروں میں متعارف کروایا۔ بہت سے فارسی الفاظ عربی میں داخل ہوئے۔ ایرانی رسوم و رواج اور جشن [نوروز، سدہ، مہرگاں] عربوں میں مقبول ہوئے۔ ایرانی مصنفین کی سوانح، تاریخ، حکایات، علوم اور اخلاق و آداب پر مشتمل کتابوں نے عرب مصنفین کو اظہار کے نئے راستے دکھائے۔ اسی طرح ایران پر عربی اثرات کا انکار ممکن نہیں۔ اس عہد میں عربی نے ایران میں ایسی مقبولیت حاصل کی کہ بہت سے ایرانی شاعروں نے عربی میں شاعری کی۔ وہاں عربی میں دینی کتب لکھی گئیں۔ دو سو سال تک یہ زبان ایران کی واحد مقبول زبان رہی۔ اور کسی نے قدیم فارسی اور پہلوی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ پہلوی زبان کا ذخیرہ الفاظ کم تھا۔ عربی زبان کی لفظیاتی وسعتوں نے بھی ایرانیوں کو اپنی جانب مائل کیا۔ عرب میں قیام پذیر ایرانی نژاد مصنفوں نے عربی زبان میں علم و ادب کی بلند پایہ کتب تحریر کیں۔ ابنِ مقفع، امام ابو حنیفہ، سیبویہ نحوی، بشار بن برد، ابو نواس، موسیٰ بن شاکر خوارزمی اور بہت سے دوسرے عالموں، دانشوروں اور شاعروں کو اس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایرانی سیاست، معاشرت اور مذہبیات پر عربی اثرات کی موجودگی اظہر من الشمس ہے۔ فارسی زبان کی ابتدائی شاعری میں ان اثرات کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ ایران میں پہلوی اور دیگر السنہ میں طلوعِ اسلام سے قبل کے زمانے میں شاعری کا سراغ ملتا ہے۔ راوی کے ادارے کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ شاعری عہدِ جدید کے قارئین تک نہیں پہنچی۔ مسلمانوں کی آمد کے دو سو سال (ہجری) بعد ایران میں ابتدائی فارسی شاعری کا سراغ ملتا ہے۔

عجمی عرب جھگڑے اور تعصب کی داستان زمانی اعتبار سے طویل ہے اور مزاج اعتبار سے متخالف۔ ہر دو علاقوں کے لوگ اپنی اپنی زبانوں کو خالص دیکھنا چاہتے تھے۔ عربوں میں یہ تعصب عجمیوں کے مقابلے میں کم تھا۔ لیکن ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان کے اوائلی عہد میں ایرانی عربی زبان کے الفاظ کو اپنی زبان کا حصہ نہیں بنانا چاہتے تھے

اور وہ شعرا اور اُدبا جنہوں نے اس آمیزش کو روا جانا انہیں قابل تحسین نہیں سمجھا۔ عربی زبان نے ایران میں اپنا سفر بہت آہستہ طے کیا۔ سمرقند اور بخارا کے علاقوں میں عربی زبان ہی کیا اسلام کو بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی مزاحمت کے نتیجے میں بعض حکمرانوں نے جمعہ کی نماز، خطبات اور قرآنی تفسیر و ترجمہ کے ضمن میں فارسی زبان کو رواج بخشا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے عہد سے لے کر خلیفہ عبدالملک کے پیش رو خلفا تک شعبۂ مالیات کے رجسٹر پہلوی زبان میں رکھے جاتے تھے۔ اس زبان پر خلیفہ عبدالملک کے عربی کو بین الاقوامی حیثیت دینے کے فیصلے سے ضرب کاری لگی۔ عربوں کے حکومتی استحکام کے ساتھ ساتھ حالات تبدیل ہوتے گئے اور آخر آخر ایرانیوں کو عربی زبان میں دلچسپی لینی پڑی۔ عربی زبان کے ایران میں پھیلاؤ کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ایرانی شعرا جو شاہی اور درباری قربت کے وسیلے سے اپنے روزگار کا بندوبست کرنے کے خواہاں تھے عربی زبان میں قصیدے لکھنے لگے۔ اپنے شعری اور تخیلی مزاج کی بنا پر ایرانی شعرا نے عربی میں ایسی نازک شاعری لکھی کہ ان کے عربی اساتذہ اور اہلِ زبان عرب محوِ حیرت ہوئے۔ ایرانی شعرا عربی مجلس اور مسرت اور خوشی کے مواقع پر ہونے والے جشنوں میں جوق در جوق شریک ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کی شعری تخلیقات میں بلند پایہ عربی لسانی مہارت نظر آنے لگی۔ انہوں نے عربی زبان کو اپنے تخیلی اور نزاکت آشنا طرزِ بیان سے نیا موڑ دینے کی سعی کی۔ اس زبان میں نئے نئے خیالات شامل ہوئے۔ ایسے خیالات جو قدیم خیمہ نشیں یا صحراگرد عرب شاعروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ اس دور کے ایرانی نژاد عربی قصیدہ نگاروں نے اپنا مواد اور انسپیریشن (INSPIRATION) تو اس عربی شاعری سے حاصل کیے جس میں صحرائی نغموں کی بازگشت تھی تاہم اس میں شہر اور اس کے ہنگاموں اور ایرانی تہذیب و آرائش کے عناصر کو بھی شامل کر دیا۔

یہ ضرور ہے کہ فارسی قصیدہ گو شعرا کے پیشِ نظر عباسی عہد کا عربی قصیدہ تھا اور انہوں نے اس کے ماڈل اور ڈیزائن کو اس کے اجزا سمیت قبول کیا تاہم خود ایرانی شاعروں نے اس صنف کو اس درجۂ کمال تک پہنچا دیا کہ پھر اردو سمیت کسی اور زبان میں بھی اس پر فوقیت حاصل نہیں کی جا سکی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے لیے ایک بار پھر ہمیں قدیم ایرانی ماحول اور معاشرت کی جانب رجوع کرنا پڑے گا۔ اور اجمالی طور پر یہ دیکھنا ہوگا کہ ایرانیوں کے ہاں فنِ تعمیر، مصوری، سنگ تراشی، شاعری اور مذہب و فلسفہ کی کیا کیا صورتیں اور تصورات تھے؟

قدیم عربوں کے پاس زیادہ تر خیمے تھے۔ مکانات نہیں تھے۔ وہ بدویانہ زندگی گزارتے تھے۔ ایرانی شہری زندگی کے رسیا تھے اور اجتماعی معاشرت کے قائل۔ عرب قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ ایران میں عظیم الشان مطلق العنان حکومتیں قائم تھیں۔ عرب سادگی پسند تھے۔ ایرانی بادشاہ اور امرا شان و شوکت کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ لق و دق صحراؤں میں زندگی بسر کرنے کی بجائے محلات میں رہتے تھے۔ طنطنہ، کر و فر اور ہیبت و جلال ان کی زندگی کا حصہ تھا۔ علم میں بھی عربوں کے پاس سوائے حکمتوں کے ذخائر کے اور کچھ نہ تھا۔ ایرانیوں کے پاس اپنا رسم الخط (میخی خط، اوستائی خط) تھا۔ ان رسم الخطوں میں لکھے ہوئے کتبے آج بھی موجود ہیں۔ زرتشت کی مذہبی کتابیں اوستائی زبان میں تھیں۔ ان میں مناظرِ قدرت کا بیان بھی ہے۔ خدا کی تعریف میں منظّم (؟) نثر سے معمور مقفّیٰ اور منظوم جملے بھی۔ ایرانی درباروں میں وقائع نگاری بھی ہوتی تھی۔ وہاں مدرسے بھی موجود تھے۔ درباروں میں مرد اور عورتیں نغمے اور گیت گاتی تھیں۔ زرتشت کی مذہبی کتب کی شرحیں بعد میں پہلوی زبان میں بھی ملتی ہیں۔ بہت سی ایرانی کتابیں مسلم حملوں کے ساتھ ہی ضائع ہو گئیں جو بچ رہیں ان میں دینکرت، بندہشن، اوستا کے پانچ اجزا پر مشتمل کتب باقی ہیں۔ کارنامک اردشیر بابکان،

مذکورہ بالا تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق و تاریخ ایران جلد اول از مقبول بیگ بدخشانی

خسرو گواتان، یادگار زرداں (جسے شاہنامہ گشتاسپ بھی کہا جاتا ہے) بھی محفوظ ہیں۔ قدیم ایرانی فلسفہ، طب، اخلاقیات، گرامر اور ادبیات نظم و نثر کا وسیع ذخیرہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ کتب کا تذکرہ ان عربی کتب میں موجود ہے جو یونانی، رومی اور دیگر زبانوں سے اموی اور عباسی ادوار میں ترجمہ ہوئیں۔ زرتشتی کتب کے علاوہ مانی کی ایک کتاب "شاہ برقان" پہلوی زبان میں تھی۔ مانی کی کچھ دیگر تصنیفات شامی زبان میں تھیں۔ بہار نے سبک شناسی حصہ اول میں پہلوی زبان کی ۲۷ زرتشتی کتب، ۸۲ اخلاقی و دینی اور ادبی کتب اور ۱۹ غیر دینی کتب کا حوالہ دیا ہے۔ نوشیرواں کے زمانے میں بہت سی پہلوی کتب یونانی اور سنسکرت زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئیں۔ ان کا آج سراغ نہیں ملتا۔ ہخامنشی عہد سے آل ساسان تک ایرانی تہذیب نے ترقی کی بڑی منزلیں طے کیں۔

ہخامنشی عہد کے فن تعمیر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہخامنشی بادشاہوں نے مختلف رنگوں کے پتھروں سے عظیم الشان محلات تعمیر کروائے۔ یہ محلات جاہ و جلال کے مجسمے تھے اور عام زمین سے بہت بلند ہوتے تھے۔ دروازوں، سیڑھیوں اور دہلیزوں پر ابھری ہوئی تصویریں ان کی آرائش میں اضافہ کرتی تھیں۔ ان کے محلات ستونوں پر ایستادہ تھے۔ خشیارشاہ کا محل سو ستونوں پر تعمیر ہوا تھا۔ اس عہد میں پہاڑوں کو کاٹ کر جو مقبرے بنائے جاتے تھے وہ بھی آرائشی ہوتے تھے۔ انسانوں اور جانوروں کی تصویروں سے یہ محل اور مقبرے مزین ہوتے۔ اس عہد کے ایرانی بلند کاشی کاری کو پسند کرتے تھے۔ مختلف دروازوں اور دہلیزوں پر پیتل، تانبے اور سونے چاندی کے منقش پترے چڑھائے جاتے تھے۔ پازارگد کے آثار، کوروش اعظم کا مقبرہ، تخت طاؤس، تخت جمشید، قصر اپادانا، قصر تاچارا، ایوان صد ستون، قصر هدیش اور نقش رستم وغیرہ میں پتھروں کو موم کر دیا گیا تھا۔ خاکستری، زرد، قرمزی، سیاہ اور اسی نوع کے دوسرے پتھروں نے ان عمارات کی شان کو بہت بڑھا دیا تھا۔

ساسانیوں نے بھی بہت سے شاہی محلات تعمیر کروائے۔ ان کی امتیازی خصوصیات یہ بتائی جاتی ہیں کہ ان کے عین وسط میں ایک ایوان ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ مربع شکل کے کمرے تھے۔ جن کے اوپر گنبد نما چھتیں تھیں۔ کمرے ایک دوسرے میں کھلتے تھے۔ دیواروں پر پچی کاری کے ذریعے تصویریں بنائی گئی تھیں۔ ان تصویروں میں شکار کے مناظر، حیوانات اور سبزہ زار دکھائے گئے تھے۔[1] قصر فیروز آباد، سروستان، ایوان کسریٰ اور قصر شیریں ان کی یادگار عمارتیں ہیں۔

سونے چاندی اور کانسی کے برتنوں پر باریک نقش و نگار بنانا قدیم ایرانی ذہن کو مرغوب تھا۔ قدیم ایران میں مانی کی کتاب ارژنگ مانی مصوری کے عظیم شہکاروں میں شامل تھی۔ ایرانی منی ایچر مصوری پر مانی کے گہرے نقوش مرتسم ہیں۔ قدیم ایرانی مجسمہ سازی میں بھی انسان اور اشیا کی جزئیاتی تفاصیل مہیا کرنے کا شوق رکھتے تھے۔

قدیم ایرانی قوم آریا کا مذہب مغوں کا مذہب تھا۔ مغ آہورامزدا (یزداں) کی پرستش کرتے تھے۔ زرتشت نے مغوں کے قدیم مذہب میں شامل ہونے والی توہمات، جادو اور سحر کے خلاف اپنی مذہبی تحریک کو سرگرم عمل کیا۔ ہخامنشی ایرانی خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے وہ بھی آہورامزدا ہی کو خالق کائنات قرار دیتے تھے۔ آہورامزدا کا تصور چونکہ مجرد تھا۔ انہوں نے اس کے مظہر کے طور پر آتش کی پرستش شروع کر دی یوں آتشکدے وجود میں آئے۔ پانچویں صدی قبل مسیح ایران میں آفتاب کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ پانی، ہوا اور روشنی کو بھی مقدس سمجھا جاتا تھا۔ آتش پرستوں کا روحانی پیشوا مغ کہلاتا تھا۔ یزدگرد کو ماننے والے

۱: تاریخ ایران جلد اول ص ۵۸۰۔

اشکانی چاند، سورج اور ستاروں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے بھی زرتشتی مذہب قبول کر لیا۔ زرتشتیوں کے نزدیک آتشکدوں میں جلنے والی آگ حقیقت مطلق کی مظہر تھی۔

دارایوش بزرگ کی سرزمین اپنے تہذیبی اور تمدنی آثار کے اعتبار سے قدیم یونانی اور رومی تہذیبوں کے ہم پلہ تھی۔ ایرانی بادشاہوں کی شان و شوکت، سطوت و عظمت اور تقدیس و حرمت کا اندازہ ظاہری طور پر ان کے پرشکوہ ایوانوں اور آرائش و زیبائش کے حامل درباروں سے تو ہوتا ہی ہے۔ داخلی طور پر بھی ان کی رعایا اور مذہبی شخصیات انہیں الوہیت کا درجہ عطا کرتی تھیں۔ قدیم ایرانی بادشاہ کے لئے "باغ" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ باغ کے معنی خدا کا کسی جسم میں حلول کے ہیں۔ یوں ان کے نزدیک بادشاہ محیر العقول طاقتوں کا مالک متصور تھا۔ درباری دربار میں داخل ہوتے وقت سفید اور صاف رومال منہ پر رکھ لیتے تھے۔ کیونکہ سانس کی آمد و رفت سے دربار کی "مقدس" چیزوں اور دیگر "پاک" عناصر کے ناپاک ہونے کا خطرہ تھا۔ بادشاہ کے تقدس اور جلال کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ دربار میں حاضر ہونے والا ہر شخص تعظیماً زمین پر گر جائے اور اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھے جب تک بادشاہ کا اشارہ نہ ہو۔ ساسانی بادشاہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ "پرستار مزداہ" کہا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے القاب ان کی خدائی ہی کو ظاہر کرتے تھے۔ ان کے سکوں پر ان کے ناموں کے ساتھ بغی کا لفظ لکھا جاتا جس کا مفہوم تھا 'مثلِ خدا'۔ ان کے لئے 'واجب الاحترام' 'خدائے لاثانی' "فیض رساں" "زبردست" اور "امان دہندہ" وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔ ایرانی دربارداری کے یہ آداب برامکہ اور دیگر ایرانیوں کی وساطت سے عرب درباروں میں پہنچے۔ عباسی خلفاء بھی ان کے رنگ میں رنگے جانے لگے مگر عربی مزاج میں جو جرأت اور بے باکی کے رجحانات تھے ان کے لئے ابھی مکمل طور پر ایرانی تقلید ممکن نہ تھی۔ وہ تو خدائی اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔ اتنا ضرور تھا کہ ان کی سفاکی اور قتل و غارتگری کا جواز ان کے ضمیر میں ان کا مافوق الانسانی ہونا ہی تھا۔ قدیم ایرانی سلطنتوں میں بادشاہوں کی مطلق العنانی عروج پر تھی۔ ان کے بنائے ہوئے قوانین اٹل ہوا کرتے تھے ایرانی عوام میں یہ خیال عمومی طور پر رائج تھا کہ ہخامنشیوں کو خدا نے 'فر ایزدی' یا 'فر کیانی' سونپی ہے۔ اسی کی بدولت وہ سرزمینِ ایران کے حکمران بنے۔ یہ 'فر کیانی' ہخامنشی بادشاہوں کی اولاد کو نسل در نسل ملی۔ ساسانی بھی اپنے آپ کو ہخامنشی نسل سے ظاہر کرتے تھے اسی لئے انہوں نے اپنے آپ کو 'فر ایزدی' کا وارث جانا۔ ان کے پاس عظمت و جلال کی زندگی گزارنے کا یہ بھی ایک جواز تھا۔ ایرانی بادشاہ لباسِ فاخرہ پہنتا تھا۔ یہ لباس جواہرات سے آراستہ و پیراستہ ہوتا تھا۔ وہ طلائی تخت پر بڑی شان سے بیٹھتا تھا۔ اس کے سر پر مروارید اور ہیرے جواہرات سے مزین چمکتا ہوا تاج ہوتا تھا۔ اس شان و شوکت کو دیکھ کر اہلِ دربار اور رعایا پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ ہخامنشی بادشاہوں نے آلِ ماد اور ساسانی بادشاہوں نے ہخامنشی بادشاہوں کی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ تاریخ ایران میں مرقوم ہے "تخت جمشید کی ابھری ہوئی شبیہوں سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کانوں میں بالیاں پہنتے تھے گلے میں طلائی ہار اور زنجیریں بھی ہوتی تھیں" ① ان کا تاج بلند ہوتا تھا۔ پیٹیاں سونے کی۔ شاہی عصا کے سر پر سونے کا سیب بنا ہوا ہوتا تھا۔ بادشاہ کے پیچھے کوئی خدمتگار ہوتا تھا اور ساتھ ہی مگس رانی کے منصب پر فائز آدمی۔ ایران میں جب اسلام پھیلا تو ابتدا میں وہاں کے مسلم حکمرانوں اور امراء نے اسلامی تقلید میں سادگی کا شعار اپنایا۔ لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی یہ غیر اسلامی شعار اختیار کر لیے۔ غزنویوں، غوریوں اور مغلوں کا جاہ و جلال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسے ہی ماحول میں مقبرے نے ترقی کی۔

---

① تاریخ ایران جلد اول ص ۸۲

عربی قصائد کے فارسی قصائد پر اثرات

قصیدہ عربی شاعری کی قدیم صنف ہے۔ آمدِ اسلام کے بعد بھی اس کا تکنیکی ماڈل قائم رہا۔ فارسی قصیدہ گو شعرا نے اس صنف کو بعض مفاہیمی اور موضوعاتی تبدیلیوں کے ساتھ قبول کیا۔ انہوں نے تشابیب میں استعمال ہونے والے روایتی انداز کو بدلا۔ مدحیہ حصوں میں قدیم ایرانی درباروں اور شاہوں سے وابستہ خیالات و تصورات کو پیش کیا۔ ایرانی ذہن کی نازک خیالیوں اور آرائش پسندیوں کو اس صنف کا حصہ بنایا۔ فارسی قصیدہ نگاروں نے تشابیب میں کھنڈرات، محبوب کے ہجر اور صحرائی کیمپ وغیرہ کے تصورات و خیالات کی بجائے منظری مناظر (باغ و راغ) کی تصویر کشیوں اور کائناتی خوب صورتیوں کے بیان کو اہم جانا۔ ان میں علمی و اخلاقی موضوعات کو جگہ ملنے لگی۔ تشبیب شاعروں کے تبحر علمی کے اظہار کا ذریعہ بنی۔ اس میں شعری اور سماجی علوم کی اصطلاحیں مستعمل ہوئیں۔ حقیقت کو حقیقت نگارانہ انداز میں پیش کرنے کی بجائے شاعر کے ذہن میں پیدا ہونے والے خود ساختہ تخیلات کے روپ میں پیش کیا گیا۔ مدحیہ حصوں میں ممکنہ حد تک مبالغہ آرائی کا سہارا لیا گیا۔ خود عربی شاعروں نے بھی قصیدے کے ماڈل میں کچھ رد و بدل کیا تھا۔ متنبی کے خطابیہ قصائد اس کی واضح مثال ہیں۔ بعض ان میں اس نے تشبیب کے جزو کو خیرباد کہہ دیا اور براہ راست مدح کا وتیرہ اپنایا۔ کئی عربی شعرا نے تشابیب میں شہری مناظروں اور احوال کو بھی قلمبند کیا۔ فارسی میں منوچہری اور معزی وغیرہ نے اپنے قصائد میں قصیدے کے قدیم عربی ماڈل ہی کی پیروی کی۔ ان کے قصائد میں جذباتی حالتوں کا طویل ہونا، اپنے ساتھیوں کو خیمے کے باقی ماندہ آثار کے پاس رک کر نوحہ و زاری کرنے کی اپیل، صحرا کے آتشیں رستوں پر ہونے والے سفر کا بیان، گھوڑے اور اونٹ کی تھکن کا اظہار، اور تاروں بھرے آسمان وغیرہ کی تصویر کشی، ان شاعروں کے قصائد میں عربی قصیدے ہی کی تقلید میں ظاہر ہوا ہے۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں فصاحت اور صراحت کو عربی شاعری کی ملکیت قرار دیا ہے[1]۔ ایرانی شعرا نے بھی اس میدان میں عربوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ فارسی قصیدے پر ابتدا ہی میں دوہرے اثرات مرتب ہوئے عربی بھی اور عجمی بھی۔

فارسی شاعری کا آغاز اس دور میں ہوا جب صنفِ قصیدہ مسلم بادشاہوں اور حکمرانوں کے درباروں میں اپنا رسوخ مستحکم کر چکی تھی۔ عربی قصیدہ میں بھی زمانی اقتضا کے پیش نظر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ قصیدہ فیشن بن گیا تھا۔ اس کا قدیمی معیار برقرار نہ رہ سکا تھا۔ اب اس کا کردار حقیقی وارداتوں اور تجربوں کے اظہار تک محدود نہیں رہا تھا۔ اس میں بادشاہوں اور امرا کی مبالغہ آمیز مدحیں کی جانے لگی تھیں۔ وہ فارسی شعرا جو شاعری کو روزگار کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے، قربِ سلطانی کے خواہاں تھے انہوں نے عربی شاعری کے رائج الوقت ماڈل ہی کے حوالے سے شاعری کی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی قصیدہ اپنے ابتدائی دور ہی میں پیشہ ورانہ حوالہ اختیار کر گیا اور یوں اس میں قدیم عربی قصیدے کے بہت سے احسن پہلو شامل نہ ہو سکے۔ عرب اپنے زمینی مزاج کے اعتبار سے حکمرانوں اور خلفاء کی مدح میں ایک خاص حد تک تجاوز نہیں کرتے تھے۔ فارسی قصیدہ نگاروں نے قدیم ایرانی عادات و رسومات کے زیر اثر بادشاہوں کو انصاف مطلق کی علامت بنا کر پیش کیا۔ انہیں زمین پر خدا کا سایہ جانا۔ شان و شوکت رکھنے والے قدیم ایرانی بادشاہوں اور ان کے سماجی نظاموں کی بدولت عوام میں غلامی اور اطاعت کے جذبات راسخ تھے۔ قصیدہ میں ان کا کھل کر

---

[1] تذکرۃ الشعرا از دولت شاہ ص ۳۹

اظہار ہوا۔ علاوہ ازیں فارسی شعرا نے عربی قصیدہ نگاروں کی ہو بہو تقلید کو اپنا شیوہ بنانے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ بسا اوقات تقلیدی موضوعات کی وجہ سے ان کے مشاہدہ شدہ مناظر اور تجربہ شدہ معاملے ماورائے اظہار ہی رہتے تھے اور قصائد میں چھوٹی چھوٹی بڈیوں کو مزید چچوڑا جاتا تھا۔ فارسی شعرا نے اپنے اشعار میں عربی شعرا کا نام لے کر ان کی تعریف کی ہے اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عربی قصیدے کا ماڈل فارسی شعرا کے لئے اہم تھا۔ چند اشعار دیکھیے

- شاعری دانی کدامی قوم کردند آن کہ بود + ابتدا شان امرؤ القیس انتہا شان بوفراس (۱) [انوری
- دید ایزد مراد در نظم شرف + دل بشار طبع ابن مقبل (۲) [منوچہری.
- ہست معزی بدولت تو عجم را + ہمچو عرب را جریر و اخطل و اعشی (۳) [معزی.
- اگر امرؤ القیس فخر عرب باشد + سزد گر بتو فخر باشد عجم را (۴) [عبدالواسع.

فارسی کے مندرجہ ذیل مطالع کے حامل قصائد پر عربی قصیدے کے ماڈل کے واضح اثرات ہیں

- سلام علی دار ام الکواعب + بتان سیہ چشم عنبر ذوائب (۵) [منوچہری
- ای ساربان منزل مکن جز بر دیار یار من + تا یکزمان زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن [تاریخ ادبیات در ایران از ذبیح اللہ صفا جلد دوم ص ۱۵ طہران ۱۳۳۹ ہجری شمسی
- یک امشب ز بہر من ای ساربان + ز دروازہ بیرون مبر کاروان (۶) [امیر معزی
- چند باشم در دیار و منزل رعد و رباب + روز و شب نالندہ و گریندہ چون رعد و سحاب (۷) [عبدالواسع

منوچہری کے مذکورہ قصیدے پر امرؤ القیس کے غیر معمولی اثرات ہیں۔ اس کے ایک اور قصیدے میں عربی معلقات کے غیر معروف قافیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اس قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ ہو

- زخواب گشتہ ہوا گشتہ بیدار ہر کس + نخواہم شدن من زخوابش معیقا [منوچہری (۸)

ان فارسی شعرا کے علاوہ بھی اور بھی بہت سے شعرا نے اس ماڈل کو اپنایا ہے۔ ان قصائد کی تشبیب میں شاعر لمبے سفر کے بعد کاروان کو جا لیتا ہے اور سالار قافلہ سے کہتا ہے کہ اونٹ روکو تاکہ میں اپنے محبوب کا نظارہ کر سکوں۔ امرؤ القیس کے قصیدے میں سوال و جواب کا جو انداز موجود ہے فارسی قصیدہ نگار شعرا میں سے کچھ نے اسے بھی اپنایا ہے۔ عمر بن ابی ربیعہ نے اپنے قصائد میں مناظرے کا جو انداز استعمال کیا ہے فارسی شاعروں میں وہ بھی بہت مقبول ہوا۔ جاحظ کے قصائد میں بہار و خزاں کی منظر کشی میں بھی فارسی قصائد میں استفادہ کیا گیا ہے۔ یہی نہیں اکثر فارسی شعرا نے اوزان و قوافی میں بھی عربی ماڈل ہی کی پیروی کی۔

یہ درست ہے کہ فارسی قصائد کا خاصا حصہ عربی قصائد کے ماڈل پر تیار ہوا ہے تاہم یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ فارسی قصیدہ گو شعرا نے اس صنف کو شاعرانہ اور فنی کمالات کے اعتبار سے بام عروج تک پہنچا دیا۔ خراسانی اور ہندی اسالیب اظہار نے "فرد" اور "اشتراک" حالتوں میں اس کو اظہار و بیان کی بلندیاں عطا کیں۔ اخلاق، فلسفہ، حرکت زندگی، مناظر فطرت اور علوم و فنون کی تفاصیل سے فارسی قصیدے کا دامن بھرا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی زبان میں اس صنف کو وہ سب نزاکتیں میسر آئیں جو ایرانی مزاج کا حصہ ہیں۔ ہندوستان میں لکھے جانے والے فارسی قصیدے میں ہندی ذہن کی باریکیوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ یوں فارسی قصیدے میں

---

(۱) قصائد انوری ص ۲۴۴، نول کشور لکھنو ۱۲۹۶ھ (۲) دیوان منوچہری مرتبہ بیبرسٹین کازیمرسکی پیرس ۱۸۸۶ء
(۳) دیوان معزی مرتبہ عباس اقبال تہران ۱۳۱۸ ہجری شمسی قصائد و مسمطات منوچہری مطبوعہ مشہد ۱۲۸۵ رجب
(۴) دیوان عبدالواسع جبلی مرتبہ ذبیح اللہ صفا ص ۲۳ تہران ۱۳۳۹ ہجری شمسی (۵) دیوان منوچہری پیرس ایڈیشن
(۶) دیوان معزی ص ۶۶۴ (۷) دیوان عبدالواسع ص ۳۵ (۸) دیوان منوچہری پیرس ایڈیشن

ایک سطح پر ایسی باریکیوں سے آشنائی ہوتی جنہیں دیکھنے کے لئے مائیکروسکوپ کی ضرورت پڑے اور دوسری سطح پر ایسے مناظر دیکھنے کو ملے جن سے برہنہ آنکھ گریزاں نہ ہو سکے ۔ موضوعاتی اعتبار سے یہ صنف ہمہ گیر رہی ہے ۔ فارسی قصیدہ نگاروں نے معانی کے آتشکدے بھی تعمیر کیے اور خیالات و افکار کے نگارخانے بھی۔ فارسی قصائد کے الفاظ کہیں اپنی شان و شوکت میں عظیم الشان عمارتوں میں جڑے قیمتی ہیروں کی مثل ہیں اور کہیں تراکیب اور بندشیں اپنے حسن اور معنویاتی پھیلاؤ کی بدولت شیش محلوں میں جڑے آئینے! آئینہ در آئینہ معانی کی شکلیں پھیلتی بڑھتی اور گہری ہوتی چلی جاتی ہیں ۔ تشبیب کی توضیحی صورتیں، گریز کی نزاکتیں، مدح کی ہمہ جہتی، حسنِ طلب کا تنوع اور دعا کی تاثیر سب کچھ مل کر فارسی قصائد کو ان کا علحدہ تشخص عطا کرتا ہے ۔ اردو قصیدہ نگاروں نے فارسی قصائد کے ماڈل کو سامنے رکھا اور اس صنف میں شاعرانہ جذبات و خیالات کے وسیع ذخائر کو اکٹھا کیا بہرحال یہ تو طے ہے کہ فارسی قصیدہ عربی قصیدے کے زیر اثر نمو پذیر ہوا ۔ ہمیں بہت سے ایسے فارسی قصائد کی مثالیں دستیاب ہو جاتی ہیں جو عربی اوزان اور قوافی میں لکھے گئے ہیں (۱)

ایرانی قصیدہ فی الحقیقت اپنی شان و شوکت، باکمال تخیل، بیان کی نزاکت، مواد کی جزوی تفصیلات اور اظہار کی آرائش کے اعتبار سے عربی قصیدے پر فوقیت رکھتا ہے ۔ یہ فرق اسلوب زندگی کے ساتھ ساتھ علاقائی ساخت کے حوالے سے بھی ہے سامی ذہن استغراقیت کا حامل ہے اور آریائی ذہن استخراجیت کا ۔ شاعری کے لئے استقرائی یا منطقی یا سائنسی سوچ سے زیادہ استخراجی یا جذباتی یا تخیلاتی اپروچ کی ضرورت ہے ۔ ایران اس تناظر میں شاعری کے اثاثوں سے مالامال ہے ۔ ایرانی دماغ سانچہ سازی اور صورت آفرینی میں باکمال ہے ۔ ایرانی قالین ہی کو لے لیجئے اپنی باریک بنت، شاہانہ شکوہ، رنگوں کے موثر امتزاج، تصویری سانچوں اور مجموعی توازن کے اعتبار سے دنیا بھر کے قالینوں پر فائق ہے ۔ یہی حال ایرانی مصوری کا ہے ۔ یہ شوخ آرائشی رنگوں کی حامل ہے ۔ جانوروں کی شکلیں، جیومیٹری کے سانچے، پھل پھول، باغات، جام و مینا، محبوب جبین دوشیزائیں، سیر و شکار کے مناظر ایرانی پینٹنگز میں معمول تھے ۔ ابتدائی زمانے سے لے کر مسلم عہد کی مصوری تک ایران میں آرائشی اسالیب اور نزاکتوں سے پر منتخبہ کا مسلسل اور مستقل ارتقا نظر آتا ہے ۔ علاوہ ازیں عمارتوں میں استعمال ہونے والی نقش و نگار کی حامل ٹائلیں جس نوع کے بیل بوٹوں سے مزین ہوتی تھیں وہ بھی ایرانی مزاج ہی کا ایک اور مظہر ہیں ۔ ایرانی ٹائلوں اور قالینوں پر مسلم ادوار میں ہونے والی فنی ترتیبوں کے اثرات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔ تیموری عہد میں چینی مصوری میں موجود آرائشی تکنیکوں کے اثرات نے ایرانی مصوری کو اور زیادہ چمکایا ۔ اس نوع کی ایرانی فنی تصویریں تاریخ اور شاعری کی کتابوں میں نظر آتی ہیں ۔ ایرانی مصوری کے نمونے غسل خانوں کے در و دیوار پر بھی نظر آتے ہیں کپڑوں اور ظروف پر بھی ۔ ایرانی مصور سبزیوں اور پھولوں سے رنگ لیا کرتے تھے اور حیاتی لکیروں، جزئیاتی نقاشیوں اور جدت طراز شعور کی مدد سے تخیل کی نہ ختم ہونے والی زنجیروں کو کاغذ یا در و دیوار پر بکھیر دیتے تھے ۔ فارسی قصیدہ بھی ایسے ہی اذہان کی پیداوار تھا ۔ ایرانی تصویری یا تعمیری رجحانات بازنطینی اثرات کے تابع ہیں یا یونانی یا مصری کے ۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں ۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ قدیم ایرانی ذہن علم، ادب اور فن سے صرف شغف ہی نہیں رکھتا تھا ان میں باریکیاں، آرائشیں اور نزاکتیں بھی پیدا کرتا تھا ۔ اس نوع کے ذہن نے جب عربی اور فارسی قصائد لکھے تو اسے شرف سبقت حاصل ہوا ۔ فارسی شاعری کو علی اصغر حکمت نے نازک، باریک دماغ، تیز فہم اور فنی ذوق کی پیداوار قرار دیا ہے ۔ ساسانیوں کے عہد کے 'Hymns' سے لے کر عرب و عجم کے ملاپ کے بعد کے زمانے تک یہی آسمانی آگ جلتی رہی ہے (۲)

---

(۱) دیکھئے The influence of Arabic Poetry on the Developement of Persian Poetry P69 By DR Mohd Umer Daud Pota.

(۲) Glimpses of Persian Poetry P3. By Dr. Ali Asghar Hikmat

فارسی قصیدہ [اوائلی دور]

بنو عباس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دور افتادہ صوبوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ۸۲۱ء میں خراسان کے گورنر طاہریہ خاندان کے بانی ایرانی نژاد طاہر ذوالیمینین نے خود مختاری حاصل کی۔ اسی صدی میں یعقوب بن لیث صفاری نے طاہریہ خاندان سے حکومت ۸۶۸ء چھین لی اور دولت صفاری کا اعلان کیا۔ بعد ازاں صفاریوں کی جگہ سامانیوں نے (جن کے پاس سمرقند، بخارا اور فرغانہ کے علاقے پہلے ہی سے موجود تھے) خراسان کو بھی اپنے دائرہ اختیار میں لے لیا۔ سامانی بادشاہوں میں اسمٰعیل نصر بن سامانی علم و فضل کی سرپرستی میں ممتاز تھا۔

خراسان میں طاہریہ خاندان کی حکومت خالص ایرانی تھی۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے فارسی زبان و ادب کو عربی پر فوقیت دی۔ فارسی شاعری کے آغاز کے متعلق متباین آراء ہیں۔ محمد عوفی نے عباس مروزی کے ۸۰۹ء میں مامون رشید کی شان میں لکھے ہوئے ایک قصیدہ کا ذکر کیا ہے۔[1] براؤن نے اس سے اختلاف کیا ہے اور بہرام گور کو فارسی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔[2] شمس قیس رازی[3]، احمد بن یحییٰ البروی[4] اور دولت شاہ[5] نے بھی بہرام گور کو فارسی کا باوا آدم ٹھہرایا ہے۔ تاریخ سیستان کی روایت ہے کہ تیسری صدی ہجری میں محمد بن وصیف نے عربی شاعری چھوڑ کر فارسی اشعار کہے۔[6] حافظ محمود شیرانی نے بالتحقیق دورِ امویہ کے عرب شاعر ابن مفرغ کو فارسی کا پہلا شاعر کہا ہے۔[7] عباس مروزی کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مامون کے ۸۰۹ء میں مرو آنے پر اس نے ایک قصیدہ پیش کیا اس کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

اے رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرقدین + گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین
مر خلافت را تو شایستہ چو مردم دیدہ را + دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین
کس برین منوال پیش از من چنین شعری نگفت + مر زبانِ فارسی را ہست تا این نوع بین
لیک زاں گفتم من این مدحت ترا تا این لغت + گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین[8]

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ عباس مروزی اس زبان پر عبور رکھتا تھا۔ اس امر کا سراغ بھی لگتا ہے کہ اس سے قبل فارسی شاعر موجود تھے۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق[9] اور حافظ محمود شیرانی[10] نے ان اشعار کو عباس مروزی سے منسوب ٹھہرایا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ اتنی صاف زبان اس زمانہ میں لکھنا مشکل تھا۔

تواریخ ادب میں صفاری دور کے چند شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے ان میں حنظلہ بادغیسی م ۸۳۲ء کا نام اہم ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے حنظلہ بادغیسی کو فارسی کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا ہے۔[11] حالانکہ اس حوالے سے مستند محققوں نے رودکی کو سند دی ہے لیکن اس کا دیوان نایاب ہے۔ صفاری ایرانی زبان و ادب سے طاہریوں کی بہ نسبت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اس خاندان کے بانی یعقوب بن لیث صفاری کے دربار میں اگرچہ عربی قصائد (اس کی مدح میں) پڑھے جاتے تاہم وہ اس کی فہم سے بالاتر تھے۔ اس نے صرف اپنی شعراء کی حوصلہ افزائی کی جن کی زبان فارسی تھی۔ محمد بن وصیف نے فارسی میں اس کی شان میں قصائد لکھے۔ ایک قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

ای امیری کہ امیران جہان خاص و عام + بندہ و چاکر و مولای و سگ بند و غلام

فیروز مشرقی اور ابو سلیک گرگانی بھی اسی دور کے شعراء ہیں تاہم ان کا پورا کلام دستیاب نہیں ہے۔ ایرانی ادب کی تاریخ میں فیروز

---

(1) لباب الالباب ص ۲۱ (2) A Literary History of Persia P. 42 Brown London 1902. (3) المعجم ..... شمس قیس رازی ص ۱۶۸
(4) کتاب الدر النضید من مجموعۃ المفید الحفید چاپ تہران ۱۳۴۲ھ ص ۲۹۸ بحوالہ احوال و اشعار رودکی ص ۱۱۵۱ جلد دوم از سعید نفیسی، تہران ۱۳۱۹ ہجری شمسی
(5) تذکرۃ الشعراء مرتبہ براؤن ص ۳۸ مطبع برل لندن ۱۹۰۱ (6) تاریخ سیستان مرتبہ بہار ص ۲۰۹ تہران ۱۳۱۴ ہجری شمسی
(7) مقالات محمود شیرانی جلد پنجم ص ۴۹۶ (8) لباب الالباب ص ۲۱ (9) تاریخ ادبیات ایران ص ۵۰ ترجمہ مبارز الدین رفعت
(10) مقالات شیرانی جلد پنجم ص ۷ (11) چہار مقالہ مرتبہ محمد قزوینی ص ۲۶ چاپ سوم تہران ۱۳۳۲ ہجری شمسی

کا ایک قطعہ درج ہے جو اس نے صفاری ممدوح کی تیر کی تعریف میں لکھا تھا۔ طاہری اور صفاری دور میں قصائد کی تعداد بہت کم ہے۔ البتہ دستیاب مواد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان صاف اور شگفتہ ہے۔ خیالات میں الجھاؤ نہیں۔ خطابیہ انداز زیادہ اختیار کیا گیا ہے مدحیہ حصوں میں حکمرانوں کا علم و فضل اور مذہب وغیرہ پر اظہار خیال ہے۔ محاسن شعری اور صنائع بدائع کے حوالے سے اس عہد کے شاعر اعلیٰ معیار کے متلاشی

سامانی دور

سامانی خاندان ۸۷۵ء تا ۹۹۹ء حکمران رہا۔ سامانی خاندان کے جد امجد سامان کے چار بیٹے نوح، احمد، یحییٰ اور الیاس خلیفہ مامون رشید کی جانب سے بالترتیب سمرقند، فرغانہ، چاچ اور ہرات کے حکمران تھے۔ فرغانہ کے حکمران احمد نے نوح کی وفات پر سمرقند اور کاشغر کے انتظامی اختیارات بھی سنبھال لیے۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں نصر سامانی اور اسماعیل سامانی نے اپنی سلطنت کو خراسان، ماوراءالنہر سے کرمان اور رے تک پھیلا دیا۔ ان کے بعد احمد بن اسماعیل، نصر بن احمد، نوح بن نصر، عبدالملک اور منصور وغیرہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ عبدالملک دوم نے ایلک خان کے ہاتھوں شکست کھائی اور یوں سامانی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ سامانیوں ہی کے دور میں طبرستان میں زید خاندان، علوی خاندان، زیاری خاندان، ماوراءالنہر میں اہل محتاج اور چغانیوں اور عراق اور فارس پر آل بویہ کی حکومت تھی۔ اسماعیل سامانی علم و فضل کا پرستار تھا۔ اس کے دربار میں علوم و فنون کے ماہرین کا جمگھٹا رہتا۔ اسی طرح زیاری خاندان کا حکمران قابوس بن وشمگیر ۹۷۶/۹۷۸ تا ۱۰۱۲/۱۰۱۳ء شاعر بھی تھا اور علم دوست بھی۔ اس کے پوتے امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن سکندر بن قابوس نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کی راہنمائی کے لئے ۱۰۸۲ء میں قابوس نامہ جیسی عظیم کتاب لکھی۔ اس کے پیش کردہ نظریات ایک عرصے تک حکمرانوں کے کام آتے رہے۔ ابو ریحان البیرونی اور بوعلی سینا وغیرہ کا بھی اسی خاندان سے تعلق رہا ہے۔ آل بویہ کے حکمران شمس الدولہ، عزالدولہ اور بہاؤالدولہ خود بھی عالم تھے اور علما کی قدردانی میں بھی بہت معروف تھے۔ آل بویہ کا وزیر صاحب بن عباد شعرا اور علما کا مربی اور سرپرست تھا۔ اس دربار میں عربی اور فارسی دونوں زبانیں مقبول تھیں۔

سامانی دور ایران میں علم و فضل کی سربلندی اور فارسی زبان کے مقبول ہونے کا دور ہے۔ بخارا، سمرقند اور دیگر اہم شہروں میں اس دور میں شعرا، ادبا اور علوم و فنون کے ماہرین جمع ہوئے۔ اس دور میں جیہانی، ابوالفضل بلعمی اور ابوعلی بلعمی جیسے وزرا نے بھی علم و ادب کی ترقی کے لئے راہیں ہموار کیں۔ انہوں نے علمی مباحثوں اور مذاکروں پر مشتمل کئی مجالس کا اہتمام کیا۔ اس دور میں بخارا میں ایک کتب خانہ بھی تھا جس کا تذکرہ ابن سینا نے کیا ہے۔① یہ زمانہ ایران کی ادبی، علمی اور ملی رسوم کے احیا کا بھی ہے۔ سامانی حکمران مذہب کے معاملے میں سخت گیر نہیں تھے۔ ان کے متعصب نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نصر بن احمد کا وزیر ابوعبداللہ جیہانی مانوی مذہب کا پیروکار تھا۔② سامانی دور میں زرتشتی، یہودی اور مسیحی مذاہب پر بھی کوئی قدغن نہیں تھی۔ طبرستان، خراسان، ماوراءالنہر، سیستان، فارس اور خوزستان میں ہزاروں زرتشتی موجود تھے۔ وہ نوروز اور مہرگان وغیرہ پر جشن مناتے تھے۔ اسی طرح شیعہ، شافعی، حنفی اور حنبلی بھی اپنے اپنے اطوار کے مطابق زندگی کے معاملات میں حصے لے رہے تھے۔ اس دور میں نثر میں کشف المحجوب جیسی اعلیٰ پائے کی کتاب بھی تخلیق ہوئی۔ علاوہ ازیں تاریخ و تفسیر طبری کے ترجمے بھی ہوئے۔ جغرافیہ اور طب پر بھی اکا دکا کتابیں مل جاتی ہیں۔ اسی دور میں اخوان الصفا نے بھی اپنا کام شروع کیا۔ سامانی دور کی آزاد خیال روایات اور علمی و فنی نشو و نما کے اثرات معاصر قصائد پر مرتب ہوئے

① تاریخ ادبیات ایران از حسین فریور ص ۸۷ مطبوعات امیر کبیر

سامانی دور کے مشہور فارسی شعرا شہید بلخی، رودکی سمرقندی، دقیقی طوسی، عمارہ مروزی، ابوشکور بلخی اور ابوالحسن کسائی مروزی وغیرہ نے بلند پایہ قصائد لکھے۔

شہید شہید بلخی م ۹۳۷/۹۳۸ء نے نصر بن احمد سامانی کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں۔(۱) رودکی نے اسے پسند کیا اور فرخی نے اس کے اشعار کی تازگی اور دلآویزی کو سراہا ہے۔ فلسفہ اخلاق اور الم پرستی کو حافظ محمود شیرانی نے اس کی شاعری کا جوہر قرار دیا ہے۔(۲)

رودکی رودکی سمرقندی م ۹۴۰ یا ۹۴۱ء) فارسی زبان کا عہد ساز شاعر تھا۔ عنصری، مسعود سعد سلمان اور خاقانی وغیرہ نے اپنے اشعار میں رودکی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ اسے فارسی قصیدے کا رجحان ساز شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔ فارسی قصیدے کی حقیقی شکل رودکی کے قلم سے ابھری ہے۔ اس کے بلند پایہ اور محکم قصائد کی تعریف عالموں اور ادب دوستوں نے بھی کی ہے۔ سبک خراسانی یا سبک ترکستانی اسی سے منسوب ہے۔ اس سبک میں سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ طویل قصائد لکھنا، پرشکوہ الفاظ استعمال کرنا، قدرتی اور فہم انسانی سے قریب تر تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال، تسلسل مضامین اور مناظر فطرت و قدرت کی عکاسی اس سبک کی خاص عطا تھی۔ رودکی کی شاعری میں عبرت سرائے دہر کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور پند و حکمت کے مضامین بھی۔ رودکی نے اپنے قصیدے میں آپ بیتی بھی رقم کی ہے۔ وہ بربط بجانے میں کمال رکھتا تھا اور اپنے ممدوحین (امیر ابوجعفر احمد صفاری، اسماعیل بن احمد سامانی، ابوالفضل بلعمی اور امیر نصر بن احمد سامانی) میں سے بعض کے درباروں میں اشعار اور قصائد گا کر سنایا کرتا تھا۔ رودکی کے قصائد میں مطلع کے ساتھ ہی تشبیب کا آغاز ہو جاتا تھا۔ پھر گریز اور پھر مدح، پھر دعا اور حسن طلب کے مرحلے طے ہوتے۔ اس نے قصیدے کی ہیئتی روایت کو استحکام بخشا۔ لذتیہ پر مبنی موضوعات، خمریات و شراب، تغزل، خوبصورت تشبیہات و استعارات اس کے قصائد میں رنگینی پیدا کرتے تھے۔ رودکی کا دیوان چھپ چکا ہے تاہم محققین کا کہنا ہے کہ اس میں شامل بیشتر اشعار قطران تبریزی کے ہیں۔(۳) رودکی کے قصائد کے چند مطالع درج ذیل ہیں۔

اے آنکہ غمگنی و سزاواری + و اندر نہاں سرشک ہمی باری [در مدح یکے از مشاہیر]

مادر می را بکرد باید قربان + بچہ او را گرفت و کرد بزندان [در مدح امیر ابوجعفر احمد صفاری]

مرا بسود و فرو ریخت ہر چہ دندان بود + نبود دندان لا بل چراغ تابان بود [قصیدہ برائے آپ بیتی]

بوئے جوئے مولیان آید ہمے + یاد یار مہربان آید ہمی [در مدح نصر بن احمد سامانی]

دقیقی دقیقی طوسی م ۹۷۸/۹۷۹ء امرائے چغانیاں کا مادح بھی تھا اور امیر منصور بن سامان کا بھی۔ منصور ہی کے ایما پر اس نے شاہنامہ کا آغاز کیا تھا۔ بعض محققوں نے اسے مجوسی یا آتش پرست بھی کہا ہے کیونکہ وہ اپنے اشعار میں زرتشت کا نام بڑی عقیدت سے لیتا تھا۔ وہ قصیدہ نگاری میں رودکی کا مقلد تھا۔ جزو مدح میں وہ بادشاہوں کی تعریف ہی نہیں کرتا تھا ان صفات کا بیان بھی کرتا تھا جو بادشاہوں کے لئے ضروری ہیں یعنی سخاوت، شجاعت اور دانش وغیرہ۔ بعض قصائد میں اس نے بہار کے موسم کی رنگینی اور وصف محبوب وغیرہ کا عمدہ اظہار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خرد باید آنجا و جود و شجاعت + فلک کی دہد مملکت رایگانی

بہ دو چیز گیرند مر مملکت را + یکے پرنیانی یکے زعفرانی

یکے زر نام ملک بر نوشتہ + دگر آہن آب دادہ یمانی (۵)

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران و تاریخ شعرا حسین فریور ص ۸۷ مطبوعات امیر کبیر تہران (۲) تنقید شعر العجم ص ۱۱۵ (۳) ایضاً ص ۱۶ تا ۵۲ (۴) لباب الالباب

(۵) اس کے قصائد کے اشعار کے لئے دیکھئے مجمع الفصحا، تاریخ بیہقی، ترجمان البلاغت، حدائق السحر، المعجم اور لغت فرس اسدی

لباب الالباب ص ۳۶

● کسائی

ابوالحسن کسائی مروزی پ ۹۵۳/۹۵۲ ۔ پہلا فارسی شاعر ہے جس نے دینی قصائد اور حکیمانہ اشعار لکھے ہیں[1] ۔ حضرت علی کی منقبت میں عمدہ قصیدے کہے ناصر خسرو نے اس کے بارے میں کہا تھا ۔ من چاکر غلام کسائی کراو بگفت + جان و خرد رونده بر این چرخ اخضرند

کسائی کے قصائد میں منظری مناظر کی بھی عمدہ عکاسی ملتی ہے اس کا ایک قصیدہ آپ بیتی پر بھی مشتمل ہے اسکا مطلع ہے

بہ سی صد و چہل و یک رسید نوبت سال + چہار شنبہ و سہ روز باقی از شوال[2]

● عمارہ مروزی نے ابوابراہیم (نوح بن نوح کا بیٹا) اور سلطان محمود کی مدح میں قصائد لکھے ۔

سامانی دور کے شعرا نے صنفِ قصیدہ کی مزاج شناسی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ۔ رودکی نے اس کی تکنیکی اور موضوعاتی بنیادوں کو اجاگر کیا ۔ سامانی شعرا کے قصائد ایرانی ماحول اور ثقافت کے اشارے اور جھلکیاں سمیٹے ہوئے ہیں ۔ پند و نصائح ، مدح ، منظر نگاری اور وصف نگاری کے حوالے سے ان شعرا کے قصائد کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اس دور میں خراسان کے قدیم شعرا کا اظہاری ذخیرہ سبکِ خراسانی کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔

غزنوی

غزنوی اور سلجوقی ادوار ہندوستان ، ایران اور دیگر علاقوں میں مسلم فتوحات اور سرحدی پھیلاؤ کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں ۔ غزنوی خاندان کی سرفرازی کا آغاز نوح بن سامانی کی جانب سے الپتگین کو خراسان کی امارت ملنے سے ہوا ۔ اس نے غزنی میں بھی اپنی حکومت قائم کی ۔ اس کی وفات کے بعد اس کے غلام اور داماد سبکتگین نے سامانیوں سے علاحدگی اختیار کر کے آزاد غزنوی حکومت کی داغ بیل ڈالی اس نے راجہ جے پال (ہندوستان) سے جنگیں ۹۹۰/۹۹۱ لڑ کر اپنی سلطنت کو پشاور تک پھیلا دیا ۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں غزنوی خاندان کو انتہائی عروج حاصل ہوا ۔ محمود غزنوی نے ایلخانیوں اور صفاریوں کو بھی شکستیں دیں یوں بخارا اور سمرقند کا علاقہ بھی غزنوی سلطنت میں شامل ہوا ۔ محمود نے ہندوستان پر بھی متعدد حملے کیے اور فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوا مگر اس نے وہاں مستقل حکومت قائم نہیں کی ۔ محمود کے جانشین سلطان مسعود ، ابراہیم ، بہرام شاہ نااہل ثابت ہوئے ۔ ہندوستان میں غوری اور ایران میں سلجوقی خاندان نے ان کی حکمرانی کا استیصال کیا ۔ غزنوی خاندان ۹۶۲ء تا ۱۱۸۶ء حکمران رہا ۔

سلجوق سلطنت کے بانی وقاق کا بیٹا سلجوق غز ترکوں کا سردار تھا اس کے دو پوتوں چغرل اور طغرل نے خراسان میں ۱۰۳۹ء غزنویوں کو شکست دی ۔ چغرل نے مرو اور طغرل نے نیشاپور کی حکمرانی حاصل کی ۔ طغرل نے رے کو بھی فتح کیا ۔ سلاجقہ بزرگ جن طغرل اول ، عضد الدولہ الپ ارسلان ، جلال الدولہ ملک شاہ اول ، ناصر الدین محمود اول ، رکن الدین برکیارق ، معز الدین ملک شاہ ثانی ، غیاث الدین محمد اول اور سلطان سنجر شامل ہیں ایران پر ۱۰۳۷ء تا ۱۱۵۷ء قابض رہے ۔ سلاجقہ عراق کی حکومت عراق اور مشرق ایران پر ۱۱۱۸ء تا ۱۱۹۴ء قائم رہی ۔ یہاں مغیث الدین محمود ثانی ، غیاث الدین داؤد ، رکن الدین طغرل ثانی ، غیاث الدین مسعود ، معین الدین ملک شاہ ثالث ، معز الدین ارسلان اور رکن الدین طغرل بیگ ثالث حکمران رہے ۔ سلاجقہ کرمان ۱۰۴۱ء تا ۱۱۸۶ء ۱۳ حکمران تخت نشین ہوئے ۔ سلاجقہ بزرگ کا خاتمہ سلطان سنجر کے لاولد فوت ہونے پر ہوا ۔ عراق میں خوارزم شاہ تکش نے سلاجقہ عراق کا خاتمہ کیا ۔ سلاجقہ کرمان کی حکومت کو ایران کے لوٹ مار کرنے والے قبیلے غز نے ۱۱۸۶ء میں ختم کیا ۔ ۱۰۲۸ء تا

---

(1) تاریخ ادبیات ایران ص ۵۹ از رضا زادہ شفق
(2) لباب الالباب ۔ جلد دوم ص ۲۳۸
(3) ایضاً ص ۲۴۲

۱۱۱۷ء سلاجقۂ شام نے حکومت کی اور سلاجقۂ ارض روم کی حکومت ۱۰۷۷ء تا ۱۳۰۰ء قائم رہی۔ رومی سلاجقہ نے ایشیائے کوچک میں فارسی زبان کو فروغ بخشا
غزنوی دور میں سلطان محمود غزنوی نے فارسی علم و ادب کی بڑی خدمت کی۔ وہ علما، فضلا اور شعرا کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے غزنی میں ایک
مدرسہ بھی قائم کیا اور عجائب خانہ بھی۔ وہ سنی الحنفیہ مسلمان تھا۔ اس نے اسماعیلی فرقے کے خاتمے کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ محمود کے جانشینوں نے
بھی علما اور شعرا کی قدردانی کی۔ دانشنامۂ علائی [ابن سینا] نجوم پر [البیرونی] کی تصنیف کا ترجمہ اور تاریخ بیہقی [ابوالفضل بیہقی]
اسی دور کی یادگار ہیں۔ شاعری میں سبک خراسانی کی روایات زیادہ مستحکم ہوئیں۔ عربی الفاظ کی جگہ فارسی الفاظ کو زیادہ اہمیت دی
جانے لگی۔ شاعری میں امثال اور کلمات کی تکرار نے رواج پایا۔ اوزان اشعار پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ صنائع لفظی کی قیود سے آزادی
حاصل تھی۔ غزنوی فتوحات کی بدولت ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے مستحکم قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ ایک نئے تمدن کی داغ بیل پڑی۔
اس تمدن سے سندھ اور ملتان کے عوام عرب حکومتوں کی وساطت سے آگاہ تھے۔ مگر اب یہ تمدن اپنے ہمراہ عجمی اثرات بھی لے کر آیا تھا۔
بنو عباس اور بنو امیہ کے فرستادہ حاکموں نے سندھ اور ملتان میں اسلامی شرع کا نفاذ کیا۔ نئی مسلمان بستیاں (منصورہ) بسائیں۔ عربی
زبان کا علم بلند کیا۔ علما و مشائخ کی حوصلہ افزائی کی۔ یوں مقامی زبانوں یعنی سندھی اور ہندی میں عربی الفاظ کی شمولیت کا عمل بڑے
پیمانے پر جاری ہوا۔ بعد میں صفاری خاندان نے ان علاقوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس خاندان نے بغداد میں پھیلنے والے معتزلی خیالات سے
دامن بچائے رکھا۔ دسویں صدی عیسوی میں ملتان اور منصورہ قرامطیوں کے قبضے میں آ گئے۔ مسلمانوں کا پیر پرستی اور اعتقادی تنزل
سے سابقہ پڑا۔ یہاں عرب اقتدار اور افکار غیر مستحکم ہوئے۔ محمود غزنوی کے حملوں کی وجہ سے لاہور بھی ایک بڑا علمی مرکز بن گیا۔ فارسی
زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ اشعری اور غزالی کے فکری اثرات پھیلنے شروع ہوئے۔ تصوف کی درس و تدریس کے سلسلے دکھائی دینے
لگے۔ فارسی اور مقامی زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان کے ابتدائی نقوش ابھرنے لگے۔

سلجوقی دور میں زیادہ تر قتل و غارتگری کا بازار گرم رہا۔ جس کے نتیجے میں یاسیت، بد اعتمادی اور خود غرضی کے رجحانات کا دور دورہ
ہوا۔ لوگ گوشہ نشیں ہونے لگے۔ فتنۂ حسن بن صباح بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ سلجوقی ایرانی آداب و رسوم کی جانب زیادہ توجہ نہ دے سکے
خارجی انتشار نے داخلی علوم کو فروغ بخشا۔ سیاست کے ساتھ تصوف کے حوالے سے بھی کتابیں رقم ہوئیں۔ شعرا کی قدردانی اس لیے کی گئی کہ
وہ اپنے قصائد میں سلجوقیوں کے ناموں اور کارناموں کو زندۂ جاوید کر دیں گے۔ یوں درباری مداحی کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ شاعری میں
مذہب، حکمت اور دیگر علوم کے اثرات نظر آنے لگے۔ پند و حکمت اور نصائح پر مبنی قصائد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ عربی زبان
و ادب کی جانب ازسرِنو توجہ کی جانے لگی۔ نظام الملک نے سیاست نامہ، محمد بن علی بن سلیمان راوندی نے راحۃ الصدور لکھی۔ یہ
حکایات کی کتاب ہے۔ اس میں آیات و احادیث سے نثر مزین ہے۔ بعض شعرا کے قصائد بھی اس میں نظر آتے ہیں۔ عربی سے سکندر نامہ کا ترجمہ
ہوا۔ ناصر خسرو نے سفرنامہ اور زاد المسافرین جیسی کتب تصنیف کیں۔ شاہ مردان بن ابی الخیر نے روضۃ المنجمین لکھی۔ عمر خیام کا نوروز نامہ
اور غزالی کی کیمیائے سعادت بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ حدائق السحر فی دقائق الشعر (صنائع شاعری) چہار مقالہ [تنقید شاعری و
دیگر علوم] ذخیرۂ خوارزمشاہی [طب] مقامات حمیدی، تاریخ بخارا اور کلیلہ و دمنہ وغیرہ کی تخلیق بھی اسی ادوار میں ہوئی۔ مقامات
حمیدی نثر مصنوع کا بہترین نمونہ ہے۔ صنعت مقابلہ، ایہام، تجنیس، سجع اور تشبیہات و استعارات نے اس کتاب کو منفرد مقام بخشا۔ اس کی
تقلید میں نثر اور شاعری میں بہت کچھ لکھا گیا۔ یہ کتاب قاضی حمید الدین ابوبکر بلخی کی ہے۔ آئندہ چند صفحات میں ہم اس دور کے اہم مقیدہ نگاروں
کا جائزہ پیش کریں گے

• اسدی ابونصر احمد بن منصور اسدی طوسی کو فارسی قصائد میں فن مناظرہ کا موجد قرار دیا گیا ہے۔ وہ لب اوقات تشبیب میں دو چیزوں کا موازنہ کرواتا اور پھر کسی ایک کی جانب جھکتا۔ عرب و عجم، روز و شب اور زمین و آسمان کے مابین مناظرے اس کے قصائد کا حصہ ہیں
مناظرہ شب و روز کا مطلع ~ بشنو از حجت گفتار شب و روز بہم + سرگذشتی کہ زدل دور کند شدت غم (1)

فردوسی م ۱۰۲۰ء نے قصیدے کی صنف کو تو براہ راست کچھ عطا نہیں کیا۔ تاہم اس کے شاہنامے میں استعمال ہونے والی تلمیحیں، نام اور ایران کی قومی نسلی اور ثقافتی مواد دیگر شعرا کے قصائد پر اثر انداز ہوا۔ اسکا یہ رزم نامہ عظیم عالمی ادب کا حصہ بن چکا ہے۔

• فرخی فرخی سیستانی م ۱۰۳۷/۱۰۳۸ء۔ قصیدہ گوئی میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اس نے دربار چغانیاں سے بھی اس نے گرانبہا صلے پائے۔ ابوالمظفر امیر چغانیاں کی مدح میں اسکا قصیدہ "کاروان حلہ" بہت مشہور رہے۔ بعد ازاں فرخی محمود غزنوی کے درباری شعرا میں شامل ہو گیا۔ اس کے قصائد میں لذت پرستی اور عیش و نشاط کے ماحول کی عمدہ عکاسی ہوتی ہے۔ سادہ اور فطری انداز میں لطیف و نازک موضوعات پر اظہار خیال اس کا وتیرہ تھا۔ موزوں و مناسب الفاظ کے انتخاب اور بزم و رزم کے مناظر کے بیان میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ تشبیب میں مناظر فطرت کا ہوبہو نقشہ کھینچنے کے لئے وہ فطری اور حقیقی تشبیہیں استعمال کرتا تھا۔ کہیں کہیں خیالی تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں سے بھی کام لیتا تھا

~ برآمد نیلگوں ابرے زروئے نیلگوں دریا + چو رائے عاشقاں گرداں چو طبع بے دلاں شیدا (2)

قصائد میں ممدوح کی نیک صفات کا بیان اس کی عمومی عادت تھی۔ اس کے قصائد میں تاریخی واقعات کا ذخیرہ جمع ہے۔ وہ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر بعض حملوں کے دوران اس کا ندیم رہا۔ سلطان کی فتوحات کے حوالوں سے لکھے گئے اس کے قصائد میں تاریخی واقعات، نام اور مقام زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔ فرخی کے قصائد اپنے معاصر ماحول کے رسوم و آئین کے عکاس بھی ہیں۔ سلطان کی مجالس کے نقشے، نوروز اور مہرگان کے جشنوں کی تصویریں اس کی تشبیبوں میں خصوصی طور پر منعکس ہوئی ہیں۔ محمود غزنوی کو اس نے اکثر قصائد میں خسرو غازی اور قاہر کفار قرار دیا ہے۔ سومنات کی فتح پر اس کے قصیدے کا مطلع ہے

~ فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر + سخن نو آر کہ نو را حلاوتیست دگر (3)

اس کے ایک قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

~ شبے گذاشتہ ام دوش خوش بروئے نگار + خوشا شبا کہ مرا دوش بود با رخ یار
نہ شام آنکہ زاول بگفت شاید جست + نہ نیم آنکہ با آخر تباہ گردد کار
ہمی بجست من اندر چو شنبلوئی کلاہ + ہمی بہ پیش من اندر چو تازہ روئے بہار
چو شب دو بہر گذشت از دو گونہ شدیم + یکی زیادہ و دیگر زعشق بادہ گسار

حافظ محمود شیرانی نے فرخی کے ۲۱ ممدوحین کی فہرست تنقید شعر العجم میں پیش کی ہے۔ محمود غزنوی کے فرزندوں ابو احمد محمد اور سلطان مسعود کا بھی وہ مداح تھا (4)۔ محمود کا بھائی امیر یوسف اور دیگر وزراء اور ندما بھی اس کے ممدوح تھے (5)

---

(1) تاریخ ادبیات در ایران جلد دوم ص ۴۱۴ (2) دیوان فرخی سیستانی مرتبہ محمد دبیر سیاقی ص ا و ص ۶۶
(3) ایضاً (4) ایضاً" ص ۱۴۱، ۵ (5) ایضاً

● عنصری

عنصری (م ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء) نے اول اول سلطان محمود کے بھائی نصر بن ناصر الدین (جو خراسان کا امیر لشکر تھا) کی مدح میں قصائد کہے۔ اس کی وساطت سے محمود کے دربار میں جگہ پائی۔ محمود غزنوی نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا اور اس کے سپرد یہ کام بھی کیا کہ وہ شاعروں کے دربار میں پیش ہونے والے قصیدوں کی جانچ پرکھ کرے۔ محمود غزنوی کے بعد سلطان مسعود نے بھی اس کے مرتبے کو برقرار رکھا۔ وہ جس مرتبے پر تھا اس کی وجہ سے بہت سے دوسرے شاعر اس کی مدح میں بھی قصیدے لکھ کر لاتے تھے۔ منوچہری نے خطاب بہ شمع کے نام سے اس کا قصیدہ کہا۔ عنصری سبک خراسانی کا مقلد تھا۔ مناظر قدرت کا عمدہ بیان، واقعہ نگاری، اخلاقی تعلیم، معنی آفرینی اور شکوہ لفظی اس کے قصائد کے خاص اوصاف ہیں۔ اس نے اپنے قصائد میں محمود غزنوی کی ادب پروری، علم دوستی اور شاعر نوازی کا بالتفصیل ذکر کیا ہے (۱)۔ محمود کی مہموں کے حقیقی نقشے، سوال جواب کے طریقے کی ایجاد، مبالغہ آرائی سے اجتناب، تعقید اور تکلف سے پرہیز اور صنائع بدائع کا عمدہ استعمال اس کے قصائد کے خاص اوصاف ہیں

چیست آن آبی چو آتش و آہنی چون پرنیان + بی روان تن پیکری پاکیزہ چون در تن روان (۲)

مذکورہ شعر میں صنعت تنسیق الصفات استعمال ہوئی ہے۔ ایک قصیدے میں اس نے اسدی طوسی کے تتبع میں زاغ و باز کا مناظرہ پیش کیا ہے

میان زاغ سیاہ و میان باز سپید + شنیدہ ام ز حکیمی حکایتی دلبر
بباز گفت ہمی زاغ ہر دو یاریم + کہ ہر دو مرغیم از جنس و اصل یکدیگر
جواب داد کہ مرغیم جز بجای ہنر + میان طبع من و تو میانہ البتہ مگر
خورند از آنکہ بماند ز من ملوک زمین + تو از پلیدی و مردار پر کنی ژاغر (۳)

ایک گریز کا شعر دیکھیے: روزی بر روزی بیفزاید چو قدر شہریار + بوستان چون بخت او ہر روز برناتر شود (۴)

● منوچہری

منوچہری دامغانی (م ۱۰۴۰/۱۰۴۱ء) متنبی کے ساتھ ساتھ طبیب اور صرفی و نحوی بھی تھا۔ عربی ادب پر اس کی خاص دسترس تھی وہ خود کہتا ہے کہ ع من بسی دیوان شعر تازیان دارم زبر / نجوم، ہیئت اور موسیقی کے علوم اس کی گھٹی میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قصائد میں دقیقات نے عروج پایا۔ فنی اصطلاحات اور ادبی و تاریخی تلمیحات کے استعمال نے اسے 'سبک خراسانی' سے نکال باہر کیا۔ مبالغہ، تجنیس، اور تصنع کے استعمال میں اسے بڑی مہارت تھی۔ حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ نئے عروضی اوزان کے استعمال پر اسے تقدم حاصل ہے (۵) کہ مغان از میں عرب میں رائج اور / یہ بحر ایرانیوں نے کم استعمال کی ہے۔ منوچہری کو قصیدے کے تشبیبی حصے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس نے اپنی تشابیب میں مناظر باغ و راغ، مئے و آثار سفر، بہار و خزاں وغیرہ کی عمدہ تصویریں مہیا کی ہیں۔ عربی قصائد کی تشابیب سے متاثر ہو کر وہ اطلال و دمن، دیار معشوق کی یاد، قافلہ اور محبوب کی جدائی، اونٹ کا سفر، بیابان کی حالت، خار مغیلاں کی صحبت اور سہیل و سماک (ستارے) کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ اس کے کلام میں عجیب و غریب نامانوس عربی قافیے بھی دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً کواعب، نجائب، نواجب وغیرہ۔ اپنے ایک قصیدے میں وہ امراء القیس کو بھی یاد کرتا ہے۔ یعنی اس کے معلقہ کا حوالہ دیا ہے

قوس قزح قوس وار عالم فردوس وار + گنبد دوری کوس وار گرد قفا نبک یاد (۶)

ایک اور جگہ منوچہری نے عمرو بن کلثوم کے معلقے کی طرف اشارہ کیا ہے ع تو ندانی خواند الا ہبی بصحنک فاصبحین
منوچہری کے کلام میں تشبیہات کی ندرت بھی قابل توجہ ہے۔ اس نے بعض عربی الفاظ و تراکیب کو فارسی کا مستقل حصہ بنا دیا۔

---

(۱) عنصری نے خوارزم شاہ کی فتح پر ۱۰۲ اشعار کا قصیدہ لکھا۔ اس میں جنگی جزئیات کا عمدہ اظہار ہے دیکھیے دیوان عنصری مرتبہ دکتر یحیی قریب ص ۱-۱۰، تہران ۱۳۴۱ ہجری شمسی
(۲) دیوان عنصری ص ۱۵۴ (۳) دیوان عنصری ص ۱۱۴ (۴) دیوان عنصری ص ۵۴ (۵) تنقید شعر العجم ص ۱۸۸ مقالات محمود شیرانی جلد پنجم
(۶) قصائد و مسمطات منوچہری ص ۷۰

وہ فطرت پرست تھا ایک قصیدے میں اس نے رات کی تاریکی، ستاروں کی محفل، طلوعِ آفتاب - اور بارش اور طوفان کی جاندار لفظی تصویر کشی کی ہے
اس تصویر کشی میں روانی و سادگی کا جوہر نمایاں ہے

شبی گیسو فرو ہشتہ بدامن + پلاسش معجر و قیرینش گرزن
ثریا چون منیژہ بر سر چاہ + دو چشم من برو چون چشم بیژن
سر از البرز بر زد قرص خورشید + چو خون آلود دزدی سر ز مکمن
برآمد بادی از اقصائی بابل + ہبوبش خارہ درد بارہ افکن

غزنوی دور کے دیگر قصیدہ نگاروں میں عنصری رازی م ۱۰۳۹ / ۱۰۴۰، عسجدی مروزی م ۱۰۴۰ / ۱۰۲۱، لبیبی خراسانی، زینتی علوی محمودی، مسعودی غزنوی، مطاردی اور منشوری غزنوی کے نام لئے جا سکتے ہیں - عسجدی مروزی نے فتح سومنات پر ایک عمدہ قصیدہ لکھا (۱)
مسعودی غزنوی نے ایک قصیدے کی بدولت اسے سلطان مسعود بن محمود نے جلاوطن کر دینے کا حکم دیا تھا - کیونکہ اس میں سلطان کو نصیحت کی گئی تھی یہ واقعہ ۱۰۳۷ء کے جشن مہرگان کا ہے - ابو عبداللہ روزبہ بن عبداللہ لاہوری (۱۰۳۰ / ۱۰۴۰ میں زندہ) بھی سلطان مسعود شہید کا مداح تھا - سلطان کی مدح میں اس کا یہ شعر ملاحظہ ہو

روی آن ترک نہ روی است و براو نہ براست + کو برینی ز رباب است و برآن گل ببر است

مسعود سعد سلمان م ۱۱۲۱ء کے قصائد میں فکر و خیال کی جدت ہے - خطابیہ قصائد لکھنے میں اسے مہارت تھی - شیر زاد کے درباری ماحول کی عکاسی پر اس کا ایک عمدہ قصیدہ موجود ہے (۳) - اس عہد کے امراء، ندماء اور ارباب طرب کا بھی اس میں تذکرہ ہے - ان کے قصیدے ان کی قید و بند کی صعوبتوں کے عکاس ہیں
غزنوی دور کے قصائد اپنے عہد میں ہونے والی علوم و فنون کی ترقی کے آثار سمیٹے ہوئے ہیں - اس دور میں عرب اور عجمی تضادات از سرِ نو ابھرے - زیادہ تر شاعروں نے قدیم ایرانی تہذیب و ثقافت کو اپنا مطمحِ نظر بنایا - نوروز اور مہرگان کے جشنوں کے حوالے سے قصائد لکھے گئے - ان میں علمی تلمیحیں اور اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہوئیں - تشبیب میں مناظرے اور موازنے کے انداز نے فروغ پایا - منوچہری کے قصائد میں عرب قصائد کی تقلید نظر آتی ہے - منظروں اور موسموں کی تصویر کشیوں کے ساتھ ساتھ شاعروں نے محمود غزنوی کے فتوحاتی اور جنگی کارناموں کی تفصیلات کو قصائد کا حصہ بنایا - صنائع بدائع اور دیگر محاسنِ شعری کی بدولت اس دور کا قصیدہ امتیازی حیثیت کا حامل ہے -

سلجوقی دور

ازرقی ہروی م ۱۰۷۲ سے قبل] طغانشاہ حاکم خراسان کا درباری شاعر تھا - قصائد میں وہ عنصری کا مقلد تھا طغانشاہ کی بنائی ہوئی عمارت اور باغ کی تعریف میں اس نے پر زور قصیدہ لکھا (۲) - وہ نامانوس تشبیہوں اور شعری تکلفات سے گریزاں تھا - مدح کے حصے میں مبالغہ اور اغراق سے کام لیتا تھا -
قطران تبریزی م ۱۰۷۲ / ۱۰۷۳ء نے آذربائیجان کے حکمرانوں کی مدح کی - ابو نصر مملان (امیر وہسودان) کی شان میں متعدد قصائد لکھے -
ترکیبوں کی کثرت اور اضافاتِ تشبیہی کا استعمال اس کے کلام کا خاص وصف تھا - اس کے قصائد میں اردبیل اور دامودر کی لڑائیوں کا ذکر ہے
وہ قصائد میں تصنع، مضمون بندی اور تکلف کا قائل تھا - عربیت، مبالغہ، تجنیس اور وہمی اور غیر محسوس تشبیہوں کے استعمال میں وہ منوچہری کا مقلد دکھائی دیتا ہے - البتہ جس قصیدے میں اس نے تبریز میں آنے والے خوفناک زلزلے کا ذکر کیا ہے اس میں حقیقت اور واقعیت کا رنگ جھلکتا ہے - اس کے بعض قصائد ذو قافیہ ہیں - صنعت ترجیع اسے مرغوب تھی -

---

(۱) اس قصیدے کا مطلع ہے ـــ تا شاہ خسروان سفر سومنات کرد + کردار خویش را علم معجزات کرد [تاریخ ادبیات ایران ص
(۲) قصیدے کا مطلع ہے فال ہمایوں و فرخندہ اختر + بہ بخت موفق و سعد موفر
(۳) سلطان محمود بن ابراہیم کا بیٹا

؎ وخفاش را بس بیکار اُ روبیل دلیل + شبرش را بس بیکار دار مور عیاں

چوں بطرف جوی بنشاید گل خود روی روی + جای با معشوق می خوردن بطرف جوی جوی [تذکرہ دولت شاہ ص ۱۶۸]

• ناصر خسرو

ناصر خسرو[1] م ۱۰۸۸ء کے قصائد کا عمومی رنگ دینی ہے۔ مفہوم حیات، حصول ایمان، تحقیر دنیا، دنیاوی آرائشوں زیبائشوں اور آلائشوں سے پرہیز، ریاضت و تقوی اور باطن جوئی کی تدبیر وغیرہ کے مسائل و معاملات اس کے قصائد کا حصہ ہیں۔ تشبیب کی رنگینیوں اور دنیاوی حکمرانوں کی مدحوں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے اس صنف میں اسماعیلی عقائد پیش کیے ہیں۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد لکھنا اسے مرغوب تھا ؎ ناصر و خرد کو رو کرنباشد + از کار فلک بے خبر نہ باشد

• معزی

امیر معزی م $\frac{1147}{1148}$ء سلجوق عہد کے آخر کا درباری شاعر تھا۔ اسے ملک الشعراء کا درجہ حاصل تھا۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق کا کہنا ہے کہ وہ بہت بڑا قصیدہ گو اور مدحیہ قصائد کا زبردست استاد تھا۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے خراسانی شاعروں کی پیروی کی[2]۔ عنصری، فرخی، منوچہری اور مسعود کے رنگوں کے امتزاج سے اس نے اپنا رنگ پیدا کیا۔ امیر معزی کے قصائد میں سلطان سنجر کے زمانے کے تاریخی اور معاشرتی حالات مرقوم ہیں۔ بعض قصائد میں عربی انداز کی تشابیب بھی موجود ہیں ؎ اے

؎ اے ساربان منزل مکن جز در دیار یار من + تا یک زمان زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن

• سنائی

حکیم سنائی م ۱۱۵۰ء حکیمانہ شاعری کے ضمن میں معروف ہیں۔ بہرام شاہ غزنوی اور شاہ سنجر کی شان میں ان کے قصائد ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ وہ منوچہری اور فرخی کے قصیدوں سے متاثر تھے۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں دو مشہور عرب قصیدہ نگار فرزدق اور جریر کا تذکرہ کیا ہے۔ فلسفے کے موضوعات کو قصائد میں کھپانا ان کا امتیازی وصف ہے۔ ان کے صوفیانہ اشعار بھی متاثر کن ہیں۔ سنائی نے امام موسیٰ رضا کی شان میں فارسی کا پہلا قصیدہ لکھا۔ دیگر آئمہ اور بزرگوں کی مدح میں ان کے عمدہ قصائد دستیاب ہیں۔ ان کے قصیدے کا مطلع دیکھیے ؎ دوش چوں صبح برکشید علم + شد جہاں از نسیم او خرم[3] [در منقبت امام زکی الخ]

• جبلی

عبدالواسع جبلی م $\frac{1151}{1152}$ء غزنوی اور سلجوقی درباروں سے وابستہ تھا۔ اس کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے شاعری کے کمال کو صنائع بدائع پر منحصر سمجھا[4]۔ اس نے اپنے قصائد میں صنعت تقابل، لف و نشر اور ایہام وغیرہ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے مدحیہ قصائد مال و منال کے لئے نہیں لکھے اس کا مقصود دوسرے عظیم لوگوں کے کارناموں کو منظر عام پر لانا ہے۔ وہ لکھتا ہے ؎ اگرچہ پیشہ مداح جز طمع نہ بود + ہنر و من طمع است از کبائر اعمال

نہ گر صدور نملق کنم ز بہر طمع + نگویم از جہت مال و دحت ارذال

کنم بگوشہ خالی کفایت از دنیا + کنم بہ توشہ خالی قناعت از اموال (۵)

• خاقانی

افضل الدین خاقانی م $\frac{1198}{1199}$ء طب، ہیئت اور الہیات میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ فارسی قصیدے کو پرشکوہ اور علمی بنانے میں اس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاقانی کے قصائد میں تلمیحات کا استعمال کچھ اس کثرت سے ہے کہ ان کو سمجھنے کے لئے تاریخ، روایات اور مروجہ علوم [الہیات، نجوم، طب، موسیقی وغیرہ] کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ خاقانی نے سبک عراقی کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے استعمال کردہ ضرب الامثال، اشارات، کنایات، تجنیس اور ایہام وغیرہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ بوجھل معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے کلام کی تازگی اور روانی

---

(۱) دیوان اشعار ناصر خسرو مرتبہ سید حاجی نصر اللہ تقوی ص ۱۱۱ تہران ۱۳۴۸ ہجری شمسی (۲) تاریخ ادبیات در ایران ص ۵۱۵
(۳) دیوان سنائی غزنوی قصیدہ نمبر ۲۳۰ گنج نجانہ ابن سینا تہران (۴) شعر و ادب فارسی از زین العابدین موتمن ص ۱۲۶ تہران ۱۳۳۲ ہجری شمسی
(۵) دیوان عبدالواسع جبلی جلد اول قصائد مرتبہ ذبیح اللہ صفا ص ۱۱۲ تہران ۱۳۳۹ ہجری شمسی

اس کی شاعری کو سبکِ عراقی کا حصہ بنا دیتی ہے۔ نئی تراکیب کے علاوہ خاقانی نے اپنے قصائد میں مقامی بولیوں کے الفاظ کو بھی جگہ دی۔ گرجی زبان کے الفاظ بھی اس کے ہاں ملتے ہیں۔ مُرزآن، مطران، بطریق، اسقف اور نسطور وغیرہ کے الفاظ سریانی کی اصطلاحیں ہیں نصرانی عقائد سے اس کی واقفیت نے اسے دوسرے تمام ایرانی شعرا سے ممیز کیا۔ اس کی مدحیہ شاعری میں بادشاہوں کے لئے پند و نصائح کا اہتمام ہے۔ خاقانی نے اپنے قصائد میں اپنے عہد کے ایران میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کا تذکرہ کیا ہے۔ عبدالمالک آروی نے لکھا ہے "خاقانی کے قصائد میں اسلامیات اور خرافیات کی جانب اس بے تکلفی سے اشارے کیے گئے ہیں جس بے تکلفی سے ملٹن یونانی اوہام و اساطیر اور لاطینی قصص و روایات کی طرف اشارے کرتا ہے"① خاقانی نے کئی بلند پایہ نعتیہ قصائد بھی لکھے ہیں② اس کے ایک نعتیہ قصیدہ کا مطلع ہے

؎ طفل ہنوز بستۂ گہوارۂ فنا + مرد آں زماں شوی کہ شوی از ہمہ جدا

خاقانی نے حج کے دوران میں مکہ معظمہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اسکا مطلع ہے

؎ تا خیالِ کعبہ نقشِ دیدۂ جاں دیدہ اند + دیدہ را از شوقِ کعبہ زمزم افشاں دیدہ اند

خاقانی نے صفا خراقی انداز کا قصیدہ بھی لکھا۔ طویل اور مفصل قصائد لکھنا اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کا مشہور قصیدہ وہی ہے جو اس نے ساسانی بادشاہوں کے پایۂ تخت مدائن کے کھنڈرات کے حوالے سے لکھا ہے۔ اسکا مطلع ہے

؎ ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں + ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں

خاقانی کا ایک طویل قصیدہ اصفہان کی مدح میں بھی ہے

؎ نکہت حور است یا صفائے صفاہاں + جبہت جوز است یا لقائے صفاہاں ③

• جمال الدین

جمال الدین اصفہانی م ۱۱۹۲ء۔ عراق کے مشہور قصیدہ نگاروں میں سے تھا۔ دنیا کے فانی اور ناپائیدار ہونے کے حوالے سے اس کے قصائد تاثیر سے معمور ہیں۔ آذربائیجان کے شاہوں، مازندران کے امرا اور اصفہان کے دو بڑے خاندان آلِ خجند اور آلِ صاعد اس کے ممدوح تھے۔ عراق ہونے کے باوجود وہ خراسانی سبک سے متعلق تھا۔ مبالغہ آمیز مضامین کو لطیف انداز عطا کرنا اس کا خصوصی شیوہ تھا۔ امیروں، قاضیوں، فقیہوں اور عالموں کی مدح میں اس کے قصائد یکسانیت کا شکار رہتے ہیں۔ ہر شخصیت کے مرتبے کے مطابق اس نے انداز مدح میں تبدیلی کی۔ گردشِ زمانہ، دوستوں کی بے رخی، ازواق مصائب کے موضوعات پر اس کے بعض قصائد بہت مشہور رہے۔ حکمت اور موعظت کے موضوعات بھی اسے مرغوب تھے④

؎ ایں ہمہ لاف مزن گرچہ ترا سیم و زر است + کہ زر و سیم بر اہلِ خرد مختصر است

تاجِ زر بر سرِ شمع است چراغ گرید + خود ہمہ گریش از آں است کہ آں تاجِ زر است

• انوری

انوری م ۱۱۸۷ء اپنے مرتبے کے لحاظ سے غیر معمولی قصیدہ نگار تھا۔ علم نجوم، منطق، فلسفہ، ہیئت، طبیعات، الٰہیات اور حکمت میں مہارت کی بدولت اسکا شمار اپنے زمانے کے ممتاز ترین عالموں میں تھا۔ اس نے قصائد میں الفاظ کی شان و شوکت، نادر تشبیہات اور صنائع بدائع کے استعمال سے الگ رہ کر بھی موضوع اور مضمون کے حوالے سے زور پیدا کیا ہے۔ اس کے قصائد عالمانہ شان کے حامل ہیں۔ اس نے لاتعداد نئی بندشوں کو رواج دیا۔ بعد میں ظہیر، عرفی اور قاآنی وغیرہ نے اس کے اثرات قبول کیے۔ اردو شاعروں نے بھی اس کے قصائد سے بہت استفادہ کیا ہے۔ انوری کو لف و نشر اور تجنیس کے استعمال سے خصوصی رغبت تھی۔ اس کی تشبیب متنوع موضوعات پر ہیں۔ بہار و باغ، گل و ریاحین

---

① مضامین مالک از عبدالمالک آروی ص ۳ سلسلہ مطبوعات طاق بستان آرہ ② دیوان خاقانی شیروانی مقدمہ مرتبہ علی عبدالرسولی چاپخانہ سعادت ③ دیوان خاقانی مرتبہ محمود عباسی، قصائد ص ۱۱۸ تہران ۱۳۳۶ ہجری شمسی

④ دیوان جمال الدین اصفہانی ص ۳۷۲ مرتبہ حسن وحید تہران ۱۳۲۰ ہجری شمسی

ذکر محبوب، ہجر، صبح، شام، سفر، عیدین، فلکیات، زمانے کی ناقدری، قصر و ایوان، شکارگاہیں اور رزم گاہیں وغیرہ بہت کچھ اس کے قلم کے احاطے میں آیا ہے۔ اس کے قصائد کے چند مطلعے ملاحظہ ہوں

ے صبا بہ سبزہ بیاراست باغ دنیا را + نمونہ گشت زمین مرغزار عقبی را

خبر دہید کہ ہنگام صبوح دگر آمد + شب رفت و ز مشرق علم صبح برآمد

چون وقت صبح چشم جہان سر زد ز خواب + بگسستہ شد ز خیمۂ مشکین شب طناب

اے ترک می بیار کہ عید است و بہمن است + ہنگام بادہ خوردن و شادی بر زن است

جرم خورشید چو از حوت در آید بحمل + اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

باز این چہ جوانی و جمال است جہان را + وین حال کہ نو گشت زمین را و زمان را

گر دل و دست بحر و کان باشد + دل و دست خدایگان باشد ①

انوری نے اپنے بہت سے قصائد میں مختلف علوم و فنون کی ادق اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ قصائد شرح کے خواستگار رہیں۔ انوری کی دشوار پسندی اور مضمون آفرینی کو بہت سراہا گیا ہے۔ خطابیہ قصائد میں بھی اس کا مرتبہ بہت بلند ہے

• ظہیر ظہیر فاریابی م $\frac{1201}{1202}$ء نے مازندران، نیشاپور اور آذربائیجان کے حکمرانوں کی شان میں قصائد لکھے ہیں۔ عربی زبان، نجوم اور حکمت پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس نے شکایت زمانہ و روزگار کے حوالے سے بھی قصائد لکھے ہیں۔ مولانا شبلی نے اسے انوری پر ترجیح دی ہے مگر حافظ محمود شیرانی نے ثابت کیا ہے کہ ظہیر انوری سے کمتر درجہ کا شاعر ہے ②۔ سلجوق بادشاہ سلطان رکن الدین کی مدح میں اسکا ذیل کا مطلع دیکھیے

ے زلف سرمستش چو در مجلس پریشانی کند + جان اگر جان در نیفشاند از گران جانی کند ③

• عطار فرید الدین عطار م ۱۲۲۰ء کے قصائد دنیاوی ممدوحین کی شان میں نہیں ہیں۔ انہوں نے اس صنف کو نعت اور پند و عرفان کے موضوعات کے لیے وقف کیا۔ ان کے قصائد صوفیانہ علامات، اشارات اور کنایات سے معمور ہیں

ے سبحان خالق کہ صفاتش ز کبریا + در خاک عجز می فگند عقل انبیا ④

اس دور کے دیگر قصائد نگاروں میں ابوالفرج ⑤ مسعود رومی م $\frac{1114}{1115}$ء، ابوجعفر عمر بن اسحق الوشتی ⑥، عمعق بخارائی ⑦ م $\frac{1148}{1149}$ء، مختاری غزنوی ⑧ م ۱۱۵۰ء، ادیب صابر ⑨ م $\frac{1151}{1152}$ء، سید حسن غزنوی ⑩ م ۱۱۶۱ء، رشید الدین وطواط ⑪ م ۱۱۸۲ء، مجیر الدین بیلقانی ⑫ م ۱۱۹۰ء اور ابو نظام فلکی شیروانی ⑬ م ۱۱۹۰ء بہت معروف ہیں۔ عمعق آل خاقان کے حکمران خضر خان کا درباری شاعر تھا۔ وطواط خوارزم شاہیوں کے دربار سے منسلک تھے۔ مجیر الدین سیف الدین ارسلان کے علاوہ رکن الدین، شمس الدین، قزل ارسلان اور عثمان بن ایلدگز کا مادح تھا۔ فلکی خاقان اکبر منوچہر بن فریدون کا مادح تھا

سلجوقی ادوار میں جہاں ایک سطح پر پند و نصائح اور تصوف کے کوائف میں ڈوبے قصائد دستیاب ہیں وہاں دنیاوی ممدوحین کی عظمتوں اور بلندیوں کو بھی مبالغہ اور حسن تعلیل کے حوالے سے بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ سلجوقی شعراء نے بادشاہوں کی شان و شوکت کے لفظی مرقعے تیار کیے ہیں۔ سبک عراقی کی تشکیل میں انوری اور خاقانی وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا یعنی انہوں نے فکری عناصر پر توجہ مرکوز کی۔ اس کے ساتھ ساتھ سبک خراسانی کو بھی ترقی کا موقع ملا۔ اس دور کا قصیدہ اپنے عہد کے علوم و فنون سے بھی منسلک نہیں رہا۔ علوم و فنون کے حوالے، تاریخی اشارے، عصری واقعات و حوادث کا بیان اس دور کے قصیدے میں ملتے ہیں

① دیوان انوری مرتبہ سعید نفیسی تہران ۱۳۳۷ ہجری شمسی ② مقالات حافظ محمود شیرانی جلد پنجم ص ۳۲۷ تا ۳۳۵ ③ سلجوق نامہ از ابن بی بی ص ۲۰

④ قصائد و غزلیات عطار نیشاپوری دیکھیے قصائد ص ۱ تا ۳۲، تہران ۱۳۱۹ ہجری شمسی ⑤ لباب الالباب ص ۲۴۱

⑥ ہفت اقلیم از امین احمد رازی مرتبہ جواد فاضل ص ۳۲۹ تہران ⑦ لباب الالباب ص ۱۸۱ ⑧ تذکرہ دولتشاہ ص ۹۲ ⑨ ایضاً ص ۹۳

⑩ مجالس النفائس از نظام الدین علی شیر نوائی مرتبہ اصغر حکمت ص ۳۳۵ تہران ۱۳۲۳ ہجری شمسی ⑪ تذکرہ دولتشاہ ص ۹۱ ⑫ ایضاً ص ۱۱۵ ⑬

مغلیہ عہد سے قبل فارسی قصیدہ

پس منظر

علاؤالدین جہاں سوز نے غزنوی حکمران بہرام خاں کو شکست ① دے کر غزنوی حکومت کا خاتمہ کیا۔ علاؤالدین جہاں سوز کے بھتیجے شہاب الدین غوری نے بلوچستان اور سندھ کی فتح کے بعد ہندوستان کے آخری غزنوی حکمران خسرو ملک کو شکست دے کر لاہور اور سیالکوٹ کو بھی اپنے زیرنگیں کرلیا۔ ۱۱۹۲ء میں غوری نے پرتھوی راج کو شکست دے کر شمالی ہند پر بھی قبضہ کرلیا۔ شہاب الدین غوری برصغیر میں اسلامی حکومت کے بانی کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ شہاب الدین غوری کے جانشین غیاث الدین محمود غوری نے ہندوستان کی مہموں پر قطب الدین ایبک کو (سلطان الہند) بھیجا۔ اس نے اپنے چار سالہ دور میں اجمیر سے لے کر انہل واڑہ تک، گنگوتری سے گجرات کاٹھیاواڑ تک کے علاقے کو اور بندیل کھنڈ میں کالنجر کے مضبوط قلعے کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ ایبک کی وفات کے بعد اس کا نااہل بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا چنانچہ ایبک کے منظور نظر شمس الدین التتمش نے دہلی کی سلطنت سنبھال کر اسے استحکام اور مزید توسیع عطا کی اور یوں وہ پورے شمالی ہند کا خودمختار بادشاہ بن گیا۔ ۱۲۳۳ء میں التتمش کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد سلطانہ رضیہ ۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء پھر اس کا بھائی بہرام شاہ اور ایک بھتیجا تخت نشین ہوئے مگر وہ بھی معزول کردیئے گئے۔ ۱۲۴۰ء سے ۱۲۶۶ء تک التتمش کا سب سے چھوٹا بیٹا ناصرالدین محمود بادشاہ بنا۔ ۱۲۶۶ء میں بلبن، ۱۲۸۶ء میں کیقباد کو حکومت ملی ۱۲۹۰ء میں جلال الدین خلجی نے خاندانِ خلجی کو ہندوستان کا اقتدار دلادیا۔ ۱۳۲۰ء تک جلال الدین فیروز، علاؤالدین محمد اور قطب الدین مبارک شاہ اسی خاندان کا تاجِ شاہی پہنا۔ ۱۳۲۰ء میں قطب الدین مبارک کو قتل کرکے خسرو خاں نے حاکمیت سنبھالی اسے قتل کرکے غیاث الدین تغلق نے ہندوستان میں خاندانِ تغلق کی بنیاد رکھی۔ تغلق خاندان ۱۳۲۰ سے ۱۴۱۲ء تک تخت نشین رہا۔ محمد تغلق، فیروز تغلق اور محمود تغلق اس خاندان کے بادشاہ تھے۔ محمود تغلق کی وفات کے ساتھ ہی تغلق خاندان کی بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔ محمود تغلق کے دور میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ تغلق خاندان ہی کے دور میں دکن میں بہمنی سلطنت کا آغاز ہوا۔ اس دور کے خاتمے پر بنگال میں حبشی خاندان، جونپور میں شرقی خاندان اور مالوہ اور گجرات پر مقامی خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ بہمنی سلطنت کی حریف سلطنتِ وجیانگر بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ بابر کی آمد سے قبل ہندوستان میں سید خاندان اور لودھی خاندان کی حکومت بھی قائم ہوئی۔ سید خاندان کا بانی خضر خاں والئی لاہور اور ملتان تھا یہ خاندان ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک حکمران رہا۔ خضر خاں کی وفات ۱۴۲۱ء کے بعد اس کے چار جانشینوں میں سے مبارک شاہ اور علاؤالدین عالم شاہ کو اہمیت حاصل ہے۔ مبارک شاہ کے دور میں تاریخ مبارک شاہی رقم ہوئی۔ ۱۴۵۱ء میں پنجاب کا حاکم بہلول لودھی سلطنت پر قابض ہوا لودھی خاندان کی حکومت ۱۵۲۶ء تک رہی۔ بہلول لودھی، سکندر لودھی اور ابراہیم لودھی نے سلطنت کی حدود میں توسیع کی اور جونپور، دھولپور، گوالیار وغیرہ کو اپنی سلطنت کا حصہ بنایا۔

ایران میں تاتاری، منگول۔ ایل خانی حکومت آٹھویں صدی ہجری ( ) تک قائم رہی اس دوران میں خوارزم شاہی بھی حکمران رہے اور اتابکانِ فارس بھی۔ ۱۲۲۱ء میں خوارزم شاہی سلطنت منگولوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی مہموں نے ایران اور بغداد کو اجاڑ دیا۔ منگولوں کا عہد دو حصوں میں منقسم ہے ① چنگیز خاں سے منگو خاں کی وفات تک ② ہلاکو سے ابوسعید تک (ایلخانی دور)۔ احمد تکودار اور غازان نے اسلام قبول کیا۔ غازان پہلا حکمران تھا جس نے خاقانِ تاتار سے آزاد ہوکر خودمختار

---

① اس وحشتناک حملے میں ستر ہزار افراد تہ تیغ اور شہر نذر آتش ہوئے

حکومت کی بنیاد ڈالی۔ خاندانِ جلائر ١٣٣٩ء سے ١٤١٢ء تک عراق میں، آلِ مظفر ١٣١٣ء تا ١٣٩٣ء یزد اور اصفہان میں، اتابکانِ فارس ١١٤٨ء تا ١٢٨٧ء فارس میں، اتابکانِ یزد ١٠٥١ء تا ١٢٢١ء یزد میں، قراختائیان ١٢٢٢ء تا ١٣٠٣ء کرمان میں، آلِ کرت ١٢٤٥ء تا ١٣٨١ء ترکستان کے بعض حصوں میں، خاندانِ اینجو ١٣٢١ء تا ١٣٥٧ء شیراز میں، سربداران ١٣٣٧ء تا ١٣٨٦ء سبزوار میں حکمران رہے۔

تاتاری حملوں نے شاعروں کو بہت متاثر کیا۔ رزمیہ شاعری ختم ہوئی۔ باطن پرستی اور تصوف کا دور دورہ ہوا۔ بے ثباتیِ دنیا، عبرت بینی، گوشہ نشینی، عزلت گزینی، تسلیم و رضا اور قناعت وغیرہ کے موضوعات شعر و ادب میں کثرت سے در آئے۔ ایلخانی حکمرانوں کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے اہم درباری قصائد نگار علاقائی حکمرانوں سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ البتہ ہندوستان میں دہلی کے بادشاہوں نے اس صنف کو خوب خاطر رکھا۔

دورِ منگول کے خاتمے پر امیر تیمور نے خراسان، مازندران، سیستان، آذربائیجان، گرجستان، مغربی ایران، اصفہان، فارس، شام، حلب، دمشق، روس، ترکستان، اور ہندوستان کے بعض علاقے اپنی سلطنت میں شامل کیے۔ ان فتوحات سے فارغ ہو کر وہ سمرقند واپس چلا گیا۔ اس کی وفات کے بعد ایرانی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مشرقی ایران پر اس کا بیٹا شاہ رخ مرزا قابض ہو گیا۔ آذربائیجان کا علاقہ ترکوں نے سنبھال لیا۔ شاہ رخ کی وفات کے بعد تختِ سلطنت پر متمکن اس کا بیٹا الغ خاں اپنے بیٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوئی اس دوران میں سلطان حسین بایقرا نے خراسان کی حکومت سنبھال لی۔ شاہ رخ اور بایقرا علم و فن کے رسیا اور شاعروں ادیبوں کے قدردان تھے۔ بایقرا کے بعد شیبانیوں نے حکومت کی باگ ڈور تھامی۔ یہ حکومت صفویوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ ترکمانی قبائل قراقویونلو اور آق قویونلو نے ١٤٦٨ء سے ١٥٠٢ء تک ایران میں بہت ہنگامے مچائے۔ سردار قرا محمد قرا یوسف بابا، قرا یوق عثمان اور اوزون حسن کے پیروکاروں نے سازشوں سے ایرانی اقتدار اپنے قبضے میں لیا۔ اسی دوران میں صفی الدین اردبیلی (جو ایک روحانی پیشوا تھا) کے خاندان سے اٹھنے والے اسمٰعیل نامی ایک شخص نے بزورِ شمشیر ازبکوں کے سردار محمد شیبانی کا خاتمہ کیا اور صفوی خاندان ١٥٠٢ء میں بنیاد ڈالی۔ تبریز، موصل اور بغداد کو فتح کرنے کے بعد اس نے آق قویونلو حکمرانوں کو شکست دے کر ایران کی وسیع سلطنت کو اپنے دائرہ اختیار میں سمیٹا اور شمال مغربی ایران کو فتح کرنے کے بعد بلخ اور ہرات کے علاقے بھی صفوی سلطنت میں شامل کر لیے۔ صفوی حکمرانوں میں شاہ طہماسپ، شاہ اسمٰعیل دوم، محمد خدا بندہ، شاہ عباس اعظم، شاہ صفی، شاہ عباس دوم، سلیمان، شاہ حسین نے ایران کے مختلف علاقوں پر حکومت کی یہ عہد دو سو سال تک پھیلا ہوا ہے۔ ١٧٢٢ء میں صفوی خاندان کی حکومت اختتام کو پہنچی۔

ہندوستان میں خاندانِ غلاماں کی حکومت میں سلاطین نے علم پروری کی غزنوی روایت کو استحکام بخشا۔ انہوں نے مدرسے اور معیاری علمی درسگاہیں قائم کیں۔ خانقاہ نظامیہ دہلی بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ یوں تصوف کے دائرے کو پھیلاؤ میسر آیا۔ خواجگانِ چشت اور دیگر صوفیوں نے اپنی تعلیم و تربیت اور درس و تدریس سے حنفی مسلک و مشرب کو اور زیادہ راسخ کیا۔ ہندوستان دارالاسلام بن گیا۔ شاہی فتوحات کی بدولت اسلامی تصورات دور دراز علاقوں میں پھیلے۔ پنجاب، دہلی، بدایوں اور اجمیر میں علماء نے بڑی خدمات سرانجام دیں۔ اسلام کا دبدبہ قائم ہوا اور مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی برتری کو اور زیادہ استحکام ملا۔ خلجیوں، تغلقوں اور لودھیوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہی ادوار میں دکن میں علیحدہ مسلم سلطنت کا قیام ہوا۔

ہندوستان میں اس دور کے مسلم سلاطین کم و بیش اسلامی شعائر کو اہمیت دیتے تھے۔ ان ادوار میں چشتیہ، سہروردیہ اور نظامیہ سلاسل کو زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ شریعت و طریقت، ہندو مسلم، شیعہ سنی اور منقولاتی اور معقولاتی تضادات کھل کر سامنے آئے۔ سید محمد جونپوری کا دعویٔ مہدویت اور بھگتی تحریک کا شب خون بھی انہی ازمنہ سے متعلق ہے۔

ابتدا میں منگولوں اور تیموریوں کی بڑے پیمانے پر انسانی قتل و غارتگری نے ایشیا اور یورپ میں بسنے والے انسانوں کی سائیکی کو شدید طور پر متاثر کیا۔ علما اور دانشور سیکڑوں سے قتل کیے گئے۔ مدرسے، مساجد اور کتب خانے برباد ہوئے۔ اہلِ علم نے دور دراز علاقوں میں جائے اماں تلاش کی۔ ملحد منگولوں نے اسی دور میں بت پرستی اور اسی قبیل کے دیگر غیر اسلامی شعائر کو فروغ دیا۔ بعد میں عجمی تہذیب نے ان خاندانوں کے حکمرانوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ بھی علم و ادب کی خدمات میں مصروف ہوئے۔ ان ادوار میں تاریخ جہانگشا [جوینی] جامع التواریخ [خواجہ رشید الدین فضل اللہ] طبقات ناصری [منہاج سراج] تاریخ یمینی [ابو نصر عتبی] مجمل التواریخ [فصیحی] تاریخ وصاف [ادیب عبداللہ شیرازی] تاریخ گزیدہ [حمد اللہ مستوفی] زبدۃ التواریخ [خواجہ نور الدین] ظفر نامہ [نظام الدین] اور ظفر نامہ [شرف الدین علی یزدی] مطلع السعدین [کمال الدین] لباب الالباب [محمد عوفی] المعجم [شمس قیس رازی] مرصاد العباد [شیخ نجم الدین] اخلاق ناصری [نصیر الدین طوسی]، تذکرہ [دولت شاہ سمرقندی] اخلاق جلالی [جلال الدین دوانی] اور اخلاق محسنی جیسی تواریخی، ادبی اور اخلاقیاتی کتب لکھی گئیں۔ نصیر الدین طوسی، زکریای قزوینی، قاضی بیضاوی، قطب الدین شیرازی، قاضی عضد الدولہ ایجی، قطب الدین رازی، سعد اللہ تفتازانی اور سید شریف جیسے مفکروں نے علم و ادب اور فن و تصوف کی بڑی خدمات سرانجام دیں۔ نصیر الدین طوسی، خواجہ شمس الدین جوینی اور رشید الدین جیسے وزرا نے دیگر علم و ادب کے سرپرست بادشاہوں کے دوش بدوش اس دور میں علم و ادب کی خدمات کے سہرے دروا کیے۔ تیمور، بایسنقر، مظفر شاہ اور اتابکان فارس کی علم دوستی اور شعرا پروری سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ منگولوں اور تیموریوں کے اس عہد میں نجوم، مصوری، تاریخ، موسیقی اور تعمیر وغیرہ کے میدانوں میں خاص ترقی ہوئی۔ اس حوالے سے قصیدہ نگار شاعروں کی تخلیقات بھی بڑی اہم ہیں ان کے قصیدوں میں معاصر علوم و فنون اور موضوعات و حقائق کو پوری طور پر لفظوں کے دائروں میں سمیٹا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس عہد میں پرورش پانے والی مختلف فکری و مذہبی تحریکوں کے اثرات بھی ان قصائد میں دیکھے جا سکتے ہیں

ہندوستان میں مسلم بادشاہوں نے جب باقاعدہ سلطنتیں قائم کیں تو انہوں نے اپنے درباروں کو عربی اور عجمی تہذیب و تمدن کے اشتراک کے زیر اثر قائم ہونے والے غزنوی اور غوری ادوار کے درباروں کی طرز پر آراستہ کیا۔ ان درباروں پر جب ہندوستان کی مقامی بادشاہتوں کے تابع شان و شوکت کے حامل درباروں کے اثرات مرتب ہوئے تو ان کی شان و شوکت اور طمطراق کے ساتھ ساتھ سطوت و حشمت، جلال و جبروت اور نمود و نمائش کے انداز بھی چوکھا رنگ اختیار کر گئے۔ ان درباروں کی دھوم چار دانگ عالم میں تھی۔ رعب و جلال کا ایسا طلسم خانہ وجود میں آیا کہ خلقت اس کے سحر میں سے اطاعت کی جانب مائل ہوئی۔ عہد مملوکیت کے آغاز کے جلوؤں سے لے کر مغل بادشاہوں کے عہد زوال تک ہندوستان کے عوام نے شاہی رنگینیوں اور دلآویزیوں کے تمدن آزیں اور تہذیب خیز منظر ناموں سے بہترین حظ و فیض حاصل کیا ہے۔ مسلم بادشاہوں نے یہاں جس تہذیب و ثقافت کے پرچم بلند کیے وہ کئی اعتبار سے مقامی ہندوستانی خلقت کے لیے نئے، انوکھے اور اجنبی تھے۔ ہما کی شکل کا چترِ مطلا، مرصع شاہی عصا، دور باش

ہتھیار بند پیدل اور سوار محافظ، سایہ گستر اور مورچھل کے زیر سایہ سلطان کا براجمان ہونا، شاہی خاندان سے منتخب ہونے والے امیر حاجب کا اس کے قریب رہنا، دوات دار، امیر دار اور دبیر خاص وغیرہ کیا کیا شعبے اور عہدے تھے۔ دربار کی آراستگی اور سجاوٹ شحنۂ دربار کے سپرد تھی۔ نقیب اور چاؤش بھی ہر طرف نظر آتے۔ خاص خاص درباریوں کے علاوہ کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ ہوتی۔ دربار میں آنے والا ہر فرد تخت کے قریب آکر تین مرتبہ زمین بوسی کرتا۔ البتہ علماء، صلحا اور مشائخ اس عمل سے مستثنیٰ تھے۔ نقیب آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھتے۔ منصب دار ان کے نام روزنامچے میں لکھ لیتے۔ درباری مخصوص پوشاک پہنتے تھے۔ خلعت یافتہ خلعت پہن کر آتے تھے۔ تاجپوشی، سالگرہ، سفیر کی آمد، قبول نذرانہ، مختلف مذہبی اور غیر مذہبی تہواروں، شادی بیاہ کی رسموں کے علاوہ فتح کی خوشی اور تیز بینی و ثقافتی حوائج کی ادائیگی کے دنوں میں بھی دربار منعقد کیے جاتے۔ منقش فرش بچھتے، زربفت کے پردے لٹکائے جاتے۔ آرائش دربار، آداب سلطنت کے لحاظ اور شاہی رسومات پر عمل درآمد کا مطلب درباریوں اور دیگر متعلقہ افراد پر شاہی ہیبت اور دبدبے کی دھاک بٹھانا تھا۔ دربار میں کبھی نقارے کی آواز گونجتی، کبھی نفیری کی، کہیں سرنا کی دھن اور کہیں قرنا کا خروش۔ قاضی القضاۃ، خطیب الخطباء کے علاوہ فقیہہ، سادات، مشائخ، سلطان کے لواحق، داماد، امراء، پردیسی مہمان، ایلچی اور فوج کے جتھے وار درباری دربار یوں کے روپ میں ایستادہ ہوتے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے "جب دربار کسی عام جگہ پر منعقد ہوتا تو سیاہ اور سفید ریشم کی لگاموں سے مزین زیوروں سے پیراستہ خاصے کے گھوڑے بھی نظر آتے۔ طلائی اور ریشمی کپڑوں سے سجے ہاتھی بھی دکھائی دیتے۔ ان کے دانتوں پر لوہا چڑھا ہوتا۔ ہر ایک کی گردن پر آنکس رکھنے والا فیل بان سوار ہوتا۔ ہاتھیوں پر ہودج رکھے جاتے۔ یہ ہاتھی تربیت یافتہ ہوتے تھے سر جھکا کر تعظیم بھی کیا کرتے تھے" ① شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی اور طبقات ناصری میں ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں اور ابوالقاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں مملوک سلاطین کے زمانوں میں آداب دربار اور معروف سلاطین کے عہد میں درباروں کی عمومی حالت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان میں فارسی وجہ عقیدے نے کم و بیش اسی طرح کے درباری شکوہ کو قلمبند کیا ہے اس صنف نے اسی ماحول کے پس منظر میں نشو و ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں

مغلیہ عہد سے قبل کے ہندوستانی مسلم حکمران موسیقی، رقص، مصوری اور عمارت سازی کے دلدادہ تھے اس ضمن میں یہ اقتباسات دیکھئے

"بلبن کے دربار سے ارباب طرب کو وظائف ملتے تھے جشن نوروز میں طرب دربار میں آتے اور اپنے فنون کی داد لیتے" ②

جلال الدین خلجی کے ضمن میں ضیاء الدین برنی رقمطراز ہے "سلطان کی مجلس میں محمود چنگ بجاتا۔ فتوحا دختر فتاعلی اور نصرت خاتون گاتیں — سلطان کی مجلس میں جب رقص کرتیں تو جوان کے کرشمہ اور ناز کو دیکھ اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا" ③

محمد بن تغلق کے حوالے سے ابن بطوطہ کا کہنا ہے "شادی بیاہ کی تقریب کے موقع پر مطربوں اور طوائفوں کا ناچ گانا بھی ہوتا" ④

شمس سراج عفیف نے لکھا ہے "سلاطین کے خلوت خانوں میں مصور نقاشی کیا کرتے تھے تاکہ بوقت خلوت بادشاہ ان تصویروں کو دیکھے ⑤ اس دور میں ساغر، مینا، پوشاک، بارگاہ، خرگاہ، پردوں اور تخت وغیرہ پر تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ جانداروں کی تصویروں کے غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے فیروز شاہ نے حکم دیا تھا کہ دیواروں پر باغات اور مناظر قدرت کو منقش کیا جائے" ⑥

سلاطین ہند تعمیرات میں دلچسپی لیتے تھے۔ دہلی کی قدیم مسجد قوت الاسلام، قطب مینار [قطب الدین ایبک] علائی دروازہ حوض

① سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ص ۱۰۲ ② تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۸۷ ③ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۹ ④ سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۱۴۳
⑤ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۷ ⑥ Painting During the Sultnate period 8 Dr. M. Abdullah Chughtai P.9.

فیروز شاہ کا محل، ناصر الدین، غیاث الدین تغلق اور خان جہاں تلنگانی کے مقابر وغیرہ ان کے اس ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شہر رنگ پور بختیار خلجی نے، اُچ سلطان التمش کے عہد میں، دولت آباد سلطان محمد تغلق شاہ نے آباد کیا۔ فیروز شاہ کو باغات بنانے کا شوق بھی تھا اس نے اطراف دہلی میں ایک ہزار سے زائد باغ لگوائے تھے۔ اس طرح سلطان محمود بیگڑہ نے شہر محمد آباد آباد کیا اور سواد شہر میں کثرت سے باغ لگوائے۔ "جن میں مختلف پھول اور پھل مثلاً آم، انجیر، انگور، کیلا، امرالیس، نارنگی، کمرک، لعل السہ، آملہ، گل لعل، سیوتی، چنبیلی، چنبیا، بیلہ، موگرہ، جوہی، کرنی، کیوڑا وغیرہ پیدا ہوتے تھے① یہ سلاطین علم کی ترقی کے بھی خواہاں تھے۔ شہاب الدین غوری نے جب اجمیر فتح کیا تو وہاں کئی مدرسے بنوائے② رضیہ سلطان نے مدرسہ معزی اور مدرسہ ناصری کی سرپرستی کی③ فیروز شاہ نے قدیم مدارس کی مرمت و اصلاح بھی کی اور خود تیس مدرسے قائم کیے④ سلطان محمد شاہ تغلق فن تاریخ، فلسفہ، طب، نجوم، ریاضی اور منطق میں کمال رکھتا تھا⑤ نظام الدین اولیا کی خانقاہ کے ایک بڑے کتب خانے کا تذکرہ بھی تاریخوں میں آیا ہے⑥ سلاطین کے امرا بھی اکثر علم دوست حضرات ہوا کرتے تھے فیروز شاہ کا امیر تاتار خاں مفسر تھا اس نے تفسیر تاتار خانی اور فتاوی تاتار خانی کے نام سے کتابیں لکھیں⑦ سلطان ابراہیم لودھی کے دربار کے ایک معزز امیر غازی خاں نے ایک کتب خانہ قلعہ کے اندر قائم کیا⑦۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ایسے بادشاہوں اور امیروں کی محفلوں میں شرف باریابی حاصل کرنا کچھ ایسا آسان کام بھی نہ تھا۔ چنانچہ حرف علم و فضل میں یکتائے روزگار قصیدہ نگار ہی ان کے درباروں میں اپنا چراغ جلا پاتے تھے۔

بہاؤ الدین اوشی قطب الدین ایبک کے مداحوں میں سے تھا۔ قطب الدین ایبک اپنی بخشش اور فیاضی کی عادت کی وجہ سے لک بخش سے ملقب تھا۔ اسکا تذکرہ بہاؤ الدین اوشی نے اپنے ایک قصیدے میں کیا ہے

اے بخشش لک تو در جہاں آوردہ + کان را کف تو کار بجاں آوردہ

اس دور میں قاضی حمید الدین نے بھی بہت سے قصائد لکھے ان کا تذکرہ عوفی نے لباب الالباب میں کیا ہے⑧۔ روحانی اور ناصری عہد التمش کے شاعر تھے مگر ان کا ایک آدھ قصیدہ ہی دستیاب ہے۔ تاج الدین ریزہ اسی دور کا ایک مشہور شاعر ہے۔ غیاث الدین تغلق اور رضیہ سلطان کی مدح میں اس کے قصائد موجود ہیں۔ صنعت توافق اور صنائع بدائع کا استعمال اسے مرغوب تھا

صبح خیز آنانکہ وصف آں خط و خد کردہ اند + در رہ فکرت نوشتن جہد بے حد کردہ اند

سلطان رکن الدین فیروز شاہ بھی اس کا ممدوح تھا۔ اسی عہد میں اُچ میں ناصر الدین قباچہ خود مختار حکمران تھا اس کی ستائش میں کاتب بلخی، منضل بخاری اور ضیاء الدین سجزی نے عمدہ قصائد لکھے۔ مولانا منہاج سراج اور عمید سنامی ناصر الدین محمود کے دربار سے وابستہ تھے۔ منہاج سراج نے ہلاکو خاں کے ایلچی کی آمد پر ناصر الدین محمود کے دربار کی آرائش کی تفصیل پر مشتمل ایک قصیدہ لکھا طبقات ناصری میں منہاج نے اپنے کئی قصائد کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ذاتی حالات و کوائف بھی قلمبند ہوئے ہیں۔ ان کا ایک مطلع ملاحظہ ہو

آں شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش است + ناصر دنیا و دیں محمد بن التتمش است⑨

مذکورہ قصیدہ نگار شعرا کے قصائد اپنے عہد کے علمی اور فنی منظر نامے سے مکمل طور پر متاثر ہیں۔ انہوں نے شاہی شان و شوکت اور سطوت کا موثر بیان کیا ہے۔ نقاشی، موسیقی، تعمیرات، باغ و راغ اور دیگر علوم و فنون کے حوالے ان کے قصائد کو معتبر بناتے ہیں۔ یہ لوگوں کی پختگی فارسی پر عبور کی بنا پر ان کے عبور

---

① مرآت سکندری از ص ١٩٤ تا ص ١٩٥ بحوالہ محمد بن جلوے از صلاح الدین عبداللہ ② معارف جلد چہارم نمبر ٣ بابت ماہ ذیقعدہ ١٩٣٣ ③ طبقات ناصری ص ١٨٨
④ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ١٥١ ⑤ ایضاً حالات محمد تغلق ⑥ تاریخ فیروز شاہی ص ٣٩٢ ⑦ تزک بابری ⑧ لباب الالباب جلد اول ص ١٨٨
⑨ طبقات ناصری ص ٨٣٢

بابر نامہ انگریزی جلد اول ص ٤٥٠ مرتبہ اینیٹی سوزانا بیوریج لندن ١٩٢١ء

مرآت سکندری از سکندر ابن محمد ص ٨٧ مطبع فتح الکریم بمبئی ١٣٠١ھ

کمال الدین

کمال الدین اصفہانی م ۱۲۳۷/۶۳۸ء سلجوقی دور کے معروف قصیدہ نگار جمال الدین اصفہانی کا بیٹا، اصفہان کے دو مذہبی خاندانوں آلِ صاعد، آلِ خجند، فارسی اتابکوں اور طبرستانی سپہداروں کا مداح تھا۔ خطابیہ قصائد اسے مرغوب تھے۔ مدحیہ حصوں میں پند و نصائح بیان کرنا اس کا عمومی وتیرہ تھا۔ کمال کے قصائد اس عہد کے اصفہان اور اس کی زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

اصفہان خرم است و مردم شاد + این چنان عہد کس ندارد یاد (۱)

منگولوں کے مظالم، مرثیہ، شکایتِ زمانہ، شاعری کی ناقدری، وحشتِ خلائق کے علاوہ بے صبری بار بار اسکے معاملات بھی اس کے قصائد کا موضوع ہیں چنانچہ ان میں شیخ والا شدید برف باری بھی اس کے ایک قصیدے میں منعکس ہوئی ہے۔ کمال نے ایک قصیدے میں ردیف کی تبدیلی کا اجتہاد کرنے کی بھی کوشش کی یعنی قصیدہ کے حصہ تشبیب میں "می آمد" ردیف استعمال کی ہے اور گریز اور مدح کے حصوں میں "می آید"۔ یہ اجتہاد مقبول نہ ہوا (۲)

ردیف شعر دگر کردم از پی مدحش + کہ آنچہ از پی چیزے بہ کار می آمد
ز بہر حال زمانی شدم بہ مستقبل + کہ این ایام چنین خوشگوار می آید

سعدی

مولانا سعدی شیرازی (۱۲۹۲ء اور ۱۲۹۵ء کے درمیان وفات) نے عربی اور فارسی قصائد بھی لکھے ہیں۔ ان کے قصائد میں پند و نصائح کا عنصر غالب تھا۔ ان کے ہاں مدح بہت کم ہے اور جہاں کہیں ہے بھی ان کا طرزِ بیان خوشامدانہ نہیں ہے۔ سعدی کی سادہ، صاف، شستہ اور معانی و موضوعات کی متانت کے حامل قصائد لکھے۔ شکوہِ الفاظ اور قصائد کے طمطراق سے وہ گریزاں تھے۔ تشبیب میں عاشقانہ غزلیت کا اہتمام کرتے تھے سعد بن اتابک زنگی ان کا ممدوح تھا

شہاب

الدین مہمرہ م ۱۳۰۲/۱۳۰۳ء امیر خسرو کے ممدوح بھی تھے۔ انہوں نے رکن الدین فیروز شاہ کی مدح میں قصائد لکھے وہ ہندوستان میں قصائد مصنوعہ کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے قصائد میں صنعت لزوم مالا یلزم کا عمدہ استعمال کیا ہے۔ وہ غیر متجانس اور بے جوڑ الفاظ کو اشعار میں اس حسن خیز طریقے سے لاتے تھے کہ بیان کی درستی اور ہمواری میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ حمد و نعت اور تصوف و اخلاق کے موضوعات پر ان کے عمدہ قصائد دستیاب ہیں۔ ان کے نعتیہ قصائد جواہر معانی سے مزین ہیں

شہ تخت کن محمد کہ سرادق شرف زد + بسوی در جیمیں بہ سرای ام ہانی
لبشرے ملک لطافت فلک زمیں تواضع + چو فلک بپاک جسمی چو ملک بپاک جانی

خسرو

امیر خسرو م ۱۳۲۵ء نے بلبن، کیقباد، خلجی اور تغلق سلاطین اور امراء کی ستائش میں متعدد قصائد لکھے۔ یہ قصائد ان کے دواوین موسوم بہ تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال میں موجود ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی منقبت میں بھی انہوں نے لاجواب قصائد رقم کیے۔ تقویٰ، اخلاقیات اور تصوف کے موضوعات پر اظہار خیال انہیں مرغوب تھا۔ وہ قصائد میں نئی طرز کے موجد تھے۔ دیگر لوگوں کی تتبع میں انہوں نے احتیاط سے کام لیا۔ ابتدا میں ان کے قصائد پر انوری، خاقانی، ظہیر اور کمال کے اثرات تھے۔ بعد میں ان کے مخصوص اسلوب نے ان کی شاعری کو منفرد اور یکتا بنایا۔ تشبیب اور گریز میں ان کے شاعرانہ جوہر کھل کر نظر آتے ہیں۔ مدحیہ اشعار میں تکلف اور تصنع کا انداز نمایاں ہے۔ مستحق ممدوحین کی شان میں ان کے قصائد طبعی خلوص اور جوش و جذبہ کے حامل ہیں۔ پرشکوہ الفاظ، خوبصورت ردیف و قوافی، عمدہ اور نادر تراکیب، تلمیحات، تشبیہات اور صنائع بدائع کے استعمال میں وہ لاجواب تھے۔ بحر الابرار اور مرآۃ الصفا

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران و تاریخ نثر از فرولو، ص ۲۴۳ (۲) اس قصیدے کا مطلع ہے: سپیدہ دم کہ نسیم بہار می آمد + نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آمد

(۳) دیوان سعدی میں انکیانو، علاؤ الدین جوینی، شمس الدین حسین، تارک سوس، خاتون کرمانی وغیرہ کی شان میں قصائد ملتے ہیں دیکھئے قصائد و دیوان سعدی، نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۵ء

ان کے معرکۃ الآرا قصائد ہیں ۔ ان قصائد کے مطالعے سے امیر خسرو کے علمی تبحر اور قادر الکلامی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ پند و موعظت، تصوف و معرفت، فکر و کلام اور حمد و نعت وغیرہ کے موضوعات پر انہوں نے پورا زورِ طبیعت صرف کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر قصائد میں ترصیع و توشیح کے آہنگ نے جنم لیا ہے ۔ امیر خسرو نے توحید اور دینی عقائد کے حوالے سے ایک قصیدہ حیات النبی رقم کیا تھا ۔ نظم التہ، مرأة الرحمان، عین العبر، مرأة رحاق سلوک و معرفت کے حوالے سے لکھے گئے ان کے معرکۃ الآرا قصائد ہیں ۔ (۱)

صبا ز گاہ آں آمد کہ راہ بوستاں گیرد + زمیں را سبزہ در دیبائے گل در پرنیاں گیرد

چو از چشمہ موج آب و لرزاں در زمیں افتد + زند بر لالہ باد تند و آتش در زباں گیرد

دلم طفلیست و پیر عشق استاد زبانِ دانش + سواد لوح سبق و سکنت گنج دلبستانش

کوس شغالی و بانگ غلغلش در سراست + ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است

در جہاں و در مجلسی پادشاہ عالم است + تیغ خفتہ در جہاں پاسبان کشور است [بحر الابرار]

بدر چاچ [۱۳۵۰ تک زندہ تھا] کے قصائد علمی تبحر کے استعمال کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں ۔ اسکا ممدوح محمد بن تغلق تھا ۔ ہیئت و نجوم، موسیقی، تاریخ گوئی اور فنونِ شاعری پر اس کی مکمل دسترس تھی ۔ اس نے نگر کوٹ کی فتح ۱۳۳۷ء پر ایک پر مغز قصیدہ لکھا ۔ صنائع بدائع سے معمور، آورد اور مشکل قصائد اس کی انفرادی شناخت کا باعث ہیں ۔ اس کے قصائد میں لفظی رعایتیں، متجانس رابطے اور متضاد کوائف انتہائی خوش اسلوبی سے استعمال ہوئے ہیں ۔ علم نجوم اور موسیقی کی اصطلاحات اس کی تشابیہ میں کثرت سے جھلکتی ہیں ۔

خیز در خانۂ کماں سپر آمد + مغفر زر در وبال تیر آمد (۲)

اس شعر میں خانۂ کماں [برج قوس] سپر [آفتاب] مغفر زر [آفتاب] اور تیر [عطارد] فلکیات کی اصطلاحیں ہیں ۔ بدر چاچ فن محمد بن طاق تھا ۔ اس کے قصائد تاریخی معلومات کے اثاثے سمیٹے ہوئے ہیں ۔ محمد بن تغلق کو عباسی خلفا کی خلعت و پیغام پہنچنے پر، نئے شہر آباد کرنے، قلعے بسانے اور مساجد وغیرہ کی تعمیر پر اس کے عمدہ قصائد موجود ہیں ۔ بدر چاچ نے اپنے عہد کی ثقافتی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔ شاہی جشنوں، عیدوں اور دیگر مذہبی و غیر مذہبی تقریبوں کا حال اس کے قصائد میں موجود ہے ۔ عید ناصر الدین محمود میں بننے والے محل ہزار ستون کی شان میں بدر چاچ کے اشعار ابن بطوطہ نے سفرنامے میں لکھے ہیں ۔ (۳)

حافظ شیرازی م ۱۳۸۹ء نے اینجو خاندان کے ایک امیر فارس کے حکمران شیخ جمال الدین ابو اسحق کی مدح میں قصائد لکھے ۔ اس امیر کو انہوں نے "جمال چہرۂ اسلام" اور "سپہر علم و حیا" کہا ہے ۔ شیخ امین الدین کی مدح میں بھی ان کے قصائد ہیں ۔ ان میں حافظ نے ممدوح موصوف کو صوفیوں کا ابدال بھی لکھا ہے ۔ آل مظفر کے حکمران شاہ شجاع اور شاہ منصور بھی حافظ کے ممدوح تھے ۔ حافظ کے مدحیہ قصائد سعدی کے قصائد کی مانند عارفانہ رنگ میں رنگے ہیں ۔ غلو اور چاپلوسی سے انہیں سروکار نہ تھا ۔ انہوں نے حکمران کو دنیا کے فانی اور عبرت آمیز ہونے کا احساس دلایا ہے ان کے ایک قصیدے کا مطلع ہے

ہزار دلبری نتواں لاف زد بآسانی + ہزار نکتہ در کار ہست تا دانی (۴)

صفوی دور کے شعرا میں **فغانی شیرازی** م ۱۵۱۹ء نے تبریز کے سلطان آق قویونلو کی مدح سرائی کی ۔ قصیدہ نویسی میں نازک

---

(۱) قصائد خسرو دیوان مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری قلمی (۲) قصائد بدر چاچ مرتبہ شفیق علی خان ص ۱ تا ۲۱۸
(۳) سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۹۵، دیوان بدر چاچ ص ۳۶ (۴) دیوان حافظ مرتبہ حسین پژمان ص ۳۲۵، تہران ۱۳۱۸ ہجری شمسی
(۵) دیوان بابا فغانی شیرازی مرتبہ سہیل خوانساری ص ۸، چاپخانہ گودرزی ۱۳۴۶ ہجری شمسی

خیالی کی ایجاد یا دوسرے لفظوں میں سبک ہندی کے آغاز کا سہرا فغانی ہی کے سر بندھا ہے۔ سبک ہندی فی الاصل فارسی شاعری پر ترک اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس دور کے دیگر فارسی شعرا میں حسن سنجری م ۱۳۲۷ء، اوحدی مراغی م ۱۳۳۷ء، ابن یمین م ۱۳۶۷/۱۳۶۸ء، عبید زاکانی م ۱۳۷۲ء، سلمان ساوجی م ۱۳۷۶ء، عبدالرحمن جامی م ۱۴۹۲ء، شیخ جمالی (دہ بکنبوہ دہلوی) اور محتشم کاشانی م ۱۵۸۸ء کے قصائد بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

حسن سنجری نے الغ خاں کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی جنگیں کفر و اسلام کی جنگوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ الغ خان نے جب دوبارہ سومنات فتح کیا تو انہوں نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے محمود غزنوی کی روح زندہ کر دی۔

اوحدی مراغی ایلخانی سلطان ابوسعید کے وزیر غیاث الدین کا مداح تھا۔ اس کے بعض قصائد سنائی کے تتبع میں صوفیانہ موضوعات پر ملتے ہیں۔

خواجوئے کرمانی م ۱۳۵۲ء بھی غیاث الدین کے مداح تھے۔ انہوں نے آل مظفر کے بعض سلاطین کی مدح بھی کی ہے۔ عرفانی قصائد لکھنے میں انہیں سنائی سے خاص شغف تھا۔
ابن یمین نے خراسان، گرگان اور ہرات کے سلاطین و امرا کی مدح میں قصائد لکھے۔ مشہور ہزال عبید زاکانی ابو اسحٰق انجو، سلطان اویس وغیرہ کا مداح تھا۔
سلمان ساوجی نے ایلخانی سلاطین، جلائری امرا اور آل مظفر کے حکمران شجاع کی مدح میں قصیدہ نویسی کی۔ عراقی سبک اور خراسانی سبک کے شاعروں نے اسے متاثر کیا۔(۳) عبدالرحمن جامی نے بھی قصائد لکھے مگر وہ انوری اور ظہیر کے تتبع میں تھے۔ محتشم کاشانی شاہ طہماسپ کے دربار سے منسلک تھا اس نے اس کے بلند پایہ قصائد لکھے۔ ایک وقت محتشم شاہ طہماسپ کی شان میں دو قصیدے لکھ کر اس کے دربار میں پہنچا۔ طہماسپ ان دنوں شیعہ علما کے اثر میں تھا اس نے کہا "بادشاہوں اور شہزادوں کی تعریف میں لکھے جانے والے قصیدے دروغ گوئی پر مبنی ہوتے ہیں۔ البتہ انبیاء اور اماموں کی ثنا مبالغے سے پاک ہوتی ہے" یہ سن کر وہ قصیدہ گوئی سے تائب ہوا اور مرثیہ نویسی کی جانب توجہ کی۔(۴)

فارسی شاعری کے اس دور میں صنف قصیدہ نے بہت سی منزلیں طے کیں۔ سبک عراقی نے اس دور میں اہمیت حاصل کی۔ قصائد میں عربی کے استعمال، صنائع لفظی کے برتاؤ، تصوف اور مذہبی شاعری کے مسائل وغیرہ نے رواج پایا۔ ہجو و ہزل گوئی نے فکری انحطاط کو مستحکم کیا۔ شاعروں نے معاوضوں اور صلوں کے حصول کے لیے قصیدے لکھے۔ بعض شاعروں نے پند و نصائح اور عارفانہ موضوعات کو اپنے قصیدوں میں جگہ دی۔ صنائع لفظی کے ساتھ ساتھ معنوی صنعتوں کو بھی موثر طریقے سے استعمال کیا گیا۔ مدح اور تشبیب کے حصوں میں اخلاقی، اجتماعی (سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی) مسائل نے جگہ پائی۔

---

(۳) اس کے دو اشعار ملاحظہ ہوں سے باد نوروز از کجا این بوی جان می آورد + جان من پی تا بکوی دلستان می آورد
سے سقی اللہ بلدۃ کصدغ الکواعب + شبی عنبرین خال و شکین ذوائب

(۴) براؤن بحوالہ ادبیات ایران ص ۹۶۹

فارسی قصیدہ کا مغلیہ دور

پس منظر۔ ہندوستان پر ظہیر الدین بابر کے حملے کے وقت دہلی، پنجاب، سندھ، جونپور، بہار، بنگال، گجرات، مالوہ، خاندیس، راجپوتانہ، کشمیر، اڑیسہ، گونڈوانہ اور دکن کی ریاستیں قائم تھیں۔ ہندوستان غیر متحد اور کمزور تھا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم کی۔ بابر کی رگوں میں ماں کی طرف سے چنگیزی اور باپ کی طرف سے تیموری خون گردش کر رہا تھا۔ یوں ترکی ایرانی روایات کا امتزاج ہندی مسلم تہذیب کو نئے امکان بخشنے لگا۔ ۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات پر ہمایوں تخت نشیں ہوا۔ اسے ۱۵۴۰ء میں سوری خاندان (شیر شاہ سوری) کے ہاتھوں شکست ہوتی ہے۔ وہ بھاگ کر ایران چلا جاتا ہے۔ ایرانی حکمران کی امداد سے ہمایوں ۱۵۵۵ء میں دوبارہ ہندوستانی سلطنت پر قابض ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک مغل بادشاہوں کا طویل سلسلہ ہندوستان کی حکمرانی پر فائز رہتا ہے۔ جلال الدین اکبر، نور الدین جہانگیر، شہاب الدین شاہجہاں اور محی الدین اورنگ زیب جیسے عظیم الشان مغل حکمرانوں نے مغلیہ سلطنت کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد ڈیڑھ سو برس کا عرصہ فی الاصل مغل سلطنت کے زوال کا عرصہ ہے۔ اس دوران میں قطب الدین شاہ عالم، بہادر شاہ اول، معز الدین جہاں دار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، نکوسیر، رفیع الدولہ، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور سراج الدین بہادر شاہ ثانی تخت نشیں ہوئے۔ مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کی مرکزیت مستحکم رہی۔ اس کے زوال کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی خود مختار عملداریوں کا عمل شروع ہوا۔

مغلیہ عروج کے دور میں درباری آداب و رسوم پر خصوصی توجہ صرف ہوئی۔ کورنش و تسلیم[۱]، دربار عام و دربار خاص، سجدۂ تعظیمی[۲]، شکوہ دربار، آرائش دربار کے معاملات اہمیت اختیار کر گئے۔ بقول صباح الدین عبدالرحمن "دربار کی فضا میں مکمل خاموشی رہتی، بادشاہ کا لباس آنکھوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔ اس کی دستار اور سرپیچ میں جواہرات جگمگاتے رہتے، امرا زرق برق پوشاک زیب تن کیے خاموش ہاتھ باندھے کھڑے رہتے، سب کی نگاہیں نیچی ہوتیں۔ نظر اٹھا کر بادشاہ کی طرف تاکنے کی اجازت نہ تھی۔ دربار گلیم (قالین)، حاجم، شطرنجی، بلوچی، حصیر، پرتگالی بانات، رومی و کاشانی، گجراتی زربفت و سنجاب، زرنگار اور مصور پردے سے آراستہ رہتا۔ عود، عنبر اور دوسری خوشبودار چیزوں سے دربار کی تمام فضا معطر رہتی"[۳] مختلف شاعروں کے قصیدوں میں شاہی شان و شکوہ کو ظاہر کرنے کے لئے اورنگ، چتر، سائبان اور کوکبہ کے الفاظ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ خاصے کے گھوڑوں اور شاہی ہاتھیوں کی آرائش و زینت کا تذکرہ تمام و خوش کیا ہے۔ تاجپوشی کی رسموں کا شکوہ بھی قابل دید ہوتا۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا، خطیب اپنی زبان سے القاب شاہی ادا کرتا، بڑے پیمانے پر سیم و زر لٹایا جاتا۔ امرا کو عہدے اور منصب تقسیم ہوتے، شاعر قصیدہ خوانی کرتے، رقص و سرود کی محفلیں جمتیں، تواضع اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جاتی۔ نجومی اور ہیئت داں ہر کام کے لئے نیک ساعت مقرر کرتے۔ نقار خانوں میں دمامہ، دہل، کرنا، سرنا، نفیر، سینگ اور سنج بجائے جاتے۔[۵] خلوت، عالیشان محلات تعمیر

---

(۱) آئینِ اکبری جلد اول آئین ۷۴ ص ۱۰۷ (۲) ایضاً (۳) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۱۶۷ (۴) ایضاً

کروائے۔ خوبصورت باغ بنوائے۔ شاہجہاں عمارت سازی میں دیگر مغلوں پر سبقت لے گیا۔ اس دور میں افغانوں، مغلوں اور راجپوتوں کے باہمی روابط بڑھے۔ رواداری اور آزاد خیالی کے رجحانات نے نئی تہذیبی روایات کو جنم دیا۔ فکری، علمی اور سماجی ماحول میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ہوئیں۔ مسلم تہذیب و ثقافت میں ہندو رسوم و رواج دخیل ہو گئے۔ ایک مخلوط معاشرے کا سلسلہ مستحکم ہوا۔ تاہم جہانگیر اور شاہجہاں نے کسی حد تک اس رجحان کی روک تھام کی۔ اورنگ زیب نے اسلامی اقدار کے احیاء پر زور دیا۔ مغل بادشاہ مصوری،(۱) موسیقی، خطاطی، تاریخ، فلسفہ، شاعری اور تعلیم و تدریس کے رسیا تھے۔ ان کے درباروں میں علماء، فضلا اور شعراء کی بڑی قدردانی تھی۔ فیضی، ابوالفضل، عبدالرحیم خانخاناں کی سطح کے وزراء، امراء کی موجودگی میں علم سے دامن کیسے بچایا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ایران میں صفوی خاندان شعرا اور ادبا کی سرپرستی میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا اس لئے فارسی زبان کے بڑے نامور شعرا، ادبا، علماء اور دانشوروں نے مغلیہ درباروں میں پناہ ڈھونڈی۔ بھگتی تحریک کے صلح کل کے رویے، ابن عربی اور عراقی کے وحدت الوجودی مسالک، اور روایات نے اپنے پنجے مضبوطی سے جمائے۔ اکبر کے دین الٰہی کے اثرات سے بھی مغلیہ ادوار کا ماحول محفوظ نہ رہا۔ حضرت مجدد الف ثانی اس کے خلاف علمی جہاد بھی کیا۔ مغلیہ دور میں تفسیر نویسی، تذکرہ نگاری، نجوم، رمل، جفر، فال، منطق، طب، علم الکلام اور جغرافیہ وغیرہ نے ترقی کی۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے زیر اثر سندھ، ملتان، پنجاب، دہلی، نواحِ بہار، بنگال، مالوہ، گجرات اور راجستھان میں ایک نئی زبان کے نقوش ابھرے۔ یہ زبان بعد میں اردو کہلائی۔ فارسی چونکہ حکمرانوں کی زبان تھی اس لئے فارسی اسالیب اور اصناف نے دکنی علاقوں میں پیدا ہونے والے اردو ادب اور بعد میں دلی اور لکھنؤ میں ہونے والی اردو شاعری اور ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

مغلوں ہی کے معاصر ایران میں صفوی حکومت قائم تھی جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ دو سو چالیس سال کے عرصے پر محیط یہ حکومت نادر شاہ کے ہاتھوں ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۸ء میں ختم ہوئی۔ اس دور میں بغداد سے دلی تک نادر شاہی یلغاروں نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ کریم خاں زند (۱۷۵۰ء تا ۱۷۷۹ء) نے افشاریوں کے خلاف بغاوت کی اور اس کے بعد چند برس ہی میں قاچاریوں نے زندیوں کا اقتدار بھی ختم کر دیا۔ ۱۷۷۹ء میں آغا محمد خان قاچار نے ایران کی سلطنت سنبھالی۔ یہ خاندان ڈیڑھ سو برس تک حکمران رہا۔ اس زمانے میں قاآنی جیسا قصیدہ نگار پیدا ہوا۔ عہد صفوی میں شیعیت ایران کا سرکاری مذہب بن گئی۔ تاریخ نویسی عروج کو پہنچی۔ فنون لطیفہ کو عروج ملا۔ مصور بہزاد صفوی دور کے آغاز تک زندہ تھا۔ میرک، سلطان محمد اور میر سید علی جیسے مصوروں نے طہماسپ کے عہد میں اپنے کمالات دکھائے۔ قالین بافی اور فن تعمیر بھی عروج کو پہنچے۔ اس دور میں عمدہ نثر لکھی گئی اور شاعری میں سبکِ ہندی کو فروغ ملا۔

---

(۱) اکبر کے دربار میں میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی جیسے مکتبِ بہزاد سے متاثر مصور تھے۔ مغل مصوری کا آغاز انہی کا مرہونِ منت ہے۔ جہانگیر کے عہد میں محمد شریف کی مصوری کی دھوم تھی اس نے مہابھارت کے فارسی ترجمے کو مصور کیا۔ رزم نامہ، بابر نامہ، دیوانِ حافظ، جامع التواریخ، داراب نامہ، بہارستانِ جامی، خمسۂ نظامی اور انوارِ سہیلی، داستانِ امیر حمزہ جیسی کتابیں اکبری دور میں مختلف مصوروں نے مصور کیں۔ صرف بابر نامہ کو ۴۹ ہندو مسلم مصوروں نے رنگینی بخشی۔ اس میں ۱۸۳ تصویریں ہیں۔ جہانگیر کے دور میں پھولوں، درختوں اور جانوروں کی ان گنت تصویریں بنائی گئیں۔ آغا رضا، [illegible]، ابوالحسن، منصور، بشن داس، منوہر وغیرہ جہانگیری دور کے مصور ہیں۔ شاہجہاں اور دارا شکوہ نے بھی اس فن کی سرپرستی کی۔ یہ مصور شاہانہ ماحول کو تصویروں کی صورت میں اسی طرح پیش کرتے تھے جیسے شاعر لفظوں میں۔ درباروں میں پیش ہونے والی موسیقی بھی شاہی تعریف و توصیف کا مظہر ہوتی تھی۔

مغل بادشاہ علوم وفنون اور شعر و ادب کے رسیا تھے۔ ان کے درباروں میں ہندی، سنسکرت (۱)، فارسی اور دیگر السنہ کے شاعروں کی قدر افزائی ہوتی۔ بابر اور ہمایوں نے (۲) شیخ جمالی جیسے قصیدہ نگاروں کی آؤ بھگت کی۔ اکبر کے درباری شعرا میں فیضی، عرفی جیسے عظیم شاعر موجود تھے۔ خواجہ حسین ہروی بھی اسی دور سے متعلق تھے۔ طالب آملی جہانگیر کا ملک الشعرا تھا۔ نظیری نے بھی اس کی شان میں قصیدہ لکھا۔ شاہجہان نے حاجی جان محمد قدسی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔ ابوطالب کلیم کو بھی اس عہدہ پر منصب عطا کیا۔ باقیا ناشی نے بھی شاہجہان کی شان میں قصیدہ لکھا۔ میر صیدی طہرانی بھی اس کا مادح تھا۔ یہ شعرا مختلف تقریبات اور جشنوں کے حوالے سے بادشاہوں، امیروں اور شہزادوں کے قصیدے لکھتے۔

• عرفی

عرفی شیرازی م ۱۵۹۱ء نے حکیم ابوالفتح، عبدالرحیم خانخاناں اور جلال الدین اکبر کی ستائش میں بہت سے قصائد لکھے۔ خیال بندی، زورِ کلام، انوکھی تراکیب کی ایجاد، رفعتِ خیال، الفاظ کے نئے معنوی استعمال اور فکر و فلسفہ کا شاعرانہ اظہار اس کے قصائد کے خاص وصف ہیں۔ منقبت اور نعت کے قصائد میں اس نے بھرپور شعری کمالات دکھائے ہیں۔ عرفی کے قصائد میں ہندی ثقافت اور ہندوستان میں پنپنے والی فارسی شاعری کی آواز گونجتی ہے۔ اس کے مشہور قصیدہ "بطور چیستاں در مدح شیخ بزم بادشاہ" کا یہ شعر ملاحظہ ہو

چوں عروسانِ ہند در دمِ رقص + از خمِ گیسوش چکد روغن
چوں شکر شبانِ ہندوستاں + چہرہ زرتار و چرب پیراہن

اسلامی، ہندی روایات اور مقامی مناظرِ فطرت اس کے قصائد میں موثر طور پر منعکس ہیں۔

بر سر مویش اگر باز شگافی بخرد + سومنا تیست کہ چیدہ ست در و لات و ہبل (۳)

عرفی کے کلام میں تفاخر کا انداز بھی ملتا ہے۔ وہ اپنے قصائد میں اعلانیہ تعلی کرتا ہے۔

• فیضی

فیضی م ۱۵۹۵ء کو امیر خسرو کے بعد فارسی زبان کا دوسرا بڑا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ ریاضی، طبیعات، نجوم، رمل، طب، علم الکلام، منطق اور علوم شعر و ادب پر اس کی مثالی دسترس تھی۔ اس کے قصائد میں جہاں اپنے عہد کی ہندی تہذیب کی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہاں ان فتوحات کا بھی تذکرہ ہے جو مغلیہ عہد کے عروج کا حصہ تھیں۔ فیضی نے اکبر کی مدح میں عمدہ قصائد لکھے۔ توحید، نعت، منقبت، تصوف اور فلسفہ کے موضوعات بھی اس کے قصائد کی زینت ہیں۔ شکر خدا کہ عشق بتاں است رہبرم + در ملت برہمی و در دین آذرم (۴)

• نظیری

نظیری نیشاپوری م ۱۶۱۲ء جلال الدین اکبر اور جہانگیر کا مادح تھا (۵)۔ اس نے اکبر کے شخصی کردار اور رعایا کے ساتھ اس کے سلوک کے موضوعات کو اپنے قصیدوں کا موضوع بنایا۔ اس کے قصائد سے شاہی دربار کا شکوہ، بادشاہ کی سیر و تفریح اور فنون سے دلچسپی، اکبری جنگوں کے حالات (تسخیر دکن اور فتح قلعہ اسیر) بادشاہ کے انداز جنگ اور بہت سے دیگر سیاسی و تہذیبی احوال سے آگاہی ہوتی ہے۔ عہد جہانگیر کے حوالے سے جہانگیر کے کردار اور عدل وغیرہ کی تفصیلیں بھی ہاتھ آتی ہیں۔ جہانگیر کے عہد کی صنعت گری پر بھی اس کے اشعار دستیاب ہیں۔ اس کے لامیہ، راشیہ، تائیہ اور یائیہ قصائد مذکورہ احوال کی تفصیلی تصویروں کے حامل ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں مغنیاتِ حرمش بہ زخمہ ناخن + زہمن سینہ کشا بند چشمہائے زلال

---

(۱) اکبر بیربل، سورج داس کی ہندی شاعری کو پسند کرتا تھا۔ علاوہ ازیں اور جگناتھ پنڈت راج جیسے شاعروں نے اکبر کی مدح میں اشعار لکھے۔ ممتاز محل بھی ہندو شعرا کی شاعری کو پسند کرتی تھی۔ ہری نرائن مصرا شاہجہان کے دربار کا سنسکرت شاعر تھا۔ سندر، چنتامنی اور راجا شمبھو داس اس کے دربار کے ہندی شعرا تھے
(۲) جنوبی، بدخشانی، ملا حیرتی، نادری سمرقندی، مفارعی ہراتی، طاہر دکنی اور کاہی کابلی وغیرہ اس کی صحبت میں رہتے تھے۔
(۳) قصائد عرفی
(۴) کلیاتِ فیضی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ع ۲/۷ ص ۲۱۴ پھلواری
(۵) شعر العجم جلد سوم ص ۱۰۴ تا ۱۰۹

برتخت ہند والئی ہندوستاں نشست + جہان جہاں بمردم چشم جہاں نشست
ترکیب کہن تازہ شد آئین زماں را + نو داد نسق شاہ جہانگیر جہاں را

• ظہوری

ظہوری ترشیزی م ۱۶۱۶ء ابراہیم عادل شاہ کے دربار سے منسلک تھا اس دکنی بادشاہ اور اس کے امرا کے قصائد لکھنے کے علاوہ وہ مغل بادشاہ اکبر اور اس کے امرا کی ستائش میں قصائد لکھ کر بھجوایا کرتا تھا۔ ظہوری کے قصائد رنگینی، اخلاق تہذیب اور تازہ گوئی کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔ مضمون بافی اور خیال تراشی اور ایہام اور دور از کار استعاروں کے استعمال سے اس نے اپنی شاعری کو محفوظ رکھا۔ اس کے قصائد سے اس دور کے فکری ماحول اور تہذیب و ثقافت کی مختلف جہتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان پر موسیقی، مجلسی ترکیب اور کنایہ آفرینی کے اثرات ہیں۔

• طالب

طالب آملی [۱۶۲۵ اور ۱۶۲۹ء کے درمیان وفات] ہندوستان آنے سے قبل مرو اور مازندران کے حاکموں کا مادح تھا۔ وہ پرگو شاعر تھا جہانگیر تک رسائی سے قبل اسے جہانگیر کے کئی امرا کی مدح بھی کرنی پڑی[۲]۔ جہانگیر نے طالب آملی کو اپنی تخت نشینی کی چودھویں سالگرہ پر ملک الشعرا کا خطاب دیا[۳]۔ طالب سبک ہندی کی روایت کا قصیدہ نگار ہے۔ استعارے کا عمومی استعمال، کنایے کی جانب خصوصی توجہ تراکیب کی تازگی، فکری عمق اور اپنے دور کی ترجمانی وغیرہ کی خوبیوں نے اس کے قصائد کو اہم اور جاندار بنایا ہے۔ اس کے قصائد کی بدولت اس پر انعام و اکرام کی جو بارشیں ہوئیں بیشتر ان کی شہادت ہے

؎ در آب ہند بہ بیں رتبہ سخاوت سخن + کہ منبع سخن و معدن سخا اینجا است

جہانگیر کے علاوہ حسن جمال پر گیا اس کا تخیلی بیان اس کے قصائد کی زینت ہے

؎ چوں موج زد سیاہ شبستہ بر زبدا + ملک دکن بر اہل دکن گشت تمکدہ

وہ قصائد لکھنے میں قلم برداشتہ تھا ؎ گواہ این دو سہ حسن بہ قصیدہ بس است + کہ بافت از سر شب تا سپیدہ دم اتمام

اسکا یہ مطلع ملاحظہ ہو ؎ چو شہسوار مرا چشم بر شکار افتاد + بزخم تیر نگہ صید بے شمار افتاد

• قدسی

حاجی محمد جان قدسی [م ۱۶۴۶ء] بلند پایہ قصیدہ نگار تھا۔ مشہد میں اس نے سات قصائد امام رضا رض کی شان میں لکھے۔ ہندوستان آ کر وہ شاہجہان کے دربار سے وابستہ ہوا۔ یہاں اس نے مختلف مواقع پر عمدہ قصائد پیش کیے سادہ اور رواں قصیدے کہنے میں ماہر تھا اس کے ہاں مبالغہ اور حسن تعلیل کا عمدہ استعمال ہے

؎ اے علم بر خود ببال از شادی و بکشا زباں + در ثنائے قبلۂ اقبال خاقان زماں

• کلیم

ابوطالب کلیم م ۱۶۵۱ء شاہجہان کے دربار میں ملک الشعرا کے منصب پر فائز تھا۔ فتح پور پر شاہجہاں کی فتح، ججھار سنگھ بندیلہ کی بغاوت اور قحط دکن کی تفصیلات اس کے قصائد میں موجود ہیں۔ اس نے تخت طاؤس کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ لکھا۔ شاہجہان کے محل کی تعمیر اور جشن وزن پر اس کے متعدد قصائد ملتے ہیں۔ باغ جہاں آرا پر اس کے قصیدے میں بہت سے مقامی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ سبک ہندی کا پیرو کار ہوتے ہوئے بھی وہ دقائق اور ایہام کی پگڈنڈیوں سے بچ کر چلتا تھا۔ اس کے قصائد کی تشبیب میں مقامی مناظر کا مؤثر بیان ہے موسم کی گرمی، پہاڑوں کی پیچ داریاں، سفر کی سختیاں وغیرہ کے بیان میں اس کی خیال مضمون آفرینی قابل ستائش ہے

؎ ز نازکی نتواں غنچہ را ز گلبن چید + گل حباب نیارد کسے بدامان کرد
چراغ روز تگو بہ فروغ ہی باشد + بہ بیں کہ لالہ درو دشت را فروزاں کرد

؎ ① ہمہ عمر باشد کہ فارغ از جانیم + زندۂ التفات جانانیم (ظہوری) قصائد ظہوری، مخطوطہ نمبر ۲۵۱۰ پنجاب یونیورسٹی لاہور از ورق ۳ تا ۱۵۵

② تذکرہ طالب آملی ص ۲ از خواجہ عبد الرشید ③ تزک جہانگیری، ص ۵۹۰، مجلس ترقی ادب لاہور ④ کلیات اشعار ملک الشعرا طالب آملی مرتبہ طاہر شہاب، ص ۳۵۱ تہران ۱۳۴۶ ہجری شمسی

⑤ کلیات قدسی، مخطوطہ نمبر ۱۵۶۷ پنجاب یونیورسٹی ورق ۳۹ پشت ⑥ دیوان ابوطالب کلیم مرتبہ پرتو بیضائی ص ۲۲ تہران ۱۳۳۶ ہجری شمسی

• صائب

مرزا صائب تبریزی م ۱۶۷۷ء ابتدا میں کابل کے تیموری امیر ظفر خاں سبزواری کا مداح بنا۔[1] بعد میں شاہجہان کے دربار میں پہنچا اور پھر ایران واپس جاکر صفوی بادشاہ عباس شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعرا بنا۔ اس نے متعدد قصائد لکھے ہیں۔ طالب آملی ہی کی طرح وہ ایک پر گو شاعر تھا۔ وہ اپنی قادر الکلامی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔ یہ قصیدہ اس کے قیام دکن [برہان پور] کی یادگار ہے

بہ از رحیت کہ عرق و لولی و سنجر + نبیند جمع بدار الحیار برہان پور

کہ تو تیہ سخن و لطف طبع می دیدند + نمی شدند بہ طبع بلند خود مغرور [کلیات صائب ص ۶۹۸، نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۶]

• بیدل

عبدالقادر بیدل م ۱۷۲۰ء۔ اگرچہ شاہزادہ اعظم شاہ کے دربار سے منسلک تھے تاہم کہا جاتا ہے کہ جب اس نے اپنی شان میں قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تو وہ مستعفی ہو کر گوشہ نشیں ہو گئے۔ کلیات بیدل[2] میں نعت و منقبت کے قصائد کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ اور فکری قصائد بھی شامل ہیں۔ رمز حیرت، مداح فطرت، محیط بے کراں، چراغان جہلی، خیمہ بیدل، شعلۂ یاقوت بار اور در صفت چشم کے ناموں سے عمدہ قصائد اس صنف میں ان کی مہارت کا ثبوت ہیں۔ یہی نہیں محمد اعظم شاہ کی مدح میں غزل کے مطلع کا حامل قصیدہ بھی انہوں نے لکھا ہے

حبذا خورشید قدرت منظر اوج یقین + حکم فرمائے سلاطین متکائی عالمین [کلیات بیدل جلد دوم ص ۱۰۹]

بیدل کے کلیات میں در مدح شاہ و تاریخ تولد شہزادہ کے عنوان سے بھی اشعار موجود ہیں

حمد خدا کہ از چمن شاہ کامراں + گل کرد نشہ طرب عیش جاوداں [ایضاً، ص ۱۱۰]

شکر اللہ کے خیر مقدم میں غزل کے مطلع کا حامل قصیدہ بھی ان کی یادگار ہے

بیار مژدہ دیدار می خواہد گلفشانی + خداوندا ز مشت خاک من آئینہ رو یانی [ایضاً، ص ۱۱۱]

خان دوراں اور شاکر خاں کی مدح میں بھی ان کے قصائد ان کے دیوان میں مندرج ہیں

فلک عمریست می نازد بدور شوکت و شانش + بیا تا وا نمایم اقتدار خان دورانش [ایضاً ص ۱۱۲]

الٰہی تا ابد دل کہ عمر رفتہ مراد دریافتم + رنگ بر روئے آب در حوصلہ بساغر یافتم [ایضاً ص ۱۱۴]

ان قصائد کی موجودگی میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ بیدل دنیاوی ممدوحوں کی شان میں قصائد نہیں لکھتے تھے۔ بیدل کے قصائد فکر و فلسفہ کے موضوعات سے مزین ہیں۔ ان کی معاصر علوم و فنون سے واقفیت نے ان میں علمی شان پیدا کردی ہے

مغلیہ دور کے دیگر قصیدہ نگاروں میں مولانا قاسم کاہی م ۱۵۸۰ء[3] مظہری کاشمیری م ۱۶۱۷ء [ہرات کے سلطان ابراہیم اور شاہ اسمٰعیل، اکبر، شہزادہ سلیم[4] حکیم ابوالفتح اور خانخاناں کا مداح تھا] سعیدائے گیلانی [۱۶۳۷ / ۱۶۳۸ء میں زندہ تھا جہانگیر کا مداح۔ ایک قصیدہ تخت طاؤس پر لکھا جس کے ہر مصرعہ سے تخت طاؤس کی تاریخ برآمد ہوتی تھی] ابوالبرکات منیری لاہوری م ۱۶۴۱ء [شاہجہان کا درباری] چندر بھان لاہوری م ۱۶۶۲ء[5] سلطان شاہ کمالی [م ۱۶۶۸ء، اورنگ زیب کا مداح]۔ غنی کاشمیری [م ۱۶۶۸ء] سیادت لاہوری [م ۱۶۶۸ء] عاقل خاں رازی [م ۱۶۹۶ء] ناصر علی سرہندی [م ۱۶۹۷ء] اور نعمت خان عالی [م ۱۷۰۹ء] کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شیخ عبدالحق [م ۱۵۵۳ء] نے شیر شاہ سوری کے جانشین اسلام شاہ کی شان میں عمدہ قصائد لکھے[6]۔ مغلیہ دور کے اواخر کے ہندوستان میں علی حزیں م ۱۷۶۶ء سراج الدین علی خان آرزو، میر قمر الدین منت اور مرزا غالب کے فارسی قصائد توجہ طلب ہیں [غالب نے انگریز افسروں اور حکمرانوں کی شان میں بھی عمدہ فارسی قصیدے لکھے]۔ ان کے علاوہ غلام امام شہید، فخر الدین خیالی، لعل شاہ جگر کاظمی اور حکیم فیروز طغرائی کے فارسی قصائد اہم ہیں

---

(1) شعر العجم سوم ص ۱۵۳ (2) کلیات بیدل جلد دوم دو بنی مطبع سرطان ۱۳۴۲ ہجری شمسی
(3) ہمایوں اور اکبر کے دربار سے وابستہ تھے عروض، موسیقی اور بدیع وغیرہ کے ماہر تھے صنعت لزوم مالا یلزم کا عمدہ استعمال کرتے تھے ان کا ایک شعر یہ ہے تا بہ فیلان فیل دیدم داستان خویش را + حرف راہ فیل کردم نقد جان خویش را [اس قصیدے کے ہر شعر میں فیل اور اس کے لوازم کا تذکرہ ہے
(4) تزک جہانگیری ص ۲۰۹ (5) ایضاً (6) کلیات چندر بھان لاہوری (7) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ... خواجہ نعمت اللہ ہروی ص ۲۶۷ - ۲۸۳

قاچاری دور کے فارسی قصیدہ نگار شعرا میں ہاتف اصفہانی م ۱۷۸۳ء، سید محمد سحاب م ۱۷۹۷ء، مجمر اصفہانی م ۱۸۱۰ء، فتح علی صبا م ۱۸۲۲ء، نشاط م ۱۸۲۸ء، قائم مقام م ۱۸۳۵ء، وصال شیرازی م ۱۸۴۶ء، قاآنی م ۱۸۵۳ء/۱۸۵۴ء، فروغی م ۱۸۵۷ء اور سروش اصفہانی م ۱۸۶۸ء جیسے اہم نام ہیں۔ ان میں قاآنی ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی قصیدہ نگاری کا شہرہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے اردو شعرا کے درمیان تھا۔ قاآنی شیرازی نے قصیدہ نگاری میں بڑی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا۔ ابو مظفر غازی، محمد شاہ غازی، ناصر الدین شاہ اور آن گنت دوسرے اس کے ممدوح تھے۔ آمد نوروز کی نقش کشی، بہار کی ستائش اور بادشاہ کی تعریف وغیرہ میں وہ مہارت تامہ رکھتا تھا۔ انوری، خاقانی اور منوچہری سے متاثر تھا۔ اس کے دیوان میں ۳۴۰ قصائد موجود ہیں ان میں منقبت کے قصائد بھی شامل ہیں۔ قاآنی قدرتی تشبیہات کے استعمال کا رسیا تھا۔ پرانے مضمون میں اپنے اسلوب کی ندرت اور انوکھے پن سے زندگی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ شاعری (قصیدے کی) میں مبالغے کا استعمال غلو کی حد تک پہنچ گیا تھا قاآنی نے اس سے پرہیز کی۔ قاآنی کے قصائد میں مترنم بحریں اور خیالات کی روانی مل کر سحر کا سا سماں پیدا کرتے ہیں۔ اپنے قصائد میں اس نے جا بجا کہیں بھی واقعات نگاری کی بے جزئیات کو فراموش نہیں کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎ ماہ رمضان آمد اے ترک سمن بر + برخیز و مرا سبحہ و سجادہ بیاور [دیوان قاآنی شیرازی ص ۳۲۱]

؎ آمد بہ برم دوش یکی سادہ پسر بر + وز مشک فروہشتہ دو گیسو بہ کمر بر [ص ۴۲۴]

؎ بگردون تیرہ ابری باد او ل برشد از دریا + جواہر ریز و گوہر خیز و گوہر بیز و گوہر زا [ص ۳]

؎ یکے بر کف نہد لالہ کہ ترکیب قدح دارد + یکی بر گل کند تحسیں کہ سبز و بوئے نگار آید [ص ۱۹۵]

؎ ساقی بالا زند اندر شمر آب گلرنگ + ہمچو بلقیس کہ بر صرح سلیمان گزرد ① [ص ۱۲۶]

مغلیہ دور کا فارسی قصیدہ عقلیت اور جدت پسندی کے امتزاج کا علمبردار ہے۔ اس میں تخیلی انداز سے بات کہنے کا ڈھنگ بکثرت نظر آتا ہے۔ مغل بادشاہ اور امراء شاعروں کی سرپرستی بھی کرتے تھے اور سخن فہم بھی تھے۔ صفوی بادشاہوں نے دنیاوی موضوعات کے رسیا شاعروں کو پسند نہیں کیا۔ ایرانی شعرا مغل درباروں میں آگئے۔ محمد قلی سلیم نے تحصیل کمال کے لئے ہندوستان کے سفر کو ضروری قرار دیا۔ طالب آملی نے اس علاقے کو منبع سخن اور معدن سخا ٹھہرایا ہے۔ ابو طالب کلیم بھی اپنے آپ کو اسیر کشور ہند جانتے تھے۔ مغل بادشاہوں کے زیر سایہ فارسی قصیدہ نے ترقی کی کئی منزلیں طے کیں۔ عجمی شاعرانہ روایات کا ملاپ جب مقامی تہذیب اور انداز نظر سے ہوا تو نئے اسلوبی ذائقے حاصل ہوئے۔ مغلیہ دور کے عروج میں لکھے گئے قصائد میں مدحیہ حصوں میں بھی حقیقی اخلاص و صداقت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس دور کے قصیدہ نگاروں نے قصیدے کی روایتی ہیئت اور ساخت کو برقرار رکھا اوزان و بحور کے مروجہ سانچوں کو قبول کیا۔ عروج پر پہنچے ہوئے مغل بادشاہوں میں سے اورنگ زیب نے اس صنف پر کوئی توجہ نہ دی جس کے نتیجے میں اس صنف کے لکھنے والوں کا زور ٹوٹا۔ اورنگ زیب کے جانشین نا اہلی کا شکار رہے اور سنگین حالات میں گھبرا رہنے کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ کر سکے۔

مغلیہ عہد کے قصیدہ نگاروں میں بعض کی جدت طراز طبع نے اپنی تشبیب میں فکری اور صوفیانہ معاملات کا اظہار پر مائل کیا۔ علاوہ ازیں ان کے قصائد عالمانہ تبحر کا اثاثہ لیے ہوئے ہیں۔ اس دور میں سبک ہندی کو بہت فروغ ملا۔ دقیق مضامین، انوکھے شاعرانہ

① دیوان قاآنی شیرازی با تصحیح و مقدمہ بقلم محمد جعفر محجوب۔ انتشارات امیر کبیر ۱۳۳۶ ہجری شمسی

تخیلات کو سادہ اور عمومی الفاظ میں استعمال کرنا اور پیچیدہ کنایوں اور استعاروں کی تخلیق اس سبک کا خاصہ تھا۔ عرفی، فیضی، صائب اور کلیم نے اس سبک میں نام پیدا کیا۔ سبک ہندی فی الاصل قدیم ایرانی شعرا کی ساختہ سبک ہی کی بازگشت تھی۔ اس میں متقدمین شعرائے فارسی کے اسالیب کو نئی اختراعات کے ساتھ رواج بخشا گیا۔ معنی آفرینی، اغراق اور پیچ در پیچ خیالات کا اظہار کرنے کے علاوہ سبک ہندی کے شعرا نے لطیف، نازک اور نکتہ رس خیالات کے بیان پر توجہ دی۔ سبک ہندی میں شاعری آسان نہیں تھی۔ جگر خون کرنا پڑتا تھا کیونکہ غور و فکر کے مراحل سے گزر کر مناسب اور موزوں الفاظ کی تلاش سے عہدہ برآ ہونا پڑتا تھا۔ اس سبک میں مضامین کی تکرار اور پر تکلف اظہار کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ سبک ہندی کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ فارسی ادب پر ترکی انداز فکر کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس میں الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات فارسی کے تھے لیکن انداز نظر ترکی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے لیکن ترکی مزاج پر ایرانی اثرات کی گواہی تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہے چنانچہ خیال بندی اور نزاکت آفرینی دونوں علاقوں کی تہذیبوں ہی کا حصہ ہے۔ بابا فغانی شیرازی کا اسلوب اسی نوعیت کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اس سبک کا موجد سمجھا گیا ہے تاہم اس کی نمایاں صورتیں ہمیں مغلیہ عہد کے ہندوستان کے فارسی گو قصیدہ نگار شعرا کے ہاں نظر آتی ہیں۔ خیال بندی، تجسیم نگاری، تمثیلی انداز اور شاعرانہ تعلّی کی نسبت اسی سبک سے ہے۔(۱) اس لحاظ سے اردو قصیدہ پر فارسی قصیدہ کی تقلید میں عربی، ایرانی اور ترکی اثرات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے

فارسی قصیدہ نگاری کے حوالے سے رضازادہ شفق کا یہ اقتباس قابلِ غور ہے

> "اس میں شک نہیں کہ بہت سے فارسی قصیدوں میں طول کلام، عبارت پردازی، قافیہ پیمائی اور اخلاقی برائیاں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود قصیدے میں بہت سی بنیادی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں (۱) قصیدہ گو شاعروں نے اونچے درجے حاصل کر کے سلاطین سے انعام پائے اور لوگوں سے داد حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت سے کام لیا اور فارسی میں بہترین ترکیبیں ایجاد اور موزوں ترین الفاظ استعمال کیے اور انہیں زندہ کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی زبان کی بقا کے لئے بہت بڑی خدمت سرانجام دی (۲) تملق گوئی کو مذموم جانتے ہوئے بھی انہوں نے نہایت اچھوتے مضامین، نہایت نازک تشبیہیں، ماہرانہ اور استادانہ تخیلات مدحیہ قصیدوں میں پیش کیے ہیں۔ یہ چیزیں ایرانی قوم کی تیز فکر، بلند تخیل اور لطیف قریحہ گوئی پر دلالت کرتی ہیں اور ہر قوم ایسے لطیف معانی پیش نہیں کر سکتی (۳) فارسی قصیدوں میں نہایت بلند پایہ اخلاقی مضامین درج کیے گئے ہیں (۴) قصیدوں میں ضمنی طور پر بہت سے تاریخی مطالب، عادات اور حکایتیں آتی ہیں۔ ان سے پچھلے زمانے کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے (۵) ایرانی امثال اور حکیمانہ اقوال ان میں جمع ہو کر محفوظ ہو گئے ہیں (۶) قصیدوں کی ابتدا میں وہ بے نظیر تخیل درج ہے جو ایرانی استادوں کے لطیف احساسات اور قدرتِ کلام کا بین ثبوت ہے (۷) بادشاہوں کی مدح و ستائش کے ضمن میں جو پند و نصیحت کی گئی ہے۔ وہ بڑے دلکش اور شیریں انداز میں کی گئی ہے۔ اس

---

(۱) جہاں تک ہمارے شاعروں کا تعلق ہے انہوں نے سبک ہندی کا راستہ چھوڑ کر قدیم ایرانی قصیدہ نگاروں فرخی اور منوچہری کی تقلید کی

پراثر کلام نے سخت گیر اور ظالم مغلول بادشاہوں کے اخلاق کی سختی کو یکسر بدل دیا۔ اس لحاظ سے یہ
قصیدے بہت زیادہ قابل قدر اور قابلِ تعریف ہیں (۸) ایسے قصیدے جو بالکل مدحیہ اور اخلاقی ہیں
وہ چاپلوسی اور خوشامد سے یکسر خالی ہیں۔ ان میں علمی، حکیمانہ مطالب یا شاعر نے خود اپنے
حالات یا اپنے افکار درج کیے ہیں۔ ایسے قصیدوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔(۹)

---

(۹) تاریخ ادبیات ایران ص ۵۲۵ - ۵۲۶ [ترجمہ]

باب سوم

اردو قصیدہ

آغاز سے ۱۷۵۷ تک

فصل اول: ابتدائیہ [فارسی قصیدہ بطور ماڈل]
اردو قصیدہ کی چند ابتدائی صورتیں

فصل دوم: جنوبی ہند کا ادبی و ثقافتی تناظر

فصل سوم: جنوبی ہند میں اردو قصیدہ
[اجمالی منظر]

فصل چہارم چند خصوصی مطالعے

فصل اول ابتدائیہ

فارسی قصیدہ بطور ماڈل

ہندوستان میں اردو قصیدہ کا تقلیدی نمونہ فارسی قصیدہ ہی تھا۔ اردو قصیدے کے آغاز کے وقت فارسی قصیدہ موضوعات کے تنوع اور محاسن شعری کے استعمال کے اعتبار سے اپنے عروج پر تھا۔ علم دوست، فن شناس، سخن پرور جہانگیری اور جہانبانی کرنے والے بادشاہ خود جس شان و شوکت سے زندگی بسر کر رہے تھے اپنی ذات اور زندگی سے متعلق ہر چیز کو ویسا ہی معیاری دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے قلعے، محل، باغات، مساجد، مقبرے، تخت و تاج، دربار، درباری، امراء، وزراء، لشکر، ہاتھی، گھوڑے اور تلواریں ہر شے آراستگی اور پیراستگی کی حامل تھی۔ موسیقی، مصوری، رقص، اور علوم و فنون کے رسیا شمالی اور جنوبی ہند کے خود مختار حکمران خیال کی پہیلی سمتی ہوتی، بصری اور فکری بستیوں کی آئینہ بندیوں سے خوش ہوتے تھے۔ ہر علم و فن اور روزمرہ زندگی میں شکوہ، طنطنہ اور بالیدگی انہیں مرغوب تھی۔ وہ نازک مزاج بھی ہوا کرتے تھے اور نزاکت فہم بھی۔ فنون لطیفہ اور علم و ادب کی فکری اور فنی باریکیوں سے انہیں خاص شغف تھا۔ ان کے لیے شاعری شاعر کے زور بیان کا امتحان تھی۔ یہ اور بات ہے کہ شاعروں کی قصیدہ گوئی سے ان کی انا کو بھی تسکین ملتی تھی۔ اور درباروں میں ان کی مدح پر داد و تحسین کا غلغلہ بھی بلند ہوتا تھا۔ قصیدہ نگار شاہی معماروں، موسیقاروں اور مصوروں ہی کی مانند اپنے فن میں باریکیاں، نزاکتیں، حسن کاریاں، رنگینیاں اور نقش و نگار پیدا کرتے تھے۔ وہ اپنے ذہن کے سوتوں کی شعاعوں سے شاعری کے چمن کے ارد گرد خیالات کی بہتی ندی کو "خط گلزار کے صفحے پر طلائی جدول" بنا دیتے تھے صنائع لفظی اور معنوی ان کے قصائد کو بادشاہوں کے گلے میں لٹکتی خالص موتیوں کی مالا بنا دیتے تھے۔ تکرار، تجنیس، اشتقاق، قطار البعیر، رد العجز علی صدر، توشیع، سیاق الاعداد، طباق، ایہام، مراعاۃ النظیر، سوال و جواب، سجع، ترصیع، لزوم مالایلزم، فوق النقاط، مہملہ، تضمین، ذو لسانین، تنسیق الصفات، تنسیق الاعداد، تاریخ، ابداع، ذو القوافی، منقوطہ، غیر منقوطہ، تلمیح، تجرید، لف و نشر، جمع، تفریق، حسن تعلیل، تقسیم، مبالغہ، ایراد المثل اور اسی نوع کی اور بہت صنعتوں کے استعمال سے فارسی قصائد نگار خانے، آئینہ خانے اور آراستہ و پیراستہ باغات معلوم ہوتے تھے۔ اسی کو کہنے والوں نے لفظی بازیگری کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ دروغ پردازی اور بعضوں پر بھی محمول کیا ہے۔ ان اعتراضات کا جواب پہلے باب میں دیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ مدحیہ قصائد کو ان کی نزاکتوں اور شاعرانہ خوبیوں کے حوالے سے پرکھا جائے گا تو زیادہ لطف ملے گا۔ بعضوں اور دروغ پردازی کا الزام درباری مورخوں اور تخیل پرست شاعروں پر بھی لگایا جا سکتا ہے

جہاں تک مذہبی قصائد کا معاملہ تھا فارسی شاعروں نے ان میں اپنے عقائد کا خلوص سے اظہار کیا ہے۔ ان کا محرک دنیاوی زر و مال کی حصولی نہیں تھا۔ ان میں شاعروں نے اپنے مذہبی ضمیر کی صداقتوں کو سمویا ہے۔ تخیل کی جولانیوں سے یہ قصائد عاری نہیں تھے۔ اردو قصیدہ سے قبل ہندوستان میں لکھے جانے والے فارسی قصائد میں مقامی ثقافتی زندگی کی جزئیات کے ساتھ ساتھ مسلم تہذیبی ماحول (عربی، ایرانی اور ترکی اثرات کے حوالے سے) کی تصویریں بھی ملتی ہیں۔ زندگی، ماحول، مسائل اور حادثات کا بیان بھی نظر آتا

ہے۔ شاہی فتوحات، زلازل، قتل و غارتگری، تعمیرات کی تعریف، شادی، سہرا بندی اور جلوس شاہی وغیرہ کے حوالے سے اَن گنت قصائد لکھے گئے۔ فارسی قصیدوں کا تہذیبی تناظر خاصا وسیع ہے۔ ان میں مذہب، رہن سہن، جغرافیہ، زبان، رسوم و رواج عیدین، نوروز، مہرگان، عید غدیر، محرم اور رمضان وغیرہ کے معاملات منعکس ہوئے ہیں۔ کھیل تماشے اور سیر و شکار وغیرہ کے سلسلے بھی ان میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ قدیم زرتشتی عقائد سے لے کر بابی اور بہائی عقائد تک متنوع مذہبی عقائد فارسی قصائد کا حصہ ہیں۔ ان میں ہر دور کے لباس، رہائش، خوراک، عہدے، مراتب اور طبقے وغیرہ کا سراغ دستیاب ہے۔ خراسان سے لے کر دلی تک اور دلی سے دکن تک ہر علاقے کے جداگانہ ماحول، آب و ہوا اور خارجی مناظر کو شاعروں نے اپنے قصائد میں منتقل کیا ہے۔ بعض قصائد سیاسی پند و نصائح اور تبلیغی استفادے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ فارسی قصیدے میں رعایا اور بادشاہ کے ربانی تعلق ہی کو معیار ٹھہرایا گیا۔ ظل اللہ، ظل الٰہی، عالم پناہ، فریدوں فر، خداوند دوراں، ولی مطلق وغیرہ کے ناموں سے بادشاہ کو یاد کرنا قدیم ایرانی تہذیب کے اثرات ہی کا نتیجہ ہے۔ اردو قصیدہ کو فارسی قصیدہ کا یہی سرمایہ منتقل ہوا۔ اردو شاعروں نے اسے اپنا تقلیدی معیار بنایا۔ لیکن شومئ قسمت سے اردو قصیدہ نگاروں کے دنیاوی ممدوح فارسی قصیدے کے ممدوحین کے مقابلے میں کم حیثیت اور کم مرتبہ ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ تر بادشاہی عہد زوال سے متعلق تھے۔ ابتدائی دکنی قصیدے کے ممدوحین سلجوقی، غزنوی، غوری اور مغلیہ عروج کے زمانوں کے ممدوحین کے مقابلے میں انتہائی کم سطح کے دکھائی دیتے ہیں۔ شمالی ہند میں اردو قصیدہ اس دور میں پروان چڑھا جب مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اردو شاعروں کے پاس ممدوحین کی تعریف کرنے کے لئے ان کے حقیقی کارنامے نہ ہونے کے برابر تھے۔ چنانچہ وہ قصیدے کے روایتی شکوہ کو برقرار رکھنے کے لئے قلعے میں بادشاہوں کے رہن سہن، آداب و رسومات، ساز و سامان اور جنگوں میں استعمال ہونے والی سواریوں اور ہتھیاروں کو موضوعِ مدح بناتے تھے۔ البتہ مذہبی اردو قصائد کا معاملہ ذرا الگ ہے۔ ان میں خلوص، صداقت اور جوش و جذبہ کے ساتھ مذہبی عقیدت اور عقائد کا اظہار ہوا ہے۔

جب دکن میں اردو قصیدہ کا آغاز ہوا تو وہاں کے حکمران نہ تو وسیع سلطنت رکھتے تھے اور نہ ہی یہ استطاعت کہ جہانگیری و جہاں بانی کریں۔ وہ اپنی سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لئے دفاعی جنگیں کرنے پر مجبور تھے۔ ان کا یہ سلسلہ بھی اورنگ زیب کی فتح دکن کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس سارے عرصے میں نہ تو اردو زبان میں اتنی صلاحیت پیدا ہوئی تھی کہ وہ قصیدے کی کسی رفیع الشان روایت کو جنم دے سکتی اور نہ ہی ممدوح ایسی شان و شوکت اور عظمت کے حامل تھے جن کی وجہ سے مدح سرائی صداقت کی بنیاد پر استوار ہوتی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا اور پھر پچاس برس بھی نہ گزرے تھے کہ فرنگی ہندوستان کے اقتدار میں دخیل ہونے لگے اور ۱۸۵۷ء میں اس پر مکمل طور پر قابض ہو گئے۔ انگریز فاتحین کے لئے جو قصیدے لکھے گئے ان کا محرک وقتی مادی احتیاجات تھیں۔ انگریزی دور میں ریاستی نوابوں نے اپنی الگ منڈلیاں جما رکھی تھیں وہاں قصیدہ نویسی کا بازار زیادہ گرم ہوا۔ لکھنؤ کے نوابوں نے بھی اردو قصیدہ کی نشو و ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاہم ہمیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ اردو قصائد خصوصاً مدحیہ قصائد کے سارے ذخیرے میں وہ جان نہیں ہے کہ جس کی بدولت ہم اسے فارسی کے مقابلے میں رفیع الشان قرار دے سکیں۔ آئندہ صفحات میں ہم اردو قصیدے کا عہد بہ عہد ارتقائی جائزہ لیں گے

اردو قصیدہ کی چند ابتدائی صورتیں

اردو قصیدہ کی مکمل ہیئت کے رواج سے قبل ہمیں مدح کی ان صورتوں کا اجمالی جائزہ بھی لینا ہے جو اس زبان کے شمال اور جنوب میں مکمل طور پر رواج پانے سے قبل موجود تھیں۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ وسط ہند میں راجہ گنڈا نے قنوج کے راجہ کے ساتھ مل کر سلطان محمود غزنوی کی فوجی یلغار رد کرنے کی کوشش کی۔ سلطان اس کی مزاحمانہ کارروائی سے برہم ہوا۔ چنانچہ راجہ گنڈا نے ہندی میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا تاکہ سلطان اس کی خطا بخش دے[1]۔ ہندی یا ہندوی اس زبان کا نام تھا جو شمالی ہند میں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اردو کا روپ اختیار کر گئی۔ راجہ گنڈا کے مدحیہ قصیدے کی صورت و ہیئت کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں۔ شمالی ہند ہی میں مسعود سعد سلمان نے ہندی دیوان مرتب کیا تھا۔ یہ دیوان دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خیال اغلب ہے کہ جس طرح انہوں نے عربی اور فارسی میں قصائد لکھے ہیں۔ ہندوی میں بھی ضرور مدحیہ اشعار کہے ہوں گے۔ فریدالدین گنج شکر کے دوہوں میں ہمیں حمدیہ اور نعتیہ موضوعات دستیاب ہیں[2]۔ امیر خسرو نے ہندوی زبان میں نظام الدین اولیا کی مدح میں اشعار لکھے ہیں[3]۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کا زمانہ اٹھارہویں صدی کے ربع اول و دوم کا ہے۔ اس سے قبل دکن میں اردو قصیدے کی روایت مستحکم ہو چکی تھی۔ تاہم یہاں شمالی ہند اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز سے قبل مدح کی چند صورتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مولانا جمالی کے ہم عصر حکیم یوسف یعنی یوسف بن محمد یوسف سکندر، ابراہیم لودھی اور ہمایوں کے عہد میں موجود تھے۔ ان کی مشہور کتاب ریاض الادویہ طب کی مستند کتاب ہے۔ منظومہ در اسم ادویہ مفردہ اور قصیدہ حفظ صحت بھی ان کی مشہور تالیفات ہیں۔ ان کی ایک دلچسپ کتاب قصیدہ در لغات ہندی بھی ہے۔ جس میں مقادیر نامہ اور خالق باری کی طرز پر حکیم یوسف نے مختلف اشیا اور ادویہ کے نام فارسی اور ہندی السنہ میں دیے ہیں[4]۔ اس قصیدے کے چوالیس اشعار ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں

> نام ہر چیز بہ ہندی بشنو از من پسر + خاصہ نام ہر دوائے نفع برداری مگر
>
> بل تکلم باشد و بل کر بگو یعنی سخن + شکر فرما ہند ترا آنکس کہ گوید شکر کر
>
> جیبھ و کن آمد زبان و گوش داری را بشنول + موچہ را می خواں بروت و انہ کور و بجر کر
>
> آنکہ چشم و ناک بینی بون ابرو ہونٹ لب + دند دنداں کارہ گردن گونہ زانو مونڈ سر[5]

عشقی خاں عشقی م ۱۵۸۲ء کا فارسی قصیدہ سرد و گرم زمانہ بھی دستیاب ہے اس میں ان کے اردو اور ترکی اشعار موجود ہیں۔ اس قصیدے کے بارے میں اورینٹل کالج میگزین ۱۹۳۲ء میں یہ عبارت درج ہے

> "مسٹر عبدالعزیز ضیا پاشنوی نے (جو ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک ہیں) حال ہی میں میرے پاس چند قلمی اوراق بھیجے ہیں۔ ان میں "عشقی خاں راست" کے عنوان سے ایک فارسی قصیدہ ملا ہے۔ جس میں شاعر نے عشقی کے تخلص سے سرد و گرم

---

(1) مقالات شیرانی جلد دوم ص ۱۶۹ (2) ایضاً ص ۶۵ (3) ایضاً ص ۷ ۱۶ (4) ایضاً ۶۸ (5) اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۲ ص ۲۸، ۲۹ بحوالہ محمود شیرانی

زمانہ کی عبرت انگیز کیفیتیں منظوم کی ہیں اور ضمناً چند اردو اور ترکی کے اشعار بھی اس کے قلم سے نکل گئے ہیں۔ یہ حشتی خاں حشتی ترکوں کے پیر و مرشد اسمٰعیل تاش کی اولاد سے تھا اور اکبر کے عہد میں میر بخشی کے عہدے پر سرفراز تھا۔ اس نے مثنوی بروزن حدیقۂ سنائی بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے اسکا انتقال ۹۹۰ھ [۱۵۸۲ء] میں ہوا" ① [اردو مغلوں کے دربار میں از قاضی فضل حق]

مذکورہ قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

زن ہندی زیک طرف گوید + ہوں ترکی لونڈی تو را خوندگار

تم جو مجھ کوں پیار کرتے ہو + ہوں بھی کرتی ہوں تمارا پیار

اپنی کوٹھے پہ میں بچھاؤں پلنگ + اوس اوپر لیت جیو پاؤں پسار

بیچ توں لیت لونڈیاں جو گرد + جس‌ماں آس پاس تم بچھار

زن ہندی زیک طرف گوید + تیری ماں کوں تیرا باپ چمار

جھوٹھ مجھ نقیس بہت سنا مت بول + سچ ترا ہوں کیوں مرا مت مار

مجھ نقیس مجھ کوں نہ رونق و بیانی + مجھ نقیس مجھ کوں نہیں سوا و سنگار

اب نہ راسیوں ترے خدا کی سوں + نکلوں گی تمہارے گھر نقیس بیار

عشقیا ایں سمر ترانہ نست + دیگرے را بر ایں ترانہ چہ کار ②

علاوہ ازیں پنجاب کے ایک شاعر قطبن نے اپنے مرشد کی مدح میں ہندی اشعار لکھے ہیں اور حسین شاہ والئ بنگالہ [۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء] کی توصیف کی ہے۔ یہ توصیف قصیدے کی ہیئت میں نہیں ہے۔ مندرجہ بالا منظومات کہ جو قصیدے کی ہیئت میں ہیں ان کی صرف تاریخی اہمیت ہے۔ مقصود صرف یہ عرض کرنا تھا کہ چند فارسی گو شعرا نے اس ہیئت میں ہندی زبان میں اظہار خیال کیا ہے۔ حکیم یوسفی نے تو قصیدے کی ہیئت میں اپنی تدریسی نظم اور دیگر [طب کے بارے میں معلوماتی] منظومات کو قصیدہ ہی قرار دیا ہے۔ یوں اس امر کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ قصیدہ کو غزل کی مانند قدیم اردو اور فارسی میں طویل نظم ہی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے خیال میں مندرجہ بالا امثلہ معنوی یا ہیئتی اعتبار سے قصیدے کے کسی ایک جزو سے کلی یا جزوی طور پر متعلق ہیں۔ قصیدے کے پورے اجزا ان میں موجود نہیں ہیں۔

قدیم عہد میں ہندوستان میں مدح کی مختلف شکلیں مقامی زبانوں میں دیئے جانے والے زبانی خطبوں میں موجود رہی ہوں گی۔ بعض مذہبی ملفوظات، اقوال اور رسائل میں پیر و مرشد کی شان میں مدح سرائیاں ملتی ہیں۔ دلو پدوں، بشن پدوں اور جکریوں وغیرہ میں بھی مدحیہ عناصر تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ دلو پد اور بشن پد ہندو موسیقی کی اصناف ہیں ان میں دیوتاؤں کے محاسن بیان کیے جاتے ہیں۔ وشنو اوتار کی مدح گائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلم صوفیا بھی انہیں پسند کرتے تھے۔ لیکن ان میں صوفیانہ رنگ کی آمیزش کر دیا کرتے تھے۔ جکری ذکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے

---

① اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۳۱ص ۱۴۹ - ۱۵۰

② ایضاً ص ۱۵۳

یہ مسلم عہد کی [ہندوستان میں] صنف شعر و موسیقی تھی اس میں روحانی، دینی اور صوفیانہ موضوعات کا اظہار ہوتا تھا۔

حافظ محمود شیرانی کہتے ہیں " جکری کا اطلاق ایسی نظموں پر ہوتا ہے جن میں اور مضامین کے علاوہ صوفیانہ سلسلہ کا شجرہ اور مشائخ کی مدح ہوتی تھی۔ حمد و نعت کے مضامین بھی اس میں پیش کیے جاتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے متعلق سید مبارک نے سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ انہیں قوالوں سے مولانا وجیہہ الدین کی جکری سن کر حال آ گیا تھا"۔ (۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ جکری میں

" بنیادی طور پر ذکر خدا، ذکر رسول، ذکر پیر و مرشد، ذکر تجربات باطنی و واردات روحانی کو اس طور پر ایسے اوزان اور ایسے عام فہم الفاظ میں لکھا جاتا تھا کہ اسے گایا بھی جا سکے۔ اور سازوں پر بجایا بھی جا سکے۔ جکری کی حیثیت مختصر گیت یا راگ راگنیوں کے ان بولوں کی تھی جنہیں گا بجا کر لوگوں کے اندر عالم جذب و سرور پیدا کیا جا سکے۔ اس میں عشق و محبت کے جذبات بھی ہوتے تھے اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہو سکے" (۲)

جکری کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں موجود مختلف اصناف شعر و موسیقی میں بھی مدح اور توثیقی و توصیفی مضامین کو جگہ دی جاتی تھی۔ گفتار نامہ، چکی نامہ، ڈھول نامہ، چرخہ نامہ، وفات نامہ، میلاد نامہ، ماں باپ نامہ، قیامت نامہ، فقر نامہ، موت نامہ، عبرت نامہ، معراج نامہ، ظفر نامہ، نور نامہ، کافی، چوپائی، سی حرفی، دوہا، خیال، شبد، شلوک، ساکھی، نکتے اور بارہ ماسہ وغیرہ میں ہمیں روحانی و دنیاوی مدح کی صورتیں ملتی ہیں۔ اردو زبان میں فنی سطح کا قصیدہ اس زبان کے آغاز کے بہت دیر بعد وجود میں آیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس صنف کی موضوعاتی و لسانی شان و شوکت اور بالیدگی کے لئے پختہ اظہار، وسیع لسانی ذخیرہ اور متنوع صنائع بدائع کی ضرورت ہے یہ تقاضا زبان کے ابتدائی دور میں پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس صنف کی فنی پختگی، لسانی بالیدگی اور شعری معیارات کی عمدگی کسی زبان کی لسانی اور فکری وسعتوں کی رہین منت بھی ہے۔

---

(۱) مقالات محمود شیرانی جلد اول ص ۲۹۳ (۲) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۰۷

فصل دوم

جنوبی ہند کا ادبی و ثقافتی تناظر

[دکن]

دکنی اردو قصیدہ کا جائزہ لینے سے قبل ہمیں جنوبی ہند کے مسلم عہد کے سیاسی، فکری، معاشرتی، ثقافتی اور ادبی حالات کا اجمالی جائزہ لینا ہوگا تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان علاقوں میں لکھے جانے والے قصائد کا تہذیبی و ثقافتی تانا بانا کن عناصر سے تیار ہوا ہے۔ علاؤالدین خلجی نے تو جنوبی ہند کے حکمرانوں کے علاقے فتح کر کے انہیں باجگذاری کی شرط پر بحال رہنے دیا تھا۔ لیکن تغلق بادشاہوں نے دکن کا الحاق دہلی سے کیا۔ محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں اپنا دارالحکومت دیوگرہ [دکن] منتقل کیا اور اس کا نام دولت آباد رکھا۔ یوں اس علاقے کے مقامی ہندی تمدن کے ساتھ اسلامی تمدن ممتزج ہوا۔ محمد تغلق کی وفات کے بعد اس علاقے میں خود مختار مسلم ریاستیں قائم ہو گئیں۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں

> "شمال کے فاتحین نے جب ۱۱۹۳ء میں دہلی کی جو ہان سلطنت فتح کر لی تو وہ اپنی زبان بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس سرزمین برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا۔ اولاً علاؤالدین خلجی نے پھر ملک کافور نے دکن پر مسلسل حملے کیے ۱۵۷۰ء [۱۳۱۵] میں راس کماری تک علاقہ علم پہنچ گیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا سیلاب محمد تغلق کے زمانہ میں اٹھا اور دکن جا کے رکا محمد تغلق نے نہ صرف دکن پر فوج کشی کی بلکہ دیوگرہ کو دولت آباد سے موسوم کر کے اس کو اپنا پایۂ تخت بھی قرار دے دیا۔ اس کے باعث نہ صرف فوجی اشخاص بلکہ اہل علم و فضل اہل حرفہ اور تجار سب ہی دہلی چھوڑ کر دکن آگئے۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے دہلی کو مراجعت کی لیکن ایک بڑے گروہ نے یہاں بود و باش اختیار کر لی۔ یہ فاتح اپنے ساتھ جو زبان لائے تھے وہ یہاں آزادانہ نشو و نما حاصل کرنے لگی"۔ (۱)

یہ وہ عہد تھا جب اسلامی شعائر پر کاربند رہنے کا جذبہ اس عہد کے سلاطین اور مسلم عوام دونوں میں تھا۔ ہندوستان میں چشتی، نظامی اور سہروردی صوفیانہ سلاسل کو فروغ مل رہا تھا۔ فتاوئ تاتارخانی اور لمعات عراقی کے اثرات کے ساتھ ساتھ ابن عربی کے خیالات بھی پھیل رہے تھے۔ یوں تصوف و شریعت کے مابین نزاعی مباحث اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں [فاتحین] کی رواداری اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر ہندو اور غیر مسلم اسلام کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ فارسی زبان کے ساتھ آنے والی عجمی تہذیب مقامی تہذیب کے ساتھ میل جول کی حالت میں تھی۔ علماء، مشائخ اور صوفیا مقامی ہندی عوام کو کثرت پرستی سے توحید کی جانب آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ سلاطین کی علم پروری کا ثبوت کہ مختلف علاقوں میں اسلامی درس و تدریس کے سلاسل شروع ہو گئے تھے۔ معزی، ناصریہ، مقبرۂ علاؤالدین، قلعہ خرم آباد اور حوض خاص کے مدرسے سرگرم عمل تھے۔ اس دور میں اسلامی فن تعمیر نے بھی نئی جہتیں اختیار کر لی تھیں۔ وسط ایشیا کے فن تعمیر کے اصول و قوانین، ہندو فن تعمیر سے متحد ہو رہے تھے۔ مسجدوں، مقبروں

---

(۱) دکن میں اردو ص ۱۵

مقبروں، محلوں، قلعوں، محل سراؤں اور حویلیوں وغیرہ کی تعمیر میں شان و شوکت، حسن اور فنی کمالات کے عناصر دکھائی دینے لگے تھے۔ پیچیدہ، بھول بھلیوں کی حامل عبادت گاہوں کی جگہ صاف ستھری اور ہموار عبادت گاہیں قائم ہونے لگیں۔ ہندی معماروں کی تعمیراتی باریکیوں اور فنی نزاکتوں وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جانے لگا۔ پل، حوض، باؤلیاں، سرائے اور شفاخانے وغیرہ تعمیر ہونے لگے تھے۔ سنگ تراشی اور بت پرستی اور صورت سازی کے رجحانات سے گریز کیا جا رہا تھا۔ بدلومت کی عبادت گاہوں، چٹانوں کو کاٹ کر بنائی جانے والی خانقاہوں اور تنگ و تاریک مندروں کی جگہ کھلی مسجدیں تعمیر ہونے لگیں۔ بیل بوٹوں اور آرائش کی دوسری شکلوں کو اپنایا جانے لگا۔ مسلم عمارتوں میں جلال اور وسعت کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ موسیقی کے میدانوں میں بھی امیر خسرو جیسے مخترع اور موجد خیال، ترانہ اور قوالی کی بنا ڈال چکے تھے۔ اس پس منظر میں دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام عمل میں آتا ہے۔

[گجرات]

دکن کے ساتھ ساتھ گجراتی علاقوں میں بھی مقامی اور غیر مقامی السنہ اور ثقافت کے میل جول سے پیدا ہونے والی اردو زبان اور مسلم تہذیب کی نشو و نما ہوئی۔ گجرات کا نام کبھی سوراشٹر تھا۔ محمود غزنوی کے عہد میں اسے گجرات کے علاوہ دیلمی بھی کہا جاتا تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں گورجارا قوم کی برصغیر میں آمد کے بعد سرحد سے لے کر کاٹھیاواڑ تک گوجر خان، گجرات، گوجرانوالہ اور گوجرہ وغیرہ کے علاقے اسی قوم کی مناسبت سے موسوم ہیں۔ گجراتی تہذیب قدیم تہذیب ہے۔ بحیرۂ عرب کے ذریعے بھی اس علاقے میں بہت سے غیر علاقوں کے لوگ داخل ہوئے۔ عرب، مصر اور یورپ سے گجرات کی (قدیم زمانے سے) تجارت ہوتی تھی۔ بھروچ، کھمبایت، اسوپارہ اور جمور جیسے شہروں میں عرب آبادی کی موجودگی تھی۔ اس کی شہادت قدیم سیاحوں [البیرونی، ابن خورداذبہ اور سلیمان تاجر] نے دی ہے۔ یوں یہاں کی مقامی زبانوں میں عربی الفاظ کی شمولیت لازمی تھی۔ (اس نوع کا عمل محمد بن قاسم کے سندھ میں آنے کے بعد وہاں بھی شروع ہوا تھا)۔ قدیم جاہلی دور کے عربوں اور بعد ازاں اسلامی عہد کے عربوں کی اس علاقے میں آمد و رفت تھی۔ یونانیوں نے بھی اس علاقے کی تہذیب کو متاثر کیا۔ غزنویوں اور غوریوں کے حملوں سے بھی یہ علاقہ محفوظ نہ رہا۔ ۱۲۹۷ء میں اسے علاؤ الدین خلجی نے ہندوستان کی مرکزی حکومت کے تابع کیا یہی وہ دور تھا جب شمالی ہندوستان کی تہذیب اور زبان نے اس علاقے پر شب خون مارا۔ فارسی زبان اور عجمی و ترکی ثقافت نے مقامی السنہ اور ثقافت سے متعلق ہو کر ایک نئی زبان کے ابتدائی نقوش ابھار دیے۔ علاؤ الدین خلجی نے اس علاقے کو ٹکڑوں میں بانٹ کر اس میں 'امیر صدہ' کہلانے والے ترک افسر مقرر کیے۔ یہ امیر صدہ 'علاقائی حکمران' تھے۔ ان کے ساتھ ان کے خاندانوں کے افراد بھی یہاں آ کر بسنے شروع ہو گئے۔ یوں عربی، ترکی، عجمی اور مقامی ثقافتی و لسانی آمیزے سے تیار ہونے والی زبان کاروباری ضروریات کے لیے استعمال ہوئی۔ غیر گجراتی علاقوں سے تبلیغی اور دینی مقاصد کے لیے آنے والے صوفیوں نے یہ زبان استعمال کی اور یوں اردو زبان روزمرہ زندگی میں سمجھی اور بولی جانے لگی۔ علاوہ ازیں تیموری حملے کے خوف سے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے بہت سے علاقوں

امراء گجرات آ بسے۔ سلطان ناصر الدین محمود بھی اپنا پایۂ تخت چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ دہلی سے بزرگوں اور صوفیوں کا ہجرت کر کے یہاں پہنچنا اسی زمانے کی یادگار ہے۔ فیروز شاہ بہمنی کو تیمور نے ایک تحریری فرمان کے ذریعے جب دکن، گجرات اور مالوہ کا خود مختار حکمران تسلیم کر لیا تو دلی اور اس کے نواحی علاقوں سے امراء، فضلاء، دانشور اور صوفیا امن و امان کے حامل اور معاشی طور پر آسودہ علاقہ گجرات کی جانب راجع ہوئے۔ مظفر شاہ ظفر خاں م ۱۴۱۱ء نے گجرات میں خود مختار حکومت قائم کر کے جب اہل علم و فضل کو انعامات اور داد و دہش سے نوازا تو یہ گجرات میں دیگر علاقوں کے لوگوں کی آمد کی ایک اور وجہ بنی۔ اس زمانے میں بقول حافظ محمود شیرانی "اردو کو مسلمانوں نے من حیث القوم اپنی زبان تسلیم کر لیا" (۱)

گجرات میں اردو زبان دو مختلف النوع لسانی اور ادبی روایات کے نرغے میں تھی (۱) عربی اور فارسی السنہ اور ان کی ادبی روایت (۲) سنسکرت زبان اور اس کی ادبی روایت ــ گجری زبان کے ابتدائی دور میں ان روایات کی چھاپ زیادہ گہری نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے "یہاں تقریباً دو سو سال تک ہمیں صرف و محض ہندوی روایت ہی اپنا رنگ جماتی دکھائی دیتی ہے۔ مغلوں کی فتح گجرات (۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء) کے برسوں بعد کہیں گیارہویں صدی ہجری میں فارسی روایت اور اصناف اس وقت اپنا رنگ دکھاتی ہیں جب دو سو سال میں ہندوی روایت و اصناف اپنا پورا زور لگا کر سوکھنے لگتی ہیں اور نئے تخلیقی ذہنوں کو نئے راستوں کی تلاش شروع ہوتی ہے" (۲)

گجرات میں اردو کے ابتدائی نمونے ہمیں صوفیا کے ملفوظات کی صورت میں ملتے ہیں۔ ان ملفوظات میں اسلامی تعلیمات (توحید، مساوات، اخوت، اخلاقی اقدار، جنت، دوزخ، فنا وغیرہ) کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان ملفوظات کی ادبی اہمیت صرف اس حد تک ہے کہ ان سے اس عہد کی روزمرہ بول چال کی زبان کا سراغ ملتا ہے۔ شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی جیو گام دھنی اور خوب محمد چشتی جیسے شعراء کی شاعری گجراتی اردو میں تخلیقی روایت کی غماز ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں

"گجرات کا صوبہ ایک زمانے میں بہت وسیع تھا اور جودھپور سے لے کر مالابار تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں تقریباً ستر بندرگاہ تھے۔ ان میں سورت بہت بڑا اور مشہور تھا اور تجارت کا خاص مرکز بن گیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان یہیں سے حج کو جاتے تھے اور ہر سال ملک کے دور دور کے مسلمان یہاں جمع ہوتے تھے غرض شمالی ہند کی زبان کا جو اثر اس علاقہ کی زبان پر پڑا وہ اس وسیع صوبے کے ہر گوشے اور آس پاس کے اضلاع تک پہنچ گیا اسی زبان میں شاہ علی جیو کا کلام ہے" (۳)

گجرات میں کاٹھیاواڑ، کچھ، بڑودہ اور پالن پور کے علاقے بھی شامل ہیں۔ اس کا بڑا اور مشہور شہر احمد آباد ہے۔ گجرات میں ظفر خاں کے بعد اس کا پوتا احمد شاہ تیس سال تک حکمران رہا۔ (اس کے دور میں قدیم شہر سوال کے نشانات پر احمد آباد کی بنیاد ڈالی گئی) اس کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ ۱۴۴۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد کچھ اور سلاطین آئے۔ ۱۵۱۱ء میں محمد شاہ

---

(۱) مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اول ص ۱۶۱ (۲) تاریخ ادب اردو ص ۹۲ (۳) قدیم اردو ص ۹۰-۹۱ انجمن ترقی اردو

کے پوتے محمود شاہ بیگڑہ نے حکمرانی سنبھالی۔ اس کی حکومت چون سال قائم رہی۔ جونا گڑھ اور بڑودہ کے علاقے اسی زمانے میں
گجراتی سلطنت میں شامل ہوئے۔ اس خاندان کا آخری مشہور بادشاہ بہادر شاہ ہمایوں سے شکست کھا گیا۔ ۱۵۷۲ء کے بعد گجرات
کو مغل سلطنت کا حصہ بنا لیا گیا۔ پونے دو سو سال تک یہ علاقہ مغلیہ سلاطین ہی کے قبضے میں رہا۔ گجراتی زبان کا حقیقی ادب
اسی دور کی یادگار ہے۔ "تاریخ ادبیات اردو" میں مرقوم ہے کہ "گجراتی زبان ہندوستان کی

> عام زبان شورسینی 'مغربی ہندی' کی ایک شکل ہے جو اپ بھرنش سے نکلی ہے
> اور سنسکرت' پراکرت اور ہندی الفاظ سے متاثر ہے۔ اس کا رسم الخط ناگری ہے۔ جب یہاں
> مسلمانوں کا تسلط ہوا تو اس زبان میں فارسی اور عربی الفاظ داخل ہو گئے۔ چنانچہ خوب
> محمد چشتی فرماتے ہیں "ہمیں بزبان گجرات کہ بالفاظ عربی و عجمی آمیز است گفتہ ام" غرض شمالی
> ہند کی طرح گجراتی بھی فارسی میں لکھی جانے لگی اور اردو (گوجری) کہلائی" ①

احمد آباد کے ایک قصبہ کے ساکن فضل الدین بلخی نے اپنی لغت "بحر الفضائل" [مصنفہ ۱۴۳۲ء] میں ان ہندی الفاظ کی فہرست دی
ہے جو فارسی شاعری میں کھپائے جا سکتے تھے۔ اس لغت میں جو ہندی الفاظ ہیں ان میں سے آج بھی بہت سے موجودہ اردو کا حصہ ہیں۔
اپنے آغاز کے بعد تقریباً تین صدیوں تک گجراتی ادب میں تصوف کا موضوع نمایاں رہا۔ قدیم گجراتی دور کی شاعری کا موسیقی سے گہرا تعلق تھا
شاعری زیادہ تر گانے کے لئے لکھی جاتی اس لئے وہ راگ راگنیوں سے ہم آہنگ ہو کر ترتیب دی جاتی۔ چنانچہ اس شاعری میں جہاں خدا
اور رسول کی حمد و ثنا ہے وہاں کرشن اور اوتاروں کے تذکرے بھی ہیں۔ گجراتی شاعری ہندو اسلامی تہذیب کے امتزاج کا ایک نمونہ ہے
اس پر بھگتی کال کے اثرات نمایاں ہیں۔ نانک پنتھی اور نرگن واد تصوف کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اکبر کے عہد میں بننے والی گجراتی اردو کے مشہور شعرا میں امین گجراتی' خروش گجراتی' ثنا گجراتی' سید محمد اشرف' اشرف
احمد گجراتی' نادر' ہاشم علی' غلامی' رضا گجراتی' ولی گجراتی' عاجز' ضعیفی' بحری' ذوقی' صادق' ولی ویلوری
معظم' آزاد' رضی' صالح اور عبد المجید وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں سے چند شعرا کے قصائد بھی دستیاب ہیں۔ گجرات میں بڑی
تعداد میں قصائد کے نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ اکبر کی فتح گجرات کے بعد گوجری دانشور اور شاعر دربار کی سرپرستی سے محروم
ہو گئے۔ انہوں نے دکنی ریاستوں کا رخ کیا۔ اکبر کے عہد کے بعد کی گوجری اردو میں بہاؤ الدین باجن' جیو گام دھنی' محمود
دریائی اور خوب محمد چشتی کی سطح کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ البتہ سترھویں صدی میں گجرات کی اردو زبان میں نکھار پیدا ہو چکا
تھا۔ اورنگ زیب نے اس صدی کے اواخر میں دکن فتح کر کے شمال اور جنوب کو ایک مرتبہ پھر ملا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
اردو زبان ان علاقوں میں ایک نئے روپ میں سامنے آئی۔ ریختہ کے ارتقا میں ولی اور ان کے معاصرین کی شاعری خصوصی
اہمیت کی حامل ہے۔

---

① تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (اردو) جلد اول ص ۹۸ء - پنجاب یونیورسٹی لاہور

دکن کا سیاسی اور تہذیبی منظر نامہ

اردو شاعری اور نثر نگاری کا حقیقی آغاز سرزمین دکن ہی سے ہوا۔ دکنی بادشاہ علم دوست تھے۔ شعر و ادب سے ان کو خصوصی دلچسپی تھی۔ ثقافتی طور پر وہ علاقائی السنہ کے حامی تھے۔ وہ مرکزی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں اور ان کے تہذیبی ضابطوں سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ مرکزی حکمران ان کے لئے مسلسل خطرہ کے باعث تھے۔ وہ اپنے آپ کو ان سے محفوظ کرنے کے لئے دفاعی حربے استعمال کر رہے تھے۔ سیاسی اور لسانی طور پر مرکزی ہندوستان کے حکمرانوں سے علیحدہ اور ممیز ہونے کی تمنا نے انہیں اپنے علاقوں میں موجود السنہ اور ماحول کی جانب مائل کیا۔ مقامی زبانوں اور ثقافتی و تہذیبی رجحانات کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ انہوں نے فارسی اور عربی السنہ سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ یہ زبانیں اس زمانہ میں مسلمانوں کی ترقی یافتہ زبانیں تھیں۔ ان میں علوم و فنون کے بیش بہا ذخائر موجود تھے۔ ان سے علیحدہ رہ کر حکومتی نظم و نسق چلانا مشکل تھا۔ یوں لسانی تعامل اور ارتباط کی بدولت ایک نئی زبان کے نقوش اجاگر ہوئے اردو زبان جسے دکنی بھی کہا جاتا ہے۔ اس علاقے میں اس زبان اور اس کی شاعری کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ اس کی اس سیاسی تاریخ اور تہذیبی صورت حال کا احاطہ کیا جائے جس کی بدولت اس زبان کی نشو و نما اور ارتقا کے مراحل طے ہوئے۔

یوں ہمیں ایک بار پھر برصغیر کے مسلم عہد کی تاریخ و ثقافت کی جانب لوٹنا پڑتا ہے۔ اموی اور عباسی ادوار میں سندھ اور ملتان میں قائم ہونے والی مسلم حکومتیں اپنے ہمراہ اس عہد کی زرخیز ترین زبان عربی کا اثاثہ لائیں۔ غزنویوں اور غوریوں نے اپنی یلغاروں کے دوران میں اور خاندانِ غلاماں سے لے کر تغلقوں اور لودھیوں کے عہد کی مستحکم حکومتوں نے فارسی زبان کو اپنا ذریعۂ ابلاغ بنائے رکھا۔ سلجوقیوں، منگولوں اور تیموریوں کے ساتھ ترکستانی اور روسی ترکستانی السنہ اور تہذیب کے اثرات بھی مقامی ہندوستانی ماحول اور السنہ پر نمودار ہوئے۔ جب دہلی کے بادشاہوں نے ملتان اور سندھ کے علاقوں پر قبضہ کیا تو ہندوستانی سرزمین پر عربی زبان فارسی سے ممتزج ہوئی۔ یہ اس مفروضہ کا ایک دوسرا پہلو ہے کہ مسلمان ہونے کے ناتے فارسی بولنے والے مسلمانوں کا عربی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ غزنویوں، غلاموں اور ملوکوں کے درباروں میں عربی علما، فضلا اور شعرا کی موجودگی کی شہادتیں معاصر تواریخ اور تذکروں میں موجود ہیں۔ یوں عربی، فارسی اور ترکی السنہ کے مقامی زبانوں کے ساتھ ارتباط نے ابتدائی اردو زبان کے نقوش اجاگر کیے۔ اس زبان کے ابتدائی مراکز دہلی، پنجاب اور ان کے نواحی علاقے تھے [بعد میں یہ گجرات اور دکن میں ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد شمالی ہند میں اردو زبان کے از سر نو راسخ ہونے کے بعد یہ سندھ، بنگال، سرحد، بلوچستان اور پنجاب وغیرہ میں مستحکم ہوئی]۔ مقامی عوام اور فاتحین کی السنہ ثقافتی ضرورتوں کے حوالے سے ایک دوسرے میں مدغم تو ہو رہی تھیں مگر اس قسم کی مشترکہ زبان کو درباری اور سرکاری سطح پر اہمیت حاصل نہ تھی۔ گجرات میں یہ زبان گجری تھی۔ دکن میں دکنی اور شمالی ہند میں اسے ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ کھڑی بولی، برج بھاشا، پنجابی اور سندھی وغیرہ کے اثرات سے بھی یہ محفوظ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمیل جالبی نے اردو کو برعظیم کی واحد لنگوا فرینکا کہا ہے[1]۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ زبان برعظیم کی سب زبانوں کی زبان ہے۔

---

① تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۴

اردو قصیدہ کا آغاز دکن سے ہوا۔ اس حوالے سے ہمیں دکن کے سیاسی تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ یہ تو بیان ہو چکا کہ دکن کو سب سے پہلے جس مسلم فاتح نے سلطنت دہلی سے متعلق کیا اس کا نام علاءالدین خلجی ہے سلطان محمد تغلق نے دولت آباد (دکن) کو دارالخلافہ قرار دیا اور اس کی تعمیر کی نگہداشت کے لیے دو سال تک اپنے امراء لشکریوں اور دیگر درباری کارندوں سمیت وہاں مقیم رہا۔ بہت سے تاجر، پیشہ ور افراد، اہل حرفہ، ارباب ہنر، نوکر چاکر اور امیر غریب بھی دلی سے دولت آباد منتقل ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلی میں جنم لینے والی مشترکہ زبان اور فارسی کا دکن کی مقامی زبانوں سے آمیزش کا عمل جاری ہوا۔ علاوہ ازیں خاندانِ بہمنیہ کے بانی گنگو نے جب دکن میں خود مختار حکومت قائم کی تو اس نے وزارت مال کا شعبہ ہندو برہمنوں کے سپرد کیا۔ اس کے نتیجے میں ہندو مسلم ارتباط بڑھا اور مشترکہ عناصر کی حامل زبان کی نشو و نما ہوئی۔ ابراہیم عادل شاہ نے بعد میں ملکی حساب کتاب کے لیے فارسی کی جگہ ہندی یا ہندوی کو رائج کیا۔ یوں دیسی اور مقامی زبان سرکاری اور درباری زبان کا درجہ اختیار کر گئی۔ دکن میں ہندوؤں کی کثرت اور مسلمانوں کی کمی نے بادشاہوں کو مجبور کیا کہ وہ حاشی تہذیبی زندگی کے مختلف امور میں ان کی اعانت حاصل کریں۔ یہ امر فاتحین اور مقامی افراد کی السنہ میں مزید اشتراک عمل کا باعث تھا۔ یہ ارتباط تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بھی ہوا۔ مسلمانوں نے رہن سہن، آرکیٹکچر، ملبوسات، کھانے پینے کے معاملات کے علاوہ سنگھار، رسوم و رواج (بچے کی پیدائش، شادی بیاہ، مذہبی و غیر مذہبی تقریبات وغیرہ۔ شب برات، میلاد، محرم، دسہرہ، دیوالی، ہولی، میلے، عرس، جنازے وغیرہ) موسیقی وغیرہ میں ہندو اثرات قبول کیے۔ ان علاقوں میں ان دو متضاد و متخالف قوتوں میں ابتدا میں رواداری اور حسن سلوک کے عمل مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ آپس کے اس اتحاد اور لگانگت پر مرہٹوں کی شورشوں کی وجہ سے خاصے مضر اثرات پڑے۔ تاہم اس وقت تک دکنی زبان اور تہذیب واضح شکل اختیار کر چکی تھی۔ مزید برآں قدیم دکن میں فارسی اور عربی بولنے والے مسلم صوفیا اور اولیاء نے بھی مقامی لوگوں کی تربیت مقامی زبانوں ہی میں کرنے کی کوشش کی تھی یوں بھی دکنی اردو کو بہت تقویت ملی۔ بہمنی حکمرانوں نے علاقائی (مقامی) رسوم و رواج، میلوں ٹھیلوں اور مذہبی و غیر مذہبی تہواروں کو سرکاری سرپرستی عطا کی یوں اس زبان پر مقامی تہذیبی اثرات بھی راسخ ہوئے۔ دکنی اردو قصیدے میں مقامی تہذیبی عناصر کی بہتات ہے۔

[بہمنی] دکن میں بہمنی سلطنت کا زمانہ (۱۳۵۰ء تا ۱۵۲۵ء) پونے دو سو برس پر محیط ہے۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں امرائے دکن نے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور حسن خان ظفر خان علاءالدین بہمن شاہ کے خطاب سے دکن کا خود مختار حاکم بنا۔ اس خاندان کے اٹھارہ حکمرانوں نے گلبرگہ اور بیدر کے علاقوں پر حکمرانی کی۔ مرور زماں کے ساتھ بہمنی سلطنت زوال پذیر ہوئی اور پانچ ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، برار اور بیدر میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں علاؤالدین حسن شاہ [۱۳۴۷ تا ۱۳۵۸ء] محمد شاہ اول [۱۳۵۸ تا ۱۳۷۳ء] داؤد شاہ [۱۳۷۸ء] محمد شاہ دوم [۱۳۷۸ تا ۱۳۹۷ء] غیاث الدین [۱۳۹۷ء] شمس الدین [۱۳۹۷ء] فیروز شاہ [۱۳۹۷ تا ۱۴۲۲ء] احمد شاہ [۱۴۲۲ تا ۱۴۳۵ء] علاءالدین ثانی [۱۴۳۶ تا ۱۴۵۷ء] ہمایوں [۱۴۵۷ تا ۱۴۶۱ء] نظام شاہ [۱۴۶۱ تا ۱۴۶۳ء] محمد شاہ سوم [۱۴۶۳ تا ۱۴۸۲ء] اور محمود شاہ [۱۴۸۲ تا ۱۵۱۸ء] بہمنی سلطنت کے حکمران رہے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے آغاز سے قبل ہی یہ سلطنت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

بہمنی حکمران اور اس دور کے علماء علم پروری اور ادب نوازی میں مشہور ہیں۔ انہوں نے مدرسے بھی قائم کیے اور فارسی اور عرب کے جید علماء اور شعرا کو دکن میں جمع کیا۔ اس دور میں دور دراز علاقوں میں رہنے والے علماء کو تحائف اور پیغام بھیج کر بلایا جاتا۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس عہد کے شاہی دفاتر میں ہندوی رائج تھی۞ سالقوی اس نے یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ یہ وہ زبان ہے جو دلی کے حکمرانوں کے ساتھ دکن پہنچی۔ یوں اس زبان میں فارسی، عربی، مرہٹی، کنڑی اور تلنگی زبانوں کے الفاظ داخل ہوئے۔ دکنی زبان [جسے دکھنی بھی کہا گیا ہے] بہمنی دور میں روزمرہ بول چال میں رائج تھی۔ صوفیائے کرام اسے تبلیغی مشن کے لئے کام میں لا رہے تھے۔ حضرت سید محمد حسینی م ۱۴۲۲/۸۲۵ھ سید محمد اکبر حسینی م ۱۴۲۰ھ وغیرہ کے ملفوظات، اقوال، فقرے اور تحریریں دکنی زبان میں دستیاب ہیں۔ علاوہ ازیں اردو کی قدیم ترین مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا مصنف نظامی بھی [۱۴۶۱ء اور ۱۴۳۲ء میں موجود تھا] اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مثنوی میں علاء الدین شاہ بہمنی کی مدح میں اشعار موجود ہیں۔ اردو کے پہلے قصیدہ نگار [جن کے قصائد تاحال دستیاب ہو سکے ہیں] مشتاق اور لطفی کا تعلق بھی اسی دور سے تھا [یہ مسئلہ نزاعی ہے اس پر مزید بحث آگے چل کر کی گئی ہے] صدر الدین، عبداللہ حسینی اور آذری وغیرہ کا بھی یہی دور تھا۔ آذری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سلطان احمد شاہ بہمنی نے [۱۴۲۲ تا ۱۴۳۶ء] اسے ملک الشعراء بنایا۔ آذری نے سلطان موصوف کی شان میں فارسی قصائد لکھے ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دکن میں صنف قصیدہ دکنی زبان میں فارسی ہی کے وسیلے سے داخل ہوئی۔ بہمنی دور میں میر فیض اللہ انجو، محمود گاؤ، زوائی، حسن گیلانی، ملا عبد الغنی، مفتی نجم الدین، محمود گاواں، سلامت اللہ اوحدی، شمس الدین ساقی، عبد الکریم ہمدانی، اور ملا نظیری جیسے عالم و فاضل اشخاص علم و ادب کی خدمت پر مامور رہے ہیں۞۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہماری تاریخ اسلوب کے اعتبار سے اہم ہے۞۔ اس میں خالص ہندوی اسلوب بھی دستیاب ہے اور فارسی آمیز ہندوی اسلوب بھی۔ اس مثنوی سے اردو زبان کی قدامت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں استعمال ہونے والے محاورے اور ضرب الامثال سینکڑوں برسوں کے عمل کا نتیجہ ہیں۔ اس میں سنسکرت الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔

بہمنی دور کی شاعری اور ادب کے مروجہ تناظر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس زمانے میں دکن کے علاوہ پورے ہندوستان میں اسلامی فقہ پر توجہ صرف کی جا رہی تھی۔ شمال ہند میں معقولات فروغ پا رہے تھے۔ دکن میں شیعہ سنی مسئلہ سر ابھار رہا تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر میں جونپور میں سید محمد جونپوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا۔ (اس کی شان میں شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں۔ اس صدی میں اسلامی عقیدوں اور علمی تعلیمات کی بدولت ہندوؤں میں عقائد کی سطح کی بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں وحدانیت اور عشق الٰہی کے تصورات پھیلے۔ بھگتی تحریک کو فروغ ملا۔ شمال میں سکندر لودھی اور جنوب میں محمود گاواں وغیرہ کی کوششوں سے علم و ادب کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔

مشہور ہے کہ محمد شاہ دوم بہمنی کے عہد کے صدر جہاں میر فضل اللہ شیرازی نے حافظ شیرازی کو دکن آنے کی دعوت دی۔ وہ دکن آنے کی نیت سے خلیج فارس تک آئے مگر بحری سفر اور طوفان سے گھبرا کر واپس چلے گئے۔ بہمنی سلطنت کے بانی علاء الدین حسن کی علم دوستی کی مورخین نے بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے درباری مقربین میں مولانا لطیف اللہ،

---

① تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۹۰ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ② ③ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی

ملا اسحٰق سرہندی، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، شریف سمرقندی اور رضی الدین جگا جو جیسے علماء مجتمع تھے۔ اسی دور میں تغلق کے دربار سے وابستہ مولانا عصامی بھی دکن تشریف لائے۔ انہوں نے فتوح السلاطین کے نام سے اس سلطنت کی منظوم تاریخ قلمبند کی ہے۔ محمد شاہ دوم ہی کے زمانے میں گلبرگہ، بیدر، قندھار، دولت آباد، جنیر، ایلچپور اور دابیل وغیرہ میں درس و تدریس کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ تاریخ فرشتہ (۱) میں مذکور ہے کہ فیروز شاہ نے خود علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ دنیا کی کئی زبانیں جانتا تھا۔ عربی، فارسی اور ترکی تو خیر اس کی گھٹی میں تھی یورو پین السنہ [بعض] میں گفتگو بھی کر لیتا تھا۔ اسے تفسیر، فقہ اور حدیث کے علوم میں بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی، علم ہندسہ، طبعی اور اخلاقی علوم بھی اس کا مرکز نگاہ تھے۔ احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں بیدر میں قلعہ اور شاہی محلات کی تعمیر ہوئی (ان سے اس عہد کے حکمرانوں کی شان و شوکت کا اندازہ ہو سکتا ہے) فیروز شاہ ذی علم بھی تھا اور علم دوست بھی۔ جہاں تک علاء الدین کا تعلق ہے وہ فصیح و بلیغ خطبات دینے کا ماہر تھا۔ ہمایوں شاہ کے دربار میں ظاہر شاہ استر آبادی اور ملا محمد تقی جیسے درباری شعرا تھے۔ ملک التجار خواجہ محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک اس کے مشیروں میں سے تھے۔ بہمنی وزراء میں سیف الدین غوری کی علمیت قابل ستائش ہے۔

اس پس منظر کے ساتھ فارسی روایات کے استحکام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب مذکورہ بالا علمی، تہذیبی اور ادبی و لسانی صورت حال کے اثرات متعلق ادب پر پڑے تو ایک نئے طرز کے ادب نے جنم لیا۔ جس میں ہندی اور فارسی روایات منتقل تھیں۔ اردو مثنویہ نویسی کے لئے فضا ہموار تھی۔ حکمرانوں کی شان و شوکت بھی عروج پر تھی اور علم و فضل کی ترقی بھی۔ دکنی زبان میں اظہاری امکانات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ بہمنی دور کی شاعری میں تمام تر مذکورہ روایات کے اثرات موجود ہیں۔

---

(۱) تاریخ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۹ ۱۳ ترجمہ

[عادل شاہی دور]

۱۴۹۵ء میں دکن کی بہمنی سلطنت ٹکڑوں میں بٹ گئی ۔ اس سلطنت میں شامل علاقوں کے صوبے داروں نے اپنے اپنے علاقے میں خود مختار مملکتیں قائم کرلیں ۔ عادل شاہی سلطنت بھی ان میں سے ایک تھی ۔ یوسف عادل شاہ م ۱۵۱۰ء نے ۱۴۹۰ء میں بیجاپور میں اس ریاست کی بنیاد ڈالی ۔ عادل شاہی سلطنت میں یکے بعد دیگرے نو بادشاہ حکمران ہوئے ۔ یہ سلطنت ۱۶۸۶ء میں اپنے انجام کو پہنچی ۔ یوسف عادل شاہ علم دوست اور شاعر نواز تھا ۔ وہ خود فارسی کا پختہ گو شاعر تھا ۔ اس کو دور دراز علاقوں کے علماء و فضلا کو اپنے دربار میں جمع کرنے کا شوق تھا ۔ تعمیرات کے شعبے سے بھی اسے بڑی دلچسپی تھی اس نے فرخ محل اور آنند محل جیسے خوب صورت قصر تعمیر کروائے ۔ بہمنی دور میں شروع ہونے والے اردو ادب کو اس کے عہد میں مزید تقویت ملی ۔ اسمٰعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء میں حکمران ہوا ۔ یہ اپنے والد یوسف عادل شاہ ہی کے مانند فارسی کا شاعر تھا ۔ شہر چندا پور اس کا بسایا ہوا تھا ۔ اس کے محل کا نام چینی محل تھا ۔ علم پروری اور شعر نوازی میں اس نے بخل سے کام نہیں لیا ۔ دونوں مذکورہ حکمرانوں کے زمانے میں اردو کی نشو و نما دربار کی بجائے شہری اور عوامی سطح پر ہوئی ۔ البتہ ۱۵۳۴ء میں تخت نشین ہونے والے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے فارسی زبان کی جگہ اردو زبان کو شاہی دفاتر میں رواج دیا ۔ اس کے علم و ادب کے ذوق کو شاعروں اور مفکروں میں پذیرائی حاصل ہوئی ۔ وہ علم و ادب ، موسیقی اور صناعی وغیرہ کا دلدادہ تھا ۔ اس کے عہد میں ان شعبوں نے بڑی ترقی کی ۱۵۵۷ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا ۔ ایران ، عراق ، آذربائیجان اور عرب علاقوں کے علماء و فضلا اس کے دربار میں جمع ہوئے ۔ عادل شاہی بادشاہوں نے خاصے عرصے تک اردو زبان پر خاص توجہ مرکوز نہیں کی ۔ اس عرصے میں اردو زبان تبلیغی مقاصد کے لئے خوب استعمال ہوئی ۔ ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا اس کے عہد حکومت میں اردو زبان کے دن پھر گئے ۔ وہ مغلیہ بادشاہ اکبر اور قطب شاہی حکمران قلی قطب شاہ کا معاصر تھا ۔ بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ وہ علوم و فنون کی پرورش میں کسی بھی عادل شاہی سلطان سے کم نہ تھا ۔ نورالدین ظہوری ، حکیم ابوالقاسم فرشتہ ، اور ملا رفیع الدین شیرازی جیسے صاحب کمال اصحاب اس کے درباری تھے ۔ ملا ظہوری نے اس کی کتاب " نورس " کا دیباچہ لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے ۔ تاریخ فرشتہ اور تذکرۃ الملوک بھی اسی دور کی یادگار تصانیف ہیں ۔ اس کے دربار میں اردو شعرا کی بڑی قدر افزائی تھی ۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی ہندوستانی موسیقی پر عبور رکھتا تھا ۔ نورس ، موسیقی پر لکھی ہوئی اس کی کتاب ہے ۔ اس میں مختلف راگوں اور راگنیوں کو دکنی نظم میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس نے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جسکا نام بھی نورس رکھا ۔ عید نورس بھی اس کی اختراع ہے ۔ یعنی جس قمری مہینے کی نویں تاریخ جمعہ کو آتی تو عید منائی جاتی ۔ عیدین ، شب برات ، نوروز اور سالگرہ وغیرہ کے جشن اس دور میں بڑی شان و شوکت سے منائے جاتے ۔ ۱۶۲۶ء میں ابراہیم کی وفات پر حکومت اس کے بیٹے محمد عادل شاہ کے ہاتھ آئی ۔ وہ خود تو شاعر نہ تھا ۔ لیکن شعرا کی سرپرستی سے اسے دریغ نہ تھا ۔ ۱۶۵۶ء میں علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا ۔ وہ خود اردو کا بلند پایہ شاعر تھا ۔
اسکا دور بغاوتوں کا دور تھا ۔ مغلوں اور مرہٹوں وغیرہ سے اسے نبرد آزما ہونا پڑا ۔ ایام فرصت میں اس نے ادب و فن پر خصوصی توجہ دی

عادل شاہی دور میں دکنی تخلیقی ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس خاندان کے بعض سلاطین نے دکنی زبان و ادب کی نشو و نما میں ذاتی دلچسپی لی۔ بیجاپور کا علاقہ زرخیز اور مردم خیز تھا۔ عدل و انصاف، بہادری و شجاعت، عقل و فراست، عوام دوستی، مضبوط دفاعی صلاحیت، رواداری، حسن سلوک، اشاعت علم اور شرع پرستی وغیرہ کے اعتبار سے یہاں کے یہ مسلم حکمران بے مثال تھے۔ رشوت، بددیانتی، لوٹ مار اور چوری چکاری وغیرہ سے مملکت محفوظ تھا۔ علوم و فنون کے فروغ میں یہ سلاطین کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ دکنی مصوری کے نقوش ہمیں بعض قلمی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان قلمی کتابوں میں موجود منی ایچرانگ کی مصوری دکنی مصوروں کے تخیل پرست اذہان کی نقیب ہے۔ سلطان ابراہیم خود فن مصوری میں مہارت رکھتا تھا۔ نجم العلوم① نامی کتاب میں جو تصاویر موجود ہیں ان پر تمام دکنی ریاستوں میں ہونے والی مصوری کی روایات سایہ فگن ہیں۔ اس دور میں حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، مراثی اور قصائد وغیرہ کی اصناف کو بڑی تقویت ملی۔ ان اصناف میں جہاں بیجاپوری ثقافت کے بارے میں معلومات مجتمع ہیں وہاں سماجی اور معاشرتی حالات کی نمایاں جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ لباس، تقاریب اور رزم بزم اور رہن سہن کے معاملات ان میں منعکس ہوئے ہیں۔ یہاں کے آرائشی ساز و سامان کی تفاصیل سے بھی ہمیں آگاہی ہوتی ہے۔ اس دور میں جہاں طویل جنگیں لڑی گئیں وہاں علم و ادب کے پودے کو پروان چڑھنے کا موقع بھی ملا۔ خافی خاں نے علی عادل شاہ کی علم دلچسپی کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ موزوں کو عزیز رکھنے والا بادشاہ تھا۔ سخاوت، شجاعت اور حسن اخلاق میں اس کا شہرہ تھا۔ عالموں اور فاضلوں کو دوست جانتا تھا۔ شاعروں خصوصاً اردو گو شاعروں کی قدردانی کرتا تھا② نصیرالدین ہاشمی کے بقول

"علی عادل شاہ کے بعد جب سکندر عادل شاہ مسند نشیں ہوا تو اس کے دور میں اگرچہ جنگی مصائب کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا مگر اس کے باوجود علم کی گرم بازاری میں فرق نہیں آیا③

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ عادل شاہی حکمرانوں کے آخری سو سال ماقبل کے سو سال کے مانند علمی کاوشوں کے لئے بڑے زرخیز ثابت ہوئے اس دور میں بلند پایہ ادبی شہ پارے تخلیق ہوئے تاریخی کتب کے علاوہ شاعری، مصوری اور موسیقی کے علوم کو تقویت حاصل ہوئی۔ عادل شاہی عہد میں مذہب انفرادی اور اجتماعی زندگی میں راسخ تھا۔ بادشاہوں اور امراء کے ہاں

"دعا مانگی جاتی اور اسی کو اثر پذیر خیال کیا جاتا۔ دسترخوان پر کھانا کھانے تمام قسم کے کھانے لوازمات نمکین اور شیریں دسترخوان پر چنے جاتے۔ ملازم نوکر سے مکھی اڑایا کرتے۔ ملاقات کے وقت بغل گیر ہوتے تھے۔ موسیقی کا عام رواج تھا۔ رقص بھی ہوتا تھا۔ زمین پر فرش، مسند کے ساتھ تخت اور کرسیوں کا طریقہ موجود تھا"④

---

① ہندوستانی مصوری ایک خاکہ از ڈاکٹر انیس فاروقی ص ۴۹ ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۱ ② منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۵۹ از خافی خاں، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، ۱۹۲۵ ③ دکنی کلچر ص ۸۸ ④ دکنی کلچر ص ۸۹

نجوم پر بہت اعتقاد تھا۔ عورتیں سر کھول کر ماتم کیا کرتی تھیں (یہاں مذہب اثنا عشری بہت مستحکم تھا) سواریوں میں گھوڑے ہاتھی، بہلی گاڑیاں، رتھ اور میانے وغیرہ استعمال میں تھے۔ شکار، تفریح اور باغوں کی سیر کا عمومی رجحان تھا۔ عورتیں باغوں میں جھولے ڈالتیں گیت گاتیں۔ مردوں اور عورتوں کی جداگانہ محفلیں برپا ہوتیں۔ مردانہ کھیل اور فوجی کرتب بھی ہوتے جن میں مرد دلچسپی کا اظہار کرتے۔ یہ خوشحال ماحول کی علامتیں تھیں۔ اسی ماحول کے بطن میں بیجاپوری قصیدہ نگاروں نے پرورش پائی تھی۔ ان کے قصائد میں مذہب، زبان، جنگ، محفل آرائی، سیر و تماشہ، بہاریہ مناظر سے دلچسپی وغیرہ کے موضوعات کثرت سے ہیں۔ نجوم اور اس کے مخصوص خیز علامتی تہذیبی تقریبات اور ان کے متعلقات اور موسیقی اور اس کی جزئیات کو ان قصائد کے بطن میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ شاعروں کے لفظی تصویر کاری کے ہنر نے دکنی ثقافت کی بہت سی تفاصیل کو محفوظ کر رکھا ہے۔

گجرات اور بیجاپور کے علاقوں کی تہذیبی قربت کی وجہ سے دونوں علاقوں کے عوام ایک دوسرے سے بہت سے معاملات میں ہم آہنگ تھے۔ گجری ادبی روایت نے اس علاقے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ دونوں علاقوں میں تصوف اور فکر کے متعدد سلاسل جانے پہچانے تھے۔ لسانی اور فنی جائزہ لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں بیجاپور میں بھی شعری اصناف، اوزان، بحور، لفظی نوعیتیں اور صورتیں ہندوی روایات سے متاثر تھیں۔ یہاں کی اردو زبان پر گجراتی کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے یعنی عربی اور فارسی کی ہندی کے ساتھ آمیزش سے تیار ہونے والی زبان جب عادل شاہی شعرا کے استعمال میں آئی تو انہوں نے اس کے متعدد امکانات اجاگر کیے ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے

> "یہ بات واضح رہے کہ گجری ادب اصل میں ہندوی روایت ہی کی تجدید
> ہے۔ بہمنی دور کا ادب اسی روایت کی مزید تجدید و توسیع ہے اور بیجاپوری ادب
> ـــــ بیجاپوری ادب بھی اسی روایت و مزاج کی مزید توسیع ہے" (۱)

ہندوی روایت کو یہاں آہستہ آہستہ فارسی مزاج اور طرز احساس نے مدغم کیا۔ بعد میں شمالی ہند میں جس دکنی اسلوب کو خوش آمدید کہا گیا وہ فارسی چھاپ کا حامل ولی دکنی کا اسلوب تھا۔

عادل شاہی دور میں دکنی ادب کے دو لسانی و تہذیبی دھاروں کی آمیزش نمایاں ہے۔ کسی شاعر نے ہندوی روایت کے زیر اثر شعر کہے اور کسی نے فارسی الفاظ کو اپنے اظہار کے لئے معاون جانا اور کسی نے دونوں روایات کی ہم آہنگی سے اس زبان و ادب کے نئے پہلو گرفت میں لیے۔ عادل شاہی دور کا مجموعی لسانی جائزہ یہ باور کراتا ہے کہ اس دور میں اردو پر فارسی کے بہت زیادہ اثرات ہیں تاہم ہندوی روایت کی چھاپ بھی گہری ہے۔ تصوف میں فلسفہ وحدت الوجود کو اہمیت حاصل تھی۔ مذہب میں شیعیت کو قبول کیا گیا تھا۔ فکری حوالے سے تصور چہار عناصر کو مسلمہ مانا جاتا تھا۔ شعرا کے افکار پر ہندی فکر و فلسفہ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس دور میں شاعری کو بہت اہمیت دی گئی۔ اسے شاعر کے نام کی دائمگی سے منسوب کیا گیا۔ یعنی شاعر کی شاعری اسے آئندہ زمانوں کے لوگوں کے دلوں میں بھی زندہ رکھ سکتی۔

---

(۱) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۸۷

یہ دور صنفِ قصیدہ کی مقبولیت کا دور بھی ہے۔ مدحیہ موضوعات مثنویوں میں بھی بیان ہوئے ہیں اور ان فتح ناموں میں بھی جو کسی بادشاہ کی کسی حلاقائی یا بڑی جنگ کے جیتنے پر احاطۂ تحریر میں آتے۔ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں تھیں مثلاً کسی بادشاہ نے کوئی محل بنایا یا کوئی باغ سجایا تو شاعر اس کی تعریف میں بھی رطب اللسان ہوئے۔ بزرگانِ دین کی مدح بھی دہاں کے شاعروں کے کلام کا حصہ ہے۔ جمیل جالبی کے بقول

> "جب یہ صنف سمن نصرتی کے علی نامہ میں جلوہ گر ہوتی ہے تو قصیدہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ قصیدے ہیں جو فارسی قصائد کو معیار و نمونہ بنا کر لکھے گئے ہیں اور آج بھی زبان و بیان کی قدامت کے باوجود فنی اعتبار سے ان کی حیثیت اتنی ہی مسلم ہے جتنی سودا اور ذوق کے قصائد کی" (۱)

---

(۱) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۹۵ - ۱۹۶

فصل سوم : جنوبی ہند میں اردو قصیدہ

بہمنی دور [صلاحیہ رجحان] [اجمالی منظر]

بہمنی دور [۱۳۵۰ء تا ۱۵۲۵ء] میں اردو زبان ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ قدیم تاریخوں اور تذکروں میں شاہ برہان الدین غریب م ۱۳۳۷ء، زین الدین خلد آبادی م ۱۳۶۹ء اور شاہ کوچک ولی ۱۴۰۲ء کے اردو زبان میں ادا کیے گئے فقروں سے لے کر اشرف تک ہمیں اردو شعر و ادب کی بہت کم تخلیقات دستیاب ہیں۔ البتہ وقتاً فوقتاً یہ شور اٹھتا رہتا ہے کہ بہمنی دور کے فلاں شاعر کا کلام دستیاب ہو گیا۔ بہمنی دور میں ادبی سطح پر مثنوی اور قصائد کی اصناف کا سراغ ملتا ہے۔ چند طویل و مختصر مذہبی نظمیں بھی ملی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک منظوم نعت بھی موجود ہے۔ بہمنی ادب کی روایت فخرالدین نظامی، میرانجی شمس العشاق م ۱۴۹۶ء، سید اشرف بیابانی م ۱۴۹۶ء، مشتاق اور لطفی وغیرہ کی تصنیفات یا صوفیا کے ملفوظات کے حوالے سے ہم تک پہنچی ہے۔ عین الدین گنج علم م ۱۳۹۲ء، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور سید محمد اکبر سے منسوب کتب کو جدید محققوں نے اس دور سے متعلق ماننے سے انکار کیا ہے(۱) عین الدین گنج علم کے تین رسائل کا تذکرہ شمس الدین قادری نے کیا ہے(۲) لیکن جمیل جالبی [ڈاکٹر] کا کہنا ہے کہ ان کی کوئی دکنی تصنیف دستیاب نہیں ہوئی اور ان سے منسوب رسائل افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف معراج العاشقین کو اردو کی پہلی نثری تصنیف سمجھا جاتا تھا مگر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب گیارہویں صدی کے نصف آخر اور بارہویں صدی ہجری کے مصنف مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی ہے(۳) سید محمد اکبر حسینی کہ جن کا اپنے والد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا تھا ان کے رسالے کے بارے میں بھی محققوں نے تشکیکی رویہ ہی اختیار کیا ہے(۴) اس دور کے ایک اور مصنف سید عبداللہ حسینی کا تذکرہ بھی ادبی تاریخوں میں ہے لیکن ان کی کوئی کتاب کسی محقق کے ہاتھ نہیں لگی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی تصنیف نشاط العشق کا دکنی ترجمہ کیا تھا(۵)

بہمنی دور کی دستیاب کتابوں اور تخلیقات کے حوالے سے اس دور کے مدحیہ رجحانات کا سراغ مل سکتا ہے۔ اس دور کے دو قصیدہ نگاروں مشتاق اور لطفی کے بارے میں محقق دو کیمپوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ سخاوت مرزا اور ان کے ہمنوا ان دونوں شاعروں کو بہمنی دور سے متعلق قرار دیتے ہیں(۶) اور ڈاکٹر نذیر احمد انہیں عادل شاہی دور سے متعلق سمجھتے ہیں(۷) دونوں کیمپوں کے پاس اپنی اپنی دلیلیں ہیں (ان کا تذکرہ ان دونوں کے تخصیصی مطالعے میں کیا جائے گا) اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسی مضبوط کہ قاری چہ می کنم کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ صرف ایک شہادت ان کو بہمنی دور سے غیر متعلق ٹھہرانے کے سلسلے میں اہم ٹھہرتی ہے اور وہ یہ کہ لطفی اور مشتاق دونوں کے کلام میں زبان صاف اور پختہ ہے یہ صفائی اور پختگی نظامی اور میرانجی شمس العشاق کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ مگر دراصل یہ مشتاق اور لطفی بہمنی دور کے اواخر کے شعرا ہیں علاوہ ازیں ان کی زبان اسی دور کے ایک اور شاعر اشرف بیابانی کی زبان سے ہم آہنگ ہے۔ اس لیے ہم ان دونوں شاعروں کو بہمنی دور سے متعلق ٹھہرائیں گے۔ یوں اردو کا پہلا قصیدہ نگار مشتاق ہی ٹھہرتا ہے۔ مخالف کیمپ کے محقق قلی قطب شاہ کو پہلا قصیدہ نگار کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلا صاحب دیوان قصیدہ نگار ہے

---

(۱) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ جمیل جالبی دیباچہ ص ۳۰ تا ۳۵ (۲) اردوئے قدیم ص ۳۹-۴۰ (۳) معراج العاشقین کا مصنف ص ۲۹-۴۲
(۴) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۵) دکن میں اردو ص ۳۸ (۶) کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا رسالہ اردو جنوری اپریل ۱۹۵۹ (۷) کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر تھا رسالہ اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۶۸

مشتاق اور لطفی کا تذکرہ اپنے مقام پر کیا جائے گا ۔ یہاں ہمیں بہمنی دور میں دستیاب ہونے والی دیگر منظومات میں مدحیہ عناصر کا اختصار سے جائزہ لینا ہے ۔ اس جائزے سے اندازہ ہو گا کہ بہمنی دور میں اردو زبان میں قصیدے سے متعلقہ موضوعات داخل ہو چکے تھے ۔ اس لئے اس دور میں اردو قصیدہ لکھا جانا ممکنات میں سے ہے ۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں ایک عنوان یہ بھی ملتا ہے " مدح سلطان علاء الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ " ظاہر ہے یہ مدحیہ اشعار مرثیہ نما ہی ہوں گے کیونکہ عنوان سلاطین مذکور کے انتقال کا اشارہ بھی دیتا ہے ۔ نظامی احمد شاہ ثالث بہمنی کے زمانے کا درباری شاعر تھا ۔ اس کی مثنوی میں احمد شاہ ثالث کی مدح میں یہ اشعار ملتے ہیں

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار + پرت پال سیسار کرتار آدھار

دھنیں تاج کا کون راجا ادھنگ + کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ

لقب شہ علی آل بہمن ولی + ولی خنی بہت بدھ تد آگلی

اس مثنوی میں حمد و نعت کے اشعار بھی ملتے ہیں[1] ۔ احتمال کیا گیا کہ نظامی نے بادشاہ کو محافظ اور سرپرست قرار دیا ہے ۔ آدھار کے معنی معاون اور مددگار کے ہیں کرتار آقا اور سربراہ کے معنوں میں ہے[2] ۔ ولی اور علی کے الفاظ بھی معنی خیز ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مثنوی سنسکرت ، ہندی اور فارسی زبان کے الفاظ کی آمیزش سے تیار ہوئی ہے ۔ علاوہ ازیں بادشاہ کے بارے میں قدیم ہندوانہ اور قدیم ایرانی تصورات کے ساتھ ساتھ اسلامی تصور بھی ظاہر ہوا ہے ۔

میراں جی شمس العشاق کی چاروں تخلیقات خوش نامہ ، خوش نغز ، شہادت التحقیق اور مغز مرغوب کے قلمی نسخے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہیں[3] ان کی نظم مغز مرغوب کا یہ شعر حمد و نعت و منقبت کے قصیدہ حسین کی جانب اشارہ کرتا ہے

اللہ محمد علی امام دایم ان سوں چال + سب جاسوں سوں اللہ اللہ تو رکھوں کیا کمال

میراں جی کی نظمیں اخلاق اور روحانی نتایج کی حامل ہیں ۔ ان میں شریعت و طریقت کے مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور پیر و مرشد کی تلاش پر بھی زور دیا گیا ہے ۔ یہاں بھی تاریخی اسلامی عقائد سے مطابقت کرتے ہیں ۔ اور اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ یہ موضوعات آئندہ چل کر کسی ادب کا حصہ بننے والے تھے ۔ بعد کے دکنی قصائد میں اس نوعیت کے خیالات بھی ملتے ہیں ۔

جانم کے سید اشرف بیابانی (۱۴۵۹ - ۱۵۲۸) کی مثنویوں نوسرہار ، لازم المبتدی اور واحد باری کا تعلق ہے ان میں نوسرہار میں واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ اسمیں ایک مقام پر حضرت زینب کے بارے میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں

زینب ایہے اس کا نام + نین سلونے جوں بادام

ماتھا جانوں سورج جوت + یا کے جانوں چاند لاٹ

اسطرح امام کی توصیف و تحسین بھی تشبیہی انداز میں کی گئی ہے ۔ واحد باری اشرف بیابانی کی ایک تدریسی نظم ہے یہ خالق باری کی طرح ہی سے عربی فارسی اور اردو کی ایک منظوم لغت ہے ۔ اسمیں الفاظ کے مترادفات دینے کے ساتھ ساتھ شاعر نے موسیقی ، عروض ، ردیف ، قافیہ اور اصناف سخن پر بھی اپنی رائے ظاہر کی ہے ۔ اسمیں قصیدہ کے بارے میں بھی اظہار خیال ہے

---

① کدم راؤ پدم راؤ ص ۳۰ تا ۳۵۱ ② اردو کلاسیکی ہندی اور انگریزی ڈکشنری مصنفہ جان ٹی پلیٹس ص ۲۱۸ ، ۳۳ ، ۸۲۲
③ مخطوطات انجمن چکالیفے چار جلدیں

۵۰ بحر ہے دریا آب فراخ + کلام موزوں ہے ڈالی شاخ

نیم بیت کو مصرع بول + دو مصرع کی بیت ہے کھول

رباعی کیا؟ چو مصرع جان + مخمس کیا؟ پنج مصرع خواں

چند بیت کو قطعہ تو جان + از شعر و غزل سے کاٹ کے آن

کم از پنج بیت نہ آوے غزل + ہو ذکر فراق محبت مثل

قصیدہ غزل کا اول مطلع + تخلص آخر بیت کا مقطع

ردیف بعد از قافیہ آر + ایک گھوڑے پر دو سوار (۱)

اس بیان کو اصناف شاعری کے ضمن میں اردو کی پہلی تعارفی منظوم دستاویز جاننا چاہیے۔ اسمیں قصیدہ کا بھی تذکرہ ہے۔ اسے اردو میں قصیدہ کے بارے میں پہلی منظوم رائے کہا جاسکتا ہے۔ قصیدے میں مطلع کی اہمیت واضح ہے قطعہ رباعی غزل اور قصیدہ کے باہمی تفاوت کے بارے میں بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ اشرف کی مثنوی نوسرہار میں تعلی اور فخر کا انداز بھی ملتا ہے اور شاعر نے اسمیں اپنی شاعری کی خوبیاں بھی گنوائی ہیں۔

بہمنی عہد کی شاعری کی اندرونی شہادتیں ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر مختلف اصناف سخن کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ تھے۔ اور وہ ان کی اسی صورت کو قبول کر رہے تھے جو فارسی میں رائج تھی۔ اگرچہ رباعی میں اوزان کی قیود کا تذکرہ اشرف بیابانی نے واحد باری میں نہیں کیا تاہم اس کے چو مصرعے ہونے، مخمس کے پانچ مصرعے ہونے، قطعہ کو غزل اور اشعار سے قطعہ کیا ہوا ہونے اور غزل میں پنج بیت سے کم اشعار نہ ہونے اور اس کے موضوعات کے حوالے سے اس میں اشارے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشرف بیابانی نے ان اصناف کے فارسی ماڈل ہی کو سامنے رکھا تھا۔

(۱) تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول ص ۲۸۵ ادارہ ادبیات حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء

[قطب شاہی دور]

قطب شاہی دور کا آغاز ۱۵۱۸ء میں بہمنی حکومت کی جانب سے مقرر شدہ تلنگانہ کے صوبے دار سلطان قلی نے خود مختار ہو کر کیا۔ آپ نے اس نے ارد گرد کے علاقوں کو بھی اپنی سلطنت کا حصہ بنانا شروع کیا۔ تاریخ قطب شاہی کے حوالے سے نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ اس نے ساٹھ ستر قلعے فتح کیے اور اپنی سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے مچھلی پٹنم تک وسعت دی[1] اردو شہ پارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اطلاع دی ہے کہ سلطان قلی نے ایک محل بنوایا جس کا نام آتش خانہ رکھا۔ اس محل میں شاعر اور ادیب مجتمع ہوتے تھے اور اپنی تخلیقات سلطان کے حضور پیش کرتے تھے۔[2] سلطان قلی قطب شاہ کا دورِ حکومت پچاس برس پر محیط ہے اس نے سلطنت کی توسیع و استحکام پر پورا زور صرف کیا۔ ان پچاس برسوں میں ۲۶ برس اس کی خود مختاری کے ہیں۔ سلطان قلی اپنے بیٹے جمشید کے اشارے پر قتل ہوا اس کی جگہ جمشید ہی تخت نشین ہوا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ اس کے بارے میں ابوالقاسم فرشتہ کہتا ہے کہ اس کے قصیدے اور غزلیات موجود ہیں[3] جمشید قلی کے بعد اس کا بھائی سبحان قلی چند ماہ کے لیے تخت پر متمکن ہوا۔ لیکن امرا نے جمشید قلی کے بھائی ابراہیم قلی کو تاج شاہی سونپا۔ ابراہیم قطب شاہ کا دور امن و امان، عدل و انصاف اور سکون و آشتی میں لاثانی تھا۔ اس دور میں گولکنڈہ کے علم و ادب نے بہت ترقی کی۔ وہاں کی ثقافت کو عروج ملا۔ ۱۵۸۰ء میں ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد سلطان محمد قلی قطب گولکنڈہ کا حکمران بنا۔ اس نے اردو زبان اور علم و ادب کی ترقی اور نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۶۲۶ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بارہ سالہ بیٹا عبداللہ قطب شاہ کو گدی نشین کروایا گیا۔ اس کی والدہ حیات بخش بیگم اس کی مشیر مقرر ہوئی۔ اس دور میں سلطان عبداللہ کے عیش و نشاط میں مبتلا ہونے کی وجہ سے گولکنڈہ کی سلطنت بہت کمزور ہو گئی۔ تا آنکہ اسے مغلوں نے اپنی باجگذار بنا لیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس عہد میں کرناٹک قطب شاہی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ ۱۶۷۲ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے انتقال پر اس کا داماد ابوالحسن تانا شاہ حکمران بنا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس کے دور میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو مغل سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ جب ہم قطب شاہی سلطنت کے عہد میں گولکنڈہ کا مجموعی جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جنگ و جدل کا بازار بھی گرم رہا اور امن و آشتی کے بے مثال لمحات بھی عوام کو نصیب ہوئے۔ اس سلطنت کے حکمرانوں نے نظم و نسق کو موثر بنایا۔

قطب شاہی بادشاہوں نے نئے شہر بسائے۔ ان کے عہد میں نئے باغات بنے۔ قلعے، مساجد اور حمام وغیرہ تعمیر ہوئے۔ شاعری اور موسیقی کو فروغ حاصل ہوا۔ مصوروں نے در و دیوار کو اپنی نقاشیوں سے آراستہ کیا۔ علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ مقامی ہندوستانی علوم و فنون اور فکر و فلسفہ کی ترقی ہوئی۔ اس علاقہ کے تخت پر جہاں قلی قطب شاہ جیسے مذہب پرست، پاکیزہ اخلاق اور اعلیٰ فہم و فراست کے حامل سلطان متمکن ہوئے وہاں عبداللہ قطب شاہ جیسے سیر و شکار کے رسیا، عیش و عشرت کے دیوانے، رقص و سرود کے دلدادہ، نغمہ طرب کے پجاری اور عیش و نشاط کی محفلیں برپا کرنے والے بادشاہ بھی براجمان ہوئے۔ ایسے بادشاہوں کے دور میں بھی گولکنڈہ کی زندگی میں ثقافتی تنوع کا دور دورہ رہا۔ تانا شاہ کے دور میں زراعت کو فروغ ملا۔ تمام علاقہ میں آبپاشی کے لیے۔

---

① بحوالہ تاریخ قطب شاہی / دکنی کلچر ص ۹۰۔۹۱ ② تاریخ فرشتہ ص ۳۱۸

باؤلیاں، تالاب اور کنٹے بنائے گئے۔ ویران دیہات نئے سرے سے آباد ہوئے۔ معدنیات کے نئے ذخائر کی تلاش شروع ہوئی۔ پرانے خلم کا میں لائے جانے لگے۔ نصیرالدین ہاشمی کے بقول

"حیدرآباد کے تمدن و سماجی تاریخ میں گولکنڈہ کی سلطنت نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ مٹ نہیں سکتے۔ دراصل دکنی کلچر کا آغاز اور مسلمانوں کے تمدن و تہذیب میں تلنگانہ کے کلچر کو داخل کرنے کا بڑا سہرا قطب شاہی سلطنت کے سر ہے خصوصیت سے ابراہیم عادل سے محمد قلی قطب شاہ تک اس کے ہیرو قرار دیئے جا سکتے ہیں" ①

گولکنڈہ کو سلطان قلی نے محمد نگر کا نام دیا۔ یہ علاقہ اپنے نادر ہیروں اور عمدہ دمشقی تلواروں کی بدولت دنیا بھر میں مشہور تھا جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ گولکنڈہ کی ثقافت کا تانا بانا مقامی اور اسلامی عناصر کی آمیزش سے تیار ہوا تھا۔ عربی، عجمی اور ترکی ثقافت اور زبان نے مقامی ثقافت اور زبان سے مل کر بلند پایہ اقدار کے حامل ماحول کی تشکیل کی۔ اسلامی عقائد و تصورات کے تحت یہاں وحدانیت، انسان دوستی، حسن سلوک، مروت اور روحانی و مادی اقدار کی ہم آہنگی وغیرہ کے رجحانات دیکھنے میں آئے۔ بھگتی فلسفے اور عقائد اور ہندو خیالات و افکار کے اثرات بھی اس ماحول میں شامل تھے۔ ابراہیم قطب شاہ نے ہندوؤں کو بھی اپنی مشاورت میں شامل کیا۔ اس نے رائے راؤ نامی ایک برہمن کو اپنا وکیل بنایا اور اسے قلعہ کے اندر محلات شاہی کے قریب ایک دیول بنانے کی اجازت بھی دی بلکہ وہ اسے ہر روز پاؤ بھر مشک و عنبر، روغن صندل اور ہزار ہا پان پوجا کے لئے فراہم کرتا۔ اس سے یہاں کے بادشاہوں کے غیر متعصب رویے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گولکنڈہ کے بادشاہ عمارت سازی کا شوق رکھتے تھے۔ اس عہد کے انگریز سیاح ولیم میتھ وولڈ کا کہنا ہے "گولکنڈہ میں دو اہم فرقے آباد ہیں یعنی شیعہ اور سنی۔ شیعوں کی اکثریت ہے جس کے سبب شیعہ مذہب زیادہ پھیلا جو اختلاف ان فرقوں کے درمیان عرصہ دراز سے چل رہے ہیں وہ یہاں بھی موجود ہیں۔ شیعہ اور سنی دونوں کے حقوق برابر تسلیم کیے جاتے ہیں ②۔ ہر دو کو عبادت کی آزادی ہے۔ اس سیاح نے قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی سلاطین کے مغلوں کو تحائف بھجوانے کا تذکرہ بھی کیا ہے اور کہا کہ اگرچہ مغلوں کی ان سے دشمنی ہے مگر یہ انہیں تحائف بھیج کر خوش کرتے رہتے ہیں۔ وہ گولکنڈہ کے قلعوں کی تعداد چھیاسٹھ سے زیادہ بتاتا ہے۔ یہ قلعے پناہ گاہوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ان میں باغات اور چشمے بھی موجود تھے۔ ان کی فصیلیں خوبصورت پتھروں سے بنی تھیں ان کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار فوج مقرر تھی۔ یہاں حساب کتاب کا کام برہمنوں کے سپرد تھا۔ عبدالمجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ میں لکھتے ہیں

"امراء کی زندگی بھی کچھ کم شاندار نہ تھی۔ یہ بڑی حویلیوں میں رہتے تھے جو کئی منزلہ بلند ہوتی تھیں۔ ان کا جلوس بھی ایسا شاندار ہوتا تھا کہ گویا خود بادشاہوں کا جلوس ہے جب یہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ہمراہ ہاتھی اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ متوسط طبقہ بھی بہت پاکیزہ اور پر تکلف زندگی بسر کرتا تھا" ③

قطب شاہی عہد علم پروری، ادب نوازی اور اردو زبان کی درباری سرپرستی کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ قطب شاہی بادشاہ وسیع النظر تھے۔ علما پرور تھے۔ ان کی شعر و سخن سے دلچسپی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اردو زبان کو اس عہد میں بے مثال شہرت و مقبولیت

---

① دکنی کلچر ص ۹۸
② "شروع سترھویں صدی میں گولکنڈہ کے حالات" بادارت ڈبلیو ایچ مورلینڈ ص ۸ تا ۳۶
③ تاریخ گولکنڈہ ص ۷۱ ④
از عبدالمجید صدیقی

حاصل ہوئی۔ تاریخ عمادیہ میں ابراہیم قلی قطب شاہ کی علم دوستی کے بارے میں (بحوالہ حدیقۃ العالم جلد اول ص ۱۲۹) مرقوم ہے کہ

"وہ سفر میں ہوتا یا محفل شاہی کے تخت پر۔ ارباب کمال ہر وقت اس کے جلو میں رہتے تھے اور ان مجالس میں علمی مباحثے ہوتے" (۱)

سلطان ادبا بھی اسی طرز پر اپنی محافل سجاتے۔ شاعروں اور ادیبوں کو عزت بخشی جاتی۔ ان کے اشعار کی قبولیت کے عوض انہیں گراں بہا صلے اور خلعتیں عطا ہوتیں۔ "امین خاں ابراہیم قلی قطب شاہ کے دربار کا ایک امیر تھا۔ ایک مرتبہ تلنگی زبان کے ایک شاعر نے اس کی شان میں اشعار لکھے تو اس نے اسے اپنے قریب بٹھایا اور اس کی عزت افزائی کی۔ وہ شاعر کہتا ہے" میرے جسم پر خوشبوئیں لگائی گئیں۔ ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کا شال میرے کندھوں پر ڈالا گیا اور جواہر کا ایک ڈبہ جس میں کئی لعل تھے مجھ دیا گیا۔ اس کے بعد نظم سنانے کی فرمائش کی گئی" (۲)

قطب شاہی سلاطین نے اپنا دربار بہمنی سلطنت کی طرز پر چلایا۔ یہ سلاطین تعلیم کے اعتبار سے پسماندہ نہیں تھے۔ اس دور میں فارسی زبان کے بہت سے علماء اور شعرا بھی ان کے درباروں میں رہے۔ قاسم طبسی، حاجی ابرکوہی اور خورشاہ بن قباد الحسینی اگر فارسی زبان کا چراغ جلا رہے تھے تو دوسری طرف اردو شعرا بھی اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی زبان کے امکانات کو وجود میں لا رہے تھے قطب شاہی عہد میں دوہروں اور گیتوں کے ساتھ ساتھ غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے

"ازمنۂ وسطیٰ کا معاشرہ بادشاہوں کا معاشرہ تھا۔ سارا معاشرہ اسی ادارے کے ارد گرد گھومتا تھا۔ اسی لئے اس دور کے ادب میں سارے کردار شہزادے، شہزادیاں، بادشاہ وزیر راجے مہاراجے ملتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سرزمین دکن کی تہذیب شمالی ہند کی طرح فارسی تہذیب اور اس کے طرز احساس کے زیر اثر بدل کر ایک نئے قالب میں ڈھل رہی تھی۔ سیاست میں، انتظام سلطنت میں، فوجی تربیت و تنظیم میں، آداب محفل اور آرائش و زیبائش میں، لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے میں اسی تہذیب کی پیروی کی جا رہی تھی۔ یہی عمل ادبی سطح پر بھی ہو رہا ہے۔ اور فارسی تصانیف کو، ان کے فکر و خیال کو اردو کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے۔ اس لئے یہ سارا دور اخذ و ترجمہ کا دور ہے شاید ہی کوئی قابل ذکر تصنیف ایسی ہو جو فارسی سے نہ لی گئی ہو" (۳)

---

(۱) تاریخ عمادیہ ص ۱۸ بحوالہ حدیقۃ العالم از میر عالم ص ۱۲۹ (۲) داستان ادب حیدر آباد ص ۱۸ (۳) تاریخ ادبیات اردو جلد اول ص ۳۹۰

عادل شاہی دور کا قصیدہ

عادل شاہی دور میں قصیدے کی صنف نے بڑی ترقی کی ۔ عادل شاہی حکمران کروفر اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ ان کے دربار کا شکوہ قابلِ دید تھا ۔ ان کے درباروں میں مسلم تہذیبی عناصر اور مقامی ثقافتی رجحانات ملاپ کے عالم میں تھے ۔ عادل شاہی حکمران فارسی اور اردو دونوں السنہ کو عزیز جانتے تھے ۔ ابراہیم عادل شاہ، شاہی، عبدل، آتشی، مقیم، چیفی، امین، شوقی، صنعتی، ملک خوشنود، رستمی، دولت، نصرتی، شاہ ملک، شاہ امین الدین اعلیٰ، ہاشمی، ایاغی، شغلی، سید ابوالحسن علی، کریم، مرتضیٰ، حسین، مختار، قدرتی، مومن، نادر، شاہ معز اور معظم اس دور کے شعرا میں سے تھے ۔ مرزا مقیم نے چندر بدن و مہیار، عبدل نے ابراہیم نامہ، محمد بن احمد عاجز نے یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں، ملک خوشنود نے جنت سنگار، حسن شوقی نے فتح نامہ نظام شاہ اور میزبانی نامہ، محمد امین اور ایاغی نے نجات نامہ جیسی مثنویوں میں عادل شاہی حکمرانوں کی مدح کی ہے ۔ علاوہ ازیں شاہ برہان الدین جانم نے وصیت الہادی، منفعت الایمان اور سکھ سہیلا میں خدا کی وحدانیت اور بزرگی کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے ۔ محمد مختار نے معراج نامہ میں حضرت عثمان اور حضرت حسینی بیجاپوری کی مدح میں اشعار لکھے ہیں ۔ علی عادل شاہ ثانی نے گیسو دراز کی تعریف میں نظم کہی ۔ سید میراں ہاشمی نے مہدی جونپوری، عبدالمومن مومن نے مہدی موعود ۔ افضل نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مدح میں اشعار کہے لیکن ہم انہیں قصیدے کے ذمرے میں نہیں رکھ سکتے کیونکہ ان میں قصیدے کی ہیئت اور اجزا کا استعمال نہیں ہے ۔ علاوہ ازیں صنعتی اپنی مثنوی قصۂ بے نظیر میں شاعری کی مدح میں بھی اشعار لکھے ہیں

سخن گنج ہے عالم الغیب کا + سخن موجزن ملک لاریب کا

سخن بادشاہ جہانگیر ہے + سخن مس کے عالم کوں اکسیر ہے

سخن کا عجب کچھ قوی باز ہے + ازل تا ابد جس کوں پرواز ہے

عجب ہے سخن کا شہِ سر بلند + عجب ہے سخن کا سمند ارجمند

سخن کا عجب فرد ہے بالیقیں + سدا دار دیدار اوس سے لعیں

سخن گر نہ ہوتا تو اے نیک ذات + نہ ہوتا کدھی شش جہت شش جہات

سخن فیض ہے عالم الغیب کا + سخن نقش ہے جیب کے جیب کا

سخن کا سدا سبز گلزار ہے + سخن کا سدا گرم بازار ہے (1)

صنعتی نے شاعری کی جس انداز میں وضاحت اور تعریف کی ہے اس سے اس کے تفکر، شعور، علمی گہرائی اور فن شناسی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ظہور ابن ظہوری نے محمد نامہ (قلمی مملوکہ نصیر الدین صدیقی مرحوم) میں ایک شاعر صنعتی کے بارے میں لکھا ہے "سرگرم شعار ملک معنی گردیدہ و قصیدۂ معانی رنگین برجستہ" (2) ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ یہ بیان قصۂ بے نظیر کے مصنف صنعتی

(1) بحوالہ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۷۸ - ۲۷۵

ہی کے بارے میں ہے۔ لیکن تاحال صنعتی کے قصائد دستیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن ان کی مثنوی کے بعض حصے شہادت دیتے ہیں کہ ان میں قصیدہ کہنے کی پوری صلاحیت تھی۔ اسی طرح کمال خاں رستمی کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے نامور ادیب اور شاعر تھے سیکڑوں قصائد اور غزلیات نظم کیے تھے مگر افسوس اب سب ناپید ہیں (۱)۔ محی الدین قادری زور کا کہنا ہے انہوں نے اردو غزلیں اور قصیدے بھی لکھے تھے۔ ان کے فارسی اور دکنی قصیدے اور غزلیں بہت جامع تھیں (۲) رستمی کی قصیدہ نویسی کے بارے میں کریم الدین نے بھی گواہی دی ہے (۳)۔ رستمی دکنی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کی مثنوی خاور نامہ اس کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ اسمیں تقریباً چوبیس ہزار اشعار ہیں (۴)۔ یہ ابن حسام کے فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے۔ صفائی بیان، سادگی اظہار، تسلسل موضوع، شستہ تشبیہات، جا بجا شاعرانہ وصف نگاری اسے قادر الکلامی کے زمرے میں داخل کرتی ہے
اس مثنوی میں رزم و بزم کے نقشے عمدہ انداز میں کھینچے گئے ہیں۔ اسمیں بادشاہِ وقت کی تعریف میں اشعار دستیاب نہیں ہیں البتہ نعتیہ اشعار مل جاتے ہیں۔ اس مثنوی میں واقعہ نگاری کی خاصیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

مرزا مقیم م [م ۱۶۶۲ - ۱۶۶۹] سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ فارسی کا بلند پایہ شاعر اور خطاطی کا ماہر تھا۔ کتب خانہ سالار جنگ میں اسکا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا دیوان محفوظ ہے اس دیوان میں محمد عادل شاہ کی مدح میں لکھے ہوئے اس کے فارسی قصائد دستیاب ہیں۔ اس کی ایک مثنوی فتح نامہ بکھیری کے علاوہ اس کے اردو اشعار دستیاب نہیں۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ میں موجود ہے (۵)۔ ۲۲۴ ابیات کی اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے کی ایک جنگ "جنگ بکھیری" میں اس کے فوج کے ظفرمند ہونے کی داستان رقم ہے۔ اس مثنوی میں بادشاہ کی تعریف، دربار کا شکوہ اور جنگ کا نقشہ وغیرہ بیان ہوا ہے اسمیں بہت سے مصرعے فارسی آمیز اردو کے بھی ہیں۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں تاکہ دکن میں فارسی اور دکنی کی آمیزش کی کوئی مثال سامنے آسکے؎

کیتا شاہ تب تس در آغوش گی + کیا مرحبا از رہ ہوشگی
رکھیا ناؤں میرا اور مردی کیا + جو رستم نے اگلے ہنروری کیا
دیا خاص خلعت زسیم برتری + زیادت ز معتاد سرلشکری

یوں یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ فارسی کے بلند پایہ ذوق کے حامل شعرا دکنی زبان میں شاعری کو معیوب نہیں جانتے تھے۔ ایسے شعرا نے اپنی فارسی اور افکار دونوں سطح پر دکنی زبان پر اثرات مرتب کیے

ملک خوشنود اس زمانے کا ایک اور شاعر ہے جس کے قصائد کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن قصائد دستیاب نہیں ہیں۔ یہ شاعر محمد عادل شاہ کی ملکہ کو جہیز میں ملا تھا۔ اس نے اپنے علم اور شاعری کی بدولت بہت ترقی کی اور گولکنڈہ کا سفیر مقرر ہوا۔ اس نے قصائد، غزلیں، مرثیے اور مثنویاں لکھی ہیں۔ اس کی ایک مثنوی ایک ہجو اور ایک مرثیے کے علاوہ ہم تک اور کوئی تخلیق نہیں پہنچی۔ اس کی شاعری میں مرصع کاری اور بلند آہنگ لہجے سے اس کے قصائد کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ معنی آفرینی، شائستگی اور آرائش کی تفصیل میں کوشاں یہ شاعر اپنے دور میں ممتاز حیثیت کا حامل تھا اس نے امیر خسرو کی تصنیفات ہشت بہشت اور یوسف زلیخا کو بھی دکنی زبان کی پوشاک عطا کی تھی۔ اس کی مثنوی جنت سنگھار کے حمد، نعت، منقبت اور شاہی مدح کے اشعار کا زور بیان

(۱) دکن میں اردو ص ۱۶۵ (۲) اردو شہ پارے ص ۸۱ (۳) طبقات شعرائے ہند ص ۱۳۶ - ۱۳۷ (۴) دکن میں اردو ص ۱۶۵
(۵) مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد اول ص ۳۴۸

اور بلند آہنگی سے اس کی قصیدہ گوئی کی بلندی کی نشاندہی ہو سکتی ہے محی الدین قادری زور نے دکنی ادب کی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ سفر کر کے جب ملک خوشنود سفیر عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں پہنچا تو دربار کے سلطان کی تعریف میں ایک عمدہ قصیدہ پڑھا۔ اس کی مثنوی جنت سنگار کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

محمد مصطفیٰ محبوب رب کا + کہے سارے نبی توں تاج سب کا
کہ احمد احد میں بانداہے کمر بند + جو لیو بندا ہے اور صاحب خداوند
نبی کا حق حبیب اللہ دیا بانوں + نبی کا جیو تیں یوں کوئی دیکھیا نیں چھاؤں ①

اس نے ایک گھوڑے کی ہجو میں اشعار بھی کہے ہیں

ہارون گھوڑا اولکھن کھیکال ہے یکیا بار کا + اوس کی بری خصلت ستی سینا ہوٹیا ہے یار کا
رنگ میں حرامی پور ہے موں کا بڑا سر زور ہے + دمچی چھپیا نا چور ہے دل جوں بجر مردار کا
خوبی نہ اوس میں جا ترا کھوٹا بورا ہے دانت را + جاما چراغاں لا ترا دل جوں بجر گفتار کا
مارے اگرچہ کب دمچی کوں رکھتا ہے جیگل + کھینچے تو نیں آل نکل ہے وقت استغفار کا ②

عادل شاہی دور میں بادشاہ شاعروں سے قصیدہ لکھنے کی فرمائش بھی کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا [م $\frac{1672}{1662}$ سے قبل] کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ علی عادل شاہ کے دور کا سب سے بڑا مرثیہ نگار تھا ایک مرتبہ اس سے بادشاہ نے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تو بھی اس نے ایک مرثیہ لکھا اور بادشاہ کے نام معنون کر دیا ③

عادل شاہی دور کے اہم قصیدہ نگاروں تخصیصی مطالعہ اپنے مقام پر کیا جائے گا۔ یہاں اس دور کے چند دیگر قصیدہ نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے شاہی طبیب آتشی کے بارے میں تواریخ کی کتب میں موجود ہے کہ وہ قصیدہ بھی لکھتا تھا۔ امیر اوروسوی نے اس کا نام حکیم محمد امین اور تخلص آتشی لکھا ہے ④ آتشی اسکا خاندانی لقب ہے اور اس کی روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس خاندان کا کوئی بزرگ اپنی سیادت ثابت کرنے کے لئے آگ میں کود گیا تھا ⑤۔ فتوحات عادل شاہی میں اس کی قابلیت کے حوالے سے مرقوم ہے کہ اس نے شاعری کی تمام اصناف غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ احوال سلاطین بیجاپور میں لکھا ہے کہ وہ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتا تھا ⑥ افسوس کہ اس کا اردو کلام دستیاب نہیں ہے اس نے مقیمی کی مثنوی چندر بدن مہیار کو فارسی میں بھی منتقل کیا۔

شریف علی عادل شاہ کے زمانے کا غزل گو شاعر تھا اسکا ایک قصیدہ "در مدح علی عادل شاہ" ⑦ انجمن ترقی اردو پاکستان کا مملوکہ ہے۔ یہ قصیدہ اس نے صلح نامہ علی عادل شاہ ۱۶۶۸ء کے موقع پر لکھا تھا۔ یہ واقعہ علی عادل شاہ ثانی شاہی م ۱۶۷۲ء کے زمانے کا ہے۔ علی عادل شاہ نے بیجاپور سلطنت کا شمالی علاقہ اورنگ زیب کو دے کر اس سے صلح کر لی تھی شریف نے اس قصیدہ میں اس واقعہ کی تاریخ بھی نکالی ہے۔ اسکا یہ شعر ملاحظہ ہو

---

① تاریخ ادب اردو ص ۱۸۵ ② ایضاً ص ۲۶۰ ③ منتخب اللباب ص ۲۴ جلد سوم ④ مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد اول ص ۲۳۹
⑤ تذکرہ مخطوطات اردو جلد اول ص ۴۰ ⑥ اردو شہ پارے ص ۲۶ ⑦ قصیدہ در تعریف علی عادل شاہ قلمی مملوکہ انجمن ترقی اردو پاکستان

کیا میں سال تاریخ اس وضا مطرح لیسارا + سوا یوں صلح اورنگ زیب عادل شاہ دیا ہے

شاہ امین الدین اعلیٰ م سنہ ۱۰۷۵ھ برہان الدین جانم کے فرزند بیجاپور کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ امین الدین اعلیٰ نے مثنویاں بھی لکھی ہیں اور قصائد بھی۔ انہوں نے ایک قصیدہ اپنے باپ کی مدح میں لکھا تھا۔ علاوہ ازیں ایک عشقیہ نظم محبت نامہ کو نصیر الدین ہاشمی نے ان کے قصائد میں شامل کیا ہے۔ محبت نامہ شاعرانہ پابندیوں سے آزاد ہے معیاری قصیدہ گو شاعرانہ پابندیوں کو فنی بنیاد ٹھہراتا ہے۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

سہ

قمر جیں میں تیرے سلام ہوے سبھوں کوں + مگر اس کر عبلا دے قوس قزح بھوں کوں

پیچوں جو یاں زلف تج موجوں دے بحر کوں + پر لہو پڑ کرشمہ عشاق کے رہجن کوں

راہ صراط پل جوں سر مانگ جو چھپی ہے + کا ہے کشاں سما پر محب بلاونے کوں

سیما عرش علامت کرسی ملک سماوے + روشن شمع منور پروانے جانے کوں

دنداں شال بجلیاں رخشاں کلام کرتے + زہرہ دھڑ نہ دیدہ خوبیں تجاوے کوں

چاہ زنخ کا تیرا مانند حوض کوثر + مقتول ہیں جو تیرے الکار نے غسل کوں (۱)

نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے "شاہ صاحب فطری شاعر تھے۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں ــــ ان کی شاعری میں روانی اور نزاکت پائی جاتی۔ قیود شاعری سے آزاد ہے، اسلوب بیان بھی اچھا ہے" (۲)۔ امین الدین اعلیٰ کی مثنویوں میں رموز السالکین اور نظم وجود کی خصوصی اہمیت ہے۔ یہ ان کے فکری و عقائدی رجحانات کی خبر دیتی ہیں۔ ان کی مثنوی محبت نامہ فی الوصل محب نامہ ہے۔ اس کے بارے میں جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ یہ ایک عاشقانہ نظم ہے (۳) اس میں محبوب کے سراپا کی عمدہ نقش کشی کی گئی ہے۔ اس نظم میں محض ردیف کی پابندی ہے۔ قافیے کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس میں فارسی بحر کا استعمال دیدنی ہے علاوہ ازیں قمر، قوس وقزح، زلف، کرشمہ عشاق، صراط، راہ، کاہکشاں، سیما، عرش، علامت، کرسی، فلک، روشن، شمع منور، پروانہ، رخشاں، چاہ زنخ، حوض کوثر، مقتول وغیرہ کے الفاظ و تراکیب امین الدین اعلیٰ کے اسلوب پر فارسی اثرات کا کھلا ثبوت ہیں۔ محب نامہ کو ہم کسی بھی طور قصیدہ کے زمرہ میں نہیں رکھ سکتے۔ وہ نظم جو امین الدین اعلیٰ نے اپنے والد کی مدح میں لکھی ہے۔ اس کی اہمیت بھی زبان کے استعمال کے حوالے سے ہے۔ قصیدہ کی فنی ہیئت سے اسکا صرف اتنا سروکار ہے کہ اسمیں غزل و قصیدہ کی مانند ردیف و قافیہ کا استعمال ہے

سہ

اکمل ولایت بخ عطا ثابت ثبوت نائب خدا + خبر عین حق دیگر نہ تھا برہان بن میراں اُپر (۴)

علم لدن مقدور تج نکتے خفی مکشوف تج + اشغال مشغل حل کیا برہان بن میراں اُپر

نیکو سرشت رحماں دیا اعلام شاں یزداں کیا + حسن خلق حق تقیں لیا برہان بن میراں اُپر

ہادی توں ہے راہ خدا عامل توں ہے حق میں خدا + واعظ توں ہے راہ خدا برہان بن میراں اُپر

---

(۱) محبت نامہ از رسالہ اردو نمبر ۸ جلد ۲۹ (۲) دکن میں اردو ص ۱۹۰ (۳) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۳۱۲
(۴) قدیم اردو ص ۱۵۱

دکھیں اپس خادم کمیں دم دم سرن گل برزمیں + مقبول ہو گفتار اپیں برہان بن میراں اپر

علی عادل شاہ کے زمانے کے شاعر شغلی کا قصیدہ بھی ملتا ہے۔ اس شاعر نے پند نامہ کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے جسکا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ میں موجود ہے۔ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کی مملوکہ قلمی بیاضوں میں شغلی کی چند نظمیں، غزلیں اور ایک قصیدہ محفوظ ہے۔ یہ قصیدہ تیرہ اشعار کا ہے (جو قصیدے کی مطلوبہ طوالت سے کم اشعار پر مبنی ہے) اس میں صوفیانہ مضامین عربی آمیز دکنی زبان میں قلمبند ہوئے ہیں۔

مطلع ـــ شہ رگ تے ورے تیرے ہیے توں جاگتا کیوں بعید + گرنہ سنیا توسن اونحن اقرب الیہ حبل الورید

مقطع ـــ شغلی خدا کوں کھوئے کر خود میں خدا کوں جوئے کر + یوں مل رہا یک ہوئے کر جوں قطرہ فی البحر الحقید (۱)

قادر نامی ایک شاعر کا ایک قصیدہ مجموعہ سفینہ کتب قلمی انجمن ترقی اردو پاکستان کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔ قادر کا اصل نام شاہ عبد القادر تھا۔ وہ قادر لنگا کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اردو کتب خانہ نواب سالار جنگ میں جو مخطوطہ نمبر $\frac{۳۷۲م}{۳۴۸}$ قصیدہ قادر کے نام سے موجود ہے اس کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ وہ میراں حسینی کی مدح میں ہے اسکا تصنیفی سال $\frac{۱۱۴۰}{۱۱۷۱}$ کے بعد کا ہے (۲)

شاہ امین الدین اعلیٰ کے ایک اور معتقد قادر کے شاگرد معراج نامہ کے مصنف معظم بھی تھے۔ معراج نامہ کے بر باب کی سرخی منظوم ہے۔ یہ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات میں محفوظ ہے۔ جب اس کی منظوم سرخیوں کو مثنوی کے اشعار سے علیحدہ کر کے پڑھا جاتا ہے تو ایک مستقل قصیدہ کی صورت واضح ہوتی ہے۔ یہ قصیدہ اور مثنوی الگ الگ بحروں میں ہیں۔

ضعیفی نے ۱۶۸۸ء میں ہدایات ہندی کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی۔ جس کے پچیس ابواب میں شرعی مسائل کو پیش کیا گیا ہے اس مثنوی کے آخر میں اورنگ زیب کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے

ـــ یہ دور جہاں دار اورنگ زیب + کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب
شہنشاہ عادل اہے در امور + کہ بدعت ضلالت ہوا جس سے دور
دیا یوں اُسے حق تعالیٰ نے جس + جو دشمن ہوئے اس اگے خار و خس
دیا سر پو چوبین شہی کا رہ تاج + دل ہور دکن کا ہوا ایک راج
عجب فتح و نصرت ہے اس کے سنگات + جو کوئی نہیں کیا اس سوں دعویٰ بات
کہ شاہاں بھی اول ہوئے ہیں تو کیا + نہ کوئی زہد و تقویٰ میں ایسا دسیا
رہے اس منے بھی ولی کی صفات + کہ ہو آئے جو یوں سوں کا ڈے سو بات
بڑا دین اسلام کا کارساز + الٰہی تو کر عمر اس کی دراز (۳)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا خیال ہے کہ یہ پہلی مدح ہے جو کسی حیدر آبادی شاعر نے اورنگ زیب کی لکھی تھی اس میں اورنگ زیب کے عدل، بدعت دشمنی، زہد و تقویٰ، ولی صفتی، نصرت مندی اور اسلامی خدمات کا تذکرہ ہے

---

(۱) اردو مخطوطات ص ۲۴۹ (۲) توضیحی مخطوطات اردو کتب خانہ نواب سالار جنگ پر سرسری نظر رسالہ اردو اپریل جولائی ۱۹۵۷ء
(۳) دکنی ادب کی تاریخ ص ۱۱۵

اس کے برعکس ایک عادل شاہی شاعر عبدالرحمن قادری نے اورنگ زیب کے ہاتھوں بیجاپور کی تباہی پر۔ اس کی ہجو لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عادل شاہی دور میں بیجاپور ایک عالم میں مشہور تھا۔ وہاں کے بادشاہ صاحب عدل تھے۔ وہاں کی خلقت وضیع و شریف تھی۔ سخی مہربان تھے۔ انہیں فریب نہیں آتے تھے۔ وہ فقیروں کے معتقد تھے۔ اس شہر میں آنے والے بزرگ آرام و چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لوگ وہاں آنا پسند کرتے تھے۔

سہ خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا + اسی کے کرم سوں وہ منصور تھا
ہوئے بادشاہ جب سوں اورنگ زیب + کئے اس کے لینے کے تئیں سو فریب
دیے بھیج فوجاں کوں اول شتاب + جو جا کر کریں ملک سارا خراب
پچھے آپ آ ایک حیلے سنے + لئے شہر ہور ملک سب غضب تھے (۱)

میں ہیں۔ شاہ معظم (۱۶۴۳ تا ۱۷۱۲ء) کے مراح نامہ میں اورنگ زیب کی مدح میں بھی اشعار دستیاب ہیں۔ اس کے مذکورہ قصیدہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں (۲)

سہ محباں فرض ہے بوجھنا اول اللہ اکبر کا + جو املا نیچر و بولیلو کیا ہے رتر دلبر کا (۳)
اول توحید کہتا ہوں سپاس قدرت کے قادر کا + کہ مالک ہے دو عالم کا وہ رازق بحر و بر کا
الہی پاس منگتا ہوں ایس بولو محباں سوں + معظم عرض کرتا ہے پریشاں حال ابتر کا

اسی طرح بمبئی سی کے کتب خانہ میں معجزات نبی نامی ایک مخطوطہ پڑا ہے۔ اس کے مصنف کے بارے میں علم نہیں ہے۔ جب اس کی سرخیوں کو یکجا و مجتمع کرکے پڑھا جاتا ہے تو وہ ایک الگ قصیدہ نظر آتی ہیں

عادل شاہی دور کے مستقل اور اہم قصیدہ نگاروں میں (فنی پختگی کے اعتبار سے) علی عادل شاہ شاہی، نصرتی اور سید میراں ہاشمی شامل ہیں۔ ان کے قصائد کا تنقیدی و فنی مطالعہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

---

(۱) دکنی ادب کی تاریخ ص ۱۱۲ (۳) منقولہ از مخطوطات کتب خانہ آصفیہ و سالار جنگ حیدرآباد۔ مضمون: نصیر الدین ہاشمی، رسالہ اردو جولائی ۱۹۵۵ء
(۲) ملاحظہ ہو کلام معظم بیجاپوری مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی مطبوعہ قدیم اردو حصہ اول عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

قطب شاہی دور میں قصیدہ

قطب شاہی دور میں صنفِ قصیدہ نے خاطرخواہ ترقی کی ۔ اس خاندان کے سلاطین کی علم دوستی اور ادب پروری کے علاوہ درباری ماحول کے مخصوص تقاضوں نے بھی شعرا کو قصیدہ نویسی کی جانب مائل کیا ۔ قطب شاہی بادشاہوں نے اپنے دربار اور محلات دہلی کے مملوک بادشاہوں کے درباروں کے معیار پر آراستہ کیے ۔ قطب شاہی شعرا میں فیروز، محمود، خیالی، وجہی، غواصی، احمد، قطبی، سلطان، بلاقی، جنیدی، ابن نشاطی، طبعی، سیوک، شوق، غلام علی، فائز، محب، افضل، نوری، راجو، قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ⑤ معروف ہیں ۔ اس دور کے شاعروں نے قصیدے کی طرف خاص توجہ دی ۔ اس صنف کو بادشاہوں نے بھی استعمال کیا ۔ قطب شاہی عہد کا قصیدہ جہاں ایک سطح پر مذہبی جذبات و خیالات کا مفصل ذخیرہ لیے ہوئے ہے وہاں مذہبی قصیدے نے بھی بہت ترقی کی ۔ عمارات اور باغوں کی شان میں عمدہ قصائد لکھے گئے ۔ مختلف تہذیبی تیواروں اور ثقافتی جشنوں کے حوالے سے بھی قصائد نگار شعرا نے اپنے شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں ۔ قطب شاہی دور کے مثنوی نگاروں نے بھی مثنویوں میں اپنے اپنے عہد کے حکمرانوں کی مدح میں اشعار لکھے ہیں ۔ ملا وجہی کی قطب مشتری [مثنوی] کا ہیرو ولی عہد [قطب شاہی] محمد قلی ہے ۔ سیف الملوک اور بدیع الجمال طوطی نامہ، مینا ستونتی جیسی مثنویوں میں پیش ہونے والے منظروں اور اندرونی نقشوں میں غواصی کے ہاں دربار کے حوالے ملتے ہیں اور قصیدے کا سا اثر دکھائی دیتا ہے ۔ ابن نشاطی نے پھول بن میں عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ۱۳۸ اشعار لکھے ہیں ۔ محب نے معجزہ نامہ میں اور افضل نے محی الدین نامہ میں قطب شاہی سلاطین کی مدح کی ہے ۔ فیروز بیدری نے پرت نامہ میں عبدالقادر جیلانیؒ اور شیخ ابراہیم مخدوم جیؒ کی تعریف میں شعر لکھے ہیں ۔ سید بلاقی نے معراج نامہ میں شاہان گولکنڈہ کے عقائد کے برعکس 'چار یاروں' کی توصیف بیان کی ہے ۔ فائز نے رضوان شاہ اور روح افزا میں حمد، نعت اور مدح صحابہ پر مشتمل اشعار قلمبند کیے ہیں ۔ اولیا نے قصہ ابو شحمہ میں حمد و نعت کے اشعار رقم کرنے کے ساتھ ساتھ مدح صحابہ اور مدح گیسو دراز کی ہے ۔ جنیدی نے مثنوی ماہ پیکر میں حمد و نعت پر مشتمل اشعار تخلیق کیے ہیں ۔ حسن شوق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے محمد قطب شاہ کی تعریف میں قصیدے لکھے اور اس کی فرمائش پر کوئی مثنوی بھی لکھی جو اب ناپید ہے① ۔ طبعی نے قصہ بہرام و گل میں قطب شاہی سلطان کی تعریف کی ہے علاوہ ازیں شاہ راجو قتال کی مدح میں اس کے اشعار موجود ہیں

دل سے بڑا ہے کنگر شاہ راجو + چل آیا ہے شہ ترے گو شاہ راجو

خبر تیری معلوم نئیں بے خبر کوں + خبردار جانے خبر شاہ راجو②

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک شاعر نے قصیدے کی ہیئت میں راجو حسینی کی منظوم قصیدہ نما تصنیف تحفۃ النصائح کا ترجمہ $\frac{۱۶۳۵}{۱۱۳۶}$ کیا ۔ اس مخطوطہ میں اصل ردیف و بحر کو برقرار رکھا گیا ہے ۔ تحفۃ النصائح کا ایک مخطوطہ

---

① دکنی ادب کی تاریخ ص ۷۶ ② اردو شہ پارے ص ۱۱۵
⑤ کلیات عبداللہ قطب شاہ مرتبہ سید محمد سلسلہ یوسفیہ شمارہ نمبر 9 حیدر آباد دکن

انجمن ترقی اردو پاکستان کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ اس کے مصنف یا مترجم کا نام اس پر قطب زاری لکھا ہوا ہے اور اس سے یہ سراغ ملتا ہے کہ یہ ترجمہ شاہ ابوالحسن نامی کسی بزرگ کے کہنے پر کیا گیا ہے (۱)۔ اس کے ۱۵ ابواب ہیں اور ۱۸۶۷ اشعار۔ عامۃ المسلمین کے لئے اس میں پند و نصائح کا ذخیرہ جمع ہے۔ تحفۃ النصائح کے مترجم کا تخلص اس سے زاری ظاہر ہوا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قصیدہ کی ہیئت طویل نظموں کے لئے اس زمانہ میں خاص اہم ہوتی تھی۔ اس کے اشعار دیکھئے۔

بولوں صفت میں بہ گفت اس خالقِ جن و بشر + نر دھار کر آسمان رکھیا سورج رکھیو ستارے چندر

جودی بزرگی عرش کوں پنکھے آٹھ یک پائے نے + جوں بیچ برساں چار سو انپڑے بزاں پائے دگر

نازش جہاں میں میں کیتا، کیتا برائی کے جوگی + قطبی دکو یا امید یو لایا سوں سب صاحب نظر

ہوئے جو بالغ آدمی حق بوجنا ہے فرض اس + ایک سچ بے شک ہے خدا اس باج بھی نہیں کوئی مگر

سند یاں سبکرا ہے زاری تخلص قطب کا + تحفہ کیا دکھنی زباں شہ کی رضائے سیس پر (۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے "تحفۃ النصائح ۱۵ ابواب اور ۱۶۹۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ شاہ راجو قتال نے جو اپنے زمانے کے برگزیدہ بزرگ اور فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ اس تصنیف میں دین و دنیا کی ساری نصیحتیں اور معلومات اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لئے فراہم کی ہیں۔ توحید باری، احکام و ارکان، ایمان، عقائد، عقوبت گور، بیان علم و فضل، قضائے حاجت، وضو و غسل، آداب، جامہ پوشیدن، آب خوردن، طعام خوردن، در بیان پیری و جوانی، لدغ بازی، نرد شطرنج، سماع، رقص و سرود، بخل و سخا، امر معروف و نہی منکر، آوردن عروس بخانہ و مجامعت او غرض کہ کوئی معلوم موضوع ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ قطب زاری کا ترجمہ ۱۸۷ اشعار اور ۱۵ ابواب پر مشتمل ہے (۳)

یہ کتاب قدیم عہد کی تہذیب کے اقداری معیارات کی شارح ہے۔ ادب، آداب، تہذیب و معاشرت، جنس و مذہب، عقائد و افکار ہر چیز احاطۂ تحریر میں آئی ہے۔ تحفۃ النصائح کی طوالت اور اس کا قصیدہ کی ہیئت میں ہونا اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ قدیم دکھنی زبان میں اظہاری امکانات کم نہیں تھے۔

افضل قطب شاہی دور کے اواخر کا شاعر تھا۔ اس نے ۱۶۸۶ء میں محی الدین نامہ کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ وہ مرثیہ گو بھی تھا اور اس نے قصائد بھی لکھے ہیں۔ اس کے قصائد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ان میں عرب فارسی کی شعری روایت کی تقلید نہیں کی (۴)۔ الفاظ کی چستی اور خیالات کی روانی سے اس نے قصائد میں خاص تاثر پیدا کیا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں اس کے قصیدے کے ذیل کے اشعار تاثیر سے معمور ہیں۔

---

(۱) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کا نام قطب زاری ہی لکھا ہے تاریخ ادب اردو ص ۲۸۶ جلد اول (۲) دکن میں اردو ص ۹۳ (۳) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۸۵

سہ میرا مکھ بھاگ لو چن لب تے پایا ہے یوں سکندر + جلا سورج گلا چندر ستارہ جوت رنگ عنبر

ترے لب، دنت، ہور جوبن بچن دیکلا اج تے پڑے + گلے سرقی سو موتی خوشے ہیرا سنے جیل جوہر

مشک جوتی اتک عنبر سو خوی گلاب تن صندل + ہنس سر خود ادلور اداں کمر شرزہ چینن خنجر

براغمزہ، قہرعشوہ، ظلم ہے ناز آفت چھند + کہ مکھ معجز نشیں تو نا ادلور تا اون بچن منتر

مذکورہ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ افضل لفظوں کے آہنگ کا موثر استعمال کر سکتا تھا ۔ ان کے صوتی تاثرات سے قارئین کے شعور میں آہنگ بھی جگا سکتا تھا ۔ اس کے الفاظ رواں اور مترنم ہیں ۔ بغیر اضافت کے دو لفظوں کو ملانے کے دکنی لسانی جوہر کو وہ عمدہ طریقے سے بروئے کار لایا ہے ۔ اس نے اپنے مذکورہ بالا قصیدے میں وجہی کی توہین بھی کی ہے ۔ افضل عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔ اس کی غزلوں اور قصیدوں کا مجموعہ دستیاب ہیں افضل ملک الشعرا ہونے کا مدعی تھا اس کے اس قصیدے کا جواب شاہ سلطان نے دیا ہے ① وجہی کی توہین میں اس کے قصیدے کا یہ شعر عمدہ ہے

سہ تجھ الیسے شاہ کو ہونا سو وجہی سا کا شاعر + نپٹ عاقل نپٹ کامل، نپٹ گیانی، نپٹ گنبھر

قطب شاہی دور کے اہم قصیدہ نگار جن کا تہذیبی اور فنی مطالعہ ہمیں اس دور کے قصائد کی مجموعی حالت کا سراغ مہیا کرے گا، اظہار و بیان کے اعتبار سے بڑے زرخیز تھے ۔ ان کے سامنے فارسی قصائد بطور ماڈل موجود تھے ۔ تاہم ان پر مقامی طرز احساس اور علاقائی ثقافت کی گہری چھاپ بھی دکھائی دیتی ہے ۔ محمد قلی قطب شاہ اور غواصی وغیرہ اس دور کے قصیدہ کے معمار ہیں ۔ ان کے قصائد کی تہذیبی اور فنی اہمیت پر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی ۔

---

① "قدیم اردو کی دو نایاب بیاضیں" رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۳ء ص ۲۵
ماخوذ از سخاوت مرزا

گجرات میں مدح کی روایت

پندرھویں صدی میں فارسی اور عرب کی زرخیز زمین میں نمو پانے والا قصیدے کا پودا اردو زبان کے زرخیز میدانوں میں پرورش پانے کے لئے تیار تھا۔ جنوبی ہند کے درباروں میں اس کی نگہداشت کے لئے فضا مناسب تھی۔ بادشاہوں کو ذاتی استحکام اور نام و نمود کی ضرورت تھی اور شاعروں کو انعام و اکرام اور داد و دہش کی۔ دکن کی دو بڑی سلطنتوں عادل شاہی اور قطب شاہی میں مدحیہ قصیدہ خوب لکھا گیا۔ گجرات میں اس کے لئے مطلوبہ فضا موجود نہیں تھی۔ تاہم اس علاقہ کی تاریخ، تہذیب اور ادبی صورتِ حال کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ اردو زبان کے ابتدائی نقوش کے اثاثے اس علاقے کی جھولی میں بھی ہیں۔ علاوہ ازیں گجرات کے شاعروں اور مصنفوں نے اس کی اظہاری صلاحیتوں کو خاصی تقویت دی۔ گجرات میں پرورش پانے والی زبان نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے شعر و ادب پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ قدیم گجرات میں اردو شاعری کا ذخیرہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بہاؤ الدین باجن، شاہ علی محمد جیو گام دہنی، قاضی محمود دریائی، خوب محمد چشتی اور شاہ برہان الدین جانم کی تخلیقات ہی اس دور کا اثاثہ ہیں۔

گجرات میں ابتدا میں ہمیں صوفیا کے ملفوظات اور مختلف کتبات میں مدح کی چند صورتیں ملتی ہیں۔ سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ قطب عالم م ۱۴۵۳ء کا یہ فقرہ ملاحظہ ہو "بعالیٰ محمود خوش ہو آسماں لقیں ورڈا، تساں لقیں ورڈا ساڈے گھر جلال جہانیاں آیا" ①۔ سلطان قطب الدین نے جنہیں حضرت شاہ عالم[شاہ عالم] سے حد درجہ عقیدت تھی ان کی مدح میں یہ شعر کہا۔

ے منجھن شاہ جہانیاں جس دنیا سبحان + شاہوں کیرا شاہ توں دو نہ جل تری آن ②

شیخ بہاؤ الدین باجن م ۱۵۰۶ء ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے دوہے، منقبت، نعت اور دیگر صوفیانہ موضوعات سے معمور ہیں۔

ے محمدؐ سرور پیرم کار رحمت اللہ کبریا + باجن جیوڑا وار کر سر اگیں دلبریا

بہاؤ الدین باجن کی جکریاں بھی بہت معروف ہیں۔ خود بہاؤ الدین باجن نے لکھا ہے "میرے اشعار کو ہندوی میں جکری کہتے ہیں اور ہندوستان کے قوال ان کو سرود کے پردوں میں نوازتے اور گاتے ہیں" ③

باجن کی جکریاں پیر دستگیر [غوث الاعظمؒ] کی شخصیت کی مدح میں بھی ہیں اور ان کے روضے کے وصف میں بھی بعض جکریوں میں انہوں نے اپنے وطن گجرات کی تعریف کی ہے۔ بعض عشق کے موضوعات کے لئے مختص رکھی ہیں۔ باجن کی جکریوں میں ناصحانہ مضامین کی کمی نہیں ہے۔

قاضی محمود دریائی م ۱۵۳۴ء نے بھی بہت عمدہ جکریاں لکھی ہیں۔ ان کے دیوان میں نظموں کے اس نوع

---

① تحفۃ الکرام جلد اول ص ۱۸ ② تاریخ ادب اردو ص ۹۵/۹۶ ③ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ ص ۳۴۲۱

کے عنوانات ان کی شاعری کے موسیقی سے تعلق کی کھلی دلیل ہیں کہ "جکری در پردۂ بلاول" درد کھناسری در۔ بلیار کدارا، کلیان، کانگرہ، سارنگ، رام کلی وغیرہ وصالیہ، عشقیہ، طلبیہ، فراقیہ، توحید یہ موضوعات پر مشتمل جکریاں ان کے دیوان کا حصہ ہیں۔ قاضی محمود دریائی کی جکریوں میں حمد، نعت اور منقبت کے جذبات بھی موجزن ہیں ان پر ہندوی روایت کا چوکھا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ ان کی زبان کی پختگی اس امر کی غماز ہے کہ اس عہد کی گجری زبان تخلیقی اور ادبی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکتی تھی۔ (قاضی محمود دریائی کا دیوان انجمن ترقی اردو پاکستان کے قلمی کتب کے ذخیرے میں موجود ہے) ان کی جکریوں سے یہ نمونہ ملاحظہ ہوں

امت نبی محمدؐ کی ہے + محمود نبیرا داس
برکت پیر جا بلیند تھا + سائیں پوروبیں من کی آس ① [در بلاول]

شاہ علی محمد جیوگام دھنی م ۱۵۶۵ء کے اکثر اشعار میں توحید اور وحدت الوجود کے موضوعات ملتے ہیں ان کے کلام پر ہندوی اور فارسی دونوں رنگوں کا اثر ہے۔ ان کے مکاشفوں میں حمد و نعت و منقبت کے موضوعات موجود ہیں

ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول " شیخ باجن اور محمود دریائی نے اپنے صوفیانہ خیالات کو سنگیت کی زبان بنا کر پیش کیا ہے لیکن شاہ علی محمد جیوگام دھنی نے اسے پوری سنجیدگی سے اپنے منفرد تجربات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے" ②

شیخ خوب محمد چشتی م ۱۶۱۴ء نے ستر کینے کے علاوہ صنائع شعری کے تذکرے پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اسمیں گوجری زبان کی مثالیں مرقوم ہیں۔ صنائع شعری کی تعریف فارسی زبان میں ہے۔ ان کی اس تصنیف کا نام امواج خوبی ہے اس کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کا مخزونہ ہے۔ علاوہ ازیں خوب محمد چشتی نے 'چھند چھنداں' نامی ایک رسالہ بھی تصنیف کیا ہے۔ اس رسالے کے دو حصے ہیں ایک میں ہندی عروض پر اظہار خیال ہے اور دوسرے میں عربی عروض پر۔ شیخ خوب محمد چشتی کی اصل شہرت ان کی مثنوی خوب ترنگ کے حوالے سے ہے۔ اس مثنوی میں انہوں نے گجرات کی بولی میں حرب عجم کی بات شامل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ خدا کی ذات و صفات اور کائنات و ذات کے متعلقات وغیرہ پر شعر کہے ہیں۔ اس مثنوی میں توحید، الہیات، وجود و شہود ظہور و حجاب، موجودات و غیر موجودات وغیرہ کے صوفیانہ مسائل کو رواں اور عمدہ زبان میں بیان کیا ہے۔

اکبر کی فتح گجرات کے بعد سے لے کر اورنگ زیب کے عہد تک کے گجراتی شعرا میں امین، خروشی، ثنا، سید محمد اشرف، اشرف، احمد، ہاشم علی، خلاق، رضا، ولی، عاجز، بحری، ذوقی، صادق، ولی ویلوری، آزاد، رضی، جنونی اور صانع وغیرہ کے نام معروف ہیں۔ ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر کسی کے کلام میں قصائد دستیاب نہیں ہیں۔ متعلق السنہ کے ساتھ ساتھ گجراتی علاقے میں فارسی کی پرورش بھی ہوئی۔ گجرات میں قصیدہ کی کمیابی کی وجہ وہاں کے سیاسی ماحول میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ ابتدا میں گجراتی حکمران مغلوں سے محفوظ رہنے کی سبیلوں میں مصروف رہے اور

---

① تاریخ ادبیات اردو ص ۱۱۳ ② ایضاً ص ۱۱۹

بعد میں مغلوں نے یہاں صوبیدار مقرر کر دیئے جن کی خود مختار حیثیت نہ تھی۔ یہاں قصیدہ کیسے پرورش پا سکتا تھا۔ اسے جس نوع کے شاہی شان و شوکت اور درباری ماحول کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ یہاں ناپید تھا۔ البتہ بزرگوں اور صوفیا کی شان میں اور خدا اور دیوتاؤں کی ثنا میں یہاں کے شاعروں کے دوہے، کبت اور نظمیں مل جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں مختلف شاعروں کی مثنویوں میں مدحیہ اشعار کی کمی نہیں ہے۔ حسین ذوقی نے اپنی مثنوی وصال العاشقین میں اورنگ زیب کی تعریف کی ہے۔ شیخ وجیہ الدین وجدی نے تحفۂ عاشقاں، پنچھی باچھا اور باغ جانفزا جیسی اپنی عمدہ مثنویوں میں حمد و نعت کے مضامین کو اہمیت دی ہے۔ سید اشرف اشرف نے جنگ نامۂ حیدر میں خدا، رسولؐ، علیؓ، فاطمہؓ اور حسنؓ، حسینؓ کی مدح کی ہے۔ ولی ویلوری نے اپنی مثنویوں روضۃ الشہدا، مثنوی رتن و پدم اور عائشہ فاطمہ وغیرہ میں حمد و نعت پر مشتمل اشعار بھی لکھے ہیں۔ مرتضیٰ نے مثنوی وصل نامہ میں اپنے مرشد شاہ سلطان کی مدح میں عمدہ شعر کہے ہیں۔

۱۶۹۵ء میں ایک گجراتی شاعر المتخلص بہ جنونی نے ایک قصیدہ قصیدہ معجزہ کے نام سے لکھا[۱]۔ اس کے ۲۷ اشعار ہیں یہ دراصل مولانا رومؒ کے اس فارسی کلام کا ترجمہ ہے جس میں بوجہل اور رسول اکرمؐ کے باہمی مکالمے کے ذریعے رسول اکرمؐ کے معجزات بیان کیے گئے ہیں اس قصیدے کے یہ اشعار دیکھیے

شعر زباں کہنی سکت ناہی جو اس کے سوبنی اوپر + جیسے نوری نبی کیتے آپس کے نور سیں ظاہر

تو نے جنونی یہ سخن در معجزہ کیتا ختم + حق تجھ اوپر آخر کرے اپنے کرم سیتے نظر

ایک اور گجراتی شاعر شیخ محمد امین کی معجزہ نامہ ۱۶۸۷ء، یوسف زلیخا ۱۶۹۷ء، تولد نامہ، معراج نامہ اور وفات نامہ ۱۶۹۲ء اہم تصانیف ہیں۔ وہ سنی العقیدہ شاعر تھا۔ اس نے اپنی مثنوی میں خلفائے راشدین کی تعریف کی ہے حضرت محی الدین جیلانی کی مدح میں اشعار لکھے ہیں[۲]

محمد علی عاجز کا نام سید محمد بھی لکھا گیا ہے۔ اس کے کلام کا لسانیاتی تجزیہ اسے گجراتی الاصل ثابت کرتا ہے[۳]

ڈاکٹر حفیظ سید نے اس کے ایک ایسے قصیدے کا تذکرہ کیا ہے جو صنعت غیر منقوطہ میں لکھا گیا ہے[۴]

قاضی محمود بحری م ۱۷۱۷ء کا دیوان ڈاکٹر محمد حفیظ سید نے مرتب کیا۔ ان کی مثنویاں من لگن اور بنگاب نامہ بھی معروف ہیں۔ دو منقبتی نظمیں بھی ان کے ادبی اثاثے کا حصہ ہیں۔ ان دونوں کے ممدوح شیخ محمد باقرؒ ہیں۔ ان نظموں کو ڈاکٹر محمد حفیظ سید نے قصائد کا نام دیا ہے[۵]۔ مثنوی نما نظموں کو قصائد کہنے کی وجہ ان میں موجود مدحیہ مضامین ہیں۔ بحری کی مثنوی من لگن میں اورنگ زیب عالمگیر کی مدح میں اشعار ہیں۔ البتہ ان کے مراثی میں غزل کی ہیئت کا استعمال انہیں قصیدے کے قریب کرتا ہے

---

① تذکرہ مخطوطات اردو جلد اول ② مقالہ نصیر الدین ہاشمی مثنوی یوسف زلیخا، مشمولہ مقالات شیرانی جلد اول ③ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند چھٹی جلد اردو ادب اول ص ۵۵۳ (از محی الدین قادری زور)

④ کلیات بحری مرتبہ ڈاکٹر حفیظ سید ص ۷۲، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۸ ⑤ کلیات بحری ص ۹۷

فصل چہارم : چند خصوصی مطالعے

[مشتاق]

محمد سخاوت مرزا نے اپنے مضمون بعنوان "کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا"[1] میں علی گڑھ کے ڈاکٹر نذیر احمد کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا[2]۔ ڈاکٹر نذیر نے مشتاق کو گیارہویں صدی ہجری کے ابتدا کا شاعر ظاہر کرتے ہیں اور اس کا تعلق قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار سے جوڑتے ہیں۔ سخاوت مرزا نے ڈاکٹر نذیر احمد کی اس رائے کی تردید کی ہے کہ مشتاق نے اپنے ایک قصیدہ میں میر خلیل اللہ بت شکن ثانی [معاصر سلطان محمود شاہ بہمنی م ۱۵۱۸ء] کی مدح کی ہے۔ ان کے خیال میں مشتاق کے قصیدے کے ممدوح تو خلیل اللہ خطاط الملقب بہ بادشاہ قلم ہیں۔ خطاط مذکور کا تعلق انہوں نے سلطان ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے زمانے سے بتایا ہے۔ مشتاق کی ایک غزل میں بہمنی کے لفظ کا استعمال ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر نذیر احمد کا استدلال یہ ہے کہ یہ کسی برہمن مہ جبین کی شان میں ہے۔ سخاوت مرزا اس کے برعکس کہتے ہیں کہ اس غزل میں شاعر نے بہمنی بادشاہ کے تزک و احتشام اور دربار کی عظمت کو موضوع بنایا ہے جس شعر میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو سہ اے بہمنی تجھ دوار نقیباں آتے ہو جاتے + جیوں دوار کے پوجن کو سباں آتے ہو جاتے

ڈاکٹر نذیر احمد کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے سخاوت مرزا کا کہنا ہے کہ بہمنی دور کے کتبات اور سکوں پر 'بہمن شاہ' کے الفاظ کندہ ہیں اور معاصر مورخ طباطبائی نے لکھا ہے کہ سلاطین بہمنیہ ایران کے مشہور بادشاہ بہمن ابن اسفندیار کی اولاد سے ہونے کے مدعی تھے۔ ویسے بھی برہمن کے لئے شمالی ہند میں برہمن اور جنوبی ہند میں بمن کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر یہ لفظ برہمن کے لئے استعمال ہونے لگا ہو۔ سخاوت مرزا کا کہنا ہے

> "مشتاق نے برہان الدین خلیل اللہ نبیرہ سید شاہ حبیب الدین محب اللہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا ہے جن کے صاحبزادے کا نام شمس الدین محمد تھا اور خلیل اللہ ثانی کا وجود بہمنی دور میں ہونا کوئی بعید از قیاس نہیں ہے یعنی محمود شاہ بہمنی ۱۵۱۸ء اور کلیم اللہ بہمنی ۱۵۲۶/۱۵۲۷ میں حضرات قدس سرہم بقید حیات تھے۔ فاضل نقاد [ڈاکٹر نذیر احمد] کا یہ خیال کہ خلیل اللہ سے مراد خلیل اللہ خطاط بادشاہ قلم معاصر سلطان ابراہیم عادل شاہ [۱۵۸۰ تا ۱۶۲۷] قرین عقل و قیاس ہیں ہماری ناقص رائے میں صحیح نہیں ہے[3]۔"

ان کے خیال میں مشتاق نے اپنے قصیدے میں اپنے ممدوح کے حسن و جمال کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اشعار دیکھیے

سہ۔ ناز کا اے طرز ہے کھینچے وفا پر قلم + غمزے کا اے طور ہے گود میں پالے ستم
صاف صفا صفحہ پر جدول مشکیں خط + موں پہ وفا کے رہیا فتح لبرے کا جم

---

① قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۰/۱۹۵۱ از سخاوت مرزا و کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا رسالہ اردو جنوری اپریل ۱۹۵۲
② کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر تھا رسالہ اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۸ ③ کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر تھا — نہیں تھا

مطلع ثانی کیوں شاہ جو ہے محترم + تخت ولایت اُپر شاہ سلیماں حشم
سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ ہے + ... بت شکن و دین کرم
معجزہ اس کے حسن کا حالیا فضا کا قلم + رخ کے جو آتش اپر سبزہ ہے خط کا رقم

یہ اشعار سراپا اور تعریف حسن کے حوالے سے ہیں۔ محی الدین قادری زور لکھتے ہیں "مشتاق نے ایک مرصع قصیدے میں حضرت شاہ خلیل اللہ بت شکن ثانی کی مدح کی ہے"[1] ڈاکٹر الف۔ د نسیم کا خیال ہے۔

"انہوں نے سید شاہ عبدالقادر عرف سید میاں ابن عبد المومن اللہ کی بھی مدح سرائی کی ہے۔ ان قصائد کی زبان اور ان میں شاعرانہ نازک خیالیوں اور لطافتوں کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ بہمنی دور میں اردو کس حد تک صاف اور مصفا اور اسالیب سے پُر ہو چکی تھی"[2]

مشتاق کے قصیدے میں تشبیبی اشعار بھی ہیں اور مدحیہ بھی۔ یوں لگتا ہے انہوں نے کسی پختہ نویس فارسی قصیدہ گو شاعر کی مانند اپنے قصیدے کی ابتدا کی ہے۔ طرز، وفا، قلم، غمزہ، ستم، صاف صفا صفحہ، جدول مشکیں، خط، فرق، جم، محترم، تخت ولایت، شاہ سلیماں حشم، بت شکن، معجزہ، آتش اور رقم کے الفاظ و تراکیب مشتاق کے فارسی مزاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسلامی و ایرانی تلمیحات کے استعمال نے انہیں اسی رو کا شاعر ٹھہرایا ہے جس کا تعلق عربی عجمی مزاج سے ہے۔ بہمنی دور ہو یا کوئی بھی دوسرا دور مسلم شعرا کے لئے اپنے تہذیبی اور لسانی منظر نامے سے منفک رہنا ممکن نہ تھا۔ قصیدہ کے مزاج میں موجود جلال و جمال کے عناصر کی جھلکیاں بھی ہمیں مشتاق کے ہاں نظر آتی ہیں۔ مشتاق کا یہ قصیدہ منقبتی انداز کا ہے تاہم اس میں عقیدت کا بیان سراپا نگاری کے حوالے سے بھی ہوا ہے۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے مجاز سے حقیقت تک پہنچنا ہماری قدیم صوفیانہ شاعری میں معیوب نہ تھا۔ بلکہ مشاہدۂ حق کی گفتگو جب تک بادہ و ساغر کے حوالے سے نہیں کی جاتی تھی شاعری حسن و تاثیر سے محروم رہتی تھی اور بات بنتی نہیں تھی۔

بہرحال مشتاق کو ہم دکنی ادب کے ابتدائی دور سے متعلق سمجھیں یا وسطی دور سے وہ پختہ قصیدہ نگار تھا اور اس لحاظ سے اہم بھی۔ بہمنی دور میں فارسی کا عمدہ استعمال اس کی تخلیقات کا خاصہ ہے۔ مذکورہ قصیدہ میں صاف صفا صفحے پر جدول مشکیں سے ہمیں سودا کے لامیہ قصیدہ کا یہ شعر بھی یاد آتا ہے

؎ آ بجو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے + خط گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

مشتاق کا ایک اور قصیدہ شاہ عبدالقادر عرف سید میاں نبیرۂ خواجہ ابوالفضل بیدری کی مدح میں ہے یہ ۲۸ بیت کا قصیدہ ہے اسکا مطلع ہے ؎ فیض کا ساقی دیا دل کے تئیں جب کا شراب + طبع دیا نسیم فہم کے گل کوں شباب[3]
اس قصیدے میں بھی مذکورہ قصیدہ کے خصائص ملتے ہیں۔

---

(۱) دکنی ادب کی تاریخ ص ۱۶-۱۷ (۲) تاریخ ادبیات اردو ادب اول حصہ جلد ص ۲۷۶ (۳) رسالہ اردو جنوری اپریل ۱۹۵۹

[لطفی]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب دکنی ادب کی تاریخ میں لطفی کا تذکرہ کرتے ہوئے
اس کا نام میر لطف علی لطفی [۱۲۲۳ تا ۱۸۰۵] بتایا ہے۔[1] یہ لطفی دور آصفیہ کا شاعر ہے۔ اسکا مخزن نکات میں بھی تذکرہ
ہے[2] اور وہ بہلول صادق نامی ایک مثنوی کا خالق ہے۔ اس مقام پر ہمیں جس لطفی کا تذکرہ کرنا ہے اسکا تعلق بہمنی دور
کے شعرا سے ہے۔ یہ لطفی مشتاق کا معاصر ہے۔ اردو کی ایک نایاب بیاض میں سخاوت مرزا نے لطفی کو بہمنی دور سے
متعلق کیا ہے[3]۔ ڈاکٹر نذیر احمد اپنے مضمون "قدیم اردو شاعر لطفی کے زمانہ کا تعین" میں لطفی کو ستھویں صدی کا شاعر
قرار دیا ہے[4]۔ تاریخ ادبیات اردو میں لکھا ہے کہ ان کا ایک زوردار قصیدہ کسی سلطان کی مدح میں ہے اور وہ
مشتاق ہی کی مانند قصیدہ گو اور غزل گو شاعر تھے۔ اس قصیدے میں انہوں نے خواجو کرمانی [فارسی شاعر] کا تتبع کیا ہے
خواجو کرمانی کے قصیدے کا مطلع ہے ۔ قرطۂ زرچاک زد لعبت سیمیں بدن + رشتۂ ملح فشاند شمع ومح لگن

لطفی کے اشعار دیکھیے ۔ مملکت دارا لیا بہمن اسفندیار + تخت فریدوں دیا بر بت سیمیں بدن
اے شہ دلدل سوار فارس خنجر گداز + صفدر شرزہ شکن، شہزۂ لشکر شکن

خواجو کرمانی حضرت نور سمنانی کے مرید تھے۔ نور سمنانی کا بہمنی دربار میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ لطفی کے قصیدے
کی تشبیب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ان میں سورج کے غروب ہونے اور چاند کے طلوع ہونے کا منظر دکھایا گیا ہے

چار پہر برقرار یو پچ رہیا تھا سنبار + غرب کے کوے منے ڈول ڈبایا رسن
نین سورج جھال تھے لعل ہوئے سرگ کے + رین کا کاجل منگا نین میں کھینچا انجن
سرگ تھے نکلیا چندر لعل لہو کے بھتر + سورج چھپایا خنجر چندر دکھایا کفن
چندر کا بالا بچہ رین کی دائی اچا + مشک و عنبر میں چھپا جھانک کے راکھے ختن
سرگ کا طوطی ہریا مشک خطائی چرٹیا + رات کا عنبر سریا صبح کی پھوٹی کرن

لطفی کے قصیدے کی زبان میں فارسی اور ہندی ہر دو روایات کا عکس نظر آرہا ہے۔ مملکت دارا، اسفندیار،
تخت فریدوں، بت سیمیں بدن، شہ دلدل سوار، فارس خنجر گداز، صفدر شرزہ شکن، شہزۂ لشکر شکن
وغیرہ کی تراکیب فارسی اور عجمی روایات کی خبر دیتی ہیں۔ برقرار، غرب، رسن، لعل، مشک و عنبر، ختن،
اور صبح وغیرہ کے الفاظ بھی انہیں سے مربوط ہیں۔ ڈول، نین، سورج، جھال، سرگ، رین، کاجل، چندر،
لہو اور بالا بچہ کے الفاظ ہندی اور مقامی علاقائی اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ فارسی قصیدہ کی زمین میں لکھے ہوئے لطفی
کے اس قصیدے میں بعض مصرعوں کی پختگی اور جلال و جمال آہنگ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قصیدے میں
شکوہ پیدا کرنے کے لئے فارسی زبان کے جلالی لہجوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مشتاق اور لطفی نے شاید اسی

---

① دکنی ادب کی تاریخ [illegible] لطفی
② مخزن نکات ۔ تذکرہ لطفی دیکھیے ص ۷ از ضیاء الدین قائم، اورنگ آباد ۱۹۲۹
③ اردو کی ایک نایاب بیاض رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۰ ص ۱۸
④ قدیم اردو شاعر لطفی کے زمانے کا تعین رسالہ اردو ادب علی گڑھ

حوالے سے فارسی زبان اور عجمی روایات کا استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر اے۔ دنسیم کا کہنا ہے

"قصیدے میں جب تک پرشکوہ فضا نہ ہو۔ قصیدہ صحیح رنگ نہیں پکڑتا یہ پرشکوہ فضا مضامین کی بلندی و رفعت اور خیالات کی سطوت و دبدبہ کے علاوہ زبان میں مرصع کاری سے بھی پیدا کی جاتی ہے۔ [ملا وجہی] اور [شوقی] نے قصیدے کی اس خصوصیت کو قائم رکھا ہے" (۱)

محمد قلی قطب شاہ

محمد قلی قطب شاہ م ۱۶۱۱ء، گولکنڈہ کا پانچواں قطب شاہی حکمران تھا۔ اس کا دیوان "کلیات محمد قلی قطب شاہ" کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے (۲) یہ دیوان اس امر کا غماز ہے کہ شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ اپنے دور کے کسی بھی دوسرے شاعر سے پیچھے نہیں ہے۔ اس نے اپنے دربار میں بہت سے شاعروں اور عالموں کو جمع کیا تھا میر محمد مومن، ملا وجہی اور غواصی کے پایے کے مصنفین اور شعرا کو اس کا قرب حاصل تھا۔ قلی قطب شاہ نے تقریباً تمام اہم اصناف سخن [غزل، مثنوی، مرثیہ، ترجیع بند، رباعی اور قصیدہ] میں طبع آزمائی کی۔ عربی، فارسی اور ہندی السنہ اور مسلم اور غیر مسلم تہذیبی عناصر کی آمیزش سے بننے والے اس کے نقطۂ نظر اور اظہاری سانچے نے دکن میں اردو شاعری کی روایات کو بہت مستحکم کیا۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کے دیوان کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ اس کے ہاں خیالات کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی تقریباً مفقود ہے اس کا دیوان بھی وہی گل و بلبل، شاہد و ساقی کی پرانی داستان کا دفتر ہے (۳)۔ اس تنقید کا کھلا جواب تو خود قلی قطب شاہ کی شاعری ہے جب وہ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے کہ "تو شاہاں اوپر مجھے کلس کر بنایا" یا "میرا قطب تارا ہے تاریاں میں نجل" یا "کرے مشتری رقص مجھ بزم میں نت" یا "تو مجھ پر فلک رنگ کا چتر چھایا" تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے ہاں تشبیہ اور استعارے کی ندرت نہیں ہے یا تخیل کی ندرت اور بلند پروازی مفقود ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے طویل قصائد اور مثنویاں نہیں ملتیں ورنہ یہ معلوم ہو جاتا کہ اس پر ایران کے کس شاعر (قصیدہ نگار) کا رنگ غالب ہے (۴) قلی قطب شاہ کے قصیدۂ بسنت کے اشعار کے درمیان یہ شعر بھی ملتا ہے

نزاکت شعر کے من میں خدا بخشا ہے توں تج کوں + معانی شعر تیرا ہے کہ پایا ہے شعر خاقانی (۵)

قلی قطب شاہ نے اپنے دیوان میں محمد، قطب اور معانی کے علاوہ چودہ اور تخلص استعمال کیے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ خاقانی کی تقلید میں بلند پایہ اشعار لکھنے کے لیے قطب شاہی عہد کی دکنی زبان ناکافی تھی

---

(۱) تاریخ ادبیات اردو جلد اول اردو ادب ص ۲۷۸ (۲) کلیات قلی قطب شاہ مرتبہ محی الدین قادری زور (۳) دکن میں اردو ص ۵۱ (۴) کلیات قلی قطب شاہ پیش لفظ ص ۳۹
(۵) کلیات قلی قطب شاہ ص ۳۷

محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں بارہ مکمل اور نامکمل قصائد طبع ہوئے ہیں۔ چونکہ وہ خود حکمران تھا اس لئے کسی حکمران کی مدح سرائی اس کے لئے ممکن نہ تھی تاہم نعت و منقبت کے قصائد اس کے دیوان کا حصہ ہیں۔ ایک قصیدہ باغ محمد شاہی کی تعریف میں ہے علاوہ ازیں عید، عید قربان، نوروز اور بسنت کی تعریف و توصیف میں اس نے متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ اس کے اکثر قصائد خطابیہ ہیں۔ البتہ دو نامکمل منقبتی قصائد کی تشابیب پر اس نے تخلیقی زور صرف کیا ہے۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلی قطب شاہ تشبیب کہنے کے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ یہ اشعار دیکھئے

سہ آج شہ چین چلیا شرق نگر تھے شتاب + ڈھال فلک کی اُچا او شہ عالی جناب
باندھ خنجر کرن کی، زریں فرنگ ہات لے + صبح کے وقت آیا پیک دو پیالی شراب
چتر کے فلک نیل مت، مستی سوں مکھ لال کر + گرم ہو چلنے لگیا اوں کے کنک بے حساب
شاہ ختن سن چلیا غرب نگر تھے لے فوج + رین کے تمثال رین رنگ جیسے ابے مشک ناب
اتنے میں دیتا ابے صلح خدا رین منیں + ہے تمیں نس دن کے شہ نال تم اتے باب
میں کیا تم دو کو شاہ یک سورج ہور یک ماہ + دھوتی تمیں دونوں جا دونوں کوں سر پہ داب
دن کوں سورج نس کوں چند مقرر کیا ہے وہ آب + چاند کو کیتا مجی سور کوں کیتا ڈھاب ①

یہ تشبیب سورج اور چاند کے آمادۂ جنگ ہونے کے منظر کو پیش کرتی ہے۔ ایک کو اس نے چین کا بادشاہ اور دوسرے کو ختن کا شاہ قرار دیا ہے۔ اس سے اس دور میں ہونے والی جنگوں کے نتیجے میں ابھرنے والی سیاسی کا سراغ بھی مل سکتا ہے علاوہ ازیں تقدیر پرستی اور قسمت کے نظریے کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ دنیا میں چاند ہو یا سورج یا کوئی اور شے سب کا اپنا اپنا منصب اور کام ہے۔ دوسری تشبیب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

سہ نس کے سمند سیام میں سستے کی زورق ڈبیا + ڈوبنے میں ترنے لگے بڑ بڑے کے لکھ ہزار
غرب کے چہ میں پڑیا یوسف انبر کا سور + جگ سبھیں یعقوب کے نین تمن اندکار
آگ براہیم کا جگ ہوا پھول بن + رین سو تس آگ کا ہے دھنوے کا دھندکار
چند ہو سکندر چلیا رین کے ظلمات میں + شمع دیپک مشعلاں روشن ہوئے اپار ②

اس تشبیب میں رات کے منظر کو قلی قطب شاہ نے عمدہ اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان تشابیب سے خبر ملتی ہے کہ قطب شاہی دور میں شاعر اسلامی تلمیحات و تصورات کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں فارسی ادب کے اثر کی بدولت تراکیب عمومی تھیں۔ قلی قطب شاہ کی شاعری میں دو الفاظ کو بغیر ترکیب کے مرکب بنانے کا ڈھنگ مقامی السنہ کا عطا کردہ ہے۔

قلی قطب شاہ کے قصائد جہاں منظر نگاری کے حوالے سے پختگی کے حامل ہیں۔ وہاں ان میں تین تہذیبی دھارے یکجا ہوتے نظر آتے ہیں۔ پہلا دھارا اس مقامیت کا ہے جسے دکنی بادشاہوں نے شمالی ہند کی مرکزیت سے اپنے آپ

①② کلیات قلی قطب شاہ ص ۲۰ - ۲۱ - ۳۸ - ۳۹

کو علیحدہ کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ بسنت کے حوالے سے اس کے قصیدے کو اسی تناظر میں پرکھا جا سکتا ہے۔ دوسرا دھارا عجمی اثرات کا تھا نوروز پر لکھا ہوا اس کا قصیدہ اس کا کھلا ثبوت ہے۔ فکر و ثقافت کے عجمی دھارے کو فارسی ادب کی استنادی حیثیت کے حوالے سے ہی قبول کیا جاتا تھا۔ تیسرا دھارا خالص اسلامی روایات کا ہے جس کے حوالے سے عیدین اور منقبت کے موضوعات کو اپنایا گیا ہے۔ عید میلاد النبی پر قلی قطب شاہ کا قصیدہ اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہ تینوں دھارے قلی قطب شاہ کے قصائد میں الگ الگ بھی ملتے ہیں اور امتزاجی حالت میں بھی۔ ان تینوں دھاروں کی الگ الگ مثالیں درج ذیل ہیں

بسنت کا پھول کھلیا ہے سو جیوں یاقوت رمانی + کرو مل کر سہیلیاں بسنت کے تائیں مہمانی (۱)
مگر شبنم کا ہے یا آدھر جلاب کا پیالا + پیو پی خوب ہو راوی خوب تج سوں مل پون سارا

اُمنگاں آپ اُمنگاں سوں آپس میں آپ مل ناچیں + تننا کا تنن ناچیں ہوئے تن تن تنن سارا (۲)
پھولاں کا عید ہے یک دہر خوشی نوروز کی یک دہر + اُنند اں طرح کر ساقی طرب ہو دل پیا دتا
جو اپنے برج اوپر مشتری ہو زہرہ آئے کر + بڑائی آن تھے پیا نوروز نوروزی صفا دتا (۳)

پیا مکھ نور تھے ہے جاوداں ہم عید و ہم نوروز + سورج آ دو حمل یا نہ عیاں ہم عید و ہم نوروز (۴)
حضرت نبیؐ پیغمبری حق تھے سو اس دن پائے ہیں + جبریل کن تھے مصطفیٰ کن وحی لے کر آئے ہیں
سارے نبیاں پر سروری دیتا خدا حضرت کوں توں + قدرت تھے چتر ہوئے کر سر پر اُجالا چھائے ہیں (۵)

قلی قطب شاہ کے قصائد میں منظر نگاری میں زور بیان (جس حد تک اس عہد کی زبان کی صلاحیت تھی) موجود ہے۔ خارج میں بکھرے منظروں کو وہ کچھ اس طور مربوط کرتا ہے کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے ایک مکمل تصویر آ جاتی ہے۔ باغ محمد کی توصیف میں اس کے قصیدے کے یہ اشعار دیکھئے قلی قطب شاہ کے پاس جزئیات کو جمع کر کے مکمل تصویر بنانے کا ہنر تھا

دسے فانوس کے درمیاں تھے جوں جوت دیوے کا + سو تیوں دستار والاں میں تھے میویاں کا برن سارا (۶)
بسے دم عیسوی دائم چمن میں گل لگانے تیں + ہرے نہالاں کے جلوے تیں مشاطا ہو پون سارا
سرگ تھے باغ کوں دیکھت کھلے منج باغ کے غنچے + سو اس غنچے کے باساں تھے لگیا جگ مگمگن سارا
چمن کے پھول کھلنے دیکھ سکیاں کا مکھ یاد آیا + سہانا تھا محمد جیل تمن ان کا نین سارا
دسے نا سیک کلی چنپا بھواں دو پات ہیں تس کے + بھنور تل دیکھ اس جا کا ہوا حیران من سارا
سو خوشے داکھ لڈکھاں کے ثریا سنبلاں ہے جوں + مسیے اس داکھ منڈوا سو جیا انبر گگن سارا
اناراں میں سہے دانے سو جیوں یاقوت پنتلیاں میں + ہر اک پھل اُس اناراں پر سہے سکے تمن سارا

نصیرالدین ہاشمی نے قلی قطب شاہ کی شاعری کو گل و بلبل کی شاعری قرار دے کر (۷) اردو ادب کے قارئین کے ذہن کو متعصب کرنے کی جو کوشش کی تھی قلی قطب شاہ کے دیوان کی اشاعت نے اس کی قلعی کھول دی ہے۔ خیالات کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی کے فقدان کا دعویٰ محمد قلی قطب شاہ کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے باطل ہو جاتا ہے

---

(۱) تا (۶) بالترتیب بسنت ص ۴۴، باغ محمد شاہی ص ۱۶، عید نوروز ص ۱۷، نوروز ص ۲۲، بعثت نبیؐ ص ۴۴ (۶) بسنت ص ۴۳ کلیات قلی قطب شاہ
(۷) دکن میں اردو ص ۵۰

"ویسے دمِ عیسیٰ دائم چمن میں گل لگانے تیں" والا شعر سودا کے قصیدہ لامیہ کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے

دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک +

ہوا باغ میں سبز پودوں اور درختوں کی مشاطگی کر رہی تھی ۔ قلی قطب شاہ نے "باغ محمد شاہی کی تعریف" کے عنوان سے جو قصیدہ لکھا ہے اس میں پیش کیے گئے مناظر کی اجمالی نثری وضاحت یہ ہے کہ اس باغ میں کھجوروں کے گچھے یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے مرجان کے پنجے ہوں ۔ تیلیں خوشوں کے اندر سے دن رات ستاریاں نظر آ رہی تھیں ۔ چمن کی بلبلوں کے گیت سن کر حوریں رقص کر رہی تھیں ۔ درختوں کے پتے مست ہو کر تالیاں بجا رہے تھے ۔ ان منظروں کی تازگی اور ندرت کا اندازہ کرنے میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔ دکنی ماحول کی زرخیزی اور شادابی کے ساتھ ساتھ قلی قطب شاہ نے اپنے شاہانہ مزاج کے حوالے سے عیش و نشاط میں ڈوبے منظروں کی عکاسی کی ہے ۔

قلی قطب شاہ کے مذکورہ قصائد مختصر منظومات ہیں ۔ ان میں پھولوں، روشنیوں، رنگوں، خوشبوؤں، خوشیوں اور حسن پرستیوں کے جلوے نظر آتے ہیں ۔ شاعر نے مبالغہ اور اغراق سے کام لینے کی بجائے تشبیہی اور حسیاتی طرزِ اظہار قبول کیا ہے ۔ ہم ان کے قصیدوں کو فطرت نگاری کی روایت میں لکھے گئے قصیدے قرار دے سکتے ہیں ۔ ان قصائد میں قلی قطب شاہ نے رسوم و رواج اور منظروں کی توصیف بھی کی ہے، اور عظیم مذہبی شخصیات کی بھی ! اس کے منقبتی اور نعتیہ قصائد میں داخلی ایمانی کیفیت اور عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار خوش اسلوبی سے ہوا ہے ۔ بعض اشعار سے سلطنتِ دکن کے سیاسی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ قلی قطب شاہ نے اکثر مقامات پر اپنے دشمنوں کا تذکرہ کیا ہے اور دعا کی ہے کہ اسے ان پر فتح حاصل ہو اور وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں ۔

نظر ہے مصطفےٰ ہور مرتضےٰ کا قطب شاہ اوپر + کہ دشمن کی پیشانی پر لکھے حرفِ پشیمانی (۱)

محمد ہور علی صفدر کے زوراں تے سدا + دشمن کلیجے میں کفر کی ہو مار گیا ول حیدر کا

محمد قلی قطب شاہ کے قصائد میں طوبیٰ، جنت، عشرت، ساقی، طرب، عید رمضان، شب برات، گنج قاروں، پری، حور، سجدہ، آستاں، آتش بازی، بہشت، بوستاں، نگارستاں، تہجد کی نماز، دعا دم، کشف، ازل، گنجِ لامکاں، ملک، قدسی، بارہ امام، ابراہیم کی آگ، کنوئیں میں یوسف، یعقوب کا بینائی سے محروم ہونا، دینِ محمد کا دشمن، اسلام و سجدہ، حاتم کی بخشش، الحان داؤد، دیو سلیمان، حج اکبر، صلوٰۃ، بخشش، نماز، خوارج، جبرئیل، شفاعت امتی اور موسیٰ و فرعون کے الفاظ اس کے تہذیبی مناظر کے ایک عنصر کو واضح کرتے ہیں ۔ جوت، کلی، جھومر تل، جھند، سہیلی، جگت، سنگاری، چھبیلی، سوند مدن، امرت، اباس، چتری وغیرہ کے الفاظ مقامی ہندی عنصر کے نشان دہ ہیں ۔ قلی قطب شاہ کے قصائد کا تہذیبی مزاج اسلامی خمیر سے بنا ہے ۔ کے قصائد میں علم فلکیات کے گہرے اشاروں کا سراغ تو نہیں ملتا تاہم سورج، چاند، ہلال، زہرہ، مشتری، قطب تارا اور چرخ وغیرہ کا بہت تذکرہ ہے یوں دکنی شاعری میں چرخیات کی ابتدائی صورتیں اجاگر ہوتی نظر آتی ہیں ۔ علاوہ ازیں جم، کوہ قاف، صاحبقراں وغیرہ کے الفاظ دیگر بہت سے الفاظ کے ساتھ بھی اثرات کے عکاس ہیں ۔ قلی قطب شاہ کی شاعری میں مختلف قسم کے زیورات اور جواہرات کا تذکرہ بھی ہے ۔ علاوہ ازیں ایک

---

(۱) ایضاً ص ۳۳ کلیاتِ قلی قطب شاہ (۲) محبہ قربان ص ۸ کلیاتِ قلی قطب شاہ

آدابِ شعور سے اس کی رقص و موسیقی سے دلچسپی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ قلی قطب شاہ کے قصائد کا موضوعاتی دائرہ سمٹا ہوا نہیں ہے۔ زندگی کی جزئیات پر اس کی توجہ اس کے مشاہدے کی خوبی کا ثبوت ہے۔ مذہب و عقائد، شاہی ماحول کی رنگینیاں، درباری معاملات، عامۃ الناس کی زندگی کی تصویریں، اپنے عہد کی تقریبات، مہمانوں کی خاطر مدارات، سامانِ آرائش و زیبائش، میلہ و مسلم رسومات اور معاصر علوم کے اشارے اس کی شاعری کو وسعت آشنا ٹھہراتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کے قصائد میں استعمال ہونے والی زبان میں فارسی، پنجابی، سنسکرت اور عرب کے الفاظ موجود ہیں اس زبان کا غالب لہجہ دکنی اردو کا ہے۔ ابھی اردو زبان میں مکمل اظہاری نکھار پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی گرامر کی بنیادیں واضح نہیں ہوئی تھیں۔ اس پر ابھی اس کی مکمل قلب ماہیت کرنے والے ذخیرہ الفاظ کا غلبہ نہیں ہوا تھا۔ یہ زبان ناہموار تھی۔ اسمیں جملہ سازی کے متعینہ معیارات نہیں تھے۔ اس کے باوجود قلی قطب شاہ نے اپنے تجربات و جذبات کو موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے لکھا ہے۔

"جو لوگ فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں اور جن کے ذوق کی بنیاد ایرانی شاعری اور بعد کے اردو کلام پر ہے انہیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں خیالات کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی، بندش کی چستی نہیں نظر آئے گی۔ نہ انہیں الفاظ کی نشست اور ان کی باہمی ترکیب میں کوئی خوبی معلوم ہوگی۔ اور نہ طرزِ ادا میں (جس پر کلام کی خوبی کا بہت کچھ انحصار ہے) کچھ زیادہ لطف آئے گا۔ اس میں سر اسر شاعری کا قصور نہیں پڑھنے والے کا بھی ہے۔ اس کے پڑھتے وقت یہ بات نظر انداز نہیں کر دینی چاہیے کہ یہ اردو کا قدیم ابتدائی کلام ہے۔ جس سے قبل کا کوئی کلام ہمارے پاس نہیں ہے اور اگر ایک آدھ چیز ہے بھی تو وہ کم و بیش ایسی ہی ہے۔ دوسرے اس کی زبان اس وقت کی ہے جب کہ اردو نے میدانِ ادب میں پہلا قدم رکھا تھا اس لیے نہ صرف زبان بلکہ طرزِ ادا میں بھی فرق پایا جاتا ہے" ⓵

محمد قلی قطب شاہ کے اظہاری سانچے سادگی آشنا ہیں۔ اس کے قصائد پر پُر تکلف اور صناعانہ طرزِ اظہار کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ ایک نئی زبان میں پُر شکوہ اور عالیشان صنفِ سخن استعمال کر رہا تھا۔ اس کی سادگی اور براہِ راست انداز کے پیشِ نظر بعض نقادوں نے یہ بھی خیال کیا ہے کہ اس کی شاعری حقیقت نگاری کے اتنے قریب آگئی تھی کہ شعرائے جاہلیت کی طرح اس نے حسن و عشق کی سچی داستانیں سنانے سے بھی گریز نہیں کیا۔⓶ یہ بیان فی الاصل اس بیان کا شاخسانہ ہے جو محی الدین قادری زور نے دیا ہے کہ دنیا کا کوئی شاعر اپنے کلام میں زندگی کو اتنا عریاں پیش نہیں کر سکتا جتنا محمد قلی نے کیا ہے۔⓷ آئندہ شاعری کے بارے میں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے تاہم ماضی میں کسی اور علاقے کے شاعروں کا ذکر نہ بھی کریں تو عرب معلقات ہی اس بیان کو رد کرنے کے لئے کافی ہیں۔

⓵ قدیم اردو ص ۱۲۸ ⓶ اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۳۵ ⓷ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ص ۲۰۸

غواصی

غواصی م ۱۶۵۰ء غواص تخلص بھی لکھتا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اسے فصاحت آثار کا خطاب دیا تھا (خطاب ملنے کو دیا ہے فصاحت آثار کا)[1] وہ اس کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ ۱۶۳۵ء میں عادل شاہی شاعر ملک خوشنود جب گولکنڈہ میں سفیر کے طور آیا تو اس کے جواب میں عبداللہ قطب شاہ نے غواصی کو اپنا سفیر بنا کر بیجاپور بھیجا۔ جہاں اس نے اپنے شعر و علم کا سکہ جمایا۔ یہی وجہ ہے کہ نصرتی اور مقیمی جیسے شعرا نے اپنی شاعری میں اس کو خراج عقیدت پیش کیا اور اس کا نام بہت احترام سے لیا۔ البتہ قلی قطب شاہ کے عہد کے نثر نویس اور شاعر ملا وجہی سے اس کی معاصرانہ چشمکوں کا سراغ ملتا ہے۔ وجہی نے قطب مشتری[2] کے دیباچے میں غواصی پر چوٹیں کی ہیں۔ غواصی کے ساتھ ایک واقعہ یہ بھی منسوب ہے کہ محمد قطب شاہ [جانشین محمد قلی قطب شاہ] کے زمانے میں اس نے اپنی مثنوی "سیف الملوک اور بدیع الجمال" مکمل کی۔ اس میں سلطان محمد قطب شاہ کی مدح میں اشعار لکھے ۱۶۲۵ء میں جب سلطان فوت ہوا تو اس نے اس کا نام نکال کر اس میں عبداللہ قطب شاہ کا نام شامل کر دیا۔ اس قسم کا ایک واقعہ غالب کے ساتھ بھی وابستہ ہے کہ اس نے بھی ایک مکفوی بادشاہ کی شان میں لکھا ہوا قصیدہ دوسرے کے نام کر دیا اور استفسار پر جواب دیا کہ "خدا نے بھی تو ایسا کیا تھا[3] بہرحال درباری شعرا میں سہل پسندی اور ضمیر کے نقطہ نظر کے حوالے سے اس نوع کی بہت سی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ طوطی نامہ اور مینا و ستونتی غواصی کی دیگر مشہور مثنویاں ہیں۔ کلیات غواصی محمد بن عمر نے مرتب کیا تھا۔ اسے بعد میں محی الدین قادری زور کے دیباچے کے ساتھ چھاپا گیا[4]۔ اس میں غزل، مرثیہ اور قصیدہ جیسی اصناف بھی دستیاب ہیں

کلیات غواصی کے قلمی نسخے[5] میں تو ۳۵ قصائد ہیں۔ محمد بن عمر نے ۲۱ قصائد کو مستند مانا ہے ان میں سے بھی چھ قصائد ناقص الاول ہیں اور ایک قصیدہ ناقص الآخر قصیدہ نمبر ۱۲ قصیدے کی ہیئت میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور رقمطراز ہیں[6] "کتب خانہ آصفیہ کے نسخے میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور دوسرے شاعروں کا کلام بھی کلام غواصی کے ساتھ بہ تبدیل تخلص خلط ملط کر دیا گیا تھا اور پروفیسر مرحوم (محمد بن عمر) نے ان دوسرے شاعروں کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے غواصی کے کلام کو علحدہ کیا تھا (اس پر پنسل سے حاشیے اور نوٹ لکھے ہیں) راقم الحروف نے انہی تصریحات کے بموجب کلیات کی کتابت کرائی ہے اور ان میں ایسی غزلیں، قصیدے اور رباعیات وغیرہ شریک نہیں کی گئی ہیں جن کو مرحوم نے مشتبہ قرار دیا تھا یا جن کے متعدد اشعار ناقص ہیں"[7]

---

(۱) کلیات غواصی مرتبہ محمد بن عمر (۲) مخطوطات انجمن جلد اول ص ۱۲۱ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن ۱۹۵۹ء (۳) اردوئے معلیٰ خط بنام یوسف مرزا (۴) کلیات غواصی مرتبہ محمد بن عمر مقدمہ محی الدین قادری زور
(۵) نسخہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ (۶) عبداللہ قطب شاہ کے قصائد کا تذکرہ نصیر الدین ہاشمی نے کیا ہے لیکن نمونہ دستیاب نہیں ہے (دکن میں اردو) مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے دکنی ادب کی تاریخ ص ۶۷ سے آگے
(۷) کلیات غواصی مقدمہ ص ۱۶

یا حصہ اول، جلد دوم ص ۵۵۶
مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۹

غواصی کے مطبوعہ کلیات میں موجود اکیس قصائد اس کی قصیدے سے رغبت کے غماز ہیں ۔ وہ خود لکھتا ہے

ع ہمیشہ تیری ثنا ہیں رتن بکھیروں میں + گیہ قصیدہ کہوں بے نظیر گاہ غزل

سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں اس کے قصائد پختگی اور فنی بالیدگی کے حامل ہیں ۔ الفاظ کی تراشیدگی، تراکیب کی ایجاد و اختراع میں انہیں امتیاز حاصل ہے ۔ غواصی نے رواں دواں بحروں میں رواں دواں اشعار نکالے ہیں ۔ دکنی زبان کے بوجھل اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے وہ گریزاں رہا ۔ فارسی تراکیب اور پر شوکت الفاظ کا استعمال اسے مرغوب تھا ۔ شستہ، صاف اور پاکیزہ اسلوب بیان غواصی کا طرۂ امتیاز ہے ۔ اس کے دیوان میں حمدیہ اور منقبتی قصائد بھی ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی قصائد میں اس کی طبیعت کا زور جولانی آشنا ہے ۔ اس نے مدحیہ قصائد کی بعض تشابیب میں بھی نعت و منقبت کے مضامین رقم کیے ہیں ۔ اسی طرح مذہبی قصائد میں دنیاوی ممدوحین کی مدح میں بھی اس نے کوئی عار نہیں سمجھی ۔ غواصی نے حضرت غوث اعظم اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مدح بھی کی ہے۔① غواصی نے اپنے اکثر قصیدے قصیدے کے فارسی ماڈل کے تابع ہو کر لکھے ہیں وہ کہتا ہے

ع قصیدہ ہور غزل کہنے کے فن میں دیکھتا ہے تو + غواصی میں ظہیر فاریاب کی نشانی ہے

ظہیر فاریابی نے گوہر ردیف میں ایک قصیدہ لکھا تھا جسکا مطلع ہے

ع سحر چوں تا تافت زدریائے خاوراں گوہر + زمانہ کرد بہ درج فلک نہاں گوہر

غواصی نے اس کی ردیف اڑا کر اور بحر بدل کر یہ قصیدہ کہا

ع دریا میں تھے جو نکلے بھار لے نگار موتی + سکو یا دے دیکھ تیرا مکھ آبدار موتی

غواصی نے قلی قطب شاہ کی شان میں بھی عمدہ قصائد لکھے ہیں ۔ ایک قصیدے کا مطلع ہے

ع جگ میں جو برگ سوا نیض بھریا توبہار + دھرت کوں رنگیں کیا پھول کھلا گلزار

ان کے قصائد منقبت سے ایک دو شعر ملاحظہ ہوں

جو خالق افلاک ہے کرتار علی کا + آکار کیا جگ میں اظہار علی کا
یہی حبیب خدا کا رسول ہے برحق + یہی طبیب نبی ہے شفیع روز شمار

ایک قصیدہ میں اس نے شاہ سے براہ راست طلب بھی کی یہ عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ہے

ع معمور ہو ایک گاؤں میں جوش کی دولت پاؤں میں + تو سگ سوں روش کھاؤں میں جم راج کرانے راج توں

غواصی نے ایک قصیدہ فتح کی لکھا ہے اسکا ایک شعر ہے

ع پنجہ سو تیرے ہاتھ کا ہے اللہ کا ہے نقش جبین + جو ہر سو تیری تیغ کا ہے مصحف زیور فتح کا ۔

غواصی کے قصائد اختصار اور طوالت کے اعتبار سے متوازن ہیں ۔ اس کے کلیات میں سب سے بڑا قصیدہ چھپن اشعار کا ہے ۔ شگفتہ اور مترنم بحروں میں کہیں کہیں ان کی طبیعت میں موجود مشکل پسندی کے آثار دکھائی دیتے ہیں

---

① دکنی اردو میں مدحیہ شاعری مضمون از پروفیسر نجم الاسلام صریر خامہ جامعہ سندھ ص ۱۰۱ شمارہ ۵ نمبر ۱۹۶۷ - ۱۹۶۸

انہوں نے لمبی اور مشکل ردیفوں اور بسا اوقات غیر مروج قوافی سے بھی کام لیا ہے[1] "آرسی" "موتی" "نین تو نین" "پکڑیا ہوں" "منج کا" وغیرہ جیسی مشکل ردیفوں میں رواں اشعار کی تخلیق ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ غواصی نے اپنے قصائد میں عارفانہ مفاہیم، مذہبی ارادتمندی، صوفیانہ جوش اور وعظ و نصیحت وغیرہ پر مشتمل مضامین خوش اسلوبی سے باندھے ہیں۔ ان کے قصائد کی تشابیب سے چند اشعار درج ذیل ہیں

سہ شکر خدا جو ذوق پر ہے ذوق نغمہ نگار آج + یعنی ہوا ہے ہر طرف ہور ابر گوہر بار آج
نادر بہارستان کا زرگر ہزاروں صنع سوں + کیتا جڑت گلزار کے فعازان کوں خوش سنگھار آج
عالم معطر ہوئے کر کیوں رات دن مہکا نتا + کھولیا یوں ہر پھول تھے صد نافۂ تاتار آج
باؤ جو مشاطہ ہو زیب دیا باغ کوں + جلوے میں آئے ہوئے ڈال عروساں کی سار
عطر کے طبلے کلیاں کھل جو کھلیاں تمام + ار گجہ کی باس کا جگ میں اٹھا مگ مگار
جو لگ تھے جو پریاں کن تھے بیقرار تو لگ + تج دلھن کے تن چڑے جیوں پڑے قرار موتی
خاطر میں کس رتن کوں لیائے نیں آج ہرگز + تج گل سری کے بالے ہیں قرب دار موتی
تاریاں سوں چاند گگن کا بے شک ہوئے دوانہ + چندنے میں جوں توں نکلے سب تن سنوار موتی

غواصی نے گریز کے جزو کو بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔ اپنے ایک رائیہ قصیدے میں بہاریہ تشبیب کے بعد حمد نعت اور معانی آفریں انداز سے بلکہ تمثیلی طور سے گریز کی ہے۔ شاعر موسم بہار کی سیر کر رہا تھا تو ایک بلبل نے اسے پکارا کہ تو کون ہے شاعر نے جواب دیا میں عاشق زار ہوں۔ اس پر بلبل نے اپنے عشق کی کتھا سنائی۔ بلبل سے ہمکلامی کے بعد شاعر پھول کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا

سہ دیکھ کے ہنس پر کہیا کوں ہوں میں جانتا + شاہ کے رخسار کا میں ہوں ہیں یادگار

دیگر گریز۔
تج نور سوں مشرف جب تھے ہوئے ہیں نبی تھے + گذرانتے ہیں اپنا خوش روزگار موتی
محبوب بدل توں قطب جہاں کی ہے کر + کہتے ہیں کان میں آ میرے پکار موتی
جو ہے قطب جہاں دکھن کے شاہاں میں شریف ازل + منج اس کا پیار کافی ہے کسی کا پیار نیں تو نیں
بکھیرن تج شہنشاہ کی مدح میں گوہر تازے + خوش اپنی طبع کوں جیوں ابر گوہر بار پکڑیا ہوں
نبیرا انگ جو حیدر آباد آج اس کا نانوں ہے + سو بے گماں بے شبہ ہے اوتار بندر فتح کا
قطب جہانگیر جو اس کی لطافت پہ تھے + زیب چمن تو ہی ہور باغ کو سو ہے سنگار

غواصی کے قصائد میں مدحیہ اشعار مبالغہ آرائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اس نے اپنے ممدوحین کی حق شناسی، حق گزاری، مرکز محفل ہونے، بہادری، دولت و اقبال، ملِ سبحانیت، بادشاہوں پر فوقیت وغیرہ کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی محفل آرائیوں، راگ رنگ، رقص و سرود وغیرہ کی توصیف بھی کی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں

---

[1] انہوں نے ظہیر فاریابی اور کمال خجندی وغیرہ کی زمینوں میں بھی قصیدے کہے۔
علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۳۹۷ مطبوعہ علی گڑھ یونیورسٹی ۱۹۶۲ء

مدح — آج نہ اس دھات کا جگ منے کوئی حق شناس + آج نہ اس سار کا شاہ کہیں حق گزار

بزم کی بستان کا ہین ہے چشم و چراغ + رزم کے میدان کا شیر ہے یو شہریار

دولت و اقبال سوں عزم کرے جس طرف + فتح و ظفر باندہ صف دعا ئیں یمین و یسار

کلانا بات کی جب کا مزا ہے تج میٹھے لب کا + عجب کچھ بے بدل چھب کا ہے تو اے ظل سبحانی

کرنے ترا سنگھاتی سلطان عبداللہ جو + شاہاں کے تار پر کا ہے شا ہوا ر موتی

اگر گدا کوں ترا لطف ہاتھ پکڑے آج + تو پل میں اس کو شہنشاہ روم و شام کرے

راگ رنگ تاناں ترانے ناچ سو ہر بند گیت + تار سو رمندل دو تارے چنگ سو روحی رباب

اس مدن بھوگ کی دولت پائے یوں رچھا سو + گر سنے دیوا اندر اتو نار ہے نچیج اس میں تاب

بلقیس کے مرتبے کوں انپڑائے + جس نار پہ توں جو پیار پکڑے

مناجاتی مدح — زبان اچھا تو ترے شکر سات اے باری + کہ ہر زباں پہ ترا شکر ہے سدا جاری

حسنِ طلب — نج نول شہ کے بزرگاں کہیں تار پرے ہم + یوں نہ رکھ تج دور میں ہمنا کو دیلے ہور بے آب

اس ضعیفی اور پیری وقت کر اے دستگیر + مہرباں ہو کچھ ہمیں دوتوں کی جمعیت کی بات [1]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے لکھا ہے

" غزلوں کے بعد کلیاتِ غواصی میں قصائد بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں
اس لئے کہ اتنے زیادہ، اتنے طویل اور اتنے عمدہ قصائد کسی دکنی شاعر کے
اب تک دستیاب نہیں ہوئے۔ یوں تو محمد قلی، نصرتی، افضل اور ولی وغیرہ
کے قصائد موجود ہیں، لیکن تعداد اور تنوع کے لحاظ سے موجودہ معلومات
کی حد تک غواصی دکن کے سب سے بڑے قصیدہ نگار ثابت ہوتے ہیں۔
انہوں نے فارسی کے مشہور و مقبول قصیدہ نگاروں ظہیر فاریابی اور کمال خجندی
وغیرہ کی زمینوں میں بڑے کامیاب قصیدے لکھے " [2]

انہیں دکن کا سب سے بڑا قصیدہ نگار تو نہیں کہا جا سکتا البتہ جیسا کہ خود محی الدین قادری زور نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ گولکنڈہ کے کسی اور شاعر کے اس پایہ کے قصیدے موجود نہیں ہیں [3] اس نقطہ نظر سے اتفاق ممکن ہے۔ غواصی کے قصائد میں سے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں

تحت الثریٰ تھے تا بہ ثریا رواج دے + قدرت ہر ایک چیز میں اپنی عیاں کا

امامِ دین و دنیا کا جو اس پنجے میں ہیں آج + گنبھیر شیرِ خدا کا علی ولی بیچ بل

حیات باد ہے اس باد پر نہ کرنا تاؤ + کہ باد کوں نیں پکڑیا منگی میں کوئی چگل

---

(۱) دونوں سے مراد غواصی اور وجہی ہیں (۲) کلیاتِ غواصی مقدمہ ص ۱۶ (۳) دکنی ادب کی تاریخ ص ۴۷

غواصی کے ہاں مدح، حسن طلب اور دعا کے حصے بڑے جاندار ہیں۔ اس کے زیادہ تر قصیدے خطابیہ ہیں یا اس نے تشبیب میں اختصار سے کام لیا ہے۔ ممدوح کے گھوڑے، تلوار، ڈھال، گرز، محل اور خیمہ کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جاہ و جلال، بہادری، سخاوت، عدل و انصاف وغیرہ پر اس کے موثر اشعار موجود ہیں۔ اس نے زندگی کی حقیقت، کائنات اور قدرت، خداوندی کے تعلق اور حیات کے گرفتار نہ ہو سکنے کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ اس نے ایک قصیدے میں برہمنوں کے مظالم کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی تھی

غواصی نے صنف قصیدہ کو اپنے دیگر معاصر شعرا کے مقابلے میں خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ اس کے قصائد میں فارسی اور دکنی الفاظ کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ شکر خدا، سکندر، سر پر، سلیمان وقار، ابر گوہر بار، نافہ تاتار، مشاطہ، عروس، آبدار، عود سوز، عنبر، عاشق شعار، اور دل فگار وغیرہ کے الفاظ و تراکیب کے ساتھ جگ، پرگٹ، دلوت، جاؤ، اور باگ وغیرہ کے الفاظ ہمارے دعوے کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ ازیں مصرعہ سازی میں بھی اس نے بھر پور لسانی روایتوں کی شاعری سے کام لیا ہے۔ یہی حال اس کی مثنویوں اور غزلوں کا ہے۔ غواصی نے اپنے قصائد فارسی زبان کے بہترین قصائد کو نمونہ بنا کر لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر عجمی تہذیبی اثرات سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ بادشاہ کے لئے ظل سبحانی، ملک ابد کا خسرو وغیرہ کے الفاظ اسی روایت کا حصہ ہیں اس روایت کا شدید احساس قارئین کو شاید اس لئے بھی نہیں ہو پاتا کہ دکنی زبان قدیم اردو ہے۔ اس کی عادت عمومی نہیں ہے اور اس میں استعمال ہونے والے متعدد الفاظ متروک ہو چکے ہیں۔

غواصی کی شاعرانہ تفوق کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مقیمی، نصرتی، غوثی بیجاپوری اور عشرتی وغیرہ نے اس کی شاعرانہ عظمت کا لوہا مانا ہے۔ مقیمی نے اس کے تتبع پر فخر کیا ہے[1] غواصی ملا وجہی کی چوٹوں کا جواب دیتے ہوئے فخر و تعلی کے انداز میں کہا تھا

؎ بیراگیاں عجب شکرستاں ہے + جو اس تیں میٹھا سب ہندوستاں ہے

یہ حقیقت ہے کہ اس کی شاعری کی شیرینیوں سے کم از کم دکنی شعرا بہت مستفیض ہوئے۔

---

[1] دیکھئے تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۳۷۴ - ۴۷۴

علی عادل شاہ شاہی

علی عادل شاہ شاہی بیجاپور کا حکمران تھا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۶۵۶ تا ۱۶۷۲ تک تھا۔ مبارز الدین رفعت[1] اور زینت ساجدہ[2] نے اس کے کلیات اپنے اپنے طور پر مرتب کیے ہیں۔ شاہی نصرتی کا استاد بھی تھا اور مربی بھی۔ اس کا شمار دکنی دور کے اہم شعرا میں ہوتا تھا۔ اپنے عہد میں بیجاپور میں دکنی شاعری کو گھر گھر مقبول بنانے کا سہرا اس کے سر ہے۔ شاہی نے صنفِ قصیدہ کے نظمیہ امکانات سے بھرپور استفادہ کیا۔

کلیاتِ شاہی میں چھ قصائد شامل ہیں۔ پہلا قصیدہ حمدیہ ہے مگر ناقص الاول۔ اسکا پہلا شعر ہے

؎ عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بول + عقل معلم ایسیں قصہ سکھایا کین[3]

اس قصیدہ کے ۲۹ اشعار محفوظ ہیں۔ دوسرا قصیدہ نعتیہ ہے یہ ۵۰ اشعار کا ہے۔ اس کی تشبیب بہاریہ ہے اس کا مطلع ہے ؎ دیکھو نوروز چینچل یو بہارستاں دکھایا ہے + برگ بن پھل و پھولاں تیں لون کے بٹ کھلایا ہے[4]

اس نعتیہ قصیدہ کے تمہیدی حصے میں۔ تمثیلات و گلستاں کے تلازمے باہمدیگر پیوست ہیں۔ شاہی کا تیسرا قصیدہ منقبتِ علیؑ کے حوالے سے ہے۔ اس کی تشبیب میں شراب و شباب کے موضوع پر اظہارِ خیال ہے مطلع دیکھیے ؎ آرے کلال مجھ کوں پیالا پیا میا کا + تا مست ہو کے دیکھوں مکھڑا علی پیا کا[5]

یہ قصیدہ بھی ۵۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ شاہی کے چوتھے قصیدے میں دوازدہ امام کی ثنا ہے۔ اس کی تشبیب میں عشقیہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہ قصیدہ ۶۵ اشعار کا ہے۔ اسکا مطلع ملاحظہ ہو۔

؎ مج دل کیرے میدان پر جب عشق کے فوجاں چڑھے + تب ہوش کے راوت جتے مکھ موڑ ہو بے خود پڑے[6]

شاہی کا پانچواں قصیدہ محل محل للابیہ ہے۔ اس میں حوضِ علی دار محل اور باغ کی تعریف ہے۔ اسکا آغاز یوں ہوا ہے ؎ دسے مج نین میں اس حوض میں چندنا یو نجل + دھریا ہے چاند نیں جیوں ٹیک ایس مکھ کے اگل[7]

قصیدہ محل محل کے بھی ۶۵ اشعار ہیں۔ ۱۱۹ اشعار کا قصیدہ چار در چار شاہی کا چھٹا قصیدہ ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎ دیکھو اچنبا لگیا ہے یو بن نوے گلاں سوں بھریا ہے را + سرو و صنوبر سمن کے بیلاں پھلے ہیں پھولاں اچھے مکار[8]

یہ قصیدہ عشقیہ جذبات و خیالات کا مظہر ہے۔

شاہی چونکہ حکمران تھا اس لئے اس نے دنیاوی ممدوحین کی طرف توجہ نہیں دی۔ البتہ مذہبی شخصیات، باغات اور عمارات کی تعریف میں اس کے قصائد اس کے علمی مرتبے اور شاہانہ مہارتوں کے نقیب ہیں۔ قصائد میں جس نوع کے شکوہی معاملات اور پختہ اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے شاہی نے ان سے اغماض نہیں برتا۔ اس کا ہر قصیدہ اپنے آہنگ، طریقِ کار، موضوع کے تفصیلی تلازمات اور اظہار یاتی تاثیر کے حوالے سے قصیدہ گوئی کے

---

① کلیاتِ شاہی مقدمہ مبارز الدین رفعت مطبوعہ علی گڑھ ② کلیاتِ شاہی مرتبہ زینت ساجدہ مطبوعہ حیدرآباد اردو اکیڈمی
③ قصیدہ در حمد ص ۱ ④ قصیدہ در نعتِ پیغمبر ص ۳ ⑤ قصیدہ در منقبت حضرت امیر المومنین علیؑ ص ۱۱ ⑥ قصیدہ در منقبت دوازدہ امام ص ۱۷
⑦ قصیدہ محل محل ص ۲۵ ⑧ قصیدہ چار در چار ص ۳۸

(اپنے) معاصرانہ معیارات کے مطابق ہے۔ تخیل کی کرشمہ سازیوں، جذباتی ترسیلوں، اسالیبی سبیلوں اور طرزِ فکر کی ندرتوں کے اعتبار سے وہ اپنے معاصر کسی بھی قصیدہ نگار سے کسی طور کم نہیں ہے۔ شاہی کے قصائد کی طرزِ ادا کا جائزہ قاری پر یہ عقدہ وا کرتا ہے کہ سادہ اور عام فہم الفاظ کو شاعر کے مزاج کا شکوہ شان و شوکت کا حامل بنا دیتا ہے اور یوں روزمرہ اور معمول الفاظ شاعرانہ ترکیب کا حصہ بن کر بلند آہنگ ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاہی کے قصائد میں مشکل، ادق اور غیر مانوس الفاظ دکنی زبان سے قاری کے نامانوس ہونے کی حد تک ہیں۔ شاہی کے موثر طرزِ بیاں کا یہ وصف ہے کہ اس کے ہاں ہر نوع کا خیال برجستگی اور روانی کے کوائف میں ڈوبا ہے۔ اپنے نعتیہ قصیدہ کی اس نے لکھا ہے کہ قصیدیاں میں مرصع کر قصیدہ یوں بنایا ہے۔

شاہی کے یہ قصائد اس کے عقائد کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ ان میں اس کی عقیدتیں اور دلچسپیاں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ شمالی ہند کے حکمرانوں اور جنوبی ہند کے حکمرانوں کے مذہبی عقائد میں بڑا تفاوت تھا۔ دکنی ریاستوں میں شیعیت کا دور دورہ تھا۔ شمالی ہند میں حنفی عقائد راسخ تھے۔ البتہ دونوں سلسلوں کے اثرات ایک دوسرے کے علاقوں میں تھے۔ عمارت سازی، فنونِ لطیفہ اور علم و ادب میں دلچسپی شمالی اور جنوبی ہند کے حکمرانوں میں مشترک تھی۔ قلی قطب شاہ اور علی عادل شاہ شاہی کے شعری کلیات میں۔ باغوں، محلوں اور حوضوں کی تعریف ملتی ہے۔ محرم اور دوازدہ امامین اور دیگر مذہبی نظموں کے حوالے سے ان بادشاہوں کے عقائد کی خبر ہم تک پہنچتی ہے۔ شاہی کے قصائد میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا کے اجزا کے اشعار دیکھیے

تشبیب ؎ عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے + عقل کا جاسوس ہو مکھ پہ اچھے یوں کرن
عقل کے کونے جتنے نیم دلوم ہو رکتے + عقل کو اوصاف کالے کے بیٹھائے برن
سرگ کے اوج کی کرسی سنوار یا دول ہو دنگر + چندر تارے بلائے گھر لینت رانبایا ہے
کھلائے ہانس گل ڈالیا ثریا کا ہند لعبیا کر + گگن ہیرا ہوا شہری لگن اپنا گنایا ہے
ہوا پردہ ملیح کا کر ستاریاں کا تنگ تس کر + مشاطہ مشتری ہو کر پلنگ سورج لگایا ہے
جو عشق کے سلطان کا فرمان گھٹ میں آیا + اینال ہو پتلیاں لو دو خدمت بدل تس دن کوٹے
نادر ہوا سلطان لو اب بڈ کیا حیران ہو + جب عشق کے پردھان مل بڈ سات صف در صف لڑے
سینا مگر ظلمات ہے دل آپ تس میں پانچ ہے + دستے نشانیاں عشق کی جیسے سکندر تھم بڑے

گریز ؎ عقل کا جس گھٹ منے پورا چھے گا گھنا + حق کوں وہی پا اول راہ لگا دے لگن
گلابی پھول پر دعوی لگیا کر نہ سمن سیفتی + کھیا مالی نہ کر دعوی بڑا او وناؤں پایا ہے[1]
ہر یک لگا دے عشق کیں مجھ عشق ہے اس شاہ کا + جس کے کفر گ کا ناؤں سن کفار جگ کے ہر ٹلے

---

① اسکا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎ وہ بولیا باغ مالی سوں بڑا ہے ناؤں سو کس کا + کھیا وہ اسم احمد کا جنے دیں آپ بنایا ہے

مدح
خاک کے پتلے بنا روح لے تن میں ہوا + چال چلا کر اول آپ سکھایا مگن
آپ کو آتش ملا خاک و ہوا نے ملا + چار عناصر لگا دیہہ سنواریا ہمن
مطہر جسم ہے اعلیٰ منور اسم ہے سارا + بڑائی جب دکھایا توں گگن نے سر نوایا ہے
نپایا یا رب محمد جب کھپایا یا کفر کا تب + نزخ جا کاخ کسریٰ سب اگن ساری بجھایا ہے
جگت کے سر اوپر سایہ گگن کا روز محشر تک + تری نعلین کا سایہ گگن کے سیس چھایا ہے

دعا
آہ و افسوس کے تسبیح تے محفوظ دلہر + سایہ کرم کا دکھا ذوق سوں رکھ مجھ بدن
تمہارے عشق کا نس دن دھندا دل ہے دلوا شاہی + چرن تل سیس لا اپنا دعا منگنے کو رہا یا ہے

دوازدہ امام کے قصیدہ میں مدح کے حصے میں حضرت علیؓ [بہادری] حضرت امام حسنؓ [شہادت] امام حسینؓ [قربانی] امام زین العابدینؓ [ہدایت] امام باقرؓ [معلم] امام جعفرؓ [استاد الاساتذہ] امام کاظمؓ [کرامت] امام موسیٰ رضاؓ [کرامت] امام متقیؓ [ظالموں کا خاتمہ] امام نقیؓ [نکتہ داں] امام عسکریؓ [سرداری] اور امام مہدیؓ [مقبول جہاں] کی ثنا میں ان کے ناموں کے آگے مذکور صفات کے حوالے سے شاہی نے ایک ایک شعر لکھا ہے۔

شاہی کی تشابیب تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کسی تشبیب میں اس نے عقل کی بڑائی بیان کی ہے اور کسی میں عشق کی۔ (عقل و عشق کے موضوعات دکنی شعرا کو مرغوب تھے۔ نصرتی نے گلشن عشق میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ دکنی نثر میں حسن و عشق کے موضوع پر ملا وجہی کی سب رس لاجواب ہے)۔ شاہی نے تشابیب میں بہت سی نزاکتیں بھی پیدا کی ہیں مثلاً نعتیہ قصیدہ کی بہاریہ تشبیب لکھ کر نعت رسولؐ بیان کرنے کے لئے روشن، بالیدہ اور لطیف پس منظر مہیا کی ہے۔ قصیدہ چار در چار خالص عشقیہ فضا سے تیار ہوا ہے۔ مذہبی قصائد کی تشبیب میں خمریات کا استعمال شاہی نے عمدہ انداز سے کیا ہے۔ شاہی کا لاجبہ قصیدہ حوض شاہی کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ حوض کی صفائی، فوارے کی خوبصورتی، جل کنول، مچھلیوں کا حسن اور اس کے پانی کی تاثیر کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد علی دار محل کے فرش، سقف، اس کی آرائش اور تعمیراتی حسن کی توصیف کی ہے۔ اس میں باغ شاہی کے رنگ برنگے پھولوں اور بیلوں کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ شاہی نے یہ بھی لکھا ہے

دکھانے طبع کی قوت شاہی اس بحر میں + بندھیا ہر بیت میں کئی لفظاں یوں صنعت کے نول

اس قصیدے میں علم نجوم کی اصطلاحات کا استعمال شاہی کے مطالعے اور فنی مہارت کو ظاہر کرتا ہے

جان ہور دل تجھے اُجابات دعا منگتا ہے + تا اچھے امن میں سکھ چین تے یو خلق سگل
جو لگوں نور سوں دنکر اچھے ہور چاند رتن + جو لگوں زہرہ ہے زاہر اچھے ہور پیر زحل
مشتری سعد ہے جو لگن و عطارد ہے دبیر + جو لگوں پانچوے آکاس پہ دستا ہے منگل
تو لگوں رات دن و پہر گھڑی جشن منے + بجو آنند سوں اس گھر میں سدا تال بندل

یعنی شاعر دل و جان سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے کہ ساری خلقت سکھ چین اور امن سے رہے۔ جیسے نور سے

سورج چاند اور آسمان روشن ہے۔ جیسے زہرہ روشن ہے اور بوڑھا زحل جیسے مشتری سعد ہے اور عطارد دبیر جیسے پانچویں آسمان پر مریخ نظر آرہا ہے۔ ویسے ہی ان کے رات دن اور پہروں کی گھڑیاں جشن کی حالت میں رہیں۔ اور اس گھر میں آنند سے تال اور منڈل بجے"

شاہی کے قصائد سے شاہانہ طمطراق اور رعب و داب کا عنصر لیے ہوئے ہیں۔ زورِ بیان، تازہ لفظیات اور موثر اظہار کی بدولت اس کے قصائد اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا ممدوح چاہے کوئی برگزیدہ ہستی ہے یا بے جان حوض، محل یا باغ ہے اس کا قلم اس کی مناسبت سے رواق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ شاہی کے مذہبی قصیدوں میں عقیدت و احترام کے جذبات اظہار کی خلوص سے تلمیذ ہوئے ہیں۔ علی عادل کے توصیف بیان میں شگفتگی کا عنصر غالب ہے۔ شاہی کے قصائد میں زندگی روشن اور کھِلی کھِلی سی محسوس ہوتی ہے۔ ہر شے نکھری نکھری سی، تازہ خوشبوؤں اور رنگوں میں بسی دکھائی دیتی ہے ہجر و فراق کی کیفیات کے اظہار میں بھی اس کا شاہانہ وقار قائم رہتا ہے۔ اس کے قصیدے بلند آہنگ اور موسیقیت سے معمور ہیں۔ ان قصائد میں تخیل کی لطافت، ضروری جزئیات کا اظہار، مجرد خیالات کا تاثری بیان، موضوع کا ممکنہ پھیلاؤ اور فارسی قصائد کی روایت کا عکس وغیرہ جیسے خصائص امتزاجی حالت میں سامنے آئے ہیں۔

شاہی کے قصائد سے اس کی حسن پرستی، رندمشربی، موسیقی سے محبت، آرائش و زیبائش کی جانب جھکاؤ اور طرب و مستی کے کوائف کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ منقبتی قصائد میں بھی وہ ان سے گریزاں نہیں ہے۔ منقبت علی کے قصیدے میں اس نے حضرت علی کو "پیا" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔[1] اس قصیدے کی تشبیب میں شراب و ساقی کے معاملات کا بیان ہے۔ انگیا کے بند بھی کھلتے نظر آتے ہیں[2]

سہ شق کے مدن پورن میں پیو کی پھرا دو رائی + لاگیا ہے بھوت میٹھا دو ڈول عد پیا کا

پیو سات رات جاگوں پیالا پیا سوں مانگوں + پیالا سچا دیا ہے پیو ہات کے دیا کا

اس قصیدے میں شاہی نے ہندی روایات سے استفادہ کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فارسی کے ساتھ اسے مقامی لسانی اور ثقافتی سانچوں سے بہت دل ہے۔ شاہی کی تشبیہوں میں ندرت، استعاروں میں تازگی، کنایوں میں اُپج ہے۔ یوں وہ واقعی استاد عالم کے درجے پر فائز نظر آتا ہے۔ نصرتی نے کہا ہے

سہ اے نصرتی جب توں منگے لکھنے مخمس بے بدل + تو قافیا میں لیا بند تھیا استاد عالم کی غزل،

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہی کی شاعری پر حسن شوقی کی غزلیات کے اثر کی روداد بیان کی ہے اور لکھا ہے

> " شاہی نے جب شعور کی آنکھ کھولی حسن شوقی کی شاعری کی دھوم سارے دکن میں مچی ہوئی تھی۔ اور خصوصاً اس کی غزل نئے شعرا کے لیے جدید اسلوب اور نئے معیارِ سخن کا نمونہ بن چکی تھی۔ نئی نسل کے شعرا اس کی زمینوں میں غزلیں کہہ رہے تھے۔ اس کی غزلوں کی تضمین کر رہے تھے اور

---

(۱) تا مست ہو کے دیکھوں مکھ اعلیٰ پیا کا (۲) آنگ بول رہوں اب بند کھول انگیا کا

اس کے انداز بیان کی پیروی کر کے اپنی انفرادیت کے خدوخال نمایاں کرنے میں مصروف تھے۔ شاہی کی غزل پر بھی حسن شوق کے اثرات نمایاں ہیں" اس کی غزل پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ فی الحقیقت اس کی پوری شاعری پر تھے" (۱)

جمیل جالبی نے یہ بھی کہا ہے کہ شوقی کی غزل کے مزاج اور فارسی رنگ و آہنگ کے اثرات قبول کرنے کے باوجود بحیثیت مجموعی شاہی کی شاعری پر بیجاپوری اسلوب و روایت کے اثرات ہیں۔ مبارز الدین رفعت نے شاہی کو نصرتی کے بعد دکن کا سب سے بہتر قصیدہ نگار کہا ہے (۲)۔

شاہی کے قصائد کی روانی اور موسیقیت میں جہاں اس کے موسیقی سے لگاؤ کو دخل ہے۔ وہاں شاعرانہ وسائل کے ماہرانہ استعمال کی اہمیت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے صناعانہ آورد اور بے جا جوش و خروش سے اپنے قصائد کو پاک رکھا۔ شاہی اپنے قصیدہ چار در چار میں کہ جس کا موضوع عشق و حسن پرستی ہے سولہ رکنی بحر متقارب مثمن مقبوض اضاعف) استعمال کی ہے اور اس کا نام بقول زینت ساجدہ اسی حوالے سے چار در چار رکھا ہے (۳) زینت ساجدہ نے اس قصیدہ لامیہ کی بحر کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شاعر نے قصیدوں میں لفظوں اور بحروں کے انتخاب میں کمال دکھایا ہے۔ یہی وہ گر ہے جس کی بدولت ہیئت اور موضوع اور اظہار و معانی میں شاعری کو ساحری بنانے والی ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ شاہی نے شاعری میں موسیقی اور بحر کے انتخاب کے بارے میں خود کہا ہے "بارے کہتا ہوں اتا چند سخن خوش وزن" "جیتے بحر میں بحر میٹھائیوں ولے ہیے مشکل اگر ہند میں کوئی" - میٹھی رواں اور آہنگ بھری بحروں کے انتخاب میں شاہی دیگر معاصر شعرا سے ممیز ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان اور اسلوب میں پختگی کے عناصر کا فقدان ہے۔ یہی نہیں اوزان کے اعتبار سے بھی اس کے ہاں عموماً دکنی روایت ہی کا اثر ہے یعنی ضرورت شعری کے مطابق لفظوں کی قطع و برید، کسی حرف کا گرانا، بڑھانا، تلفظ بدل کر یا عوامی تلفظ استعمال کرنا۔! شاہی کو قصائد میں صنعتوں کے استعمال کا بھی شوق تھا۔ منظر نگاری اور محاکات کے اعتبار سے بھی اس کے قصیدے اعلیٰ پایہ کے ہیں۔

---

(۱) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۳۲۰ - ۳۲۱ (۲) کلیات شاہی مرتبہ مبارز الدین رفعت ص ۴۰
(۳) کلیات شاہی مرتبہ زینت ساجدہ ص ۷۶

نصرتی۔

نصرتی م ۱۶۸۴ء علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔ وہ اردو مثنوی نگار شعرا میں ممتاز تھا ۔ گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری اس کی بلند پایہ مثنویاں متصور ہوتی ہیں ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کا دیوان ترتیب دے کر چھپوایا ہے ۔ اس کے دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے

"لطف کی شیرینی تخیل کی پرواز اور چند لفظوں میں معانی کا دفتر بیان کر دینا نصرتی کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جو ہمیں اس طور پر بہت کم شعرا کے ہاں نظر آتی ہیں ۔ قصیدوں میں اس کے تخلیقی عمل نے ایسا رنگ جمایا ہے کہ نصرتی اردو کا پہلا بڑا قصیدہ نگار بن کر سامنے آتا ہے" (۱)

نصرتی عادل شاہی حکومت کے دورِ آخر کا شاعر ہے ۔ علی عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد اس کے شیر خوار بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا اور اس پر عادل شاہی خاندان کی حکمرانی ختم ہو گئی ۔ نصرتی کو گارساں دتاسی نے برہمن قرار دیا تھا ۔ تاہم حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی مدح میں گلشن عشق میں اس نے جو اشعار لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد بھی مسلمان تھے اور وہ خود بھی ۔ یہ شعر دیکھئے

بحمد اللہ کرسی بہ کرسی مری + چلی آئی ہے بندگی میں تری (۲)

مثنویوں کے علاوہ نصرتی کی غزلیں اور قصائد بھی معیاری ہیں ۔ شوکتِ الفاظ، مضامین کی بلندی اور پر تاثیر اظہار میں نصرتی دکنی دور کے شعرا میں تخصیصی مقام رکھتا ہے ۔ اس کی مثنوی علی نامہ میں سات قصائد علی عادل شاہ ثانی کی مدح میں ہیں ۔ علی نامہ اور گلشن عشق کے منظوم عنوانات کو یکجا کرنے سے دو اور قصیدے حاصل ہوتے ہیں ۔ مدح علی عادل شاہ ثانی، قصیدہ گھوڑا مانگنے کی درخواست پر اور قصیدہ چرخیہ کو شامل کر کے قصائد کی تعداد بارہ ہو جاتی ہے ۔ ہجو سنور کے عنوان سے اسکا ایک ہجویہ قصیدہ بھی ملتا ہے یوں کل قصائد کی تعداد ۱۳ ٹھہرتی ہے ۔

نصرتی کے قصائد بے جا مداحی اور خوشامد پرستی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ۔ اس نے ان میں وقوعات، جنگ اور مناظرِ قدرت کی موثر عکاسی کی ہے ۔ نصرتی نے اورنگ زیب کی ہجو میں بھی اشعار کہے ہیں ۔ علی نامہ کا قصہ جاتی منظر نامہ علی عادل شاہ ثانی کی ان مہمات سے تیار ہوا ہے ۔ جو اس نے شیواجی کی یلغار کو روکنے، کرنول کے حبشی سرداروں کو شکست دینے، راجہ بدنور کی سرکوبی کرنے اور مغلوں کے سردار جے سنگھ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی راہ میں حائل ہونے کے سلسلے میں انجام دیں (۳) ۔ اس مثنوی میں نصرتی کے سات قصائد ہیں ۔ ان میں سے کوئی قصیدہ تزویج جشن کے حوالے سے لکھا گیا ہے اور کوئی فتح کی مبارکباد دینے کے لئے ۔ یہاں قدرتی مناظر و مظاہر کے بیان پر مشتمل قصائد بھی دستیاب ہیں (۴) معراج نبیؐ کے موضوع پر ۱۳۲ اشعار کا طویل قصیدہ بھی نصرتی کی یادگار ہے

---

(۱) دیوان نصرتی مرتبہ جمیل جالبی ص ۱۳ (۲) گلشن عشق ص ۲۱ (۳) نصرتی از ڈاکٹر عبد الحق ص ۸۱ تا ۲۱۶

(۴) علی نامہ از نصرتی مرتبہ عبد المجید صدیقی، حیدر آباد دکن ۱۹۵۹ء

یہ اس کے چرخیہ قصائد کے زمرے میں آتا ہے۔ چرخیہ قصائد میں جزوِ تشبیب فلکیات کے موضوع پر محیط ہوتا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کے تخلیق کردہ قصائد میں چرخیہ بھی موجود ہیں۔

علی نامہ کے سات قصائد کی تفصیل یہ ہے۔ پہلا قصیدہ قلعہ پنالا کی فتح پر لکھا گیا ہے۔ دوسرا قصیدہ جوہر صلابت خان پر علی عادل شاہ کے فتوحاتی غلبے کے حوالے سے رقم ہوا ہے۔ اس فتح کی خوشی میں جو جشن منایا گیا تھا اس پر بھی ایک قصیدہ اس مثنوی میں شامل ہے۔ یہ جشن سرما کے موسم میں برپا کیا گیا تھا اسی لئے اس قصیدے کے ضمن میں ایک اور قصیدہ ان کوائف کو بیان کرنے کے لئے علٰحدہ ردیف اور قافیے کی صورت میں موجود ہے۔ اس مثنوی میں ایک قصیدہ مجلسِ عاشور کے حوالے سے بھی ہے۔ ملنار کی فتح پر بھی نصرتی کا ایک طویل قصیدہ موجود ہے۔

نصرتی نے صرف دو قصائد میں تشابیب کا اہتمام کیا ہے۔ ایک قصیدہ معراج میں ہے اور دوسری علی عادل شاہ کی مدح میں کہے جانے والے قصیدے میں۔ مجلسِ عاشور کے قصیدے میں نصرتی نے حمد و نعت و منقبت کے موضوعات پر اظہارِ خیال کرنے کے بعد ذکرِ شہادت بھی کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس قصیدے میں علم نکلنے اور مرثیہ خوانی کی محافل کا تذکرہ بھی ہے۔ مبارکباد کے حوالے سے لکھے گئے نصرتی کے قصائد خطابیہ ہیں اور یہ براہِ راست مدح سے شروع ہوئے ہیں۔ جہاں تک قصیدے کے جزوِ گریز کا تعلق ہے یہ دو متضاد و متناقض معاملات و موضوعات میں ربط و تعلق کے لئے ہے۔ نصرتی نے گریز کی مشق نزاکتوں کی طرف نہیں دی۔ نصرتی کے چند قصائد کا آغاز ملاحظہ ہو

؎ تخت پہ جب جن پتی سیج پہ کیتا گون + پنس کا سپہدار تب گرم کری انجمن [قصیدہ معراج
جب نے فلک دیکھیا اوسورج تری تروار کا + تب تھے لگیا تھر کانپنے ہو پر عرق یکبار کا [قلعہ پنالا کی فتح پر
علی عادل شہ غازی یو شاہ بوالمظفر کوں + دیا ہے جس خدا ایسا کہ تھا جیسا سکندر کوں [عادل شاہ کی فتح پر
دی زمستاں نو گزی ڈونگا او نچا دیعنہ کا آج + سرد ہو باد خزاں ٹھنڈ کا رچیا ہے بہار آج [زمستاں کی تعریف میں
اے شہ تو ہم نام علی شاہاں پہ تیری سروری + دلدل فلک کا رام تجھ کرتا زمانہ قنبری [جشن فتح کی خوشی میں
اے نرپتی بھوگی سگھڑ تجھ بھول دنیا استری + پل پل سنوارے تجھ انگے پردم دکھانے دلبری [قصیدہ ثانی
کیتا ہوں اول حمد میں عالم کے سرجنہار کا + افلاک کا او نچا چھجا باندیا ہے کس لبستار کا [مجلس عاشور کی تعریف میں
ہوا ہے کون عالم کے شہاں میں شاہ تیرے بل کا + سچا تو نانو کاری ہے وصی شاہ رسل کا [فتح ملنار پر

گلشنِ عشق کے عنوانات کو جمع کرنے سے جو قصیدہ بنتا ہے اسکا مطلع ہے

؎ ثنا صانع کی ہے جن ہو کتابِ عشق کا بانی + دیا ہے حسن کوں خلقت کے ہر ایک جزو پہ عنوانی

علی نامہ کے عنوانات کو جمع کرنے سے جو قصیدہ حاصل ہوتا ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے

؎ حمد اول ہے خدا کا کہ جنے روزِ ازل + دیا ہے سمتِ فرداں کو جو توفیق سوں بل

قصیدہ ہجویہ کا مطلع ہے

سہ سخن ور شعر کہنے تھے رہنا چپ آج بہتر ہے + جماعت ہر زہ گویاں کی ہر کونے میں گوگو ہے

گھوڑا مانگنے پر جو قصیدہ نصرتی کے ہاں دستیاب ہے اسکا آغاز یوں ہوا ہے

سہ اے شاہ نامدار ہے تج پر سوں نت نظر + تج بخت کا سرفراز ہے ذرہ سورج ور

اور دوسرا جو اسپ کا مطلع ہے

سہ اے شاہ نر پتی تو اپے نامور اپنگ + جاں ٹبدک ہوئے نہ دور اچھ واں تیز ارنگ

نصرتی نے قلعہ پنالا کی فتح پر جو قصیدہ لکھا وہ خطابیہ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب سے فلک نے تری تلوار کے چمکتے ہوئے سورج پر نظر ڈالی ہے۔ وہ تھر تھر کانپ رہا ہے اور عرق میں تر ہے۔ اور اے شاہ علی عادل اسوقت دنیا کا مالک تو ہے۔ تجھ جیسا بہادر، کفار شکن اور عالم پناہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس قصیدے میں قلعہ کی تعریف یوں کی گئی ہے سہ

تھا یکہ یک جگ منے او گڑ پنالے کا بلند + تھمنے دلفت لنگر ہے ہوا نبر کو تھام ادھار کا

پو نچے یون پیری میں جا کر گر جوانی میں چڑھے + اپنچرے نہ دو جی عمر لگ تس پر جبل اک بار کا

میں بات کئی لگ کو ملے کئے تھار پر پھیلے زباں + گر ناؤں کوئی لینے منگے تجھ راہ ناہموار کا

گڑ پر بہنے پانی تھوات گو گو تو ما والنہر ہے + کرتا ہے رد کشمیر کوں انگن لی ہر گلزار کا

نصرتی نے پنالے کے قلعے کو بلندی اور رفعت میں بے مثال کیا ہے۔ اسے یہ دلفت کا لنگر اور آسمان کا تھم نظر آیا۔ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے یہ کہا کہ اس قلعے پر اگر کوئی جوانی میں چڑھے تو بڑھاپے میں جا کر پہنچے اور اگر اسے اور بھی زندگی مل جائے تو وہ اس میں بھی نہ پہنچ سکے۔ اس کی ناہموار راہوں کی بات کرتے زبان کئی بار پھسل پھسل جاتی ہے۔ قلعہ پر پانی کی افراط کو بھی نصرتی نے موضوع سخن بنایا اور کہا کہ گویا یہاں کا گوگو ما والنہر ہے اور اس کا ہر باغ کشمیر کے آنگن کو رد کرتا ہے۔ یہ قصیدہ تاریخی وقوعات کی تفاصیل بھی مہیا کرتا ہے۔ اس میں شیواجی کی سرکشی، اس کی دلو کا دہی، قلعہ بندی کا سامان، فوج کی گھاتے، شیواجی اور صلابت خاں کا مقابلہ، علی عادل شاہ کی ہمت و دلیری، جنگ کا ہیبت ناک نقشہ، فتح کی خوشی رعایا کا جشن اور شہر کی آراستگی وغیرہ کے تناظر میں آن گنت تفصیلیں ملتی ہیں۔ چلتے چلتے نصرتی نے اپنے معاصر شاعر شوقی پر بھی طنز کی ہے

سہ دس پانچ بیت اس دلعات میں کہے ہیں تو شوقی کیا ہوا + معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس لبتار کا

یہ تفاخر ایک لحاظ سے حقیقت پسندانہ بھی ہے۔ اس عہد میں دکنی زبان جس حالت میں تھی اس میں طویل قصیدے لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ غزل کے "دس پانچ بیت" تو نصرتی کی استعمال کردہ زمینوں میں نکالے جا سکتے تھے مگر ایسے قصائد لکھنا جن میں، جن میں تاریخی تفاصیل کی ترتیب، مدح سرائی اور مختلف مناظر کی حقیقی نقشہ کشی ہوتی مشکل کام تھا۔ نصرتی نے جس طرح علی نامہ اور گلشن عشق میں باغ، صبح، رات، چاندنی، سردی، تمازت آفتاب وغیرہ کے مناظر کی نقشہ کشی کی ہے، پرندوں اور پھلوں پھولوں کی تصویریں کھینچی ہیں، فراق و وصال کے معاملات کے لفظی خاکے بنائے ہیں، کشتی کی روانی، دعوتوں اور محافل کی رنگینی، جنگ کے

نقشے، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کے وصف اور زمینی تفاصیل کا موثر بیان کیا ہے وہ کسی زورِ بیان کے حامل شاعر ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ مثنوی میں اس نوع کی تفصیلات کو سمیٹنا مشکل نہیں ہوتا لیکن قصیدے میں قوافی اور ردیف کی کڑی قیود شاعر کے زورِ قلم کے لئے رکاوٹیں ثابت ہوتی ہیں۔ نصرتی کے راہوارِ تخیل نے اس میدان میں ہمواری سے اپنا سفر طے کیا ہے۔ اس کے قصائد میں موجود چند مناظر ملاحظہ ہوں

سے صبح کا فراش جگ شمع سوں روشن کرے + رنگ سوں تاریاں کی نت جانچ گگن کا گلش

سبز سوں جب سیر ہو شہر گوٹ میں گیا + سبزہ بیابان تب پھیر کوں نکلے ہرن

صبح کا بادِ خزاں چرخ پہ بہنے منبس + رین کا ملا رہے گلشن سو کن سمن

شام کے عطار نے بانٹے تب آرام جگ + طبلۂ کافور میں جب دھوئے مشکِ ختن

چلیں بادِ صبا نے خوش صفا پانی پہ مرجاں یوں + کہ جیوں محبوب کے مکھ پہ ڈھلک زلفِ مسلسل کا

فلک سقائے خضر کی ہو پیالا دے نیر سو جگ کوں + سورج کے جام سوں بھرتا ہے نت وان مشک بادل کا

اوپٹیا ہوا کا فوج یوں شبنم کیاں گولیاں چھانٹنا + ڈر سوں اگن موں چھپانے رین ٹھارے ٹھار آج

حوض ایک ہوا یوں دیکھ مشرق نے مغرب لگ بھر یا + کا نپے فلک جیوں بڑبڑا ہیچ تو تس کیا ار آج

گلشن کے آشیے اوپر پڑتا چلیا سرد کی سوں زنگ + ہر خار و خس شبنم سیتی ہوتا ہے جوہردار آج

کیا شہ کا تازی تیز بر ہے ناز کی بازی بھر یا + سکتی ہے جس طناز کن پرواز نس دن ہیر کی

خوش رنگ کس یک پھول کا ہرگز تفاوت نا کرے + گلشن اوپر چل جائے تو مانند بادِ سحری

—

کھرکاں کھنا کھن سوز دیر سوران کے یوں بجنے لگے + زہرہ کا زہرہ گل رہیا آواز سن جھلکار کا

کھرکاں گھرکاں لگ اچک چوندھے یوں چنگیاں اوڑیاں + جیوں آگ کی بجلیاں چمک برسیا بادل زنگار کا

نصرتی نے اپنے چرخیہ یا معراجیہ قصیدہ کی تشبیب میں معراج کی مناسبت سے سورج کے غروب ہونے اور رات اور چاند کے طلوع ہونے کے کوائف کے علاوہ روز و شب کا مقابلہ کرنے کے بعد ذکرِ معراجِ رسولؐ کیا ہے اور اختتامی اشعار میں محمد عادل شاہ کی مدح کی ہے۔ اس قصیدے میں حضورؐ کی ثنا میں جو اشعار موجود ہیں ان میں سے دو درج ذیل ہیں

سے نورِ خدا عین وہ مظہرِ دین رہن وہ + ہے شہؐ کونین وہ خلق کے جیو کا جیون

سرورِ پیغمبراں، مفخرِ نام آوراں + مالکِ پورب پچھم والیٔ اتر دکھن

انہیں نصرتی نے دین کا رہ تاج، صاحبِ معراج، حق کا نبی پاک، مفخرِ لولاک، خاتمِ آخر زمن، حامیٔ شرعِ ملل، ماحیٔ کفر و ضلل، ہادیٔ دین، ناطقِ نصِ قدیر، بانیٔ شرع و سنن بھی کہا ہے۔ اس قصیدہ میں ایک شعر میں خلفائے راشدین کی مدح بھی کی گئی ہے

؎ صادق ابوبکر امیر والی عادل عمر + شرف کے عثمان شرف شاہ علی صف شکن

نصرتی نے علی عادل شاہ کی مدح میں اس قصیدے میں خیل کے اشعار بھی لکھے ہیں

؎ صاحب دین و دول مالکِ ملک و ملل + عالم علم و عمل عامل نص و سنن

معدنِ جود و سخا منبع لطف و عطا + حامیٔ دین بادشاہ ہادیٔ شمشیر زن

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دکنی قصیدہ نگار سلاطین کی تعریف کرتے ہوئے دین و مذہب سے ان کے تعلق کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اس نوع کی مدح اردو قصیدے کے تمام ادوار میں نظر آتی ہے۔ اسے چاہیے فارسی قصائد کے اثرات کا نام دیا جائے خواہ بادشاہوں سے وابستہ مستقل صفات کا۔ یہ حقیقت ہے کہ بیشتر قصیدہ نگاروں نے مدح کے حوالے سے تقریباً یکساں مضامین منتخب کیے ہیں۔

نصرتی کے قصائد کا مجموعی جائزہ باور کراتا ہے کہ وہ فارسی قصیدے کی روایات کو شعور میں رچا کر شاعری کر رہا تھا۔ اس نے مبالغہ، حسن تعلیل، مراعاۃ النظیر، تضاد اور تقابل وغیرہ کی صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ ایجاز و اختصار کے اوصاف کی تحصیل میں بھی اسے بہت حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ تشابیب میں فلکیات اور مناظرِ فطرت کا استعمال فارسی قصیدے ہی کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اپنے ہجو یہ قصیدہ میں ایک جگہ نصرتی نے لکھا ہے

؎ دکھن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیا نئیں

اس سے اس کی مراد غالباً یہی ہے کہ اس نے فارسی شعرا کی تقلید کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے معاصر شعرا اور ناقدین اس کی زبان پر حرف گیری کرتے نظر آتے ہیں۔ نصرتی ان کے بارے میں کہتا ہے وہ کوتہ نظر ہیں

؎ حقیقت میں جو ہوئیں کوتہ نظر + زباں پر رکھیں عیب سٹ سب ہنر

فارسی قصائد میں صنعت مبالغہ عروج پر نظر آتی ہے۔ نصرتی نے بھی اس صنعت کو استعمال کیا ہے لیکن چونکہ اس کے بیشتر مدحیہ قصائد علی عادل شاہ ثانی کی تعریف میں ہیں۔ اس نے بہت سی مہمات سر کی تھیں اور بہت سے میدان مارے تھے۔ اس لئے نصرتی کے قصائد میں مبالغہ بلا جواز نہیں ہے۔ نصرتی کے اکثر و بیشتر قصائد علی عادل شاہ کے دور کی منظوم تاریخ ہیں۔ ان میں اس نے اپنے مثنوی نگاری کے تجربے سے استفادہ کیا ہے۔ وقوعات رزم و بزم کے عمدہ نقشے دلکش پیرائے میں یوں کھینچے ہیں کہ قاری شاعر کی قادر الکلامی کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے

"فتح کے بعد جس طرح اپنے بہادروں اور منتظموں کی تعریف بڑھا چڑھا کر دل سے کی جاتی ہے مدح کی یہی کیفیت علی نامہ کے قصائد کی ہو جاتی ہے" (۱)

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ نصرتی کے یہ قصائد سودا اور ذوق کے قصائد کے مقابلے میں زیادہ فطری معلوم ہوتے ہیں (۲)

---

(۱) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۴۶۳ (۲) ایضاً

یہ تجزیہ اس تناظر میں درست ہے کہ سودا اور ذوق کے ممدوحین ان کارناموں سے متصف نہ تھے جن کی مدح ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ بھی استدلال ہے کہ نصرتی نے عادل شاہ کی تعریف میں علی نامہ کے قصائد سے الگ جو قصیدہ لکھا ہے وہ تاثر کے اعتبار سے مقابلتاً فطری معلوم نہیں ہوتا۔ ان قصائد میں تشابیب کے نہ ہونے کا جواز انہوں نے یہ پیش کیا ہے کہ ان کے پس منظر میں وہ جنگ ہے جس کی فتح کا حال نصرتی پہلے بیان کر چکا ہے یعنی ان وقوعات کو جو مثنوی میں موجود ہیں قصائد کی تمہید ہی جاننا چاہیے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ نصرتی کے ہاں شاعری اور تاریخ کے متوازن اور مربوط رشتے کی تلاش ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمود الہی کا کہنا ہے

"قصیدے کے موضوعات میں ہجو کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عرب کے قدیم شعرا اپنے ہجویہ قصیدوں میں اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ فلاں شخص یا فلاں قبیلے میں شجاعت و سخاوت کا فقدان ہے۔ وہ مہمان نوازی کے آداب سے عاری ہے یا شعر و شاعری کا ذوق نہیں رکھتا۔ لیکن متنبی اور بعض دوسرے شاعروں نے ہجو کا دائرہ سب و شتم اور گالی گلوچ تک وسیع کر دیا۔ فارسی شعرا کے بعض ہجویہ قصیدوں پر یقین نہیں آتا کہ اتنا بڑا شاعر فحش گوئی کی اس سطح تک اتر سکتا ہے۔ نصرتی اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے ہجو کو قصیدہ کا باقاعدہ موضوع بنایا ہے۔ اس نے ایک ہجویہ قصیدہ لکھا ہے جو معاصرانہ چشمک کا نتیجہ ہے۔ نصرتی کی شاعری میں جگہ جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے معاصرین اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس نے بڑی شان کا ہجویہ قصیدہ کہا جس میں اپنی شاعرانہ قوتوں پر فخر کیا ہے اور مخالفوں کو برا بھلا کہا ہے۔ اس نے اپنے معاصرین کے لئے 'ہرزہ گویاں' 'خام طفلاں'، 'غبی'، 'خر'، 'منافق'، 'پھکڑ'، 'کور طبعاں' اور 'کم ذات' جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ فحش الفاظ کے استعمال سے بھی اس نے گریز نہیں کیا" ①

نصرتی کے نظریہ شعر میں سنجیدگی، پختگی، شعور، انسانی احساس، صاف گوئی، جذباتی انگیخت، دانائی و بینائی اور بلند سیرتی وغیرہ کی خوبیوں کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ انہیں شاعر اور شاعری کے لئے ضروری گردانتا تھا۔ نصرتی خود ان خوبیوں کا کس حد تک مرقع تھا یہ ایک طویل بحث کا متقاضی ہے تاہم قصیدہ گوئی کے لئے جس متانت، عقل، بینائی اور اسلوب سازی کی ضرورت تھی وہ اس کی تحصیل کر چکا تھا۔ اس تناظر میں حاسدوں کا پیدا ہو جانا

---

① اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۵۰

اچنبھے کی بات نہ تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے جب شاعروں کی ہجو لکھی تو حاسدوں نے اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔①
اس معاملے میں کس حد تک صداقت ہے اس کی تو تحقیق نہیں ہو سکی تاہم یہ حقیقت ہے کہ نصرتی کے معاصرین نے اس پر
اس کی زبان کے نامانوس ہونے انوکھی اور غیر مستعمل محاورہ بازی اور مشکل پسندی وغیرہ کے اعتراض کیے تھے۔ نصرتی بجا طور
پر یہ سمجھتا تھا کہ اس نے دکنی زبان کو ایک نیا طرزِ اظہار عطا کرنے کی کوشش کی ہے بقول اس کے اس کی زبان فارسی آمیز دکنی ہے

معانی کی صورت کی ہے آرسی + دکھن کا کیا شعر جیوں فارسی

نصرتی یہ بھی کہتا ہے کہ فارسی فصاحت میں اگر خوش کلام ہے تو ہندی اپنے اشعار پر بھی ہمیشہ فخر کرتا ہے۔ ہندی شاعری
کے بعض ہنر فارسی سے الگ ہیں۔ نصرتی کا دعویٰ درست ہے کہ اس نے دونوں زبانوں کو ملا کر شاعری کی ہے

ہیں اس دو ہنر کے خلاصے کو پا + کیا شعر تازہ دونوں فن ملا۔

نصرتی نے موضوع کے برتاؤ میں فارسی شعرا کی تقلید کی ہے تاہم لسانی حوالے سے ہندی روایت سے زیادہ اثر لیا ہے
البتہ اپنے قصائد میں کہیں کہیں اس نے فارسی زبان کا بھرپور استعمال کیا ہے

نصرتی کے قصائد میں قلی قطب شاہ کے قصائد ہی کے مانند مسلم روایات اور مقامی ہندی روایات کا امتزاج
نظر آتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ تہذیبوں کے حامل معاشروں میں ایک دوسرے کے رسوم و رواج اور روایت سے دامن
بچانا ناممکن نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندو شعرا کے ہاں مسلم روایات کا اور مسلم شعرا کے ہاں ہندو روایات
کا اثر ہونا حیرانی کی بات نہیں ہے۔ نصرتی کے قصائد سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

تصویر کی جھنڈاں پریوں وانزوسیں سیناسوں جیوں + کہتا ہے کچھ لنکا میں جا ہنومنت رام اوتار کا
کیس چین کے تختے نول دکھلائیں بندرابن نوی + کیس دست جو پھلیاں کی خوش بسرائے دوار کا
دعدلہ فرشتے رحمتی پنکھے کر اپنے پر پھیر ہیں + حوراں کے چک کے پٹ چنور لکھا طرہ طرار کا
مجمر کے مہکاراں تے ہوئے دن کا گریباں مشک بو + دامن رین کا عطر سوں ناتہ ہوا تاتار کا

افسر صدیقی امروہوی نے لکھا ہے

" نصرتی کے قصائد میں قصیدہ گوئی کے تمام لوازمات موجود ہیں
علوئے تخیل، نفاست، تشبیہ، ندرت بیان اور کثرت اشعار کے اعتبار سے
وہ سودا کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں " ②

---

① اردو شہ پارے ص ۲۶ ② مخطوطات انجمن جلد اول ص ۳۲۷

میراں ہاشمی

میراں ہاشمی (م ۱۶۹۷ء کے بعد) کا نام دکنی قصیدہ گو شعرا میں اہم ہے۔ اس نے مثنوی یوسف زلیخا کا منظوم اردو ترجمہ کیا، معراج نامہ لکھا اور غزلوں کا ایک دیوان ترتیب دیا۔[1] وہ دکنی دور کے آخر کا شاعر ہے۔ اس کے کلام کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے لسانی سانچوں پر قدیم دکنی اردو کے ساتھ ساتھ شمالی ہند میں آئندہ رائج ہونے والی زبان کے اثرات ہیں۔ ہاشمی بنیادی طور پر مثنوی نگار تھا اس لئے اس کے قصائد قصیدے کے عنصر سے نامانوس نہیں ہیں۔ اس کے دو قصائد بہت مشہور رہیں ایک قصیدہ در مدح ذوالفقار علی خاں اور دوسرا قصیدہ سرس بائی کے نام سے ہے۔ یہ دونوں قصائد ذوالفقار خاں ہی کی مدح میں ہیں۔ مہدی جونپوری کی مدح میں میراں ہاشمی کا ایک مخمس بھی محفوظ ہے۔ اول الذکر قصیدے میں ممدوح موصوف کے جنگی کارناموں کا بیان ہے۔ اور موخر الذکر میں اس کی محبوبہ سرس بائی کی زبانی مدح کی گئی ہے۔ اس قصیدے میں اظہار عشق کی ہندی روایت (یعنی محبوبہ کی جانب سے) کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

ذوالفقار خاں نصرت جنگ[2] کا اصل نام محمد اسماعیل تھا۔ وہ گیارہویں جلوس عالمگیری میں اورنگ زیب کا ملازم ہوا اور ترقی کرتا ہوا بڑے عہدوں تک پہنچا۔ ہاشمی کے اول الذکر قصیدے میں اس کے مختلف کارناموں کی تفصیل مرقوم ہے۔ یہ قصیدہ ۱۶۹۱ء - ۱۶۹۷ء کے درمیانی عرصے میں لکھا گیا۔ تکمیل قصیدہ کے وقت ذوالفقار خاں ارکاٹ کا گورنر تھا یہ قصیدہ خطابیہ ہے اسکا مطلع ہے

؎ ہے یک ہنر کے فن منے فاضل تے اور کوئی نامدار + جس کے کوئی تے جنگ منے پکڑیا ہے عزت عز ہتھیار

اس قصیدے کے ایک شعر میں اس کی اشعار کی تعداد ۱۴۰ بتائی گئی ہے تاہم اس کے صرف ۱۳۵ اشعار ملتے ہیں۔ اس میں ذوالفقار خاں کے قلعہ جینجی [مدراس] فتح کرنے کا ذکر بھی ہے۔ ذوالفقار خاں ۱۷۰۳ء تک اورنگ زیب کی جانب سے کرناٹک کا گورنر رہا۔ دکن کی فتح میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ اس قصیدے میں ہاشمی نے فوجی شکوہ اور میدان جنگ کے عمدہ نقشے مہیا کیے ہیں۔[3] اسے پڑھ کر نصرتی کے قصائد یاد آنے لگتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے

؎ میدان کے تختے اوپر ہر ایک تردد کے رچیا + تو زرد جینا رزم کی تیرے غنیم کی ہوئی ہے ہار
تجھ دل فلک بجلیاں کوند بادل ذرا اپولاک کٹ + نکلیاں کماناں رنگ برنگ تیرا سرک ہے میوک دلعار
توپاں گرجتیاں رعد سو لاگی جھوڑ باری کی جڑ + ہے رت برشگال کا کر گاؤں ترے گاویں ملہار
تیرے کمان ہور تیر کی کان لگ صفتیں بولنا + مستک میں لاگے تیر جو ہاتی کے ہو وے ڈھو نیر سو بار
تیری سروہی کے وارتوں ہاتی دو دو لنگ ہو پیں کٹ + یا گھوڑا سوں سوار اوپر یک وار سوں ٹکڑے ہوئیں چار[4]

ہاشمی نے اس قصیدے میں ممدوح کی بہادری کے ساتھ ساتھ اس کے رعب و دبدبہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس میں اسے تحفے میں ملنے والی کرناٹک کے راجاؤں کی بیٹیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ یہ شعر دیکھئے

---

(۱) دیوان ہاشمی مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن (۲) مآثر الامرا جلد دوم ص ۹۸ (۳) اس کے باوجود کہ وہ مادر زاد اندھا تھا۔ ہاشمی بیجاپوری۔ از محمد احسان اللہ مطبوعہ لاہور۔

؎ راجہ جتنے کرناٹک کے دہشت سوں تیری گزبڑا + عاجز ہو اپنیاں دختراں تحفے میں بھیجے تجھ سوار۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فاتحین مفتوحین کے ساتھ کیسا سلوک کیا کرتے تھے۔ ہاشمی نے ممدوح کی شان و شوکت کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس کی امارت، عیش و عشرت، حسنِ انتظام، خوش اخلاق، عدل پروری، علم دوستی، فیاضی، سخاوت اور غربا پروری کا بیان تشبیہ، استعارے اور حسن تعلیل کی تاثیر کے ساتھ کیا ہے۔ حسنِ طلب اور دعا کا یہ حصہ دیکھئے۔ اس میں شاعر نے انعام میں ممدوح سے گاؤں طلب کیا ہے۔

؎ کوئی پانچ بیتاں کی غزل لیا کر جو گزرانے تجھے + گاواں سو کئی ہاتی اسے دیتا ہے مہراں کے انبار
بیتاں سو یک صد چہل و شش بولیاں ہوں تیرے حق منے + میرا تو ہے بھو تیچ کچھ دسریاں کے دینے تے ابار
حق دار کا دینے کوں حق حقا کہ تیرا حق اہے + بخشش تجھے حق کا ہے کر یوں حق کہتے ہیں حق گزار
ہاتی رو پے کے ہور سوں کئی گاؤں لکھ کر لیونگا + آیا ہوں بر ان پورتے یوں دل میں اپنے کر قرار

قصیدہ سرس بائی میں بھی میراں ہاشمی نے ممدوح سے انعام میں گاؤں مانگا

یک گاؤں ہاشمی کوں چین کر سرس ہا دینا + مشغول ہو دعا میں جو دلبر رہے کنارا

قصیدہ سرس بائی ہاشمی نے سرس بائی کی زبان سے ادا کیا ہے۔ قصیدے میں عورت کی طرف سے اظہارِ عقیدت و احترام (گیت کی روایت) کی یہ پہلی اردو دستاویز ہے۔ اسے قصیدۂ ریختی بھی کہا جا سکتا ہے ذوالفقار خاں کی محبوبہ سرس بائی ارکاٹ کی رہنے والی تھی نواب ممدوح نے اسے بخشش میں کچھ گاؤں عطا کیے تھے۔ اس قصیدے کی پوری فضا عورت کے جذبات کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ اس قصیدہ کا پس منظر یہ ہے کہ نواب ذوالفقار خاں اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر جنگی مہمات پر نکل جاتا ہے۔ سرس بائی اس کے فراق میں اداس اور غمگین رہتی ہے۔ آخر ایک دن اسے خبر ملتی ہے کہ اسکا مقصود نظر آنے والا ہے۔ یہ قصیدہ ارکاٹ میں ممدوح کی آمد کی خوشی میں برپا ہونے والے جشن کے لئے لکھا گیا تھا۔ اسکا آغاز یوں ہوتا ہے

؎ آنے لگر سنگھاتی عالم کتا ہے سارا + انکھیاں میریاں لگر کتیاں سچ مچ ہے آنے ہارا

اس قصیدے میں، سازوں، راگوں، آرائش اور سنگھار کے بیان میں یہ اشعار نظر آتے ہیں

؎ عطار لدیا خوشبو آنے لگر سنگھاتی + آیا ہے ڈیوڑھی پر پھول بیکر پھولارا
کوئی تن کوں لائی چکسا الغل ہو گھال مہر میں + کوئی آمجنس ملا دے سنگھا اگر دو بارا
کوئی بال بو بجتی ہے کوئی لیا اگر جلاتی + عود سوز کوئی لا کر دے عود کا مہکارا
دہیرہ، تنبورا، جنتر، دف، ڈھول، تال فندل + کوئی چنگ رباب ہت میں لیتی ہے کوئی دو تارا
سارنگ کوئی گاوے کوئی پوروی یمن کوئی + کوئی کلیان گانا کوئی کانہڑا کیدارا

قصیدہ سرس بائی میں ہاشمی نے انواع و اقسام کے کھانوں کی تفصیل بھی دی ہے۔ نواب کی آمد کے موقع پر

خوشی منانے کے یہ انداز بھی دیکھیے :

نواب آئے گر کبھی تو مجھ گلے کا سیج پچ سلے + جھانگڑ بجے چھپنا چھن دلھوں دلھوں بجے نقارا

ذیل کے اشعار میں رس بالی کے جذبات کا بھرپور اظہار ہوا ہے

نواب چاند سا منہ دکھلائیں گے تو دیکھوں + سکہ کا پڑے گا چندنا ہوئے دو دکھ کا دور اندھارا
ہاتی او پر ملک سے خورشید سا دسے تو + صدقہ نواب پر سوں جیو دیونگی اتارا
دل میں تو پیار یوں ہے ظاہر میں تک گھونگھٹ کر + لاجونگی تو نزدیک آ بیٹھے گا جب پیارا
میں واری گئی خدا کے پھر رب قدم دکھایا + شک سٹ کو یوں کہوں گی جو تو لیا آشکارا
راجہ چندر شنکر یا دیکھنا سنتا کون + او تینیاں کوں لینے تجھ دل لگا ہے پنڈارا
دنیا کے دکھ سوں تو تک کرتا رہے عیش و عشرت + سورج چندر رہے جو لگ آسمان پر ستارا

ہاشمی نے اپنے دیوان میں جگہ جگہ اپنی دیگر اصناف کے ساتھ قصائد پر اظہار مفاخرت کیا ہے

غزلاں قصیدے مثنویاں توریف میں دلھن کے لیٹیج ہیں + سچ نیں جسے لگتا سو دو دیکھو لو پر کا بیاض
غزلاں قصیدے مثنویاں ہے جو میں تجھ بولنا + دلو بیت خیالاں تجھ اپر آتا مجھے گانے سوں

ہاشمی کی بینائی نہ ہونے کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے ۔ اندھے کے ہاں تین چیزیں نمایاں ہوتی ہیں ۔ ایک یہ کہ اس میں "سماجی ذمہ داری کا احساس کم ہو جاتا ہے اس لیے کہ وہ بات کہتے وقت
دوسروں کو دیکھ ہی نہیں رہا ہے ۔ دوسرا یہ کہ اسکا تخیل اور حافظہ غیر معمولی
ہو جاتا ہے اور تیسرا یہ کہ موسیقی کا لطیف احساس بڑھ جاتا ہے" (1)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فنی اعتبار سے ہاشمی کو بیجاپوری شعرا میں اول درجے کا قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا نام نصرتی کے بعد ہی لیا جانا چاہیے (2) ۔

ہاشمی کے مذکورہ قصائد میں لطیف حواس کا بھرپور استعمال ہے ۔ اور یہ شاعری ایک نابینا کی معلوم نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں یہ بحث الگ ہے کہ آیا وہ مادر زاد اندھا تھا؟ (3) یا عمر کے کسی حصے میں چیچک کی بیماری سے ان کی بینائی جاتی رہی ۔ خیر جو بھی صورت ہو حقیقت یہ ہے کہ صنائع و بدائع کے استعمال میں ہاشمی کو بڑی مہارت حاصل تھی ۔ اس کے قصائد اپنے معاصر عہد کی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی کا پرتو لیے ہوئے ہیں ۔ ان میں عقائد، عبادات، رسوم و رواج، تہوار اور اس عہد سے متعلقہ وقوعات کا سراغ ملتا ہے ۔

---

(1) تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۳۴۷ (2) ایضاً (3) ایضاً ص ۳۵۴

ولی

ولی م ۱۷۰۷ء نے اپنے قصائد کا موضوعاتی دائرہ نعت و منقبت تک محدود رکھا۔

کلیاتِ ولی[1] میں دستیاب قصائد لسانی اور ادبی حوالوں سے بلند پایہ نہ سہی اہم ضرور ہیں۔ دکن کے بلند پایہ قصیدہ نگاروں سے ولی کا تقابل یہ حقیقت منکشف کرتا ہے کہ وہ اگرچہ نصرتی اور غواصی (اور اس سطح کے دیگر قصیدہ نگاروں) کے ہم پلہ نہیں ہیں تاہم لسانی اور ادبی خدمات کے حوالے سے انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ ولی کے قصائد لسانی شکوہ اور اظہار بیان طمطراق کے اوصاف سے تو مزین نہیں ہیں ان میں زورِ بیان اور مضمون آرائی کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت مخفی نہیں رہے گی کہ ولی کی زبان دیگر دکنی شعرا کے مقابلے میں رواں، صاف اور شستہ ہے۔ اس زبان پر اس عہد کے شمالی ہند کے تہذیبی و ادبی رجحانات کا گہرا اثر ہے۔ شمالی ہند کے شعرائے ولی کو اگر شرفِ قبولیت بخشا تو اس کا پس منظر یہ تھا کہ وہ ان کے مزاج کے زیادہ قریب تھے۔ ولی کے شعری مزاج کی تشکیل میں گجرات کے اس ماحول کا بڑا حصہ ہے جو مغل اقتدار کی بدولت وہاں راسخ ہوا تھا۔ فارسی زبان اور عجمی و ترکی ثقافت کے آثار سے نمو پانے والا ادبی ماحول ولی کی شاعری میں انقلاب آفریں لب و لہجہ کی صورت نمودار ہوا۔ ان کی زبان شمالی ہند کے شعرا کے لئے زیادہ سلیس اور رواں ٹھہری

جب ہم ولی کے قصائد کی موضوعاتی جہت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو یہ جاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ انہوں نے ان میں نعت و منقبت کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے۔ کسی تہذیب کی ساخت و تشکیل میں جہاں جغرافیائی ماحول، لسانی عوامل، بود و باش اور رہن سہن کے مسائل، رسوم و رواج وغیرہ کا عمل دخل ہوتا ہے وہاں مذہب و فلسفہ بھی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مسلم قصیدہ نگاروں کے ہاں دنیاوی قصائد میں بھی مذہبی شعور کی گہری کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان قصائد کا دعائیہ حصہ تو خیر مذہبی شعور سے مزین ہوتا ہی ہے مدحیہ حصوں میں بھی اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں تلمیحات و روایات کے بیان میں اور لسانی سٹرکچر کے داخلی تاثرات میں بھی مذہبی طرزِ احساس کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ دنیاوی قصائد کو چھوڑ کر مذہبی قصیدہ تو ہوتا ہی ہے اپنے عقائد اور عقیدت و احترام کے اظہار کے لئے۔ ولی ویسے بھی ایک درویش صفت انسان تھے۔ فقر و غنا کی صفات رکھنے کی وجہ سے وہ طبعی طور پر قانع تھے۔ ان کے ہاں مدحیہ قصیدہ کی عدم موجودگی کا یہ ایک بنیادی سبب ہے۔ ولی کے سات دستیاب قصائد ان کی مذہبی عقیدتوں کے اظہار کے لئے وقف ہیں۔

ولی اورنگ آباد کے باشندے تھے ان کا تعلق تصوف کے قادریہ سلسلہ سے تھا۔ انہوں نے احمد آباد میں

---

[1] کلیاتِ ولی مرتبہ نور الحسن ہاشمی انجمن ترقی اردو پاکستان

شاہ وجیہہ الدین کے مدرسے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اپنے سفرِ دہلی کے بعد شاہ گلشن دہلوی کے مشورے پر فارسی انداز بیان اور موضوعات کو اردو شاعری میں جگہ دی۔ ولی کے قصائد میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

[در مدح حضرت علیؓ]

ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ + ہوا ہے غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ
جہاں کے گل بدناں جلوہ گر ہوئے ہیں جہاں + اڑا ہے ان کی تجلی سوں عاشقاں کا رنگ
ہے عاشقاں کے جلانے کو مستعد ہیں مدام + گویا ہے اس کے اپر نور شمع وحال پتنگ
سوائے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل + ورائے خونِ جگر نئیں دسا مجھے گلرنگ
دسانئیں جو گل بے وفا ہیں رنگ وفا + تو لو بچہ شور میں ہیں بلبلان خوش آہنگ
فلک کے دیکھ کے خشکی جگت ہوا ہے دم + رہا نہیں ہے فوارے کے دل میں آب امنگ

گریز

جگت کے دیکھ کے حالات لاعلاج سوں + سوئے ہیں گوشہ نشیں اہل دانش و فرہنگ
ہو دستگیر مجھے یا علی ولی اللہ + کہ اس فلک نے کیا ہے کمال مجھ کوں تنگ

[قصیدۂ نعت]

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے + ہو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے
یاد کے گلزار پر دو نین کر ابرِ بہار + ہیچ کھا سینے میں دل کوں سنبلستانی کرے
مرتبہ حلت پناہی کا وہ پاوے جو کئی + مثل اسمعیل اول جی کو قربانی کرے
جوش دے یک بارگی دریا کوں دل کے لہو سینے + گوہر انجھواں کوں رور و رنگِ مرجانی کرے

ولی کے قصائد میں بھی لسانی و ثقافتی عناصر کثرت سے ہیں۔ ان کے قصائد کی تشابیب پر ایہ اثرات گہرے ہیں۔ ولی نے بہاریہ تشبیب بھی لکھی ہے اور عشقیہ بھی۔ حضرت علیؓ کی منقبت میں لکھے ہوئے قصیدے کے تمہیدی حصے میں انہوں نے چرخِ کج رفتار کی بے انصافیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں دنیا کے فانی اور ہرجائی ہونے کا احساس جھلکتا ہے۔ خلق کے ہاتوں ولی کو جو گزند پہنچا، انہوں نے اس کا بھی خوب بیان کیا ہے۔ اس تشبیب کے چند اشعار پہلے لکھے جاچکے ہیں [ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ]
بہاریہ تشبیب کے اشعار درج ذیل ہیں۔

[قصیدہ در مدح وجیہہ الدین]

ہوا ہے خلق اُپر پھر کے فضل سبحانی + کیا ہے ابر نے رحمت سوں گوہر افشانی
قطار قطرۂ شبنم سوں آج سبزۂ خضر + لے سبحہ ہات میں کرتا ہے ادعیہ خوانی
اس آب روح فزا کے کمال لطف کوں دیکھ + چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیوانی

ولی کا ایک قصیدہ میراں محی الدین کی تعریف میں ہے اس کی تشبیب عشقیہ ہے

دکھے نظر سوں اگر یہ جمالِ نورانی + شرم سوں مصر بسے جا کے ماہِ کنعانی
ترے یہ غمزۂ خوں ریز سے ہوا معلوم + کہ عاشقاں کوں اسی سوں ہے عید قربانی
ترے فراق نے عشاق کو کیا امداد + غذائے خونِ جگر ہور لباسِ عریانی

ولی کے قصائد علو تخیل، تناسب الفاظ اور زور بیان کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے تخیل کے زور پر خیالی نقشے کھینچ کر حسن کاری کی کوشش کی ہے۔ ولی کو اپنی قصیدہ نگاری پر بہت ناز تھا۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں [مفہوم] مجھے یقین ہے کہ اگر یہ قصیدۂ رنگیں انوری اور خاقانی کے کانوں تک پہنچے تو وہ حالت وجد میں آجائیں۔(۱) ایک اور جگہ ولی نے یہ کہا ہے

اے ولی یہ قصیدۂ رنگیں + جگ میں رکھتا نہیں نظیر و بدل

ولی نے اپنے ایک قصیدے میں عرفی کے مصرع پر تضمین کی ہے

لکھا ہوں دل کوں ولی کے یہ مصرع عرفی + کہ ایں قصیدہ بیاضی بود نہ دیوانی

ولی کے قصائد شمالی ہند کے قصیدہ نگاروں کے لئے اردو قصیدہ کا نقش اول ٹھہرے ہیں۔ ان کے قصیدوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سودا کے قصائد کے مقابلے میں نہیں آتے۔(۵) ان کے بے مزہ اور پھیکے ہونے پر بھی رائے زنی کی گئی ہے۔ تاہم ہمیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ ولی کے بعد کے قصیدہ نگاروں نے ولی کے قصائد کو بھی ایک معیار کے طور پر سامنے رکھا۔

ولی کے قصائد میں مدح کے حوالے سے شخصی اوصاف و محاسن، اخلاق و فضائل، عدل و انصاف اور جلال و جمال وغیرہ کے پہلو مؤثر انداز سے منعکس ہوئے ہیں۔ وہ ممدوحین کے ساز و سامان کی تعریف میں رطب اللسان ہونے سے گریزاں رہے۔ البتہ ایک جگہ حضرت علیؑ کے گھوڑے کی تعریف میں یہ شعر ہے

خدا نے اس کوں دیا مرکب ایک دلدل نام + کیا دریا کوں جو یک پل میں لاکھ بار الانگ

حضور نبی کریمؐ کی فصیح البیانی کا تذکرہ یوں کیا ہے

اس فصاحت آگے دسے مجھ کوں + نطق سحباں عبارت مہمل

ولی نے شاہ وجیہہ الدین کی تعریف میں لکھے گئے قصیدے میں ان کے آستان کی توصیف میں کہا ہے کہ (مفہوم) "تیرے آستان مبارک پر نقش قدم کی مانند ایران اور توران اپنا سر رکھتے ہیں"۔ وہ مزید لکھتے ہیں

تری جناب کا وہ صحن ہے سراپا نور + کہ جس کی خاک بہ از سرمۂ صفاہانی

ولی کے نعتیہ قصیدہ میں انداز مدح دیکھیے

یا محمدؐ دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں + خلق کوں لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے
وہ اچھے آزاد جو بازار میں تجھ حسن کے + بندگی میں آپ کوں جوں ماہ کنعانی کرے
زینو الحانکم کا گر سنے داؤد ناد + ہو کے خوش دربار پر تیرے خوش الحانی کرے
نوح تجھ رحمت کی کشتی باج کہیں پاوے نہ تھاہ + تجھ غضب کا گر سمندر جوش طوفانی کرے
رتبۂ عالی میں دیکھے حق نزیک اپنا کلام + گر کلیم اللہ آ تیری ثنا خوانی کرے
تب مسیحا مشق کے خط کو سکھے گا تجھ نزیک + مشق کرنے مشق کی جب لوح پیشانی کرے

---

(۱) یقیں ہے مجھ کوں کہ گر یہ قصیدہ رنگیں + سنیں تو وجد کریں انوری و خاقانی

جس مکاں میں ہے تمہاری فکرِ روشن جلوہ گر + عقلِ اول آ کے واں اقرارِ نادانی کرے

حکمتاں کی سب کتاباں دھو سٹے یکبار گی + گر فلاطوں تجھ دبستاں میں سبق خوانی کرے

اس مدح میں ولی نے بڑی خوش اسلوبی سے حضور کے جمالِ آگہی اور حسنِ فکر کی عظمتوں کے بارے میں بلیغ اشارے کیے ہیں

ولی کا قصیدہ لامیہ حمد، نعت، منقبت اور پند و نصائح کے موضوعات پر محیط ہے۔ اس قصیدے کی اجمالی توضیح یہ ہے کہ اس میں ولی نے حمد و نعت کے بعد، خلفائے راشدین کی ثنا، آئمہ معصومین کی توریف اور حرص دنیا کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ تلقینِ عشق کرتے ہوئے محبوب کے سراپا کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں عاشقانہ مضامین بھی قلمبند ہوئے ہیں۔ دعا بھی کی گئی ہے اور اپنی شاعری پر فخر بھی کیا ہے۔ اس قصیدے کا مطلع ہے

ے زباں پر تو اول اول + نامِ پاکِ خدائے عزوجل

ولی نے اپنے ایک قصیدے میں گجرات کے ہجر سے پیدا ہونے والی کیفیت کا ذکر کیا ہے

ے گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل + شمشیرِ ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

سینے میں میرے آ کے چمن دیکھ عشق کا + ہے جوش خوں سوں تن میں گلِ لالہ زار دل

ہجرت سے دوستاں کی ہوا ہی ہراگداز + عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل

ولی نے بہت سی غزلوں میں بھی شخصی مدح کا اہتمام کیا ہے۔ امرت لال، گوبند لال، میرزا، حکیم داس، اکمل ابوالمعالی، کامل اور سراج وغیرہ کی توریف میں ان کے اشعار ممدوحین کے اخلاقِ حسنہ، وفاداری، وقار، دوست پروری استقامت اور حیا پروری کے خصائص کی تفاصیل مہیا کرتے ہیں۔ ولی کی ایک غزل محمد یار خاں کوتوال دہلی کی توریف میں بھی ہے۔ ابوالمعالی کی توریف میں ان کی غزل جس کا مصرعہ اول ہے ع تبسم اہلِ صفا شمشیر ہے ان کے مزاج کی قصیدے سے ہم آہنگی کا اشارہ ہے۔ ولی کی اس نوع کی غزلوں کو شمالی ہند میں مدحیہ نظموں کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مبالغہ، تلمیح، حسنِ تعلیل، تجنیس، مراعاۃ النظیر وغیرہ کی صنعتوں کے استعمال نے ان کے قصائد کی گہرائی اور جمال میں اضافہ کیا ہے۔ ولی قصائد میں صنائع بدائع کا استعمال قرینے سے کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں پڑھتے ہوئے کسی جگہ مصنوعیت اور بوجھل پن کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ولی کے قصائد مذہبی جوش و خروش اور موسیقیت سے معمور ہونے کے علاوہ نجوم[1] و تصوف کے حوالوں سے بھی مالا مال ہیں۔ وہ کثرت سے تشبیہوں کا استعمال کرتے تھے۔ ان کے استعارے زیادہ پیچیدہ نہیں ہیں

ڈاکٹر محمود الٰہی کا کہنا ہے

" ولی کی آزاد طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ مغلیہ سلطنت کے امراء سے جلبِ منفعت کے لئے وابستگی اختیار کریں۔ اس لئے وہ مدحیہ قصیدے تو نہ کہہ سکے لیکن جس شاعر کے شعر عرش پر قدسی پڑھتے ہوں، جس کی فکر رسا حدِ بشر سے باہر ہو۔ جو بحرِ معانی کا غواص ہو۔ جس کے شعر میں شراب،

---

(1) یہ شعر ملاحظہ ہو عشق سوں فارغ جو کئی رہ مخمسِ اکبر ہے مدام + ساتواں گنبد پراگر ایوان کیوانی کرے

پر تنگال جیسا اثر ہو - جس کی گفتگو ہر جانب تحفہ میں لے جائی جاتی ہو اور
جس کے سینے میں ہزاروں گوہر معانی ہوں وہ اپنی قادر الکلامی اور
شاعرانہ عظمت و جامعیت کا سکہ بٹھانے کے لئے قصیدے کیوں نہ کہتا" (۱)

ولی کے قصائد پر مسلم تہذیبی پس منظر کی گہری چھاپ ہے ۔ اسلامی عقائد سے لے کر مسلم تاریخی اور مذہبی تلمیحات تک ولی دکنی نے بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹا ۔ ہندوستان میں مقبول ہونے والے مسلم تصوف سے بھی انہوں نے گہرا استفادہ کیا ہے ان کے یا محمدؐ، علی دستگیر، ذات کو فنا کرنا، فنا فی اللہ، انقور قربانی، رحمت طلبی، نوح کی کشتی، الحان داؤدی، کلیم اللہ، مسیحا وغیرہ کے حوالے اور تصورات مذکورہ رائے کا ثبوت ہیں ۔ خدا کو ولی نے سلطان بارگاہ ازل کہا ہے (۲) اور یہ بھی لکھا ہے کہ زمین اور آسمان کے سب ساکن اسے ہر پل یاد کرتے ہیں ۔

ولی کے قصائد کی زبان شمال اور جنوبی ہندوستان میں ابھرنے والی اردو زبان کے لہجوں کے آمیزے سے تیار ہوئی ہے ۔ فارسی روایات و تلمیحات کے ساتھ انہوں نے فارسی لفظیات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ۔ ولی نے اپنے قصائد میں قدیم دکنی قصائد کے عمدہ خصائص کو سمیٹ کر انہیں ایک نئی اسلوبیاتی جہت عطا کی ہے ۔ ان کے بعض قصائد میں فارسی قصائد کی زمینیں بھی استعمال ہوئی ہیں ۔ ولی نے چونکہ زیادہ تر مقدس شخصیات کی مدح کی ہے اس لئے ان میں اس جذباتی بے تکلفی سے گریز کیا گیا ہے جو ان کی غزلوں کا حصہ ہے ۔ صاف و شستہ دکنی، گجری اور ہندی الفاظ کے استعمال کے علاوہ ولی نے اردو کے ایسے روپ کو اجاگر کیا جو عرصہ دراز تک آنے والے اردو شعرا کا تقلیدی نمونہ رہا ۔ انہوں نے اپنے قصائد میں ثقیل دکنی اور گجری الفاظ کے استعمال سے دامن بچایا ہے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی غزل کے مقابلے میں قصائد کی زبان پر دکنی الفاظ کا زیادہ اثر ہے ۔ ہندی اور فارسی کی آمیزش کے ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ان قصائد میں بعض جگہ ہندی اور بعض جگہ فارسی کو فوقیت دی ہے ۔ کہیں کہیں دونوں السنہ کا عمدہ امتزاج بھی نظر آتا ہے

---

(۱) اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۵۱ (۲) شکر اس کا محیط اعظم ہے + وہ ہے سلطان بارگاہ ازل

جنوبی ہند میں اردو قصیدہ [اجمالی جائزہ]

قدیم دکنی اور گجراتی ادوار کا ادب اردو زبان کے ابتدائی دور سے متعلق ہے۔ اس لئے ان علاقوں کے قصیدہ نگاروں کے ہاں اس سطح کے قصائد کی تلاش تو بے سود ہے جو زبان کی پختگی کے دور میں لکھے گئے ہیں تاہم محمد قلی، غواصی، نصرتی، شاہی اور ولی کے قصائد مستقبل کے اردو قصیدہ کے نقوشِ اولین کے بطور اہم ہیں۔ ان تمام قصیدہ نگاروں نے قصیدے کے فارسی ماڈل کو اپنے سامنے رکھا تھا۔ تشبیب نگاری ہو کہ مدحیہ موضوعات کا بیان، اگریز کی نزاکتیں ہوں کہ دعا کی دردمندی اور تاثیر مذکورہ قصیدہ نگاروں نے حسبِ توفیق فنی مہارتیں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے قصائد کی موضوعاتی وسعتوں اور فنی بالیدگیوں کے سبب نصرتی اس دور کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ٹھہرتا ہے۔ اس نے صنفِ قصیدہ کو جس خوب صورت اور موثر انداز سے استعمال کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ اس دور میں قصائد کی تعداد زیادہ نہیں ہے جو قصیدے دستیاب ہیں استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر فارسی اثرات کے تابع ہیں۔ بعض شاعروں نے اپنی مزاجی مناسبت کے حوالے سے ہندی اثرات کے تابع رہ کر بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ حقیقت میں یہ دور قصیدے کی امکانی روایات کے لئے بنیادیں مہیا کرتا ہے۔

ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو دکنی ریاستوں کا ماحول قصیدہ نگاری کے لئے سازگار تھا۔ یہاں شخصی اور خود مختار حکومتیں بھی تھیں اور علم دوست اور ادب پرور بادشاہ بھی۔ دولت کی فراوانی بھی تھی اور شعر و دربار کی ثقافتی اور تہذیبی بیداری بھی۔ اس پس منظر میں درباری شاعروں نے دنیاوی ممدوحین کی مدح کی۔ دکنی اور گجری شاعری میں مذہبی قصائد کی بھی کمی نہیں ہے ان شاعروں کا عمومی مزاج مذہبی ہی نظر آتا ہے۔ انہوں نے حمد، نعت اور منقبت پر مبنی عمدہ قصائد لکھے ہیں۔ دکنی اور گجراتی شعرا شاعری میں اپنے مذہبی عقائد کا بلا جھجک اظہار کرتے تھے۔ قصائد کے حمدیہ اشعار میں قرآن و حدیث کی روشنی میں خدا کو قادر، لامحدود اور لاتعین ٹھہرایا گیا ہے۔ بادشاہ کی تعریف کرتے ہوئے یہ شعرا مذہبی طرز احساس سے کم کم ہی دور ہو پاتے تھے۔ بادشاہوں کے لئے وہ ظل اللہ، حافظِ دین، قاطع کفر و باطل، حامیِ حق، پروردگارِ خلق، والیِ غربا اور مولائے بیتامی، منبع لطف و عطا، معدنِ جود و سخا وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان تصورات کو خالص اسلامی تو نہیں کہا جا سکتا تاہم مذہبی حوالوں سے انہیں فروغ ضرور ملا تھا۔ نعت و منقبت کے تصورات میں قرآن و حدیث کے تصورات سے مدد لی گئی تھی۔ نعتیہ قصائد میں نبی کریمؐ کی شخصیت، سیرت اور فضائل و مناقب کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ منقبت کے ضمن میں حضرت علیؓ، اہل بیت، خلفائے راشدین اور آئمہ اطہارین کے حالات و واقعات پر توجہ دی گئی۔ دکنی قصائد میں قصیدہ نگاروں کے مذہبی اور فرقہ وارانہ عقائد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ قلی قطب شاہ نے اپنے قصائد میں اپنے مذہبی مخالفین پر فتوے بھی صادر کیے ہیں۔ عقیدہ

میلادالنبی میں وہ کہتا ہے

؎ ستی کافر کے بت خانے ٹوٹے ہیں اس گھڑی سب + سو معجزے تھے خوارج کوں ہے ہیبت گھڑی کا
نبی کا ناؤں ہے تیر احمد قطب شاہ نڈر + قصہ موسیٰ و فرعون شہ کوں ہے رہبری کا

قصیدہ بسنت میں وہ کہتا ہے

؎ انوں کے دشمناں اوپر ازل تے لعن واجب ہے + اگر سوئے سمرقندی، بخارائی و ملتانی

قلی قطب شاہ یہاں لعن اپنے مخالف فرقے کے لیے واجب سمجھتا ہے اور اس کو اس نے فرعون اور خوارج سے بھی ملایا ہے۔ انہیں کافر کہا ہے۔ اسی طرح ولی گجراتی نے اپنے ایک قصیدے میں کہا ہے منکر غوث الاعظم پر مسلمان تو مسلمان یہود و نصرانی بھی طعن کرتے ہیں

؎ تیری جناب سوں کینہ جو کوئی دل میں رکھے + تو اس پہ طعن کریں سب یہود و نصرانی ①

اس دور میں مذہبی ~~موضوعات~~ عمارات اور ② بیانات کے حوالے سے بھی عمدہ قصائد لکھے گئے۔ مسلمانوں کے مذہبی تہوار [عید مین، عید میلاد النبی، شب برات] مجوسیوں کے مذہبی تہوار [نوروز وغیرہ] اور ہندوں کے مذہبی تہوار [بسنت] کے حوالے سے بہت سے قصائد دستیاب ہیں۔ نصرتی کے قصیدہ عاشورہ میں مجلس عزا کے انعقاد اور شہادت کا مختصر بیان ہے اس میں حسینی محل کی توصیف بھی کی گئی ہے اور مجلس کی ترتیب، مرثیہ اور ماتم وغیرہ کا تذکرہ بھی ہے اور علم نکالنے اور اس کے شہر میں گشت لگانے کا حال بھی ہے۔ اسلامی، عجمی اور ہندی تلمیحات بھی کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس دور میں جعفری اور حنفی③ دونوں عقائد کے شعرا موجود تھے انہوں نے اپنے اپنے عقائد کو خوش اسلوبی سے قصائد کی زینت بنایا ہے۔

دکنی قصائد میں فارسی اور عجمی اثرات کے ساتھ ساتھ بیان کے مقامی رنگ کو بھی مکمل اہمیت دی گئی۔ ان میں جگہ جگہ سرزمین دکن کے مظاہر کا تذکرہ ملتا ہے۔ مقامی پرندے، پھول، پھل، موسم، تہوار اور طرز زندگی کی تفاصیل سے ان ادوار کے قصائد مالا مال ہیں۔ یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ ابھی یہاں اردو زبان نے پورے طور پر نشوونما اور ترقی کی منزلیں طے نہیں کی تھیں اس لیے ان میں شمالی ہند کے دورِ عروج کے قصائد میں ملنے والے شکوہِ بیان اور قوتِ اظہار کو نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ یہاں بہت کم قصیدہ نگاروں کے ہاں تسلسل بیان، واقعہ نگاری اور شوکتِ الفاظ کے عناصر نظر آتے ہیں۔ اس عہد کا قصیدہ (لسانی طور پر) مقامی زبانوں سے فارسی اور پنجابی السنہ کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ ہنوز اس میں فارسی کی شوکت لفظ غالب عنصر نہیں بنی تھی۔ البتہ قصیدے کی ہیئت فارسی قصیدے کے ماڈل کے پیش نظر اپنائی گئی۔

دکنی قصائد میں مبالغہ اور غلو کا وہ انداز موجود نہیں ہے جو بعد کے اردو قصائد کا حصہ بنا۔ ان دونوں عناصر کو فارسی قصائد کا لازمہ ٹھہرایا گیا ہے۔ دکنی قصیدہ نگاروں نے اپنے ممدوحین کے بارے میں حقیقت پسندانہ

---

① قصیدہ در مدح حضرت میراں محی الدین ② ولی نے ایک قصیدہ بیت الحرام کی مدح میں لکھا ہے جس میں کعبے کے مراتب و برکات کا ذکر ہے

نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں مثالی ممدوح بھی نظر آجاتے ہیں
دکن کے ان قصیدہ نگاروں نے بزم و رزم دونوں قسم کے موضوعات کو اپنے اظہار کے لیے منتخب کیا۔ دینی اور روحانی پیشواؤں اور بادشاہوں کے اخلاق، جنگی، تعمیراتی اور جمالیاتی کارناموں کو انہوں نے دائرہ اظہار میں سمیٹا مصوری، تعمیرات، موسیقی کے رسیا حکمرانوں کی مدح میں تصویری، نقوش اور آہنگ سے معمور قصائد لکھے گئے۔ اس عہد کے مروجہ علوم سے قصیدہ نگاروں نے استفادہ کیا۔ ان کے قصائد میں علم نجوم، فن موسیقی اور فنون حرب کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ جنگ و جدل، فتح و ظفرمندی، پند و اخلاق، دینی اور روحانی مدح، ذاتی احوال کا بیان، مبالغات اور تعزیبات وغیرہ کی نقشہ کشیاں، بہار و خزاں وغیرہ کی تصویر ساز یاں دکنی قصیدے کے موضوعات ہیں۔
شاعروں نے اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق بحور کا انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ ہمیں ان کے ہاں ادق اور مشکل بحریں بھی نظر آتی ہیں اور آسان اور سہل بھی۔ دکنی قصائد میں بے تکلف اور سادہ انداز بیان عموماً ہے۔ کئی شاعروں نے صنعتوں کے استعمال سے اپنی شاعری میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی تاہم یہ ان کے اظہار کی خوبی ہے کہ اس میں ثقالت اور بوجھل پن صرف اتنا ہی ہے جتنا کہ جدید عہد کے قاری کے لئے دکنی زبان کی مبہم کے حوالے سے ہو سکتا ہے۔

ابو محمد سحر کا کہنا ہے

> "ولی سے قبل اردو قصیدہ نگاری گہرے انفرادی رنگ کی حامل تھی
> ولی کے قصائد سے وہ فارسی کے اوسط بلکہ معمولی معیار پر آجاتی ہے" (۱)

اسی نوع کی رائے کا اظہار ڈاکٹر محمود الٰہی نے کیا ہے وہ کہتے ہیں

> "اس دور کو قصیدہ نگاری کا دور تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دکن کے شاعروں نے قصائد کے جو نمونے چھوڑے ہیں اگر ان کی تقلید کی جاتی تو اس صنف سخن پر کسی اعتراض کی گنجائش کم ہی رہتی" (۲)

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دکنی قصیدہ نگاروں نے اپنے قصائد میں جس مقامی، ارضی اور ثقافتی رنگ ڈھنگ کو منعکس کیا ہے بعد کے ادوار میں بھی اگر قصائد نگار اپنے اپنے مقامی ماحول اور ثقافتی منظر نامے سے استفادہ کرتے تو اس صنف میں تصنع اور بناوٹ کے عناصر داخل نہ ہوتے یا یہ کہ جس نوع کی عقیدت کا اظہار دکنی قصائد نگار اپنے ممدوحین کے حوالے سے کرتے تھے وہی وتیرہ اگر شمالی ہند اور ریاستی عہد کے قصائد میں استعمال کیا جاتا تو جھوٹی مدح سرائی سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ دکنی شاعروں نے ممدوحین کی تعریف اس کی فتوحات اور کارناموں کے حوالے سے کی ہے۔ لیکن ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ بعد کے اردو قصیدہ نگاروں

---

(۱) اردو میں قصیدہ نگاری ص ۸۲ (۲) اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۶۱

کے ممدوحین کا منھ چڑاتی اور کارنامہ جاتی خانہ خالی ہی تھا۔ انگریز آہستہ آہستہ برصغیر میں پھیل رہے تھے۔ مغل
حکمران اپنی نااہلیوں کے سبب اپنی عظیم سلطنت مسلسل اجاڑ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے مرکزی حکمران اور
ریاستی نواب بھی انگریزوں کے وظیفہ خوار ہو گئے۔ ایسے میں قصیدہ نگار ان کے کارنامے تو خیر کیا بیان
کرتے فارسی قصیدہ کے اجزائے مدح کی تقلید اور جگالی کرنے لگے۔ یوں حقیقت نگاری اور واقعیت
کے عناصر قصائد سے غائب ہو گئے۔ تاہم برصغیر میں مسلم حکمرانوں کے دورِ زوال کا قصیدہ اپنے
شاعرانہ اوصاف، لسانی شان و شوکت اور فنی نزاکتوں کے حوالے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ اردو میں قصیدہ صرف دنیاوی ممدوحین کے لیے نہیں لکھا گیا۔
حمد، نعت، منقبت اور دیگر کئی امور کے حوالے سے بھی قصیدے لکھے گئے ہیں۔ دکنی بادشاہوں نے قصائد لکھ
کر ثابت کیا ہے کہ یہ صنف محض دنیاوی ممدوحین کی مدح کے لیے وقف نہیں ہے۔ اس سے نظم کا بھی
کام لیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے بطور صنف مطعون کرنا روا نہیں ہے۔ یہ صنف شمالی ہند
میں کیا جنوبی ہند میں بھی شعرا کی قادر الکلامی کا امتحان تھی۔ اس کا [illegible] اور خوشامد سے رابطہ جوڑنا
اس کے مجموعی مزاج سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔

قصہ مختصر ہم اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتے کہ دکنی دور کے قصائد میں عجمی قصیدہ کی تقلید ہوئی
تھی یہ رجحان بعد کے شمالی ہند کے قصائد میں زیادہ نظر آتا ہے۔ فارسی قصیدے کی علامات و اصطلاحات
اور دیگر شعری محاسن دکنی قصائد پر اثرانداز ہوئے۔ یہاں صنائع بدائع سے بھرپور کام لیا گیا۔ شمالی ہند کے
اردو قصیدہ میں یہ عمل زیادہ سرعت اور تاثیر کے ساتھ ہوا۔ دکنی قصائد کے موضوعات میں حسن و عشق،
اخلاق و مذہب، مدح و ذم اور فلسفہ و حکمت کے جو معاملات سادگی اور بے تکلفی سے بیان ہوئے ہیں
وہی آگے چل کر تکلف سے پُر، آورد آشنا آرائشی انداز سے مربوط ہو کر زیادہ پرشکوہ قصیدے
کے جنم کا باعث بنے۔ دکنی دور کی مدح میں یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان قصیدوں میں اپنے
عہد کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کی تفصیلیں دستیاب ہیں۔ شمالی ہند کے قصیدہ نگاروں نے
بھی ان امور کی طرف توجہ دی ہے۔ دکن میں جس نوع کے سیاسی اور سماجی حالات موجود تھے۔ ان
کے مطابق بادشاہوں کے عدل و انصاف اور بہادری و شجاعت کا تذکرہ شعرا نے خوش اسلوبی سے کیا ہے۔
لیکن شمالی ہند میں مخصوص سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر قصائد میں عدل و انصاف اور امن و امان
کے مسائل کی جانب (بالواسطہ) ممدوحین کی توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ شمالی ہند کے
اردو قصائد پر دکنی اور گجراتی قصائد کا مکمل اثر ہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے
شاعروں نے فارسی قصیدے کی شان و شوکت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔

باب چہارم

اردو قصیدہ اٹھارہویں صدی میں

فصل اول: سیاسی، تہذیبی و ادبی منظرنامہ

فصل دوم: خصوصی مطالعے

[ضمیمہ]

چند اور قصائد نگار اور اجمالی جائزہ

—

فصل اول: سیاسی، تہذیبی اور ادبی منظر نامہ

دہلی

تاریخ میں ۱۷۰۷ سے ۱۸۵۶ تک کا زمانہ (اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے شاہ عالم کی وفات تک مغل حکومت کے زوال کا زمانہ ہے۔ دیندار، متقی اور صالح بادشاہ اورنگ زیب کے جانشین برصغیر کی وسیع مسلم سلطنت کو متحد نہ رکھ سکے۔ یہ زمانہ اقتدار کی بساط پر ہونے والی شطرنج کی ایک ایسی بازی سے عبارت ہے جس میں انگریز شاطروں کے ہاتھوں مسلم ناعاقبت اندیش حکمرانوں کے مہرے ایک ایک کر کے پٹتے رہے۔ مہرے پٹنے کا یہ عمل کبھی تنہا انگریز پیادوں نے اور کبھی (مرہٹوں اور معزول مسلم وزراء کے اتحاد سے) ترچھے اور ڈھائی ہاتھ چلنے والے وزیروں اور گھوڑوں نے ان پیادوں کے ساتھ مل کر کیا۔ بنگال، دکن، میسور، اودھ اور بالآخر شمالی ہندوستان کے مرکزی دربار سیاسی اور معاشی طور پر انگریزوں کے تابع ہو گئے۔ ایسے میں اردو میں لکھنے والے شاعر جن کی اکثریت اسلام کے دائرے میں داخل تھی۔ ہر قدم پر شکست کھانے والے مسلم حکمرانوں اور امیروں کے "حقیقی کارناموں" پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے مواد کہاں سے لاتی۔ تاہم دردمند دل رکھنے والے شاعروں نے ان حکمرانوں کے وہ اوصاف بیان کیے جو ان کے ضمیر و کردار کا حصہ ہونے چاہییں تھے۔ یعنی عدل، شجاعت، سخاوت، علم دوستی، علوم و فنون سے مہارت کی حد تک شغف، ذاتی اخلاقی بلندی، کفر و اسلام کی جنگ میں اسلام کے پرچم کو سربلند رکھنا، ایسی شاہی شان و شوکت اور سطوت کا بیان کہ جو دشمنوں کے دلوں میں ہیبت پیدا کر دے وغیرہ کے اوصاف ان سے منسوب کیے۔ اسے خوشامد اور بخشش کے زمرے میں رکھ لیجئے یا یہ سمجھ لیجئے کہ یہ شعراء ان حکمرانوں کو اتفاقی انداز میں ان کا مقام و مرتبہ یاد دلا رہے تھے چنانچہ سودا نے تو ایک پوری غزل میں بادشاہوں کے لئے پند و نصائح کا اہتمام کیا ہے[1] اور تمہیدی باب میں ہم دیگر شاعروں کے حوالے سے لکھ چکے ہیں کہ ان کی اپنے عہد کے سیاسی اور معاشی حالات پر گہری نظر ہوتی تھی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کی کئی وجوہات تھیں۔ ان کا اجمالی جائزہ یہ نتائج فراہم کرتا ہے کہ مرہٹوں کے خلاف مغلوں کی طویل جنگوں، دشمنوں کی چھاپہ مار کارروائیوں، ست نامیوں، جاٹوں، راجپوتوں اور سکھوں وغیرہ کی بغاوتوں، مسلمانوں کی باہمی فرقہ بندانہ آویزشوں، ایرانیوں اور تورانیوں کے جھگڑوں، امراء اور لشکریوں کی عیش و عشرت پسندیوں، ناقص منصوبہ بندیوں، خود غرضیوں، سازشوں اور رشوت وغیرہ کی گرم بازاریوں نے مغلیہ سلطنت کو پہلے ہی خاصا کمزور اور کھوکھلا کر دیا تھا۔ فاتح دکن اورنگ زیب کی وفات تک تو اس کی تنظیمی صلاحیتوں کی بدولت استحکام سلطنت میں خلل واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھ کیا بند ہوئی یہ سب قوتیں سلطنت کے موٹے تازے بدن کا لہو پینے لگیں اور ان سب پر نگراں گدھوں کا

---

[1] دیکھیے اس کی کلیات سودا ص ۱۷۷ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۲

غول دانگریز) اس کے مردہ ہونے کے منتظر ہے تاکہ وہ اسے پورے طور بھنبھوڑ سکیں۔ ان سو برس میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات کا جائزہ مغلیہ سلطنت کے زوال کی داستان بھی سنائے گا اور ہم اس ماحول سے بھی آگاہ ہوں گے جس کی وجہ سے ہمارے شاعروں نے دنیاوی ممدوحین کی جھوٹی تعریفیں کیں اور مذہبی ممدوحین کی بارگاہوں پر گہری عقیدتوں کے پھول چڑھائے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ عالم بہادر شاہ محمد معظم (۱۷۰۷ - ۱۷۱۲ء) تخت نشین ہوا۔ اس کا عہد راجپوتانہ کے ہندوؤں اور پنجاب کے سکھوں کی شورشوں کو دبانے اور سرکشیوں کو کچلنے گزر گیا۔ اس نے اپنے بھائیوں (محمد اعظم اور کام بخش) کو بھی تہ تیغ کیا۔ محمد معظم نے اودے پور اور جودھپور کے راجاؤں سے از سر نو وفاداری کے عہد نامے لیے۔ اس کی وفات کے بعد جانشینوں میں اقتدار کی جنگیں ہوئیں۔ جہاندار شاہ نے اپنے بھائیوں کو شکست دے کر دہلی کا تخت حاصل کیا۔ وہ طوائفوں ڈوموں اور میراثیوں کا رسیا تھا۔ اس کا ایک سالہ دور تعیش پسندی کا دور ہے۔ جہاندار شاہ ایک طوائف (لال کنور) پر فدا ہوا اور اسی کے زیر اثر عروس البلاد دہلی کا دربار شاہی عیش و عشرت کا گہوارہ بنا۔ فروری ۱۷۱۳ء میں جہاندار شاہ کے بھتیجے فرخ سیر نے سید عبداللہ اور سید حسین علی کی مدد سے اسے قتل کر کے اقتدار حاصل کیا۔ یوں سادات بارہہ کو عروج ملا۔ راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں نے مرکزی اقتدار کو کمزور دیکھ کر پھر سر اٹھایا۔ ان کی لوٹ مار اور ظلم و تشدد کی کارروائیوں نے عوام کا ناطقہ بند کیا۔ اس دور میں سکھوں کے پیشوا بندہ بیراگی کے قتل کی وجہ سے ان کی تحریک دب گئی۔ فرخ سیر نے سادات بارہہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو محدود کرنا چاہا تو انہوں نے اسے ۱۷۱۹ء میں اندھا کر کے مروا ڈالا۔ اس دور کے پیش نظر سادات بارہہ کو بادشاہ گر کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بہادر شاہ اول کے پوتے رفیع الدرجات کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھایا۔ رفیع الدرجات کی درخواست کے بعد شاہجہان ثانی رفیع الدولہ کو جون ۱۷۱۹ء میں حکومت دی گئی۔ اسی سال ستمبر میں رفیع الدولہ وفات پا گیا۔ اس کی جگہ بادشاہ گر سیدوں نے بہادر شاہ کے ایک اور پوتے روشن اختر کو ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ کے نام سے تاج سلطنت بخشا۔ محمد شاہ کو اس کے تعیش پسند مزاج نے رنگیلا کا نام بھی دلوایا ہے۔ اس نے اپنے دور میں سادات بارہہ کا خاتمہ کیا۔ طبعاً عیش پرست ہونے کی وجہ سے اس نے معاملات حکومت سے غفلت برتی۔ اس کا وزیر قمر الدین خاں بھی عیش و مے پرستی کا دلدادہ تھا۔ اس کی تقلید میں امراء اور عوام بھی عیش کوشی کی جانب مائل ہوئے۔ یوں دلی ارباب نشاط اور شاہدان بازاری کے چنگل میں پھنس گئی۔ اس دور میں رقص، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ نے ترقی کی۔ یہی وہ دور تھا جب ایرانی اور تورانی امراء کے مابین اقتدار کی رسہ کشی کا عمل تیز ہوا۔ یہ اقتدار پرست تھے اور حکومت، عوام اور مرکزی مسلم حکومت کے استحکام سے انہیں سروکار نہ تھا۔ محمد شاہ ہی کے دور میں دلی میں نادر شاہ کی غارت گری[2] ہوئی۔ ان احوال کے نتیجے میں بنگال د بہار۔ اڑیسہ) اودھ، روہیل کھنڈ، دکن اور مرہٹہ ریاستوں کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بھی مغل صوبہ داروں نے من مانیاں شروع کر دیں۔ یوں مرکزی حکومت کی کمزوری پر مہر ثبت ہوگئی

---

(۱)- مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے سیر المتاخرین از غلام حسین طباطبائی جلد اول، دوم، سوم، بدائع وقائع آنند رام مخلص اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۵۰ شمارہ ۱۲۵ اگست ۱۹۵۰ء
برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مطبوعہ کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء

(۲) تاریخ جہاں کشائے نادری، محمد مہدی استرآبادی، ص ۲۲۱ مطبع حیدری بمبئی ۱۲۹۳ھ

محمد شاہ ۱۷۴۸ء میں دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت سلطنت کا وارث بنا اس کے دور میں مغل سلطنت اور زیادہ کمزور ہوئی۔ یہی وہ عہد ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب اور ملتان پر قبضہ کیا۔ مرکز میں امرا کے درمیان خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ عماد الملک غازی الدین خاں کی نواب صفدر جنگ سے ٹھن گئی صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ اور عماد الملک نے مرہٹوں کا سہارا لیا۔ یوں مرہٹوں اور جاٹوں کا ہندوستان کے مرکزی اقتدار میں عمل دخل ہوا۔ عماد الملک نے ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو معزول کر کے بہادر شاہ اول کے ایک پوتے کو عالمگیر ثانی کا خطاب دے کر تخت حکومت سے نوازا۔ یہ دور احمد شاہ ابدالی کے دہلی میں داخلے کا بھی ہے۔ اس دہلی میں اتنی لوٹ مار مچائی کہ اس کی مثال سے تاریخ خالی ہے۔ کابل واپسی سے قبل ابدالی نے روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو اپنا مختار اور سلطنت مغلیہ کا میر بخشی بنایا۔ ابدالی نے اہل دہلی سے اتنا تاوان وصول کیا کہ وہ مفلس و قلاش ہو گئے۔ عماد الدولہ نے بعد میں مرہٹوں کی مدد سے میر بخشی نجیب الدولہ کو دہلی سے نکال دیا۔ عماد الملک کے تعلقات عالمگیر ثانی کے ساتھ بھی خوشگوار نہیں تھے نومبر ۱۷۵۹ء میں عماد الملک نے اسے قتل کروا دیا۔

عالمگیر ثانی کے بعد شاہ جہاں سوم نے حکومت کا نظم و نسق سنبھالا اس کا نام محی الملت تھا اور وہ کام بخش کا پوتا تھا عماد الملک نے مرہٹوں کو بڑی رقمیں اور مراعات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ اسے نباہ نہ سکا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے دہلی اور دوسرے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹوں کا زور توڑنے کے لئے احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا اور سرہند اور لاہور کو مرہٹوں کے قبضے سے چھڑا کر دہلی پہنچا۔ عماد الملک احتساب کے خوف سے فرار ہو کر جاٹوں کی پناہ میں چلا گیا اور وہاں سے فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش سے پناہ کا طالب ہوا۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے دہلی پہنچ کر شاہ عالم دوم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں کی قوت کو توڑنے کے لئے شاہ عالم نے شجاع الدولہ کے ساتھ مل کر بکسر کے میدان میں ان کا مقابلہ کیا۔ انگریزوں نے اس جنگ میں فتح حاصل کی (کرناٹک اور بنگال کے بعد یہ انگریزوں کی تیسری اہم فتح تھی) یوں مغل بادشاہ اور وزیر اودھ دونوں کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔ شاہ عالم نے ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند چھبیس [۲۶] لاکھ روپے کے عوض انگریزوں کو لکھ دی۔ ۱۷۷۱ء تک شاہ عالم انگریزوں کی نگرانی میں الہ آباد رہے اور دہلی میں نجیب الدولہ نے نائب سلطنت کی حیثیت سے مغل سلطنت کی حفاظت کی۔ یہی دور تھا جب مغلیہ سلطنت دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں تک محدود ہو گئی تھی۔ وزیر اودھ نواب وزیر کہلاتے تھے ان کا تعلق اگرچہ مغل سلطنت سے تھا تاہم وہ خود مختار حکمرانوں کی مانند حکومت کر رہے تھے۔ ستلج کے زیریں علاقے سے لے کر دوآب اور آگرہ کا علاقہ سلطنت دہلی کا حصہ رہ گیا تھا۔ ۱۷۷۲ء میں نجیب الدولہ کی وفات کے بعد شاہ عالم دہلی آئے۔ یہاں انہیں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں جیسا ذی شعور وزیر ملا۔ اس نے دس برس تک شاہ عالم کو طرح طرح کی مصیبتوں اور سازشوں سے بچایا۔ اپنے طویل دور حکومت میں شاہ عالم وزرا اور امرا کے ہاتھوں کا کھلونا بنے رہے۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے انہیں اندھا کرا دیا

اس عہد میں مہاراجہ مادھوجی سندھیا نامی ایک مرہٹہ سردار کو عروج حاصل ہوا ۔ وہ شمالی ہند پر قبضہ کرنا چاہتا تھا ۔ اس نے دہلی پر کنٹرول حاصل کرکے غلام قادر روہیلہ کو قتل کرا دیا اور خود مرکزی اقتدار میں شریک ہو گیا اس نے شاہ عالم سے مرہٹہ پیشوا کے لئے وکیل مطلق کی سند حاصل کی ۔ اس کے سامنے شاہ عالم اپنے آپ کو بے بس قیدی متصور کرتے تھے ۔ ۱۷۹۴ء میں مادھوجی کے مرنے کے بعد اس کے جانشین دولت راؤ سندھیا نے شاہ عالم کو ایک طرح سے محصور کر دیا ۔ اس دوران انگریزوں نے اپنے اقتدار کو بڑھانا شروع کیا ۔ ۱۸۰۳ء میں جنرل لیک نے علی گڑھ، دہلی اور آگرہ پر اقتدار قائم کر لیا ۔ شاہ عالم دہلی کے تخت پر ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے بیٹھے رہے اور ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے

اودھ

مرکزی مغل سلطنت کے کمزور ہو جانے کے ساتھ ہی سلطنت اودھ وجود میں آئی ۔ اٹھارہویں صدی کے دوسرے ربع میں مغل سلطنت کے بڑے بڑے صوبیدار تقریباً خود مختار ہو گئے تھے ۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت اودھ کے گورنر سعادت خاں برہان الملک تھے ۔ انہوں نے کرنال کے میدان میں مغل حکمران محمد شاہ کی حمایت میں نادر شاہ سے جنگ لڑی اور قید ہوئے ۔ بعد میں نادر شاہ کو ترغیب دی کہ وہ مغلوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی کرے ۔ یوں نادر شاہ نے دلی میں لوٹ مار مچائی ۔ ۱۷۳۹ء میں سعادت خاں کی وفات پر اودھ کی گورنری ان کے بھانجے اور داماد ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے حصے میں آئی ۔ ۱۷۴۴ء میں انہیں میر آتش اور گورنر کشمیر کے عہدے بھی تفویض ہوئے ۔ احمد شاہ کی جانب سے ۱۷۴۸ء میں انہیں مغلیہ سلطنت کی وزارت ملی ۔ ۱۷۵۳ء تک وہ اس عہدے پر متمکن رہے تاہم جب انہوں نے اپنے اقتدار کو زیادہ مستحکم کرنے کے لئے احمد شاہ کے مقرب خواجہ سرا جاوید خاں کو تہہ تیغ کرا دیا تو بادشاہ نے اس عمل کو ناپسند کیا اور انہیں اپنے صوبے کی جانب لوٹ جانے کا حکم دیا ۔ صفدر جنگ نے جاٹوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کے طرفداروں کے ساتھ جنگ کی ۔ چھ ماہ تک دہلی اور نواحِ دہلی میں خانہ جنگی کی کیفیت رہی ۔ پھر صلح ہو جانے کے بعد صفدر جنگ اودھ چلے گئے اور ۱۷۵۴ء میں وہیں وفات پائی ۔ ان کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ اودھ کے نواب وزیر بنے ۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں وہ ابدالی کے ساتھ بھی رہے اور مرہٹوں سے بھی صاحب سلام رکھی ۔ شاہ عالم کے ساتھ بکسر کی لڑائی میں وہ بھی حلیف کی حیثیت سے لڑے ۔ مرہٹوں کو حلیف بنا کر شجاع الدولہ نے کوڑے کے مقام پر انگریزوں سے دوبارہ جنگ کی ۔ اسمیں بھی شکست کھائی اور نواب احمد بنگش والیٔ فرخ آباد کے کہنے پر انگریزوں سے صلح کر لی ۔ نجم الغنی کا کہنا ہے "الیسٹ انڈیا کمپنی سے یہ معاہدہ ہوا کہ شجاع الدولہ اس ملک پر جو ان کے قبضے میں تھا فرمانروائی کریں ۔ البتہ الہ آباد اور کوڑے کے اضلاع

بادشاہ کی مدد معاش کے لئے محفوظ کر دیئے جائیں۔ پچاس لاکھ روپے اخراجات جنگ کے ہرجانے کے طور پر شجاع الدولہ انگریزوں کو اس تفصیل سے ادا کریں کہ اس وقت بارہ لاکھ نقد، آٹھ لاکھ کے جواہرات اور پانچ لاکھ ماہانہ بالاقساط تاکہ تیرہ ماہ کے عرصے میں سب رقم ادا ہو جائے" (۱) شجاع الدولہ نے انگریزوں کو ریذیڈنٹ مقرر کی اجازت دی۔ نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ کی جگہ فیض آباد کو دارالخلافہ بنایا۔ فوج کو انگریزی طرز پر استوار کیا۔ فیض آباد میں نئی عمارتیں بنوائیں۔ شجاع الدولہ نے اٹاوہ اور فرخ آباد پر بھی قبضہ کیا اور فیض اللہ خاں کو ریاست رامپور بخشی (روہیلوں کی سلطنت پر بھی قبضہ کیا) روہیلوں کے علاقے کی مالگزاری سے انگریزوں کو چھ آنے فی روپیہ حصہ دیا۔ جنوری ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ نے فیض آباد میں انتقال کیا۔

شجاع الدولہ کے بیٹے مرزا امانی کو شاہ عالم نے آصف الدولہ کا خطاب دے کر وزیر نامزد کیا۔ آصف الدولہ نے فیض آباد سے دارالخلافہ لکھنؤ منتقل کیا۔ اس دور میں انگریزوں کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ اودھ انگریزوں کے ماتحت ایک دیسی ریاست بن گیا۔ آصف الدولہ تعیش پسند تھے۔ انہوں نے فوج میں کمی کی اور دولت عیش و عشرت میں صرف کی۔ اسی دور میں انگریزوں نے بنارس کا علاقہ اپنے اختیار میں لیا۔ اور اودھ میں اپنی فوج میں اضافہ کر کے اس کے مصارف کی ذمہ داری آصف الدولہ کے کندھوں پر ڈالی۔ اس سے اودھ کی آمدن گھٹ کر آدھی رہ گئی۔

آصف الدولہ لہو و لعب کے رسیا تھا، چوپڑ بازی، مرغوں کی لڑائی، اور پتنگ بازی سے انہیں خاص شغف تھا امور مملکت انجام دینے کی فرصت نہ تھی۔ وہ انگریزوں کو اپنا خیر اندیش جانتے تھے۔ سیر المتاخرین میں لکھا ہے" شجاع الدولہ کی ریاست سلاطین ہند کی قائمقام تھی۔ راجے، شاندار زمیندار اور بڑے بڑے آدمی یہاں زندگی گزارتے تھے اور آصف الدولہ کے دربار میں ان میں سے کوئی نہیں رہا تھا سوائے رذیل اور لوچ مصاحبوں کے (۲) عبدالحلیم شرر کا کہنا ہے آصف الدولہ کے زمانے تک"

"انہیں یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق میں کسی بیرونی قوت کو دخل ہے۔ جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست اور عشرت طلب بنا دیا تھا۔ اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہری صورت میں ان دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان و شوکت پیدا ہو گئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہیں تھی اور ایسا سامان عیش جمع ہو گیا تھا جو کسی جگہ نظر نہ آتا تھا۔ ان دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں دنیا کا کوئی شہر بھی لکھنؤ کے اوج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو گا" (۳)

آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خاں کی شادی میں تزک و احتشام کا یہ عالم تھا کہ بارہ سو ہاتھی جلوس میں تھے۔ دولہا کی شاہی

---

(۱) تاریخ اودھ ص ۱۲۰-۱۲۱ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ

(۳) مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۹۴/۹۵ (۲) ایضاً ص ۱۲۲، ۱۲۳

خلعت پر بیس لاکھ کے جواہرات لگے ہوئے تھے ۔ خیام و خرگاہوں کا ہجوم تھا ۔ ان پر تقریباً دس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے
اس نے ایک امام باڑہ بیس لاکھ روپے صرف کر کے بنوایا ۔ اس دور میں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا①

۱۷۹۸ء میں آصف الدولہ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا وزیر علی خاں مسند سلطنت پر بیٹھا ۔ لیکن انگریزوں نے چار ماہ بعد اسے معزول کر دیا اور آصف الدولہ کے بھائی سعادت علی خاں کو حکومت دی ۔ اس سے ایک نئے عہد نامے پر دستخط کروائے ۔ اس کی رو سے الہ آباد کا قلعہ بھی انگریزوں کو مل گیا ۔ علاوہ ازیں اس نے انگریزوں کی سالانہ رقوم میں بھی اضافہ کر دیا ۔ بعد میں سعادت علی خان پر انگریزوں نے بدنظمی کا الزام لگا کر اس سے آدھی سلطنت چھین لی اور اودھ کی فوج میں مزید اضافہ کر کے اس کا بوجھ بھی سلطنت اودھ کے خزانے پر ڈال دیا ۔ ۱۸۱۴ء تک سعادت علی خان نے اپنی کفایت شعاریوں کی بدولت تقریباً تیرہ کروڑ روپیہ کے لگ بھگ جمع کر لیا ۔ عوام اس کی جزرسی اور احتیاط سے نالاں تھے ۔ بہت سے معافی دار اور جاگیردار اپنی جاگیریں چھن جانے سے ناراض تھے ۔ حکومتی ملازمین اور کارندے رولے کے نہ ہونے کے شاکی تھے ۔ سعادت علی خاں کو تعمیرات سے دلچسپی تھی ۔ پانچ چھ انگریزی طرز کی کوٹھیاں، اپنے دربار کے لئے بارہ دری بنوانے کے علاوہ منور بخش اور خورشید منزل کے نام سے یورپی طرز تعمیر کے انداز میں عمارتیں بنوائیں یوں ہندوستانی فن تعمیر میں مغربی عمارت سازی کے اثرات نظر آنے لگے ۔ نواب سعادت علی خان نے اپنے دور میں لکھنؤ میں بہت سے اہل علم و فن جمع کیے ان کا انتقال ۱۸۱۴ء میں ہوا ۔

حیدر آباد

دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ ساتھ حیدر آباد، سندھ اور وسطی ہند کی چند ریاستوں میں اردو زبان و ادب کا کام جاری رہا ۔ حیدر آباد میں سلطنت آصفیہ کے نوابوں نے اردو شعر و ادب کی خدمت کی ۔

فرخ سیر نے اپنے عہد حکومت میں نواب نظام الملک آصف جاہ کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا محمد شاہ کے زمانہ میں وہ عہدہ وزارت② پر متمکن ہوئے ۔ لیکن نادر شاہی حملوں کی وجہ سے دہلی کا نظام درہم برہم ہو گیا جب محمد شاہ ان سے بدظن ہو گیا تو ۱۸۲۰ء میں نظام الملک دہلی چھوڑ کر دکن روانہ ہوئے ۔ شکر کھیڑہ کے مقام پر دکن کے صوبیدار عماد الملک مبارز خاں سے آپ کا مقابلہ ہوا ۔ نظام الملک کو فتح حاصل ہوئی یوں دکن میں آصف جاہی حکومت کا قیام عمل میں آیا ۔ ۱۸۰۳ء تک آصف جاہ اول [م ۱۸۲۴ تا ۱۷۴۸ء] نواب ناصر جنگ [۱۷۴۸ تا ۱۷۵۱] نواب مظفر جنگ [۱۷۵۱] نواب صلابت جنگ [۱۷۶۱ تک] نظام علی خاں آصف جاہ ثانی [۱۷۶۱ تا ۱۸۰۳] حیدر آباد کے حکمران رہے ۔ نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے " آصف جاہ اول کے بعد آپ کے صاحبزادے نواب ناصر جنگ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی ۔ مگر آپ کے بھانجے مظفر جنگ ہدایت محی الدین خان نے فرانسیسیوں کی تائید سے آپ کا مقابلہ کیا ۔ اگرچہ باہم صلح پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن بعض مفسدوں نے ناصر جنگ کو شہید

---

① لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۸ ② ۱۷۳۱/۱۷۳۲ء ۱۱۳۴ھ

گویا اس کے بعد چند ماہ تک مظفر جنگ اور پھر صلابت جنگ حکمران بنے۔ اس دور میں فرانسیسیوں نے عروج حاصل کر لیا۔ مرہٹوں نے سر اٹھایا اور ملک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔ گیارہ سالہ حکمرانی کے بعد صلابت جنگ کے حکومت سے کنارہ کش ہونے کے بعد ان کے چھوٹے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی تخت نشیں ہوئے ابتداً فرانسیسیوں نے آصف جاہ ثانی کو اعتماد رہا مگر آگے چل کر انگریزوں نے رسوخ پیدا کر لیا۔ محمد علی والا جاہ صوبہ دار ارکاٹ کی کوشش سے انگریزوں سے آپ کی دوستی مستحکم ہو گئی۔ متعدد مرتبہ آپ نے عساکر آصفی سے انگریزوں کی مدد فرمائی اور ٹیپو سلطان سے بھی کئی مرتبہ جنگ لڑی۔ ایک طویل حکمرانی کے بعد آپ کا انتقال ۱۸۰۳ میں ہوا۔"[۱] ہاشمی صاحب کا کہنا ہے "حکومت آصفیہ کا المناک حادثہ یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء کے معاہدے کے بعد جو انگریزوں سے ہوا تھا حکومت آصفیہ انگریزوں کی ایک باجگذار سلطنت بن گئی[۲]

[فرخ آباد، بنگال، مرشد آباد، ٹانڈہ اور سندھ]

نواب احمد خاں بنگش فرخ آباد م ۱۷۷۱ء، مہاراجہ شتاب رائے حاکم اعلیٰ بنگال، نواب نوازش محمد خاں شیا۔ جنگ مرشد آباد، نواب محمد یار خاں آف ٹانڈہ وغیرہ نے بھی اس دور میں شعرا کی پذیرائی کی علاوہ ازیں سندھ میں تالپور امیروں نے بھی اردو شاعری اور شعرا کے لیے فضا ہموار رکھی۔[۳]

انگریزی اقتدار [ایسٹ انڈیا کمپنی]

۱۷۵۷ سے ۱۸۱۳ء کا زمانہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسیعی عزائم کی تکمیل کی جانب بڑھنے کا زمانہ ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز ۱۶۰۰ء میں لندن میں ہوا۔ اس نے تجارتی مقاصد کے لیے برصغیر کے مختلف علاقوں کو اپنے تصرف میں لینے کی منظم سکیمیں تیار کیں۔ ۱۶۰۸ میں جہانگیر نے کیپٹن ہاکنز کو سورت کے مقام پر تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دی۔ جہانگیر ہی نے انگریزی سفیر سر طامس رو کے کہنے پر کمپنی کو اہم مراعات و حقوق تفویض کیے۔ انگریزوں نے آہستہ آہستہ پرتگیزیوں کے قبضے میں موجود برصغیر کے مختلف علاقے اپنے قبضے میں لینے لگے۔ انہوں نے ۱۶۲۰ میں ہرمزہ کا علاقہ پرتگالیوں سے چھینا۔ اس کے علاوہ آرام گاؤں اور مسلی پٹنم میں بھی اپنے تجارتی مراکز قائم کیے۔ ۱۶۳۹ء میں انہوں نے چندر گری کے راجہ سے زمین خرید کر مدراس شہر کی بنیاد رکھی اور وہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا جس کا نام سینٹ جارج رکھا۔ اسی قلعہ کو برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی سب سے پہلی ملکیت تصور کیا جاتا ہے۔ ۱۶۹۰ء تک انگریز بنگال، بمبئی اور کلکتہ کو اپنے تصرف میں لائے۔ ۱۶۹۰ء میں انہوں نے کلکتہ کی میں فورٹ ولیم کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ ان کی اولین وجہ سیاسی اور

۱۔ دکنی کلچر ص ۱۳۶
۲۔ دکنی کلچر ص ۱۳۶
۳۔ تاریخ ادبیات اردو ص ۲۵۵ تا ۲۸۰ علمی کتب خانہ اردو بازار لاہور ۱۹۹۰ء

تجارتی مقاصد کا ٹکراؤ بھی۔ فرانسیسی چاہتے تھے کہ مشرقی علاقوں پر انگریزی اثر و رسوخ بالکل ختم ہو جائے۔ فرانسیسیوں کے ساتھ کرناٹک کی تین جنگوں میں اور دوسرے محاذوں پر انگریزوں کی فتح نے فرانسیسیوں کو دبا دیا۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں کا اقتدار بنگال میں قائم ہوا۔ جنگ بکسر میں فتح پانے کے بعد لارڈ کلائیو نے عہد نامہ الہ آباد کی رو سے شاہ عالم سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حکومت کے اختیارات ۲۶ لاکھ روپے سالانہ کے عوض حاصل کر لئے۔ شاہ عالم نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ انگریزوں کو ان تمام علاقوں کا خود مختار مالک بنا دیا جو انہوں نے اپنی عیاری، چالاکی سے یا زبردستی ہندوستانی حکمرانوں سے چھینے تھے۔ اس زمرے میں کرناٹک بھی آتا ہے اسے حیدرآباد سے جدا کر کے انگریزوں کو دے دیا گیا تھا۔ لارڈ کلائیو نے اپنی گورنری کے پہلے دور ۱۷۵۷ء تا ۱۷۶۰ء میں حیدرآباد دکن پر حملہ کر کے اسے فرانسیسیوں کے رسوخ سے آزاد کیا۔ اس نے ایک معاہدے کی رو سے نظام حیدرآباد سے مسلی پٹم اور اس کے آس پاس کے علاقے بھی حاصل کر لئے ۱۷۶۵ء سے ۱۷۶۷ء تک اپنے دوسرے دور میں کورا اور الہ آباد کو بھی انگریزی توسیعات میں شامل کیا۔ یوں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے بہت سے علاقوں کی مکمل مالک بن گئی۔ (۱)

اسی عہد میں میسور میں حیدر علی انگریزوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ (۲) حیدر علی سے مرہٹوں، نظام دکن اور انگریزوں کو خطرہ محسوس ہوا چنانچہ تینوں طاقتوں نے متحد ہو کر میسور پر حملہ کر دیا۔ یہ میسور کی پہلی جنگ (۱۷۶۶ء تا ۱۷۶۹ء) تھی۔ حیدر علی نے اس جنگ میں فتح حاصل کی اور کرور کا علاقہ حاصل کیا۔ میسور کی دوسری جنگ (۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۴ء) وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء تا ۱۷۸۵ء) کے عہد میں ہوئی۔ اس جنگ کے دوران حیدر علی کی وفات ہوئی۔ انگریز مضبوط ہو گئے حیدر علی کے بعد ٹیپو سلطان نے عنان حکومت سنبھالی۔ ۱۷۸۵ء میں انہوں نے شاہ نور کے مقام پر نظام اور مرہٹوں کی متحدہ فوجوں کو شکست دی۔ لارڈ کارنوالس کے عہد میں ۱۷۸۹ء میں میسور کی تیسری لڑائی چھڑی۔ مرہٹوں، نظام اور انگریزوں نے متحد ہو کر سلطان ٹیپو کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان کو صلح کرنا پڑی اور انگریزوں کو الوانگر، سلفی ور، بارہ محل، سلیم، ڈنڈیگل اور کالی کٹ کے علاقے انگریزوں کو دینے پڑے۔ دریائے تنگبھدرا سے شمالی جانب کا تمام علاقہ مرہٹوں کے حصہ آیا۔ اور نظام حیدرآباد نے تاڑپتری، اپاورگی اور بلاری کے علاقے حاصل کیے۔

۱۷۹۸ء میں لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بنا۔ اس نے ہندوستان میں سب سڈی ایری سسٹم نافذ کر کے حکمرانوں کی آزادی سلب کی۔ یہ امداد کا سازشی نظام تھا جو حکمران اسے تسلیم کر لیتا اسے انگریزوں کو سب سے بڑی طاقت بھی ماننا پڑتا۔ انگریز اس کی محافظت کا عہد کرتے۔ چنانچہ دیسی حکمرانوں کے پاس اندرونی نظام کی دیکھ بھال کے لئے معمولی فوج رہ جاتی۔ انہیں انگریزی فوج پر انحصار کرنا پڑتا اور ان کے مصارف بھی برداشت کرنے پڑتے۔ دیسی حاکم انگریزوں کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے علاقے کے حاکم سے معاہدے بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سسٹم کے تحت ایک انگریز افسر دیسی دربار میں بطور ریذیڈنٹ مقرر ہوتا

۱-۲ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ از ڈاکٹر معین الدین عقیل انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۶ء
ص ۱۷ تا ۲۵

یکم نومبر ۱۷۹۸ء میں نظام حیدرآباد نے قبول کیا اور حیدرآباد کی آزادی سلب کروالی۔ نانا فرنویس نے یہی سلوک پونا کے ساتھ کروایا اور مرہٹوں کو انگریزوں کی کٹھ پتلیاں بنادیا۔ ٹیپو سلطان نے یہ نظام قبول نہ کیا اور یوں ۱۷۹۹ء میں میسور کی چوتھی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سلطان ٹیپو شہید ہوئے اور ہندوستان میں انگریزوں کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ دور ہوئی۔ کرناٹک اور پائین گھاٹ اور ساحلی علاقے انگریزوں کو ملے اننت پور، کڑپہ، کرنول اور بلاری نظام حیدرآباد کے حصے آئے۔ تنگ بھدرا سے شمال کے جتنے علاقے تھے مرہٹوں کے لیے رکھے گئے بقیہ علاقے میسور کے راجگان قدیم کے خاندان کو ملے۔ سرنگاپٹم انگریزوں کے قبضے میں رہا۔ سب سڈی ایری سسٹم کی بدولت ایسٹ انڈیا کمپنی کے وسائل میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کمپنی کے مقبوضات جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہوئے۔ کیونکہ اب اکثر جنگیں ان علاقوں میں لڑی جاتیں جو اس معاہدے کے بوجھ تلے ہے۔ لارڈ ولزلی نے تنجور، کرناٹک اور سورت وغیرہ کے دیوانی انتظامات بھی سنبھالے۔ علاوہ ازیں اودھ کے سرحدی صوبجات مع روہیل کھنڈ بھی انگریزوں کے قبضے میں آئے۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ کارنوالس نے دوبارہ گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا مگر اس کا انتقال اسی سال ہوا۔ ۱۸۰۵ – ۱۸۰۷ء تک لارڈ بارلو گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس نے سب سڈی ایری سسٹم سے لاتعلقی کا رویہ اپنایا۔ چھوٹی مرہٹہ ریاستوں کو اپنے حال پر چھوڑا۔ تمام سرحدی تنازعات سے الگ رہنے کی پالیسی اختیار کی۔ ۱۸۰۶ء میں ویلور میں بغاوت ہوئی۔ مقامی سپاہیوں نے کئی انگریز افسر اور سپاہی تہ تیغ کیے۔ اس بغاوت کا بنیادی سبب مقامی فوج میں اس خیال کا پھیلنا تھا کہ حکومت نے فوجی وضع قطع کے حوالے سے جو نئی ہدایات جاری کی ہیں وہ فی الاصل فوجیوں کو عیسائی بنانے کے لیے ہیں۔ اس بغاوت کے نتیجے میں حکومت کو نئی ہدایات واپس لینی پڑیں۔ ۱۸۰۷ء میں لارڈ منٹو اول گورنر جنرل بنا۔ وہ ۱۸۱۳ء تک اسی عہدے پر فائز رہا۔ اس دور میں فرانسیسی مشرق نوآبادیوں پر انگریزوں کا قبضہ ہوا یوں گویا یہ انگریزی مقبوضات میں شامل ہوا۔

تاریخ ادبیات اردو میں مرقوم ہے اورنگ زیب کے جانشینوں نے مرہٹوں کے خطرات پر پورے طور پر توجہ نہیں دی۔ شیعہ سنی اختلافات نے قومی اور ملی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ ذاتی اور مذہبی اختلافات نے مسلم قوم کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا تھا۔ باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں میں شدت پیدا ہوئی اور انہوں نے نہ صرف اقتدار کو اپنے ہاتھوں سے کھویا بلکہ اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے بھی بچانے کی کوشش نہ کی سنگین خطرات کی موجودگی کے باوجود جو سلطنت کے وسیع حصوں کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں ظاہر ہونے لگے تھے اور جن کی سنگینی کو جاننے کے لیے کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہ تھی وہ آپس میں متحد نہ ہوسکے خصوصیت سے وسط صدی میں غازی الدین عماد الملک اور نواب صفدر جنگ کی خانہ جنگی نے دہلی کا امن چھین لیا اس طرح مرہٹوں اور افغانوں کا سلطنت مغلیہ میں دخل ہو گیا[1]

---

[1] تاریخ ادبیات پاک و ہند ساتویں جلد اردو ادب دوم ص ۲

تہذیبی اور ادبی منظر نامہ

اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں کی نااہلی اور بالائی طبقوں کے اخلاقی زوال نے سماج میں تعیش پسندی، خود غرضی اور باہمی چپقلش وغیرہ کے رجحانات کو فروغ بخشا۔ یوں مغل سلطنت کے لیے گوناگوں مسائل پیدا ہوئے۔ صوبائی گورنروں کی سرکشیاں، محصولات کے حصول میں بدانتظامیاں، سرکاری عہدے داروں کی رشوت ستانیاں، بیرونی حملہ آوروں کی یلغاریں، لاقانونیت، بدنظمیاں، باہمی غداریاں، اقتدار بچانے کے لئے ضمیر و ملک فروشیاں ان سب کی بدولت عظیم الشان مغل سلطنت کی عمارت میں ناقابل مرمت دراڑیں پڑ گئیں۔ یہ دور مرکزی ہندوستان میں اقتصادی بدحالی کا بھی ہے۔ دکن، سندھ، اودھ، بنگال وغیرہ کے مغل سلطنت سے عملاً علیحدہ ہونے اور مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں، روہیلوں اور انگریزوں کی شورشیں دبانے کے سلسلے میں اٹھنے والے اخراجات اور ان قوتوں کی لوٹ مار کی وجہ سے مرکزی حکمرانوں کے پاس بہت کم وسائل رہ گئے تھے۔ شاہی خزانوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ امراء، وزراء، بادشاہ اور شہزادے مفلس و قلاش ہونے لگے تھے۔ غلام حسین طباطبائی لکھتے ہیں" محمد شاہ

خاتم السلاطین بابریہ است چہ بعد او سلطنت غیر از نام چیزے دیگر نہ دارد" (۱)

ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی لکھتے ہیں

" نوبت یہاں تک پہنچی کہ اورنگ زیب عالمگیر کی جگہ محمد شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا اور آصف جاہ نظام الملک جیسے دانشمند منتظم کے نظم و نسق میں دربار کے مسخرے اور شہدے روڑے اٹکانے لگے۔ وہ ملت جو سپاہی پیدا کر تی اب بانکے پیدا کرنے لگی تھی۔ سپہ سالار بھی میدان جنگ کی طرف پالکیوں میں جانے لگے۔ مذہب کی جگہ اوہام پرستی نے لے لی۔ ملی اور مذہبی وفاداریاں خود غرضی کا شکار ہو گئیں " (۲)

مرکزی اقتدار کے محدود ہو جانے پر سودا کہتے ہیں

سہ سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند + سو آمدان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند + جو ایک شخص تھا بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوج داری کول

ایسے ہی حالات میں آنند رام مخلص نے لکھا کہ شومئی تقدیر سے دہلی اتنی زخم خوردہ ہو گئی کہ اس عشق کدے کو پھر سے اصل حالت میں آنے کے لیے مدت درکار تھی (۳)

---

(۱) سیر المتاخرین جلد سوم ص ۸۷۰ مطبوعہ نولکشور پریس غلام حسین طباطبائی (۲) برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ص ۲۲۲ مطبوعہ کراچی یونیورسٹی اشتیاق حسین قریشی

(۳) بدائع وقائع ص ۸۱ مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین لاہور شمارہ ۱۰۲ اگست ۱۹۵۰ء آنند رام مخلص

جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے بسا اوقات بادشاہوں کو ان حالات میں سواری کا گھوڑا میسر نہیں آتا تھا[1] جادو ناتھ کا یہ بھی کہنا ہے "شہزادوں اور شہزادیوں کی حالت مفلسوں سے بھی گئی گزری تھی۔ شاکر خاں جو

شہزادہ عالی گوہر کا دیوان تھا بیان کرتا ہے ایک دن میں خیرات خانے کا شوربہ
شاہی معائنے کے لئے شہزادے کے پاس لے گیا۔ تو اس نے کہا یہ محل کی بیگمات
کو دے دو کیونکہ حرم کے مطبخ میں تین روز سے چولھا نہیں جلا[2]

شاہی خزانے سے اکثر سپاہیوں کو تنخواہ ادا نہ کی جاتی۔ اکبر شاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ شاہی محلات کا ساز و سامان بیچ کر تنخواہ ادا کی گئی۔ بعض فوجیوں نے تنگ آ کر گھوڑے بیچ دئیے، پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہیں ان احوال کا تذکرہ سودا نے اپنے شہر آشوب۔ اور ہجو یہ قصیدہ تضحیک روزگار میں کیا ہے۔ جانوروں کو چارہ تک نہیں ملتا تھا۔ وہ بھوک سے مرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر تارا چند نے اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کو ایک جنگل کہا ہے۔ ایسا جنگل جہاں خوفناک درندوں کا راج ہو[3]۔ اس دور میں لوگوں کے دلوں سے نظام اقدار کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ عدم تحفظ، بے یقینی اور ہر میدان میں عدم توازن کے گہرے سائے لوگوں کو ضعیف الاعتقاد اور اوہام پرست بنا رہے تھے۔ اس دور کی اردو شاعری کے مجموعی مزاج پر تصوف اور مذہب کی گہری چھاپ اسی صورت حال کا ایک اور عکس ہے لوگ پیر پرست ہو رہے تھے، اور خدا اور اس کی برگزیدہ ہستیوں سے اظہار عقیدت کر رہے تھے۔ پیداوار اور حرفت تعلق اور آفات ثنویت، انصاف اور استحصال، مقصد اور بے مقصدیت، جبت اور لاجبتی، انجماد اور ارتقا، اختیار اور عدم اختیار اور فکر اور جذبے کی لہریں آپس میں یوں مل گئی تھیں کہ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ جاگیرداری اور منصب داری کے نظام کے تضادات ابھر کر سامنے آ رہے تھے۔ بد انتظامی کی بدولت لمحہ انتشار اور بے اطمینانی کے ماحول میں زمینیں بنجر ہو گئی تھیں کسان بے دخلیوں کے اندیشوں میں مبتلا تھا۔ امرا بادشاہوں کو انگلیوں پر نچا رہے تھے، رشوت اور لوٹ کھسوٹ عام تھی ایرانی اور تورانی اور افغانی اور ہندوستانی امرا کی آویزشیں روزافزوں تھیں۔ رسم پرستی، ماضی پرستی اسی صورت حال کا لازمی نتیجہ تھا۔ سو علوم و فنون کے دھارے مخصوص کناروں ہی کے اندر بہتے رہے۔

ہندوستان کے مذکورہ حالات نے خود غرضی، بددیانتی، خوف اور طمع کے رویوں کو مستحکم کیا۔ لوگوں نے تصوف اور تعیش دو انتہاؤں پر یا ان دونوں کے درمیان پناہ ڈھونڈی۔ روحانی اور مذہبی افکار کو اختیار کرنے والے بے ثباتی دنیا، توکل، قناعت، استغنا، اخلاق کی درستی اور راستی کی طرف توجہ دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جسمانی اور حسی لذتوں کی پناہ لینے والے عیش و عشرت، رامش و رنگ اور رقص و نغمہ میں اپنی زندگی غلطاں کرتے۔ یہ فراری ذہنیت بادشاہوں میں بھی موجود تھی۔ وہ جب محسوس کرتے ان کے اقتدار میں رخنہ ڈالا گیا ہے تو وہ باغات میں چلے جاتے یا شکار کے لئے جنگلوں میں نکل جاتے

---

(۱) تاریخ عالمگیر ثانی از جادو ناتھ سرکار ص ۱۴۲ مطبوعہ کلکتہ (۲) ایضاً ص ۳۷

(۳) History of Freedom Movement in India P. 52
ڈاکٹر تارا چند VI پبلی کیشن ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا 1961

ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں " نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کے بعد جب اپنے منجھلے بیٹے کی شادی محمد شاہ رنگیلے کی بیٹی سے رچائی تو گھر گھر طبلے کھڑکنے لگے ۔ ناچ، رنگ، جلسے، دعوتیں جہاں دیکھو محفل رقص و سرود برپا ہے ۔ بھانڈ خود اپنے سپاہیوں اور سرداروں کی نقلیں دکھا رہے ہیں ۔ تماشائی شرمانے کی بجائے قہقہے لگا رہے ہیں "[1] شاعروں نے شہر آشوبوں اور ہجووں کے ذریعے اس ماحول کے خلاف بھرپور احتجاج کیا ہے

اس دور میں اصلاح احوال کی کوششیں بھی ہوئیں ۔ شاہ ولی اللہ نے قرآنی تعلیمات کے ذریعے معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کی ۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے پیغامات پر عمل کرنے پر زور دیا ۔ یہی نہیں اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو مربوط و منظم شکل میں پیش کرنے کا سہرا بھی ان کے سر ہے فرقہ وارانہ (شیعہ سنی) اختلافات کو ختم کرنے کی انہوں نے سر توڑ کوشش کی ۔ قوم کی سماجی و معاشی اصلاح کے لئے بھی ان کی تصنیفات میں گہرے نکات درج ہیں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا کہنا ہے " اٹھارویں صدی کے مسلمانوں کی رجحانی، مذہبی، اخلاقی، فکری، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی حالت کا شاہ صاحب نے گہرا مطالعہ کیا اور ہر پہلو سے ان کی اصلاح و ترقی کی کوشش کی ۔ اس تعمیری مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ نے فارسی اور عربی میں کوئی پچاس کتابیں لکھیں "[2] شاہ ولی اللہ کے بیٹوں شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر وغیرہ نے بھی ان کا مشن جاری رکھا ۔ شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسمٰعیل نے بعد میں اس ضمن میں بڑی خدمات انجام دیں ۔

یہ دور شرافت و نجابت کے مخصوص معیارات کو مسلمہ جانتا تھا ۔ اعلیٰ خون اور اعلیٰ نسل کو فوقیت حاصل تھی ۔ ہندوؤں کے ذات پات کے تصورات کا زیر مسلم تہذیب و ثقافت کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا ۔ اشراف و اجلاف میں تمیز روا رکھی جاتی تھی ۔ اعمال کی بجائے فرد کے معاشرتی مرتبے کو اہمیت دی جاتی تھی ۔ جو ہندو مسلمانوں کی قربت اختیار کرتے تھے انہیں بھی شریف گردانا جاتا تھا ۔ معیار شرافت یہ بھی تھا کہ آدمی نوکر پیشہ ہو اور قربت دربار رکھتا ہو ۔ اس دور میں مسلمان ہندوؤں کے تہواروں بسنت اور ہولی وغیرہ میں بھی دلچسپی لیتے تھے ۔ اس کے علاوہ ہفت تماشا میں درج ہے کہ شاہ مدار کی مدرس اور شیخ سدو کی نیاز کے بکرے وغیرہ کی رسومات میں ہندو اور مسلم دونوں مذاہب کے لوگ شریک ہوتے اکثر ہندو شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی ہنسلی اپنے بچوں کے گلے میں ڈالتے تھے اور نیاز دلواتے اپنے بچوں کے نام کا تعزیہ مسلمانوں کے گھروں سے اٹھاتے تھے[3] اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کوئی ہندو تخلیق کار مسلم ثقافت و تہذیب کے حوالے سے کیسے عمدہ اشعار رکھ سکتا تھا ۔ شادی بیاہ کی رسوم سے لے کر مرگ کی رسموں تک مسلمانوں نے بہت کچھ ہندو ماحول سے لیا ۔ مرزا قتیل کا کہنا ہے " شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی اور لڑکے کو زرد کپڑے پہنانا، کلائی میں ریشمی کلاوہ باندھنا، عقد سے فارغ ہونے تک، دو لہا کے ہاتھ میں لوہے کا ہتھیار پکڑے رہنا،

[1] تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت از ہاشمی فرید آبادی ص ۳۴ مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان
[2] تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند جلد ساتویں اردو ادب دوم ص ۱۶
[3] ہفت تماشا از مرزا قتیل ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر ص ۹۹ مکتبہ برہان اردو بازار دہلی

ان کے علاوہ سیاچق یا میوہ سنبھانا۔ مہندی لے جانا، سہرا باندھنا، راستہ روکنا، نیگ مانگنا، سلامی لینا، رقص و سرود
روشن چوکی، بابا فرید کا جوڑا، جہیز، پنجیری اور جوتی کی رسمیں عام ہیں (۱)۔ بسنت کے تہوار پر ہندو اور مسلمانوں کی
ٹولیاں تماشے کے لیے ساتھ لگتیں، پری پیکر لولی بوکیے لباس پہن کر قبروں پر جاکر رقص کرتے (۲)۔ پیر پرستی کا
رجحان عمومی تھا۔ محمد شاہ رنگیلا کی آخری عمر فقرا میں بسر ہونے لگی تھی (۳) عالمگیر ثانی نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضر ہوتا (۴)
حضرت سلطان المشائخ کے مزار پر چہار شنبہ اور دیگر مزاروں پر (حضرت شاہ ترکمان بیابانی اور حضرت شاہ حسن
رسول نما کے) عرس کے دنوں میں رونقیں ہوتیں۔ نقال و رقاص خوش ادائیوں میں مشغول رہتے (۵)۔ "بیادِ شاہِ اول
خلد منزل کے عرس کے موقع پر عشرت پسند لوگ ہر طرف اپنے محبوبوں کے ساتھ بغل میں ہاتھ ڈالے اور عیاش ہر کوچہ و
بازار میں نفسانی شہوت کی قوت میں رقصاں نظر آتے" (۶) امرد پرستی عام تھی وزیر الممالک بھی اسی شوق میں
مبتلا تھا اور ہر روز پیکر تازہ جادو سے تسخیر کرتا (۷) عام طور پر مسلمانوں کے گھروں پر روز از لولیوں کا رقص ہوتا اور
رات کو اس میں ہیجڑوں اور نقالوں کا اضافہ ہو جاتا (۸)۔ شراب کا استعمال عام تھا بعض امیر زادے اور شرفا و
عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے۔ گھروں میں لونڈیوں کی اولادیں عام تھیں (۹)۔ طوائف اس دور میں اتنی اہم ہو
گئی تھی کہ شرفا اور امرا ان سے ملنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ وزیر الممالک اعتماد الدولہ نے ایک مرتبہ مرصع جام
و صراحی بہنیا بیگم سوار کو (جو اس زمانہ کی مشہور طوائفیں تھیں) بھیجیں تو وہ ستر ہزار روپے قیمت کی تھیں (۱۰)
بیگم ایک مشہور طوائف تھی جو پاجامہ نہیں پہنتی تھی اور قلم نقاش کی رنگ آمیزی سے بدن اسفل کو اس طرح
رنگین پاجامہ کی صورت دیتی کہ رومی کمخواب کے تھان کی پھول پتیوں کے بنائے ہوئے نقش و نگار میں
کوئی فرق محسوس نہ ہوتا اور امرا کی محفلوں میں وہ اسی طرح جاتی (۱۱)۔

اس دور کی مصوری کے بارے میں ایک اقتباس پر نظر ڈالیے۔ صباح الدین عبد الرحمن لکھتے ہیں

"اٹھارہویں صدی ہجری میں جہاندار شاہ، محمد شاہ اور احمد شاہ کے دور حکومت میں دربار میں
بڑی رندی اور سرمستی رہی۔ اس لیے اس زوال پذیر عہد کے مصوروں کی تصویریں زیادہ تر ایسی ہیں
جن میں عاشقانہ، فاجرانہ اور عیاشانہ رنگ ہے۔ عورتوں اور خوابگاہوں کی تصویروں کی بڑی فراوانی
ہے۔ عورتیں پتنگ اڑاتی دکھائی دیتی ہیں۔ کبوتروں کو دانے دیتی نظر آتی ہیں۔ ایک تصویر میں
یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک عاشق جانباز نے اپنی معشوقہ سے ملنے کے لیے بے تابانہ اپنے گھوڑے کو دریا میں
ڈال دیا ہے اور ساحل پر پہنچ کر وصل کرنا چاہتا ہے۔ پھر ایک شاہزادہ اپنی خوابگاہ میں اپنی محبوبہ
سے مل رہا ہے اور کنیزیں بھی کھڑی ہیں۔ ایسی تصویریں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں نہیں بنائی
گئی تھیں۔ لیکن حکومت پر زوال آگیا تھا تو زوال پذیر سوسائٹی کے آثار ان تصویروں میں بھی نظر آنے لگے تھے (۱۲)

---

(۱) ہفت تماشا ص ۱۴۲ تا ۱۵۲ (۲) ایضاً ص ۸۸، (۳) سیر المتاخرین جلد سوم ص ۸۴۰ (۴) ہفت تماشا ص ۱۲۵
(۵) مرقع دہلی نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ ص ۶ (۶) ہفت تماشا ص ۱۲ (۷) ایضاً ص ۳۲ (۸) ایضاً ص ۹۲
(۹) ایضاً ص ۱۴۳ (۱۰) مرقع دہلی مقدمہ ص ۲۶ (۱۱) مرقع دہلی ص ۷۵ (۱۲) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے
تمدنی جلوے ص ۶۱۶-۶۱۷

اس دور کے اردو شاعروں نے غزلوں، مثنویوں، واسوختوں، ریختیوں، قصیدوں اور شہر آشوبوں میں اس عہد کے حالات کے تقریباً سارے ہی رخوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے وسط تک دہلی میں مغلیہ تہذیب و تمدن اور اردو ادب کی پرورش نسبتاً پرسکون ماحول میں ہوئی۔ بعد ازاں سیاسی انتشار، بدامنی اور بے چینی کی وجہ سے علماء، فضلا، ادیب، دانشور اور شاعر دیگر علاقوں میں تلاش رزق کرنے لگے۔ زیادہ حضرات لکھنؤ پہنچے۔ فرخ آباد، روہیل کھنڈ، ٹانڈہ، مرشد آباد اور فیض آباد کے علاقے بھی ان کی وقتی پناہ گاہیں ثابت ہوئے۔ مگر آخر آخر لکھنؤ ہی وہ شہر رہ گیا جس کے حکمرانوں کی فیاضیوں نے شعرا اور ادبا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ دکنی علاقوں میں بھی اردو شعر و ادب کی روایت پروان چڑھتی رہی۔ ۱۷۳۹ء کے بعد بے شمار علماء، فضلا اور شعرا لکھنؤ پہنچے۔ آرزو، حسرت، ضاحک، منت، فرخاں، سودا کے علاوہ میر، میر سوز، مصحفی، انشا، جرأت اور میر حسن وغیرہ نے بھی لکھنؤ کی علم پرور اور فن شناس سرزمین کو اپنے لیے منتخب کیا۔ شمس الدین صدیقی کے بقول "چونکہ اودھ کے پہلے دو صوبے دار اور ان کے ممتاز امراء و ابستگان دولت سب اپنی تہذیب و تمدن ثقافت و معاشرت میں مغل پایہ تخت دہلی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس لئے اودھ میں جس نئی تمدنی و ثقافتی روایت کی اساس پڑی وہ قدرتاً دہلی سے ماخوذ تھی۔ اور وہ بھی محمد شاہ رنگیلے کے زمانے کی دہلی سے جب مغلوں کا قدیم نظم و نسق اور شان و شکوہ رخصت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ نمائش، تن آسانی، عیش و عشرت اور لہو و لعب نے لے لی تھی۔ اور لوگ سپہ گری اور فنون حرب کی بجائے فنون لطیفہ کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ اودھ کے خوشحال ماحول اور پرامن فضا میں اس زوال یافتہ تہذیب و تمدن کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا۔" "اودھ کے باشندوں میں سرخوشی و مستی، رنگین مزاجی و رنگین خیالی وارفتگی و بشاشت، اور رجائیت و انبساط کے جذبات پرورش پانے لگے"①

نفاست پسندی، تکلف اور تصنع لکھنوی ادب کا طرۂ امتیاز ٹھہرا۔ تہذیبی حوالے سے دیکھا جائے تو لکھنؤ کے خوش مزاجوں نے ہر گھر کو خانۂ شادی اور ہر کوچہ کو عشرت گاہ بنا دیا تھا۔ الغرض بیٹھنے، روزمرہ بول چال، رسوم و رواج، رہن سہن اور لباس و وضع قطع میں آرائش و تکلفات اور جدت طرازی کا عام عمل دخل ہوا۔ نئے تمدنی اور معاشرتی اصولوں کی داغ بیل پڑی، فنون لطیفہ اور رقص و موسیقی میں نئے رجحانات داخل ہوئے۔ زبان دانی اور زبان سازی کے معاملات باعث فخر ٹھہرے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اہل لکھنؤ نے ہر معاملے میں دہلی کی مرکزیت سے انحراف کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ مذہب کا معاملہ لے لیجئے دہلی میں اگر تسنن کا عروج تھا تو لکھنؤ میں شیعیت کو فروغ ملا۔ برہان الملک اور ان کے جانشینوں نے مذہب اثنائے عشری کے استحکام و اشاعت کے لئے اہم

---

① تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند جلد ساتویں اردو ادب دوم ص ۲۹ - ۳۰

کردار ادا کیا۔ آصف الدولہ کے دور میں تو اسے سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا۔ دربار میں مجتہد العصر کا منصب قائم کیا گیا۔ "علمائے فرنگی محل نے دوسرے مذہبی علوم کی شمع بھی روشن رکھی تھی لیکن ان کے اثرات اتنے روحانی نہ تھے جتنے کہ مکتبی و متکلمانہ، دینیاتی اور ذہنی تھے۔ فرنگی محل میں جو سلسلہ تعلیم درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہوا اس میں تفسیر و حدیث اور علوم باطنی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ صرف و نحو، معانی و بیان، منطق و فلسفہ اور فقہ و کلام وغیرہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح تصوف اور علوم باطنی، تفسیر اور حدیث کی تعلیم کے جو اثرات اہلِ دہلی پر مرتب ہو رہے تھے اہل اودھ پر مرتب نہ ہو سکے" (۱)۔

مذہبی قصائد کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ۔ حضرت علیؓ اور دیگر اماموں کی شان میں کہے گئے قصیدے لکھنؤ کی اسی مذہبی روایت کا حصہ ہیں۔ علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ مذہبی رجحان رکھنے والے شعرا تو مذہبی قصائد کہا ہی کرتے تھے درباری قصیدہ نویس بھی آخرت میں ثواب حاصل کرنے کے لیے مذہبی قصائد ضرور لکھتے تھے (۲) اس لئے امداد امام اثر کا یہ بیان محلِ نظر ہے کہ اردو میں درباری قصائد کے مقابلے میں مذہبی قصائد کم ہیں (۳)۔ کیونکہ اگر تمام مدحیہ قصائد یکجا کر لئے جائیں تو بھی اردو میں ان کی تعداد مذہبی قصائد سے زیادہ نہ ہوگی (۴) اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ذہنی اور اقتصادی پریشانیوں میں مذہب سکون اور ہمت عطا کرتا ہے (۵)۔ اس لیے سیاسی ادبار و زوال کی فضا میں منقبتی اور نعتیہ شاعری کو بڑا عروج ہوا (۶)۔ علی جواد زیدی کا یہ بھی کہنا ہے "منقبتی اور نعتیہ شاعری ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے۔ دکنی شعرا میں سبھی نے (جن میں سلاطین قطبیہ شامل ہیں) مذہبی قصائد لکھے ہیں۔ شمال و جنوب کے خاص نقطۂ اتصال مانے جانے والے ولی کے دیوان میں چھ قصیدے ہیں اور سب مذہبی نوعیت کے تینوں قصیدے منقبتی ہیں۔ میر و سودا نے بیشتر قصائد بزرگانِ دین کی مدح میں لکھے ہیں۔ میر حسن کے دو قصیدے منقبتی ہیں (۷)"۔

شمالی ہند میں ولی کے کلام کے زیرِ اثر اردو شاعری کے لیے فضا ہموار ہوئی۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے اسے علمی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ مرزا مظہر جانجاناں نے اردو زبان کو پاکیزہ اور مصفا بنانے کی کوشش کی۔ شمالی ہند میں سودا سے قبل قصیدے کی روایت کے بارے میں محمد حسین آزاد، مولانا عبد السلام ندوی اور شیخ چاند نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس دور میں معیاری قصائد نہیں لکھے گئے۔ البتہ ان میں سے کسی نے ان کے فقدان کا تذکرہ نہیں کیا۔ آزاد نے دوسرے طبقے کے شعرا کے ہاں مدح کے رجحانات کی طرف اشارہ کیا ہے (۸)۔ عبد السلام ندوی نے بھی شمالی ہند میں دورِ قدیم کے اردو شعرا کے ہاں قصائد کی موجودگی کا ذکر کیا ہے البتہ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کی اصل ترقی قدما کے دوسرے دور میں ہوئی (۹)۔ شیخ چاند نے بھی یہ رائے دی ہے کہ دلی میں اردو شاعری کے آغاز سے ساتھ ہی تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی گئی (۱۰)۔

---

(۱) تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند جلد ساتویں اردو ادب دوم ص ۲۹۔۳۰ (۲) قصائد نگارانِ اترپردیش ص ۷۰
(۳) کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۱۲ (۴) قصائد نگارانِ اترپردیش ص ۷۰ (۵) ایضاً ص ۷۰ (۶) ایضاً ص ۷۰
(۷) ایضاً ص ۷۰ (۸) آبِ حیات ص ۱۱۱ تا ۱۱۹ (۹) شعر الہند جلد دوم ص ۴۱
(۱۰) سودا از شیخ چاند ص ۱۸۵ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں شاکر ناجی، عبدالحی تاباں، سراج اورنگ آبادی، درگاہ قلی خاں درگاہ، اشرف علی فغاں، ضیاءالدین پروانہ وغیرہ نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ علاوہ ازیں دیگر علاقوں میں ابوالحسن قرب، عارف الدین عاجز وغیرہ نے بھی عمدہ قصیدے لکھے۔ ان کے بعد کے قصیدہ نگاروں میں میر عوض علی مدعا، مرزا رفیع سودا، میر حسن، میر جعفر علی حسرت، بقاءاللہ بقا، غلام حسین ہدایت یا انسق، قیام الدین قائم چاندپوری، خواجہ احسن الدین خاں بیان، میر محسن تجلی، محمد روشن جوشش، میر باقر آگاہ، لچھمی نرائن شفیق، شیخ قلندر بخش جرأت، شیر محمد خاں ایمان اور میر تقی میر نے بڑا نام پیدا کیا۔ انشا، مصحفی اور سعادت یار خاں رنگین نے بھی اسی دور میں اپنے تخلیقی کارنامے سرانجام دیے۔ ان تینوں شاعروں کو ہم انیسویں صدی کے آغاز کے شعرا کی صف میں رکھ کر زیر بحث لائیں گے۔ ان کے علاوہ نول رائے وفا، ابوالحسن قرب، فدوی پنجابی، مرزا علی نقی ایجاد، نور محمد عاصی، حافظ فضل علی ممتاز، نواب محمد یار خاں امیر، مرزا عظیم بیگ عظیم، محمد جمیع عالم خاں ممتاز، میر امانی اسد، میر محمد حسن محزوں، میر عطا حسین خاں تحسین، میر عبدالقادر مہربان، شاہ واقف بیکفوی، میر غلام حسین شورش، مرزا علی بخش دہلوی، محمد علی شوق، بالاجی ترمبک، میر اسد علی تمنا، محمد عابد دل، فرح بخش ارکانی، ولی اللہ محب، میر محمدی بیدار، محمد شریف مفتون، شاہ آیت اللہ جوہری، میر حیدر علی حیران، جعفر علی ثروت، معین الدین، شاہ عالم، میر شبیر علی افسوس، سید ثابت علی شاہ ثابت، ضیاءالدین ضیا، شاہ عنوق، الفت محمد الفت، امداد، انوار، میر محمد علی عشق، میر محمد علی خاں ماہ، فرسون، موزوں، نصیر، صدق، میر صادق علی تاثیر، جعفری، حمایت، خاص، رضا محمد رضا، شہرت، غیرت، فیاض، مجرم، نوید، ہادی، محمد داؤد رہبر، یک رنگ، امتیاز، غلام احمد، برج ناتھ خیال، زماں، غازی، ہذا، اور سمیت وغیرہ نے بھی قصائد لکھے ہیں جن کا اجمالی جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

اردو زبان شمالی ہند کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ ہندوستان میں عام بولی جانے والی زبانوں میں سے تھی البتہ یہاں کی درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی اور اسی میں تخلیق ادب کا کام ہو رہا تھا۔ فارسی بولنے والے مہذب، شائستہ اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے۔ اس زبان کے ناتے لوگوں کو روزگار میسر ہوتا تاہم مغلیہ سلطنت کی مرکزیت کے کمزور ہوتے ہی فارسی پر بھی زوال کے آثار نمودار ہوئے۔ آہستہ آہستہ اردو اس کی جگہ لینے لگی۔ یہ عمل انتہائی سست تھا۔ اردو اور فارسی ۱۸۵۷ تک ایک دوسرے کے متوازی ہندوستان میں اپنا سفر طے کرتی رہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اردو درباروں میں بھی راسخ ہو گئی اور فارسی کی حیثیت کم ہو گئی۔ اسی دوران یہ زبان سندھ، بنگال، پنجاب اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی ادبی زبان کے طور پر ابھرنے لگی۔ دکن میں اٹھارہویں صدی سے قبل اردو کی تین سو سالہ ادبی روایت کا گزشتہ باب میں ذکر ہو چکا ہے۔ دور عروج کے مغلیہ حکمران اردو سے شناسا تھے تاہم جہاندار شاہ کی ملکہ

طوائف لال کنور، عزیزالدین عالمگیر ثانی کی ماں انوپ بائی اور محمد شاہ کی بیوی ادھم بائی (نو مسلم رقاصہ) کے محلات کی
زینت بننے سے حکمرانوں کے عوامی مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔ یوں اردو زبان بھی محل اور دربار میں اپنے تیور دکھانے
لگی۔ اور پھر یوں ہوا کہ قلعہ معلی کی اردو ٹکسالی روزمرہ اور محاورہ کی حامل ہو گئی۔ ① محمد شاہ اور عالمگیر ثانی ②
وغیرہ نے اردو میں اشعار کہے ہیں۔ شاہ عالم ثانی نے اردو داستان نویس اور شاعر ہو کر بھی نام پیدا کیا ہے
تاہم خواص ابھی تک اس زبان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ البتہ جب شیخ علی حزیں کا رسالہ تذکرۃ الاحوال
چھپا تو مقامی فارسی دانوں اور شاعروں اور ادیبوں کو معلوم ہوا کہ اس میں ہندوستانیوں کی فارسی پر اعتراضات
کیے گئے ہیں تو ان کی آنکھیں کھلیں۔ اس رسالے کی غرض و غایت ہندوستانیوں کی مذمت تھی ③ امیر خسرو، ابوالفضل
اور فیضی جیسے مقامی ہندوستانی شعرا اور ادیبوں پر ایرانی پہلے بھی اعتراضات کیا کرتے تھے۔ قاضی عبدالودود نے
اپنے مضمون "عہد شاہجہاں کا ایک ادبی مناقشہ اور غالب" میں منیر لاہوری کے کارنامہ منیر کا حوالہ دیتے ہوئے
لکھا ہے کہ ایرانی اگر فارسی میں غلطیاں کرے تو اعتراضات نہیں کیے جاتے "تاہم اگر کوئی ہندی شیخ ہندل کی
طرح اپنے جوہر ظاہر کرتا ہے تو اس کی تعریف نہیں کی جاتی ④۔ ایرانی ہندوستانیوں پر بطور ڈاکٹر جمیل جالبی
دو اعتراضات کرتے تھے ایک یہ کہ وہ کتابی فارسی سے سروکار رکھتے ہیں اور دوسرا ایسے الفاظ، روزمرہ اور
محاوروں کا استعمال کرتے ہیں جن سے اہل عجم ناواقف تھے ⑤۔ شیخ علی حزیں کے اعتراضات کا جواب خان
آرزو نے اپنے رسالہ تنبیہ الغافلین میں دیا ⑥ مختصراً ان کا کہنا تھا ایران میں بولی جانے والی ترکی اگر ترکی میں بولی
جانے والی ترکی سے الگ ہو سکتی ہے تو ہندوستان کی فارسی بھی مخصوص ہے۔ فارسی میں اگر دیگر زبانوں (عربی، ترکی) وغیرہ
کے الفاظ شامل ہو سکتے ہیں تو ہندی الفاظ بھی شجر ممنوعہ نہیں ہیں۔ ایرانیوں کو اردو کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے
علاوہ ازیں فارسی لسانی اور شعری قواعد کی کورانہ تقلید جائز نہیں ہے خان آرزو نے غیر زبانوں کے آشنا
میں ہندوستانیوں کو ایرانیوں پر فوقیت دی ⑦۔ مثمر، داد سخن اور مجمع النفائس جیسی اپنی کتابوں میں بھی
آرزو نے مذکورہ نکات کا اظہار کیا ہے ⑧ خان آرزو کے ان نکات کے بعد اردو کی طرف خواص نے بھی توجہ
دینی شروع کی ان کے اپنے گھر میں مراختوں کا اہتمام ہوا۔ سودا اور مکین کے درمیان ہونے والے
ادبی اور لسانی جھگڑے کی بنیاد دلی متعلق فارسی کے خلاف ایرانی دانشوروں کا رویہ ہے۔ سودا کے شاگرد نے اپنے
قصیدے میں اس کا تذکرہ کیا ہے اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔ یوں ریختہ کے آئین کی طرف زیادہ
جھکاؤ ہوا اور مقامی افراد جو فارسی زبان سیکھنے میں بڑی محنت کرتے تھے ایرانیوں کے رویے سے بددل
ہوئے۔ ادھر دیوان ولی کے شمالی ہند آنے سے پہلے ہی اس زبان میں موجود ادبی روایت کا چرچا ہو چکا تھا
اس سے اندازہ ہوا کہ یہ زبان صوفیانہ اور حکیمانہ موضوعات کے اظہار کے لئے ویسے ہی عمدہ ہے جیسے فارسی
اس دیوان نے دکن کی تین سو سالہ ادبی روایت کو بھی شمالی ہند کی نئی ادبی روایت کا حصہ بنا دیا

---

① بزم تیموریہ مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن ص ۳۰۶ اعظم گڑھ ۱۹۴۸ ② ایضاً ص ۳۱۶
③ مردم دیدہ از حاکم لاہوری مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۴۶ (مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین) پنجابی ادبی اکادمی ۱۹۶۱ لاہور
④ معاصر ۵ پٹنہ ص ۱۵۲ ⑤ تاریخ ادب اردو جلد دوم اول ص ۲۲
⑥ داد سخن سراج الدین علی خان آرزو دیباچہ ص ۱۲ مطبوعہ مرکز تحقیقات ایران و پاکستان
⑦ معارضہ حزیں و آرزو، منقولہ سبا نے انور، معاصر ۱۵ پٹنہ ص ۳۰، ۳۱ ⑧ بحوالہ تاریخ ادب اردو ص ۴۲

اردو زبان کے نئے سوچنے کی بدولت شاعروں اور ادیبوں نے اس کے لاتعداد لسانی اور ادبی امکانات کی تلاش شروع کی اور اس دور کے سماجی، معاشی اور لسانی مسائل کو جابجا اظہار دیا۔ اردو کو فارسی کا ہم پلہ بنانے کے لئے فارسی نمونوں کی تقلید کا آغاز ہوا چنانچہ فارسی اصناف شاعری سے لے کر ان میں اظہار پانے والے تجربات و جذبات اور خیالات و افکار وغیرہ کو بھی اردو میں منتقل کیا جانے لگا۔ قصیدہ اور اس سے متعلق خیالات و موضوعات بھی اسی زمرے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ ولی کے دیوان کے ساتھ مذہبی قصیدے کی روایت تو شمالی ہند کے حصے میں آئی تاہم بعد میں درباری ضرورتوں کے لئے لکھے جانے والے مدحیہ قصائد میں فارسی شاعری کے معیارات کو سامنے رکھا گیا۔ فارسی کی تقلید ہندوستانی شعرا اور ادبا نے ویسے ہی کی جیسے فارسی میں عربی اصناف و موضوعات کی تقلید کو روا رکھا گیا تھا۔ گزشتہ ابواب میں تذکرہ ہو چکا ہے فارسی قصیدہ گو شعرائے عربی قصیدہ گو شعرا کی پیروی میں قصائد لکھے۔ ولی، سودا اور دیگر شعرا کے قصائد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح انوری، عرفی، خاقانی کا تذکرہ کرتے ہیں جیسے فارسی میں منوچہری اور دیگر شعرائے امرؤ القیس، ابو فراس، متنبی اور دیگر عربی شعرا کا کیا ہے۔

اس دور کے اردو قصیدوں میں فارسی لہجے، علامتیں، تلمیحات، رمزیات و کنایات، اسالیب بیان، فکری و معنوی سانچے، مزاجی خوشبو راسخ ہوئی۔ جس کے نتیجے میں اردو قصیدہ نے بھی وہ شان و شکوہ حاصل کر لیا جو فارسی شعرا نے مرور زمان کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ فارسی قصائد کی تشابیب میں ظاہر ہونے والے منظریہ، وصفیہ، امتنازی، حکیمانہ، صوفیانہ، اخلاقی، عشقیہ اور پند و نصائح پر مبنی موضوعات کو اس عہد کے قصیدہ گو شعرا نے بہت جلد اپنے قصائد میں شامل کیا۔ فارسی تلمیحات و تراکیب سے بھی اس عہد کے قصیدہ نگاروں نے بھرپور استفادہ کیا۔ فارسی قصائد کے اجزائے گریز و مدح اور دعائیہ حصوں سے بھی انسپیریشن لی گئی۔ شمالی ہند میں قصائد پر عربی، فارسی اور ترکی لسانی اثرات کی وجہ سے یہاں کی زبان دکنی قصیدوں کی زبان سے ممیز ہے۔ دکنی قصائد مقامی بولیوں اور پراکرتوں کے اثرات لئے ہوئے تھے۔ دکنی گرامر کے قواعد بھی مقامی السنہ کے قواعد سے متعلق تھے شمالی ہند میں اپنے قواعد استعمال ہوئے۔ شمالی ہند کے قصائد کی زبان دکنی قصائد کی نسبت شستہ دھلی ہوئی، بامحاورہ اور صاف ہے اس کی بھی بنیادی وجہ دکنی قصائد پر مقامی السنہ کے ناہموار اور بوجھل لفظوں کا غلبہ ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس عہد کے قصیدوں پر صرف فارسی اثرات تھے۔ بعض شاعروں نے مقامی ہندی روایات و لفظیات کو اپنے قصیدوں میں جگہ دی ہے ہولی، دسہرہ اور ہندوؤں کی دیگر تقریبات کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور کنہیا، کرشن، راون، بھیم، ارجن ساکھی وغیرہ کے الفاظ بھی مستعمل نظر آتے ہیں۔

اردو کے قصائد میں بادشاہوں کو سپہر مرتبہ، شاہ زمین و زمن، ظل اللہ وغیرہ کے الفاظ سے نوازا گیا۔ (۱)
مذہبی لفظیات کا خاصہ استعمال کیا گیا۔ بعض شاعروں نے ان میں ذاتی احوال کی ترسیل بھی کی۔ اپنے عہد کے
خراب حالات اور قحط و قلت کا بیان بھی ہوا۔ اشیائے صرف کی گرانی پر بھی اظہار خیال ملتا ہے (۲)
امرخانوں کی زبان کا استعمال بھی نظر آتا ہے (۳) وحدت الوجود اور شریعت و طریقت کے معاملات بھی زیر بحث
آئے ہیں (۴) بے پردگی کے خلاف احتجاج بھی ہوا ہے (۵) واقعات کربلا کا تذکرہ بھی دکھائی دیتا ہے (۶)
سامان ہول کا بیان بھی ہے (۷) شہروں کی توصیف بھی کی گئی ہے (۸) نجوم رجفر اور دیگر علوم کی
اصطلاحات بھی برتی گئی ہیں (۹) آئمۂ اطہر کی مدح میں اظہار عقیدت پر مبنی خیالات کا اظہار ہے
شیعہ اور سنی دونوں عقائد کے حوالے سے مدح کی گئی ہے۔ انگریزوں کی شان میں بھی قصائد موجود
ہیں (۹) تصنع اور بناوٹ اسلوب قصیدہ نگاری کا غالب رجحان ہے علاوہ ازیں لفظیاتی ارتفاع
کی وہ صورتیں نظر آتی ہیں جیسی منی ایچر مصوری میں باریکیوں کے اظہار کے حوالے سے اور عالی شان
عمارتوں میں بلندی، شکوہ اور آرائش کے حوالے سے دکھائی دیتی ہیں۔ اس عہد کے قصیدہ نگاروں نے اپنے
عہد کے ولیسٹ لینڈ کی نقشہ کشی بھی کی ہے اور انسان کے حقوق کے ختم ہو جانے کی تصویر کشی بھی۔ شاعروں
نے معاصرین کے زبان و اظہار پر لے دے بھی کی ہے اور شاعری کو پرکھنے کے تنقیدی حوالے بھی فراہم کیے
ہیں (۱۰) بوریا نشینی اور قالین دشمنی کے رویے بھی ان قصائد کا حصہ بنے ہیں اور مرشد کامل کا
تصور بھی (۱۱) پیروں کی مدح میں بھی قصیدے دیکھنے کو ملتے ہیں (۱۲) فلسفیانہ، فکری اور حکیمانہ انداز سے
موضوعات کی ترسیل وغیرہ اس دور کے قصیدوں میں کمیاب نہیں ہے اپنے عہد کے حالات کی عکاسی اور
جنگ کے نقشوں سے مزین قصائد بھی مل جاتے ہیں (۱۳) بعض قصیدہ نگاروں نے عورتوں کی مدح بھی کی
ہے (۱۴) فلکیات و جیر خیات (۱۵)، صوفیانہ منقبتی، مذہبی اور شاعروں کی مدح میں (۱۶) قصائد بھی مل جاتے ہیں (۱۷)
ثقافتی مزاج کی عکاسی کرنے والے (۱۹) (ٹیٹنگ، ڈانڈا، رمضان کی تفصیلات) ہندی عجمی تہذیب کے حامل (۱۹)
ماحول کے تعیش اور رقص و سرود کی محفلوں کے عکاس (۲۰) رسوم و رواج کی تفاصیل سے مملو (۲۱) (رسم بسم اللہ پر)
اپنے عہد کے حوادث کے شارح (۲۲) محلوں، قبوں اور روضوں کی توصیف کرنے والے (۲۳) قصائد بھی لکھے گئے ہیں۔

ملاحظہ ہوں قصائد از

(۱) سراج اورنگ آبادی (۲) درگاہ قلی خاں (۳) عوض علی بدعا (۴) شاہ حاتم
(۵) ابوالحسن قرل (۶) مرزا علی لطف (۷) نواب محمد یار خاں امیر (۸) میر عطا حسین خاں تحسین (۹) سودا
میر عبدالقادر مہرباں، اسد علی تمنا (۹) سودا۔ میر شیر علی افسوس (۱۰) سودا کے شاگرد اصلح الدین کا قصیدہ
(۱۱) احسن الدین خاں بیاں (۱۲) قلندر بخش جرأت (۱۳) سودا (۱۴) شیر محمد ایمان (۱۵) محمد روشن جوشش
(۱۶) میر محسن محسن (۱۷) ضیاء الدین قائم (۱۸) میر حسن (۱۹) بقا الدین بقا (۲۰) جعفر علی حسرت، سودا (۲۱) (۲۲)
(۲۳) ہدایت یا اشتق

اس عہد کے افراد کی چپقلشوں اور رنجشوں کا تذکرہ ہے کہ تہذیبی زوال کی داستان، غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کرنے اشخاص کی کہانی ہو یا متکبر، مغرور اور نخوت زدہ افراد کی روداد ہمارے ان مقیدہ نگاروں نے زندگی کے متنوع مناظر و افکار کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں مرصع کاریاں اور استانوں اور ڈراماتی لہجوں کا استعمال اس عہد کے مقیدہ نگاروں کو مرغوب تھا۔

ان قصائد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خالق شعرا اپنے عہد کے علوم و فنون پر کس مکمل طور پر حاوی تھے۔ نجوم، رمل، جفر، طب، مذہب، حرب، حکمت، اخلاقیات، تعمیر، مصوری، موسیقی، رقص، باغبانی، اسپ و فیل پروری وغیرہ کے معاملات پر ان کی نظر تھی۔ آئندہ صفحات میں ہم اس عہد کے مقیدہ نگاروں کا جائزہ پیش کریں گے۔

فصل سوم خصوصی مطالعہ

شاکر ناجی

شاکر ناجی (م ۱۷۴۴ء قیاساً) شمالی ہند کے اولین قصیدہ نگار ہیں۔ وہ ایک پختہ کار شاعر تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میر تقی میر نے انہیں میاں آبرو کا معاصر لکھا ہے۔ اور کہا ہے کہ وہ آبلہ رو تھے اور سپاہی پیشہ ① عالم جوانی میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ میر حسن نے انہیں ایہام بندی کا استاد کہا ہے ② شاکر ناجی کا دیوان ڈاکٹر فضل الحق نے ادارہ صبح ادب دہلی سے ۱۹۶۸ میں چھپوایا ③ ڈاکٹر فضل الحق نے یہ دیوان سنٹرل لائبریری پٹیالہ سے حاصل کیا تھا۔ ناجی کے دیوان کا ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی موجود ہے۔ مگر اس میں قصائد نہیں ہیں۔ مطبوعہ دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ قصیدے، رباعیات، مرثیے، چار مخمسات اور متفرق اشعار ہیں۔ ان کے قصائد نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام اور نوازش علی خاں کی مدح میں ہیں۔

شاکر ناجی کی شہرت ان کی ہزل گوئی کی وجہ سے تھی تاہم ان کے دیوان کی اشاعت سے معلوم ہوا ہے کہ وہ سنجیدہ اور قابل قدر شاعر ہیں۔ قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے "مدتے در سرکار دولت مدار نواب عفران مآب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر بحرمت تمام دحرمت تام ایام الکام دل بسری برد" ④ ناجی کے کلام میں ایہام گوئی کی تحریک سے متاثرہ اشعار بھی ہیں اور پند و نصائح اور حکمت کے مضامین بیان کرنے والے فارسی شعرا کے اثرات بھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے "قصائد میں ناجی نے براہ راست فارسی اساتذہ سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان میں ہندوستانی فضا، ہندو اسطور بھی ایسے ہی ساتھ ساتھ موجود ہیں جس طرح فارسی اثرات ایہام میں نظر آتے ہیں۔ ان قصائد میں زورِ بیان بھی ہے، نازک خیالی، معانی آفرینی بھی۔ غزلوں کے مقابلے میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال بھی زیادہ ہے اور ساتھ ساتھ ایہام کا استعمال بھی نہایت کم ہے۔ ناجی کے ان قصائد میں تشبیب اور گریز نہیں ہے۔ قصیدہ براہ راست مدح سے شروع ہو کر دعا پر ختم ہو جاتا ہے۔ ——— ان قصائد پر فارسی قصیدہ گو انوری اور خاقانی کا اثر نمایاں ہے۔ قصائد میں جس مہارت اور قدرت کے ساتھ ناجی نے قافیوں کا استعمال کیا ہے وہ یقیناً قابل ذکر بات ہے۔ ایک قصیدے میں اور ہی کی ردیف کو بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ نبھایا ہے ناجی کے یہ قصائد آنے والے دور میں سودا کے قصائد کے لئے رستہ ہموار کرتے ہیں" ⑤۔

شاکر کے دیوان میں قصائد کی موجودگی اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ شمالی ہند میں [متقدم] اردو کے اولین شعرا نے بھی اس صنف کو قابل توجہ جانا۔ شاکر کا سب سے طویل قصیدہ ۴۲ اشعار کا ہے

---

① نکات الشعرا ص ۱۰۴ ② تذکرہ شعرائے ہندی ص ۲۹۶ ③ دیوان ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق ادارہ صبح ادب دہلی ④ مجموعہ نغز ص ۲۵۷ مرتبہ حافظ محمود شیرانی پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ ⑤ تاریخ ادب اردو جلد دوم اول ص ۲۵۵

ان کے قصائد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

چمن میں آج ترا نام سن کے پھر ہے بہار + کرے ہے بلبل و گلشن کا گرم پھر بازار
گرہ ستارے ہوں اور کہکشاں ہو رشتۂ عمر + خوشی سے رات ہو سالگرہ کی دن تجھے تیوہار ①

کرم میں تجھ پہ خدا کا ہے ودعا اور ہی + جدی ہے مہر نبی فیض مرتضیٰ اور ہی
ملک صفات و ملک مرتبت محمد شاہ + کہ جس کے تاج کے گوہر کا ہے بہا اور ہی
تم اپنی مہر میں اب تربیت کرو جس کو + ہو اسکا ہوش جدا ذہن اور ذکا اور ہی
بلند مرتبہ نواب امیر خاں صفدر + ترے عروج کے کوکب کی ہے ضیا اور ہی
ترے کرم کی صفت کیا ہے میر گنجینہ + کہ جس کو کرتے ہیں تحسین و مرحبا اور ہی

یہ ایک روز کیا ہے؟ تجھے خرم ستیں + ہر شب شب برات ہو ہر روز روز عید
جھوٹے موحدوں کو ترے در پہ بار نہیں + ظاہر میں یا حسین ہیں باطن میں با یزید
باندھو اگر سلاح کو تم عزم رزم پر + راون بھی ہو تو جان میں اپنی حذر کرے
جو مثل گرد باد کے سرکش ہو تجھ سیتی + دو دن میں چرخ اس کو ترا خاک در کرے
ہنر از تیغ ترا نام جب آوے رن میں + تیرے اعدا کے اوپر حشر بپا ہوتا ہے
جس کے لگتا ہے ترا وار تو پل میں اس کا + سر جدا ہوش جدا جیو جدا ہوتا ہے
ہر شہر ہر نگر میں ہے تیرا ہی ذکر خیر + تیری سپہ گری کا ہے عالم میں قیل و قال
لشکر میں حریف کے قحط الرجل پڑے + جب کھینچ لو میان سیں تم تیغ بے مثال
مسند زریں اور حشمت کو تیری دیکھ کر + بھیم و ارجن ہے بجا جو آکے دربانی کرے
جو بڑا دانا ہو عالم میں وقوف و ہوش میں + رو برو آکے ترے اقرار نادانی کرے

ناجی کے قصائد کا مطالعہ باور کراتا ہے کہ انہوں نے ممدوحین کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے ان میں مبالغہ کا استعمال بہت ہی کم ہے۔ جہاں کہیں ہے بھی تو شعری جمالیات مجروح نہیں ہونے پاتی۔ اس دور کی غزلوں میں فارسی روایات کے اثرات تو مستند ہیں تاہم قصائد میں بھی ان سے دامن نہیں بچایا جا سکا۔ زور کلام، ادبی شان اور لفظی شکوہ کے اعتبار سے ناجی کے قصائد اہمیت رکھتے ہیں۔ شاعر کے ہاں ہندی الفاظ اور ہندو تلمیحات کا بھی خاصا استعمال ہے۔ ان کی شاعری میں کنہیا، کرشن، راون، گیان، برن، بدلا، سوہن، اگن، چھب، کال، جگت، چندن، رین، تن، ساکھی، بھیم، ارجن، چھند کیسری، مکٹ، لچھن، سوانگ وغیرہ کے الفاظ و تلمیحات نظر آتے ہیں۔ مہر نبی، فیض مرتضیٰ، ملک صفات، شب برات، عید، موحد، حسین، ۔۔۔ اور یزید وغیرہ کے الفاظ ان کی مذہبی ہنیج کو واضح کرتے ہیں

---

① اس قصیدے کا یہ شعر بھی دیکھیے۔ سے دعا کرتے ہیں تجھے ہندو و مسلمان سب + کہ جانتا ہے کرو دعا کا ترا یہ ابلق سوار

شاکر کے ہاں ہندی لسانی و ثقافتی عناصر کے استعمال کے ساتھ ساتھ فارسی لسانی اور موضوعاتی مسلسل کے نمایاں اثرات ہیں۔ مذکورہ اشعار سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندی اور عجمی روایات کے امتزاج سے اپنے قصائد کا پیرہن تیار کیا ہے۔ شاکر ناجی نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ وہ فارسی قصیدے کے معیار کی تحصیل کریں۔ وہ قصائد میں خیال کا حسن پیدا کرنے کے قائل تھے۔ ہندی مسلم کلچر کی روایات کے استعمال کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی بہت سی اشیا کا تذکرہ بھی ان کے قصائد کی زینت بنا ہے مثلاً انہوں نے تیغ پرتگال کا تذکرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں پرتگالی تلواریں موجود تھیں۔
تشبیہات کے استعمال میں بھی انہوں نے بعض جگہوں پر جدتیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً باغیوں کو گرد باد سے تشبیہہ دینا۔ علاوہ ازیں انہوں نے رشتہ عمر کا کہکشاں سے اور گرہ کا ستاروں سے تعلق جوڑ کر عمدہ انداز سے دعا کی ہے۔ ناجی کے ان قصائد میں ممدوحین کے لئے ان کا جذبہ شکر و احسان بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے قصیدے اور غزل کی زبان کا فرق بھی ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ممدوح کو ملک صفات اور فلک رتبت کہنا عجمی روایات کی وجہ سے ممکن تھا۔ ممدوح کی بہادری، دینداری، مذہب کے لئے لڑنے کا جذبہ، منافقت دشمنی، کرم، انکا مقبول خاص و عام ہونا اور اس کی حشمت و شان کا بیان شاکر ناجی کے قلم میں موجود قدرت اظہار کی خوبی کا اشارہ ہے۔
شاکر ناجی کے قصائد شمالی ہند میں اردو قصیدے کی ابتدائی صورت محسوس نہیں ہوتے ان کی پختگی، قدرت اظہار، بات کہنے کا ڈھنگ، مدح کا انداز، دعا کی عمدگی، تیغ، بہادری اور سخاوت وغیرہ کا بیان اس حقیقت کا اشارہ بھی ہیں کہ ان سے قبل یا ان کے معاصرین میں اور بھی اہم قصیدہ نگار ہوں گے کہ جن کا کلام تا ہنوز پردہ شہود پر موجود نہیں ہے۔ اتنا تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ناجی کے قصائد شمالی ہند میں خطابیہ قصیدے کی روایات کا رستہ ہموار کرتے ہیں۔

عبدالحی تاباں

عبدالحی تاباں [م ۱۷۲۸ء تا ۱۷۵۱ء کے درمیان] شاہ حاتم کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے دیوان میں ایک قصیدہ در مدح بادشاہ ملتا ہے[۱]۔ عبدالحی تاباں شاہجہاں آباد کے باشندے تھے اور محمد شاہ کے عہد سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے قصیدے کا مطلع ہے

سے ہوئی ہے فیض ہوا سے عجب طرح کی بہار + کہ جس طرف کو نظر جا پڑے تو ہے گلزار

عبدالحی تاباں نے اس قصیدے میں منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ انہوں نے تشبیب میں گلوں کے گریبان سے سر نکالنے کا تذکرہ کیا ہے۔ سبزۂ خوابیدہ کے جاگنے کی کیفیت بیان کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب میں گلستان میں سبزے کو دیکھتا ہوں تو مجھے سبزۂ خط یار یاد آتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوہ و صحرا میں جوشِ بہاراں کی وجہ سے پتھر اگر سبز شرار نکالیں تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہ ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں

سے چمن ہیں جیسے زمرد کی کان ہے سبزا + کہ جس کے عکس سے سقفِ فلک ہے میناکار

اس قصیدے میں تاباں نے فیض ہوا، گل صد برگ کے ہنستے ہوئے، نرگسِ بیمار کے ہاتھ میں عصا لے کر اٹھنے اور خوشی کی حالت میں پتھر سے سرخ شرار نکلنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے ساتھ یادِ محبوب میں بھی چند اشعار قلمبند کیے ہیں۔ گریز یوں کیا ہے

سے نہ یہ بہار رہے گی نہ یہ چمن نے گل + خزاں کے ہاتھ سے ہو جائے گا یہ سب کچھ خوار

بس اس کی فکر میں اوقات کیوں گنوائے + کہو نہیں کیوں نہ شہنشہ کے وصف میں اشعار

تاباں شمالی ہند کے ابتدائی قصیدہ نگاروں میں سے ہیں ان کی کوشش کو ہمیں یکسر قلم مسترد نہیں کرنا چاہیے[۳]۔ انہوں نے حصہ مدح میں بادشاہ کو سپہر مرتبہ شاہنشاہ زمین و زمن کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کے حکم میں یہ چرخ کج رفتار ہے[۴]۔ اس میں بادشاہ کی بہادری، تیغ کی کاٹ، اسپ کی تیز رفتاری کی بھی تعریف کی ہے اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ گھوڑے کی رفتار کے بارے میں وہ کہتے ہیں

سے چلے ہے گرم کمیتِ فضا سے بھی آگے + کب اس کی جلدی کو پہنچے ہے برق یا کہ شرار

ہما کے بال سے ہے ہم سرِ کدم اس کی کو + کہ شاہ خود بہ سعادت ہوا ہے اس پہ سوار

تاباں نے فارسی قصیدے کے تتبع کی کوشش کی ہے۔ مدح بھی فارسی طرز کی ہے۔ قدیم عجمی مبالغے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ منظر نگاری موزوں ہے۔ الفاظ کی بندش مناسب ہے۔ موضوع سے مربوط رنگین و بلیغ زبان کے استعمال کا بھی اہتمام ہے۔ تاباں کے دیوان میں ایک مثنوی در مدح استاد خود حشمت و عمدۃ الملک امیر خاں انجام بھی ہے[۵]۔

---

(۱) دیوان تاباں مرتبہ سید بادشاہ حسن ص ۱۷۵ و دیوان تاباں مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۲۶۷

(۳) جیسا کہ شیخ چاند اور محقق نے سودا سے قبل اردو قصیدہ نگاری کو (شمالی ہند میں) تسلیم نہیں کیا

(۴) سپہر مرتبہ شاہنشاہ زمین و زماں + کہ جس کے حکم میں ہے گا یہ چرخ کج رفتار (۵) انجام کے حالات کے لیے دیکھیے مآثر الامرا جلد دوم ص ۹۲

سراج اورنگ آبادی

سراج اورنگ آبادی [م ۱۷۶۳ء] کے کلیات میں ایک قصیدہ دستیاب ہے۔ یہ فی الاصل نظمیہ قصیدہ ہے۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے "آتش رسیدہ، احوال دیدہ، غم دیدہ و دلِ ہجراں کشیدہ، خطاب بہ قاصد آہ مناجات بجناب مرشد اللہ" اس قصیدہ کا مطلع ہے

؎ کہاں رفیق موافق کہاں ہے یارِ ندیم + کہ اس کے پاس کرے رسمِ بندگی تقدیم

یہ ۳۵ اشعار کا قصیدہ ہے۔ اس کے بارے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں

"قصیدے سے سراج کی طبیعت کو مناسبت نہ تھی۔ صرف ایک قصیدہ ان کے کلام میں مل سکا ہے اور خاص ان کے متصوفانہ رنگ میں ہے۔ اسمیں بھی وہ کسی کی مدح سرائی کی بجائے اپنی کہانی سناتے ہیں" ①

اس قصیدے میں سراج نے ذاتی احوال قلمبند کیے ہیں۔ عشق میں ہجر کے کوائف کی اجمالی وضاحت بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دردِ جگر کے طبیب کو میری خبر پہنچا کہ میں فراق کے بخار کے باعث بسترِ الم پر سقیم ہوں نہ میرے دل میں تاب ہے اور نہ آنکھوں میں خواب۔ خدا میری اس بات کا علیم ہے۔ میری آنکھ کے چشمے سے دل کا خون جاری ہے مجھ کو تو تسنیم کے پانی کی تشنگی نہیں ہے۔ میرا یارِ الف قد کہاں ہے کہ ہجراں کے بوجھ نے مجھ کو حلقۂ میم کی مانند خمیدہ کیا ہے۔

؎ کہاں ہے آہ وہ گوہر شناسِ مشتاقاں + کہ آنکھ کے ہے صدف میں پر اشک درِّ یتیم
لگے ہیں ہجر کے شعلے دکھا بہارِ جمال + توں کر یہ آتشِ نمرود باغِ ابراہیم
مری امید کوں برلا شتاب یارِ رحمان + کہ جانتا ہوں تجھے اپنی بے کسی پہ رحیم
جمال مج کوں دکھا اپنے یارِ جانی کا + کہ قلبِ صاف سے کرتا ہوں میں دعائے صمیم ②

سراج اورنگ آبادی اپنی غزل ہی کی مانند قصیدے میں بھی پختگی کی معراج کو پہنچے دکھائی دیتے ہیں۔ اس قصیدے میں خدا سے عرضداشت ہے کہ انہیں محبوب عطا ہو اور ساتھ ہی بخشش کے لئے دعا بھی مانگی گئی ہے

؎ نہیں ہے طالبِ دیدار کوں خیالِ بہشت + کہ زاہدوں کو سزاوار ہے بہشتِ نعیم
شفیعِ حشر میں ہے آرزو مجھے بخشش + اگرچہ سر میں قدم لگ ہوں پر گناہِ اثیم

مائلِ تعظیم، عذابِ الیم، موجِ شمیم، مانندِ خاک، طورِ بے خودی، سیرِ ہفت اقلیم اور حرمِ حریم جیسی ترکیبیں بھی اس قصیدے کا حصہ ہیں۔ یہ اس امر کی غماز ہیں کہ سراج مزاجاً فارسی لفظیات اور تراکیب کے استعمال کی جانب مائل تھے۔ یہ دلآویز ترکیبیں اور بندشیں ان کے قصیدے کو ممتاز و منفرد کرتی ہیں۔ اس قصیدہ کے آخر شعر میں عشقِ رسول کا اظہار دیکھیے

؎ صدا ہے حرمِ حریم میں سراج بے پروا + لگا ہے ہاتھ اسے دامنِ رسولِ کریمؐ

کوثر، تسنیم، ابراہیم اور کلیم وغیرہ کی تلمیحیں ان کے زبان کے مسلم تہذیبی مزاج کی نقیب ہیں۔

---

① کلیاتِ سراج مقدمہ از عبدالقادر سروری ص ۱۱۸ ② ایضاً ص ۲۰۵ - ۲۰۱

درگاہ قلی خاں درگاہ

درگاہ قلی خاں درگاہ [۱۲۹۹/۱۲۹۲] فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی تصنیف مرقع دلی کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اسمیں محمد شاہی دور کی تہذیبی اور سماجی زندگی کے عمدہ نقشے محفوظ ہیں۔ وہ نظام الملک آصف جاہ کے ہمراہ ۱۲۳۸ھ میں دکن سے دہلی پہنچے انکا ایک منقبتی قصیدے کے اشعار دستیاب ہیں[1] یہ قصیدہ کسی اچانک سفر کی یادگار ہے

ع پڑی ہے آ کے گلے ناگہاں بلائے سفر + سفر نہیں ہے سقر بل سقر سے ہے بدتر

اس قصیدے کی تشبیب میں خراب حالات اور قحط و قلت کا بیان ہے۔ اشیائے صرف کے گرانی کی زد میں ہونے کا ذکر ہے وہ کسی ایسی جنگ میں گھرے ہوئے تھے جس میں گولے برس رہے تھے اور تیر چھوڑے جا رہے تھے۔ وہ اس حالت میں سوئے تو ایک ان کی ملاقات ایک نورانی چہرہ بزرگ سے ہوئی۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ تجھے کیا فکر ہے تیرے کام کا حامی امام حسن دلبشر، شہ سرِ کرامت، امیر کل امیر، حضرت مولی کا ولی اور وصی پیغمبر ہے۔ اس مقام پر حضرت علی[2] کی مدح میں اٹھارہ اشعار موجود ہیں۔ اس قصیدے کے بعض اشعار سے اس دور کے سماجی و ثقافتی حالات کی خبر ملتی ہے

ع اسیر پنجۂ تعذیب صامت و ناطق + غریق لجۂ تخریب ہیگا سب لشکر

نہیں ہے تختۂ بازار پر اناج کی جنس + نہ غلہ بلکہ سبھی نقد و جنس ہے کمتر

گیہوں کی جنس ہے نایاب مثلِ آدم خوب + مثال بین نظر آتی نہیں ہے اب تو ر

مگر ذخیرہ کیا ہوئے ماش خوروں نے + ہے دال ان کی رکاکت یہ باکمال ہنر

ہوا ہے قحط سے دیکھو دو باجرا عالم + نہیں ہے سمت اک جو کسی میں بل کمتر

نظر بچا کے نکلتے نہ ہو وہیں قرب و جوار + فقیر و سائل و محتاج و نوکر و چاکر

جوارِ رحمتِ حق میں ہوئے ہیں سب غربا + کہیں جوار و جوار از رجوعِ جوعِ بقر

وہ اس قصیدے میں مزید کہتے ہیں (مفہوم) کہ غنی اور فقیر سب رنج میں مبتلا ہیں۔ رئیسوں کا پلیتھن نکل گیا ہے۔ وہ دال کی تلاش میں گھر گھر دوڑ رہے ہیں۔ تل اور السی کا تیل گھی کے عوض مل رہا ہے۔ روغن بادام کی بجائے تیل کرڑ ہے ترکاری اب خواب میں نظر آتی ہے۔ قحط سے جانداروں کو ہوکا ہوا ہے بشر کو جوعِ بقر ہے اور بقر کو جوع شتر ہے وضیع و شریف سبھی سخت مصیبت میں ہیں

ع رئیس وقت ہے قائم لقیر در ہمہ وقت + لسانِ طوطی بے نطق طائر بے پر

ہوئی ہے خلق پہ کیا شاق وجیہہ غیر + ہزار حیف مسیحا صفت ہیں تابع خر

اس قصیدے کے شیر آشوبانہ مزاج نے اسے نظمیہ قصیدہ کے قریب تر کر دیا ہے۔ اس کی زبان صاف شستہ ہے۔ فارسی تراکیب کا عمدہ استعمال، لہجے کی تاثیر اور خلوص کے علاوہ الفاظ کے در و بست کا حسن قاری کو متاثر کرتا ہے۔

---

[1] مرقع دہلی ص ۱۸۱ تا ۱۸۳ تاج پریس حیدرآباد دکن

اشرف علی فغاں

اشرف علی فغاں [م ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء-۱۷۷۳ء] بادشاہِ دہلی محمد شاہ کے کوکہ تھے۔ ان کا خطاب ظریف الملک تھا دہلی کی تباہی (۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) کے بعد بہار کی طرف چلے گئے۔ میر ان کے بارے میں لکھا ہے
"شعر ریختہ را بخوبی می گویند۔ گاہے فکر فارسی ہم می کنند"①

میر حسن نے انہیں شیریں بیاں کہا ہے② فغاں کا دیوان سید صباح الدین عبدالرحمن نے منتخب کر کے ۱۹۵۰ء میں شائع کروایا③ اس دیوان میں ان کی غزلیات کے ساتھ ساتھ ہجویات بھی ملتی ہیں اور تین قصائد بھی۔ ہجویات اخوند، لوعز، معصوم، شاہ عبدالرحمن الہ آبادی، برادر نسبت خاں اور کاتب کی ہیں قصائد کے مطالع درج ہیں

در منقبت علی ۔ شادی و غم کہاں خالی ہے بزم روزگار + جام اگر ہنستا ہے تو روتا ہے مینا زار زار

ایضاً ۔ امام مسجد و منبر علی ابن ابی طالب + ستون دین پیغمبر علی ابن ابی طالب

امام موسیٰ رضا ۔ ازل سے میرے دل زار کا یہ استدعا + کبھی نہ فکر منا ہو کبھی نہ فکر بقا

یہ قصائد فغاں کے مذہبی عقائد کا اظہار بھی کرتے ہیں اور ان کی عقیدت کا بیان بھی۔ اشرف علی فغاں کے ہاں غیر مذہبی ممدوحین کے لیے مدحیہ جذبات نہیں تھے۔ اس کے باوجود کہ ان کا تعلق دربار سے رہا ہے انہوں نے دنیاوی مدح سے پرہیز ہی کیا ہے۔ فغاں کے دور میں اردو زبان زیادہ منجھی ہوئی نہیں تھی تاہم فغاں نے اپنے تخلیقی جوہر کو بروئے کار لاتے ہوئے ان قصائد میں پرشکوہ مضامین بھی پیدا کیے ہیں اور زبان و بیان کے اعتبار سے فنی تقاضے بھی پورے کیے ہیں۔ فغاں کے قصائد مختصر ضرور ہیں مگر معنوی جامعیت کا عنصر بھی سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالع جدت موضوع، قدرت زبان شگفتگی اور برجستگی کے اعتبار سے عمدہ ہیں۔ فغاں نے تشبیب میں شکایت روزگار اور غم جاناں ہر دو موضوعات کو خوش اسلوبی سے جامۂ اظہار بخشا ہے۔ ان کی تشبیب فکر انگیز اور حکیمانہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کب تمامی عمر بلبل کو رہا ہے وصل گل + گل نے یک ہفتہ سوا پایا چمن میں کب قرار
صبح کو مذکور تھا غنچہ کھلا دل وا ہوئے + شام کو کہتے ہوئے پھرتے ہیں گلشن میں پکار
جائے حسرت ہے چمن تک غور کر اے عندلیب + کیا ہوئے وہ گل کدھر جاتی رہی فصل بہار
ہم اسیروں نے نکالے ہیں قفس میں بال و پر + کس کو کہتے ہیں خزاں اور کس کو کہتے ہیں بہار
خاک پر ہم بے کسوں کی کون لاوے گا چراغ + اے دل سوزاں تو ہی ہونا وا شمع مزار

دوسری تشبیب کے اشعار دیکھیے

---

① نکات الشعرا ص ۵۷ ② تذکرہ شعرائے ہندی ص ۲۱۲ ③ دیوان فغاں مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

ہوئی ہے رسم محبت یہاں تلک معدوم + نہ عندلیب میں الفت رہی نہ گل میں وفا
چمن چمن جسے کہتے ہیں واں بھی خاک نہیں + کرے ہے نالۂ بلبل پہ زاغ استہزا
ہمارے آبلۂ دل کے کب برابر ہو + اگر حباب کی صورت تمام ہو دریا
جلا غبار سے پاتا ہے روئے آئینہ + بجا ہے خاک ملیں منہ پہ اپنے اہل صفا
گریز یوں کرتے ہیں: اگر طواف کروں تو اسی کے مشہد کا + کہ جس کے واسطے خلقت ہوئے ہیں ارض و سما
وہ کون شاہ خراساں امیر ابن امیر + امام ضامن ثامن شفیع روز جزا

ان قصائد میں تلوار کی مدح بھی ہے اور امیر المومنین حضرت علیؓ کی تیر اندازی کا تذکرہ بھی ان کے گھوڑے کی تعریف بھی دیتا ہے اور آخر میں دعا بھی مانگی گئی ہے

مدحیہ اشعار: تیغ جس کی آب داری میں یہاں تک ہے کہ برق + خوف سے اس کے رہے ہے چرخ اوپر بے قرار
دوست تو کہتے ہیں اس کو ناخن شیر خدا + خاک پر اس کے عدو کی گر کسی کا ہو گزار
واں اسے پوچھے کہ کیسی تیغ تھی کرار کی + کیا فرکیب تھا علی کا نقارہ کیا شہسوار
یہ صدا نکلے تب اس کی خاک سے کیا پوچھیے + لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار
عدو سے پوچھیے گر تیری تیغ کی برش + کہے جہاں میں ہوئی ذوالفقار پھر پیدا
قلم تو میرے کف سیف سے نکل جاوے + تیرے سمند کی جلدی کروں اگر انشا

اشرف علی فغاں کے قصائد کی تشبیب میں اپنے عہد کی تکلیف دہ صورت حال کی جانب اشارے بھی ملتے ہیں اور ان کے ذاتی کوائف کا بیان بھی۔ فنا کے موضوع پر اظہار خیال کرکے جہاں انہوں نے فانی دنیا میں انسان کے فانی ہونے کا حکیمانہ اظہار کیا ہے وہاں اس کے پس منظر میں موت کے وہ گمبھیر سائے بھی لہراتے نظر آتے ہیں جنہوں نے فغاں کے عہد کے ماحول کو بے چین و بے اطمینان کر رکھا تھا۔ ظریف الملک خون کے آنسو کیسے رونے لگا؟ اسے محسوس ہوا کہ چمن (ملک) اب وہ نہیں رہا اس میں بلبلوں پر زاغ خندہ استہزا کرنے لگے ہیں۔ جب دردمند دل رکھنے والے انسانوں کا مذاق اڑایا جائے۔ جب اہل صفا کے چہرے خاک آلودہ کرنے کا مشورہ دیا جا رہا ہو۔ جب قفس میں اسیر بال و پر نکالیں، جب گل نہ رہیں اور چمن برباد ہو جائے تو سوچنے کی بات ہے شاعر یہ استعارے کس کے لیے استعمال کر رہا ہے ذاتی احوال منعکس کرنے کے لیے یا اپنے ماحول کی عکاسی کے لیے؟

مدحیہ حصوں میں فغاں نے روایتی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے یہ ضرور ہے کہ ان تمہیدوں کے پر تاثیر حصے وہی ہیں جن میں فغاں نے زمانے کی بے ثباتی اور عبرت سرائے دہر کے احوال کا نقشہ کھینچا ہے انہوں نے گل و بلبل، شمع و پروانہ، قفس و باغ، مزار و شمع، خزاں و بہار، دریا و حباب، غبار و آئینہ وغیرہ کے پرانے استعاروں سے کام لے کر اپنے ذاتی اور اجتماعی ماحول کے ادبار کو قلمبند کیا ہے

—

میر عوض علی مدعا

میر عوض علی مدعا [۱۷۷۶ - ۱۷۷۷ میں زندہ تھے] کے بارے میں میر حسن نے لکھا ہے کہ اس کی اصل جہاں آباد ہے۔(۱) وہ بے نظیر شاعر اور منشی خوش تحریر ہے(۲)۔ انہوں نے اسکا تعلق عنایت خاں سے بھی جوڑا ہے(۳)۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کچھ عرصہ بریلی میں بھی رہا(۴)۔ نواب محبت خاں کی شادی پر ان کا ایک قصیدہ دستیاب ہے۔ میر حسن کا یہ بھی کہنا ہے کہ بعض تازہ مضامین اس نے 'زبان افاغنہ' میں بیان کیے ہیں۔ مدعا کے مذکورہ قصیدہ کی زمین سنگلاخ ہے۔ یہ زمین سودا نے بھی استعمال کی ہے۔ اس میں شعر نکالنا قادر الکلام شعرا ہی کے بس کی بات تھی۔ میر عوض علی مدعا میں یہ جوہر موجود تھا۔

ہجر سے بادل شدگاں در پے آزار فلک + متصل چھوڑ کے ہے شاں سو رپہ چھاتی کے فلک

[شادی کا بیان] ماہ نے کھول دیا ہے کف سیمیں اپنا + دوسرا ہاتھ جو پایا تو بجایا دستک

نشۂ عیش سے ہے سرو بیاں تک سرشار + کر لیا چاہیے ہے غنچے کے نمکداں سے گزک

حسن کے خلوتیاں بزم حنا بندی میں + شعلے سے باندھتے ہیں پروانے کے پاؤں پہ لگک

محفل عیش میں بلبل نے بجائی شہنا + گوشۂ باغ میں غنچے نے اٹھائی ڈھولک

[در تعریف معشوقاں] غمزہ یہ گرم کہ ہو برق زن خرمن عمر + عشوہ یہ ظلم کہ ہو رہزن تقوم زوک

چشم آشوب قیامت سے لکھا ہے محضر + صف محشر کو الٹ مارے ہے ہر ایک پلک

شعلۂ حسن کی گرمی سے عرق ریز جبیں + دیکھ ہو گی کبھی مہتاب میں موتی کی ڈھلک

قلقل شیشہ یہ کہتا ہے کہ مت بیٹھ خموش + جام مارے ہے صف بادہ کشاں پر چشمک

ساقی شوخ کہے ہے کہ غنیمت ہے وقت + ساغر عمر تو لبریز ہے مت جائے چھلک

شیخ گر کچھ بھی ہے غیرت کی ترے دل میں ترنگ + ساغر و شیشہ اٹھا سبحہ و سجادہ پٹک

جشن نواب فلک رتبہ محبت خاں ہے + جس کی شادی میں ہیں سب جمع بزرگ و کوچک

سرود روہیلہ سے لختے زادوں کو جو دیکھو تو بہنگام سرود + بیچ رہا ہے یہی غل رشتہ پلک پلک (۵)

اس قصیدے میں مدعا نے گھوڑے کی تعریف میں بھی چند اشعار لکھے ہیں اور کہا ہے کہ وہ جو تیری سواری کا خاص گلگوں ہے اسکی کیا وصف بیان کروں کہ مہ نو نعل ہے اور کاہکشاں بہر قطاس + اس کی عہد رس ہے فلک پیر سے وضع اور رنگ (۶)
اس کی جلدی کا یہ عالم ہے کہ وہ مرغ دعا کی طرح ہاتھ اٹھاتے ہی فرش سے عرش تک جا پہنچتا ہے۔ اور اگر مصور اس کی تصویر بنانے لگے تو وہ تیغۂ وہم سے بے شکستہ شیشہ اڑ جاتا ہے۔ مدعا کی مشکل پسندی کا اندازہ تو اس قصیدے کی زمین ہی سے ہو گیا تھا۔ اظہار کے حوالے سے بھی انہوں نے قصیدہ نگاری کے عمدہ معیار کو برقرار رکھا ہے۔ شادی کے ماحول کی منظر کشی کر کے اس عہد کی تہذیبی تصویر کا ایک رخ کو محفوظ کیا ہے۔ 'زبان افاغنہ' اور علمی اصطلاحات کے استعمال میں ان کی لسانی مہارت قابل قدر ہے

---

(۱) تا (۴) تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن ص ۲۷۳ - ۲۷۳ - ۲۷۴ (۵) (۶) ایضاً ص ۲۷۲ تا ۲۷۴

ظہور الدین شاہ حاتم

شاہ حاتم [م ۱۷۸۱] کے دیوان میں قصائد موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ رائے محققین کے
لئے موجبِ حیرت ہو۔ لیکن جب ہم ان کے قصیدۂ شہر آشوب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس میں زورِ بیان
اور شکوہِ اظہار کے عناصر ملتے ہیں۔ اس سے حاتم کی قصیدے سے طبعی مناسبت کا سراغ ہاتھ آتا ہے۔ دیوان زادہ
کا جو نسخہ لاہور میں موجود ہے اسمیں مذکورہ شہر آشوب قصیدے ہی کے عنوان تلے مرقوم ہے۔ اسکا مزید
ثبوت یہ ہے کہ حاتم کے پورے دیوان میں کوئی ایسی غزل نہیں ہے جو بارہ اشعار سے زائد ہو (۱)۔ مذکورہ قصیدۂ
شہر آشوب ۱۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ غزل کے ذیل میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں تسلسل و تواتر کے خصائص
بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے دیوان زادہ میں موجود بہت سی نظموں کا قصیدہ ہی کے ذیل
میں تجزیہ کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں تصوف و عرفان کے موضوع پر ان کا ایک قصیدہ دستیاب ہے (۲) اس
کا مطلع ہے ؎ تو جو کہتا ہے بولتا کیا ہے + امرِ رب ہے روح مولا ہے
اس قصیدے میں وحدت الوجود کی گتھیاں سلجھائی گئی ہیں اور شریعت و طریقت کی منزلوں اور مرحلوں کی خبر دی گئی ہے
ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے شاہ حاتم کے ایک اور قصیدے کے بارے میں لکھا ہے

> "اسمیں وہ منازل عشق حقیقی اور مجازی پر بحث کرتے ہیں اور
> اپنی بے خواہشی اور قانع زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جس کو انسان
> کی بے اختیاری کے اظہار پر ختم کیا ہے" (۳)

حاتم نے اس قصیدہ میں مروجہ عشق کے خلاف اظہارِ خیال کیا ہے۔ اردو شاعری کے اولین دور میں ان کا طنزیہ انداز قابلِ توجہ ہے
اسکا مطلع ہے ؎ پیری میں آج یار ہم کنار ہے + ساقی بیا بیا کہ خزاں میں بہار ہے۔
انہوں نے اپنے ایک قصیدے میں بعض فارسی قصائد کے انداز تشبیب کی تقلید کی ہے۔ یعنی ایسے قصائد کے جزو تشبیب
میں شاعر محبوبیت کے کوائف منعکس کرتے تھے اور پھر پیرِ عقل یا پیرِ غیب انہیں محویت سے چونکا دیتا تھا۔ ایسا ہی انداز
شاہ حاتم کے ہاں دیکھئے ؎ ایک دن گذرا میں گورستان میں + دیکھ مردوں کو یہ آیا دھیان میں
شاہ حاتم نے بقول ڈاکٹر محمود الٰہی "اردو قصیدہ نگاری کو فارسی قصیدوں کی عام روش سے الگ رکھنے کے لئے

> حاتم نے بڑا انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ ان قصائد میں نہ مصنوعی تشبیب و گریز ہے اور نہ
> الفاظ کی گھن گرج اور نہ سرکش مبالغے۔ یہ نکتہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ حاتم نے
> یہ قصیدے ۱۱۶۲ سے ۱۱۷۵ کے درمیان کہے تھے۔ جب وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے
> تھے۔ اس وقت سودا کے قصیدوں کی دھوم دھام تھی۔ مبالغہ پردازی اور تخییل کی
> جولانی اردو قصیدہ نگاری کا معیار بنتی جا رہی تھی۔ اگر حاتم کے ان قصیدوں کی

---

(۱) دیوان زادہ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار لاہور (۲) اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۷۸ (۳) رسالہ ہندوستانی ص ۴۸ جنوری ۱۹۳۲

تقلید کی جاتی تو یہ صنف اتنی رسوا نہ ہوتی"①

ڈاکٹر محمود الٰہی نے مغرب زدہ تنقید کے معیارات کو سامنے رکھ کر اردو قصیدہ نگاری میں تخیل کی جولانی صنائع بدائع سے معمور تشبیب، بلند درجہ کے پرشوکت الفاظ (کہ جس سے گرینڈ اسٹائل بھی وجود میں آسکتا ہے) اور حسن مبالغہ وغیرہ کو ناپسندیدہ عناصر میں شامل کیا ہے۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ شاعری حقیقت محض کی عکاسی کا نام نہیں ہے بلکہ شاعر اس میں اپنے تصور و تخیل کے عناصر کو شامل کرتا ہے۔ وہ موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے گھن گرج رکھنے والے الفاظ گیت کی صنف کے لئے معیوب ہوں تو ہوں قصیدے میں روا اور جائز ہیں۔ رہا سرکش مبالغے کا سوال تو اگر ہو ا ور تخیل کی جولانیوں کے بغیر اسے بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا اور تخیل شاعری کا جزو خاص ہے۔ صنعت حسن تعلیل، تشبیہ، استعارہ اور اس نوع کی دوسری صنعتیں مبالغہ آفریں ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ حسن و جمال کی خالق ہیں۔ ویسے بھی قصیدہ عہد قدیم میں شاعر کی قادر الکلامی کی آزمائش تھا۔ اسمیں شاعرانہ صنعتوں کے استعمال اور لفظیاتی ارتفاع کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ ایسے ہی جیسے ایک عام گھر اور ایک شاہی محل کے تعمیری لوازمات میں فرق ہوتا تھا۔ ایسے ہی جیسے ایک عام خاکے اور منی ایچر آرائشی تصویر کی ٹریٹمنٹ کا اختلاف تھا۔ ایسے ہی جیسے ایک عام ہلکے پھلکے گیت گانے اور کلاسیکی راگ کی معنوی و صوتی آرائش میں منی سطح اور بالیدگی کا فرق تھا ہم قصائد پر اور سطح کے اعتراضات تو کر سکتے ہیں (مثلاً اگر بہت ضروری ہو تو بعض اور خوشامد اور وہ بھی وہاں جہاں بادشاہ، امراء اور رؤسا نااہل تھے) لیکن اظہاریاتی حوالے سے مذکورہ نوع کے اعتراضات اس صنف کے داخلی اور خارجی تقاضوں کی فہم کے بغیر ہی ممکن ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ یہ صنف ہندوستان میں مسلم عہد زوال کے دور سے متعلق ہونے کے باوجود حقائق و واقعات کے ان گنت خزینے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور مذہبی قصیدہ تو خاص طور پر مسلم تہذیبی نقطہ نظر کی بھرپور وضاحت کا علمبردار ہے۔

جہاں تک شاہ حاتم کے قصیدہ شہر آشوب کا تعلق ہے۔ اسمیں انہوں نے اپنے عہد کے ویسٹ لینڈ کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ وہ اسمیں کہتے ہیں کہ نیرنگی اوضاع جہاں کا کیاں بیان کریں کہ چشم زدن میں عالم ویران ہو گیا ہے۔ جن امرا کے پاس ہاتھی تھے وہ اب ننگے پاؤں ہیں اور روٹی کے محتاج۔ جن کے توشک خانے پوشاکوں سے معمور تھے وہ پیوند لگے کپڑوں کو بھی ترس رہے ہیں۔ گل کے گلخن میں ہونے اور خس کے گلشن میں ہونے یعنی ڈس پلیس منٹ Displacement کی وہ یہ مثال دیتے ہیں سہ رتبہ شیروں کا ہوا ہےگیا شغالوں کو نصیب + جائے بلبل ہے چمن بیچ غزلخوان زاغاں

وہ جو تھڈی کو ترستے تھے سو اس دور میں آج + ہوئے ہیں صاحب رمانی و محل و فیل و نشان

جہاں اسپ تازی پالان کے نیچے زخمی ہیں اور گدھوں کی گردنوں میں سونے کے پٹے ہیں اور کتوں کے پاس نعمت ہے اور گھوڑوں کے پاس لت و لد۔ شاہ حاتم نے علامتوں اور استعاروں کی زبان میں اپنے ماحول کی تکلیف دہ تصاویر مہیا کی ہیں۔

---

① اردو قصیدہ نگاری ص ۱۸۵

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع سودا [م ۱۷۸۱ء] فی الحقیقت اردو قصیدہ کے امام ہیں ان کے قصیدے شاعرانہ جذبات کی ترسیل میں صناعانہ قابلیت کے عکاس ہیں۔ سودا نے حسن الفاظ معانی سے کام لے کر بلیغ و نادر اشعار کا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ الفاظ کی سلاست و روانی، ترکیب کی عمدگی اور صحت زبان کے عناصر کے یکجا ہونے سے ان کے قصیدے نہایت وقیع و مستند ہیں۔ تخیل کی اختراعی صلاحیت سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ سودا کے مشاہدات و محسوسات میں فکر و خیال کی نزاکتیں بھی شامل ہیں۔ ان کے قصائد معنوی مصوری اور وصف نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ وہ خیال اور جذبات کی تصویر کشی میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے جزئیات و صور میں تصرف کر کے متخیلہ کی ایسی صورتوں کو نمایاں کیا ہے جن کے نتیجے میں ان کے قصائد حسن شاعری اور خیال کی وسعتوں کا ورق بن گئے ہیں۔ سادہ خیالی سے لے کر دقت خیال تک اور سہل ممتنع سے لے کر تزئینی اسلوب تک سودا نے اپنے قصائد کا حصہ بنایا ہے۔ تخیل کی کارسازیوں کی مدد سے انہوں نے شعر میں حسن و لطافت کے عناصر کی تخلیق بھی کی ہے سودا نے اردو قصیدہ کو نہ صرف اس کی ابتدائی سطح سے بہت بلند کیا بلکہ مابعد کے قصیدہ نگاروں کے لئے ایک تقلیدی معیار بھی فراہم کیا۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے سودا کے ۵۹ اہم قصائد کو مرتب کیا ہے[1] ان کے مطابق اہم قصائد تو بلاشک و شبہ سودا ہی کے ہیں یہ ان کے مرتب کردہ کلیات سودا جلد دوم کے حصہ اول میں ہیں۔ اسی جلد کے حصہ دوم میں ایک قصیدہ در شکوہ معشوق شامل ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے بالتحقیق کہا ہے "یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا واقعی سودا کا لکھا ہوا ہے"[2] حصہ سوم میں سودا کا ایک قصیدہ در ہجو شیخ بریلی "بربنائے کثافت شامل نہیں کیا گیا اسے بھی ڈاکٹر صاحب نے مشکوک قرار دیا ہے[3] کلیات سودا کے حصہ چہارم میں موجود حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا، حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ اور حضرت باقر رضی اللہ عنہ کی مدح میں قصائد شامل ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے "اس حصے میں سودا کا وہ کلام ہے جو میں نے خود تو کسی مخطوطے میں نہیں پایا لیکن اکبر الدین صدیقی اور عبد السلام صاحب نے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے ایک مخطوطے میں پایا ہے یہ کلام بھی بہت مشکوک ہے"[4]

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے سودا کے مذکورہ قصائد کی استنادی حیثیت کو وقیع بنانے کے لئے سودا کے کلام کے انیس مستند اور غیر مستند نسخوں کا تقابلی مطالعہ کر کے مذکورہ آرا کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس مساعی جمیلہ سے ہمیں سودا کے جو اہم مستند قصائد دستیاب ہوئے ہم یہاں انہیں سے استفادہ کریں گے[5]۔

---

(۱) کلیات سودا جلد دوم (۲) ایضاً ص ۳۶۱ (۳) ایضاً ص ۳۶۶ (۴) ایضاً ص ۳۶۷

(۵) سودا کے تین مستند قصیدے جن میں دو مولوی ساجد اور ایک شاہ ولی اللہ کی ہجو میں ہیں ڈاکٹر صاحب نے بربنائے کثافت حذف کر دیے ہیں۔ علاوہ شیخ چاند نے قصائد کی تعداد ۵۵ (سودا ص ۱۸۲) امداد امام اثر نے ۴۴ (کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۳۴) ڈاکٹر محمود الہی نے ۵۳ (اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۸۵-۱۸۶) رشید حسن خاں

سودا کے مذہبی ممدوحین رسول مقبولؐ، حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت موسیٰ رضاؒ، حضرت حسن عسکریؒ، حضرت مہدی آخرالزماںؑ ہیں اور غیر مذہبی ممدوحین میں بسنت خواں خواجہ سرا احمد شاہی، سیف الدولہ احمد علی، عماد الملک غازی الدین خاں، شاہ عالمگیر ثانی، نواب مہربان خاں، شاہ عالم، شجاع الدولہ حکیم میر محمد کاظم، نواب آصف الدولہ، نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں، رچرڈ جانسن شامل ہیں علاوہ ازیں ایک قصیدہ در ہجو اسپ اور قصیدہ شہر آشوب بھی ان کی یادگار ہے۔(۱)

سودا کے قصائد میں موجود علمی، شعری اور حکیمانہ تنوع کا احاطہ کرنے کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے علاوہ ازیں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم ان کے قصائد میں سے تفصیلی حوالے دیں۔ یہاں کوشش صرف یہ ہے کہ ان کی بنیادی خوبیاں سامنے آجائیں۔ سودا نے اپنی شاعرانہ صلاحیت اور تخیل آفریں دماغ سے کام لے کر اپنے اردگرد کے متنوع موضوعات کو شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے روایت سے اپنا ناطہ توڑنے کی بجائے اس سے اس طور کام لیا کہ ان کے قصائد فارسی قصائد کی علویت اور شکوہ کے ہم پلہ ہو گئے۔ سودا کے پیش نظر فارسی قصائد کی ہیئت، معیار اور مواد تھا مزید برآں ان کی اختراعی صلاحیت بھی عروج کو پہنچی ہوئی تھی چنانچہ انہوں نے اپنی ایجاد کردہ سنگلاخ زمینوں میں بڑے کمالات دکھائے ہیں مثلاً اس زمین کے حامل قصیدے کو دیکھئے۔ یہ نعت و منقبت کا موضوع لئے ہوئے

چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام اور + حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام اور

اس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں

اپنی یہ عرض اس سے ہے کہہ تو بھلا یہ کیونکہ ہو + ایک زمیں ہو سنگلاخ اس میں نہ میں گے کام اور

سودا اردو قصیدے کے وہ مرد میدان ہیں کہ اور کوئی دوسرا شاعر (نصرتی، ذوق، غالب) ان کا حریف نہیں ہے۔

قدیم فارسی شعرا نے عربی شعرا کی تقلید میں قصیدے لکھ کر فارسی میں اس صنف کو مقبول بنایا تھا شمالی ہند میں یہ کام سودا نے کیا مگر ان کے سامنے تقلیدی نمونہ فارسی شاعری کا تھا۔ سودا اور فارسی شعرا کے قصائد کی چند مماثل زمینیں ملاحظہ ہوں(۲)

مسلماناں مسلماناں، مسلمانی مسلمانی + ازیں آئین بے دیناں پشیمانی پشیمانی [سنائی]

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغۂ مسلمانی + نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی [سودا]

شبی گذاشتہ ام دوش خوش بروی نگار + خوشا شبا کہ مرا دوش بود با رخ یار(۳) [فرخی]

سوائے خاک نہ کھینچوں گا منت دستار + کہ سر نوشت کھی ہے مری بخط غبار [سودا]

---

(۱) ملاحظہ ہو کلیات سودا جلد دوم مطبوعہ نولکشور لکھنؤ (۲) دیوان سنائی غزنوی قصیدہ نمبر ۵۹ (۳) دیوان فرخی ص ۱۰۹ مرتبہ دبیر سیاقی

سہ بر لشکر زمستاں نوروز نامدار + کرد است رای تاختن وقصد کارزار (۱) [منوچہری]

برج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار + کھینچے ہے اب خزاں پہ صفِ لشکر بہار [سودا]

آں ہیبر ما کہ صبح لقا شیبت خضر نام + ہر صبح بوئے چشمۂ خضر آیدش ز کام (۲) [خاقانی]

سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام + لائے گر اس طبیب کے پیے عقل جس کا نام [سودا]

برمن آمد خورشید نیکواں شب گیر + بقد چو سرو بلند بہ رخ چو بدر منیر (۳) [انوری]

کیسے ہے کاتبِ دوراں سے منشی تقدیر + سمجھ کے دفترِ قسمت کیا کر اب تحریر [سودا]

چہرہ پرداز جہاں رخت کشید چوں بحمل + شب شود نیم رخ روز شود مستقبل (۴) [عرفی]

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل + تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل [سودا]

انوری کی تقلید میں سودا نے تضحیک روزگار جیسا قصیدہ لکھا انوری کا ایک قصیدہ گھوڑے کی ہجو میں ہے۔ عنصری کی زمینوں میں بھی سودا کے قصائد ملتے ہیں سودا کے تقریباً تمام غیر مردف قصائد فارسی شعرا کی زمینوں میں ہیں (۱)۔ اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا — (۲) ہے صباح عید ہے دل ہے خوش سے مالا مال —

(۳) ہے ہوا کے فیض سے ایسا ہے سبز باغ جہاں — (۴) ہے منکر خدا سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں —

(۵) ہے صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرہ عام —

سودا کے قصائد کے مذکورہ اولین مصرعوں کے حوالے سے بہت سے فارسی شعرا کے قصائد کا حوالہ دیا جا سکتا ہے مثلاً پہلے مصرعے کے حوالے سے خاقانی کا ایک قصیدے کا آغاز کا مصرعہ دیکھیے ؎ سر بر مغز تراست کشید بتاج رضا (۵) اور تیسرے مصرعے کے حوالے سے انوری کے قصیدے کا یہ اولین مصرعہ ملاحظہ ہو ؎ نماز شام چو خورشید گنبد گرداں (۶) چوتھے مصرعے کے ضمن میں خاقانی کا ایک قصیدے کے آغاز کا مصرعہ یہ ہے ؎ ہیں کز جہاں علامت انصاف شد نہاں (۷)

یہ تو طے ہے کہ سودا نے فارسی قصیدہ نگاروں سے متاثر ہو کر اپنے قصائد میں شان و شوکت پیدا کی۔ علاوہ ازیں ان کی پر گوئی اور اسالیبی طنطنے نے متحد ہو کر ان کے قصائد کو وسیع و مفصل بنایا۔ سودا کی طبیعت قصیدے سے مناسبت رکھتی تھی۔ ان کی بعض غزلوں میں بھی قصیدے کا سا طمطراق ہے۔ دربار سے ان کے رابطے نے بھی انہیں ہر لحاظ سے عمدہ اور پختہ قصائد لکھنے کی جانب مائل کیا۔ چنانچہ سودا کے قصائد معنوی لحاظ سے مکمل اور ہیئتی لحاظ سے بلند پایہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی معیاری بھی ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے شکوہِ الفاظ، بلندیٔ مضامین، چستیٔ تراکیب، اعلیٰ تخیئل، قادر الکلامی، روانیٔ زباں، نادر تشبیہات واستعارات وغیرہ کو قصیدے کے لوازمات میں شامل کیا ہے (۸) اگر ان میں سے کسی ایک لازمے میں کمی ہو یا کسی قسم کی کمزوری ہو یا وہ قصیدہ میں موجود نہ ہو تو معیار کے

---

(۱) دیوان منوچہری قصیدہ نمبر ۱۳۰ در مدح سلطان مسعود (۲) دیوان خاقانی قصیدہ نمبر ۵۸ (۳) دیوان انوری قصیدہ ۵۸

(۴) قصائد عرفی ص ۱۵ (۵) دیوانِ خاقانی ص قصیدہ نمبر ۳۰ (۶) دیوانِ انوری قصیدہ نمبر ۲۳

(۷) دیوانِ خاقانی قصیدہ نمبر ۴۱ (۸) آبِ حیات ص ۴۱

مجروح ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ عرفی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلی نے[1] ان کے زورِ کلام، نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ استعارات و تشبیہات کی جدت، مضمون آفرینی کی طرفگی اور خیالات کی وسعت کو قصیدہ کے لوازم جانا ہے۔ سودا کے قصائد میں زورِ بیان، نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبیں، استعارات و تشبیہات کی جدت و طرفگی، مضمون آفرینی اور خیالات کی وسعت کے عناصر کی کمی نہیں ہے

سودا کے قصائد معنوی لحاظ سے پھیلاؤ کے حامل ہیں۔ ان میں عالمگیریت ہے انہوں نے ہر چیز کو اپنا موضوع بنایا ہے حسن، دلفریبی، نشاط اور شگفتگی کا احساس ان کے قصائد کے مطالعہ کا حصہ ہے سودا نے حسن آفرینی پر خاص توجہ دی ہے۔ دیگر کئی مقاصد کو بھی ان کے قصائد میں جگہ ملی ہے ماحول کی ترجمانی، اپنے اور ممدوح کے جذبات کی تسکین اور حصولِ شہرت و دولت بھی ان کے مقاصد تھے۔ انہوں نے اپنے سماج کی مکمل تصویر کشی کے لئے بھی قصیدے لکھے ہیں۔ اپنے معاصر سیاسی احوال پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ یوں ان کے قصائد زندگی کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ماحول کی تصویریں اس انداز سے کھینچی ہیں کہ وہ حیاتِ جاودانی پا گئیں ہیں۔ جب تک اس خطے میں طبقاتی اونچ نیچ کے معاملات اور سیاسی اور سماجی بحران موجود رہیں گے سودا کے قصائد میں ظاہر ہونے والے حقائق بھی تازہ رہیں گے۔ سودا نے اپنے قصیدہ شہر آشوب میں زندگی کے نشیب و فراز کے مرقعے کھینچے ہیں۔ زندگی اور ماحول کی گوناگوں مشکلات کی تفصیل دی ہے، عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے اپنے معاصر عہد کی معاشی صورتِ حال کی جانب وہ یوں اشارہ کرتے ہیں

؎ گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی + تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے

اپنے اس قصیدہ شہر آشوب میں انہوں نے اپنے زمانے کے حاکموں، نوابوں، کسانوں، ساہوکاروں، سوداگروں، شاعروں، معلموں اور جاگیرداروں کے احوال کو بھی قلمبند کیا ہے۔

سودا کی سنگلاخ زمینوں میں قصیدہ گوئی کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس نوع کی زمینوں میں اپنی جولانی طبع اور علمی و فنی بصیرتوں کے استعمال سے مضمون آفرینی اور جدت آفرینی کی ہے۔ وسعتِ مطالعہ، دقتِ مشاہدہ، خیالات روانی اور لسانی قدرت نے اردو قصیدے کے ایک منفرد باب کو جنم دیا ہے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

در مدح عماد الملک غازی الدین خاں

؎ حلم تیرے کے جو ہم وزن فلک سے کوئی سنے + ڈال دیوے جو رہ سہو و خطا کوئی ملک
صدمہ ایسا ہو گاو زمیں کو پہنچے + شاخیں ہر چند وہ کھوائے تو نکلے نہ کسک

---

① شعر العجم ذکر عرفی ص ۸۲ تا ۹۱

؎ اور اس کی بو چھپے جو شجاعت بہ بن رکھو + اژدر کے چیر جبڑے کہ جب تھا یہ شیر خوار [در مدح احمد علی خاں سیف الدولہ]

جدتِ بیان ؎ بحر خوبی کی گویا مچھلی ہے قلاب کے بیچ + نتھ کے حلقے میں جو دیکھے کوئی نتھنے کی پھڑک

ہم اس کی میں نہ دیکھی کہ کروں اس کا وصف + تھی وہ اک آہوئے دل کے لیے چیتے کی لپک

علاوہ ازیں سودا کے قصائد میں حرفِ ناسزا، مگسِ رال، دیدۂ زنجیر، سنبلِ مشکِ خام، گہرہائے تگرگ، شعلہ آباد ابرِ سیہ، تگرگ بار، کحل الجواہر، نگہ دیدنِ پنہاں، آہ کی پیچش، کلبۂ احزاں، مہندسانِ قضا، ابلقِ گردش گرد آریز، سنگ نشاں، زخمِ سنگِ بلا، کرمکِ شب تاب، آوازِ شکستِ رنگ، شامِ سلخِ ماہِ محرم، معالجۂ نفخِ آسماں، مشتِ حبابِ جو، مانندِ برگِ خشک، سبزۂ خوابیدہ، شیرِ قالی، مثلِ شیرازۂ کتاب، مہرِ منیر، تخمِ نشاط، ساعدِ دستِ حنا بستہ، شرارِ سنگ، تحویلِ دل، رخشندگیِ ذرہ، اطلسِ ہفت فلک، دستِ تعدی، مریضِ نگاہ، رخشِ فلک سیر، ابرِ گہربار، ترکِ فلک، خواصِ زیاق، خسروِ خاور، سحرِ صولت، دیدۂ شاہین، مصدرِ کافور، سقفِ حمام، سودۂ الماس، عیش گاہِ جہاں، تعلیمِ پیرِ عقل، لذتِ شبہ، مانندِ نقشِ نعل جیسی ترکیبیں بھی ان کی جدتِ طبع کا ثبوت ہیں

تشبیہوں اور استعاروں کی خوبی کے لیے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

؎ یوں ہے کٹوری اس میں کہ جوں مغ کے ہاتھ سے + مستی میں چھوٹ کے جا رہے ساغر تہ سبو

بلبل ہو واں کی بلبل آملی سے دو بہ دو + طوطی کرے ہمیشہ فصیحی سے گفتگو

ہر پرت پرت کوہ کا یوں اڑ چلے کہ جوں + کھل جائے باد تند میں شیرازۂ کتاب

حسن تعلیل ؎ اگر عدم سے نہ ہو سالکِ فکر روزی کا + تو آب و دانے کو لے کر گہر نہ ہو پیدا

لف و نشر ؎ ہے مجھے ابر و ہوا شیشہ و جام اب جو بچے + گریہ و نالہ، دل و دیدۂ نم چار روں ایک

مراعاۃ النظیر ؎ نہ کھوائی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم + پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

مضمون آفرینی ؎ آبجو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے + خطِ گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

شجاع الدولہ کی شان میں اپنے قافیہ قصیدے میں سودا نے صنعت توشیح کا استعمال کیا ہے

اس کے پہلے پندرہ مصرعوں کو جوڑنے سے شجاع الدولہ کا نام برآمد ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں

؎ اس بحر میں وہ نام بزرگ آئے تو کیوں کر + چلو میں سمندر نہیں آتا ہے کسی رنگ

ان بیتوں کے ہر حرفِ سرِ مصرع نظر کر + جو اسم شریف اس کے سمجھنے کا ہے آہنگ

سودا سے قبل اردو شاعری میں صنائع بدائع کا استعمال فراواں نہیں تھا۔ شاعر براہ راست اور سادہ انداز سے عرض مدعا کرتے تھے۔ اظہار کی جہات بہت کم تھیں۔ سودا کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کے اندازِ بیان سے روائتی موضوعات کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا۔ معمولی اور سطحی اشیا اور مناظر ان کے زورِ تخیل سے اہمیت اختیار کر گئے۔ تشبیہی اور تمثیلی انداز سے ان کی طبعی

رغبت نے ان کے شاعرانہ مفاہیم کو برجستہ کر دیا۔ سودا نے اردو میں ان گنت نادر تشبیہیں داخل کرنے کا اثاثہ بخش کام کیا۔ سودا کے بارے میں شیخ چاند کا یہ بیان قابلِ غور ہے "سودا نے غزلوں میں قصیدے کی زبان استعمال کی ہے جس میں عربی فارسی ترکیبوں کی بہتات ہے اور قصیدے کی طرح سنگلاخ زمینیں اختیار کی ہیں" (۱) یہ سودا کا عمومی رنگ تھا۔ انہوں نے اپنے زیادہ تر قصائد میں پیچیدہ اور ثقیل زبان، اجنبی ترکیبیں، نئی بندشیں، پرتکلف اور پرتصنع تشبیہیں اور عمدہ استعارے استعمال کیے ہیں۔ ان کے قصیدوں کا وقار، شکوہ، طنطنہ، ترکیب در ترکیب اظہار، علوِ تخیل و معنی انہی کا رہینِ منت ہے۔ انہوں نے اپنے اکثر قصائد میں روائتی اور پیش پا افتادہ طریقِ اظہار سے گریز کیا ہے۔ سودا کے قصائد میں صنعتوں کی بہتات ان کے زبان پر قادر ہونے کا ثبوت ہے۔ صنائع لفظی و معنوی کے استعمال کے لیے جس نوع کی لسانی قدرت اور فکری سلیقہ مندی کی ضرورت ہے سودا کے قصائد اس سے مملو ہیں

سودا کے قصائد کے مطالع بلند اور شگفتہ ہیں، خیال کی ندرت، بیان کی جدت اور برجستگی کے اعتبار سے وہ اعلیٰ درجے کے ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں

درمدح میرزا حسن رضا ~ صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام + حلال دخترِ رز بے نکاح و روزہ حرام

قصیدۂ شہر آشوب ~ اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے + دعوٰی نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

درمدح وزیر فرجانشین ~ دیکھا نہ جائے اس سے روئے گلِ رخاں بہ رنگ + غنچے کے بھی دہن سے ہے چشمِ زمانہ تنگ

مدح آصف الدولہ ~ کیا قلم کو رقم سے ہے منظور + کہ تحریر اس کی سے ہے دل کو سرور

ایضاً ~ ترے سائے تلے ہے تو وہ صنعت + لیشہ کر جائے دلیو دد سے کرامت

درمدح شجاع الدولہ ~ اشجار کا بستان جہاں کے ہے عجب ڈھنگ + جلتا ہے چنار اس سے رخِ گل پہ جو ہو رنگ

ایضاً ~ مرغِ معنی کے اگر صید پہ اپنا ہو خیال + عرش پر واز ہو تو کھل نہ سکیں اس کے بال

درمدح شاہ عالم ~ ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب + رخشندگی ذرہ ہے از فیضِ آفتاب

درمدح عماد الملک غازی الدین ~ فجر ہوتی جو گئی آج مری آنکھ جھپک + مری وہیں آکے خوشی نے در دل پر دستک

درمدح حضرت موسیٰ رضا ~ ہے پرورشِ سخن کی مجھے اپنی جان تلک + جوں شمع زندگانی ہے میری زبان تلک

مذکورہ مطالع کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتے ہیں۔ اس کے دل میں احساس بیدار ہوتا ہے کہ وہ دیکھے کہ آگے کیا بیان ہوا ہے؟

سودا نے تشابیب میں بہار و خزاں، ایام شباب، شکایتِ زمانہ، ذکرِ محبوب، حکمت و اخلاق اور چرخیات و طبابت وغیرہ کے موضوعات کو سمیٹا ہے۔ یہ زورِ تخیل اور مبالغے کی حسن کاری سے تیار ہوئی ہیں۔ بعض تشبیبوں میں عاشقانہ اور رندانہ مضامین کو جگہ ملی ہے۔ سودا نے ان میں تمثیلی اندازِ بیاں

---

(۱) سودا ص ۱۴۳

سے بھی کام لیا ہے ۔ کہیں انہوں نے عقل اور حس کو مجسم کر کے ان کے اوصاف و عیوب اور نصائح و ترغیبات کو مکالماتی صورت میں پیش کیا ہے ۔ شیخ چاند نے لکھا ہے "تشبیب قصیدہ نگار کے کمال کی کسوٹی ہے سودا نے اس کے مضامین اور موضوعات میں تنوع پیدا کیا ہے ۔ خارجی اور داخلی شاعری سے کام لیا ہے لفظی بیان اور عروضی مہارت کا کمال دکھایا ہے ۔ خیال اور واقعات کو تشبیہ و استعارہ و مبالغہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور اکثر مضامین میں خیالی باتوں کا اس قدر غلبہ ہے اور اس پر مبالغے کا رنگ اسقدر تیز ہے کہ ان میں واقعیت کا نشان نظر نہیں آتا تاہم ہم خیال و مضمون اور زبان و بیان کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے"[1] تشبیب کے اجزا میں سودا کے مضامین کی وسعت قابل داد ہے یہ ضرور ہے کہ جب وہ تخیل اور مبالغہ کی مدد سے خیالات و مناظر کو سپرد قلم کرتے ہیں تو کہیں ان کی اصلیت اور واقعیت گم ہوتی بھی نظر آتی ہے لیکن زیادہ تر تشابیب میں سودا نے اصلیت اور واقعیت کی شاعرانہ شکلوں کو ہی نمایاں کیا ہے ۔ کیونکہ بہرحال شاعری میں مبالغہ سے نجات ممکن نہیں ہے ۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے "تشبیب کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی جائے جو ممدوح کی حیثیت کے مطابق ہوں یعنی تشبیب میں جو کچھ کہا جائے وہ موقع محل کے بالکل خلاف نہ ہو ۔ سودا نے اکثر قصیدوں میں اس کا خیال رکھا ہے"[2]

در منقبت ؎

قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض + ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل

عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے + کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ + ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں + شاخ میں گاو زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل

حضرت امام ضامن کی ثنا میں لکھے گئے اپنے قصیدے میں سودا نے اپنے بعض معاصرین پر چوٹیں بھی کی ہیں ۔ قصیدے میں فاخر مکیں اور ان کے استاد اکسیر کی ہجو بھی ہے ۔ ایک اور قصیدے میں سودا نے سرقے کے الزام کی تردید کی ہے ۔ نواب احمد علی خاں کی مدح میں لکھے ہوئے اپنے قصیدے کی تشبیب میں بھی سودا نے اپنے معاصر شعرا کے حوالے سے یہ اشعار لکھے ہیں

؎ داغ ہوں ان سے اب زمانے میں + بزم شعرا کے جو ہیں صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائم و درد + لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

کیا غرور و دماغ کیا نخوت + کون سا کبر ہے جو ان میں نہیں

سودا نے مہربان خاں کی مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے میں فن شعر کے سلسلے میں کچھ نصیحتیں کی ہیں ۔ اس کی تشبیب سودا کے نظریہ شعر کو واضح کرتی ہے ۔ اس میں افسانوی انداز اختیار کیا

---

(۱) سودا ص ۳۵۹ تا ۳۷۲ از شیخ چاند (۲) مرزا محمد رفیع سودا ص ۲۵۵

ہے اور شعرا کی شاعری کے حوالے سے جبنت نمائی بھی کی ہے۔ اس میں ایسے شاعروں کی ہجو بھی ہے جو زبردستی اشعار سناتے ہیں یا داد پانے کے لئے اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ سودا نے لکھا ہے کہ اگر کسی شاعر کی شاعری ہی تاثیر سے عاری ہے تو اس کا تفاخر یا تعلی کیا کرے گی۔ اس قبیل کے شعرا دوسرے شعرا کے بارے میں جو کچھ بھی کہیں بے معنی ہے اس لئے کہ ان کے اپنے اشعار جزدان میں لپٹے رہ جائیں گے سودا

؎ سخن ایسا نہ ہو سرزد کہ دل اس کا ہو وہم + گو ہو اتیغ زباں کا ترا جوہر اشعار

سنو تحسیں پہ نادان کے نہ پڑھیو اک بار + پڑھیو دانا کی تو لغزیں پہ مکرر اشعار

نہیں آفاق میں دلکش سخن بے تاثیر + گر اثر ہو تو کریں دل کو مسخر اشعار

سودا نے امنافوں تشابیب بھی لکھی ہیں ان میں معروف تشبیب عماد الملک غازی الدین بہادر کے قصیدے کی ہے۔ اکثر شاعروں نے اس کی تقلید کی ہے

؎ فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک + دی وہیں آ کے خوشی نے در دل پہ دستک

پوچھا میں "کون ہے"؟ بولی کہ میں ہوں غافل + نہ لگے شوق میں جس کے کبھی مشتاق کی پلک

سن کے یہ مژدہ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ + اشعہ نور کی سی مجھ کو نظر آئی جھلک

اس کے بعد سودا نے ایک دوشیزہ خوب صورت کے حسن و جمال کی نقشہ کشی کی ہے

حسن ایسا کہ جسے ماہ شب چاردہم + یک بیک دیکھ کے یکچند تو رہ جائے بھچک

جبہ وہ غیرت گنجینے کی ہو جس کے برابر + گو ڈباد بینے کو عشاق کے دریائے اشک

زلفیں یوں کھول ہوئی چہرے پہ ناگنیں نقش دل + جس طرح ایک کھلونے پہ بیٹھیں دو بالک

ناگنی بیچ ہیں آن کے نہ مانگے پانی + کہیں جا دے وہیں کالا جو ڈسے ان کی لٹک

حسن سے کان کے آویزے ہے وہ لطف کہ جوں + مستعد قطرۂ شبنم کہ پڑے گل سے ٹپک

تمثیلی انداز کے یہ اشعار بھی ان کی تشابیب کا حصہ ہیں

؎ ہنر کو مفلسی ہرگز ضرر نہیں کرتی + چنار کو نہیں دستی سے نقص جوہر کا

قصیدہ نعت — اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا + ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی

حکیمانہ حوالے سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

قصیدہ نعت ؎ فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے + نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی + نہ جھاڑے آستیں کہکشاں شاہوں کی پیشانی

عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے عجب تاج سلطانی + فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

سودا نے رندانہ مضامین کو یوں تشبیب میں کھپایا ہے

پھرا ہے آج بہ مقصود بادہ خواراں چرخ + ہے اب بروئے زمیں دور دور ساقی و جام

وہ اس کو تحفۂ گل سمجھے ہے جو زاہد کے + دلوا ہو سامنے مینائے بادۂ گلفام

کہتے ہیں کہ کارِ بستہ کی گرہ دوستوں سے کب کھلے گی اس کا بند و بست ناخنِ ممدوح سے ہوگا۔ کبھی سودا سراپا بیان کرنے کے بعد یا محبوب کے حسن و جمال اور عیش و نشاط کا تذکرہ کرتے کرتے اچانک کہہ اٹھتے ہیں یہ کیا بے ہودگی ہے تم تو فلاں ممدوح کے مداحوں میں سے ہو وغیرہ وغیرہ۔ سودا نے گریز میں برجستگی کبھی افسانوی انداز سے پیدا کی ہے اور کبھی براہِ راست اظہار سے۔ چند مزید گریزیں ملاحظہ ہوں

نعتیہ قصیدہ — نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے + برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی

ز ہے دینِ محمد پیروی میں اس کے جو ہووے + ز ہے خاکِ قدم سے اس کی چشمِ عرش نورانی

قصیدہ منقبت علی رضؑ — فریاد کروں کس سے روا داری کی تیرے + کہنے کے لئے گبر و مسلماں ہے برابر

نالش کروں اب واں کہ جہاں حق لب طرفین + مور و ملخ و دیو و سلیماں ہے برابر

در منقبت مہدی آخر الزماںؑ — نام اپنے سے کوئی جو ترے شعر کو پڑھیو + بولے فصاحت "اس کا نہیں ہے لب و دہاں"

اس کا یہ شعر ہے کہ قلم جس کی روز و شب + ایسے حساب کی ہے ثنا میں گہر فشاں

در مدح حکیم محمد کاظم — سو قاعدہ یوں ہے پھر آگئے ہے شفا اس کے ہاتھ + جس کے ہے قبضۂ قدرت میں علاجِ عالم

سو تو ان باتوں سے ہے خوض طبیبوں کے کیسے + اس زمانے میں بجز میر محمد کاظم

در مدح رچرڈ جانسن — بس اب کوئی کسو سے رکھے کس طرح امید + بیٹے کا باپ سے ہو زمانے میں جب یہ ڈھنگ

ہے اب مگر وہ ایک کہ جس کا ہے یہ خطاب + ممتاز دولہ فخرِ جہان و حسام جنگ

جزو مدح میں سودا نے اپنی قوتِ تخیل سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے خاقانی اور عرفی کے مانند مبالغہ آرائی کو عروج بخشا ہے۔ ان کے مدحیہ مضامین خیالی ہونے کے سبب شوخ اور تیز رنگ کے مبالغے سے مزین ہیں۔ شیخ چاند ان کی مبالغہ آمیزی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"یہ سودا کی بدعت نہیں ہے بلکہ یہ چیز ان کو فارسی سے ورثے میں ملی ہے اس نے فارسی قصیدے کو مدِ نظر رکھ کر اپنی مدحیات کو انشا کیا ہے ایسی حالت میں ان کو کسی خاص معیار پر جانچنا اصولاً صحیح نہیں ہے" (1)

مبالغے کے حوالے سے سودا کا تخیل شش جہتی پھیلاؤ رکھتا ہے۔ وہ ممدوح کی جتنی زیادہ تخیلاتی مدح کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ ان کا قصیدہ زوردار ہوتا تھا۔ سلاطین و امرا کے عدل، شجاعت، سخاوت، جلال، تدبیر، سیاست، فیاضی، دلیری اور انصاف وغیرہ کے مضامین کو دلکش و پر شکوہ پیرائے میں بیان کرنا سودا ہی کا حصہ تھا۔ سو آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار + دیکھا جسے نہ ترکِ فلک نے بروزگار

آتش غضب کی تو نے یہاں کی فسردہ کی + تن میں نہیں ہے قطرۂ خوں صورتِ شرار

[مدح شجاع الدولہ] نام ان کا تیری تیغ نے معدوم یہ کیا + زعفر کرے ہے سنگ پہ نہ غاں زاغ کوہسار

---

(1) سودا، ص ۲۵

عماد الملک کے گھوڑے کی تعریف میں سودا یوں رطب اللساں ہیں

نہ چلے خامہ اب آگے نہ سیاہی ہو رواں + باد پا کا ترے کچھ وصف نہ کیجے جب تک
چڑھ کے اس پر جو تری طبع میں گزرے یہ خیال + فاش سے زین کے گر ہیچیے ٹک باگ اچک
گاہ آجائے نظر گاہ نظر سے غائب + پھر ہوا ہیچ وہ شب رنگ ہے جگنو کی دمک

نعت [در مدح بسنت خاں] گھبائے ٹک مبادت چھیڑے تو یوں چلے ہے + عاشق کی وصل کی شب جس طرح سے رواں ہو

ایضاً — دریا دل اس قدر ہے جگ میں تمام خلق + بحر سخا کی سمجھے ہے تجھ کو ہی آبرو

در مدح سیف الدولہ — ارجن کہے کماں کو تری دیکھ بھیم سے + اپنے تیش تو کھینچا اس کا ہے سخت کار

ایضاً — رہنے نہ دے صفائے برش اس کی ضرب کی + باقی کسو ہی طرح سے ضارب کے دل میں زنگ

در مدح عماد الملک غازی الدین — نہیں ہے معجز عیسٰی سے کم تری تدبیر + کیا ہے زندہ سر نو سے جس نے عالمگیر

در مدح شاہ عالمگیر ثانی — جلے جو شام کو پروانہ بزم میں تیری + تو صبح شمع کے آتا ہے سر پہ روز سیاہ

در مدح مہرباں خاں — اس کی ہمت نے کیا ایک جہاں کو شاکر + کہتے ہیں اب سمجھ لینے کے لئے زر اشعار

در مدح شاہ عالم — برج حمل کی طرح سے ہے اس کے ہیچ تخت + تو اس میں یوں شرف سے ہو جوں گو میں آفتاب

در مدح نواب شجاع الدولہ — اطلس ہفت فلک ہو جو عدو کی چلمن + کٹے اس طرح وہ اس سے کہ چھلکے جوں پیاز

ایضاً [تلوار] — کافر حربی و موذی و منافق و ملحد + ایک جو رنگ ہے چاروں کا اسے استیصال

ایضاً — آتش رہے یوں آب میں انصاف سے تیرے + آئینے میں جس شکل ہو عکس رخ گل رنگ

ایضاً در تہنیت فتح روہیلہ — تھے جو ہاتھیوں پہ بیٹھے جو جانا کہ ہم نشیں + سالا تو اس کے ہم پیالہ و باہم نوالہ خوار
وہ بھاگے اس طرح کہ بہ کشتی نقی ان کو خلق + بھاگا وہ دیکھو جائے ہے میداں سے کوہسار

در مدح رچرڈ جانسن — تیری وہ ذات کو تو نہیں ہے شہ زنگ + کرسی میں تیری پایۂ اورنگ کا ہے ڈلنگ

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں قصائد میں

"مضامین کی تکرار سے بچنے کے لئے مبالغہ زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا گیا۔ مگر بالآخر چند اسالیب میں مدح کر چکنے کے بعد انفرادیت کی زیادہ گنجائش نہ رہی چنانچہ چند مضامین بار بار دہرائے جانے لگے۔ مدح میں زیادہ اختصار اور طوالت دونوں کو نامناسب سمجھا جاتا ہے کیونکہ تھوڑی تعریف سے ممدوح کی تسلی نہیں ہوتی اور نازک مزاجی طویل مدح کو سننے کی متحمل نہیں ہو سکتی ـــــ سودا کے قصائد میں مدح کی ان شرائط کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا قصیدہ نعتیہ ہو کسی بزرگ دین کی شان میں ہو یا کسی نواب کی تعریف میں مضامین میں بہت یکسانیت ہے[1]۔

---

[1] اردو کی قدیم اصناف سخن ص ۱۹۹-۲۰۰

خواجہ صاحب نے سودا کے مختلف قصیدوں سے درج ذیل مثالیں بھی دی ہیں تاکہ بے کیف یکسانیت کا اندازہ ہو سکے

ــہ خاک نعلین کی جس کے مدد طالع سے + پہنچے اس شخص کو جو شخص ہوا عمائے ازل

وہ نظر آئے اسے دیر کی بینائی سے + رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل

عالم لاہوت ہو اس کی نگہ کا سیرگاہ + دیویں جس اعمیٰ کو گرد اس کے سے کر تک سرمہ دل

دیدہ تیرا بدوش حق سے نگہ کا ہے خلل + ایک شے دو نظر آتی ہے بچشم احول

رضا ہے جس کی وہی ہے جو کچھ رضائے حق + رضائے حق بھی وہی ہے جو کچھ کہ اس کی رضا

جو گدا ہے بجہاں تیرے گدائے در کا + اس کے در کا وہ گدا کہیے جیسے اہل دول

چاہے اگر کوئی دو جہاں کا متاع و مال + تیرے گدا کے در سے کرے آ کے وہ سوال

گھوڑے کی تعریف میں سودا اس کی چال ڈھال، رنگ روپ، سراپا، جلال و جمال اور معمولات کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہاتھی کی تعریف کرتے ہوئے سودا نے اس کی خرطوم، زنجیر، دانت، سبک روی، مستک، جھباگ وغیرہ کے حوالے سے اشعار لکھے ہیں لیکن یکسانیت سے وہ اپنا دامن نہیں بچا سکے

سودا نے نعت اور منقبت کے قصائد میں ممدوحین کی عظمت و بزرگی، شرافت و نجابت، فیوض و برکات، کشف و کرامات اور حلم و حیا کے حوالے سے مدح کی ہے۔ ان میں شاعر نے اپنے ذاتی جذبات و عقائد کو شامل کرتے ہوئے خیال انگیز اشعار تخلیق کیے ہیں

منقبت و نعت — ہو نہ دے عزوب ایک بہر نماز مہر کو + ایک کرے اشارے سے قرص قمر تمام دو

ایضاً — ہے علم الہی سے وہ اتنی لغت آگاہ + واں عقل کل اور طفل دبستاں ہے برابر

منقبت علی رض — وہ تیری ذات ہے مشکل کشا جو کھولے ہے + جہاں کے کام سے کیا نیں و کیا سنیار گرہ

ایضاً — شعلہ کوہ طور سے کیا کم ہے اس رخ کی شمع + دونوں آپس میں ہیں گویا خلقت یک دودماں

ایضاً — شاہ مرداں تری خلقت جو نہ ہوتی منظور + ہوتے عنصر نہ کبھو مل کے بہم چاروں ایک

ایضاً — ہیبت عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر + واسطے درد سر آہو کے گھسے ہے صندل

منقبت حضرت امام حسین رض — گر اس کا حکم انفاذ جہاں سے رشتہ کفر + مجال کیا جو سلیمانی میں رہے زنار

موسیٰ رضا کاظم رض — موقوف تعاظیمِ خدا تم پہ بیاں تلک + جوں بن حروف معنی نہ آوے بیاں تلک

ایضاً — شرار آب میں رہتے ہیں گوہر آتش میں + زبس کہ عدل ترے عدل نے جہاں میں کیا

ایضاً — شاہا وہ تری ذات منزہ ہے کہ جس میں + مخصوص تری شان میں ہے آیہ تطہیر

منقبت حسن عسکری — ہے حباب اور آب شر میں ربط فانوس و چراغ + گلشن انصاف پر اس کے یہ آب و رنگ ہے

مہدی الہادی آخر زماں — اس کا قدم نہ ہووے جہاں کے جو درمیاں + کب چار عنصروں میں رہے حد اعتدال

تا قیامت کے واسطے ہو جرس قرنوں کا دل + نکلے جو تجھ قدم کی زیارت کو کارواں

مذکورہ مذہبی ممدوحین کے علاوہ سودا نے دنیاوی ممدوحین کے حوالے سے بھی مذہبی امور کا تذکرہ کیا ہے
"شاہ عالم ثانی اور وزیر الممالک کی شان میں کہے گئے ان کے قصیدوں میں انہوں نے بادشاہ کو ظل اللہ، ضامن عفو گناہ، مسجود روشن دلاں، آستانہ معراج امت، قاطع کفر وغیرہ کا مقام بخشتا ہے" (۱)

رکھے ہمیشہ تری تیغ کار کفر تباہ + بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ
پران کو اوج سعادت سے مہر کیا نسبت + وہ ہو بچے ظل ہما تک میں تا بہ ظل اللہ
روشن دلوں کو گر نہ ہو مسجود در ترا + رکھے نشان سجدہ زمیں پر نہ ماہتاب
معراج وہ نبی کی جو ہو عرش کے پرے + معراج امت اس میں جو اس جا ہو بار یاب

قصائد میں مذہبی حوالے کی شمولیت کا یہ رنگ بھی دیکھیے

اس کے ہو درج پہ تجھے دیکھ کے سمجھے ہے خلق + کرسی پر عرش کے ہے صورت انساں کا ملک
رواج دین نبی کا یہ عہد میں تیرے + کہ شکل انس پہ عابد نہ ہو دے اب تکفیر
شکست دے ہے بتوں کو جو عرصہ سے بیچ + صدا نکلتی جرس سے ہے کیا ہے وہ تکبیر

ڈاکٹر الف۔ د نسیم لکھتے ہیں

"سودا نے حضرت علی رض کے گھوڑے کا ذکر دو تین قصیدوں میں اس طرح کیا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ وہ گھوڑے کی بجائے کسی غزل گو کے محبوب کی تعریف کر رہے ہیں" (۲)

اس کی سر چوٹی کا میں حسن کہوں کیا جس + زلف معشوق کا دیکھے سے نکل جاوے بل
دیں خراج آنکھوں کو جس کے چشم خوباں ہر آ + باج دیویں بال ودم کو زلف وجعد مہوشاں

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں "میر کے ہاں حضرت علی اور خدا کو اور سودا کے کلام میں حضرت علی رض اور نبی کریم کو ایک دکھانے کا رجحان بڑا کارفرما ہے" (۳)

حضرت علی رض سے مشکل کشائی کے تصور کی وجہ سے ہی سودا نے اپنے ایک قصیدہ کی ردیف "گرہ" منتخب کی ہے
ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے یہ بھی لکھا ہے

"نبی کریم ص اور حضرت علی رض میں اشتراک صفات کے رجحان کے سلسلے میں متفرق اشعار کے علاوہ سودا کے "دو" اور "برابر" کی ردیف والے قصائد خصوصیت سے دیکھیے جن میں وہ کہتے ہیں کہ مثل نوک خامہ اگرچہ نبی ص اور علی رض دو الگ الگ ہستیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک ہیں۔ بہ نام علحدہ علحدہ ضرور ہیں لیکن ان کے معانی ایک ہیں۔ جبرئیل دونوں کے روضے کا طواف کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت خضر کا بھی یہی حال ہے۔ دونوں

---

(۱) اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر ص ۵۰۰ (۲) ایضاً ص ۵۵۰ (۳) ایضاً ۵۵۱

"کا امر، امرِ الٰہی سے کم نہیں۔ وہ خلق کی میزان کے دو پلّے ہیں جن میں مساوات ہے" (۱)

؎ اس حرف میں جو شبہ رکھے ہو مسلماں + اس شخص کا الحاد ہے ایماں کے برابر
جس طرح تجلّی کو خدا کی نہیں تکرار + حیدرؑ بھی محمدؐ سے بدیں شاں ہے برابر
دونوں کا نہیں امر کم از امرِ الٰہی + دونوں کی حدیث آیۂ قرآں ہے برابر

ڈاکٹر الف د نسیم نے یہ بھی لکھا ہے "سودا نے اس برابر کا التزام اس حد تک کیا ہے کہ جہاں نبی کریم کے معجزۂ شق القمر کا ذکر آتا ہے وہاں حضرت علی کے معجزہ رد الشمس کا بیان بھی ہے۔ اگر ایک کے براق کے وصف رقم کیے ہیں تو دوسرے کے دلدل کی توصیف بھی کی ہے" (۲)

سودا نے اپنے نعتیہ قصیدہ میں حضورؐ سے بھرپور عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے

؎ زہے دینِ محمد پیروی میں اس کو جو ہو وے + ار ہے خاکِ قدم سے اوس کی چشم عرش نورانی
ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو گر اس کے + امانت دار نورِ احمدی ہوتی نہ پیشانی
اوسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا + مراد الفاظ سے معنی ہیں تا آیات قرآنی
خیال خلق اوس کا گر شفیع کا فراں ہو وے + رکیں بخشش کے سر منت یہود کیا و نصرانی
جو صورت اس کی ہے لاریب ہے وہ صورتِ ایزد + جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنی ربانی
حدیثِ من رانی راٰی الحق ہے اوس گفتگو اوپر + کہ دیکھا جس نے اوس کو اون نے دیکھا شکل یزدانی

سودا رنگ بدل بدل کر بات کہنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے

سودا نے مدح کے اجزا میں بعض جگہوں پر فوج و لشکر کی تفصیلات لکھی ہیں ان میں مغنوں، بان، رہکلہ، توپ، فتیلے، رہکل، گجنال وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ مذہبی قصائد میں انہوں نے ممدوح کے روضوں اور فتوں وغیرہ کی توصیف بھی کی ہے۔ ان کے بعض ہجویہ قصائد میں شیعہ سنی آویزش کا موضوع چھیڑا گیا ہے۔ انہوں نے ایک سنی پیشوا کی مذمت میں ہجو بھی لکھی ہے۔ سودا نے اپنی ہجویات میں فحش گوئی سے زیادہ پرہیز نہیں کیا۔ ان کے مذہبی تعصب کا اندازہ ان ہجویات سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے عقائد کے مخالف افراد کی براءۃ میں لکھی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سودا کا قصیدہ ہجا تضحیک روزگار ہی ایک ایسی نادرۂ روزگار تخلیق ہے جس کا جواب ہجویات کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ سودا کا شہر آشوب بھی بڑے معرکے کی چیز ہے قاضی عبدالودود کا کہنا ہے "دو صدیاں گزر گئی ہیں۔ اس کی تازگی باقی اور اسکا اثر برقرار ہے، سودا کا لہجہ ظریفانہ ہے لیکن اس کے لب متبسم ہوتے ہوں اس کا دل روتا ہے، سودا نے جو تصاویر کھینچی ہیں وہ واضح اور تسلی بخش ہیں۔ اس جو کچھ کہا ہے وہ آنکھوں دیکھی ہے یا آپ بیتی" (۳)

---

(۱) اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر ص ۵۵۲ (۲) ایضاً ۵۵۳ (۳) مضمون کچھ سودا کے بارے میں ص ۱۱۱ "مطبوعہ معاصر" شمارہ ۲ پٹنہ

حسن طلب اور دعا کے اجزا میں بھی سودا نے مقاصد برآری کے لئے سحر بیانی کی ہے۔ دعا کا یہ انداز ملاحظہ ہو

ہ
کر تو سودا اب قصیدے کو دعا پہ ختم + گو خطاب اس کو دیا ہے تو نے "بحرِ بے کراں"
تا کہ ہیئت کو زمانہ کی ہے یاں مولد قرار + منجمد جب تک ہے اجزائے زمین و آسماں
دوستوں کو تیرے نت اوج بشارت ہو نصیب + خاکِ ذلت سے رہیں یکساں ہمیشہ دشمناں
اس تخت پر بہ مسندِ اقبال بیٹھ کر + کرتا رہے تو شادی نوروز اے جناب
تا بندہ جب فلک بہ فلک ہو وے مہر و ماہ + تا جلوہ گر رہیں یہ جہاں صبح اور شام
دنیا ہو اور تو ہو الٰہی یہ خرق + تیرے نصیب جام مئے عیش ہو تمام

حسن طلب کے حصوں میں سودا نے ایسی تاثیر پیدا کی کہ ممدوح کی طبیعت پر گراں گزرنے کا احتمال نہ تھا

حسن طلب
لیکن نہ سمجھیو یہ اس گفتگو سے ہرگز + مقصود مجھ کو تیری ہمت کا امتحاں ہو
کس واسطے کہ مجھ کو اتنا ہی چاہیے + جامہ ہو ایک تن پر کھانے کو نیم ناں ہو
سو تو زیادہ اس سے تیرا کرم ہے مجھ پر + کفرانِ نعمت اوپر قادر نہ یہ زباں ہو
اتنی ہی آرزو ہے کچھ عمر ہو جو باقی + مصروف جہاں میں اس کا تیرے قدم کے پاں ہو
کب جا سکے ہے کوئی دروازے تیرے آگر + بیٹھے جو تیرے در پر وہ سنگِ آستاں ہو
تا مہر و مہ فلک پر یا رب رہے درخشاں + یہ آستانِ دولت مسجودِ دو جہاں ہو

سودا نے اپنے بعض قصائد کے مختلف نام رکھے ہیں مثلاً تضحیک روزگار،(1) باب الجنت(2) اور بحرِ بے کراں وغیرہ
سودا کے قصائد ان کے مشاہدے کی ہمہ گیریت، پر اعتماد لہجہ، اخلاقی و تمثیلی انداز "مضمون آفرینی اور خیال بندی کی خوبی"
اور بالخصوص خیال کے نئے نئے پیرایوں کی بدولت انہیں ایک بڑا قصیدہ نگار بناتے ہیں۔ ان کی اس صلاحیت کا اعتراف
پرانے تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔(3)

محققین نے سودا کو صنف قصیدہ (اردو) میں نقاش اول قرار دیا ہے(4) اس بیان کو شمالی ہند کے اردو قصیدہ
کے حوالے سے تو اہمیت دی جا سکتی ہے کہ سودا نے اس علاقے میں فارسی معیار کا اعلیٰ قصیدہ لکھا تاہم ان سے قبل
نصرتی جیسے قصیدہ نگار موجود ہیں۔ اردو قصیدے کا نقش اول دکن ہی میں تلاش ہو سکتا ہے۔ البتہ سودا نے
اردو میں اس صنف کو عروج پر ضرور پہنچایا ہے۔ انہوں نے تمثیل اور مبالغے کا خوش اسلوبی سے استعمال کیا۔ اظہار علم
کے لئے فنی و علمی معلومات اور اصطلاحات کا سہارا لیا۔ مثلاً میر حکیم میر محمد کاظم کے قصیدے میں طب کی اصطلاحات کا استعمال
(تشخیص، قارورہ، جنبشِ نبض، خواصِ مفرد، ترکیبِ مرکب، دم، سودا، صفرا، بلغم وغیرہ) علاوہ ازیں ہاتھی گھوڑے
اور فنونِ حرب سے متعلقہ اصطلاحات سے بھی وہ کماحقہ آگاہ تھے۔ حافظ رحمت خاں اور شجاع الدولہ کے درمیان ہونے
والی جنگ میں انہوں نے جنگ کے مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔(5) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رزمیہ مناظر کے بیان میں انہیں

---

① یہ نام اس قصیدے کا "تضحیک روزگار" ② تا مسمی رہے یہ نظم بہ باب الجنت ③ دیکھئے نکات الشعراء ص ۸۰، گلشن ہند ص ۱۲۶
مخزن نکات ص ۸۷، تذکرہ ریختہ گویاں ص ۱۶۷، تین تذکرے ص ۸۶، خوش معرکہ زیبا ص ۳ ④ تذکرہ ہندی ص ۱۲۵ مرتبہ مولوی عبدالحق، برقی پریس دہلی ۱۹۳۳
⑤ ملاحظہ ہو قصیدہ در مدح نواب شجاع الدولہ در تہنیت فتح روہیلہ، کلیات سودا، مرتبہ شمس الدین صدیقی، جلد دوم

انہیں مہارت حاصل تھی۔ سودا کے قصائد فارسیت سے مملو ہیں تاہم کہیں کہیں وہ ہندی ماحول، رسوم و رواج، توافق اور روایات و تلمیحات سے بھی علاقہ رکھتے نظر آتے ہیں ان کے گول مول، لپک جھپک اور رونق مبنت توافی میں کھل گئے قصیدے اس ضمن میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں یہ قصائد فارسیت سے زیادہ مربوط نہیں ہیں۔ ہندو مذہب اور معتقدات کے حوالے سے بھی سودا کے قصائد میں اشارے موجود ہیں مثلاً برہمن، گنیش، ارجن، ساونت، ہنونت، بھیم، ارتھی، کنہیا اور بہت سے دوسرے الفاظ اور تلمیحات انہوں نے مکمل تلازموں کے ساتھ استعمال کیے ہیں

؎ ہندو مسلماں کا پھرا اس پالکی اوپر + ارتھی کا توہم ہے جنازے کا گماں ہے

سودا نے اپنے شہر آشوب اور قصیدہ تضحیک روزگار میں اپنے معاصر عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ شہر آشوب میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ہند کی معاشی صورت حال بگڑ چکی ہے اگر کوئی گھوڑا لے کر کسی کی نوکری کرتا ہے تو اسے تنخواہ نہیں ملتی / تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ مکاں ہے / سپاہی اپنے ہتھیار بیچ بیچ کر شکم کی آگ بجھا رہے ہیں۔ قاضی، ملا، خطیب بھی برے حال میں ہیں طبیب اگر کوئی کسی امیر کے ہاں ملازم ہے تو اس کی بھی حالت پتلی ہے حتیٰ کہ اگر وہ بوعلی سینا بھی ہے تو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ سوداگر سے بھی امرا چیزیں خریدتے ہیں لیکن ان کی قیمت ادا نہیں کرسکتے۔ شاعر بھی رسوا اور خوار ہو رہے ہیں۔ ملا، کاتب، پیر، متوکل اور حافظ سب ہی پریشان حال کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی طرح تضحیک روزگار میں انہوں نے لکھا ہے کہ جن امرا کے طویلوں میں عراقی اور عربی کا شمار نہیں ہوتا تھا وہ زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں حتیٰ کہ موچی سے اپنے جوتے بھی ادھار گٹھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ

سودا نے اپنے بعض قصائد میں اپنے دور کے تہذیبی عیش و نشاط اور رنگین مزاجیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے

؎ نہ ترے گھر میں کبھو ناچ ہیں ہوتے دیکھا + نہ ترے در پہ سنی آ کے پکھاوج کی گمک
آدمی کے تئیں کچھ گرمیٔ صحبت ہے شرط + وہ بھی انسان ہے دنیا میں جو اتنا ہو خنک
گو ترا وضع زمانہ سے ہے دل افسردہ + پر ہم آئے ہیں ترے گھر میں اڈلو دیکو تنک
ایسے مہماں کی تو لازم ہے کہ خاطر ہو عزیز + بادہ پر شیشے میں رکھو لا کے نمکداں میں گزک
بزم آراستہ بلوا کے گر ارباب نشاط + پاس لے بیٹھو ہمیں سب کو چھکا آپ بھی چھک
آج وہ دن ہے کہ جس گھر میں تو دیکھو اس میں + کہیں ہوتی ہے جھگت اور کہیں ہے اولک
یاں تلک شیخ و برہمن ہیں طرب کے مصروف + دیر میں بجتی ہے مردنگ، حرم میں ڈھولک
تار تنبور نہیں رشتۂ زنار فقط + گلے سر ساز میں تسبیح کے بھی دانوں تک
بادے کو ہاتھ سے اب مغ کے نہ پیوے ملا + پر یہ راضی ہے کہ کپڑوں پہ جو چھڑکے تو چھڑک
محتسب سے چلے ہے مست رگڑ کر کاندھا + مغبچے آئے چلا قاضی کے آگے نہ لٹک

علاوہ ازیں جشن نوروز کے حوالے سے بھی سودا نے تعیش پسند از معاشرتی زندگی کی استعاراتی تصویریں کھینچی ہیں سودا کو اپنی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ تھا وہ لکھتے ہیں

سو آوے ہے شعر و سخن پر جو طبیعت میری + معنی پردے سے عدم کے کریں ہیں استقبال

کس کو ہے فن شعر میں مجھ ساتھ ہمسری + قطرہ نہ پاوے پیش لب گنگ رنگ ڈھنگ

مذہبی قصائد میں سودا اپنے فن کا جوبن دکھلاتے ہیں ۔ یہ قصائد ان کے دل کی گہرائیوں اور شعور کی بلندیوں کی مدد سے تخلیق ہوئے ہیں۔(۱) ان میں صناعانہ شعاری کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں اور معاصر عہد کے حالات کی عبرتناکیاں بھی۔ سیاسی اور سماجی ماحول کی ناہمواری، شکوہ فلک، شرفاء کی بدحالیاں یہ سب کچھ ان قصائد کی تشبیب میں مل جاتا ہے عرض و دعا کے اجزا میں بھی ان حالات کی چند جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں ۔

سودا نے صنف قصیدہ کو معراج کمال تک پہنچایا ۔ اسے نیا پیرہن عطا کیا ۔ انوری کی زبان، خاقانی کے زور بیان عرفی کی مضمون آفرینی اور ظہوری کی رنگینی کے ساتھ سودا کے جوہر شاعری نے مل کر سحرکارانہ رنگ پیدا کیے ہیں ۔ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات اور فکر و شعور کی بالیدگی سے اس کی شان و شوکت میں اضافہ کیا ۔ تشبیب و گریز کی نزاکتوں کو نازکی سے استعمال کیا ۔ مبالغے کے مناسب استعمال سے وہ کیفیت پیدا کی ان کے معاصرین تو ایک طرف مابعد کے شعرا نے بھی اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ سودا کے قصیدے کا ایسا مقناطیسی معیار مقرر کیا کہ اس کی کشش سے بچ نکلنا محال ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سودا کے بعد شعرائے متوسطین و متاخرین نے اس کی تقلید میں نقش ثانی ہی تخلیق کیے ہیں ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ لکھتے ہیں

"سودا کے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ انہوں نے ایسے زمانے میں اس فن کو عروج پر پہنچایا جب کہ وہ ابتدائی منازل میں تھا" (۲)

---

(۱) ڈاکٹر شمس الدین نے لکھا ہے کہ سودا نے چاروں ایک "دال ردیف پر مشتمل قصیدہ)" ابوالحسن کے مطابق سودا نے دراصل یہ قصیدہ نواب مہربان خاں رند کی مدح میں لکھا تھا لیکن بعد میں حضرت علیؓ کے نام کر دیا" کلیات سودا جلد دوم حاشیہ ص ۹۰ اگر اس بیان کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سودا نے دنیاوی ممدوحین کی شان میں دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر قصیدے لکھے ہیں (۲) ادبی جائزے ص ۲۳۷

کلیاتِ سودا میں موجود ایک طویل قصیدہ

سودا کے کلیات (مطبوعہ نول کشور ۱۹۳۲) میں مہتمم مطبع نے ان کے کسی شاگرد کے ایک قصیدے کے آٹھ سو اٹھاسی اشعار شائع ہوئے ہیں یہ قصیدہ بقول مہتمم مطبع نو سو پچاس اشعار پر مشتمل تھا بقیہ اشعار بربنائے کثافت اور اسی نوع کی دیگر وجوہات کی بنا پر اسمیں شامل نہیں کیے گئے۔ اگر ان اشعار میں سے ۹۳ اشعار مصحفی اور سودا کے نکال دیے جائیں تو یہ قصیدہ ۷۹۵ اشعار کا رہ جاتا ہے (۱) اسے کسی نے شاگردِ سودا اصلح الدین کے زورِ طبع کا نتیجہ قرار دیا ہے (۲) کسی نے ان کے شاگرد احسن کا (۳) اور کوئی اسے بندرابن راقم سے منسوب کرتا ہے (۴)۔ ایک سرسری قیاس یہ بھی ہے کہ یہ سودا کے کئی شاگردوں نے مل کر لکھا ہے بہرحال یہ سودا کے کسی ایک شاگرد کا ہو یا بہت سے شاگردوں کا اسے ایک زمانے میں اردو کا طویل ترین قصیدہ سمجھا جاتا تھا (اسمیں واحد متکلم کا صیغہ غالب ہے جس سے یہ کسی ایک شخص کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے)۔ اس قصیدے کے آخر میں تکرارِ قوافی کے عذر میں یہ شعر بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ آٹھ سو اور نو سو اشعار کے درمیان ہے۔

> ؎ ان قافیوں میں آٹھ سو اور کتنے ہیں اشعار + کس طرح سے اس میں نہ قوافی ہوں مکرر

بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس قصیدے سے زیادہ طوالت کا حامل قصیدہ شاطر مدراسی نے لکھا ہے۔ یہ ۱۳۹۶ اشعار پر مشتمل ہے (۵)۔ اس سے بھی طویل اردو قصیدہ کنور حسین مضطر کفوی کا ریاض الشہدا (۶) ہے یہ ۱۴۲۵ اشعار پر مشتمل ہے اسے ہی اردو کا طویل ترین قصیدہ کہنا چاہیے۔ یہاں سودا کے شاگرد کے قصیدے سے بحث کی جائے گی۔ اس کی نوعیت اس قصیدے کی ہے جو کسی دور میں درمذمت سودا نظر آتا ہے۔ اس میں مصحفی کی ہجو بھی ہے اور فاخر مکین اور سودا کے مناظرہ کا تذکرہ بھی۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فاخر مکین کے کن الفاظ پر سودا نے اعتراضات کیے تھے۔ اس ہجو یہ قصیدہ کو منظوم تنقیدی قصیدہ اردو تنقید نگاری کا مرقع سمجھنا چاہیے۔ یہ خطابیہ ہے اور اسمیں براہ راست مصحفی سے مخاطب ہو کر اسے تعلّی سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے اور مشورہ یہ دیا گیا ہے کہ وہ حمق و حسد و خودستائی کے رجحانات ترک کر دیں۔ اس کے بعد شاعر نے اپنی شاعری کی تعریف کی ہے اور تکرارِ قوافی کا عذر بھی پیش کیا ہے۔ اس قصیدے میں عقلا و علما کے حق میں دعا اور جہلا و جہلا کے حق میں بددعا بھی کی گئی ہے۔ خطابیہ انداز، ہجویہ عنصر اور خاتمہ میں دعا کے التزام سے قصیدے کی ہیئت کے تقاضے پورے کرنے کی سعی ہے۔ اس قصیدے کا نام "برشِ شمشیر" ہے۔

> ؎ تیزی و صفائی کو قصیدے کی مرے دیکھ + حاتم نے خطاب اس کو دیا برشِ شمشیر

مصحفی کے جن مخربہ اشعار کا اس میں جواب دیا ہے وہ یہ ہیں

> ؎ شانہ پہ میرے مہرِ نبوت نہیں ہنس + کرتا میں صاف دعویٰ وحی و پیمبری
>
> گربا زمعانی کا مرے ہودے ہوا گیر + پیدا کریں احرار ہوا حکم عصافیر

---

(۱) کلیاتِ سودا جلد دوم مطبوعہ نول کشور ص ۲۳۱ تا ۳۲۳ (۲) سودا از شیخ چاند ص ۵۷ (۳) معاصر پٹنہ اگست ۱۹۵۲ ص ۹ مضمون از قاضی عبدالودود

(۴) سودا کا ایک قصیدہ امتیاز علی عرشی اردوئے ادب جولائی ۱۹۵۰۔ عرشی نے اس کے ثبوت میں یہ شعر دیا ہے ؎ اقلیم معانی میں ہے راقم ترا ڈنکا + عالم میں سخن کی تری بجتی ہے بم و زیر

(۵) اردو میں قصیدہ نگاری ص ۲۷۹ (۶) ریاض الشہدا از کنور حسین مضطر دوسرا ایڈیشن

سہ لیتا ہوں کماں فکر کی جب ہاتھ میں اپنے + پاتا ہوں میں عنقائے تیش وس کے سر تیر
اور باندھوں ہوں جب شست نشانہ پہ سخن کے + رہ جائے ہے منہ دیکھ مرا دیدۂ زہ گیر
دیوان کو میرے نہ لگا ہاتھ تو کہ ناداں + ہر صفحۂ کاغذ پہ ہے یاں سیر کی تصویر
میرا نہ چھوروں کی طرف روئے سخن ہے + اس بات کو وے سمجھیں گے جو ہیں گے نکتے گنجیر
سودا ہے کیا فخر قصیدہ میں یہی تا + کچھ اس کے سوا اور تو میری نہیں تقصیر
مصرع ہے بصد خون جگر مصرع چسپاں + مصرع یہ عجب پوچ تولتا ہے بہ تسطیر

مصحفی کے مذکورہ اشعار میں موجود نقائص کا اظہار یوں کیا گیا ہے

لائے ہیں کہیں میر سے کا وہ مذکور + جو شاعری کے فن میں ہیں مشاہیر

اور پھر لکھا ہے کہ سودا کو تو مصحفی نے شاعر مطلق کہا تھا اور خود وہ بے ربط مصرعے تحریر کر رہا ہے اور یہ بھی کہ مصحفی جو بلیغ ہونے کا دعوی کرتا ہے وہ سودا جیسے خلاق معانی کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔ وہ مانی اور بہزاد سے زیادہ معانی کی صورت کشی میں تشہیر رکھتا ہے۔

سہ اقلیم سخن میں تھا وہ بہزاد کا استاد + تب کھینچ گیا حسن معانی کی تصاویر
روغن سے معانی کے تو اور رنگ سخن سے + واقف نہیں کیا جائیگا تو کھینچ کے تصویر

اسمیں سودا کی طراحی تقریر، الوانِ معانی، اعجاز بیاں، شاعرانہ ساحری، شستگی زبان کی کھل کر تعریف کی گئی ہے اور اسے انوری ہند کا خطاب بھی دیا گیا ہے ① پھر سودا کی زبان سے تعلی آمیز بیانات درج کیے ہیں جن میں وہ کہتا ہے "میری مغلائے سخن آئینہ کی مانند ہے، میں سخن ایجاد ہوں، اگرچہ مشاہیر شعرا کے پاس اس جیسے الفاظ و معانی نہیں ہیں۔ اس کے فکر نے شاعری کو ایسا رنگ بخشا ہے جو سورج کی چمک لعل کو بھی نہیں دے سکتی۔ اس کی فصاحت خاقانی سے بڑھ کر ہے۔ اس کا ہر معانی اور ہر لفظ خورشید سا روشن ہے۔

سہ انداز ہر اک اوسکے قصیدہ کا جو دیکھو + تمہید سے تا بگریز اک نئی تقریر

اگرچہ وہ نام کا ہندی ہے تاہم اس کے اشعار میں وہ گرہ گیر مضامین ہیں جو فارسی سے بہتر ہیں۔ اس کے کلام میں باغ سے زیادہ بوقلموں ہے۔ وہ اپنی طرز کا خود مخترع ہے اور اس نے قدما کے طرز پر خط نسخ کھینچا ہے۔ وہ ریختہ کے راہِ سخن کا ہادی ہے"۔ آگے تنقید کے ہیں۔ مصحفی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی آنکھوں پر حق کی چربی چھائی ہوئی ہے تو سودا کی مسندِ معانی پر کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ سودا تو خوبیٔ معانی، بندشِ الفاظ، پاکیزہ بیانی، صافی تقریر میں طاق ہے۔ اس نے اس ریختہ کو جس کی قدر خزف ریزے سے کمتر تھی لعل و گوہر کی توقیر دی ہے۔ وہ دنیا میں ایک قلزم زخارِ سخن تھا۔ شاعر نے مصحفی کے حسب نسب کو مجہول کہا ہے۔ اس کی بد باطنی کی طرف اشارے کیے ہیں اور لکھا ہے سہ اظہار معانی کو کیا تو نے ہے الجھا + ہرگز کسی استاد کو سوجھی نہ یہ تدبیر

---

① اس انوری ہند نے دلیوان میں اپنے + اک شعر کیا ہے اسی مضمون کا تحریر

علاوہ ازیں مصحفی کے اشعار کے جواب میں یہ بھی لکھا ہے ۔ سہ کی تو نے ان الفاظ کی موزونی بہ تنخواہ + پر دی انہیں زنہار معانی کی نہ جاگیر

سہ رکھتے جو معانی سے یہ الفاظ علاقہ + عنقا ہو گر اجرا سو گر دیدۂ زہ گیر

یہ شعر ہے کیا واہی و بے معنی کہ جس سے + تصویر کے لا تو نے کیا شیروں کو زنجیر

گنجفہ یہ کہتے ہیں سخن کا کوئی پرساں + اس وقت میں ہوتا تو وہ دیتا تجھے تحریر

ہے فارسی و ہندی کا تری مضحکہ جو ہے + طینت کا تری لیکن حماقت سے ہے تخمیر

اس کے مقابلے میں سودا کی فکر رسا کی داد دی ہے ۔ اور کہا ہے کہ آجکل کے شاعر اگر مطلعوں میں پستہ معانی کو بند کریں تو وہ سمجھتے ہیں انہوں نے عالم کو زنجیر کر لیا ہے ۔ علاوہ ازیں وہ اپنے کلام کو سورہ یوسف سے بہتر سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے معانی خواب فراموش کی تعبیر ہیں ۔ اور اگر سامعین انہیں داد نہیں دیتے تو وہ ناراض ہوتے ہیں ۔ ان کے کلام میں لفظی تناسب نہیں ہے ۔ تلازمات متعلقہ نہیں ہیں ۔ تذکیر و تانیث کا بھی وہ خیال نہیں رکھتے نہ وہ سرقہ کو سمجھتے ہیں اور نہ توارد کو ۔ قصیدے کے مصنف نے لکھا ہے کہ قصیدہ اور غزل کہنے میں زمین و آسمان کی فرق ہے

سہ کہتے ہیں غزل اور قصیدہ کی زباں کے + تقریر و بیاں کرنے میں ہے فاصلہ سو تیر

ہے طرز غزل اور قصیدہ کی ہے طرز اور + آپس میں ہے ان دونوں کے فرق زبر و زیر

معروف غزل گوئی میں لیکن گہ و ناگاہ + کرتے ہیں قصیدہ جو بصد فکر بہ تحریر

کہتے ہیں قصیدہ بھی غزل ہی کی زباں میں + مطلق او نہوں کی کرتی تفاوت نہیں تقریر

اس قصیدہ میں مصحفی کے تذکرۂ ہندی کے بعض بیانات کی تردید بھی کی گئی ہے مثلاً میر کی ذیل میں مصحفی نے لکھا تھا کہ انہیں غزل میں مثنوی میں مرزا سودا پر افضلیت دی جاتی ہے اسی طرح ہجو اور قصیدہ میں مرزا کی فوقیت ہے ① لیکن قصیدہ نگار نے سودا کے بارے میں کہا ہے کہ انہوں نے غزل اور قصیدہ دونوں میدانوں میں عمدہ شاعری کی ہے ۔ علاوہ ازیں مصحفی نے اپنے تذکرے میں بقاء اللہ بقا اور سودا کی معرکہ آرائیوں کا جو تذکرہ کیا ہے ② اس کی تردید بھی اس قصیدے میں موجود ہے ۔ قصیدہ نگار کا کہنا ہے کہ بقاء اللہ بقا کی سودا سے براہ راست معرکہ آرائی نہیں تھی بلکہ سودا اور فاخر مکین کی معرکہ آرائی میں وہ فاخر مکین کی جانب تھے ۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ معرکہ کے بعد بقا سودا کے تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے ۔ اور جب سودا نے بقا کی دیوان کی اصلاح کر دی تو اس خیال سے کہیں مکین ناراض نہ ہو جائیں انہوں نے سودا سے تعلق توڑ لیا تھا ۔ سودا اور مکین کی معرکہ آرائی لکھنؤ میں ہوئی تھی اس میں بقا ارمیں اور خنجر لے کر آئے تھے یہ قصیدہ اس اعتبار سے واقعہ نگاری کا عمدہ نمونہ بھی ہے ۔ اسمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نواب آصف الدولہ کے ڈر سے فاخر مکین اور ان کے ساتھی سودا سے معافی مانگنے آئے تھے ۔ تذکرہ ہندی کے اس بیان کی کہ سودا کی شاعری میں بعض جگہوں پر توارد اور سرقہ ہے قصیدہ نگار نے بہتان تراشی قرار دیا ہے ۔ اس قصیدہ میں سودا کی معاصرانہ چشمکوں کا عمدہ تصویری بیان نظر آتا ہے ۔ اسمیں مبتذل، عامیانہ، فحش گوئی اور کالم گلوچ پر مبنی ہجویہ اشعار بھی کم نہیں ہیں

---

① تذکرہ ہندی ص ۲۰ ترجمہ نمبر ② ایضاً ص ۳ م

میر حسن

میر حسن م ۱۷۸۶ء کا نام ان کی مثنوی سحر البیان کی بدولت اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ مثنوی اپنے ربط و تسلسل، پرواز تخیل، منظر نگاری، زبان و بیان، احساس و خیال، شاعرانہ نزاکت، کردار نگاری، ایجاز و اختصار، توازن و تناسب، دلچسپ کہانی اور سلاست و روانی کے عناصر کی بدولت نہایت بلند پایہ ہے۔ میر حسن نے دیگر شعری اصناف بھی خوش سلیقگی سے استعمال کی ہیں۔ ان کے غیر مطبوعہ دیوان میں سات قصائد موجود ہیں[1]۔ ان میں سے دو مذہبی ہیں اور بقیہ غیر مذہبی۔ لمعہ نور کے عنوان سے انہوں نے ایک قصیدہ (بائیہ) حضرت علیؓ کی منقبت میں لکھا ہے۔ دوسرا مذہبی قصیدہ امام حسینؓ کی مدح میں ہے۔ ان کے غیر مذہبی قصائد میں دو آصف الدولہ کی مدح میں ہیں اور ایک ایک نواب سالار جنگ، جواہر علی خاں اور نواب آدم علی خاں کی مدح میں ہیں۔ یہ قصائد بالترتیب نونیہ، میمیہ، رائیہ، کافیہ اور لامیہ ہیں۔ ان قصائد کے چند اشعار دیکھیے

شکن سے زلف کے عارض نمود ہے ہر جا + ہیں ایک شب میں کئی بہر عاشقانہ ہتاب [لمعہ نور]

از بس حسن ازل سے غلامِ حسین ہے تو + سے سبزہ جہاں میں خط و بیں بزار بار [در مدح امام حسین]

جو گوش ہوئے نکتہ دانِ سخن + وہ کرے سیر بوستانِ سخن [در مدح آصف الدولہ]

کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم + کس کی بو دوش پہ اپنے لئے پھرتی ہے نسیم [ایضاً]

نکالے کیونکر قدم اس کی زلف سے یہ اسیر + پڑی ہے پاؤں میں دل کی تو یہ طرح زنجیر [در مدح نواب سالار جنگ]

بھرا ہے شب نے مئے تہنیت سے جام ہلال + صباح عید ہے اور آج خرمی ہے کمال [در مدح جواہر علی خاں]

بیاں تک کیا ہے اس غم دوراں نے کار تنگ + کیا ہے عجب جو مجھ میں سما وے نہ فرزانگ [در مدح نواب آدم علی خاں]

میر حسن کے قصیدے زور کلام اور شکوہ الفاظ کے اعتبار سے اہم ضرور ہیں تاہم انہیں ہم سودا اور ذوق کے قصائد کے ہم پلہ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے اشعار میں روانی کا عنصر نمایاں ہے۔ میر حسن نے متروکات کا استعمال کم کیا ہے۔ الفاظ کی صفائی اور شستگی کے اعتبار سے بھی ان کے قصائد اپنے معاصرین کے قصائد سے ممیز ہیں۔ میر حسن فارسی شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کے قصائد پر اس زبان کے اثرات نمایاں ہیں۔ جہاں تک صنعت مبالغہ کا تعلق ہے میر حسن اس سے حسن کاری کا کام لیتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے پیچ در پیچ استعاروں اور دور از کار تشبیہوں سے سروکار نہیں رکھا۔ اس حوالے سے ان کے قصائد دل گداز اور دل نشیں ہیں۔ لفظ اور معنی کی ہم آہنگی ان کا خاص وصف ہے۔ میر حسن الفاظ کے طلسم یا محاورہ بندی سے مفہوم پیدا کرنے کی بجائے خیال کی براہ راست ترسیل کے قائل تھے۔ البتہ کریم الدین نے لکھا ہے ان کا

"قصیدہ مطلق اچھا نہ ہوتا تھا"[2]

---

(1) حیات میر حسن دہلوی مضمون از مولانا حبیب الرحمن شروانی ہمارا ہندوستانی اکتوبر ۱۹۳۱ (2) طبقات شعرائے ہند ص ۱۸۸

سے بدر اور کوئی ہلال بنا تا تھا۔ انار اور لیموں کے آبشورے ہوتے تھے۔ کورے کوزے شربتوں سے مالا مال دھرے نظر آتے تھے۔ میر حسن مزید لکھتے ہیں

وہ دعوت اور وہ روزہ کشائیاں باہم + نئے طرح کے وہ کھانے نئے نئے ارسال
وہ کوری کوری دھری جھجھریاں سرہانے اور + وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ سرد آب زلال
عجب طرح سے بہم اور کٹتے تھے اوقات + عجب طرح کے ہر اک روز و شب میں شغل اشغال
لبوں پہ ذکر خدا سر پہ سایۂ قرآں + عمل میں لاتے تھے صوم و صلوۃ کے اعمال

مذکورہ اشعار میر حسن کی مثنوی نگاری کی قوت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مقیدے میں انہوں نے اس قوت سے تسلسل بیاں کے عنصر کو شامل کیا ہے۔

میر حسن نے مقیدے کے مدحیہ مضامین میں ہند عجمی تہذیب میں جاری ساری بعض خیالات کو منعکس کیا ہے۔ وزیر اعظم کو انہوں نے ایک جگہ نائب ظل خدا کہا ہے

گلشن ہستی میں اس طرح چمن عیش آباد + کس کی خاطر سے ہوا ہے یہ خداوند علیم
شاید اس باغ میں ہے آصف دوراں کا گزر + کہ وہ ہے ابن کریم ابن کریم ابن کریم
آصف الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم + نائب ظل خدا صاحب تاج و دیہیم

میر حسن ممدوح کے مقام اور مرتبے کے مطابق اس کی مدح کرتے تھے۔ مقیدے کے جزو مدح کی نزاکت بھی یہی ہے۔ اچھے قصیدہ نگار ممدوحین کو ایک ہی پیمانے سے ناپنے کی بجائے فرق مراتب کے اعتبار سے مدح لکھتے تھے۔ میر حسن نے بھی اس امر کو ملحوظ رکھا ہے

وہ اپنے عہد میں فخر زمانہ ہے بے شک + کہ خوبیوں سے ہے اور نیکیوں سے مالا مال
کرم سے حق نے کیا اپنے اس کے دل کو کریم + سخی تو سونا کچھ اتنا نہیں ہے اس کا کمال
کریم اور سخی میں بڑا تفاوت ہے + کہ یہ سوال پہ دیتا ہے اور وہ غیر سوال
قسم جو راگ کی کھائی تو پھر کبھی نہ سنا + ہزاروں طرح کے چرچے ہوئے ہزار خیال
رہا جو شغل تو قرآن یا کتاب کا کچھ + سو وہ کتاب کہ جس میں ہو شرع احوال

میر حسن کے قصائد میں دعا خلوص و صداقت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتی ہے اور مقطعے برجستگی کا پر تو لیے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ صنعت تضاد اور مراعاۃ النظیر وغیرہ کا عمدہ استعمال کرتے ہیں۔

میر جعفر علی حسرت

میر جعفر علی حسرت م ۱۷۹۱ء/۱۷۹۲ء[1] کا تعلق بنیادی طور پر دہلی سے تھا۔ وہ شاعری کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔[2] میر، سودا اور مصحفی ہی کے مانند وہ بھی دہلی سے لکھنؤ ہجرت کر گئے۔ لکھنؤ میں جرأت جیسے شاعر کو بھی ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی شاعری کے نقوش گہرے ہیں۔ غزل اور قصیدہ کہنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔[3] احمد علی یکتا کا بیان ہے کہ حسرت متین اور پختہ گو شاعر تھے۔ ان کا کلام مربوط و رنگین ہے۔ انہوں نے شاعری کی تمام اصناف کو خوب سے استعمال کیا اور نیز یہ کہ انہیں فن شاعری کے بارے میں جو معلومات اور خود ان کی اپنی شاعری میں جو طنطنہ تھا اس کے پیش نظر وہ سودا جیسے شاعر کے حریف بنے۔ عبد الرؤف عشرت کے مطابق حسرت نے مشکل زمینوں میں قصائد لکھے اور اس صنف میں ان کا مرتبہ سودا سے کم نہیں ہے۔[5] عشقی نے اپنے تذکرے میں حسرت کی طبیعت کو معنی یاب کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے صنف قصیدہ میں داد سخنوری دی ہے۔[6] میر حسن نے بھی ان کی جولانی طبع کی داد دی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حد سے گزر گئی تھی اور ہر آدمی کی فکر اس کی اپنی ہمت کے مطابق ہوتی ہے۔[7] حسرت کا کلیات ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس میں ان کے قصائد ملتے ہیں۔[8]

حسرت کے آٹھ قصائد ہم تک پہنچے ہیں ان میں سے پانچ کا تعلق حمد، نعت اور منقبت سے ہے اور بقیہ تین غیر مذہبی قصائد شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور نواب محبت خاں محبت کی مدح میں ہیں۔ حسرت کو قصیدہ گوئی میں ہم سودا کا ہم پلہ تو قرار نہیں دے سکتے تاہم انہوں نے اس صنف کے تقاضوں کو خوش اسلوبی سے پورا کیا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا انہیں مرغوب تھا علاوہ ازیں صنائع شعری کے استعمال پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی۔

حسرت نے سودا کے شجاع الدولہ کی مدح میں لکھے ہوئے ایک قصیدہ کے اس شعر پر اعتراض کیا[9]

؎ نورِ خورشید ہو شب گو سے فلک کے زائل + نورِ معنی سے مری بیت کے ہے دورِ زوال

حسرت کا کہنا تھا کہ خورشید کا نور رات کو زائل نہیں ہوتا۔ جب بات نے طول کھینچا تو نواب تفضل حسین خاں حکم بنے انہوں نے فریقین کے دلائل سن کر سودا کے حق میں فیصلہ دیا اور کہا کہ "نورِ خورشید کا زائل ہونا تاریکی شب سے ظاہر اور ثابت ہے فروغ کوکب اس پر حجت ہے"[10] حسرت نے اپنے قصیدہ منقبت (در مدح امام علی موسیٰ رضا ع) میں سودا پر اعتراض کرتے ہوئے اپنے موقف کا اعادہ کیا۔ اس قصیدے میں انہوں نے سودا کے خلاف تو لکھا ہی ہے نواب تفضل حسین کے فیصلے کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔[11] سودا نے بھی اپنے ایک قصیدہ میں (در مدح علی موسیٰ رضا ع) حسرت اور ان کے استاد ناخر مکین پر چوٹیں کی ہیں[12]

حسرت نے سنگلاخ زمینوں میں طویل قصائد لکھنے میں قدرت حاصل کی تھی۔ سنگلاخ زمینوں میں تکلف اور تصنع سے محفوظ رہنا مشکل ہوتا ہے۔ حسرت نے اس مشکل پر قابو پا لیا تھا چنانچہ ان کے قصائد میں بے تکلفی اور

---

(۱) جائزہ مخطوطات اردو ص ۲۹۴ (۲) تذکرہ ہندی ص ۷۴ (۳) "در قصیدہ و غزل ید طولیٰ دارد" ایضاً ص ۷۴
(۴) دستور الفصاحت ص ۲۷ (۵) تذکرہ آب بقا ص ۱۸۳ (۶) دو تذکرے جلد ۱ ص ۲۲۰ (۷) تذکرہ شعرائے ہندی ص ۵۲
(۸) کلیات حسرت ادارہ فروغ اردو (۹) تذکرہ خوش معرکہ زیبا جلد اول ص ۲۴۹ (۱۰) ایضاً (۱۱) کلیات حسرت ص ۱۵-۱۴
(۱۲) کلیات سودا جلد دوم ص ۱۷۱

بے ساختگی بھی ہے اور سلاست، روانی، آمد اور برجستگی بھی۔ مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے عناصر بھی ان کے قصائد میں منعکس ہیں۔ البتہ شوکت الفاظ کے ضمن میں انہوں نے زیادہ شغف کا اظہار نہیں کیا

س شیخ و سجادہ و اسلام و حرم چاروں ایک + عاشق و بت کدہ و کفر و صنم چاروں ایک
اس کی دو چشم دو ابرو ہو بہم چاروں ایک + کیسے ہیں دل کہیں چھوڑیں گے نہ ہم چاروں ایک
ایک جی کا رہے پھر آہ خدا حافظ ہے + جب ہوئے درد و محن رنج و الم چاروں ایک
مومن و گبر و نصاریٰ و یہودی پر ایک + تو نے عذاب کیے اے عشق کے غم چاروں ایک
یار و غم، عشق و فلک آہ پھر اس دل پر + کرتے ہیں ظلم و جفا، جور و ستم چاروں ایک
کس سے داد فلک و یار و غم و عشق ملے + سب یہ دشمن ہیں نہ افزود نہ کم چاروں ایک
غم ہے اس عشق سے اور یار سے عشق اور وہ یار + چرخ کے ہاتھ ہے یوں گرتے ہیں ہم چاروں ایک
گریز
کون فریاد کو ہم غم زدگاں کی پہنچے + بے مخاں ہے دل و جان و لب و دم چاروں ایک
ہاں مگر ذات نبیؐ اور علیؓ و حسنینؓ + دو جہاں میں ہیں یہ ملجائے امم چاروں ایک

قصائد میں اگر شوکت الفاظ اور بیان کا طنطنہ موجود نہ ہو تو وہ کچھ پھیکے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ اس صنف میں شاعروں کو تشبیب، مدح اور گریز وغیرہ کے اجزا میں در آنے والی یکسانیت کو ختم کرنے کے لئے الفاظ و تراکیب کی ساحری دکھانی پڑتی ہے۔ اور اگر بیشتر قصائد میں یہ عنصر موجود نہ ہوتا تو وہ محض وزن و قافیہ پیمائی ہی کا نمونہ ٹھہرتے۔ حسرت نے اپنی طبعی جولانی سے اپنے قصائد میں مٹھاس اور شیرینی پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں متعدد مقامات پر طنطنے اور شکوہ کے عناصر کی عدم موجودگی قاری کو کھلتی نہیں ہے۔

حسرت نے قصائد میں تشبیب و گریز کی پابندی کو باقاعدگی سے قبول کیا۔

حسرت کی بعض تشابیب غزلیہ رنگ میں رنگی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے تسلسل مضمون کی بجائے ریزہ کاری کو اپنا مطمع نظر قرار دے کر تشابیب لکھی ہیں۔ لیکن اس ریزہ کاری کے باوجود ان کی ہر تشبیب ایک نوع کا مجموعی تاثر رکھتی ہے۔ ان کی تشابیب کے اشعار تسبیح کے دانوں کے مانند ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے لگتے ہیں۔ اپنی بعض تشبیبوں میں حسرت نے تسلسل مضمون کی خوبی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ حسرت نے زیادہ تر کیفیاتی تشابیب لکھی ہیں۔ رسمی، کھوکھلی اور بے جان تشبیبوں سے ان کا سروکار نہیں ہے۔ ان کی تشابیب میں ایسی سطحیت اور رنگینی بھی نہیں ہے کہ جس سے اندازہ ہو کہ کوئی معمولی سطح کا غزل گو قصیدے کے میدان میں آنکلا ہے۔ حسرت گہری معنویتوں کی حامل تشابیب سے علاقہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک تشبیب میں موازنہ اور تقابل کو لازمہ قرار دے کر خامہ فرسائی کی ہے

ان دو چیزوں میں سے ایک انہیں مفید نظر آتی ہے اور ایک نقصان دہ۔ اس میں انہوں نے اپنے تجربے اور دلائل کی مدد سے اتنے پختہ انداز سے اپنے دعوے پیش کیے ہیں کہ ان کی ہر بات صداقت کا پرتو نظر آتی ہے

؎ دو چیز دشمنِ جاں ہیں دو راحتِ دلِ زار + عطا و لطفِ رقیباں جفا و رنجشِ یار

دو شے کا لطف نہایت دو شے بہت بے لطف + طلب کے ساتھ قناعت طمع کے ساتھ انکار

دو چیز آکے نہ جاویں وہ چیز جاکے نہ آئیں + بلائے خرفت و پیری جوانی اور بہار

دو کار باعثِ حرمت دو آبرو کا خلل + گدا سے عجز اور احساں پدر سے ننگ اور عار

جعفر علی حسرتؔ نے افسانوی تشابیب کا اہتمام بھی کیا ہے۔ مثال کے طور ان کے کافیہ قصیدہ کی تشبیب دیکھئے

؎ فکر میں رات پلک سے لگی میری پلک + کہ کوئی ایسا مصور بھی یہاں زیرِ فلک

کھینچ دیوے جو مرقع مجھے اس شکل کا وہ + جس کو دکھلاؤں رہے صورتِ تصویر بھچک

اس کے بعد حسرتؔ بیان کرتے ہیں کہ ان کی تمنا ہے وہ مصور ایک ایسا شہر آراستہ کرے جس کی مٹی آسمان کی آنکھ کا سرمہ بن جائے اور اس کے فرش پر ایک ایسی مرصع کرسی رکھے جس کی روشنی کی جھلک عرش تک پہنچے، اور اس کرسی پر ایک ایسا جوان بیٹھا ہو کہ زمانے میں ازل سے لے کر ابد تک خلق نہ ہوا ہو۔ اس کے ارد گرد قرینے سے منصب دار کھڑے ہوں اور ان میں سے کسی کو بھی اپنی جگہ سے آگے بڑھنے کی تاب نہ ہو۔ وہاں اک طرف ارباب نشاط حاضر ہوں اور دوسری طرف سب پری جیسے چہرے رکھنے والیاں شراب پی کر بہک چلی ہوں کوئی ان میں گا رہی ہو، کوئی ناچ رہی ہو، کوئی مجرے کو کھڑی ہو۔ کوئی تال دے رہی ہو اور کوئی ڈھولک بجا رہی ہو۔ کسی کے پاؤں سے گھنگھروؤں کی آواز آ رہی ہو اور کسی کے ہاتھ سے مردنگ کی گمک نکلے، کوئی گت لینے کے لئے ٹھوکر لگا رہی ہو جس سے صدمۂ محشر آگے سرک رہا ہو۔ کبھی وہ ہاتھ میں جام و سبو لے کر شراب نوش کرے اور کبھی نشے میں صراحی کو پتھر سے ٹکرا دے اور

ہاتھ گردن میں کبھی ڈالے کمر میں گاہے + کبھی اٹھ جائے خفا ہو کے وہیں ہاتھ جھٹک

جب وہ آئے کہیے دل دیکھ کے یا روح تعال + جب وہ جاوے کبھی جی جاوے ہے اللہ معک

اس قصیدے میں گریز کی لطافت دکھانے سے قبل شاعر کہتا ہے میری ساری رات اسی فکر میں کٹی۔ عقل نے مجھ سے کہا اے دانا آدمی تو کس فکر میں ہے تو جیسے مکان، چمن، بزم، سریر، شخص، امیر اور سپاہ کا متقاضی ہے

؎ تو کوئی صورت نہیں دنیا میں جو ہو وے ممکن + اور جو ہو وے بھی تو ہے ایک جگہ زیرِ فلک

نام اس قطعۂ فردوس کا ہے فیض آباد + رشکِ گلزارِ ارم ہے وہ بلاشبہ و شک

غیرِ نقاشِ ازل کیونکہ کھینچے اس کی شبیہ + جس صاحب کا ادب کرتے ہیں سب حور و ملک

یعنی نواب سلیمان فر و کیواں رتبہ + جس کا ثانی ہے نہ ہو نہ ہوا آج تلک

قصیدے کے مدحیہ حصے میں حسرتؔ روائتی خیالات و موضوعات ہی کو جگہ دیتے ہیں۔ البتہ مذہبی قصائد میں ان کے دلی خلوص اور جذبۂ ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر مذہبی ممدوحین کی تعریف میں ان کے ذیل کے اشعار دیکھئے۔

؎ ذات وہ ذات ہے تیری کہ فرشتے کی نہیں + لیس طہارت کو ملک آب کرے جس سے وضو
قوم اپنی کا تو اوتار ہے کہتا ہیں تجھے + پر مسلمان ہے گر پاس نہیں ہیں ہندو
ممدوح کے غیظ کا ذکرہ قاف تا قاف پڑے شور کہ چل نکلا پہاڑ + پر ہوا سے لبِ سبک رو ہے نہیں جس کی دھمک ۔

حسرت ان شاعروں کے خلاف ہیں جو سیم و زر اور مال و دولت کی طلب میں قصائد لکھتے ہیں

؎ ہیں تو مداح تمہارا ہیں مری آنکھوں پہ + ہیں سوا سنگ و گہر دام و درم چاروں ایک
ایسے شعرا کو تو نسبت نہیں مجھ سے حاشا + بہر زر کرتے ہیں اشیا جو ہم چاروں ایک

حسرت کے قصائد میں تعلّی اور تفاخر کے مضامین بھی بندھے ہیں۔ انہوں نے اپنے معاصر شعرا کی زبان دانی پر تنقید بھی کی ہے۔ ان کی ذیل کی تشبیب ملاحظہ ہو اس میں ندرت، نزاکتِ خیال اور اندازِ بیان کی متانت نمایاں ہے۔ بعض نادر ترکیبوں کا استعمال بھی دیدنی ہے

؎ ہوش جس کا ہو نہ کی عقلِ رسا طبعِ سلیم + سمجھے بن بولے نہ ہرگز رکھے گو نطقِ سلیم
دادِ حق گرچہ ہے شیریں سخنی معنی سخن + فن ولے شعر کا آتا ہی نہیں بے تعلیم
علم کتنے ہیں کہ اس فن کے لئے ہیں لازم ہیں + ورنہ بے علم کا احوال ہے مانندِ سقیم
لغزشیں لاکھ جگہ پائے زبان شاعر کی + جب تلک صحتِ الفاظ سے ہووے نہ علیم
شعر جب ان کا پڑھا جاوے تو مانیں وہ سند + گفتگو اپنی نہ وہ سمجھیں کہ وہ کتنی ہے سقیم
لفظ نکلے نہ مزاج ان سے کبھی غیر مجاز + زے کا مخرج ہو جہاں بولیں وہ اُس جا پہ جیم
صبح کو بولیں صبح عقل ہے حیران اس جا + نورِ عرفان کے ایجاد کو سمجھے نہ ذمیم
چار در چار کہیں بحر جو وہ سن پاویں + لفظ ثابت جو نہ بیٹھے کریں اس کی ترمیم
جانے کیا عیب قوافی کے وہ ایطا الفا + غنیم کا قافیہ پوچھو تو وہ بتلاویں میم

حسرت نے اپنی تعلّی میں یہ شعر لکھا ہے

؎ حرف احمق کا کہاں اور تری بات کہاں + آبِ زمزم ہے ترا شعر وہ ہے نارِ جحیم

مذکورہ تنقید سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت نے ایک ماہر لسانیات اور استادِ عروض و قوافی کے مانند اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سے ان کے فنونِ شعری سے شغف کا سراغ بھی ملتا ہے۔ اپنے قصائد میں حسرت نے زبان و بیان پر اپنے عبور کو ظاہر کرنے کے لئے غزل مصرعے بھی کہے ہیں۔ حسرت کے قصائد اپنے عہد کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔ ان سے ان کے موسیقی، رقص، شاعری اور مصوری کے ذوق کی خبر بھی ملتی ہے۔ ہندو مسلم تفاوت کے معاملات ہوں کہ اپنے مخصوص مذہبی عقائد کا اظہار، اپنے عہد کی عیش و نشاط ہو، دلی زندگی کی رنگا رنگ عکاسی ہو کہ معاصر شاعرانہ منظرنامے پر کھلی تنقید حسرت کا قلم یکساں روانی سے چلتا ہے۔ مذکورہ معروضات کی روشنی میں ہم انہیں عمدہ قصیدہ نگار تو کہہ سکتے ہیں لیکن سودا کا ہم پلہ قرار نہیں دے سکتے۔

بقاء اللہ بقا

بقاء اللہ بقا م ۱۷۹۱ء کے بارے میں مصحفی کا خیال تھا کہ وہ قصیدے میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے بہت زیادہ تلاش اور بلند پایہ انداز سے کہتے تھے۔[1] دستور الفصاحت میں درج ہے کہ وہ قصیدہ نگاری کے معاملے میں سودا کے مد مقابل بھی تھے اور ان کا جواب بھی۔[2] یکتا نے ان کے معنی یاب کے ہنر اور اچھوتی تشبیہوں کے استعمال کو سراہا ہے۔ مبتلا کاظم نے بھی ان کی قصیدہ نگاری کا ذکر کیا ہے۔[3] بقا کے میر حسن سے گہرے مراسم تھے۔ انہوں نے ان کا نام بقاء اللہ لکھا ہے۔[4] یادگار شعرا، گلشن بے خار، گلشن ہند اور طبقات الشعرا وغیرہ میں ان کا نام درست نہیں لکھا گیا۔ بقا[5] کے دیوان کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کا مملوکہ ہے اسے دلی یونیورسٹی نے شائع بھی کر دیا ہے۔

بقاء اللہ بقا کے قصائد اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان میں اردو کے عظیم قصیدہ نگار سودا کے مقابلے کی نیت منعکس ہے۔ انہوں نے ایک ہجو میں اپنے "دو حریفوں" میر و سودا پر چوٹیں کی ہیں اور یہ لکھا ہے

عیب ہے گرچہ کثرتِ یک لفظ + سخن فارسی سے تا ہندی
پر جدا ہے تمام عالم سے + وضعِ سودا و طرزِ میر تقی
یعنی والفظ تو ہے پر کس شو + ہیں ہے یاں پر کلام کی بھرتی
کھول دیوان دونوں صاحب کے + ہم نے جس دم بقا زیارت کی
شر سودا و میر کے دیکھے + و ہے تو تو تو کریں ہیں یہ ہی ہی

ہجو کہنا تو آسان ہے لیکن خود اپنی قادر الکلامی کا مظاہرہ فنی ریاضت و مہارت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بقا کے قصائد میں تخیل اور زورِ بیاں کی وہ کیفیت موجود نہیں ہے جس کے نتیجے میں ایک عمدہ قصیدہ جنم لیتا ہے۔ سودا کے جواب میں انہوں نے جو قصیدہ لکھا ہے۔ اسمیں صنائع بدائع کا استعمال تو ہے تاہم تخیل کی وہ صورت موجود نہیں ہے جس کی مدد سے محسوس ہونے والے منظروں کی تجسیم ہو سکے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں

جب مری چشم گش نیند سے کل رات جھپک + جاگ اٹھے طالع خوابیدہ لگاتے ہی پلک
خواب میں آئی نظر مجھ کو وہ غیرت دہ حور + حور بھی دیکھ کے شاید جسے رہ جائے ٹھٹھک
زیب تن تھا نہ فقط اس کو لباسِ تن زیب + سر سے تھی وہ زر و زیور میں چھپی پاؤں تلک
عضو عضو اس کا ہر اک خوبی درعشاق میں + ایک سے ایک زیادہ تھا جو کی غور ٹک
مانگ وہ جادۂ ظلمت کہ سکندر جس میں + جا کے یک چندرہا نور کی صورت کو لٹک
سن تو کالے کا ہیں دم میں دیا سا بجھ جائے + دیکھے عارض پہ جو اس طرۂ شب گیں کی لٹک
جا چھپا زیرِ زمیں عہد میں اس کاکل کے + چھوڑ کالے کا برن خوف سے راجا باسک

---

[1] تذکرہ ہندی گویاں ص ۳۳م [2] دستور الفصاحت از احمد علی یکتا، مرتبہ امتیاز علی عرشی ص ۸۰ رامپور ۱۹۴۳ء [3] گلشن سخن ص ۳۱م [4] تذکرہ شعرائے ہندی ص ۷۶
[5] دیوان بقا مرتبہ خواجہ احمد فاروقی قصائد ص ۱۸۱ تا ۱۹۸ مطبوعہ دلی یونیورسٹی دلی ۱۹۷۷ء

بقا کے قصائد کی تشابیب افسانوی نوعیت کی ہیں۔ مذکورہ بالا قصیدہ کی تشبیب میں انہوں نے افسانوی انداز میں ایک حور کی سراپا نگاری کی ہے۔ یہ سراپا نگاری پرتاثیر نہیں ہے۔ سودا کے اسی زمین میں لکھے گئے قصیدے میں سراپا نادر تشبیہوں اور استعاروں میں بیان ہوا ہے۔ بقا تخیل کی بلندی اور کلام کی ندرت اور پختگی کے اعتبار سے سودا کے مقابلے میں کمتر درجے کے شاعر ہیں۔ بقا کی تشبیہوں اور استعاروں میں غرابت کا احساس ہوتا ہے۔ دور از کار خیالات بھی ان کے کلام کا حصہ ہیں۔ البتہ ان کے ذیل کے مطلع والے قصیدہ میں تشبیہات و استعارات سہل انداز کے ہیں اس میں بھی افسانوی تشبیب نظر آتی ہے

؎ کل حضرت بقا سے کہا میں نے یہ سوال + کہیے کچھ ایسے شعر کہ ہو وے وہ عجب حال

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں

؎ بولے جواب میں کہ یہ منظور ہے تو کر + آراستہ ہمارے لیے خلوت خیال
جز خادمان فکر سخن اپنے پاس تک + ساقی کو بھی نہ ہووے گزر کی واں مجال
لیکن وہ ہو جگہ جو در دل کو کھولیے + آجائے واں بتوں کا نظر گلشن جمال
کی عرض میں نے قبلہ یہ مشہور مثل ہے + راجہ کے گھر میں بھی ہے کہیں موتیوں کا کال
حاضر ہے مختصر سا مرے دل کا یہ مقام + یہ ہے زیادہ اس سے جو کی تم نے قیل و قال
بولے یہ مسکرا کے کہ سب مشکلیں ہیں سہل + لیکن شکست خاطر احباب ہے محال

بقا کے ایک اور قصیدے میں زور کلام کی خوبی دیکھی جا سکتی ہے یہ قصیدہ مختصر ہے اور خطابیہ بھی۔ قصیدہ گو شاعر کی حقیقی شاعرانہ صلاحیت تمہیدیہ قصائد ہی میں ظاہر ہوتی ہے اس قصیدہ کا مطلع ہے

؎ مئے معانی سے کر اب جام سخن کو سرشار + دل میں ہے تو ڑ دیئے چھپائے خوشی کا خمار

بقا کے موجود قصائد سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ فارسی زبان اور مسلم تہذیبی عناصر سے مملو شاعری کرتے ہیں وہاں ہندی الفاظ و تلمیحات کا استعمال بھی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ راجہ، موتی، کال، کالے کا برن، راجا بامک وغیرہ کے الفاظ ہندی کی جانب ان کی رغبت کے غماز ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ بقا کی افسانوی تشابیب میں قاری کو گرفت میں لینے کی کوشش نہیں ہے۔ ان میں وہ دلچسپی نہیں ہے کہ ذہن ان کی طرف مائل ہو سکے

غلام حسین ہدایت، افسق

غلام حسین ہدایت یا افسق [۱۸۵۰ء کے بعد حیدرآباد میں تھے] کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں

"ہدایت اللہ خاں شمالی ہند کے باشندہ تھے پہلے امیر بیگ کے ملازم ہوئے پھر شمس الامراء کی سرپرستی حاصل کرلی۔ قصائد اور ہجو دونوں لکھا کرتے تھے۔ قصائد میں ہدایت اور ہجو میں افسق تخلص کیا کرتے تھے"⑴ نصیرالدین ہاشمی نے مذکورہ شاعر کا نام غلط بتایا ہے۔ ان کا اصل نام غلام حسین تھا اور تخلص ہدایت اور افسق⑵ ہدایت کے قصیدے اور ہجویہ قصیدے تاریخی، سماجی اور ماحولیاتی مرقع نگاری کے اعتبار سے بڑے اہم ہیں۔ ان میں انہوں نے معاصر تہذیبی اور ثقافتی اقدار و عناصر پر خصوصی توجہ دی ہے۔ محی الدین قادری زور نے اردو مخطوطات⑶ میں ان کی ہجویہ اور مدحیہ شاعری کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے قصیدہ گوہر شنا، جواہر سخن، گوہر سخن تنزل آفاق، بحرِ سخن اور گلشنِ بہار کے طویل اقتباسات بھی بہم کیے ہیں۔ زور صاحب نے افسق کے قصیدہ زلزلۂ فلک اور ہجوِ آخرج کی تفصیل بھی دی ہے۔ ہدایت کا ایک مخطوطہ دلوانچہ کے نام سے بھی دستیاب ہے⑷ اس میں ان کے دو قصیدے صدماتِ زمانہ اور قصیدہ تنزلِ آفات موجود ہیں۔ ہدایت نے ایک قصیدہ شاہی حکیم کی ہجو میں بھی لکھا ہے⑸

ہدایت کا قصیدہ گوہر شنا سودا کے مشہور رثائیہ قصیدے کا جواب ہے۔ اس کے آغاز میں شاعر نے فارسی میں اس قصیدے کی نوعیت واضح کی ہے وہ لکھتے ہیں "یا علی مدد قصیدہ گوہر شنا در شکریہ باحمد رب العالمین و حالات رو داد و وصفِ محسن دوستاں، مشفق مخلصاں دلوم مورت، کرم صورت، پرت پال خورشید مثال رائے دولہا سنگھ و رائے بالاجی دام اقبالہ و ذکر توصیف نواب مستطاب نواب شمس الدولہ مدظلہ بیازدہ مطلع در جوابِ قصیدہ سودا" ہر مطلع کے آغاز سے قبل شاعر نے اس کے مابعد کے موضوع کی وضاحت کردی ہے۔ مطلع اول کے بعد حمدیہ موضوع بیان ہوا ہے۔ مطلع دوم کے تابع اشعار میں شاعر نے اپنے حالات بیان کیے ہیں۔ مطلع سوم کے بعد لکھے جانے والے اشعار میں مرزا اللہ یار بیگ کی تعریف کی گئی ہے (اس ممدوح کی بدولت وہ امیر بیگ خاں شجاعت جنگ کے ہاں ملازم ہوئے)۔ مطلع چہارم کی ذیل میں آنے والے اشعار میں شجاعت جنگ کی عادات کا تذکرہ ہے اور ان اسباب کا بھی جن کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ پانچویں مطلع کے تحت ہدایت نے اپنی شاعری اور ہجو گوئی کی تعلی کی ہے۔ مطلع ششم کے بعد امان اللہ رکی خدمات کی ہجو ہے اسمیں فحش گوئی بھی ہے ساتواں مطلع گریز کا ہے اس کے تابع اشعار میں جنگ اور دولہ وغیرہ کے خطابات رکھنے والے بعض امرا کی ہجو لکھی گئی ہے۔ آٹھویں مطلع کے ذیل میں آنے والے شعروں میں اعظم الامرا ارسطو جاہ کی ہجو ہے۔ ہدایت نے ارسطو جاہ کو بارہویں صدی ہجری کا سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ نویں مطلع کے بعد نواب شمس الملک بہادر کی تعریف ہے۔ دسویں مطلع کے تحت لکھے گئے اشعار میں دولہا سنگھ اور رائے بالاجی کی مدح کی گئی ہے بارہویں مطلع کے بعد قصیدہ کے اختتامی اشعار ہیں۔ اس قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

⑴ دکن میں اردو ص ۴۳۳ - ۴۳۱ ⑵ دیکھئے شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ص ۱۶۵ - ۱۶۱ ⑶ اردو مخطوطات ص ۱۲۲
⑷ ایضاً ص ۳۸ ⑸ ایضاً ص ۱۲۶

آغاز ؎ ہزار شکر بہ درگاہِ پاک یزدانی + ہے جس کے فضل سے سب مشکلوں کی آسانی

[اشعار بحوالہ امیر بیگ شجاعت جنگ] امیر صاحب نوبت بعزّ و دولت و جاہ + بشانِ شوکتِ دولت بقومِ تورانی

نگارِ رزم شجاعت سے وہ شجاعت جنگ + سوائے برق سے خالی زکینہ لاثانی

غرور و عجب سے ظاہر میں نفت ہی باطن + بروں زفسق دگر یزداں زفحش شیطانی

چوتھا مطلع ؎ جو سانچ پوچھو تو یہ بات ہے گی حقانی + کہ وہ امیر ہے اس وقت میں جی لاثانی

پانچواں مطلع اور مطلع بعد کرو ہی ہجو کے لکھنے میں گر قلم رانی + تو چومے ہاتھ قرے آ کے روحِ شاہ زمانی

فلک پہ پھینکے وہ اپنی کلاہِ فخر مدام + جسے میں بخشوں جہان ثنا کی سلطانی

ہے بعد حضرت سودا دکن میں میرا نام + ہوں اپنے فن کا میں استادِ وقتِ لاثانی

آٹھویں مطلع کے بعد کا شعر ؎ نہ کیونکہ ملکِ دکن ہوئے خراب اور ویراں + مشیرِ ملکِ شقاوت کو جب ہو دیوانی

دیکھیے نویں مطلع کے بعد کا دوسرا شعر ؎ سو یعنی ملکِ سخاوت کا مہر شمس الملک + خدا سے جس کو شجاعت کی ہے جہانبانی

امیر ابن امیر و شہ جہانِ کرم + کریم خلق و رحیم الستیر بر حمانی

اختتامی اشعار درازِ عمر بہ دولت دونوں کو رکھو یارب + بصد ہزار مسرت بہ قربِ سلطانی

بقائے دیر تک ان کے محب رہیں شاداں + عدوئے ظالم دوراں انوں کے ہوں فانی

ہدایت کے مذکورہ قصیدے سے امرا کے مابین کشمکش اور چپقلشوں کا سراغ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اس تہذیبی زوال کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ جس میں مسائلِ شکم کو بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ ایک امیر کی ملازمت ترک کر کے دوسرے امیر کی نوکری کرنے کے بعد بعض شعرا تمام تر اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے سابقہ آقا کے بارے میں مبتذل زبان کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ارسطو جاہ کی ہجو اس امر کی یاد دہانی کراتی ہے کہ بڑی تعداد میں دکنی شعرا نے اس کی تعریف میں مدحیہ قصیدے بھی لکھے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب افراتفری اپنے عروج پر تھی۔ ہر شخص خود غرضی کا اسیر تھا۔ چنانچہ جہاں اسے پناہ ملتی وہ اسی کے گن گاتا۔ شاعر بھی اس سلسلے سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ جس نواب کی ملازمت کرتے تھے یا جس امیر یا وزیر کی مصاحبت میں رہتے تھے اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جاننا ان کا فریضہ بنتا تھا۔ یہی نہیں اگر وہ کسی امیر سے دکھی ہوتے یا کسی نواب سے علیحدہ ہوتے تو بھی اس کے خلاف ہجویہ اشعار لکھتے۔

قصیدہ جواہرِ سخن کا ممدوح نظام علی خاں آصف جاہ ثانی ہے۔ یہ ۱۳۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ہدایت نے شجاعت، تیغ، زور، سخاوت، کمیت نالکی، عشرت محل، دانش، ضبط و نسق، عدل، لباس، جواہر، رعبِ سلطنت، دولت اور فیل وغیرہ کے موضوعات اور سرخیوں کے تحت عمدہ اشعار لکھے ہیں۔ جواہرِ سخن کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

رہے دل میں جب تک کہ قرّتِ جاں رہے + اور تر دہن میں فضلِ خدا سے زباں رہے

طغیانِ بحرِ موج مضامیں کے جوش سے + مثلِ صدف سخن کا دہن دُرفشاں رہے

اس قصیدے میں خانِ زماں مرحوم پر آصف جاہ کی سخاوت کو ترجیح دینے کے ساتھ ساتھ شمس الملک شمس الامرا
کی مدح بھی کی گئی ہے اس کے اختتام کے اشعار درج ذیل ہیں

ع یعنی وہ تختِ ہند کا آصف نظام ملک + ہر دم ہمیشہ عیش سے نت شادماں رہے

یا رب ترے طفیل عنایات فضل کے + ایسا ظہور اس کے کرم کا عیاں رہے

جو صلے میں مدح کے ہدایت کے حال پر + چشمِ نگاہِ فیض بہت بے گراں رہے

اس قصیدہ کے مدحیہ حصے کے چند اشعار حسب ذیل ہیں

ایسا بلند جس کا وہ عشرت محل ہے خاص + اطلس سے آسمان کے جیسے سائباں رہے

کیجے سوادِ صحن کا اوس کے بیاں اگر + مشتاق اس کو دیکھنے باغ جناں رہے

قامت سا گل رخوں کے برابر جس کا سرو سبز + فیضِ نسیم صبح سے جلوہ کناں رہے

آب و ہوا کہ جس کی تفریح کے خرچ سے + ہر غنچہ دل کا گل سا شگفتہ وہاں رہے

قالین کے جس کے فرش کا گلزار دیکھ کر + نرگس کی چشم وا بسوئے آسماں رہے

احمر، بنفشہ، سوسن و سنبل چمن چمن + زیبِ روش سے فرش کے گلشن نشاں رہے

بارِ ثمر کو مجرے کے خم سیو دے ہر نہال + رونق فزا جب اس میوہ شاہِ جہاں رہے

رقاصان بمثلِ حور کے ہر اہل رقص وال + طاؤس سایہ زیب مسرت کناں رہے

ان اشعار میں آصف جاہ ثانی کے محل عشرت محل کا عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے اس کے باغ کے پھولوں کا تذکرہ
تو خیر ہے ہی فرش پر بچھے گل و گلزار قالین کی تعریف کے ساتھ ساتھ اہل رقص کا ذکر بھی ملتا ہے ایس
کے علاوہ مجرے کے لیے شاخوں کا جھکنا بھی مخصوص تہذیبی مزاج کا عکاس ہے۔ بادشاہی درباروں
میں کورنش، آداب، تسلیمات کے ساتھ ساتھ مجرے کی رسم بھی مستحکم تھی۔ مجرے کے ایک معانی بادشاہوں کو
امراء کے سلام کے بھی ہیں۔ درباروں میں مجرائی بھی ہوا کرتے تھے جو محض سلام کرنے کی تنخواہ پاتے تھے[1]

ہدایت کے قصیدہ گوہر سخن کی ردیف "کر" اور قافیہ "جاں" ہے۔ یہ ٨١ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نواب
شمس الملک بہادر کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہے۔ اس کی تشبیب بہاریہ ہے آغاز کے دو اشعار ملاحظہ ہوں

ع اس تخمِ فکرِ دل سے اگر گل زباں کرے + مضمون کی زمین وہاں گلستاں کرے

فیضِ نسیمِ طبع سے ہر غنچۂ سخن + ایسی بہارِ نطق سے وا گل بیاں کرے

اس قصیدہ کے مدحیہ جزو میں ممدوح موصوف کی شجاعت، تیغ، تیر کماں، قوت اور سخاوت کا بیان ہے۔
گریز کے اشعار کا نثری مفہوم یہ ہے کہ جب چمن میں ایسا جشن ہے (یعنی بہار عروج پر ہے) تو پھر اس امیر ابن امیر
کی مدح کیوں نہیں کرتا جس کا کوئی سہنا نہیں ہے اور کوئی اگر اس کے سہنا کی تلاش میں عرب اور عجم بھی جائے تو

---

[1] نسیم اللغات ص ٨٦٩

اسے پھر ہندوستان آنا پڑے اور ہند میں اگر بالاتفاق تلاش کرنے والے کو مرزا رفیع سودا کی خواب گاہ مل جائے اور اس قصیدے کے کچھ مضمون وہاں سنائے جائیں تو مرزا رفیع سودا خوابِ سکوت سے اپنی زبان بیدار کر کے اس کی تعریف کریں گے اور اس قصیدے کا جواب نہ پا کر دل و جاں سے ترکِ سخن کر بیٹھیں گے۔ قصیدے کا اختتام ان اشعار پر ہے

دولت کا اس کے مہرِ درخشاں رکھے مدام + دل دوستوں کا اس کے خدا شادماں کرے
اور اس کی بارگاہ کے بدخواہ کا روسیہ + نت خالق دو کون بہ کون و مکاں کرے

ہدایت کے قصیدہ تزلزل آفاق کے بھی کئی مطالع ہیں یہ مشیر الملک ارسطو جاہ اور ان کے مشیروں رام راؤ اور روشن راؤ وغیرہ کی ہجو میں ہے۔ یہ رائیہ قصیدہ ہے

کروں کیا مشرب و مذہب کا ذکر اب اوس کے + نہ شیعہ اور نہ سنی نہ نطفۂ الکفیر
نہ شیخ سید و مرزا نہ قوم افغاں میں + جو لاعذات کا مومن بنا، وہ ہے شریر
حریف اپنے ہے محسن کا آشنا کش وہ + غریب اور حرامی دراصل جیوں عصفیر

ہدایت کا ایک ۱۵م اشعار کا ہجویہ قصیدہ کسی شاہی حکیم کی ہجو میں دستیاب ہے۔

قصیدہ بحر مثمن ۵۸ اشعار پر مشتمل ہے اس میں ہدایت نے موسٰی ندی کی اس طغیانی کے حالات لکھے ہیں جو ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۹ء میں حیدر آباد شہر کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ اس کے آغاز اور اختتام کے اشعار ملاحظہ ہوں

آغاز ۔ گوش دل سے سنو اے اہلِ شعور + تازہ جیدر نگر کا اک مذکور

انجام ۔ سببِ حسنِ نیت اس شہ کے + ہیوں بلیات یہ جہاں سے دور
سن کے یہ بات اے ہدایت تب + دل کو حاصل ہوا ہے سرور

ہدایت کے قصیدہ گلشن بہار میں نواب تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا کے فرزند کی بسم اللہ کا ذکر ہے پہلا اشعار کا یہ مطلع ثانی ہے ۔ فصلِ خوشی کی آج مچی ہے بہار کے + گلشن میں ان کی عیش کی ہر سو لگار ہے

ہدایت کا قصیدہ ہجو آخر ج شیعہ سنی تضاد کے حوالے سے رقم ہوا ہے اور قصیدہ زلزلہ فلک ارسطو جاہ کی ہجو ہے اول الذکر کا آغاز دیکھئے ۔ ہے یہ سوال ذرا تجھ سے چرخ نافرجام + خلل یہ کیسا ہے تجھ سے بدین خاص و عام
دو فرقے خلقت حق سے جو ہیں گے آدم سے + سو یعنی اہلِ کنشت اور صحابِ اسلام

یہ ہجویہ قصیدہ سودا کے مولوی ساجد کی ہجو میں لکھے گئے اشعار کی تقلید میں ہے۔ موخر الذکر قصیدہ ہجویہ کا آغاز یہ ہے

بارشِ جورِ فلک دیکھنے دو زلزلے + جوشِ موجِ غم سے کیوں نہ بحرِ دل اب کھل بلے
خشک ہو جب قحط سے آلِ محمد کا دریا گوش + ماہی بے آب سا نب کیوں نہ ہر اک تلملے

دیوانچہ کے نام سے ہدایت کا دستیاب ہونے والا مخطوطہ[1] ایک مثنوی کے علاوہ دو قصائد کو بھی اپنے

---

(۱) اردو مخطوطات ص ۱۳۸

دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلا قصیدہ صدمات زمانہ ہے جس میں آصف جاہ ثانی کے جشن سالگرہ پر دربار میں ہونے والے ایک قتل کے واقعے کی تفصیلی نقشہ کشی ہے اسکا آغاز یوں ہوا ہے

کروں ہوں صفحۂ کاغذ پہ لے قلم مسطور + سنو زمانے کے صدمات کا بیان ذکور

اٹھا یا پل میں بلا ایسی جشن کے صد حیف + ہوئے نمود علامات روز نفخ نشور

دوسرا قصیدہ ارسطو جاہ کی تفصیلی ہجو پر مشتمل ہے یہ ذوالمطلعین ہے اور ۱۲۰ اشعار کا حامل ہے یوں شروع ہوتا ہے

زاہد نے عمر زہد میں اپنی تمام کی + چھوٹی نہ فکر شیخ سے اکل دوام کی

عالم نے فارسی کی کتابیں پڑھا تو کیا + حرص و ہوا کی ترک نہ اپنی تمام کی

ہدایت یار افسق کے اشعار میں فرعونیت، عجب و نخوت، سختی گردوں، سفارش وغیرہ کے خلاف متعدد اشعار ملتے ہیں۔ کمینوں اور سفلوں کے صاحب زر ہو جانے کا انہیں بڑا افسوس ہے۔ زر پر غرور کرنے والوں کو وہ انسانوں کی صف میں شامل نہیں سمجھتے۔ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی انہیں اس نوع کے ماحول میں غنیمت نظر آتے ہیں۔ وہ انہیں شریف، شجاع، کریم، خلیق اور نیک صفات نظر آتے ہیں۔ وہ ان کے لئے سپہر رتبہ، انجم جاہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح شمس الامرا کی تعریف میں وہ کہتے ہیں کہ وہ عالم تاب آفتاب کے مانند ہیں۔

قیام الدین قائم

قیام الدین قائم چاندپوری م $\frac{1795}{1796}$ کے قصائد پختگی اور زورِ بیان کی خوبیوں سے مزین ہیں۔ انہوں نے صنفِ قصیدہ کو اس کے تمام تر فنی تقاضوں سمیت استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نگاروں اور فن شناسوں نے انہیں اپنے بعض معاصر قصیدہ نگاروں پر فوقیت دی ہے۔ قصیدہ کی مزاجی شان و شوکت اور لسانی و مواداتی آرائش و بناوٹ کے اعتبار سے ان کے قصائد اپنے معاصرین کے قصائد سے کمتر درجے کے نہیں ہیں ان کی تشابیب کا موضوعاتی تنوع، گریز کی نزاکتیں، مدح کی گھن گرج اور شان و شوکت اور دعائیہ اور طلبیہ لہجے کا وقار انہیں کئی دوسرے قصیدہ نگاروں سے ممیز ٹھہراتا ہے۔ مذہبی اور غیر مذہبی مدح کے میدانوں میں ان کا رخشِ قلم اپنی رنگا رنگ جولانیاں دکھاتا ہے۔ قائم کے بارے میں مصحفی کا کہنا ہے کہ وہ قصیدہ اور مثنوی میں زمانے کے رواج کے برخلاف چلے۔ کلام کی پختگی، غزل کے مصرعوں کی چستی میں بھی بعض مقامات پر اپنے استاد (میر درد) پر غلبہ رکھتے تھے[1]۔ شیفتہ نے لکھا ہے کہ قائم شاعری میں دل پسند دستگاہ کے حامل تھے۔ اگرچہ ان کا مرتبہ سودا کے برابر نہ تھا تاہم اصنافِ شاعری پر ان کا عبور اور احاطہ تھا[2]۔ صاحبِ دستور الفصاحت کا خیال ہے کہ ان کے ہاں قصیدہ، غزل سے، غزل، رباعی سے اور رباعی ان کے کلیات میں موجود دیگر اقسام سے مختلف تھی۔ انہوں نے جس بھی صنف میں شاعری کی حد سے تجاوز نہیں کیا۔ اور اسے جیسا ہونا چاہیے اُسی پر نگاہ رکھی۔ اس لحاظ سے وہ ان استادوں سے ممیز ہیں کہ جو غزل کو ترقی دے کر قصیدہ بنا دیتے تھے اور قصیدہ اور فروتر کر کے غزل کے مرتبے پر لے آتے تھے[3]۔ مذکورہ تذکرہ نگاروں کے بیانات قائم کی شاعرانہ اہمیت کے اندازے کے لئے کافی ہیں۔ قائم خود بھی ایک اہم تذکرہ نگار ہیں ان کا تذکرہ مخزنِ نکات ان کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیت کا غماز ہے۔ کلیاتِ قائم [مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن] جلد دوم میں ۱۳ قصائد موجود ہیں[4] ایک نعتیہ ایک منقبتی اور گیارہ دنیاوی ممدوحین کی مدح میں ہیں۔ ان قصائد کے ممدوحین میں آصف الدولہ، سلیمان شکوہ، نعمت اللہ خاں دہلوی، مرزا رفیع سودا، نواب عنایت خاں، محمد یار خاں امیر اور نواب لطف اللہ شامل ہیں ان قصائد کے مطالع یوں ہیں:

ہے اس حدیقے میں جوں غنچہ اس کی زیست بہ کام + کہ تنگ آئے جو شیشے سے منتقل ہو بہ جام [۷۱ اشعار نعتیہ]

میں کیا کیا تھا تراے سپہرِ کج رفتار + کہ یاں تلک تو ہوا ہے درپئے آزار [۵۱ اشعار منقبت علی]

جنگ گردوں نہ ہوئی آج بھی اصلاح پذیر + ہاں کہ ہونا ہے کا نیزہ ہے کہ لوا آہ کا تیر [۵۹ اشعار مدح آصف الدولہ]

سحر کو پرورشِ گریہ پر تھی دل کی نگاہ + کہ ہے تھی موجِ نفس ہر قدم لبوں سے شناہ [۵۱ اشعار مدح سلیمان شکوہ]

صباح عید تھی از بس منوّر چرخِ عموم + زمیں کے ذروں نے حاصل کیا تھا نورِ نجوم [۴۲ اشعار در مدح میر بخشی]

تمام مائل بیداد تری تیغِ جفا ہے + جو زخم کھلا تن پہ سو وہ دستِ دعا ہے [۴۲ اشعار در مدح امیر الامرا]

کہو عدو سے خراب رہے وہ فارغ بال + کہ یاں نہیں ہے سرِ کینہ و دماغِ جدال [۴۹ اشعار در مدح نعمت اللہ خاں]

شبِ گزشتہ میں تھا کنجِ حزن میں گریاں + بہے پڑے تھے کئی موجِ اشک برطوفاں [۳۸ اشعار در مدح سودا]

---

(1) تذکرہ ہندی گویاں ص ۱۷۹ (2) گلشنِ بے خار ص ۲۵۰ (3) دستور الفصاحت ص ۱۵ (4) کلیاتِ قائم جلد دوم ص ۱ تا ۱۴۲

کیا ہے جب سے نزع معالف نے جگہ میں ظہور + ہے چار وانگ جہاں امن و عیش سے معمور [۴۲ اشعار در مدح نواب منایت خاں]

نت نزع امر پر رکھے ہے نظر + ہے اگر یاں تضاد و گر ہے قدر [۱۶ اشعار مدح نواب محمد یار خاں]

سنا ہے جب سے ناوک کا تیر بیم + تکے ہے منہ کو ارجن کے گو ابھیم [۲۰ اشعار ایضاً]

ہے نفخ اپنی جنبش سے زیر فلک محال + کھولے گرہ نجوم کی کب ناخن ہلال [۴۶ اشعار در مدح نیر جنگ]

ہے نگاہ دیدہ حق بیں پہ تیرگی غیاب + غیب میں جو راز تھا چشم ملائک سے نہاں [۲۷ اشعار مدح نواب لطف اللہ]

قائم کے ایک اور قصیدے کا مطلع ہے

قابل حمد ہے وہ مبدع فیاض و کریم + جس نے بخشا مجھے ذوق سخن و طبع سلیم

ان کے ایک اور نعتیہ قصیدہ کا مطلع ہے

اعتدال انفس گروں کی طبیعتیں نہیں + بس کہ ہے تغیر اس کو گہ خیال گاہے نہیں

ایک منقبتی قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے

جہاں میں ہے ستاکش کو اختیار + وزیر کا ہے یہ مداح وہ ثنائے شاہ

مذکورہ بالا مطالع یہ حقیقت منکشف کرتے ہیں کہ قائم کا مزاج صنف قصیدہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھا۔ اپنی مضمون آفرینی، نازک خیالی اور علو تخیل کے اعتبار سے وہ بڑے قصیدہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ شیفتہ ان لوگوں سے بیزار ہیں جو قائم کو سودا کے مقابل لا کھڑا کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ سودا کے شاگرد بھی رہے ہیں اور ان کی مدح میں ان کا ایک پرتاثیر قصیدہ بھی موجود ہے۔ قائم نے اپنے استاد سے اکتساب فیض کیا ہے اور اپنے بیشتر قصائد انہی کی تقلید میں آراستہ کیے ہیں۔ چنانچہ اگر وہ کسی مقام پر سودا کے سر چڑھ کر بول رہے ہوں تو اس میں خفگی کی کیا بات ہے۔ اسے حق شاگردانہ کی ادائیگی ہی کہنا چاہیے۔ بات سے بات پیدا کرنے اور نکتہ سے نکتہ نکالنے کے ہنر میں قائم سودا سے پیچھے نہیں ہیں۔ پیش پا افتادہ مضامین کو انداز بیان کی تبدیلی سے اشعار میں منتقل کرنا انہیں مرغوب تھا۔ یہ مضامین نئے ذائقوں سے آشنا ہو کر سامنے آتے تھے موسیقی، رقص، طب، مصوری، نجوم، حکمت، تصوف اور دیگر علوم و فنون کی علمی اصطلاحات ان کے قصائد میں وافر مقدار میں مستعمل ہیں۔ مشکل پسندی اور پیچیدگی کے حوالے سے وہ اپنے استاد ہی کے مانند ہیں۔ وہ بھی انہی کی طرح ان مقامات سے بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔ قائم کی ایک کمزوری ان کے قصائد کو ارتفاع نہیں رہنے دیتی۔ یہ کمزوری ان کی زبان سے متعلق ہے۔ بسا اوقات وہ قصائد میں ناہموار زبان بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے قصائد میں جوش و خروش کی کمی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ پرشوکت الفاظ اور بلند آہنگ تراکیب کی ترتیب و تلفیظ میں محتاط رویہ اختیار نہیں کر سکے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قائم نے اپنے قصائد میں توازن و تناسب کے شاعرانہ وصف کو کما حقہ استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔ قائم کے مصرعوں میں روانی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے قصائد کا قاری اٹک اٹک کر آگے بڑھتا ہے۔ کھردرے الفاظ کے استعمال سے ان کے قصائد کی تاثیر میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ان سے آمد و برجستگی کی تخلیق شاید اسی لیے نہیں ہو پاتی کہ پرشکوہ الفاظ ان پر حملہ آور رہتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الہی کا کہنا ہے

"اگر وہ اپنی غزل کی زبان میں قصیدے کہتے جیسا کہ بعض قصیدوں میں کہی ہیں

انہوں نے کیا ہے تو قصیدے کی ایک نئی طرز کے موجد ہوتے مگر سودا کے تتبع نے انہیں
کہیں کا نہ رکھا۔ سودا کی زبان اپنانے کے پیچھے وہ اپنی زبان بھی کھو بیٹھے" ①

اس بیان کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میر نے قصائد میں غزل کی زبان استعمال کر کے انفرادیت کی تحصیل تو کی تاہم اس میدان میں ان کا رنگ سخن مقبول نہیں ہو سکا۔ قائم چاندپوری کے قصائد کا بھی یہی حال ہوتا۔ سودا کے قصائد کے تتبع نے انہیں بھی مقتضائے قصیدہ شکوہ لفظی کا جوہر تو بخشا ہے۔ ڈاکٹر محمود الہی نے آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ قصیدے میں جوش و خروش صرف شوکت الفاظ ہی سے پیدا نہیں ہوتا۔ ترکیب و بندش کی چستی بھی ضروری ہے۔ خواہ یہ ترکیب و بندش غزل کے مروجہ الفاظ سے عبارت ہو۔ سودا کے قصیدہ شہر آشوب میں ان کے دوسرے قصائد کے مقابلے میں بھاری بھرکم الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں مگر ہر ترکیب میں پائندگی اور ہر بندش میں چستی ہے۔ ایک ایک لفظ کا استعمال برمحل ہے۔ قائم کے قصیدوں میں اس طرح کے اشعار بھی ملتے ہیں اور یہ اشعار سودا کے قصیدہ شہر آشوب کے اشعار سے کم رتبہ نہیں ②۔ قائم نے سودا کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے۔ اس کی روشنی میں خود قائم کی شاعری بھی پرکھی جا سکتی ہے۔ اس قصیدے میں انہوں نے سودا کو باغ شاعری کا عندلیب قرار دیا ہے انہیں وہ افصح الفصحا ٹھہراتے ہیں۔ قائم نے سودا کو پیمبر اہل سخن کہا ہے۔ ان کے شاعرانہ معجزات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ان کے ضمیر پر غیب کے خیالات منکشف ہوتے ہیں۔ سودا کے علو تخیل کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ان کی فکرت کے باغ کا آشیاں اس جگہ ہے جس جگہ سیمرغ وہم کا گماں نہیں پہنچ سکتا۔
قائم کے سودا کی مدح میں یہ اشعار دیکھئے

لسان حرف غلط صفحۂ زمانہ میں + ہیں تیرے عہد میں بے کار ظلمت و حیواں
مداد تیرہ سے لاتا ہے مژدۂ جاں بخش + قلم ترا کردہ ہے معجز آفرین زباں
ہزار حسن ہر اک بات کے ترے صدقے + ہزار لطف ترے ہر کلام کے قرباں
ہو خشک خار کی مانند سامنے تیرے + جو عندلیب کرے وام برگ گل سے زباں
وہ گل زمین ہے شاداب شعر کی تیرے + کہ پھول منہ سے جھڑیں ہیں اگر جب کروں میں بیاں
در بہشت کا کھلنا نظر ہیں اس کی ہو سہل + جو دیکھے کھول کے اک مرتبہ ترا دیواں
سخن پناہا ہو مجھ سے کی مدح اور قائم + کسو طرح سے نہیں ہے یہ عقل کا امکاں
بس اب دعا پہ میں کرتا ہوں اختتام سخن + کہ ایسے موقع پہ سودا ادب ہے طول بیاں
الٰہی جب تلک اوراق روز و شب کے اوپر + برات ہستی کی لکھتا ہے کاتب دوراں
جہاں سفینہ لکھا جائے روزگار کے بیچ + ہو پہلے اس پہ ترا نام زینت عنواں

اردو شاعری میں اس نوع کا قصیدہ نادرۂ روزگار ہے۔ اسمیں ایک شاگرد اپنے عظیم استاد کی مدح کرتا ہے

① اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ ص ۳۲۵ ② ایضاً

اس کے ہر مصرعہ میں خلوص اور عقیدت کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ اس قصیدے میں کچھ شاعرانہ اصولوں کی نشاندہی بھی ہوئی ہے ۔ قائم جن چیزوں کو شاعری کے لئے ضروری گردانتے ہیں ان میں قوتِ ممیزہ، آہنگ و نغمگی، قادر الکلامی، آن کہی باتوں کی تہہ تک پہنچنا، پروازِ فکر، قلم کی معجزہ کاری، حسن آفرینی تاثیری لطافت ۔ جمالیاتی اظہار، تمام و دائم رہنے والے شاعرانہ مناظر اہم ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ قائم کے قصائد میں قوتِ ممیزہ کی عمدگی ڈھکی چھپی نہیں ہے ۔ ان کی پروازِ فکر بھی کمتر درجہ کی نہیں ہے ۔ اس کا ثبوت ان کی وہ تشابیب ہیں جن میں تصوف، حکمت اور وزدم کے مسائل رقم ہوئے ہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ قائم کے قلم کی معجزہ کاری مکمل طور پر وہ رنگ نہ دکھا سکی جو سودا نے اپنے قصائد میں پیدا کیا ہے ۔ البتہ البتہ جستہ جستہ حوالوں سے وہ اپنے استاد کے ہمسر ہیں ۔ سودا کی شان میں لکھا ہوا قائم کا قصیدہ الفاظ و تراکیب کی عمدگی اور مضامین و معانی کی ندرت کے اعتبار سے بلند پایہ ہے ۔ سودا کی شاعری کے بارے میں ان کے شاگرد کی مبالغہ آرائی فی الحقیقت مبالغہ آرائی معلوم نہیں ہوتی ۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے سودا کے شعری مزاج کو گرفت میں لے کر خامہ فرسائی کی ہے ۔ قائم نے سودا کی تقلید تشابیب میں تمثیلی اور افسانوی مناظر قلمبند کیے ہیں لیکن ہر دو شعرا کے انداز بیان میں وہی فرق ہے جو ایک مصنوعی اور فطری نقاش کے مابین ہوتا ہے

قائم چاندپوری کی تشابیب میں حزن و ملال اور جنگ و جدال کے موضوعات کی بھی کمی نہیں ہے ۔ رنگ نشاط اور کیفیت سرخوشی و مستی پردۂ غیب میں معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ اشعار دیکھئے

سہ غرض جہاں تھا خوشی سے تمام مالا مال + مگر یہی ایک کہ جیسا کچھ ہے تمہیں معلوم
وہی رکھے تھا غم و دل وہی مصائب جاں + وہی قدیم تھے اطوار وہی کینہ رسوم
ہے سانحۂ عیش کے زیر سپہر کلفت رغم + کہ متصل ہو شفق سے ہمیشہ کلفت شام
لے آہ اوراں سے مجھ اب تو اس مصیبت میں + کہ یاں نہ مونس و ہمدم نہ یار و نے غمخوار
کب تلک قید میں غم کی میں رہوں آٹھ پہر + تا کجا دام قفس میں ہوں فلک کے اسیر
ہجوم غم سے یہ صورت تھی مزرع دل کی + ہو جوں گزار سے لشکر کے حال کشت تباہ
اے اشک شتاب لے خبر میری گریہ خاک + آتا ہے کوئی آہ کا جھونکا تو ہوا سے
تمام رات میں رو رو کے اشک حسرت سے + پروئے تار مژہ بیچ گوہر غلطاں
کچھ ربط ہے کہ ایک دل اور اس قدر ستم + کچھ دخل ہے کہ ایک سر اور اس قدر وبال

قائم چاندپوری نے اپنی ایک تشبیب میں دوسروں کی ہجویات لکھنے والے بعض شاعروں کی مذمت کی ہے

سہ سبب ہے یہ کہ جو نا شاعر اب ہیں ہند کے بیچ + سر آمد آپ کو ہر فن کا بوجھ کر بہ خیال
ہے کون جس پہ نہیں کرتے نسبت نقصان + کہ اس کے پردے میں اپنا ہو تا کہ عرض کمال

علی الخصوص رہ و رسم پیروی سے ہو گم + بسانِ سایہ پڑے ہیں عبث مرے دنبال

ہر ایک جا ہیں ہجا گو وہ غائبانہ مرے + کہ رو بہ رو نہیں دم مارنے کی جن کو مجال

قائم چاند پوری نے قصائد کی تمہیدوں میں جور فلک کے گلے اور شکوے بھی کیے ہیں، آلام روزگار اور غم ذاتی کے معاملات بھی رقم کیے ہیں۔ عیش و غم، حسد و کدورت، خود کفالتی، عشق، مفہوم وجود، ناہمواری خلقت، گناہ ندامت، یادِ ماضی، تیرہ بختی، انقلاب روزگار اور گردشِ دوراں وغیرہ کے مسائل و موضوعات بھی تشابیب میں دستیاب ہیں

ہیں ہوں وہ دانۂ آتش رسیدہ ہو کے جسے + خجل ہے آپ کشاورز گردشِ ایام

میں کیا ہوں کہ عجب گومگو ہے حال مرا + نہ ہے مجالِ خموشی نہ طاقتِ گفتار

کیا مناسب ہے رہوں میں فلک کا روکش + خونِ روباہ سے آغشتہ نہ ہو پنجۂ شیر

ہجوم غم سے یہ صورت تھی مزرعِ دل کی + ہو جوں گزار سے ملک کے حال کشت تباہ

یہ تلخ زیست تھی مجھ پر کہ آبِ چشمۂ خضر + مرے مذاق میں رکھتا تھا طعم زہر زقوم

جوں اشک ملا جائے ہے دل خاک میں کچھ آج + کیا جانیے کس کی یہ نگاہوں سے گرا ہے

جہاں تک قائم کے قصائد میں گریز کے اشعار کا تعلق ہے۔ تو ان میں عام طور پر انہوں نے یہ انداز اختیار کیا ہے کہ مجھے ان غموں، مصیبتوں یا تکلیفوں سے گھبرانے کی ضرورت کیا ہے کہ جہاں میں ترا "فلاں" دستگیر ہے۔ وہ دستگیر یا ممدوح موصوف نا انصافیوں کو نہیں دیکھ سکتا، انصاف پسند ہے۔ مذہبی قصائد کی گریز میں قائم نے بہت زیادہ عقیدت و احترام کا اظہار کیا ہے

کر تھا تو ہم دوزخ تو فعل بد کے سبب + پہ بخشے جرم ترے ہیں پے شفیع انام

ہے چرخ کون کہ جس سے طلب کرے امداد + وہ شخص ہوئے جو مداح حیدرِ کرار

غیر مذہبی قصائد کی گریزوں میں دنیاوی ممدوحین کو مشکلیں دور اور آسان کرنے والا کہا ہے

گر یہی شکل ہے اس دل کی تو کب تک یہ صبر + ایک دن میں وہ درِ دولت نواب وزیر

کیا میں عزم کہ حاضر ہو پیشِ شاہِ زمن + کروں جفا سے زمانے کی التماس پناہ

جو سنگ کعبہ کو حجاج نے دیا بوسہ + تو آستانۂ دولت کو جا کے اس کے تو چوم

کہ جس کا عدل ہے جب سے جہاں پہ سایہ فگن + رہا نہ ایک زمانے میں نام کو مظلوم

ڈرتا ہوں کسی کا نہ کرے حوصلہ تنگی + یاں داد رسِ خلق امیر الامرا ہے

مگر وہ داد دے جس کے حضور آئنے سے + ہمیشہ طوطیٔ رضواں کا شکر ہے مقال

مذہبی ممدوحین کے حوالے سے جز و مدح میں قائم نے اطاعت، دین، کفر و اسلام، جلالت، اور وسعی، شیریں بیان، عدل، رحم، رواجِ دین، حلم، حلال و حرام، رخش، اور تلوار وغیرہ کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔

دنیاوی ممدوحین کی مدح میں اشعار لکھتے ہوئے قائمؔ نے ان کی کرم نوازی، عدل و انصاف، علم و دانش، شجاعت و بہادری، قصر و محل، تلوار، اسپ و فیل اور تدبیر و فراست کے موضوعات منتخب کیے ہیں۔

شعر
یعنی وہ آصفِ دولہ کہ کرم سے جس کے + ہے ہر اک مور جہ ثروت میں سلیماں سے نظیر
زبس کہ عام ہے اس کا جہاں پہ جود و کرم + ہو اس عہد مبارک میں ہر اک کو رفاہ
ترے ہی سایہ میں شاداں مدام اہلِ فنون + تری ہی ذات سے نازاں ہمیشہ اہلِ علوم
ہو عکس پذیر آئینۂ طبع میں اس کی + وہ راز جو نظروں سے فلاطوں کی چھپا ہے
جدھر ہو دام ترے لطف کا آوازہ طلب + بنائے طائرِ تصویر کے بند مجھے پر و بال
زہے وہ رخشِ سبک رو کہ سم لبانِ حباب + نہ ڈوبیں عرصۂ دریا سے گر کرے تو عبور
سہم سے تجھ خدنگ کے ہر دم + منہ پہ رو کے ہے آسمان سپر
وہ اندر کا اکھاڑا ہے ترا شہر + ہے جس میں چار سو خوباں کی تعلیم
کہیں مردنگ کی دھکڑ کا شور + کہیں تن تن تننم تا دیم تا دیم
خولی پہ سونڈ کی ہوں ترے پیل کی میں مست + دانتوں نے جس کے شوق میں باہیں جہاں نکال
اللہ اللہ مخیم اجلال کا تیرے شکوہ + جس کے ہر ہر برج میں ہے وسعتِ کون و مکاں

قائمؔ چاند پوری کے قصائد میں مختلف علوم و فنون کی جو اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں ان میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں خنیاگرِ فلک، اقترانِ نجوم، برج، عصائے بنات النعش، بیدق (۱)، کشت (۲)، ترخیم (۳)، دیدہ بان (۴)، زمیر (۵)، زیر (۶)، اسدرہ (۷)، صفرہ لون (۸)، عیوق (۹)، کسوف، گاوِ زمیں (۱۰)، مائے حمیم (۱۱)، مشک حداد (۱۲)، نص (۱۳)، افصح الفصحا (۱۴)، طائرِ تصویر (۱۵) وغیرہ علاوہ ازیں تمام علمی، مذہبی، روایاتی اور تاریخی نوعیت کی تلمیحات کا استعمال کر کے قائمؔ نے اپنے علم و شعور کی وسعتوں سے قارئین کو آشنا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اکثر قصائد میں روایتاً فخر و تعلّی کا اظہار بھی کیا ہے

شعر
غرض دوں اپنے قصائد سے میں جس جاگیر + مول ردیوں کے نہ لے واں کوئی دیوانِ ظہیر
شروع فکر سخن میں کرے نہ یاں شاعر + مرود کے کان نہ جب تک وہ لے کے میرا نام
خدا گواہ انہیں میں عزیز ہر کہ و مہ + زبس ہے شعر کی میرے تمام خلق میں دھوم

قائمؔ چاند پوری کے قصائد میں حسنِ طلب اور دعائیہ مضامین کا عمدہ اور موثر بیان ہے

شعر
یقیں ہے منزلِ مقصود کو پہنچا ہوں + جو چند گام ہو ہمت تری قرینِ ہمراہ
یا رب احباب ترے شاد رہیں تا بہ ابد + ہو ٹپے پامال جو اعدا ہیں الی یوم عسیر

قائمؔ چاند پوری کے قصیدوں کو ہم عظیم اور صفِ اول کے قصائد تو نہیں کہہ سکتے تاہم اس میدان میں ان کی شاعرانہ مہارت کی داد دیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ وہ بلاشبہ اپنے دور کے اہم قصیدہ نگار تھے۔

---

(۱) نجوم (۲) رقص (۳) خیمہ سازی (۴) عروض (۵) حرب (۶) جغرافیہ (۷) مابعد الطبیعات (۸) طب (۹) علم فلکیات (۱۰) اسطوریات (۱۱) ارضیات (۱۲) آہن گری (۱۳) مذہبیات (۱۴) شعر و ادب (۱۵) مصوری

احسن الدین خاں بیاں

خواجہ احسن الدین خاں بیاں [م ۱۷۹۸] دلی کے رہنے والے تھے۔ فخرالدین چشتی کے مرید اور
مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے ۱۷۹۳ء میں وہ حیدرآباد نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ بعض
تذکرہ نگاروں نے ان کا نام احسن اللہ لکھا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی کا کہنا ہے یہ درست نہیں ہے احسن اللہ ان سے قدیم
شاعر تھے①۔ ان کے دیوان میں حضرت علی کی شان میں ۲۲ اشعار کا ایک قصیدہ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں میر نظام
علی خاں آصف جاہ کی مدح میں ۹۷ اشعار کا ایک اور قصیدہ بھی ہے②۔ کتب خانہ آصفیہ میں ان کے دیوان کا جو نسخہ محفوظ ہے
سخاوت مرزا نے لکھا ہے اس میں ایک نعتیہ قصیدہ ۱۷ اشعار پر مشتمل محفوظ ہے③ مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ تذکروں میں
بیاں کا نام احسن اللہ خاں اور احسن الدین خاں دونوں طرح سے آیا ہے مثلاً شیر علی خاں سرخوش نے احسن اللہ احسن
لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ ایہام گو اور نواب سرفراز الدولہ کے ملازم تھے غزلیں، مثنویاں اور قصیدے کہے ہیں④۔ بعض تذکروں
میں انہیں خواجہ بھی لکھا گیا ہے ان کا صحیح نام احسن الدین خاں بیاں ہے جو مناقب فخریہ میں نواب عماد الملک غازی الدین
خاں نظام نے لکھا ہے (ص ۳۲۹) بیاں کے شاگرد گلاب چند حیدرآبادی نے اپنے ایک قصیدے میں ان کا نام احسن الدین
خاں ہی لکھا ہے⑤۔ ارسطو جاہ کی مدح میں بیاں کے ایک قصیدے کے اشعار درج ذیل ہیں

اگر ہزار برس تک بیاں کروں تقریر + تو ہو سکے نہ ادا مجھ سے شکرِ حیِ قدیر
رہے تو دل میں تلاشِ معاش اور نہ ہیں + کہ جس کے واسطے اتنا فلک کرے تشہیر
نہ چاہیوں اس سے کبھی میں عروجِ منصب کا + نہ حرصِ زر کی رکھوں ہوں نہ خواہشِ جاگیر
جسے ہو کنجِ قناعت میں خشک ناں کافی + خرید کرنے نہ جاویں کہیں پیاز و پنیر
ملا ہو لطف جسے بوریا نشینی کا + وہ پشم سمجھے ہے قالین کو اگرچہ حریر
مگر تلاش تھی دل میں تو شخصِ کامل کی + وہ خواہ امیر بظاہر ہو خواہ ہووے فقیر
سو ایسی دولتِ جاوید یاں دکن میں ملی + کہ ایک شخص کا پایہ ہے بے عدیل و نظیر⑥

بیاں کے قصائد کی زبان پر فارسی اثرات کے باوجود عام بول چال اور روزمرہ لہجے سے دوری کا احساس نہیں ہے صاف
سلیس اور شگفتہ الفاظ میں احساس و جذبہ کا موثر اظہار ان کا وتیرہ تھا۔ ارسطو جاہ کے مذکورہ قصیدہ میں انہوں نے
اس دور کی تہذیب کے زیر اثر بننے والے عمومی شاعرانہ مزاج کا اظہار کیا ہے۔ پیری مریدی تصوف کے زیر سایہ پروان
چڑھنے والے فکری اور سماجی خیالات سے ہے۔ کنجِ قناعت میں خشک نان کا تصور اسی حوالے سے ہے۔ بوریا نشینی اور
قالین پشمی کا رد بھی اسی روایت کا حصہ ہے۔ حرص زر کے خلاف تقریباً تمام شاعروں کے کلام میں اعلیٰ درجے کے
اشعار مل جاتے ہیں۔ مرشد کامل کی تلاش یا پڑھے لکھے لوگوں کے حلقے میں بیٹھنا ایک قدر سمجھی جاتی تھی۔ بیاں نے اپنے
مذکورہ قصیدے کی تشبیب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس عہد کی تہذیب میں راسخ تھے

---

① اردو مخطوطات جلد چہارم ص ۱۲۱ ② دیوان بیاں ③ احسن اللہ خاں بیاں مشمولہ اردو نامہ ۱۹۶۷ء ص ۳۱ ④ بحوالہ جائزہ مخطوطات اردو ص ۱۸۲ تا ۱۸۷
⑤ دیوان ہمدم ص ۱۰۱ مطبع نواب شمس الدولہ حیدرآباد دکن ⑥ دیوان بیاں مرتبہ ثاقب رضوی مجلس اشاعت ادب دہلی

میر محسن تجلی

میر محسن تجلی م ۱۱۹۸/۱۱۹۹ ھ مشہور شاعر محمد حسین کلیم (جنہوں نے فصوص الحکم کے چند ابواب کا ترجمہ بھی کیا تھا) کے بیٹے تھے۔ میر محسن تجلی کی والدہ میر تقی میر کی بہن تھیں[1]۔ انہوں نے مذہبی قصائد نویسی میں نام پیدا کیا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک اور شاعر جن کا تخلص تجلی تھا اور نام تجلی علی شاہ قصیدہ نویس تھے۔ ان کے کلام کا قلمی نسخہ دفتر دیوانی حیدرآباد میں موجود ہے۔ اسمیں ان کے چند اردو قصیدے، قطعے اور مسمط محفوظ ہیں۔ انہوں نے بندگان عالی اور ارسطو جاہ کی مدح کی ہے[2]۔ قصائد اعظم سے بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ ارسطو جاہ کے مداح تھے[3]۔ عبد القادر سروری نے دفتر دیوانی حیدرآباد میں موجود مجموعہ فصاحت (کہ جسے تجلی علی شاہ تجلی نے تالیف کیا ہے) کی بنیاد پر اپنی قصیدہ گو قرار دیا ہے[4]۔ مجموعہ فصاحت کے قصائد کی تفصیل رسالہ رہبر دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوئی ہے[5]۔ تجلی علی شاہ تجلی نے تزک آصفیہ جیسی تاریخی کتاب بھی لکھی ہے ان کے قصیدے کا نمونہ دیکھئے

گر وصل گل بدن ہو مجھے ایک بار دست + ہر مو سے بہر شکر ہوں پیدا ہزار دست
اوس زلف مشکبار پہ جی تنگ کر نثار + دلوئے یہ بخت تیرہ جو بہر نثار دست
ہر چند خاکساری کو میری سمجھ رہیں + دامن فلک تو تیرے ہے اک عرش وار دست
لکھتا ہوں اور مطلع رنگیں حضور میں + مضموں ہزار دلوئے ہے بے اختیار دست
ایسا دیا ہے حلم میں تجھ کو وقار دست + باندھے سپہر رو برو جیوں کوہسار دست
زر پاشی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب + رکھتا ہے اپنے چہرے پہ ہوش ہزار دست
یک دست جو ہے تجھ کو زمانے میں اقتدار + پایا تھا کون ایسا شہ و شہریار دست
بذل و سخا و جود و کرم فیض و لطف و خلق + کھولے ہیں تیرے سامنے یہ ہفت بار دست
مانند گوسپند ہو قرباں ترے عدو + احباب کو دے عید کا نت روزگار دست[6]

میر محسن تجلی، تجلی علی شاہ تجلی سے مختلف شخصیت ہیں۔ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کا مخزونہ ہے۔ اسے ایم اے کے مقالے کی صورت میں نادرہ زیدی نے مرتب کیا ہے[7]۔ اس دیوان میں دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ بہت سے مذہبی قصائد بھی موجود ہیں جن میں حمد و نعت و منقبت کے موضوعات قلمبند ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے دیوان میں حضرت قدم شریف کے روضہ وغیرہ کی مدح میں قصیدہ بھی دستیاب ہے۔ منقبت کے قصائد میں زیادہ حضرت علیؓ کی شان میں ہیں ایک دو قصیدے حضرت امام حسینؓ کی تعریف میں بھی ملتے ہیں۔ میر محسن تجلی کے قصیدہ حمد کا مطلع ہے

سو کر اس دفتر کو اس کی حمد سے چل اے قلم انشا + کہ جس یکتا نے صنعت سے دو عالم کو کیا پیدا

ان کے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

---

(۱) شاہ تجلی اور ان کا کلام (ص ۱۲) از عبد القادر سروری رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۶ (۲) تذکرہ شعرائے دکن ص ۳۲۲-۳۲۷ (۳) خزینۃ الحکام ص ۱۵۱
(۴) دیکھئے حاشیہ نمبر ۱ (۵) مضمون دفتر دیوانی و مال کے ہندوستانی مخطوطات (ص ۹۵) از سید نصیر الدین ہاشمی رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۶
(۶) دکن میں اردو ص ۳۵۳-۳۵۴ (۷) دیوان تجلی مرتبہ نادرہ زیدی مقالہ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی

دستِ صبا سے کھلا شاہدِ گل کا نقاب + رخ پہ ہوا بار ہے پھر مرغِ چمن سے حجاب

باغ کی دیوار پر خار بھی سرسبز ہیں + دیکھ کے اب تر اماں جوشِ بہار اور سحاب

طرفِ کلاہِ بہار پہنچے ہے گردوں تلک + باندھے ہے محور سے اب ابر کا خیمہ طناب

سایۂ دیوار میں اینڈتے ہیں طلق بھی + جھولے ہیں ہر طرف بید جیسے کہ مستِ شراب

جوشِ طراوت کا ہے اتنا بہاراں کے ساتھ + مل رہے ہیں باغ میں موجِ گل اور موجِ آب

سرو سبھی خوش لگے نے کی بھی آواز ہے + طوق میں قمری کے ہے نالۂ چنگ در رباب

سنبل پر پیچ و تاب ہو گیا گرداب وار + موجِ گلوں کی میں ہے غنچہ برنگِ حباب

چاندی کے پھول کو چاند سے ہے ہمسری + عار ہے خورشید پر طعنِ گل آفتاب

موجِ گل و یاسمن جوش میں ہے بحرساں + یاں ہیں شاداب ہے روئے نشاط تر آب

نعتیہ مضامین بیان کرنے کے لئے انہوں نے مذکورہ بالا آراستہ تشبیب کو لاکر پر تاثیر انداز میں اظہارِ عقیدت کیا ہے ۔ اس نعتیہ قصیدہ کے مطلعِ ثانی کے بعد شاعر لکھتا ہے [مفہوم] کدورت کی شام گئی ، کامیاب سحر آئی آفتاب کا آئینہ نور سے منجلی ہے ۔ غم کی کلفت غبارِ سحر کے مانند ہوا ہو گئی اور ہوا سے گرد کدورت حباب کی صورت ختم ہو گئی اور باغ کی رنگینی تازگی اور سبزہ دیکھ کر مجھے باغِ ظہور کا وہ گل یاد آ گیا ۔ جن کے آنے سے گلشنِ دنیا باغ ہوا اور رشکِ پارس ہوا ۔ اس گریز کے بعد ۴۲ اشعار مدح و دعا و حسنِ طلب کے ہیں ۔ حضور ؐ کو خیر البشر ، بحرِ کرم ، گنجِ صواب ، پیشرو انبیا ، راہبرِ اصفیا ، نایبِ ذاتِ خدا ، صاحبِ وحی و کتاب ، حاکمِ ملک ورا ، شہ دوسرا ، شافعِ یوم الحساب ، مرکزِ افلاک ، کرۂ ارضِ وجود ، شاہدِ بزمِ شہود ، گوہرِ فیض انتساب کہا ہے ۔ اس قصیدے میں حضرت علی رض حضرت فاطمۃ الزہرا رض اور حضرت حسن رض و حسین رض کی مدح و ستایش کی گئی ہے ۔ حضور ؐ کی شان میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ع ماہ سے اس نور کے پایا ہے سب نے فروغ + خلق کے ذرات کو مہر اسی کے سے تاب

احمد بے میم تم ، صاحبِ تعظیم تم + تم ہو تشبہ جناب تم ہو تنزہ مآب

بحرِ ازل اور ابر قطرہ ترے وصف میں + جوشِ محیط دو کون نعت میں تیری سحاب

میر تجلی کے قصائد کی بعض تشابیب میں میر کے لہجے کی دردمندی ، سوز و گداز اور غزلیت کی جھلکیاں ہیں ۔ عشقیہ کوائف سے ان کی غزلیں بھی مملو ہیں اور قصائد بھی ۔ تجلی کے قصائد میں صنائع بدائع ، روزمرہ ضرب الامثال ، ہندی ، فارسی اور عربی الفاظ و تراکیب وغیرہ کا استعمال دکھائی دیتا ہے ۔ اسے ہم ان کی استادانہ مہارت پر محمول ٹھہرائیں گے ۔ صنائع بدائع کے استعمال کے باوجود ان کا کلام الجھاؤ اور ثقالت سے پاک ہے کئی قصائد میں انہوں نے مدح میں کوئی قطعہ بند کیا اور ترنم کی ہے اور اس کے وسیلے سے ممدوح کی صفات کو اجاگر کیا ہے ۔

میر محسن تجلی کے دیوان میں حضرت علیؓ کی مدح میں ۳ قصائد موجود ہیں۔ ان قصائد کے مطالع یوں ہیں۔

سے چھپا منہ زلف میں روئے پہ تیرے یار خنداں تھا + اندھیری رات تھی وہ ابر میں تھا برق و باراں تھا

سے ہے دل میں جب سے اس کے رخ و زلف کا خیال + کٹتا ہے دن ملال میں اور رات ہے وبال

ہوا ہے رستہ شکر برتبات اب لے حور + کلام تلخ سے اس واسطے ہوا تو دور

حضرت علیؓ کی مدح میں اول الذکر قصیدے کی تشبیب میں ذاتی غم و اندوہ اور زمانے کے ستم کے بیان کے بعد حضرت علیؓ کی مدح کی جانب گریز ہے۔ اس قصیدہ کے مدحیہ اشعار میں تلمیحات کا استعمال عمدہ ہے

سے خلیل آسا انہوں نے پہنا ہے جب خلعت خلت + نے جب عزور تھا نے آگ نہ گلستاں تھا

نکالا ہوگا چاہ غم سے کتنوں ہی کو حیدر نے + کہ جب نہ پیر کنعاں تھا نہ یوسف تھا نہ زنداں تھا

مدحیہ اشعار کے بعد اس قصیدہ میں ایک قطعہ بیان کیا گیا ہے جس میں ایک کہانی رقم ہوئی اور اس کے حوالے سے بھی مدح علیؓ کی گئی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ ایک دن مسجد میں حضور اکرمؐ بیٹھے تھے۔ صحابہ اور دین کے ارکان بھی جمع تھے اچانک وہاں فرشتے کے دل کو لرزا دینے والا ایک عفریت آ دکھا۔ اس کے قد و قامت کی بلندی اور درازی کے بعد میر تجلی نے لکھا۔ بصد عجز و ادب کرکے سلام اس سرور دیں کو + بر رنگ رعد نالاں تھا بسان ابر گریاں تھا

حضورؐ نے پوچھا کہ تو کس کا دادخواہ ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ یہ قصہ تب کا ہے جب ابھی ہبوط آدم نہیں ہوا تھا۔ دنیا میں جنوں کی حکومت تھی اور میں بھی ایک جگہ کا بادشاہ تھا۔ ایک دن میں دریا کے کنارے شکار میں مصروف تھا کہ مجھے ایک ہلال کے مانند کشتی نظر آئی۔ اس میں ایک طفل بدر تاباں سوار تھا میں نے اسے پکڑنا چاہا مگر اس نے الٹا میرے سینے پر ایک ایسا سخت مکا مارا جس سے میری چھاتی پھٹ گئی۔ دریا میں خوں کی طغیانی آگئی میں پھر حملہ آور ہوا اس طفل نے میرے ہاتھ برگ خرما سے باندھ دیے۔ ہزار کوشش کے باوجود میں انہیں چھڑا نہ سکا وہ کشتی دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے چلی گئی اور میں اس جگہ تنہا رہ گیا۔ وہ جن کہتا ہے کہ یہی وہ گرہ ہے جو آج تک مجھ سے نہ کھل سکی۔ اس مشکل کے حل میں نہ تو آدم نے میری مدد کی اور نہ ہی ادریس کی دانائی میرے کام آئی۔ یہ عقدہ نہ تو حضرت نوح سے کھلا اور نہ ہی سلیمان سے۔ میرا زخم دن بدن بگڑتا گیا اسکا علاج لقمان اور حضرت عیسیٰ سے بھی نہ ہو سکا۔ جتنے پیغمبر آئے میں نے سب کے سامنے یہ عقدہ رکھا مگر کسی نے حل نہ کیا اب میں آپ کے دروازے پر آیا ہوں۔ سے پیمبر مسکرا کر بولے بلواؤ علی کے تئیں + یہ زخمی جس کے پنجے کا ہے سو وہ شیر یزداں تھا

حضرت رسول اکرمؐ نے حضرت علیؓ سے کہا اسکا گناہ معاف کر دیجیے۔ انہوں نے اول اسے اس بند سے رہا کیا اور اس کے بعد اس کے زخم پر لعاب لگا کر اسے ایک دم ہی چنگا کیا۔

حضرت علیؓ کی شان میں ثانی الذکر قصیدہ میں روائتی عشقیہ اور غم و اندوہ پر مشتمل تشبیب لکھنے کے بعد گریز یوں کی ہے سے نادا ہے یہ سجدہ گاہ خلائق ہے روز و شب + یہ جبہ سائے جملہ ملائک ہے با جلال

اس قصیدے میں تجلی نے آدم و حوا، حضرت خلیل، نوح، یونس، عیسیٰ، خضر کے حوالے سے مدحِ علیؑ بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کو مشکلات میں سے حضرت علیؓ ہی نے نکالا تھا۔ یوں قریب قریب تجلی نصیری عقائد کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

میر تجلی نے ایک قصیدہ خیر النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شان میں بھی لکھا ہے اسکا مطلع ہے

ع وقت وہ پہنچا کہ محشر کی طرح دورِ فلک + حضرت النساء کو کرے صفحۂ دنیا سے حک

اس قصیدہ میں بھی انہوں نے دو قطعات لکھے ہیں علاوہ ازیں ایک معجزہ بھی بیان کیا ہے۔ جس کی بدولت ایک یہودی مسلمان ہوا۔ شاہ تجلی کے دیوان میں حضرت امام حسینؑ کی مدح میں بھی دو قصائد ہیں جن کے مطالع یوں ہیں ع جانِ غم کش کو رکھا تو نے ہمیشہ سوگوار + کیا کریں گے یاد ہم تجھ کو بھلا اے روزگار

خبر لے جسم میں تیرے چھپا ہے آکے جاں اسکا + تو اس پر ڈھونڈتا پھرتا ہے اے ناداں جہاں اس کا

حضرت علیؓ کی مدح میں ان کی ترکتازی کی توصیف بھی ہے ان کے نیزے اور اسپ کی تیزی کا بیان بھی۔ ان کی شمشیر کی برش بھی موضوعِ اظہار رہی ہے۔ تجلی نے حضرت علیؓ کے خانہ خدا میں پیدا ہونے کی فیوض و برکات کا تذکرہ بھی کیا ہے حضرت فاطمۃ الزہرا کو انہوں نے شافعِ روزِ جزا، سیدہ انس و ملک قرار دیا ہے۔ ان کے ایک معجزے کا تذکرہ بھی ہے۔

حضرت امام حسینؑ کو میر تجلی نے یکہ تازِ ساحتِ دیں، شہسوارِ نامدار، نورِ احمد، جانِ حیدر، شاہِ اقلیمِ غنا، افتخارِ ملک، فخرِ گلبن، گلزارِ عزت، سروِ باغِ احترام، وارثِ ملکِ ولایت، ہمدمِ پروردگار، قاضیِ احکامِ عصمت، امینِ علم و عمل، تحفۂ شیرِ شریعت کہا ہے

ع یہ نکتہ پایا میں نے معنی ذبحِ عظیم اندر + ذبیح اللہ سے برتر ہے کتنا عز و شاں اس کا

انہوں کے ذوالجناح کے کیا کیوں میں وصف تجھے + کہ توسن چرخ کا کیا ہے جو پہنچے ہم عناں اس کا

جہاں تک میر محسن تجلی کے قصیدہ حمد کا تعلق ہے۔ اس میں انہوں نے خدا کی صناعانہ قدرت اور ماورائے عقل و گماں ہونے کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ خدا نے انسان کا طلسم پانی کے ہر قطرہ سے باندھا ہے اور حکمت سے اضداد کو موافق کر کے ایک جا رکھا ہے۔ خدا ہزاروں طرز کے جلووں میں خود کو دکھاتا ہے۔ اور انسان کے حوالے سے لکھا ہے

ع تامل کی نظر کرتا نہیں کیوں حسن پر اپنے + خطابِ احسنِ تقویم سے واقف نہیں تو کیا

بنایا گو کہ اخلاطِ عناصر سے ترے تن کو + ولیکن ہے نفخت فیہ من روح ترا رتبہ

میر محسن تجلی نے دہلی میں موجود حضرت قدم شریف کی درگاہ کی شان میں بھی ایک قصیدہ لکھا ہے اسکا مطلع ہے ع جہاں ڈر ہو نہ فتنے کی کمیں کا + نہ دیکھا کوئی قطعہ سرزمیں کا

اس کی تشبیب میں ذاتی دکھ درد کے سرسری اظہار کے ساتھ نعتیہ مضامین بھی قلمبند ہوئے ہیں اس کے بعد قدم شریف کے ماحول کی تعریف کی گئی۔ اور قدم شریف کی وضاحت یوں ہے

ع بجا ہے فخر دہلی کی زمیں کا + قدم ہے جس پہ ختم المرسلیں کا

حوض کی تعریف ـ وہ حوض اس جا ہے گویا خاتم حق + قدم کا نقش نقش اس میں نگیں کا

قلعہ ـ رہے وہ قلعہ یاں جس کا ہر اک برج + ہوا ہے رشک اس چرخ بریں کا

دروازہ ـ وہ دروازہ وہ ہے عارف کے دل کو + کھلے ہے جس پہ در عین الیقیں کا

تجلی علی شاہ کے قصائد میں صوفیانہ موضوعات بکثرت ملتے ہیں ۔ ان کے تخیل کی پرواز ان کے علم کے آثار بھی سمیٹے ہوئے ہے ۔ حوض کو حق کا خاتم کہہ کر حضور کے نقش قدم کو نگیں کہنا شاعرانہ تخیل کا کرشمہ ہے ۔ اسی طرح سے دروازے کو در عین الیقیں کہنا ان کے تخیل کی صوفیانہ جہت کا اشارہ ہے ۔ تجلی علی شاہ تجلی نے دنیاوی محبوب حسین کی تعریف سے گریز کیا ہے ۔ اس سے بھی ہم ان کی طبع کی صوفیانہ جہت کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ صوفی کے لیئے بزرگ و برتر خدا اور اس کی برگزیدہ ہستیاں ہی ٹھہرتی ہیں ۔ شاہ تجلی کے قصیدے اپنے اندر شیعہ تہذیبی زندگی کے آثار سمیٹے ہوئے ہیں ۔ وہ مذہبی روایت کو مقدم جانتے تھے ۔ سادگی، سلاست اور موثر اظہار سے مملو یہ قصائد اردو قصیدے کی اس روایت سے متعلق ہیں جس کا اہم نقش میر کے قصائد میں دستیاب ہے ۔ لسانی شکوہ اور خیالاتی بلند آہنگی سے انہوں نے زیادہ سروکار نہیں رکھا البتہ نکتہ آفرینی میں انہیں خاص مہارت ہے ۔ انہوں نے مقصد کے اظہار کے لیئے مناسب و موزوں واقعات سے استفادہ کیا ہے اور اپنے صناعانہ جوہر کے حامل قلم کے وسیلے سے عمدہ شاعرانہ نقاشیاں کی ہیں ۔ ان کے تخیل کے اختراعی اور ابداعی رجحانات نے انہیں عمدہ شعرا کی صف میں لاکھڑا کیا ہے ۔

محمد روشن جوشش

محمد روشن جوشش [م ۱۸۰۱ء/ ۱۸۰۲ء] کا تعلق عظیم آباد سے تھا۔ ان کا دیوان قاضی عبدالودود نے مرتب کیا تھا۔[1] جوشش مصحفی اور انشا کے معاصر تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا ثبوت مختلف تذکرہ نگاروں کے بیانات سے ملتا ہے۔[2] قصیدہ نویسی سے انہیں خاص شغف تھا۔ سودا کی بعض زمینوں میں ان کے عمدہ قصائد ان کے دیوان کی زینت ہیں۔ زمینوں ہی پر کیا موقوف ہے ان کا طرز اظہار بھی کہیں کہیں سودا کے آثار سمیٹے ہوئے ہے۔ مضمون آفرینی اور شوکتِ الفاظ کے اوصاف کے اعتبار سے وہ اہم قصیدہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ جہاں تک زورِ بیاں، روانی اور برجستگی کے خصائص کا تعلق ہے ان کے قصائد میں یکمیاب ہیں۔ ان کا سمندِ قلم بارِ گراں اٹھانے کا عادی دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عشقِ حقیقی، تصوف اور اخلاق کے موضوعات کو برتنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس میدان میں سودا کے مقلد نہیں ہیں۔ یہ موضوعات ولی کی تقلید میں ہیں۔ جوشش نے ولی ہی کی مانند مذہبی قصائد پر اکتفا کیا۔ درباری قصائد کی جانب ان کی رغبت نہیں تھی۔ ان کے قصائد ان کے مذہبی معتقدات اور روحانی جذبات کا پرتو ہیں۔

جوشش کے دیوان میں پانچ قصائد ملتے ہیں۔[3] پہلا قصیدہ رائیہ ہے اور نعتِ رسولِ مقبولؐ میں ہے اسکا مطلع ہے

؎ جو کوئی در گہ عالی کا تیری ہو زوار + لگے پلک سے پلک پھر نہ اس کی آئینہ دار

ان کا دوسرا قصیدہ منقبتِ علیؓ میں ہے اس کی زمین درج ذیل ہے

؎ صاف طینت نہ کیا چاہیے گردوں کو خیال + عکس رکھتا ہے یہ ہر ایک سے آئینہ مثال

اس لامیہ قصیدے کے بعد ان کا ایک کافیہ قصیدہ بھی منقبتِ علیؓ ہی میں ہے اس کی گریز کے اشعار ملاحظہ ہوں

؎ سنتے ہی عرض مری یوں کہا مجھ کو ارشاد + راہِ توصیف میں خوبانِ جہاں کی نہ بھٹک
شعر کہتا ہے تو کہہ شان میں تو ایسے کی + فخر سمجھے ہے ثنا جس کی فلک اور ملک
یعنی وہ حیدر کرارؓ خدا کا مظہر + فیض سے جس کی ہے معمور سما تا بہ سمک

جوشش کا چوتھا قصیدہ نونیہ ہے یہ حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں کہا گیا ہے

؎ عطا کیا ہے مجھے حق نے وہ دلِ روشن + کہ رشکِ شمعِ حرم ہے مثالِ ظلمت تن

ان کا پانچواں قصیدہ نامکمل ہے اس کی تشبیب کے چھ اشعار ہی ملتے ہیں۔ یہ اشعار فلک کی

---

① دیوانِ جوشش مرتبہ قاضی عبدالودود مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۷۴ء ② تذکرہ شعرائے ہندی ص ۹۱ طبقات شعرائے ہند ص ۳۴۳ علاوہ ازیں ملاحظہ ہوں تذکرہ شورش تذکرہ مسرت افزا ص [illegible] تذکرہ عشقی ص ۱۱۸ گلشن ہند از مرزا علی لطف مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۹۳ دار الاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۰۶ء ③ کلیم الدین احمد نے بھی جوشش کا دیوان مرتب کیا اور دیوان جوشش کے نام سے پٹنہ سے چھپوایا

تعریف میں ہیں۔ اسے انہوں نے صاف ضمیر کا حامل بھی قرار دیا ہے اور بے کدورت، صفا پرست، صاف طینت اور صفا پرور بھی کہا ہے اور لکھا ہے خدا نے اپنے نور سے اسکا ضمیر بنایا ہے۔ فلک کی تعریف میں چند اشعار لکھ کر جوشش کیا گریز کرنا چاہتے تھے اس کی خبر نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ فلک کو

؎ غرض کسی کی ترقی سے نہ تنزل سے + وزیر بادشاہ ہو یا ہو بادشاہ وزیر

محمد روشن جوشش کے قصائد بے معنی مبالغہ آرائی سے پاک ہیں۔ انہوں نے بزرگانِ دین کی انہی باتوں کی طرف اشارے کیے ہیں جو عموماً ان کے مریدوں کے حلقوں میں ملتی ہیں۔ جوشش اپنے کلام میں نہ تو الٹنیاک پیدا کرتے تھے اور نہ ہی حقیقت کو مسخ کرتے تھے۔ انہوں نے مبالغہ کا سلیقہ سے استعمال کیا ہے۔ مبالغے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ خوشامد اور الحاد کے حق میں اگر استعمال ہو گا تو معیوب ٹھہرے گا۔① جوشش نے اپنے قصائد میں نہ تو کہیں خوشامد کی ہے اور نہ ہی الحاد کا پرچار۔

جوشش کی تشابیب میں فلکیات اور چرخیات کے معاملات کا موثر اظہار ہوا ہے۔ اپنے عقیدہ لامیہ میں انہوں نے فلک کے ہر برج کی رعایت سے اشعار لکھے ہیں اور شکوہ و شکایت کے مضامین رقم کیے ہیں۔ اپنی تشابیب میں جوشش نے ذاتی احوال کا بیان بھی کیا ہے اور حسن و جمال کے کوائف بھی رقم کیے ہیں۔ وہ اکثر ڈرامائی انداز سے گریز کرتے تھے۔ کبھی وہ آسمان کی شکایت میں تشبیب لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ جس کی ایسی خراب حرکات سکنات ہوں اس کے افعال رقم کرنے سے کیا فائدہ کیوں نہ ایسے شخص کی تعریف کی جائے جس سے دین قوی ہوتا ہو اور کبھی خواب میں آ کر کوئی بزرگ ان کے ذاتی مخزیہ کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے تجھے اس شخصیت کی تعریف کرنی چاہیے جو سرورِ سینۂ احمدؐ اور فروغِ چشمِ علیؓ ہے۔ جوشش کے قصائد میں سے چند مدحیہ اشعار دیکھیے

؎ اے شہ کون و مکاں دیکھ ترا جاہ و جلال + دست بستہ ہیں شہ ماضی و مستقبل و حال

آستاں پر ترے ہر آن کریں ہیں سجدے + غوث و قطب و ولی اور عارف و دانا ابدال

خوشہ چیں خرمنِ عالی کے ہیں اے بابِ علوم + حکماء و علماء و فضلاء و اہلِ کمال

سرورِ سینۂ احمد فروغِ چشمِ علی + شہنشہِ دو جہاں حضرتِ امام حسن

ہے اس کے عہد میں قیدی نہ کوئی دیوانہ + رہے ہے خانۂ زنجیر میں صدا شیون

جہاں تک مقصدے کے خاتمے کا تعلق ہے اس میں جوشش کے اظہار کا خلوص دیدنی ہے② وہ دردمندی اور عاجزی سے اظہارِ عقیدت کرتے ہیں ؎ یہ جو کہتا ہوں ترے سامنے میں بیہودہ + اس طرح ہرزہ درائی کا نشہ ہے یہ مآل

کہ نہ محتاج ہوں عالم میں کسی و ناکس کا + ملے ترے ہی خزانے سے مجھ کو مال و منال

جوشش کے قصائد ان کے پرخلوص مذہبی جذبات سے مملو برصغیر کے مسلمانوں کے بعض اسلامی عقائد کا اظہار بھی کرتے ہیں کفر و الحاد دشمنی میں وہ دیگر مذہبی مقصدہ نگاروں ہی کے مانند جوکس ہیں۔

---

① مرآۃ الشعر صفحہ ۱۲۲ ② جوشش کے نمونہ ہے شاگرد کو ملا خط کے حوالہ کے ہم قدم ہیں اشعار ملاحظہ ہوں

؎ وہی شاہ مسلم ہے اے جوشش + جو آگے کو دو شعر مقطع سے ہے ذرا ربط

زور آور کی ہے کہا ہی مضمون باندھیے + الفاظ جس کے سست ہیں وہ شعر سست ہے

الفاظ شوخ و تعقید رنگیں ہو شوخ ہے + جوشش یہی تلاش یہی جستجو رہے

میر باقر آگاہ

میر باقر آگاہ م ۱۸۰۵/۱۸۰۶ء نے اپنے اردو دیوان کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ہندی (ہندیاں) عربی اور فارسی کے غیر معروف الفاظ سے مانوس نہیں ہیں اس لئے شاعر کو چاہیے کہ وہ قصیدہ، غزل اور مثنوی میں "الفاظ عرب و لغات غیر مشہور عربی و فارسی" نہ لائے اور ہندی وضع کو ترکیب میں فارسی نہج پر غالب کر دے۔ باقر آگاہ کا یہ نقطۂ نظر خود ان کے قصائد میں نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اپنے دستیاب ہونے والے دو مذہبی[1] قصائد میں عربی فارسی طور ہی کو پیش نظر رکھا ہے اور اس امر کی پرواہ نہیں کی کہ ہندیاں اس سے مانوس نہیں ہیں۔

میر باقر آگاہ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے ان کی عربی اور فارسی تصانیف کی تعداد ۲۰۳ بیان کی گئی ہے ان میں سے سولہ اردو نظم میں ہیں[2]۔ انہیں مثنوی ہشت زیادہ مقبول ہوئی۔ نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے باقر آگاہ کے کلیات میں غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ کی اصناف موجود ہیں۔ آگاہ کا تعلق اگرچہ ارکاٹ کے والاجاہی خاندان سے تھا تاہم انہوں نے اس خاندان کے کسی بھی امیر یا نواب کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا۔ ان کی قصیدہ نویسی کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے سترہ سال کی عمر میں ایک قصیدہ نونیہ حضرت قرلی کی شان میں کہہ کر ویلور بھجوایا تھا۔ ان کے دکنی دیوان میں بھی قصائد و غزلیات ہیں[3] اردو مخطوطات میں لکھا ہے "آگاہ کے دیوان میں ہر صنف کا کلام ہے۔ قصائد، قطعات، رباعی اور غزلیں۔ قصائد میں فارسی قصائد کا تتبع ہے[4]"۔

باقر آگاہ کے قصائد حمد و نعت و منقبت پر مشتمل ہیں۔ ان کے قصیدے غوث الاعظم کی شان میں بھی ہیں ان کے مخطوطے محبوب القلوب[5] کے آخر میں جو قصیدے درج ہیں ان کے مطالع ملاحظہ ہوں

پڑا ہوں ورطۂ اندوہ و محنت میں بہ حیرانی + مری اب دستگیری کر تو اے محبوب سبحانی

کیوں حسن کا دکھاتا ہے کر و فر آفتاب + ٹک دور کر نقاب کہ ہو شپرہ آفتاب

اول الذکر قصیدہ مفرح القلوب کے نام سے مشہور رہے

باقر آگاہ نے اپنے دیوان کا جو اردو دیباچہ لکھا تھا جس کے ایک نکتے کا تذکرہ آغاز میں ہو چکا ہے[6] اس میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ غزل اگر بارہ بیت سے زیادہ ہو جائے تو وہ قصیدہ کہلاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قصیدہ نظم ہی کا نام تھا جو تعداد اشعار میں غزل سے طویل ہے۔

---

(۱) اردو مخطوطات ص ۸۸ (۲) اہل نوائط کی اردو خدمات کا جائزہ (مضمون) نقوش ۱۰۲ ص ۱۳۲
(۳) مضمون تذکرہ شعرائے دکن رسالہ زبان نمبر ۳ جلد نمبر ۲ ۱۹۵۹ (۴) اردو مخطوطات ص ۳۱۴ (۵) اردو مخطوطات ص ۸۸
(۶) مطبوعہ رسالہ ماہی اردو ص ۲۹۸ - ۳۰۹ اپریل ۱۹۲۹

لچھمی نرائن شفیق

لچھمی نرائن شفیق [م ۱۸۰۸/۱۸۰۹ کے بعد] مشہور تذکرہ نویس ہیں انہوں نے اپنا تذکرہ چمنستان شعرا
۱۱۷۶ - ۱۷۶۲ء میں مکمل کیا۔ وہ فارسی میں شفیق اور اردو میں صاحب تخلص کرتے تھے ان کے دیوان دوم
کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کا مخزونہ ہے اس میں قصائد موجود ہیں (۱)۔ لچھمی نرائن شفیق
اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ۱۷۳۹ء میں جب میر غلام علی آزاد اورنگ آباد تشریف لے گئے تو شفیق نے ان کی
شان میں زوردار قصیدہ لکھا (۲) اسکا اولین مصرعہ ہے ع للہ الحمد صبا مژدہ عشرت لائی
یہ فی الاصل غزل ہے لیکن بقول مولوی عبدالحق اسے چھوٹا سا قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ چمنستان الشعرا پر لکھے گئے
اپنے مقدمے میں مولانا نے لچھمی نرائن شفیق کے قصائد کے حوالے دیے ہیں (۳) اور ان پر تبصرہ کیا ہے (۴) یہ قصائد
نواب احمد علی خاں کی شان میں ہیں۔ مولوی عبدالباری آسی نے اپنے ایک مضمون میں لچھمی نرائن شفیق کے
قصیدے کے چند اشعار درج کیے ہیں (۵)

شفیق کے کلیات میں نواب امیر احمد علی خاں کی شان میں متعدد قصائد مندرج ہیں وہ خود
لکھتے ہیں ع یک زبردست ہے میرا والی + یک قوی دل مرا ہے پشت پناہ
یعنی نواب میر احمد خاں + اسد الملک حضرت عالی جاہ
باپ جس کا نظام دولت و دیں + جد ہے جس کا جناب آصف جاہ (۶)

دیوان صاحب ۱۱۸۹ھ میں مرتب ہوا تھا (۷)

ان کے دو مذہبی قصائد کا حوالہ افسر صدیقی نے بھی دیا ہے وہ لکھتے ہیں "دیوان ناقص الآخر ہے
اختتامی اشعار کے بعد شاہ ولایت کی منقبت میں ایک قصیدہ ہے مگر اس کے دو ورق اور اس سے
پہلے کے ½ ورق بہت کرم خوردہ اور خستہ ہیں" (۸) صاحب کا ایک اور قصیدہ سودا کی زمین میں بھی
دستیاب ہے یہ نعتیہ قصیدہ ہے اور ایک ہندو شاعر کے عقیدت مندانہ جذبات کا عکاس ہے۔ اس
قصیدہ کا آغاز یوں ہوتا ہے

ع شام کے وقت میں گل گرد ہے دامن کو جھٹک + صحن میں گھر کے ٹہلتا تھا تفکر میں لڑک
گاہ ایوان سے کرتا تھا خیابان کی سیر + گہہ خیابان میں آتا تھا میں ایوان تلک

اختتام ع خاتمہ ہووے بخیر اب مرا اے ختم رسل + صدقے اس شخص کے جس کو تو کہا ہے لمک
مجھ کو کیا منہ جو درود اب میں زباں پر لاؤں + بھیجتا تجھ پہ ہے صلوات خدا اور ملک (۹)

یہ نعتیہ قصیدہ جس تاثیر بھرے لہجے میں لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشترکہ ہندوستان میں

---

(۱) مخطوطات انجمن جلد چہارم ص ۱۲۵ - ۱۲۶ (۲) چمنستان الشعرا ص ۵ (۳) ایضاً ص ۱۲ تا ۱۸ (۴) ایضاً
(۵) دو نایاب زمانہ بیاضیں اور ان کا انتخاب رسالہ ہندوستانی ۱۹۴۲ (۶) مرقع سخن ص ۸۷ (۷) ایضاً
(۸) مخطوطات انجمن جلد چہارم ص ۱۲۶ (۹) ایضاً ص ۱۰۶ - ۱۰۷

غیر مسلم بھی مسلم تہذیب سے پورے طور پر آگاہ تھے اور بسا اوقات یہ تہذیب ان کی واردات کا حصہ بن کر ان کی تخلیقات میں در آتی تھی۔ لچھمی نرائن شفیق کے الفاظ، تلمیحات، خیالات اور طرزِ اظہار سب کچھ اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ مسلم تہذیبی زندگی کے شب و روز کو اپنے لہو کا حصہ بنائے ہوئے تھے۔

شیخ قلندر بخش جرأت

شیخ قلندر بخش جرأت [م ۱۸۰۹] اردو شاعری کے اساتذہ میں سے ہیں عربی اور فارسی السنہ پر ان کی مہارت متنازع نہیں ہے۔ موسیقی اور نجوم وغیرہ پر بھی انہیں دسترس تھی نواب محبت خاں محبت کے جوان کے استاد بعد ازاں بھی تھے اور نواب سلیمان شکوہ ان کے ممدوحین میں سے تھے۔ ان کے ایک اور ممدوح کا سراغ بھی ملتا ہے مگر اس کا نام دستیاب نہیں ہو سکا۔ یعنی ان کے دیوان میں خلعت "روزِ دسہرہ" کا قطعہ تہنیت بھی ہے۔ قطعہ میں راجہ کا نام مذکور نہیں ممکن ہے کہ یہ مکیت رائے کی شان میں ہو۔ جرأت نے نواب احمد علی خاں شمس الدولہ بہادر کی تعریف میں بھی اشعار لکھے ہیں۔ نواب وزیر علی خاں بھی ان کے ممدوحین کی فہرست میں شامل ہیں① ۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "طبیعت کی تیزی وطراری تھی مگر تنزلے کا زور اور ظرف جا کر گرا تھا یہی وجہ ہے کہ کلام میں بلند پروازی، لفظوں میں شان و شکوہ اور معنوں میں دقت نہیں جس نے قصیدے تک نہیں پہنچنے دیا اور غزل کے کوچے میں لا ڈالا"② رام بابو سکسینہ نے بھی تقریباً یہی بات کہی ہے کہ جرأت نے قصیدہ یا کسی دوسری شکل اور متین صنفِ نظم کو اختیار نہیں کیا"③ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے رائے دی ہے "..... جرأت نے سلیمان شکوہ کے متعلق ایک مقطع میں لکھا ہے "جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم + کہ خدا دلوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے" اور غالباً اسی وجہ سے تمام عمر سوائے غزل کے اور کچھ نہیں کیا قصیدہ ان کی فطرت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا ..... زبان نہایت سادہ اور صاف ہے غالباً اسی وجہ سے قصیدہ کی طرف توجہ نہیں ہوئی"④ دہلی کے دبستانِ شاعری میں نور الحسن ہاشمی نے بھی اسی انداز کی بات کی ہے "انہوں نے قصیدے کی طرف کبھی بھول کر بھی رخ نہیں کیا"⑤ یحییٰ تنہا نے بھی ایسا ہی بیان داغا ہے⑥ یہ سب بیانات محلِ نظر ہیں کیونکہ کلیاتِ جرأت کی جلد دوم⑦ میں چار قصائد ملتے ہیں جن کے مطالع درج ذیل ہیں

① منقبت علی سے — کھلے گر آبلہ دل کی ایک بار گرہ + تو قطرے اشک کے ہو کر پڑیں ہزار گرہ

② ایضاً سے — بھلا بشر کی بھی اوقات کا ہو کیونکہ نباہ + یہ ایک قطرۂ خوں اور سینکڑوں بدخواہ

③ در مدح شاہ کریم عطا سلونوی سے — فلک سے زمیں یاں کیے جبیں مل جا + یہ وہ مکاں ہے جسے کہیے جنت الماوی

④ در مدح سلیمان شکوہ سے — یہ بے کلی نے باغ جہاں سے کیا فرار + آرام کے الف کی ہے صورت پر ایک خار⑧

علاوہ ازیں رضا لائبریری رامپور کے مخزونہ جرأت کے قلمی کلیات میں ایک اور قصیدہ دستیاب ہے جو لیسر راۓ رتن چند کی شادی کے موقع پر کہا گیا تھا۔ یوں ان کے قصائد کی تعداد پانچ ہو جاتی ہے⑨

---

① جرأت اور اس کی شاعری از فائق رامپوری صحیفہ نمبر ۱۸۰ ص ۱۸ ② آبِ حیات ص ۲۰۲
③ تاریخ ادبِ اردو ص ۱۴۱ ④ جرأت ان کا عہد اور شخصیہ شاعری از ابواللیث صدیقی، فکر جرأت ص ۲۰۸، سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۲ ⑤ دہلی کا دبستانِ شاعری
⑥ مراۃ الشعراء ص ۲۸۲ ⑦ مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن اورینٹل انسٹی ٹیوٹ اٹلی جلد سوم ص ۳۰۹، ۳۱۵ ⑧ کلیاتِ جرأت مرتبہ نور الحسن نقوی
⑨ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۳۰۷ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ درست ہے کہ جرأت کی شاعری میں قصیدہ مرکزی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے ان کے لیے یہ صنف شجرِ ممنوعہ نہ تھی۔ البتہ ان کا دنیاوی ممدوح سلیمان شکوہ ہی ہے جہاں تک ان کے پانچویں قصیدے کا تعلق ہے تو اس کا ممدوح ہنڈرسپر ہے اور یہ سہرا نما قصیدہ ہے۔ منقبتِ علی کے علاوہ جرأت نے خانقاہ سلون کے سجادہ نشین پیر کریم عطا صاحب کی مدح بھی کی ہے جس سے ان کے عقائد کا سراغ بھی ملتا ہے

جرأت معمولی درجے کے شاعر نہیں تھے۔ انہیں شاعرانہ زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ادب فہمی اور شعر شناسی میں بھی انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اگر وہ اپنی زبان دانی کے ضمن میں مفاخرت سے کام لیتے تھے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ زبان اور شعر و ادب کی نزاکتوں کی انہیں گہری شناخت تھی وہ یہاں تک کہتے نظر آتے ہیں ؎ اب تو جرأت وہی ہے ریختہ گو + جو مقلد مری زبان کا ہے

جرأت کے اشعار زبان و بیان کے اعتبار سے درجۂ سند تک پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے لسانی اور اظہاری معیارات کے آثار سمیٹے ہوئے ہیں۔ بعض نقادوں نے جرأت کی غزلوں کی سلیس زبان اور تغزل کے پیشِ نظر ان کی قصیدہ نگاری کو خارج از امکان ٹھہرایا ہے۔ لیکن جب ہم ان کے قصائد کا غور سے جائزہ لیتے ہیں تو لامحالہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ شکوہِ الفاظ اور علوِ تخیل کے شاعرانہ اوصاف ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک کامیاب اور اہم قصیدہ نگار ٹھہرتے ہیں۔

جرأت کے قصائد کی تشبیب میں سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ بہار اور اس کے متعلقات کے اظہار میں دیگر اہم قصیدہ نگاروں سے کمتر نہیں ہیں۔ ان میں انہوں نے شکوہ ہائے روزگار و فلک کو بھی خوش اسلوبی سے اظہاری زبان عطا کی ہے

؎ ہر اک ہو صورتِ گل کیوں نہ خرم و شاداں + ہزار رنگ سے ہے اب شگفتہ باغِ جہاں
بہ ہر روش ہے بہ صحنِ چمن بہ صد عشرت + نسیم چوں زنِ رقاص چار سو رقصاں
مشامِ جاں کو معطر کرے ہے اب سب کی + بسانِ کوچۂ عنبر فروش جملہ جہاں

؎ ہزاروں سینکڑوں آزار ایسے مہلک ہیں + کہ گر کہوں میں مفصل تو ہے بیاں جاں کاہ
سو سب بشر ہی کے رہتے ہیں جان کے درپے + ہر اک عدو کی طرح وقت ہی تکے ہے آہ
بسانِ بیضۂ فولاد وا نہ ہو کہ مرے + فلک نے کام میں دی ہے وہ استوار گرہ
برنگِ گل میں پریشان اور ہوتا ہوں + کھلے ہے عقدۂ دل کی جوں غنچہ وار گرہ
وہ میرے بختِ سیہ کے سبب ہے بس کی گانٹھ + رکھے ہے یار کی جو زلفِ تابدار گرہ

جرأت کا قلم صنفِ مدح پر بھی روانی آشنا ہے۔ شاہ کریم عطا سلونوی کی مدح میں ان کے اشعار گواہی دیتے ہیں کہ وہ قصیدہ گوئی کے جوہر سے آگاہی رکھتے تھے

بہ شکلِ چترِ فلک کیوں نہ ہو زمیں پہ نثار + زبس کہ خطرِ حق چار سو ہے جلوہ نما
ہر ایک کوچہ سے نکلے ہے یاں رہِ تسلیم + یہ وہ مقام ہے کہیے جسے مقامِ رضا
ہزار رنگ سے مشغولِ ذکرِ خالق ہے + ہر شاخِ گلشنِ جنت رکھے ہے یاں کی ہوا
بہ شکلِ سبحہ ہے دانائے رفتِ دست نگر + یہ ایک رشتۂ آبِ وضو درِ یکتا
وہ کہہ کے مطلعِ ثانی سناؤں اسمِ شریف + کہ جس کی خوبی کو پہنچے نہ مطلعِ اولا
مہِ سپہرِ شرافت ضیائے مہر و صفا + درِ محیطِ کرم حضرتِ کریم عطا
چراغِ بزمِ کرامت گلِ حدیقۂ کشف + فروغِ محفلِ عرفان و خضرِ راہِ ہدا
بہارِ باغِ شریعت نثارِ نامِ رسول + شرارِ برقِ تجلی حصارِ برجِ سرا

مذکورہ اشعار میں جرأت نے ممدوح کے احوال و معمولات کے ساتھ ساتھ اس کے گرد و پیش کے بعض معمولات کو بھی مدح کا حصہ بنایا ہے۔ مذہبی تقدس، صوفیانہ فضا، خانقاہ اور اس کے بعض متعلقات اس قصیدے کا حصہ ہیں۔ جہاں تک زورِ بیاں کا تعلق ہے جرأت اس معاملے میں اپنے حریف معاصرین سے پیچھے نہیں ہے جرأت کے عہد میں قصیدہ شاعرانہ فضل و کمال کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ انہوں نے اس میدان میں بھی کو اپنے نقوشِ قدم سے نوازا ہے۔ جرأت نے زبان و بیاں کو بھی اہمیت دی اور اختراعی معانی کو بھی۔ کہنے والوں نے شاعری کو معنوی مصوری سے تعبیر کیا ہے۔ جرأت نے جو شاعرانہ تصویریں بنائی ہیں وہ معانی اور صناعی کے آمیزے سے تیار ہوئی ہیں۔ ان کی عروسِ فکر زیور سے لدی دکھائی دیتی ہے

تہذیبی حوالے سے بھی جرأت کی شاعری تفصیلات سے مملو ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کی بہتات کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان افکار و خیالات سے بھی پورا پورا استفاضہ کیا ہے جو مشترکہ ہندوستان کی مخصوص فضا میں مسلم شعور میں راسخ تھے۔ خانقاہی نظام کی جانب عوام کے جھکاؤ سے لے کر بزرگ و برتر مذہبی شخصیتوں کی مدح و ستائش تک کے رجحانات ان کی شاعری کا حصہ بنے ہیں۔ رقص و موسیقی کے حوالوں سے لے کر شرافت کے آسمان کے چاند کے تذکرے تک ان کے قصیدے متنوع موضوعات کے حامل ہیں مذکورہ اشعار و احوال سے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں ہے کہ یہ شعرا جس معاشرے میں سانس لے رہے تھے اس میں مقامی اور غیر مقامی کئی تہذیبی روشیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں مسلم شاعروں کو بسا اوقات دوسرے اوروں کی تعریف میں قصیدے لکھنے پڑتے تھے اور غیر مسلم شاعروں کو مسلم مذہبی اور غیر مذہبی شخصیتوں کی مدح کے عمل سے گزرنا ہوتا تھا۔ چتر اور سبحہ کا ایک ہی قصیدے میں تذکرہ بھی اسی امر کی نشاندہی ہے لیکن اس کے باوجود حقائق کی روشنی میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ بہارِ باغِ شریعت اور فروغِ محفلِ عرفاں کے جلوے اردو شاعری کے غالب جلوے ہیں۔ مقامِ رضا، مشغولِ ذکرِ خالق، آبِ وضو، چراغِ بزمِ کرامت اور گلِ حدیقۂ کشف جیسی ترکیبیں یاد دلاتی ہیں کہ اردو شاعری اور زبان پر مسلم تہذیبی اثرات کی گہری چھاپ ہے

شیر محمد خاں ایمان

شیر محمد خاں ایمان م ۱۸۱۰ء[۱] کا تعلق ریاست حیدرآباد سے تھا۔ ان کے کلیات میں ۱۰ قصائد ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے "ان کے بیسوں شاگردوں نے میدانِ سخن میں شہرت حاصل کی ہے" وہ مزید کہتے ہیں کہ دیوانِ دکن ارسطو جاہ کی مصاحبت میں رہتے تھے اور سفر و حضر میں ان کے شریک تھے۔[۲] انہوں نے قصائد کے پانچ سو کے قریب اشعار لکھے ہیں۔ ان کے ممدوحین میں نظام علی خاں، ارسطو جاہ، جہاں پرور بیگم وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے منقبت علیؓ اور نعتِ رسولِ مقبولؐ پر مشتمل قصائد بھی کہے ہیں۔ مجموعہ نغز میں قدرت اللہ قاسم نے ان کے ایک قصیدے کے یہ اشعار دیے ہیں۔

اے ابرِ عنایاتِ خدا، آیۂ رحمت + سرسبز ہوا تجھ سے گلستانِ وزارت
گلشن میں زمانہ کی کبھو پیرِ فلک نے + دیکھا نہیں ہنستا گلِ خندانِ وزارت
ایمان کی یہ حق میں دعا تیرے ہے دن رات + اے موجبِ شادابیٔ بستانِ وزارت
طوبیٰ کی طرح سایہ فگن سر پہ جہاں کے + تا حشر ہو سر پہ ترا دامانِ وزارت[۳]

دکن میں اردو کے مصنف نے ان کے ایک قصیدے کا انتخاب دیا ہے ملاحظہ ہو

ہوا ہے آج شبِ ماہتاب کا یہ وفور + کہ شش جہت کو جو دیکھو ہے ایک عالمِ نور
زمیں جو دیکھو تو ہے خوانِ نقرہ گویا + ہے آسماں سے بھی سرپوشِ نقرہ کا ظہور
ہے بس کہ دامنِ صحرا پہ نور پاشیٔ ماہ + ہر ایک کوہ ہوا کوہِ برف سے مشہور
نکھوں کو اور بھی ایمان آبِ نقرہ سے + جو ہو دے خامۂ الماس اور لوحِ بلور
کہ اک لطیفۂ مضمونِ خاص کا اظہار + ہے ایسی طرز کہ ہند سے مجھے منظور
کہ فیضِ عام ہے یہ ایک روشِ اختر کا + ہیں جس کے عہد میں اشاد کام سب جمہور
امیرِ اعظم و عالی ہمم ارسطو جاہ + وزیرِ شاہِ دکن فخرِ قیصر و فغفور
دعا پہ ختم میں کرتا ہوں اب قصیدے کو + الٰہی تا ہے یہ گردشِ سنین و شہور
برنگِ صبح رہیں رو سفید تیرے دوست + سیاہ رو ہوں عدو تیرے جوں شبِ دیجور

ایمان کے قصیدے روایتی انداز کے حامل ہیں وہی ممدوح کو جمشید ثانی کہنا، کیقباد سے اس کا نسب ملانا، بذل میں فریدوں، عدل میں کسریٰ اور جہاں کشائی میں سکندر و تیمور قرار دینا، البتہ کہیں کہیں تراکیب و الفاظ کی تازگی سے قاری کشش محسوس کرتا ہے۔ خوانِ نقرہ، کوہِ برف وغیرہ کی ترکیبوں کا نیا پن ان کی شاعرانہ صلاحیت کا غماز بھی ہے۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے بسا اوقات چمکتے ہوئے معانی کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ ایمان نے تخیل کی صناعی اور مہارت سے خوب استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے "قادر الکلامی کی وجہ

---

(۱) افسر صدیقی امروہوی نے تاریخ وفات ۱۸۰۶ء لکھی ہے، مخطوطات انجمن جلد چہارم ص ۱۲۹ (۲) دکن میں اردو ص ۳۲۵
(۳) مجموعہ نغز قدرت اللہ قاسم ص ۹۵-۹۶

سے ہم ایمان کی شاعری کو "پختہ و صاف شاعری کی ذیل میں لاسکتے ہیں۔"[1] وہ اپنے اشعار میں معنی شیریں سے دلچسپی پیدا کرنے کے قائل تھے[2] و صحت ترکیب وغیرہ پر غور کرنے کا تذکرہ بھی ان کے اشعار میں ملتا ہے[3] ایمان اپنی طبع کو نیساں کہتے ہیں اور اپنے اشعار کے ہر لفظ کو گوہر۔[4] وہ بیاں تنگ بیان کرتے ہیں

سہ سیکھ لے ہم سے تو ایمان مضامیں کی تراش + بانذ لغتا کچھ نہیں اشغال زباں آنکھوں میں

ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول "یہی قادر الکلامی، مبالغے اور معانی آفرینی کے ساتھ مل کر ان کے قصائد کو قابل توجہ بنادیتی ہے۔ ایمان کے قصائد میں علم و فضل کا اظہار بھی ہے اور فنی اعتبار سے بھی وہ اچھے قصیدے ہیں خصوصیت کے ساتھ قصیدہ جلوس آصفی اور قصیدہ تہنیتِ تاریخ قصیدہ ہیں یقیناً قابل ذکر ہیں"[5]

شیر محمد ایمان کے قصائد میں مطالع کتنے چونکس اور توجہ کھینچنے والے ہوتے تھے ان کا اندازہ لگانے کے لئے یہ مطالع ملاحظہ ہوں سہ ہرچند غرق ہم رہے جوں گوہر آب میں + لیکن کبھو کیا نہیں دامن تر آب میں [قصیدۂ نعت]

سہ ساقی پلا شراب کہ ہے موسم بہار + دل چاہتا ہے کیجئے گلگشت لالہ زار [قصیدۂ منقبت]

سہ شکر اللہ اب سعادت پر ہے دور آسماں + راحت و آرام سے معمور ہے سارا جہاں [جلوس آصفی در مدح نظام علی خاں]

سہ جہاں کے بیچ ہے اب یہ نوید شہرہ عام + کہ عشرت و طرب و عیش و راحت و آرام [جشن نوروز]

سہ عجب بہار ہے آیا ہے اب کے خرم سال + زمانہ عیش و طرب سے ہوا ہے مالا مال [ایضاً]

سہ نیلم کے سریر اوپر بیٹھا جو شہ خاور + اور سر پہ رکھا زریں زینبدہ عجب افسر [در مدح نواب شمس الدولہ محمد شمس میاں]

جہاں کے بیچ وہ آئی ہے اب کے فصل بہار + کھلے ہیں لالہ و گل جو طرف ہزار ہزار [شادی نواب میر اکبر علی]

شکر خدا بہار ہے عہد شباب ہے + ساقی پری نژاد ہے جام شراب ہے [در مدح اعظم الامرا]

ہے لبسکہ مہر کیانی کی آج سالگرہ + ہوا ہے بدر کی مانند اب ہلال گرہ[6]

شیر محمد ایمان نے نوروز کی تقریبات کے حوالے سے بھی قصائد لکھے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جشن (قلی قطب شاہ، سودا اور بہت سے شاعروں نے بھی اسے موضوع بنایا تھا) ہند کی مسلم حکومتوں کے لئے خاص اہمیت کا حامل تھا۔ ایمان نے نوروز کے حوالے سے لکھے ہوئے اپنے قصائد میں "معنی شیریں" سے جان ڈال ہے۔ ایمان نے اپنے تمام قصائد میں زبان کی شیرینی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ نئی نئی طرز سے "لطیفہ و مضمون خاص بیان کرنے کے قائل تھے۔"

ایمان کے قصائد میں مدحیہ حصے ممدوح کے مرتبے اور مقام کے مطابق لکھے گئے ہیں ان میں دعا اور حسن طلب کے حصے بھی بڑی نفاست سے تیار ہوئے ہیں۔ ممدوح کے دشمنوں کو بد دعا اور دوستوں کو دعا دینے کا عمومی وغیرہ انہوں نے بھی اختیار کیا سہ برنگ صبح رہیں رو سفید تیرے دوست + سیاہ رو ہوں عدو تیرے جوں شب دیجور

---

① تاریخ ادب اردو جلد دوم ص ۹۷۱ ② شعر ہوتا ہے کب ایمان کسو کا دلچسپ + جب تلک معنی شیریں نہ ہوں تحریر میں جان
③ سہ غور کر صحت ترکیب کو ہر مصرع میں + سقم رکھتی سی نہیں اپنے تو اشعار کی نبض
④ سہ طرز یہ نہیں آسان طبع ہے کہ ہے نیساں + شعر کا تیرے ایمان لفظ ہے ہر ایک گہر
⑤ تاریخ ادب اردو جلد دوم ص ۹۷۲ بحوالہ دیوان ایمان نسخہ قلمی، انجمن ترقی اردو کراچی

میر تقی میر

میر تقی میر [م ۱۸۱۰] میدانِ غزل کے شہسوار ہیں۔ ان کے مطبوعہ کلیات میں قصائد بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ یہ قصیدے ان کی شاعرانہ عظمت میں نہ تو اضافے کا باعث ہیں اور نہ ہی کمی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ صنف ان کے لئے مایۂ افتخار نہیں ہے۔ ان کے مطبوعہ کلیات میں سات قصائد ہیں[1] ان میں دو آصف الدولہ کی مدح میں بشمول ایک شاہ عالم کی تعریف میں اور چار منقبتی ہیں۔ ادارہ ادبیاتِ حیدرآباد کے مخزونہ کلیاتِ میر (قلمی نسخہ) میں ان کا ایک قصیدہ "در نفاقِ یارانِ زماں" بھی موجود ہے۔ کلبِ علی خاں فائق رامپوری نے میر کے آصف الدولہ کی مدح میں لکھے گئے رائیہ قصیدہ کے بارے میں بالتحقیق ثابت کیا ہے کہ وہ آصف الدولہ کی بجائے عماد الدولہ کی تعریف میں ہے وہ لکھتے ہیں "ہماری رائے میں میر کا قصیدہ رائیہ عماد الملک کی تعریف میں ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ میر نے لکھنؤ پہنچنے کے بعد اس کا عنوان بدل دیا ہو اور جو قصیدہ پہلے عماد الملک کی مدح میں تھا اسے عماد الملک کے زوال کے بعد نواب آصف الدولہ کے نام سے منسوب کر دیا ہو اور فورٹ ولیم کالج کے مطبوعہ کلیات میں آصف الدولہ سے انتساب میر کی خواہش کا آئینہ دار ہو" [2] بہر حال جو بھی صورت ہو آصف الدولہ کے لئے اسے لکھا گیا ہو یا عماد الملک کے لئے یہ ممدوحین دورِ زوال سے متعلق ہیں اور ان کے کارناموں کے خلط ملط ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔ غالب اور کئی دوسرے شعرا کے بارے ایسا کیا ہے کہ ایک ممدوح کی شان میں لکھے جانے والے قصیدے کو کسی دوسرے کے نام کر دیا۔ لیکن ان میں سے کوئی ممدوح بھی فاتح سومنات نہیں تھا چنانچہ ان کی مدح میں لفظی توصیف و تحسین (اور وہ بھی یکسانیت آمیز) ہی کا اہتمام ہو سکتا تھا۔

دستور الفصاحت میں مرقوم ہے کہ ایک دن میر تازہ قصیدہ کہہ کر آصف الدولہ کے دربار میں لائے۔ نواب چاشت سے فراغت پا کر قصیدہ سننے لگے۔ میر صاحب نے قصیدے کو طول دیا چنانچہ اسی دن ملا محمد نامی ایک مغل کو جو شاعر بھی تھا اور ولایت سے تازہ آیا ہوا تھا ملازمت کی غرض سے حضور میں لائے ہوئے تھے۔ چاہتے تھے کہ اس سے بھی کچھ پڑھوائیں۔ لیکن میر کے قصیدے کے طول کے باعث وقت نہ بچا ملا محمد نے تنگ آ کر کہا "میر صاحب قصیدہ خوب ہے لیکن طولانی، اگر نواب کا دماغ وفا نہ کرتا تو کون سنتا" میر نے یہ سنتے ہی بیاض زمین پر پھینک دی اور منغض ہو کر کہا "اگر نواب کا دماغ وفا نہیں کرتا تو میرا دماغ کب وفا کرتا ہے" آدابِ درباری کا مطلق خیال نہ کیا۔ نواب تو خلق مجسم تھے ہی انہوں نے انتہائی مہربانی کا اظہار کیا اور ان کی طبیعت کی بے لطفی دور کی، پھر پورا قصیدہ سنا اور ملا کی پرواہ نہ کی [3] دستور الفصاحت کی یہ روایت محلِ نظر ہے۔ اس لئے کہ میر کے ہاں ایسا کوئی طولانی قصیدہ موجود نہیں ہے کہ جس کو سنتے سنتے سامعین اکتا جائے۔

---

(۱) کلیاتِ میر مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور

(۲) مضمون میر کا ایک قصیدہ ماہنامہ اردو جنوری ۱۹۶۸ء ص ۴۲ (۳) دستور الفصاحت ص ۲۵-۲۶۔

میر کے کلام میں سودا کے مقابلے میں کم قصائد کا ہونا اس امر کا غماز ہے کہ ان کی طبیعت اس صنف سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ میر کے دور میں قصیدہ گوئی کو قادر الکلامی کا وسیلہ جانا جاتا تھا اس میدان میں سودا کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا۔ میر کے قصائد ان کی طبیعت کے دھیمے پن کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔ میر نے جس انداز کے قصائد لکھے اس دور میں اس کی توصیف ممکن نہیں تھی۔ اس دور پہ کیا موقوف ہے بعد کے مبصرین نے بھی اس انداز کو قصیدے کے لئے پسندیدہ نہیں ٹھہرایا عبد الغفور نساخ کا کہنا ہے "میر سوائے قصیدہ کے تمام اصناف سخن پر قادر تھے" [1] گلشن بے خار میں شیفتہ نے ان کی غزل گوئی کی تعریف کی ہے اور قصیدے کو اس کے مقابلے میں 'پست پایہ تر' کہا ہے۔ [2] میر کے قصائد کے بارے میں سخن فہموں نے مثبت آرا کا بھی اظہار کیا ہے عبد السلام ندوی نے میر کے قصائد کا سودا کے قصائد سے مقابلہ کر کے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ وہ چند امور میں سودا کے ہم پلہ بلکہ ان سے بڑھ کر نظر آتے ہیں۔ [3]

ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ شہنشاہ قصیدہ گوئی سودا کے مقابلے میں شہنشاہ غزل کے قصائد کم تر درجے کے ہیں لیکن شیفتہ نے ان کے لئے جو پست پایہ تر کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ قصائد میں وہ خوش فکر کے مالک نہ تھے ان سے نا اتفاقی ہے۔ شیفتہ میر کے قصائد کا تجزیہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ میر کے قصائد میر کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ قصیدے کی اس متغزلانہ روش سے متعلق ہیں جسے اردو کے متاخرین قصیدہ گو شعرا نے بام عروج پر پہنچایا۔ میر کے قصائد کی سادگی اور روانی قابل تعریف ہے۔ بسا اوقات وہ روایتی قصیدہ نگاری کے شوق میں اپنے قصائد میں شاندار الفاظ اور باوقار تراکیب کے انبار لگانے کی بھی کوشش کرتے ہیں سودا نے فارسی کی تقلید میں ایسے عمدہ قصیدے لکھے کہ اردو میں فارسی قصیدے کا معیار حاصل ہوا۔ میر نے اس روش سے الگ رہنے کی کوشش کی یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد کا مزاج جذباتی شاعری کا ہے۔ میر نے تکلف اور اہتمام کے عناصر کو اس صنف سے دور رکھنے کی سعی کی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے غزلیہ مزاج کی چھاپ قصیدے پر بھی لگائی۔ مگر یہ انداز اپنے زمانے میں شرف مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ قصیدہ گوئی کے فارسی معیارات کو حرف آخر ماننے والے نقادوں اور تذکرہ نگاروں کے دلوں میں میر کے قصائد کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ میر کو بھی اس حقیقت کی خبر تھی چنانچہ انہوں نے فارسی قصائد کی تقلید کی کوشش میں بھی قصائد لکھے اور مبالغہ آرائی، شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کا سہارا لیا۔ ایسے تقلیدی قصائد میں وہ مصنوعیت کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں۔ دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کی وجہ سے ان کے بعض قصائد میں ناہمواری دکھائی دیتی ہے

---

[1] سخن شعرا ص ۴۷۹ [2] گلشن بے خار تذکرۂ میر [3] شعر الہند جلد اول ص ۱۶۸، ۱۶۹

میر کے قصائد کے حوالے سے مولانا عبدالسلام ندوی کی یہ رائے ملاحظہ ہو " اس زمانہ میں جو چیزیں قصیدہ گوئی کا معیار خیال کی جاتی تھیں ان سے ان کے قصائد خالی ہیں۔ انہوں نے مشکل زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ علوم و فنا کی تشبیہیں نہیں لکھی ہیں۔ طولانی قصائد بھی ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ ان کے یہاں عموماً الفاظ کی شان و شوکت بھی موجود نہیں' قصائد میں ان کی بندشیں بھی چست نہیں ہوتیں "

میر کے قصائد میں شعریت کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ان میں اپنے جذبات کا خلوص و صداقت پر مبنی اظہار بھی کیا ہے۔ ان کے اشعار میں غزل کا سا جوش، تاثیر اور سوز بھی مل جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر قصائد میں روش میر اختیار کی جاتی تو صنف قصیدہ کے عصری حوالے سے مفید نتائج پیدا ہوتے۔ بہر حال میر کے قصائد کی مخصوص تاثیر کے باعث انہیں اردو شاعری کے اثاثے کا اہم حصہ سمجھا جا سکتا ہے میر کے رنگ تغزل کی یہ صورت دیکھیے

ے اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال + اب تک ہے وحشتی میں وہی میرا بال بال
میں مرگیا فراق میں پر اب یہ کیا ہے ظلم + جیتی گڑی ہے ساتھ تو حسرت وصال
جنبش ہوئی مژہ کو ادھر گڑگئی سناں + ابرو ہلے ترے کہ ادھر کٹ گیا ہلال
آیا ہے یاد تیس بہت اب کہیوں بہ تنگ + اس کے تغافلوں نے مجھ کو نہیں چھوڑتے غزال
خوش وقت تک تو ہوں یہ کیسی کا ہیں ہوں گھر + آزردہ ہوئے مجھ سے اگر خاطر ملال
رنگ اڑا گیا تبھی کہ ہوا تجھ سے چہرہ گل + رکھے ہے اب نسیم کی سیلی سے منہ کو لال
دوزخ ہے میر شرم گنہ کی عرق میں غرق + لیکن نہیں ہنوز مجھے تک بھی انفعال
خوش تھا عشق کو آہ کے کب پہنچتا ہے سرو + ہے یہ تو باغ رنگ شکستہ کا نونہال (۱)

میر کے منقبتی قصائد کے مطالع ملاحظہ ہوں

منقبت علی رضو ے جب سے خورشید ہوا ہے حمل افروز حمل + رنگ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے ادھمل
منقبت علی رضو اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال + اب تک ہے وحشتی میں وہی میرا بال بال
منقبت علی غنچے ہو دل پہ آتے ہیں اندوہ ایام + پھولوں تجھ ہے مجھ کو داغ گل جنگ صبح و شام
منقبت امام حسین فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجھ کو شکار + ہزار کوس پہ ہے جائے اک تپیدن وار

دنیاوی ممدوحین کی شان میں قصائد کے مطالع

در مدح آصف الدولہ رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب + آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب
در مدح شاہ وقت جو پہنچی قیامت تو آہ و فغاں نے + قرار آگیا تو ہیں دامن آسماں سے
در مدح آصف الدولہ ہوا کیسے ہیں زبس شکوہ فلک تحریر + سیہ ہے کاغذ مشق کے رنگ لوح ضمیر

---

(۱) کلیات میر ص ۱۱۰۷ مرتبہ عبادت بریلوی

جہاں تک قصیدہ نگاری کے ظاہری لوازم کا تعلق ہے میرؔ نے ان کی مکمل پابندی کی ہے۔ پُرجوش
اور پُرکشش مطالع، عمدہ تشابیب، گریز کی ملائمت، مدح میں خیال و راتیب اور دعا اور حسنِ طلب کی
نزاکتیں میر کے قصائد کو پُرمایہ بناتی ہیں۔

میرؔ کی تشابیب کا موضوعاتی دائرہ وسیع نہیں ہے۔ بہاریہ، عشقیہ اور شکایتِ روزگار پر مشتمل تشابیب
ان کے ہاں عموماً ہیں۔ البتہ اپنے سیاسی اور سماجی ماحول کی تصویر کشی سے اُن میں انہوں نے سروکار نہیں رکھا
زمانے کی شکایت میں بھی میرؔ نے رسمی انداز اختیار کیا ہے۔ نواب آصف الدولہ کی شان میں ان کے
بائیہ قصیدہ میں گردشِ روزگار کے موضوعات کا مؤثر اظہار ہے۔ اس میں بھی میرؔ نے اپنے معاصر عہد کی
معاشرتی بدحالی اور اہلِ علم و ہنر کی کسمپرسی کا تذکرہ نہیں کیا۔ مضامین حسن و عشق کے بیان میں یہاں
میرؔ اپنی غزلوں ہی کی طرح بلیغ نظر آتے ہیں۔ یہ مضامین انہوں نے لطیف انداز سے سپردِ قلم کیے ہیں۔
جہاں تک بہاریہ تشابیب کا تعلق ہے ان میں میر نے اپنی مثنوی نگاری کے تجربے سے مکمل استفادہ کیا
ہے۔ ان کی قلمی تصویریں تاثیر میں ڈوبی محسوس ہوتی ہیں۔ میرؔ ملائم منظروں کی جانب راغب تھے
ان کے مقابلے میں سودا کے ہاں طمطراقیت اور شوخ رنگ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں دونوں شاعروں
کے لامیہ قصیدہ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ میر نے لوچ دار زبان استعمال کی ہے لیکن سودا نے
بارعب مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل + تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل [سودا]
جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروزِ حمل + رنگِ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل

میرؔ نے بہاریہ تشابیب میں محاکات اور تخیل آفرینی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک جگہ انہوں نے
عرفیؔ کے ایک خیال کی تقلید میں شعر لکھا ہے

برگِ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو + آگ کی گر کہیں سلگائے رکھیں ہیں منقل

سودا نے عرفیؔ کے مذکورہ مصرعے "اخگر از فیضِ ہوا سبز شود در منقل" پر تضمین کی ہے
میرؔ کی ایک بہاریہ تشبیب کے اشعار ملاحظہ ہوں

وقت وہ ہے کہ بس شوق سے چشمِ بلبل + خوبیِ رنگینیِ گل دیکھنے کو ہو احول
جوشِ گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر + لالہ و نرگس و گل سے بھرے ہیں دشت و جبل
لطفِ روئیدگی مت پوچھ کہ ہیں شیشے میں یوں + سبزہ غلطاں ہے لبِ جو یہ کہ خوابِ مخمل
چشم رکھتا ہے تو چل فیض ہوا کو ٹک دیکھ + نرگس اُگتی ہے جہاں بوئی تھی دہقاں نے بصل
سیر کر تازگی و خرمی و نشو و نما + خشک بھی شاخ نہ اب سبز نکالی کونپل
خونِ خمیازہ کشِ عاشق و پنجۂ گل + دونوں نکلے ہیں تہِ خاک سے اب دست و بغل

میر تقی میر نے تشبیب میں حالیہ کوائف بھی قلمبند کیے ہیں۔ ان کوائف کے اظہار میں میر کے غزلیہ لہجے کی دردمندی جھلکتی ہے۔ انہوں نے اپنے رنج والم کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ گردشِ زمانہ، فلک کے جور و ستم خرابیٔ قسمت اور اپنی زندگی کے جزو اعظم یاسیت کے معاملات ان کے قصائد میں دیدنی ہیں۔ ان کے داخلی اور شخصی کوائف کے حوالے سے یہ اشعار دیکھیے

غنچے سے دل پہ آتے ہیں اندوہ بے مدام + پہنچے ہے مجھ کو داغ گل جنگ صبح و شام

فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجھ کو فگار + ہزار کوس پہ ہے جا بڑے اک تپیدن وار

بہ چیدنِ رخِ جاناں بچشم وا مانده + بہ سعی باطل ناخن بہ عقدۂ دلِ کار

بہ سینہ کوبیِ زخمِ جگر بہ ماتمِ میر + بہ جاں کنی گلو گیرِ حسرتِ دیدار

کروں نہ شکر جفا ہائے آسماں کیوں کر + مری خرابی میں ان نے نہ کی کبھو تقصیر

جور و ناسیوں میں بھی غبارِ دل سے + تو آنسو کا سیلاب رنگِ رواں ہے

لوٹتا تھا سوزِ غم سے آگ میں + دل جگر سنکے تھے دونوں جوں کباب

پر زماں تھی ہسالو اپنے گفتگو + کیا کروں شہر اور میں دونوں خراب

تھا کرم شیوہ جنہوں کا اٹھ گئے + بیٹھے بیٹھے کھینچیے کب تک عذاب

جا بیٹھے کس در اوپر کون ہے + ملیے کس سے کون ملنے کا ہے باب

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے + خراب کوچہ و بازاریاں محبت ہے

باتفاق اگر دو عزیز مل بیٹھیں + زبانِ مردم بد سے انہوں پہ آفت ہے

میر نے گریز کے حصوں پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ان میں کوئی خاص اہتمام بھی نظر نہیں آتا

کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر + اے طبع رہ نہ اتنی بھی پابندِ خط و خال

پڑھ لو منقبت یہ شاہ کی جس سے نجات ہو + وہ شاہ جس کے ایک گدا کو ہے یہ کمال

غزل کو سن کے کیا ہمنشیں نے مجھ سا شخص + بجا ہو خاک ہو گر پیشِ آستانِ وزیر

مدح میں میر کی خوددار طبیعت اور انانیت کی بدولت وہ رنگ تو پیدا نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے کوئی قصیدہ پُر وقار اور پُر شکوہ بنتا ہے۔ تاہم انہوں نے غیر مستحقین کی تعریف سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ مذہبی قصائد میں ان کا اظہارِ عقیدت پُر تاثیر ہے۔ دنیاوی ممدوحین کی شجاعت، عدل، سخاوت و حشمت کے خصائص کو متین الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ممدوح کے ساز و سامان اور گھوڑے کی تعریف وغیرہ میں انہوں نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ تیر و شمشیر، فوج، ہاتھی اور مطبخ وغیرہ کی تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ ممدوح کے لیے انہوں سوارِ دولت، گنجینہ بخش، دشمن گیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میر نے حصہ مدح میں جس نوع کی مبالغہ آرائی کی ہے وہ فارسی قصائد کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے

؎ تر ہو گئی ہے بس کہ لہو سے یہ گل زمیں + گر خشک ہوئے خاک کہیں بعد ماہ و سال

ہو پھر گزار باد صبا سے یہ واں کا رنگ + اڑتا ہے جیسے ہولی کے ایام میں گلال

من بعد اور باقی رہیں جتنے کشتنی + کر جمع ان کو زور شجاعت سے پیل بال

تلوار لے پھرے تو وہ پھر جائے روزگار + نعرہ کرے تو تن سے کرے روح انتقال

نعرہ سے اس کے بیلوں میں بیت یوں رہ گئے نہ + بھاگے ہے جیسے شیر کی آواز سے شغال

نہیں ہے فیل کہ زر لبفت پوش کوہ ہے یہ + کروں شکوہ کو اس کی تو کس روش تنظیر

رواں رکاب میں ہے آسمان زر گو یا + ستارے جھول کے ایک ایک آفتاب نظیر

جان یہ ہے نرے گھوڑے کو کرنا روز جزا + گرد کو اس کی نہ پہنچے گی کبھو اس کی اجل

میر کے ہاں بعض جگہوں پر تسلسل و روانی اور اختصار و جامعیت کے خصائص عمدہ طور پر استعمال میں آئے ہیں ۔ ان کے مدحیہ اشعار میں تشبیہ و استعارہ کی ندرت و لطافت بھی قابل داد ہے ۔ البتہ بعض مقامات پر خیال و بیان کی سستی اور ناہمواری بھی دیکھنے کو ملتی ہے ۔

میر کے قصائد میں ان کے مذہبی عقائد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ ان کی عبارت انہیں اپنے بزرگوں سے گہری عقیدت کے اظہار پر مائل کرتی ہے ۔ انہوں نے اپنے مدحیہ قصیدہ میں شیعیت کا تذکرہ کیا ہے

؎ دور از بسکہ کھچا عرش سے رتبہ تیرا + حرف تیرا ہے ترے شیعوں کو وحی منزل

انہوں نے دشمنان اہل بیت کے لئے بد دعا کی ہے

؎ ہرگز نہ ہو حلال عدو پر ترے خوشی + ہو دے تمام تیرے محبوں پہ غم حرام

رہے ہمیشہ ترے دوستوں کے ساتھ اقبال + عدو کو تیرے نہ دے فرصت ایک دم ادبار

میر اپنے ماحول سے نالاں اور مایوس ہو کر غبار کی طرح اڑ کر کربلا پہنچنے کے متمنی ہیں

؎ یہ آرزو ہے قرِ دل میں مدتوں سے شہا + رہے نہ بعد مرے ہند میں یہ مشت غبار

اڑا دے اس کو صبا یاں تلک کہ لے پہنچے + تجھ آستان کے آگے کہ ہے فلک کردار

میر نے قصائد کی زبان کو دلچسپ بنانے کے لئے تشبیہات و استعارات اور محاورات کے استعمال کے ساتھ صنائع بدائع سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ کہیں کہیں فارسی تراکیب کا استعمال بھی نظر آتا ہے " تپیدن وار" صوت جرس، "مشت غبار"، "خوردن خوں" اور "دیدۂ خونبار" وغیرہ یہ تراکیب جس فنی مہارت سے استعمال ہوئی ہیں وہ میر ہی کے شاعرانہ کمال کا حصہ ہے ۔ ایک جگہ انہوں نے آبلوں کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے

؎ آبلے جیسے ستارے ہیں قرِ دل کے بیچ

استعارے کی خوبی ملاحظہ ہو ؎ آج تجھ نیر اعظم کی خلافت کا ہے دور + داد دے میری کہ دیکھوں میں اسے مستاصل
محاورے کا استعمال بھی عمدہ ہے ؎ کو دنے کو جو اٹھا سر پہ اٹھالی مجلس + دیکھیے بیٹھے جو پھر اونٹ تو بیٹھے کس کل

تلمیح کی خوبصورتی ؎ یہ سر و مہری شیریں یہ کینۂ خسرو + یہ گرمجوشی فرہاد و سختی کوہسار

مبالغے سے اشعار میں جس نوع کا حسن پیدا ہو سکتا تھا وہ میر کے ہاں مفقود ہے، بسا اوقات ان کا پیرایۂ بیان بھی عجیب ہو جاتا ہے ایسا لگتا ہے وہ اپنے مزاج کے خلاف مدح میں الجھے ہوئے ہیں، مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے " امراکی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل و قناعت انہیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے یا خود پسندی اور خود بینی جو انہیں اپنے آپ میں غرق کیے دیتی تھی تو وہ زبان سے کسی کی تعریف نہیں نکلنے دیتی تھی " ① آزاد کی یہ بات تو درست ہو سکتی ہے کہ وہ مدح امرا میں ناقص اظہار کے حامل تھے لیکن ایسا تو نہیں ہے کہ انہوں نے امراء کی مدح ہی نہیں کی۔

میر کے قصائد میں گلال، ہول، ہفت گنجِ خسروی، سام، افراسیاب، سروش، ہاتفِ غیبی، جم، جمشید وغیرہ کے الفاظ سے ان کے ہاں عجمی ہندی روایت کا سراغ ملتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ میر نے صنفِ قصیدہ کو اپنے مخصوص مزاج کی چھاپ سے ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی یہ وہ رنگ ہے جو خلوص اور تاثیر سے معمور ہے اور اس میں غزل کے سوز اور نغمگی کا عمل دخل ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر کے قصیدوں کو سودا کے مقابلے میں کمتر درجے کے قرار دیا ہے ② ان کے خیال میں میر کے قصائد میں مذکورہ شعرا کے قصائد جیسا تنوع، تسلسل، تشبیب اور مدح کی شان نہیں ہے۔ جمیل جالبی نے یہ بھی کہا ہے کہ "میر کا قصیدہ ایک مکمل وحدت نہیں بنتا بلکہ پڑھتے وقت ایک طرح کی بے دلی کا احساس ہوتا ہے۔ نہ ان میں مبالغے کا جادو ہے کہ ممدوح پر اثر کرے اور نہ موضوعات کا تنوع" ③

قصائد کے حصہ دعائیہ میں بھی میر نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تاہم بعض جگہوں پر ان میں ان کے انا پسندانہ مزاج کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں

؎ دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ + کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے

تری عمر ہو میر طولِ امل سی + کرم کا سرِ رشتہ اک تیرے ہاں ہے

---

① آبِ حیات ص ۲۰۸ تا ۲۰۹ ② ③ تاریخ ادبِ اردو جلد دوم حصہ اول ص ۴۲۳

ضمیمہ
باب چہارم

چند اور قصائد نگار

● نول رائے وفا [۱۷۵۰ء] قائم کے شاگردوں میں سے تھے خوب چند ذکا نے وفا کے ایک قصیدہ رثیہ کے دو شعر نقل کیے ہیں۔ اس قصیدے کا محرک یہ ہوا کہ نواب نجیب الدولہ کے صحن کی حویلی میں ایک بار بہت مٹی پڑی تھی وفا کا پاؤں پھسل گیا انہوں نے اس پر قصیدہ لکھا اور اسمیں کہا سے کیا کہوں میں کہ کس قدر دلدل + ہے درونِ حویلی سرکار

کہ وفا واں پڑے جو سیٹھ ترغ + پشت ماہی پہ جا کے پاؤں تو دار (1)

● عارف الدین عاجز [م ۱۷۶۵ء] اورنگ آباد میں رکن الدین کے رسالہ سواراں میں بخشی گیری کی خدمت پر مامور ہوئے وہ مشکل پسند اور نازک خیال شاعر تھے۔ قصائد بے تنفعا میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کا بیشتر کلام لاپرواہی کی بدولت تلف ہو گیا (2)

● ابو الحسن قرب [م ۱۷۶۸/۱۷۶۹] بیجاپور سے متعلق تھے ۱۲ برس کی عمر میں ارکاٹ آ گئے ان کے کلیات کے قلمی مخطوطہ میں ایک نظیر قصیدہ موجود ہے جس میں بے پردگی کے موضوع پر اظہارِ خیال ہے۔ اس میں وہ مرد مطعون ہوئے ہیں جو اپنی عورتوں کو بے پردہ گھماتے ہیں (3)

● فدوی پنجابی [م ۱۷۷۱ء] کہ جن کی ہجو میں سودا نے اشعار لکھے ہیں۔ انہوں نے ایک قصیدہ احمد شاہ کی تعریف میں کہا۔ احمد شاہ نے اس کے عوض ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا در تلوار سے نوازا۔ وہ ملک الشعرائی کا دعویٰ کیا کرتے تھے (4)

● مرزا علی نقی ایجاد [م ۱۷۷۱/۱۷۷۲] نواب ناصر جنگ شہید [حیدر آباد] نے انہیں خدمتِ دیوانی پر مامور کیا تھا ان کا دیوان کتب خانہ نواب سالار جنگ میں محفوظ ہے اس میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں وہ صرف اہلِ بیت کے مداح تھے

سہ پھر میں نہ جانوں کیا ہے زمانے کا اقتضا + دل جس کا دیکھیے تو ہے اس عصر میں خفا

فکروں میں چور پنجم درویش ہیں سبھی + اندوہ میں تمام ہیں کیا شاہ کیا گدا

دارِ دنیا ہے منزلِ فانی	+	اس کا اصل بنا ہے ویرانی
کہہ قصیدہ امام پنجم کا	+	کر شروع ان کی منقبت خوانی
سایۂ ذاتِ حق ہے ان کی ذات	+	خلق پر ہیں وہ ظلِ سبحانی

کوئی جی ہنس ہے خوش دل کوئی دل ہنس ہے بے غم + گویا کہ ان دنوں میں ماتم سرا ہے عالم [قصیدہ در مدح امام حسین]

اس قصیدے میں واقعاتِ کربلا کا تفصیل سے ذکر ہے۔ مکہ، کربلا، فرات، ابن سعد، زور بازوئے عباس، قاسم کی کتخدائی، علی اکبر، علی اصغر وغیرہ کے حوالے موجود ہیں۔ وہ طویل قصائد لکھتے تھے اور عربی کا بے جا استعمال کرتے تھے (5)

● نور محمد صاحی [م ۱۷۹۱/۱۷۹۲] برہان پور کے رہنے والے تھے۔ آصف جاہ اول کے پاس آنے سے قبل انہوں نے نظیر الدولہ کی مدح میں ایسا عمدہ قصیدہ لکھا کہ اس نے انہیں داروغۂ قلمدان بنا دیا (6)

● ۱۷۷۰ء کا لکھا ہوا ایک قصیدہ جو رسالہ عقائد گروہ میہ وہاں بھی ملتا ہے جسکا ایک مصرعہ حق حاضر ہے حق ناظر ہے (7) / ہے

---

(1) عیار الشعرا ص ۷۶ (نسخہ خطی لندن) مائیکرو فلم پنجاب یونیورسٹی لاہور (2) تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند ساتویں اردو ادب دوم ص ۸۵ - ۸۶ (3) مخطوطات انجمن جلد چہارم ص ۱۸۹

(4) آبِ حیات ص ۱۵۵ (5) مرقع سخن ص ۳۶ ، ۳۲ - ۲۲ - ۲۱ (6) دکنی ادب کی تاریخ ص ۱۲۲ (7) مقالات محمود شیرانی حصہ دوم ص ۲۰۰ - شیرانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ قصیدہ محمد حی عیاں کا ہو

- اسی عہد کے ایک اور دکنی شاعر سید محمد نے قصیدہ بردہ کا ترجمہ قصیدہ کی ہیئت میں کیا۔(١) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور کے شعرا کا عربی قصائد سے بھی تعلق رہا کرتا تھا اس کے آغاز میں ٢٩ اشعار(٢) بطور دیباچہ ہیں اصل قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے

  اے محبِ قریادتوں ہمسایہ شہرِ سلیم + جب سے انجواں سوں ملا جاری کیا لہو و میدم

- حافظ فضل علی ممتاز [م ١٢٤١ھ / ١٨٢٥ء] سودا کے شاگرد تھے ان کے دیوان کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کی ملکیت ہے اس میں دو قصائد نعت اور تین قصائد منقبت موجود ہیں(٣) لیفرالدین ہاشمی نے لکھا ہے انہوں نے نواب والاجاہ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں(٤)
- نواب محمد یار خاں امیر [م ١٧٧٠ء] نواب علی محمد خاں روہیلہ کے بیٹے تھے۔ پرزور اور رنگین قصائد لکھتے تھے۔ انہوں نے نعتیہ قصائد بھی لکھے۔ ایک قصیدہ سامانِ ہولی مرزا رفیع سودا کے قصیدہ رزمیہ بہار کے تتبع میں کیا(٥)
- مرزا عظیم بیگ عظیم [م ١٧٧٠ء میں زندہ تھے] شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ سودا کی تقلید میں غزلیں اور قصیدے لکھتے تھے۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد لکھنے میں مہارت تھی(٦)۔ ان کے ریختہ کے قصائد سے طبیعت روشن ہو جاتی تھی(٧) میر حسن نے انہیں سودا کا شاگرد لکھا ہے(٨)
- محمد صبیح عالم خاں نیاز [١٧٧٠ء میں زندہ تھے] بلدہ سنبھل کے متمولین میں سے تھے۔ قصائد اور مثنویاں بھی لکھتے تھے(٩)
- میر امانی اسد [م ١٧٧٠ء میں زندہ تھے] سودا کے شاگرد تھے۔ دلی میں کچھ عرصہ نواب افضل خاں سے وابستہ رہے وہاں سے لکھنؤ اور پھر دکن پہنچے۔ انہوں نے ایک دیوان مرتب کیا تھا جس میں قصیدہ مثنوی اور غزل کی اصناف میں طبع آزمائی ہے(١٠)
- ضیاء الدین پروانہ [١٧٧٦ء سے قبل فوت ہوئے] سراج اورنگ آبادی کے خلیفہ مجاز اور غلام علی آزاد بلگرامی کے تلامذہ میں تھے ان کے قلمی دیوان مخزونہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ایک قصیدہ دستیاب ہے(١١)
- مولانا محمد حسن محزوں الہ آبادی نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قصیدے لکھے تھے وہ ١٧٧٨ء میں فوت ہوئے(١٢)
- میر محمد حسین عطا تحسین ١٧٨٥ء میں زندہ تھے۔ انہوں نے شجاع الدولہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا(١٣) یہ خطابیہ قصیدہ ہے اسمیں لکھا ہے کہ اگر دریا مداد ہو اور اشجار قلم ہوں تو بھی اس کے کمال کا اظہار نہیں لکھا جا سکتا۔ اس کی ہمت عالی سے دنیا کا عرصہ گوہر بار ہے۔ اگر اس کی سخاوت کا ابر بہار نہ برسے تو زمانے کا چمن شبنم سے محروم رہے۔ عطا نے اس قصیدے میں فیض آباد کی تعریف کی ہے

  زبس ہوا نے طراوت سے واں کیا ہے گزار + عقیق رنگ بدل کے رہے زمرد وار
  کمال فیض طراوت سے برسرِ ہر سنگ + شرر کے تخم سے جمتا ہے واں درختِ انار
  گر اس طرف سے صبا ہو کے باغ میں جاوے + درخت خشک وہیں سبز ہو کے لاوے بار

اس کے شہر پناہ کی خوبی کا بیان کرتے ہوئے عطا لکھتے ہیں کہ یہ عمدہ کتابہ ہے جدول کے سنگھار کی مانند ہے اور اس کا قلعہ فلک رتبت ہے اور یہ نقش و نگار کی بدولت زینتِ ہندوستان ہے۔ تحسین نے موضوعات و خیالات کو روایتی انداز سے قلمبند کیا ہے تاہم فارسی طرز کا شکوہ بھی نظر آتا ہے۔

- میر عبدالقادر مہربان ١٧٨٠ء میں زندہ تھے۔ لچھمی نرائن شفیق نے ان کے قصائد کے اشعار کی تعداد دو ہزار بتائی ہے(١٤) وہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ نجوم اور جفر سے واقف تھے۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے مولانا غلام علی آزاد سے تلمذ تھا(١٥)

---

(١) انڈیا آفس لائبریری میں ہندوستانی قلمی مخطوطات انگریزی از جیمز فلر بلوم ہارٹ ص ١٢ (٢) یورپ میں دکنی مخطوطات ص ٢٩٣ - ٢٩٢
(٣) جائزہ مخطوطات جلد اول ص ١٢١ / ٤٥٥ (٤) کتب خانہ سالار جنگ مرحوم کی قلمی اردو کتابیں ص ٢٤٣ (٥) طبقات الشعرا ص ١٨٨ (٦) طبقات الشعرائے ہند ص ١٨١ - ١٨٢
(٧) مجموعہ نغز جلد دوم ص ١ (٨) تذکرہ شعرائے ہندی ص ٢٥٦ (٩) طبقات شعرا ص ٣٤٣ (١٠) طبقات الشعرائے ہند ص ٩٦ (١١) مخطوطات انجمن جلد چہارم
(١٢) تذکرہ مسرت افزا ص ٢١ (١٣) تذکرہ مسرت افزا ص ٥ (١٤) چمنستان شعرا ص ٢٩٨ (١٥) دکن میں اردو ص ٣٢٩

- شاہ واثق لکھنوی [۱۷۸۵ میں زندہ تھے] مثنویاں، قصیدے اور رباعیاں سب اچھی کہتے تھے، منقبت لکھنے میں شہرت تھی (۱)
- میر غلام حسین شورش م [۱۷۸۰/۱۷۸۱] تذکرہ شورش کے مولف تھے ان کا اپنے بارے میں بیان ہے کہ انہوں نے قصیدہ بھی کہا ہے (۲)
- مرزا علی عیش دہلوی ۱۷۸۲ سے قبل زندہ تھے ان کے قلمی دیوان میں ایک ۲۲ اشعار کا قصیدہ منقبت علی رضا ہے (۳)

اس کا ایک شعر ہے ؎ یہی سوال رکھے تم سے عیش یا شہدا + کہ مشت خاک کو اس کی نجف میں کر جا گیر (۴)

- محمد علی شوق م ۱۷۸۸ء کا تعلق اورنگ آباد سے تھا وہاں سے حیدر آباد آکر انہوں نے آصف جاہ ثانی کی مدح میں قصیدے لکھے
- بالاجی ترمبک نائک ذرہ ۱۷۸۵ میں زندہ تھے۔ ان کا تعلق نظام علی آصفجاہ ثانی کی حکومت سے تھا۔ کتب خانہ آصفیہ میں ان کا قلمی دیوان موجود ہے۔ صادق علی خاں خورشید جنگ (۵)، احمد میر خاں اور عبدالرحیم خاں اور امیر بیگ خاں ان کے ممدوح تھے۔ برہان پور کے صوفی حکیم شاہ عبدالقدوس المتخلص بہ اقدس کی مدح بھی انہوں نے لکھی ہے (۶)
- میر اسد علی تمنا [م ۱۷۸۹/۱۷۹۰] نے تذکرہ گل عجائب لکھا۔ ان کا کلیات نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے (۷)
خلیق احمد نعمانی کے کہنے کے مطابق اس میں دس قصائد موجود ہیں یہ قصائد آئمہ اطہار اور دنیاوی ممدوحین کی شان میں ہیں۔ ان کے دو قصیدے آصف جاہ ثانی کی مدح میں ہیں، ایک قصیدے کی گریز کے اشعار ملاحظہ ہوں

؎ لیکن گرہ وہ جس سے کہ دل کی گرہ کھلے + دنیا میں نہیں ہے ایک گرہ کے سوا گرہ
گرچاہتا ہے تو کہ ہو واشد اسے نصیب + ناخن سے بستگی کی جو ہو وے رہا گرہ
چل ایک بارگاہ وزارت پناہ میں + وہ کئی دنوں سے دل میں جو ہے بندھا گرہ
نواب مستطاب معلی جناب کی + ہوگی کرم سے عقدۂ مطلب کی وا گرہ

ان کے ہاں بہاریہ تشابیب بھی ملتی ہیں وہ اکثر ان کے درمیان غزلیں بھی لکھتے تھے (۸) ان کے قصائد کے یہ اشعار دیکھئے

؎ باغ جہاں میں یارب جب تک گل لقا ہو + گلشن ہو باغباں ہوں غنچہ ہو اور صبا ہو
شاعر ہو اور رنگیں مضموں ہو دست بستہ + پائے نگار ہو اور رنگینی حنا ہو
قمری ہو اور صنوبر پروانہ اور چراغاں + میں اور حصول میری خاطر کا مدعا ہو (۹)
کرتا ہے کار بستہ سے نت چرخ وا گرہ + ناخن ہلال پاس ہے انجم ہے تا گرہ (۱۰)
سبحہ ہزار دانہ کا ہے یا گہر کی سلک + یا زلف میں صنم نے گرہ پر دیا گرہ
میں نے کہا کہ شکر خداوند ذوالجلال + تا صد ہزار راس میں ہو نام خدا گرہ
مدحت سرا ہوں اس کا وہ ممدوح ہے مرا + کیونکر رکھوں نہ ہر میں زبان ثنا گرہ

اسد علی تمنا نے اپنے قصائد میں علمی اصطلاحات کا عمدہ استعمال کیا ہے۔ نجوم سے ان کی دلچسپی مذکورہ اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے

---

(۱) معیار الشعراء ص ۱۹۲ و تذکرہ ہندی ص ۲۴۹ (۲) دو تذکرے، تذکرہ شورش دیکھیے ص ۸۷ (۳) مخطوطات انجمن جلد اول ص ۱۸۸ (۴) اردو مخطوطات ص ۱۲۰
(۵) مرقع سخن جلد دوم ص ۷۹ (۶) مضمون بالاجی ترمبک ذرہ، اردو نامہ، مئی ۱۹۷۱ (۷) مرقع سخن ص ۲۷ (۸) ایضاً ص ۷۳
(۹) دکن میں اردو ص ۲۵۲ - ۲۵۳ (۱۰) طبقات شعرائے ہند ص ۲۸۶

- محمد عابد دل عظیم آبادی کے بارے میں میر غلام حسن نے لکھا ہے وہ غزل، قصیدہ اور مثنوی کہنے میں مہارت رکھتے تھے (۱)
وہ محمد روشن جوشش کے بڑے بھائی تھے۔ علی ابراہیم کا کہنا ہے دل کے اشعار "مثل ناخن کے جو دل کو تراشتا ہے بہت خوب ہیں (۲)
اسی دور کے ایک اور مقصیدہ نگار خان بہادر نوازش علی شیدا بھی تھے۔ وہ دکن سے متعلق تھے اور نعتیہ قصائد لکھتے تھے (۳)
- فرح بخش ارمان ۱۷۹۰ (۱۷۹۱) کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ امراء اور رؤسا کی مدح کرتے تھے اور جائزے اور صلے پاتے تھے (۴)
- خوب چند ذکا کے حوالے سے لکھا گیا ہے شیخ ولی اللہ محب دہلوی م ۱۷۹۲ (۱۷۹۳) قصیدہ گوئی میں ملکہ رکھتے تھے (۵)۔ محب کا قلمی دیوان انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں کوئی قصیدہ نہیں ہے (۶)۔ کسی دوسرے تذکرہ نگار نے ان کے اردو قصائد کا ذکر نہیں کیا۔
- میر محمدی بیدار م ۱۷۹۳ء کا تذکرہ مصحفی نے تذکرہ ہندی میں کیا ہے ان کا بیان ہے کہ بیدار کے دیوان میں نعت اور منقبت کے دو تین قصائد موجود تھے (۷)۔ میر محمدی بیدار کے دیوان قلمی، مملوکہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں بھی کوئی قصیدہ نہیں ہے (۸)۔ علاوہ ازیں ان کے دو مطبوعہ دیوان بھی قصائد سے عاری ہیں (۹)
- محمد شریف مفتون ۱۷۹۵ میں زندہ تھے۔ اورنگ آباد سے متعلق تھے نواب نصرت جنگ سے رابطہ رکھتے تھے ان کے قلمی دیوان میں تین نعتیہ قصائد موجود ہیں ان کے مطالع ملاحظہ ہوں

ع برنگ سبزہ سراسر ہو جس میں غلطاں + تمیز ہو سکے کیا اس کا اول و ثانی
اے عشق اب مجھے تو گل زعفراں سمجھ + اور دل کے شیشے کو درد ارغواں سمجھ
دل بے چارے کو نہیں جوش تمنا وصل + خوب نہیں ہم سے فلک کا وش تمنا وصل (۱۰)

- شاہ آیت اللہ جوہری م ۱۷۹۵ء ان کا تعلق بہار کے قصبہ بہن سے تھا۔ بنارس بھی گئے ان کا ایک قصیدہ اپنے عہد کے حالات کی بھرپور عکاسی پر مشتمل ہے (۱۱)۔ اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ان دنوں دین کی شوکت رہی ہے اور نہ مسلمانی تو اس دور میں طغیانی کی صورت ہے۔ مسجد خراب ہے۔ محراب صنم خانہ بن گئی ہے۔ ابلیس میر ساماں ہے۔ خدا کا گھر اندھیرا ہے دیر کا چراغ روشن ہے۔ اذانوں کی گلبانگ کم سنائی دیتی اور بت خانوں میں ناقوس عام سنائی دیتے ہیں۔ برہمن قشقہ کش کی توقیر ہے، عالم جینے کا عمومی رواج ہے۔ صوبے دار ہندو ہیں اور ہندو کو ہی دیوانی دی گئی ہے۔ مسلمان کو ان کی مجلس میں توقیر نہیں ہے وہ اس طور سے سلام لیتے ہیں جیسے سر میں مگس رانی کرتے ہوں۔ ہر کافر کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ دجال ہے۔ لیکن اسے ختم کرنے کے لئے نہ عیسیٰ فلک سے اترا ہے اور نہ ہی کوئی مہدی آیا ہے کہ جس کی بدولت ہر گھر میں اسلام کا چراغ کشتہ روشن ہو۔ نہ دنیا میں خیر و برکت رہی ہے اور نہ مہر و محبت، حرص حیوانی بڑھ گئی ہے۔ نہ بیٹے کو باپ سے شفقت ہے اور نہ مادر کو دختر سے بھائی بھائی سے حسد کرتا ہے۔ دنیا میں قناعت نہیں رہی وہ اب عنقائے مغرب ہے۔ لجاجت اور سماجت کی گرم دکانی ہے مرد دانا کا دامن خاک سے بھرا رہتا ہے اور نادانوں کی کمر میں زر ہمیانی ہے۔ کوئی اس دور میں پاک لوگوں کو نہیں پوچھتا استنجائے شیطان کے کلوخ اور سنگ موقر ہیں۔ نجیبوں پہ حالت ہے اور کمینوں کی بنی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں

---

(۱) تذکرہ شورش ص ۲۸۱ (۲) بحوالہ طبقات الشعرائے ہند ص ۸۳ (۳) دکن میں اردو ص ۳۳۳۔۳۴۴ (۴) تذکرہ شعرائے دکن، جلد دوم ص ۸۹۸
(۵) بحوالہ عیار الشعرا مقصد نگاران اتر پردیش ص ۲۴۸ (۶) جائزہ مخطوطات اردو ص ۳۶۱ تا ۴۶۲ (۷) تذکرہ ہندی ص ۴۲ (۸) مخطوطات انجمن جلد چہارم ص ۱۴۳۔۱۴۴
(۹) دیوان بیدار مرتبہ محمد حسن محوی و دیوان بیدار مطبوعہ الہ آباد (۱۰) مفتون از اسد صدیقی اردو ہوں رسالہ شاد کو نوٹ نمبر
(۱۱) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۲۹۲ تا ۲۹۴

؎ مگر زلفِ پری رویاں کو گہرے خواب میں دیکھا + کہ گرتی ہے در و دیوار سے بارش پریشانی
رباب و چنگ سے جاں سوز تر ہے آہِ مظلوماں + ہوا بیشہ نیستاں اور دلِ عالم نیستانی
رگیں نالاں تر ہیں تارِ رباب و چنگ بربط سے + کہ دستِ گوشمالِ چرخ سے عالم ہے افغانی
ہوا گوشِ فلک کا گر فغانِ دادخواہاں سے + نہ کھولے کان گل کا نالۂ مرغِ شبانی

شاید آیت اللہ جوہری کے اس قصیدے میں اپنے عہد کی غیر اخلاقی سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ مذہبی تضادات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔

● میر حیدر علی حیران (۱۸۰۰ میں زندہ تھے) لالہ سرب سکھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔(۱) نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں ان کا ایک سنگلاخ قصیدہ تذکرہ نگاروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔(۲) یہ تعقید اور سنادت کا مظہر بنے ہوئے ہے۔ اس کے ہر شعر میں چار چیزوں کا ذکر ہے ؎

جگر و جان، دل و سینہ بہم چاروں ایک + شور و بے تابی و اندوہ و الم چاروں ایک
بیٹھے جس دن سے تری راہ میں سمجھے تب سے + بوریا، خاک و نمد مسندِ جم چاروں ایک
مشرق و غرب، جنوب اور شمال اے غافل + جستجو میں پڑے کرتے ہیں بہم چاروں ایک
صوفی و زاہد و ترسا و برہمن پیارے + بندگی کرنے میں تیری ہیں بہم چاروں ایک
نہ کتابت نہ ملاقات نہ جلوہ نہ پیام + جی جلانے کو ہمارے ہے یہ غم چاروں ایک
تو ہی جب پاس نہیں ہے تو ہمارے نزدیک + ہستی و نیستی و شادی و غم چاروں ایک
آپ کے دل میں جو کچھ آوے سو کیجے یاں تو + ہو گئے جور و ستم، لطف و کرم چاروں ایک

● جعفر علی حسرت [۱۸۰۶ء میں زندہ] بنیادی طور پر مثنوی نگار تھے لیکن ان کی غزلوں میں قصیدے کا سا شکوہ غالب ہے ان کے قصائد کی خیال بندی کا تذکرہ نگاروں نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔(۳) کریم الدین کا کہنا تھا کہ وہ قصیدہ اور غزل سودا کے طور پر لکھتا تھا(۴)

● معین الدین م ۱۸۰۶ء بداؤں کے رہنے والے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کی شان میں ہر سال قصیدہ جشن پیش کیا کرتے تھے(۵) میر حسن نے انہیں سودا کا شاگرد کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی طبیعت میں وقت پسندی تھی(۶) شاعری وسیلۂ روزگار تھی۔

● اسی دور میں شاہ عالم بادشاہ المتخلص بہ آفتاب م ۱۸۰۶ء کے قصائد کا تذکرہ بھی ملتا ہے(۷) قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ " اپنے قلم جواہر رقم سے اس شہسوار میدانِ شاعری نے فارسی و ریختہ کے مکمل اور مرتب دیوان جن میں غزلیات، قصائد اور دیگر اصنافِ سخن ہیں، تحریر کیے"(۸)

● میر شیر علی افسوس م ۱۸۰۹ء فورٹ ولیم کالج کے ملازم تھے ان کے دیوان میں مذہبی ممدوحین (حضرت علیؓ، امام حسنؓ، امام موسیٰ رضاؓ) کی ثنا میں چار اور غیر مذہبی ممدوحین (آصف الدولہ، مارکوئیس ولزلی، بارلو اور برک) کی مدح میں پانچ قصائد موجود ہیں۔(۹) یہ قصائد روایتی مدحیہ اور تشبیبی مضامین پر مشتمل ہیں

؎ اب بڑی نظم کی تو گوندہ لاشنا میں اس کی + صدف کون و مکاں میں ہے جو یکتا گوہر

---

(۱) تذکرہ شعرائے ہندی ص ۱۰۸ (۲) تذکرہ مسرت افزا ص ۸۲ (۳) تذکرہ ریختہ گویاں ص ۲۱۵ (۴) طبقات شعرائے ہند ص ۲۰۱
(۵) طبقات الشعراء ص ۲۷۳ (۶) شعرائے ہندی ص ۲۹۱ (۷) بحوالہ عمدہ منتخبہ ص ۳ (۸) مجموعۂ نغز ص ۱۸-۱۹ (۹) کلیات افسوس مرتبہ سید ظہیر احسن

- سید ثابت علی شاہ ثابت م ۱۸۱۰ء کہ جن کا تعلق ملتان سے تھا اردو اور فارسی میں قصائد اور ہجویات لکھتے تھے (۱)
- ضیاء الدین ضیا [پیدائش ۱۷۷۴ء] سندھ کے اردو شاعر تھے۔ اردو میں ان کا ایک دیوان موجود ہے جس میں قصائد بھی شامل ہیں۔ ضیا کا تعلق میران تالپور کے عہد سے تھا (۲)
- شاہ عنوتی م ۱۸۱۰ء ارکاٹ کے صوفی منش شاعر تھے ان کا ایک قصیدہ ضیافت نامہ اردو مخطوطات میں ملتا ہے (۳)

یہ قصیدہ عنوتی نے اپنے مرشد کے کہنے پر لکھا تھا۔ اس کے سو اشعار ہیں۔ اس میں اس ضیافت کا بیان ہے جو حضرت عثمان رض اور حضرت فاطمہ رض نے آنحضرت صلعم کی کی تھی اس کے آغاز و اختتام کے اشعار درج ذیل ہیں

آغاز ؎ اول کریم حق کی صفت ہے بعد ختم مرسلاں + ان پر درود در ہے سدا جو ان کے ہیں اصحابیاں

مرشد کے جو فرمان سے بولیا روایت عوثیا + مرقوم ہے راوی ستی سننا ضیافت کا بیاں

اختتام ؎ عاصی ہے یہ عنوتی امتی ہے فاطمہ بنت رسول + کرتا عطا بندہ اوپر ہر دو جہاں کی نعمتاں

ہے صدق جو عدل و حیا شیر خدا کا دلگن + کر خاتمہ ایمان پر اے خاتم پیغمبراں (۴)

ذیل میں ان قصیدہ نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جنہوں نے ارسطو جاہ م ۱۸۰۳ء کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ ان شاعروں کی تاریخ پیدائش و وفات کا علم بھی نہیں ہو سکا اور نہ ہی ان کے اشعار ملے ہیں ان میں الفت محمد الفت (۵)، امداد (۶)، انوار (۷)، میر محمد علی عشق (۸)، میر محمد علی خاں ماہ (۹)، فرسون (۱۰)، موزون (۱۱) اور نعیم (۱۲) اور صدق (۱۳) شامل ہیں۔ ارسطو جاہ کی مدح میں میر صادق علی ناشر [حیدر آباد] (۱۴) جعفری (۱۵)، حمایت [حیدر آباد] (۱۶) خاص (۵) رضا محمد رضا [دکن] (۱۷)، سکندر [خلیفہ محمد علی] (۱۸)، شہرت [دکن] (۱۹) غیرت [دکن] (۲۰) فیاض [حیدر آباد] (۲۱) مجرم (۲۲)، نوید (۲۳) نادی (۲۴) محمد داؤد مبنر (۲۵) اور یک رنگ نے (۲۶) بھی قصائد لکھے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے اشعار ملاحظہ ہوں

؎ اعدا کی صف پہ جب چلے وہ تیغ آبدار + ہوں ایک کے تو دو وہیں اور دو کے ہوویں چار [میر صادق علی ناشر]

جہاں ہے فرحت و بہجت سے رشک صد گلزار + ہوا ہے روئے زمیں غرق سے باغ و بہار [جعفری]

آج کے دن جو کھلا باغ مسرت کا در + دیکھتا کیا ہوں کہ ہے جشن چمن ہیں اکثر

اس طرف نعرہ کناں سرو پہ قمری ہے وہاں + اسی طرف بلبل شیدا ہے تصدق گل پر [حمایت]

تار کھیے قطعہ گلشن کو جہاں کے مشموم + خاص اس تازہ مضامین چمن کی بو باس

سرو ز سینبدۂ گلزار دکن آصف + شمع تابندۂ ایوان رواق کسریٰ (۲۷) [خاص]

---

(۱) تاریخ ادبیات اردو پاکستان جلد اردو ادب دوم ص ۳۷۱ (۲) میران تالپور کے عہد میں اردو شعر و ادب کی ترقی مضمون حسین الدین در دائرۂ اردو نام اپریل ۱۹۷۴ء

(۳) اردو مخطوطات ص ۹۱ (۴) ایضاً (۵) تا (۱۳) خزینۃ العلوم بالترتیب ص ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۸۶، ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۰۳، ۲۰۴، ۱۸۴

(۱۴) عمدہ منتخبہ ص ۱۹۱ (۱۵) خزینۃ العلوم ص ۱۵۵ (۱۶) عمدہ منتخبہ ص ۲۲۱ (۱۷) عمدہ منتخبہ ص ۲۸۲ - ۲۸۳ (۱۸) خزینۃ العلوم ص ۱۶۳

(۱۹) عمدہ منتخبہ ص ۳۸۱ (۲۰) ایضاً ص ۳۵۴ (۲۱) خزینۃ العلوم ص ۱۹۱ (۲۲) ایضاً ۱۹۶ (۲۳) ایضاً ۲۴ (۲۴) ایضاً ۲۲۳ (۲۵) ایضاً ۲۰۰

(۲۶) ایضاً ص ۲۳۱ (۵) ایضاً ص ۱۵۷ - ۱۵۸ (۲۷) خاص آصف جاہ کا مداح بھی تھا

ؔ فیض بخش جہاں کرم تخمیر + ہے بجا وصف جو کروں تحریر
سکہ جاوے بیاں ارسطو ہے + علم و حکمت فراست و تدبیر [رضا محمد رضا]
توسن ایام پر اقبال ہے تیز اسوار + نقرۂ وشکی جلو میں جس کے ہیں لیل و نہار [خلیفہ محمد علی سکندر]
ہے کج روی پہ ہمیشہ یہ چرخ ناہموار + کروں جفاؤں کا اس کی میں کس سے استفسار [شہرت]
مجھ سے چھوڑ اے سپہر زنگاری + روش کج روی و عیاری [غیرت]
خاتمہ بالخیر ہو یارب کریم + بسم اللہ الرحمن الرحیم [مجرم]
ہوا آہنگ بر پا جس گھڑی مجھ سے خوش الحانی کا + چھپا پردہ میں جا کر زمزمہ راگ غزل خوانی کا [نوید]
ہرچند ہے حوائج بشری سے دلفگار + پر حرف احتیاج سے ہے سخت ننگ و عار [نادی]
کیا گھٹا ہے بادلوں میں اور برستی ہے پھوار + سبز ہے صحرا تمام اور سرخ ہے سب کوہسار [محمد داؤد سبز]
گر کھینچے سیف عدو کش تری بروز جہاد + احد کو دو کرے دو کو ربع ہفت کو ہفتاد [یک رنگ]

ان شاعروں کے علاوہ امتیاز [اسد علی خاں تمنا کی بیوی اور بقول نصیر الدین ہاشمی اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ] (۱) غلام احمد [برہان پور سے متعلق] (۲) حاجی قدرت اللہ بلیغ [حضرت فخر الدین زاہد کی اولاد میں سے تھے] (۳) برج ناتھ خیال [شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے اور حیدرآباد میں گئے] (۴) زماں [خدا بندہ خاں افغان کا بیٹا] (۵) غازی [دکن سے تعلق] (۶) ندا [دکن کا شاعر] (۷) اور ہمت (۸) وغیرہ کے قصائد بھی دستیاب ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ؔ جب کبھی آتا نظر وہ چہرۂ گلنار ہے + سلسلہ ہوتا ہے برپا اشک آتش بار ہے
دیکھنے میں ہے وہ یا کیو دکھا نا لطف ہے + جی میں آتا ہے کہ پوچھو ساقی سرشار ہے [امتیاز]
مدح نواب اعظم الدولہ ؔ شکر خدا نشاط جہاں میں ہے آشکار + غنچے دلوں کے کھل گئے گلشن میں آئی ہے بہار
یاں تک ہوا ہے جشن کہ شبنم چمن کے بیچ + گوہر کے ڈالتی ہے گلوں کے گلے میں ہار [غلام احمد]
خوشی و غم [جو] زمانے میں نہ ہوتے توام + خندہ صبح یہ زینہار نہ روتی شبنم [قدرت اللہ بلیغ]
موج تبسم گل خنداں کا پر تو + اس طرح جلوہ ساز لب جو نبار ہے
جیسے کہ عکس معنی رنگیں کو بر زماں + آئینۂ خیال سخن ور میں بار ہے [برج ناتھ خیال]
احمد خاں بنگش کی مدح ؔ با شان و با شکوہ وہ عالی مقام ہے + جس شخص کا خدائی میں نام ہے
لاکھوں ہی اس کے سایے میں پاتے ہیں تربیت + تابع ہیں اس کے سب وہ و دار الملک ہے [زماں]
کیا ں میں عندلیب دل کو شگفتہ لے بہار آئی + نسیم عنبریں بھی بوئے گل پر اب سوار آئی [غازی]
صبح ہاتف آ خبر دل کے کانوں میں پکار + یوں کہا دیوانے کیا سوتا ہے اٹھ ہو ہشیار
وا شد دل مدعا ہے گر تو کر سیر چمن + دیکھ آنکھیں کھول کیسی ملوم ڈالے ہے بہار [ندا]

---

(۱) مضمون نقوش ۱۹۶۱ (۲) عمدہ منتخبہ ص ۹۶ (۳) ایضاً ص ۱۵۲-۱۵۳ (۴) ایضاً ص ۲۵۲ (۵) ایضاً ص ۳۱۱
(۶) خزینۃ العلوم ص ۱۸۷ (۷) خزینۃ العلوم ص ۲۴۶ (۸) عمدہ منتخبہ ص ۸۱۲

۵ جلو میں تہنیت گویاں ظفر ہمت نمایاں ہو + جناب اعظم دوراں کو جس دم عزم میداں ہو
خدا محفوظ رکھے تجھ کو چشم زخم اعدا سے + یہ رزم و بزم تائیدات غیبی فضل یزداں ہو [ہمت]

مجموعی جائزہ

شمالی ہند اور بعض دیگر علاقوں میں اٹھارہویں صدی کے اردو قصائد کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں قصیدے کے ابتدائی دور کے نقوش بھی ملتے ہیں اور عروج وشباب کے زمانے کی بھرپور صورتیں بھی مہیا ہوئی ہیں۔ سودا سے قبل جن لوگوں نے قصائد لکھے انہیں قابل اعتنا نہیں جانا گیا لیکن اس امر سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس عہد میں دستیاب ہونے والے قصائد میں سیاسی حالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ، شعرا کے داخلی جذبات کا اظہار بھی ہوا ہے اور سماجی ماحول کی تصویریں بھی سامنے آئی ہیں۔ ان سے ایک نوع کی تاریخ گوئی کا احساس بھی ہوتا ہے سچے جذبات کی ترجمانی میں ابتدائی دور کے قصیدہ نگار کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ ان قصائد میں درباری ممدوحین کے جنگی اور ثقافتی امور کی نشاندہی بھی ہوئی ہے۔

سودا اور اس کے معاصرین نے قصیدے میں زور بیان، بے تکلفی اور فطری لب ولہجہ کو داخل کیا۔ البتہ اس دور میں یہ صنف اظہار جذبات یا عرض صداقت سے زیادہ شاعروں کے فضل وکمال کے اظہار اور زبان وبیان کی حشمتوں کی تظہیر کا وسیلہ بنی۔ اس عہد کے زیادہ تر شاعروں نے اپنے شاعرانہ وقار کا لوہا منوانے کے لئے اس صنف کو بطور وسیلہ استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان شاعروں نے اپنی توجہ صناعی اور فنی بالیدگی کے رجحانات پر صرف کی۔ قصائد کے سماجی، تاریخی اور ثقافتی مواد کا زیادہ استعمال نہیں کیا۔ الفاظ کی تراش خراش پر زور صرف ہوا۔ تراکیب کی اختراع کا شوق بڑھا۔ مصرعوں کی عمدہ ترتیب اور خیال کی معقول تزئین کے معاملات پیش نظر رہے۔ اسلوب بیان میں زور اور تخیل کی بلند پروازی مقدم ٹھہری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدے کے شان وشوکت کے حامل اسلوب کو پذیرائی ملی۔ اس اسلوب کے برعکس قصیدہ لکھنے والوں کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے غزل کے اسلوب سے جتنا زیادہ ممیز کیا جاسکتا تھا کیا گیا۔ قصیدے کا پرشکوہ اسلوب سودا اور اس قبیل کے دیگر شعرا کے حصے میں تو آ گیا مگر میر اور حسرت جیسے شعرا اس سے محروم رہے۔ چنانچہ انہوں نے غزلیہ آہنگ میں قصیدہ نویسی کی۔

سودا نے اپنے قصائد کے وسیلے سے وسعت زبان وبیان کے عمل میں اعانت کی ان کے اور ان کے معاصرین کے قصائد میں فارسی زبان کی موثر اور عمدہ ترکیبیں اردو کا لبادہ پہن کر سامنے آئیں۔ مذہبی، علمی اور فنی اصطلاحوں کا استعمال بڑھا۔ موسموں، منصوبوں اور منظروں کا تفصیلی بیان کیا گیا۔ رزم وبزم کے معاملات اردو زبان میں سمٹے۔ البتہ بعض قصیدہ نگاروں نے قصیدے میں ثقافتی سیاسی اور معاشرتی تفاصیل کا استعمال بھی کیا۔ مصحفی نے ایک بار کہا تھا "ایں ہمہ شیر ینی کہ در ریختہ دارم طفیل فارسی است"[1] سودا نے روایات اور فارسی قصائد کی تقلید وپابندی بھی کی اور اختراعی مزاج سے استفادہ بھی کیا۔ یوں قصیدہ عروج پر پہنچا۔

[1] ریاض الفصحا ص ۲۸۸

میر و سودا کے دور سے قبل شمالی ہند میں قصائد کی تعداد زیادہ نہیں ہے ۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں درباری زبان فارسی تھی ۔ شعرا ٹوٹی پھوٹی اردو میں قصائد لکھنے کی بجائے روایاتی اور لسانی اعتبار سے مستحکم زبان کو ذریعہ اظہار بناتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اردو شاعری زیادہ مستحکم نہیں ہو سکی ۔ امرا و رؤسا کی سرکاروں سے وابستہ اردو شعرا بھی اردو زبان میں قصیدہ لکھنے سے گریزاں رہے ۔ شاید اس لئے کہ قصیدہ جس لسانی شکوہ اور اظہاریاتی طنطنے کا متقاضی تھا اس کے لئے شمالی ہند کی قدیم اردو زیادہ مناسب نہیں تھی ۔ مزید برآں اس عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات بھی سازگار نہ تھے ۔ امرا اور رؤسا تو ایک طرف خود بادشاہوں کو سکون و اطمینان میسر نہ تھا ۔ قصیدہ خوانی کی محفلیں کم کم ہی جمنے پاتی تھیں ۔ اردو شاعری کا یہ دور ، دور ایہام گوئی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے ۔ صنعت ایہام غزل میں تو کھپ سکتی تھی ـــــــ قصیدے میں اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا ۔ البتہ اردو مثنویوں میں مدحیہ اشعار لکھنے کی روایت اس دور میں بھی نظر آتی ہے ۔

میر و سودا کے دور میں اردو زبان اس معیار کو پہنچ چکی تھی کہ شعرا نے بلا تامل اسے قصیدہ نویسی کے لئے استعمال کیا ۔ یوں بھی اب وہ دور طلوع ہو رہا تھا جب درباری شعرا کی پذیرائی ہونے لگی تھی ۔ اس دور میں وہی قصیدہ نگار زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں جن کے قصائد میں شاعرانہ صناعی اور لسانی شان و شوکت کا اہتمام ہے ۔

اس دور کے اردو شعرا نے فارسی زبان و ادب اور علوم و فنون کو تقلیدی نمونہ کے طور پر قبول کیا ۔ اگر یہ شعرا عربی قصیدہ کو اپنا معیار بناتے تو آج اردو قصیدہ کی صورت مختلف ہوتی عربی میں قصیدہ فی الاصل نظم ہی کا نام تھا ۔ اسے ہم معلقہ تنظیم کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں فارسی شعرا نے بقول وحیدالدین سلیم قصیدے میں "قافیے کے ساتھ ردیف کا بھی دم چھلا لگا دیا"① یوں شاعرانہ خیالات کی روانی اور ہم گیریت متاثر ہوئی اور نظم میں جس قسم کے اتحاد و تسلسل کی ضرورت ہوتی ہے وہ میسر نہیں آسکا بلکہ شاعرانہ موضوعات میں اختلاف و تناقص پیدا ہوا ۔

اس دور میں قصیدہ کے لئے فارسی قصیدہ کے معیار کو مستند سمجھا گیا ۔ فارسی علم و ادب پر اس عہد کے بعض مصنفین کی گہری نظر تھی ۔ آنند رام مخلص کی مرآۃ الاصطلاح ، ٹیکا لکونی مل وارستہ کی لغت مصطلحات وارستہ ، ٹیک چند بہار کی بہار عجم ، کاشی کی ہفت اختر ، سراج الدین علی خاں آرزو کی چراغ ہدایت اور مثمر وغیرہ کم فارسی لسانیات کے استحکام کی وضاحت ہیں ۔ اس عہد کے اردو شعرا اور مصنفین ۔ حکمت علم و عمل کا تذکرہ کرنے والی کتاب (نصیرالدین طوسی کی) اخلاق ناصری سے بھی واقف تھے اور جلال الدین دوانی کی اخلاق جلالی سے بھی ، ملا واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی

---

① افادات سلیم ص ۹ م ، کتبخانہ اعظم گڑھ ۔

(کہ جو سیاست و اخلاقیات کے تابع رکھنے کا درس دیتی) اور انوار سہیلی (جس میں فرد اور جماعت کی تہذیب و پند و موعظت وغیرہ پر زور ہے) بھی ان کی اخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں یہ کتب اردو اور فارسی شاعروں کے اخلاقی اور سماجی ویژن کی تشکیل میں ممد تھیں۔ علاوہ ازیں محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کے ذریعے مسئلہ وحدت الوجود بھی ہمارے شاعروں کے افکار کا حصہ بن چکا تھا (میر محمد حسین کلیم نے فصوص الحکم کا ترجمہ . یہ کتاب بھی ہمارے شاعروں تک فارسی ہی کے وسیلے سے پہنچی) فردوسی کا شاہنامہ ہو (کہ جس کے ذریعے اردو میں جنگ ناموں کا دفتر رقم ہوا ہے) نظامی کی ہفت پیکر اور سکندر نامہ ہوں (سکندر نامہ میں ارسطو، سقراط، افلاطون اور بعض دیگر یونانی فلسفیوں کے اقوال بھی دستیاب ہیں اور موجودات کی ابتدا و انتہا، افلاک و عناصر وغیرہ کے معاملات بھی زیر بحث آئے ہیں) امیر خسرو کی مطلع الانوار جامی کی تحفۃ الاحرار، شفائی صفاہانی کی دیدۂ بیدار، فقیہہ کرمانی کی مونس الابرار، شیخ علی حزیں کی مطلع الانظار، محمد کاتبین کی گلشن ابرار (یہ کتب نظامی ہی کے اثرات کے تابع لکھی گئیں۔ یوں ہندوستانی اذہان پر نظامی کے اثرات واضح ہیں) اسی نوع کی دیگر کتب میں حکیم سنائی کی حدیقۂ سنائی (جس میں بنو امیہ کی عظمت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بنو عباس کو اس کے تضاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے) خیام کی رباعیات (ابیقوریت کا فلسفۂ لاتو) اور عطار کی منطق الطیر وغیرہ کے اثرات بھی اردو شاعروں کے خیالات و افکار پر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ میر و سودا کے دور کے اردو شعرا نے اگر امراض نفس کی بات کی ہے (خوف، حزن و رنج، افراط شہوت) یا سیاست کی بارہ زمرہ آداب کی بات کی ہے یا عالم اجسام، شہادت، برزخ، عالم غیب، عالم ارواح حال و مقام، النفس و آفاق، وحدت و کثرت، حادث و قدیم، ممکن و وجوب، وجود و عدم، جسم و روح فنا و بقا، عین و ظل، تشبیہہ و تنزیہہ، جبر و قدر، خیر و شر، جوہر و عرض، وجد و سماع، اثبات و نفی ذات و صفات، عقل و عشق، مادہ و روح، زمان و مکان، علت و معلول، وحدت و شہود، علم و عمل، ذکر و فکر، وہم و یقین، شریعت و طریقت، حق و باطل، دیر و کعبہ، توکل و تواضع، صبر و رضا، علم و بردباری، انکساری، سلوک، خلق، ایثار، وقت، مشاہدہ، مقام، مکاشفہ قبض و بسط، النفس، حال، لطف، علم، مجاہدۂ باطن، معرفت، تفرید، تجرید، ازل، ابد، استغراق، حیرت، خلوت، جلوت، موت، ایثار، ولایت، رضائے الٰہی، شکر، ہر ذرۂ کائنات کا خدا کا مظہر ہونا، اعیان، مظاہر، موحد، ارادہ، نیت، اخلاص، انس، تبلیغ و تفکر، تفویض تقویٰ، تواضع، توبہ، توحید، توکل، خشوع و خضوع، خوف، دعا، رجا، رضا، زہد، شوق، صبر صدق، محبت، کذب، غیبت، اسراف، بخل، بغض، تکبر، حب جاہ، حب دنیا، حسد، ریا، وغیرہ کے موضوعات کا عمل دخل ہوا تو اسے فارسی علم و ادب اور زبان و بیان ہی کی عطا سمجھنا چاہیے۔

اس عہد کے اکثر قصیدہ گو شعرا نے فلسفہ، ریاضی، منطق، نجوم، شاعری، موسیقی، گنجفہ، شطرنج، چوسر، جفر، رمل، جغرافیہ، ہیئت وغیرہ کی جو اصطلاحات استعمال کی ہیں (سکون، حرکت، جوہر، کل، جز، ہیولا، حکمت، مادہ، زمان و مکان، جماد، حیوان، خط جوہری، حجت، معقول، قضیہ، اثبات، نفی، قیاس، جنس، نوع، خاصہ، عرض، موضوع، محمول، صغریٰ، کبریٰ، عکس، نقیض، افلاک، چرخ، زہرہ، مشتری، خورشید، مریخ، زحل، عقرب، حوت، سرطان، جدی، اسد، حمل، جوزا، میزان — جوہر، آب، خاک و باد، آتش، تحلیل، جمع و تفریق وغیرہ (جادو، رسوم، توہمات اور ان سے متعلقہ الفاظ) یہ سب کچھ فارسی علم و ادب اور فن و حکمت ہی کے زیر اثر اردو قصیدہ گو شعرا کے فکر و خیالات کا حصہ بنا۔ اسی دور کے قصیدوں میں - مانی، فرہنگ، خیر و شر، اہرمن و یزداں، رستم، سہراب، فریدوں، اسفندیار، درفش کاویانی، کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس، ایرج، جمشید، جام جمشید، تخت جمشید، نوروز، مہرگاں وغیرہ کے الفاظ بھی فارسی اثرات ہی کے مظہر ہیں۔

ہم مقامی ہندی ماحول اور بھگتی تحریک کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بدھ کا مایا اور لوبھ کا عقیدہ، تناسخ اور آواگون کا مسئلہ، دیوالی، بیساکھی، ہولی، پھولوں والوں کی سیر، شاہ مدار کی چھڑیاں، جوالا نگر کی چھڑیاں، دسہرہ، کرشن بھگتی (صلح کل)، رام بھگتی، کبیر اور نانک کے عوام دوستی کے خیالات وغیرہ کا عکس بھی ہمارے قصیدہ نگار شعرا پر دکھائی دیتا ہے۔

مسلمان ہونے کے ناتے یا مسلم تہذیب میں پرورش پانے کے باعث ان کے قصائد میں قرآنی حوالوں کی بھی کثرت ہے۔ مومن، منافق، کافر، جنت، حور و غلماں، صراط مستقیم، عذاب، شمس، قمر، نجم، سلسبیل، کوثر، تسنیم، برق، رعد، صاعقہ، مریخ، مرجان، شجر طور، زیتون، بدر و حنین، طور، صفا، مروہ، لات و منات، سحر، حکمت، تاویل، حمد، ثنا، رب، رحمٰن، رحیم، ملک، قدوس، کتاب، لوح، قلم، عرش، کرسی، غیب، دین آخرت وغیرہ کے الفاظ کا ماخذ و منبع قرآن ہی ہے۔

میر و سودا کے دور کے قصیدہ گو شعرا کے معنوی نظام میں انسانیت و آدمیت اور تہذیب و شرافت کے معاملات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ درویشی، صلح پسندی، دین آگاہی ان کی سرشت کا حصہ تھی۔ وہ اپنے علم و فن کے تناظر میں لفظ بھی تراشتے کے اہل تھے اور مضمون آفرینی کے قابل بھی۔ صرف و نحو، عروض و قافیہ، علم بیان، علم لغت، علم عروض اور علم معانی پر انہیں پورا پورا عبور تھا۔ اس دور کے تذکروں میں استعمال ہونے والی ذیل کی اصطلاحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا شعری نقطہ نظر کیا تھا

ایہام گوئی، تازہ گوئی، تلاش معانی، ادابندی، صفائی، نزاکت، سنجیدگی، تہہ داری، موزونیت، شستگی و برجستگی، مضمون یابی، عذوبت، کرسی نشینی، شیریں سخنی، نالہ تراشی، بلند تلاشی، نازک خیالی، حسن ادائے تازہ، آمد،

نکتہ سنجی، ہمواری، رنگینئ خیال، مربوط گوئی، فارسی اثر اور دلخواہ اسلوب" اردو قصیدہ گو شعرا کے کلام میں یہ سارے رجحانات دستیاب ہوتے ہیں۔

اس دور میں مذہبی قصیدہ بھی لکھا گیا اور اہل دول کی مدح سرائی بھی کی گئی۔ ہجویہ قصائد پر بھی توجہ ہوئی اور اور شہر آشوبیہ قصائد پر بھی۔ ہمارے قصیدہ گو شعرا نے دہلوی دربار کی حالت زار کا بیان عمدہ طریقوں سے کیا ہے۔ شرفا کی خواری، ہندوستانیوں کی سستی و کاہلی، آرام طلبی اور ناز پروری کے مسائل کے ساتھ ساتھ انہوں نے معاشرتی انتشار، اقتصادی بدحالی، سیاسی ابتری، زوال پذیر اخلاقیت و اخلاقی اقدار کا تذکرہ موثر اشعار کی صورت میں کیا ہے شاعر بیان تک کہہ گزرے کہ شہر میں گاؤ کشی موقوف ہوئی ہے اس کی جگہ رعیت کا خون رواں ہے (1) یہ دور عوام کی بے بسی کا دور تھا، دوست نا آشنا بن گئے تھے زمانہ قدر شناس نہ رہ تھا، شرفا خوار ہو رہے تھے۔ خود غرضی کا دور دورہ تھا، تعلقات کی بنیاد مطلب پرستی تھی، بادشاہ اور امرا بھی کس مپرسی کے عالم میں تھے۔ دولت مند بے آبرو ہو رہے تھے۔ شاعر چیخ رہے تھے کہ بزم روزگار شادی و غم سے کہاں خالی ہے اگر جام ہنستا ہے تو مینا زار زار روتا ہے۔ انہیں اوضاع نیرنگی جہاں سے عالم بیک چشم زدن ویران ہوتا نظر آرہا تھا۔ ایسے میں ہمارے شعرا نے مذہبی شخصیات کی جانب رجوع کیا، ان کی شان میں بلند پایہ قصائد لکھے جہاں مذہب آئے گا وہاں عقائد کی (2) اظہار پائیں گے۔ سودا نے جو قصیدہ منقبت امام کاظمین میں لکھا ہے اس میں انہوں نے مذہبی ممدوح کے رتبے کو دنیاوی ممدوح کے رتبے سے بلند دکھایا ہے اور کہا ہے کہ سودا تو دنیاوی ممدوحوں کی مدح سے باز آ

سودا تو ان کی مدح کرے گا کہ جز دروغ + یک حرف راست دل سے نہ پہنچے زباں تلک
حیراں ہوں میں کہ مثل نگیں بہر نام غیر + اپنا تو رو سیاہ کرے گا کہاں تلک
رکھیے قلم کو مدح میں ایسوں کے سرنگوں + سجدہ کریں ہیں جن کو زمین و زماں تلک

سودا جیسے شاعر کے مذکورہ تصور مدح سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے عمومی شاعروں نے بھی حقیقی مدح کا مستحق دینی ہستیوں ہی کو گردانا تھا۔ یہ شعرا سمجھتے تھے کہ تعریف کے لائق ذات خداوندی ہے یا وہ انسان جو بزرگ، امام یا نبی کی صورت میں ذات خدا کے مظہر ٹھہرتے ہیں۔ حقیقی بادشاہ ان کے نزدیک خدا تھا اور دنیاوی بادشاہ اس کے مطیع۔ سودا نے اپنے بعض قصائد میں بادشاہوں اور حکمرانوں کو ظل اللہ، مسجود روشن دلاں

---

(1) گاؤ کشی شہر میں موقوف ہوئی ہے + اب ان کی جگہ خون رعیت کا رواں ہے [مصحفی]
(2) اس دور کے شعرا نے جہاں حمد و نعت کے قصائد لکھے وہاں بارہ اماموں کی منقبت میں بھی بہت کچھ لکھا۔

آستانہ معراج اُمت، قاطع کفر، ضامن عفوِ گناہ وغیرہ قرار دیا ہے۔ یوں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس دور کے قصیدہ گو شعرا کے ہاں بادشاہ کارِ کفر کو تباہ کرنے والا تھا۔ اور یہ کام اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کے حق میں تھا۔ وہ بادشاہ کو خدا کا سایہ بھی ٹھہراتے تھے

؎ پیران کو اوجِ سعادت سے جیسے کیا نسبت + وہ ہیں تجھے ظلِ ہما تک میں نا لبِ ظل اللہ

[در مدح عالمگیر ثانی از سودا]

اس دور کے مدحیہ قصائد پر مذہبی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہمیں یہ تو نہیں کہنا چاہیے کہ یہ شاعر صرف مذہبی طرزِ احساس ہی کے حامل تھے ان کے ہاں بھی کئی مقامات پر دنیاداری کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دین و دنیا کے معاملات میں تفاوت و تفریق کے قائل نہیں تھے۔ نواب وزیر الممالک کی سالگرہ کے حوالے سے لکھے ہوئے سودا کے ایک قصیدے میں یہ رنگ دکھا گیا ہے

؎ یاں تلک شیخ و برہمن ہیں طرب میں مصروف + دیر میں بجتی ہے مردنگ، حرم میں ڈھولک
بادہ کو عزّت سے زاہد کے نہ ہووے ملاؔ + پر یہ راضی ہے کہ کپڑوں پہ جو چھڑکے تو چھڑک
محتسب سے چلے ہے مست اگر کے کا ندھا + مغبچہ آئے چلا قاضی کے آگے سے دلاوک

عقائد کے اعتبار سے ہمیں شیعہ اور سنی ہر دو عقائد کے حوالے سے لکھے ہوئے قصائد ملتے ہیں۔ سودا کے برابر اور دوگی ردیف میں قصائد[1] اور میر کے قصیدہ لامیہ میں شیعیت کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے[2]۔ دہلوی شعرا نے منقبت علیؑ کے ضمن میں حضرت علیؑ کی جن صفات کا تذکرہ کیا ہے ان کے مطابق وہ وصی ختم الرسل، ظل اللہ، امامِ برحق، جانشینِ مصطفیٰ، مہرِ نبوت کے نگیں، راکبِ دوشِ نبوت، زورِ بازوئے نبوت، مظہر العجائب، حیدرِ کرار، میرِ میدانِ شجاعت، شیرِ بیشۂ شجاعت، صاحب ذوالفقار، شہِ مرداں، امامِ اول، شیرِ یزداں، شہسوارِ راہِ دیں، قوتِ ارکانِ دیں، امام مسجد و منبر وغیرہ۔ دیگر آئمہ کی مدح میں بھی ان کی اعلیٰ صفات کا موثر بیان ہوا ہے۔ اس دور کے مذہبی قصائد میں جو رنگ پیدا کیا گیا ہے بعد کے ادوار میں بھی اردو شاعروں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔

ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی ماحول میں موجود انتشار اور بے یقینی نے اردو شاعروں کو مایوسی کی گہری دلدلوں میں دھکیل دیا تھا۔ ایسے میں وہ صرف مذہبی ہستیوں پر ہی بھروسہ کر سکتے تھے مذہبی قصائد میں رحمت اللعالمین، شفیع المذنبین، مشکل کشا، احسان گستر اور دستگیر وغیرہ کے الفاظ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر ماحول کی سنگینی

---

(1) سودا نے یہ قصائد حضور اور حضرت علیؑ کی اشتراک صفات کے تذکرے کے لیے لکھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مثل نور خدا نبیؐ اور علیؑ دو الگ الگ ہستیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایک ہیں۔ دونوں کا او ادا الٰہی سے کم رتبہ نہیں رکھتا۔ جس طرح تجلی خدا کی ذات سے جدا نہیں ہے اسی طرح نبی اور علی میں تفریق مشکل ہے
؎ دونوں کا نہیں امر کم از امرِ الٰہی + دونوں کی حدیث آیہ قرآں کے برابر

(2) میر کا یہ شعر دیکھیے ؎ دور از بسکہ کھنچا عرش سے رتبہ تیرا + حرف تیرا ہے ترے شیعوں کو وحی منزل

سے کس قدر نالاں تھے

اردو قصیدہ گو شعرا کے دواوین و کلیات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عہد قدیم میں شعرا شاہی درباروں کا اہم جزو تھے - دربار میں اگر کوئی جشن برپا کیا جاتا یا کوئی اہم تقریب ہوتی تو وہاں شعرا کو بھی قصیدہ پیش کرنے کے لیے کیا جاتا۔ وہ حکمرانوں اور درباریوں کو محظوظ کرتے- قصیدہ پیش کرنے کے باقاعدہ آداب تھے (۱)

جہاں تک قصائد کے اسلوب کا تعلق ہے اس دور میں قصیدے نے جو شکل اختیار کرلی بعد کے ادوار میں اس میں تبدیلی کی بہت کم گنجائش نکلی - باغ و بہار، گل و گلزار، عقائد و روایات، احوال و معاشرت، اخلاق و حکمت، مدح و ذم اور مضمون و موضوع کے بیان کا جو طریقے وضع کرلیے گئے وہ اتنے پختہ تھے کہ امیر مینائی اور عزیز لکھنوی تک کو بھی (دور جدید میں) انہی کی پیروی کرنی پڑی، ہندی تہذیب کا حوالہ اگر شاکر ناجی کے قصائد میں نظر آتا ہے تو محسن کاکوروی کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ سودا اگر قصائد میں اپنے عہد کے علوم کے حوالے دیتے ہیں تو شاطر مدراسی اپنے عہد کے۔

اٹھارہویں صدی کے اردو قصیدہ نگار شعرا نے اردو زبان کے حوالے سے بھی اہم خدمات سرانجام دیں۔ سودا نے اس دور میں ہند کے زبان دان شاعر کے لئے ریختہ کے آئین کو بہتر قرار دیا (۲) اور ہدایت اللہ ہدایت نے بھی اس امر پر فخر کیا کہ انہوں نے جو ریختہ شاعری کو خلعت قبول دیا تو اس کے نتیجے میں ہند سے فارسی کا رواج اٹھ گیا - ریختہ گوئی کو عیب تصور کیا جاتا تھا - میر تقی میر نے لکھا

سے دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے + بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

قصیدہ گو شعرا نے ریختہ یا اردو کو درباری فضا میں لے جا کر اردو کی حیثیت کو مستحکم و مستند کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ہر طبقے کے شعرا کو اس زبان میں کشش سی محسوس ہونے لگی۔ اس دور میں شاہانہ مجلس آرائیاں بادشاہوں اور رئیسوں کے معمول کا حصہ بھی بنیں، مصحفی نے تذکرہ ہندی گویاں میں لکھا ہے "کہ روزانہ کے وظائف و اوراد سے فارغ ہو کر بادشاہ دیوان خاص میں آ کر اپنے اشعار کسی خوش الحان سے پڑھوا کر سنا کرتا تھا- حاضرین میں پایۂ تخت کے مشہور شعرا بھی موجود ہوتے۔ (۳)

درباروں کے توسل اور امرا کی قدر دانی کے وسیلے سے بہت سے شعرا روزی کے غم سے آزاد ہو جاتے تھے۔ اس کے عوض انہیں اپنی طبیعت پر زور دے کر مدح سرائی کرنی پڑتی تھی "جس سے قصیدے کی صنف کو تھوڑی بہت ترقی ملی اور الفاظ و تراکیب کا ایک قابل قدر ذخیرہ جمع ہوا" ایک ایک شاعر کو کئی کئی نوابوں اور رئیسوں کے در دولت پر جانا پڑتا (۴) "ذکر میر سے پتہ چلتا ہے کہ میر نے کچھ دن رعایت خاں

---

(۱) دیکھئے تذکرہ ہندی گویاں ص ۱۸۷/۱۸ (۲) سہ جو چاہے یہ کہ کیجے ہند کا زباں داں شعر + تو بہتر اس کے لئے ریختہ کا ہے آئیں
(۳) تذکرہ ہندی گویاں ص ۱۰
(۴) ذکر میر ص ۳۶

کی رفاقت میں بسر کیے۔ پھر محمد شاہ بادشاہ کے خواجہ سرا نواب بہادر کی سرکار سے توسل حاصل کیا۔ ان کے
قتل کے بعد وزیر کے دیوان مہا نرائن کی پناہ لی۔ جب یہاں قسمت نے یاوری نہ کی تو دیوان بنگالہ راجہ جگل کشور
کے پاس چلے گئے۔ ان کے دن برے آئے تو پھر راجہ ناگرمل کے ہاں آ گئے تھے جو ان دنوں نائب وزیر عمدۃ الملک
اور مہاراجہ کے خطاب سے سرفراز تھے۔ وہاں سے ابو القاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں صوبہ دار کشمیر کے دستگیر
رہے اور جب عبدالاحد گرفتار ہو گئے تو یہ لکھنؤ میں آصف الدولہ کے پاس آ گئے۔" (۱)

مذکورہ اقتباس سے جہاں شاعروں کی معاشی جدوجہد کا سراغ ملتا ہے۔ وہاں اس امر کا بھی احساس ہوتا
ہے کہ شاعروں کو ان امرا و روسا کی خوشامدانہ اور مجبورانہ مدح سرائی بھی کرنا ہوتی تھی۔ بہرحال شاہ عالم کے عہد
میں یا اس سے قبل دہلی میں جس نوع کی سیاسی معاشرتی اور معاشی بے چینی اور بے اطمینانی تھی اس کے
نتیجے میں شاعروں کی مختلف ریاستوں اور صوبوں میں نقل مکانی لازمی تھی۔ الہ آباد، لکھنؤ، مرشد آباد،
عظیم آباد اور فیض آباد میں اردو شاعری کی ترویج و ترقی اور اردو قصیدے کی نشوونما کا یہی تناظر
ہے۔ دنیاوی ممدوحوں کی مدح سرائی کے لئے مناسب ماحول خود مختار بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں
کے عروج ہی کے زمانے میں نظر آتا ہے۔ ان کے بخشے ہوئے انعامات و تحائف قصیدہ گو شعرا کے حوصلے
بڑھاتے ہیں۔ لیکن اردو قصیدہ تو کیا اردو زبان کی حقیقی نشوونما کا دور مغلیہ سلطنت کا دور زوال
ہے۔ شمالی ہند میں اردو قصیدہ کی نشوونما مغل بادشاہوں سے زیادہ امرا، روسا یا وظیفہ خوار
خود مختار حکمرانوں کے زیر سایہ ہوئی۔ اس دور کے مغل بادشاہ یہ سکت نہیں رکھتے تھے کہ وہ اکبر
اور جہانگیر کی طرح شعرا کی پرورش کر سکیں۔ انہیں قیمتی انعام یا صلے سے نواز سکیں۔ البتہ
روسا اور امرا نے کسی حد تک شاعروں کو سہارا دیا۔ اس دور میں حاتم شعار امرا کا ملنا
تو محال تھا کہ بخیلی اور دست کشی ان کی مجبوری تھی۔ تاہم زوال پذیر مغل بادشاہوں یا دیگر روسا
نے اپنی اپنی بساط کے مطابق شاعروں کی پذیرائی کی یہی وجہ ہے کہ ایسے دور زوال میں بھی امرا
اور روسا کی شان میں بڑی تعداد میں قصائد موجود ہیں۔

اس دور میں حمد، نعت اور منقبت کے قصائد بھی بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ صحابہ کرام
آئمہ اطہار اور بزرگان کرام کی مدح میں اردو قصیدہ نگاروں کے ان گنت مختصر اور طویل قصائد موجود ہیں
تاہم اس نوع قصائد کا بنیادی معیار تو میر و سودا ہی کے زمانے میں مقرر ہو چکا تھا۔
جہاں تک قصیدہ گو شعرا نے خدا کی صفات کھول کھول کر بیان کی ہیں
ان کے قصیدے خدا کی مختلف صفات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ خدا کی سلبی صفات ہوں یا اثباتی
ان قصیدہ نگاروں نے دونوں پر اپنے مخصوص زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ خدا کا سمیع و بصیر ہونا
تکوین اور قدرت کے موضوعات، اور وحدانیت وغیرہ پر متعدد اشعار مل سکتے ہیں۔ اردو کے

---

(۱) ذکر میر ص ۱۳۸

قصیدہ گو شعرا نے حقیقت ذات الٰہیہ اور صفات الٰہیہ کی کنہ پر غور و فکر کی کوشش کی۔ حمد کا کلمہ مسلم تہذیب میں بھرپور طور پر راسخ ہے قرآن کا آغاز اللہ کے نام سے اور وحی پیغمبر کا آغاز بھی حمدیہ کلمات سے ہوا تھا۔ یہی روایت اردو شاعروں نے بھی اختیار کی۔ ایک زمانے میں نظم و نثر کا آغاز حمد سے ہوا کرتا تھا۔ قصیدہ گو شعرا نے بھی اس موضوع کو اپنی معنوی اقلیم کا حصہ بنایا ہے۔

نعتیہ قصائد میں اس دور کے شاعروں نے بعثت نبوی، ختم نبوت، حضور کا صادق و امین ہونا عبادت، رحمت اور شفقت وغیرہ (کے موضوعات) کو اپنا موضوع اظہار بنایا۔ احادیث کے حوالے، حضور کی زندگی، صورت و سیرت کی تفصیلات ان کے محاسن و محامد پر قصیدہ گو شعرا نے خصوصی توجہ دی اسی طرح منقبتی قصائد میں خلفائے راشدین، خصوصاً حضرت علی، آئمۂ اہل بیت، پنجتن پاک، دوازدہ امام اور چہاردہ معصومین کو موضوع بناتے ہوئے شاعروں نے مذہبی روایات و خیالات کی روشنی میں کلمات توصیف و تعریف استعمال کیے ہیں۔ ان قصائد میں کہیں کہیں نعت و حمد کے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں۔

مقصد مختصر یہ ہے کہ میر و سودا کے دور کے قصیدہ نگار شعرا کے ہاں عجمی، ہندی اور اسلامی اثرات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں لیکن یہی نہیں انہوں نے اپنے عہد کی معاشرت اور اپنے ارد گرد کے احوال کے بھی عمدہ نقشے کھینچے ہیں۔ جن میں سے بعض کی وضاحت گزشتہ صفحات میں کی جاچکی ہے۔ اگلے ابواب میں ہمیں انیسویں صدی کے اردو قصیدہ کی تہذیبی اور فنی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے۔ چند قصیدہ نگاروں کا انفرادی مطالعہ بھی کرنا ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس صدی میں اردو قصیدہ کی مجموعی تہذیبی اور فنی صورت حال کیا تھی

باب پنجم

باب پنجم

انیسویں صدی کے نصف اول میں اردو قصیدہ

فصل اول: سیاسی منظر نامہ

فصل دوم: تہذیبی و ادبی جہت

فصل سوم: خصوصی مطالعے

فصل اول : سیاسی منظر نامہ

برصغیر ہند و پاک میں انیسویں صدی عملی طور پر انگریزی اقتدار کی صدی ہے انیسویں صدی کے نصف تک انگریز ریذیڈنٹوں کے حکم چلتے رہے۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد تمام علاقے مکمل طور پر تاج برطانیہ کے قبضے میں آ گئے۔

۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی دہلی کے تخت پر متمکن ہوئے۔ ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ یہ حکمران انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں معزول کر دیا۔ ان پر مقدمہ چلایا اور (رنگون دربار) جلاوطن کر دیا۔ یوں مرکزی ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل اقتدار قائم ہوا

ادھر اودھ کے علاقوں میں ۱۸۱۴ء میں نواب سعادت علی کے انتقال کے بعد غازی الدین حیدر نے اقتدار (کٹھ پتلی) سنبھالا اور پہلا کام یہ کیا کہ مرکزی ہندوستان سے اپنے رسمی تعلق کو بھی منقطع کیا۔ وہ اودھ کے بادشاہ کہلائے۔ غازی الدین حیدر عیش پرست اور آرام طلب انسان تھے۔ بے دریغ دولت لٹاتے تھے۔ انہوں نے سعادت علی خاں کے جمع کردہ کروڑوں روپے دریا دلی سے لٹائے۔ وہ موسیقی کے رسیا تھا۔ بعض مذہبی رسومات میں ردوبدل کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ان کے عہد میں امام العصر کی چھٹی کی رسم اور اچھوتیوں کے سلسلہ کی شروعات ہوئے کے ساتھ ساتھ اماموں کی ولادت کے ڈرامے بھی کھیلے گئے۔

۱۸۲۷ میں غازی الدین حیدر نے وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے فرزند نصیر الدین حیدر نے حکومت سنبھالی۔ عیش و عشرت ان کے لئے بھی شجرِ ممنوعہ نہ تھے۔ نئی رسومات کی داغ بیل ڈالنے کے ضمن میں ان کی شہرت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت عورتوں کے درمیان گزارتے تھے ان کے ہاں زنانہ مزاجی کا اس حد تک عمل دخل تھا کہ بقول عبدالحلیم شرر خود حاملہ عورت بن کر زچہ خانہ میں بیٹھتے اور چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لئے ولادت، چھٹی اور نہانے کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔① انہوں نے اچھوتیاں (آئمہ اثنا عشری کی فرضی بیبیاں) اور آئمہ کی ولادت کی تقریبات کو بہت فروغ دیا۔ بادشاہ ان تقریبات میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ اسے انتظام سلطنت کی فرصت نہ ملتی۔ ۱۸۳۷ میں نصیر الدین حیدر کی وفات پر ان کے فرزند محمد علی شاہ مسندِ سلطنت پر بیٹھے۔ انہوں نے بھی انتظام سلطنت سے زیادہ دیگر امور پر توجہ دی انہیں تعمیرات کا شوق تھا حسین آباد کا امام باڑہ اور اس کے قریب موجود عالی شان مسجد

---

① گزشتہ لکھنو از عبدالحلیم شرر ص ۵۶ مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنو

بھی ان کی تعمیر کروائی ہوئی ہے ۔ ایک پانچ منزلہ برج نما عمارت بھی ان کی یادگار ہے ۔ ان کے انتقال کے بعد اودھ کی حکومت امجد علی شاہ کو ملی جو ایک مذہبی آدمی تھے ۔ ان کے زمانے میں علما اور مجتہدین کا بڑا زور تھا ۔ تاہم ارباب نشاط کو وہ اپنی سلطنت سے خارج نہیں کر سکے ۔ ۱۸۴۷ء میں امجد علی کی وفات کے بعد واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے ۔ وہ عیاشی اور فنون طرب و نشاط کی جانب مائل تھے موسیقی اور رقص کا ذوق ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا ۔ گویے اور ڈھوم ڈھاری ان کے ارد گرد جمع تھے ۔ آوارہ عورتوں کی جانب ان کی رغبت نے لکھنو کے ماحول کو بھی تعیش پسندانہ بنا دیا تھا ۔ واجد علی شاہ خوش شاعر تھے تاہم علمی مضمون سے زیادہ محفل طرب سجانے کے قائل تھے انہیں تصنیف و تالیف اور عمارت سازی کا بھی شوق تھا ۔ ان کی ادبی، مذہبی، سیاسی، جنسیاتی، مضحکاتی، فکری، اخلاقی اور تاثراتی کتب موجود ہیں (۲) ۔ قیصر باغ کی شاندار عمارت اور باغ واجد علی شاہ ہی کا تعمیر کردہ ہے ۔ اس باغ میں ہر سال ایک میلہ لگا کرتا تھا جس میں عام لوگوں کو بھی شرکت کا موقع ملتا ۔ ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کو برطانوی ہند میں شامل کر لیا ۔ واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیے گئے ۔ جہاں مٹیا برج میں وہ اپنی عاداتی دلچسپیوں سے دل بہلاتے رہے

ادھر حیدر آباد میں آصف جاہ ثانی کے انتقال کے بعد (۱۸۰۳ء) ان کے فرزند نواب سکندر جاہ اور ان کے بعد ان کے فرزند اکبر ناصر الدولہ اور ان کے بعد ان کے فرزند نواب افضل الدولہ یکے بعد دیگرے مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے ۔ افضل الدولہ ہی کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کا مشہور معرکہ ہوا ۔ افضل الدولہ نے جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا

حیدر آباد کے ان ادوار میں وہاں کے نوابوں کے ساتھ ساتھ بعض وزراء اور امراء بھی ادبی سرپرستی اور علم دوستی کے رجحانات رکھتے تھے ۔ ارسطو جاہ ۱۷۷۳ء تا ۱۸۰۳ء وزیر اعظم کے عہدے پر متمکن رہے ان کی شان میں قصائد کے دو مجموعے بھی مرتب ہوئے (مجموعہ فصاحت اور خزینۂ سخن) یہ مجموعے شاہ تجلی نے مرتب کیے تھے ۔ مہاراجہ چندو لال بھی ادب پرور اور علم دوست تھے ان کی وفات ۱۸۴۵ء میں ہوئی ۔ انہوں نے شاعروں اور ادیبوں کی قدردانی کی وہ خود بھی شاعر تھے اور شاداں تخلص کرتے تھے ۔

انگریزوں نے ۱۸۱۸ء تک مرہٹوں کو بھی اپنا مکمل مطیع بنا لیا ۔ لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں ہلکر اور سندھیا نے سب سڈی ایری سسٹم قبول کر لیا ۔ اس کا پس منظر انگریزوں کے ساتھ مرہٹوں کی تیسری جنگ (۱۸۱۷ء-۱۸۱۸ء) تھی ۔ لارڈ ہیسٹنگز نے نیپال کی جنگ [۱۸۱۴ء - ۱۸۱۶ء] میں بھی

---

(۱) رجب علی بیگ سرور از نیر مسعود ص ۳۲ ۲۵ الہ آباد ۱۹۶۸ء

فتح حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں وہ گڑھوال اور کماؤں کے علاقوں پر قابض ہوئے کھٹمنڈو میں برطانوی ریذیڈنٹ مقرر ہوا۔ اسی زمانے میں جنگ پنڈاری (۱۸۱۶ - ۱۸۱۸) میں پنڈاریوں کا خاتمہ ہوا۔ پنڈاریوں نے حیدر آباد (وادی گنگا) میں لوٹ مچا رکھی تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے اڑلیسہ اور بریلی کی بغاوتوں کو بھی دبایا۔

۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۵ تک ہندوستان میں ولیم بینٹنگ حکمران رہا۔ اس نے میسور کی بدنظمی اور انتشار کو دیکھتے ہوئے ریاستی نظم ونسق سنبھالا۔ اس کے یہ انتظامات ۱۸۸۱ تک چلے۔ ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۲ لارڈ آک لینڈ گورنر جنرل بنا۔ اس نے ریاستی نظام کو بہتر بنانے کے لیے کچھ اصلاحات جاری کیے ۱۸۴۲ - ۱۸۴۴ لارڈ ایلن برو گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس کے عہد میں سندھ کا الحاق ۱۸۴۳ء عمل میں آیا۔ یوں اس علاقے میں مسلم آزادی کا خاتمہ ہوا۔ ایلن برو کو اسی زمانے میں ریاست گوالیار سے بھی جنگ لڑنا پڑی۔ گورنر جنرل نے ریاست کے سربراہ سے مطالبہ کیا کہ وہ فوج میں تخفیف کرے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا۔ جنگ ہوئی اور ریاستی فوج کو مہاراج پور کے مقام پر شکست ہوئی۔ یوں وہاں بھی انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہوا اور فوج میں تخفیف ہوئی

لارڈ ہارڈنگ کے زمانے میں (۱۸۴۴ تا ۱۸۴۸) سکھوں کی پہلی جنگ ہوئی اور بعد میں لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں (۱۸۴۸ تا ۱۸۵۶) انگریزوں نے پنجاب کو بھی انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے مقامی ریاستوں کا اندھا دھند الحاق شروع کیا۔ انہیں برطانوی سلطنت کا حصہ بنایا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں عوام اور مقامی ریاستی حکمرانوں کے جذبات شدید مجروح ہوئے۔ چنانچہ وہ ریاستی حکمران کہ جنہیں ابھی تک لارڈ ڈلہوزی نے چھوا تک نہ تھا خوف میں مبتلا ہوئے۔ انہیں احساس ہونے لگا کہ انگریزی اپنی جابرانہ پالیسیوں کی وجہ سے یا اور مکارانہ طور طریقوں کے سبب انہیں بھی ہڑپ کر لیں گے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اصول عدم استحقاق بھی نافذ کیا اس سے بھی ریاستی حکمران پریشان ہوئے۔ یہ اصول ستارہ، ناگپور جھانسی سنبھل پور، جے پور، بگھت اور اودے پور کی ریاستوں پر نافذ ہوا۔ یہ سامراجی توسیع پسندی کا معاون اصول تھا۔ ڈلہوزی نے یہ بھی اعلان کیا کہ کرناٹک اور تنجور کے حکمرانوں اور مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے بعد ان کے جانشین پنشن اور خطابات کے مستحق نہ ہوں گے۔ لارڈ ڈلہوزی نے برائے نام حکمرانی یا حاکمیت کی منسوخی کے ذریعے مختلف آزاد علاقوں کو برطانوی ہند کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ فروری ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ ہندوستان کا گورنر جنرل بنا۔ اسی دور میں

ہندوستان پر انگریزی تسلط مکمل ہوا ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی ۔
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اسباب میں سے ایک ڈلہوزی کی الحاقی حکمت عملی بھی تھی ۔ علاوہ ازیں مغل بادشاہ کی بے دخلی ، نانا صاحب کی پنشن کی ضبطی ، رانی جھانسی سے ناروا سلوک ، مقامی معززین کی اہانت (روز افزوں) عوام الناس کی بدحالی ، لائق ہندوستانیوں کی اعلیٰ ملازمتوں سے محرومی ، زمینداروں کی بدحالی ، بے روزگاری ، قیمتی دھاتوں کی قلت ، کاشتکاروں پر سختیاں ، عیسائیت کی تبلیغ کے علاوہ کئی مقامی اور غیر ملکی فوجیوں کے ملازمتی معاملات وغیرہ بھی شامل تھے ۔ اس جنگ کے نتیجے میں کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے تسلط میں آ گیا ۔ اب گورنر جنرل کی بجائے وائسرائے مقرر ہونے لگے ۔ ہندوستان میں یورپی افواج میں اضافہ کر دیا گیا ۔ دیسی ریاستوں کے راجاؤں کو تحفظ کا یقین دلایا گیا ۔ مذہبی آزادی اور مساوی سلوک کا اعلان کیا گیا قدیم رسوم و رواج کی تکریم کا حکم نافذ ہوا ۔ ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی ترقی کا عہد کیا گیا ۔ مسلمانوں پر بڑے پیمانے پر مظالم ڈھائے گئے ۔ مسیحی مشنریوں کا عمل اور زیادہ تیز ہوا ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستانی تہذیب کا رخ بھی بدلنا شروع ہوا قدیم علوم کی جگہ نئے علوم لینے لگے ۔ ادب و شعر پر بھی اس کے گہرے اثرات ہوئے نئے طرز کے مضامین لکھے جانے لگے ۔ داستان کی جگہ ناول ، تقریظ کی جگہ تنقید ، شاعرانہ نثر کی جگہ منطقی نثر کو فروغ ہونے لگا ۔ اس جنگ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحدہ طور پر بھی اور علیحدہ علیحدہ بھی انگریزی فوج کا مقابلہ کیا ۔ یہ جنگ ہندوستان میں کمپنی کے اقتدار کے خاتمے پر منتج ہوئی ۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا ۔ اس کی آنکھوں دیکھی تفصیلات اس عہد کے ادب میں مل جاتی ہیں (۱) ۔ ہاشمی فرید آبادی کا کہنا ہے کہ ہر انگریز کے عوض کم و بیش ایک ہزار دیسی یا مقامی لوگوں کا خون بہایا گیا (۲) ۔ انگریزوں کے مظالم کا دائرہ دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ ساتھ الہ آباد ، آگرہ ، بنارس ، کانپور ، باندہ ، بلند شہر ، بریلی ، شاہجہاں پور ، مراد آباد ، اٹاوہ ، علی گڑھ ، مظفر نگر ، پٹنہ ، جھانسی اور بہار وغیرہ تک پھیل گیا تھا ۔ مسلمان سیاست پا رہے تھے ، انہیں کالے پانیوں کی سیر دکھائی جا رہی تھی [کالے پانی کی آپ بیتی کا اظہار منیر شکوہ آبادی کے قصائد میں ہے] ۔ قتل عام ہو رہا تھا [دیکھئے خطوط غالب] زندہ انسان نذر آتش ہو رہے تھے ، گرم سلاخوں سے ان کے بدن داغے گئے ، انہیں سؤر کی کھال میں سی کر جلا دیا گیا ، توپ سے باندھ کر ، سولی دے کر ، درختوں سے لٹکا ، لہو کا رنگ کر یا دم گھونٹ کر مارنے کے واقعات عموی تھے (۳) غالب کے خطوط میں سے چند فقرے ملاحظہ ہوں

---

(۱) داستان غدر از ظہیر دہلوی / خطوطِ غالب / منیر شکوہ آبادی کے بعض قصائد ملاحظہ ہوں
(۲) تاریخ مسلمانان پاک و بھارت جلد دوم ص ۳۴۱ (۳) دیکھئے جنگ آزادی ۱۸۵۷ خورشید مصطفیٰ رضوی مطبوعہ دہلی ۱۹۵۹ دیکھئے ص ۱۰۰ سے آگے

"حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی۔" احمد حسین اور ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔" "طالع یار کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب سے جا نہیں سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی"(۱) "میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔"(۲)

اگرچہ ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے کیے گئے اعلان میں ظاہراً مکمل مذہبی آزادی دینے کا تذکرہ تھا تاہم واقعات سے کھلتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا صدیوں پرانا انتقامی رویہ (بحوالہ صلیبی جنگوں کا بدلہ) بدستور عمل میں تھا۔ جنگ آزادی کے خاتمے کے بعد بھی مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ انہیں ذہنی، سماجی اور ثقافتی طور پر مفلوج بنانے کا کام جاری رہا۔ سید احمد خاں نے ان حالات میں رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا اور مسلمانوں کو انگریزی مظالم سے بچانے کی کوشش کی۔ ان کی چلائی ہوئی اصلاحی تحریک نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب راغب کیا اور نئے عہد کے تقاضوں سے مصالحت کرنے کی راہ دکھائی۔

—

(۱)، (۲) عود ہندی ص ۱۶۳ مجلس ترقی ادب لاہور
خط نوشتہ ۱۸۶۰ء

فصل دوم

دورِ زوال کے لکھنوی اور دہلوی دربار [تہذیبی جہت]

۱۸۵۵ء کے بعد ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں مغلیہ بادشاہت نام کی تھی۔ اب بائیس صوبوں کا خاوند فوجداری کوئی کو ترس رہا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی آمدن سوا لاکھ تھی مگر "شان و شوکت، تزک و احتشام، ادب و آداب دربار و انتظام سواری کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ خاندان عالی شان سزاوار فرمانروائی ہندوستان ہوگا(۱) ظہیر دہلوی لکھتے ہیں

"جو قرینے دربارِ سلاطینِ دہلی کے تھے۔ سوائے سلطنتِ ایران کے کسی سلطنت یورپ میں مروج نہیں۔ دیوانِ خاص کے وسط میں تختِ طاؤس نصب ہوتا تھا اور بالائے تخت تمگیرۂ زریں چوبہائے نقرہ ملمع طلائی پر نصب کیا جاتا تھا۔ تختِ طاؤس کے برابر چار گوشوں پر طلائی مینا کار نصب ہوتے اور ان کی منقاروں میں بڑے بڑے موتیوں کی مالائیں جن میں زمرد کے گچھے ہوتے تھے آویزاں ہوتی تھیں تختِ طاؤس میں مسند تکیے لگائے جاتے تھے۔ جب بادشاہ دربار فرماتے تختِ طاؤس کے دونوں پہلوؤں میں دو طرفہ دو صفیں درباریوں کی دست بستہ ایستادہ ہوتیں۔ سب نیچی نگاہیں کیے کھڑے رہتے تھے (اس حال کی تصویر کشی حکیم آغا جان عیش کے ایک قصیدے میں بھی ہوئی ہے) دربار کے دونوں گوشوں پر دو قطار لکڑی بردار و لکڑیاں سرخ لیے کھڑے رہتے تھے۔ ذرا سی کسی سے بے اعتدالی ہوئی گردن میں لکڑی ڈال کر دربار سے باہر کیا گیا اور رؤسائے ہند کا سا دربار نہ تھا دیوانِ خاص کے مقابل لال پردے کا دروازہ تھا۔ وہاں سرخ بانات کا پردہ کھنچا رہتا تھا۔ جو شخص دروازے سے داخل دیوانِ خاص ہوتا تھا پہلے لال پردے کے آگے آکر سلام گاہ پر آکر استادہ ہوتا تھا آداب و تسلیمات بجا لاتا تھا اور تین سلام مؤدب بہت جھک کر بجا لاتا اور نقیب لال پردے کے برابر سے آواز لگاتا ملاحظہ آداب ہے۔ آداب بجا لاؤ جہاں پناہ، بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت بعد اس کے شخص سلامی پہلو میں ہو کر عقب حمام کی جانب کے زینے سے دیوانِ خاص کے چبوترہ پر چڑھتا اور نعلین خالی کرتا اور دیوان خاص میں جا کر دوبارہ دوسری سلام گاہ پر آداب بجا لاتا۔ اور نقیب دربار بطور اول آواز لگاتا اور سلام کراتا۔ اگر نذر گزرانی ہے تو سیدھا تخت کی طرف جا کر نذر پیش کرے گا اور بادشاہ نذر اٹھا کر نذر نثار کے داروغہ کو دے دیتے، نذر نثار کا داروغہ تخت کے پہلو میں استادہ رہتا تھا ایک قصیدی لکھتا جاتا تھا۔ مگر نذر دے کر پھر پچھلے قدموں ہٹ کر سلام گاہ تک جاتا۔ اور بقاعدہ اول پھر اسی طرح آداب بجا لاتا اور جہاں جا ملتی صف دربار میں جا ملتا تھا۔ تخت کے عقب میں خواص لوگ عہدے سے کھڑے رہتے تھے۔ وہ پنکھا مگس رانی کرتے تھے۔"(۲) اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں بھی دربار کی شان و شوکت قائم تھی علاوہ ازیں شاہی کارخانجات خاصہ کلاں، خاصہ خورد

---

(۱) داستانِ غدر، ص ۳۷۵ اکادمی پنجاب۔ لاہور ۱۹۵۵ء (۲) ایضاً، ص ۳۶، ۳۷

آبدار خانہ، دواخانہ، توشہ خانہ، جواہر خانہ، اسلحہ خانہ، خالصہ مالی، فیل خانہ، اصطبل، بگھی خانہ، توپ خانہ، شتر خانہ، رتھ خانہ، کارخانہ، جلوس ماہی، مراتب (چتر و علم)، بخشی خانہ فوج، کتب خانہ، کبوتر خانہ، داروغہ نذور نثار، داروغہ فراش خانہ، پالکی خانہ، داروغہ کہاران، داروغہ خاص برداران، جمعدار جلیبان، نواب ناظر اعتبر خواجہ سرایان اور کارخانہ داران وغیرہ کا لاؤ لشکر بھی بہادر شاہ ظفر کے ساتھ تھا (۴) بہادر شاہ ظفر خوش نویسی، شعر و سخن، سپاہ گری، تیر اندازی، شمشیر زنی، شہسواری اور مصوری وغیرہ میں ماہر تھے۔ یہ مہارتیں بادشاہوں اور شہزادوں میں عمومی طور پر بھی ملتی تھیں۔ اس نوع کی صورت حال اور یہ دربار کی تھی اس کا ایک نقشہ ملاحظہ کیجیے۔

قصرِ شاہی یعنی فرح بخش کے متعلق نائٹین لکھتا ہے کہ،

'اس کی وسعت اور گنجائش، اس کے متعدد قطعے اور ہر قطعہ میں اچھے خاصے صحن، اس کے تالاب یا آراستہ حوض، اس کے مختلف باغیچے اور چمن، اور اس کے لانبے لانبے شاگرد پیشہ کے مکانات ایک نظر دیکھ لینے سے صرف اس کی بیرونی شوکت اور اوپری اوپری حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے درون دروازوں کے بھاری بھاری پردے، اس کی دیواروں پر گنگا جمنی ملمع کاری اور رنگ آمیزی، اس کی زرق برق آرائش و زیبائش، اس کے ذخیرۂ نوادرات و عجائبات صنعت، اس کے نظر خیرہ کرنے والے جھاڑ فانوس، کنول، ہر رنگ کر دیکھ کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قصرِ شاہی کے اندر کیا کچھ ہے اور کن مخصوص چیزوں سے اس کی نمود ہے۔

اس کوٹھی میں وہ کمرہ بھی ہے جس میں تختِ شاہی رکھا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر چھجاتے ہوئے سُرخ رنگ کے زربفتی پردے پڑے ہوئے تھے جو بجائے خود فریبندہ و دلچسپ تھے۔ دیواروں پر اِدھر اُدھر کی طرف جو کھڑکیاں تھیں اُن سے بہت پاکیزہ ہلکی ہلکی روشنی پھیلتی تھی کہ جس سے شاہی دربار کا جبروت دوبالا ہو جاتا تھا۔ انہیں پردوں کے بیچ بیچ میں شاہانِ اودھ کی چند قدِ آدم تصویریں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ تصویریں کسی طرح بُری نہیں کہی جا سکتی تھیں اور پادری بشپ ہیبر صاحب نے یہ بہت منصفانہ بات کہی ہے کہ غازی الدین حیدر اوّل شاہ اودھ کی تصویر جس مصور نے کھینچی ہے وہ اگر لندن یا پیرس جاتا تو وہاں بھی نام و نمود پیدا کرتا۔ اس وسیع دالان کے ایک سرے پر جو ذرا بلند تھا تختِ شاہی رکھا ہوا تھا اور وہ بہت ہی گراں بہا تھا۔ وہ بالکل ایک چبوترے کی قطع کا تھا، جو وسعت میں دو گز مربع اور فرش سے چند فٹ بلند تھا۔ اس کے سامنے

داستانِ غدر ص ۳۶۵

کی طرف چند سیڑھیاں طے کرکے اس پر پہنچنا ہوتا تھا۔ باقی تین طرف سونے کا کٹہرا لگا ہوا تھا۔ اس چبوترے کی دیواریں ٹھوس چاندی کی تھیں اور اُن پر بافراط جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ سابق شاہِ اودھ یا نوابانِ اودھ کی عادت یہ تھی کہ اس چبوترے پر ایک اعلیٰ درجے کی مسند بچھوا کے مشرقی لوگوں کی طرح زانو تہ کرکے بیٹھتے تھے لیکن نصیر الدین حیدر کا یورپین مذاق بھلا اس کو کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایک بیش بہا اور نفیس کرسی جو سونے اور ہاتھی دانت کی بنی تھی بجائے مسند کے اسی تخت پر رکھوا دی تھی۔

اس تخت پر ایک مربع شامیانہ تنا ہوا تھا جس کی چوبیں اندر سے لکڑی کی تھیں اور اوپر سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ اس شامیانے اور شامیانے کی چوبوں میں گراں بہا جواہرات بے حساب جڑے ہوئے تھے۔ اسی شامیانے میں سامنے کے رُخ پر ایک بہت ہی بڑا زمرد جڑا ہوا تھا جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ کمرے کے پردوں کی طرح اس شامیانے کے پردے بھی ارغوانی رنگ کے نہایت نفیس کاشانی مخمل کے تھے جن پر سنہری زردوزی کا کام بنا ہوا تھا اور گرد موتیوں کی جھالر لگی ہوئی تھی۔[۱]

ڈاکٹر صفدر لکھتے ہیں

لکھنؤ میں ہونے والی رسم مسند نشینی میں تاج بھی ہوتا تھا، انگریزی باجا بجتا تھا، شلک سلامی ہوتی تھی اور شہر میں منادی کرادی جاتی انگریز ریذیڈنٹ بادشاہ کا انتخاب کرتا اور اس کے سر پر تاج خود پہناتا تھا۔ لکھنؤ میں لکھے جانے والے قصائد میں شاہی درباروں کی شان و شوکت کے تقریباً مذکورہ بالا نقشے ہی ملتے ہیں۔ لکھنؤ کے کھیل تماشے، ملبوس زر میں لپٹی حسین و جمیل خواصیں، ملکہ رانیاں، حقہ برداریاں، شاہی لباس (زر جنتری، موتی، زمرد، الماس و یاقوت اور ہیرے جواہرات ٹنکے ہوئے) زیورات، پردہ، شادی بیاہ کی رسومات، مذاق معاشرت، سستی کاہلی، طوائفیں، رقاص، شیعہ عقائد۔ کا اظہار بھی ان میں ہے۔ لکھنؤ کے شعرا خدا کی حاکمیت، نبی کی حقانیت، دین و شریعت کے اصول و قوانین، ملائکہ، کتب آسمانی پر یقین رکھتے تھے۔ وہ امامت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ حضور کے بعد بارہ امام جانشین تھے، تمام آئمہ معصوم ہیں اور دنیاوی مدرسوں کی بجائے ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے ہیں انکا کام شرعی ریاست قائم کرنا ہے امام لطف قادر ہی سے امام ہوتا ہے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ حضرت علی امام اول ہیں اور رسول خدا کے خلیفہ بلا فصل ان کے پاس اہلبیت رسول کا تصور تھا، جہاد، رجعت، معاد جسمانی، فنائے عالم و حشر خلق سکرات موت، قبر، عالم برزخ، جنت و دوزخ، اعراف، حساب اعمال، شفاعت محمدؐ و آل محمدؐ (۲)

---

① شباب لکھنؤ اردو ترجمہ The Life of An Eastern King از ولیم نائٹین بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۱۷۴، ۱۷۵ ② لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۱۷۹، ۱۸۰ ③ ایضاً ص ۲۲۸، ۲۲۹

وغیرہ کے تصورات ان کے شعور کا حصہ تھے - فن تعمیر، مصوری، خطاطی، موسیقی، طب وغیرہ
کے حوالے لکھنوی قصائد نگاروں کے ساتھ ساتھ دہلوی شعرا کے ہاں بھی نظر آتے ہیں۔ بعد دہلی میں دربار
کو مرکزی حیثیت حاصل تھی لیکن وہاں بدحالاتی کی وجہ سے شعرا کو پرسکون اور پرامن علاقوں کی تلاش ہوئی جہاں
ان کا روزگار کا بندوبست ہو سکے۔ وہ مفلسی اور تنگدستی سے عاجز آ کر اودھ کی جانب کھنچ آئے
فیض آباد اور لکھنؤ عیش و عشرت کے گہوارے تھے۔ تاہم تہذیبی طور پر دلی کی برتری کو لکھنؤ
والے بھی تسلیم کرتے تھے۔ لکھنؤ میں عوام کا مزاج نرم اور دھیما تھا انہیں سکون و فراغت حاصل تھی۔ یہاں ہولی
دیوالی، بسنت وغیرہ کے تہوار منائے جاتے۔ رام لیلا، کرشن لیلا کی تمثیلیں ہوتیں (۱) ناچ گانے کی
محفلیں عموماً تھیں۔ لکھنوی قصیدہ اپنے اندر لکھنوی ماحول کی جھلکیاں رکھتا ہے محمد بخش مہجور
کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں یہ (ان کے) نواب غازی الدین حیدر کے قصیدہ میں سے لیے گئے ہیں

ہولی کے موسم میں نیر کی بزم کا دیکھا جو رنگ + غٹ کے غٹ باندھے ہوئے داغ حسینان جہاں

پھرتے ہیں رنگ شفق میں شکل مہ ڈوبے ہوئے
ہاتھ میں مثل ثریا لے کے سب پچکاریاں
آنکھ اٹھا کر جس طرف دیکھا تو باندھے اپنا غول
ہر طرف کو پھرتی ہیں اس روپ سے سب رنڈیاں
دست رنگیں میں ہے دف اور گیند گل صد برگ کے
چھاتیوں پر بھی دوپٹے کی بندھی ہیں گاتیاں
اور کہیں آپس میں ہولی کھیلتی ہیں وہ جو سب
آن پری رویوں کا نقشہ کیا کروں میں اب بیاں
کوئی ملتی ہے عبیر اور کوئی ملتی ہے گلال
اور کوئی پیچھے کسی کے دے رہی ہے تالیاں
اور کوئی منہ سے گلابی کو لگائے اینڈتی
پھرتی ہے ہر سمت کو کھولے نشے میں چھاتیاں
کوئی ہاتھ اپنا دو گانا کے گلے میں ڈال کر
اس کے ہونٹوں کی لب جو پر ہے لیتی مچھیاں
کوئی پہنے لال کپڑے اور ملے منہ پر گلال
جلوہ گر یوں ہے شفق میں جیسے مہر آسماں
اور کوئی سادہ رو منہ پر ملے ہے یوں عبیر
دیکھ کر جس کو یہی کہتے ہیں دانائے جہاں
غور سے دیکھا تو یہ جانا کہ ہلکے ابر میں
چاند اترا ہے زمیں پر چھپ کے زیر آسماں
اور کسی نے جو کسی کے منہ پہ پھینکا ہے عبیر
تو وہ خم گردن کیے ملتی ہے اپنی انکھڑیاں (۲)

(۱) لکھنؤ کا تہذیبی میراث ص ۲۶۹ (۲) نورتن از محمد بخش مہجور، ص ۱۵، ۱۴ مجلس ترقی ادب لاہور

ادبی جہت

اردو قصیدہ کو اودھ اور دہلی ہر دو درباروں میں پناہ ملی - یہ زمانہ اردو ادب کی ترویج اور ترقی کا زمانہ ہے۔ شعرا نے روایت سے وابستہ رہ کر قصیدہ نویسی میں تازہ لہجے پیدا کرنے کی کوشش کی، دنیاوی قصائد ذریعہ معاش تھے اور شاعراس کے وسیلے سے قرب حاکم حاصل کرتے تھے۔ اپنے آپ کو درباروں میں امتیازی مقام دلوانے کے لیے شعرا نے صنف قصیدہ کو اپنے فضل و کمال اور علم و ہنر کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ شاعر سمجھا کرتے تھے کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اسے شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے -
جہاں تک مذہبی قصائد کا تعلق ہے وہ بھی اس دور میں کثرت سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں شعرا کے مذہبی عقائد (شیعہ، سنی رجحان وغیرہ) بھی دکھائی دیتے ہیں -

۱۸۰۰ سے ۱۸۵۷ تک کا زمانہ دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کے درباروں کے لیے پریشان کن زمانہ تھا - بادشاہ، نواب اور نظام وظیفہ خوار تھے۔ شاعر ان سے معاشی آسودگی کیسے پاتے۔ سیاسی ہلچل اور ہنگاموں کے دور (۱۷۵۰ سے ۱۸۰۰) سے نجات ملی تو کٹھ پتلی حکمرانوں کی صورتیں نظر آئیں۔ اب نواب اور امیر شاعروں کے مربی بنے۔ فیض آباد، الہ آباد، محمود آباد، بنارس، سندیلہ، جہانگیر آباد، اٹاوہ، رامپور، بریلی، بلرامپور، عظیم آباد، مرشد آباد اور کلکتہ وغیرہ کے نوابوں، امیروں اور رئیسوں نے کسی حد تک شاعروں کو پناہ دی۔ ہمارے شاعروں نے انگریزوں کی مدح سے بھی گریز نہیں کیا۔ انشا اور چند دیگر شعرا کے ہاں اس نوع کے قصائد مل جاتے ہیں۔ آصف الدولہ، عماد الملک غازی الدین، شاہ عالم، سلیمان شکوہ، نواب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، معتمد الدولہ بہادر، روشن الدولہ، آغر بن علی خاں، ہادی علی خاں، جہاندار شاہ، میر محمد نعیم خاں، حسن رضا خاں، نواب محبت خاں، سیدی فولاد خاں، نواب شمس الدولہ، ٹیپو سلطان، جارج سوم، میجر پارلر، نواب ظفر یاب بہادر، اکبر شاہ، مرزا جہانگیر، نصیر الدین حیدر، وزیر الدولہ محمد وزیر خاں، راجا اجیت سنگھ، بہادر شاہ ظفر، واجد علی شاہ، نواب محمد احسن خاں، آصف جاہ ثانی، مہاراجہ چندو لال، افضل الدولہ، ناصر الدولہ، آصف، شرف الدولہ ابراہیم خاں، ظفر الدولہ علی اصغر خاں بہادر، نواب حضور محل، کرنل ایبٹ، میکلوڈ صاحب وغیرہ۔ شعرا کے ممدوحین ہیں۔
اس دور کے شاعروں میں جسونت سنگھ پروانہ، انشاء اللہ خاں انشا، غلام ہمدانی مصحفی، غلام علی راسخ، ولی محمد نظیر، سعادت یار خاں رنگین، محمد تقی ہوس، شاہ نصیر، کرامت علی شہیدی، نظام الدین ممنون، کنور سین مضطر، مومن خاں مومن، فقیر محمد گویا، ابراہیم ذوق، امان علی سحر، رائے گلاب چند ہمدم، غلام محمد خبیر، مہدی علی ذکی، اصغر علی نسیم، اسد اللہ خاں غالب وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں علاوہ ازیں رونق، حسام، موزوں، سبقت، احسان، ایجاد، ولا، طپش، مقیس، لطف، کافی، حیدری، آشفتہ، مہجور، نوا، سخن، غیور، مہر، احسن، آغا علی مہر، ادیب، قاسم، والہ، فضل، جولاں، شگفتہ، خاں، اختر، سلیمان شکوہ، حیدر، عشق، ناسخ، غفلت، میرزا محمد صفا، اثر، شاداں، سعید، ناصر، مسیحا، احسان عبدالرحیم، سجو، عارف، ہجر، احسان (عبدالرحمن)، ہدہد، جودت، وزیر، نیر، بیمار، حسن، شیفتہ، شہید، اختر، شبرانی، عرشی، عباس، فراسو، آزاد، ظفر، ہدایت، حیات، آزیں، فیض، مصطفیٰ خاں شیفتہ وغیرہ نے بھی قصائد لکھے۔ اس سے اس صنف کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے

مذکورہ قصیدہ نگار حضرات میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب نے اپنے قصائد کو روائتی سانچوں ہی میں ڈھالا ہے۔ مضامین اور موضوع کے اعتبار سے ان میں تنوع کا فقدان ہے۔ البتہ جہاں مذہبی ممدوحین کا معاملہ آجائے وہاں ان کے قلم کی عقیدتیں اور تخیل کی جولانیاں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ درباری مدحوں میں یکسانیت کا آجانا لازمی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بادشاہوں، امیروں اور نوابوں کی مثالی زندگیوں کی عکاسی ہے۔ ہمارے شعرا شخصیت کی انفرادیت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے تھے۔ کٹھ پتلی حکمران انہیں کیقباد و کیکاؤس کی شان و شوکت کے حامل نظر آتے ہیں۔ جن شاعروں نے شہر آشوب یا ہجویہ قصائد لکھے ہیں ان کے ہاں زندگی کی جیتی جاگتی موثر تصویریں ملتی ہیں۔

جہاں تک انگریزوں کی مدح کا تعلق ہے انگریز ریذیڈنٹ رچرڈ جانسن، جارج سوم، میجر یا رلز نواب ظفر یاب جاں یا اس نوع کے دیگر ممدوحین کی شان میں لکھے گئے قصائد اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے قبل بھی انگریزوں کے اثر و رسوخ کچھ کم نہیں تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے ملازموں نے انگریزوں کے جو قصائد لکھے ہیں ان کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے لیکن انشا کا جارج سوم کا قصیدہ کھٹکتا ہے۔ یہ غازی الدین حیدر کے زمانۂ اقتدار میں لکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مرضئ شاہ بھی شامل رہی ہو گی۔ یوں ہم جان سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے انگریزی حاکمیت ہندوستانی علاقوں اور لوگوں کو محسوس ہونے لگی تھی۔

اس دور کے اہم قصیدہ نگاروں کے قصائد میں وحدتِ اجزا (تشبیب، گریز، مدح، طلب اور دعا وغیرہ ہیں) بھی دکھائی دیتی ہے اور ان کی تشبیبیں پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قدرت اور فطرت کے مناظر کا اظہار خوش اسلوبی سے کرتے ہیں اور ان میں خدا اور اس کی حکمت، اس کی موقفیت و مطلقیت کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ قصیدہ نگار تمام مظاہر اور مخلوق کو نظامِ خداوندی کے کارکن سمجھتے تھے۔ وہ ان کی بطور دیوتا کے پرستش نہیں کرتے تھے۔ ممدوح کو ان شاعروں نے خدا کا نائب اور ظل اللہ کہا ہے اور یوں توحید اور خدا کی بزرگی کو بیان بھی تسلیم کیا ہے۔

قصیدہ نگاروں نے ممدوحین کو صحیح العقیدہ مسلمان، خوش صفاتِ انسان، خدا کا بندہ بندوں کا نگہبان، مخلوق پر رحم کرنے والا، رعایا پرور، انسان دوست، غریب نواز، ملجائے بےکساں ماوائے بے لبساں، سایۂ بےسایگاں، صاحبِ ایمان، مالکِ یقیں، امینِ خزانہ، سخی، حاتم شعار وغیرہ قرار دیا ہے۔ جہاں تک نعتیہ قصائد کا تعلق ہے اس میں بھی حضورؐ کو بعد از خدا بزرگ کہا گیا ہے۔ وہ مذہبی شخصیت یا کسی کو دیوتا اور خدا نہیں کہتے تھے۔ وہ انہیں بے مثل، بےنظیر یا یکتا کہتے ہیں مگر کن میں؟ ظاہر ہے کہ انسانوں میں، ممدوحین ان قصیدہ نگاروں کے نزدیک عبدہٗ تھے "ھو" نہیں تھے۔ وہ صفاتِ خداوندی کے مظہرِ تام ضرور تھے خود خدا نہیں تھے

اپنے قصائد کے دعائیہ حصوں میں بھی بیشتر عقیدہ نگاروں نے محمدیہ جذبات کا اظہار کیا ہے علاوہ
ازیں دست طلب یا دست سوال دراز کرتے ہوئے بھی انہوں نے یہی فضا قائم رکھی ہے ۔ وہ ممدوح کو
خدائے مطلق یا رازقِ مطلق سمجھ کر کچھ طلب نہیں کرتے تھے یعنی ان کے نزدیک اگر ممدوح گنج بخش تھا
یا حاتم تھا تو وہ خدا کے دیے ہوئے گنج یا دولت کی وجہ سے تھا ۔ اگر وہ نصیب تھا تو خدا کی دی ہوئی
نعمتوں کی بنا پر، وہ ممدوح کے لئے دعا کرتے تھے کہ وہ بندۂ خدا ہو، اچھا حکمران بنے، پرشکوہ بادشاہ ہو،
پرہیبت امیر مملکت ہو تاکہ کفر اس سے مرعوب ہو، ظلم کافور ہو جائے، انصاف و عدل جو منشائے
حکومت ہے قائم ہو، عدل کی حکمرانی، انصاف کی بادشاہت اور خدا کی حاکمیت کا دور دورہ ہو،
اس ادبار کے دور میں جب حکمران لا مذہبی ہو گئے تھے ہمارے عقیدہ نگاروں نے
خدا کی حاکمیت، بندگانِ خدا پر خدا کے نیک بندوں پر وغیرہ کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔
مسلمان عقیدہ نگاروں نے اسلام کو امن اور رحمت کا مذہب جان کر اس کی توصیف و ثنا کی ہے
یہ رحمت اور امن ہر قسم کی مخلوق کے لئے تھا ۔ ان عقیدوں کی پوری فضا میں یہ تصور رچا بسا ہے
اسلام کے اس تصور کی شدت سے کفار باطل کی طرف سے حق کی جانب آتے ہیں

ان عقیدہ نگاروں کی امیجری میں صحرا، پہاڑ، باغ، دریا، میدان، دشت، جنگل،
چمن، شہر، کوچہ، درخت، جانور، پرندے، درندے، حیوانات وغیرہ کی تفصیلی نقشہ کشیاں
ملتی ہیں ۔ ان کی تشبیب میں کوہ و صحرا، دشت و جبل، باغ و راغ کی جو حسین تصویریں اور دلکش مرقعے
ہیں ان سے ان مناظر اور کوائف سے ان عقیدہ نگاروں کی گہری وابستگی کا سراغ بھی ملتا ہے ۔
یہ عقیدہ نگار ایسے الفاظ، تراکیب اور تلمیحات استعمال کرتے ہیں جن سے ان کے عقیدوں کی فضا
ہموار رہے ۔ ان کے اسلوب کی عظمت، پرشکوہ، پرجمال اور پرجلال تصویروں میں نظر آتی ہے

مدح میں یکسانیت کے باوجود ہم ان عقیدہ نگاروں کی تشبیب میں استعمال ہونے
والے سیاسی، عشقیہ، اخلاقی، فخریہ، بہاریہ اور سماجی موضوعات کا تنوع بھی دیکھ سکتے ہیں انہوں
نے روایتی علوم طب، نجوم، منطق، ہیئت، تصوف، موسیقی، رقص اور دیگر علوم و فنون کی
اصطلاحیں استعمال کی ہیں ۔ سراپا کا بیان ہو یا ہجر و وصال کے کوائف کا، تاریخی واقعات کا
اظہار ہو یا شکایت آسماں، زمانے کا شکوہ ہو یا علم و فن کی ناقدری کا بیان، اخلاق اور
پند و نصائح پر مبنی خیالات کا بیان ہو یا دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ یہ عقیدہ نگار اپنے
اظہار میں چست اور بیان میں پختہ ہیں ۔ تاہم ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ
یہ شاعر بھی فارسی کی تقلید ہی میں قصائد لکھتے رہے ہیں ۔ عجمی فضا اور فارسی لسانی شکوہ
ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔ تاہم انہوں نے مقامی فضا سے پورے طور پر دامن نہیں بچایا
ان کے قصائد میں ہندی فضا اور ہندی ماحول کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں

یہ دور اگرچہ سیاسی زوال پذیری کا تھا تاہم ابھی علاقائی راسخ نہیں ہوئی تھی اور سماجی اور سیاسی شان و شوکت
خاک میں نہیں ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان شاعروں کا لہجہ پروقار اور علویت کا اثر رکھتا ہے۔ یہ
قصیدہ نگار صنائع بدائع کے استعمال سے آگاہ تھے اور غزل اور قصیدہ میں تفریق کرنا جانتے تھے
البتہ کہیں کہیں مشکل، پیچیدہ اور سنگلاخ زمینوں کا استعمال فضا کو بوجھل کرتا ہے۔ غیر معروف
تلمیحیں ہوں یا دقیق اصطلاحیں اس میں شک نہیں کہ ان سے قصائد بھاری بھرکم ہو جاتے ہیں
لیکن ان میں جذبات کا اظہار مشکل سے ہو پاتا ہے۔

اس دور کے قصیدہ نگاروں میں اردگرد کی زندگی کی تفصیلات دینے کا زیادہ رجحان نہیں
تھا۔ ورنہ ماحول کی تمام تر جزئیات مشاہدات ان کے قصائد کا حصہ ہوتیں۔ البتہ اپنے عقائد اور مذہبی خیالات
کے اظہار میں شعرا نے بخل سے کام نہیں لیا۔ نوروز کا بیان ہو یا مختلف اقسام کے پھلوں اور پھولوں کا
نجوم و خوش نویسی کے حوالے ہوں یا ہیئت و رمل کے، نئی سائنسی ایجادات کا بیان ہو یا جنگی مناظر کا
خوش لسانی لہجے ہوں یا صنائع بدائع سے معمور شعر، ان شاعروں کی جودت طبع اور اختراع ذہنی
کی داد دینی پڑتی ہے۔ ہندوستانی تلمیحات و روایات کے استعمال سے یہ شاعر کتراتے ہیں
بعینہٖ جیسے غیر مسلم قصیدہ نگار اپنے قصائد میں اسلامی ماحول کے عناصر و اجزا لانے سے گریز
نہیں کرتے۔ ان قصیدہ نگاروں کی مضمون آفرینیاں اور مبالغہ آرائیاں بھی قابلِ داد ہیں

خصوصی مطالعے

فصل سوم

جسونت سنگھ پروانہ

رائے جسونت سنگھ پروانہ [م ۱۸۱۳] عرف کاکا جی ابن بینی بہادر لکھنوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ابتدا میں میر تقی میر اور میر حسن کے شاگرد تھے۔(۱) بعد میں مصحفی سے نسبت پیدا ہوئی۔(۲) فارسی شاعری میں ان کے استاد سرب سنگھ دیوانہ تھے۔ مصحفی نے پروانہ کے بارے میں لکھا ہے "غزل اور قصیدے میں مرزا محمد رفیع سودا کی طرز کے مقلد تھے۔ اور معانی نئے تازہ شعار کرتے تھے"(۳)۔ دیوان پروانہ کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کا مملوکہ ہے۔(۴) اس کے ابتدا میں قصائد موجود ہیں۔ ان قصائد کی تعداد دس ہے یہ حضرت علی اور امام مہدی کی منقبت میں بھی ہیں اور آصف الدولہ کی مدح میں بھی۔ ان کا جو دیوان ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کی ملکیت ہے۔ اس میں چھ قصائد ہیں۔ دو منقبت (امام مہدی[ع] حضرت علی[ع]) ایک قصیدہ پر ممدوح کا نام عماد الملک غازی الدین خاں بہادر لکھا ہوا ہے۔ باقی تین قصائد پر ممدوح کا نام نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں آصف الدولہ کی مدح بھی ہو گی۔ علی جواد زیدی نے لکھا ہے یہ عماد الملک کی مدح میں ہی ہوں گے(۴ الف) کریم الدین نے پروانہ کو نواب شجاع الدولہ کے خاص تا شیوں میں لکھا ہے(۵) اور کہا ہے اس کے شعر فصیح اور دلچسپ ہیں(۶)

جسونت سنگھ پروانہ کا کوئی قصیدہ بھی پچاس اشعار سے کم نہیں ہے۔ دو قصائد کے اشعار ستر سے زیادہ ہیں اور دو قصائد علی الترتیب ایک سو اور ایک سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہیں۔(۷) حضرت علی[ع] کی مدح میں ایک قصیدہ بہاریہ ان کے دیوان میں موجود ہے جس پر لکھا ہے "قصیدہ در جواب قصیدہ مرزا رفیع سودا مرحوم مسمی 'تکان گل' اسکا مطلع ہے

سہ شنبہ نوروز کا ہے گلشن دوراں میں عمل + افسر زر سے ہوا زیب دہ تخت حمل

اس کے یہ اشعار بھی دیکھیئے ان میں بہاریہ کو اتنے کے ساتھ پھولوں کے نام بھی گنوائے گئے ہیں

موتیے کی جو وہ کلیاں ہیں لڑی موتی کی + طرۂ زر سے ہر اک گل کے کہیں ہیں اول

نت زر جعفری انعام کرے ہے سب کو + جعفری جعفر برمک سے سخا میں ہے مثل

رو سفیدی سے ہے نامی سمن سیمیں تن + سرخروئی سے ہیں لالہ سے لے تا گڑہل

اس قصیدے میں پروانہ نے گل عباسی، زعفران، عشق پیچاں، رائے بیل، کیتکی، نازبو، گلنار، سنبل مولسری، موگرا، شبو، اشرقی، سوسن اور نرگس وغیرہ کے حوالے سے عمدہ تشبیہی و جمالیاتی اشعار نکالے ہیں۔ اس میں خط ریحان خط نسخ اور خط غبار کے حوالے بھی آتے ہیں اس قصیدے میں گریز بھی عمدہ ہے سو کیوں نہ اس رنگ پہ نوروز ہو جب اس دن میں + افسر آرا ہو خلافت کا امام اول

جس نے عالم سے کیا خار و خس کفر کو دور + جس سے آراستہ پیراستہ ہے باغ ملل

بوتراب اس کا لقب گلشن ہستی میں جو ہے + رتبۂ خاک کے آگے ہے فلک بھی اسفل

(۱) (۲) تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص ۳۹۲ (۳) تذکرہ ہندی ص ۱۰۱ (۴) قومی عجائب گھر کراچی (۴ الف) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۰۲
(۵) طبقات شعرائے ہند ص ۲۱۴ (۶) ایضاً ص ۱۲۸ (۷) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۰۳

جسونت سنگھ پروانہ کے قصائد کے مطالع ملاحظہ ہوں

ے اس قامتِ رعنا سے صنوبر ہے برابر + روئے عرق افشاں سے گل تر ہے برابر
کس لطف سے بہار کی آمد ہے اب کے سال + تختے گلوں کے کانِ جواہر کی ہیں مثال
موسمِ گل میں ہمیں خواہاں ہے اپنا دل مدام + ابر و سیرِ باغ و ساقی بادہ و مینا و جام
کیا جوشِ گل سے اب کے چمن کی ہے آب و تاب + ہے مخمل دو خوابہ کا ہر جا پہ فرشِ خواب

انہوں نے چرخیہ تشبیب کا حامل ایک قصیدہ بھی لکھا ہے اس کا مطلع ہے

ے ہر ایک کو گردشِ گردوں نے کر دیا مجبور + کہ اختیار پر اپنے نہیں یہاں کے امور

پروانہ کے مذکورہ مطالع جو کس اور پر تاثیر ہیں۔ آخرالذکر قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ے سبھوں کے کام و دہن میں ہے نوش و نیش مدام + نجوم و چرخ ہیں مانندِ خانۂ زنبور
کیس ہیں جس کو ہر ایک خاص و عام ہفت اقلیم + سو ہفت اخترِ سیارہ اس پہ ہیں مامور
کوئی ستارہ جو قوت پہ ہو کہ یا ہو ضعیف + تو ہووے حال بھی اس ملک کا اسی دستور
ان اختروں کے تیئں زیچ سے کر استخراج + کر ان کی ضبط تو گردش جو اس میں ہو مسطور
وتد میں گر ہو شرف بیچ ماہ اور خورشید + تو ہووے طالع سائل ہی خرمی و سرور
جو نیّرین ہوں بدحال تو یقیں ہے پھر + نکال در بخ و غم و ظلم و جور کا ہو ظہور
جو سات ماہ کے کوکب ہے افتراق میں ہے + سوائے ماہ کہ ہو مجتمع وہ تب مشہور
تو پھر سقیم کا اس برج کے ہے یہ احوال + کہ جس طرح سے کوئی قلعہ بیچ ہو محصور

پروانہ نے اس قصیدے کے اشعار میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ مشتری، زحل، زہرہ اور مریخ جب چلتے ہیں تو ہر ایک شعور حیرت کے گم ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ بطی ہیں اور کبھی سریع السیر، کبھی یہ راجع مشہور رہیں اور کبھی مستقیم۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر ایک جگہ دو منحوس ستارے جمع ہو جائیں تو ملک میں فتور برپا ہو جاتا ہے۔ اس قصیدے میں مشتری اور زحل کے قران کا تذکرہ بھی ملتا ہے وتد، تاسع، خانۂ اوتاد وغیرہ کا تذکرہ بھی ہے طالع کے نہم یا شرف میں ہونے اور ان کے ہبوط و زوال وغیرہ سے اوج جاہ اور طالع پر کیا اثر پڑتا ہے اس کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ برج ثالث، یازدہم، تسدیس، برج خامس و تاسع، تثلیث، سرطان، زہرہ وغیرہ کی اصطلاحوں کی مدد سے پروانہ کے قصیدے کو علمی تاثیر سے معمور کیا ہے۔ اس قصیدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروانہ اپنے علم اور قدرتِ بیان کو شاعرانہ معنی خیزی کے لئے استعمال میں لاتے تھے۔ اس قصیدے کے مزید اشعار دیکھئے

یہ جب کہ صاحب طالع سوں اتصال کریں + تو پھر ہو سائل و مولود کو بہت مسرور
دگر حضیض میں ہوں یا ضعیف دو کوکب + تو نور دینے سے آپس میں پھر رہیں گے نفور

وگر ہوں نحس وہ دونوں ستارے بد اثر تیسے + خدا ہر ایک کے طالع کو ان سے رکھے دور
نظر دبیل و شواہد پہ تو یہ کر من بعد + جو سعد ہیں تو ہے نیکی جو بد ہے تو ہے فتور
مساوی ہوئے سے گر نیک و بد کے شک ہو تجھے + تو وہم اس کے سے کر حکم تا نہ آئے قصور

ہندوستان میں نجوم درباری تہذیب کا حصہ تھا۔ نجومی اور ہیئت دان دربار کے باقاعدہ ملازم ہوتے تھے۔ جب وہ کام کے لئے نیک گھڑی کا تقرر کرتے تو اسکا آغاز ہوتا۔ ذاتی احوال سے اجتماعی معاملات تک (لشکری، درباری اور رسومیاتی امور) نجومیوں کے مشورے پر عمل کیا جاتا۔ مغل بادشاہ ہمایوں کے بارے میں کہا جاتا ہے "ہندوستان میں کرّے اور اصطرلاب کا رواج دینے والا وہی تھا۔ اس نے خود ایک طرح کا اصطرلاب تیار کیا تھا جو اصطرلاب ہمایونی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے دربار میں بساط نشاط فلکی دائرے پر مشتمل تھی اور دربار کا لباس بھی ستاروں کی مناسبت سے روزانہ بدلا کرتا تھا۔ اس نے ایک خرگاہ بھی تیار کروائی تھی۔ اس کی تقسیم آسمان کے بارہ برجوں کے مطابق کی تھی۔ ہر برج کے کواکب سے کواکب و دولت کے انوار چمکتے تھے" (۱)۔ جہانگیر شاہجہاں اور حتیٰ کہ اورنگ زیب کی تاجپوشی نجومیوں کی مقرر کردہ ساعت پر ہوئی (۲)۔ علم نجوم کے حوالے سے شبھ لگن کا تصور یا زائچہ بنوانے کا (جو ہماری داستانوں اور مثنویوں میں بھی رقم ہوا) خیال ہندوستانی معاشرے میں عمومی تھا۔ جسونت سنگھ پروانہ نے اپنے قصیدے کے حصہ تشبیب میں اس شکل موضوع کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں کو موثر طور پر بیان کیا ہے۔ جسونت سنگھ پروانہ کے قصائد پر میر حسن کی (مثنوی کی) جزئیات نگاری کا خاص اثر ہے انہوں نے پھولوں، موسموں، باغوں کے ماحول کی عمدہ منظر کشی کی ہے مدح کے حوالے سے بھی وہ ممدوح کی اصل خوبیوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں مثلاً حضرت علی(ع) کو عالم سے خار و خس کفر دور کرنے والا کہنا وغیرہ۔

پروانہ اگرچہ ہندو تھے لیکن مسلم دربار کی قربت اور مسلمانوں کے تہذیبی ماحول نے ان کے مزاج پر گہرا اثر ڈالا۔ اسلامی عقائد و فرقہ وارانہ نظریات سے ان کی واقفیت اسی ماحول کی بدولت تھی حضرت علی(ع) کو خلافت کا امام اول کہنا، ساقی حوض کوثر قرار دینا اس ماحول کے واضح اثرات ہیں۔ جسونت سنگھ پروانہ ایک بزرگ مستان شاہ کے مرید تھے۔ حضرت علی کی مدح میں پروانہ کے چار قصائد ہیں انہیں مشفق خواجہ نے ان کے تمام قصائد سے زیادہ بہترین کہا ہے (۳) ان کے ایک قصیدے کے یہ اشعار بھی دیکھیے

[در منقبت علی] ؎ میں نے کل عرض یہ کی پیر خرد سے جا کر + کہ غم و درد سے اب تنگ ہے عرصہ دل پر
اخگر سرخ ہے ہر قطرہ خونناب سرشک + سینہ تفتہ دہکتا ہے برنگ مجمر
بادۂ باراں سے نہ ہو نفع جو بے موسم ہو + سو دیوں گریہ و نالے سے ہیں غیر حذر
روز روشن ہے شب مرگ کی مانند سیاہ + شام غم دیکھیے تو وہ بھی ہے صبح محشر

---

(۱) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۷۷ (۲) ایضاً (۳) مقالہ جسونت سنگھ پروانہ از مشفق خواجہ غالب کراچی شمارہ اول ۱۹۷۵

یکتا نے دستور الفصاحت میں شاعر خوش تقریر اور فکر رسا کا مالک قرار دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے

"قصیدہ و غزل ہر دو بتلاش تمام گفتہ" (۱)

پروانہ کے قصائد کے یہ مطالع بھی موثر ہیں

در مدح ابیر ~ یہ نقش پیر عقل نے شب طرفہ کی بیاں + بحث ایک روز تھی زر و آہن کے درمیان

در منقبت علی ~ شبدیز قلم دیکھ کے قرطاس کا میداں + کرتا تھا سرِ صفحہ کو کل زور سی جولاں

جسونت سنگھ پروانہ کے قصائد علمی شان رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے بوجھل ہونے کا احساس زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ تشبیہ اور تلازمہ کی تلاش میں مہارت رکھتے تھے۔

~ زعفران زار کی ہے سیر سے مسرور آثار + کھلکھلا کر جو ہنسا دانت سبھی آئے نکل

عشق پیچاں کے رگ و ریشہ میں ہیں عشق کے پیچ + ناتوانی اسے رکھتی ہے ولیکن بے کل

رائے ہیں ان میں وہ ہے ہند کی اقلیم کا رائے + کینتی جس کی کنیزوں میں ہے سب سے ارذل

نمِ شبنم سے نہیں سنبلِ مشکیں میں غبار + جیسے پانی سے کوئی بالوں کو دھو دے مل مل

مثال اس کی کیوں گر ہو ماہ سرطان میں + ہو زہرہ ثور میں جیسے بہشت میں ہو حور

پروانہ کا تخیل بسا اوقات ماورائے تشبیہ نئی باتیں پیدا کر لیتا تھا۔ مولانا عبد الرحمن نے لکھا ہے "بہ ظاہر ہے کہ خیال کا گنجینہ معلومات جو کچھ ہے حافظہ کی کتاب میں ہوتا ہے۔ وہ اگر بڑی ہے اور شاعر کی معلومات وسیع ہیں تو خیال بھی معانی و تشبیہات کثیر اپنے لئے موجود پاتا ہے۔ ورنہ اس کی جولانگاہ تنگ ہو جاتی ہے اور جلد تر اس کو تجنیس کی قلمرو میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تاکہ تنگ مائگی کے ننگ کو ڈھانک سکے" پروانہ نے اپنے علم اور معلومات کے زور پر شاعری کی ہے تاہم ان کے تخیل کی اقلیم ان کے علم سے جدا نہیں رہی اس کے اثرات بہر طور ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ انہوں نے سودا کی پیروی بھی کی ہے اور اس کے جواب میں قصیدہ بھی لکھا ہے لیکن نقش اول کی وسعتوں کو چھونا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ بلکہ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ سودا کے نقوش و روایات کی پیروی میں اکثر عرقوں نے منہ کی کھائی ہے۔

---

(۱) دستور الفصاحت ص ۱۱۱ مطبوعہ ہندوستان پریس رامپور ۱۹۴۳ (۲) مراۃ الشعر ص ۱۷۶-۱۷۷

انشاءاللہ خاں انشا

انشاءاللہ خاں انشا [م ۱۸۱۸ء] کہ جو دلبستانِ لکھنو کے اہم نمائندے متصور ہوتے ہیں۔ قصیدہ گوئی میں منفرد اسلوب کے حامل ہیں۔ اس صنف میں انہوں نے اپنی ذہانت، فطانت اور علمیت کے ایسے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ ایک جگ ان کے کمالات کا معترف ہے۔ الفاظ و معانی پر ان کی قدرت کو تمام قدیم و جدید تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے۔ میر حسن نے ان کی طبعِ تازہ، ذوق بے اندازہ، شرابِ معانی وغیرہ کی تعریف کی ہے[1] شیریں زبانی سے متصف یہ شاعر معانی آفرینی کے متعدد نمونے رکھتا ہے۔ ابوالقاسم الہ آبادی کے بقول زبان دانی کی لذت سے ان کی طبیعت رسا واقف ہے۔ ان کے کلام کی انشا مضبوط ہے اور طرزِ ادا بہت ہی مربوط ہے۔[2] کشمیری، مارواڑی، فارسی اور عربی السنہ میں انشا کی عبارت کو کریم الدین نے بھی تسلیم کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اشعار میں صنائع بدائع کا استعمال اکثر کرتا ہے بعض اشعار بے نقط اور بعض نقطہ دار اور بعض صنعتِ قلب میں لکھے ہیں[3]۔ راجستھانی، مرہٹی، پشتو، ترکی، انگریزی اور بھاشا سے بھی انشا کی گہری دلچسپی تھی۔ ان کے قصائد میں قارئین سے نامانوس السنہ پر مشتمل مصرعے بوجھل پن اور ثقالت کا احساس دلاتے ہیں۔ عربی الفاظ کا استعمال بھی انشاء نے فصاحت و بلاغت کے معیارات کے اعتبار سے نہیں کیا۔ مغلق اور دقیق عربی الفاظ ان کے قصائد میں بھی بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی شاعرانہ قوت اور لسانی عبور کا انداز اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سنگلاخ زمینوں کا استعمال ان کے لئے معمول بات تھا علاوہ ازیں مشکل ردیفوں کی ایجاد اور پیچیدہ قوافی کا استعمال ان کے لئے کارِ محال نہیں تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے انشا کے قصائد " بڑی دھوم دھام کے ہیں۔ الفاظ کی شکوہ، طبیعت کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں

مگر سید یہ چلتے چلتے ایک ایسی چال بدلتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ وہ یہی بات ہے کہ اپنی زبان دانی کے جوش اور قوتِ بیانی کے مزے میں آکر کبھی کوئی شوخ مضمون، کبھی کوئی خوش آئند ترکیب، ونئی تراش ایسی سوجھ جاتی ہے کہ اسے باندھے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہاں قصیدہ کی متانت اور وقار کے اصول ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں اس میں کبھی تو کلام میں شوخی اور ایک قسم کا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی مبتذل ہو جاتا ہے۔ مگر پھر لطف یہ ہے کہ قدرتی لذت جو زبان میں ہے وہ کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی۔ اور اسی واسطے جس دربار یا جلسہ میں قصیدہ پڑھتے سبحان اللہ اور واہ واہ کے سوا سننے والوں کو ہوش نہ ہوتا۔ اس بے اعتدالی کا سبب یہ تھا کہ طبیعت میں طاقت بہت تھی مگر اس پر قابو نہ تھا۔ ان قصیدوں میں مزہ وہاں آتا ہے جہاں ممدوح کی تعریف کرتے کرتے دفعتاً" کہتے ہیں کہ دارائے ایران مجھے ایران

---

① تذکرہ شعرائے ہندی ص ۵۹ ② تذکرہ مسرت افزا ترجمہ ص ۱۴۶ ③ طبقات شعرائے ہند ص ۲۰۲

میں بیٹھا کہہ رہا ہے اور جھٹ چند شعر فارسی کے اس طرح کہہ جانے گویا ایک آغائے تازہ ولایت آیا اور اپنی چنیں وچناں کسے سالوٹ شیرۂ شیراز کے دو دو گھونٹ سب کو پلا گیا۔ اس کے برابر گویا ایک عرب العربا جبّہ پہنے، عبا اور عمامہ سجے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ یوز شاہ بخارا ترکستان سے ترکی میں آواز دیتا ہے۔ اور سالوسی عالی جاہ کابل اپنی افغانی میں یہ کہتا ہے۔ اور برج کی گوپیاں یوں کہتی ہیں اور پنجاب میں جھنگ سیالے کی جٹیاں یوں کہتی ہیں وغیرہ وغیرہ (۱)

انشاء اللہ خاں انشا کے کلیات میں فارسی اور اردو قصائد موجود ہیں (۲) مرزا محمد حسن عسکری نے اپنے مرتبہ کلامِ انشا میں ان کے دس اردو قصائد درج کیے ہیں (۳) ان میں تین منقبتی ایک حمدیہ اور چھ غیر مذہبی ممدوحین کی شان میں ہیں ان کے ممدوحین شاہ عالم، شہزادہ سلیمان شکوہ، نواب سعادت علی خاں، اور جارج سوم شاہ انگلستان کے علاوہ دلہن جان بھی ہے

انشاء اللہ خاں انشا کا ایک قصیدہ صنعتِ اہمال یا صنعت غیر منقوط میں لکھا گیا ہے۔ یہ حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے۔ اس میں صنعت اہمال کے علاوہ صنعت مقلوب مستوی (۴)، صنعت رقطاء (۵)، صنعت محتمل اللغات، صنعت منقوط کل اور صنعت خیفا کا استعمال بھی کیا گیا ہے (۶)۔ یہ اشعار دیکھیے

؎ مراد روح درد اور روح در دارم + مال کل امور سرور مال کلام [مقلوب مستوی]

شہ بلند نصیب اب مجھے سبھی دلوئے + جبین لامع زینت حصول جشن مرام [صنعت خیفا]
[صنعت رقطا]

[illegible]

انشاء نے اس قصیدے کے مقطع میں اپنے منقوط نام کی جگہ اس کا ہم معنی عربی لفظ لوار اداللہ (۷) استعمال کیا

؎ محمد و حاکمہ معلوم، لوار داللہ + عمال اس کا کرو حور دل کو دو آرام

انشا نے ایک غیر منقوط قصیدہ عماد الملک کی شان میں بھی لکھا اور انعام و تحسین و آفریں سے نوازے گئے۔ ان کی مشکل پسند طبیعت کا اندازہ ذیل کے قصائد کی زمینوں سے بھی کیا جا سکتا ہے

در مدح دوازدہ امام ؎ نوع البشر میں تھے نیاں آتش و آب و باد و خاک + عشق نے کر دیے نیاں آتش و آب و باد و خاک

در حمد ؎ اے خداوند مہ و مہر و ثریا و شفق + لمعہ نور سے ہے تیرے جہاں کو رونق

در منقبت علیؓ ؎ گرچہ افلاک کے سب پونگ دے الطباق آتش + منہ تو دیکھو کہ کرے آ مجھے احراق آتش

اردو قصائد کی تاریخ میں انشا کا نام تکلف اور آورد کا مظاہرہ کرنے والے قصیدہ نگاروں کی صف میں آتا ہے انشا کا زورِ بیاں قابلِ دید ہے۔ لیکن تاثیر سے انہوں نے سروکار نہیں رکھا۔ ان کے قصائد تہذیبی اور ثقافتی حوالوں

---

(۱) آبِ حیات ص ۲۷۳ (۲) کلیات انشا مطبوعہ نول کشور (۳) کلام انشا مرتبہ مرزا محمد عسکری مطبوعہ اردو اکیڈمی اتر پردیش
(۴) پورا لفظ پورا فقرہ یا مصرع یا شعر الٹا جائے اور پھر بھی لفظ فقرہ یا شعر پڑھا جائے (۵) کسی عبارت یا نظم یا مصرع میں ایک حرف بے نقطہ اور ایک حرف نقطہ دار بالترتیب موجود ہو (۶) جس میں شعر یا فقرے کے ایک لفظ کے کل حروف بغیر نقطوں کے ہوں اور ایک لفظ کے سب نقطہ دار ہوں (۷) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۹۵ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انشا نے اس قصیدے کا نام طور الکلام رکھا ہے حیدر آباد

اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں مقامیت کا بھی گہرا عمل دخل ہے۔ ان کی تلمیحیں، تشبیہیں، استعارے اور بہت سے الفاظ ہندوستانی تہذیب کی رنگا رنگی سے معمور ہیں۔ ہندوستانی سنگیت، معتقدات، رسوم و رواج اور میلوں ٹھیلوں کی جزئیات کو انہوں نے اپنے قصائد کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے مقامی ہندی فضا اور ہندوستانی تلمیحات و روایات کا بے دریغ استعمال کیا ہے

سانگ ہولی میں حضور اپنے جو لاویں ہر رات + کہ کنہیا بنیں اور سر پہ وہ دھر لیویں مکٹ
گوپیں ہو کے پڑیں ڈھونڈیں قدم کی چھائیں + بالنری دھن میں دکھاویں وہی جمنا تٹ
کہیں شہنائی کی آواز ہے کہیں کاموَد + کہیں تو رام کلی بھیرویں کہیں تھا نٹ
بہاگ تھا کہیں توڑی کہیں تھی مالسری + کہیں کدارا کہیں تنکلی کہیں تھا کھٹ
بنے ہوئے کہیں رادھا کہیں کنہیا جی + پیتمبر اوڑھے ہوئے سر پہ رکھے مور مکٹ
وہی کریل کی کنجیں تھیں اور بندرابن + سہانی دھن وہی مرلی کی وہی بنسی بٹ

انشا کے قصائد تاریخی تلمیحات اور مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات سے بھرے ہوئے ہیں۔ عدل، شجاعت اور سخاوت کے بیان میں وہ تاریخی شخصیات کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ ممدوحین کی ان پر برتری ثابت کرتے ہیں منطق، فلسفہ، ہیئت، حکمت وغیرہ کے حوالے ان کے قصائد کو علمیاتی سطح عطا کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انشا کے قصیدے خاقانی کی علمیت اور عرفی کی نازک خیالی کا پرتو رکھتے ہیں۔ ان کے ذوق موسیقی نے ان کے قصائد کو علم موسیقی کی اصطلاحات کا خزینہ بنا دیا ہے علاوہ ازیں منطق و فلسفہ اور ہیئت و نجوم کے معاملات و مسائل سے انہوں نے گہرا شغف رکھا ہے۔ انشا کے حمدیہ قصیدے کی تشبیب فلسفیانہ ہے انہوں نے کہا ہے کہ خدا کے لمعہ نور سے جہاں پر رونق ہے۔ جب اس نے ابداع کے مکتب میں افلاک کے نسخے کے ہفت اوراق کھولے تو مسئلہ وحدت سامنے آیا عقل اول کو معلوم ہوا کہ استاد ازل کی ذات کی منہم کہ جس میں آن حد مغلق دقائق ہیں مشکل ہے

مقیدہ حمد — بحر مواج حقائق سے گزر کون سکے + ہاں مگر فضل ہے تیرا ہی بجائے زورق

اس کے بعد انشا نے عرش، شش جہت، لوح و قلم، ہفت طبق اور مو الید ثلاثہ کے عمل کا تذکرہ چھیڑا ہے اور شکر ادا کیا ہے کہ

کہ مجھے دین محمدؐ میں کیا تو نے خلق + ورنہ تھے اور بھی انواع کے ادیان و فرق

انشا نے حضرت علی اور دوازدہ امام کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں ان میں ان کے عقائد کا کھل کر اظہار ہوا ہے

اس کے اعدا کا جلانا جو نہ ہوتا منظور + خلق کرتا نہ کبھی حضرت خلاق آتش
ان کے عدو کے واسطے حق نے جحیم کی ہے خلق + دشمنوں کے ہیں درمیاں آتش و باد و آب و خاک

انشا کے قصائد کی تشابیب ان کی جودت طبع اور اختراعی ذہن کا کھلا ثبوت ہیں۔ انہوں نے انہیں بہاریہ، نشاطیہ فخریہ اور حکیمانہ اشعار سے آراستہ کیا ہے۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کی مدح میں لکھے گئے قصیدے میں سودا کی تقلید میں ایک پری کا سراپا رقم کیا ہے۔ جارج سوم کی مدح میں انگریزی ثقافتی و سماجی حوالوں کے ساتھ ساتھ بہار اور جشن کے کوائف کا رنگ چوکھا کرنے کے لئے چپلا بائی کی جسمانیت کو ابھارا گیا ہے۔ نواب سعادت علی خاں کی

مدح میں مرقومہ قصیدے کی تشبیب میں فتح کا تمثیلی پیرایے میں اظہار ہے۔ انشا نے دولت، نشاط، عشرت اور خوش دلی کو بھی مجسم کر کے پیش کیا ہے۔ ان کے اوضاع و اطوار، معمولات و ملبوسات کے ساتھ ساتھ ان کے سراپا کا بیان بھی ہے یہ بیان کسی حد تک مبتذل، عامیانہ اور فحش ہے

در مدح سلیمان شکوہ

دیکھتا کیا ہوں سرہانے ہے کوئی ایک پری + جس کے جوبن سے ٹپکتی ہے نری گدرا ہٹ
عطر میں ڈوبی ہوئی زور ہے بو باس اس کی + بل بے دیکھ بل بے اکڑ بل بے نری گرماہٹ
موتیوں سے جو بھری مانگ وہ دیکھے اس کی + سیر سے تاروں بھری رات کی جی جائے اچٹ

در مدح صاحب عالم

بگھیاں نور کی تیار کرا لے بوٹے سمن + کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن
عالم اطفال نباتات پہ ہوگا کچھ اور + گورے کالے سبھی پہنیں گے نئے کپڑے بہین
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پلو ڈر + بیٹھ کر جلوے کی کرسی پہ دکھاوے گی پھبن
اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر + غنچہ و گل سبھی واں کھولیں گے بوتل کے دہن
بینے ہل مل کے بجاویں گے فرنگی طنبور + لالہ لاوے گا سلاقی کو بنا کر بلٹن
آوے گا نذر کو شیشے کی گھڑی لے کے حباب + یا سمیں پتوں کی پنسن میں چلے گی بن ٹھن
نظر آئی مجھے کل با طرز و طوغ و علم + صورت فتح مجسم ہو بہ شکل آدم
سر پہ اک خود دیکھو جس پہ پڑی سی کلغی + ڈھال کاندھے پہ پڑی ہاتھ میں شمشیر دو دم
زرہ حرت داؤد گلے میں اس کے + جبروت اس کا و زیدون فر و جمشید حشم
ہیں سلامی کو کھڑے باندھ کے صف سب انگریز + مارٹین اور برن، رومل، ایمل، آرنٹ

گریز میں انشا کبھی مکالماتی انداز اختیار کرتے ہیں جیسا کہ سلیمان شکوہ کے قصیدے کی گریز سے ظاہر ہوتا ہے۔ نواب سعادت علی خاں کی مدح میں اپنے دوسرے قصیدے میں انشا نے فخریہ اشعار لکھنے کے بعد یوں گریز کیا ہے ؎

[در مدح سعادت علی خاں مکالماتی گریز] ؎

کیوں کر نہ یہ گھمنڈ ہو بیٹھا ہوں آج میں + کہیے وزیر اعظم ذی شان کے سامنے
با ادب میں نے یہ جو عرض کیا اسم شریف؟ + بار سے فرمائیے اے مخزن الطاف و ہمہ ہم
تو یہ ارشاد ہو "تجھ کو نہیں کیا معلوم" + نیر طالع منیر و رہیں اس شخص کے ہم

انشا کی طبیعت کا زیادہ زور جز و مدح میں نظر آتا ہے۔ ممدوحین کی شجاعت، عدالت اور سخاوت وغیرہ کے بیان میں اگرچہ انہوں نے روائتی تخیلات ہی کو قلمبند کیا ہے تاہم ان کے اظہار کی بدولت ان میں شوخی و رنگینی پیدا ہو گئی ہے۔ نواب سعادت علی کی مدح میں یہ اشعار دیکھئے

؎ حاضر ہوا ہوں یوسف کنعاں کے سامنے + یا آ گیا ہوں میں مہ تاباں کے سامنے
یاد آوے تیری چشم کی شوخی تو پھر وہیں + ساقی کرے مراقبہ فنجاں کے سامنے

دلہن جان کے حسن و جمال کی تعریف میں انشا کے یہ اشعار اصلیت کا رنگ لیئے ہوئے ہیں

در مدح دلہن جان سے عرض کہ ہے وہ پری زاد ایسی ہی دلچسپ + رہا یہ باغ میں نکہت سے روپ جس کا جھپٹ

کبھی جو انگلیوں کی فندق اس کے دیکھیے تو + ہیار بیر بہوٹی کی طرح جائے سمٹ

لبسان سیب جناں ہے جو اس کا سیب ذقن + زیادہ ہے ذقن حور سے بھی گدرایٹ

اس قصیدے سے حیا اشعار دلہن جان کی "شخصیت" کے نقیب ہیں ہم جان پاتے ہیں کہ اس کا تعلق سماج کے کس طبقے سے ہے

انشا مدحیہ مضامین کے حوالے سے لبسا اوقات اپنے علم کا پشارا بھی کھول لیتے ہیں

در مدح شاہ عالم سے ہے عدل تیرے عہد میں اتنا کہ بر فلک + بارہ بروج نظم و نسق سے ہیں منتظم

میزان، قوس و سنبلہ، سرطان و دلو و حوت + عقرب، اسد، حمل سے لے ثور و جدی بہم

جوزا سمیت رہ گئے ہیں تیرے خوف سے + ورنہ زیادتی کریں ایک ایک پر بہم

مذکورہ اشعار میں شاہ عالم کے عدل و انصاف کی تعریف کرنے کے لیئے انہوں نے علم نجوم کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔

انشا کی مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی تو اظہر من الشمس ہے تاہم جارج سوم کی مدح میں مذکورہ عناصر کا سہارا لینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اصلیت اور واقعیت کے حوالے سے بھی کچھ موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ جارج سوم کے زمانے میں علم اور سائنس کی نشو و نما کی تعریف کے ساتھ ساتھ انشا نے انگریزوں کی ایجادات اور تاریخی وقوعات کا احاطہ بھی کیا ہے۔ ان کی علمی ترقی اور تصنیف و تالیف کا ذکر کیا ہے۔۔ یہی نہیں انہوں نے انگریزوں کی "شجاعت" اور "دبدبے" کی مدح کرتے ہوئے انگریز قوم کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اسے ہجو ملیح بھی کہا جا سکتا ہے علاوہ ازیں یہ قصیدہ اودھ کے حکمرانوں اور انگریزوں کی مفاہمتوں، دوستیوں اور سیاسی متعلقوں کی کتھا بھی کہتا نظر آتا ہے

سے اس کی افواج نے جا کی مدد قیصر روم + مصر کے ملک سے سب مار نکالے دشمن

قوم نے اس کی جو دوڑائے سمندر میں جہاز + وہ کیا کام سکندر سے نہ جو آیا بن

ایک انگریز نے ایسی بنائی جس کو + کبھی دیکھے تو فلاطون رہے سر کن برکن

تھے ریاضی میں جو ماہر حکمائے یونان + سب بجاتے تھے وہ نقارۂ الملک لمن

پر ترے عہد میں موجود جو ہوتے تو انہیں + ایک لڑکا بھی گنتا کہ بڑے ہو کودن

ہوئی تصنیف کتابیں جو ترے عصر میں ہیں + ان کے آگے کتب جامعیہ تقویم کہن

قوم انگریز یہ ہیں ایسے کہ جن سے کانپے + آوے گر فوج غفاریت سمیت اہرمن

دبدبہ ان کو خدا نے وہ دیا جن کے حضور + چیز کیا ہے وہ طہمورث وہ کیاں کا روان

اس خوشی کا یہ سبب ہے کہ سب انگریز کے راز + اس فلک دبدبہ پر آئینہ ساں ہے روشن

دعا : کمپنی نور کی جب تک رہے پر قائم + بادشاہی رہے اس کی ہی بوجہ احسن
ناظم الملک بہادر سے اور انگریزوں سے + رابطے یوں ہی رہیں اور محبت سے چلن

انشا نے اس قصیدے میں ٹیپو سلطان کے خلاف بھی اشعار لکھے ہیں

ٹیپو سلطان کا قصہ وہ سنا ہو وے گا + کر کے کیا کام پھرا واں جو گیا تھا رجمن
لارڈ دھیما نے ایسے ہی کیے اک دو وار + دفعتاً کانپ گیا جس کے سبب سے دکن

انشا کے اس قصیدے کو قومی و ملی نقطۂ نظر سے احسن نہیں جانا جا تا یقین کیا کیا جائے بعد میں ہمارے عام شاعر تو ایک طرف مقتدر و عظیم شعرا نے بھی انگریزوں کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔

درباری مدح میں انشا نے اغراق سے بھی کام لیا ہے۔ دنیا کا ہر مشہور اور بہادر حکمران انہیں اپنے ممدوح کا غلام نظر آتا ہے۔ وہ اپنی زبان کی بجائے دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کی زبان سے اپنے ممدوح کی تعریف کرواتے ہیں۔ شاہ ایران، عرب حکمران، والئ ترکستان، شاہ کابل، انگریز شہنشاہ، حاکم کشمیر کے فرضی مقولوں سے ان کے قصائد بھرے پڑے ہیں۔ ممدوحین کے ساز و سامان کی تعریف میں بھی ان کا قلم جولانیاں دکھاتا ہے اس حصے کو وہ زیادہ طول دیتے ہیں۔ ہاتھی کی تعریف میں ان کا زورِ طبع عروج پر ہوتا ہے گجگ، دانت، آنکس اور خرطوم وغیرہ کی مدح کے ساتھ ساتھ انہوں نے مہاوتوں کے ان الفاظ تک کو منظوم کیا ہے جو وہ ہاتھی چلانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ملاحظہ ہوں ہاتھی کی آواز اور خرطوم پر اشعار

گو نجنے کو نرے ہاتھی کے اگر رعد سنے + رفعت و منزلت سے اپنی وہیں جاوے گھٹ
ایک ہی لقمۂ خرطوم میں وہ قاف شکوہ + کشتِ آمال کو کفار کی کر جائے چٹ

انشا نے اپنے ایک حمدیہ قصیدہ میں اپنی تر دامنی کا دردمندانہ انداز سے اقرار کیا ہے اور اس بات پر ندامت کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان کی زندگی شعر و شاعری، لہو و لعب اور منطق و فلسفہ کی دلدلوں میں گزری اور ان سے منہ ہی فرلیضے ادا نہیں ہو سکے سو رہا ہمیشہ سرد کار فسق سے مجھ کو + جو چیز ظاہر و باہر ہو اس کی کیا تصریح

—

انشاء اللہ انشا کے قصائد فی الاصل ان کی لسانی مہارتوں اور نو بہ نو موضوعات کے تنفّس کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے قوافی اور ردیف کی سنگلاخیوں پر مکمل قدرت حاصل کی۔ جارج سوم کے قصیدہ کو اردو شاعری کی سطح پر انگریزوں کے کارناموں کے بیان کے حوالے سے اولین دستاویز ٹھہرایا جا سکتا ہے انگریزی علوم و فنون اور سائنسی اختراعات کی طرف انشا کا اشارہ کرنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ہندوستانی فرد اور اقوام و ملل اس نئی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے جدید علمی، فنی اور فکری ہتھیاروں سے لیس ہوں۔ شاعری کے حوالے سے مولانا محمد حسین آزاد نے انگریزی کلید اور صندوق کا تذکرہ کیا تھا علمی اور تہذیبی حوالے سے جدید افکار و خیالات اور دریافتوں کے ہتھیاروں کا حوالہ انشا نے دیا ہے

—

غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی مصحفی م ۱۸۲۴ [۱۸۲۵] کے اردو قصائد کے دیوان کے تاحال چار نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ رضا لائبریری رامپور کا نسخہ[۱] جس میں ۶۹ قصائد ہیں (دو نامکمل بھی انہی میں شامل ہیں) نسخہ اورینٹ[۲] میں قصائد کی تعداد ۸۶ ہے۔ حکومت مغربی بنگال کے ذخائر میں بھی مصحفی کا ایک ۹۶۶ صفحوں کا دیوان موجود ہے جس کے قصائد کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانہ میں قصائد مصحفی پر مشتمل دیوان کی تین جلدیں موجود ہیں ان میں ۸۳ قصائد ہیں۔ بعض محققوں نے دو قطعات (جو بحوالہ انشا اور سلیمان شکوہ ہیں) اور ایک نامکمل قصیدے کو بھی ان میں شامل کر کے قصائد کی تعداد ۸۶ بتائی ہے[۳] تاہم اس دیوان کی تینوں جلدوں میں ۸۳ مکمل قصائد ہیں اور ایک نامکمل۔ جلد اول میں ۴۲ جلد دوم میں ۱۸ اور جلد سوم میں ۲۴ قصائد ہیں۔ یہ قصائد مذہبی بھی ہیں، غیر مذہبی بھی۔ مصحفی کے مذہبی ممدوحین خدا، رسولؐ، حضرت علیؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ، امام زین العابدینؓ، حضرت علی اکبر شامل ہیں غیر مذہبی ممدوحین میں صفدر علی خاں، مرزا محمد تقی ہوس، شاہ اسمٰعیل خاں، کلب علی خاں، نواب غازی الدین حیدر، معتمد الدولہ بہادر، روشن الدولہ، آذین علی خاں، نواب ہادی علی خاں، میر فضل علی، مولوی فخر الدین، جہاندار شاہ، صاحب عالم، آصف الدولہ، سیف علی خاں، میر محمد نعیم خاں، سرفراز الدولہ حسن رضا خاں، طاہر الدولہ، نواب رگاہ قلی خاں، نواب محبت خاں، سعادت علی خاں، زین العابدین مرزا مینڈھو، شبدی خاں، مرزا جعفر، سلیمان شکوہ، خیالی رام، مرزا علی حسن، لالہ شیکارام کی مدح میں قصائد دستیاب ہیں۔[۵] علاوہ ازیں چند قصائد پر یہ عنوانات بھی ملتے ہیں جواب قصیدہ انشاء اللہ خاں انشا، مدح اسپاں نواب جلال الدولہ بہادر، در جواب مرزا رفیع سودا قصیدہ شیخ برآں، قصیدہ شہر آشوب دہلی، در مدح اسپ کہ یار وفادار نام است، قصیدہ نسبت بہ چند شخص گفتہ شد، وغیرہ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو قصیدہ کے قدیم ادوار میں سب سے زیادہ ممدوحوں کا حامل اور سب سے زیادہ تشابیب لکھنے والا شاعر مصحفی ہی ہے۔ ان کے چند قصائد کی زمینیں ملاحظہ ہوں

نعتیہ قصیدہ — ؎ بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہل زباں ہیں + دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

در مدح مرزا محمد تقی ہوس — ؎ آوے گلگشت گلستاں کو جو وہ تازہ نہال + تا لب فرش کرے الٹو کے چمن استقبال

ایضاً — اس سال یہ سردی کی ہے تاثیر ہوا پر + جوں موج ہوا نخ کی ہے زنجیر ہوا پر

در مدح شاہ اسمٰعیل خاں — کھل گئے منہ پہ مرے شب جو در خواب کے پٹ + نظر آئی مجھے اک طرفہ بھبھوکا نٹ کھٹ

---

(۱) اس نسخے کے حوالے سے قاضی عبدالودود کا مضمون ملاحظہ ہو شاعر بمبئی فروری ۱۹۶۱ (۲) نقوش ص ۱۹۶۸ مضمون نثار احمد فاروقی (۳) دیوان قصائد مصحفی شمیم کاشمیری ص ۷۴ تا ۶۰ صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۰ (۵) مخطوطہ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

درمدح کلب علی خاں — لیتے خمیازہ جو اس گل کی گٹھ چولی چسں + جا پڑی صاف بدن پر نگہ اہل ہوس

ایضاً — برج حمل سے نیّر اعظم کا ہے گزار + کیوں کر نہ ہو بو صبح دگر رنگ روزگار

نواب غازی الدین حیدر — اگر نزاکت موئے میاں کروں تحریر + شکستہ چینی فغفور ہو شکست پذیر

نواب روشن الدولہ — قلمداں زیر کرسی کیوں نہ رکھے فکر خاقانی + کہ زانو سے پھر پیدا ہوا ہے ربط پیشانی

معتمد الدولہ بہادر — آیا ہے جب سے دیکھ رخ دلبر آفتاب + کھاتا ہے اس کے بام پہ نت چکر آسمان

آصف الدولہ — منہ سے برقع کو مری جاں تو اگر دیوے کھول + تجھ سے خوبان عرب ناز و ادا لیویں مول

میر محمد نعیم خاں — ہے بنا چہرہ ترا جیسے کہ تصویر فرنگ + دیکھ کر کیوں نہ تجھے عالم تصویر ہو دنگ

مقبرہ شہر آشوب — یہ گوئے یہ میداں یہ زباں اور بیاں ہے + دعویٰ ہے جسے شعر کا آوے تا کیاں ہے

سلیمان شکوہ — گر باز معانی کا قرہ ہووے ہوا گیر + پیدا کریں اجزائے ہوا حکم عصافیر

ایضاً — ہوئے آپس میں جو روز و شب بیاض لکھوں ایک + تیری ہی رکھتے ہیں اب جاہ طلب لاکھوں ایک

ایضاً — تلتا ہی اس کے پلے میں ہو تا جو انور ل + مرزا و میر سے مجھے کیا ہے برابری

منقبت علی — تیرہ روزی سے مری کیوں نہ ہو شاد آتش + شب کو آتی ہے نظر جیسے پری زاد آتش

منقبت امام زین العابدینؑ — تھی بس کہ بحر خواب عدم بے قرار چشم + کھلتے ہی مژگئی مری مثل شرار چشم

مصحفی کے مذکورہ بالا مطالع ہر اعتبار سے جاندار ہیں۔ مصحفی نے ان میں فصاحت و بلاغت کی موجیں رواں کی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی برجستگی اور اپنی جانب توجہ مبذول کرنے کی کشش ان کی خاص خوبیاں ہیں۔ مصحفی نے اپنی زمینیں بھی نکالی ہیں اور روایتی زمینوں میں بھی تازہ اور نئے خیالات کو سمویا ہے۔ انہیں غزل کے میدان میں جسی تجربوں کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ قصائد کے تشبیبی حصوں میں انہوں نے اپنی شاعری کی اس جہت کا بہتر استعمال کیا ہے۔

مصحفی کے قصائد اعتدال آشنا تھے۔ ان کا ذہن سلجھا ہوا تھا، مزاج میں کجی نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں انشا کے قصائد میں بے اعتدالیاں نظر آتی ہیں۔ مصحفی نے تمسخر، ٹھٹھا اور تمسخوں سے سروکار نہیں رکھا تھا۔ انشا اور مصحفی کے مزاجی اختلاف نے ان کے شعری اسالیب کو بھی مختلف کیا ہے۔ مصحفی نے استادی کا زور دکھانے کے لیے سنگلاخ زمینیں منتخب کیں اور بعض جگہوں پر اپنی عزت نفس کے دفاع کے حوالے سے ہجو و طنز کا سہارا لیا۔ ان کے قصیدے ابتذال، فحاشی اور پھکڑپن سے پاک ہیں۔ جہاں جہاں انہوں نے زمانے کی بے انصافیوں کا تذکرہ کیا ہے ان کے لہجے کی تلخی عیاں ہے۔ طنز کے نشتر بھی چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ مصحفی نے قصائد میں اگرچہ دقت پسندی سے بھی کام لیا ہے تاہم ان میں ناہمواری اور بوجھل پن کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ مصحفی کے مقابلے میں انشا کے قصائد غیر متین بھی محسوس ہوتے ہیں اور ناہموار بھی۔ انشا نے اپنی دقت پسندی

کو انوکھے پن سے مربوط کرنے کے لئے اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ یہ دور بھی وہ تھا جب استادانہ قسم کی فنی مہارت اہم سمجھی جاتی تھی۔ شاعروں کو ان کے دقت پسندانہ اظہار پر داد بھی ملتی تھی۔ کسی شخص کی شاعری کو قدرتِ کلام، علم و فضل اور طباعی کے عناصر کی بدولت اہمیت ملتی۔ مصحفی کی شاعری میں ایک سطح پر تو ان کے داخلی شاعرانہ جذبوں کی ترسیل ہوئی ہے اور دوسری سطح پر خارجی دباؤ اور شاعرانہ ماحول کے تقاضوں کے باعث ان کے تخیل کے گھوڑے نے الٹی اور سیدھی زقندیں بھی لگائی ہیں۔ داخلی شاعرانہ جذبوں کی ترسیل نے ان کی شاعری کو معانی آفرینی اور مفہوم سازی کا نمونہ بنایا اور خارجی دباؤ نے انہیں صنائع بدائع کے کثرت استعمال، بے جا لفاظی اور سنگلاخ زمینوں میں اظہارِ خیال پر مائل کیا۔ انشا اور مصحفی کی چشمکوں اور مجادلوں میں شاعرانہ[1] قدرتِ اظہار غالب معیار تھی۔ اس کے نتیجے میں قصائد کی زبان پیچیدہ اور ثقالت آشنا ہوئی۔
ان محرکوں نے مصحفی کی طبیعت کو منغض کیا، ان کی داخلی ناراضگی اور مزاجی تشویش کھل کر سامنے آئی وہ لکھتے ہیں

؎ وہی ہوں میں کہ جیسے مصحفیؔ زماں انشا + سمجھ کے دل میں یہ لڑتا تھا کچھ خیال غرور
وہی ہوں میں جسے رنگیں نے اپنا سب دیواں + دکھا کے تابہ تماحی کیا ہے رنج خطور
وہی ہوں میں کہ حسن جس کے شاد شاد ملا + کسی نے غیر ستائش کیا نہ کچھ مذکور
پر اب سخن میں مگر شاید آ گئی سردی + کہ ان کی شورش تحسین ہو گئی کافور
عجب معاش ہے ان دوستان یکدل کی + اس اتحاد میں یہ کچھ بھرے ہیں دل میں فتور

مذکورہ بالا اشعار سلیمان شکوہ کی مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے کے ہیں۔
اس دور کے بعض شعرا اپنے درباری تعلقات کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے اور امرا و سلاطین کے زیادہ منظورِ نظر ہونے اپنے ہم عصر شعرا کے خلاف ان میں منافرت کے جذبے پیدا کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ مصحفی کے خلاف انشا کی اتہام بازی نے مصحفی کو متاسف و شکستہ خاطر کیا۔ اس قصیدے میں انشا کی بہتان تراشی کی تردید کرتے ہوئے مصحفی نے یہ بھی کہا ہے کہ انشا چونکہ بزم و رزم میں درباری مشیر ہے اس لئے وہ افترا پردازی کر سکتا ہے لیکن اب غضب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں خیال میں بھی ہجو کی تصویر نہ کھینچوں

؎ جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ + زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر

انشا کے رویے اور دربار میں اس کے رسوخ کی وجہ سے مصحفی کی انا بہت مجروح ہوئی۔ میر و سودا کے حوالے سے ان کے ہجویہ اشعار سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک چوٹ کھائے ہوئے انسان تھے۔
مصحفی نے اپنے قصائد میں عربی اور فارسی قصائد کے معیارات کو سامنے رکھا۔ حسب موقع معذرتی، واقعاتی، ہجویہ اور شہر آشوب کے موضوعات پر مشتمل قصائد لکھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی ادبی فضا پر لکھے ہوئے قصائد میں اپنے معاصرین کے باہمی مناقشات کی تفصیلی تصویریں ہیں۔ مصحفی کے اعتذار پر مشتمل قصائد میں

---

① نقوشِ ادب سوکیمہ جلد دوم ص ۸۷ مضمون جسیم کاشمیری مصحفی اور سودا کا موکہ

فخر و تعلّی کے موضوعات کے ساتھ ساتھ طنز و تعریض کے نشتروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے حریفوں کو شاعری کے وسیلے سے شکست دینے کی کوشش کی۔

مصحفی کے قصائد کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے معاصر قصیدہ نگاروں سے کمتر درجہ نہیں رکھتے۔ وہ خود بھی اس امر سے آگاہ تھے اس لئے ایک جگہ فخریہ انداز سے اپنے آپ کو خاقانی سے ملایا ہے اور ایک اور جگہ انوری کا ہم پلہ کہا ہے۔ میر و مرزا اور اپنے دیگر معاصرین پر اپنی برتری کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کے دیوان کے ۸۳ مکمل قصائد قصیدے کی جانب ان کی مزاجی رغبت کے نقیب ہیں۔ قدیم تذکرہ نگاروں نے ان کی قصیدہ نگاری کو خاص اہمیت دی ہے میر حسن نے لکھا ہے "قصیدہ و غزل و مثنوی ہمہ خوب"① خوب چند ذکاء کا کہنا ہے "قصیدہ چند بہ کمالِ خوبی و متانت کلام در مدح شاہزادہ عالی مقدار مرزا سلیمان شکوہ بہادر از در سرانجام یافتہ"② عشقی نے اپنے تذکرے میں یہ رائے دی ہے "در اکثر اقسامِ نظم خاصہ در غزل سرائی شہرتے معقولے دارد و قصائد و مثنوی نیز بقدر مشق بہ آب و تاب انجام می دہد"③ سرور نے عمدۃ المنتخبہ میں لکھا ہے "اکثر قصائد در مدح فرزندزادہ (سلیمان شکوہ) بہ کمالِ فہم و جودتِ طبع تصنیف کرد"④ مولانا محمد حسین آزاد نے خیال ظاہر کیا ہے "ان کے قصیدے خوب ہیں اور ان میں اکثر نہایت مشکل زمینوں میں ہیں — ان میں بڑے بڑے الفاظ، بلند مضمون، فارسی کی عمدہ ترکیبیں، ان کی درستی، نشستیں جو اس کے لوازم ہیں سب موجود ہیں۔ البتہ بندشوں کی چستی اور جوش و خروش کی تاثیر کم ہے شاید کثرتِ کلام نے اسے دھیما کر دیا ہے"⑤ ابو اللیث صدیقی نے لکھا ہے "قصیدے کے میدان میں ان کا نام (مصحفی) سودا، ذوق، امیر، محسن اور ان کے ہم پلہ شعرا کے ساتھ لیا جانا چاہیے"⑥۔ مذکورہ بالا تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے مصحفی کے قصائد کی عمدگی، خوبی، متانت، آب و تاب، کمالِ فہم، جودتِ طبع، الفاظ کی شوکت، مضامین کی بلندی اور عمدہ تراکیب کے استعمال کے حوالے سے ان کی عظمت تسلیم کی ہے

مصحفی نے قصائد کی تشابیب میں رندی و مستی، حسن و عشق، بہار، پند و موعظت، شکوہ دوراں، سراپا نگاری اور ذاتی تفاخر کے موضوعات کو قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے ان میں ذاتی احوال اور معاصر ادبی و سماجی ماحول کی نقشہ کشی بھی کی ہے

نہ نکلی آرزوئے دل کبھی ہزار افسوس + اس طرح سے رہی جی کی جی میں اپنے امنگ
ذلیل و خوار ہوں آنکھوں میں خلق کی اتنا + کہ میرے نام سے آتی ہے میرے نام کو ننگ

ستارہ کو نظر آتے ہیں مکدر تمام + ز بس کہ قساوتِ قلبی کا ہے بلند غبار
نہ دوستی ہے نہ شفقت نہ رحم نہ انصاف + غرض کہ بغض و جہالت کا گرم ہے بازار
ہنسے نہ کیوں کہ بھلا مجھ پہ چرخ لعبت باز + بنا کے خصم کرے مجھ کو جو مرا اکرے تیار

مصحفی تمام عمر معاش پریشانیوں کا شکار رہے۔ اکثر امراء نے ان کے قصائد کا مناسب معاوضہ ادا نہ کیا۔ اور جب کسی امیر

---

① تذکرہ شعرائے ہندی ص ۲۷۵ ② عیار الشعرا مائیکرو فلم ورق ۹۰ الف مخزونہ کتب خانہ جامعہ پنجاب
③ دو تذکرے جلد دوم ص ۲۲۳ ④ عمدۃ المنتخبہ ص ۵۸۹ ⑤ آبِ حیات ص ۳۱۲ - ۳۱۳
⑥ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۵۰۰

کی ملازمت اختیار کی تو مشاہرہ نہ ملنے پر اسے بھی ترک کرنا پڑا۔ ذاتی اور جذباتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے معاصر شاعرانہ ماحول سے بھی نالاں تھے۔ اپنی متعدد تشابیب میں انہوں نے اپنی محرومیوں، تلخیوں، بے بسیوں اور مایوسیوں کو نظم کیا ہے۔ اپنے احوال کے ردعمل کے طور پر انہوں نے تعلی کا انداز بھی اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

سہ شانے پہ میرے مہر نبوت نہیں نہیں + کرتا ہے صاف دعویٔ وحی و پیمبری
انصاف کر کے میرے کلامِ نفیس کو + حاصل جہاں میں جس سے ہے مجھ کو یہ اشتہری
کہیے جو معجزہ تو ہے عیسیٰ کا معجزہ + کیجیے قیاس سحر تو ہے سحرِ سامری
ہزار حیف کہ دنیا سے چل بسے سب یار + نہ سوز و قائم و سودا رہا نہ درد نہ میر
خدا رکھے تجھے اے مصحفی کہ اب تو ہے + عوض سبھوں کے نواسنجِ گلشنِ تقریر
ترا کلام کہاں اور کہاں وہ ریختہ گو + وہ شکل خوشۂ پروین تو شکلِ بدرِ منیر

پھر وہ کہتے ہیں کہ میں علم منطق میں طاق ہوں اور تصور و تصدیق کا تجزیہ گر ہوں، رباعی اور دوسرے فنون میں بھی مجھے بقدر کمال درک ہے سہ

غزل کی طرز میں سعدی پہ حرف ہے مجھ کو + قصیدہ گوئی میں ہوں رشکِ نقشِ کلکِ ظہیر
جو سادہ گوئی پہ آؤں تو ہوں فصیحِ وقت + جو معنی بندی پہ جاؤں تو ہوں جلالِ اسیر

اس قصیدے میں مصحفی نے اپنے آپ کو "صدرِ بزمِ سخن" بھی کہا ہے۔

مصحفی کے ہاں بہاریہ تشابیب بھی ملتی ہیں۔ بہار کے مناظر کو ان کے بیان میں مصحفی نے اپنے حسیاتی اور جمالیاتی طرزِ اظہار [illegible] سہ

چمن ہے صاف تر از دامنِ دریائے اٹک + لالہ ہے سرخ تر از کاغذِ ہندی تقویم
آبِ جو بار ہے یوں گردِ خیاباں کے محیط + ورقِ لعل پہ جیسے ہو کھنچی جدولِ سیم
شعلہ افروز ہے ہر سو جو گلوں سے گلشن + سطحِ باغ ہے آتش کدۂ ابراہیم
شاید رنگِ جدیدی[1] کا ہوا ہے جلوہ + تازگی لائے ہیں شاخوں پہ درختانِ قدیم

سہ اہلِ طرب نے سازِ طرب کوک کر لیے + گلبانگ مطرباں کی گئی آسماں کے پار
پھر تالیاں بجانے لگے برگِ ہر درخت + بادِ صبا کو دیکھ کے رقصاں و بے قرار
پہنے ہوئے ہیں بر میں لباسِ بہشتیاں + اوراقِ سبز سے تنِ طربانِ شاخسار
جوں آسمانِ سبز پہ ماہِ دو ہفتہ ہو + ایسی صفا سے چمکے ہے سبزہ میں آبشار

بہار کی رنگینیاں اور جوش و خروش مصحفی کی بہاریہ تشابیب میں دیدنی ہیں۔ مصحفی نے ایک ایک منظر کو الٹ پلٹ کر کئی پہلوؤں سے دیکھا ہے انہوں نے جزئیات و صور میں تصرف کر کے اپنی متخیلہ کا لوہا منوایا ہے۔ مصحفی کی تشبیب میں وصفیہ، فکری، تخیلاتی، جذباتی اور خیال انگیز اشعار کی کمی نہیں ہے۔ تشبیہ اور غیر تشبیہ کے وسیلے سے وہ اشیا کے مابین اشتراک کی روابط تلاش کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔

---

(1) "رنگِ جدیدی" کی ترکیب کا استعمال مصحفی نے کس زمانے میں کیا ملاحظہ ہو۔ اس زمانے میں بیمبری اور جدید شاعری والے پیدا بھی نہیں ہوئے تھے

مصحفی کی جمالیاتی حسوں نے ان کی تشابیب میں سراپا نگاری کو پرکشش اور موثر بنایا ہے۔ وہ کسی خیالی محبوبہ کے خواب میں آنے پر غفلت سے بیدار ہو کر یا اچانک آنکھ کھلنے پر کسی محبوبہ کو سامنے پاکر سراپا نویسی کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ جس حسینہ کا سراپا بیان کرتے ہیں وہی انہیں ممدوح کی تعریف پر آمادہ کرتی ہے مصحفی اس پری پیکر کے اعضاء کی تعریف مست و مسرور ہو کر کرتے ہیں۔ ان کا مبالغہ حسن پیدا کرتا ہے اور حسن کے ممکنہ اوصاف کا بیان ان کی قادر الکلامی ظاہر کرتا ہے۔

در مدح نواب سعادت علی خاں ؎ سر پہ شبنم کا وہ شفاف دوپٹہ سارا + چاندنی دیکھ جسے دور سے رہ گئی ہو چپ

سرخی چشم سے کافر کا یہ عالم پیدا + جیسے شیشہ میں ہو رنگ مئے گلگوں کی جھلک

جس طرح ماہ کو آغوش میں لیوے ہالہ + گرد یوں سیب زنخداں کے تھی وہ تحتو کی لٹک

جس کا مذکور کیا میں یہ بت شہر آشوب + تھی کھڑی طرف چمن مکھڑے سے الٹے گھونگھٹ

مصحفی کی تشابیب میں دقت پسندی بھی نظر آتی ہے

مقیدہ نعت ؎ حنا سے ہے یہ تری سرخ اے نگار انگشت + کہ ہو نہ پنجۂ مرجاں کی زینہار انگشت

در مدح سلیمان شکوہ علم کیے ہوئے ہے ترک آسماں شمشیر + ہے اس کے ہاتھ میں یہ ہلال کہکشاں شمشیر

در مدح جنیال رام یہ کس کی چشم سے سیکھ آئی ہے حیا نرگس + کہ چشم دوختہ ہے سوئے پشت پا نرگس

مصحفی نے بعض قصائد میں افسانوی اور حکایاتی تشابیب کا اہتمام بھی کیا ہے۔ سودا کے مشہور قصیدہ کافیہ کے جواب میں مصحفی نے بھی افسانوی طرز کی تشبیب رقم کی ہے اس کی مثال دی جا چکی ہے۔ مصحفی نے تشابیب (طربیہ۔ بہاریہ۔ احوالیہ) میں علو تخیل اور مضمون آفرینی کے کمالات دکھائے ہیں۔ کہیں کہیں انہوں نے غزل کا عام رنگ بھی تشابیب میں داخل کیا ہے

؎ یاں سے قدم تو جلد اٹھائے گا گر تو پھر + آگے ملے گی جا کے رہ دیر اور حرم

شورش اعظم یہ تری جعد نے پھینکی ہے کمند + جا پڑے یو جیسے تری زلف نے ڈالا ہے ڈول

آصف الدولہ کی مدح میں مصحفی نے مشہور ردیفیہ قصیدہ لکھا جب سے سرطاں میں ہوا نیر اعظم کا عمل خوب صورت تشبیہوں اور شاعرانہ الہامات کے عناصر سے مملو ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

سبزہ عالم بالا جو ہوا ہے درپیش + تکتہ ابر نے دریا سے لیا ہے جیا گل

تال اور سم سے جو الفت ہے گھٹا طاؤس کی + ناچتے پھر ہیں طاؤس بر کوہ و کتل

آب کی ایسی ہے ریزش کہ نظر آتا ہے + در و دیوار پہ اک صورت آئینہ عمل

جیسے نے تار یہ باندھا ہیں گر دیکھیے خوب + یک قلم کھینچی ہے صفحے پہ ہوا کے جدول

مصحفی گریز کے نازک منزل مقام سے بطریق احسن گزرتے ہیں۔ ان کی تشابیب گریز کے وسیلے سے اجزائے مدح سے ہم آہنگ و مربوط ہو کر قصیدے کے ناصیاتی کل کی تکمیل کا وسیلہ بنتی ہیں۔ مصحفی تشبیب اور مدح کو

یوں گریز کرتے ہیں کہ گریز کی بے تعلقی اور جابکدستی کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا مثلاً ایک مقام پر زمانے کا شکوہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ روزگار کے مسائل جھیلتے جھیلتے سینہ ضبط کے مارے زخمی ہو گیا ہے اور ان کا دل ان کے پہلو میں ایسے ہے جیسے کوئی مچھلی قلاب میں پھنس جائے اور آسمان کی چکی نے اہل کمال کی ہڈیوں کو اس طرح پیسا ہے کہ وہ غبار بن گئی ہیں اور

پائے فرار تنگ ہے میرا کیا کروں + از بسکہ اس کے تیر جفا کا ہوں میں شکار
تدبیر سو مجھے نہیں الا کہ جاؤں اب + ہو داد خواہ بر در نواب جم وقار
مرزا تقی بحرف محمد تقی کہ ہے + اونیٰ مصاحب اس کا فلاطون روزگار

ایک اور قصیدے میں مصحفی اظہار تعلّی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں اور بھی شاعر ہیں لیکن مجھ پر سخن فہمی، سخن گوئی، سخن سنجی اور سخن رانی ختم ہے۔ وہ یہ دعویٰ بغیر دلیل کے نہیں کر رہے کیونکہ اس کی حجت قاطع ان کے خامہ کی جولانی ہے۔ اس کے بعد یوں گریز کرتے ہیں

سوا اس کے دلیل اک دوسری یہ ہے کہ کرتا ہوں + میں ایسے صاحب جاہ و تجمل کی ثنا خوانی
اگر حاتم مکرر خلق ہوتا عہد میں اس کے + سمجھتا اپنا فخر خاندان اس در کی دربانی
وہ نواب ثریا جاہ یعنی روشن الدولہ + کہ روشن مہر رخ سے جس کے ہیں ذرات امکانی

بعض گریزوں میں مصحفی نے نزاکت خیال کے حوالے سے فنی مہارت دکھائی ہے

قصیدہ نعت

مجھ کو تو عروض آتی ہے نے قافیہ چنداں + اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں
سو کیوں نہ ہوں ہوں بھی تو میں ایسے کا ثنا خواں + جس کے لیے مخلوق یہ سب کون و مکاں ہیں
ماہ عرب، اُمّی لقب اعنی کہ محمدؐ + نت جس کی طرف دیدۂ اختر نگراں ہیں

مصحفی قصائد کے اجزائے مدحیہ میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ آرائی کو روا نہیں رکھتے۔ البتہ وہ بھی دیگر قصیدہ نگاروں کی مانند ممدوحین کی شخصیات کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کسی رئیس کی مدح لکھتے ہوئے وہ اس کی ممکنہ صفات بھی قلمبند کر دیتے تھے۔ بسا اوقات وہ حکمرانوں اور بزرگوں کی مدح کے دوران ان کے ذاتی اوصاف کے ساتھ اس کے طبقے کے مثالی اوصاف کی تصویر کشی سے عہدہ برآ ہوتے تھے، بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کی شجاعت، بہادری، انصاف پروری، سخاوت، جاہ و حشمت، خاندانی اوصاف، شان و شوکت، اسپ، فیل اور شمشیر وغیرہ کے بیان میں مصحفی کو قدرت حاصل تھی

ہے شرف گاہ تری برج حمل اے ممدوح + جس طرح نیر اعظم کا شرف گاہ حمل
اب تو کرتا ہوں میں تعریف ترے گھوڑے کی + وہ جو گھوڑا کہ بجلی کی طرح ہے چنچل

تیغ

ریگ کی طرح سے فولاد کے اجزا ہوں رقیق + ڈالے گر بیضۂ فولاد کو پاؤں میں مسل
برسے گر ابر کرم اس کا بہ دریائے سراب + ریگ ماہی کا دہن اگلے دو صد در یتیم

در نعت

بیاں ضرور ہے اب وصف تیغ کا اس کی + فلک کو جس سے سپر وہ ہے جس کی یار انگشت

مصحفی حسن طلب اور دعا کے حصوں میں بھی تاثیر پیدا کر دیتے تھے۔ آصف الدولہ کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب تک شب و روز کا ہنگامہ گرم ہے مہ و خورشید کی مشعل روشن ہے جب تک خاک سے نبات پدید ہوتی ہے جب تک زہرہ خنیاگری پر آمادہ ہے اور چرخ کے ہاتھ میں مہ کا مندل ہے اور ستاروں کی آنکھ سے نظارہ زیب ہے

ع یا الٰہی ہے محکم یہ ترا پنجہ و تیغ + یا الٰہی رہے قائم یہ ترا دین و دول
جو نکو خواہ ہیں پہنچیں بہ مقام اعلیٰ + اور جو بد خواہ ہیں تا ان کی جگہ ہو اسفل
شاعری مصحفی کی ان روزوں + گر گئی بلکہ از نگاہ حضور
اس لئے ہے امیدوار علام + کہ اگر اس کی عذر ہو منظور
تو تبرک شتاب ہو اس کو + کیونکہ مقصد یہ سمجھ گیا ہے حرور
جو ہو ملبوس خاص کیجے عطا + نہیں مانگوں ہوں اطلس اور سمور
گوشوارہ قبا ہو یا پٹو + صلہ خالی نہ جائے تا مقدور

مصحفی دھیمے مزاج کے شکستہ خوردہ انسان تھے اس لئے ان کے قصائد میں سودا جیسا طمطراق، طنطنہ، شوکت اور بلند آہنگی پیدا نہیں ہو سکی شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی، بندشوں کی چستی اور مضامین کی بلندی میں بھی سودا ان سے بہت بلند ہیں۔ تاہم مصحفی اپنے دیگر معاصرین اور بعد کے قصیدہ نگاروں کے مقابلے میں (ذوق و غالب کو چھوڑ کر) بلند و بالا اور زبردست ہیں۔

مصحفی نے اپنے شہر آشوب میں کہ جو سودا کی زمین میں ہے سودا کو شاعر مغلق قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسے مضمون و معانی بہرہ نہیں ہے۔[1] مصحفی نے اس شہر آشوب میں عہد شاہ عالم کے حالات لکھے ہیں اور کہا ہے کہ لوگ اسے شاہ عالم کہتے ہیں لیکن اس کی شاہی سب پر عیاں ہے۔ نائب کی بیداد سے احوال یہ ہے کہ ہر روز نیا قافلہ یورپ کو رواں ہو رہا ہے۔ بازار نشین صاحب حرفہ کا سراغ نہیں ملتا۔ شہر میں نہ کوئی نواب رہا ہے اور نہ ہی خان۔ نواب گوجر ہیں اور مواتی خان بنے ہیں سلاطین پر فاقوں کی مار پڑ رہی ہے۔ ان کے لئے ہر مہینہ ماہ رمضان ہے۔ ان کو عید کا چاند لب نان ہو گیا ہے

ع اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک + ہے صاف تو یہ گلشن دہلی ہی خزاں ہے

اس شہر آشوب میں مصحفی نے سودا پر طنز تو کیا تاہم سودا نے اپنے شہر آشوب میں دلی کے سیاسی و سماجی ماحول کے جو نقشے کھینچے ہیں اور جس انداز سے طنزیہ نشتروں سے معمور مصرعے تخلیق کیے ہیں مصحفی اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے قاضی عبدالودود کا یہ بیان ملاحظہ ہو "حادثۂ غلام قادر ۱۲۰۳ھ کے بعد شاہ عالم برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے کل اختیار مرہٹوں کے ہاتھ میں تھا ان کے مظالم سے دہلی والے تنگ آ گئے تھے اور مرہٹوں اور نائب شاہ نظام الدین سے سخت بیزار تھے مصحفی نے اپنے قصیدے میں اس زمانے کی دلی کی تصویر کھینچی ہے یہ قصیدہ ۱۲۰۳ھ اور ۱۲۱۰ھ کے درمیان وجود میں آیا۔ مصحفی نے سنی سنائی باتیں لکھی ہیں اس لئے کہ وہ حادثۂ غلام قادر سے کئی سال قبل ہی دلی چھوڑ کر چلے گئے تھے" اس قصیدے کا اصل محرک یہ خیال ہے کہ سودا کے قصیدے کا جواب لکھا جائے۔ سودا کی شدت احساس، شوخ طبعی اور تعمیری صلاحیت بھی مصحفی کو نہیں ملی۔[2]

---

[1] یہ گوئے بے معنی، بے زباں ہے یہ بیاں ہے + دعوی ہو جسے شعر کا آئے نہ کہاں ہے
[2] معاصر پٹنہ نومبر ۱۹۴۲ء

غلام علی راسخ

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی [م ۱۸۲۴ء] ابتدا میں راسخ محمد علی فدوی سے اصلاح لیا کرتے تھے[1] بعد میں میر کے شاگرد ہو گئے[2]۔ امر اللہ الہ آبادی کا کہنا تھا وہ حلاوت آمیز معانی تلاش کرتے ہیں ۔ شاعری کے خیال میں ہمہ وقت غرق رہتے ہیں ۔ طبیعت بہت رسا پائی ہے"[3] راسخ کا کلیات عظیم آباد میں چھپا۔ اس میں تمام اصناف سخن ہیں[4] علی جواد زیدی نے کریم الدین کے طبقات شعرائے ہند کے صفحہ ۳۳۸ کے حوالے سے لکھا ہے " کریم الدین نے ان کے دیوان قصائد کا بھی ذکر کیا ہے لیکن وہ اب کہیں نہیں ملتا "[5] یہ بیان بھی غلط ہے کیونکہ کریم الدین کے تذکرے میں اس صفحہ (۳۳۸) پر ولا[6] کے دیوان قصائد کا تذکرہ ہے راسخ کے نہیں ۔ راسخ کے بارے میں کریم الدین نے صرف یہ لکھا ہے " راسخ تخلص، غلام علی نام عظیم آباد میں درویشانہ عمر بسر کرتا تھا سنہ ایک ہزار دو سو چالیس ہجری میں فوت ہوا[7]۔ علی جواد زیدی نے لکھا ہے راسخ نے "بعض قصائد آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی مدح میں بھی لکھے ہیں[8] یہ بیان بھی غلط ہے راسخ کے مطبوعہ کلیات میں جو سات[9] قصائد دستیاب ہیں[10] ان میں نعت اور منقبت کے قصائد کے علاوہ باقی پانچ قصائد میں سے کوئی آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر سے تعلق نہیں رکھتا۔ ان کے دیوان میں موجود قصائد کی تفصیل درج ذیل ہے

[(۱) قصیدہ نعت کہ اعتدال افسوس گردوں کی طبیعت میں نہیں (۲) در منقبت علی کہ جہاں میں ہے مساکین کو اغنیا سے راہ (۳) قصیدہ کہ قابل حمد وہ مبدع فیاض و کریم (۴) قصیدہ کہ اے شمس منیر و فلک عزت و توقیر (۵) قصیدہ ہوا بھرا ہے بسکہ مینائے دل اپنا غم کے صہبا سے (۶) قصیدہ در مدح نواب شمس الدولہ بہادر کہ اتفاقاً میں رہا رات جو اک دو ست گو (۷) قصیدہ در مدح نواب خان جہاں خان بہادر کہ کل اک شخص ہوا مجھ حزیں سے راہ میں دوچار]

راسخ کے نعتیہ اور منقبتی قصائد میں ان کا صوفیانہ لہجہ اور غور و فکر سے معمور انداز توانائی پیدا کرتا ہے۔ ان کے قصائد فارسیت سے معمور ہیں ۔ انہیں انسانوں اور احوالیہ تشابیب لکھنے میں مہارت تھی ۔ ان کی تشابیب میں حزنیہ رنگ ان کے استاد میر کی دین ہے ۔ راسخ کی علم عروض پر دسترس تھی اپنی وفات سے پانچ سال قبل انہوں علم عروض پر (۱۲۳۵ھ) ایک رسالہ بھی رقم کیا۔ یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے ۔ اس کے مواد کی تفصیل ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو حصہ دوم جلد دوم ص ۹۴۷ پر دی ہے[11]۔ ڈاکٹر صاحب نے راسخ کو عظیم آباد میں دہلوی روایت کا ایک ممتاز شاعر بھی کہا ہے ۔ راسخ نے عشقیہ، معاشرتی، اخلاقی، مدحیہ اور ہجویہ مثنویاں بھی لکھی ہیں ۔ ان سے ان کے مشاہدے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے قصائد میں بھی مشاہدے کی خوبی موجود ہے انہوں نے احساس و جذبہ کو معنوی حوالوں سے منقذ کر کے استعمال کیا ہے

---

(۱) شاگرد ہیں گو حضرت فدوی کے بے شمار + راسخ ہوں ایک میں بھی وہ لاکھوں شمار میں (۲) راسخ کو ہے میر سے تلمذ + یہ فیض ہے ان کی تربیت کا
(۳) تذکرہ مسرت افزا ص ۱۰۸ (۴) کلیات راسخ مطبوعہ خیر المطابع عظیم آباد (۵) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۸۱
(۶) مرزا لطف علی ولا اور مرزا مظہر علی خاں ولا کے نام سے مشہور رہے (۷) طبقات شعرائے ہند ص ۲۶۳
(۸) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۸۱ (۹) حسرت موہانی کے لفظوں کلیات میں دس قصیدے ہیں" اردوئے معلیٰ ص ۲ نومبر ۱۹۰۷ یہ بیان غلط ہے
(۱۰) دیکھیے کلیات راسخ (۱۱) تاریخ ادب اردو جلد دوم ص ۹۴۷

ولی محمد نظیر

نظیر اکبر آبادی [م ۱۸۳۰] کا نام پابند اردو نظم کا عظیم نام ہے۔ ان کے کلام کی لفظی و معنوی وسعتوں کی تحسین ہر گروہ اور ہر طبقے کے نقادوں نے کی ہے۔ نظیر کی نظموں کو جدید اردو نظم کا حرفِ آغاز بھی تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے کلیات (۱) میں تین مذہبی قصائد دستیاب ہیں ان کے مطالع دیکھیے ؎

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے بے آب و تاب + اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب

کیا کاسہ لے لیجیے اس بزم میں اے ہم نشیں + دورِ فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں

کیا کہیں دنیا میں ہم انسان یا حیوان تھے + خاک تھے کیا تھے غرض اک آن کے مہمان تھے

یہ قصائد عارفانہ اور صوفیانہ رنگ میں رنگے ہیں۔ دنیا کو سراب کہنا، دوسرے پل کی خبر نہ ہونا اور دنیا میں انسانوں کا مہمان ہونا۔ نظیر اکبر آبادی کے یہ مرغوب موضوعات ہیں انہوں نے اپنی دیگر نظموں میں (کہ جو قصیدے کی ہیئت میں نہیں ہیں) ان موضوعات پر بطورِ خاص توجہ دی ہے۔ نظیر اکبر آبادی عوامی لب و لہجہ کے شاعر تھے تاہم اپنے قصائد میں انہوں نے لسانی سنجیدگی اور معنوی متانت کو برقرار رکھا ہے۔ عوامی لب و لہجہ کی بدولت ان کی نظموں میں مقامی ثقافتی عناصر بکثرت مل جاتے ہیں۔ ان کے قصائد ہماری تہذیب میں غالب طور پر موجود صوفیانہ جہت کا حصہ ہیں۔ علاوہ ازیں مغلیہ سلطنت کے عہدِ زوال میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری فرد کی اس سائیکی کی نقیب ہے جو ہندوستان کے اس دور کے سیاسی، معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کا لازمی نتیجہ تھی۔ درسِ فنا، سبقِ عبرت، دنیا کو ہیچ جاننا، بے یقینی میں زندہ رہنا اور اس نوع کے دیگر رویے نظیر کے قصائد کا حصہ ہیں اور کیوں نہ ہوتے انہوں نے عظیم الشان مغلیہ سلطنت کی عظیم الشان روایات کو ختم ہوتے دیکھا تھا۔ بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی گئیں، درباروں میں ریذیڈنٹ متقرر ہو گئے اور بقول مصحفی گائے کی جگہ انسان ذبح ہونے لگے (۲)۔ مزید برآں نظیر اکبر آبادی کا مزاج بھی اخلاقی اور صوفیانہ تھا۔ اردو شاعری کی زبان میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کرنے والے اس شاعر کی نسبت یہ بھی کہا گیا ہے "جیسے انہوں نے کسی کی ہجو نہیں کی ویسے ہی کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا" (۳) نظیر اکبر آبادی کے قصائد قصیدے کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں (۴)۔ انہوں نے اپنے قصائد میں فارسیت سے کام تو لیا ہے تاہم اسے اپنے اشعار پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ دقیق الفاظ، مشکل تراکیب اور پیچیدہ تشبیہیں بھی ان قصائد کا حصہ نہیں ہیں۔ تفکر اور اصلیت دونوں کے اتحاد سے ان کے قصائد وقیع ہوئے ہیں۔ نظیر نے ان میں زندگی اور اس کے مسائل پر صوفیانہ، مابعد الطبیعاتی اور فکری انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ غزل کی یک رنگی اور قصیدے کی روایتی لفاظی کو ترک کر کے انہوں نے اپنے لیے الگ ڈگر منتخب کی۔ وہ ڈگر جہاں خیال و معنی کی وسعتیں ان کے الفاظ کی گہرائیوں میں اضافہ کر گئیں۔

---

(۱) کلیاتِ نظیر مطبوعہ نول کشور (۲) گاؤ کشی اس شہر میں موقوف ہوئی ہے + اب ان کی جگہ خونِ رعیت کا رواں ہے (مصحفی)
(۳) تاریخ ادب اردو ص ۲۱۶ (۴) وہ تقاضے کہ جو مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے کیے ہیں

سعادت یار رنگین

سعادت یار خاں رنگین م [۱۸۳۵] نے اردو قصیدہ کی اقلیم میں ریختی کو داخل کیا۔ جسمانی اور جذباتی معاملات کا کھلے بندوں اظہار کر کے ایک نوع کے ابتذال کو بھی جنم دیا۔ بلوم ہارٹ نے ان کے پانچ دواوین کا تذکرہ کیا ہے۔ (۱) ان میں موجود ان کے مختلف قصائد کی اطلاع بھی فراہم کی ہے بلوم ہارٹ نے ان دواوین کے مندرجات کی تفصیل فراہم کرتے ہوئے دیوان ریختہ میں رنگین کے ایک قصیدہ در مدح نواب ظفر یاب دانگریز) دیوان بیختہ میں در مدح نواب سید احمد میر خاں کا تذکرہ کیا ہے مزید برآں یہ بھی بتایا ہے کہ دیوان آمیختہ کا آغاز بھی ایک قصیدے سے ہوا ہے اور دیوان انگیختہ میں شاہ دریا اور شاہ سکندر کی شان میں ایک قصیدہ ریختی ہے۔ بلوم ہارٹ نے ان کے کلام مجموعہ رنگین میں محفوظ سلطان ٹیپو (شہید) کی شان میں لکھے گئے ایک قصیدے کا ذکر بھی کیا ہے۔ (۲) یحییٰ تنہا نے رنگین کے ایک اور قصیدے کا سراغ بھی لگایا ہے یہ شیطان کی مدح میں ہے (۳) ڈاکٹر صابر علی خاں کے بقول "انڈیا آفس لائبریری میں رنگین کی ۲۸ کے قریب قلمی تصانیف موجود ہیں ان میں ترجمہ قصیدہ غوثیہ، ترجمہ قصیدہ بانت سعاد اور نسخہ در شکوہ قصیدہ سودا بھی دستیاب ہیں (۴) اکرام چغتائی نے رنگین کے چھ سو اشعار کے ایک قصیدہ کا ذکر کیا ہے (۵) سعادت یار خاں رنگین نے شیطان پر طعن و تشنیع کے لئے بھی ایک قصیدہ لکھا۔ دونوں کے مطالع درج ذیل ہیں

در مدح شیطان ؎ لعنت میں کوئی شریک نہیں تیرا دوسرا + جتنے ہیں رنڈی باز تو ان کا ہے پیشوا
برائے طعن و تشنیع ؎ نہ ہووے کیوں تو سزاوار طوقِ لعنت کا + تو واقف اس سے ہے جو کام ہے شرارت کا

سعادت یار خاں رنگین نے رجب بیگ خاں کے غلام سہو شیار کی ہجا کی ہے۔ (۶) انہوں نے قصیدہ غوثیہ اور بانت سعاد کے جو تراجم کیے وہ مثنوی کی شکل میں ہیں (۷)۔ رنگین کا دیوان انگیختہ اور بیختہ ریختی کے دیوان ہیں۔ دیوان آمیختہ میں موجود قصیدہ در طعن و تشنیع شیطان کے دو مطالع ہیں پہلے میں پندرہ اور دوسرے میں سولہ اشعار ہیں۔ اسی دیوان کا دوسرا قصیدہ در ہجو ہشیار کے چوالیس اشعار ہیں یہ صنعت توشیح ہے "نام او نشان از حرف سر بر شوخی برآید" (۸) اس میں اس کی شریف دشمنی اور بد دوستی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دیوان انگیختہ میں نوری شہزادے (میاں شاہ دریا اور شاہ سکندر) کی شان میں ان کا جو قصیدہ ریختی موجود ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

فلک کے ہاتھ سے آنا یہ ناک میں ہے دم + نہ کھائے سوریوں کچھ بھی ہیں تجھ علی کی قسم
یہ بیر باندھ لی ہے اب مجھ سے اس کمبخت نے + نہ ہو سکے ہے بیان وہ نہ ہو سکے ہے رقم
ہر ایک جوڑتی ہے مجھ پہ تو تہمتیں لوگوں + کہے ہے مجھ کو برا کہے ہے اسے کسی کا غم

---

(۱) انڈیا آفس لائبریری میں ہندوستانی مخطوطات از بلوم ہارٹ ص ۹۱ تا ۹۴ (۲) ایضاً ص ۹۸ (۳) واۃ الشعرا ص ۵۵۶ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور
(۴) سعادت یار خاں رنگین ص ۱۳۵ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی (۵) شاہان اودھ کے کتب خانے ص ۶۶
(۶) سعادت یار خاں رنگین ص ۹۱ علم (۸) ایضاً ص ۳۸۶ - ۳۸۷ (۹) اسکا یہ شعر دیکھئے
سے سرخی نہیں شفق کی یہ ہے خونِ خلق کا

؎ بنتی ہے بنتوں کو جس گھر میں جائے تیرا قدم + لگے بہشت نہ اس گھر کو وہ باغ ارم (۱)

اس قصیدہ ریختی میں نوری شہزادے یعنی شاہ دریا سے خطاب کر کے کوئی اپنی ساس کا شکوہ کرتی اور کوئی نند کا کہ انہوں نے اس پر پابندیاں لگا رکھی ہیں اور اسے تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اصیلیں اور مغلانیاں بھی اپنے دکھ بیان کرتی ہیں اور پھر کہا ہے کہ اے شاہ دریا تری وہ ذات ہے کہ جو تجھ کو دلھا ہے وہ اگر بانجھ ہو تو دو لڑکے توام جنے اور جس کی زناخی اس سے خفا ہو تو وہ مل جائے

؎ حسن اور لطف ترا نام سن کے یوں لگا گیس + شعاع مہر سے اُڑ جائے جس طرح شبنم
اٹھاویں تخت سو اوار کوترے پریاں + چلیں جلو میں تری جن و حور ہو خرم
ترے صدقے گئی میرے نوری شہزادے + طفیل شاہ سکندر کے کر کچھ ایسا کرم (۲)

رنگین کے دیوان مجموعہ رنگین میں سلطان ٹیپو کی شان میں جو قصیدہ ہے اس پر لکھا ہے "قصیدہ در ہندی بر طرز انوری در صفت زبان بر توصیف ٹیپو شاہ پسر حیدر نائیک مالک مندراج" (۳) اس قصیدے میں رنگین نے فارسی، ترکی، برج بھاشا، پشتو، مارواڑی، پنجابی اور اردو زبان کا استعمال ہے یوں یہ قصیدہ صنعت جمع اللسان کا حامل ہے۔ یہ ۴۲ اشعار پر مشتمل ہے ڈاکٹر صابر علی خاں نے اس کی تفصیل مہیا کی ہے "وہ لکھتے ہیں " اسکا اٹھارہواں اور انیسواں شعر فارسی میں ہے بیسواں اور اکیسواں زبان ترکی میں، بائیسواں اور تیئیسواں زبان پشتو میں۔ چوبیسواں اور پچیسواں زبان برج میں چھبیسواں اور ستائیسواں زبان مارواڑی میں، اٹھائیسواں اور انتیسواں زبان اردو میں تیسواں اور اکتیسواں زبان پنجابی میں۔ اردو زبان میں جو دو شعر ہیں ان کے علاوہ ہر زبان کے شعر کے نیچے سرخی سے لفظی ترجمہ لکھا ہے۔ مارواڑی کے دو اشعار کا پہلا مصرعہ اردو کا ہے اس طرح پنجابی کے دو اشعار کا پہلا مصرع بھی اردو ہی میں ہے۔ فارسی کے دونوں شعروں کا پہلا مصرعہ اردو ہی کا ہے۔ ۳۵ اشعار کے بعد مطلع ثانی شروع ہوتا ہے مطلع اول کے آخری دو شعر یہ ہیں

؎ حق میں ہے رنگیں کے مطلع اور میں ایسا کہوں + جس کو سن کے وجد میں آجاوے روح انوری
اور ایسا ہو سراسر اس کی وہ تعریف میں + رشک کھائے جس کی رفعت پر یہ چرخ چنبری

مطلع ثانی کا پہلا اور دوسرا شعر ہے

؎ کیوں نہ شاہان جہاں سمجھے تجھ کو برتری + ہے جبیں سے آشکارا تیری شان حیدری
میں فلک کے جو تو سے تجھ پاس لایا ہوں پناہ + اے کرم گستر کرم سے کر تو میری دلبری (۴)

اس قصیدے میں تلوار کی تعریف میں ایک عمدہ تشبیہ استعمال ہوئی ہے

؎ پاک ہو اک دم میں اس سے اس طرح میدان جنگ + گولے بیانی کو کرے صاف جیسے پھٹکری

سعادت یار خاں رنگین کی شاعری میں رنگا رنگی اور بو قلمونی ہے۔ ان کے دیوان ہزلیات میں جنسی معاملات کے حوالے سے ایک قصیدہ ملتا ہے اس میں انہوں نے ناصحانہ انداز سے زندگی کے طور اطوار بیان کیے ہیں۔

---

(۱) سعادت یار خاں رنگین ص ۱۹۳ (۲) ایضاً ۲۰۴ (۳) ایضاً ص ۳۶۱ (۴) ایضاً ص ۲۴۷ - ۲۴۸

رنگین نے ایک قصیدہ امیرالدولہ نواب امیر خاں بہادر کی شان میں بھی لکھا ہے اس میں انہوں نے سودا کا تتبع کیا ہے

؎ داغ عشق عارض کرتا ہے پر دل کو سیاہ + دھو نہیں سکتا کلف کو چہرۂ روشن سے ماہ

رنگین کے درباری قصائد میں روانی اور تسلسل تو موجود ہے زور بیان نہیں ملتا۔ شوکت لفظی پیدا کرنے کے لئے وہ مصنوعی طریقے اختیار کرتے ہیں اس کی وجہ سے ان کی زبان میں متانت اور ہمواری کا فقدان نظر آتا ہے۔ مدحیہ مضامین میں ان کے ہاں غلو کا احساس ہوتا ہے

؎ حق تعالیٰ نے عطا کی ہے یہ تجھ کو سروری + ہیں نمک پروردہ تیرے آدم و جن و پری

صفحۂ سینہ پہ تجھ سادہ سرا لبتا نہیں + کلک نقاش ازل کرتی ہے گو صنعت گری

آج جو حشمت تجھ ہے وہ سکندر کو نہ تھی + ہے بجا فغفور چین تیری کرے گا چاکری ①

رنگین کی ایک تشبیب کے یہ اشعار دیکھئے اس میں حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا گیا ہے

؎ گر نہ اب ظاہر سے رنگ باطن دور ہو + چاہیے ہوئے نہ دود شمع کا نوری سیاہ

اپنی عزلت گاہ سے ہرگز قدم باہر نہ رکھو + کم ہوئی یوسف کی قیمت چھوڑ کر زندان چاہ

جسم میں ہوتا ہے رعشہ پر ضعیف و پیر کے + ہر سحر فانوس میں کانپے ہے شمع صبح گاہ

سعادت یار خاں رنگین کا نام بطور ہزال اور ریختی گو خاصا معروف ہے۔ فحاشی اور ابتذال کے میدان میں انہوں نے کھل کھیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تاہم جب ہم ان کی لسانی، اسالیبی اور شعری صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہیں یا متنوع اصناف سخن پر ان کے عبور کو دیکھتے ہیں تو ان کی ہزلیات اور ابتذال پر کف افسوس ملتے ہوئے ان کی اختراعی اور ابداعی قوت پر رشک بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صابر علی خاں کا کہنا ہے "محض نظم میں رنگین ستائیس[۲۷] اصناف سخن گناتے ہیں اور ان اساتذہ کے نام بھی لیتے ہیں جنہوں نے ان اصناف میں استادی کا مرتبہ حاصل کیا لیکن ایسا کوئی نہیں ہے جنہوں نے ان تمام ستائیس اصناف پر بیک وقت طبع آزمائی کی ہو اور رنگین کا یہ دعویٰ کہ فخر انہی کو حاصل ہے بظاہر ایک بہت بڑی تعلی معلوم ہوتا ہے لیکن انہوں نے اس دعوے کا ثبوت پیش کر کے کسی گنجائش نہیں رکھی" ②

اپنے مدحیہ قصائد میں رنگین نے حسن طلب کے اجزا میں دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یعنی وہ وہ مطلب بھی بیان کرتے جاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں اسے خوشامد پر محمول نہ کیا جائے۔ رنگین نے ریختی کے قصائد کے علاوہ دیگر قصائد میں رسمی ماحول و موضوعات ہی سے تعلق رکھا ہے۔ اس لحاظ سے ان کے اس قبیل کے قصیدوں کو نادرۂ روزگار یا عمدہ قصائد کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا تاہم اصطلاحات و محاورات بیگمات کے اظہار میں انہوں نے جو قدرت دکھائی ہے اور قصیدے میں ریختی لکھی ہے وہی ان کی خاص دین ہے۔ یہ صنف مغلیہ سلطنت کے عہد زوال کی پیداوار ہے اور ادبی زوال کا اشارہ بھی

---

① یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎ چاہیے تنگ فرنگ اپنے کو سمجھے وہ کوئی + تیرے دروازے پہ ہووے جو لٹکتا عنتری

② سعادت یار خاں رنگین ص ۹۰ یہ ستائیس اصناف ہیں ① قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، سلام، غزل، رباعی، قطعہ، فرد، تاریخ، پہیلی، واسوخت، منقبت، کبت، دوہرہ، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، مربع، مثلث، مستزاد، ملمع، تضمین، مستطر بند، شہر آشوب، بحر طویل، صنائع بدائع بحوالہ امتحان رنگین

محمد تقی ہوس

نواب مرزا محمد تقی ہوس [م ۱۸۳۶ء] اواخر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے نصف اول کے لکھنؤ سے متعلق تھے۔ نواب ہونے کے ناطے شاعروں کے سرپرست بھی تھے۔ فنِ شاعری سے مکمل آگاہ اور صاحبِ علم تھے۔ میر حسن، طالب علی خاں عیشی، اور میاں مصحفی ان کی سرکار میں ملازم تھے۔① شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے "ہوس شعر بسیار دارد"② کریم الدین کے مطابق ہوس کے "اشعار سلیس اور عبارت خوش اور شیریں ہے۔"③ انہوں نے مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی تصنیف کی۔ ان کے قصائد کے بارے میں یہ تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ قومی عجائب گھر کراچی میں دیوان ہوس کے ایک مخطوطہ میں ان کے تین قصائد موجود ہیں، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہوس کے کلام کے دو قلمی نسخوں اور شاہانِ اودھ کے نسخہ میں بھی ان کے قصائد دستیاب ہیں۔ شاہانِ اودھ کے نسخے میں غازی الدین حیدر کی مدح میں ان کے قصائد موجود ہیں۔⑤ ڈاکٹر محمود الٰہی کا کہنا ہے "ہوس نے کل دس بارہ قصائد کہے ہیں مگر قصیدہ نگاری کی تاریخ میں انہیں بلند مقام حاصل ہو گیا ہے۔ دبستان لکھنؤ کے بڑے قصیدہ نگاروں میں جو حیثیت دلی میں سودا کو حاصل تھی وہی حیثیت ہوس کو لکھنؤ میں ملی۔"④ یہ بیان حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ مصحفی اور انشا کی لکھنؤ میں موجودگی اور وہاں کے نوابوں کی شان میں ان کے قصائد کی توصیف کرنے والا نقاد اگر اس نوع کا بیان دے تو اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے ان کے بارے میں لکھا ہے "انہوں نے صرف نواب سعادت علی خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں"⑦ یہ بیان بھی محلِ نظر ہے کیونکہ شاہانِ اودھ کے نسخہ (دیوانِ ہوس) میں غازی الدین حیدر کی مدح میں بھی ان کے قصائد محفوظ ہیں۔

ہوس نے دنیاوی قصائد کے علاوہ بزرگانِ دین کی مدح میں بھی عمدہ قصیدے لکھے ہیں۔⑧ ان کے ایک قصیدے کی یہ تشبیب دیکھیے

> نقوشِ کلکِ قسمت میں ہے اندیشے کو حیرانی + پڑھا جاتا نہیں ہرگز کسی سے خطِ پیشانی
>
> میں کیا کھولوں دکاں اس شہر میں گو ہر فروشوں کے + شبہ کے نرخ میں بکتا ہو جس جا لعل رمانی
>
> نہیں آتش نفس محتاج پوشاکِ تکلف کے + ملی ہے اس صفائے طبع پر شعلے کو عریانی
>
> تماشا کر گلستانِ جہاں میں چشمِ عبرت سے + جہاں ہے آج آبادی وہیں ہوتی ہے ویرانی
>
> ہوا میں کی ہے ذروں نے چمک خورشید کی پیدا + ہماری خاک کی ہے باعثِ رونق پریشانی
>
> جو چھپ جاتا ہے تو کر پہلے ملائم اپنی طینت کو + زمیں نرم پر کرتا ہے دہقاں دانہ افشانی

ہوس کے قصائد کے یہ مطالع بھی ملاحظہ ہوں

> اک صلح ہے مزاجِ فلک میں تو لاکھ جنگ + ہے طرفہ شعبدہ یہ طلسمِ کبود رنگ
>
> وہ سحر بیاں ہوں میں سخن گر ہری تقریر + صامت ہو لب ناطقہ گویا لبِ تصویر

مصرعوں کی چستی، بندشوں کی ہمواری، معانی بھرے اصطلاحات و خیالات کے اعتبار سے ہوس کے قصائد اہمیت کے حامل ہیں۔ البتہ یہ کہنا کہ ان کے ہاں سودا جیسا جوش و خروش، نازک خیالی، معنی آفرینی اور شوکتِ لفظی پر مشتمل لہجہ

① خوش معرکہ زیبا ص ۳۱۵ ② گلشن بے خار ص ۲۷۶ ③ طبقات شعرائے ہند ص ۲۵۷
④ بحوالہ ۱۹۷۱ — ۱۹۷۱ ⑤ ملاحظہ ہو جائزہ مخطوطات اردو ص ۶۸۲ تا ۷۵۱ ⑥ اردو میں قصیدہ نگاری ص ۳۲
⑦ مضمون "بہار زمانہ" جنوری ۱۹۲۹ء از عبدالرؤف عشرت لکھنوی ⑧ لکھنؤ کے چند نامور شعرا از سید سلیمان حسین ص ۲۲-۲۵ قومی پریس لکھنؤ

ملتا ہے درست نہیں ہے (۱) البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے سودا کے اسلوب سے استفادہ کیا ہے۔ زبان کی شستگی، تخیل کی ندرت تشبیہات و استعارات کی عمدگی میں ہوس کی شاعری بلند مرتبہ ہے

بساطِ خاک سے خوش کیوں نہ ہو مزاجِ ہوا + کہ روکش پر طوطی ہے سطوۂ عنبرا

کروں زبانِ قلم سے جو میں دُر افشانی + تو زیرِ آب ہو چشمِ صدف کو حیرانی (۵)

ہوس مثنوی نگاری میں بھی تجربہ کار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد میں بیانیہ اور وصفی شاعری کے عمدہ نمونے مل جاتے ہیں۔ مناظرِ فطرت کا موثر بیان ہو یا کوائفِ باطنی کا بامعنی اظہار، ہوس کا قلم روانی کے جوہر سے مزین ہے۔ ہوس کی تشابیب میں عاشقانہ اشعار بھی مل جاتے ہیں اور بہاریہ بھی۔ انہوں نے حکیمانہ انداز سے بھی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کا مشاہدہ، تخیل اور تجربہ متحد ہو کر ان کی تشابیب کو جاندار بناتے ہیں۔ رسمی اور روایتی موضوعات کو اپنی شاعرانہ جولانیوں سے موثر بنانے کا ہنر بھی ان کے پاس تھا۔ ہوس صنعتوں کے استعمال میں بھی مہارت رکھتے تھے علاوہ ازیں زبان پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ تمثیلی، اخلاقی اور فخریہ تشابیب بھی ان کے ہاں دستیاب ہیں

کسی کے روئے عرقناک کے تجسس سے + چمن میں قطروں سے شبنم کے گل میں آبلہ پا

در مدح نصیر الدین حیدر

[سنگ میں عکس گل تر نے سرایت کی ہے + آبِ گل بن کے اگر کوئی نچوڑے پتھر

بجا ہے رشک سے بلبل اگر کرے فریاد + قبائے گل کے صبا نے چمن میں کھولے بند

در مدح سعادت علی خاں

[سفینۂ دوراں سے ایمن ہیں جو ہیں اہلِ صفا + دانۂ شبنم نہ ہو رزقِ دہانِ آسیا

[ہر کسب نورِ عرفاں جوہرِ ذاتی ہے شرط + دیدۂ بادام کو روشن کرے کیا توتیا

میں بلبلِ بستانِ خوش لہجہ سخن ہوں + ادراکِ معانی کو ہے واجب مری توقیر

ہوں صاحبِ گنجینۂ اسرارِ معانی + ہے وسعتِ صحرائے تصور مری جاگیر

ایک عمدہ قصیدہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجزائے قصیدہ میں بے ربطی یا ناہمواری نہ پیدا ہونے دے یہ اجزا ایک کل میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوں۔ ہوس کی تشبیب سے گریز، گریز سے مدح اور مدح سے حسنِ طلب اور دعا کے حصے نازک انداز یا غیر محسوس طریقے سے برآمد ہوتے نظر آتے ہیں۔۔

ہوس نے بھی دیگر قصائد نگار حضرات کی طرح حصۂ مدحیہ میں ممدوح کو (دنیاوی) ظلِ حق، شاہِ زمن، غازی دین حیدر، خسروِ جم حشم، جاہِ فریدوں، توقیرِ معدنِ لطف و کرم، منبعِ افضال ہمم، مالکِ طبل و علم اور صاحبِ طوغ و شمشیر وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے (۴) حضور کو ہوس نے مہرِ اوجِ مجد و علاء، مرادِ علتِ غائی آسمان و زمیں اور حصولِ معنیٔ ایجادِ عروۃ الوثقیٰ کہا ہے (۳) ۔ دعائیں دیتے ہیں کہ ہو شبِ سحر شام ترے عدو کی پر نور + اور صبح فی الفک رہے رشکِ شبِ قبر

ہوس کے قصائد اپنی متعدد خوبیوں کی بنا پر قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ انہوں نے قصیدے کے روایتی طرزِ احساس میں اپنی جولانیٔ طبع سے ایک نئی روح پھونکی اور بے سروپا مبالغہ آرائی اور لفظی بازیگری سے بھی اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دیا

---

(۱) اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۲۳۵ (۲) ظلِ حق شاہِ زمن غازی دین حیدر + خسروِ جم حشم و جاہِ فریدوں توقیر (ہوس)

(۳) مرادِ علتِ غائی آسمان و زمیں + حصولِ معنیٔ ایجادِ عروۃ الوثقیٰ (نعتیہ قصیدہ) ہوس

(۵) ملاحظہ ہوں یہ اشعار: سہ نسیم ہوتی ہے صدقے ہر خیاباں کے + گلوں سے بھرتی ہے دامن کو اپنے بادِ صبا

موئے تر مجھ سے نہیں کم موجِ نسیمِ سحر کی + سر کو اٹھاتے ہیں قدم چومنے لگتے ہیں شجر (ہوس)

شاہ نصیر

شاہ نصیر نصیر الدین م ۱۸۳۸ء، اردو شاعری کی تاریخ کے قادر الکلام شعرا کی صف میں شامل ہیں۔ انہوں نے سنگلاخ زمینوں میں بلند پایہ اشعار کہے ہیں۔ شیفتہ نے لکھا ہے شاہ نصیر "زمین ہائے سنگلاخ طرح می کند"(1) کریم الدین کا کہنا ہے "بہت شہروں میں ان کے شاگرد ہیں"(2) ابتدا میں ان کی رسائی شاہ عالم کے دربار میں ہوئی(3) ۱۸۰۳ء میں دہلی سے حیدر آباد دکن پہنچے اور مہاراجہ چندو لال کے دربار سے وابستہ ہو گئے(4) وہاں سے دلی آئے اور پھر تین بار دکن گئے(5) مراۃ الشعرا میں لکھا ہے ان کا دیوان از روئے ضخامت میر تقی میر کے دیوان سے کم نہ تھا(6)۔ ۱۲۹۶ھ میں اعلیٰ پریس میرٹھ سے شاہ نصیر کے کلیات کا ایک انتخاب چھپا اس میں شاہ نصیر کے چار قصائد بھی شامل ہیں

در مدح اکبر شاہ ثانی سے — دکھلادوں اپنی گر گل باغ سخن کی شاخ + ہو وے قلم گلاب کٹے نسترن کی شاخ

در تہنیت نوروز الضیا مخمس — کیوں نہ ہوں اب حشم و جاہ فراہم دونوں

در مدح راجہ چندو لال مخمس — گو ہیں سپر تیغ اور سناں۔ شمس و ہلال و کہکشاں + پر ہیں ترے قبضہ میں یاں شمس و ہلال و کہکشاں

در تہنیت تولد پسر غضنفر جنگ بہادر وزیر اعظم شاہ زمن سے — خوشی نے شب کو یہ مجھ سے کہا بہ عالم خواب + کہ ہو گیا اب ترے بیدار بخت خفتہ شناب

آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا تھا کہ شاہ نصیر کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ حبیب الرحمن شروانی نے اس کی تردید کی ہے کیونکہ ان کے کتب خانہ میں شاہ نصیر کے دیوان کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود تھا(7) کلیات شاہ نصیر جلد اول کی اشاعت مجلس ترقی ادب لاہور نے کی اس کے پیش لفظ میں اس کے مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ان کے چند قصائد کا تذکرہ کیا ہے(8) کتب خانہ رامپور میں کلیات شاہ نصیر کا جو نسخہ ملتا ہے اس میں شاہ نصیر کے گیارہ قصائد موجود ہیں جن میں چھ کا ممدوح شاہ عالم ہے ساتواں مرزا سلیم کی شادی پر ہے باقی چار قصائد کے ممدوحین بالترتیب نواب احمد بخش خاں، میجر بالر، مرزا بہادر بیگ اور الطاف علی ہیں(9) شاہ نصیر کا ایک قصیدہ جرمن نژاد نواب ظفریاب کی شان میں بھی ہے(10) اس قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں — جہاں میں یمن قدم سے ترے برب غفور + ہر ایک طرف ہوئی محفل نشاط و سرور

سرور و عیش مے و مینا ہے چار طرف + نوائے بربط و قانون و نغمہ طنبور

کرے ہے رقص فلک ہو زمیں پہ مستانہ + صدائے کوس طرب کا بیاں تلک ہے شور

سبو بدوش ہے کیا باغ دہر میں غنچہ + کہ گل ہے کثرت شبنم سے رشک جام بلور

مدح — بیان واقعی یہ ہے کہ عہد میں تیرے + کم از نگین سلیماں نہیں ہے چشم مور

گھوڑا — رقم میں کیا کروں تیرے سمند کی تعریف + کہ جس کا دامن زین مثل صبح ہے پر نور

ہاتھی — شکوہ فیل بھی کچھ کم نہیں شکوہ سے اب + جو نام لیجے تو ہو جائے ہے دہن معمور

حسن طلب سے — صلہ میں اس کے ہے نواب آج خلعت و زر + جو بخشش دے تو نہیں ہمت و کرم سے دور

---

(1) گلشن بیخار ص ۲۴۱ (2) طبقات شعرائے ہند ص ۲۱۹ (3) گل رعنا از عبد الحی ص ۳۰۶ مطبوعہ اعظم گڑھ (4) تاریخ ادب اردو سکسینہ ص ۲۴۰
(5) آب حیات ص ۳۹۵ (6) مراۃ الشعرا از محمد یحییٰ تنہا ص ۱۳۱ لاہور ۱۹۵۵ (7) شیر کتب خانے کے پرانے چھپے اردو دیوان رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۶
(8) کلیات شاہ نصیر جلد اول مرتبہ تنویر احمد علوی ص ۲۵ (9) مضمون شاہ نصیر از سخاوت مرزا رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۵ء
(10)
(11) Indo European Poets of Urdu and Persian P 311 - 312

شاہ نصیر کے مطبوعہ قصائد میں مضمون آفرینی، خیال بندی، تمثیل نگاری، لفظی صنعت کاری اور سنگلاخ زمینوں کا استعمال انہیں پرشکوہ بناتا ہے۔ مشکل ردیف و قوافی کو بہ آسانی شعر میں لانا، ٹکسالی زبان و شستہ بیان، تشبیہات و استعارات کی عمدگی ان کے قصائد کو ایک قادر الکلام شاعر کی جھولی میں ڈالتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں شاہ نصیر

"کے کلام کو اچھی طرح دیکھا گیا، زبان، شکوہ الفاظ، چستی ترکیب میں سودا کی زبان تھی اور گرمی و لذت اس میں خداداد تھی۔ انہیں اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ بجا تھا۔ نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے" (۱)

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے شاہ نصیر کے لسانی آرٹ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے "شاہ نصیر کی شاعری میں لسانی اور تکنیکی فنکاری ضرور ہے مگر تعبیر حیات اور تنقید حیات کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی" (۲)۔

شاہ نصیر نے مختلف مذہبی اور غیر مذہبی تقریبات کے لیے خاصے قصائد لکھے تھے ان کے موضوعات میں جشن نوروز جشن تاجپوشی، عید الفطر، عید الاضحیٰ، بسنت، رسم بسم اللہ اور شادی بیاہ کے مواقع پر شہزادوں اور شہزادیوں کی) لکھے ہوئے ان کے قصائد کو شامل کیا جاتا ہے۔

شاہ نصیر کی تشابیب میں تنوع اور ندرت کے عناصر ملتے ہیں کسی تشبیب میں انہوں نے زمانے کی ناقدری کا رونا رویا ہے۔ کسی میں خوشی اور نشاط کے ماحول کو پیش کیا ہے۔ حالات کی ناسازگاری بھی ان کا موضوع ہے علاوہ ازیں انہوں نے حسن و عشق، بہاریہ مناظر وغیرہ کو بھی اپنی تشابیب کا حصہ بنایا ہے۔ مزید اخلاقی اور پند و موعظت کی تشابیب بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ شکایت آسمان بھی ان کا موضوع بنی ہے

ع مضمون کے پھول جھڑتے ہیں پھلجڑی کی طرح + اگلے ہے لعل میری زبان سخن کی شاخ

صفا کر دل کو اپنے خوب نامعلوم ہو صورت + کہ زنگ آلودہ آئینہ میں گم جاتی ہے پہچان

انہوں نے گریز میں زیادہ مہارت نہیں دکھائی۔ اس میں کسی نوع کی نزاکت کا اہتمام نہیں کیا۔ بلکہ اکثر براہ راست انداز سے کہا کہ وہ مدح کا آغاز کرنے والے ہیں

ع نصیر اب تک نہ بیہودہ تجھے کیا ہوش ہے اتنا + بیاں نواب صاحب کی یہاں کر اب ثنا خوانی

کہیں کہیں انہوں نے طویل گریز سے بھی کام لیا ہے

شاہ نصیر نے مدحیہ حصوں میں مدح کے روایتی لوازمات سب سے کام لیا ہے مثلاً شخصیت اور ممدوح کے اوصاف، ساز و سامان اور متعلقات کا بیان

ع آتش حسرت سے تیرے دست گوہر بار کے + کیا عجب ہے چرخ پر ہو خشک دامان سحاب

نبی میں نورِ خدا ہے نبی کا تجھ میں ظہور + چراغ شمس و قمر میں ہوا ہے تیرا نور

اپنے قصائد کے مدحیہ حصوں میں شاہ نصیر نے لباس اوقات وقت وانب کا لحاظ بھی رکھا ہے بہر پا تلم کے فوجی عہدے کے حوالے سے انہوں نے اس کی مدح کی ہے ع جبکہ پلٹن کے قواعد دیکھتا ہے تو کبھو + بھول جاتا ہے زمیں پر پک قلم اک گلستاں

---

(۱) آب حیات ص ۳۹۸ - ۳۹۹ (۲) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند آٹھویں جلد اردو ادب سوم ص ۱۵۰

کرامت علی شہیدی

کرامت علی شہیدی [م ۱۸۴۰ء] نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے کی بدولت بہت شہرت پائی
اسکا مطلع ہے ~ رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کی مد کا + سر دیوان لکھا ہے میں نے مطلع نعت احمد کا
یہ قصیدہ اگرچہ خطابیہ ہے تاہم اس کی تقلید میں بعد کے شعرا نے بھی بہت لکھا ہے۔ شہیدی بریلی میں
پیدا ہوئے لکھنؤ میں پرورش پائی، زیادہ عرصہ پنجاب اور گجرات میں گزارا (۱)۔ کسی نے شہیدی کو ناسخ کا شاگرد بتایا ہے (۲)
اور کسی نے مصحفی کا (۲) اور ان کی وفات کے بعد شاہ نصیر کا۔ شہیدی شاعری میں طاق تھے شیفتہ نے لکھا ہے "در عروض
دستگاہے معقول دارد (۳)" سعادت خان ناصر نے انہیں شاعر منتہی قرار دیا ہے (۵)۔ امیر مینائی اور محسن کاکوروی نے شہیدی
کے مذکورہ قصیدے پر قصائد لکھے ہیں۔ شہیدی کے کلیات میں اس نعتیہ قصیدہ کے علاوہ حمد اور منقبت علی کے قصائد
بھی ملتے ہیں (۶) کریم الدین نے لکھا تھا شہیدی نے بہت قصیدے اور ہر ایک قسم کے شعر کہے ہیں (۷)۔ شہیدی کے نعتیہ قصیدے کو انہوں
نے دھوم دھام کا کہا ہے۔ اس قصیدے کی روانی، اظہار عقیدت، جذبات آمیزی، نکتہ آفرینی اور شیفتگی نے شہیدی کو
مقبول خاص و عام کیا ~ مٹیں گے مثل تقویم کہن دیواں ہزاروں کے + ہوا عالم میں شہرہ میرے اشعار مجدد کا
یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شہیدی کے اس قصیدے کی بدولت جدید طرز کی نعت گوئی کا آغاز ہوا۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

~ دبستان ازل میں وہ معلم عقل کل کا تھا + نہ تھا نام و نشاں جس روز اس لوح زبرجد کا
عجم میں زلزلہ نوشیرواں کے قصر میں آیا + عرب میں شور تھا جس وقت اس کی آمد آمد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے + قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

حضرت علی کی شان میں ان ایک قصیدے کا مطلع ہے

~ مرا سینہ ہے بیشہ بود و باش شیر یزداں کا + فضائے لامکاں سے قرب ہے میرے نیستاں کا

اس قصیدے میں شہیدی نے مضمون آفرینی کرنے کے ساتھ ساتھ نزاکت خیال کو بھی اہمیت دی ہے۔ ان کے شاعرانہ جوہر
کی بھرپور شہادت ان کے کلام میں موجود صنائع لفظی و معنوی سے مل سکتی ہے۔ لکھنوی انداز کا شاعرانہ تکلف اور
مواداتی تصنع بھی ان کے قصائد کا حصہ ہے۔ حسن تعلیل، رعایت لفظی، مبالغہ، تلمیح، مراعاۃ النظیر وغیرہ کا عمدہ
استعمال ان کی شاعرانہ قوت کا مظہر ہے۔

~ گر افعی بن کے جا نکلے عدو ابلیس اندلعا ہو + ملا ہے قصر اخضر روح کو اس کی زمرد کا
ترا پابوس ہے ہفتم فلک پر منزل کیواں + ترے سجدے سے ہشتم آسماں پر فرق فرقد کا

شہیدی کے قصائد کی تاثیر میں ان کی فارسی شناسی کا خاصا عمل دخل ہے ان کے کلام میں خاقانی، بیدل، جامی
اور حافظ وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ ان کے قصائد حسن خاتمہ، نکتہ آفرینی، مضامین بندی، عقیدت و شیفتگی کے
اعتبار سے اپنے معاصرین کے مذہبی قصائد سے ممیز ہیں

---

(۱) تذکرہ گل رعنا ص ۳۴۳ مطبع معارف علی گڑھ۔ (۲) عیار الشعرا ص ۴۱۱ (۳) شعر الہند جلد اول ص ۱۵۲
(۴) گلشن بے خار ص ۲۸۳ (۵) خوش معرکہ زیبا ص ۳۵ (۶) دیوان شہیدی مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۸۹۱ء
(۷) طبقات شعرائے ہند ص ۳۷۹

نظام الدین ممنون

میر نظام الدین ممنون [م ۱۸۴۴] معروف شاعر میر قمر الدین منت کے فرزند ہیں۔ ان کے قصائد اکبر الدین صدیقی نے زیورِ طبع سے آراستہ کرائے۔(۱) وہ اردو کے ممتاز قصیدہ نگار ہیں ان کے مذہبی اور غیر مذہبی قصائد کی تعداد ۳۲ ہے۔ انہوں نے فخر الشعرا کا لقب پایا(۲) شیفتہ نے ان کے کلام کو عذب و شیریں کہا ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "مضامین بیگانہ بندش میں یگانہ ہیں۔ انہیں فخر الشعرا کا خطاب شاہ عالم ثانی نے دیا۔" "شہر کے موزوں طبع لوگوں میں سے اکثر ان کے شعر سے استفادہ کرتے تھے"(۳)۔ ممنون کو میر قدرت اللہ قاسم نے شیریں سخن، فن شعر سے واقف، سلیس گفتار اور فصیح زبان کہا ہے(۴) سرور نے انہیں ریختہ گوئی میں بہت رسا اور برجستہ فرمایا ہے(۵) قادر بخش صابر نے لکھا ہے ممنون نے "تراکیب فارسی کو زبان ریختہ سے ایسا ارتباط بخشا کہ کمال آشنائی سے بیگانگی کا اثر نہیں پایا جاتا اور معنی درشت کو الفاظ قریب الفہم سے اس طرح جلوہ دیا کہ ماہ سی روزہ کی مانند کوتہ نظر بھی اس کے نظارے میں دعوی کاہش کرتا ہے"(۶)

ممنون نے حمد، نعت اور منقبت کے قصائد کے ساتھ ساتھ دنیاوی ممدوحین کی شان میں بھی عمدہ مدحیات لکھی ہیں امرا اور سلاطین کی مدح میں ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود قصائد دہلی سے متعلق ہیں یعنی یہ شاہ عالم، میرزا جہانگیر، سید ناصر الدین اور اکبر شاہ وغیرہ کی مدح میں ہیں۔ ان کے بعض منقبتی قصائد لکھنؤ میں قیام کے زمانے کی یادگار ہیں۔ ممنون طویل قصائد لکھنے میں مہارت رکھتے تھے ان کے اکثر قصائد ایک سے زیادہ مطالع پر مشتمل ہیں ان کے دیوان میں چار چار اور پانچ پانچ مطالع پر مشتمل قصیدے بھی ملتے ہیں۔ طوالت کے باوجود ان کے قصائد روانی اور زور بیان کے نمونے لئے ہوئے ہیں۔

ممنون کے دیوان میں سترہ قصائد مذہبی (ایک حمد، تین نعت اور تیرہ منقبت) اور باقی پندرہ غیر مذہبی (جن میں ۳ اکبر شاہ، میرزا جہانگیر، ایک شاعر اور دو گمشدگی سے بازآمدہ ہیں)۔ ان کے درباری قصائد میں پانچ عید کے حوالے سے ہیں اور ایک بسنت کی تہنیت کے حوالے سے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لال قلعہ میں بسنت کے تہوار کو بھی عید ہی کی مانند اہمیت دی جاتی تھی۔ بسنت کہ جو ایک موسمی تہوار ہے اس کی آمد پر اس دور کے درباری شعرا بادشاہ کی خدمت میں تہنیتی قصائد پیش کرتے تھے۔

ممنون نے اپنی زبان و بیان کی قوت کا اپنے قصائد میں بھرپور استعمال کیا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں سنگلاخ زمینیں استعمال کرتے تھے۔ قصیدہ ان سے کیوں محروم رہتا۔ انہوں نے قصائد میں بھی مشکل انداز اختیار کیا۔ ان کے قصائد مشکل ردیف و قوافی میں سے چند ایک یہ ہیں / مانوس، طاؤس / کار انگشت، نگار انگشت / پدیدار سنگ، خاکسار سنگ / شمار گرہ، ہزار گرہ / استخوان آتش، نیستان آتش / سامان تیغ، بران تیغ / ساغر آب میں، نیلوفر آب میں / وغیرہ وغیرہ۔ ایسی سنگلاخ زمینوں میں کثیر اشعار لکھنا قادر الکلام شاعر ہی کا حصہ ہے

---

(۱) کلیات ممنون جلد اول مرتبہ اکبر الدین صدیقی فائن پرنٹنگ پریس حیدر آباد ۱۹۴۲ (۲) گلشن بےخار ص ۵۱۷
(۳) تذکرہ ہندی ص ۲۳۸ - ۲۳۹ (۴) مجموعہ نغز جلد دوم ص ۲۱۲ (۵) عمدہ منتخبہ ص ۷۲۲ - ۷۲۵ (۶) گلستان سخن جلد ۳ ص ۴۴ مطبوعہ نولکشور

ممنون کے غیر مردف قصائد میں چار یائیہ، تین لامیہ، چار رائیہ، تین میمیہ، اور باقی ایک ایک الفیہ بائیہ، زائیہ، سینیہ، قافیہ اور نونیہ ہیں۔ انہوں نے اپنے سنگلاخ قصائد میں سودا کی بعض زمینیں استعمال کی ہیں ان کی سنگلاخ زمینوں کے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں کہ جو باز چاہے تو عقدہ ہائے کار انگشت / گل گونہ گونہ آب ہیں پدیدار اشک سے / کشادہ کس کی گرہ سے چرخ کیں شعار گرہ / کیوں بعض تفتگاں سے کیا تھا دو چار دست / ہوئی گیا آتش دل سے نصیب استخواں آتش / ستم کی تیز کرے چرخ فتنہ ساماں تیغ / کب تاب لائے دیکھ ترا منظر آفتاب / گو ہیں فلک نجوم سے نیزے ہزار چشم / فیض اُردوں سے ہے پیکاں غنچۂ سوفار گل / واژوں نصیب سبزے ہوں رہ گر آب ہیں / —— ان زمینوں میں مطلع در مطلع قصائد لکھنا کار طفلاں نہیں۔ ممنون نے زبان پر مکمل عبور اور شاعرانہ نزاکت شناسیوں کی بدولت اس سطح کے قصائد لکھے۔ ان کی تشابیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

در مدح اکبر شاہ: سپیدہ دم باز چشم تھی یاں کہ در سے ناگاہ جلوہ گستر + ہوا ہے اک رشک باغ و بستاں بہشت خوبی قدم سے تا سر وہ قد و قامت وہ رو وہ طلعت وہ لعل خنداں وہ چشم فتاں + نہال طوبیٰ، بہار خوبی، جواب غنچہ، حریف عنبر جبیں مصفا، لبوں میں احیا، عذار زیبا، ذقن تماشا + کف کلیم و دم مسیحا، جمال یوسف، چہرہ محشر گلوئے سیمیں، دہان رنگیں، لبان نوشیں، حدیث شیریں + صراحی جیں، پیالہ لعلیں، شراب احمر، نبات و شکر

[در مدح امام حسینؑ]
بہ مناسبت گرمی میدان کربلا

ہوا ہوئی یہ تپ، مہر سے حرارت گیر + کہ موج باد سحر گہ ہے آتش زنجیر
تمام قسم جمادات ہو گئے ہیں آب + زبسکہ آتش گرما کی عام ہے تاثیر
جلے ہے جسم ملاقات ماہتاب سے یوں + کسی کے تن پہ گرے گرم گرم جیسے شیر

سردی کا منظر

ہزار طرح سے ہو تیغ آزما خورشید + نہ ذرہ بھی طبق یخ کی کٹ سکے ہے ڈھال
بدن پہ شعلے کے رعشہ ہے خوف سرما سے + رکھے ہے دود کی ہر چند سر پہ کالی شال

عید الاضحیٰ کے موقع پر

ہوا ہے نغمۂ بلبل ترانۂ لبیک + ادائے حج کے مراسم بیاں تلک ہیں عام
نسیم گرد چمن یوں پھرے ہے جوں حاجی + طواف کعبہ کی خاطر سب اٹھائے ہے گام
شب کہ تا صبح مری چشم تحیر تھی باز + ناگہ اک نور کا لمعہ ہوا پرتو انداز

ممنون کی تشابیب زیادہ تر محبوب چین کے احوال و کوائف سے مطابقت رکھتی تھیں سراپا نگاری سے گریز ہیں اور رومانی زندگی کے مظاہر خصوصی تک چند موضوعات ان کی تشابیب کا حصہ بنے ہیں۔ بیان احوال اور توضیح مناظر میں انہوں نے نادر تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ اشیا اور مناظر کی لطافتیں، رنگینیاں اور رنگینیں ممنون نے موثر طور پر اشعار میں منتقل کی ہیں۔ انہوں نے ان میں اظہار علم بھی شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ تلمیحات والفاظ کی مختلف جہتوں کا عمدہ استعمال کیا ہے ممنون کی تشابیب میں موضوعاتی تنوع کی تلاش بے سود ہے البتہ وہ موسیقانہ اور مناظراتی تشابیب میں پر از زور قلم صرف کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے ہاں مناظر میں مقامی بو باس کم اور عجمی رنگ و روغن زیادہ ہے۔ وہ کبھی کبھی تشابیب میں امتنانوی اور کلاسیکی رنگ بھی داخل کرتے ہیں۔

جہاں تک گریز کا تعلق ہے تو ممنونؔ نے سیدھے سادے انداز سے گریز کرنے کا ڈھنگ بھی اپنایا ہے اور ڈرامائی انداز بھی اختیار کیا ہے ۔ وہ اس جزو میں لطافت پیدا کرنے کے ہنر سے بھی واقف تھے ۔

؎ بہ نام شوکت بہ عرفِ دولت، لقب جلالت، خطاب حشمت + بہ پیشِ سلطاں کہ جشن تعاواں چلے وہ خنداں یہ شور لب پر
سن کے یوں لائی وہ لب پر سخنِ روح افزا + کرکے انفاسِ مسیحی سے لبوں کو دمساز
تہنیت نام ہے اور قصہ کی پوچھی جو طرف + حیف دانش پہ تری ہے کہ نہیں محرمِ راز
شادی جشن جلوس آج ہے یعنی اس کی + کہ وہ ہے زینت اورنگ وقار و اعزاز

ممنونؔ نے جزو مدح میں بھی بہ طریقِ احسن اظہار خیال کیا ہے

؎ مہ منور کے گرد اختر چمک چمک کر گریں تھے بکھر + جو نیر سر پہ لاؤ ڈالو نثار کرنے لگے گل زر
وہ شاہِ برحق شہی کے لائق جہاں کی رونق ولی مطلق + وہ پاک طلعت وہ صاف طینت درون مصفٰی برون مطہر
جناب خاقان ابن خاقاں خدیو دوراں و شاہ شاہاں + سپہر جاہ و ملک سپاہ، فلک علاؤ ستارہ چاکر
دم شجاعت اگر سخاوت بوقتِ شوکت بہ گاہ حشمت + عطائے حاتم، وغائے رستم فرِ سلیمان و مور لشکر
دعا: سخن ہے ختم اب دعا ہے واجب کہ حق سے سائل ہوں اور طالب + محب ہوں مسرور شاد و خرم عدو ہوں مقہور و خوار و مضطر

اس جزو مدح کے الفاظ و تراکیب، مرصع کاری، داخلی قوافی، ذیلی قوافی سے ترنم اور نغمگی کی تخلیق ہوئی ہے یہی کیفیت پورے مقصد سے کی ہے ۔ ممنونؔ ممدوح کی شخصیاتی مناسبت سے مدح کرنے کے ہنر سے واقف تھے ۔ ان کے دنیاوی ممدوحین کے مدحیہ حصوں اور مذہبی ممدوحین کے قصائد کے مدحیہ حصوں میں واضح فرق ہے ممنونؔ کے نعتیہ قصائد ان کے زورِ قلم کے عروج کے مظہر ہیں ۔ ان میں خوب صورت ترکیبیں حسن کارانہ انداز سے استعمال ہوئی ہیں ؎ نگاہ و غمزہ و ابرو و مژگاں جفا کیشاں + رگ جاں میں جگر میں دل میں سینے میں رکیں پنہاں

اس مطلع کے حامل نعتیہ قصیدہ میں ممنونؔ نے ہر مصرعے میں چار چیزیں رقم کرنے کی پابندی کی ہے ۔ اس فنی پابندی کے باوجود انہوں نے دلکش الفاظ کے تفحص میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ۔ صنعت ترصیع میں حفظ و مثنا دیگر کئی صنعتوں کے استعمال (الشئد واعادۃ النظیر، لف و نشر اور حسن تعلیل) میں عموماً انہیں ملکہ حاصل تھا ۔ ان کے مرصع قصائد تاریخ ادب اردو میں اہم مقام کے متقاضی ہیں ۔ ترصیع کے لیے جس ترنم اور اوزان پر عبور کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ عام شاعروں کے بس کی بات نہیں ہے ۔

شیخ چاند نے ممنونؔ کے ایک مقصدے پر [حافوس، محسوس کے توافی والا] سودا کے قصیدہ کے احتمال میں بحث کی ہے ① ۔ چنانچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ممنونؔ کے قصائد اپنے بعض اوصاف کی بنا پر سودا کے قصائد سے مماثل ہیں ممنونؔ کے قصائد نزاکت، زورِ بیان، آمد و برجستگی، جوش و جذبہ، شان و شوکت اور تفنع و ترصیع کے حوالے سے اہم ہی نہیں نادر بھی ہیں ۔

---

① سودا از شیخ چاند ص ۱۸۹ مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶

کنور سین مضطر

کنور سین مضطر لکھنوی م [۱۸۲۷ء سے قبل] اردو میں اپنے طویل ترین قصیدے کی بدولت معروف ہیں① یہ قصیدہ ریاض الشہدا کے نام سے طبع ہوا ہے اس کا تاریخی نام نجم منا ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) ہے اس قصیدہ کے اشعار کی تعداد ۱۲۲۵ ہے اور اس میں نعت و منقبت کے مضامین رقم ہوئے ہیں۔ کنور سین مضطر کا اصل نام کرپا دیال تھا اور وہ مصحفی کے شاگرد تھے② شیفتہ نے ان کے مذکورہ قصیدے کو واقعات کربلا سے منسوب کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کے تذکرہ نگاروں (کریم الدین، نیلین، نساخ) نے ان کی رائے کو مقدم جانتے ہوئے اسے موقوعات کربلا کے حوالے سے لکھا ہوا قصیدہ ہی قرار دیا۔ اس قصیدے میں واقعہ کربلا کا تذکرہ ضرور ہے تاہم اسکا اصل کینوس رسول کریمؐ کی شان میں نعتیہ اشعار، حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ثنا کے ساتھ ساتھ یازدہ اماموں کی مدح سے متعلق بھی ہے اور اس میں امام مہدی کے غیاب و ظہور کے معاملات کی تفاصیل بھی رقم ہوئی ہیں۔ اس قصیدہ کا مطلع اور چند اشعار دیکھئے

طفلان اشک لالہ گوں گرم لعب آبشار + یا سحاب بحر خوں گلشن یہ درد شعلہ بار
آغشتہ جوں موج صبا ارمن میں ہے شورش فزا + یا ہیئتوں کے غار کا اٹھا ہے اک گلگوں غبار
خون جگر شد اس شکن ہے گرد مردم حلقہ زن + یا روسیان سر نگن حصار ملک زنگبار
پیغمبر آخر زماں، شاہنشہ کون و مکاں + سالار جیش مرسلاں، لمعان نور کردگار
پیغمبر احمد لقب، والا حسب عالی نسب + مہر عجم ماہ عرب لا مثل فرد روزگار

اس قصیدے میں حضورؐ کے وقت آخر روح القدس اور دیگر فرشتوں کے حاضر ہونے کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے

اول سلام حق دیا پھر عرض خدمت میں کیا + اے سرگروہ انبیا اے عاشق پروردگار
آ دیں گے حاضر اجمعیں از انبیا تا مرسلیں + اے رحمۃ اللعالمیں تم ہو گے سب کے تاجدار

کنور سین مضطر کی اسلام اور اسلامی امور کے بارے میں معلومات قابل قدر ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف فرقوں کے اسلامی عقائد بھی ان کے سامنے رہے۔ مسلم ثقافت اور تہذیب کے حوالے سے ان کے اشعار میں عمدہ معلومات ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ قصیدہ کسی مسلم ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں قرآن و حدیث کے حوالے بھی ہیں، عرش و ملائکہ وغیرہ کی باتیں بھی توحید، قیامت، جنت، دوزخ، شریعت، طریقت، عشق، شہادت، جہاد اور ایمان وغیرہ سے متعلق تفصیلیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں مسلم اقتدار کے دور میں ہندو شعرا اور دانشوروں کا ایک روادار طبقہ مسلمانوں کی قربت کو اپنے لئے باعث فخر جانتے تھے اور ان کی تہذیب و ثقافت سے زیادہ سے زیادہ رچنے بسنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ کنور سین مضطر کا اتنا طویل مذہبی قصیدہ اس امر کا غماز ہے کہ وہ فکر و عقائد کی سطح سے لے کر عام سماجی زندگی کے معاملات تک مسلم تہذیب و ثقافت سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ اس قصیدے میں انہوں نے فارسی اور عربی کا بھرپور استعمال کرکے ہندوستان میں مسلم ثقافت کے لسانی ہتھیاروں کو بھی قبول کیا ہے۔

---

① ریاض الشہدا از کنور سین مضطر مطبع ثمر ہند لکھنو ۱۲۳۶ھ ② خوش معرکہ زیبا ص ۳۸۱

فقیر محمد گویا

فقیر محمد گویا [م ۱۸۴۸ء] نصیر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر کے مداح تھے۔ انہوں نے منقبت علی پر مشتمل ایک قصیدہ بھی لکھا۔ گویا خود بھی امرائے لکھنؤ میں سے تھے اور شیفتہ کے بقول اس علاقہ کے شعرا اس کی مدح میں رطب اللسان ہیں۔ وہ شاعری میں ناسخ کے شاگرد ہیں۔(۱) دیوان گویا میں جو چھ قصائد ملتے ہیں(۲) وہ یہ ہیں

منقبت علی — بہار میں ہو اگر ساقیا گلاب قلم + کھلے یہ غم سے کہ ہو شیشہ شراب قلم

در مدح نصیر الدین حیدر — برنگ گل جسے اب دیکھئے وہ خنداں ہے + بہار عیش سے ہندوستاں گلستاں ہے

ایضاً — ہے جلوۂ دنداں لب جاناں کے برابر + رکھتے ہیں گہر لعل بدخشاں کے برابر

در مدح غازی الدین حیدر — خیال نرگس سے گوں تھا جو دم تحریر + ہوئی ہے تعلق مینائے مے قلم کی صریر

ایضاً — بہار نے یہ کیا گلشن جہاں میں اثر + کہ کھل کے غنچہ تصویر ہو گیا گل تر

ایضاً — ہوا ہے آتش گل سے یہ عالم گلزار + کہ نخل طور ہیں گلشن میں اک قلم اشجار

قصائد نگاران اتر پردیش میں علی جواد زیدی نے شیخ حیات اللہ گویا فرخ آبادی کی ذیل میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھے ہوئے فقیر محمد گویا کے دو قصائد کے اشعار قلمبند کیے ہیں(۳)۔ ان سے یہ غلطی شاید اس لئے ہوئی ہے کہ انہوں نے کتب خانہ سالار جنگ کی فہرست (۴۴۴) کے حوالے سے قصائد گویا نامی کتاب کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے مصنف کا نام شیخ حیات اللہ گویا فرخ آبادی بتایا ہے(۴)۔ اس میں سے جن قصائد کے اقتباسات دیے گئے ہیں وہ فقیر محمد گویا کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ انہوں نے فقیر محمد گویا کے قصائد کو شیخ حیات اللہ گویا کے قصائد سمجھ لیا ہے۔ فقیر محمد گویا کے قصائد شاعرانہ پختگی کا عنصر رکھتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں

تری بہار کرم کا ہے فیض عالم پر + کہ پھل تو رکھتی ہے تلوار اور پھول سپر

ترے سحاب قلم کا جو دشت میں ہو گزار + تو شاخیں آہوؤں کی سبز ہو کے لائیں بار

ریاض دہر میں ہے بعد ریخ راحت بھی + کہ پھول کھلتا ہے ہوتا ہے جب گلاب قلم

یہی اشارہ ہے اب چشم مست ساقی کا + کہ وصف کشتی مے میں چلیں شتاب قلم

عروس فکر اٹھا دے ہے اپنے منہ سے نقاب + ہو انگل کے قلمدان سے بے حجاب قلم

گویا نے نصیر الدین حیدر کو بھی اپنا استاد لکھ دیا ہے(۵)

اب ایسے شاہ کا گویا ہوا ہوں میں شاگرد + کہ جس کے ملک معانی بھی زیر فرماں ہے

گویا کی تشبیہات عمدہ اور معنی خیز تھیں۔ انہوں نے شاعرانہ تاثیر سے معمور عمدہ قصیدے لکھے ہیں۔ اپنے مذکورہ قصائد کے مدحیہ حصوں میں گویا نے روایتی طرز احساس ہی کو اپنایا ہے۔ وہ حرف وصف کشی کا ہنر بھی جانتے تھے مناظر باغ و راغ کی بھی عمدہ تصویریں کھینچتے تھے

---

(۱) گلشن بے خار ص ۱۵۷ء (۲) دیوان گویا از فقیر محمد خاں گویا مطبع نظامی کانپور ص ۹ تا ۱۳ ۱۲۸۰ھ ۱۲۸۵ھ (۳) قصیدہ نگاران اتر پردیش ص ۲۲۶
(۴) یہ حیات اللہ گویا انگریز سرکار کی جانب سے مناصب رکھتا تھا (اس لئے اس کے قصائد میں اپنے آقاؤں کی نعت کی تعریف ہوتی) بحوالہ گلشن بے خار ص ۱۵۷ء (۵) شیفتہ نے انہیں ناسخ کا شاگرد لکھا ہے

مومن خاں مومن

مومن خاں مومن [م ۱۸۵۱] کے قصائد کی بلند پائیگی غیر متنازعہ ہے۔ اس صنف میں ان کی مہارت[1] جید نقادوں اور محققوں کے نزدیک مسلمہ ہے۔ مومن کے دیوان[2] میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں ہی قسم کے قصائد ان کی علمی لیاقت اور شاعرانہ تخیل کی عمدگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان قصائد کے مطالع ملاحظہ ہوں

حمدیہ ــ الحمد لواہب العطایا + اس شور نے کیا مزہ چکھایا

نعتیہ ــ چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس + کہ جیسے صبح شب ہجر نالۂ ناقوس

منقبت حضرت ابوبکرؓ ــ کوئی اس دور میں جیسے کیوں کر + ملک الموت ہے ہر ایک بشر

منقبت حضرت عمرؓ ــ جو اس کی زلف کو دوں اپنے عقدۂ مشکل + تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل

منقبت حضرت عثمانؓ ــ ہے یہی حسرت دیدار تو فرہاد دشوار + دم شماری کی مری عمر ہے تا روز شمار

منقبت حضرت علیؓ ــ کشتی ہے میری تیغ زباں سے زبان تیغ + کیوں کر سخن فروش ہوں سوداگران تیغ

منقبت امام حسنؓ ــ چاہا نہ خلق کو صہبا و صنم سے محروم + ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم

مدح نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خاں نصرت جنگ[3] ــ یاد ایام عشرت فانی + نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

مدح راجا اجیت سنگھ[4] ــ صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری + کثرت دود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری[5]

مومن خاں مومن کے قصائد بلند مرتبہ فارسی قصائد کے ہم پلہ ہیں۔ انہوں نے انہیں علمیاتی اصطلاحوں سے مزین کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ عوام پسندی کے میدان سے باہر نکل کر خواص پسندی کے دائرے میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کی معانی یابی کے لئے عام قاری کی نہیں صاحب استعداد قاری کی ضرورت ہے۔ یعنی ایسے قاری کی جو فارسی اور عربی پر بھی قدرت رکھتا ہو اور عہد مومن کے متنوع علوم و فنون سے گہرے طور پر واقف بھی ہو۔ یہ احتمال بھی ممکن ہے کہ کیا جائے مومن خاں مومن نے لفظی بازیگری سے کام لیا ہے اور اظہار جذبات سے سروکار نہیں رکھا۔ اس کا جواب تو یہی ہے کہ مومن خاں مومن نے اپنے قصائد میں جو شان و شکوہ پیدا کیا ہے وہ لفاظی پر مبنی نہیں ہے۔ مومن خاں مومن مفہوم و معانی کی نوعیت کے اعتبار سے تفحص الفاظ سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد میں لفظ و معانی ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ غزل کے لوچ اور گھلاوٹ کو علمیاتی مواد سے ملا کر مومن نے ایک نوع کی نزاکت و لطافت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ علمی اور عقائداتی موضوعات ان کے ہاں جہاں اصطلاحی الفاظ کی غرابت میں منتقل ہوئے ہیں وہاں شعری فضا کا بوجھل ہونا ناگزیر تھا۔ بایں ہمہ آزاد لکھتے ہیں " وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی خاص صفت کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اس طرح ہیر پھیر سے عجیب لطف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں"[6]

---

(1) دلی کا دبستان شاعری ص ۲۱۹ (2) کلیات مومن جلد دوم مجلس ترقی ادب لاہور، (3) والئ ٹونک (4) والئ پٹیالہ (5) مجموعہ قصائد مومن مرتبہ ضیاء الدین احمد بدایونی الناظر پریس لکھنؤ، قصائد مومن مع شرح مرتبہ ظہیر احمد صدیقی بدایونی مطبوعہ کلیات مومن ڈاکٹر عبادت بریلوی کتاب دنیا کراچی (6) آب حیات ص ۴۲۹

مومن نے اپنے قصائد میں اپنے عقائد کا برملا اظہار کیا ہے۔ وہ سنی العقیدہ تھے۔ منقبت کے حوالے سے خلفائے راشدین میں سے پہلے تین خلفاء کی شان میں اردو میں کم قصیدے لکھے گئے ہیں۔ مومن نے ان کی شان میں قصیدے لکھ کر جہاں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے وہاں اپنے عقائد پر مہر تصدیق بھی ثبت کروائی ہے۔ ان قصیدوں کی داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن نے اپنے مذہبی حریفوں کی چوٹوں سے تنگ آ کر اپنے عقائد کو شرعی دلایل و براہین سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یوں ان کے قصائد میں مذہب و شاعری کی آمیزش عقائدی جذبات کی ترسیل کا باعث بنی۔ مومن نے اپنے حمدیہ قصیدے میں وحدت الوجود کا نقطہ نظر بھی پیش کیا ہے

؎ وہ رفعت جلال دے کہ جس نے + منصور کو دار پر چڑھایا

مومن کے قصائد کا مطالعہ پہلی ہی نظر میں اس حقیقت کا کاشف ہے کہ یہ سودا اور ذوق کے قصائد سے مختلف ہیں۔ ان میں مومن نے منفرد اسلوب کی تلاش کی ہے۔ قصائد میں دینی اصطلاحات، اظہار علمیت، تصنع اور مشکل پسندی کے استعمال کا تذکرہ آئے تو ذہن مومن کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہمہ دانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قارئین کو بھول بھلیوں میں بھی الجھا دیتے ہیں۔ قصیدے کے روائتی شکوہ، بلند آہنگی اور طنطنہ کو قائم رکھنے کے لئے مومن کو صنائع بدائع کا رستہ بھی اختیار کرنا پڑا۔ مومن نے نادر الکلامی کا زور دکھانے کے لئے مشکل ردیف و قوافی منتخب کیے۔ اور مجموعی اعتبار سے مشکل پسندی کا سہارا لیا۔ ان کے نعتیہ قصیدہ میں سدوس، منکوس، ایلاؤس، اینوس، سالوس، طیموس، فربوس، جاموش، بسوس، نحوس، دلوس، الکوس، مطموس اور بدریطوس کے قوافی عام فہم نہیں ہیں۔ برجیس، قران، ثور، تحسین، شرف، اسد، سعد ذابح، جبار اور تربیع کی اصطلاحیں مومن کی نجوم میں مہارت کی مظہر ہیں۔ ایک قصیدے میں تو وہ مبہم اسلوب تک بھی جا پہنچے ہیں اس میں جمع التراکیب کی تکنیک استعمال کی گئی ہے اور مفہوم قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے

؎ ہر حرکت محرک شوق و مہیج ہوس + قلقل شیشہ قاہ قاہ، مطرب طرفہ زیور کی
بستر گل بہ خواب خوش، رہ خوش نشاط خواب + عطر لباس سے گلاب جرم دماغ کی تری
رطل گراں دم صبوح، مست مئے شبینہ روح + سر بسر امتیاز طبع رنج خمار سے بری
عطر مشام حور عیش نہ فلک نہ آفریں + اد خندہ بخور سے عنبر و بان مجمری (۱)

اس میں شک نہیں کہ مومن کے بعض قصائد پیچیدہ اور مشکل الفاظ سے تیار ہوئے ہیں لیکن یہ پیچیدگی اور اشکال زمانی اور لسانی فیصلوں کی وجہ سے بھی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مومن، ذوق و غالب کے دور تک فارسی اور عربی زبانیں برصغیر کے مسلم عوام میں راسخ تھیں اور وہ علوم و فنون بھی رائج تھے جن کی اصطلاحیں انہوں نے قصائد میں استعمال کی ہیں۔ آج نہ وہ علوم و فنون رہے ہیں اور نہ ہی ان السنہ کا رسوخ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان قصائد میں پیچیدگی اور اشکال زیادہ نمایاں ہو کر دکھائی دیتا ہے۔ مومن نے بھی دیگر قصیدہ نگاروں ہی کی مانند تبحر علمی کے اظہار کے لئے ذخیرے استعمال کیے

---

(۱) کلیات مومن جلد دوم ص ۸۴ - ۸۵

مومن خاں مومن نے اپنی بعض تشابیب میں غزلیت اور تغزل کو بھی جگہ دی ہے۔ اس ضمن میں حضرت عمرؓ کی شان میں لکھا ہوا مومن کا قصیدہ قابلِ ذکر ہے۔ عرفی نے بھی اپنے بعض قصائد میں غزلیت اور تغزل کا اہتمام کیا ہے۔ مومن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

~ تم اور حسرتِ ناز آہ کیا علاج کروں + میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل

چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا + غضب ہے شوقِ رسائی و دوریٔ منزل

خدا سے ڈر بتِ بے درد یہ کیا انصاف + کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل

بعض جگہوں پر انہوں نے متغزلانہ انداز ہی میں شکایتِ زمانہ کے ساتھ اپنی بے قدری، ناکامی اور نامرادی کا تذکرہ کیا ہے۔ ان جگہوں پر مومن نے غزل کے عام موضوعات کو فن کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔ فخر و تعلّی کرتے ہوئے ایک مقام پر انہوں نے اپنے آپ کو شاعرِ بے نظیر اور دبیرِ سحر بیاں بھی کہا ہے۔ ذکر ہو رہا تھا شکایتِ زمانہ اور جورِ فلک کا۔ مومن نے اس حوالے سے حضرت ابوبکرؓ کے قصیدے کی تشبیب میں تفصیل نویسی کی ہے۔

~ داد خواہ ہوں کہ شور سے دیکھو + چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر

نہ امیروں کو پائے بندگی ہے + نہ رعایا مطیع و فرمانبر

اس کو ہو ستمِ زماں کا خطاب + جو کرے قتلِ خورد سالہ پسر

ہائے مجھ سا عزیز ہو یوں خوار + حیف خورشید زیرِ خاکستر

نالہ و زاری، آہ و شیون، فریاد و شکوہ کے جذبات مومن کے دلِ دردمند سے برآمد ہوئے ہیں۔۔ زمانے کی ناقدری کا شکوہ وہ کیوں نہ کرتے ان کی شاعری کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ غالب اور ذوق کی مانند درباروں میں ان کی طلبی نہیں ہوئی تھی۔ ~ جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں + کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

ہیں رشکِ آسماں سے جل + ہائے کیسی بلند ایوانی

ایسی وحشت سرا میں آئے کون + بے دری کر رہی ہے ویرانی

ننگ نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار + چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار

مومن کی تشابیب نادر تشبیہیں اور مشکل استعارے بھی دکھائی دیتے ہیں

چشمِ ستارہ سحر لونِ زحل سے سیہ تھا + دشنۂ ترکِ چرخ سے تیز نگاہِ مشتری

خطِ بیاضِ صبح وہ شعلۂ دمِ اژدرِ سیاہ + عکس سے جس کے آب ہو آئینہ سکندری

مومن کی تشابیب میں بعض جگہوں پر پورے پورے مصرعے عربی کے بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً "سبحانک یا الٰہ العالم / اکشف بجمالک الغطایا"

بہاریہ تشبیب کا یہ رنگ دیکھئے ~ ہے اس طرح فرح انگیز کوکوئے قمری + کہ جیسے موجِ منظر کو شور و غلغلِ کوس

نوائے طوطیِ شکر فشاں کی لذت ہے + سماع و رقص میں اہلِ مذاق جوں طاؤس

غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط + بہارِ لالہ و گل سیمیائے عرضِ شموس

صفا سے وہ در و دیوارِ باغ کا عالم + کہ آشیانے میں دشوار طائروں کو جلوس

مومن نے بعض گریزوں میں نزاکتِ خیال سے کام لے کر دو متضاد حصوں کو عمدہ طریقے سے مربوط کیا ہے

اے صنم چاہیے مومن کی فراست سے حذر + کیا نہیں تو نے سنا فقرۂ شاہ ابرار

سو ہمیں زیب وہ صدرِ خلافت عثمان + جس کی مسند کے حسد سے فلک اطلس خوار

انہوں نے اپنے مدحیہ حصوں میں حضورؐ کے لیے احمدؐ رسل، شفیع دوسرا، جہاں مطاع، شہنشاہ آفتاب نشاں، فلک سریر و قمر طلعت و ملک ناموس، حضرت ابوبکرؓ کے لیے زندگی بخش دین پیغمبر، اولی الفضل منکم، حضرت عمرؓ کے لیے امام اہل یقین، شہریار کشور عدل، امیر لشکر دیں اور مبارز مقبل، حضرت عثمانؓ کے لیے شہ عرش سریر، خورشید عذار، حضرت علیؓ کے لیے شیر خدا، خداوند ذوالفقار، حضرت امام حسنؓ کے لیے افضل الناس سبطِ نبی، سید سرور و مولا و مطاع و مخدوم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ والیٔ ریاست ٹونک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ کے لیے با یہ سیخ کمال اہل کمال، خارق فلزی ومعانی اور راجا اجیت سنگھ والیٔ پٹیالہ کو کام روائے خاص و عام کے لفظوں سے نوازا ہے مدحیہ حصوں میں مومن نے تشبیہ و استعارہ کی نزاکتوں سے بڑا کام لیا ہے۔ غیر مذہبی ممدوحین کی مدح میں تیغ و تیر و اسپ وغیرہ کی تعریف رقم کی ہے۔ توسن باد پا ترا روز وغا لگائے + حرص علاء کی سواد میں دکھا کے گرد کل

خندۂ برقِ تیغ میں گرمیٔ مہر نیمروزہ + گریۂ زخم تیر میں جوشِ سحابِ آذری

تیر خار انشگاف سے اس کے + لعل جو ہے سو لعل پیکانی

زیر ران اس کے توسن چالاک + رشک اسپ سپہر گردانی

مومن نے مذہبی قصائد میں مذہبی ممدوحین کے حوالے سے ان کے دینی اور دنیاوی استحقاق کو دلائل شاعری اور براہین ایمان کے وسیلے سے ثابت کیا ہے۔ معاند وجو کیا خاتمِ رسالتؐ نے + کہ میرے بعد نبوت کے لقا تھے قابل

یہی خلافتِ راشد کی اس کو بس ہے دلیل + یہی امامتِ برحق کی اس کو بس ہے محل

شرط ایمان ہے پیمانِ خلافت ہی کا + وہ مسلمان ہے کیا جس کو ہو اس میں انکار

قصۂ بیعتِ رضواں میں اشارہ ہے یہی + ورنہ کوئی نہیں ہم دستِ رسولِ مختار

مومن نے عمدہ قصائد لکھے ہیں۔ ان میں انفرادیت بھی پیدا کی ہے تاہم انہیں قصیدہ کے دیگر اساتذہ (سودا، انشا، ذوق اور غالب) سے بڑا قرار دینا (۱) انصاف نہیں ہے۔ صنفِ قصیدہ سے مومن کا مقصود صلہ طلبی کی بجائے عقائد کا اظہار تھا مومن نے قصائد میں مشکل پسندی کا دانستہ اہتمام کیا ہے ان کی غزلیں دقت پسند لہجے سے غیر متعلق ہیں تاہم ان میں رعایت لفظی زور و شور پر ہے۔ مومن کے قصائد جہاں تہذیبی طور پر سوادِ اعظم کے مسلک کے نمائندہ ہیں وہاں ان میں وہ تمام اثرات ہیں جنکا ذکر مذہبی قصیدے کے حوالے سے ڈاکٹر اعجاز حسین نے کیا ہے "غزل کے برخلاف" قصیدہ میں متشرع عقائد کا غلبہ ہے صوفیانہ خیالات وجذبات زیادہ نہیں۔ یہاں حدیث و قرآن سے زیادہ کام لیا گیا ہے اصول دین مثلاً قیامت، حج، نماز، روزہ عدل وغیرہ پر بحث اور سنت کے مسائل سے زیادہ دلچسپی لی گئی ہے" (۲)

---

(۱) حکیم مومن خاں مومن کی شاعری از سید امتیاز احمد (مضمون) نگار مومن نمبر ص ۲۰۸ (۲) مذہب و شاعری از ڈاکٹر اعجاز حسین ص ۳۰۲ اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۱

ابراہیم ذوق

ابراہیم ذوق [م ۱۸۵۴] کو خاقانی ہند کہا گیا ہے۔[1] اس خطاب سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے قصائد کس پایے کے ہوں گے؟ تاہم اس مقام پر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ خاقانی کا دور مسلم توسیعات کا دور تھا اور ابراہیم ذوق کا دور مسلم انحطاط کا۔ اول الذکر دور کے ممدوح حقیقی کارناموں کے مالک تھے موخر الذکر زمانے کے ممدوح محصور و مجبور تھے۔ ذوق کی ملک الشعرائی کے ساتھ ایسے انعام و اکرام بھی نہیں تھے کہ وہ خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتے۔ دور عروج کے ملک الشعرا عظیم الشان سواریوں کے مالک تھے اور سونے کے برتنوں میں خورد و نوش کرتے تھے۔ عہد ذوق کے حکمران خود وظیفہ خوار تھے۔ انگریز ریذیڈنٹ کے تابع تھے۔ وہ کیا ملک الشعرا رکھتے اور کیا خاقانی ہند کا خطاب دیتے۔ ذوق جیسے شاعر کی قدر دانی کے لیے شاہجہان اور اس سے قبل جہانگیر کے درباری ماحول کا ہونا ضروری تھا۔ ذوق نے اردو قصیدے کی اس عظیم الشان روایت میں اضافہ کیا جسے اولاً نصرتی نے اور بعد ازاں سودا نے فنی اور مواداتی اعتبار سے ارتفاعیت عطا کی۔ ذوق نے معنوی جدتوں کی تخلیق بھی کی۔ الفاظ کی جامعیت کا خیال اور معانی کی پہلو داریوں سے شغف رکھا۔ روایتی مضامین کو خوش اسلوب و پر جمال انداز سے استعمال کیا۔ شاعرانہ صناعی کے باوجود سلاست لفظ و بیاں کو مطمح نظر بنایا۔ وہ لفظوں کو موتیوں کی لڑی کی مانند رشتۂ بلاغت میں سونے کے لیے کوشاں تھے۔

ذوق سے قبل اردو قصیدہ عروجی منزلوں کو چھو چکا تھا۔ اس کی شاندار روایات مستحکم ہو چکی تھیں۔ سودا کے ایسے قصائد سامنے آ چکے تھے جو فنی بالیدگی کے اعتبار سے لاثانی تھے۔ ذوق نے ان کے مطالعے کے ساتھ ساتھ انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی اور عرفی وغیرہ کے قصائد کو بھی نظر سے گزارا۔ یوں ان کی مائل بہ قصیدہ طبیعت میں اور زیادہ زور پیدا ہوا۔ مزید برآں انہیں درباری سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر نے ملک الشعرا قرار دیا اور دیگر شاہی سرپرستوں نے خاقانی ہند۔ وہ قلعہ معلیٰ میں ہونے والے تقاریب میں قصیدے پڑھتے یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے دیوان میں قصائد کی اچھی خاصی تعداد ملتی ہے۔ کلیاتِ ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی میں ۳۶ قصائد ہیں[2] قصائد ذوق مرتبہ شاہ سلیمان میں ۳۳ قصائد ہیں[3] علاوہ ازیں دیوانِ ذوق مطبع نولکشور وغیرہ میں بھی قصائد شامل ہیں[4]۔ ابھی تک تحقیقی طور پر سب سے مستند دیوان ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا مرتبہ کردہ ہے۔ ہمارا انحصار اسی پر ہو گا۔ ایک دیوانِ ذوق مولانا محمد حسین آزاد کا مولفہ بھی ہے اس میں ذوق کے ۲۸ قصائد دستیاب ہیں[5] تنویر احمد علوی نے ذوق کے ۲۷ قصائد کو مستند مانا ہے اور ۹ قصائد وہ بھی شامل کیے ہیں جو مولانا محمد حسین آزاد کے بقول نظر ثانی سے محروم رہے تاہم ان کے حیلے ہوئے ۲۷ قصائد میں بھی صرف ۲۰ قصائد قصیدے کی ہیئت میں ہیں انہوں نے ان میں قطعات، مخمس، مسدس

---

(۱) آبِ حیات ص ۴۵۱ (۲) کلیاتِ ذوق جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (۳) قصائد ذوق مرتبہ شاہ سلیمان
(۴) دیوان ذوق مطبوعہ نولکشور / دیوان ذوق مطبوعہ محمدی پریس / دیوان ذوق مطبوعہ احمدی پریس اور دیوان ذوق مطبع رفاہ عام پریس نظامی پریس بدایوں
(۵) دیوانِ ذوق مولفہ مولانا محمد حسین آزاد۔

اور سہرا کی ہیئت میں لکھی ہوئی مدحیات کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ مدحیات معنوی اعتبار سے مدح کی ذیل میں ہیں ہیئتی اعتبار سے قصیدہ کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتیں۔ کلیات ذوق میں ہیئتی اعتبار سے جو قصیدے ہیں ان کے ممدوحین میں اکبر شاہ ثانی، سائیں نثار علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر کے نام اہم ہیں۔[1] ذوق تقریباً ۵۰ برس تک مغلیہ دربار سے وابستہ رہے۔ عید الفطر، عید الاضحیٰ، جشن نوروز، جشن تخت نشینی اور شادی شاہزادگان وغیرہ کے مواقع پر قصائد پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے مطبوعہ دواوین میں ان کے کل قصائد دستیاب نہیں ہیں۔

ذوق کے قصائد رنگ و آہنگ کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ لفظی صنعت گری سے لے کر معنوی دقت پسندی تک، وصف نگاری سے لے کر سراپا نویسی تک ان کے کلام میں حسن تشبیہ، لطف استعارہ، رعنائی خیال اور تازگی فکر وغیرہ کے عناصر نے کیف و اثر کی فضا پیدا کی ہے

نغمہ برلب کہیں مطرب پسر زہرہ جبیں + جام در دست کہیں مغبچہ ماہ طلعت

در مدح بہادر شاہ ظفر بحوالہ عید الاضحیٰ

دھوم ہے مسجد میں موذن نے اذاں بہر نماز + با وضو ہو کے نمازی ہے باندھی نیت

ہوئی بت خانے سے ناقوس کی پیدا آواز + چلے جمنا کو برہمن کوئی لے کر مورت

مذکورہ اشعار میں جن تہذیبی لہروں کا لہریا دکھائی دیتا ہے ذوق نے ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یعنی انہوں نے اسلامی ہندی روایت کو اپنے قصائد میں جگہ دی۔ تاہم فارسی کی جانب زیادہ جھکاؤ کی وجہ سے ان کے قصائد پر عجمی اسلامی روایات کا زیادہ غلبہ ہے۔

ذوق اپنے قصائد کو شعریت سے ہمکنار کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ ان میں علمیت کا اظہار کچھ اس طور کرتے تھے کہ شاعرانہ کوائف اور جذبات کی آنچ برقرار رہتی تھی۔ ان قصائد کی تاثیر سے متاثر ہو کر غالب بھی اسی رنگ میں اشعار کہنے لگے تھے۔[2] ان کے قصائد خیال کی متانت، بیان کی برجستگی، الفاظ کی شائستگی اور بندش کی چستگی میں بے مثل ہیں۔ انہیں زبان و محاورے کے استعمال سے بھی خصوصی شغف تھا۔ ان کا ہر قصیدہ ایک نوع کی علمی فضا رکھتا ہے۔ ذوق تقلید کو معیوب نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے جذبات، تجربات اور مشاہدات کو کلاسیکی رچاؤ بخشا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں عمدہ قصائد کہنا، لفظی صنعت گری اور معنوی لوازمات کا آرائشی اظہار کہ جس میں زبان کا لطف بھی برقرار رہے ذوق کو مرغوب تھا۔ انہوں نے مشکل زمینوں میں کامیاب قصائد تیار کیے مثلاً ہیں دو آئینہ دل کے تماشا گوہر / ع مانع سیر گلستاں ہیں قفس کی تیلیاں / ع ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق / ع ہے وہ لے دار دو حباب نافع اعضاد حواس / ایک خورشید لقا نو جوان ارشق / ع اس قد کو کیوں کہ کہیے نہال چمن کی شاخ / طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ / آیا ہے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں / وہ ابر در فشاں ہے چمن میں کمال کے / سحر جو گھر میں یہ شغل آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں[3] / ع گردش میں چشم مست کی ہو دل مرا اگر[4] / صبح سعادت نور ارادت نمن بہ ریاضت دل بہ تمنا /[5]

---

[1] انہوں نے ایک بزرگ عاشق نہال چشتی کی مدح میں بھی قصیدہ لکھا اس لحاظ سے نیم مذہبی قصیدہ کہا جا سکتا ہے
[2] نئے اور پرانے چراغ از آل احمد سرور ص ۱۴۲
[3] تا [5] قصائد بہ روایت آزاد دیوان ذوق جلد دوم

ذوق نے اپنے زورِ بیاں کے وسیلے سے محدود ردیف اور قوافی میں لامحدود موضوعات و خیالات سمیٹنے کی سعی کی۔ انہوں نے مضامین کے بلند گھوڑے کو قابو کر رکھا تھا۔ "خوشتر آسماں" اور "چکر آسماں" کے قوافی و ردیف والا قصیدہ فلک کی مدح میں ہے۔ عموماً شعرا فلک کو معتوب ٹھہراتے تھے۔ ذوق نے تصورِ آسماں کو عیش و طرب کے مضامین کے بیان کے لیے استعمال کیا۔ ذوق نے ایک قصیدہ ہفتاد و زبان میں لکھا اور خاقانیِ ہند کا خطاب پایا۔ ایک قصیدے میں وہ خود لکھتے ہیں ؎

مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوق + تو ہے خاقانیِ ہند اور وہ خاقانِ زماں

ذوق نے مطالع کا چابکدستانہ استعمال کیا۔ سنگلاخ زمینوں میں عمدہ مطلع نکالنا عام شاعروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کے مطالع قاری یا سامع کو جذباتی اور فکری طور پر جکڑ لیتے تھے

در مدح بہادر شاہ ظفر قصیدہ عید ؎

لوٹتا پھرتا ہے رنگ لیے چرخِ حبل + واہ کیا گڑا ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے نیل

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت + نشۂ علم میں سرمست و غرور و نخوت

شاہا ترے حضور میں خواہانِ صد شرف + گر عید یک طرف ہے تو نوروز یک طرف

بہادر شاہ ظفر جشنِ سالگرہ

حبذا ساقیِ فرخ رخ و خورشید جمال + مرحبا مطربِ ناہید فن و زہرہ خصال

ایضاً برائے جشنِ عید

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی + برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

ذوق منفردانہ انداز سے تخلیقِ تشبیب کرتے تھے۔ ان کے ہاں یہ جزو بوقلمونی کا حامل ہے۔ فنِ تشبیب نگاری میں وہ فارسی اور عرب کے معیاری قصیدہ نگاروں سے کمتر درجے کے نہیں ہیں۔ انہوں نے اس فن کو سطحِ کمال تک پہنچایا۔ اس ضمن میں ان کی لیاقت اور صناعانہ مہارت کا گرویدہ ہونا پڑتا ہے۔ ذوق نے بہاریہ تشابیب کا خصوصی استعمال کیا ہے۔ لیکن ہر بہاریہ تشبیب یکتا اور منفرد نظر آتی ہے۔ حکمت، علوم، نجوم و ہیئت کے موضوعات بھی انہیں پسند تھے۔ انہوں نے متغزلانہ تشابیب سے بھی کام لیا۔ ایک بہاریہ تشبیب میں انہوں نے علمِ طب کی اصطلاحات کے وسیلے سے اظہارِ خیال کیا۔ سوال و جواب کے انداز میں تشبیب لکھنا بھی انہیں پسند تھا انہوں نے جلوسِ تخت نشینی، شاہزادوں کی شادی، نوروز، عیدین اور بادشاہ کے غسلِ صحت کے حوالے سے جو قصائد لکھے ان کی تشابیب میں موضوعاتی مناسبت قائم رکھی۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں انہوں نے بہاریہ اور رندانہ مضامین کی آمیزش سے کیف و اثر پیدا کیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہے عکس فگن جامِ بلوریں پہ مئے سرخ + کس رنگ سے ہیں ہاتھ مے کش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشے میں + ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی

ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں + چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

یہ ذہن کو ہے عالمِ مستی میں روشنی + ہر خشتِ خم ہے حکمتِ اشراق کی کتاب

کبھی میں کرتا تھا تصریحِ معانی و بیاں + کبھی میں کرتا تھا توضیحِ نجوم و ہیئت

حیراں ہوں دیکھ خال کو ابروئے یار پر + گل نیلوفر کا لائی ہے کیونکر ہرن کی شاخ

؎ بل بے بالیدگی عیش کہ برگ گل پر + قطرہ شبنم کا ہے مینائے شراب گل رنگ
واہ کیا گلشن آفاق میں ہے جوش بہار + چہچہے کرنے لگے بلبل تصویر فرنگ
کلک نقاشی قدرت سے گلستاں میں ہے آج + تختۂ لالہ و گل صفحۂ نقش ارژنگ

ذوق کی تشابیب میں مبالغہ آرائی بھی ہے اور تخیل کا پیچیدگی پیدا کرنے والا انداز بھی - لیکن ان کی محاکاتی تفاصیل نے ان کی تشابیب کو بوجھل نہیں ہونے دیا - الفاظ کے در وبست اور انداز بیان سے ذوق نے پر تاثیر اشعار تخلیق کیے ۔ ذوق کو منطق، طب، نجوم، موسیقی، رمل، جفر، حکمت، مذہب، نحو، طبیعات، جغرافیہ، ریاضی، وغیرہ سے خاصا مس تھا۔ اس کے علاوہ باغبانی، اسپ پروری، فیلبانی، سنگ تراشی، مصوری، رقص، آتش بازی، نشانہ بازی، خوش نویسی، جواہرشناسی، و تعویذات، تاریخ، کلام، تعبیرِ لغت، مذہب اور نباتات وغیرہ کے علوم و فنون سے بھی گہری دلچسپی تھی (ان حوالوں سے استعمال ہونے والی اصطلاحات کا ایک اجمالی جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔ ذوق کو طبعی طور پر حکیمانہ اور ناصحانہ خیالات و احساسات سے دلچسپی تھی - انہوں نے تشابیب میں اخلاقی حقائق بھی قلمبند کی ہیں ؎ پیش دشمن نہ گزر حق سے نہیں سانچ کو آنچ + بلکہ ہے آتش نمرود گلستان خلیل
دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری + جس کا اجمال قضا اور قدر سے تفصیل

گرہ ردیف والے قصیدے کی تشبیب میں ذوق نے ذاتی احوال کو بھی پیش کیا ہے - اس میں ان پر گزرنے والے صدمات کا بیان بھی ہے - ایک جگہ قلم کی تعریف کی ہے اور فخریہ لہجہ اختیار کیا ہے -

؎ ہوں وہ گرفتہ دل کہ مژہ پر ہجوم اشک + ہوتا ہے شکل خوشۂ انگور آگرہ
قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہو وے نکتہ نگار + تو اپنے نقش مٹا دیں جہاں کے جادو کار
سخنوروں نے جو باندھے سخن کے ہیں نیرنگ + زباں سے اس کی ہیں وابستہ ان کے سب اسرار

ذوق اپنی تشابیب کو قصیدے کے دیگر اجزا سے خوش اسلوبی سے پیوند کرتے ہیں - تعداد کے لحاظ سے بھی تشابیب کے اشعار مدح سے نہیں بڑھنے پاتے - ذوق نے تشابیب میں ندرت خیال، ایجاد معانی، اختراع ذہنی سے خاصا کام لیا ہے علاوہ ازیں بہت سے مقامات پر شاعرانہ باریکیوں کے استعمال سے نادرہ کاری کی ہے - البتہ کہیں کہیں مضمون آفرینی کا بار گراں انہیں جذبہ و ندرت سے عاری ایسے علاقوں کی سیر دکھاتا ہے جہاں سوائے صنائع لفظی و معنوی کے اور کچھ موجود نہیں ہوتا -

ذوق گریز کرنے میں خاصے برجستہ تھے - جن قصائد کی تشابیب میں خوشی اور عیش و طرب تمثیل انداز میں پیش ہوئے ہیں یا معشوق کا سراپا بیان کیا گیا ہے وہاں انہوں نے مکالماتی انداز سے گریز کی ہے

؎ آ کے بالیں پہ وہ طناز سراپا انداز + مجھ سے یہ کہنے لگا کیوں ہے تو غمگیں ناحق
مژدۂ عید سے ہے گلشن عالم میں بہار + نغمۂ عیش سے ہے بزم جہاں میں رونق

ذوق نے بعض مکالماتی گریزیں نسبتاً طویل بھی کی ہیں - ان کے ہاں اختصار و جامعیت کی حامل گریز بھی ملتی ہے

؎ ذوق موقوف کر انداز غزل خوانی کو + ڈھونڈ اس بحر میں تو اب کوئی اچھا گوہر

اکبر شاہ ثانی کی شان میں تہنیت عید کے قصیدے میں ذوق یوں گریز کرتے ہیں

ہے جو ہر کوچہ میں آرائش نوبت خانہ + خالی آواز و ماعہ سے نہ ہو کوئی رواق

یوں جو آراستہ افلاک پہ ہو بزم طرب + گلشن عیش و طرب کیوں نہ ہو بزم آفاق

آج وہ روز ہمایوں ہے جسے کہتے ہیں عید + بذلہ سنجی میں شگفتہ ہے دل اہل مذاق

بزم خسرو میں چل اے بار بد بزم سخن + سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق

ذوق نے بعض جگہوں پر گریز میں قائم رہنے والی فنی نزاکت کو نظر انداز بھی کیا ہے اس لئے وہ کسی قدر غیر مربوط انداز سے مدح کی جانب آتے دکھائی دیتے ہیں

ذوق نے زیادہ تر قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھے ہیں "ان کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ حمید الدولہ مرزا مغل بیگ کی شان میں بھی ملتا ہے۔ یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب انہیں شاہی وزیر بنایا گیا (۱) یہ قصیدہ بعد میں ان کے دیوان میں شامل کر لیا گیا تھا (۲)۔ حصہ مدح میں ذوق نے فنی روائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس میں ان کا زور طبع عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ مدح کرتے ہوئے ذوق پر شکوہ الفاظ اور نادر تراکیب کا استعمال کچھ اس طور کرتے تھے کہ ایک طلسمی فضا بندی ہو جاتی تھی۔ اس جزو میں ان کی مبالغہ آرائی، تجنیس آفرینی اور خیال بندی کی عمدہ مثالیں مل جاتی ہیں۔ وہ ممدوح کے مراتب، شجاعت، عدالت اور خلق وغیرہ کے حوالے سے مدحیہ مضامین بیان کرتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے لئے سراج دین نبی، سایہ خدائے قدیر، خدیو مہر کلاہ، خسرو سپہر سریر، قوت ملت دین، قاطع کفر و الحاد، حامئی شرع نبی، ماحی شرک بدعت، خسرو جم حشم، داور کسری انصاف، سلطان سکندر اقبال، دارا حشمت وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ خدا کا سایہ ہے اور نائب رسول خدا + محمد اکبر عالم نواز و عرش وقار

اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر کو بھی انہوں نے بار ہا نائب رسول خدا کہا ہے۔ اس نوع کے الفاظ و خطابات اس دور میں جائز ہی نہیں ضروری بھی تھے کہ یہ دور مسلم سلطنت ہیر ا دبار کا دور تھا۔ اور مسلم عوام اور دربار ارکان وغیرہ کا حوصلہ بڑھانا بھی فریضہ شاعری تھا۔ ان خطابات کی معنویت منشر کہ ہندوستان کے ماحول میں زیادہ بہتر طور پر سمجھی جا سکتی ہے۔ بادشاہ کے لئے نوع کے الفاظ و تلمیحات کا استعمال عموماً تھا

وہ مسیحا دم، یوسف رخ و داؤد الحاں + وہ سلیماں وش و موسی کف و صالح اعمال

آسمان جاہ وعطارد رقم و مہر علم + مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جمال

ظل اللہ خسرو دین دار، دیں پناہ + شاہ بلند جاہ و خدیو فلک جناب

تیغ اس کی وہ ظفر دم نصرت اثر کہ ہے + گنج ہزار فتح کے مفتاح فتح باب

سودا کے دور تک رائج ہونے والے مدحیہ موضوعات میں ذوق نے اضافہ تو نہیں کیا۔ تاہم ان میں بادشاہ

---

(۱) ذوق سوانح و انتقاد از ڈاکٹر تنویر احمد علوی ص ۲۲ (۲) دیوان ذوق جلد دوم ص ۷

خصوصاً بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے مذہبی طرز احساس[1] کا رنگ تیز نظر آتا ہے۔ قصائد میں بادشاہ کے لئے بھی استعمال کیے گئے ہیں جو عجمی قصیدے کی روایت میں راسخ تھے۔ ذوق نے مبالغہ اور غلو کا استعمال بھی نسبتاً زیادہ کیا ہے۔ ممدوح کے ساز و سامان میں خدنگ، تیر تفنگ، شمشیر، تیغ اصفہانی، گھوڑے، ہاتھی اور مطبخ وغیرہ کی تعریف میں انہوں نے انداز بیان بدل بدل کر عمدہ اشعار کہے ہیں۔ اسپ اور ہاتھی کی وصف نگاری میں ذوق نے بسا اوقات طوالت سے کام لیا ہے۔ ان کی تعریف میں چند اشعار دیکھیے

سہ ہوا شب دیز فلک سیر یہ دولہا جو سوار + روز نے صدقے کیا اشہب و شبدیز ادہم

آسیا وار پھرے کیوں نہ فلک گرد زمیں + تیرے توسن کے جو کاوے کے اڑا جائے بھوت

[ہاتھی] اس کے دندان ہیں غور سے دیکھا میں نے + کشور زنگ میں آئے ہیں فرنگی بچگاں

کہ مثل کوہ کجک تیشہ، فیلباں فرہاد + وہ دونوں دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

ذوق نے دعائیہ حصوں میں بھی روایتی مضامین کا استعمال کیا ہے

سہ تو شہ بحر و بر اے شاہ سکندر فر ہو + دے خدا عمر خضر تجھ کو حیات الیاس

یہاں ہم ذوق کے قصائد میں استعمال ہوئے والے مختلف علوم و فنون کے الفاظ کی ایک اجمالی فہرست کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سے ان کے خیال، فکر اور جذبے کی وسعت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے اور اس دور سے متعلق علوم و فنون کے رائج لفظوں کا بھی!

[مذہبی اور تاریخی الفاظ و تلمیحات] حقیقت، طریقت، شریعت، قطمیر، اصحاب کہف، ہاتف، چاہ بابل، تیغ حیدری، اعجاز شق ماہ، مسجد اقصیٰ، صالح، موسیٰ، عیسیٰ، لقمان، جبرئیل، خضر، روکش یوسف، نگین دست سلیمان، ریش فرعون، ملکہ سبا، عزرائیل، عصائے موسیٰ، نار خلیل، الحان داؤد، ماہ نخشب، آیۃ الکرسی، آیۃ قدسی، سورۂ یٰسین، سورہ طٰہٰ، سعیر، برزخ، ثریا، براق، سدرۃ المنتہیٰ، تحت الثریٰ، طوبیٰ، باغ ارم، روضۂ رضواں، تنور طوفاں، جوگی، استدراج، نالۂ ناقوس، تناسخ، لات، حشر اجساد، ملاحدہ، وجودی، شہودی، انجیل، زبور، توریت، ژند پاژند، شاستر، بید، محراب عبادت، طاق مسجد، مناۃ، آن ایجاد، کوہ مروہ، کوہ صفا، حج، سجدہ، طواف، تخت فریدوں، مسند کسریٰ، نوشیرواں، ضحاک، حاتم، اساور کیلیوف، لشکر دارا، فوج سکندر، ازبک، قلماق، ضحاک، سد سکندری، قارون، ید بیضا، فغفور، خط چلیپا وغیرہ

[طب] ناخن، حکاک، لازغ، رخوہ، ثاقب، ثقیل، نبض، صحت، دارالشفا، مومیا، سودا، صفرا، بلغم، تریاک، جدوار، دوران سر، موتیا بند، ہو الشافی، جید الکیموس، اوراق طلا، مقوی، ماء الحیات، معجون، لاغر، اشتہا، ہچکی، پیچش، تبخیر، تپ لرزہ، زکام، رطوبت، خارش، فکر بحران، فکر الوان و قوام، نکیر، طباشیر، قیفال، فصد

---

① اللہ ری پاس داری اسلام و پاس شرع۔ ذوق

[نجوم و رمل وجفر] قوس، حوت، سنبلہ، جوزا، برجیس، زحل، گاؤ گردوں، عقرب، انکیس، جنتری، سرطان، ماہی، زہرہ، میزان، قوس، تیر، حمل، قران السعدین، خانہ کعبہ، شکل داخل، شکل خارج، ثریا، سہا، اختر دنبالہ دار، رجعت مریخ و زحل، قاضی چرخ، دہقان فلک، دبیر فلک، سبعہ سیارہ، اصطرلاب، عطارد، تقویم، کیواں، ناہید، عقد ثریا، ماہی گردوں، رقاص فلک، سعد اکبر، نسر طائر،

[منطق، فلسفہ و حکمت] کلیات خمسہ، جنس، فصل، نوع، خاصہ، عرض، عام، ایساغوجی، علت مادی، علت فاعلی، علت غائی۔ ارسطو، افلاطون، دانش یونان، جزو لایتجزیٰ، عقول عشرہ، ہیولیٰ، صغریٰ، کبریٰ، حادث، علم، تصور، تصدیق، نظر، صور علمیہ، بدیہی، قدیم، جوہر، علت و معلول، مشائی، اشراقی، نفی حقائق، سوفسطائی، رد رویت، معتزلہ، جبری، مجبوری، قدری، مختاری، معدوم، موہوم، نیستی، عقدہ، بدیہہ الانتاج، تہذیب اور سلم، اقلیدس کی مجسطی، بو علی سینا کی قانون، مکرفرنگ،

[جغرافیہ] خط محور، قطبین، کرۂ عالی، کرہ ہوائی، طبقۂ زمہریر، بارش، بادل، بخارات، قلزم، عمان، قبچاق، کشور ہرمان، کوہ البرز، قطب نما، فروردی، ابار، آب، ایلول، اور نیل

[پرندے، جانور، پھول، پھل، دیگر اشیا] نہنگ، خرچنگ، شبر، آہو، زاغ، لقلق، کبوتر، زغن، شاہین، چیل، ماکیاں، شہباز، طاؤس، ہما، سیمرغ، ابابیل، بط، عقاب، قمری، عنادل، صلصل، اژدر، افعی، پلنگ، نہنگ، لالہ، نسرین، سمن، گل، چنبیلی، سوسن، عشق پیچاں، گلبرگ، نیلوفر، سورج مکھی، نرگس، انگور، شمشاد، سنبل، کشتی، لنگر، موتی، غواص، بحر، سیپی، چتر، قلیان، مندیل، قبا، گوہر، شب چراغ، خلعت، ساغر، پیالہ، صراحی، جام، شطرنج، قفل ابجد، تیغ اصفہانی، فلاخن، چار آئینہ، طغرائے رخ، خط و رخسار

[گھوڑا اور چند متعلقات] دلکی، سرپٹ، اڑان، مینڈھا پویہ، ہیبہ، کاوا، شاہ گام، رخش، توسن، شبدیز، اشہب، ادہم، نقرہ، خنگ، سمند، گلگوں، ابلق، عناں، رکاب،

[ہاتھی اور چند متعلقات] گجباگ، فیل، آنکس، عماری، ہودج، مستک، دانت، مہاوت، خرطوم، زنجیر، نیشکر، گجک، فیل بان،

[شاعری اور اس کے متعلقات] ایراد معانی، سحر بدیع، تحسین الکلام، مستقبل، مضارع، اوزان، بحور، ردیف، قافیہ، معمہ، نغز، جریر، زلالی، معزی، اعشیٰ (سحبان، لیلیٰ، سلمیٰ، شیریں، عذرا، قیس، گاؤ زمیں، عنقا) [بحوالہ تلمیحات]

[سیمیا گری] روغن کبریت، پارس، مہوس

[سنگ سازی] سنگ رخام، سنگ تعویذ، یاقوت یمن، کاہ ربا، سنگ سماق، سنگ جراحت، باروت، جر ثقیل، سنگ یدہ،

[شادی بیاہ] حنابندی، ساچق، چڑھاوا، عطر سہاگ، سہاگ گانا، نوشہ، سہرہ، رقعہ شادی، رخصتی،

[آتش بازی] : گھن چکر، شورا، پنج شاخہ، نخل گل، آتش بازی، فلیتہ، ہوائی، انار وغیرہ
[موسیقی] مدہم، پنچم، کھرج، گندھار، دھیوت، نکھاد (نغمہ ہندی کا ہو گے سات سر سے انتظام
جلاجل، دائرہ، طنبور، جلترنگ، بربط، دمامہ، نقارہ، قانون، نفیری، شہنا، زمزمہ، نے، شہنائی، زیروبم
نغمہ، بوق، نوبت، کوس، مزامیر، گھنگرو، بارہ مقام، چاروں وقت، راگنی، للت اور بسم وغیرہ
علاوہ ازیں نحو، ہیئت، علم الہی، کیمیا، علم طبعی، علم الکلام، علم ہندسہ، منقولات و معقولات، فقہ،
تعبیر، قرأت، قیافہ، اخبار، تاریخ اور کتابت وغیرہ کی متعدد اصطلاحیں اور الفاظ بھی ذوق کے قصائد
کی زینت بنے ہیں۔ ذوق کے قصائد میں صنعت جمع (۱)، صنعت مشاکلہ (۲)، صنعت اشتقاق (۳) و شبہ اشتقاق (۴)
صنعت تنسیق الصفات (۵)، صنعت تجاہل عارف (۶)، صنعت تاکید المدح بما یشبہ الذم (۷)، صنعت تجرید (۸)، صنعت تجنیس تام (مماثل) (۹)
صنعت تجنیس تام مستوفی (۱۰)، صنعت تلمیح (۱۱) اور صنعت مراعاۃ النظیر (۱۲) وغیرہ کا عمدہ استعمال ہے، معنوی صنائع میں انہوں
نے حسن تعلیل (۱۳) سے خاصا کام لیا ہے۔

صنف قصیدہ کے حوالے سے ذوق کی قادر الکلامی اور فضیلت شک و شبہ سے بالا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے
کہ وہ سودا کے مقام اور مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے۔ ان کے ہاں مضامین کا تنوع تو ہے لیکن جو سماجی، سیاسی، معاشی
اور تہذیبی حوالوں کی وسعتیں سودا کے قصائد میں ہیں ذوق ان سے محروم رہے ہیں۔ سودا کے ہاں ذوق کی نسبت
بے تکلفی اور آمد کا احساس زیادہ ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کا کہنا ہے "ذوق نے بھی قصائد نہایت کاوش و اہتمام
سے لکھے۔ ہر قصیدے کا رنگ جدا ہے۔ تنوع میں سودا کی پیروی کرتے ہیں لیکن وہ جوش وہ گرمی اور وہ اصلیت
میسر نہیں۔ سودا کا تخیل مثل ایک سیل بے پناہ کے رواں دواں ہے جسے روکنا مشکل ہے۔ ذوق کا تخیل بھی
رواں ہے مگر اس کی رفتار میں کچھ رکاوٹ سی معلوم ہوتی ہے" (۱۴)۔ ذوق کے ہاں ترنم، روانی، بلند آہنگی، شکوہ الفاظ
اور خوش نما تراکیب کا خاصا عمل دخل ہے۔ ان کی تشبیب کے عالمانہ رنگ پر نئی نئی تشبیہیں اور نادر استعارے سونے پر
سہاگہ ہیں۔ ذوق نے پیکر تراشی اور سراپا نگاری میں سلجھا ہوا انداز اختیار کیا ہے۔ سودا اور انشا کے ہاں ان
حوالوں سے متانت اور استادانہ وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوق کی تشبیبیں
اور عشقیہ مضامین سے مناسبت طبعی نہ تھی۔ وہ شاعری میں اخلاقی نظریات اور حکیمانہ خیالات کو زیادہ اہمیت دیتے
تھے۔ البتہ ایک آدھ جگہ پر انہوں نے بھی کھل کھیلا ہے ۔ ہر سبو چہ پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ + اپنے ابھرے ہوئے پستاں پہ چڑھائے محرم

---

(۱) مقصود و حاسد و عماز و عدو ہے سرکش + زیر شمشیر غضب تیرے ہیں چاروں چو رنگ (۲) جا ہے گردش ہے تیرے شکوہ خسروی کا + زیبا ہے ماہ نو کو گر فرمان بہتری ہو
(۳) دیا اس نے وہ قلب مصفا تجھ کو + اے شہنشاہ صفا دین سراپا صفوت (۵) طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ + دیکھ کر لگا جسے ریخ ہزاروں فرسنگ
(۵) وہ نکو روئے و نکو خوئے خجستہ منظر + وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال (۶) ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق + پرتو ہے کس خورشید کا نور سحر رنگ شفق
(۷) اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظے میں تو یہ + نہ اپنا یاد ہے احسان نہ اور کی تقصیر (۸) ماہ نو چشم زدن میں مہ کامل ہو جائے + نظر مہر میں تیرے ہے وہ نور تکمیل
(۹) اثر نغمہ شمشیر میں سے جہاں بھول گیا + کہ سوا آگ کی سم کے ہے کوئی اور بھی سم (۱۰) ہے ابر درفشاں وہ چمن میں کمال کے + عاشق نہال کیوں نہ ہوں عاشق نہال کے
(۱۱) تو ہے اس طرح سے عزت دہ اولاد تیمور + جیسے موسیٰ شرف افزائے بنی اسرائیل (۱۲) دریائے قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا + بہہ جائے مثل کشتی بے لنگر آسماں
(۱۳) ذکر حق سے کوئی خالی نہیں تیرا ہے وہ دور + کہ تہ خانے میں ہے شیشہ کے بھی حق حق (۱۴) اردو شاعری پر ایک نظر ص ۹۸، ۹۹

ذوق کے قصائد صناعانہ صورت گری، پیکر تراشی اور خیال کی دقت پسندی کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہیں

بے علف ناقۂ لیلیٰ ہے مگر قیس غریب + ہیں دیتا بہ ضیافت سر خارِ مژگاں
واہ کیا گلشنِ آفاق میں ہے جوشِ بہار + چہچہے کرنے لگی بلبلِ تصویرِ فرنگ
شاخِ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا + زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

یہ حقیقت ہے کہ اردو قصیدہ کی تاریخ میں سودا کے بعد ذوق ہی ایسے قصیدہ نگار ہیں جن کا مدِ مقابل اور کوئی نہیں ہے۔ ذوق کے معاصرین میں غالب نے عمدہ قصائد لکھے ہیں۔ غالب کے بیشتر قصائد چھوٹی بحروں میں ہیں اور انہوں نے زیادہ تر آسان، سلیس اور غیر پیچیدہ انداز اختیار کیا ہے۔ ذوق دقت پسندی کے قائل تھے انہوں نے اپنے قصائد میں شکوہ پیدا کرنے کے لئے تکمیبِ گو تجدار اور طنطنہ خیز الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ غالب کے قصائد میں نئے تجربات و اجتہادات کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کی وسعتِ نظر اور فکری پھیلاؤ نے ان کے قصائد کو نیا انداز و لہجہ عطا کیا۔ ذوق کا تقابلی مطالعہ ان کی روایت پسندی کی بنا پر سودا ہی سے ہو سکتا ہے سودا اور ذوق کے قصائد میں موضوعاتی مماثلت اور یکسانیت بھی نظر آتی ہے۔ سودا ہی کی طرح ذوق نے بھی فارسی شعرا کی زمینیں استعمال کی ہیں۔ انہوں نے خاقانی کی زمینوں میں دو اور انوری کی زمینوں میں چار قصیدے لکھے ہیں[1] سودا نے بھی بعض فارسی شعرا کی زمینیں اپنے اظہار کے لئے منتخب کیں۔ جیسے کہا جا چکا ہے تنوع کے اعتبار سے ذوق سودا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تخیل بھی سودا کا بلند ہے۔ البتہ قصیدے کے فنی لوازم سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دونوں شعرا نے خوب جگر کاوی کی ہے۔ امداد امام اثر نے لکھا ہے "سودا ایک شاعر تھے ان کی فطرت نگاری کی ہوا بھی ذوق کو نہیں لگی تھی"[2] ڈاکٹر سلام سندیلوی کا خیال ہے کہ ذوق نے معاشی مجبوریوں کے حوالے سے قصیدے لکھے اس لئے ان کے ہاں جدت اور ندرت کم پائی جاتی ہے[3]۔ یہ بیان خاصا تیز ہے۔ ذوق کی قادر الکلامی چیلنج نہیں ہو سکتی وہ فارسی، عربی اور اردو شاعری کی روایات سے کما حقہٗ آگاہ تھے۔ انہوں نے فارسی اور عربی قصیدہ نگاروں کے نام بھی اپنے قصائد میں استعمال کیے ہیں لیلیٰ اور قیس کے حوالے سے بیان ہونے والے ان کے مضامین پر عربی اثرات واضح ہیں لیلیٰ کے سیہ خیمہ کا تذکرہ اور قیس کی صحرا نوردی کا بیان ہمارے مذکورہ دعوے کا ثبوت ہے۔ مزید برآں ذوق کے اشعار میں جریر اور اعشا کا ذکر بھی ہمارے دعوے کی تائید ہے۔ ذوق نے سودا کے مقابلے میں تشبیہات کی تراش خراش اور زبان کی صفائی کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ انہوں نے جزئیات کے بیان میں بھی ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر سے ان کا قلبی تعلق تھا اس لئے ان کے قصائد میں عقیدت و احترام کی لہر کے ساتھ ساتھ خلوص و محبت کا پاکیزہ جذبہ بھی نظر آتا ہے[4]۔ ذوق نے محدود دائرے کے اندر رہ کر اختراعات کی کوشش کی ان کے قصائد میں تمثیلی اور ڈرامائی انداز (کہیں کہیں) بھی نظر آتا ہے وہ معانی آفرینی پر زور دیتے تھے

---

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے ذوق سوانح اور انتقاد ص ۲۷۲ (۲) کاشف الحقائق جلد دوم ص ۲۵۸۔ ۲۵۹
(۳) ادبی اشارے ص ۸۱ از ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی (۴) ذوق کی قصیدہ نگاری مضمون قومی زبان جنوری ۱۹۶۷ از احمر رفاعی

امان علی سحر

امان علی سحر [م ۱۸۵۹] کا تعلق لکھنؤ سے تھا ابتدا میں شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہوئے بعد ازاں برق کی شاگردی اختیار کی[1] جلال الدین زبینی نے ان کی خوش گوئی اور سلاست پسندی کو سراہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ تلازمات و رعایات کا استعمال ساحر شعرا ہی کی مانند کرتے تھے[2] سحر کا دیوان ریاض سحر کے نام سے چھپا تھا اس میں ان کے قصائد موجود ہیں[3] اس میں ان کے دو مشہور شہر آشوبیہ قصائد بھی شامل ہیں۔ ایک کا تعلق ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ کی حالت زار سے ہے اور دوسرے میں اپنے ارد گرد کے سماجی و معاشی حالات کی ابتری کا جائزہ ہے ان کے مطالع یہ ہیں

گردش چرخ سے ابتر ہے زمانے کا حال + ذرۂ خاک ہے پستی سے نجوم اقبال

سحر کے ممدوحین میں واجد علی شاہ، نواب محمد احسن خاں اور لکھنؤ کے بعض امرا شامل ہیں۔ سحر کا کلام بے جا مبالغہ سے پاک ہے۔ مزید براں انہوں نے جس اسلوب میں قصائد لکھے وہ آنے والے دور کی نظمیہ فضا سے مربوط ہیں ان کے ایک مطلع کو لو محسن کاکوروی کے مشہور مطلع کا نقش اول کہا جا سکتا ہے[4] یہ بہاریہ قصیدہ اور اسکا مطلع ہے

اے سبو احباب کے بنارس سے اڑا لا بادل + چاہیے متھرا و سوکن کے لئے گنگا جل

واجد علی شاہ کی شان میں ان کے ایک قصیدے کا یہ مطلع ملاحظہ ہو

رند و بہار آگئی بیتا ہوئی خزاں + جمنا بھی جامنوں کی سڑک پر ہوئی رواں

ایک اور قصیدہ کا وہ یوں آغاز کرتے ہیں بولیں لوڈ برانڈی کی مناییں ساون + آج کل باغ پہ عالم ہے گھٹا پر جوبن

امان علی سحر وصف و منظر نگاری میں ماہر تھے۔ ماحول کی تصویر کشی میں ان کا قلم رواں تھا۔ لکھنؤ کے عروج و زوال کی اشاراتی کہانی ان کے قصائد کی زیریں لہروں میں موجود رہی ہے۔ علاوہ ازیں جہاں انہوں نے خارجی سطح پر اس ریاست کے ماحول کو لفظوں میں منتقل کیا ہے اسکی تاریخی اہمیت ہے۔ انہوں نے مقامی ماحول کو خوش اسلوبی سے قصائد کا لبادہ دیا ہے۔ لکھنؤ کے بارے میں کہتے ہیں

عجیب مجمع اہل کمال تھا افسوس + ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا

نہ چوک کا کہیں جلسہ نہ تیجے کی صحبت + جہاں میں شادی و غم دونوں کا فسانہ رہا

نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وہ دریاں نہ گجر + نہ توپ چلتی ہے اب ہے غضب کا سناٹا

سحر لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ جیسے مسیحا کا فراق موت سے بدتر ہے۔ اس کے مصاحبوں میں لکھنؤ کے چیدہ چیدہ لوگ تھے۔ کوئی شہرۂ آفاق تھا اور کوئی شاعر غرا کسی پر ابو الفضل، فیضی اور عرفی کو رشک تھا۔ یہ لوگ اکبر کے نورتنوں سے زیادہ قابل تھے آج صاحب جوہر کی یہ قدر ہے کہ ٹکے ٹکے پر اصفہانیاں بک رہی ہیں۔ سینکڑوں مکان سرکار نے مسمار کر دیے، اس شہر کو پرستان کہتے تھے اور یہ راجا اندر کے اکھاڑے کی مانند تھا۔ اب نہ عید کی خوشی رہی ہے یہ شہر ویران ہو گیا ہے۔ وہ تمنا کرتے ہیں کہ ڈنکے کی صدا پھر سے سنیں اور پر کو چے میں پھر سے میلہ لگ جائے اس تہذیب کے

---

(۱) تاریخ قصائد اردو ص ۴۴۴ (۲) ایضاً (۳) ریاض سحر امان علی سحر مطبع کارنامہ لکھنؤ ۱۸۷
(۴) سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل قصائد ص ۱۵۲ تا ۱۶۹

کے بعد انہوں نے منور الدولہ کی مدح کی ہے اور یوں گریز کی ہے

؎ سحر وہ شعر پڑھ کے دل دکھا دیا تو نے + اب آگے سننے کی طاقت نہیں برائے خدا
کوئی قصیدہ رنگیں پڑھو کہ جی بہلے + وہ مدح دو اسے جس کا ہو مرتبہ اعلا

اس گریز کے بعد پھر بہاریہ تشبیب کے اشعار لکھے ہیں اور مدح کے اشعار میں لکھا ہے

؎ وہ کون ہے کہ جناب منور الدولہ + وزیر ایسا نہ آگے ہوا نہ اب ہو گا
امیر و ابن امیر و وزیر و ابن وزیر + محب شیعہ و زوار سید الشہدا

پھر اس کی صفائے باطن، غریب پروری، عدل گستری، خیر و عنایات، فروتنی، تواضع، انکسار، عجز کا بیان کیا اور یوں دعا دی ہے

؎ سوار اسپ مضامیں جو ہے ثنا ممدوح + الٰہی اس پہ ہو سایہ سوار دلدل کا

سحر نے ایک اور قصیدہ شہر آشوب میں اپنے معاصر امرا کی بخیلیوں اور کج رویوں پر چوٹیں کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک رئیس کے گھر اپنا قصیدہ لے کر گیا جب ڈیوڑھی سے آگے بڑھنے کا خیال کیا تو چوبداروں نے میری صورت دیکھ کر کہا کہ آپ دوشالہ اور رومال اپنے گھر میں رکھ کر آتے یہ رئیس بڑا موذی ہے چنڈال ہے اس سے تو مردوں کے کفن تک نہیں بچتے۔ شاعر نے ان باتوں کی پرواہ کیے بغیر رئیس کے حضور قصیدہ پڑھا تو وہ کہتے ہیں

؎ جانے کی شرم میں میں نے وہ قصیدہ تو پڑھا + کیا کہوں میں کہ جو کچھ مجھ کو ہوا رنج و ملال
سن چکے سارا قصیدہ تو یہ ارشاد کیا + آپ نے خوب کیا حضرت حر کا احوال

اس قصیدے میں امان علی سحر نے بتایا ہے کہ اہل قلم عطارد کی طرح چکر میں ہیں اور اہل کمال صورت بدر ہیں۔ جہاں میں خوشی اور گانا عنقا ہے اور طوائفوں کا ناچنا صورت زہرہ محال ہے۔ شہر میں نیستی کنگلوں کی طرح پھیلی ہے اور لوگ دست سوال دراز کرتے ہیں۔ روپے کی صورت نظر نہیں آرہی لوگ بھول گئے ہیں کہ وہ سبز تھا یا لال۔ اور

؎ کوئی مرتا ہے جوان میں سے تو خوش ہوتے ہیں + نعش پر کہتے ہیں ہنس ہنس کے تمام اہل و عیال
آمد و رفت نفس بند ہے دیکھو دیکھو + ہے یہ ادنا سا دل تنگ کی تنگی کا حال
رات دن جوتے اچھلتے ہیں عجب صحبت ہے + دھول دھپے کے سوا اور نہیں کوئی خیال
تھما تھمی سے رہا کرتی ہے صحبت ہر دم + رذلے نچلے تو مصاحب ہیں کہاں اہل کمال

امان علی سحر نے اپنے ارد گرد کے تہذیبی، سماجی، معاشی اور اخلاقی ماحول کی عمدہ عکاسی کی ہے اور شکوہ الفاظ سے زیادہ تمثال نگاری پر توجہ دی ہے اور سادگی و پرکاری میں اپنا لوہا منوایا ہے

؎ کس قدر گلزار یوں ہیں جمع ہیں گلہائے رنگ + یہ بڑے دن کے سے ہوتی ہے شاید کونسل
ہائے کیا ابر ہے کیا باغ ہے کیا سبزہ ہے + بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سن سن
پانی پتوں سے ٹپکتا ہے شرابور ہیں پیڑ + دھوئی دھوئی روشیں صاف ہیں جیسے چندن
سارے کمروں میں چلی آتی ہے مینہ کی بوچھاڑ + بھیگنے سے نہیں باقی کوئی پردہ چلمن
سنتے ہیں موتی جھیل میں پانی بھی آ گیا + تیراکیاں بھی ہونے لگیں بہر امتحاں

رائے گلاب چند

رائے گلاب چند ہمدم [۱۸۶۲ء / ۱۸۶۳] کا تعلق حیدرآباد سے تھا وہ نواب شمس الامرا کی سرکار میں پیشکاری کے منصب پر فائز تھے[۱]۔ ان کے دیوان مطبوعہ میں ایک قطعہ وفات سے معلوم ہوتا ہے کہ احسن الدین خاں بیان ان کے استاد تھے[۲]۔ ہمدم کے ایک معاصر آفاق نے لکھا ہے کہ ان کا سخن لطف سے خالی نہیں ہے اور صفائی میں درعدتی سے بہتر ہے[۳]۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی، نواب ارسطو جاہ اور راجہ چندو لال شاداں کا زمانہ دیکھا تھا[۴]۔ ان کے دیوان میں شمس الامرا ابوالخیر خاں، آصف جاہ ثانی، راجہ چندو لال اور خواجہ احسن الدین بیان کی شان میں قصائد موجود ہیں ان کے مطالع ملاحظہ ہوں۔ یہ برجستہ بھی ہیں اور موثر بھی، ایک آدھ انشائی رنگ بھی ہے۔

مدح آصف جاہ ثانی سے — کرے ہے ابر گہر بار گہر افشانی + تمام خلق پہ جاری ہے فیض سبحانی

مدح شمس الامرا سے — نہیں ہے ایک طرح پر زمانہ نیرنگ + جو دم میں کچھ ہے تو دم میں کچھ اور ہی ہے رنگ

مدح مہاراجہ چندو لال سے — کیا ہے راون بھی تو ہے وہ بلونت + رہے زمان میں تیرے ہنومنت

مدح خواجہ احسن الدین بیان سے — خواب سے یکبار جو میں آنکھ کھل گئی صبح کو + یہ خیال آیا کہ لکھوں اک قصیدہ آج تو

ان قصائد میں مدح و گریز اور تشبیب وغیرہ کا انداز روایتی ہے کہیں ممدوح کی ذات منور کو شبیہ نورانی کہا گیا ہے کہیں اسے جم اقتدار، سکندر حشم، سلیمان فر، زیب مسند اورنگ ٹھہرایا ہے کہیں اس کی ہمت، عدل اور بہادری کا تذکرہ ہے اسی طرح خنجر، تلوار، اسپ اور ہاتھی کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں

سے

عجب ہے ذات منور شبیہ نورانی + کہ اس قدر نہیں خورشید میں درخشانی

جم اقتدار، سکندر حشم، سلیماں فر، نظام سلطنت و زیب مسند و اورنگ

اے مہاراجا مہاراجا + سب ڈریں تجھ سے سور اور سماونت

شگاف ہو کے جگر کٹ پڑے زبان قلم + لکھوں جو خنجر براں کی تیرے برّانی

نہ پہنچے گرد کو گلگوں کے تیرے باد صبا + نہ اس قدر کوئی طائر میں ہوگی پرّانی

ہے اس کی مشک خوش رنگ خوشنما اتنی + کہ وقت شام کبھو زیبندہ جوں شفق کا رنگ

رائے گلاب چند ہمدم نے احسن الدین خاں بیان کی شان میں بھی قصیدہ لکھا ہے تاہم اس میں بیان کے خصوصی تخلیقی رنگ کی تعریف نہیں ہے صرف شاعر کی عمومی خوبیوں کا تذکرہ ہے۔ بیان کو انہوں نے شعر کو فخر دینے والا کہا ہے۔ دیوان ہمدم کا وہ قصیدہ اہم ہے جس میں انہوں نے ہندی الفاظ، روایات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ یہ چندو لال کی مدح میں ہے۔ اس میں بلونت، ہنومنت، انت، پرلے، گرنت، دنت، سماونت، مہنت، سنت، بھگونت، بچنت، اڑنت، لبنت کے قوافی جہاں اس قصیدے کے ہندی مزاج کے عکاس ہیں وہاں اس میں بیان ہونے والے امور ہندی ثقافت کے بعض پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں۔ اسمیں انہوں نے لبنت کا ذکر بھی کیا ہے

---

(۱) دکن میں اردو ص ۵۳۴
(۲) دیوان ہمدم مطبوعہ ۱۲۸۵ھ یہ قطعہ درج ہے ؎
ماہ صفر بچہارم ازدہر چوں بیاں رفت + صد نالہ از تہ دل تا اوج آسماں رفت
تاریخ رحلت او ہمدم چو جستم از دل + نالید و گفت ہاتف استاد از جہاں رفت
(۳) مخطوطات انجمن ترقی اردو ص ۱۶۱ بسعادت چھوٹے لال
(۴) مضمون رائے گلاب چند ہمدم حیدرآبادی از سخاوت مرزا صفحہ ۱۹۶۸ جلد اول

غلام محمد خبیر

غلام محمد خاں خبیر (حیات در ۱۸۶۳ء/۱۸۶۲) کا تعلق فرخ آباد سے تھا۔ میر علی اوسط رشک ان کے استاد تھے[1] ان کا تعلق مہاراجہ کلب علی خاں والئ رامپور سے بھی رہا۔ انہوں نے نواب آصف جاہ نظام الملک افضل الدولہ کی مدح میں بھی قصائد لکھے ہیں اور نعت اور حمد بھی۔ انہوں نے خریطۂ سرور کے نام سے نوطرز مرصع کی کہانیوں کو منظوم بھی کیا[2] اور عروض پر بھی ان کے رسائل ہیں (رسالہ عروض، قسطاس المستقیم) ہیں[3] رسالہ عمل الامتحان در خواص مقناطیس اور مثنوی ملعبتیں بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں[4] خبیر کا کلیات سالار جنگ میوزیم کا مخزونہ ہے جس میں ان کے قصائد ملتے ہیں۔ ان کے دیوان کا ایک نسخہ قومی عجائب گھر کراچی کی ملکیت ہے[5] اس میں ان کا ایک عقیدہ ہے جس کے ممدوح کا علم نہیں ہو سکتا[6] سالار جنگ میوزیم میں موجود ان کے کلیات میں ۱۷ طویل و مختصر قصائد افضل الدولہ کی شان میں ہیں اور تین نعت رسول مقبولؐ اور ایک حمد ہیں ان میں سے چند ایک کے مطالع ملاحظہ ہوں

حمد — ہر طرف جلوہ نظر آتا ہے اس کی شان کا + مظہر حق کے لئے ہے آئینہ انسان کا

نعت — پہنچا وہاں جہاں نہ گزر تھا گمان کا + تجھ میں خدا میں فرق رہا دو کمان کا

در مدح افضل الدولہ — نہایت زینت رخسار ہے کانوں کے زیور سے + مگر نکل ہے جھلی چشمۂ خورشید خاور سے

ہیں آلات رصد عاجز ترے طالع کے کوکب سے + نہ ہوگا ارتفاع منزلت ربع مجیب سے

پہنچے اثر جو گرمئ بزم شراب کا + ہو ماہی سپہر میں عالم کباب کا

افضل الدولہ کی مدح میں خبیر کے چوبیس اشعار سے زیادہ صرف پانچ قصائد ہیں تین ۲۱ اشعار رکھتے ہیں باقی سب ۱۲ اشعار سے کم ہیں جن میں ایک سات شعر کا بھی ہے چنانچہ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خبیر کے کلام میں غزل نما قصائد بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

خبیر نے اپنے قصائد میں تشبیب کم لکھی ہیں۔ خطابیہ انداز سے کبھی ممدوح کی یہ کہہ کر مدح کی ہے کہ حضرت مصطفیؐ کا جسم جان سے بڑھ کر ہے اور نگینہ گل ہے یا خدا تجلیٔ محمد کی برق کا مشتاق ہے اور وہ شمع احمد کے جمال کا پروانہ ہے وغیرہ۔ دنیاوی ممدوح کی شان میں لکھا کہ اس کی شان کو بیان کی حاجت نہیں کہ اس کا مکان کرسی سا تویں سپہر میں ہے۔ اس کے خوان کے ریزہ چینوں میں حاتم بھی ہے۔ کیقباد اس سے رتبے میں کم ہے اس کے فرق پر رب عباد کا سایہ ہے۔ وہ مرکز ہے اور اسکا گھر مرجع سلام۔ زمانے کا ہر آدمی اس سے زر کی طلب کرتا ہے اور یہ کہ

رتبہ وہ ہے بلند تری بارگاہ کا + جس پر گزر محال ہے مرغ نگاہ کا

حال شرق و غرب میں روشن ہے تیری جاہ کا + آفتاب حشر ہے شمع تری درگاہ کا

خبیر نے اپنے قصائد میں استادانہ فنی مہارت کا استعمال کیا ہے۔ تاہم ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قصائد اس دور کی یادگار ہیں جب شعرا مختصر غزل نما قصیدوں کی جانب مائل ہو رہے تھے اور طویل قصائد لکھنے کا رواج کم ہو رہا تھا

---

① خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۱۲ ② جائزہ مخطوطات اردو جلد اول ص ۱۷۱ ③ مقبول لغات نگاران از پروفیسر ص ۱۳۱
④ ایضاً ص ۱۳۱ ⑤ ۳ مارچ ۱۹۵۸ء ⑥ جائزہ مخطوطات اردو جلد اول ص ۴۸

خبیر کا دیوان شمس سخن کے نام سے نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۹۲ھ میں چھپا اس میں نواب مہابت خاں والئ جوناگڑھ کی مدح میں لکھے ہوئے قصائد بھی ہیں ان کا ایک قصیدہ ۱۰۷ اشعار پر مشتمل ہے ص ۱۲ تا ۱۰۰

مہدی علی ذکی

مہدی علی خاں ذکی [م ۱۸۶۵] مراد آباد میں پیدا ہوئے عمر کا زیادہ حصہ لکھنؤ میں گزارا[1]
علمائے فرنگی محل سے تحصیل علم کی[2] فن تاریخ میں ماہر تھے[3] سعادت خاں ناصر نے ذکی کو تاریخ کے علاوہ علم معما میں بھی
استاد لکھا ہے[4]۔ نواللہ خوبشگی نے ان کی موزونیت کی تعریف کی ہے[5] دیوان ذکی تین مذہبی اور دو غیر مذہبی
اردو قصائد طبع ہوئے ہیں[6] مذہبی قصائد میں سے ایک حمد، ایک نعت اور ایک منقبت علی پر مشتمل ہے۔ غیر مذہبی
قصائد میں سے ایک ناصر الدولہ آصف اور دوسرا غازی الدین حیدر کی مدح میں ہے۔ آصف الدولہ کے قصیدے پر جو عبارت
درج ہے اس سے ذکی کے ملک الشعرا ہونے کا پتہ چلتا ہے عبارت یہ ہے "قصائد مع تاریخ تصنیف مولوی مہدی علی ذکی
ملک الشعرا"[7] ان کے قصائد قصیدے کی روایتی پختگی اور صناعیت کے غماز ہیں۔ انہوں نے مبالغہ کا شستہ اور سنجیدہ استعمال کیا
ان کے قصائد کے یہ مطلع دیکھئے۔ حمد ؎ ہے حسن معنی روشن ہے شمع بزم شعور + کہ ہے فروغ سخن آفتاب عالم نور

نعت ؎ رقم کرے جو سخن کے مری کتاب قلم + لکھے بجائے ورق داغ آفتاب قلم

(ان کے قلمی دیوان مخزونہ پنجاب یونیورسٹی میں یہ مطلع یوں ہے[8] ؎ جو شیخ آہ کا مصرع لکھے شتاب قلم + شرار برق کی ہو بنض اضطراب قلم)

منقبت ؎ جو حیرت دل بے تاب کھینچے تحریر + قلم سے حرف کھینچے شکل ماہی تصویر

در مدح ناصر الدولہ آصف ؎ کیا لب و لہجہ کہ ہم سے ہو سکے ہم داستاں + بلبل شیراز ہو یا طوطی ہندوستاں [قصیدہ اعجاز سخن]

در مدح غازی الدین حیدر ؎ اہل جوہر سے نہ پوچھو اثر حسن عمل + کہ خود آئینہ ہے فولاد سے کار صیقل۔

نعتیہ قصیدے میں انہوں نے انتہائی عجز و درد مندی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے حضورؐ کے لئے ذکی نے سرور انبیا، ختم النبیین
مالک دوسرا، شفیع المذنبین، رحمۃ اللعالمین اور سید المرسلین کے الفاظ استعمال کیے ہیں حضرت علیؓ کے لئے
امیر المومنین، امام زماں، شیر یزداں، شاہ مرداں اس میں حضرت علیؓ کی بہادری کے حوالے سے عمدہ اشعار دستیاب ہیں
ناصر الدولہ آصف خاں کے قصیدہ میں ذکی نے قطعہ تاریخ بھی شامل کیا ہے اور اس میں یہ مہارت دکھائی ہے

"ہر مصرع تاریخ و منقوط ہر شعر ہم تاریخ، غیر منقوط ہم تاریخ، و منقوط ہر مصرع غیر منقوط دیگر ہم تاریخ است"[9]

اسی طرح غازی الدین حیدر کے قصیدے میں ذکی نے تاریخ جلوس تخت سلطنت نکالی ہے اس کی تکنیک یہ ہے کہ
"ہر مصرع تاریخ است و حروف منقوط ہر بیت تمام و غیر منقوط مادہ تاریخ است و از روئے توشیح بیت
برمی آید کہ متصف است بدیں صفات مذکورہ"۔ ذکی شیریں کلام اور صناع تھے۔ ان کی قادر الکلامی شبہے
سے بالاتر ہے۔ مضمون آفرینی اور تلازمہ کاری میں قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ فصیح الفاظ اور قابل فہم استعارے ان کے کلام کی جان ہیں

؎ چرخ اخضر کو کیا عکس شفق نے گلرنگ + قصر یاقوت بنا گنبد فیروزہ محل

چوری چوری کسی مشتاق کے تڑپانے کو + بوئے گل کو لئے جاتی ہے صبا زیر بغل

ذکی کی تشبیہوں میں بہاریہ مناظر اور حکیمانہ خیالات کا استعمال مدح میں متین انداز بیان انہیں اہم قصیدہ نگار بناتا ہے۔

---

① گلشن بے خار ص ۲۱۵۔ ② ایضاً ③ ایضاً ④ تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص ۳۹ ⑤ گلشن ہمیشہ بہار ۱۷۸
⑥ دیوان ذکی مطبوعہ نولکشور ⑦ دیوان ذکی ⑧ دیوان ذکی قلمی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی ع ۵۱۹
⑨ دیوان ذکی

اصغر علی نسیم

اصغر علی خاں نسیم دہلوی [۱۸۶۶] مومن خاں مومن کے شاگرد تھے[1]۔ واجد علی شاہ کے دور میں وہ لکھنؤ آ گئے[2]۔ کلیات اصغر میں ۱۶ قصائد ہیں۔ نسیم کے اس دیوان میں مذہبی قصیدہ نہیں ملتا۔ مطالع ملاحظہ ہوں قصیدہ در مدح واجد علی شاہ سے

پیرہن میں ہے مرا شاہد مضموں پنہاں + دائرہ شکل گریباں ہے تو کاغذ داماں

الیضاً — بہر ترتیب سخن دو حرف بھی ممکن کہاں + لفظ کی ترکیب کو محتاج ہے حسن بیاں [3]

شرف الدولہ ابراہیم خاں — کیوں نہ گنجائش مضموں میں نظر آئے خلل + مختصر جیب ابد تنگ ہے داماں ازل

الیضاً — شوخیاں کرتی ہے کیا کیا دم دیدار نظر + شرم کہتی ہے بچے گی مری عصمت کیونکر

الیضاً — برشتگی ہے نگہ میں یہ گرم ہے جوبن + فروغ عارض گل سے فتیلہ روشن [4]

الیضاً — کہاں ہے ایک طرح پر یہ دور لیل و نہار + کبھی ہے شام مصیبت کبھی ہے صبح بہار

الیضاً — دیکھ تو رفعت امنوں بتان طرار + رشتۂ قوس کی پہنی ہے فلک نے زنار

الیضاً — بجد لات فکر کا کرتے ہیں ہم آج امتحاں + ایک ساعت اے فلک بن جا خدا را مہرباں

ظفر الدولہ علی اصغر خاں بہادر — کثرت عیش سے یہ بے خبری ہے ہر دم + کہ فراموش ہیں جو یاد تھے گردوں کے ستم

الیضاً — یہ رفعت کلام کسی کے بیٹے کہاں + ہر زادۂ خیال ہے ہمراز آسماں

امیر الدولہ بہادر — تحریر کا وقت آ گیا لکھو نام اقدس اے قلم + نواب امیر الدولہ عالی مرتبت والا ہمم

وصی علی خاں — ذرا تو چین دے اے دل تجھے خدا کی قسم + کہ اور فکر میں ہے آج خاطر برہم

الیضاً — بہار آئی کھلے ہیں غنچہ زمرد میں ہے چمن کا ساماں + وظیفہ گل ہے ان دنوں میں ترانۂ عندلیب نالاں

نواب جعفر علی صاحب — مانند شانہ ہے خلشوں پر جو روزگار + حاصل ہے مثل زلف مجھے طول انتشار

مدح کرنل ایبٹ — اے فلک افسوس اکیوں کرتا ہے ہم سے انقلاب + سو رج اتنا تو ستم گر تو کہاں اور ہم کہاں [5]

الیضاً — دریغا کہ یہ دور لیل و نہار + ہمیں ایک صورت پہ رکھتا بہار [6]

نسیم کے قصائد ہیئت کے اعتبار سے روایتی رنگ میں رنگے ہیں ان میں شکوہ الفاظ علو تخیل اور جدت مضامین کا انہوں نے خاص خیال نہیں رکھا۔ چونکہ مطالع لکھنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ ان کے قصائد میں غزل کی سادگی اور رمزیت اظہر من الشمس ہے۔ قصائد میں نسیم نے علم و فضل کے اظہار سے گریز ہی کیا ہے وہ خود کہتے ہیں

کہ ہیں قصیدے میں غزل اور کچھ رنگینیاں — اصغر علی نسیم کے دور میں قصیدے پر غزل کی چھاپ نمایاں طور پر دکھائی دینے لگی تھی۔ نسیم نے بھی اپنے قصائد کو روایتی شان و شکوہ سے مملو کرنے کی بجائے متغزلانہ تشبیب لکھ کر سادگی و سلاست سے قریب کیا۔ مومن نے ان سے قبل اپنے بعض قصائد میں یہ طریقہ استعمال کیا تھا نسیم کی زبان کی سادگی نے ان کے قصائد کو جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے

---

(1) کلیات نسیم مرتبہ کلب علی خاں فائق ص ۱ (2) الیضاً ص ۲ مزید حالات کے لئے دیکھیے سراپا سخن بیان نسیم مطبوعہ نولکشور سخن شعرا مطبوعہ نولکشور شمیم سخن مطبع اعداد الہند عین الاخبار مراد آباد۔ بزم سخن مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ طور کلیم مطبوعہ مفید عام آگرہ وغیرہ (3) تا (6) یہ چار قصائد ان کے دیوان دفتر شنگرف مطبوعہ مطبع مصطفائی میں نہیں ملتے لکھنؤ کمشنر کرنل ایبٹ کی شان میں یہ دو قصائد نسیم دہلوی نے مقبول نو لکشور کے حاشیے میں ... [illegible]

؎ لاجرم مرضیِ احباب مناسب سمجھا + طبع کو میل ہوا جانب تمہیدِ غزل
اتنے میں آ کے مضامین قصائد نے کہا + صورتِ وعدۂ دیروز گئے آج بدل

نسیم نے مومن کے بعض مشکل اور پیچیدہ علمیاتی قصائد کو نمونۂ تقلید نہیں بنایا۔ تاہم فکر و حکمت کے مضامین سے انہوں نے بلا ذوق رغبت رکھی ہے۔ ان کی اکثر تشابیب رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ایک تشبیب میں بادہ و ساغر کے تذکرے سے تو تقوی پسندوں پر چوٹیں کی ہیں

؎ مستیاں کیف و سخن سے ہیں زباں میں پیدا + بات کرنے میں سمجھتی نہیں مطلب اکثر
ہے وہ موسم کہ ہوا گوشہ نشیں پیرِ واعظ + دخترِ رز پردۂ خم سے نکل آئی باہر

اصغر علی نسیم نے ذاتی احوال و کوائف کی عکاسی تشابیب بھی لکھی ہیں اور شکوۂ روزگار و گردشِ فلک کے مضامین پر مشتمل بھی لیکن ان کا زیادہ زور بہاریہ اور خمریہ تشابیب پر صرف ہوا۔ غزل و قصیدہ کے مضامین کو متحد کر کے انہوں نے تشابیب کی ثقالت کچھ کم کی ہے۔

؎ ربطِ لفظی نے نیا فائدہ دکھلایا آج + دہنِ حرف سے پیوند ہے خامے کی زباں
نظر آتا ہے ورقِ ناصیۂ معشوقی + ریزشِ کلک سے لفظوں نے چنی کیا افشاں

انہوں نے مختصر تشابیب بھی لکھی ہیں۔ تشابیب میں رمز و ایما سے کام لینا ان کا خاص انداز ہے۔ تفصیل نویسی یا بیانِ جزئیات ان کے مزاج سے موافق نہیں تھا۔ واجد علی شاہ کی شان میں لکھے گئے ایک قصیدے میں انہوں نے علم عروض کی شرائط، حشو و بندش ابیات وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ بہاریہ اشعار ملاحظہ ہوں

؎ بہت دنوں سے قدم رنجگی بہار نے کی + کہ ہر طرف سے گل افشاں زبانۂ گلشن
کھڑا ہوا ہے جو ابرِ بہار صورتِ شام + جبینِ شاخ پہ گل کے کنول ہوئے روشن

؎ کھل جو سنبل کی زلفِ پرخم مزاج از خود ہوئے ہیں برہم + طواف میں ہے نگاہ پیہم نثار ہوتے ہیں تحفۂ جاں

نسیم مختصر گریز لکھتے تھے ؎ خیالِ مدحِ رئیسِ زمانہ ہے دل کو + ادب کی جا ہے یہاں گردنِ قلم ہو خم

اصغر علی نسیم ممدوح کے مرتبے اور مزاج کے حوالے سے مدح لکھنے پر قادر تھے۔ حضور محل کی تعریف میں لکھے گئے اشعار میں خاتون کے تقدس کا لحاظ رکھا ہے

؎ آنکھوں میں ہے لحاظ لگا ہوں میں احتیاط + ممکن نہیں خلافِ شریعت ہو کوئی کار
عصمت وہ ہے کہ خامۂ نقاشِ کائنات + ممکن نہیں کہ کھینچ کے تصویرِ آبدار

واجد علی شاہ کی سخاوت ؎ بارشِ سیم نے کی وقتِ سخاوت جو سفید + چاند کا ہوتا ہے خورشید کے چہرے پہ گماں

مدحیہ مضامین میں نسیم نے ممدوح کے حسن و جمال کو بھی موضوعِ اظہار بنایا ہے۔ اس میں ان کی خوش سلیقگی اور لذیذ لہجے نے تاثیر پیدا کی۔

حسنِ طلب میں اختصار اور جامعیت نسیم کے پیشِ نظر رہتی تھی۔ دعا میں بھی انہوں نے چستی پیدا کی ہے

؎ نسیم عمرِ خضر رتبۂ سلیماں ہو + رہے ستارۂ اقبال جلوہ بخش قدم

نسیم کا اظہار دل نشیں، دلکش اور موثر ہے جہاں کہیں علمی اور فنی امور کا لانا مقصود تھا انہوں نے شاعرانہ دلائل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تاہم انگریز کمشنر کی مدح میں ان کے قصائد (خواہ وہ نول کشور کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہوں) قارئین کو خصوصاً اس لئے بھی ہضم نہیں ہوتے کہ ابھی جنگِ آزادی میں شکست کے زخم تازہ تھے

اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں غالب [م ۱۸۶۹] نے اردو قصیدہ کی تاریخ میں نادرۂ روزگار قسم کے قصائد کا اضافہ کیا۔ ان کے متداول دیوان میں صرف چار قصائد ملتے ہیں۔ دو منقبت علی کے اور دو بہادر شاہ ظفر کی شان میں۔ انہوں نے اور بھی بہت سے اردو قصائد لکھے ہیں۔(1) تاہم ان کے صرف انہی قصائد کو اہم جانا جاتا ہے جو متداول دیوان میں ہیں۔ ان کے مطالع ملاحظہ ہوں

در مدح بہادر شاہ ظفر	ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام + جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
ایضاً	صبحدم دروازۂ خاور کھلا + مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
در منقبت علی	دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں + ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
ایضاً	ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار + سایۂ لالہ بے داغ سویدائے بہار

نسخۂ عرشی اور منسوخ دیوان میں ملنے والے غالب کے قصائد کی اپنی اہمیت ہے۔ ان میں چند ثقافتی تہذیبی اور سیاسی اشارے ملتے ہیں۔ ایلن برون کے فرزند کی پیدائش پر شیو نرائن کی جانب سے لکھے گئے غالب کے قصیدے میں اس چیز کا اشارہ ہے کہ یہ فرزند بڑا ہو کر اپنی تیر کمان سے کشورِ روس پر حملہ کرے گا اور بادشاہ چین سے تخت و کلاہ چھین لے گا۔ یہ قصیدہ ۱۸۵۸ میں لکھا گیا اور انگریزوں نے ۱۸۵۷ میں تخت ہندوستان پر قبضہ کیا۔ یہ زخم تازہ تھا۔ اس میں اس نوع کا اشارہ فی الاصل ہندوستان کے چھینے جانے کا کنایہ بھی ہے۔ اس میں غالب نے ایلن برون کے عدل، توسن، مہربانی، بہادری وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ راجا شیو دھان سنگھ والیٔ الور کی شان میں غالب کا قصیدہ ان کی سالگرہ کے حوالے سے ہے۔ اس میں حسن طلب کے حوالے سے عمدہ اشعار لکھے گئے ہیں۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کی شان میں غالب کا قصیدہ ہولی اور عید کی رونقوں کی اجمالی تفصیل لیے ہوئے ہے

شہر میں کو بکو عبیر و گلال + باغ میں سو بسو گل و نسریں
راجا اندر کا جو اکھاڑہ ہے + ہے وہ بالائے سطحِ چرخ بریں
نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا + جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

غالب کے فرمانروائے پنجاب میکلوڈ صاحب کی شان میں لکھے ہوئے قصیدے سے ہندوستان میں ریل کی آمد کی خبر ملتی ہے
ع آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا جب قریب

---

(1) دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں ان کے مذکورہ قصائد کے یہ مطالع ملتے ہیں مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی

(1) توڑے ہے عجز تنگ حوصلہ بر روئے زمیں + سجدۂ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں [در منقبت علی رض]

(2) ملاذ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ + جناب عالی ایلن برون والا جاہ [غالب نے یہ قصیدہ شیو نرائن کی طرف سے ممدوح کے بیٹا ہونے پر پیش کیا ۱۸۵۸ء]

(3) گھن ہے سال کے رشتے میں بیس بار گرہ + ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ در مدح شیو دھان سنگھ والیٔ الور ۱۸۶۳ء

(4) مرحبا سالِ فرخی آئیں + عید شوال و ماہ فروردیں [در مدح نواب یوسف علی خاں بہادر جنوری ۱۸۶۳ سے ۱۸۶۵ کے درمیان]

(5) کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام + فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام ۱۸۶۷ء

یہی قصائد غالب کے منسوخ دیوان مرتبہ مسلم ضیائی مطبوعہ ادارہ یادگار غالب میں ہیں

اس قصیدے میں میکلوڈ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو حق گو، حق پرست، حق اندیش و حق شناس کہا گیا ہے علاوہ ازیں اسے جم مرتبہ بھی قرار دیا گیا ہے اور اسے حق کے نقد فضلا سے مرجع انام بھی لکھا ہے۔ اس قصیدے میں غالب نے اپنی ناقدری کا رونا رویا ہے اور بتایا ہے کہ جب دربار کے کنارے جیسے استادہ ہوئے تو مجھے اہتمام کی رو سے نشیب میں نمبر ملا۔ اس پر مجھے عوام میں بہت سبکی ہوئی۔

ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو + چاہیں اگر حضور تو یہ مشکل نہیں ہے کام

اس قصیدے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گورنر ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ کو دلی میں ریل کا افتتاح کرنے آیا تھا اور اس سلسلے میں ایک بزم آراستہ کی گئی تھی اس میں مدعو کیے گئے حضرات کے نام اخبار لودھیانہ میں چھپے تھے۔ اس میں غالب کا نام غلط چھپا۔ غالب کے لیے نمبر، نذر اور خلعت کا استثنا بھی نہ رہا وہ کہتے ہیں

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز + جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام۔

غالب دلی میں گورنر مذکورہ سے نہیں مل سکے اس لیے یہ قصیدہ لکھ کر بھجوایا۔ اس میں اپنے رتبے کی بحالی کی درخواست کی گئی ہے۔ بہر حال جو بھی معاملہ رہا ہو۔ انگریز حکمرانوں کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا۔ اس دور کے شعرا کے ضمیر پر ایک کالا دھبہ ہے۔ یہ قصائد قومی زندگی کے حوالے سے مکروہات میں شامل ہوتے ہیں۔ انشا کا جارج سوم کا قصیدہ ہو یا غالب کا مدح میکلوڈ کا قومی حوالے سے ان کو سراہا نہیں جا سکتا ①

آمدم برسر مطلب غالب کے متداول دیوان میں جو قصائد موجود ہیں ان سے وہ قصیدہ نگاری کی ایک نئی طرح کے موجد بھی ٹھہرتے ہیں اور خاتم بھی۔ قصیدہ نگاری کی ہیئتی و فنی پابندیوں کے باوجود غالب نے اپنے رنگ ڈھنگ اور آہنگ کے اعتبار سے منفرد قصائد لکھے۔ یہ قصائد فکر و فلسفہ کے آثار سمیٹے ہوئے ہیں۔ غالب نے ایک عملی قصیدہ نگار کی حیثیت سے فن قصیدہ نگاری کے حوالے سے اپنے مکتوبات میں چند معروضات پیش کی ہیں۔ غالب کے قصائد پر مزید اظہار خیال سے پہلے ان کا مختصر جائزہ ضروری ہے۔

غالب کے خیال میں قصائد میں الفاظ کا استعمال بے محل اور بے موقع نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی کسی ترکیب کو ٹکسال باہر نہیں ہونا چاہیے اور اس کا طرز گفتار ممدوح کے رتبے کے مطابق ہونا چاہیے ②۔ غالب چاہتے تھے کہ قصیدہ روش خاص میں لکھا ہوا ہو ③ غالب کا یہ بھی خیال تھا کہ قصیدے میں معانی آفرینی ضروری ہے محض قافیہ پیمائی سے گریز کرنا چاہیے ④ وہ قصائد میں الفاظ کی تسبیح کو ناپسند کرتے تھے اور ان کی جگہ بے عیب الفاظ رکھنے کے قائل تھے ⑤ اس کے تحت انہوں نے سوار الفاظ کی اصطلاح بھی برتی ہے ⑥ غالب نے فن قصیدہ کے ضمن میں حسن مقطع کی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ایک خیال رکھا کرو کہ شعر کے اخیر میں کوئی بات ایسی آ جائے جس سے اختتام کے معانی پیدا ہوا کریں" ⑦۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام کسی ممدوح کے سزاوار مدح ہونے کے حوالے سے غالب نے لکھا تھا "حضرت اس قصیدے کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا

---

① عبدالرؤف عروج نے اپنی کتاب بزم غالب میں غالب کے ۲۶ فارسی قصائد کا تذکرہ کیا ہے جن کے ممدوحین میں انڈر یو سرانگ (حکومت انگریزی کے سیکرٹری) فریڈرک ایڈمنسٹن، لارڈ ایلن برا، فرانسس ہاکنس (دلی کا ریذیڈنٹ) ولیم فریزر اور سر چارلس مٹکاف وغیرہ شامل ہیں ② اردوئے معلیٰ ص ۵۸۲ ③ ایضاً ص ۹۶۳ ④ ایضاً ص ۸۹۱
⑤ ایضاً ص ۵۸۲ ⑥ ایضاً ص ۹۱۰ ⑦ ایضاً ص ۹۹۹

شعر لکھے ہیں لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہے۔ اس مدح اور ممدوح کا بعینہٖ وہ حال ہے کہ ایک مزبلہ پر سیب یا بہی کا درخت اُگ جائے ①۔ ممدوح کے حوالے ہی سے ایک اور جگہ غالب نے یہ کہا ہے "میاں سنو اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائلِ دینی سے بلکہ ہم تم باوجود علوم و واقفیت امورِ دینی سے نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے ـــــ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں ہیں کہ نام لیا جائے چہ جائیکہ مدح کی جائے" ②۔ چنانچہ ممدوح کے سزاوارِ مدیح ہونے پر غالب نے خاصا زور صرف کیا ہے لیکن خود اس پر کچھ کم ہی عمل کیا ہے۔ انہوں نے وظائف اور انعامات حاصل کرنے کے لئے جو قصائد لکھے ان سے مایوسی ہوئی چنانچہ وہ یہاں تک کہہ اٹھے "میں تو کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کو کیا ملا تو آیا جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا" ③ فنِ قصیدہ سے ان کی بیزاری اس حد تک بڑھی کہ ایک خط میں لکھنے پر مجبور ہوئے "اغنیائے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو" ④ قصیدے کے ضمن میں وہ اتنے غیر سنجیدہ تھے کہ وہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام کر دیتے تھے۔ ایک قصیدہ انہوں نے بہادر شاہ کے غسلِ صحت پر لکھا اور اس کے کچھ اشعار بدل کر بعد میں ملکہ وکٹوریہ کے نام کر دیا ⑤ اسی طرح بہادر شاہ ظفر کی شان میں لکھے جانے والے ایک اور قصیدے کو اس کے چند اشعار بدل کر ایڈمنسٹن کی مدح میں کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کرسی والے کی بجائے کرسی کے لئے قصیدے لکھتے تھے یوسف مرزا کے نام ایک خط میں انہوں نے لکھا "جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح (امجد علی شاہ) کی نظر سے نہ گزرا تھا۔ میں نے اس میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا ہے خدا نے بھی تو یہی کیا تھا انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام کر دیا ـــ اس قصیدے سے مجھ کو غرض دستگاہِ سخن منظور نہیں گدائی منظور ہے" ⑥۔ غالب کے لئے قصیدہ نویسی وسیلۂ روزگار بھی تھی "لیفٹیننٹ گورنر پنجاب آتے ہیں انبالہ میں دربار ہوگا۔ نذرِ معمول میرا قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، اُدھر روپے کی تدبیر" ⑦ غالب جہاں خود نہیں پہنچ پاتے تھے وہاں دوسروں کے توسط سے قصائد پہنچایا کرتے تھے "ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لیفٹیننٹ گورنر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا ⑧ وہ یہ بھی لکھتے ہیں "واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں لیکن سلطنت جاتی رہی ⑨

غالب کے متداول دیوان کے قصائد میں الفاظ کا استعمال برجستہ اور برمحل ہے۔ ان میں مستعمل تراکیب غریب و نامانوس نہیں ہیں۔ انہوں نے ممدوح کے مقام اور رتبہ کا بھی خیال رکھا ہے۔ ان کے یہ چاروں قصیدے روشِ خاص رکھتے ہیں۔ ان میں انہوں نے مزبلے پر سیب و بہی کے درخت نہیں اُگائے۔ تشبیب، گریز، مدح اور حسنِ طلب و دعا کے حصے ایک مجموعی کل میں ڈھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا آغاز و اختتام بھی موثر ہے

---

① اردوئے معلیٰ ص ۹۰۸ ② ایضاً ص ۸۹۷ ③ ایضاً ص ۱۸۴ ④ ایضاً ص ۲۲۳ ⑤ ایضاً حاشیہ ص ۵۲۶
⑥ ایضاً ص [illegible] ⑦ ایضاً ص ۲۲۲ ⑧ ایضاً ص ۲۶۲ ⑨ ایضاً ص ۲۸۲

غالب کے ان قصائد میں غیر تقلیدی رویہ نمایاں ہے۔ اردو قصیدہ کی مروجہ روایت سے ان کا انحراف اسلوب کی حد تک ہے۔ غالب کے فکر انگیز اختصار، خلوص و عقیدت، جدت ادا اور تازہ کاری نے ان کے قصائد کو دیگر قدیم و جدید قصیدہ نگاروں کی تخلیقات سے جدا کر دیا ہے۔ ان کے لفظی، تکلف میں سطحی معنویت اور بے معنویت نہیں ہے۔ جوش بیان اور روانی کے عناصر نے بھی ان کے قصائد میں جان پیدا کی ہے۔ غالب کے قصائد میں تلازمے مضبوط ہیں۔ وہ اشعار کو با اعتبار مفہوم ایک دوسرے میں پیوست کر دیتے تھے۔ ان کے قصائد میں نظم تسلسل کے آثار موجود ہیں۔ غالب نے سنگلاخ زمینوں کو اس طور برتا کہ ان کی سنگلاخیت کا احساس ختم ہو گیا۔ انہوں نے حسب ضرورت طوالت و قوافی سے کام لیا ہے۔ ان کی صناعی یا بناوٹ اتنی ہموار ہے کہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے صنعتیں استعمال کی ہیں۔ ان کی تشابیب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

(۱) ؎ کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز + دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی + بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

(۲) نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت + سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین

عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس + وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقین

(۳) اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا + آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

عذر میں تین دن نہ آنے کے + لے کے آیا ہے عید کا پیغام

(۴) خسروِ انجم کے آیا صرف میں + شب کو اک گنجینۂ گوہر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ + دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

غالب کے تشبیبی اشعار میں تخیل نازک اور بلند ہے الفاظ پرشکوہ اور والہانہ پن کے حامل ہیں۔ ان میں فکر و فلسفہ کی گہرائیاں اور نزاکتیں بھی ہیں۔ ان کے ایک قصیدہ (منقبت علی) میں فکریہ تشبیب استعمال ہوئی ہے۔ خیالات کی گہرائی کے اعتبار سے یہ اردو قصیدہ کی تاریخ میں ممیز ہے۔ اس میں غالب نے تصوف اور زندگی کے مسائل کو جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ وحدت الوجود اور نفی کثرت کا مسئلہ عمدگی سے بیان ہوا ہے۔ تیسرے قصیدے کی تشبیب مکالماتی ہے۔ غالب نے ہلال عید سے گفتگو کرتے کرتے اس میں مدح کا پہلو نکالا ہے اور قصیدے کا خاتمہ دعا پر کیا ہے چوتھی تشبیب میں طلوع آفتاب اور صبح کے ماحول کی موثر تصویر کشی کی ہے تشبیہات اور استعارات کا استعمال بھی برجستہ اور فطری دکھائی دیتی ہے۔

غالب نے گریز کے حسن و اختصار کو قائم رکھا وہ لکھتے ہیں

؎ لحن سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شہ + طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیان تحریر + یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

غالب نے مدحیہ اجزا میں بھی جدت طرازی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے پیش پا افتادہ مدحیہ مضامین

کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے اس حصے کو خاصا جاندار بنایا ہے۔ غالب نے یہاں بھی فارسی آمیز اردو ہی کا استعمال کیا ہے۔

وہ شہنشہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا + چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار
فلک العرش ہجوم خم دوش مزدور + رشتۂ فیض ازل ساز طناب معمار
ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز + گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبی + جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب + شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ + رقم بندگی حضرت جبریل امیں
برش تیغ کا تیری ہے جہاں میں چرچا + قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ + اب مآل سعی اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے + اب فریب طغرل و سنجر کھلا

غالب نے اجزائے مدح میں اختصار و جامعیت سے کام لیا۔ انہوں نے ممدوحین کے ساز و سامان اور متعلقات کی تعریف بھی کی ہے ان کے جاہ و جلال، عدل و انصاف، شجاعت و بہادری کے ساتھ ساتھ تیر، تلوار، گھوڑے اور ہاتھی کے بیان میں بے جا پھیلاؤ اور طوالت سے پرہیز کیا ہے۔ ان کا ہر شعر ایک نئے مضمون اور موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ شعر

تیرے فیل گراں جسد کی صدا + تیرے رخش سبک عناں کا خرام

غالب نے ان قصیدوں میں تلمیحات کا معنویت بھرا استعمال کیا ہے ان کے ہاں تراکیب کی ندرت اور عمدگی بھی قابل دید ہے سویدائے بہار، داغ پلنگ، کاغذ آتش زدہ، طاؤس شکار، عالی اندیشہ، چشم جبریل، ساز طناب معمار، عرض خمیازۂ ایجاد، نغمۂ زیر و بم ہستی، خواب گران شیریں، مظہر فیض خدا، جان و دل ختم رسل، کعبۂ ایجاد یقیں، نگہ جلوہ پرست، نقش صدق یقیں، اثر شعلۂ دود دوزخ، میزبان تیمور و جم، استاد رستم و سام، صورت تکوین، ناخن تاویل، سعی اسکندر، معجز اعجاز ستائش گر، خط لوح ازل اور طلسم روز و شب وغیرہ نے غالب کے قصائد میں شکوہ و علویت پیدا کی ہے۔ علاوہ ازیں ایرج، تور، خسرو، بہرام، کیو، گودرز، بیژن، رہام، دارا، آذر، طغرل اور سنجر کی تلمیحات غالب کے ذہن کے عجمی گوشوں کو منور کرتی ہیں۔ غالب کے ان دعائیہ حصوں میں بھی جامعیت کے آثار ہیں۔

دشمن آل نبی کو بطرب خانۂ دہر + عرض خمیازۂ سیلاب ہو طاق دیوار
تم کرو صاحبقرانی جب تلک + ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

غالب کے یہ قصیدے فکر، لطف اور جذبے سے مملو ہیں۔ انہیں فی الحقیقت نوائے سروش کہنا چاہیے۔ غالب نے اپنے آپ کو گلشن ناآفریدہ کا عندلیب کہا ہے۔ انہیں احساس تھا کہ انہوں نے شاعری کے نئے اسالیب کی جہت نمائی کی ہے۔ ان قصیدوں میں غالب نے اشکال لفظی، دقت آفرینی اور اغلاق وغیرہ سے دامن بچایا ہے۔

مجموعی جائزہ

ہندوستان میں انیسویں صدی کے نصف اوّل کے اردو قصائد کا تجزیہ یہ باور کرواتا ہے کہ اس دور میں قصیدہ نگار شعرا نے اپنے ماحول کی انحطاطی کیفیات کو بھی پیش کیا ہے اور تن آسانی، معاشی بدحالی، تعیش اور لہو ولعب کے متضاد کوائف نے معاشرے کو جو ہنیج عطا کر دی تھی اس کی جھلکیاں قصیدہ نگاروں کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ انگریزوں نے عیاری اور چالاکی سے ہندوستان کے خزانوں کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ بادشاہ کٹھ پتلی ہو گئے تو ملک الشعرائی کی قدر بھی جاتی رہی۔

اس دور میں قصیدے کی عجمی روایات نے زیادہ فروغ پایا۔ تشبیب میں فطری مناظر اور کائنات کے حسن و جمال کی تصویر کشیاں ہوئیں۔ تصنع، بناوٹ اور آرائشی انداز کو فروغ ملا۔ شاعروں نے حقیقت نگاری سے زیادہ سروکار نہیں رکھا۔ حسی اور جذباتی امیجری کی بنسبت تخیلی اور فکری امیجری سے سروکار رکھا گیا۔ یوں بھی معاشرے میں بظاہر کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ فرد کا ذہن یکسانیت کا شکار تھا۔ انگریزی اقتدار غیر محسوس طریقے سے اثر انداز تھا۔ لوگوں نے شکر، قناعت، تزکیہ نفس کے رویے اپنا لیے تھے۔ ہنوز بادشاہ عوام کے لیے ظل الٰہی کا درجہ رکھتا تھا۔ شکوۂ فلک، ناسازگاری روزگار، خود اذیتی کے رویے اور کوائف شاعری کا حصہ بن رہے تھے۔ شہر آشوبوں اور ہجویات میں اس دور میں نظر آنے والے ماحول کی کھل عکاسی ہوئی ہے۔ بادشاہ اور امرا کے ایسے کارنامے مفقود تھے جن کی بدولت ان کی سچی مدح ممکن ہوتی۔ ان کی شان و شوکت جاہ و جلال، شرافت، بزرگی، عدل و شجاعت، عفت و قناعت، خدا ترسی، راست بازی، علمیت، قابلیت کی امتیازی اور تخیلی تشریحات قصائد کا حصہ بنیں۔ ان کے ہاتھیوں، گھوڑوں، تلواروں اور لشکروں کی تعریف کیا ہوتی کہ یہ سب کچھ تو محض رسمی حیثیت کا حامل تھا۔ سلاطین اور امرا نام کے سلاطین اور امرا تھے تو ان کے مرتبے کے مطابق الفاظ نکلتے ہوئے بھی شاعروں کے دلوں میں جھجک پیدا ہوتی ہے۔ اس دور کے قصیدوں میں ممدوحین کی عقل، شجاعت، عدل اور عفت کے آئیڈیل نقشے سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدحیہ حصوں میں یکسانیت اور تکرار کا احساس ہوتا ہے۔ لفظی بازیگری، دروغ پردازی اور لغویت سے بھی ہمارے قصائد نگار محفوظ نہیں رہ سکے۔ مروجہ اخلاق و آداب، معاشرتی جبر اور دباؤ کی وجہ سے قصیدہ نگاروں نے تازہ اور نئی باتوں کی تحصیل سے اجتناب کیا۔ سودا اور ان کے معاصرین نے قصیدے کے لیے جو ڈگر متعین کر دی تھی قصیدہ نگاروں نے اسی پر اکتفا کیا۔ زندگی کے بارے میں عینی اور تصوراتی خیالات قصائد میں بھی منعکس ہوتے نظر آتے ہیں۔ تصوف اور اس کے بعض متعلقات صبر و رضا، قناعت اور ترکِ دنیا وغیرہ نے بھی معاشرے میں نئے تصورات کے لیے رستہ ہموار نہ ہونے دیا۔

ہنوز حیات و کائنات کے نوافلاطونی تصورات میں شکست و ریخت نہیں ہوئی تھی۔ آریائی اور دراوڑی ثقافتی اثرات، ایرانی فکری و مذہبی اثرات وغیرہ نے مذہب نے شرک و بدعت کے معاملات

کو فروغ دیا۔ ابھی بادشاہی نظام پر اعتقاد راسخ تھا۔ بادشاہ معاشرے کا مرکزی کردار تھا تمام ڈراما اس کی ذات اور شخصیت کے گرد گھومتا تھا۔ "ہر چھوٹا کل ایک بڑے کل میں تحلیل ہو جاتا ہے" بادشاہ بڑا کل تھا اور معاشرہ اس کا حصہ، بادشاہ کا تعلق ایک مابعد الطبیعاتی فکری اور مذہبی نظام سے تھا۔ ہندوستان میں بادشاہ کل مذاہب کے لوگوں کا محافظ بھی جانا جاتا تھا۔ کعبہ و دیر کی تفریق کو تقصیر نظر تصور کر کے کارواں ایک ہی منزل کی طرف رواں کیے جاتے تھے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے گنجلک مندروں سے لے کر ایرانی طرز تعمیر کے آرائشی اور تزئینی کوائف تک بہت کچھ موجود تھا ان کا شعر و ادب پر اثر لازمی تھا۔ محرابیں، گنبد، دائرے، قالینوں کے نقش و نگار، دیدنی تھے چادروں پر پھول بوٹوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ مصوری میں بھی دائرہ در دائرہ آرائشی دروازے، بیل بوٹے تزئینی اور سجاوٹی رنگ نظر آتے تھے۔ فن تحریر میں دائرہ نما حروف تہجی سے سجاوٹ، نکھار اور صفائی پیدا کی جاتی تھی۔ شاعری میں ایہام، مراعاۃ النظیر، حسن تعلیل، ترصیع پر زور تھا۔

دائرہ در دائرہ عروضی ارکان ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک بڑے آرائشی اور فنی کل میں ڈھل جاتے تھے۔ قدیم شعری نظام پیچیدہ اور آرائشی قواعد و ضوابط کا حامل تھا۔ اوصاف کے اعتبار سے شعر کو مطبوع، نامطبوع، ملائم، متنافر، متصف، مہمل، ممتنع، مرتجل اور خمریات وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے کڑے اصولوں کی پابندی ہونے لگی تھی، علم بیان اور صنائع بدائع کی لامحدود قسمیں تھیں۔ روزمرہ زندگی میں بھی فرد تکلفات سے کام لیتا تھا، علاوہ ازیں تشبیہات، استعارات اور علامات کا استعمال عمومی تھا۔ فرد کو خارجی زندگی کے مصائب اور تلخ حقائق سے زیادہ سروکار نہ تھا۔ شعری معانی بھی تکرار و تفصیل، یکسانیت انجماد اور ٹھہراؤ کا شکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قصیدہ نگار شعرا تزئینی، مکلف اور آرائشی معیارات کی تحصیل کرتے میں اتنے منہمک ہو گئے کہ انہوں نے زندگی کو اس کی پوری الجھنوں، تکلیفوں اور مجبوریوں سمیت قبول نہیں کیا۔

میر و سودا کے دور سے قبل الفاظ ذومعنیین کو مضامین تازہ کا نام دیا جاتا تھا۔ تاہم اس دور میں شمالی ہند میں قصیدہ نگاری کے لیے ماحول ناساز گار نہیں تھا۔ زبان پر شعرا کی گرفت مضبوط تھی۔ اسے ہم دکنی اور شمالی ہند کے دور دوم کے حوالے سے عبوری دور کہہ سکتے ہیں اس دور میں مستقبل کے قصیدے کے لیے لسانی اور موضوعاتی زمین ہموار ہوئی، یہ وہ دور تھا جب شمالی ہند میں فارسی ادب کی روایت مستحکم تھی۔ فارسی زبان کو علم و فضل اور شعر و ادب کے لیے معیاری جانا جاتا تھا۔ اس دور میں شعرا نے اردو قصیدے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ سراج الدین علی خاں آرزو کی میلانی ہوئی تحریک نے فارسی کے مقابلے میں اردو کی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس تحریک سے اردو

قصیدہ کو بالواسطہ فائدہ بخشا اور وہ یوں کہ اردو شعرا نے دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ قصیدہ پر بھی توجہ دی ۔ ایہام گو شعرا نے لسانی تجربے دکھائے تو ایک ایسی زبان کی بنیادیں استوار ہونے لگیں جو اظہار و بیان کی پختگی کے امکانات لیے ہوئے تھا۔ زبان میں پختگی آئی اور دکھنی الفاظ و محاورات متروک ہونے لگے ۔ فارسی تراکیب، الفاظ، تلمیحات اور دیگر اظہاری لہجے شاعروں پر اثر انداز ہوئے ، ۔ ۔ اس دور کے قصائد میں ثقیل اور نامانوس الفاظ اور بھدے محاورے موجود ہیں قواعد و عروض اور ردیف و قوافی کا پورا پورا خیال نہیں رکھا گیا تاہم جدید محاورے اور ترکیبیں بنانے کا عمل جاری و ساری رہا ۔

میر و سودا کا دور سیاسی زوال اور اخلاقی پستی کا دور تھا ۔ اس میں قوت فکر و عمل کم تھی ، اس دور میں دہلی اور لکھنؤ علیحدہ علیحدہ تہذیبی مراکز بنے ۔ صوبوں اور ریاستوں میں بھی ادب و ثقافت کی پرورش ہوئی ، موسیقی، رقص اور لہو و لعب کے رجحانات بروئے کار آنے لگے ۔ عرسوں اور میلوں ٹھیلوں کا چرچا ہوا ، عیش و عشرت اور غم و اندوہ کا ماحول ہم آہنگ نظر آنے لگا ، جہاں ہیں شادی و غم کے توام ہونے کی باتیں ہونے لگیں جہاں نفسی خواہشات اور جذبات میں اشتعال پیدا کرنے والے رجحانات کا چرچا تھا وہاں تصوف و مذہب کی گرفت بھی بڑی مضبوط تھی ۔ اس دور میں جہاں مدحیہ قصائد میں عیش و نشاط کے ماحول کی جھلکیاں نظر آتی ہیں وہاں مذہبی قصائد میں عقائد ، اخلاقیات اور صالح فکر و شعور کی باتیں بھی منعکس ہیں ۔ میر و سودا کے دور میں ایہام گوئی کے خلاف رد عمل ہوا ، قصائد کی زبان کو پختگی ملی ۔ شعرا کو یہ بھی احساس ہوا کہ زبان ہی سب کچھ نہیں ہے جذبے کی اہمیت بھی ہے تاہم یہ شعور قصائد سے زیادہ غزلوں میں جھلکتا نظر آتا ہے ۔ غیر ملکی حملوں اور داخلی انتشار اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے دہلی کی زندگی میں جو معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ ان کا احساس شہر آشوبوں ، ہجویہ قصیدوں اور ہجویات میں موجود خیالات سے ہوتا ہے ۔ اس دور کے شعرا نے اپنے قصائد میں عجمی قصیدہ کو تقلید کا نمونہ بنایا ۔ فارسی قصیدے کی علامات و اصطلاحات اور دیگر شعری محاسن سے بھرپور استفادہ کیا گیا ۔ قصائد میں صنائع بدائع کا بطریق احسن استعمال ہوا ۔ بعض قصیدہ نگاروں نے اخلاق و مذہب اور فلسفہ و حکمت کے موضوعات بھی اپنائے ۔ اس دور میں لکھے جانے والے قصائد کی تشبیب میں مناظر اور باغ و راغ کے بیان کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی ماحول کی تصویریں بھی مل جاتی ہیں ۔ شعرا نے غیر شعوری طور پر (سیاسی اور سماجی حالات کی ابتری کو محسوس کرتے ہوئے) ممدوحین کی توجہ عدل و انصاف اور امن و انصاف کے مسائل کی جانب مبذول کروائی

اس دور میں تخیل کی بلند پروازی اور جذبات کی شدت قصائد کی بنت میں شامل ہے۔ ان کی تشبیب کے تنوع سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ان میں علمی اصطلاحات، زورِ بیان، طمطراق، شکوہ الفاظ وغیرہ کا احساس نمایاں ہے۔ اکثر شاعروں نے اپنے اظہار کے لیے سنگلاخ زمینیں منتخب کیں کثرت اشعار پر مشتمل قصائد لکھے۔ نئی زمینیں دریافت کی گئیں اور نئی طرحیں اختیار کی گئیں

جہاں تک انیسویں صدی کے نصف اول قصیدہ کا تعلق ہے اس پر میر و سودا کے دور میں لکھے جانے والے قصیدوں کے اثرات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس دور کی سیاسی، فکری اور تہذیبی زندگی کا اجمالی نقشہ یہ باور کرواتا ہے کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہونے سے مرکزی ہندوستان کا اقتدار بھی ان کے پاس آ گیا تھا۔ انگریز ایک نئے سیاسی اور انتظامی نظام کی بنیادیں رکھنے لگے تھے۔ اس مقصد کے لیے مواد کی حصول فورٹ ولیم کالج کے ذریعے کی ـــــ نئی مجلسی زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہندوستان یورپی روایات سے ہم آہنگ ہونے لگا۔ جدید علمی اور ادبی ماحول کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ نئے تعلیمی مراکز کو فروغ ملا۔ نصاب میں انگریزی زبان شامل ہوئی۔ تاہم اردو قصیدہ ہنوز خیال کی بیگی کی آرائش، سجاوٹ، تزئینی اور تکلفاتی فضا سے ہم آہنگ نظر آ رہا تھا۔ اس دور میں فن تعمیر میں بھی یورپی روایات کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں ـــــ تصوف کی طرف جھکاؤ نے شاعری میں گزشتہ ادوار کے بعض موضوعات ہی کو فروغ دیا۔ فارسی علم و ادب کی روایت کا زوال ہونے لگا۔ شاعروں نے خارجیت کی طرف بھی توجہ دی۔ اس دور کے قصیدہ نگار شعرا نے قصائد میں شکوہ الفاظ، بندش کی چستی، روزمرہ اور محاورہ کے ماہرانہ استعمال پر زور صرف کیا۔ سنگلاخ زمینوں میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔ پیچیدہ لفظی اور معنوی رابطوں سے سروکار رکھا۔ زبان میں اصلاح اور تبدیلیوں کی کوششیں بھی ہوئیں۔ اس زمانے کے دہلوی قصائد پر لکھنوی شاعری کی حسیت، خارجیت اور جسمانیت وغیرہ کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی کے تصورات ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس دور کے قصیدہ نگار شعرا نے مضمون بندی کی روایت کو بھی اپنایا۔ علاوہ ازیں ان کے قصائد کی تشبیبوں میں حکیمانہ، علمی، پیشہ ورانہ اور فلسفیانہ خیالات کا عمومی اظہار ہے۔ بعض قصیدوں میں مشکل زمینیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ ذوق نے قصائد میں سودا کا مکمل اتباع کیا۔ غالب نے حیات انسانی اور کائناتی مسائل پر صوفیانہ اور فکری انداز سے اظہار خیال کیا۔ اس دور کی قصیدہ نگاری فکری عمق لیے ہوئے ہے۔ شاعروں نے فنکارانہ صورت گری اور استادانہ ترکیب سازی میں قدرت دکھائی۔

اس دور میں دلی اور لکھنؤ کے نواح اور دیگر صوبوں اور ریاستوں میں بھی قصیدہ نگار شعرا کی بڑی تعداد ملتی ہے (ان کا تذکرہ مقالہ ہذا کے ضمیمہ باب پنجم و ششم میں ہے دیکھئے ص ۱۲۱۱) ان کے قصائد مقامی جغرافیائی اور ماحولی اثرات بھی رکھتے ہیں اور ان میں قصیدے کے بڑے اساتذہ کی روایات کا تتبع بھی ملتا ہے۔ اس دور میں انگریز قصیدہ نگاروں کا سراغ بھی ملتا ہے تاہم ان کے قصائد قصیدے کی مروجہ روایات ہی کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔ زبان و بیان اور خیال و مواد کے نئے اسالیب کی دریافت کی کوششیں اسی دور میں شروع ہو گئی تھیں فورٹ ولیم کالج کے شعرا کے قصائد میں مدح کے کچھ ایسے زاویے نظر آتے ہیں جن سے انگریزی ماحول اور تہذیب کی چند باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اس دور میں مذہبی قصیدہ بھی کثرت سے لکھا گیا ہے اب ریاستی نوابوں اور امراء کے ساتھ انگریز افسروں یا مقامی عہدے داروں کی تعریف میں بھی قصائد نظر آنے لگے تھے۔

حیدر آباد، بیگن پلی، رامپور، بھوپال، گوالیار، الور، جھجھر، بھاولپور، مالیر کوٹلہ کے نوابوں اور امرا کی شان میں قصائد دستیاب ہیں لکھنؤ اور دہلی کے بادشاہوں، نوابوں اور وزیروں کی توصیف میں بھی متعدد قصائد ملتے ہیں۔ اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ظفر، نصیر الدین حیدر، غازی الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ کے علاوہ علی نقی خاں، سلیمان شکوہ، نظام الملک، سعادت علی خاں، چندو لال (راجہ حیدر آباد) کلب علی خاں (رامپور) یوسف علی خاں (رامپور) نواب عبد الرحمن خاں (جھجھر) مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا (گوالیار) راجہ شیو دھیان سنگھ (الور) نواب ابراہیم خاں (مالیر کوٹلہ) شمس الامرا امیر کبیر (حیدر آباد) کی شان میں بہت سے شعرا نے قصائد لکھے۔ علاوہ ازیں لارڈ منٹو، ہارنگٹن، ڈاکٹر ہنٹر، ملکہ وکٹوریہ، کپتان شیلر، گلکرسٹ، اسکاٹ اور ڈیوک آف ایڈنبرا وغیرہ کی تعریف میں بھی شعرا رطب اللسان ہوئے ہیں۔ مذہبی قصائد کے حمد و نعتیں میں خدا اور رسولؐ کے علاوہ ائمۂ معصومین اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور دیگر بزرگوں کی تعریف میں لکھے ہوئے قصائد دستیاب ہیں ——— (تفصیلات کے لئے دیکھئے ص ۵۷۱ تا ۶۹۶ مقالہ ہذا)

۱۸۵۷ کے بعد اردو قصیدہ میں خیالات و موضوعات کی سطح پر خاصی تبدیلیاں رونما ہوئیں البتہ روایتی طرز کے قصیدہ نگار اس دور میں بھی سرگرم عمل رہے ہیں ۱۸۵۷ سے ۱۹۰۰ء کے دور کے قصیدہ نگاروں کا جائزہ آئندہ باب میں پیش کیا جائے گا۔ تاہم یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس دور کے قصیدہ نگاروں نے بھی دیگر ادوار کے اردو قصیدہ نگاروں ہی کی مانند قصیدے کی ہیئت اور لوازمات کا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے

باب ششم

اردو قصیدہ
۱۸۵۷ سے ۱۹۰۰ تک

فصل اول : سیاسی و تہذیبی ماحول

فصل دوم : خصوصی مطالعے

ضمیمہ ؎ [باب پنجم، ششم]
چند اور قصائد نگار
۱۸۰۰ تا ۱۹۰۰ء

فصل اول : سیاسی و تہذیبی ماحول

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اردو کی پرورش کرنے والے دو بڑے مرکز بھی اجڑ گئے ۔ دلی اور لکھنو ان کے اجڑنے پر کیسی کیسی کتابیں لکھی گئیں اور کیسے کیسے نوحے رقم ہوئے (داستان غدر، فغان دہلی، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ) ۔ اردو شاعری اب ریاستوں پرورش پانے لگی ۔ سرحد و پنجاب، راجپوتانہ، ریاستہائے مغربی ہند، آگرہ اور اودھ کی ریاستیں وسط ہند، حیدر آباد اور مدراس وغیرہ کی ریاستیں اس کی پناہ گاہ ٹھہریں ۔ کشمیر، پٹیالہ، بہاولپور، کپورتھلہ، نابھہ، جیند، چمبہ، سرمور ناہن، مالیر کوٹلہ، فریدکوٹ، اودے پور، جے پور، جودھپور، ٹونک، بھرت پور، بیکانیر، دھولپور(؟)، پرتاب گڑھ، بانسواڑہ، الور، جیسلمیر، دھولپور، جھالاوار، بڑودہ، خیرپور، جوناگڑھ، رامپور، بنارس، گوالیار، اندور، بھوپال، ریواں، دیواس پانتی، راجگڑھ، حیدر آباد وغیرہ میں اردو شعرا کی فوج ظفر موج کا سراغ ملتا ہے (۱) ۔ ان ریاستوں میں حیدر آباد، رامپور، بھوپال، ٹونک وغیرہ میں اردو کی خاصی نشو و نما ہوئی ۔ یہ دور وہ تھا جب دلی کا باغ اجڑ گیا تھا اور کسی شاعر نے لکھا تھا

ع ان کے مکاں گڑے ہیں نشان مکیں نہیں + زخمی اگر ہو دل تو اسے آئے کیا قرار
شاہانِ نامور کا نہیں اب نشاں رہا + کچھ نام لیوا ان کے ہیں بے عز و بے وقار
ان کے ہی باپ دادا کا تھا تخت و تاج لکھ + مانگیں اگر کسی سے تو ملتا نہیں ادھار
برٹش گورنمنٹ کے الطاف کی نظیر + پائیے نہ خلق میں ورق الٹے کوئی ہزار
ان کا ہی صدقہ ملتا ہے نسلِ مغول کو + ہے بس اسی وظیفے پہ جینے کا انحصار
تعداد ان وظیفوں کی بالکل قلیل ہے + جن کے بیان سے ہمیں آتی ہے شرم و عار
ان شاہزادوں سے تو ہیں مزدور بھی بھلے + ملتا نہیں وہ ان کو کماتا ہے جو کمہار
اشراف گردی کا یہی دورہ ہے دیکھیے + انگلی اٹھاتا ہے شرفا پر اک چمار
ابوابِ رزق بند گرانی کا دور ہے + اک اک شریف پر پڑی چاروں طرف سے مار
بیوی کو جیکی پیسے مدت گزر گئی + لیکن بہت ہی ہے بری اس پیٹ کی بیمار
گھر میں جو لوٹم چھلا تھا وہ سارا بک گیا + بیگم کو دیکھیے تو نہیں تن پہ ایک تار (۲)

سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد اور سید احمد خان کی علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں میں شعور پیدا کیا ۔ ادھر انگریزوں نے ۱۸۶۰ء میں "قانون مجالس ہند" کی تشکیل کی جس کے مطابق ہندوستان کے مقامی لوگوں کو انتظامیہ میں شرکت کے مواقع فراہم ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگرس کا قیام اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ

---

(۱) ان ریاستوں کے احوال کے لیے دیکھیے صحیفۂ زریں از پرماگ نرائن بھارگو نولکشور پریس لکھنو ۱۹۰۲
(۲) دیوان بشیر از بشیر احمد دہلوی ص ۱۳۷ دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۲۲

کی تشکیل اس دور کے دو اور اہم واقعات ہیں۔ یہ جماعتیں اپنے اپنے مذہبی گروہوں کے حقوق کی حفاظت کی مدعی تھیں۔ لارڈ میو (۱۸۶۹ تا ۱۸۷۲) لارڈ ڈفرن [۱۸۸۴ تا ۱۸۸۸] اور لارڈ کرزن [۱۸۹۹ تا ۱۹۰۵] وغیرہ نے تعلیم، علاج اور دیگر کئی سہولتوں پر توجہ دی۔ اس دور میں پڑھے لکھے مسلمانوں نے انگریزوں سے تعاون کرکے ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک نے تعلیمی، سیاسی اور تہذیبی میدانوں میں مسلمانوں کو آگے بڑھنے پر آمادہ کیا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے مسلمانوں میں قومیت کا جذبہ بیدار کیا۔ اور انہیں سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ ہندو ہر میدان میں آگے بڑھ رہے تھے۔ بنگال، مدراس اور بمبئی وغیرہ میں ایسوسی ایشنز بنا چکے تھے۔ ہندو ازم کو فروغ دینے کے لئے برہمو سماج، آریہ سماج، پرارتھنا سماج، راما کرشنا مشن وغیرہ کام کر رہے تھے۔ محرم، دسہرا، ہولی، عیدین وغیرہ پر فرقہ وارانہ اور مذہبی کشیدگیاں ظاہر ہونے لگیں۔ متحدہ صوبوں میں دیوناگری رسم خط کو فروغ ملا اور کاروبار اور لین دین کی زبان ہندی قرار پائی۔

مسلمانوں نے دینی، مذہبی اور کلاسیکی علوم کی تبلیغ و اشاعت کے لئے دارالعلوم دیوبند، سہارنپور اور ندوۃ العلما لکھنؤ کی بنیاد ڈالی، علاوہ ازیں مدرسہ الہیات کانپور میں بھی دینی تعلیم دی گئی۔ علمائے اہل حدیث نے عربی مدرسوں کو فروغ دیا، عیسائیوں، آریہ سماجیوں، مرزائیوں کی مخالفت کی۔ ان کے ساتھ ساتھ احمد رضا بریلوی نے بریلوی عقائد کو فروغ دیا۔ مولانا عبداللہ چکڑالوی نے اہل قرآن پارٹی قائم کی۔ بریلوی حضرات حنفی فقہ کے زیر اثر مسلمانوں کے رسوم و رواج اور عقائد کی بات کرتے تھے (فاتحہ خوانی، چہلم، برسی، گیارہویں کا عرس، تصور شیخ، قیام میلاد استمداد از اہل اللہ وغیرہ) اہل قرآن نے فقہی مسائل میں قرآن سے استنباط کیا۔ اس دور میں مسلمانوں کے عیسائیوں کے ساتھ مباحثے اور مناظرے بھی ہوئے۔ انجمن پنجاب۔ لاہور، دہلی سوسائٹی، اور اسکول بک اور دیگر مجالس اور انجمنیں لکھنؤ، میرٹھ، بہار، شاہجہانپور، اٹاوہ، بنارس، بدایوں، مرادآباد، الہ آباد، پٹنہ، کانپور، کلکتہ وغیرہ میں قائم ہوئیں۔ ان سے شعر و ادب اور علم و تحقیق کو فروغ ملا۔ انجمن پنجاب نے جدید اردو نظم کو فروغ بخشا۔ یہ عقلیت، مادیت اور تجربیت کا دور تھا۔ انگریزی نظام حکومت نے "ریاست، نظم عدالت، مواصلات، انتظامی مشنری، پولیس، طب، حفظان صحت، صنعت، تجارت، معیشت، تعلیم، علوم و فنون، افکار و اقدار اخلاق معاشرت، تہذیب، ثقافت، ادبیات، زبان، رسوم و رواج اور عقائد"[1] ہر چیز کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔

---

① مذکورہ بالا معلومات کا ماخذ تاریخ ادبیات پاکستان اردو ادب چہارم نویں جلد مضمون از شمس الدین صدیقی ص ۱ تا ۵۸ ہے

اس دور کے قصائد میں بھی نئے علوم وفنون کی اصطلاحیں در آئیں۔ نظمیہ انداز اختیار کیا گیا۔ مبالغہ آرائی سے حتی المقدور پرہیز ہوا۔ تخیل کا سرچشمہ مشاہدہ یا اصلیت ٹھہرا صنعتی انقلاب نے جہاں یورپ کی کایا پلٹی وہاں ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا۔ جدید صنعتی سہولتوں سے یہاں کے لوگ بھی استفادہ کرنے لگے۔ قصائد میں اگرچہ مطلع، تشبیب، گریز، مدح اور دعا کے مراحل ہو اسے لے کر عزیز لکھنوی تک ایک مخصوص روش سے طے ہوئے ہیں تاہم ان کے اسلوب بیان اور موضوعات پر زمانی اثرات ملاحظہ ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر قصائد میں قصیدے کی قدیم روایات سے انحراف نہیں ہے تاہم مصنوعی اسلوب، مبالغہ آرائی اور خوشامد پسندی کی جگہ آہستہ آہستہ بے تکلف طرز بیاں، اصلیت اور واقعیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ قصیدے کے روایتی شکوہ اور بلند آہنگی کو روایت پرست شعرانے تو سنبھالا لیکن جدید شاعر جو غزل اور نظم کے مزاج کے زیادہ قریب تھے اس سے منقطع تعلق کرنے لگے۔

یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں قصائد کی ضخامت سمٹتی ہوئی نظر آتی ہے شاعر نے سات آٹھ یا دس گیارہ اشعار کے مدحیہ مضامین رکھنے والی نظموں (جو قصیدے کی شکل میں تھیں) اور غزلوں کو بھی قصائد میں گننا شروع کیا۔ قصیدہ کا شکوہ اور بلند آہنگی شاعر کے لئے ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ اس لئے کہ ان کی وجہ سے لفظی اور اسالیبی معاملات کو فوقیت اختیار کر جاتے تھے اور شاعر کی انفرادی اسلوبی مہارت منفرد نہیں ہو پاتی تھی۔ یکسانیت اس کے لفظ و بیان کا حصہ تھی۔ قصیدہ نگار اشیا اور علوم کی متعدد تفاصیل سمیٹنے کی کوشش میں موضوع اور خیال یا جذبہ اور احساس کے حقیقی اور تخلیقی شعور کو فراموش کر دیتا تھا۔ روایتی قصیدہ شاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کی خوشنودی کے لئے لکھا جاتا تھا۔ دورِ جدید میں بھی بعض شاعر اس راہ پر گامزن نظر آتے ہیں تاہم اب قومی مسائل اور معاشرتی معاملات کو قصائد میں زیادہ جگہ ملنے لگی تھی۔ جدید اردو نظم کو قصیدے کی تشبیب میں موجود منظر نگاری اور اخلاقی و وصفی شاعری سے استفادہ کا موقع ملا۔ انہوں نے تشبیب میں موجود یکسانیت اور عمومیت کی جگہ نئی یورپی نظموں میں بیان ہونے والے موضوعات کو منتقل کرنا شروع کیا۔ نیا دور ٹھہراؤ اور انجماد کا مخالف تھا۔ اس میں آرائش و نفاست سے زیادہ موضوع کو اہمیت دی جانے لگی تھی۔ اب منظروں کے بارے میں مثالی تفصیلات کی جگہ حقیقی تفصیلات کو فوقیت ملنے لگی تھی۔ اب قصیدہ نگار اولے پڑنے اور سورج نکلنے کے منظر کو ایک ہی سائنس اور کیفیت میں بیان نہیں کرتا تھا۔ قصائد میں ممدوحین کی شان

ہی زمین آسمان کے قلابے ملانے کا وقت لد گیا تھا نہ وہ ممدوح رہے تھے نہ ہی وہ ماحول، شاعروں نے ممدوحین کی انفرادیت کی توصیف پر توجہ کرنی شروع کی۔ جہاں بادشاہ اور سرپرست کا خوف اکثر و بیشتر خیال کی سچائی اور انفرادی صداقت کے اظہار کے لئے سدِ راہ تھا وہیں اب نئے سیاسی اور معاشرتی ماحول کی عکاسی کھلے بندوں ہونے لگی تھی۔ شاعری کذب و افترا کا دفتر بننے سے محفوظ ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں بادشاہت کے زوال کے ساتھ ہی صنف قصیدہ کا زوال شروع ہوا۔ تاہم جس طرح بعض [illegible] ایک طویل عرصہ تک بستر مرگ پر پڑے رہتے ہیں اسی طرح قصیدہ بھی اپنی آخری سانسیں گنتا رہا۔ نظم معری، آزاد نظم اور نثری نظم کے تجربوں اور دیگر اظہاری وسائل نے اس صنف پر کاری ضربیں لگائیں۔ شاعری پر محنت کرنے والے شاعر آہستہ آہستہ ختم ہوتے گئے۔ تاہم قصیدے میں موجود شہر آشوبی عناصر اور شکوہ و شکایت کا رجحان نئے ادوار میں مختلف صورتوں میں قائم رہا۔ آج بھی مدحیہ عناصر شاعری سے ختم نہیں ہوئے ان کی شکلیں، صورتیں اور اصناف بدل گئی ہیں۔

اس دور میں مذہبی قصائد بکثرت سے ملتے ہیں۔ حمد و نعت و منقبت کے قصائد علاوہ ازیں قومی، بہاریہ، وجدانی اور واعظانہ قصیدوں کی کمی نہیں ہے۔ دوازدہ اماموں کی شان میں بھی عمدہ قصائد ملتے ہیں اور حضرت علی کی منقبت میں بھی۔ تہنیت میلاد، حضور کے اسما کا بیان وغیرہ بھی قصائد کی زینت بنا ہے۔

غیر مذہبی قصائد میں نواب یوسف اور کلب علی خاں (رامپور) بہادر شاہ ظفر (شاہ ہند) شاہ رخ مرزا (یہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے قصائد ہیں) شیو دھان سنگھ (الور) تجمل حسین بہادر (فرخ آباد) امیر حسن سجر (والیٔ محمود آباد) یاور علی شتاب جنگ (حیدرآباد) کے علاوہ نرائن داس، حافظ محمد اکبر محمد حیات خاں، واجد علی شاہ (لکھنؤ) سید ذوالفقار علی خاں محبوب علی خاں (دکن) نواب سالار جنگ، حسین میاں (منگرول) مہدی علی خان، اسد علی خاں، شیو نرائن بہادر (انسپکٹر اسکول) مرزا محمد عباس (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) نواب صادق الدولہ، رابرٹ جارج گری، پرنس آف ویلز، ولیم ہینڈ فورڈ، ملکہ وکٹوریہ جان میور، رابرٹ بارلو، ڈی پی پرسنز وغیرہ کی شان میں لکھے گئے قصائد اہمیت کے حامل ہیں

۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۰۰ء کے قصائد میں عہد کے تہذیبی ماحول (قوال، مطرب، رنڈیاں، سارنگی، مردنگ، دو بدم موسیقی کے آلات، رقص و سرود کی محافل، اصطلاحات موسیقی، خرابات، کوائف حسی، متنوع مناظر (مقامی پھول، پرندے، موسم، تہوار) شادی بیاہ کی رسمیں شہروں میں ہونے والی علمی و ثقافتی ترقی، حالات غدر کی عکاسی، بازار، گلیاں، میلے ٹھیلے، بہت کچھ نظر آتا ہے۔ اس دور میں لکھے گئے بعض قصائد [illegible] مقاصد تھے

ممدوحین میں چونکہ ہر طبقے کے افراد شامل تھے اس لیے کئی جگہوں پر مدحیہ مضامین میں بھی رنگا رنگی ہے۔ بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں، فوجی افسروں، انسپکٹروں، مجتہد العصروں، کمشنروں وغیرہ کی تعریف میں قصیدہ نگاروں نے شخصی مراتب کا خیال بھی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض قصیدوں میں صنائع بدائع کا عمدہ استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ فلسفہ و تصوف اور نجوم و مذاہب کی اصطلاحات بھی کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔

فصل دوم] خصوصی مطالعے

اشرف علی مفتی عبدالفتاح الحسینی المعروف بہ اشرف علی گلشن آبادی [۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ میں ان کا دیوان دیوانِ اشرف الاشعار طبع ہوا[1]۔ اس میں فارسی اور اردو قصائد (نعت و منقبت) دستیاب ہیں۔ یہ قصائد بہیت مقفیٰ میں بھی ہیں اور مسدس و مخمس ہیئتوں میں بھی۔ اشرف علی گلشن آبادی نے ہیئت مقفیٰ میں بڑی تعداد میں (۱۰۰ کے قریب) قصائد لکھے ہیں۔ یہ قصائد مختصر بھی ہیں اور طویل بھی تقریباً تمام قصائد خطابیہ ہیں۔ نعت رسول مقبول، اہل بیت، منقبت ابوبکرؓ، عثمانؓ، عمرؓ، امام حسینؓ، غوث الاعظمؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ کے حوالے سے اشرف علی کے قصائد مختلف صنعتوں سے مزین ہیں۔ اشرف علی کو صنعتِ حرفین سے خاص شغف ہے صنعت حرفین میں قصیدہ کے ہر شعر کے آغاز اور اختتام میں کسی خاص حرف لانے کا اہتمام ہوتا ہے مثلاً اگر شعر کا پہلا حرف ش شروع ہوا ہے تو دوسرے مصرعے کا اختتام اسی حرف پر ہوگا۔ یہ اشعار دیکھیے

باراں ہے آج رحمت حق کا بڑے نصیب + حاظر ہوئے ہیں جان سے در مجلس حبیب [ب]

تارِ زلفِ عنبریں سے جب چلی بوئے صفات + میم احمد نافع مشکیں ہوا از ناف ذات [ت]

ثبت ہے عرش بریں پر نقش ایمان الغیاث + جس کو چاہے اس کو دے خلاق سبحان الغیاث [ث]

جمال مصطفائی سے ہوئی روشن شب معراج + جہاں جیسی ہو روز عید میں گلشن شب معراج [ج]

حد قیاس سے ہے فزوں حا بجا صلاح + شیدا ہوا ہے دل کیو اب اس کی کیا صلاح [ح]

خورشید کا بلند چہارم سما ہے کاخ + مور ضعیف کا یہ عجب زیر پا ہے کاخ [خ]

دل آدم میں حق نے معرفت کا گو کیا بنیاد + دمادم جان کو ہوئے وہاں تے زندگی امداد [د]

اسی طرح حرف ص، ز، ق، ض، ط، ز، ع کے حوالے سے اشرف علی نے صنعتِ حرفین کا استعمال کیا ہے اس صنعت میں لکھے گئے ان کے قصائد کے مزید مطالع ملاحظہ ہوں[2]

اے خدا کر فضل ہم پر از برائے مصطفا + آرزومندی میں جس کے آج تک ہیں انبیا

شام سے صبح تک دل نے کیا ایسا خروش + کہ بہ جز یادِ نبی اور نہ تھا کچھ مجھے ہوش

اشرف علی نے نعتیہ قصائد تہنیت میلاد کے حوالے سے بھی لکھے ہیں۔ حضورؐ کے اسماء کے بیان کے لئے بھی نبی کی خصوصیات بیان کرنے کے لئے بھی۔ حمد یہ قصیدہ پر قصیدہ موشح در مناجات لکھا گیا ہے اس میں صنعتِ ابجد استعمال ہوئی ہے۔ نعت نبی کے حوالے سے انہوں نے ایک قصیدہ ملمع بھی لکھا ہے۔ اشرف الاشعار میں اشرف علی نے مولانا شاہ عبدالحق کے قصیدہ کا ترجمہ بھی کیا ہے اور ایک جگہ قصیدہ بردہ کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان قصائد میں سے چند ایک مطالع یہ ہیں

الحمد اللہ بول کر لکھتا ہوں نعت مصطفےٰ + حق نے نبی کے نور سے پیدا کیا ارض و سما

---

(۱) دیوان اشرف الاشعار با اہتمام قاضی ابراہیم بلنداری مطبع حیدر (۲) الفیاض ۱۰

(یہ نعتیہ قصیدہ اشرف علی کے دیوان کے آغاز میں ہے یہ بلغ العلیٰ بکمالہ والے قصیدہ کے جواب میں لکھا گیا ہے
اس قصیدہ میں چار خلفا کی مدح میں بھی اشعار ملتے ہیں ۔

ے محبوب سبحانی بجا سلطان جملہ اولیا + دین نبی کے پیشوا بے شک ہو تم غوث الورا [در مدح غوث الاعظم]

سلطان ارض و آسمان حضرت محمد مصطفیٰ + مختار ہر دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ [قصیدہ نعت]

جب احد نے نور احمد کا بنایا ابتدا + حامد و محمود واحید نام عبداللہ رکھا [قصیدہ اسماء نبی ؐ]

[اس میں محمد، وحید، حامی، حاشر، عاقب، طٰہٰ، یٰسین، طاہر، سید، امی، طیب، مطہر، خاتم، کامل، جامع، خاتم مرسل، ناصر، منصور وغیرہ کے ناموں سے حضور کے اعمال کی وضاحت کی گئی ہے

ے آل نبی کی مدح میں جاری قلم ہوا + آیت مباہلہ کی ہے توصیف انما [در مدح آل نبی]

ے دلا ہستی سے اپنے ایکدم گر ترک ہو اگر + نہ رکھو تو چشم صورت پر نظر بر عین معنی کر

(اس قصیدہ پر لکھا ہوا ہے ترجمہ قصیدہ مولانا شاہ عبد الحق ؒ در ابتدا تمہید ا قصیدہ حقائق شروع کیا)

ے ہے محبت کس حبیب خاص کی اس جا بیاں + یاد میں جس کی ہوا خون بتری آنکھوں سے رواں [ترجمہ قصیدہ بردہ]

امام انبیا افضل شہ اعلیٰ محمد ؐ ہے + بشر کا بادشاہ بادل بڑا بینا احمد ہے [قصیدہ موشح در مناجات]

اشرف علی نے وصف محمود نبی بیان کرنے میں بڑی عقیدت سے کام لیا ہے ۔ انہوں نے حضور کی جامع الصفات شخصیت کے اوصاف بلیغ و جامع انداز میں پیش کیے ہیں ۔ ہم ان کے اشعار سے ان کے دینی احساس، مذہبی عقائد اور عقیدت مندی کے جذبات کو الگ نہیں کر سکتے ۔ اشرف علی نے حضور کی رسالت، محبوبیت اور عبدیت کو خصوصی طور پر اپنے نعتیہ قصائد کا حصہ بنایا ہے ۔ دیگر انبیا پر حضور کو جو فوقیت اور افضلیت ہے اس کا تذکرہ کیا ہے ۔ ان کے نور ہونے کو بار بار موضوع اظہار بنایا ۔ نور محمدی کے موضوع کے ساتھ ان کے رحمت للعالمین ہونے، محبوب خدا ہونے وغیرہ کے خیالات بھی ان قصائد کا حصہ ہیں ان کی وحی، معجزات، شفاعت، وسیلہ، علم و حکمت، امانت داری، جود و سخا، عفو و عفت، زہد و تقویٰ، مہر نبوت، سراپائے رسول کے معاملات کو خصوصی طور پر اپنے قصائد کا حصہ ٹھہرایا ۔

اشرف علی کے قصائد زیادہ طویل نہیں ہیں انہوں نے عام طور پر ۱۵، ۱۷، ۲۲، ۲۴ اشعار کے قصائد لکھے ہیں ۔

ان کے دیوان میں ۱۰ اور ۱۲ اشعار پر مشتمل قصائد بھی ہیں انہیں بہ اعتبار تعداد اشعار نعت و منقبت کی اصناف کے دائرے میں شامل کرنا چاہیے مولانا شاہ عبد الحق کے قصیدہ کا ترجمہ اور قصیدہ بردہ کا ترجمہ ان کے سب سے طویل قصائد ہیں ۔
اول الذکر کے ۵۵ اشعار ہیں اور ثانی الذکر کے ۱۸۸ اشعار ۔ کسی قصیدہ کو انہوں نے قومی کا نام دیا ہے کسی کو وجدانی کا کوئی بہاریہ قصیدہ سے موسوم ہے اور کوئی قصیدہ تسلیم ہے ۔ قصیدہ سلام، قصیدہ مدح تصلف اور قصیدہ وعظ بھی ان کے قصائد کے مختلف نام ہیں ۔ ایک نظم پر قصیدہ طرز ا لکھا گیا ہے اس کے ۱۱۱ اشعار ہیں اس میں انہوں نے اپنے دیوان کی تاریخ رقم کی ہے

نظام شاہ نظام

نظام شاہ نظام رامپوری م [۱۸۷۲] کا تعلق ریاست رامپور سے تھا۔ ان کے ممدوح نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں ہیں۔(۱) وہ شاعری کے اساتذہ میں سے ہیں۔ نظام اس دور کے شاعر ہیں جب شاعری میں قدیم و جدید کی آویزش دکھائی دینے لگی تھی۔ انہیں جدید اور قدیم رنگ کے درمیان ایک دلچسپ سمجھوتہ ہو گیا ہے(۲) اور یہ بھی کہ "ان کے کلام میں موجودہ انداز شاعری کے مقام سے آئندہ دور کی شاعری کا رنگ ڈھنگ نظر آتا ہے" اس ضمن میں جب ہماری نظر ان کے قصائد پر پڑتی ہے تو وہ متغزلانہ لفاظی اور طور اطوار کے پابند دکھائی دیتے ہیں۔ نظام نے کلب علی خاں کی مدح میں چار اور نواب یوسف ناظم کی مدح میں ایک قصیدہ سپرد قلم کیا۔ ان کے مطالع ملاحظہ ہوں

در مدح نواب یوسف ناظم ؎ جھلایا جائے کیاں دل سے وہ بت بے پیر + بگاڑیں وہ غضب اور ادا ہیں وہ تقویر

در مدح نواب کلب علی خاں ؎ جوشش نشو و نما ہے یہ چمن میں ہر جا + نگہت گل نے کیے ہیں پر بلبل پیدا

ایضاً ؎ سیل اشک و گرد غم سے ہے مکدر آستیں + دامن سیلاب صحرائی ہے ہم سر آستیں

ایضاً ؎ تری عمر ہو آسماں سے زیادہ + برس گانٹھ ہو کہکشاں سے زیادہ

ایضاً ؎ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ + دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ(۳)

نظام رامپوری کے قصائد کی تعداد علی جواد زیدی نے تین بتائی ہے جو حقائق کی روشنی میں غلط ہے(۴) انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے ممدوح صرف کلب علی خاں تھے۔(۵) یہ اطلاع بھی غیر تحقیقی ہے۔ نظام کے مطبوعہ دیوان میں مہاراج منا صاحب کی توصیف میں ایک قطعہ ہے جس کے ایک شعر کو علی جواد زیدی نے قصیدے کے شعر کے طور پر لیا ہے(۶) شعر یہ ہے

یہ رواں ہے کہیں نہیں رکتی + گویا میری زباں ہے وہ تلوار(۷)

نظام نے نواب کلب علی خاں کی مدح میں ایک مرصع قصیدہ لکھا ہے اسمیں صنعت توشیح کا استعمال بھی ہے اور بہت سی اور صنعتوں کا بھی۔ اس کا پہلا مصرعہ ہے "جوشش نشو و نما ہے یہ چمن میں ہر جا"۔ اس کے ہر مصرعے کے پہلے حرف کو اگر جوڑا جائے تو "جناب نواب مستطاب فیض مآب حضرت حاجی محمد کلب علی خاں صاحب بہادر نیر اعظم کشور ہند جی سی۔ ایس۔ آئی فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ فرماں فرمائے دارالریاست مصطفیٰ آباد عرف رامپور دام اقبالہم" برآمد ہوتا ہے
اس قصیدے میں صنعت غیر منقوط، صنعت منقوط، فوق النقاط، تحت النقاط، متصل الحروف، منفصل الحروف، جامع الحروف، ذو بحرین، واصل الشفتین، واسع الشفتین، تجنیس، مقلوب مستوی اور اضداد وغیرہ کا استعمال ہوا ہے
چند مثالیں ملاحظہ ہوں

واہ او کلک گہر سلک عطارد کردار + مطلع عالم کسی دعوم کا والہ لکھا [غیر منقوط]

پیش ہیں تخت نشیں زینت بخشش ذی نجف + بہ غضب تیغ زن چین جبین زیبا [منقوط]

داور داد رس و رب وجود و دادار + داده در روز ازل روزی اور اک اورا [منفصل الحروف]

میرا ممدوح امیر ابن امیر ابن امیر + میں کمربستہ کمیں خادم مدحت پیما [واصل الشفتین]

---

(۱) کلیات نظام مطبوعہ شمس المطابع مراد آباد۔ کلیات نظام مرتبہ کلب علی خاں فائق مجلس ترقی ادب (۲) نظام رامپوری از پروفیسر عبدالشکور مطبوعہ ہند کمرشل پرنٹنگ پریس رامپور (۳) یہ مطلع دونوں مطبوعہ دیوانوں میں نہیں ہے اس لئے کہ مراد آباد سے چھپنے والے نسخے سے قدوت رامپوری نے اور بعد ازاں کلب علی فائق نے مجلس ترقی ادب کے مطبوعہ ان کے کلیات سے اس قصیدے کی تشبیب کے اشعار خارج کر دیے ص ۸۷ قلم (۴) قصائد نگاران اترپردیش ص ۲۶۹ (۵) ایضاً (۶) ایضاً (۷) کلیات نظام مطبوعہ مجلس ترقی ادب ص ۹۳ قلم

؎ اس طرح کا ہے سخن سنج کہ جس کا ثانی + آج تک اہل جہاں نے کہیں دیکھا نہ سنا [واسع الشفتین]

ہم سے دشت کا سہیں دردِ یہ سا کت دشمن + اشک ہر گاہ رگ کا خاک رہا گرہ کشا [مقلوب مستوی]

ان فی الخلق لقد حاء عمیم الاشفاق + صاحب الخلق و الاحسان ملاذ الغربا [عربی]

ہو حیات ابدی حصہ احباب جناب + سر خود سر خود سر ہو حباب دریا [تجنیس]

نظام کے قصائد میں بہاریہ، افسانوی، شفایائی اور عشقیہ تشابیب ملتی ہیں۔ بہاریہ تشبیب میں انہوں نے جوشش موسم بہار، اثر باد بہاری، نکہت گل، گلشن کا شگفتہ ہونا وغیرہ کا حال بیان کیا ہے

؎ آشنہ خانہ ہے یا شہر حلب ہے گلشن + باغبانوں کو تحیر سے ہوا ہے سکتا

افسانوی اور عشقیہ تشابیب میں انہوں نے لکھنوی رنگ کی خارجیت سے کام لیا ہے۔

مدحیہ حصوں میں نظام نے ممدوح کی چشم عنایت، عدل، دولت، انتظامی صلاحیت، دینداری، تیغ، اسپ، فیل، وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے ایک قصیدے میں شہر رامپور کی تعریف بھی ملتی ہے[1]۔ وہ لکھتے ہیں کہ خدا کی خدائی میں کوئی ملک ہندوستان سے بڑھ کر نہیں ہے لیکن رامپور اسکا شہرہ وسعت میں پورے جہاں سے زیادہ ہے اس کی آب و ہوا کا یہ اثر ہے کہ ہر بوڑھا نوجوانوں پر سبقت لے گیا ہے۔ یہ اصفہان سے بھی زیادہ بارونق ہے اس کی دولت سرا کا دروازہ عظیم الشان ہے۔ اس شہر کے بازار پر رونق ہیں۔ اس کے باغ بے نظیر ہیں یہ سعدی کی بوستاں سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ ہر روز یہاں جلسے ہوتے ہیں نئے نئے میلے اور تماشے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی سڑکیں ایسی صاف ہیں کہ مسافران پر باد رواں سے تیز چلتے ہیں۔ یہاں جا بجا خوبصورت سرائیں ہیں کہ وہ مکینوں کو اپنے مکاں سے زیادہ لطف دیتی ہیں اور پھر نظام نے نواب کلب علی خاں کی جرأت سخاوت، اسی کی نقشبندیت، عبادت، ریاضت وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ نظام نے ایک قصیدے[2] میں اپنے پیر میاں احمد علی شاہ احمد کے عرس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس میں شیرینی روز عرس، قوال، مطرب، رنڈیاں، مشعلچی، نقارچی وغیرہ کے حوالے سے اشعار ہیں اور اس میں حسن طلب کا عمدہ نمونہ ملتا ہے

؎ قوال، مطربوں کو میں کیا دوں گا جز جواب + پھیلا کے منہ وہ مانگیں گے جس دم بڑھا کے ہاتھ

جب رنڈیاں کہیں گی کہ انعام پائیں ہم + نیچی کروں گا آنکھیں بغل میں دبا کے ہاتھ

نظام کے قصائد میں زبان سادہ اور شستہ استعمال ہوئی ہے۔ ان کے غزلیہ اسلوب نے ان کے قصائد کو نظموں جیسی سادگی عطا کی ہے۔ ادا بندی کہ محبوب کی شوخیوں کا بیان، کافر تیوروں کا تذکرہ ہو کہ اعضاء کے لوچ کا بیان، ہجر کے تجربات و خیالات ہوں یا وصل کے احساسات و جذبات نظام بے تکلفی سے ہر موضوع کو قلم کے دائرے میں سمیٹ لیتے تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے دہلوی زبان کا بھرپور استعمال کیا ہے جلیل مانکپوری نے لکھا ہے" اگر ان کا منتخب دیوان چھاپا جائے تو معاصرین میں وہ متمیز نظر آئے گا۔ داغ اور امیر معاملہ گوئی اور ادا بندی میں نظام کے متبع نظر آئیں گے اور تو اور منیر شکوہ آبادی بھی قیام رامپور میں اس کے کلام سے متاثر نظر آتا ہے"[3]۔ یہ رائے ان کی غزلیہ شاعری کی بابت ہے ورنہ قصیدے میں منیر شکوہ آبادی اپنے عہد کے منفرد اور یکتا شاعر ہیں

---

(1) کلیات نظام ص ۲۰۴ (2) ایضاً ۱۸۴ (3) ایضاً ۵۸

حکیم آغا جان عیش

حکیم آغا جان عیش [م ۱۸۷۴ء][1] بلند پایہ طبیب اور پختہ کار شاعر تھے۔ ابتدا میں نواب جھجر کے ملازم ہوئے بعد میں دہلی میں شاہی طبیب بنے۔ وہ رحمت اللہ مجرم اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان (قومی میوزیم) کے مملوکہ دیوان عیش میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے اور گیارہ قصائد[2] بہادر شاہ ظفر کی شان میں ہیں۔ وہ کسی زمانہ میں شاہ رخ مرزا کے مصاحب بھی تھے ایک قصیدہ اس کی تعریف میں ہے عیش نے بہاریہ تشابیب پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ انہوں نے یہ قصائد مختلف مواقع پر دربار میں پیش کیے۔ عیدالاضحیٰ، غسل صحت، عید الفطر، شاہی سالگرہ پر اور مرزا فرخندہ شاہ کا معالج مقرر ہونے کے ہدیۂ تشکر کے بطور وغیرہ۔ ان قصائد کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ ان میں دلی کی تہذیبی زندگی کے چند گوشے بے نقاب ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے شاہی دربار میں ولی عہد کہاں کھڑا ہوتا تھا، شاہ رخ مرزا، مرزا فخرو اور فرخندہ شاہ کی جگہیں کہاں تھیں۔ وزرا، مصاحب، درباری، اراکین حکومت تخت کے دائیں بائیں دو صف باندھ کر کھڑے ہوتے تھے۔ دربار میں نجومی اور رمال، پنڈت اور ملا کیا کیا مناصب ادا کرتے۔ جشن کی حالت میں بھانڈ، طوائفیں نقال، قوال اور دیگر ارباب عیش و نشاط اپنے اپنے فن سے بادشاہ اور درباریوں کو محظوظ کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لال قلعہ میں عید سے تین روز قبل تورہ بندی کی رسم ہوتی تھی جلوس جشن سے دو روز پیشتر دال بھیگتی تھی اس کے دوسرے دن اس کی پیٹھی پیسی جاتی تھی اور پھر اسے بڑے کڑاہے میں ڈالا جاتا تھا۔ خوشی اور شادی سے پہلے رت جگا بھی ہوتا اور اس دن سب کو جمال شاہ دیکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ بادشاہ کی رونمائی دیوان خاص میں ہوتی۔ سب سے پہلے وہاں تخت طاؤس لایا جاتا ہے

پھر اس کے بعد مقرر ہیں جو قرینے وہاں + کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح سب قرین وصال

ہیں آگے سب سے ولی عہد عصر تخت کے پاس + بہ زیر سایۂ ظل خدائی با افضال

کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح شاہ رخ مرزا + بہ صد متانت و تمکین و عزت و اجلال

اور ان کے پاس کھڑے ہیں گے فخر دیں مرزا + بہ پیش تخت شہنشاہ دیں پر اسی منوال

جناب مرزا فرخندہ شاہ عالی قدر + کہ ان پہ چشم عنایت حضور کی ہے کمال

کھڑے ہوئے ہیں وزیر الممالک اور بخشی + ہر ایک اپنی جگہ شاد و غم سے فارغ بال

حکیم اور اراکین سلطنت سارے + کھڑے ہوئے ہیں قرینے سے سب جنوب و شمال[3]

اپنے قرینے سے خواص بھی کھڑے ہوتے کسی کے ہاتھ میں اگالدان ہوتا، کسی کے رومال اور کوئی مورچھل لئے کھڑا ہوتا۔ ایک سمت خوش نویس اور شاعر کھڑے رہتے۔ کہیں نجومی ہوتا کہیں رمال۔ نجومیوں میں جو ہندو ہوتے وہ قدم بجز الجزا، ہاتھ کو نکال نکال اپنی بولی میں آشیرواد دیتے۔ ؎ اور کہتے ہا کہ رکھو جلوہ یہ قائم سدا سری گوپال

---

[1] سخن شعراص ۳۴۷ [2] انسر اور دو ہوئے بہادر شاہ ظفر کی شان میں عیش کے قصائد کی تعداد بارہ بتائی ہے (حالانکہ ان میں سے ایک شاہ رخ مرزا کی شان میں ہے۔) بحوالہ مخطوطات انجمن جلد اول ص ۴۱۹
[3] حکیم آغا جان عیش اور ہر بانہ کے مشاہیر از بلجیت سنگھ مطہر ص ۴۹ ۔ ۵۵ کا بابا بیلی کیشنز بہادر گڑھ ہریانہ

دربار میں ایک طرف جرس اور ایک طرف ناقوس بجتا۔ کوئی رباب بجاتا اور کوئی گھنٹال، طوائف و قوال خوشی میں چمک چمک کے اپنی جگہ گاتے ناچتے۔ بہروپیے، بھانڈ اور نقال بھی اپنا فن دکھاتے۔ خوشی کی نوبت جھنگڑ جھنگڑ بجتی، طاؤس تال کے ساتھ جا بجا بھی نظر کرتی۔ شہنا نواز کھلا کھلا کر گال شہنا میں گاتے " کہ ہو ویں شادیاں مبارک " حتیٰ کہ تخت پر بنے ہوئے طاؤس بھی اپنے پر و بال کھول کر ناچنے لگتے

> کھلا اپنی جگہ اس ہجوم خلقت میں + لیے کھڑے ہیں وہ با اہتمام چوبداں لال
> ہر اک کا ہوتا ہے آداب گاہ سے مجرا + بہ پیش گاہ شہنشاہ صاحب اقبال
> وہاں کھڑے ہوئے ہیں چوبدار اور نقیب + خوشی سے اپنی جریب اور چھڑی سنبھال سنبھال
> پکارتے ہیں کہ آداب سے کرو مجرا + جہاں پناہ سلامت کا ہو فزوں اقبال ①

سلامی کے لئے کہیں تو پیں کھڑی ہوتیں، کہیں شترنال اور گجرنال، اور کوہ پیکر ہاتھی ڈھالوں سے سجے صحن میں مجرے کے لئے حاضر ہوتے۔ اسی طرح خوش رفتار (گھوڑے) بھی موتیوں جڑے ہوتے ان کی پرت پھرت میں محبوبانہ چالیں ہوتیں انہیں دیکھ کر سمند ناز بھی چال بھول جاتا۔ محل میں جو نہریں بہتیں ان کا پانی آب زلال لگتا۔ شاہی قلعے سے ملا ہوا جمنا کا پانی بھی خوشیوں میں شریک ہوتا۔ اس کے بعد دعا یوں کی گئی ہے

> یہی دعا ہے طفیل محمد عربی + رہے مزاج مقدس خوشی سے مالامال

اس قصیدے کے آغاز میں ہلال عید کی تعریف کی گئی ہے۔ اس میں بہادر شاہ ظفر کو حامیٔ دین متین بھی کہا گیا ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے

> ہلال عید کو ہوتا کبھی نہ شرف کمال + رکاب سے تری دیتے اگر نہ اس کو مثال

عیش نے بہادر شاہ ظفر کی صحت کی خوشی میں جو قصیدہ لکھا اس میں بھی اس دور کے ارباب نشاط کی تصویر کشی کی ہے

> کہ سارے جمع ہیں اس جا نشاط کے ارباب + سو ان کی شرح کروں تا کجا کہ عقل ہے دنگ
> الاپتا ہے کوئی بھیروں کوئی رام کلی + کوئی بھبھاس کوئی ٹھاٹھ اور کوئی سارنگ
> جو گانے والے ہیں ٹھپوں کے ان میں گاتا ہے + کوئی نشاط کوئی بردہ اور کوئی سینگ
> پہ گا رہا ہے بس اس بزم عشرت افزا میں + کوئی خیال کوئی دھرپت اور کوئی چترنگ
> بجا رہا ہے کوئی بین اور کوئی قانون + کوئی رباب بجاتا ہے اور کوئی چنگ ②

اس قصیدے میں سارنگی، مرچنگ، اوپنگ، سنگت، درستیٔ ساز، تحفہ سازی وغیرہ کے بھی حوالے ملتے ہیں۔

حکیم آغا جان عیش کے قصیدے اسالیبی اعتبار سے قصیدے میں نظمیہ روایت سے ہم آہنگ ہیں انہوں نے عالمانہ اور فاضلانہ لفظیات کا سہارا نہیں لیا۔ یہاں تک کہ طبیب ہوتے ہوئے انہوں نے طب کی اصطلاحیں بھی بہت کم استعمال کی ہیں۔ ان کا جمالیاتی اظہار ان کے قصائد میں شاعرانہ نفاست کا باعث ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول کی بعض تفاصیل کو انہوں نے ایک مثنوی نگار کی طرح سے پیش کیا ہے

---

① حکیم آغا جان عیش اور ہریانے کے مشاہیر ص ۵۰ ② ایضاً ص ۷۹

آغا جان عیش کے چند قصائد خطابیہ ہیں اور چند تمہیدیہ۔ تمہیدیہ قصائد میں وہ فرش بچھانے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی زیادہ تر تشابیب بہاریہ اور خمریہ ہیں۔ ان کا ماحول عیش و نشاط کا ہے۔ ان کی امیجری کا رنگ شوخ ہے۔ ان کے تمہیدیہ قصائد کے مطالع دیکھئے

در مدح بہادر شاہ ظفر ؎ نسیم صبح ہوئی آج یہ نوید رسا + کہ ہے بہار کی آمد کا ہر طرف جلسہ

ایضاً ؎ جہاں میں دیکھو تو الفتہ رنگینیٔ ابر بہار + کہ دھو دیا ہے زمیں تو زمیں دلوں کا غبار

ایضاً ؎ نسیم صبح نے دی آج وہ خوشی کی خبر + کہ غنچہ ہائے دل بستہ کھل گئے یکسر

ایضاً ؎ کروں بہار کے عالم کو میں اگر تحریر + تو ہوئے نغمۂ بلبل قلم کی سریر

ایضاً ؎ ہلال عید نے کہتے ہیں یہ دیا ہے پیام + کہ ساقیٔ خیر کے رخصت ہوا ہے ماہ صیام

ایضاً ؎ عجب طرح کا ہوا ہے ظہور عالم میں + کہ آج صبح سے برسے ہے نور عالم میں

ایضاً ؎ لکھے ہے باد خط گلزار اشتہار اب کے + زمیں کے صفحہ پہ یوں واقعہ نگار اب کے

ایضاً ؎ نسیم صبح نے دی آج وہ خوشی کی ترنگ + کہ غنچہ ہائے دل بستہ کھل گئے گل رنگ

غیر تمہیدیہ قصائد ؎ ہلال عید کو ہوتا کبھی نہ شرف کمال + رکاب سے ترے دیتے اگر نہ اس کو مثال

ایضاً عید الضحیٰ کے سنتے ہی ہو مضطر آفتاب + آیا ہے بہر طوف رخ الورٰ آفتاب

ایضاً نہ کیوں ہو تیری عنایت کا مجھ کو شکر ضرور + کہ تیرا شکر ہے بس عین شکر رب غفور

در مدح شاہ رخ مرزا کروں جو صفحۂ کاغذ پہ تیری مدح رقم + عجب نہیں ہے کہ ہو درفشاں زبان قلم

عیش کی امیجری میں خمریات کے حوالے کثرت سے آتے ہیں جوانان بادہ نوش، صراحی غنچہ، ساغر گل، شراب روح افزا، شیشۂ مے، خماری انگڑائیاں اور ساغر گلنار وغیرہ۔ تشبیب لکھتے ہوئے جب وہ بہاریہ منظروں کا بیان کرتے ہیں تو پر طاؤس، بلبل تصویر، قمریوں کی کوکو، لالہ، گل، حنا، گلاب، عندلیب، حنظل، آبنوس، سنبل، نرگس شہلا، پستہ، بادام، زمرد، درشہوار، یاقوت، لعل، عنبر سارا، مشک تتار، خانۂ عطار، خط گلزار، نسیم وغیرہ کے الفاظ عموی طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک جگہ تشبیب میں انہوں نے سراپا بھی لکھا ہے، اس میں دوشیزۂ خوش رو کی جبیں، انگڑائیاں، مکھڑا، زلف، چوٹی، ناک، لب، دندان، کان، ذقن، گردن، بازو، بغل، ساعد سیمیں، پنجہ حنائی، صفائی سینہ، بحر حسن کے حباب، کچیں، پیٹ، ناف، کمر، سرین، ران، ساق، پشت پا، کف پا، قد موزوں اور خرام ناز وغیرہ تشبیہاتی و استعاراتی وصف نگاری کی گئی ہے۔ اس میدان میں وہ سودا، مصحفی اور انشا کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ عیش کی تشابیب میں سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎ یہ جوش فرحت بے حد ہے اہل فقر میں آج + کہ بس خوشی سے زمیں پر اچھل رہے ہیں ملنگ

؎ ہوا ہے فیض ہوا سے یہ جوش نشو و نما + کہ بن کے نکلے ہے پتھر سے خود بخود شیشہ

وہ جن کا قول ہے ہوتا ہے انطباع صور + خروج نور کے قائل ہوئے ہیں وہ حکما

اپنی تشابیب میں تصور، مس، گجر، شیشہ ساعت، اشتیار، گنجفہ باز، لوح، قشقہ، مونگا، ساوری، ماہ، موتی
واغظ، ہتمد، احرام، سبحہ سیارہ، شہاب ثاقب، عقد پروین، ترازو، ضیغم، ناگن، مور وغیرہ کے الفاظ بھی مختلف
تصویریں بناتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر گریزیں مکالماتی ہیں جہاں پیر خرد یا کوئی اور شخص انہیں آمادہ بہ مدح کرتا ہے
حصہ مدحیہ میں عیش روایتی الفاظ و خیالات ہی استعمال کرتے ہیں

وہ کون سایۂ حق نائب رسول خدا + سراج الدین بہادر شہنشہ والا

علاوہ ازیں وہ ان کے عدل، سخاوت، شجاعت کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ انہیں سراج دین متین محمد مختار
کہتے ہیں۔ جہاں پناہ، جہاندار، مطلع انوار، خدا شناس، خدا ترس، زبدۂ اسرار، سلیم طبع، حمیدہ خصال
نیک گہر، بلند ہمت، نیکو پسند، نیکو کار وغیرہ کے الفاظ سے ان کی شخصیت کی خوبیاں واضح کی گئی ہیں

؎ خدا دوام رکھے اس کا دور عالم میں + ہے اس کی ذات مقدس سے قوت اسلام
فزا وہ رتبۂ عالی ہے شاہ رخ وزا + نہ ہو سکے ترے ہم جنب رتبہ رتبۂ جم
اس کی تیغ سیاست نے تو مٹائے ہیں + پڑے ہوئے تھے یہ جو جو فتور عالم میں
ناقل ۔ سمجھتے اس کو ہیں ہندو کہ ہے گنیش یہی + نہ پوجیں اس کو بھلا کیونکہ ہے وہ ان کا دھرم

اس حصہ میں عیش نے مدحیہ موضوعات کے بیان میں حاتم، کیقباد، کیخسرو، نوشیرواں، سکندر، فیض، خاقان چین
وغیرہ کے الفاظ سے بھی مدد لی ہے۔ دعائے خیر، حلال و حرام، ذبح، غسل و وضو، بہشت و دوزخ، سورہ طہٰ،
سورہ اخلاص، آیہ تطہیر اور سورہ یٰسین کا تذکرہ بھی نظر آتا ہے۔ خاص طور پر دعائیہ حصوں میں وہ قرآنی
حوالے زیادہ لاتے ہیں ؎ دعائیں عیش کی ہوویں قبول ہیں یا رب + بحق سورۂ یٰسین و سورہ طہٰ،

ایک اور انداز کی دعا ملاحظہ ہو ؎ الہٰی رہیو جہاں ہیں یہ جب تلک جاری + زمیں کی سطح پر آب جمن اور آب گنگ
شگفتہ رہیو سر شاخ غنچہ جب تک اور + ترانہ سنج رہیں بلبلان خوش آہنگ
رہے یہ زیر نگیں تیرے ہند سے تا چیں + بس اور چین سے تا روم اور روم سے تا فرنگ
غرض دعا ہے یہی عیش کی شہا کہ مدام + قدم سے تیرے رہے زیب و زینت اورنگ

عیش نے اپنے قصائد میں صنعتوں کا ماہرانہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ذوق محاورہ بندی بھی نکھرا ہوا
تھا۔ ان کے ہاں زبان عمدہ استعمال ہوئی ہے تاہم کہیں کہیں مقامی لہجوں نے بھی اپنا زور دکھایا ہے
عیش کے قصائد کی تہذیبی حوالوں سے جو اہمیت ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ لسانی اور موادی حوالوں
سے بھی ان کے قصائد دور جدید میں لکھے جانے والے نظیر، تاثیر سے محمود قصائد کے اولین نقوش میں سے ہیں
عیش نے اپنے عہد کی دلی کی تہذیبی زندگی کے عمدہ حوالے مہیا کیے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے درباری
ماحول کا جو موثر اور بلیغ نقشہ کھینچا ہے وہ قصائد کی دنیا میں کم کم ہی نظر آتا ہے

غلام امام شہید

غلام امام شہید م [۱۸۷۶] مصحفی کے شاگرد تھے[1] عمدہ نعتیں اور نعتیہ قصائد لکھنے میں معروف تھے غزلیات و قصائد کا ضخیم کلیات ان کی یادگار ہے[2] ان کے قصائد نعتیہ[3] ان کے مذہبی اور عقیدت بھرے جذبات کے عکاس ہیں۔ ان کا بیانیہ انداز مترنم ہے اور شاعرانہ طرز اظہار رنگین و لطیف، عشق رسول اور مذہب سے والہانہ وابستگی نے ان کے قصائد میں شوق و سرمستی کی کوائف پیدا کر دیے ہیں، روضۂ رسول کا بیان ہو یا شہر مدینہ کا تذکرہ ان کا فریفتگی سے پُر اظہار خیال ان کے پرشور جذبۂ مذہبی کا آئینہ دار ہے۔ صاحب تذکرہ محبوب الزمن[4] اور صاحب بزم غالب[5] نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ شہید نے طویل بحریں بھی بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کی ہیں۔ اس میں رنگین اور فصیح طرز بیان دیدنی ہے۔

> آئی بہار اب پر چمن ہے بلبل و گل کا وطن، دیر و حرم سے نعرہ زن آتے ہیں شیخ و برہمن
> زاہد سے کہدو یہ سخن ہے فصل گل تو بہ شکن گر چاہے عیش جان و تن میخواروں کا سیکھے چلن
> ساقی جو شوخ و شنگ ہے مست میئے گل رنگ ہے مطرب جو خوش آہنگ ہے محو نوائے چنگ ہے
> دل عیش کا اورنگ ہے، غم خستہ و دل تنگ ہے بلبل ہے خوش دل رنگ ہے شادی سے گل یہ خندہ زن

مدح

> نور خدا پیدا ہوا، خیر الوری پیدا ہوا، بحر عطا پیدا ہوا ابر سخا پیدا ہوا
> نجم الہدیٰ پیدا ہوا، بدر الدجیٰ پیدا ہوا، شمس الضحیٰ پیدا، پیدا ہوا شاہِ زمن

ایک اور قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں اس میں چھوٹی بحر کا استعمال ہے

> چمن میں آج کیا شورِ فغاں ہے + کہ گل خنداں ہے بلبل نغمہ خواں ہے
> طرب انگیز ہے پھولوں کی خوشبو + نشاط آمیز رنگ گلستاں ہے

اس قصیدے میں شہید نے ایک عالیشان مکان کا بھی نقشہ کھینچا ہے اور گریزیوں کی ہے

> نہ جنت ہے نہ ہے عرش معلیٰ + محمد مصطفٰے کا یہ مکاں ہے

اس کے بعد حضور کو دو جہاں کا بادشاہ، قبلہ گاہ مقبلاں، قدیم بزم کی شمع، مالک کون و مکاں کہا ہے مزید برآں وہ کہتے ہیں

> محمدؐ ہے دوائے دردمنداں + محمد چارۂ بے چارگاں ہے
> محمد سے ہوئی تکوین کونین + محمد مدعائے کن فکاں ہے

ان اشعار میں تکوین، کون و مکاں، کن فکاں وغیرہ کے الفاظ تہذیبی حوالے سے مسلم تصوف و مذہب سے متعلق ہیں۔ غلام امام شہید نے فضائل نبوی کے پرتاثیر اظہار میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ انہوں نے صنف نعت میں بھی سراپائے رسول کا شاعرانہ عقیدتوں سے بھرا بیان کیا ہے اور اس گراں مایہ ہستی کا حسن و جمال لفظوں کے دائرے میں منتقل کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے اس اجتہادی اور انفرادی رنگ کو بعد کے شعرائے بھی اپنایا

---

(۱) داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری ص ۲۴۸ (۲) ایضاً ص ۲۴۹ (۳) قصائد نعتیہ غلام امام شہید مطبوعہ اسلام پریس آگرہ قصائد نعتیہ مطبوعہ نظامی پریس کانپور
(۴) تذکرہ شعرائے دکن جلد اول ص ۷۔۴۶۹ (معروف بہ محبوب الزمن)
(۵) بزم غالب ذکر شہید

غلام مولیٰ قلق

غلام مولیٰ قلق عرف مولا بخش [م ۱۸۷۹] مومن خاں مومن کے شاگرد تھے۔ ان کی پیدائش تو میرٹھ میں ہوئی تاہم تعلیم دہلی کالج میں پائی۔ ان کے کلیات میں ۷ قصائد دستیاب ہیں۔ ان کے ممدوحین نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، لالہ نرائن داس، حیات خاں گرداور، حافظ محمد اکبر ضلع دار نہر گنگ، نواب کلب علی خاں آف رامپور، رابرٹ جارج کرگی، انہوں نے قصائد میں مشکل اور آسان ہر دو اسالیب برتے ہیں۔ اب قصیدہ ریاستی نوابوں کے ساتھ ساتھ ضلعی حکمرانوں اور عام اشخاص کی شان میں بھی لکھا جانے لگا تھا۔ قلق کے قصائد کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس کے روایتی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا۔ تمہیدیہ قصائد تشبیب، گریز، مدح اور دعا وغیرہ کے اجزا سے مزین ہیں۔ غیر تمہیدیہ قصائد میں بھی مدح، دعا اور حسن طلب کی روایتی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مدحیہ حصوں میں انہوں نے وصف تیغ، تعریف اسپ اور توصیف فیل وغیرہ کا اہتمام بھی کیا ہے۔

در مدح شیفتہ — جو تیری تیغ نکل آئے فرق دشمن پر + تو جرم نالہ سے ہو لخت لخت صدفریاد

حیات خاں گرداور — سایہ گھوڑے کا اگر اسپ پہ تیرے پڑ جائے + اثر سم سے ہے چرخ پر بیں سینۂ باز

نواب کلب علی خاں — اس کی خرطوم شب تار دراز ایمن + اس کے دو دانت دو دست ید بیضا بر شکل

ممدوحین کی شخصیت کے حوالے سے سخاوت، اوج رتبہ، عدل، بہادری وغیرہ کی تعریف بھی روایتی ہے

لالہ نرائن داس — میں تیرے خلق کی کیا عطر سائیاں لکھوں + ہر اک قدم پہ ہے گلزار خطۂ کشمیر

حافظ محمد اکبر — ہوا ہے تازہ وہ تر خانہ خانہ کشت امید + کہ کو چہ کوچہ نکالی ہے تو نے نہر گنگ

[illegible]

رابرٹ جارج کرگی — تیرے دربانوں میں دارا و ارباب بے وقار + تیرے خداموں میں کسریٰ راندۂ خدمت گری

قلق نے اپنے لامیہ قصیدہ میں بہاریہ تشبیب کا اہتمام کیا ہے

تیغ خورشید حمائل کیسے بیٹھا ہے حمل + خیمہ گاہ دے و بہمن میں پڑا ہے ہلچل ②

اس میں تزاں خزاں، سواد دیدہ، جبہ روز، باد کہسار، جوش بہاراں، فتنۂ نرگس، خنجر بید، صحن چمن خانہ، رنگ گل، بیل، تاک، دامن باد سحر، زاہد خود بیں، سر سطح جبل وغیرہ کے الفاظ و تراکیب عمدہ طور پر استعمال ہوئے ہیں

بلبلوں کی ہے زباں پر سے زمزمۂ زبور + سر بسر ہر ورق گل ہے کتاب منزل

برہمن زادہ تھا تیر پہ لگا یا ہے غبار + یعنی اب سطح زمیں ہو گیا لوح صندل

رابرٹ جارج کرگی کے قصیدے میں قلق نے اس کی شان و ایوان، روشن رائے، انتظام، عدل، تیغ، خنگ، فیل وغیرہ کا تذکرہ اس طور کیا ہے کہ جیسے وہ کسی مقامی امیر اور نواب کی مدح کر رہے ہوں۔ یہ قصائد نازک خیالی، دقت آفرینی، رنگینی تراکیب، شادابی مضمون، فصاحت، بلاغت اور متانت کے اعتبار سے عمدہ ہیں مگر روایتی ہیں۔

خواجہ ارشد علی تملق

خواجہ ارشد علی خاں تملق [م ۱۸۹۲ء][1] کا دیوان مظہر عشق زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس میں تملق کے واجد علی شاہ کی مدح میں چھ قصائد ملتے ہیں جن کے اولین مطلعے ہیں

ع زیبس ہے جوشِ بیان روز وں خون رنگ بہار / ع نو بہیز آئی ہے امسال بہارِ گلشن / ع پلا دے ساقی مہوش مجھے شراب طہور / ع قربانیاں عشق کا میلا لگا رہے / ع انشاد عنان کمیت قلم / اور ع خدیو جہاں شاہ عالم پناہ[2]

تملق خواجہ وزیر لکھنوی کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ ایک قصیدے میں انہوں نے واجد علی شاہ کی شاگردی پر بھی فخر کیا ہے

ع تراب مثہ تھا کہ سلطان عالم و عادل + بنائیں بیت مبارک سے خود ترے اشعار
خوشا نصیب و خوشا قسمت و خوشا طالع + کہ ہو حضور کے شاگردوں میں ترا بھی شمار [مظہر عشق ص ۵]

اس بیان کو سکینہ نے خوشامد اور زمانہ سازی پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ واقعیت سے دور ہے[3]۔ سکینہ نے ان کی زبان کی خوبیوں کی تعریف کی ہے اور ان کی معروف مثنوی طلسم الفت میں انہیں ابتذال اور رکاکت کے عناصر ملے ہیں[4]۔ قصائد میں انہوں نے اپنی مثنوی نگاری کی مہارت کا استعمال بھی کیا ہے۔ ان کی بعض تشابیب متعالی ماحول اور عناصر کا پرتو رکھتی ہیں

ع نو بہیز آئی ہے امسال بہارِ گلشن + غیرت طائر زریں ہے ہر اک مرغِ چمن [مظہر عشق ص ۵]

اسمیں تملق نے ان خیالات کا اظہار بھی کیا ہے کہ جب کوئی سمن کا پتہ ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے تو باغبان کو احتمال ہوتا ہے کہ تارا ٹوٹ گرا ہے۔ یا جب چاندنی کا پھول پتوں کی چلمن کے پیچھے جا چھپتا ہے تو گلچیں کو شبہ ہوتا ہے کہ چاند گہنا گیا ہے۔

ع طرب انگیز ہے ایک ایک ہوا کا جھونکا + شورش برگ درخشاں ہے صدائے ارغن
فصل گل باغ میں کیا آئی ہے اک ہولی ہے + رنگ گل کھیلتے ہیں سارے جوانانِ چمن
باغباں مست، صبا مست، شمیم گل مست + بلبلیں نغمہ سرا کبک دری قہقہہ زن۔ [مظہر عشق ص ۵]

اسی تشبیب میں تملق نے بعض متعالی پھولوں، پرندوں، موسموں اور تہواروں کا تذکرہ عمدہ انداز سے کیا ہے۔ گریز مدح اور حسن طلب و دعا کے اجزا میں بھی روائتی وتیرہ اپنایا گیا ہے۔ شبیر علی خاں نے خوش لکھتے ہیں انہیں "سب اصناف سخن پر قدرت تھی۔ اپنے قصائد میں بعض جگہ انہوں نے فارسی تراکیب و الفاظ کے استعمال سے شکوہ پیدا کیا ہے۔ منظوری کی عکاسی میں ارشد علی خاں تملق زیادہ روائتی تمثالوں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں۔ خمریات، تعشق اور کوائف حسن کے بیان میں تملق نے اپنے استاد سے بھی استفادہ کیا ہے یعنی خواجہ محمد وزیر سے جن کے بارے میں مصحفی کا کہنا ہے "وہ نئے معانی کے متلاشی تھے"[5]

---

[1] بحوالہ اخبار دبدبۂ سکندری ۱۷ نومبر ۱۸۷۹ تاریخ ادب اردو حاشیہ ص ۱۹۳ [2] مظہر عشق حدیوان تملق ص تا ۱۵ مطبوعہ منشی نولکشور [3] تاریخ ادب اردو ص ۱۹۳ [4] ایضاً [5] ریاض الفصحا ص ۲۵۷

قربان علی سالک

قربان علی سالک [م ۱۸۸۰ء] دکن میں پیدا ہوئے دہلی میں تربیت حاصل کی[1] مومن و غالب کے شاگرد رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد الور میں سررشتہ دار محکمہ تعلیم مقرر ہوئے۔ "ہنجار سالک" "میخانہ سالک" "دیوان سالک" اور بعد ازاں ۱۹۶۶ء میں کلیات سالک کے نام سے ان کا کلام منظر عام پر آ چکا ہے۔ ان کے کلیات میں دس قصائد موجود ہیں ایک حمد ایک نعت دو کلب علی خاں دو شیودان سنگھ بہادر والئی الور اور چار میر یاور علی خاں شباب جنگ مدار المہام علاقہ متفرقات حیدر آباد کی شان میں ہیں نعت حمدیہ قصیدہ میں انہوں نے خدا کو "راہبر" "محیط کونین" "ہر جگہ موجود" "محلات میں عقدہ کشا" "رزق رساں" "مقرب چرباو دافع تیرگی گفت" "حامل قہر و لطف" وغیرہ کے الفاظ سے پکارا ہے اسی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

جب خامہ راحمد نگاری کو جھکا ہو + تسلیم کو پھر کیوں نہ فلک اور بھی دوتا ہو

جس قافلے کو تیری ہدایت پہ ہو تکیہ + اس کو نہ کبھی حاجت آواز درا ہو

طوفاں ہو کبھی کے یہ کشتی ہو کسی کی + فرعون کو ہو نیل تو موسیٰ کو عصا ہو

نعتیہ قصیدہ کی تشبیب میں سالک نے اپنی کسمپرسی اور حالت زار کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ناوک تقدیر ہیں زمانہ ان کا عدو ہے۔ کوئی غمگسار نہیں ہے۔ کوئی کان دھر کر بات نہیں سنتا۔ کوئی نیک خواہ نہیں ہے اب تو حرف زہر خواری علاج ہے۔ "میرا ہر اچھا کام برا ہو جاتا ہے۔ نحوست دامن گیر ہے خشک یہ کہ

جاؤ جب عین موسم گل میں + رشک ملتان ہو خطۂ کشمیر

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ سخنوری کا جرم کیا ہے۔ سالک گریز یوں کرتے ہیں

غلطی کی وگرنہ تکفی لق + نعت شاہنشہ فلک توقیر

اس قصیدے میں حضور کو احمد مرسل، فلک رتبہ کہا گیا ہے اور یہ بھی کہ خدا ان کی بات بات پر عاشق ہے انہوں نے انگلی سے چاند کے دو ٹکڑے کیا

اس نعتیہ قصیدہ کا مطلع ہے سہ قدر انداز چرخ ہیں تخچیر + اب نہیں ہے نجات کی تدبیر

کلب علی خاں کی مدح میں جو قصائد لکھے ان میں سے ایک کی تشبیب بہاریہ ہے

ہوا ہے موسم گل سے زمانے کا یہ حال + کہ صحن گلشن جنت بنے ہیں دشت و جبال

ان کی شان میں دوسرا قصیدہ شکایت روزگار کی تشبیب کا حامل ہے سہ ہوں تیرہ روز کیا ہو عنبا گستر آفتاب + جاتا ہے میرے سائے سے بھی بچ کر آفتاب

شیودان سنگھ اور نواب میر یاور علی خاں کی شان میں لکھے گئے قصائد میں بھی سالک نے اکثر جگہوں پر شکایت روزگار کا موضوع چنا ہے[3][4] غیر مذہبی قصائد میں سالک نے ممدوحین کے لئے آسمان پایہ، بلند مرتبہ، سکندر و دارا حشمت وغیرہ روایتی انداز میں کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ کلب علی خاں کو انہوں نے سحاب نوال بھی کہا ہے۔ سکینہ لکھتے ہیں سالک کا کلام "خیال اور زبان دونوں اعتبار سے اچھا ہے مگر جدت سے خالی ہے"[5]

---

(۱) گل رعنا ص ۳۴۲ اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء (۲) کلیات سالک مرتبہ کلب علی خاں مجلس ترقی ادب لکھنؤ ۱۹۶۶ء
(۳) شیودان سنگھ کی شان میں ان کے دو قصائد کے مطالع ہیں سہ جو میرے غم کی سنے داستان طولانی + تو کم خضر الہی کو اس کی ارزانی
سعادت نرم دستور کھتا ہوں سحر تک بیدار + نالہ اس بے اثری میں بھی نہیں ہے بیکار
(۴) نواب میر یاور علی خاں کی مدح میں چار قصائد کے مطالع :- جلی ہے خرمی یہ کس کے در پر + نشاط عید اضحیٰ آج بن کر
(ب) برتر ہے لامکاں سے مکان شباب جنگ + بڑھ کر زمیں سے کیوں نہ ہو شان شباب جنگ (ج) جو سکتے نہ مطلع دل کو اداز بان + کس خوبی انداز کی عطا زبان
(د) قدم بلو ٹا کرے مشکل سے وہ میرے بیاباں کو + بجائے سبزہ روندے جو کوئی خار مغیلاں کو (۵) تاریخ ادب اردو ص ۲۵۲

منیر شکوہ آبادی

اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی [م ۱۸۸۰ء] کے تین دیوان زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔[1]
انہیں قصیدے کے جدید رنگ کا نمائندہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو قصیدے کا کاروان بے سالار نہیں ہوا۔ منیر نے اس کی راہنمائی کی۔ اس صنف کو انہوں نے نظم کے طور پر برتا۔ اس سے عربی قصیدے کا وہ دور یاد آتا ہے جس میں قصیدہ وسیع المقاصد تھا اور اس کا تعلق مدح شخصی سے زیادہ استوار نہ تھا۔ زندگی کی بوقلمونی اور رنگا رنگی اس میں منعکس ہوتی تھی۔ اس کا استعمال بطور نظم ہوتا تھا۔ منیر شکوہ آبادی نے بھی اس صنف کو داخلی آشوب کے اظہار اور خارجی مسافرت کے بیان کے لیے استعمال کیا۔ قصیدے کی تشبیب میں اکثر شاعروں نے خانگی احوال اور شکایت زمانہ کا اظہار کیا ہے۔ تاہم زندگی کی جن جزئیات یا جن المناکیوں نے (سیاسی، سماجی، معاشی وغیرہ) انہیں بحران میں مبتلا کیا ہوتا تھا ان کا بیان کلیاتی بیان میں غائب ہو جاتا ہے۔ زندگی اپنی جزئیات سمیت قصائد کا حصہ نہیں بنی۔ منیر شکوہ آبادی نے نظیر اکبر آبادی کی قائم کردہ اردو نظم کی روایات سے بھرپور استفادہ کیا اور اپنے ماحول حیات کو بھرپور انداز سے اشعار قصیدہ میں سمیٹا۔ مزید تفصیلات میں جانے سے قبل ان کے حالات کا اجمالی جائزہ ضروری ہے۔

منیر نے اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ آگرے میں گزارا، وزیر شاہ اودھ کے خلف نواب نظام الدولہ انہیں لکھنؤ لے گئے۔ وہاں انہوں نے نواب علی اصغر خاں، باقر علی خاں اور نواب سید محمد خاں کی ملازمت کی۔ بعد ازیں نواب باندہ سے رابطہ ہوا۔ باندہ ہی میں تھے کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی لڑی گئی۔ منیر اور مرزا ولایت حسین کے مشورے پر نواب باندہ انگریزوں کے خلاف مصروف پیکار ہوئے۔ جب انگریزوں نے باندہ پر قبضہ کر لیا تو یہ دونوں افراد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ راستے میں دھر لیے گئے اور ایک طوائف کے قتل کے الزام میں انہیں کالے پانی (جزائر انڈیمان) بھیج دیا گیا۔[2] وہاں منیر کی ملاقات فضل حق خیر آبادی سے ہوئی۔ ۱۸۶۵ء تک وہ انڈمان میں مقید رہے۔ نواب کلب علی نے ان کی رہائی کی سفارش کی۔ اور وہ رہا ہو کر انہی کے دربار (رامپور) سے وابستہ ہوئے۔[3] منیر ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کی غزلیات ان کی قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تلازمۂ خیال کی مضبوطی سے فصیح البیانی تک ان کے کلام میں بہت سی خوبیاں ملتی ہیں۔ مشکل زمینیں بھی انہیں مرغوب تھیں اور پیچیدہ قوافی بھی۔[4]
جہاں تک ان کے قصائد کا تعلق ہے۔ جزائر انڈیمان میں مولانا فضل حق خیر آبادی نے منیر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فارسی اصطلاحوں اور کنایوں سے معمور اردو قصائد لکھیں۔ اس کا حوالہ خود منیر کے ایک قصیدے میں ملتا ہے۔ کہ مولوی بے نظیر فضل حق نے کہ جو دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن ہیں ایک دن پوچھا کہ اردو شعرا

سہ مصطلحات عجم اور کنایات فرس کس لیے کرتے نہیں زینت نظم سخن

---

(۱) منتخب العالم مطبوعہ مطبع سعیدی ۱۲۶۴ھ / تنویر الاشعار مطبوعہ مطبع سعیدی ۱۲۷۰ھ / نظم منیر ۱۲۹۵ھ و ۱۲۰۰ھ / کلیات منیر
(۲) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۵۱ (اردو مرکز ۱۹۶۷ء) (۳) ایضاً
(۴) وہ بھی ان دنوں وہیں قید تھے

کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان اس کی متحمل نہیں ہے۔ یا تم میں سے کوئی اس کام کے لئے لائق نہیں ہے وہ بار بار کہتے تھے کہ ہندیوں کے لئے رمز و کنایہ کی وقت آفرینی اور لطفِ سخن کی خوبیاں محال ہیں۔

ہو کے ادب سے خموش عیر بہ مقصد گیا + کوچۂ تو میں چلا قاصدِ مشق سخن

اس قصیدے میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی گفتگو کے اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ منیر نے دوران گفتگو کہا کہ اردو شعرا غیر وطنی ایسا مصطلحاتِ غریب کو اپنی شاعری میں کیوں جگہ دیں؟ تو مولانا بہت برہم ہوئے

کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے مغز ہے + ہیں یہ شرابے سواد، جہل ہے ان کا وطن

مولانا نے کہا کہ دقتِ مضامین کے اعتبار سے سوداؔ کے سوا کوئی دوسرا قصیدہ نگاری کے تقاضے پر پورا نہیں اترا اور جہاں تک سودا کا تعلق ہے وہ بھی حرف قطرہ زن ہو پائے ہیں۔ منیر نے فضلِ حق کی گفتگو کے زیر اثر ہی یہ قصیدہ لکھا اور اس میں اس واقعے کا بیان کیا اس کا مطلع ہے

اشک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن + غرق ہوا نیل میں یوسفؑ گل پیرہن

یہ قصیدہ منقبت حسینؓ میں ہے اس میں منیر نے اصطلاحات و کنایات کو بھی ڈھب پر استعمال کیا ہے۔ اپنے جوشِ بیان اور روانیٔ طبع سے اسمیں ایسا شکوہ پیدا کیا کہ فارسی معیار کے قصیدے کا جواب فراہم ہوا۔

منیر شکوہ آبادی کے کلام میں ۲۸ قصائد ہیں جن میں نعت و منقبت کے علاوہ غیر مذہبی بھی ہیں اور وہ نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہیں۔ ان کے قصائد پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الٰہی نے انہیں ظہوری، کمال اصفہانی اور بدر چاچ کے قریب کہا ہے① یہ قربت ان کے مجاز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کے استعمال کے طریق کار کی وجہ سے ہے۔ دقت پسندی اور مشکل گوئی کے اعتبار سے ان کے بعض قصائد معیاری فارسی شعرا کے قصائد کی ٹکر کے ہیں۔ جدت اور ندرت منیر کے مزاج کا حصہ تھی۔ کبھی تو ان کا اسلوب اغلاق، ثقل اور تعقید کی حدیں چھوتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی سہلِ ممتنع کی انتہائی شکلیں بھی ان کے ہاں نمایاں ہوتیں۔ مجموعی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ منیر نے اپنے تخیل کے گھوڑے کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ نزاکت سے پر لطیف اور عمدہ تشبیہیں اور استعارے ان کے خیال و مواد کی گہرائیوں کو قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

منیر شکوہ آبادی کے قصائد اپنے عہد کے سیاسی وقوعات، حادثاتی احوال، تہذیبی و ثقافتی جہات رسوم و رواج کی عمومی نہج اور مجموعی خیالات و جذبات کی تفصیل نہ سہی اجمالی تصاویر ضرور فراہم کرتے ہیں یوں ان کے قصائد کی اہمیت تاریخی و سماجی بھی ہو جاتی ہے۔ جزائر انڈیمان کی اسیری کے زمانے میں منیر نے جو قصائد لکھے ہیں ان میں انہوں نے آپ بیتی کے حوالے سے جگ بیتی کہی ہے۔ اپنے روپوش ہونے کے حالات یوں بیان کیے ہیں

اس زمانے میں قصیدہ یہ کہا ہے میں نے + کہ مسائل میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل
روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش + آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل

---

① اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۳۸۹

مال و سرمایہ و اسباب ہوا سب برباد + پر کتابوں کے تلف ہونے سے ہے کرب اجل
میری تصنیف سے تھو جتنے رسالے تھا یا + ان کے گم ہونے سے ہے لذت ہستی میں خلل

یہ قصیدہ "در بجف" کہلاتا ہے۔ اس میں منیر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ دو دیوان چوری ہو گئے، دو انہوں نے خود فروخت کر ڈالے۔ بہت سی کتابیں اجتماعی تباہی کی نذر ہو گئیں۔ ایک قصیدے میں منیر نے اپنی گرفتاری کے بعد جزائر انڈیمان لے جائے جانے کا حال قلمبند کیا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں

برہنہ بدن طوق و زنجیر پہنے + مشارق سے لے کر پھرا تا مغارب
پیادہ روی اور بُعدِ مسافت + ستم گار تلواریں کھینچے مراتب
نگہبانوں کے جور دستِ و بیاں سے + لگد کوب، آلافِ رنج و نوائب
اد لو سخت آلام جوع و عطش کے + بلا اس طرف سب دشتم مصائب

منیر شکوہ آبادی کے اس نوع کے اشعار مومن خاں مومن کی مشکل پسندانہ روش کی یاد دلاتے ہیں۔

اپنے ایک نعتیہ قصیدے[1] میں منیر شکوہ آبادی نے ہند کی حالت زار کا نقشہ بہ انداز دگر کھینچا ہے وہ کہتے ہیں

رخ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغض پنہانی + صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی
بنائیں بیڑیاں تلواروں کو تڑوا کے گردوں نے + کیا ارباب جوہر کو ہراک حیلے سے زندانی
مٹا ہے نام شاہی ہند سے اس درجہ ان روزوں + نہیں ممکن ہے اب بانات بھی کہلائے سلطانی
ہوا ہے قیاس حین جانے کی عالم میں چلی ایسی + چلے گھر چھوڑ کے جنگل میں گجرات الیمانی
ہوا چتر ہما عنقا سے بھی معدوم دنیا میں + پڑے ہیں دھوپ میں محتاج سایہ ظلِ سبحانی

منیر کے مذکورہ اشعار ثقالت و تعقید سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ ان میں انہوں نے دردمندانہ لہجے میں اپنے ارد گرد کے احوال کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی قصیدے میں (فریاد در زندانی) میں منیر بیان کرتے ہیں کہ حسن جہاں آرا موذیوں کے چنگل میں ہے اور ماہ کنعانی عقرب کی زد میں۔ صاحبان عالی گوہر چنوں تک کو ترس رہے ہیں۔ غدر کی بلا امیروں سے ہوتی ہوئی ان غریبوں تک پہنچی جو بے قدری اور ضعف حال میں لاثانی ہیں۔ اگر ظالموں کو سزا ملتی تو حق و انصاف کے تقاضے پورے ہوتے مگر اس دور میں غریبوں کی بے کار میں خانہ ویرانی ہوئی۔ سونے کے محل لوٹ چکے ہیں۔ مینائی ایوان کھو دیے گئے ہیں۔ محل و باغ کی جگہ وحشت فزا سروکوں نے لے لی ہے۔ زاغ و زغن نے چھتر منزل میں آشیاں بنا لیے ہیں اور لوم سر تخت ہما صرف بال افشانی ہیں۔ گلستان ارم میں مرگھٹ کی چھوت کا شہرہ ہے۔ غنیمہ حرباغ میں گھوڑے کی پر تکلف مہمانی ہو رہی ہے۔ اگر مرزا خاقانی اس زمانے میں ہوتے تو ڈر سے متاع خاقانی پھینکتے پھرتے۔ منیر نے اس قصیدے میں اپنے کالے پانی میں رہنے کے چند کوائف بھی مندرج کیے ہیں

---

[1] موسوم بہ فریاد در زندانی

؎ نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں + اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی
اگر اشیا میسر ہیں تو خود محتاج ہیں فنیڈک + بڑی قسمت جو روٹی دال مل جائے بآسانی
اگرچہ گندمی رنگوں کو پیسا اس جزیرے نے + نہ پائی ایک دن بھی آردِ گندم کی ارزانی
کرو آرہ کشی یا مٹی کھودو چکیاں پیسو + اگر ہو جاں بلب منہ میں نہ ٹپکائے کوئی پانی
وہ گرمی ہے یہاں جو ہند میں موسم ہے سردی کا + حرارت دھوپ کی ہے دوزخِ اجسامِ انسانی
گئی گرمی تو پھر برسات ٹھہری نو مہینے تک + اسی برسات سے ہے ہم بغل فصلِ زمستانی
یہاں اربابِ لندن کی بھی رنگت تیرہ ہوتی ہے + بنے مشکی اگر نقرہ دکھائے اپنی جولانی

منیر شکوہ آبادی نے جزائر انڈیمان سے رہائی پانے پر بھی ایک قصیدہ میں اظہارِ خیال کیا ہے

؎ کوچ ٹھہر انعامِ محبوب ہے + اب وطن چلنے کی ہے تیاری
رخصت اے دوستانِ زندانی + الوداع اے غمِ گرفتاری
الرحیل اے مشقتِ ہر روز + الفراق اے ہجومِ ناچاری
دال چاول سے کیدو رخصت ہوں + پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری
چینی، برمی، ملائی، مدراسی + اہلِ آسام جنگلی تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں + اپنی باتوں سے دیں سبکساری
بیٹھتے ہیں جہازِ دودی پر + اٹھتے ہیں لنگرِ گرانباری

یہ قصیدہ ایک منظوم سفرنامہ ہے اس میں جزئیات نگاری عروج پر ہے ۔ بحری مناظر کی تفصیلات دیتے ہوئے منیر کہتے ہیں کہ دن کو خورشید زرافشاں کر رہا تھا اور رات کو اوس گہر بار تھی

؎ بحرِ احضر کی پستئی رنگت + فلکِ سبز کی ضیا باری
پانی پر چڑھ کے پانی بہتا ہے + قدرتِ حق کی ہے نمو داری
سینکڑوں آگ بوٹ اور جہاز + جن سے دریا کی گرم بازاری
جیسے زلفِ پری دمِ پرواز + لٹ دھوئیں کی ہوا میں یوں پیاری

مذکورہ اشعار پڑھنے کے بعد سوچنا پڑتا ہے کہ انجمن پنجاب کے مناظموں کے حوالے سے لکھی گئی نظموں میں اس تاثیر کی بھی کوئی تخلیق ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہو گا ۔ وجہ یہ ہے کہ انجمن کے مناظموں کی نظمیں موضوعاتی تھیں ۔ ان میں شاعر کے داخلی جذبات اور وجود کی واردات کے اثرات نہیں تھے ۔ موضوع دے دیا جاتا تھا اور طبع آزمائی کا حکم ہوتا تھا ۔ ایسے میں شاعر کا داخل اور باطن اس میں شریک ہونے سے قاصر تھا ۔ منیر شکوہ آبادی نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو داخلی آنچ سے پگھلا کر موثر و لطیف بنایا ہے ۔ اگر جدید شاعری کا آغاز ان کے اس نوع کے قصائد سے ہوتا تو ابتدا ہی میں اس کا مزاج جذباتی و احساساتی تاثیر سے مملو ہوتا

منیر شکوہ آبادی کی تمام تر تشابیب کا تجزیہ تو اس مقام پر ممکن نہیں ہے تاہم ان میں موجود چند رجحانات و کوائف کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ منیر شکوہ آبادی غیر تقلیدی رجحانات رکھتے تھے۔ نئے نئے مناظر، احوال اور معاملات کو تشابیب کی زینت بنانا انہیں مرغوب تھا۔ ان کے ہاں پیچیدہ کنایوں کی حامل تشابیب بھی ملتی ہیں اور سادہ، آسان اور براہ راست بھی۔ سادہ تشابیب کے اشعار لکھے جا چکے ہیں۔ استعاروں کے جھرمٹ میں مقید یہ خیالات بھی دیکھیے

ع جب اینون شب سے ہوا چرخ نائب + ہوئی تخم خشخاش انجم بھی غائب
چنی مرغ زریں نے دانے کی صورت + زمرد کی ڈبیا سے حب کواکب
بنا کاسہ شیر وہ جام خالی + ہوئی تلخ نقل نجوم ثواقب
فلک پر کھنچا پوست زنگی شب کا + ہوا خوف سے لالہ کا نشہ غائب
چاہ سیاہ میں مگر ایوسف زریں قبا + دلو سے ہو گیا شاہد پروین پرن
خیمۂ زرباں میں لیلیٰ مشکیں لباس + زینت فانوس سبز شمع رخ صبح گون
خندۂ دنداں نما زنگی شب نے کیا + تخت سلیماں سے اٹھ گیا اہرمن

ان کے مقابلے میں درج ذیل اشعار میں منیر کے بیان کی سادگی ملاحظہ کیجیے

ع رت ہے برسات کی بہت پیاری + موجزن جھیلیں ندیاں جاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر + زرد اودی سنہری زنگاری
کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے + سبز مخمل سے بھی سوا پیاری
کوکلا، بگلے، کوئیں، طاؤس + اپنی تانیں سناتے ہیں پیاری
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب + کر رہے ہیں نظر کی دلداری
سیر مچھی بھون کی چل کے دیکھو + کیا نمایاں ہے قدرت باری

اس منظر کے بعد منیر شکوہ آبادی نے باغ میں بہشتی پریوں، جوئے شیر نما نہر، مہندی سے گلنار ہتھیلیوں اور دھانی چوڑیوں والے ہاتھوں کی تصویر کشی کے جوہر دکھائے ہیں۔ تہنیت عید کے حوالے سے لکھے گئے اپنے ایک قصیدے میں منیر نے رمضان کے مہینے کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی حالت زار کا نقشہ بھی کھینچا ہے

ع رمضاں اب کے شیر ہے مجھ پر + پھاڑے کھاتے ہیں روزے آٹھ پہر
میرے گھر پہلے مفلسی بھیجی + پھر ہوئے آپ میہماں آ کر
کون کہتا ہے روزہ ہے تا شام + رات دن ہے مقام میرے گھر
کھانے پینے کی چیز کیو لا کر آئے + خود بدولت کوڑے ہیں پہرے پر
سحری کے بدلے دکھاتے ہیں + نقل بادام دیدۂ اختر
شام کے وقت بہر افطاری + نمک بخت شور پیش نظر

—

منیر شکوہ آبادی کی تشابیب موضوعاتی پھیلاؤ، معنوی وضاحت اور تصویری وسعتوں کی حامل ہیں۔ اپنے ایک نعتیہ قصیدے میں منیر نے شب، تاریکی اور تاریکیٔ گور کے مضامین کے حوالے سے عمدہ تشبیب لکھی ہے اس میں موت و حیات کا مناظرہ بھی رقم ہوا ہے ؎ شب ہجر ستارۂ ہجوم بلا تھا میں دوچار + نصیب سوئے تھے فتنے ہزاروں تھے بیدار

رات کا نقشہ کھینچتے ہوئے انہوں نے بیان کیا ہے کہ یہ ہیبت ناک تھی، بلا رفیق و ہمنشیں تھی، آفتیں دربان تھیں اور چوکیدار فتنہ تھا۔ ہر سو موت کی زبان پر الاماں تھا، مکان گور تھا، مکین فرش خاک اور بالش سنگ، در و دیوار کھانے کے لئے کھڑے تھے۔ میں رو رو کر کروٹیں بدلتا تھا۔ فلک ہی کہکشاں مع مہتاب پنہاں تھی۔ اژدہے منہ کھول کر تہہ غبار جا چھپے تھے۔ گردوں پر نمود کاہکشاں اس طرح تھی جیسے سنگ سیہ پر چیونٹیوں کی قطار ہو۔ چکور چاند سے اور پروانہ شمع سے بیزار تھا۔ آفتاب سے خفاش ملاپ چاہتے تھے۔ اندھیروں کو لعل شب چراغ کی قدر نہ رہی تھی۔ قضا مجھے لے جانے کے لئے تیار تھی۔ اس مقام پر موت اور زندگی کا مناظرہ مرقوم ہے۔ زندگی نے کہا کہ زندگی مہ و خورشید ہے، مطلع انوار ہے، آب حیات ہے۔ اس کے نصیب میں سونے کے قصر مینا کار ہیں، بانگ نشاط اور نغمۂ عیش بھی اس سے وابستہ ہے۔ موت کے پیالے میں زہر عقرب و مار ہے۔ اس کی جاگیر ٹوٹے ہوئے مقبرے ہیں وہ نوحوں اور نالہائے زار ہی کو گھر ہے۔ موت نے اس کے جواب میں کہا کہ مجھ سے سرکشان جہاں لرزتے ہیں۔ ستمگر و اشرار عاجز ہیں۔ میری وجہ سے طاعت حق ہوتی ہے۔ اگر میں نہ ہوتی تو سب عذاب آزار ہوتے۔ تیرے سبب شہیدوں کو حیات ابدی ملتی ہے۔ پھر منیر نے [illegible] گریز کیا ہے

؎ پیغمبران خدا گر بشیر ہیں سب + کہ حسن کے نقش کف پا سے خلد ہے گلزار

اس کے بعد منیر نے مدحت پیغمبر میں اشعار کہے ہیں اور انہیں رحمت مجسم حق، شہ انبیاء، حبیب خدا، شفیع امت اور محبوب ایزد غفار کہا ہے۔ منیر کے لامیہ قصیدہ[1] کی تشبیب بھی نہایت عمدہ ہے اس کا مطلع ہے

[در منقبت علی] ؎ پر تو مہر جو ہو شمع شبستان حمل + غازۂ صبح بنے قشقۂ ہندوئے زحل

اس میں انہوں نے عرفی کے مصرعے پر تضمین بھی کی ہے

؎ اس قدر جوش نمو ہے کہ بقول عرفی + مے نہ گنجد بہ صراحی و صراحی بہ بغل

ہوا کی صفائی کا تذکرہ ؎ ملک عالم بالا بھی نہیں اڑ سکتے + وہ صفا ہے پھسلتی ہے ہوا پر [illegible]

اس تشبیب میں نوروز کی خوشیوں کا تذکرہ بھی ہے اور سیاسی اشارے بھی ملتے ہیں۔

؎ نور نوروز ہوا ظلمت شب پر غالب + آگیا اب کے مجوسوں کے عقیدے میں خلل

خسرو روز کرے مملکت شب میں جو دخل + ہند میں کیوں نہ کریں اہل فرنگ آکے عمل

نجوم و کواکب کے حوالے سے اشعار بھی ملتے ہیں ؎ لالہ و گل نظر آتے ہیں بستان مریخ + سال بھر اب کی ہے دنیا میں برابر منگل

آگ کے بدلے ہیں آتشکدوں میں لالہ و گل + بلبلیں اب نظر آتی ہیں سمندر کے بدل

---

(1) اس کا نام انہوں نے لائق ازل رکھا ہے۔

منیر نے اس قصیدے میں تیغ، غلماں، مہر، یوسف، لیلیٰ کی بغل، کعبہ، صبح ازل، دل کافر، مشرکوں کا نیم مسلمان ہونا، دین اسلام کی نشو و نما، جامہ عباسی، خضر، مسیح، لات و ہبل، مریخ، سمندر، سرمہ، چراغ، کوہ، پیالہ، مالا، مستی، شنجرف، کوئل، آئینہ، آب رواں، نیل کا حوض، لال کرتی میں چلتی مشق رائفلیں وغیرہ کی لفظیات سے کام لیا ہے۔ اس سے ان کے ذہن کی ثقافتی جہت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس قصیدے میں منیر نے گل شبو، دیدہ نرگس، سنبلستان، لالہ حمرا، تختہ سوسن، سنبل کی سیاہی، گل شریں اور کنول کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ سنہری بادل کی بات بھی کی ہے۔ منیر نے اس زمین میں قصیدہ کہنے والے شعرا میں انوری، عرفی، سودا، خورشید، سحر، اثر لکھنوی، اقبال، محتشم، سنائی اور وحشی وغیرہ کی مثال دی ہے اور کہا ہے کہ فارسی والوں کی تو فکر ہے سب سے اول۔ اس قصیدے میں انہوں نے گریز یوں کی ہے

شرح یہ ہے کہ ملا بار صبا کو اک سال + گل شمع لحد نور خداوند اجل

جلوہ قدرت حق، دست خدا، شیر خدا + زوج خاتون جناں، نفس نبی، مرسل

اور مدح یوں کی ہے

مسند خاص تری عرش خداوند اجل + منبر پاک ترا دوش نبی مرسل

ایک تشبیب میں منیر شکوہ آبادی نے دربار رامپور میں برپا ہونے والی ایک رقص و سرود کی محفل کا حال یوں بیان کیا ہے

ادھر ادھر خم مو بافت سے یہ ظاہر ہے + کہ دو ہلالوں میں روشن ہے شمع سا گردن

حلب میں شام نہ ہو صبح میں رہے نہ حشر + پڑے جو آئینے میں عکس عارض روشن

ادائیں طرفہ قیامت کی چال موزوں قد + شریک شوخیوں کے ساتھ چلبلی چتون

حباب شعلہ و طاؤس و برق پا، ڈیڑھ پریں + کہ اپنے رقص کا صدقہ ہمیں سکھا دو چلن

اندھیر میں وہ اجالا وہ نور کی آواز + اثر وہ لے میں کہ تصویر کی ہلے گردن

سبک روی جو دم رقص ہو انہیں منظور + تو فرش برگ گل تر میں بھی نہ آئے شکن

مجال کیا کبھی گھنگھرو جو بڑھ کے بول سکیں + کرے اشارہ نہ جب تک کہ جنبش دامن

منعقد ہو بزم نشاط و طرب کو ترسے گا + کہ زہرہ ڈھونڈتی ہے رامپور میں مسکن

بلائیں لینے کو نجم النساء کی روح آئے + فقط اشاروں میں یوں رقص کر کے ہو جوگن

ادائیں کھینچیں جو فرلی بجانے کی تصویر + کرشن جان کے لے رادھکا کی روح پرن

کنا کی تھاپوں پہ جھنا جھن سب ہمیں دیکھیں + کبھی نہ گوپیوں کو یاد آئے بندرابن

منیر کا مشاہدہ اور تجربہ بڑا وسیع تھا۔ ان کے قصائد میں زندگی کی وافر تصاویر موجود ہیں۔ ذاتی احوال سے لے کر تہذیبی و ثقافتی ماحول کے مظاہر تک یہ قصیدے بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہیں۔ کلب علی خاں کے دربار میں موجود مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا تذکرہ بھی انہوں نے کیا ہے۔ یہاں شعرا کے تذکرے پر مبنی چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں

بحر منتش اسیر اور امیر + ہمسر انوری و مختاری

طبع پاک عروج داغ سے ہے + منفعل ابر کی گہر باری

ہے جلال و ضیا شاغل سے + محفلِ نظم جلوہ گر ساری
مثنوی میں صبا و خواجہ کبشیر + رونقِ شاعری و نثاری
بدر شاداں، نجیب، عشق پردم + رہتے ہیں مدح خوانِ سرکاری
فارسی گو نثار، شیرازی + تر زبانی میں ابر آذاری
فنِ تاریخ میں رسا منصور + جانؔ صاحب کی ریختی پیاری
سب سے بڑھ کر منیرؔ کو حاصل + با کمالی و ہرزہ گفتاری

حقیقت یہ ہے کہ منیر کے قصائد اردو شاعری کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ منیر واقعہ نگاری میں یکتا اور اظہارِ جذبات پر قادر تھے ان کے قصائد ان کے علم و فضل اور وسیع تجربوں کی چھاپ لیے ہوئے ہیں۔ مقامی اور مسلم ثقافتی امور سے معمور ان کے الفاظ، تشبیہیں اور استعارے شاعرانہ خوب صورتیوں کے امیں ہیں

منیر نے حکاکمانی اور غیر حکاکمانی ہر نوع کی گریز لکھی ہے

[در مدح نواب کلب علی خان] کس کے لیے ہیں شعر گویوں کون ہے ایسا + انعام جو دے گوہرِ مدحت کے برابر
غصے سے چبا کر لبِ نازک کو وہ بولا + غفلت نہیں دیکھی تری غفلت کے برابر
نواب سمی کلب علی خان بہادر + دنیا نہیں جس کے درِ دولت کے برابر

[در تہنیت عقد نواب تجمل حسین بہادر فرخ آباد] محفلِ رقص میں کہنے یہ گہر باری کی + چرخ سے لوٹنے کو آئی ہے زہرا گوہر
[در مدح نواب کلب علی خان] میں اس کی خدمتِ عالی میں عرض کر دوں گا + کہ جس کے ناخنِ ہمت نے کی ہے خوار گرہ

مدحیہ حصوں میں وہ غیر مدح ہیں ممدوحین کے علم و عمل، فضل و کمال اور ساز و سامان کی توصیف روایتی انداز میں کرتے ہیں۔ ایک قصیدے میں کلب علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں

وہ ناخدائے کشتیِ اسلام ہند میں + نواب پاک کلب علی خان شہِ زماں

[سخاوت] ہے آج رامپور میں طوفانِ آبِ زر + کشتی گدا کی سونے کے پانی میں ہے رواں
[ہاتھی] ہاتھی ایسا ہے سبک رو کہ قدم سے جس کے + ٹوٹ جاتا کہ نہ ہو نام کو چیلا گوہر
دیکھ کر موتیوں کی جھول یہ سب کہتے ہیں + پہنے پوشاک ہے عروسِ شب بلا گوہر

قصائد نعت و منقبت میں منیر شکوہ آبادی نے اپنے مذہبی اعتقادات بھی بیان کیے ہیں اور آیاتِ قرآنی، احادیثِ رسول اور اسلامی تلمیحات سے بھی استفادہ کیا ہے

صفائے آئینہ لا الہ الا اللہ + جلائے سرمۂ ما زاغ واقفِ اسرار

منیر شکوہ آبادی نے آسان اور مشکل زمینوں میں قصیدے لکھے اور ان میں ایسے قواعد کا التزام کیا کہ جن کے حوالے سے غزل لکھنا بھی مشکل ہے۔ انہوں نے سودا اور ذوق کی زمینیں بھی استعمال کیں اور اپنی زمینیں بھی ایجاد کیں ان کی شاعری کا دریا اپنے کوزوں میں گوہر سمیٹے ہوئے ہے یہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا فیض ہے

—

مظفر علی اسیر

مظفر علی اسیر [م ۱۸۸۱ء] کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ وہ واجد علی شاہ کے مقرب خاص تھے۔ مصحفی سے تلمذ تھا(۱)۔ ان کے اردو اور فارسی قصائد کا مجموعہ مجمع البحرین ۳۱ فارسی اور ۳۷ اردو قصائد پر مشتمل ہے(۲)۔ یہ مذہبی اور غیر مذہبی ممدوحوں سے مزین ہیں۔ مذہبی قصائد کے ممدوحین پیغمبر آخر زماں، آل پیغمبر، فاطمۃ الزہرا، امام حسین، امام زین العابدین اور حضرت علی اصغر ہیں۔ انہوں نے مولانا سید محمد (مجتہد العصر) کی شان میں بھی بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔ واجد علی شاہ، سید ذوالفقار علی خاں، کلب علی خاں اور ولی عہد رامپور کی مدح میں ان کے قصائد مجمع البحرین کے صفحوں پر بکھرے ہیں۔ پرنس آف ویلز کی ہندوستان آمد کے موقع پر بھی انہوں نے ایک مدحیہ قصیدہ لکھا۔ ان کا ایک کلیات قصائد (۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں) زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہا۔ اسیر کے قصائد کے تشبیبی حصوں میں مناظرانہ اور حکائیتی رنگ بھی ملتا ہے یہ استعاروں، کنایوں اور رمزوں سے آراستہ ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر تھے اور بقول سعادت خاں ناصر "عطارد قلم منشی بے نظیر اور شاعر خوش تقریر"(۳)۔ اسیر عربی اور فارسی السنہ پر عبور رکھتے تھے۔ ان کے قصائد آمد اور برجستگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی، متانت، مہذب لہجے، سلجھے ہوئے خیالات اور ایجاز و اختصار کے اعتبار سے اہم ہیں۔ ان کا عالمانہ طرز اظہار، تنظیم و التزام کا رکھ رکھاؤ، سادہ و پرکار الفاظ کا استعمال ان کے قصائد کو وضیع بنانے میں ممد تھا۔ فارسی قصیدے کی روایت اور اردو قصیدے خصائص کے مطالعے سے انہوں نے کسب فیض کیا۔

اسیر نے ابتذال، رکاکت اور ناشائستہ انداز بیان کو دور سے سلام کیا۔ لفظوں کے شکوہ، لہجے کی گھن گرج اور تراکیب کی شان و شوکت سے حسب ضرورت صرف اتنا کام لیا کہ مفاہیم کی شیشی کا عطر اڑنے نہ پائے۔ انہوں نے سنگلاخ زمینوں کو بطریق احسن استعمال کیا۔ (سراپا شانہ — چلیپا شانہ) (پیدا خورشید — تماشا خورشید) (ہمسر آئینہ، پیکر آئینہ) اور (جواب قلم اور گلاب قلم) وغیرہ کے قوافی و ردیف میں طویل قصائد لکھنا جگر خوں کرنے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اسیر صنائع بدائع کے استعمال سے مکمل واقف تھے۔ ان کے قصائد میں علمیت کی شان بھی موجود ہے۔ اپنے احوال کی نقشہ کشی اور احوال زمانہ کا بیان بھی ان کے قصیدوں کی زینت بنا ہے۔ بہاریہ تشابیب لکھنے میں انہیں مہارت تھی۔ مکالماتی اور مناظراتی تشابیب اور گریز در گریز انداز اظہار انہیں مرغوب تھا یعنی وہ ایک قصیدے میں ایک سے زیادہ تشبیب اور گریز کا اہتمام کر لیتے تھے۔ ان کی تشابیب میں ارد گرد کے ثقافتی اور تہذیبی احوال بھی قلمبند ہوئے ہیں اس ضمن میں ان کا وہ قصیدہ قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے سید ذوالفقار علی خاں کی شادی کے حوالے سے شادی کی رسوم کی ادائیگی، بارات کی روانگی اور دلہن وغیرہ کی رخصتی کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ نواب کلب علی خاں کی شان میں اپنے ایک قصیدے میں اسیر نے رامپور کے بازار و گلی کوچوں، میلوں ٹھیلوں، شادی بیاہ کی رسموں اور شہر میں بسنے والے علمی اور تہذیبی ترقی کا ایک ماہر واقعہ نگار شاعر کی مانند تذکرہ کیا ہے

---

(۱) خوش معرکہ زیبا ص ۵۳۱ (۲) مجمع البحرین (دو دیوان) مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۶ [حصہ دوم] (۳) خوش معرکہ زیبا، ص ۵۳۱
(۴) جلوہ خضر جلد دوم ص ۱۲۷ مطبوعہ نور الانوار آرہ ۱۸۸۵ — اسیر کا ایک قلمی دیوان مناقب پنجاب یونیورسٹی کا مخزونہ ہے از صفیر بلگرامی نمبر ۲۶۲۵

یہ اشعار دیکھئے ؎ ہر ایک شہر سے آئے ہیں لوگ غول کے غول + امیر اہلِ تمول، رئیس پیر و جواں

عجب ہجوم ہے سوداگروں کا میلے میں + کہ سارے باغ میں ملتی نہیں ہے جائے دکاں

کسی طرف کو ہیں چینی فروش و میوہ فروش + کہیں کہیں ہے سوئے حراف ڈھیر اشرفیاں

مٹھائیاں ہیں وہ حلوائیوں کی پاکیزہ و لطیف + ہوا ہے جن کے بنانے میں صرف شیرۂ جاں

کبابیوں کی دکانوں کی کس سے ہو تعریف + وہ ذائقے کہ نہ بو لیں گے جس کو کھا کر زباں

اس میں اسیر نے خورد و کلاں کے قیام کرنے کے لیے ہزاروں خیموں اور سینکڑوں پالوں کے ایستادہ کیے جانے کا ذکر یوں کیا ہے اور یہ یوں لکھا ہے ؎ علی الخصوص شبِ آخریں کو میلے میں + عجب طرح کا تماشا تھا قدرتِ خدا سے سماں

سوار کشتیٔ گردوں شکوہ پر نواب + کمال لطف چراغاں کنارِ نہر رواں

رہی نگاہ سب نو دن بہارِ میلے کی + ہزاروں دیکھے حسین گل عذار، غنچہ دہاں

دیگر احوال کا بیان یوں دیکھئے ؎ ہوائے نشہ یہ اس دور میں ہے عالمگیر + شراب پیر کو لازم ہے جیسے طفل کو شیر

بلند رتبۂ میکدہ ہے مسجد سے + صدائے قلقلِ مینا سے پست ہے تکبیر

خدا کا ڈر نہیں پیرِ مغاں کے بندے ہیں + کیا ہے توڑ کے مسجد کو میکدہ تعمیر

جو سر فروش تھے اب وہ مے فروش ہوئے + شراب کھینچتے ہیں کھینچتے تھے جو شمشیر

بجائے علم ہے تحصیلِ علمِ موسیقی + جو ہم تو ہیں تو وہی اب گلے میں ہے تحریر

اسیر نے اس قصیدے میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ زمانہ میں کسی سے کام نہیں نکلتا۔ آج کل کے وزیر اور امیر گنجفے کے امیر و وزیر ہیں۔ اگر اتفاق سے ان کا لڑائی میں کسی سے سامنا ہو جائے تو ان کی میان سے تمام عمر شمشیر نہ نکلے۔ گھوڑے بھی ایسے ہیں کہ جنگ کے وقت وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ ان کے سوار انہیں دانہ بغیر کھلائے ہیں۔ معلم خود ہی مفلسی کا سبق پڑھ رہا ہے اور مصور خود ہی تصویر کھینچ کر حیران ہو رہا ہے۔ اسیر کا یہ بھی کہنا ہے ؎

فقیر ہو گئے ملاح ان دنوں ایسے + سفینہ کشتی ساحل ہے موج موجِ حصیر

خراب ملک اماں محکمۂ اجل کا ہے گرم + سوائے مقبرہ ہوتی نہیں کہیں تعمیر

یہ وہ زمانہ ہے ہرگز کوئی نہیں سنتا + میاں خلیق پڑھیں خواہ مرثیہ دلگیر

اسیر رمز و استعارہ کے پیرایے میں اپنے عہد کی سماجی، معاشی، اخلاقی اور عمومی ثقافتی و تہذیبی زندگی کے

یہ اشعار دیکھئے ؎

ہر ایک شہر سے آئے ہیں لوگ غول کے غول + امیر، اہل تمول، رئیس پیر و جواں
عجب ہجوم ہے سوداگروں کا میلے میں + کہ سارے باغ میں ملتی نہیں ہے جائے دکاں
کسی طرف کو ہیں چینی فروش و میوہ فروش + کہیں کہیں ہے سجے صراف ڈھیر اشرفیاں
مٹھائیاں ہیں وہ حلوائیوں کی پاک و لطیف + سوا ہے جن کے بنانے میں صرف شیرۂ جاں
کبابیوں کی دکانوں کی کس سے ہو تعریف + وہ ذائقہ کہ نہ بولیں اگر جس کو کھاؤ زباں

اس میں اسیر نے خورد و کلاں کے قیام کرنے کے لئے ہزاروں خیموں اور سینکڑوں پالوں کے ایستادہ کیے جانے کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے ؎

علی الخصوص شب آخریں کو میلے میں + عجب طرح کا نظارا قدرت خدا سے سماں
سوارِ کشتیٔ گردوں شکوہ پر نواب + کمال لطف چراغاں کنارِ نہر رواں
رہی نگاہ میں نور و بہار میلے کی + ہزاروں دیکھے حسین گل عذار، غنچہ دہاں

دیگر احوال کا بیان بھی دیکھئے ؎ ہوائے نشہ یہ اس دور میں ہے عالمگیر + شراب پیر کو لازم ہے جیسے طفل کو شیر
طبقہ فرنگیہ میکدہ ہے مسجد سے + صدائے قلقل مینا سے بیت ہے تکبیر
خدا کا ڈر نہیں پیر مغاں کے بندے ہیں + کیا ہے لکھو کے مسجد کو میکدہ تعمیر
جو سر فروش تھے آج وہ مے فروش ہوئے + شراب کھینچتے ہیں کھینچتے تھے جو شمشیر
بجائے علم ہے تحصیل علم موسیقی + جو ماتو سیقی وہی اب گلے میں ہے تحریر

اسیر نے اس قصیدے میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ زمانے میں کسی سے کام نہیں نکلتا۔ آج کل کے وزیر اور امیر گنجفے کے امیر اور وزیر ہیں۔ اگر اتفاق سے ان کا لڑائی میں کسی سے سامنا ہو جائے تو ان کی میان سے تمام عمر شمشیر نہ نکلے۔ گھوڑے بھی ایسے ہیں کہ جنگ کے وقت وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ ان کے سوار انہیں دانہ بغیر کھلاتے ہیں۔ معلم خود ہی مفلسی کا سبق پڑھ رہا ہے اور مصور خود ہی تصویر کھینچ کر حیران ہو رہا ہے۔ اسیر کا یہ بھی کہنا ہے ؎

فقیر ہو گئے ملاح ان دنوں ایسے + سفینہ کشتی ساحل ہے موج موج حصیر
خراب ملک اماں محکمہ اجل کا ہے گرم + سوائے مقبرہ ہوتی نہیں کہیں تعمیر
یہ وہ زمانہ ہے ہرگز کوئی نہیں سنتا + میاں خلیق پڑھیں خواہ مرثیہ دلگیر

اسیر رمز و استعارہ کے پیرائے میں اپنے عہد کی سماجی، معاشی، اخلاقی اور عمومی ثقافتی و تہذیبی زندگی کے چند نقوش اجاگر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کے تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی کثرت ایجاز و اختصار کی متقاضی تھی۔ انہوں نے زندگی کا علم کتاب جذبات و قاموس تخیلات سے حاصل کیا۔ احوال زمانہ کا یہ بیان بھی دیکھئے ؎

کہاں امید روزی کشت زار ملک ہستی میں + کہیں برق خرابی ہے کہیں سیلاب ویرانی
شریک حال کب آفت زدوں کا کوئی ہوتا ہے + بجائیں ناخدا بغلیں اگر کشتی ہو طغیانی
فلک کی چشم پوشی سے ہوا قحط لباس ایسا + کہ اب بازار میں بکنے لگا ہے رخت عریانی

یہ رسم ترکِ الفت ہے کہے سو شعر اگر شاعر + ملے مصراعِ اولیٰ سے نہ کوئی مصرعِ ثانی

ہزار اہلِ جہاں ڈھونڈیں نہ ہم تک آئے کہیں دولت + دہن معشوق کا اس عہد میں ہے گنجِ پنہانی

گدا ہیں کیوں نہ دنیا میں ہدف تیرِ حوادث کے + کہ تاجِ فرقِ سلطاں ہے مقامِ لعلِ پیکانی

کرم کے وقت بھی یہ چرخ جمسک کا ارادہ ہے + کہ ہوں خوانِ تہی بھوکوں کے آگے وقتِ مہمانی

بہار و خزاں کے منظر کی تصویر کشی ہو یا شکوہ و شکایت کے موضوع کا بیان اسیر کا قلم ہر میدان کی رکاوٹیں
بہ آسانی عبور کر لیتا ہے۔ مروجہ علوم و فنون ان کی گہری نظر تھی۔ رنگارنگ، بوقلموں تشابیب میں انہوں نے مختلف
علوم و فنون سے پیدا شدہ مفاہیم کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اسیر نے اپنی تشابیب میں یکسانیت سے بچ نکلنے کی کوشش کی ہے۔
ہر قصیدہ میں ایک نیا منظر نامہ اور ایک نیا علمی نقشہ مہیا کرنے کی مساعی نے ان کی تشابیب کے جال کو اتنا مضبوط
بنا دیا ہے کہ قاری آخری شعر تک اس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ فارسی میں انوری وغیرہ نے مناظراتی انداز اور عنصری نے
سوال و جواب کے اسلوب کو عمدہ طور پر برتا۔ اسیر کے ہاں یہ دونوں انداز ملتے ہیں البتہ مقابلے اور محاورے کے
موضوعات کے اظہار میں ان کا قلم رواں اور چست ہے۔ ان کے ایک قصیدے میں شوخی اور حیا کا محاورہ اور مقابلہ قلمبند
ہوا ہے ؎

شوخیٔ حسن سے کہتی ہے الجھ کر یہ حیا + سامنا آج سرِ بزم ہے میرا تیرا

دیکھوں میں آج کی شب ہوتی ہے مغلوب تو + کون پسپا ہو ظفریاب کرے کس کو خدا

ایک اور قصیدے میں اسیر نے فربہی اور لاغری کے درمیان مناظرانہ مقابلے کی تصویر کھینچی ہے۔ فربہی ضعف سے
کہتی ہے ؎

ہاتھ میں تیرے عصا آنکھ پہ تیرے عینک + نہ ترے ناخنوں میں طاقت ہے نہ یارائے نظر

تجھ سے اور مجھ سے کسی طرح کی نسبت ہی نہیں + فیل سے مور ضعیف آنکھیں ملائے کیونکر

ضعف بولا کہ ترا قول سراسر ہے خلاف + یہ تعلی بہ تبختر ہیں ترے ہوش کدھر

اہلِ حق نے رہِ تسلیم میں فاقے کر کے + جسم کو مشق ریاضت سے بنایا مسطر

خواب وہ دن کو کرے یہ رہے شب بھر بیدار + فربہی میں ہے وہ کب ہے جو نقاہت میں ہنر

عام طور پر اسیر ان مناظروں کو گریز تک لے آتے ہیں۔

افسانوی اور حکایاتی تشبیب نگاری میں بھی اسیر مہارت رکھتے تھے۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں وہ بیان
کرتے ہیں کہ انہیں خواب میں ایک آشفتہ رو ملا اس کے گیسو زمین کو چھو رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ ان کے بڑھانے
کا مقصد کسی کے دل کا شکار ہے یا ہرن کا؟ اس نے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا اور کہا اسے ان امور کی ذرہ برابر بھی
ہوش نہیں ہے۔ اس کا ایک عاشق صادق مرنے کی تیاری کر رہا ہے خستہ گلو ہے صراحی کی مانند ہچکیاں لیتا ہے اس کے
لئے ایسے بیمار کی عیادت واجب ہے کہ یہ رسمِ دنیا و شریعت ہے۔ یہ سن کر وہ اس لمبے گیسوؤں والے کے ساتھ عاشق بیمار
کے گھر پہنچا۔ وہ حالتِ نزع میں تھا۔ ایک ہنگامے کی حالت تھی فصاد اور طبیب وہاں موجود تھے۔ کوئی سر پیٹ رہا تھا
کوئی پاشویہ لے کوئی فصد کی تدبیر کر رہا تھا۔ کوئی مغزِ کدو پیس کر اس کے سر پر لگا تھا۔ ایک نے اس کے شانے کو تھام)

کہ سورۂ حمد پڑھی اور ایک نے ناد علی لکھ کر گلے میں تعویذ ڈالا

؎ آخر کار طبیبوں کو یہ تجویز ہوئی + اور تو کچھ نہیں چلتا ہے ہمارا قابو
ہاں جو اصلی کہیں مل جائے جواہر مہرہ + نفع بے شبہ کرے فرق نہیں ہے سر مو

پھر گریز یوں ہے۔ ؎ مجھ سے اس آئینہ رخسار نے گھبرا کے کہا + لاؤ سرکار سے تم جا کے پڑھوا کیوں ہو

اسیر نے نشاطیہ، حزنیہ، حالیہ تشبیب بھی لکھی ہیں اور صبح، رات، چاندنی، جوش باراں، گرمی، محفل عرس اور علم بیان کے موضوعات پر بھی، مزید برآں ان کے ہاں ان حصوں میں کہیں کسی حسین کی پریشانی خاطر، کہیں صفت قلم اور کہیں مسافرت وغیرہ کے احوال بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ بلند حوصلگی کے خیالات پر ان کی خاص توجہ ہے

؎ وہ بردبار ہوں مطلق نہیں ہے رنج کا رنج + شرار غم کو سینے میں ہے تصور سنگ

خوشی کی منظر نگاری کرتے ہوئے اسیر بادل کے جھوم کر آنے، سرد ہوا کے چلنے، جنگل جنگل طاؤس کے رقص کرنے، بارش کے موتی برسانے، مستوں کی بغل کے صراحی سے جام بھرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

؎ بادۂ صاف کی پانی میں ہوئی کیفیت + بن گئی شیشہ بلور صفا سے بوتل
واہ کیا سبزۂ نوخیز دکھاتا ہے بہار + باغ میں چار طرف سبز بچھا ہے مخمل

ایک قصیدہ منقبت میں کہ جو حضرت امام حسین رض کی شان میں ہے وہ کربلا کی مناسبت سے گرمی کا اظہار کرتے ہیں

؎ گرمی کے ہیں یہ روز گرانی ہے کمال دھوپ + آنکھیں دکھا رہی ہے غضب اب کے سال دھوپ

اسیر ایک قصیدے میں حالات زمانہ بیان کرتے ہوئے یوں گریز کرتے ہیں

؎ پھرا پھرا ہے مگر جانتا نہیں سرکش + کہ دستگیر ہے میرا امیر کل ابر

اسیر نے گریز میں موقع و محل کی مناسبت سے طوالت و اختصار کا اہتمام کیا ہے۔ ایک قصیدے میں انہوں نے بلبل کی گفتگو کے ذریعے اور ایک میں خفتگان خاک سے سوال و جواب کے وسیلے سے مدح کا جواز پیدا کیا ہے

اسیر نے مذہبی قصائد میں روضہ، کرامات، تلوار، گھوڑے کی تعریف کے علاوہ ممدوح کے دینی مرتبے اور روحانی مقام کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے حوالے سے عقائد و روایات بھی قلمبند ہوئی ہیں۔ ان کے قصیدے سراج التمکین میں حضرت علی رض اور حضرت فاطمہ رض کے عقد کا بالتفصیل اظہار ہے۔ امام حسین رض اور حضرت علی اصغر رض کی شان میں لکھے ہوئے قصائد فی الاصل رثائیہ ہیں۔ ان میں کربلا کے بعض واقعات بھی منظوم ہوئے ہیں

در مدح امام حسین رض ؎ کربلا میں جو پس قطع منازل پہنچے + کوفہ و شام سے آنے لگے پیہم لشکر

در مدح علی اصغر رض ؎ اس میں اور اکبر میں اتنا فرق ہے + تیر نیزے سے ہے جتنا مختصر۔

اسیر نے دنیاوی ممدوحین کے قصائد میں ان کی تعریف میں روایتی لفظیات ہی سے کام لیا ہے۔ یہ لفظیات تقریباً ہر قصیدہ نگار کے ہاں یکساں ہیں۔ انہوں نے ان کے ساز و سامان گھوڑے، تلوار اور فیل کا بھی روایتی تشبیہات و استعارات میں تذکرہ کیا ہے۔ اسیر کے قصائد میں دعائیہ حصے سنجیدگی اور وقار کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ تمام اجزا مل کر ان کے قصائد کے کل کو وقیع و مستحکم بناتے ہیں

—

اسیر نے دیگر قصیدہ نگاروں ہی کی مانند صنائع بدائع کا استعمال کیا ہے۔ ان کے استادانہ رنگ نے ان کے قصائد میں نکھار پیدا کیا۔ اصطلاحات نجوم و طب، علوم متداول کی لفظیات، تلمیحات و تمثیلات ان کے کلام میں کثرت سے ہیں۔ انہیں قواعد اور عروض پر بھی قدرت تھی۔ امیر مینائی جیسے شاعر ان کے شاگرد تھے (۱)
مبالغہ، تشبیہ، استعارہ اور رمز و کنایہ کا استعمال انہوں نے خوش اسلوبی سے کیا۔ صنعت ذوالبحرین، تنسیق الصفات وغیرہ کے استعمال سے انہیں لگاؤ تھا

نکو سرشت، جواں دولت، جواں طالع + بلند بخت و بلند اختر و بلند اقبال

اسیر کے قصائد ان کی طبیعت کی مشکل پسندی اور دقت آفرینی کے بھی مظہر ہیں۔ انہوں نے شکوہ تراکیب اور شوکت الفاظ کے لئے فارسی کی جانب رجوع کیا ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں

بہ خون بہ سبب سرخ پوش باغ بہشت + بہ پارۂ جگر سبز پوش شکر گزار
بہ ارتفاع سماع و بہ امتداد زماں + بہ انتشار خزاں و بہ انبساط بہار
بہ منعمان ملمع لباس ساغر و نوش + بہ صابران شکم خالی و نماز گزار

حضرت امام زین العابدین کی شان میں لکھے ہوئے اپنے ایک قصیدے میں اسیر نے لکھا ہے جو شوخیٔ معنی نازک سے پسندیدۂ خلق ان کے اپنے قصائد میں بہ حد پر پایا جاتا ہے۔ نزاکت معنی سے انہوں نے اپنے کلام خصوصاً قصائد میں خوب صورت اشعار تخلیق کیے ہیں

شیشۂ سبز سے ساغر میں گرا بادۂ سرخ + کیا تماشا ہے کہ طوطی نے دیے لعل اگل
عزیز جان کے ہر وقت آسیا کی طرح + ستم سے پیس رہا ہے مجھے زمانۂ پیر
رکھ کے مشکیزہ چلا دوش پہ سقائے حرم + ہاتھ میں تیغ علی دوش پہ حمزہ کی سپر
سب شہیدوں میں ہے اس کو آبرو + بوستاں میں جیسے بوٹا مختصر

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۱۲۵

غلام حسنین قدر

غلام حسنین قدر [م ۱۸۸۴] بلگرام میں پیدا ہوئے۔ شاعری کے جوہر قابل اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ ابتداً ان کے کلام کی اصلاح شیخ امان علی سحر، مرزا محمد رضا برق، امداد علی بحر اور غالب جیسے اساتذہ نے کی تھی[۱]۔ قواعد العروض نامی کتاب بھی ان کی یادگار ہے۔ کلیات قدر میں بہ شکل قصیدہ چھ قصائد ہیں[۲]۔ جلال الدین زینبی نے لکھا ہے کہ ان کے قصائد کی تعداد سات ہے[۳]۔ زینبی نے راجہ امان سنگھ کی شان میں ان کے مخمس مدحیہ کو قصیدے کی ذیل میں شمار کیا ہے۔ زینبی نے ان کی ریاضی، سنسکرت، عروض اور پنگل میں مہارت کی تعریف کی ہے[۴]۔ قدر کے کلیات میں ایک قصیدہ محبوب علی خاں والیٔ دکن کی شان میں ہے اسکا مطلع ہے ؎

باغ پر آج گھٹا ٹوپ اٹھا ہے بادل + خسرو باد بہاری کا کھچا دل بادل

مہر منیر نامی قصیدہ نواب سالار جنگ منیر الدولہ میر لائق علی خاں کی مدح میں ہے۔ اسکا اولین مطلع ہے ؎ نہ رہا المنتسب و قاضی و مفتی کا خط

نقش فرنگ نامی قصیدہ ولیم ہینڈ فورڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اودھ کی شان میں ہے۔ اسکا اولین مطلع ہے ؎ یہ ہوا میں ہے بروت کا اثر

دار الامارہ نامی قصیدہ محمد امیر حسین سجادہ نشین محمود آباد کی شان میں ہے اسکا مطلع ہے ؎ چمن کا بیاہ ہے کلیوں کا ہو گیا انبار + سنبل طاؤس بہار کے در پہ بندھن وار

کشت زعفران نامی قصیدہ کے ممدوح پنڈت شیو نرائن بہادر انسپکٹر سکول ہیں اسکا اولین مطلع ہے ؎ اک منجم نے کہا او ننھیسوں کو نگیاں

گل عباس نامی قصیدہ مرزا محمد عباس اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی شان میں ہے ؎ مصیبت وہ پڑی ہم پر کلیجہ ہو گیا پانی + بنا جو اشک کا قطرہ ہوا لعل بدخشانی

قدر کے زمانے میں ممدوحین ریاستی نوابوں سے بھی کمتر درجے کے لوگ ہو گئے تھے۔ قدر نے قدیم اساتذہ کی زمینوں میں قصائد لکھے ہیں[۵]۔ جس سے ان کے روایت پسندانہ ذہن کی خبر ملتی ہے۔ قدر کے قصائد پختگی اور متانت کے حامل ہیں۔ تسلسل معانی، مضمون آفرینی اور بیان کی روانی ان کی خاص خوبیاں ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد میں پرورش پانے والی نظموں سے بھرپور استفادہ کیا ہے ان کے قصائد کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خیمہ ہے نو بوندیں ہیں طناب خیمہ + چوب خیمہ ہے دھنک سبزہ ہے فرش مخمل
کبھی چھایا ہے سفید ابر کبھی ابر سیہ + گہ فرنگی کا عمل ہے کبھی زنگی کا عمل
آتش نائرہ طاؤس سے اٹھا جو دھواں + ہو کے یکجا وہ بخارات گھر آیا بادل
اک برس بعد ہم آغوش ہوئے ہیں دونوں + ہے دمن برق دماں ابر سیہ راجا نل
یوں شرابور ہیں باران بہاری سے سرو + جیسے جوگی کے شوالے میں چڑھے گنگا جل
ابر پر یوں نظر آتا ہے خم قوس قزح + جس طرح سینۂ معشوق پہ آرسی ہیکل
کیا تعجب ہے کہ پتھر میں نمو پیدا ہو + خاک میں چرخ کی جانب کو چلے بندھیاچل

---

(۱) وہ خود کہتے ہیں رباعی ؎ سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند + پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر + بدنام کنندہ نکو نامے چند
(۲) کلیات قدر مطبع مفید عام ۱۸۹۱ء قصائد ص ۱۰ تا ۶۱
(۳) تاریخ قصائد اردو ص ۳۵۵ (۴) ایضاً (۵) ان کے قصیدہ لامیہ کی زمین میں ولی، میر تقی میر، سودا، مصحفی اور منیر شکوہ آبادی وغیرہ کے قصائد ملتے ہیں رائیہ قصیدہ میں بھی ان سے قبل سودا، میر، ذوق اور منیر شکوہ آبادی طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ یہی حال ان کے نونیہ قصیدہ کا ہے اس زمین میں ان سے قبل سودا اور منیر شکوہ آبادی کے قصائد ملتے ہیں

قدر کے نونیہ قصیدہ میں ذیل کی لفظی تصویریں ملاحظہ ہوں

؎ کہیں سبزے پہ آ کر سانپ شب لہرا رہیں چاہیں گے + کہیں میداں میں کوک اٹھیں گے طاؤس بیابانی
اندھیرا وحشت میں کر دیں گے گھر کر بانس کے کوٹھے + کٹہرے میں پڑیں گے خود بخود شیر نیستانی
کہیں جنگل میں ہوں گی بوٹیاں اکسیر سے پیدا + کہیں چاندی کے پیڑ اپنی بھی دکھلائیں گے طولانی

قدر کے مذکورہ اشعار میں موجود تمثالیں نئے اور انوکھے پن کی بدولت تاثیر کی حامل ہیں ۔ جلال الدین زینبی لکھتے ہیں " قدر نے اپنے قصیدے (لامیہ) کے ہر حصے میں جس کا میلان کے ساتھ اپنی رسائی فکر اور بلندیٔ تخیل کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر نہیں۔ یہ قصیدہ ۲۴ اشعار کا ہے تشبیب جس انداز سے شروع کی وہ انہی کا حصہ ہے تشبیب کے بعد مخلص و گریز کا مضمون اتنا دلچسپ اور مضمون ما سبق سے ایسا دست و گریباں ہے کہ اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی تھی اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً قصیدہ گوئی میں تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے جاتے" (۱)

قدر بلگرامی نے طویل گریز بھی لکھی ہے اور مختصر بھی ۔

؎ دامنِ نیلگوں اللہ کے ہو چرخ نیلی + اس قدر خاک سے اونچا ہو پر اک کوہ و جبل
ہندوالوں کو نظر آنے لگے ملک دکن + پر ہے یہ شرط کہ آنکھوں میں نہ ہو کوئی خلل
کہکشاں ہے کہ نظر آتی ہے موسیٰ ندی + وہ ہے مولا کا پہاڑ اور یہ چرخ اول
مکہ مسجد نظر آتی ہے کہ بیت المعمور + چار مینار ہیں یا عرش کے ساقوں کے کھل
حیدر آباد ہے اونچا فلک چارم سے + حیدرآ قدرت و صناعی صناع ازل
ہے وہ خورشید علم اس فلک چارم پر + جس کا ہر خاک پہ ہے دھوپ کے مانند عمل
مہر گستر فلک ملک کا شاہ خاور + ذرہ پرور کرم و مہر میں اک ضرب مثل
دکھائی دے گا وہ ظلِ خدا وہ عرش وقار + وہ عرش پایہ وہ فرش آشیاں وہ عرش وقار

راسخ محمود آبادی کے قصیدہ میں شادی اور اس سے متعلقہ بعض تلازمات و تمثالات دستیاب ہیں مثلاً عروس بہاری، مشاطۂ صبا، دلہن جانا، حنا برد ست چنار، طرۂ طرار، افشاں چنتا، غازہ ملنا، خواب ناز، دم طاؤس، مانگ میں سیندور، پان سے لب لالہ کا سرخ ہونا، صدف برگ کے لب تشنہ، سحاب گوہر بار، قبائے استبرق، دستار، شملے، موسیقار، مرغ آتش زن، صدائے رعد، ستار و زخمہ، طبلے کی گمک، شہنائی، جھانجھیں، تالیاں، بہار کا الاپ، رقص اور تڑپ لینا وغیرہ ۔ مدح کے حوالے سے قدر نے رتبۂ خداوندی، خدایگاں، نعمت ابرار، نجم سعادت، شمع عبادت، حاتم، دم عیسیٰ وغیرہ کے الفاظ سے ممدوح کی تعریف کی ہے ۔ نقش و نگار میں انہوں نے انگریزوں کی کوٹھیوں کی تعریف، کرسیوں، میزوں کا ذکر اور پھر ان کرسیوں میں نورانی کرسی کا تذکرہ کر کے ممدوح کی مدح سرائی کی ہے

---

(۱) تاریخ قصائد اردو ص ۵

بال مکند بے صبر

منشی بال مکند بے صبر [م ۱۸۹۰] کے بارے میں علی جواد زیدی کا کہنا ہے۔ ان کا تعلق سکندرآباد سے تھا۔ قصیدوں کا ایک دیوان مرتب تھا۔ اسمیں چون قصیدے ترکیب بند اور ترجیع بند تھے۔ قصیدہ درۃ التاج اور نورافشاں سے کچھ اشعار قاضی معراج دھولپوری نے نقل کیے ہیں۔ ویریندر پرشاد سکسینہ کے قول کے مطابق

۱۔ یہ دیوان ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس دیوان میں قصائد نمبر ۳۰، ۳۱، ۴۶ اور ۵۳ وائسرائے ہند کو پیش کیے گئے تھے ۳۰ ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ہے نمبر ۳۱ فتح افغان کے موقع پر لکھا گیا تھا نمبر ۴۶ دربار منعقدہ ۱۵ نومبر ۱۸۸۰ء کے موقع پر لارڈ رپن کے لیے نظم ہوا تھا اور نمبر ۵۳ فتح مصر اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ہے قصیدہ نمبر ۲ توحید یہ ہے قصیدہ نمبر ۶ ہندوستان پر ہے قصیدہ نمبر ۹ قدامت روح کے عنوان سے ہے قصیدہ نمبر ۱۶ غالب کے حوالے سے ہے قصیدہ نمبر ۱۸ تفتہ کی تعریف میں ہے اور قصیدہ نمبر ۱۲ غیر منقوطہ ہے (۱) یہ دیوان دیکھنے کا موقع ملا ہے اس کے بہت سے اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔

خطۂ دل نشیں ہے ہندوستاں + خال روئے زمیں ہے ہندوستاں

یاں کے عارف جہاں میں معروف + مجمع العارفیں ہے ہندوستاں

پہلوان و حکیم و عارف سے + کبھی خالی نہیں ہے ہندوستاں

ہے تواریخ ہند سے ظاہر + کہ بہت اولیں ہے ہندوستاں

یاں بر تھا تھا جبر پردوجہاں + دو جہاں آفریں ہے ہندوستاں

یہیں آدم کا بھی نزول ہوا + متبرک زمیں ہے ہندوستاں

بے صبر کے قصائد میں اردو شاعری میں بننے والی نئی فطرت نگاری اور حقیقت پسندی کی روایت دخیل ہے انہوں نے سیاسی قصائد بھی لکھے ہیں اور قومی بھی۔ ان کے قصائد میں مقامی ہند و مسلم روایات کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے انداز بیاں میں نظموں کے آہنگ کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

حب الوطنی کا جذبہ بھی ان کے اشعار میں جھلکتا ہے۔ انہوں نے بہت سے دوسرے قصیدہ نگاروں ہی کی مانند ہندوستانی ماحول، روایات اور تاریخ کو پیش نظر رکھا ہے۔ انگریزوں کی مدح میں ان کے قصائد خوشامد اور بلکہ ناشائستہ انداز سے غیر متعلق ہیں۔ ان قصائد میں انگریزی اقتدار (ہندوستان میں) کی تاریخ کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ فتح مصر اور فتح افغانان کے حوالے سے لکھے ہوئے ان کے قصائد یہی تیور رکھتے ہیں۔ بال مکند کے بعض قصائد فکر و فلسفہ کے عناصر سے معمور ہیں۔ اس ضمن میں ان کا قصیدہ قدامت روح خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ بے صبر نے غالب اور تفتہ (مرزا) کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے بھی صنف قصیدہ کو اپنایا۔ فن قصیدہ ان میں ان کی مشکل پسندی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صنعت غیر منقوط میں بھی ایک قصیدہ لکھا

---

(۱) قصیدہ نگاران اتر پردیش ص ۱۰۱

نیاز احمد ہوش

نیاز احمد ہوش [م ۱۸۹۲] کا تعلق بریلی سے تھا ۔ نقوشِ غزل نمبر میں لکھا ہے [۱]

"نیاز احمد ہوش کا تعلق نواب حافظ رحمت علی خاں والئ روہیل کھنڈ کے خاندان سے تھا ۱۸۵۷ کے ہنگامے میں وہ بریلی سے چلے گئے ۔ مختلف ریاستوں میں گھومے ۔ انہوں نے چار عمدہ قصائد تحریر کیے ان کے ممدوح والئ دکن نواب آصف جاہ میر محبوب علی خاں [۲] نواب میر لائق علی خاں بہادر مدار المہام سرکار حیدر آباد، نواب محمد مظہر الدین خاں رفعت جنگ وزیر سرکار دکن اور سید علی صاحب شوستری اخوند و حضور تھے " نیاز احمد ہوش بریلوی نے نعت و منقبت (حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؑ) کے قصائد بھی لکھے ہیں ۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے بھی ان کے قصائد کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے "بریلی کی ادبی تاریخ میں یہ قصائد بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔" [۳]

کلیاتِ ہوش مرتبہ نواز نثار احمد [۴] میں ان کے مذکورہ بالا قصائد دستیاب ہیں ۔ ہوش کے قصائد رفعتِ خیال، پرشکوہ الفاظ، تخیل کی بلند پروازی اور لطافت و وسعت میں اعلیٰ درجے کے ہیں ان کے ایک مقصیدہ کے یہ اشعار دیکھیے

اس کے گیسو ہیں کہ دامانِ سحابِ رحمت + اس کے ابرو ہیں کہ محرابِ حریمِ طاعت

سلسلہ پھر کی زلف کا ہو جائے دراز + کاکل حور کی آنے کو اگر ہو شامت

یعنی جو سات کواکب ہیں فلک پر ممتاز + زیرِ حکم اس کے رہا کرتے ہیں وہ ہر ساعت

قابِ قوسین کی تفسیر ہیں دونوں ابرو + خطِ قوسین کو کریں ادنیٰ ہے صفت

شالِ کشمیر کے دو پھول ہیں بغلیں اس کی + خلد کا فور ہوا دیکھ کے جس کی نزہت

سینۂ صاف ہے گنجینۂ اسرارِ خدا + اس کے بندے ہوں نہ کیوں صوفیِ صافی طینت

سبزۂ خط کا کب آغاز ہے رخساروں پر + جا مذل کا یہ ہرا کھیت ہوا بے قیمت

ہوش بریلوی کی تصنیفات میں تاریخِ روہیل کھنڈ، مثنوی نزانۂ ہوش، شہادت نامہ بے نظیر، منادۂ غرائب و اسوخت ہوش اور کلیاتِ ہوش شامل ہیں ۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ علم و تحقیق میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ حکایت نویسی اور شعر گوئی میں بھی طاق تھے ۔ انہوں نے نعت و منقبت کے قصائد میں مذہبی اور دینی امور سے اپنی واقفیت کا مکمل اظہار کیا ہے ۔

نیاز نے کلیاتِ ہوش میں دستیاب قصائد کے موثر نام بھی رکھے ہیں سرمۂ طور، اوجِ بیان، قفلِ ابجد، گوہرِ نایاب اور ذوالفقارِ حیدر وغیرہ [۵] ۔ ان قصائد میں نجوم، علم الکلام، قرآن، تصوف اور بعض دیگر علوم کے حوالے سے بھی بہت کچھ معرضِ اظہار میں آیا ہے ۔ یہ قصائد نیاز احمد ہوش کے علمی قد کی خبر بھی دیتے ہیں اور اس امر کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ شاعر کا اسلوب موثر اور شگفتہ ہے ۔ یہ اسلوب فضا کو بوجھل نہیں ہونے دیتا ہے ۔ ہوش کے قصائد میں برمحل مضامین ملتے ہیں جن کی بدولت ان کا نہالِ معنی سرسبز نظر آتا ہے

یہ اشعار ملاحظہ ہوں سے مرکب ہے بہر طبعِ رواں دو رش نقشِ پا + وسعتِ سخن کی ہے لبِ خاموش نقشِ پا [سرمۂ طور] [۶]

سے فرش کیوں بزمِ سخن میں نہ ہو دامانِ گہر + کیوں ضیا شمعِ معانی کی نہ ہو جانِ گہر [گوہرِ نایاب] [۷]

سے آج ظلمت سے دلا نجمِ مقصد نکلا + وہ ہوئی صبح عیاں اور وہ اختر نکلا [در مدح امام حسینؑ] [۸]

سے ریشۂ کلک ہے کیوں اب رگِ شاخِ طوبیٰ + خلد ہے کس لیے میدانِ قلم سے بے صفا [در مدح علی شوستری] [۹]

سے ہے زنگ نقش و نور ہے آج + کیوں کر نہ ہو گل کی پنکھڑی آنکھ [۱۰]

بہاری لعل راضی

جانی بہاری لعل جی راضی [م ۱۸۹۴ میں زندہ تھے] کا دیوان منتخب قصائد و غزلیات کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔[1] بہاری لعل جی راضی ملک کچھ ریاست جونگر کے دیوان تھے۔ ان کے دیوان میں جان میور (۶ قصائد) چرناد گڑھ کے بابو بالمکند جی (ایک قصیدہ) لفٹیننٹ جیمس ایڈورڈ ٹامسن چار قصائد) ڈی پی برسنز (ایک قصیدہ) کپتان رابرٹ بارلو پارمرینگ (ایک قصیدہ) کرنل جی آر ہمبرس کمانڈنگ افسر پیادگان ہندوستان (ایک قصیدہ) لفٹیننٹ جان لیون بہادر (ایک قصیدہ) ایڈورڈ ڈیویس (ایک قصیدہ) کپتان فریڈرک ترالف (ایک قصیدہ) میجر ولیم مال رنمبری (ایک قصیدہ) کی شان میں قصائد ہیں۔ یہ قصائد فوجی افسروں کی مدح میں ہیں۔ خمخانۂ جاوید میں بھی راضی کے قصائد کا تذکرہ ہے[2] راضی کی شان میں ایک فارسی قصیدہ منشی امین صبا کا بھی ان کے دیوان کے آخر میں شامل ہے[3]۔ مسٹر اسلیم جعفر نے بھی ان کے ایک قصیدے کا تذکرہ کیا ہے[4]۔ جان میور کی شان میں ان کے قصائد کے چند اشعار دیکھیے

؎ جوان و پیر و پسر سب کو بے قراری ہے + تمہارا جانا بنارس سے سب کو بھاری ہے

مقابل آتے ہیں مر جاتے ہیں عدو پیاسے + تمہارے تیغ میں کیا قہر آبداری ہے

یہ زردی ہے تمہاری کہ دیکھنے والے + مرے قصیدے کو کہتے ہیں زر نگاری ہے

اور ہم کو عدل اکرام سے ہے امید قوی + اس لیے کرتے ہیں ہم سب آپ سے یہ التماس

اس میں جس کا امتحاں بہتر ہوا ہے اس کے لیے + ہووے کچھ افزونی تنخواہ یا عہدے کی آس

کیوں کہ پہلے امتحاں کے بدلے ہیں تو آج تک + کوئی پاتا ہے روپے پچیس اور کوئی پچاس

جان غالب ہیں ہمارے جب تلک ہے آپ کے + ہو ہمارا سایہ اعطاف میں محفوظ آراس

آپ کو اقبال و عمر و دولت و حشمت ہمیشہ + اپنی ہمتی تک رکھے اللہ خورسند و بناس

ایک اور قصیدے کے اشعار — آپ آتش میں اور آتش آپ میں محفوظ ہے + اس قدر ہے نصرت نوشیروانی آپ کی

بالیقیں سمجھا اگر ہم عطر شو آپ کا + گنگ امر کو بھی ہذاتی خوش بیانی آپ کی

ہو گیا مشہور دریا تک سے منبع فیض کا + جب سے ہے اس پر چلی کشتی دخانی آپ کی [مقفیٰ و منحف توشیح]

حرف اول جس کے ہر اک شعر بالا سے لیا + نام جانا آپ کا تو لینا جانی آپ کی

راضی کے قصائد کو کوئی اہم مقام تو نہیں مل سکا ہے تاہم انہیں ریکارڈ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں انہوں نے خوشامدانہ رویے، خود غرضانہ رویے اور بے بسی کے انداز اختیار کیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ہم انہیں پختہ قصائد کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔

---

(۱) دیوان منتخب قصائد و غزلیات دربار ریاست جونگر ۱۲۷۷ھ قصائد مدحی اشتا الم (۲) خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۳۴۳ (۳) قصائد راضی و غزلیات (۴) رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۲۷ء ص ۱۵۳ تا ۱۶۰

محمد حسین تمنا

محمد حسین تمنا مراد آبادی [۱۸۹۷ء میں زندہ تھے] مہدی علی خاں ذکی کے شاگرد تھے اور نواب محمد صدیق حسن خاں والیٔ بھوپال کے احباب میں تھے ① ان کے قصائد کا دیوان نشید ایمان کے نام سے طبع ہوا تھا ② اس میں ان کے حمدیہ قصائد شائع ہوئے ہیں اس دیوان کے آخری صفحات پر یہ عبارت بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ

"پوشیدہ نہ رہے کہ آج تک کسی شاعر نے دیوانِ حمد نہیں لکھا تھا۔ عالم ربانی صوفی حقانی شاعر لاثانی مولانا محمد حسین تمنا صاحب نقشبندی نے یہ دیوان تصنیف فرمایا ہے اور یہ مصنف مرید ہیں زبدۃ الاولیا قدوۃ الاصفیا خاتم المحدثین حضرت شاہ عبد الغنی دہلوی مہاجر مدنی قدس سرہ کے اور حضرت شاہ صاحب نے مدینہ منورہ میں ان کو لکھا تھا کہ یہ بشارت اللہم ایدہ بروح القدس میسر باشند۔ یہ وہ دعا ہے جو جناب رسالت پناہؐ نے اپنے مداح حضرت حسانؓ کو دی تھی" یہ عبارت مطبع گلزار احمدی کے مالک کی جانب سے ہے اس دیوان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد حسین تمنا مراد آبادی کا چھٹا دیوان ہے ان کا ایک نعتیہ دیوان نوائے ایمان کے نام سے ۱۸۹۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔

اپنے حمدیہ قصائد کے اس دیوان میں تمنا مراد آبادی کا کہنا ہے کہ دونوں جہاں میں کوئی ایسے کمال کا نہیں ہے کہ جو ذو الجلال کے لئے ایک حرف ثنا لکھ سکے۔ میں خدا کی ہدایت کا وصاف ہوں یہی وجہ ہے کہ رہ مستقیم کا سالک ہوا ہوں، میں وحدتِ ربِ قدیر کا نغمہ سنج بھی ہوں میری صفیر کا نام صوتِ وحید ہے۔

الہی کیا بیاں ہو مجھ سے تیری شانِ رفعت کا + کہ لا احصی ثنا قول ہے شاہِ رسالت کا

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر نورِ ربِ اکبر کا وصفِ تجلی رقم ہو جائے تو میرے دفتر کا لقب مشرقِ خورشیدِ ایماں ہو۔۔۔ ان کے خیال میں خدائے واحد کا رحم رحمِ جہاں سے نرالا ہے وہ ہر جرم و خطا کو بخشنے والا ہے۔ خدا کی قدرت کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو شاخ سے اس طرح ستارہ پیدا ہو جائے جس طرح گل و لالہ احمر پیدا ہوتا ہے۔ خدا سے اپنی محبت اور لو کا انہوں نے یوں اظہار کیا ہے

وصفِ جودِ حق اگر زیبِ رقم ہو جائے گا + خامۂ تحریر سونے کا قلم ہو جائے گا

محمد حسین تمنا مراد آبادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر غمزدوں کو غمِ عشقِ خدا مل جائے تو یہ غم جاں بخش الم کے غموں کی دوا بن جائے گا۔ خدا کا خوانِ عطا ایسی اتنا وسیع نظر آتا ہے کہ اس میں عرشِ اعظم کی حیثیت محض ایک نمکدانِ عطا کی سی دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر نورِ عرشِ ایزدی کا اثر ہو جائے تو عالمِ سفلی کا ہر ذرہ قمر بن جاتا ہے وہ حمد کے حوالے سے نعتِ رسولؐ کی یوں بات کرتے ہیں

خدا نے کیا بنایا ہے یہ منصب مصطفائی کا + نبی کی بندگی میں صاف جلوہ ہے خدائی کا

اگر میں خدائے جلیل کا جلال لکھنے کی کوشش کروں تو بجز قلم کے لئے جبرئیل کا پر آ جائے۔ انسان خدا کے سامنے

---

① تلامذۂ غالب ص ۲۲۱ ② نشید ایمان مطبع گلزار احمدی دکن ۱۲۹۹ھ

بندۂ ناچیز ہے وہ اس کا مالک ہے ۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں میرا ہاتھ گردوں کی طرف دعا کے لیے اس لیے نہیں اٹھتا کہ وہ کثرتِ عصیاں سے حیا کا گرانبار ہے۔ خدائے حبیب کا مدح خواں زندگی کے مسائل سے گھبراتا نہیں ہے ۔ وہ جودِ ایزد کو دریا کہنے کے حق میں نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ اس کا ایک قطرہ فلک بھی نہیں ہے دریا تو بہت کمتر درجے کی چیز ہے۔ خدا کے حکم سے آسمان ساغرِ حباب بن سکتا ہے اللہ نے چار عناصر سے کیا کیا جاندار پیدا کیے ہیں اور انہیں کیسے کیسے بے جان بھی کیا ہے۔ وہ فضلِ ذوالمنن، صنعتِ حق، جودِ خداوندی، مدحِ نورِ حق، ذرّہ کو آفتاب بنانے کی صفت، رفعتِ ایزدی، اس کی رحمانیت وغیرہ کے موضوعات پر بڑی روانی سے اظہارِ خیال کرتے ہیں

سہ کام عالم کے ہیں اللہ کی تقدیر کے ہاتھ + ہیں حقیقت میں قلم بندے کی تدبیر کے ہاتھ
حمد و ثنائے حضرتِ حق ہے بیاں کی روح + خلاقِ دو جہاں کی محبت ہے جاں کی روح
دیتی ہے پھول حکمِ خدا سے چمن کی شاخ + چاہے جو وہ تو دینے لگے گل ہرن کی شاخ
چل نہیں سکتا کسی شے پر کسی بندے کا بس + فضلِ ایزد کے سوا کوئی نہیں فریاد رس

تمنا مرادآبادی کہیں الغیاث پکار اٹھتے ہیں اپنے عصیاں معاف کروانے کے لیے یا الغوث کہہ اٹھتے ہیں .

ان کا کہنا ہے کہ حمدِ حق فکر کے لیے سامانِ شرف ہے ۔ صنعتِ حق اور ذرّہ نورِ خدا سے ناممکن کام بھی ممکن ہو جاتے ہیں لاحل مشکلات در فیض الٰہی پر جا کر حل ہو سکتی ہیں۔ خدا کے آغاز کو پایانِ خیال نہیں پا سکتا ۔ سارا بیانِ علم اک حرفِ حمدِ حق سے کمتر درجہ کا ہے ۔ یہ تضاد بھی

سہ قہرِ حق موت جو پھیلائے گا کفار وں کب + برہمن بھاگنے نہ پائیں گے زناروں میں ۔ انہوں نے حرفِ ثنائے حق کو دُرّ و گوہر سے کمتر نہیں ٹھہرایا اور ان کے نزدیک دیوانِ حمد کانِ جواہر سے کسی بھی طور کم نہیں ہے لبنانوں میں بلبلوں کی حمد سرائی، خدا کے در سے کسی کا خالی نہ لوٹنا، اس کی حاجت روائی، اس کا لاشریک ہونا، موجود ہونا اور بے مثال ہونا، جلالی شان، آمرزگاری، حلیمیت، رحمانیت، شانِ غفاری، ماورائے وہم و خیال رہنا، خدا کی ہمیشگی، اس کی بخشش، کارسازی، رزاقی، مختارِ کل ہونا اور اس کی کریمی کے معاملات وغیرہ کو بھی شاعر نے موضوع بنایا ہے

وہ یہ بھی لکھتے ہیں سہ اثر صنعتِ خالق ہے طلسمِ حیرت + شکلِ موجود میں جس سے نظر آتا ہے عدم
ہر صنعت خلاق تحقق سے ورا ہے + پیدا کیا بے سایہ شہِ دیں کے بدن کو
ولی کے نام پر تو گائے فربہ ذبح ہوتی ہے + خدا کے نام پر کرتے نہیں کنجشکِ لاغر کو

محمد حسین تمنا مرادآبادی کے حمدیہ قصائد خطابیہ ہیں ان میں تشبیب اور گریز وغیرہ کی پابندیوں سے گریز کیا گیا ہے تاہم مدحیہ اور دعائیہ حصوں میں انہوں نے جاندار شاعری کی ہے اور اپنے عقائد اور عقیدت کے اظہار میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ۔ اس حمدیہ قصائد کے دیوان میں سو سے زائد قصائد ہیں ان میں موضوع کی تکرار و اعادہ کا سلسلہ بھی ملتا ہے ۔ تمنا مرادآبادی شستہ، چست، رواں اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں اور کہیں کہیں تخیل کے وسیلے سے نئی بات بھی پیدا کرتے ہیں

سہ اگر حمد عطائے ایزدی تحریر ہو جائے + تو ہر سطرِ رقم سونے کی اک زنجیر ہو جائے

—

محمد جان شاد

محمد جان شاد لکھنوی پیرو میر [م ۱۸۹۹] بڑے پرگو شاعر تھے۔ ان کے تین دیوان طبع ہو چکے ہیں
سخن بے مثل اور سخن بے مثال ان دو دواوین میں ان کے قصائد ملتے ہیں۔ دیوان شاد[1] میں نواب سید محمد مہدی علی خان،
امیر الدولہ راجہ امیر حسن خان، نواب اسد علی خان ناصر الدولہ کی شان میں قصیدے دستیاب ہیں ان کے مطالع یوں ہیں

مدح مہدی علی خاں سے عالم علم جہاں ہوں بہ موافق تقدیر + کامل فن زمانہ ہوں بہ حسن تدبیر

" امیر حسن خاں سے وہ سخنور ہوں جو ہوں انجمن آرائے سخن + سر کٹے چرب زبانی جو کرے شمع لگن

" اسد علی خاں سے جھپک جھپک کے جو چشم نصیب ہو بیدار + تھپک تھپک کے سلائے سپہر نا ہنجار

ان کا ایک قصیدہ نواب صادق الدولہ صادق علی خاں بنیرۂ محمد علی شاہ کی مدح میں بھی ملتا ہے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں

سے بتوں نے دیدۂ پرنم کو کیا کیوں بادل + کہ شیشیوں میں ہے کافوارلق کے گنگاجل

سیاہ چشم نہیں یہ میان مژگاں ہے + عروس حسن کی کجلوٹیوں میں ہے کاجل

تذکرہ آب بقا میں محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی نے ان کے ایک قصیدہ در مدح شہزادہ برجیس قدر کے چند اشعار
دیئے ہیں۔ برجیس قدر کو معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ کی جگہ حریت پسندوں نے تخت سلطنت پر بٹھایا تھا
اس قصیدے کے یہ اشعار ملتے ہیں سے ہوئی جو دریم پیماں شکن کو خواہش زر + اودھ کے شاہ کا عسیا یہو نے وہ ساگھر

لٹا یہ حال کہ خاک اڑ گئی خزانے میں + بجائے درہم و دینار رہ گئے پتھر

تلاش زر میں ہیں ہتھیار بند اس درجے + لگا کے دانت کٹاری ہیں دل کی کوڑی پر

گرے پڑے ہوئے ڈھیروں جہاں جواہر تھے + وہاں نہ پوت کا چھلا رہا کہاں زیور [2]

شاد لکھنوی کے قصائد میں مخبر یہ رنگ بھی نظر آتا ہے اور اپنے عہد کی تصویر کشی بھی۔ ہندی اور اردو الفاظ پر
ان کے عبور کامل کا اندازہ بھی ہوتا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ استادانہ پر تاثیر مطالع اور اشعار کہنے میں بھی طاق
تھے۔ انہوں نے اپنے ایک قصیدے میں لکھنوی نوابوں پر انگریزوں کے تسلط کی صورت حال کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا
ہے کہ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ میں ماحول دگرگوں ہو گیا۔ خزانے خالی ہو گئے، سپاہی پیشہ حضرات
بھی تلاش زر میں اسلحہ لے کر گھومنے لگے۔ دریم پیماں شکن کہہ کر شاد لکھنوی نے نہایت ہی بلیغ سیاسی اشارہ
کیا ہے۔ شاد لکھنوی کے قصائد میں قصیدہ نویسی کا مخصوص شکوہ اور موضوعاتی شان و شوکت کی کمی نہیں
ہے۔ انہوں نے مقامی الفاظ اور مقامی رسوم و رواج کے اشاروں سے بھی اپنے قصائد کو مزین کیا ہے پوت کا چھلا
گنگا جل وغیرہ کے الفاظ ان کے اسی نقطہ نظر کے حوالے سے استعمال ہوئے ہیں۔

---

(1) دیوان شاد مجلسی پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۲۰ (2) تذکرہ آب بقا ص ۱۷۱ مطبع نامی پریس لکھنؤ ۱۹۱۱

ظہیر احسن شوق

محمد ظہیر احسن شوق نیموی [م 1900/1901] تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے حسرت موہانی نے لکھا ہے " ان کے قصیدے ان کی غزل سے بہتر ہیں "[1] حسرت نے ان کی علمی استعداد اور فصاحت و بلاغت کی خوبیوں کو اس امر کا سبب قرار دیا ہے ۔

شوق نیموی نے مذہبی قصائد بھی لکھے ہیں اور غیر مذہبی بھی ۔ حسرت نے ان کے قصیدہ در مدح نواب شیخ حسین میاں والیٔ منگرول کا ذکر کیا ہے اور ان کے نعتیہ قصیدہ پر تبصرہ بھی کیا ہے[2] ان کے ایک قصیدہ کا یہ اقتباس دیکھیے

مجھ کو خلاق معانی نے دیا ہے وہ کمال + نکلے جو بات مرے منہ سے وہ ہو سحرِ حلال
زلفِ جاناں کے جو مضموں سے الجھ جاتا ہوں + ختم ہوتا ہی نہیں سلسلۂ حسنِ مقال
والیٔ خطۂ منگرول معلّے القاب + حضرتِ شیخ حسین انجمن آرائے کمال
بدرِ اوجِ شرف و نجم سمائے رفعت + مرکزِ دائرۂ عزت و شان و اجلال
قطبِ گردوں رفعت نقطۂ چرخِ صفا + آفتابِ فلک قدر و مہ برجِ جمال

شوق نیموی کے قصائد میں زبان و بیان کی پختگی اور خیالات کی روایتی شان دیدنی ہے ۔ انہوں نے فارسی تراکیب کا استعمال کچھ اس طور کیا ہے کہ مصرعے چوکس ہو گئے ہیں اور خیالات بلیغ

ظہیر احسن شوق نیموی کے قصائد روایتی نمونوں ہی کے حامل ہیں ان میں خیالاتی اور لسانی تسلسل کلاسیکی قصائد ہی کے اثرات رکھتے ہیں ۔ مدح میں وہی یکسانیت اور خیالات میں وہی محدودیت ۔ تاہم ان کے اسلوب اور اظہار کی پختگی نے انہیں اردو قصائد کی طویل مسافت میں ایک مقام عطا کیا ہے

شوق نیموی کے دیوان "نظم سحر ساز"[5] میں ایک نعتیہ قصیدہ ملتا ہے[6] ایک اپنے مرشد مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کی شان میں (اس قصیدہ میں مختلف صوفی بزرگوں کے نام بھی استعمال کیے گئے ہیں) منقبتی ، شوق نے نواب رامپور کی شان میں بھی قصائد لکھے ہیں اور نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ کی مدح میں بھی ، یہ اشعار ملاحظہ ہوں

اللہ رے یہ جلوہ حسن و جمال عید + چمکا برنگ ابروئے خوباں ہلال عید [قصیدہ نعتیہ]
بحق حضرت یعقوب چرخی مہر چرخ دیں + بحق حضرت خواجہ عبید اللہ بیزداز [در مدح مولانا فضل الرحمن][4]
جمشید حشم ظل خدا کلب علی خاں + دارائے جہاں بخشش سکندر سے زیادہ [نواب رامپور کی مدح][7]
جناب خواجہ عالی گہر سلیم اللہ + خدا کا سایہ ہے جن کے سر مبارک پر [در مدح نواب سلیم اللہ][8]

شوق نیموی کو عربی پر دسترس کامل تھی ۔ فن شاعری سے وہ مکمل طور پر آگاہ تھے مختصر قصیدہ کے سنجیدہ مزاج سے وہ سر مو انحراف نہیں کرتے تھے ۔ انہوں نے لبقول عرش منیر کے رنگ میں قصیدے کہے ہیں اور داغ کے رنگ میں بھی[9]

---

(1) معرزن شاگردان تسلیم از حسرت موہانی اردوئے معلی اکتوبر 1911 (2) ایضاً (3) ایضاً (4) حیات جاودانی از عرش ص 55 مطبوعہ علی گڑھ س ن
(5) ایضاً (6) نظم سحر ساز از شوق نیموی ص 80 مطبع سیدی پٹنہ 1908 (7) تا (8) ایضاً ص 81، 86، 92 (9) حیات جاودانی ص 6

امیر مینائی

امیر احمد امیر مینائی (۱) م [۱۹۰۰ء] کا لکھنؤ سے تعلق تھا۔ وہ مظفر علی اسیر کے تلامذہ میں سے تھے ان کا سلسلۂ نسب شاہ مینا سے ملتا ہے۔ وہ واجد علی شاہ، نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے درباروں سے وابستہ رہے۔ امیر کے مطبوعہ دیوان میں بارہ قصائد موجود ہیں جن میں سے پانچ مذہبی ہیں اور باقی امیروں اور نوابوں کی مدح میں ہیں۔ ان کے قصائد کے دیوان کا بھی تذکرہ ملتا ہے (۲) ان کے ممدوحین میں واجد علی شاہ، مشتاق علی خاں، نواب حامد علی خاں، نواب شاہجہان بیگم، نواب کلب علی خاں اور میر محبوب علی خاں بھی شامل ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے قبل غیرستان بہار کے نام سے انہوں قصائد کا ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا یہ مجموعہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گیا (۳)۔ امیر کے دیوان مطبوعہ مراۃ الغیب (۱) اور قصائد امیر مینائی (۵) میں قصائد دستیاب ہیں۔ امیر شاعری کے بلند پایہ اساتذہ میں سے ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے (۴) مختلف تذکرہ نگاروں نے انہیں عمدہ الفاظ سے یاد کیا ہے (۶)

امیر مینائی کے قصائد لسانی اور فنی حوالوں سے پختہ ہیں۔ انہوں نے فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیارات پر توجہ مرکوز رکھی۔ مضمون آفرینی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے علمی ثقالت اور فنی تصنع سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔ امیر تخیل کے استعمال میں معتدل مزاج تھے۔ ان کے ہاں خیال اور معانی تخیلاتی وادیوں میں گم نہیں ہوتے۔ امیر مینائی نے قصائد میں گمبھیرتا اور معنی وسعت پیدا کرنے کے لئے استعارات کی جانب بھی رجوع کیا۔ اس حوالے سے بھی ان کا مزاج حد اعتدال میں رہا یعنی انہوں نے استعاراتی پیچیدگیوں اور استعارہ در استعارہ اسلوب اظہار سے پہلو بچا کر قصائد لکھے۔ قصائد کے شکوہ میں اضافہ کرنے والی تراکیب اور لفظیات سے امیر نے سروکار رکھا تاہم اس مقام پر ان کی خوش سلیقگی اور لفظی تراش خراش کا انداز انہیں اپنے معاصرین سے ممیز کرتا ہے۔ وہ قصائد میں روانی اور برجستگی پیدا کرنے کے ہنر سے آگاہ تھے۔

امیر مینائی کے قصائد میں مطلعوں کی برجستگی اور جاذبیت قابل توجہ ہے

نعتیہ قصیدہ ؎ الف آدم میں ہے محمود و احمد میں ہے بے لا کا + سبب یہ ہے کہ واں سایہ تھا یاں سایہ نہ تھا قد کا

؎ سرما میں آئے برق کے لگنے ورق ورق + آتشکدے کا پڑھنے لگے یخ بچے سبق

؎ شب دوشینہ جو کل خواب میں میں نے کروٹ + آئی اک حور لقا پاس اٹھا کر گھونگٹ

در مدح نواب کلب علی خاں ؎ فصل گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں + بڑھ کے رضواں سے ہے ان روزوں دماغ باغباں

---

(۱) شاہ مینا کا مزار لکھنؤ میں ہے (۲) مضمون امیر مینائی از تمکین کاظمی قومی زبان کراچی یکم مئی ۱۹۵۹ء

(۳) صہبائے مینائی از ڈاکٹر آمنہ احمد صدیقی ردولوی مطبوعہ عارفین پریس ڈھاکہ

(۴) مراۃ الغیب نولکشور پریس لکھنؤ ۱۲۸۹ھ (۵) قصائد امیر مینائی مکتبہ سلطانی ابراہیم بمبئی ۱۹۲۹ء

(۶) دبدبۂ امیری مولفہ و مصنفہ سید محمد عبدالحکیم برقی پرنٹنگ پریس پٹنہ (۷) تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۰ و طور کلیم ص ۱۲

در مدح نواب کلب علی خاں ؎ عالم خواب میں پہنچا میں عجب خواب میں گل + شجرِ طور کو جس باغ کی کہیے کونپل

ایضاً تخت کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہ قلم + دائرے طبل کی صورت میں الف شکل علم

تا کجا کوتہی اے دست ہوس کر جیوٹ + پردۂ شرم رخ شاہد معنی سے الٹ

مذکورہ مطالع میں الفاظ کی متانت اور خیالات کی ندرت و بلندی قابل توجہ ہے ان سے ان کے شعور کی جامعیت اور شخصی قابلیت کا سراغ بھی ملتا ہے امیر مینائی نے سنگلاخ زمینوں کو بھی خوش اسلوبی سے برتا ہے

؎ دستار زرق شیر پہ از اطِ ربط سے + کلغی کی جا ہے طرہ غزال ختن کی شاخ

نعتیہ لائق ہے کیا چمن میں ہر اک شاخسار پھول + دکھلا رہے ہیں باغ جناں کی بہار پھول

نعتیہ اے خضر بھول گئی تھی مجھے راہ تگ و تاز + وقت پر آ گئے تم عمر تمہاری ہو دراز

امیر مینائی کے قصائد کی تشبیب میں موسموں اور منظروں کے کوائف بھی نظر آتے ہیں مناظرے اور مکالمے بھی۔ علمی حوالے بھی ملتے ہیں اور وصف نگاری کے عمدہ نمونے بھی۔ امیر نے بہاریہ تشبیب بھی لکھی ہیں اور سراپا نگاری پر مشتمل بھی۔ ان کے ہاں رندانہ، حکیمانہ اور فخریہ مضامین بھی مل جاتے ہیں۔ وہ مناظرانہ رنگ کی تشبیب کو بھی خوب سنبھالتے تھے۔ امیر نے کہیں دانش و وہم اور کہیں شانہ و آئینہ کے مابین مناظرہ و مقابلہ دکھایا ہے۔ ان حصوں میں انہوں نے موافق و مخالف دلائل کے بیان میں جاندار تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ دو اشیا کے مابین مکالموں میں بھی امیر نے روانی، تسلسل اور مخالفانہ جوش و خروش کو برقرار رکھا۔ آئینہ اور شانہ کے مناظرہ پر مشتمل چند اشعار ملاحظہ ہوں

در مدح کلب علی خاں ؎ آئینہ شانے سے کہتا ہے کہ سر چڑھ تو نہ بہت + منہ کی کھائے نہ کہیں چاک نہ ہو تیرا جگر

پارہ چوب جگر چاک دنی بے قیمت + چار پیسے کو جسے مول نہ لیں اہل ہنر (1)

شانہ کہتا ہے ؎ ہمہ تن ہو کے زباں کہنے لگا یوں سرِ دست + منہ بنا چاہیے عاقل کو تعلی سے حذر

ہے حسینوں میں رسائی تری گاہے گاہے + کوچہ زلف میں میری ہے جگہ آٹھ پہر

بہاریہ تشبیب میں بھی امیر کا قلم پوری جولانی پر تھا۔ ولی، میر، سودا، آتش اور منیر وغیرہ نے جس مقبول عام زمین میں لامیہ قصائد لکھے ہیں امیر مینائی نے اس میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے اپنے لامیہ قصیدے میں گل و گلزار کے عمدہ نقشے رقم کیے ہیں اس میں انہوں نے مذہبی تلمیحات کا استعمال بھی کیا ہے

؎ ساغر عشرت کونین وہیں کے دو پھول + میوہ مقصد دارین وہیں کے دو پھل

لالہ آتا تھا نظر یوں پس دیوار چمن + جس طرح شیش محل میں کوئی روشن مشعل

ٹکڑے بادل کے نہ تھے ہند و سوسن کے لیے + بھر کے آیا تھا دھواں چھاگلوں میں گنگا جل

---

(1) یہ شعر ملاحظہ ہو اس میں قدیم ایرانی تلمیح استعمال ہوئی ہے ؎ بال تو منہ میں ترے ٹوٹ کے رہ جاتا ہے
جس طرح شانۂ ضحاک میں تھا سانپ کا گھر

؎ مور تھے رقص میں مصروف برنگ لطمے + جھومتے پھرتے تھے مستوں کی طرح سے بادل
گل نسریں پہ تھا یوں عکس شعاع خورشید + جیسے سونے کو کرے ساغر الماس میں حل

امیر مینائی کی اس نوع کی تشابیب میں مبالغہ کا حسن قابل دید ہے ۔

طوبیٰ سے جا کے خلد میں پیوند ہو گئی + ایسی بڑھی ہر ایک گل یاسمن کی شاخ

انہوں نے ایک مقام پر خیال معشوق کا نقشہ بھی کھینچا ہے دو اشعار دیکھیے

؎ پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے کہیں + ناچنے میں کو جو نکلی تو کیاں کا گھونگھٹ
جلوہ گر مردم چشم و صف مژگاں سے یہ صاف + حور بیٹھی ہے در خلد پہ کھولے ہوئے پٹ

امیر مینائی نے ایک تشبیب میں موسم سرما کا فنکارانہ صناعی سے بیان کیا ہے

؎ پیدا ہو طفل غنچہ تو برد عجوج بھی + آئے کہ نال کاٹنے کی میں ہوں مستحق
پہنچے نہ پہنچے لوگ بڑھائیں ضرور ہاتھ + دکھلائے دور سے جو فلک آتش شفق
الکن ہیں سب کے سب یہ معلم کو ہے گماں + پڑھتے ہیں کانپ کانپ کے لڑکے جو نام حق

امیر کو لفظوں کے صناعانہ استعمال پر قدرت تھی ۔ بعض جگہوں پر انہوں نے مفاہیم پر لفظی اسلوب کو فوقیت دی

؎ ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات + یہی لشکر ہے، یہی فوج یہی خیل و حشم
ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم + وزراء رتبہ و دبدبہ و جاہ و حشم
منتخب ہیں جو مضامیں تو معانی ہیں لطیف + ہیں یہی گنج و خزائن وہی دینار و درم

نواب حامد علی کی مدح میں امیر نے جو بہاریہ تشبیب پر مشتمل قصیدہ لکھا ہے اس میں گل و گلزار کے بیان کے لئے فنون حرب کی اصطلاحیں اور الفاظ بھی استعمال کیے ہیں ۔ رسالہ دار، علم، سپاہ پیادے، میمنہ، میسرہ، نوبت و نقارہ، وردیاں، صرصر ترس، خیمہ سیاہ، گولے، توپیں، پلٹنیں زرہ پوش، نیزہ دار، ترکش، افسر، میر آتش، شمشیر آبدار، احدی، ترکتاز، گولیاں اور خنجر گزار وغیرہ کی اصطلاحوں کے حوالے سے انہوں نے لشکر بہار کے ہاتھوں لشکر خزاں کے تاراج ہونے کا منظر کھینچا ہے

؎ پھولوں کی پلٹنوں کو ملیں سرخ وردیاں + پہنیں لباس سبز سواران شاخسار
موجوں کے ہر طرف سے زرہ پوش آئیں جلد + فوارہ ہائے آب کے حاضر ہوں نیزہ دار

اسی تشبیب میں بید، سرو، سوسن، سنبل اور سورج مکھی کا بھی لشکر اور اس کے متعلقات سے حوالے سے تذکرہ ملتا ہے ۔ علاوہ ازیں امیر نے مختلف پرندوں کا بھی عمدہ انداز میں ذکر کیا ہے ان میں شاہین، باز، جرہ، کلنگ، اخروس، بط، کبک، تدرو، فاختہ، طوطی، ہزار، طاؤس، کنجشک، سرخاب، کبوتر، شاز، عقاب، ہرکولہ وغیرہ کے حوالے بہار کی فوج کی کمک کے پس منظر میں آئے ہیں ۔

میر محبوب علی نظام دکن کی تعریف میں ان کے قصیدے کی تشبیب میں سرزمین دکن کی تعریف علیحدہ ہے لکھا

مطلع ہے ؎ اللہ اللہ رے بہار چمنستان دکن + عشوہ پر ہے نہ یہ جوبن نہ پری پر یہ پھبن

امیر مینائی کی تشابیب میں ان کی علمیت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں نجوم و حرب سے لے کر منطق و رمل شماری تک کے علوم و فنون کو انہوں نے تشبیب کی کٹھالی میں پگھلا کر استعمال کیا ہے۔ نواب کلب علی خاں کی مدح میں اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں انہوں نے ایک علمی مجلس کا حال رقم کیا ہے ①

امیر مینائی بعض قصائد میں سودا اور انشا سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ سراپا نگاری کے حوالے سے ان کی تشبیب سودا اور انشا کے مشہور قصائد ہی کی زمینوں میں ہے

؎ سرمہ آنکھوں میں لب لعل پہ مسی کی دھڑی + سرخی پان کو رو اخون تمنائے ملک
گرمئی شعلۂ ابرو ہے عجب شعلۂ قہر + آنچ تلوار کی اچھی ہے بری اس کی لپک

؎ شعلہ رخسار جفا کار قیامت آفت + شوخ عیار غضب قہر چھلاوا نٹ کھٹ
پختہ کار اس کو جو دیکھیں طمع خام کریں + ثمر پیش رس حسن میں وہ گدرا ہٹ

امیر مینائی نے جہاں تشابیب میں نشاط و خوشی کے مناظر قلمبند کیے ہیں وہاں ان کا ایک ایسا قصیدہ بھی نظر آتا ہے جس میں دکھ، درد، مایوسی اور اپنی حالت زار کا بیان ہے۔ یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں کے دو بیٹوں کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا اسکا مطلع ہے

؎ سیاہ اشک کی آنکھوں نے کی ہے تیاری + کہو کہ نیزۂ مژگاں کرے علمداری

جہاں تک نعتیہ قصائد کا تعلق ہے امیر مینائی نے ان میں بھی اپنے علمی اور فنی مزاج سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ شہیدی کے مشہور نعتیہ قصیدہ کی تقلید میں انہوں نے جو قصیدہ لکھا اس کی تشبیب میں حمدیہ مضامین کا اہتمام کیا

؎ تفکر امتیاز جان و جاناں میں کیا حد کا + عروض اب تک نہ آیا تو اس بیت محقد کا
نفخت فیہ من روحی کے معنی سمجھو اثابت + خزانہ ہے محیط اس چشمۂ روح مجرد کا
گیا شبہ سمجھ میں آیۂ حبل الورید آیا + رگ گردن مقام خاص ہے محبوب بے سروقد کا

اس تشبیب میں کعبۂ دل کی تجلی قلب کی صفائی، دولت دنیا اور کبر و غرور سے بیزاری اور بارگاہ خداوندی میں آہ و زاری کے مضامین قلمبند ہوئے ہیں۔ اس تشبیب میں امیر مینائی نے ایک استقبالیہ غزل بھی رقم کی ہے۔ ایک اور نعتیہ قصیدہ ② کی تشبیب میں امیر مینائی نے ایک پیر کی گفتگو رقم کی ہے جو عازم مدینہ کے لئے حوصلہ افزائی کا مژدہ بنتی ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مدینہ کا عزم کرنے والے کے حال میں تائید خدا شامل ہوتی ہے۔ اس قصیدے میں وصف روضۂ اقدس اور معراج شریف کا بھی تذکرہ ہے

---

① اس قصیدے کا مطلع ہے تخت کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہ قلم + دائرے طبل کی صورت میں الف شکل علم

② اس قصیدے کا مطلع ہے ؎ اے خضر بھول گئی تھی مجھے راہ تگ و تاز + وقت پر آگئے تم عمر تمہاری ہو دراز

امیر مینائی نے پھول ردیف والے اپنے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب میں پھول کی رعایت سے عمدہ مضامین قلمبند کیے ہیں۔ امیر مینائی نے قصائد منقبت بھی لکھے ہیں حضرت علیؑ کی تعریف میں ان کا قصیدہ فخر و تعلی سے شروع ہوتا ہے ؎ کیوں کر نہ کروں ملکِ معانی کو میں تسخیر + خامہ ہے مرا دستِ ید اللہ کی شمشیر

انہوں نے اپنے ایک قصیدہ منقبت میں (امام حسینؑ ممدوح) فلسفیانہ انداز سے معاملاتِ دہر پر روشنی ڈالی ہے اسکا مطلع ہے ؎ نشاطِ دہر ہے سو کس طرح نہ دل مایوس + کہ چار دن کی یہ مہماں ہے مثلِ شمعِ عروس

امیر مینائی کو صنعت براعتہ الاستہلال[1]، حسنِ تعلیل اور تلمیح وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل تھی۔ رعایتِ لفظی کے استعمال میں بھی ان کی شاعری درجۂ استناد کو پہنچی ہوئی ہے۔

امیر مینائی کی شوکتِ علمی، ذخیرۂ الفاظ، دلفریب تشابیب اور شاندار گریز وغیرہ نے انہیں اعلیٰ قصیدہ نگاروں کی صف میں شامل کیا ہے

مذہبی قصائد ہوں یا غیر مذہبی امیر مینائی کے ہاں گریز کا انداز عمدہ ہے جس قصیدہ کی تشبیب میں انہوں نے ایک علمی مجلس کا نقشہ کھینچا ہے اس کی گریز یوں کرتے ہیں

؎ طلب ہوئے ہیں جو یہ لوگ اس کی وجہ یہ ہے + زرِ سخن کسی کامل کا ہو گا زیورِ گوش
مرید ایک ہے اس مقتدا کا خاص الخاص + وہ مستِ بادۂ عرفاں یہ پیرِ بادہ فروش
ہمیشہ تا جورِ شہرِ مصطفیٰ آباد + مطیعِ شرعِ نبی متقی عبادت کوش
جنابِ کلبِ علی خاں بہادرِ ذی جاہ + جو آنکھ اس کی ہے حق بیں تو گوشِ عذر نیوش

منقبت علی کے قصیدے میں ان کے گریز کا یہ انداز ہے

؎ سو طرح کا بخشا ہے مجھے علم خدا نے + قرآں مرا دل ہے تو ہے سینہ مرا تفسیر
میدانِ سخن جیت لئے میں نے ہزاروں + بازو ہے قوی جھولتی ہے عرش پہ شمشیر
یہ عزّ و شرف اس کی غلامی سے ہے حاصل + جو صاحبِ منبر ہے ولا اس کی ہے اکسیر

طویل گریزوں کے ساتھ ساتھ برجستہ، مربوط اور اختصاری گریز یہ انداز بھی امیر کا طرۂ امتیاز ہے

؎ گرچہ صحنِ باغ میں ہر سال آتی ہے بہار + اور آتا ہے نظر رنگِ زمین و آسماں
ہے سبب اس کا کہ ان روزوں ہوا مسند نشیں + سروِ گلزارِ ریاست صاحبِ بختِ جواں

ایک گریز میں معشوقہ اپنے آپ کو ممدوح صفت ٹھہراتی ہے۔ ایک قصیدے میں باغ کو ممدوح کے اوصاف کا مظہر قرار دیکر اور معشوقہ کو اس کی طبع نازک ٹھہرا کر گریز کیا گیا ہے

---

(۱) اس ضمن میں دیکھیے منقبتِ علی کے قصیدہ کا مطلع

امیر مینائی کے قصائد میں مدحیہ حصے روایتی موضوعات و اطوار پر مبنی ہیں۔ غیر مذہبی ممدوح کو انہوں نے حاتم، فلک جاہ، معدنِ اخلاق، ہم مرتبہ تیمور و جم، علم و حلم و جود میں یکتائے زمانہ، دانائی میں فخرِ عالم، منبعِ سخا اور عدالت گستر وغیرہ کے الفاظ سے پکارا ہے۔ اس نوع کی خوبیوں کا جگہ جگہ تفصیلی اور توضیحی بیان بھی کیا ہے۔ علاوہ ازیں ممدوح کے ساز و سامان، اسپ و فیل وغیرہ کی تعریف کا گھسا پٹا انداز بھی اپنایا ہے

؎ تب بنی اس سے ترے خاکِ قدم کی اکسیر + چرخ نے ماہ کو شق کر کے کیا جب سمپٹ (۱)
سنگِ شمس و قمر میں جو کہیں نام نہیں + کر دیا کیا تری چنگل نے مسل کر سلیپٹ
رخشِ گردوں کی طرح گاو زمیں چل نکلے + منہ سے تیرے جو کہیں اتنا نکل جائے کہ چل
جس طرح داغ ہے آغوش میں لالے کے لپٹی + ڈر کے مریخ کے سینے سے لپٹ جائے زحل
وقتِ رفتار ہے زر ریز عجب فیضِ قدم + نقش پا راہ میں بن جاتے ہیں دینار و درم
پرواز کرے کاغذِ بادی کی طرح سنگ + نقاش اگر کھینچ دے اس اسپ کی تصویر
جتنے اوصاف ہیں گھوڑے کے وہ ان میں ہیں فرد + سخت سم، نرم دم، آگندہ سرین، پہن کفل
کبھی لنڈا جو چلے مور جھکائے گردن + ناگ چال ایسی چلے ٹھوکریں کھائے ناگن
فیل خرطوم میں لے کے جو زمیں کو پھینکے + آندھی آجائے سیہ جائے فلک گرد میں اٹ

خیالی اور تخیلاتی مدح کے ساتھ ساتھ امیر نے اصلیت اور واقعیت سے معمور مدحیہ اشعار بھی لکھے ہیں نواب حامد علی خاں کی مدح کرتے ہوئے انہوں نے رامپور میں مسجد و مسافر خانہ کی تعمیر اور کارخانوں کی ترقی کا موثر نقشہ کھینچا ہے۔ بعض جگہ امیر نے اپنے ممدوحین کے جسمانی حسن کی تصویر کشی بھی کی ہے

؎ ہے اسی سے تو ہر اک کام میں ہر دم رونق + کارخانوں میں اسی سے تو ترقی ہے سوا
کر بنائی گئی ہے ایسی جگہ اک مسجد + جس جگہ فرض تھا واجب تھا کہ ہو ایسی بنا
پاس اس کے وہ بنایا ہے مسافر خانہ + جس سے ہر وارد و صادر کو ملے گھر کا مزا
حسن میں تجھ سے سوا وہ ماہ کنعانی تو نہیں + کھول کر بیٹھے ہیں جو ایمان فروشی کی دوکاں

مذہبی قصائد میں امیر نے مذہبی شخصیات کے شمائل، برکات، معجزات اور کرامات کا بالتفصیل بیان کیا ہے

؎ تیغ انگشت مبارک سے ہوا ماہ دو نیم + کس پہ اظہار نہیں شق قمر کا اعجاز

امیر مینائی کی طبع قصیدہ گوئی سے مناسبت رکھتی تھی۔ وہ اپنی جامع العقات شخصیت، علمی وسعت اور عمدہ شاعرانہ جوہر کی بدولت ہر نوع کے موضوع کو گرفتِ اظہار میں لانے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ ان کے قصائد میں عربی ایرانی، ہندی تہذیبی روایات کی جانب اشارے ملتے ہیں۔ زبان و بیان پر اپنے عبور اور ہیئتی و فنی رکھ رکھاؤ کے آمیزے سے انہوں نے سنجیدہ، دقیع اور اہم مقام کے حامل قصائد تخلیق کیے

---

(۱) اسے نقیہ لیلۃ القدر بھی کہا ہے ؎ لیلۃ القدر رکھا نام قصیدے کا امیر + کہ یہ خامے سے کر معروف دعا ہو تھٹ پٹ

عبدالاحد شمشاد

عبدالاحد شمشاد [پ ۱۸۲۹/۱۸۵۰] کا کلام خزینۂ شمشاد المعروف بہ نظم دلفروز[1] ۱۳۱۷ھ میں شائع ہوا۔ اس میں نواب منگرول شیخ حسین میاں، رئیسہ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم، مدار المہام جوناگڑھ شیخ محمد بہاؤالدین اور (لیفٹیننٹ سید نذر الحق) مسٹر رینالڈس کی شان میں قصائد ملتے ہیں

درمدح شیخ حسین میاں ؎ کس پری زاد سے قسمت میں لکھا تھا سروکار + جو رہے دل میں رہے اور مجھی سے بیزار ص ۱

ایضاً ؎ جا پڑی ایک طرف میری لگا یک جو نظر + دیکھی وہ شکل کہ تھی غیرت خورشید و قمر

؎ جہاں میں ہوں وہ بحر معانی روشن + ہر ایک قطرہ ہے جس کا جواب در عدن

درمدح شاہجہاں بیگم ؎ تلاش فیض میں کس کے ہے چرخ پیر فضال + کہ ساتھ ساتھ ہیں انجم بہ صورت اطفال

مدح شیخ محمد بہاؤالدین ؎ رات اک مجلس میں چند اہل کرم + جمع تھے با تمکنت و جاہ و حشم

مدح رینالڈس ؎ برا ہو قحط کا کیسا رہا ہے عالمگیر + اسی کے ہاتھ سے نالاں تھے سب صغیر و کبیر

۱۸۸۹ء میں شمشاد کو والئ منگرول نے طلب کیا تھا۔ وہ ایک عرصہ تک ان کے ساتھ وابستہ رہے۔ شمشاد کے قصائد کی علمی سطح غایت درجہ بلند ہے۔ وہ ان کی شاعرانہ اور فنی مہارت کا کھلا ثبوت ہیں والئ منگرول کی شان میں ان کے مذکورہ بالا اولین قصیدے کو ہی لے لیجئے۔ یہ طویل بھی ہے اور مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں سے معمور بھی

؎ بادۂ مینخانۂ ہستی میں نہ سمجھا کم ظرف + بادۂ کبر سے پینے نہیں جام سرشار
مہر ساں، تار نفس ہے تہ سحر کے مانند + دھجیاں دل کی اڑاتی ہے قبائے زرتار
جشن جمشید کی کیا ہو گئی دل میں شوکت + میں نے منگرول میں دیکھے ہیں برابر دربار
تخت طاؤسی دہلی و سریر جمشید + حشمت مسند عالی کے ہیں برابر بے کار

اس قصیدے میں شمشاد نے منگرول کے سید بارہے، شرفاء و نجباء، تنبولی، نجار، سنار، لوہار، بزاز، بساطی، مزدور، معمار، صناع اور شیخ و برہمن وغیرہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور دیگر پیشہ وروں کا بھی

؎ اطلس چرخ سے دھو ڈالیں کبودی دم میں + ایسے منگرول میں موجود ہیں لاکھوں قصار
ہو جو نواب فلک قدر سے رخصت حاصل + گاو گردوں کو شکنجے میں لگالیں عصار
مالیوں کو ہے وہاں علم نباتی میں دخل + یاسمن لالے کو، بیلے کو بنا دیں گلنار

شمشاد نے اس قصیدے میں منطق و فلسفہ کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں

؎ متصل جملوں سے نکلا یہ نتیجہ یکبار + حد اوسط کی طرح گر گئے راس اشرار
رزم میں ضرب حقیقی کی نہیں کچھ حاجت + عزم کی تیغ عدو پر ہے اجل کی تلوار

---

(1) خزینۂ شمشاد از عبدالاحد شمشاد مطبع انوار محمدی لکھنؤ ۱۳۱۷ھ

کب نظر آئے ہیولائے قلم کی صورت + سچ ہے تجھ پر نہ ہو دولت کا اگر دارومدار

ہو گئی میرے تصور کی سفر سے تصدیق + کھل گیا دولت منگرول ہے بے حد و شمار

اس کے بعد آنے والے اشعار میں تعریف، دلیل، حجت، افتراقی قضیہ، محمول، غیر معلول، موضوع، اتصال منفصل، غیر تالی، مقدم، ادراک، غیر ممکن، تناقض، مجہول، مدلول، عالی اور سافل وغیرہ کی منطق و فلسفہ میں استعمال ہونے والی اصطلاحیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ شمشاد لکھتے ہیں

ہ منطقی لفظوں میں کی مدح تو سیری نہ ہوئی + ہاں نجوم فلک اب لاؤں میں کچھ بہر نثار

ماہ کو نور میں ہو زہرہ سے ہر روز قرآں + منفعل ہو جو ترے عیش سے چرخ دوار

سال کا سال جو تو عیش میں مصروف رہے + سنبلہ ہی میں عطارد کو رہے جائے قرار

مائل الارض نظر آتے ہیں نسرین فلک + جیتے جی تیرے مخالف کو سمجھ کر مردار

ان اشعار کے بعد آنے والے چند دیگر اشعار میں ہیئت و نجوم کی ایسی اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں جن میں سے بعض کو استاد قصیدہ نگاروں نے بھی استعمال نہیں کیا۔ کلب الجبار (ایک ستارے کا نام جو کتے کی صورت میں ہے) بطین (چاند کی دوسری منزل کا نام اور یہ تین ستارے مثلث کی شکل پر ہیں جو آنکھوں کے حلقوں کی طرح گول ہیں) شرطین (دو ستاروں کا نام) طرفہ (ایک روشن ستارا) ہقعہ (چاند کی پانچویں منزل) طرفہ (چاند کی نویں منزل) عوا (چاند کی تیرھویں منزل) عقرب (چاند کی پندرھویں منزل) نعائم (چاند کی بیسویں منزل) بلع (چاند کی تئیسویں منزل) اخبیہ (چاند کی چوبیسویں منزل) [یہ ہر منزل کے ستاروں کے نام بھی ہیں] علاوہ ازیں اس قصیدے میں شولہ (چاند کی انیسویں منزل) زبانا (چاند کی سولھویں منزل) کا ذکر بھی ملتا ہے۔ تربیع و تقابل، منطقہ، سرطان، ثریا، مشتری، زحل اور سعدین وغیرہ کی اصطلاحیں بھی نظر آتی ہیں وہ مزید لکھتے ہیں

ہ کہکشاں ہے کہ چراگاہ خیول عسکر + یہ ثوابت ہیں کہ میخیں ہیں طلائی تیار

ہے تراخیمہ زربفت محیط کرسی + ڈوریاں اس کی ہیں قطبین فلک کے اس پار

نور میں زہرہ و برجیس کو جب ہو قرآں + ملک و دولت کو تری ذات رہے دارومدار

شمشاد کو نحو، منطق، حدیث، فقہ، اصول، فرائض، قرأت و تفسیر، علم کلام، طبیعات، نجوم و ہیئت علم جمادات و نباتات کے بارے میں خاصی معلومات تھیں۔ ان کے قصائد کے یہ اشعار بھی دیکھئے جن میں شمشاد کی امیرانہ ماحول اور اس کے متعلقات سے مربوط نظر آتی ہے

ہ چشم مخمور میں دنیا کے نہ تفرقہ کرے + دو سیہ مست نفوس کے حلقوں میں سنبھالے ہنٹر

وہ ایک کون جونپور کے کلکٹر خاص + رینالڈ اس اہل مصیبت کے دستگیر کبیر

جو شیر مالیں غریبوں کو بانٹتے تھے روز + فقیران کو نہ تھی فاقوں پر بھی نان شعیر

اگرچہ ہیضہ و طاعون نے قتل عام کیا + کہیں زیادہ تھی فاقوں کے ماروں کی توقیر

چند اور قصائد نگار ۱۸۰۰ تا ۱۹۰۰ء

[ضمیمہ باب پنجم اور ششم]

میر غلام حسین رونق [۱۸۰۵ میں جوان تھے] (۱) عظیم آباد سے تعلق تھا۔ (۲) انہوں نے منقبت علی میں قصائد لکھے (۳)

چودھری حسام الدین حسام [۱۸۰۹ میں زندہ تھے] سلیم پور لکھنؤ کے باشندے تھے۔ وہ کرامت علی فرخ کے شاگرد تھے (۴)
ان کا دیوان ریختہ مع قصائد انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ (۵)

میر فرزند علی موزوں [م ۱۸۱۳/۱۸۱۴] لکھنؤ سے متعلق تھے شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ ذکاء نے ان کے قصائد کا تذکرہ کیا ہے (۶)

مرزا مغل سبقت [م ۱۸۱۳/۱۸۱۴ء] جرأت کے شاگرد تھے (۷) جہاں آباد سے تعلق تھا مصحفی نے عقیدہ گوئی میں انہیں جرأت پر فوقیت دی ہے۔ (۸) سعادت خاں ناصر نے عقیدہ گوئی میں انہیں فخر جرأت قرار دیا ہے۔ (۹)

میر عباس علی خاں احسان [م ۱۸۱۴] کے والد سیالکوٹ میں آصف الدولہ کے دربار کے امرا میں سے تھے۔ احسان قصائد اور ہجویات میں مشہور تھے (۱۰)

اگرچہ مشہور تو ہے رتبۂ انساں گوہر + نیک گوہر میں بھی ہرگز نہیں یکساں گوہر
یعنی نواب ملک رتبہ وزیر اعظم + صدف بحر کیانی کا وہ تاباں گوہر

حسین علی خاں ایما [م ۱۸۱۴/۱۸۱۵] اورنگ آباد سے تعلق تھا۔ چندو لال شاداں کے مصاحبین میں سے تھے۔ گلزار آصفیہ میں انہیں فصاحت، بلاغت، لطف کلام، شیرینیٔ سخن اور ترکیب بیان میں وقت کا ناصر علی کہا گیا ہے۔ اعظم الدولہ کی شان میں ان کے ایک قصیدے کے یہ اشعار دیکھئے

بے زر جہاں میں کچھ نہیں آتا ہے کار دست + بدتر ہے آستین سے بے اقتدار دست
یعنی وہ کون اعظم الدولہ ہے جس کا نام + ہر اہل ہمیں اسی کا ہے حاجت برار دست (۱۱)

مرزا لطف علی خاں ولد [۱۸۱۴ میں زندہ تھے] (۱۲) وہ مظہر علی خاں ولا کے نام سے بھی مشہور ہیں طپش، مصحفی اور ممنون سے اصلاح لی۔ فورٹ ولیم کالج کے مسودہ نگاروں میں۔ اخلاق ہندی، قصہ مادھونل، بیتال پچیسی، تاریخ شیر شاہ، ہفت گلشن وغیرہ کے مصنف ہیں۔ ان کا کلیات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ موجود ہے اسمیں ۶۵ قصائد ہیں جن میں ۳۶ نعت و منقبت میں ہیں۔ ان کے ممدوحین (۱۳) میں ذیل کے امرا شامل تھے حسین علی خاں ابن حیدر بیگ / شہزادہ سلیمان شکوہ / مہدی علی خاں آصف الدولہ / سعادت علی خاں / مرزا محمد علی خاں / سرفراز الدولہ حسن رضا خاں / قاسم علی خاں ابن سالار جنگ / مرزا علی حسن / ابن سالار جنگ / فخر الدین احمد خاں / کلثوم خانم بنت مرزا علی خاں / مرزا محمد علی ابن نوازش علی خاں بن سالار جنگ / میر کاظم علی ابن زین العابدین خاں / مہاراجہ ادیب راج ٹکیت رائے / حکیم ابو علی / دولت النساء بیگم / غلام رضا خاں برادر سرفراز الدولہ اور اکبر علی خاں ابن حیدر بیگ شامل ہیں

(۱) تذکرہ عشقی ص ۳۶۷ (۲) گلشن بے خار ص ۲۴۲ (۳) ایضاً بحوالہ عمدہ منتخبہ ص ۲۸۸ (۴) عمدہ یا سخن ص ۲۳۵ (۵) بلوم ہارٹ ص ۲۲۴، فہرست مخطوطات انڈیا آفس لائبریری ۱۱۷ (۶) مجموعہ نغز ص ۲۲۷ (۷) گلشن بے خار ص ۲۳ (۸) بحوالہ طبقات شعرائے ہند ص ۲۴۰ (۹) خوش معرکہ زیبا ص ۲۴۳ (۱۰) دکن میں اردو ص ۱۰۱-۱۰۲ (۱۱) دکن میں اردو ص ۹-۱۰۱ (۱۲) طبقات شعرائے ہند ص ۳۴۸ - ۳۴۹ (۱۳) فورٹ ولیم کالج کی ایک عظیم شخصیت مضمون سید ظہیر حسن زیدی نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۵ - ولا کا جو نمونہ ملا ہے وہ نظم یا غزل تھا قصائد کا ہے

اس دور میں محبت خاں محبت (۱۷۸۰ء) حضرت علی کی مدح میں ایک عمدہ قصیدہ لکھا اس کا مطلع تھا

شب نہ گلتی تھی پلک سے پلک اک پل مطلق + غم سے نزدیک تھا سینہ مرا ہو جائے شق ①

حیدر علی فاضل سندیلوی [م ۱۸۰۷ء] فارسی، اردو اور عربی کے معروف شاعر تھے۔ ان کے ایک نعتیہ قصیدہ بر انشاء اللہ خاں انشاء تخمیس لکھی اسکا مطلع ہے

رسول حق کا محمد نبی خیر انام + اے فخر کون و مکاں تجھ اوپر درود و سلام ②

دہلی کے ایک یوروپی شاعر المتخلص بہ صاحب (جرجیس صاحب) (پیدائش ۱۸۲۲ء) کا ایک غیر مطبوعہ حمدیہ قصیدہ بھی ملتا ہے۔ اس کے ۱۲۵ اشعار ہیں اسکا مطلع ملاحظہ ہو

ثنا خواں ہے ہر ایک عالم فلک سے تا زمیں تیرا + ہے برحق نام یا اللہ رب العالمیں تیرا ③

رحمت علی طپش کہ جنکا تعلق بنگال سے تھا۔ ان کا ایک نعتیہ قصیدہ ۱۸۵۷ میں طبع ہوا تھا ④

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں مولوی امداد علی حیدرآبادی کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ محفوظ ہے ⑤

نقد علی ایجاد نے بھی ایک نعتیہ قصیدہ لکھا تھا ⑥

ڈاکٹر نجم الاسلام نے بیاض مرزا جان طپش کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس سے سراغ ملتا ہے کہ اس بیاض میں خواجہ میر درد کے حلقۂ ارادت میں شامل مرزا محمد جان بیگ سامی کے دو قصائد موجود ہیں ان کے مطالع درج ذیل ہیں

سخن کیوں رتبہ میں تشبیہ ہے بر لعل و گوہر + وجود لعل و گوہر کا ہے مصرف اعتبر

غم سے منہ تلخ ہے گو شکل بطون حنظل + لیکن اب تک بھی بیاں میں ہے وہی طعم عسل ⑦

شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد کرامت علی فرخ کے قصائد کا ذکر بھی ملتا ہے ⑧

محمد علی سپہری خانہ زاد کا مجموعہ قصائد گنج شائگاں کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ خانزاد نے سودا کے قصیدہ کے جواب میں ایک طویل قصیدہ لکھا تھا ⑨

ظفر خاں کے قصائد کے کلیات کا انتخاب آگرہ سے شائع ہوا تھا ⑩

گھنشام لال عاصی م ۱۸۶۷ء کے کلیات ⑪ میں اکبر شاہ، مہاراناجی، مرزا کاواں اور اجے سنگھ والیٔ الور کی شان میں قصائد ملتے ہیں

---

① دیوان گلدستہ الشعرا مضمون از تحسین سروری ص ۵۷ قومی زبان اکتوبر ۱۹۷۰ء ② دریائے لطافت ص ۷۸/۸۵

③ اردو کے یوروپین شعرا ص ۱۳۹ ④ بنگال کی اردو تصانیف از شانتی رنجن بھٹاچاریہ

⑤ ارمغان گوکل پرشاد ص ۲ رسالہ اردو جلد ۵ شمارہ ۲ قومی زبان مارچ ۱۹۶۲ء ۱۹۲۵

⑥ فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو ہند، رسالہ اردو مارچ ۱۹۵۳ء

⑦ مضمون بیاض مرزا جان طپش ص ۷۹، نقوش لاہور ستمبر ۱۹۶۷ء

⑧ ریاض الفصحا از غلام ہمدانی مصحفی ص ۳۵۱ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۴ء

⑨

⑩ انتخاب کلیات قصائد، آگرہ ۱۸۶۰ء

⑪ کلام عاصی از گھنشام لال عاصی مرتبہ موہن لال مافر کاشتہ اردو سماج دہلی ص ن ص ۹۱، ۸۶، ۹۵، ۹۸، ۱۳۱، ۱۳۸، ۱۵۳، ۲۴۹

مرزا جان طپش [مرزا محمد اسماعیل نام] [م ۱۸۲۲ء] کا تعلق بھی فورٹ ولیم کالج سے تھا ان کی مثنوی بہار دانش چھپ چکی ہے۔ ان کے کلیات میں چھ قصائد ہیں۔ یہ کلیات عندلیب شادانی کے ذاتی کتب خانہ میں تھا (۱) یہ کلیات ۱۲۲۸ھ میں مرتب ہوا تھا اسکا تاریخی نام گلزار مضامین تھا۔ بہار دانش کے آغاز میں طپش نے مثنوی کی ہیئت میں حمد، نعت اور منقبت لکھنے کے علاوہ لارڈ منٹو، صاحبان کونسل صدر، ہارنگٹن صاحب، افاوات کالج، ڈاکٹر ہنشراور کپتان ٹیلر کی تعریف کی ہے اس سے ان کے قصائد کی سطح کا اندازہ ہو سکتا ہے (۲)

محمد عثمان تبس م ۱۸۱۲ء، چندولال شاداں اور نواب امیر کبیر کے وظیفہ خوار تھے۔ شیر محمد خاں ایمان کے ماموں تھے ان کے قلمی کلیات میں غلام علی شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ موجود ہے (۳)

مرزا علی لطف، لطف [م ۱۸۱۶/۱۸۱۸] گلشن ہند (تذکرہ) کے مولف تھے (۴)۔ ان کا دیوان عثمانیہ یونیورسٹی کا مملوکہ ہے۔ اس میں ارسطو جاہ کی شان میں تین قصائد ہیں۔ وہ میر عالم کے مداح بھی تھے (۵)۔ قطب الدین نے بھی لکھا ہے کہ انہوں نے امرائے دہر کی صفت میں قصائد لکھے اور صلہ بھی آیا (۶)

میر عباس خان کافی م [۱۸۲۱/۱۸۲۲] کا تعلق بیگن پلی جاگیرداروں سے تھا (۷)۔ مہاراجہ چندولال کی شان میں ان کے قصائد مشہور ہیں (۸)

حیدر بخش حیدری [م ۱۸۲۳ء] مشہور داستان نویس اور شاعر فورٹ ولیم کالج سے متعلق تھے ان کے دیوان میں چھ قصائد بطور غزل نواب علی ابراہیم خاں، عبدالرشید خاں، شیخ شکر اللہ، گلکرسٹ، لیفرالدین علی خاں اور لالہ موتی رام کی مدح میں ہیں (۹)

عنبر شاہ خاں آشفتہ [م ۱۸۲۳/۱۸۲۴] رامپور سے متعلق تھے۔ ان کا اردو دیوان تدقیق الخیال کے نام سے رضا لائبریری رامپور کا مخزونہ ہے۔ اس میں اسکاٹ کی مدح میں ایک قصیدہ ملتا ہے (۱۰) اردو میں ان کا تخلص آشفتہ اور فارسی میں عنبر تھا (۱۱)

حکیم محمد بخش مہجور [م ۱۸۲۲ء] جرأت اور مرزا خاں نوازش کے شاگرد تھے ان کا انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانہ کی ملکیت ہے اس میں ان کا ایک قصیدہ آصف الدولہ کی شان میں ہے اور ایک نامکمل قصیدہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی منقبت میں ہے۔ ان کی کتاب نورتن میں ایک قصیدہ غازی الدین حیدر کی شان میں ہے (۱۲) اسے علی جواد زیدی نے نواب سعادت علی خاں کی شان میں سمجھا ہے کہ ہول کا نقشہ جس قصیدے میں کھینچا گیا ہے وہ غازی الدین حیدر کی شان میں ہے نہ کہ سعادت علی خاں کی شان میں (۱۳)

---

(۱) مضمون از ڈاکٹر عندلیب شادانی رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۹ء ص ۲۰ (۲) بہار دانش ص ۱ تا ۶ (۳) مخطوطات انجمن جلد چہارم ص ۱۲۸
(۴) گلشن ہند میں ان کے قصائد کے اشعار موجود ہیں دیکھیے ص ۲ (رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور) (۵) مضمون مرزا علی لطف از حسن و قال رسالہ اردو، معلی اگست ۱۹۱۵ (۶) گلستان بے خزاں ص ۲۰۲ (۷) دکن میں اردو ص ۳۰۲ (۸) تذکرہ شعرائے دکن جلد ۲ (۹) دیوان حیدری ص ۱۶۳ تا ۱۶۸ (۱۰) انتخاب یادگار ص ۲۲۱-۲۲۸ (۱۱) تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۸، ۲۷ (۱۲) نورتن مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی ص ۲
(۱۳) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۲۵۶

ص ۹۳۶

از حافظ محمد علی خان
۱۹۲۹ء

ظہور اللہ نوا م [۱۸۲۲] کا تعلق بدایوں سے تھا(۱)۔ وہ لطف اللہ لطف کے شاگرد تھے۔ قدرت اللہ شوق نے ان کے پرزور قصائد کا تذکرہ کیا ہے(۲)۔ مصحفی نے انہیں سنجیدہ اور متین قصیدہ گو کہا ہے(۳)۔ مولانا عبدالسلام کا کہنا ہے وہ غزل میں قصائد ہی کی طرح کی مضمون آفرینی کرتے ہیں(۴)۔ حسرت موہانی نے ان کا تعلق غازی الدین حیدر کے دربار سے بتایا ہے(۵)۔ قاضی عبدالودود نے ان کے قصائد کا تذکرہ کیا ہے(۶)۔

میر غلام مصطفیٰ سخن [م ۱۸۲۳/۱۸۲۴] اورنگ آباد کے مشہور شاعر تھے۔ انہوں نے منقبت اور دنیاوی مدح پر مشتمل تیرہ چودہ قصائد لکھے(۷)۔ وہ ارسطو جاہ کے مداحوں میں سے تھے۔ سرور نے ان کے ایک قصیدے کے آٹھ اشعار درج کیے ہیں(۸)۔ ان کا ایک غیر مطبوعہ دیوان کتب خانہ آصفیہ میں اور ایک قومی عجائب گھر کراچی کا مخزونہ ہے(۹)۔ موخرالذکر نسخہ میں صفحہ ۱۹۶ الف سے ان کے قصائد شروع ہوتے ہیں(۱۰)۔

عیسوی لکھنوی م ۱۸۲۴/۱۸۲۵ تلامذہ میر میں سے تھے۔ انہوں نے مرزا جھجو کی شان میں ایک قصیدہ کہا اور ان کا وظیفہ مقرر ہوا(۱۱)۔

منصور علی خاں مہر کو مصحفی نے جرأت اور یاقوت کا شاگرد لکھا ہے(۱۲)۔ ان کا ایک قصیدہ نصیرالدین حیدر کی شان میں ہے(۱۳)۔

مرزا احسن علی احسن [م ۱۸۲۶/۱۸۲۸] سودا کے شاگرد تھے۔ قصیدہ بہت اچھا کہتے تھے(۱۴)۔ اودھ کیٹلاگ میں ان کے دیوان کا ذکر ہے۔ اس میں حضرت علیؑ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سرفراز الدولہ کی مدح میں قصائد محفوظ ہیں(۱۵)۔

سید آغا علی خاں مہر واجد علی شاہ کے معاصر و ممدوح تھے۔ ان کے مطبوعہ دیوان میں قصائد منقبت کے علاوہ واجد علی شاہ کی شان میں بھی قصیدے ہیں۔ یہ اوسط درجے کے ہیں ان میں زیادہ پختگی، سوز و گداز اور کیف نہیں ہے(۱۶)۔

امام بخش ناسخ م [۱۸۳۸] کو غالب نے یک فنا کہا ہے اس لیے کہ وہ صرف غزل کہتے تھے اور قصیدے اور مثنوی سے ان کا تعلق نہ تھا(۱۷)۔ کتب خانہ ضلع خیرپور میں ان کا ایک چار صفحے پر مشتمل "قصیدہ" ملتا ہے جس کا مطلع ہے(۱۸)

ہے بلبل بوستان جناب امیر کا + روح القدس ہے نام تیرے ہم صفیر کا

علاوہ ازیں وہ فارسی قصائد بھی لکھتے تھے(۱۹)۔ ناسخ کی غزلوں میں شوکت لفظی، صنائع بدائع کا ماہرانہ استعمال، مضمون آفرینی علو تخیل کے عناصر موجود ہیں۔ غالب کی مذکورہ رائے ان کے لیے روا نہیں ہے۔ ان کی تو غزلیں بھی قصیدہ نما غزلیں ہیں(۲۰)۔ ناسخ نے چہار دہ معصومین کی شان میں چند قصائد لکھے ہیں(۲۱)۔ ان کے ۱۳ اشعار نصیرالدین حیدر شاہ کے گھوڑے کی مدح میں بھی ہیں(۲۲)۔

---

(۱) خوش معرکہ زیبا ص ۱۱۱ (۲) طبقات الشعرا ص ۳۲۹ (۳) تذکرہ ہندی ص ۲۴۳ (۴) شعرالہند جلد اول ص ۱۵۲ (۵) اردوئے معلی سالنامہ اپریل ۱۹۱۲

(۶) نقوش ۹۶ سالنامہ لاہور (۷) مضمون میر غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی از سخاوت مرزا اردو نامہ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ ص ۴۲ (۸) عمدہ منتخبہ ص ۳۰۷

(۹) دکن میں اردو ص ۱۴۴ (۱۰) جائزہ مخطوطات اردو ص ۹۲ تا ۹۶ (۱۱) تلامذہ میر از اورنگ صابری (۱۲) خوش معرکہ زیبا ص ۲۸۷

(۱۳) اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۳۹۷ (۱۴) تذکرہ شعرائے ہندی ص ۴۰ (۱۵) ڈاکٹر اشپرنگر اور اودھ کا کیٹلاگ مضمون اکبر حیدری [illegible] ۱۹۶۸

(۱۶) میرے کتب خانے کے پرانے چھپے اردو دیوان ہندوستان ۱۹۳۶ (۱۷) بزم غالب ص ۳۶۸ (۱۸) اردوئے معلی جلد اول حصہ دوم ص ۵۱۲

(۱۹) سندھ میں اردو مخطوطات مرتبہ سید علی احمد زیدی (۲۰) کاشف الحقائق ص ۱۲۹ (۲۱) لکھنو کا دبستان شاعری ص ۳۸۷ [illegible] ۱۹۶۹، مرکزی اردو بورڈ لاہور

(۲۲) روضۃ الشعرا جلد سوم ص ۸۱، ۸۲

(۲۳) ناسخ مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل مطبوعہ مجلس ترقی ادب [illegible] ۱۹۶۹

گور بخش ادیب کا تعلق غازی الدین حیدر کے عہد سے تھا۔ مصحفی نے ان کی شان میں ادیب کے ایک آبدار قصیدے کا حوالہ دیا ہے (۱)۔ اس قصیدے کے صلے میں ایک دوشالہ اور پانچ اشرفیاں ان کے حصے میں آئیں اردو گیاروں کی حمالی سے خزانۂ عامرہ کو ... (۲)

قدرت اللہ قاسم [م ۱۸۳۰/۱۸۳۱] اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز کی وجہ سے معروف ہیں ان کا ایک مذہبی قصیدہ دستیاب ہے سوائے ایک مثنوی اور ضخیم دیوان ان کی یادگار ہے۔ طب اور جوتش وغیرہ سے وہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا تعلق دہلی سے تھا (۳)

وحمت خاں والہ م ۱۸۳۲/۱۸۳۵ کشمیری الاصل تھے۔ خزینۃ العلوم میں ان کا ایک مکمل نعتیہ قصیدہ زائیہ ملتا ہے (۴)

فضلے مولیٰ خاں فضل [م سے قبل ۱۸۳۴/۱۸۳۵] لکھنؤ سے متعلق تھے انہوں نے اکبر بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ بادشاہ نے انہیں وحید عصر افضل الشعرا کا خطاب دیا (۵)

میر حسین علی خاں جولاں [۱۸۳۴/۱۸۳۵ کے بعد انتقال کیا] دکن کے شاعر تھے۔ بہاریہ قصیدہ خوب لکھا (۶)

دکن میں اردو میں ان کا نام میر حسن علی خاں لکھا گیا ہے اور انہیں مہاراجہ چندو لال اور ارسطو جاہ کا مداح کہا گیا ہے (۷)

مرزا سیف علی شگفتہ ۱۸۳۴/۱۸۳۵ میں زندہ تھے مصحفی سمیت کئی شعرا کے مداح تھے (۸) وہ قصیدہ خوب کہتے تھے (۹)

ان کے قصائد کے آبدار ہونے کی گواہی تذکرہ نگار روز ... دی ہے۔ صاف، شستہ اور منجھی ہوئی زبان کے استعمال میں انہیں مہارت تھی (۱۰)

اشرف علی خاں، خاں م ۱۸۳۵/۱۸۳۶ مصحفی کے شاگرد تھے (۱۱) ان کے دیوان کے قلمی نسخے میں سات قصائد ملتے ہیں دو منقبت علی، ایک حضرت عباس اور ایک حضرت امام حسین کی منقبت میں ایک غازی الدین حیدر ایک مرزا سلیمان شکوہ اور ایک شہر آشوب پر مشتمل قصیدہ ہے۔ خاں نے راجا گنیش پرشاد کی مدح بھی کی ہے (۱۲)

غلام اشرف آشفتہ م ۱۸۳۶ شاگرد مصحفی تھے۔ ان کے دیوان میں قصائد موجود ہیں (۱۳)

سلیمان شکوہ م ۱۸۳۷ شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے۔ خود شعرا کے ممدوح ان کے دیوان میں آئمہ معصومین کے قصائد تھے (۱۴)

---

(۱) ریاض الفصحا ص ۳۷ (۲) خوش معرکۂ زیبا ص ۲۱۰ (۳) طبقات شعرائے ہند ص ۳۱۹ (۴) خزینۃ العلوم ص ۶۷ تا ۶۹

(۵) طبقات شعرائے ہند ص ۳۲۵ — بہار بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب ص ۱۸۲ مطبع نولکشور (۶) عمدۂ منتخبہ ص ۱۸۰ (۷) دکن میں اردو ص ۳۲۵

(۸) خوش معرکۂ زیبا ص ۴۰۹ (۹) نسخۂ دلکشا ص ۱۲۲ (۱۰) ہندی گویاں ص ۱۳۵ (۱۱) گلشن بے خار ص ۱۶۱ (۱۲) خان آرزو کا دیوان از عندلیب شادانی نقوش اپریل ۱۹۴۲ ، ۴۲

(۱۳) مضمون قاضی عبدالودود نگار رامپور مارچ ۱۹۴۲ (۱۴) بحوالہ مضمون ڈاکٹر اسپرنگر اورداد لد کی لیلا گ صحیفہ ۱۹۶۸

نصیر الدین حیدر م ۱۸۳۷ شاہ اودھ تھے قصائد علی حیدر کے نام سے ان کے قصائد کے مجموعے کا اودھ کیٹلاگ میں تذکرہ ہے[1]

میر عزت اللہ عشق م [۱۸۰۰ کے لگ بھگ] قدرت اللہ قاسم کے بیٹے تھے ان کے قلمی دیوان میں ایک قصیدہ موجود ہے[2]
ان کے قصائد کے دو انتخابات ان عنوانات کے تحت دو ہشش بیت از قطعہ قصیدہ طوی در تہنیت جشن مبارک (ب) پنج بیت از تمہید قطعہ قصیدہ طوی در تہنیت تولد ارجمند شاہزادہ والا قدر مرزا ابو ظفر بہادر[3] ۔ وہ حکیم ثناء اللہ فراق کے شاگرد تھے[4]

سید حسین علی تاسف ۱۸۲۰ یا ۱۸۲۱ میں زندہ تھے ۔ وہ میر شیر علی افسوس کے نواسے تھے ان کے دیوان میں ایک ترجیع نما[5]
عشقیہ قصیدہ بعنوان " قصیدہ در احوال عشق خود در تعریف سکینہ خانم و حور مزاں جان وتاریخ وصال اوست " ملتا ہے
یہ امتحانی نوعیت کا قصیدہ ہے ۔ اس میں بے ثباتی دنیا ہی موضوع ہے اور شکوہ الفاظ پر سادگی کو ترجیح دی ہے

غفلت احمد خاں [م ۱۸۴۳ء] رامپوری تھے ۔ قدرت اللہ شوق سے اصلاح لیتے تھے[6] ۔ قصیدہ اور مثنوی میں عمدہ تھے[7] ۔ امیر مینائی نے تیرہ قصائد کا انتخاب انتخاب یادگار میں کیا ہے[8]

میرزا محمد [۱۸۴۴ میں زندہ نہیں تھے] مشہور مورخ اور شاعر تجمل علی تجمل کے بیٹے تھے ۔ انہوں نے نظام الملک کی مدح کی[9]
میر خدا انتقار علی خاں صفا [م ۱۸۴۴] میر تقی میر کے شاگرد تھے[10] ان کے قلمی دیوان میں امرا اور روسا کی مدح میں قصائد ملتے ہیں[11]
طالب علی خاں عیشی [۱۸۴۴ / ۱۸۴۵] لکھنؤ سے متعلق تھے ۔ ان کی قصائد نویسی کا نواب کلب حسین نادر نے تذکرہ کیا ہے[12]
شیخ فدا علی عیش لکھنوی نے ان کے فارسی قصائد کی تفصیل دی ہے[13] ۔ عیشی کے قلمی دیوان مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی میں ۲۳ اشعار کا ایک قصیدہ بحوالہ تہنیت شب برات ملتا ہے یہ کسی امیر فلک قدر کی مدح میں ہے ۔ افسر اودھ نے لکھا ہے " ممکن ہے یہ امیر فلک قدر امام علی خاں سول یا نصیر الدولہ " کیونکہ عیشی دونوں کی مصاحبت میں رہے[14] ۔ ان کا دیوان کا ایک نسخہ بوہار یونیورسٹی کلکتہ کی ملکیت ہے اس میں قصائد ہیں[15]

مرزا حسین علی خاں اثر لکھنوی [م ۱۸۴۵] آصف الدولہ کے بھانجے تھے ۔ ناسخ کے شاگرد تھے غزلیات کے علاوہ قصائد بھی لکھے ہیں[16]
مہاراجہ چندو لال شاداں [م ۱۸۴۵] خود بھی بہت سے دکنی اور غیر دکنی شعرا کے ممدوح رہے ہیں ۔ ان کے دربار میں تین سو سے زائد شعرا جمع تھے ۔ انہوں نے بہت سے قصائد لکھے جوان کے قلمی دیوان مخزونہ سالار جنگ کتب خانے میں ہیں ۔ ان کا ایک قصیدہ سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کی شان میں بھی ہے[17]

قاضی حمید الدین سعید کاکوروی [م ۱۸۴۶] کے قصائد کا تذکرہ محمد علی حیدر علوی کاکوروی نے بھی کیا ہے[18]

---

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر اودھ کیٹلاگ ۔ مزید مطالعہ کیجئے مضمون نصیر الدین حیدر شاہ از مولوی تقی احمد کاکوروی الناظر مارچ اپریل ۱۹۶۳
(۲) انڈیا آفس لائبریری میں ہندوستانی مخطوطات کا کیٹلاگ از بلوم ہارٹ ص ۹۵ (۳) مجموعہ نغز ص ۳۹۴ (۴) طبقات شعرائے ہند ص ۳۷۶
(۵) دیوان صد غزل ص ۲۱۹ ۔ ۲۲۰ مرتبہ سید شبیہ الحسن نونہروی نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۲ (۶) خوش معرکہ زیبا ص ۳۲
(۷) ریاض الفصحا ص ۲۴۳ (۸) انتخاب یادگار ص ۲۷۴ تا ۲۷۸ (۹) دکن میں اردو ص ۲۴۴ ۔ (۱۰) تذکرہ شعرائے دکن ص ۴۱۵
(۱۱) دیوان مخزونہ کتب خانہ آصفیہ بحوالہ دکن میں اردو ص ۲۴۴ (۱۲) تذکرہ نادر ص ۱۱۶ (۱۳) شعرا بحوالہ مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۵ (۱۴) فہرست مخطوطات انجمن ص ۱۹۶۷
(۱۵) جائزہ مخطوطات اردو ص ۲۰۶ (۱۶) ریاض الفصحا ص ۳۲ ۔ سراپا سخن ص ۱۹ ۔ طبقات شعرائے ہند ص ۳۹۶
(۱۷) شاداں اور ان کی شاعری کا مقدمہ ڈاکٹر محمد عبد الرزاق قومی زبان جولائی ۱۹۶۵ (۱۸) تذکرہ مشاہیر کاکوری ذکر سعید

سعادت علی خاں ناصر [م ۱۸۴۵ کے بعد] تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مصنف انہوں نے شاہ اودھ کی مدح میں قصائد کہے جواب ہیں۔ بہیں[۱] ناصر کا ایک قصیدہ شاہ اودھ محمد علی شاہ کی مدح میں شاہ کے رضاعی بھائی نے اپنے نام سے پڑھا اور بقول ناصر "صلہ شائگاں لیا"[۲] شاہ کے رضاعی بھائی کا نام ما طرفتا ناصر نے اسے خود عرض لکھا ہے۔ مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ ناصر کے "مذہبی رجحان اور اہل ثروت سے تعلق کی بناپر قیاس ہے کہ اس کے قصائد دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی شخصیات کی مدح میں ہوں گے"[۳]

حکیم محمد علی مسیحا [۱۸۴۷ میں زندہ تھے] امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے "اکثر مرثیہ اور قصائد" اور دیوان ان کی یادگار ہیں[۴]

[illegible]

غلام محمد سمجھو [۱۸۵۱/۱۸۵۲ سے قبل] وہ بندر مبارک سورت سے تعلق رکھتے تھے۔ شہزادہ محمد جہاں شاہ کی مدح میں ان کا قصیدہ دستیاب ہے۔ انہوں نے اس قصیدے کے صلے میں خلعت پائی۔[۶] وہ مہاراجہ چندو لال شاداں کے مداح بھی تھے[۷]

نواب زین العابدین عارف [م ۱۸۵۲] مرزا غالب کے بھانجے تھے ان کی قصیدہ نگاری کی تذکرہ نگار تعریف کرتے ہیں[۸] مطلع مہر سعادت نامی ان کے دیوان میں قصائد ملتے ہیں[۹] صاحب عالم بہادر ان کے شاگرد تھے۔ عارف کے دیوان میں ایک قصیدہ فتح الملک بہادر کی شان میں ہے[۱۰]۔

غلام امام خاں ملک یار بہجر [۱۸۵۳/۱۸۵۴ میں زندہ] تاریخ رشید الدین کے مصنف ہیں ان کے قصیدے کا نمونہ دکن میں اردو میں درج ہے[۱۱]

حافظ عبدالرحمن خاں احسان [م ۱۸۵۴] کا تعلق دہلی سے تھا وہ شاہوں کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ احسان کا دیوان طبع ہو چکا ہے اس میں قصیدہ ملتا ہے[۱۲]۔ احسان تجنیس، اشتقاق، طباق، ایہام، اضداد وغیرہ کے استعمال پر قادر تھے[۱۳] قادر بخش صابر نے رائے دی ہے کہ "قصیدہ میں اگر تشبیب ہے طرز توطیہ اور انداز تخلیص اعجاز گوئندہ پر دلالت کرتی ہے اور اگر مدح ہے شوکت الفاظ اور طمطراق معنی سے رتبۂ ممدوح کو آسمان سے ہم رفعت کرتی ہے"[۱۴]

ہدہد نامی ایک شاعر حکیم آغا جان عیش کے چیلے تھے۔ اس نے بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس پر انہیں طائر الدراکین شہپر الملک ہدہد الشعرا منقار جنگ بہادر خطاب دیا اور سات روپے ماہوار رتبگے کے لئے مقرر کر دیے[۱۵]۔ ہدہد مشاعروں اور محفلوں میں سامعین کی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے تھے

عبدالہادی جودت ۱۸۵۵ء سے قبل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے قصیدہ گوئی کی اور اس کے ذریعے نواب بھوپال کے متعلق ہوئے[۱۶]

---

(۱) تا (۳) تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص ۳۰۶ (۲) گلدستہ سخن ص ۱۱۵ از منشی نول کشور [illegible] (۴) مخزن الشعرا ص ۱۱۹
(۵) خزینۃ العلوم ص ۱۶۳-۱۶۴ (۸) گلستان سخن جلد دوم ص ۱۹۸ (۹) طبقات شعرائے ہند ص ۳۹۹ (۱۰) رسالہ ادیب دہلی فروری ۱۹۶۲
(۱۱) دکن میں اردو ص ۴۳۹ (۱۲) دیوان احسان ص ۹۰ (۱۳) طبقات شعرائے ہند ص ۳۵۶ (۱۴) گلستان سخن ص ۳۴۲ مخزون حمیدہ سلطانہ
(۱۵) تذکرہ خندہ گل عبدالباری آسی ص ۳۷ نگار مشین پریس لکھنو (۱۶) تذکرہ طور کلیم ص ۲۶ سید نور الحسن مفید عام پریس آگرہ
(۱۷) دکن میں اردو ص ۵۱۱-۵۱۲

— بدرالدین تمیز م ۱۸۵۲/۱۸۵۳ شمس الامرا امیر کبیر [حیدرآباد دکن] کے بیٹے تھے ان کے قلمی دیوان (۱) میں ان کا ایک قصیدہ اپنے باپ کی شان میں ملتا ہے۔ اسکا مطلع یہ ہے: چلی صبح تڑکے جو بادِ بہار + تو کچھ نیند سی آگئی ایک بار

— خواجہ وزیر وزیر م [م ۱۸۵۴] لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے (۲) وزیر کے دیوان میں کوئی قصیدہ موجود نہیں ہے تاہم ان کے بارے میں مصحفی کا یہ بیان کہ "قصیدہ ہم گوید" (۳) انہیں قصیدہ نگار ثابت کرنے کے لئے کافی ہے

— علی بخش بیمار [م ۱۸۵۴] بانس بریلی کے رہنے والے اور مصحفی کے شاگرد تھے (۴) غزلیات اور قصائد کے چند دیوان ترتیب دیے تھے (۵)۔ ان کا کلام ضائع ہو گیا دیوان کے ۵۶ صفحے رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں

— شاہ محمد حسن، حسن صابری [پیدائش ۱۸۰۵/۱۸۰۶] امیر مینائی کے شاگرد تھے نواب کلب علی خاں کی مدح میں ان کا قصیدہ ملتا ہے (۶)

— عزیز اللہ خاں شیفتہ رامپوری [م ۱۸۵۶/۱۸۵۷] کرامت علی شہیدی کے شاگرد تھے۔ ان کے ایک قصیدے کا انتخاب امیر مینائی نے کیا (۷)

— محمد بخش شہید [پ ۱۸۰۷/۱۸۰۸] سندیلے سے تعلق تھا۔ انہوں نے تاریخیں اور قصیدے کثرت سے کہے ہیں (۸)

— قاضی محمد صادق اختر [م ۱۸۵۸] کے وادی ہگلی کے قاضی تھے۔ اختر کو غازی الدین حیدر نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ انہوں نے نواب مستطاب حسن رضا کی تعریف میں قصائد لکھے (۹)۔ بزمِ غالب کے مصنف نے ان کے دیوان ریختہ کا تذکرہ کیا ہے (۱۰)

— شبراتی رامپوری (مولوی الہ داد طالب) [م ۱۸۵۹] قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے (۱۱) ان کے قلمی دیوان مخزونہ رضا لائبریری رامپور میں عاشقانہ کلام کے ساتھ ساتھ قصائد نعت و حمد بھی محفوظ ہیں (۱۲)

— احمد حسن عرشی قنوجی [م ۱۸۶۰] نادر الکلام قصیدہ گو تھے۔ غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ مالک رام نے لکھا ہے کہ عرشی کی وفات کے بعد نواب صدیق حسن خاں نے ان کا سارا مجموعہ نظم و نثر شائع کرایا (۱۳)

— عباس علی عباس م ۱۸۶۱ نواب معز خاں کے منشی تھے انہوں نے ارسطو جاہ کی شان میں قصیدہ لکھا (۱۴)

— فرانسس گوتیلب کوشی فراسو [م ۱۸۶۱] نصاری تھے سرکار زیب النساء بیگم زوجہ سمرو فرانسیس کے دربار میں اچھے منصب پر تھے میرٹھ میں تحصیلدار بھی رہے (۱۵) انہوں نے زیب النساء بیگم کی شان میں علاوہ عید، دسہرہ اور ہولی کی تہنیت کے حوالے سے قصائد لکھے علاوہ ازیں نواب ظفریاب بہادر کی شان میں بھی ان کا قصیدہ ملتا ہے (۱۶)

— ایگزنڈر ہیڈرلی آزاد [م ۱۸۶۱] زین العابدین عارف سے مشورہ سخن کرتے تھے ان کا ایک قصیدہ عارف کی شان میں بھی ہے (۱۷) ان کے دیوان میں گیارہ قصائد موجود ہیں (۱۸) آزاد نے نواب نظام الدین (۱۹)، نواب جلال محمد، رولو تھامس ہیڈرلی (۲۰)، مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا (والئ گوالیار) راجا شیو دان سنگھ [والئ الور] نواب عبدالرحمن خاں (والئ جھجر) انہوں نے اپنے ماموں حیات محمد خاں کی مدح میں بھی قصیدہ لکھا علاوہ ازیں فرزند اخوی صاحب خورد ولیم کی تہنیت میں بھی۔ احمد خاں محسن اور منالال (مونس خورد) کی تعریف میں بھی ان کے قصائد ہیں۔ ایک حمدیہ قصیدہ بھی ان کی یادگار ہے

---

(۱) دیوان مخزونہ کتب خانہ آصفیہ بحوالہ دکن میں اردو ص ۳۰۸ (۲) دخترِ فصاحت مطبوعہ ۱۲۷۱ھ (۳) ریاض الفصحا ص ۲۵۷

(۴) علی بخش بیمار اور ان کا کلام رسالہ اردو ادب ۳۰/۲ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ (۵) انتخاب یادگار ص ۸۲ (۶) انتخاب یادگار ص ۳۱۱

(۷) ایضاً ص ۱۸۸ (۸) خمخانہ جاوید جلد پنجم ص ۲۰ (۹) بحوالہ نقوش ۱۲۱/۱۲۲ ص ۲۲۵ (۱۰) بزم غالب ص (۱۱) خوش معرکہ زیبا ص ۳۲

(۱۲) تذکرہ کاملان رامپور از احمد علی شوق ص ۵۲ ہمدرد پریس دہلی (۱۳) تلامذہ غالب ص ۲۳۲ (۱۴) خزینۃ العلوم ص ۱۸۵

(۱۵) طبقات شعرائے ہند ص ۴۳۲ (۱۶) یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین ص ۱۳۱–۳۲ (۱۷) خمخانہ جاوید جلد ۲ ص ۴۸

(۱۸) یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین ص ۷۷ (۱۹) آزاد کے برادر خورد (۲۰) آزاد کے برادر خورد

نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۱

میر یار علی جان صاحب [م ۱۸۷۳] فرخ آباد میں پیدا ہوئے لکھنؤ اور رامپور میں رہے۔ وہ ریختی گو شاعر کی حیثیت سے مشہور رہیں ان کے دو قصیدے جنہیں وہ ریختی کے مقابلے میں قصیدی کہتے ہیں خاصے معروف ہیں ایک "در تعریف حسن و جمال و علم موسیقی بی حسین باندی صاحبہ" ہے اور دوسرا نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے

تصدق ان کے سر سے سر سبز ہوں پھولوں پھلوں + قصیدہ مرد کہتے ہیں قصیدی میں نے کہی (۱)

بی حسین باندی کی تعریف میں ان کی قصیدی نہ صرف عورتوں کی زبان میں ہے بلکہ ان کی بعض عادات و اطوار کی غماز بھی ہے (۲)

فضل رسول خاں واسطی کا دیوان [م ۱۸۷۲] میں چھپا اس میں ڈیوک آف ایڈنبرا کی آمد پر لکھا ہوا قصیدہ ہے

شاہ محمد دلدار علی مذاق [پ ۲۰-۱۸۱۹] بدایوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے دیوان میں دو قصیدے ہیں (۳) حسرت موہانی نے انہیں ذوق کا شاگرد لکھا ہے (۴)

محمد احسن علی رسوا بیدار بجنوری کے بیٹے تھے ان کے دیوان میں چھ قصائد ہیں تین نعتیہ (۵) ایک در تہنیت جشن قیصری ۱۸۷۹ ہنجدہ انبالہ ایک اول پار کر جج عدالت خفیفہ اور ایک مالیر کوٹلہ کے نواب محمد ابراہیم خاں کی مدح میں ہے

منشی شیتل پرشاد احقر لکھنوی نے اس عہد میں شہ ہمدم لکھا گوت کے بارہویں اشلوک کا اردو قصیدے کی شکل میں ترجمہ کیا (۶)

مصیح الدین رنج نے ۱۸۷۶ [۱۸۸۴] میں تذکرہ بہارستان ناز لکھا ان کے دیوان میں چھ قصائد ہیں جن میں دو نعتیہ ہیں دو انگریزوں کی شان میں ہیں اور دو نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہیں (۷) رنج کے قصائد میں رواتی شان و شوکت کے عناصر دستیاب نہیں ہیں۔ انہوں نے جدید دور کے نظمیہ رجحانات کو پیش نظر رکھا

فدا حسین فدا کے مطبوعہ دیوان میں ایک اردو قصیدہ لفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو ہند کی شان میں مندرج ہے (۹)

محمد حبیب اللہ ذکا م ۱۸۷۵ مدرا کی الاصل تھے کے بارے میں غالب نے لکھا تھا انہوں نے قصائد میں انوری کا چربہ اٹھایا ہے۔ مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے (۱۰)

مصطفٰے حسین راسخ بلہوری کہ جو ۱۸۷۰ میں زندہ تھے قصیدے بھی لکھتے تھے (۱۱)

حاتم علی بیگ مہر [م ۱۸۷۹] مہر نے ایک قصیدے میں واجد علی شاہ کا زائچہ تقدیر قلمبند کیا ہے اس میں اس علم کی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے (۱۲)

محمد علی مراد آبادی کے دیوان سرود غیبی میں قصائد دستیاب ہیں (۱۳)

شیخ عطا حسین عطا [م ۱۸۷۹] غالب کے شاگرد تھے ایک قصیدہ شکایت زمانہ کے حوالے سے لکھا (۱۴)

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۱۰۲ و تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب مرتبہ سید محمد مبین نقوی ص ۲۹۶ مطبع انوار احمدی الہ آباد
(۲) دیوان واسطی از فضل رسول خاں واسطی مطبوعہ نولکشور [م ۱۸۷۲] ص ۲۴۴ (۳) کلام دلدار مطبوعہ عزیز آرٹ پریس ڈھاکہ ۱۹۶۱ ص ۲۸۳ تا ۲۹۱
(۴) معنون مذاق بدایونی بہار اردو محلی علی گڑھ مارچ ۱۹۱۰ (۵) دیوان رسوا مطبع صادق الانوار بہاولپور ۱۲۹۹ھ
(۶) آثار شعرائے ہنود ص ۴-۵ از دیبی پرشاد سحر (۷) مخزن الفصاحت از فصیح الدین رنج مطبوعہ ۱۸۹۱ء ص ۵۹-۶۰
(۹) دیوان فدا مطبوعہ مطبع نول کشور اس میں شیفتہ کی شان میں ایک فارسی قصیدہ بھی ملتا ہے
(۱۰) اہل نوایط کی اردو خدمات معنون نقوش نمبر ۱۰۲ (۱۱) گلدستہ سخن ص ۱۸۵۰ء (۱۲) الماس درخشاں یعنی دیوان مہر
(۱۳) سرود غیبی مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۲ھ (۱۴) تلامذہ غالب ص ۲۳۸

محمد خاں رند [م ۱۸۸۰] آتش کے شاگرد تھے[1] ۔ ان کے مطبوعہ دیوان میں خطابیہ قصیدہ امجد علی شاہ والی اودھ کی شان میں ہے اور تشبیبیہ وزیر اودھ علی نقی خاں کی مدح میں۔ امجد علی شاہ کو انہوں نے خاقان، رحیم، عادل، دین و شرع کا پابند قرار دیا ہے۔ علی نقی خاں کے قصیدے کی تشبیب بہاریہ ہے۔ مدحیہ مضامین شجاعت کے ساتھ ساتھ تلوار، گھوڑے علاوہ لوٹ کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ سودا کی تقلید میں انہوں نے قوت نامیہ اور فیضِ باد بہاری کے حوالے سے عمدہ تشبیبی مضامین باندھے ہیں[2]

الفت حسین فریاد [م ۱۸۸۰] کے کلام کے بارے میں معین الدین دردائی نے لکھا ہے کہ ان کے اردو و فارسی کے کئی قصائد اور اردو دیوان کلکتہ میں نذرِ آتش ہو گئے[3]

پنڈت بشن ناتھ صبر [۱۸۸۳-۸۱ میں زندہ تھے] لکھنو سے متعلق تھے ریاست رامپور میں ملازمت اختیار کی عبد الباری آسی کا کہنا ہے کہ صبر کا کلیات ان کے کتب خانے میں موجود تھا جس میں انہوں نے نواب کلب علی بہادر کی مدح و ثنا کے علاوہ رامپور کی بہت سی نئی عمارتوں وغیرہ کی تعریف میں قصیدے اور تاریخیں کہی ہیں[4]

● عصمت اللہ انسخ[5] ● اوحد علی اوحد کانپوری[6] ● احمد حسین واقف[7] ● نواب علی نفیس کانپوری[8]
● وارث علی ضیا[9] ● زحل دشا ہوندی[10] ● علی حسن شہ رد دہلوی[11] وغیرہ نے عبد الغفور نساخ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں

جواہر سنگھ جوہر [م ۱۸۸۰] وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں دیوان مع قصائد رکھتے تھے[12]

مولوی اصغر علی اصغر [م ۱۸۸۰] اکبر آباد کے رہنے والے تھے قصیدہ گوئی میں ان کے کمال کا ذکر ملتا ہے[13]

امداد علی بحر [م $\frac{1882}{1883}$] ناسخ کے شاگرد تھے ان کے کلیات[14] میں ایک قصیدہ نواب محمد ذوالفقار کی شادی کی مبارکباد کے حوالے سے بھی ہے۔ ان کے ایک قصیدے کا ابو اللیث صدیقی نے بھی حوالہ دیا ہے[15] یہ نواب یوسف علی خاں والئ رامپور کی مدح میں ہے امداد علی بحر کے قصائد میں رنگینی اور بے ساختہ پن کے علاوہ سلاست و صفائی بھی ہے۔ وہ مضمون آفرینی کے قائل بھی تھے اور پیچیدہ تمثیلوں اور دقیق استعاروں کے استعمال کے بھی۔ بحر بہاریہ تشبیب لکھنے میں ماہر تھے

احمد حسن شاکی [م ۱۸۸۳] کے کلیات میں قصائد موجود ہیں۔ یہ شائع ہو چکا ہے[16]

محمد عباس بیتاب رامپوری [م ۱۸۸۳] مومن کے شاگرد تھے[17] امیر مینائی نے ان کے چار قصائد کا انتخاب دیا ہے

انور دہلوی [م ۱۸۸۴] ظہیر دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے دو دواوین کے تلف ہونے کی اطلاع حسرت موہانی نے دی ہے[18] نظم دلفروز کے نام سے ان کا جو دیوان چھپا ہے[19] اس میں ان کا ایک قصیدہ مہاراجہ شیو دان سنگھ مہاراجہ الور کی شان میں ہے۔ انور سلاست، حسن آفرینی، فصاحت کے علاوہ استعارہ کو عزیز رکھتے تھے

---

(۱) بحوالہ رسالہ اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۰۶ مضمون تذکرۃ الشعرا (۲) دیوان رند مطبوعہ نول کشور لکھنو (۳) بہارستان اردو معین الدین دردائی قلمکدہ زیادہ ص ۲۴ (۴) اسلامیہ کب ڈپو آرہ ۱۹۲۴ء دو نایاب زمانہ بیاضیں اور ان کا انتخاب رسالہ ہندوستانی ۱۹۴۲ [illegible] جلد ۱۰ ص ۲۱۰
(۵) قصائد منتخبہ مطبع نامی لکھنو ۱۳۰۲ ص ۲۷ (۶) ایضاً ص ۲۴ (۷) ایضاً ص ۳۲ (۸) ایضاً ص ۳۰ (۹) ایضاً ص ۴ (۱۰) ایضاً ص ۳۳
(۱۱) ایضاً ص ۸ (۱۲) سراپا سخن ص ۱۹۶ (۱۳) شاعر آگرہ نمبر جون جولائی ۱۹۳۲ء (۱۴) ریاض البحر از امداد علی بحر مطبع مصطفائی ۱۲۸۳ھ
(۱۵) لکھنو کا دبستان شاعری ص ۱۵۵ اردو وکر گنیپت روڈ لاہور (۱۶) خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۳۳۲ (۱۷) انتخاب یادگار ص ۷۷-۷۹
(۱۸) مضمون انور دہلوی رسالہ اردوئے معلیٰ اپریل ۱۹۱۰ (۱۹) نظم دلفروز از انور دہلوی مطبع رفاہ عام لاہور ۱۸۹۹

نواب احمد حسین خاں جوش [م ۱۸۸۵/۱۸۸۶] کا دیوان گلدستہ الشعرا میں منقبت امام حسن و حسین رضو کا قصیدہ ہے (۱)

موتی لال جشمی [م ۱۸۸۵] کے ایک قصیدے کا ذکر دبیر پرشاد نے کیا ہے (۲) موتی الہ آباد کے رہنے والے تھے

فیض الحسن سہارنپوری [م ۱۸۸۷] کے مجموعہ کلام میں کل نعتیہ قصائد ہیں (۳) نواب بہاولپور کی مسند نشینی پر ایک قطعہ بھی ہے۔

مولانا عبد اللہ قریشی نے ان قصائد کی تفصیل اپنے ایک مضمون میں ہیا کی ہے (۴)

کلب علی خاں والیٔ رامپور [م ۱۸۸۷] کے دیوان نشید خسروانی میں ایک نعتیہ قصیدہ مطبع ہوا ہے (۵) نشید خسروانی ص ۲۹۷ رامپور ۱۲۹۳ھ

واجد علی شاہ اختر [م ۱۸۸۷] لکھنو کے آخری تاجدار۔ انہوں نے آئمہ معصومین کی شان میں قصائد لکھے۔ ان کے اردو اور فارسی قصائد قصائد المبارک میں چھپے۔ (۶) ان کے معروف قصائد میں قصیدہ بین النفس و عقل، نصائح اختری عشق نامہ وغیرہ اہم ہیں۔ دیوان مبارک میں ان کا ایک قصیدہ حضرت علی کے گھوڑے کی تعریف میں ہے (۷)

بہادر حسین وحید [م ۱۸۸۷] کا تعلق لکھنو سے تھا ان کے قصائد کا تذکرہ ملتا ہے (۸)

فدا علی خاں فدا رامپوری کے ایک مدحیہ قصیدہ کے اشعار امیر مینائی نے منتخب کیے ہیں (۹)

عبد الصمد صمد [۱۸۸۲ میں زندہ] کا تعلق کانپور سے تھا ان کے دو قصائد گلدستہ نتیجہ سخن میں طبع ہوئے تھے ایک قصیدہ پیر بانواں (پرتاب گڑھ) کے تعلق دار دوست محمد کی مدح میں تھا دوسرا جسٹس رمیش چندر متر کے کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہونے پر ۱۸۸۲ء میں لکھا گیا (۱۰)

مہدی حسین عاشق [پ ۱۸۳۲] منظور علی اسیر کے شاگرد تھے والیٔ رامپور کی شان میں ان کا ایک مدحیہ قصیدہ ملتا ہے (۱۱) علی جواد زیدی نے ایک شاعر مہدی حسین غافل کا (۱۲) تذکرہ کیا ہے اس نام کا کوئی شاعر موجود نہیں عاشق کو غافل پڑھ کر غافل کو ایک علیحدہ شاعر کے طور پر دکھایا گیا ہے

حشمت علی خاں موجد [پ ۱۸۳۲] مومن کے شاگرد تھے ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں کی تعریف میں ملتا ہے (۱۳)

امداد حسین صفیر ۱۸۷۸/۱۸۷۹ میں زندہ تھے مولوی عبد الوہاب کی روانگی کے موقع پر انہوں نے ایک نعتیہ قصیدہ لکھا۔ اس کا نام مخبر نجات ہے (۱۴) صفیر کا تعلق فرخ آباد سے تھا

سرفراز علی خاں شیفتہ ۱۸۷۵/۱۸۷۹ میں زندہ تھے۔ لکھنو سے متعلق تھے نواب تراب علی خاں مختار الملک اول کی مدح میں قصیدہ لکھا (۱۵)

علیم اللہ خاں رضا [پ ۱۸۳۲] رامپوری تھے نواب کلب علی خاں کی مدح میں ان کے ایک قصیدہ کا تذکرہ ہے (۱۶)

عنایت حسین کیفی [۱۸۸۲ میں زندہ] ان کا ایک قصیدہ رمیش چندر متر کے چیف جج ہونے پر ملتا ہے (۱۷)

دلاور علی دلاور [پ ۱۸۳۹] رامپوری تھے امیر مینائی نے ان کے ایک قصیدے کے اشعار منتخب کیے (۱۸)

---

(۱) گلدستہ الشعرا ص ۴۰ (۲) آثار شعرائے ہنود ص ۸۴ (۳) گلزار فیض مطبعہ (۴) ص ۲۸-۲۹ نقوش ۸۹ (۵) قیصر کتب خانے کے پرانے چھپے اردو دیوان حبیب الرحمن شیروانی رسالہ ہندوستانی ۱۹۴۱ (۶) قصائد المبارک و دیوان نولکشور ۱۹۲۲ (۷) دیوان مبارک جلد اول ص ۸ (۸) دبستان دبیر ص ۳۸۶ از ذاکر حسین فاروقی الواعظ صفدر پریس دہلی ۱۹۵۳ (۹) انتخاب یادگار ص ۲۸۲ (۱۰) گلدستہ نتیجہ سخن ص ۱۸۸۲ کلکتہ (۱۱) انتخاب یادگار ص ۲۱۷-۲۱۸ (۱۲) قصیدہ نگاران اتر پردیش ص ۲۰۴ (۱۳) انتخاب یادگار ص ۳۴۷/۳۶۹ (۱۴) مخبر نجات مطبوعہ نور الانوار آرہ (۱۵) کتب خانہ سالار جنگ فہرست ۴۳ (۱۶) انتخاب یادگار ص ۱۲۹ (۱۷) گلدستہ نتیجہ سخن جلد خط کمیٹی (۱۸) انتخاب یادگار ص ۱۲۸

- لکھنؤ کے محمد علی حسین خاں خورد کے بارے میں خمخانۂ جاوید جلد سوم میں مرقوم ہے کہ وہ قصیدہ گوئی میں ملکہ رکھتے تھے (۱)
- منشی لال سیمت مالوہ میں پیدا ہوئے ٹونک میں بطلے ہو لے اردو اور فارسی قصائد لکھتے تھے (۲) [حاشیہ: دیوان سیمت وضمیمہ از مطبع رضوی دہلی ۱۹۱۱ ص ۱۱۰ تا ۱۱۸ — وشیو راے سری کرشنا، وزارت علی، نواب ابراہیم خاں، ٹرے بیٹا، ابر پٹیال، اور نیناست جیوا سنگھ کی شان میں قصائد لکھے]
- منیحسن یارسا نے بہادر شاہ ظفر کے ولی عہدی کے زمانے میں ان کی شان میں قصیدہ کہا (۳)
- سیاۓ تمنا لکھنوی کی کتاب میں ریاست الور کے مہاراجہ سوائی مہاراو منگل سنگھ کی مدح میں قصیدہ طبع ہوا (۴)
- شیخ حفیظ احفیظ دہلی کے رہنے والے تھے چندو لال نے ایک قصیدے کے عوض خلعت ہزار روپیہ اور ملک الشعرائی عطا کی (۵)
- صادق علی صادق غازی الدین حیدر کے ملازم تھے دیوان میں قصائد موجود ہیں (۶)
- غلام حیدر صفیر نے واجد علی شاہ کی مدح میں قصیدے لکھے (۷)
- میر مظفر حسین ضمیر نے ابتدا میں قصیدہ میں بھی طبع آزمائی کی (۸)
- عبدالعزیز عزیز امام بخش صہبائی کے استاد تھے ان کے قصیدے کے چند اشعار کو صابر نے گلشن شان و شوکت کیا (۹)
- جوزف بیفنرل فنا کے دیوان میں قصیدہ ملتا ہے (۱۰)
- عابد علی خاں فرہاد کاکوروی نے واجد علی شاہ کی مدح میں قصیدے لکھے۔ انہیں واجد علی شاہ نے سات پارچے کی خلعت بھی دی (۱۱)
- مہدی علی خاں قبول لکھنؤ کے تھے واجد علی شاہ کی مدح میں ان کے قصائد دستیاب ہیں (۱۲)
- مرزا اکبر علی گل جے پور کے شعرا میں سے تھے گل تخلص اور نگار تخلص کرتے تھے۔ مسٹر ایس بویٹشل ایجنٹ جے پور کی شان میں ان کے قصیدے کے اشعار امداد صابری نے درج کیے ہیں (۱۳)
- جمعیت شاہ ماہر خاندانِ مغلیہ میں سے تھے صابر نے ان کی قصیدہ گوئی کا اشارہ کیا ہے (۱۴)
- مبارز الدولہ حیدر آباد سے متعلق تھے ان کے ایک قصیدے کے بیس اشعار ملتے ہیں (۱۵)
- مرزا محمد خاں کا قصیدہ "در مدح واجد علی شاہ" کے عنوان سے کتب خانہ ضلع خیرپور میں موجود ہے
- مول چند منشی شاہ نصیر کے شاگرد شاہ عالم کے ملازم تھے انہوں نے شاہ عالم کے حضور قصائد لکھے (۱۶)
- حضرت صوفی منیری غالب کے معاصر تھے عروۃ الوثقیٰ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے حوالے سے ان کا ایک قصیدہ معروف ہے یہ مظفر شمس بلخی کی شان میں ہے (۱۷)
- گوبند سہاۓ نشاط کے دیوان نشاط الاحباب میں قصائد کی موجودگی کی خبر ہے (۱۸)
- نعیم اللہ نعیم کے قصیدہ مدحیہ کا تذکرہ مصحفی نے کیا ہے (۱۹)
- نیاز علی بیگ نکہت شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنے سفرِ لاہور میں راجہ شیر سنگھ کی خدمت میں قصیدہ گزرانا (۲۰)

---

(۱) خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۱۳۱ (۲) خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۴۱۴ (۳) گلستان سخن ص ۱۹۲ (۴) یادگار ریاست الور از سہاۓ تمنا ص ۳ مطبع تمنائی لکھنؤ ۱۸۹۹ء
(۵) تذکرہ شعراۓ دکن جلد اول ص ۲۵۳ (۶) شاہان اودھ کے کتب خانے ص ۱۱۸ ترجمہ از ڈاکٹر چغتائی (۷) جواہر سخن ص ۱۵۷
(۸) مجلہ اسمہ از مصحفی کے شاگرد ص ۱۷۶ (۹) گلستان سخن جلد دوم ص ۲۰۷ (۱۰) یورو پین اینڈ انڈو یورو پین پوئٹس ص ۱۸۷
(۱۱) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۲۲۷ (۱۲) جواہر سخن جلد چہارم ص ۸۰ (۱۳) تلامذۂ میر ص ۸۱ (۱۴) گلستان سخن ص ۳۲۳–۳۲۵
(۱۵) مضمون جنگ آزادی کا اولین مجاہد از ثمینہ شوکت نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۲ (۱۶) گلستان سخن جلد دوم ص ۳۸۵
(۱۷) رسالہ نیرنگ خیال سالنامہ ۱۹۲۸ (۱۸) بزم غالب ذکر نشاط، تلامذۂ غالب ص ۲۷۹–۲۸۰ (۱۹) تذکرہ ہندی گویاں ص ۲۵۹ (۲۰) گلستان سخن ص ۶۷–۶۸

مولانا قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند (سن ۱۸۸۰ء) کا طویل بہاریہ قصیدہ ملتا ہے (۱) یہ نعتیہ قصیدہ ہے

محمد ہاشم ہاشم کا محمد آباد سے تعلق تھا ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی پر انہوں نے ایک قصیدہ لکھا (۲)

دانش علی دلاور مہاراجہ چندو لال کے معاصر تھے ان کے مدحیہ قصیدہ کے اقتباسات ملتے ہیں (۴)

منور خاں دلگیر عوامی شاعری کے نمائندہ تھے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں گنواری زبان میں قصیدہ پڑھا (۵)

نواب علی خاں سحر والیٔ محمود آباد نے واجد علی شاہ کی تعریف میں قصیدہ نونیہ لکھا (۶) [قصائد سحر ۱۲۹۳ھ مطبع اودھ پریس لکھنؤ ص ۲ تا ص ۱۳ ان کے دو قصائد حضرت علی کی شان میں بھی ہیں]

داد خاں سیاح نے ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ لکھا اور قید خانے سے نجات پائی (۷)

میر ابوالقاسم شاہ مرزا نواب عبدالمجید خاں نبیرہ نواب مظفر خاں والیٔ ملتان کے مداحوں میں سے تھے (۸)

تہمتن جنگ بہادر شوق کا تعلق دکن سے تھا عید رمضان کی مبارکباد کے حوالے سے ان کے قصیدے کے چند شعر ملتے ہیں (۹)

باقر علی خاں وحشت کے بارے میں سراپا سخن میں لکھا ہے کہ ان کا دیوان مع قصائد مرتب تھا (۱۰)

قاسم علی بیگ قاسم سندیلہ کے شاعر تھے انہوں نے قصائد بھی لکھے ہیں (۱۱)

قادر بخش صابر کا قصیدہ ان کے دیوان میں موجود ہے یہ نعتیہ قصیدہ ہے (۱۲)

عیش نامی کسی شاعر کا ۱۸۸۳ء کا لکھا ہوا ایک قصیدہ کتب خانہ عام ضلع خیرپور کی ملکیت ہے یہ نظام حیدرآباد کی تخت نشینی کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ (۱۳)

دیبی پرشاد بشاش بھوپال کے رہنے والے تھے انہوں نے تذکرہ آثار شعرائے ہنود لکھا اس میں اپنے ایک قصیدے کے اشعار بھی درج کیے (۱۴)

نصیرالدین خاکی کا دیوان ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنی ۱۹ مختلف نعتیہ اور دیگر موضوعاتی (مثلاً جوہر انسانی اخرب امثل اور حواس خمسہ کے نام سے چھپنے والی) نظموں کو قصائد کا نام دیا ہے (۱۵)

ابو اسحٰق محمد شجاع الدین انصاری کا تعلق لاہور سے ان کا دیوان ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا اس میں دو قصائد موجود ہیں ایک قصیدہ محی الدین غوث الاعظم کی شان میں اور دوسرا شاہی مسجد کی واگذاشت کروانے پر لاہور کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی شان میں ہے (۱۶)

منشی ہیرا لال شیریں خورجوی کے دیوان میں مہاراجہ منگل سنگھ والیٔ الور کی شان میں قصیدہ ملتا ہے (۱۷)

حضور احمد خاں آثم کا دیوان ۱۸۸۶ء/۱۸۸۷ء میں شائع ہوا تھا جس میں پانچ حمد و نعت کے قصائد طبع ہوئے ہیں (۱۸)

پنڈت بشنو ناتھ منتظر لاہور سے متعلق تھے تاہم ریاست جموں و کشمیر کے ملازم تھے۔ ان کے دیوان میں رازدان مہاراجہ کشمیر (دو قصائد) اور کرپا رام مشیر خاص مہاراجہ کشمیر کی شان میں قصائد دستیاب ہیں (۱۹)

محمد حسن متین کے دو قصائد ملتے ہیں ایک مہاراجہ پٹیالہ کی بیٹی کی شادی پر اور دوسرا ۱۸۸۸ء میں کسی وائسرائے پنجاب کی تعریف میں ہے (۲۰)

---

(۱) بحوالہ اردو میں نعتیہ شاعری ص ۴۶۵ (۲) قصیدہ نگاران اتر پردیش ص ۲۸۲، ۲۸۳ (۴) تذکرہ شعرائے دکن ص ۱۵۰ جلد دوم
(۵) رسالہ تہذیب الاخلاق جنوری تا مارچ ۱۹۶۷ء مضمون منور خاں دلگیر از سید حرمت ص ۱۵ (۶) سخن شعرا ص ۲۱۸ (۷) بزم غالب ص ۱۳۴ (۸) ملتان میں اردو شاعری ص
(۹) محمود منتخبہ ص ۳۸۲ (۱۰) سراپا سخن ص ۹ (۱۱) میران نانپور کے عہد میں اردو کی ترقی مضمون معین الدین دردائی اردو نامہ ۱۹۶۲ء
(۱۲) ریاض صابر از مرزا محمد قادر بخش صابر مطبع اخبار آصفی حیدرآباد (۱۳) سندھ میں اردو مخطوطات ص ۱۵۱، ۱۵۰ (۱۴) آثار شعرائے ہنود جلد دوم ص ۲۰
(۱۵) دیوان خاکی مطبع گلزار دکن (۱۶) باغ بہار مطبوعہ لاہور ۱۸۸۶ء (۱۷) ارمغان احبا مطبع نظامی کانپور ۱۸۱۶، ۱۸۱۸
(۱۸) منظور حق ۱۳۰۵ھ مطبع نظامی کانپور (۱۹) دیوان منتظر مطبع صحافی لاہور ۱۸۸۸ء ص ۷ تا ۹ (۲۰) ایک تاریخی تاریخ گو مضمون آغا باقر نبیرہ آزاد ادبی دنیا ص ۱۰ تا ۲۱

- اس دور میں عنایت اللہ خاں راسخ رامپوری کا ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی پر ملتا ہے (۱)
- ماہتاب الدولہ چنیاں نے ایک قصیدہ معتمد میر عباس لکھنوی کے مٹیا برج کلکتہ آنے پر کہا (۲)
- منشی نواب علی خاں کانپوری (۳) نے جسٹس رمیش چند کے چیف جسٹس کلکتہ ہائی کورٹ ہونے پر ایک قصیدہ لکھا
- مولوی میر محمد حسین فرخ بریلوی (۴) نے حمد و نعت میں قصائد لکھے
- مولوی مہدی شیدا کاکوروی نے اہل بیت کی مدح میں قصائد کہے (۵)
- مظفر علی بیگ تسکین بدایونی نے مختار الملک اول کی تعریف میں قصیدہ لکھا (۶)

۱۸۸۲ء میں قصائد مدحیہ کے نام سے ایک گلدستہ مطبع گلزار دکن سے شائع ہوا اس میں دکن کے ہوم سکریٹری عبدالحق دلیر الدولہ کی لندن سے واپسی اور تہنیت عید کے حوالے سے سید محمد عسکری عدیل برادر کاظم حبیب (۷)، سید بنیاد احمد دلیر (۸) اور منشی محمد یعقوب سخنور (۹) کے علاوہ قصائد شائع ہوئے

---

(۱) انتخاب یادگار ص ۳۲۱ (۲) گلدستہ نتیجہ سخن ص ۵ (۳) گلدستہ نتیجہ سخن کلکتہ اگست ۱۸۸۲ء ص ۵ (۴) انتخاب یادگار ص ۲۸۴، ۲۸۵
(۵) صبح گلشن ص ۲۴۴، ۲۴۵ (۶) کتب خانہ نواب سالار جنگ وضاحتی فہرست ص ۱۸۱ ب
(۷) قصائد مدحیہ ص ۱۸ (۸) ایضاً ص ۲۷ (۹) ایضاً ص ۳۲، ۳۳

انتخاب اشعار حوالوں کے لیے ص ۵۷ لم تا ۵۷ لم

ع گرچہ مشہور تو ہے رتبۂ انساں گوہر + لیک گوہر میں بھی ہرگز نہیں یکساں گوہر [میر عباس علی خاں احسان]

درمدح اعظم الامرا ع لے زر جہاں میں کچھ نہیں آتا بکار دست + بدتر ہے آستین سے بے اقتدار دست [حسین علی خاں ایما]

درمدح علاء الملک شاہ ع کیا نخل دعائے دوستو کس کی ثمر پیدا + ہوئی گویا کف بیضائے موسیٰ سے سحر پیدا [محمد عثمان قیس]

درمدح اعظم الامرا ع جہاں والسنۂ احساں ہے کس انصاف پرور کا + کہ دام صید وحشی باز ہے دانہ کبوتر کا [مرزا علی لطف لطف]

مقیدہ بطور غزل ع گل کر سبت صاحب ہے دعا دل زماں + خوش چیں ہو جیکا آب نوشیدواں [حیدر بخش حیدری]

درمدح ایکاشہ ع فلک زمیں پہ ہوا جب سے روز و شب گرداں + کسی کے دل نے نہ پایا کبھی قرار جہاں [عنبر شاہ آشفتہ]

درمدح غازی الدین حیدر ع مدح تیری کیا کروں اے زینت ہندوستاں + کشور بلقیس ہیں گویا نہیں میری زباں (۱) [محمد بخش مہجور]

مقیدہ لامیہ ع گرمئ حسن بتاں لوگ کیوں کیا میں مثل + آتش طور بھڑکتی ہے بہر دشت وجبل [غلام مصطفیٰ سخن]

درمدح نصیر الدین حیدر ع زیر ران شاہ دوراں ہے وہ اسپ بے نظیر + نام ہے فیروزہ پر لعل بدخشاں سے منیر [منصور علی خاں مہر]

درمدح واجد علی شاہ ع یہ دعا جلد ہو مقبول مجیب الدعوات + مہر کی یاد کرے بادشہ عرش وقار [آغا علی مہر]

مذہبی مقیدہ ع رات دن چکر میں ہے اتنے لیے چرخ بریں + تا نہ بیٹھیں ایک دن آرام سے اہل زمیں [قدرت اللہ قاسم]

مقیدہ نعت ع ہو گیا آپ سے جو دل ملتے ہی کچھ محرم راز + ہم نے پھر نہ کبھی آتی کسی کی آواز [رحمت خاں والہ]

مقیدہ بہاریہ ع صبحدم گزرا مری خاطر میں ناگہ یہ خیال + سیر گلشن کیجیے تا دور ہو دل سے ملال [حسین علی خاں جولاں]

مذہبی مقیدہ ع عرش اعلیٰ پہ ابھی کیا ہے مبارک باد دی + سارے عالم میں مچی کیا ہے مبارک باد دی [نصیر الدین حیدر]

[غفلت احمد خاں] ع زہے دیار مدینہ کہ جس میں آئے حضور + نفاست ہے بہشت بریں میں لا کو قصور [غفلت احمد خاں]

کے مذہبی اور ع ہو ماہ روشن طبع گر ہو مجھ سے روشن آفتاب + چرخ نظروں سے گرا دے صورت تیر شہاب [ایضاً]

غیر مذہبی قصیدوں ع زمانہ رنگ بدلتا ہے کیا عجب ہے اگر + کبھی سمن ہو کبھی گل کبھی ارغواں نرگس [ایضاً]

میں سے] ع سلوک آفاق میں ہے جو برونے کون آتا ہے + نہیں دیکھا کہ دم شمشیر جو ہیں کو کوئی پانی [ایضاً]

درمدح نظام الملک ع عجب ہے تجھ پہ اگر ہوں نہ جسم و جاں فدا + کہ نام نامی تو ہنر ایے اعظم الامرا [میرزا احمد]

درمدح امیر فلک قدر ع شب برات ہے آج اور یہ نور کا ہے وفور + کہ چشم روزن دیوار تک نہیں بے نور [طالب علی خاں عیشی]

درمدح سکندر جاہ مطلع ثانی ع اے خداوند رہے تجھ پہ خدا کا افضال + ذات تیری ہے اب ایسے کہ نہیں جس کی مثال [چندو لال شاداں]

مقیدہ - ع کہاں ہے ساقی خوش وضع یا سمیں اندام + کہاں ہے غزو مینا کدھر ہے گلفام [غلام امام خاں ملک ظہور]

فراحیہ مقیدہ ع جو تیری مدح میں ہیں جو بیچ اپنی وا کردوں + تو رشک باغ ارم اپنا گھونسلا کردوں [ہدہد]

درمدح نواب میر محبوب علی ع تلفظ میں زباں کو رتبۂ الہام حاصل ہے + دم تحریر خامہ ہے ترا جبرئیل کا شہپر [وزیر علی وزیر]

---

(۱) اس قصیدے میں مہجور نے ہولی کا نقشہ کھینچا ہے اور لکھا ہے کہ مہوشوں کے جمگھٹ ہاتھ میں ثریا مثل پچکاریاں لے کر رنگ شفق میں ڈوبے ہوئے ہیں - رنڈیوں کے ہاتھ میں دفیں اور گیند گل صد برگ لے کر گھوم رہی ہیں ان کی چھاتیوں پر دو پیولوں کی گانتیاں بندھی ہیں - کسی نے عبیر ملا ہے اور کسی نے گلال کوئی منہ سے گلال لگائے اینڈ رہی ہے - اس میں چند بیشتر اشعار بھی ہیں علاوہ ازیں ممدوح کی شجاعت اس کی شمشیر اسپ اور فیل کی توصیف بھی ہے [نورتن ص ۷ تا ۱۳]

تہنیتِ قصیدہ سے پکڑ رہی ہے زمینِ وطن دامنِ پاؤں + پڑا ہوں کنجِ قفس میں مثالِ زندانی [فصیح الدین رنج میرٹھی]

[ ]

درخواستِ تلافی دردربارِ آصفی سے اے خداوندگار بندہ نواز + فی المثل تو طبیب میں بیمار [محمد حبیب اللہ ذکا]

درمدح واجد علی شاہ سے پڑا تھا یہ پوتھیوں میں ہم نے اپنی مرزا مہر + ہوا جہاں میں جب رام چندر کا اوتار [حاتم علی بیگ مہر]
ق
اسی طرح کے ستارے پڑے تھے زائچے میں + یہ ایک زائچہ ویسا ہی دیکھا دوسری بار

درشکایتِ زمانہ سے کاوشِ اہلِ وطن سے ہے یہ جی کی حالت + کہ مشبک ہے جگر خانۂ زنبور صفت [عطا حسین عطا]

درمدح بہادر شاہ ظفر سے حسن سے اب کے یہ کیجو عارضِ گل ہے معمور + رنگِ رخسارِ بتاں سبزہ ہو جس کے حضور [محمد خاں رند]

درمدح عبد الغفور نساخ نہیں ہے سامنے میرے جو میرا رشکِ بہار + ہے خار زار لگا ہوں میں دہر کا گلزار [عصمت اللہ انسخ]

ایضاً سے ایک دن ماہ سے یوں خسروِ خاور نے کہا + تجھ سے بڑھ کر کہیں عالم میں ہے میرا رتبہ [اوحد علی اوحد]

ایضاً سے ہوا سیراب فیضِ فصلِ گل سے گلشن خانہ + مسرت سے نہیں پھولا سماتا باغ سینہ [احمد حسین وافر]

ایضاً سے جس طرف دیکھیے ہے عیش کے ساماں کی بہار + کیوں نہ مرغوب ہو پھر گلشنِ امکاں کی بہار [نواب علی نفیس]

ایضاً سے حضرت استاد کی مدحت کروں گا میں رقم + لا دے اے رضواں مجھے تو شاخِ طوبیٰ کا قلم [وارث علی ضیا]

ایضاً سے آج پھولا ہے نئے رنگ سے گلزارِ امل + شجرِ خشکِ تمنا میں نظر آتے ہیں پھل [زحل صاحب]

ایضاً سے ساقیا لکھنا ہے مجھ کو وصفِ بحرِ فیض کا + جلد چھلکا کے مجھے جامِ مئے مضموں پلا [سید علی حسن سرور]

درمدح نواب محمد ذوالفقار علی سے وہ زمانہ ہے کہ آئے جو طرفہ سامانِ بہار + آشیانوں میں عنادل کے بندھے بندنوار [امداد علی بحر]

درمدح نواب یوسف علی خاں سے شاخِ شمشیر میں مانندِ سپر پھول کھلیں + جو نئے گلشن میں جو حاسد کے پھپھولے آئیں [ایضاً]

محفل کتخدائی ولی عہد سے یہ وہ محفل ہے کہ حسرت میں ہے جس کی جمشید + یہ وہ شادی ہے کہ محتاج ہے جس کا فغفور [محمد عباس بے تاب]

درمدح مہاراجہ شیوراج سنگھ ہاں اے چمن طرازِ فضائے دل ہیم + ہاں اے شمیمِ نازِ گلِ خاطرِ نسیم [انور دہلوی]

قصیدہ منقبت سے مہر و خورشید سے مشہور ہوا دونوں ہیں + شمعِ عرفاں کی ضیا نورِ خدا دونوں ہیں [نواب احمد حسن خاں جوش]

ہوئے کیسے کیسے جوانمرد پیدا + بنائے زمیں پر مکاں کیسے کیسے [موتی لال جنس]

درمدح دلدل فہیم نکتہ الشان و نکتہ سنج سوار + عقیل بشر پہ و بطحا شکوہ گردوں جور [واجد علی شاہ اختر]

مدح و عقیدہ سے شرف افزائے جہاں صاحبِ تخت و اکلیل + حکم کی جس کے فلک کو بھی ہے واجب تعمیل [فدا علی فدا]

درمدح محمد خاں تعلقدار سے فصلِ گل آئی ہے شاداب ہے سارا گلشن + پہنے ہیں پیرہنِ سبز جوانانِ چمن [عبد الصمد صمد]

درمدح رشن چند منتر جی سے گل ہیں خنداں چمن سبز ہے شکلِ اختر + کیا زمیں پر اتر آیا ہے سپہرِ اخضر [ایضاً]

درمدح کلب علی خاں سے یہ صحنِ باغ ہے افزائشِ زرِ گل سے + کہ باغباں بھی ہے تاروں کی طرح مالا مال [مہدی حسین عاقل]

در مدح شمس الامرا ~ نظر آتی اک مہ جبیں خواب میں + کہ خورشید ہو جس کے رخ پہ نثار [بدر الدین تمیز]

در مدح کلب علی خاں ~ کس کے اوصاف کا کاغذ پہ کھلا ہے گلشن + کہ ہر اک مصرع برجستہ ہے شمشاد چمن [شاہ محمد حسن حسن]

در مدح قصیدہ ~ شفق میں مہر چھپا رشک دست رنگیں سے + خجل ہے پائے حنائی سے تیرے شعلۂ طور [عزیز اللہ خاں شیفتہ]

قصیدہ در نعت ~ ہوں عجب طائر قدسی کہ اگر کھولوں پر + ایک پرواز میں جاؤں میں دو عالم سے گزر [الہ داد طالب شیرانی]

غالب کشتہ گرو کا اعتراف مطلوب ہیں سب اہل جہاں تیر سخن سے + ہوں زلہ ربا غالب اعجاز رقم کا [احمد حسن عرشی]

در مدح ارسطو جاہ ~ بہار آئی ہے گلشن میں کیا چل رہی ہے ہوا + ہر اک غنچے نے کھول زبان ہے بہ ہوا [عباس علی عباس]

در مدح زیب النساء ~ اٹھا کے دست دعا میں نے جو سحر اک بار + جناب حق میں کہا یوں کہ ایزد غفار [فراموش]

ایضاً بتقریب ہولی باغ جہاں میں آئی ہے کہ بہار ہولی + کھیلے ہے ہو شگفتہ ہر گل عذار ہولی [ایضاً]

ایضاً بتقریب دسہرہ ~ فیض باری سے گہر بار ہے جوں ابر کرم + باغ عالم میں ہے ہر تختۂ گل رشک ارم [ایضاً]

در مدح نواب ظفریاب ~ آپ کا وصف جو کرے نہ رقم + تو زبان قلم کروں میں قلم [ایضاً]

منقبہ حمد ~ خاک و باد و آب و آتش کو فراہم کر دیا + دم میں پیدا صانع قدرت نے آدم کر دیا [ہیڈرلی آزاد]

در مدح حامیوں ~ زہے نصیب ازل میں ہوں بے تردد و بیم + نہ آرزوئے بہشت ہے نہ خوف جحیم [ایضاً]

در مدح نواب علی محمد ~ عروج پر ہے مری آہ کی شرر کاری + کرے ہے خرمن گردوں پہ صاعقہ باری [ایضاً]

در مدح ناصر ہیڈرلی ~ پھر سینہ تپ غم میں ہے مجمر سے زیادہ + جو لخت ہے دل کا سو ہے اخگر سے زیادہ [ایضاً]

براد رخورد

در مدح مہاراجہ جیاجی راؤ سیندھیا والئی گوالیار ~ کس لئے ہے تجھ کو اے دل انتظار فصل گل + ہے مہاراجہ کی محفل میں بہار فصل گل [ایضاً]

راجہ شیو دھان سنگھ والئی الور ~ جاؤں اب جنت سے وحشت میں پہاڑوں کو نکل + سر شوریدہ ہے مخصوص پئے تیشہ جبل [ایضاً]

نواب عبدالرحمن خاں والئی جھجر ~ داورا اپنے احوال کو کیا عرض کروں + بے طرح پنجۂ بیداد فلک میں ہوں اسیر [ایضاً]

نعتیہ قصیدہ ~ اے سرور دو کون شہنشاہ ذی اکرم + سر خیل مرسلین شفاعت گر امم [بہادر شاہ ظفر]

در مدح شمس الامرا امیر کبیر ~ خفا ہوئے جو ابروؤں میں ڈال گرہ + کبھی نہ کھول سکے ناخن ہلال گرہ [شمس الدین فیض]

در مدح نواب کلب علی خاں ~ خسرو دوراں فریدوں فر سکندر منزلت + حسن میں یوسف حکومت میں سلیمان زماں [محمد زکی زکی]

در منقبت کھلا ہوا ہے سر طور لالہ حمرا + تجلیوں نے کیا ہے مکان طور پسند [مہدی علی خاں خفیف]

در مدح نواب بہاولپور ~ ہے ان دنوں میں یہ کیسی بہار عالمگیر + کہ ہے شگفتہ خوشی سے دل وزیر و امیر [اوغلانقوا کبر]

قصیدہ ریختی ~ دیا دوشالے کے سائیں کو اے لو اکشمیر + ملے ہے شال کی بدری جو مانگے اک مملی [بیار علی جان صاحب]

در مدح طوائف ~

ترجمہ در ہیئت قصیدہ نعتیہ بلگوش ~ گر وا جسمی پوچھو تو وہی نکلے گا باقی + جب دفتر امکاں کی رقم خرچ میں آئی [سبتش پرشاد حقر]

علی خاں مختار الملک اول ــــ سہ بر ہو نعاش عمر زمانہ جو وہ بلند اقبال + ہزار ماہ کا ہے ماہ لاکھ سال کا سال [سرفراز علی شیفتہ]

تہنیت نواب کلب علی خاں سہ چمک ہے اس کی بجلی آب اس کا نوح کا طوفاں + زہے قدرت خدا کی ایک جا ہے آگ اور پانی [علیم اللہ خاں رضا]

مدح رنبیر سنگھ جنت مقر سہ ہوائے باغ جہاں میں ہے آج یہ تاثیر + کہ عطر بیز ہوا ہے ہر ایک گل تصویر [عنایت حسین کیفی]

اسپ ممدوح سہ نکل کے جانے میں پیک صبا سے نازک تر + پلٹ کے آنے میں آواز کوہ کی سرعت [دلاور علی دلاور]

نعتیہ قصیدہ سہ جیوں تو ساتھ سگان حرم کے تیرے پھروں + مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار [قاسم نانوتوی]

در مدح ملکہ وکٹوریہ سہ آج کس بات کی ہے عید نہ ہے چرخ کہن + تہنیت کی جو صدا ہند سے پہنچی لندن [محمد ہاشم ہاشم]

در مدح نظام حیدرآباد سہ بخت رسا خوب ہوا اوج پذیر + ہو گیا در کلاہ سر خورشید منیر [عیش]

منگل سنگھ والئی الور سہ سنا ستائش گر ہوں کس ہم بزم و ہم رزم سکندر کا + کہ میداں کم ہے شب دیز قلم کو عنان کشور کا [ہیرا لال شہرت]

نعتیہ قصیدہ سہ دشت وحدت میں پھر جست جو آہوئے قلم + پھر تو شرمندہ نظر آئیں غزالان حرم [حضور احمد آثم]

در مدح والئی کشمیر سہ واہ کس شان سے ہے آج میان گلشن + شاہ گل جلوہ نما بر سر اورنگ چمن [شیو ناتھ منتظر]

والئی ریاست پنجاب سہ کیا بہار نے پھر عرصہ جہاں میں ظہور + بنا دیا روئے زمیں کو تمام عالم نور [محمد محسن متین]

نواب کلب علی خاں سہ نالے نغمے ہوئے جاتے ہیں لب بلبل پر + کس لیے عمر نہ زمانہ میں پھر کے خاک بسر [عنایت اللہ خاں راسخ]

مدح مفتی میر عباس سہ وصف حق کا بہ تصور میں کل عنواں آیا + دیدۂ مور میں کب ملک سلیماں آیا [ماہتاب الدولہ پنہاں]

در حمد و نعت سہ مقصد کن فیکوں ناسخ ادیان و ملل + ادب آموز جہاں جوہر عقل اول [میر محمد حسین فرحت]

در مدح مختار الملک اول سہ آنکھیں ملتا ہوا جو صبح اٹھا خواب سے کل + دیکھتا کیا ہوں کہ ہے رنگ جہاں رنگ محل [منظور علی تسکین]

در مدح دلیر الدولہ عبد الحق

میں نے زور طبیعت پہ کیوں نہ ہوں مغرور + اسی کی وجہ سے عالم میں ہو گیا مشہور [محمد عسکری عادل]

ایضاً باغ عالم میں نئے رنگ سے آئی ہے بہار + تہنیت گو ہے کوئی برگ ہوا میں ہر خار [ضیاء احمد دلیر]

ایضاً کیوں دل بے قرار کیا ہے شتاب + ٹھہر باقی ہے رخصت احباب [محمد یعقوب سخنور]

مجموعی جائزہ

ہندوستان میں مرکزی بادشاہت (علامتی) کے خاتمے کے بعد اردو قصیدہ ریاستوں میں پروان چڑھا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے شعرا نے بھی اس صنف میں دلچسپی لی۔ ریاستی نوابوں نے اپنے محلات اور تاج و تخت کو مرکزی بادشاہتوں کی تقلید ہی میں آراستہ و پیراستہ کیا انہوں نے بھی مختلف تقریبات (تاجپوشی، سالگرہ، تولد فرزند، میلاد، ہولی، دسہرہ، عید، عید قربان، شادی) کو بڑے جوش و خروش اور شان و شوکت سے منایا۔ ان کے درباروں میں بھی شاعر ملازم ہوا کرتے تھے یا اگر ملازم نہیں بھی ہوتے تھے تو مختلف تقریبات میں بلوائے جاتے تھے۔ اور انہیں وہاں قصائد پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ ریاستی نواب چونکہ انگریز حکمرانوں کے تابع تھے اس لیے وہ بعض انگریزی تقریبات بھی منایا کرتے تھے۔ یا ان کے درباری یا مقرب شعرا انگریز حکمرانوں کی آمد و رفت (ریاست میں) یا بڑے انگریزی سرکاری جشنوں میں قصائد پیش کیا کرتے تھے۔ دورِ قدیم ہی سے ریاستوں سے شعرا وابستہ رہے ہیں مگر دورِ جدید میں مرکزی بادشاہت کے خاتمے کے بعد ریاستیں شاعروں کی بڑے پیمانے پر پناہ گاہیں ثابت ہوئیں

میں حیدر آباد، رامپور، بھوپال، الور، ٹونک، منگرول، جاورہ، جے پور، دوجانہ، سرونج، کچھ، بیکانیر، بلرام پور، سورٹھ، بیگن پلی، جودھپور، محمود آباد، جوناگڑھ، فرید کوٹ، مالیر کوٹلہ، پٹیالہ، دواس یا ننی، جھجر اور بہاولپور کے علاقوں میں اردو قصیدہ نگاروں نے پناہ لی۔ ان علاقوں کے نوابوں، راجاؤں، امیروں اور رئیسوں نے ان کو ملازمتیں بھی دیں اور انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ ان ریاستوں اور علاقوں میں اس عہد کے ہندوستان کے مختلف قریوں سے شعرا جمع ہوئے[1]

---

[1] اسیر، جلال، امیر، آرزو، بحر، وفا، ریاض، نظام، تسلیم، صفیر، منیر، صفدر، گستاخ، انس، شاغل اور آغا حجو وغیرہ رامپور سے متعلق ہوئے، دوست، مشیر، بیں، بہجت، جمیل، فضل رب نے بھوپال سے تعلق جوڑا، تصویر، تشنہ، انور، عاصی الور پہنچے، ٹونک سے متعلق شعرا میں بسمل، مضطر، کیف، ضبط، شرف اور خلش کے نام لیے جا سکتے ہیں، نواب منگرول سے احسان اور شوق کا رابطہ رہا، جاورہ سے غوث محمد جے پور سے ظہیر، محمد بشیر خاں، محمد عثمان عز دوجانہ سے راسخ، سرونج سے خاک کچھ سے راضی، بیکانیر سے عاشق، بلرام پور سے خلیل، سورٹھ سے خبر بیگن پلی سے بے خود موہانی اور ہشیار، جودھپور سے بے خود بدایونی۔ محمود آباد سے صفی لکھنوی جوناگڑھ سے شمشاد فرید کوٹ سے راکب مالیر کوٹلہ سے صمیم اور بے خود حمید الدین، پٹیالہ سے سلمان، محسن، رضی، راحت وغیرہ کی وابستگی کی خبر ملتی ہے

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں " اردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دل عزیز رہی اور امرا اور رؤسا کے درباریوں میں اس کی ترقی اور نشو و نما ہوئی۔ دلی، حیدر آباد، لکھنو اور رامپور شاعری کے مرکز رہے اور یہیں کے فرمانرواؤں نے اردو شاعری کو پروان چڑھایا مگر درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت میں مترتب ہوا۔ نفع ان معنی میں کہ شعرا کو ان کی جانکاہی کے سلسلہ میں انعام و اکرام خوب دیا گیا اور ان کی محنت ٹھکانے لگی، نقصان اس صورت میں کہ مضامین شاعری محدود ہو کر رہ گئے "(1)

۱۷۵۷ء کے بعد دہلی، لکھنو، فرخ آباد، عظیم آباد، ٹانڈہ، مرشد آباد، حیدر آباد وغیرہ کے مراکز میں اردو شاعری اور شعرا کی نشو و نما اور قدر دانی ہوئی ۱۸۵۷ء کے بعد مٹیا برج کلکتہ، ٹونک، منگرول، بھوپال، رامپور وغیرہ میں شاعری اور شعرا کی خدمت ہوئی۔ حیدر آباد میں تقسیم ہند و پاک تک نوابین شعرا کی سرپرستی کرتے رہے۔ مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ کی زیر نگرانی ادبی اور شعری صحبتوں کا اہتمام ہوتا رہا، ٹونک میں نواب محمد ابراہیم علی خاں، منگرول میں نواب حسین میاں بہادر بھوپال میں نواب جہانگیر خاں، نواب سلطان جہاں بیگم، رامپور میں نواب یوسف علی خاں، نواب کلب علی خاں، سید حامد علی خاں وغیرہ نے اردو شاعری اور شعرا پر خصوصی توجہ دی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بہادر شاہ ظفر معزول ہو کر رنگون بھیج دیئے گئے۔ واجد علی شاہ کو کلکتہ میں محصور کیا گیا، شعر و سخن کی محفلیں اجڑ گئیں اور بقول رام بابو سکسینہ اس حالت میں " شعر و سخن کا کیا خاک خیال آتا جب جان و مال کے ساتھ عزت اور آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی اپنی اسباب ہے اور اسی حالت میں لکھنو اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اکثروں نے رامپور کا رخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنو سے قریب تھا پھر وہاں کے والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدردان اور مربی تھے کچھ لوگ حیدر آباد پہنچے کچھ اطراف و جوانب کی ہندوستانی ریاستوں مثلاً الور، جے پور، بھرت پور، پٹیالہ، کپور تھلہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے، اسلامی ریاستوں میں یعنی ٹونک، بھوپال، منگرول، کاٹھیاوار، مالیر کوٹلہ اور بہاولپور نے بھی اکثر خانماں برباد شاعروں کو اپنی طرف کھینچا چنانچہ کچھ تو یہاں کے درباروں میں نوکر ہو گئے اور کچھ ان ریاستوں میں رہ کر وہاں کے والیان ملک کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہونے لگے(2) ان ریاستوں کے علاوہ پنجاب اور سندھ میں بھی اردو قصیدہ گو شعرا خاصی تعداد میں ملتے ہیں،(3)

ریاستی ماحول میں قصیدے کی صنف پر خاص توجہ ہوئی۔ ریاستوں میں ہندوستان

---

(1) تاریخ ادب اردو ص ۳۰ رام بابو سکسینہ ص ۳۰ (2) ایضاً ص ۲۵۹

(3) پنجاب میں احمد بخش کھرل، امر ناتھ اکبری، نور احمد چشتی، محرم علی چشتی، منتظر، نکہت، نایاب، سرور، حیرت اور فیروز اور سندھ میں مائل، ضیاء الدین، مشتری، ساغر، قلیچ، ضیا، فتح انعام گدا، محسن اور احسن کے نام لیے جا سکتے ہیں

روایتی مزاج کے شعرا پر
کے مختلف علاقوں سے آنے والے شعرا اپنے علاقائی اثرات بھی اپنے ساتھ لائے ۔ البتہ آخر دہلوی اور لکھنوی
مکتبِ فکر کے شعرا کے رنگ ہر جگہ غالب رہے۔ لکھنوی قصائد میں خارجی زندگی کی مصنوعی نقاشی پر خاصا
زور صرف ہوا ہے۔ وہاں کے تعیش پسندانہ ماحول نے رقص و سرود کی محافل اور شاہدانِ بازاری کا عروج
شاعری میں نشاطیہ عنصر کو داخل کیا۔ لکھنؤ میں تہذیب و شائستگی کے مخصوص معیارات بنے ہوئے تھے،
وضعداری، نازک مزاجی، تماش بینی، عورت پرستی، کھیل تماشوں سے دلچسپی، میلوں ٹھیلوں سے رغبت
تراش خراش کی باریکیوں اور حواشی فارغ البالی وغیرہ کے ماحول کا لکھنوی شاعری پر خاصا اثر تھا۔ لکھنوی قصائد
میں نشاطیہ اور حسی عناصر اسی ماحول کا نتیجہ ہیں۔ علاوہ ازیں لکھنؤ میں مذہب اثنا عشری کا دور دورہ
تھا اس لئے قصائد منقبت بھی بڑے پیمانے پر لکھے گئے۔ لکھنوی عوام لباس اور وضع قطع میں نئی نئی
تراشوں کے قائل تھے۔ ان کا مخصوص جمالیاتی مزاج تھا۔ وہ موسیقی اور دیگر فنون میں نزاکتوں کو رواج
دیتے تھے۔ ان کی شاعری اور قصائد سے ان کے مذہبی معتقدات کا سراغ بھی ملتا ہے۔[1]
لکھنوی شاعروں کو شاعری میں بھی نئی نئی ترکیبیں داخل کرنے کا شوق تھا۔ ان کے قصائد میں ہندی اور
اسلامی ماحول کی آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری تزئین و آرائش اور تہذیب و شائستگی کے عناصر
سے مملو ہے۔ یہ شعرا رعایت لفظی، بندش کی چستی، زبان کے نئے آہنگ، محاورات کے استعمال کی
خوش سلیقگی وغیرہ کو پسند کرتے تھے ان کے قصائد میں فصاحت کی جگہ بلاغت اور سلاست و سادگی کی جگہ
تصنع کا عنصر غالب ہے۔ لفظی گورکھ دھندوں میں الجھانا، صنعت گری سے رغبت رکھنا ان کے مزاج
کا حصہ تھا۔ قصیدہ میں عجمی قصیدہ کے ہیئتی اور موادی اطوار کی پیروی تو کی گئی ہے مگر اس میں
شعرا کا مقامی رنگ بھی چوکھا نظر آتا ہے۔

دہلوی قصائد میں شعرا نے زندگی کے حقائق پر نظر رکھی ہے۔ ان کے ماحول میں قتل و غارتگری
کی بدولت پیدا ہونے والے المیہ عناصر کی کمی نہیں تھی۔ دہلوی قصیدہ نگار شعرا نے فطری مظاہر اور
کائنات کے حسن و جمال کا تذکرہ رکھ رکھاؤ اور کلاسیکی توازن سے کیا ہے ان کے ہاں حقیقت نگاری
کے عناصر بھی مل جاتے ہیں۔ خوشامد اور پیشہ ورانہ مدح پر انہوں نے زیادہ زور صرف نہیں کیا
یہ شعرا قصیدہ میں بلند آہنگ اسلوب تو اختیار کرتے تھے تاہم غلو اور اغراق سے بچتے تھے۔
ان کے قصائد لسانی اعتبار سے صاف اور برجستہ ہیں۔ وہ صنائع لفظی و معنوی کے استعمال
میں افراط و تفریط سے کام نہیں لیتے تھے۔ لفظی بازیگری، پھبتی اور خوشامد پسند انداز بھی
ان کے ہاں زیادہ نہیں ہے۔ ان کے مذہبی قصائد خلوص، صداقت اور عقیدتمندی کا نمونہ ہیں

ریاستی ماحول کے قصائد میں مذکورہ بالا دونوں رنگ کبھی علیحدہ علیحدہ اور کبھی
باہمدیگر پیوست نظر آتے ہیں۔ ریاستی شعرا نے رسومات، عیدوں اور جشنوں پر
کثیر تعداد میں قصائد لکھے ہیں۔ ان میں رعایا اور حکمران کے رابطی تعلق پر بہت زور دیا گیا ہے

۱؎ ایضاً ۔ ص

ریاستی قصیدہ نگار شعرا نے ریاستوں کے مقامی ماحول کی نقشہ کشی کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں ہونے والی علمی، سائنسی، تعلیمی اور تہذیبی ترقی کی تصویریں بھی مہیا کی ہیں۔ ریاستی ماحول کسی حد تک قصیدے کے لئے سازگار بھی تھا۔ شخصی حکومت اور ادب دوست نواب ہوں اور قصیدے کی ترقی نہ ہو یہ کیسے ممکن تھا۔ تاہم اس دور میں نوابوں کے پاس دولت کی فراوانی نہیں تھی اس لئے شعرا کو ملنے والے صلے گراں بہا نہیں تھے۔ ریاستی قصیدہ نگاروں نے دہلوی اور لکھنوی رنگوں کے امتزاج سے بننے والی روایت سے استفادہ کیا۔ ان کے قصائد میں مقامی پرندے، ماحول، پھول، پھل، تہوار، موسم وغیرہ کا تذکرہ بھی مل جاتا ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ دور اردو کی پختگی کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعروں نے قصائد میں اسالیبی شان و شوکت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ تسلسل بیان، واقعہ نگاری اور بیانیہ انداز کے حوالے سے اس دور کے شعرا کے قصائد نظمیہ تاثیر لئے ہوئے ہیں۔ منیر شکوہ آبادی نے قصیدہ کی صنف کو نئے ذائقوں سے آشنا کیا۔ ان کے قصائد پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم قدیم عربی قصائد کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں مدح سے زیادہ منظر نگاری، ماحول نویسی، داستان گوئی اور کوائف و احوال کے بیان پر ساحرانہ انداز سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ریاستی قصیدہ گو شعرا نے ممدوحین کی تعریف میں راہوار تخیل کو بگٹٹ ہونے سے بچایا ہے

ریاستوں سے منسلک قصیدہ نگار شعرا نے اپنے قصائد میں مصنوعی نقاشی بھی کی ہے فنی نزاکتوں اور باریکیوں پر زور بھی صرف کیا ہے۔ ان میں مقامی ہندی اور علاقائی ماحول کا اظہار مہذب اور شائستہ انداز سے ہوا ہے۔ فصاحت، بلاغت، سلاست، سادگی، تصنع، لفاظی، صنعت پسندی، صفائی، برجستگی، خلوص، صداقت، عقائد اور عقیدت مندی کی ملی جلی صورت حال نے اس دور کے قصیدے میں تاثیر پیدا کی ہے۔ تاہم مدحیہ حصوں میں موجود مدحیہ موضوعات کی یکسانیت سے یہ شعرا بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے۔

یہ دور چونکہ ہندوستان میں مسلم اقتدار کے زوال کا دور تھا۔ شاعروں نے سیاسی، ذاتی اور اقتصادی پریشانیوں سے نجات پانے کے لئے حمد و نعت و منقبت کے قصائد کی جانب بھی رجوع کیا۔ اس زمانے میں آئمہ، صوفیا، علما اور مرشدوں کی تعریف میں بھی بلند پایہ قصائد رقم ہوئے ہیں۔

—

باب ہفتم

عہد جدید میں اردو قصیدہ

فصل اول : اہم قصائد نگار

فصل دوم : نئے قصیدہ نگاروں کا ذکر

فصل سوم : اختتامیہ

فصل اول اہم قصائد نگار

جدید دور کا اردو قصیدہ اپنے بطن میں نئے موضوعاتی خزینے سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ دور حالی کے اصلاحی خیالات سے شروع ہوتا ہے۔ حالی نے قصائد کے لئے جو معیارات مقرر کیے تھے بہت سے قصیدہ گو شعرا نے ان پر عمل کیا۔ اس دور کے غیر روایتی قصائد میں ہمیں زمانے کے احوال کی مفصل تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ قومی، ملی اور بین الاقوامی معاملات پر قصیدہ نگاروں نے اظہار خیال کیا ہے۔ حالی نے قصیدے کو ایک نیا رنگ و آہنگ دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے مدح کو جدید خیالات کی روشنی میں نئی جہتیں دیں۔ ان کا قصیدہ الخیاشیہ ملی جذبات کا عکاس ہے۔ حالی چاہتے تھے کہ قصیدہ محدود دائرے سے باہر آئے وہ اسے افادی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جدید دور میں جب نوابوں اور جاگیرداروں کی جھوٹی مدح کے رجحانات کم ہوئے تو قصیدے میں ایک نوع کی سچائی اور صداقت کے اظہار کا احساس ہوا۔ مذہبی قصائد میں تسنن و تشیع کے خیالات بدستور موجود رہے۔ اور مقامی علاقوں کی تہذیب اور ماحول سے بھی شاعروں کا تعلق قائم رہا۔

جدید دور میں درباری قصیدہ سسکیاں لیتا رہا۔ اس صنف کو آج کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ تاہم اس کے تاریخی اور تہذیبی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس دور کے قصیدہ نگاروں میں محسن کاکوروی، داغ دہلوی، ضامن علی جلال، کاظم حسین شیفتہ، حبیب کنتوری، سرور جہاں آبادی، عبدالغفور خرغام، ظہیر الدین ظہیر، امیر اللہ تسلیم، عبدالحی بے خود، شبلی نعمانی، منور خاں گوہر، الطاف حسین حالی، محمد اسماعیل میرٹھی، احمد رضا بریلوی، آغا جان احسن، صفدر علی صفدر، قادر بادشاہ، ابو شرف خیدری، کاظم حسین محشر، علی حیدر نظم، ریاض خیر آبادی، عزیز لکھنوی، عزیز صفی پوری، عبدالرحمن شاطر، علامہ محمد اقبال، گوری پرشاد ہمدم، محمد ہادی عزیز، مہاراجہ کشن پرشاد، اقبال سہیل، جلیل مانکپوری، نظام الدین نظامی، علی نقی صفی، وحید الدین احمد بے خود، معشوق حسین اطہر، ظفر علی خاں، سرفراز احمد سہیل اور نجم حسین نجم آفندی خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان قصائد نگار شعرا کے علاوہ اس دور کے اور بھی بہت سے شعرا ہیں جن کا اس باب میں مختصر اندراج ہے۔ ان کا اندراج ریکارڈ کے طور پر لیا گیا ہے۔ یہ شاعر ان میں طالب ہمدانی، صوفی افضل کھیم کرنی، سرور سہارنپوری، حافظ لدھیانوی، علیم ناصری، اصغر علی شاہ، اصغر حسین نظیر لدھیانوی، عزیز الرحمن، عبدالحق شوق، عبدالعزیز الدہ، ونا تابش اور خالد انور کے قصائد اہمیت رکھتے ہیں۔

جدید دور کے قصیدہ نگار شعرائے ان انگریز حکمرانوں کے قصائد کی خاصی تعداد میں دستیاب ہیں۔ انگریز حکمران بھی رعایا کے ساتھ متعلق رہنا چاہتے تھے اس لیے وہ وقتاً فوقتاً مختلف مجالس اور جشن برپا کرتے رہتے تھے ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار منعقد ہوا ۱۸۶۹ء میں انبالہ دربار اسی طرح ۱۹۰۳ اور ۱۹۱۱ء میں بھی انگریزوں نے اپنے دربار منعقد کروائے۔

اہل انگلستان تاجپوشی کی رسم بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ وہ اسے مذہبی رسم کے طور پر ادا کیا کرتے ہیں اس ضمن میں زمانہ کانپور دربار نمبر ۱۹۱۱ میں چھپنے والے ایک مضمون کا اقتباس خالی از لطف نہیں ہے ملاحظہ ہو "انگلستان میں تاجپوشی ایک مذہبی رسم سمجھی جاتی ہے اور اس کی جزوی رسمیات بہت کچھ بائبل کی آیات و روایات متعلق بنی اسرائیل سے اخذ کی گئی اور حضرت سلیمان کے رسمیات تاجپوشی کے مشابہ ہیں۔ ہزار برس کے قریب ہو گئے اس کی جزئیات میں بھی فرق نہیں آیا ــــ

پہلے برٹش بادشاہ کی تاجپوشی میدان سالسبری کے متصل مشہور اسٹونہنج پر عمل میں آئی تھی۔ انگلو سیکسن بادشاہوں میں سات کی تاجپوشی کنگس اسٹون میں ہوئی۔ بعض سیکسن بادشاہوں کی تاجپوشی ونچسٹر کیتھیڈرل اور سینٹ پال کے گرجا میں ہوئی۔ ہیرلڈ ثانی کی تاجپوشی ولیسٹ منسٹر ایبی میں جنوری ۱۰۶۶ء کو ہوئی اس زمانے سے اب تک کل شاہان انگلستان نے اس متبرک رسم کو اسی مقدس گرجا گھر میں ادا کیا ہے۔ آٹھ سو سال سے زائد ہوئے کہ شاہان انگلستان اس میں تاجپوش ہوتے ہیں اور اسمیں دفن کیے جاتے ہیں

۲۲ جون ۱۹۱۱ء کو جارج پنجم بھی یہیں تاجپوش ہوئے گانیوالوں کے حلقوں اور عبادت گاہ کی بیچ کی جگہ میں جو تھیٹر کہلاتی ہے عجب پر لطف نظارہ تھا، گہرے نیلے رنگوں کے قالینوں کا فرش بچھا تھا اور گیلریوں میں گلکاری کے نیلے پردے پڑے تھے۔ گانیوالوں کے حلقہ کے برابر ایک بلند اور عالیشان چبوترہ ملک معظم اور ملکہ معظمہ کے واسطے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اس پر چڑھنے کے لیے پانچ زینے تھے کچھ دور پر تاجپوشی کی کرسی رکھی تھی جس میں اسکاٹ لینڈ کا مشہور مقدس پتھر "The Stone of Destiny" لگا ہے

شہنشاہ کی رسم تاجپوشی میں سات ہزار افراد نے شرکت کی ان کی نشستیں درجہ بدرجہ اوپر دور دور جگہ پر رکھی تھیں لارڈ ڈ، پارلیمنٹ کے ممبر، امرائے سلطنت، بحری و بری فوج کے افسر ان کی بیگمات، سفیران غیر ممالک، وزرائے سلطنت، مقتدایان دین، بارہ گرجا گھروں کے چیپلن Chaplain، شاہی عبادت گاہ کے ڈین وغیرہ نے اس میں شرکت کی اس میں انگلستان کے ہندوستان، جنوبی افریقہ، کینیڈا اور آسٹریلیا وغیرہ کے نمائندے بھی شامل ہوئے اور یہاں پوری مذہبی کیفیت اور شاہی تزک کے ساتھ بادشاہ کی تاجپوشی کی گئی۔۔ ہندوستان کی سرزمین پر جنوری ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے ایک دربار منعقد کیا اور اس میں اس شان و شوکت کا اہتمام کیا گیا جو مغل بادشاہوں سے مخصوص تھی

اس کی تفصیل کے لئے دیکھیے سرزمین ہند میں برطانیہ عظمیٰ کا دربار از رام سرن نگم ص ۵۹ زمانہ کانپور ۱۹۱۱

جشن تاجپوشی کی رسم بڑی پرانی ہے جشن جمشیدی، نوشیرواں، جشن اشوک، جشن ہرقل

جشن بونا پارٹ، جشن پیٹر اعظم، جشن بابری، جشن اکبری، جشن جہانگیری، جشن شاہجہانی

جشن بکرماجیتی، جشن وکٹوریہ، جشن ایڈورڈ[1] وغیرہ بڑے تزک و احتشام سے برپا ہوئے

ان جشنوں پر کثیر رقمیں خرچ ہوئیں۔ بادشاہ اپنے جشن اس لیے مناتے تھے کہ ایک تو رعایا

انہیں تاجپوشی کی سند دے اور دوسرے ان کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کا مظاہرہ بھی

ہو سکے۔ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر بھی شعرا نے قصائد لکھے۔ اس سے قبل بھی

جارج سوم، ملکہ وکٹوریہ اور ایڈورڈ ہفتم وغیرہ کے جشنوں پر بہت سے فقائی شعرا نے

قصائد پیش کیے تھے۔ رضا علی وحشت کلکتوی نے لکھا[2]

؎ ہوئی ہے آج دہلی بخت سے تو کامراں کیا کیا + کرے گا ناز تیری خاک پر ہندوستاں کیا کیا

اسی جشن تاجپوشی کی تہنیت محمد اقبال نے یوں دی ہے[3]

؎ ہمائے اوج سعادت ہو آشکار اپنا + کہ تاجپوش ہوا آج تاجدار اپنا

اسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں کی + اسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا

اسی سے عہد وفا ہندیوں نے باندھا ہے + اسی کے خاک قدم پر ہے دل نثار اپنا

انگریز حکمرانوں کے قصائد لکھنے ہوئے ہمارے شعرا نے ان کی شان و شوکت، انصاف، نظم و نسق،

امن و امان، علوم و فنون، تہذیب، تمکنت، رعب داب، فیضان، عزو احترام، جاہ و جلال

فیاضی، کروفر وغیرہ کے حوالے سے اشعار لکھے۔ ان کے حق میں دعا بھی کی اور ان کی اطاعت کا

اعادہ بھی کیا۔ انہیں شاعروں نے شہ داد گر، عدل گستر، پاسبان، سایہ، عادل، سخی اور

کرم فرما وغیرہ کے الفاظ سے پکارا ہے۔

قدیم و جدید دواز انگریزوں کی شان میں محمد رفیع سودا، انشاء اللہ خاں انشا، شیر علی افسوس، شاہ نصیر

اسد اللہ غالب، اصغر علی نسیم، غلام مولیٰ قلق، مظفر علی اسیر، غلام حسنین قدر بلگرامی، بال مکند صبر

بہاری لعل راضی، مرزا لطف علی خاں ولد، مرزا جان طپش، حیدر بخش حیدری، فضل رسول خاں واسطی

فصیح الدین رنج، فدا حسین فدا، محمد ہاشم ہاشم، محمد محسن متین، محمد حسین آزاد، ظہیر الدین ظہیر

الطاف حسین حالی، عبد الحلیم آسی، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، محمد اقبال، گوپال پرشاد ہمدم

جلیل مانکپوری، نظام الدین نظامی، وحید الدین احمد بے خود، دیبی پرشاد سحر، فخر الدین سخن

سید محمود آزاد، مشتاق الہ آبادی، عبد الحمید میرٹھی، نذر محمد نذر، مولوی محمد فضل رب، دوارکا پرشاد افق

---

(1) رسالہ ادیب جنوری ۱۹۱۲ء (2) زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۱۱ (3) ایضاً سرورق

کلیم، نادر علی نادر، صبر دہلوی، ممتاز الرحمن بدنا) امین الدین فنجر، پیارے لال رونق، محمد حبیب اللہ محمد کرم الدین دبیر، سید محمد آثم، بلدیو کشن خورشید، سہاگن بیگم، محمد عمر سبحانی، مولوی محمد سعید علو، مصطفیٰ رسا، خوش محمد ناظر، شفق عماد پوری، تلوک چند محروم وغیرہ نے قصائد لکھے ہیں ①

زندگی اور زمانہ کے ہمہ وقت جاری و ساری عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت نئی نئی چیزیں، خیالات اور معیارات وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جدید دور میں ہمارے شعرا کے جذبات و احساسات، رجحانات و میلانات، طرز فکر اور زاویہ ہائے نظر میں توسیع و تنقیح ہوئی، ہمہ وقت متغیر اور متحرک زمان نے ان کو نئی سوچوں اور تازہ خیالوں سے آشنا کیا۔ ان کے طرز احساس اور طرز اظہار میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس دور میں ہمارے شعرا یورپی شاعری کے مختلف دبستانوں سے مستفیض ہوئے۔ رومانویت، حقیقت پسندی، علامتیت اور ہیئت پرستی کی تحریکوں سے استفادہ کیا جانے لگا، قدیم میکانکی ادبی اسلوب کی جگہ نیا معنویت سے مملو اسلوب اپنا راستہ ہموار کرنے لگا، روسو کے خیالات کے زیر اثر فطرت پسندی کے خیالات پھیلے، ورڈز ورتھ، کالرج، شیلے وغیرہ کی تقلید میں زندگی اور معاشرے کو از سر نو خلق کرنے کی باتیں ہونے لگیں، فرد اور فردیت کے تحفظ کے نعرے لگے، حکومت، اخلاق، مذہب، رسم و رواج اور تہذیبی اقدار کی نئی تشریحات سامنے آنے لگیں۔ ہیگل، مارکس، ڈارون، فرائڈ، ایڈگرایلن پو، بادلیر، رامبو، میلارمے وغیرہ کے خیالات سے فکر و فلسفہ اور شعر و ادب کی دنیا میں جو انقلاب پیدا ہو رہے تھے ان کے اثرات بھی۔ اردو شعر و ادب پر مرتب ہونے لگے (فکر و فلسفہ کی مذکورہ تبدیلیوں کی جانب شاطر مدراسی کے قصائد میں اشارے موجود ہیں) شاعری میں انسانی روح کی عظمت، بالادستی، ذاتی شناخت اور من و تو کے رشتوں کے تذکرے ہونے لگے چونکہ اردو قصائد میں اگرچہ فرانس کے علامت پسندوں کے خیالات اور اظہاری رنگ نظر نہیں آتے تاہم رومانویت اور دیگر جدید تحاریک کے نتیجے میں جنم لینے والے افکار کی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔

اس دور میں شخصی اور مدحیہ قصائد زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ مذہبی قصائد کی جانب شاعروں نے بھرپور انداز سے توجہ دی۔ انجمن پنجاب کی تحریک نظم نگاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نظمیہ خیالات، اصلاحی رجحانات اور حقیقت پسندانہ اظہار شاعری کا حصہ بنا، اردو شعرا نے سادگی، سلاست اور واقعیت کے رجحانات اپنائے۔ قصیدہ گو شعرا کے ہاں بھی سادگی، سلاست اور واقعیت کے رجحانات کا دورہ دورہ ہوا، قومی تحاریک (مسلم لیگ کی جدوجہد، تحریک خلافت، آزادی کے لئے ہونے والی کوششیں، اخلاقی، اصلاحی اور

ان شعرا کے حوالوں کے لئے دیکھئے ضمیمہ اور خصوصی مطالعہ،

پروگرامز، تحریک اصلاح رسوم)، تحریک تنظیم[4]، تحریک توحید خالص[3]، تحریک ہجرت[1]، ذہنی فکر کی تجدید کی تحریک[5]) وغیرہ نے اردو شاعری پر گہرے اثرات ڈالے (ان سے قبل سرسید تحریک اور حالی کی شعر و ادب میں اصلاح کی تحاریک نے بھی شاعری کو متاثر کیا تھا) جدید قصیدہ نگار شعرانے اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنے قصائد میں منعکس کرنے کی سعی بھی کی۔ اس دور میں مذہب، سیاست، اخلاق، اصلاح، تہذیب نفس، مذہبی اور قومی احیا، روشن خیالی، آزادہ روی، شاعر کی شاعرانہ ذمہ داری کے موضوعات بھی اکثر و بیشتر قصائد کا حصہ بنے، مبتذل ادب اور طرز احساس کی وجہ سے گھسے پٹے اور ڈھلے ڈھلائے موضوعات سے نجات پانے کی کوشش بھی ہوئی۔ نئی معاشرتی اور تہذیبی احتیاجات کی روشنی میں قصیدہ نگار شعرانے بھی اپنا تبدیل کیا۔

تشبیب، گریز، مدح، حسن طلب، دعا وغیرہ کے اس دور کے شعرا نے بھی استعمال کیے۔ قصیدے کی قدیم روایات سے شعرانے ہیئتی سطح پر انحراف نہیں کیا۔ مواد کی تبدیلی پر اکتفا کیا۔ قصیدے کے مصنوعی اسلوب میں ردوبدل ہوا اس کی جگہ بے تکلف اظہار نے لی، مبالغہ آرائی کا قدیمی انداز بھی تبدیل ہوا۔ اب حقیقت پسندانہ انداز سے مدح کی جانے لگی، خوشامد پسندی کا رویہ بھی منتشر ہوئی، نوابی اور ریاستی شان کے ساتھ ہی ختم ہونے لگا، قصیدہ نگار شعرانے شکوہ اور بلند آہنگی کا یکسانیت زدہ ترک کرکے اپنے اپنے انفرادی اسالیب کی طرف توجہ دینے کا قصد کیا۔ اب اشیا اور علوم کے بارے میں شاعروں نے اپنی معلومات کو قصائد کے بطن میں داخل کرنے سے [illegible] اٹھایا۔ اصطلاحات کے استعمال کا رواج معدوم ہونے لگا۔ جدید عہد کے جدید مزاج رکھنے والے قصیدہ نگار شعرانے مبالغے کے ذریعے تخیل کی ان منزلوں تک رسائی حاصل کرنے سے گریز کیا جہاں دوسرے شعرا نہیں پہنچ سکے تھے۔ اب قصیدہ کا مقصد بادشاہِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنا نہ رہا تھا۔

جدید دور کے قصائد کی تشابیب میں فطری مناظر اور حقیقی کوائف کا بیان عمومی ہے۔ اخلاقی اور تمثیلی مضامین نئے دور کے اکثر قصائد کے تمہید کے حصوں کی زینت بنے ہیں۔ خیال اور موضوع کی آرائش اور ترتیبی بنت سے شاعروں نے دامن چھڑایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تشبیبوں میں یکسانیت اور عمومیت نہیں ہے

---

① ڈپٹی نذیر احمد، ③ سنگٹھن تحریک کے جواب میں مسلمانوں کی تحریک ④ سید نذیر حسین بہاری
② پہلی جنگ عظیم کے بعد ⑤ علامہ مشرقی

شاعر نے منظروں اور ممدوحین کے بارے میں مثالی تصویریں مہیا کرنی بند کر دیں۔ انہوں نے
منظروں کے بیان میں جزئی تفصیلات اور زمان و مکاں وغیرہ کا بھی خیال رکھا۔ جدید عہد
کے شعرا نے قصائد میں دنیاوی ممدوحین کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملائے
ممدوحین کی انفرادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ــــــــ (وہ شعرا اس زمرے میں نہیں
آتے جنہوں نے عہد جدید میں بھی قصیدے کے کلاسیکل معیارات ہی کو پیش نظر رکھا)۔ اب
بادشاہ اور سرپرست کا خوف شاعروں پر مسلط نہیں رہا تھا اس لیے جدید مزاج کے حامل
قصیدہ نگار شعرا کے یہاں خلوص، صداقت اور سچائی کے رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں
جدید قصائد میں کذب و افترا کے رجحانات خال خال ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔
اصلاحی و اخلاقی تحاریک کے نتیجے میں جو منطقی
استدلال اور خطابیہ یا واعظانہ رنگ شاعری کی اقلیم میں داخل ہو گیا تھا اس دور
کے قصائد اس سے بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ رومانوی تحریک کی جذباتیت اور فطرت پرستی
نے بھی ان پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ جدید سائنسی دور نے جہاں انسانی زندگی کی
نئی نئی توجیہات کی ہیں وہاں اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے فلسفہ، نفسیات
اور اقتصادیات کی مختلف الجہات تحریکوں نے تخلیق شخصیات کو بھی نئے نئے
رجحانات اور زاویہ ہائے نظر سے آشنا کیا۔ فرائیڈ کی نفسیاتی توجیہیں معاشرے
کی اقتصادی تعبیریں بھی ان کی شاعری کا حصہ بنی ہیں۔ تجزیۂ ذات اور شعور ذات
وغیرہ کے تصورات نے جدید شعرا کے فکر، جذبے اور احساسات کو وسعت دی،
حسیات کو بیدار کرنے والی ترکیبیں اور موثر الفاظ نئے دور کے قصائد میں متحرک نظر
آتے ہیں۔ عشق، نفرت، جوش، اداسی، خوشی، قوت، اعتماد وغیرہ کے خیالات
کو انہوں نے تصویری زبان میں پیش کرنے کا جتن کیا۔ تاہم یہ بھی کہا جا سکتا ہے
کہ قصیدہ کی پابندیوں اور فنی نزاکتوں کی وجہ سے جدید دور کے ماحول کی ان گنت جہتیں
قصائد کا حصہ نہ بن سکیں۔ یہ دور جدید تہذیب اور جدید سائنس کے بطن سے
پیدا ہوا ہے۔ اس میں انسانی ذات اور خارجی اشیا بڑی سرعت سے تبدیل ہوئی
ہیں زندگی میں اضطراب اور انتشار پیدا ہو گیا ہے، زندگی اور اقدار کے روایتی
اور پرانے مسلمات پر کاری ضربیں لگیں۔ ایٹم بم، جنگیں، سائنس برائے ہلاکت انسان،
تسخیر کائنات کے رجحانات کیا کچھ سامنے آیا ہے تخلیق و ایجاد کے دائرے نئی
منزلوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ رسل و رسائل کی ترقی نے دنیا کو باہم گر

ṭā ۷ ṭ

پیوست و مربوط کر دیا ہے۔ علم و فن کے مختلف شعبے ایک دوسرے پر گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں
فلسفہ لغویات اور ادب نے سائنس کی روشنی میں اپنا سفر طے کرنے کی کوششیں کی ہیں،
تشکیک اور بے یقینی کی حالت نے شاعری میں (خصوصاً جدید نظم آزاد و نثری) پریشان خیالی
کو جنم دیا۔ قدیم مابعد الطبیعات کی بنیاد میں خطرات میں گھری نظر آ رہی ہیں جہاں لباس،
آداب، اطوارِ محفل، طرزِ زندگی، فن تعمیر کے معیارات بدل چکے ہیں وہاں قدیم طرز کی شاعری
کیسے پنپ سکتی ہے۔ جدید دور میں غزل اگر زندہ ہے تو اس وجہ سے کہ اس نے اپنے
خیالات و موضوعات کو جدید ماحول اور تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ عہدِ جدید
میں در آنے والی اقتصادی بدحالی اور معاشرتی ناانصافی سے پیدا ہونے والے کرب
کے نتیجے میں عمدہ نظمیں تو لکھی گئی ہیں تاہم ان حوالوں کو منعکس کرنے والے قصائد
نایاب ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دور میں لکھے جانے والے مذہبی قصائد میں
اسلامی تہذیب و عقائد کے حوالے سے نادر اور عمدہ موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔
صدیوں کے عمل کی کانٹ چھانٹ اور تہذیب و تنقیح سے جو تہذیبی معیارات
وجود میں آئے تھے جدید دور کے قصیدہ نگاروں نے انہیں چیلنج نہیں کیا۔
اسلامی مزاج کی شائستگی اور توازن و اعتدال جدید عہد کے مذہبی قصائد میں
راسخ ہے۔ اس دور کے قصیدہ نگاروں نے نئے عہد کے شعور کا اکتساب حدود میں
رہ کر کیا ہے۔ ان کے قصائد میں مذہبی مباحث، ان کے عقائد، اخلاقی تصورات،
اپنے ماحول کے رسوم و رواج، سماجی اور سیاسی معاملات سب کچھ موجود ہے لیکن
انہوں نے توازن، اعتدال اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔
ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا
ہے کہ کلچر اور تہذیب و ثقافت میں " زندگی کے مختلف مشاغل، ہنر اور علوم و فنون کو
اعلیٰ درجے پر پہنچانا، بری چیزوں کی اصلاح کرنا، تنگ نظری اور تعصب کو دور کرنا،
غیرت و خودداری، ایثار و وفاداری پیدا کرنا، معاشرت میں حسن و لطافت، اخلاق
میں تہذیب، عادات میں شائستگی، لب و لہجے میں نرمی، روایات اور تاریخ کو
عزت و قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کو بلندی پر لے جانا شامل ہے"
اگر ہم اردو قصیدہ کے مجموعی منظر نامے پر نظر ڈالیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس
نتیجے پر نہ پہنچیں کہ اردو قصیدہ نے مسلم تہذیبی زندگی کی عکاسی کی ہے اور
اس کے ارتقاع کی کوشش کی! آئندہ صفحات میں ہم اس دور کے چند اہم قصیدہ نگاروں کا مطالعہ کرتے
ہوئے اس صنف کے جدید فنی اور تہذیبی رجحانات کا مطالعہ کر سکیں گے۔

محسن کاکوروی

محمد محسن، محسن کاکوروی [م ۱۹۰۵] عہد جدید کے قصیدہ نگار حضرات میں اپنی جدتِ طبع اور ندرتِ فن کے اعتبار سے منفرد و ممتاز ہیں۔ انہوں نے مذہبی قصیدہ نویسی میں بلند مرتبہ حاصل کیا۔ ان کی انفرادیت کا لوہا تقریباً سبھی ثقہ نقادوں نے مانا ہے[1]۔ محسن کاکوروی کے مشہور وکیل تھے۔ ان کا کلیاتِ نعت ۱۹۱۲ء (۱۹۱۵) میں نور الحسن صاحب نے مرتب کیا[2] اس میں ان کے قصائد بھی ملتے ہیں۔ محسن کے قصائد کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ان کے پانچ نعتیہ قصائد مطبوعہ حالت میں موجود ہیں۔ ان کے نام تاریخی ہیں

گلدستۂ کلامِ رحمت ؎ پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن + غنچہ ہے نافِ خدا نافۂ آہوئے ختن ۱۲۵۸ھ

ابیاتِ نعت ؎ مٹا نا لوحِ دل سے نقشِ ناموسِ اب وجد کا + دلبنانِ محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا ۱۲۷۷ھ

مدیح خیر المرسلین ؎ سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل + برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل ۱۲۹۳ھ

نظمِ دلفروز ؎ ہے منزل آرزو کی قلبِ زارِ مضطر میں + یہ مہمان عزیز اترا ہے کس اجڑے ہوئے گھر میں ۱۳۱۸ھ

انیسِ آخرت ؎ ہے بے رنگی کے آئینے میں نقشہ شکلِ انساں کا + تجلائی شانِ یہ روپ ہے کس حسن پنہاں کا ۱۳۲۲ھ

محسن کے قصائد کا مطالعہ قاری کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ وہ اس صنف میں رتبۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں[3]۔ انہوں نے تشبیہ و استعارہ کی نزاکتوں، مبالغہ و اغراق کے محاسنوں، تلازموں اور لفظی و معنوی رابطوں اور صنائع بدائع کی لطافتوں کا استعمال کچھ اس طور کیا ہے کہ انہیں اپنے نعتیہ قصائد کی بدولت ہی شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی ہے۔ محسن کی طبیعت کا جوش و خروش، فکر کی قوت و ندرت اور جذبات و خیالات کی رسائی اور معانی آفرینی نے ان کے نعتیہ قصائد کو ثقہ اور بلند بنایا ہے۔ محسن کاکوروی نے اپنے والہانہ جذبات کے اظہار کے لئے جذبیلا انداز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے ایسے الفاظ کا تفحص کیا ہے جو فضا بندی اور تاثیری ماحول کی تخلیق کے لئے اہم تھے۔ محسن کاکوروی نے معنی بھری تلمیحات اور تخیل کی گہرائی کے آمیزے سے اپنے کلام کی تزئین کی ہے۔ ان کے نعتیہ قصائد میں نادر تراکیب، جدتِ اظہار، شکوہِ الفاظ، معنوی تسلسل اور داخلی عقیدت کے عناصر نمایاں ہیں۔ محسن کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے شعری معیارات و نظریات کو نظر انداز نہیں کیا۔ محسن نے نئے مغربی شعری معیارات کو قدیم مشرقی شعریات سے ممتزج کر کے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی۔ ان کے قصیدے کی تشبیب، گریز، مدح اور دعا وغیرہ کے اجزا میں نئے نظمیہ معیارات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

محسن کاکوروی کا قصیدہ لامیہ (مدیح خیر المرسلین) چاردانگ عالم میں مشہور ہے۔ اس کی تشبیب میں انہوں نے مقامی ہندوستانی ماحول اور ہندوانہ تہذیب سے متعلق چند تفصیلات مہیا کی ہیں اس پر بہت سے حلقوں کی جانب سے اعتراضات بھی ہوئے۔ امیر مینائی کا کہنا ہے

---

1. لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۵۰۳ اردو مرکز گنپت روڈ لاہور۔ 2. کلیاتِ نعت مرتبہ نور الحسن مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ (۱۹۱۵)
3. محسن کی ایک مسدس کی ہیئت میں مدحیہ نظم واجد علی شاہ کی تعریف میں بھی ہے بحوالہ تاریخ قصائد اردو ص ۱۶۳ تا ۱۶۶ از جلال الدین زینبی احمد پریس الہ آباد ص ۱۶۳ تا ۱۶۶

"بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ قصیدہ نعت میں متھرا، کنھیا، گوکل کا ذکر بے محل ہے۔ لہٰذا دفع دخل کیا جاتا ہے کہ لغت میں تشبیب کے معنی ہیں ذکر ایام شباب کرنا اور اصطلاح شعرا میں مضامین عشقیہ بیان کرنا۔ اساتذہ نے تخصیص مضامین عاشقانہ کی قید بھی نہیں رکھی۔ کوئی شکایت زمانہ کرتا ہے۔ کوئی متفرق مضامین کی غزل لکھتا ہے۔ کوئی غزل میں کسی طرح کا خاص تلازم ملحوظ رکھتا ہے۔ الغرض متبحران کلام اساتذہ و حقیقت شناسان تشبیب و قصیدہ پر پوشیدہ نہیں کہ مضامین تشبیب کے محصور نہیں ہیں اور نہ کچھ اس مناسبت کی قید ہے کہ حمد و نعت و منقبت میں قصیدہ ہو تو تشبیب میں بھی اس کی رعایت رہے۔ عمدہ تر سند اس کے جواز کی یہ ہے کہ حضرت سرور کائنات خواجہ ہر دو عالمؐ کے حضور میں قصیدہ بانت سعاد پڑھا گیا جس کی تشبیب بھی مشروع نہیں ہے اور حضرت رسول خداؐ نے زبان مبارک سے اس کی تحسین فرمائی ①

حقیقت یہ ہے کہ اگر محسن کاکوروی کوئی اور قصیدہ نہ بھی لکھتے تو "مدیح خیر المرسلین" ہی کے سر پر تاریخ شعر میں ہمیشہ زندہ رہتے۔ اس قصیدہ کی تشبیب میں ہندی تہذیب و ثقافت اور متعلق اشیا و احوال کا خاصا تذکرہ ہے۔ تاہم ہم اسے صرف اسی مزاج کا عکس قرار نہیں دے سکتے۔ اس میں عجمی اور عرب حوالے بھی دستیاب ہیں۔ جہاں یہ خیالات نظر آتے ہیں کہ مہابن میں ابھی خبر اڑتی ہوئی آئی ہے کہ ہوا پر بادل تیرتھ کو چلے آتے ہیں۔ ساری خدائی میں بتوں کا عمل دخل دکھائی دیتا ہے۔ بھادوں کے بیڑے گنگا جل پر نکلتے ہیں۔ شاہد کفر نے مکھڑے سے گھونگٹ اٹھا رکھا ہے۔ اس کی کافر چشم میں کاجل ہے اور یہ کہ

؎ گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل + جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

دلبر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ + ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل

دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن + سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلے + تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اب کے میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا + نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے + نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبھوت + یا کہ بیراگی ہے پربت پہ جمائے کمبل

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل + برج میں آج سری کرشن ہے کالا بادل ②

خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل + رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

---

① کلیات محسن ص ۱۵۱ ② محسن کاکوروی نے قصیدے کی تشبیب میں استعمال ہونے والی غزل کا ردیف اور قافیہ بدل کر جدت پیدا کی ہے۔ اسی زمین میں آگے چل کر حصہ مدحیہ میں بھی غزل موجود ہے

وہاں ہمیں اسی تشبیب میں عربی و فارسی مزاج کے اشعار بھی دکھائی دیتے ہیں

؎ جانب قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ + کہیں پھر کعبے پہ قبضہ نہ کریں لات و ہبل
کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہ نو کی کشتی + بحر اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل
شب دیجور اندھیرے میں ہے ظلمت کے نہاں + لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل
خضر فرماتے ہیں سنبل سے تری عمر دراز + پھول سے کہتے ہیں پھیلتا رہے گلزار امل
جگنو پھرتے ہیں جو گلشن میں تو آتی ہے نظر + مصحف گل کے حواشی پہ طلائی جدول
شجرے ہیں پیر مغاں کے نقل آتش شاخیں + حرمت دختر رز میں نظر آتا ہے خلل

علاوہ ازیں محسن نے انگریزی عہد کے حوالے سے بھی ایک دو شعر تخلیق کیے ہیں

؎ ابر پنجاب، تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم + برق بنگالہ ظلمت میں گورنر جنرل
جس طرف دیکھیے میلے کی کھلی ہیں کلیاں + لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

جہاں تک اس قصیدے کی تشبیب میں ہندی اسطوریات اور غیر اسلامی مضامین کے بیان کا تعلق ہے تو انہیں ہم نعت کے موضوع کے حوالے سے حسن تضاد کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ حضورؐ خود دنیا سے کفر کا نام و نشان مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ ان کی مدح میں لکھے گئے قصیدے کی تشبیب میں اگر چند غیر اسلامی موضوعات آ گئے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ حضور کا جہاد تو شرک و بت پرستی کے خلاف ہی تھا۔ اور یہ موضوعات اس قصیدے میں تضادیہ کوائف کی شدت کو بیان کرتے ہیں۔ محسن مدحیہ جزو کی جانب رجوع کرنے سے قبل لکھتے ہیں

؎ ہے سخن گو کو نہ انشا کی نہ املا کی خبر + ہو گئی نظم کی انشا و خبر سب مہمل
دل میں کچھ اور ہے پر منہ سے نکلتا ہے کچھ اور + لفظ بے معنی ہیں اور معنی ہیں سب بے اٹکل
کتنا بے قید ہوا کس قدر آوارہ پھرا + کوئی مندر نہ بچا اس سے نہ کوئی استھل
کبھی گنگا پہ بھٹکتا ہے کبھی جمنا پر + گھاگرا پر کبھی گزرا کبھی سوئے چمبل
چھینٹے دینے سے نہ محفوظ رہے قلزم و نیل + نہ بچا خاک اڑانے سے کوئی دشت و جبل

اس کے بعد محسن کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت نے جو غبار اڑایا ہے اس سے آئینۂ مضموں دو چنداں صیقل ہوا ہے۔ قصائد میں حمد تشبیب میں ہر نوع کے مضامین باندھنے کی گنجائش ہے چنانچہ حضرت حسان بن ثابت نے فتح مکہ کے موقع پر جو ہمزیہ قصیدہ (نعت) پڑھا تھا اس کی تشبیب میں بھی اس عہد کے عربی قصائد کی تقلید میں ذکر محبوب، دیار و آثار اور اطلال و دمن کے حوالے موجود تھے①۔ محسن کاکوروی کی مذکورہ بالا تشبیب انتہائی عمدہ اور موثر ہے۔ انہوں نے اپنے دیگر قصائد میں بھی معنی خیز تشابیب لکھی ہیں

---

① دیکھیے دیوان حسان بن ثابت ص ۱

چند اشعار دیکھئے ؎ فیض تاثیر ہوا ہے کہ ہوا جاتا ہے + رو کش باغ خلیل آب کے سراپا گلشن

جگہ دے مجھ کو میرے دلربا کے غنچۂ دل میں + بہار آب کے برس رکھ مجھ زندان دیگر میں

نکالی چیستاں چوٹی کی گیسوئے مسلسل نے + معما نام رکھا ہے ترے موئے مجعد کا

نہیں آساں اٹھانا عشق کی چوٹیں دل و جاں پر + کلیجہ چاہئے کالا جو ہو مرد میداں کا

محسن کاکوروی کے قصائد کا تشبیبی حصہ کیف آور بھی ہے اور بیانیہ شاعری کا پرتو بھی لئے ہوئے ہے یہ جذبات نگاری، تصویر کشی، خیال آرائی اور مضمون آفرینی کے حوالوں سے بھی اعلیٰ اور عمدہ ہے۔ انہوں نے اپنی تشابیب میں بوجھل تراکیب، پرپیچ استعاروں اور بے جا مبالغہ آرائیوں سے شغف نہیں رکھا وہ عہد جدید کے مقصدہ نگار ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد تک ہونے والی اردو نظم کی ترقی سے بے خبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جدید نظم میں مغربی اثرات کے زیر اثر در آنے والی حقیقت نگاری اور فطرت پسندی کی رو ان پر پورے طور پر اثر انداز ہے۔

محسن کے قصائد میں حصہ گریز مدحیہ مضامین کی مناسبت سے احاطۂ تحریر میں آیا ہے اس میں ان کی عقیدت مندی کا رنگ نظر آتا ہے

؎ زمین شعر میں اعلیٰ مضامین عرش اعظم سے + چلے آتے ہیں شوق مصرف نعت پیمبر میں

مدحیہ حصوں میں بھی محسن کے شوق اور جذبے کی بے تابی، والہانہ پن اور اخلاص عروج پر نظر آتا ہے

؎ گل خوش رنگ رسول مدنی عربی + زیب دامان ابد طرۂ دستار ازل

نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر + نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

مہر توحید کی ضو اوج شرف کا مہ نو + شمع ایجاد کی لو بزم رسالت کا کنول

مرجع روح امیں زیب دہ عرش بریں + حامی دین متیں ناسخ ادیان و ملل

ہفت اقلیم ولایت میں شہ عالی جاہ + چار اطراف ہدایت میں نبی مرسل

اس حصے میں معنی آفرینی، جوش کلام، روانی بیان، برجستگی خیال کو محسن نے لفظی اعجاز طرازی اور پرتاثیر جذبے بھرے خیالات کی مدد سے برقرار رکھا ہے۔ نعتیہ مضامین کے اظہار میں محسن کا قلم رواں اور معانی آفریں ہے انہوں نے حضور ؐ کے سراپا کا بیان، خصائص کا اظہار، روضۂ انور کی مدح عقیدت مندانہ جوش سے کی ہے۔ ان کے ہاں مشکل اشعار بھی ملتے ہیں مگر وہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں

؎ جبین عرش ایزد پر ہے خاک آستان صندل + ہر اک ذرہ ستارہ ہے کلاہ فرق فرقد کا

بیاض مطلع عارض ترا دیوان وحدت ہے + نکیلا مطلع ایجاد میں مصرع ترے قد کا

کیا شیراز کو پامال اردوئے معلیٰ نے + گیا مال صفاہاں لوہا مری تیغ مہند کا

زمین شعر پر نازل ہے قرآن سخن مجھ سے + کتاب آسماں اک نسخہ ہے لوح زبرجد کا

داغ دہلوی

مرزا داغ دہلوی [م ۱۹۰۵] کا تعلق نواب رامپور سے بھی رہا اور نظام حیدر آباد سے بھی۔[1] داغ نے ان کی شان میں خطابیہ اور تمہیدیہ قصائد لکھے۔ یہ قصائد نہ بے جا علمیت کے اظہار کا نمونہ ہیں اور نہ ہی ان میں الفاظِ غریب نظر آتے ہیں۔ البتہ فارسی تراکیب کے استعمال سے داغ نے خاص شغف رکھا ہے۔ ان کے قصائد میں اشکال اور پیچیدگی نہیں ہے اگرچہ مبالغہ اور اغراق سے انہوں نے سروکار رکھا ہے تاہم حقائق و واقعیت کے پہلو بھی ان کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ داغ دورِ جدید کے قصیدہ نگار ہیں نئے شاعرانہ ماحول اور نظریات کے اثرات ان پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کے قصائد میں فطرت نگاری کے عناصر کے ساتھ ساتھ اخلاقیات پر مشتمل قیمتی تعقلات بھی ملتے ہیں۔ داغ کے اشعار ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی چھاپ کی بدولت معنوی گہرائی کے حامل ہیں۔ ان کی غزلوں کی فصاحت و سلاست، شوخی و رنگینی اور تیکھے پن کے اثرات ان کے قصائد پر مرتسم ہیں۔ وہ برجستہ اور رواں قصائد لکھتے تھے۔ الفاظ و محاورات پر ان کی گرفت نے ان کے قصائد کے ہر جزو کو فصیح و بلیغ بنایا۔ انہوں نے سنگلاخ زمینوں میں بھی قصائد لکھے ہیں۔ داغ نے اپنی شاعرانہ مہارت اور استادانہ لسانی قدرت کی خوبیوں سے مدد لے کر ہر نوع کی فنی دشواری پر قابو پایا۔ صنفِ قصیدہ کے لئے اجنبی اور نامانوس معلوم نہیں ہوتی۔ داغ نے شکوہِ لفظی سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے کم و بیش دس قصائد دستیاب ہوتے ہیں۔ ماہتابِ[2] داغ کی زینت ہیں دو یادگارِ داغ[3] کی اور دو گلزارِ داغ[4] کی۔ ان قصائد کے یہ مطالع ملاحظہ ہوں

در مدح میر محبوب علی سے
میں ہوا بادیہ پیما طرفِ ملکِ دکن + سرمۂ چشمِ غزالاں ہوئی گردِ دامن

ایضاً
آج وہ روزِ مبارک ہے وہ ہے یومِ سعید + کہ گلے ملتی ہے خود شاہ کے اقبال سے عید[5]

ایضاً
کیا جواں بخت و جواں سال ہوا ہے عالم + فلکِ پیر بھی کھاتا ہے جوانی کی قسم

ایضاً
ہے عید کے دن دلکشا صحنِ زمیں سطحِ فلک + اے حبذا اصل علی صحنِ زمیں سطحِ فلک

شب کو میں فکر میں تھا خلوتیِ خلوت گاہ + جلوۂ شاہدِ معنی نظر آیا ناگاہ

در مدح نواب سکندر جنگ سے
نواب ہے تو نشانِ اقبال + اقبالِ جہاں، جہانِ اقبال

مدح نواب کلب علی
ہے روزِ جشن کیوں نہ کرے روزگار عیش + ایک ایک غم کے بدلے ہیں سو سو ہزار عیش

ہے رخ آصف سے کم تر آفتاب + لاکھ چمکیں آسماں پر آفتاب و ماہتاب

ایک قصیدہ کا یہ شعر بھی ہے سہ سمندِ رخش سمند ہوں صد ہیں ہیں ہوش اپیدا + جو چمکے آتشِ قہر و غضب کی تیرے چنگاری

کی شان میں ان کے قصیدہ کا ایک مصرعہ یہ بھی ہے کہ جو دوستا نظام کی ہمت کے ساتھ ہے

---

[1] نواب فصیح الملک بہادر داغ از نور اللہ محمد نوری مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس دکن ۱۹۲۶ [2] مہتابِ داغ و تتمہ کلب علی خاں فائق مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور [3] یادگارِ داغ از سید علی احسن مارہروی مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور [4] گلزارِ داغ مطبوعہ
[5] اس قصیدہ پر قطعہ مندرج ہے حالانکہ اس کے تین مطالع ہیں اس میں صفتِ اسپ، صفتِ رنیل وغیرہ کا اہتمام ہے اور اس کے اندر ایک قطعہ بھی شامل ہے

داغ کے مذکورہ مطالع سے ان کی استادانہ فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

داغ کے قصائد میں جزو تشبیب موثر انداز سے استعمال ہوا ہے۔ بہاریہ، نشاطیہ اور طربیہ ماحول کی عکاسی ان کا خاص موضوع ہے۔ خوشی و سرمستی کے خمار آگیں منظروں کے بیان میں وہ رس، لوچ اور گھلاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ داغ کے لہجے کی جذباتیت، خلوص اور شاعرانہ رنگینی نے ان کے قصائد میں تصنع اور حشو و زوائد کا راستہ (بڑی حد تک) روکے رکھا۔ نواب میر محبوب علی کی شان میں اپنے ایک قصیدے میں داغ نے دکن کی جانب اپنے سفر کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قصیدے کے اولین دو مطالع کے تحت انہوں نے تشبیب کا اہتمام کیا ہے مطلع اول کے بعد دکن کی جانب اپنی روانگی، سفر کے دوران سامنے آنے والے کوائف اور مناظر سفر کا بیان ہے اور دوسرے مطلع کے بعد دکن اور وہاں کے علمی و ادبی ماحول کی تعریف کی گئی ہے۔

نازنینوں کی کمر ہے کہ شاخ لرزاں + موجۂ ریگ رواں زلف پریشاں کی شکن

خار صحرا اسے انگلی کے اشارے سے بتائے + راہ بھولے جو مسافر کوئی آوارہ وطن

ندیاں کوہ کی ہیں رشک دہ جوئے شیر + جن سے پھیکی پڑی فردوس کی بھی نہر لبن

حوریں پانی بھریں پنگھٹ کا جو دیکھیں جمگھٹ + ہے اس انداز کا ہر ایک بت سیمیں تن

اس تشبیب میں حیدر آباد کو فخر کلکتہ و مدراس، نظیر لندن، ثانی خلد و ارم، بانی تزئین و حشم، رو کش چین و ختن اور عشرت بغداد و عدن کہنے کے بعد داغ لکھتے ہیں

ع ایسے عشرت کدے میں کیوں نہ ہو خلقت دلشاد + ایسے مامن میں نہ کیوں کر ہو زمانہ ایمن

شحنۂ عدل کا وہ خوف ہے بازاروں میں + ہنس ممکن کہ جو برتن سے بھی کھڑکے برتن

ماتھ باندھے ہوئے پھرتے ہیں یہاں دست دراز + لب سیے رہتے ہیں بے ہودہ سرا وقت سخن

ذی خرد اتنے ہیں ذی فہم ہیں اتنے کہ یہاں + کیا قباحت ہے اگر جاگی جگہ بولئے من

ناظم و ناثر و مزرانزد دانا و ادیب + عالم و عاقل و علامہ ہر اک ماہر فن

حیدر آباد کا بجتا ہے جہاں میں ڈنکا + نوبتیں کیوں نہ بجیں دھوم سے باون باون

داغ نے اس تشبیب میں بہاریہ مناظر بھی بیان کیے ہیں۔ جب وہ صفت دشت و جبل سے گریز کر کے شہر و چمن کی جانب رجوع کرتے ہیں تو قاری کو باغ میں طراوت نظر آتی ہے، کثرت سے پھول کھلے دکھائی دیتے ہیں۔ لالہ و گل کی رنگیں قبائیں، قلقل شیشہ، کمر سرو، شاخ سمن، گوہر شبنم شاداب اور سوسن کے تذکرے کے بعد داغ لکھتے ہیں

ع کیا عجب پہنچے وہاں تک اثر فیض بہار + غلس ماہی بھی کھلیں صورت گلہائے چمن

کس طرح دست حنائی نہ کرے نخل چنار + تیغ اردی سے بہا پھرتا ہے خون بہمن

داغ نے اس تشبیب کو چار چمن کا نام دیا ہے۔ اسمیں انہوں نے دشت / کوہ / چمن / اور شہر / کے نقشے کھینچے ہیں۔

عید الفطر کے موقع پر نظامِ دکن کی خدمت میں پیش ہونے والے تہنیتی قصیدہ کی تشبیب میں داغ نے خمریات اور حسن و جمال کے موضوع کو چھیڑا ہے۔ اس میں کہیں کہیں داغ کا حکیمانہ اور تعقلاتی رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔

آج یوں شغلِ درِ میکدہ وا ہوتا ہے + دستِ زاہد میں موض پیرِ مغاں کے کلید
آج وہ دن ہے کہ پیتے ہیں اسے آشام + کی ہے دو چار برس پہلے جو ساقی نے کشید
زاہدِ خشک کے منہ میں بھی بھر آئے پانی + دستِ ساقی میں بھرا دیکھے اگر جامِ نبید
حسن میں تلتے ہیں یوں ڈال کے جھولوں پہ شیم + جس طرح برج میں میزان کے فلک پر ناہید
نیک و بد کا ہو ہر اک بات میں انساں کو خیال + دوست سے وعدۂ واثق ہو تو دشمن سے وعید
وہی شہ زور رہا جس نے دبایا اس کو + نفسِ سرکش کو سمجھیے کہ یہ ہے دیوِ مرید

داغ نے ایک تشبیب میں موسمِ برسات کا نقشہ کھینچا ہے

ہو گئی فصلِ بہاری میں بھی اب کے برسات + جوش سے ابرِ بہاراں کے ہوا یہ عالم
چرخ پر چھائی ہیں اس طرح گھٹائیں کالی + جس طرح ہوں رخِ معشوق پہ زلفیں برہم
ہے سیہ ابر میں اس روپ سے بگلوں کی قطار + انجم کا کہکشاں کی ہو سڑی جیسے بہم
گردِ اقدس کو بھی ابرِ کرم دھوتا ہے + تارِ بارش میں ہے موتی کی لڑی کا عالم
کشتیوں میں کہیں جلسے ہیں چڑھے دریا کے + ہو رہی ہیں کہیں تیراکوں میں شرطیں باہم
کہیں طاؤس چمن کی ہے نوائے دلکش + کہیں آتی ہیں پپیہوں کی صدائیں پیہم
نکہتِ گل کا اثر ہو نفسِ مطرب پر + گائیں اس فصل میں گر رام کلی اہلِ نغم (۱)
روز ہر باغ میں ہیں گل بدنوں کے جلسے + چندریاں ساڑیاں سرخ اس پہ ترشح کم کم
شور ہے قلقلِ مینا کا چلو آؤ پیو + مغبچوں نے بھی مچا رکھی ہے کیا کیا اودھم
ابرِ نیساں سے ہوئی ایسی تری خشکی میں + گائیں دیپک تو اٹھے شعلے کی جا موجۂ یم

داغ کے قصائد میں مقامی ثقافتی و تہذیبی ماحول کی بعض تفاصیل ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے نجوم و فلکیات کے حوالے سے بھی متعدد اشعار لکھے ہیں (۲)۔ مذہبی معاملات و مسائل پر بھی انہیں خاصا عبور حاصل تھا

داغ کو خطابیہ قصائد لکھنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔ داغ نے گریز میں بھی کوئی ندرت نہیں پیدا کی وہ ایک دو اشعار سے گریز کر کے مدح کی جانب مائل ہو جاتے تھے۔ کہیں کہیں وہ لطیف انداز سے گریز کرتے ہیں

روشن ہیں فرش پہ جھاڑ اولو عقد ثریا ہے اُدھر + پر نور اک اک سے ہوا صحن زمیں سطح فلک
مسند نشیں ہے بادشہ ہے شاہیانہ رشکِ مہ + کیوں کر نہ اترائیں بھلا صحنِ زمیں سطحِ فلک

---

(۱) یہ شعر بھی دیکھیے ۔ بزمِ عشرت کا عجب رنگ ہے اس موسم میں + گاتے ہیں گوند ملار اہلِ طرب اہلِ نغم
(۲) روزِ نوروز ہے وہ فرخ و مسعود و سعید + کہ زحل کی بھی سعادت نہیں برجیس سے کم

داغ نے ایک تشبیب میں حقیقت نگاری اور واقعہ نگاری پر خاصا زور صرف کیا ہے۔ اور مناسک حج بیان کرنے کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کی نعت میں عمدہ اشعار لکھے ہیں۔ اس کے بعد گریز یوں کیا ہے

؎ صاحبِ علمِ لدُن، واقفِ اسرارِ خفی + حالِ کونین سے ہے قلبِ مطہر آگاہ

آپ ہی تو ہیں مددگارِ ملوک و ملکوت + آپ ہی شاہِ دکن کے بھی تو ہیں پشت پناہ

یہ قصیدہ عید اضحیٰ کی تہنیت کے حوالے سے ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ حج سے مدت العمر کے گناہ عفو ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ خوشی کا دن ہے مکے میں باہر سے لاکھوں مسافر آتے ہیں۔ وہاں درویش اور شاہ ایک ہی طرز کا لباس (احرام) پہنتے ہیں۔ کوئی نیتِ عمرہ سے احرام باندھتا ہے۔ کہیں شورِ لبیک سنائی دیتا ہے، کہیں شغل درود نظر آتا ہے، بانگ تکبیر اور بانگ صلوٰۃ بھی سنائی دیتی ہے۔ سنگِ اسود کے بوسے لیے جاتے ہیں، کہیں طواف ہو رہا ہوتا ہے۔ صفا و مروہ کا گشت ہوتا ہے۔ چاروں اماموں کے مصلّے آباد رہتے ہیں آٹھ پہر درود و صلوٰۃ ہوتے ہیں۔ کعبے سے چل کر رات کو منا میں ٹھہرتے ہیں وہاں سے سوئے عرفات آتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں

؎ ظہر کے بعد سے ہوتا ہے وہاں خطبہ شروع + عصر کے بعد سے لد جاتے ہیں خیمے خرگاہ

مسجد مزدلفہ بین منا و عرفات + بہر حجاج ہے اک رات کی وہ طاعت گاہ

پڑھتے ہیں ساتھ وہیں آکے عشا و مغرب + اہلِ حج کرتے ہیں تحمید و مناجاتِ الٰہ

جب چلے مزدلفہ سے تو منا میں پھر آئے + تین دن کے لیے ہوتی ہے وہیں منزل گاہ

رجمِ شیطانِ لعیں کے لیے کنکر مارے + پڑھ کے لاحول ولا قوۃ الا باللہ

شتر و دنبہ و بز ذبح ہوئے ہیں اتنے + آسماں شفقی رنگ بنی قرباں گاہ

اس تشبیب میں حجاجِ کرام کے مدینے پہنچنے اور وہاں روضۂ رسول پر آنکھیں بچھانے کا موثر بیان بھی ہے اور حضور کی نعت میں داغ نے اشعار لکھتے ہوئے انہیں فخرِ انسان و ملائک، شہِ کونین پناہ، احمدِ محبوب، حبیب اللہ کے نام سے یاد کیا ہے مثلاً۔

قوسین کا پایا ہے مقامِ عالی + اللہ اللہ رے یہ مرتبہ و رفعت و جاہ

آپ کی ذات سے وہ ہادیٔ دین و ایماں + آگئے راہ پر اسلام کے لاکھوں گمراہ

داغ کو جزوِ مدح سنبھالنے میں کمال حاصل تھا۔ ممدوح نوابوں کی شخصیات کے حوالے سے انہیں رستمِ دوراں، افلاطونِ زماں، دادگر، دادرس، فخرِ زمان و زمن، پاک دل، نیک خو، مجمعِ جود و سخا، معدنِ حلم و حیا، صاحبِ جاہ و حشم، مالکِ سیف و علم، نور سے پُر، اخلاق نواز، انصاف پسند اور حکیم و دانا قرار دیتے ہیں۔ ان کے گھوڑوں، ہاتھیوں، تلواروں اور دیگر ساز و سامان کی تعریف میں بھی زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ یہی ان کے مدحیہ قصائد کا عمومی رنگ ہے۔ ان نوابوں کا مرتبہ بیان کرنے کے لیے وہ خسرو، افلاطون، رستم، سلیمان حشم، فریدوں فر، ضحاک، جمشید، سکندر، دارا وغیرہ کی تلمیحات کا سہارا لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے کردار کے اوصاف بیان کرتے ہوئے وہ اخلاقی تحفظات کی چند صورتیں بھی پیش کرتے ہیں

داغ کے خیال میں نواب، رئیس، امیر یا بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مخزونِ ہو، نیک روش اور نیک چلن کا حامل ہو، علم و عمل کے اوصاف سے متصف ہو، فہیم و فطین، قاطع بغض و حسد، قامع بید اد و ستم، عادل، سخی، رعایا پرور، عقل سلیم کا حامل ہو اور مزید برآں وہ بت کدوں میں ماتم برپا کر سکتا ہو

؎ بت کدوں میں ہے یہ ماتم تری دیں داری سے + بانگ ناقوس پہ ہوتا ہے لبِ یقیں شیون

اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ سہو و خطا سے عاری ہو، غصہ و قہر کی جانب رغبت نہ کرے،

؎ حیدر آباد ہے شاہ کے دم سے آباد + جس سے ہے صورتِ اسلام نمودار و پدید

مسجدوں میں ہے یہاں شورِ اذان و تکبیر + خانقاہوں میں یہاں سلسلۂ حمد و حمید

اس امر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مغلوب ہو جانے کے بعد مسلمان شعرا کو مسلم ریاستوں کے نوابوں سے کیا کیا امیدیں وابستہ تھیں وہ انہیں ہر اعتبار سے اعلیٰ اور ارفع دیکھنا چاہتے تھے۔ خصوصاً مسلم تہذیب کے حوالے سے وہ انہیں محافظ و حامی دینِ متین سمجھتے تھے۔ اگر مذکورہ صفات مسلم نوابوں میں اگر موجود نہیں بھی تھیں تو بھی کچھ فرق نہیں پڑتا تھا اس لئے کہ شاعر اپنے ممدوحین کے لئے ان خوبیوں اور صفات سے متصف ہونا ضروری خیال کرتے تھے یا دوسرے لفظوں میں وہ اپنے ذہن میں موجود آئیڈیل نواب، امیر، رئیس یا بادشاہ کے مادح تھے۔ اس نوع کی مدحوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس عہد میں مسلم ریاستیں مسلم عوام کا کتنا بڑا سہارا تھیں

داغ نے نوابوں کے کردار و عمل کے حوالے سے اشعار لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے ساز و سامان کی تعریف بھی کی ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎ منہ چڑھے کون تری تیغ کے یہ کوہ شگاف + سر شکن، صف شکن، آہن شکن، البرز شکن

گھوڑا   چھو سکے دامنِ زیں کو نہ کبھی دستِ خیال + طے کرے مشرق و مغرب کی وہ یوں راہِ بعید

فیل   فیل وہ فیل جسے کوہ جواہر کہیے + رود الماس ہیں دانت اور بدن ہے نیلم

ایوان شاہی ؎ روز و شب ایوان شاہی پر سعادت بار ہیں + سعد اصغر، سعد اکبر آفتاب و ماہتاب

قصرِ عالی ہے وہ روشن تر کہ جس کے فرش پر + تختہ ہائے سنگ مرمر آفتاب و ماہتاب

داغ نے اپنے قصائد میں حسن طلب اور دعا کے حصوں کو بھی موثر بنایا ہے

؎ دے کے دعا اے داغ اب تاثیر کر حق سے طلب + پابند دعا کرے گا تا کجا صحنِ زمیں سطحِ فلک

ہو ربع مسکوں پر عمل آئے نہ تا گردوں خلل + تیرے ہوں اے ظلِ خدا صحنِ زمیں سطحِ فلک

دورِ جدید کے قصائد میں بھی شاعروں نے قدیم عجمی ثقافتی حوالوں کو برقرار رکھا ہے کچھ کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے یہ ظلِ خدا کا تصور بھی ملاحظہ کریں۔

داغ کے قصائد پر ان کی غزل کی سادگی اور محاورہ بندی کے اثرات بھی ہیں۔ انہوں نے بعض قصائد میں مرصع کاری بھی کی ہے اور رعایت لفظی سے خصوصی کام لیا ہے۔ حسن تعلیل، مراعاۃ النظیر، لف و نشر، مجاز مرسل وغیرہ کی صنعتوں کا استعمال اگرچہ تمام قصیدہ گو شعرا کے ہاں ملتا ہے تاہم داغ نے ان صنعتوں کو موثر انداز سے برتا ہے

—

ضامن علی جلال

میر ضامن علی جلال [م ۱۹۰۹] کا شمار ماہر قصیدہ نگار شعرا میں ہے۔ وہ لکھنؤ سے متعلق تھے۔ وہ نواب رامپور اور والیٔ منگرول کے وظیفہ خوار تھے[1]۔ انہوں نے مختلف مذہبی اور غیر مذہبی درباری تقریبات کے حوالے سے عمدہ قصائد لکھے۔ ان میں ان کی شاعرانہ صناعی کے متاثر کن نمونے موجود ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں آٹھ قصائد دستیاب ہیں[2]۔ (نظم نگاریں میں ۲ اور کرشمہ گاہ سخن میں ۶) ان میں سے ایک قصیدہ امام آخرالزماں امام مہدی کی شان میں بھی ہے اسکا مطلع ہے

> میں شب کو بند کیے دیدۂ تماشا ہیں + بغور دیکھتا تھا سیر آسمان و زمیں (ص ۲ نظم نگاریں)

جلال نے اپنے ایک قصیدے میں دو بحروں کا بھی استعمال کیا ہے اسکا مطلع ہے

> عارضِ صبح دِکھاتا ہے عیاں رنگِ بہار + کھل گئے شیشہ و نسرین رخِ لیل و نہار [ص ۱۲۳] قصیدہ تہنیت عید الفطر

انہوں نے ایک قصیدہ میں یہ التزام بھی رکھا ہے کہ کوئی ایسا حرف بھی گرنے نہ پائے جس کا گرانا عروضیوں نے روا رکھا ہے۔ یہ نواب یوسف رامپور کی مدح میں ہے[3] اسکا مطلع ہے

> ہے شگفتہ ہر چمن وہ رنگ لائی ہے بہار + جوشِ گل بے انتہا مرغانِ گلشن بے شمار ص ۱۴۶

جلال نے کسی قصیدہ کی تشبیب میں خیالی منظر پیش کیا ہے، کسی میں خوابیہ ماحول کی عکاسی کی ہے۔ کہیں باغ و بہار کے موضوعات کو پیرہنِ اظہار عطا کیا ہے، کہیں عیش و طرب کے احوال کو لفظوں میں منتقل کیا ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں انہوں نے برشگالیہ ماحول کی تفصیل پیش کی ہے اسکا مطلع ہے

> اب کے برسات نے لوگوں کو کیا تر دامن + جو گھٹا اٹھی ہے کہسار سے ہے تو بہ شکن

جلال لکھنوی کے قصائد فنی نزاکتوں سے معمور ہیں۔ صنعت لزوم مالا یلزم کے استعمال سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے بقول "انہوں نے قدیم شعرا کے قصائد اور روایات کے ورثہ میں لکھنؤ کے مزاج کا امتزاج نہایت خوشگوار طریقے پر کیا۔ اس میں لفظی موشگافیوں، شاعرانہ رعائتوں اور صنعتوں کا مناسب استعمال کیا"[4]۔ شکوہ الفاظ، مضمون آفرینی، تشابیہی تنوع کے ساتھ ساتھ فصیح و بلیغ زبان کا استعمال جلال کو دورِ جدید کا اہم قصیدہ نگار بناتا ہے۔ انہوں نے اپنے معاصر قصائد کے نمونوں کو سامنے رکھا۔ جدید نظم کے حسیاتی اور جمالیاتی طرزِ احساس نے انہیں بھی فطری مناظر کی منظر کشیوں پر مجبور کیا۔ مبالغہ آرائی کی اس انتہا سے جلال نے سروکار نہیں رکھا جس کی وجہ سے خیال بے سروپا یا گم ہو جاتا ہے۔ تشبیب اور مدح کے حصوں میں وہ لسانی مہارت کے حامل رواں نظم گو کی حیثیت سے سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ ان کی سلیس اور سادہ زبان کے باوجود ان کے قصائد کی

---

① آب بقا ص ۷۸

② نظم نگاریں مطبوعہ تصویر عالم پریس لکھنؤ ۱۹۰۳ء / کرشمہ گاہ سخن مطبع فیض محمدی لکھنؤ ۱۳۰۱ھ

③ ان کا ایک اور قصیدہ بھی ہے اسکا مطلع ہے
> بساط خواب پر اپنی ہوا سیر آج ہیں
> پڑا ہے اتفاق دل افسردہ و ملول و حزیں
نظم نگاریں ص ۷

④ جلال لکھنوی از ڈاکٹر محمد حسن ص مطبع انجمن ترقی اردو ہند

مجروح نہیں ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خیال و مواد کے استعمال میں انہوں نے قصیدے کے مزاج کا خیال رکھا ہے جلال کے ہاں خیال دھلا دھلایا، نکھرا اور صاف ہے وہ تکرار مضامین سے موضوع کو قارئین کے ذہن نشین کرنے میں کوشاں تھے۔ ان کی تشبیب میں زورِ بیان اور تسلسل خیال کا عنصر نمایاں ہے۔ تلمیحات اور علمی اصطلاحات کا استعمال ان کے شاعرانہ زور کو ظاہر کرتا ہے۔ لکھنوی رنگ کے زیر اثر جلال نے بسا اوقات خارجیت اور سراپا نگاری کی روش اختیار کی ہے۔ امام مہدیؑ کے قصیدے کی تشبیب میں انہوں نے بہت سی ایسی تفصیلات مہیا کی ہیں جو عیش و نشاط کے ماحول کی عکاس ہیں۔ انہوں نے اس قصیدے کی تشبیب میں بتایا ہے کہ وہ آنکھیں بند کیے تصورات کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے اور ان کی چشم تماشا بیں کبھی فلک پر اور کبھی زمین پر نظر آتی تھی۔ کبھی وہ زمین پر نقش قدم کی صورت گرتے تو کبھی غبار کی مانند آسمان پر جا چڑھتے۔ کبھی وہ پیر مغاں اور مے کشوں کے جلسے میں نظر آتے اور کبھی قبلۂ دیں کے ساتھ زاہدوں کی انجمن میں۔ کبھی صوفیوں کے وجد میں بھی ان کے شریک حال دکھائی دیتے اور کبھی مشائخ حق بیں کی بزم کی رونق بڑھاتے۔ کبھی وہ راہب بن کر کلیسا میں پہنچے اور کبھی خانۂ کعبہ میں اعتکاف گزیں ہوئے۔ اس طرح حسینوں، ساقیوں، خنیاگروں، باغوں اور غنچوں کے ماحول اور جھرمٹوں سے گزر کر ان کا تصور بالآخر ان کے خواب پر منتج ہوتا ہے وہ خواب میں ایک نازنین دیکھتے ہیں اور اس کی تصویر کشی سراپا نگاری کے حوالے سے کرتے ہیں اسے حور، رشکِ بدر و ہلال قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

؎ رسائیاں وہ طالع کے تھے رسا گیسو + ستارہ بخت کا تھا خالِ عارضِ رنگیں
چمک سے جس کی چکا چوند چشم انجم کی + دکھا رہی تھی وہ افشاں جمالِ نور آگیں
وہ کان کان جواہر نثار ہو جس پر + وہ کان حلقہ بگوشوں میں جن کے جملہ حسیں

پھر اس نازنین کی آنکھوں، گالوں، بینی، لب و دہاں، تبسم، خوشنما چاہ ذقن، گلے، سینے، شانہ و بازو وغیرہ کی تعریف کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں

؎ کرے سلام قیامت بھی اس کو جھک جھک کر + ادائے قامتِ دلکش جو دیکھ پائے کہیں
غرض وہ جب کہ بصد شوخی و کرشمہ و ناز + ادا سے آکے کھڑی ہو گئی سرِ بالیں
پکاری مجھ کو کہ کیا سو رہا ہے تو غافل + محل خواب نہیں یہ محل خواب نہیں

یہ مقام گریز ہے۔ اس کے بعد دس اور اشعار لکھ کر وہ ممدوح کی جانب راغب ہوتے ہیں۔ یہ طویل گریز ہے زمینی یا محسوس حوالوں سے ترتیب پانے والے خیالات ماورائی یا خیالی نوعیت کے خیالات سے زیادہ جاندار ہوا کرتے ہیں۔ جلال نے بھی اپنے قصائد میں زندگی اور کائنات کے حقائق کی جانب توجہ دی اور اپنے صحیح شاعرانہ منظر نامے سے متعلق ہوئے۔ اس دور میں اسالیبی سطح پر جو سادگی آشنا رجحانات جنم لے رہے تھے وہ جلال کی توجہ کا مرکز تھے۔

جلال نے زندگی کی تصویر کشی کو بھی اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ انہوں نے اپنے قصائد میں مقامی رسوم و رواج اور ماحول کی عمدہ تصویریں پیش کی ہیں۔ رامپور اور لکھنو کی معاشرت کی عکاسی سے انہوں نے خاص تعلق رکھا۔ واقعہ نگاری اور حقیقی منظر کشی کے حوالے سے ان کے قصائد اہم ہیں۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جہاں جہاں انہوں نے امتناعی طرز کی تشابیب لکھی ہیں ان میں وہ حکایاتی نوع کا تسلسل قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہیں۔ ان سے قبل سودا اور ذوق اس نوع کی تشابیب میں جو کمال دکھا چکے ہیں اس کی ہمسری خاصی مشکل ہے۔

جلال نے اپنی ایک تشبیب میں انسان کی شوریدہ سری، بے ہوشی، بے بال و پری، فنا اور بے نشانی کو متفکرانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس میں ان کا احساسِ تفاخر بھی جھلکتا ہے

ع ہوں وہ دیوانہ جو دیکھو مری شوریدہ سری + حور دلدار ہو جان سے عاشق ہو پری
عقل کو کرتی ہے ہشیار مری بے ہوشی + دل کو کرتی ہے خبردار مری بے خبری
لڑکھڑا جاتا ہوں سے بڑا کر مری بے سامانی + پر پرواز سے بہتر مجھے بے بال و پری
اپنے مٹ جانے کو میں جانتا ہوں اپنی نمود + بے نشانی ہے مری بہرِ لئے نام وری
نام جس کا ہے فنا عین بقا ہے وہ یہاں + موت کہتے ہیں جسے ہے وہ حیاتِ خضری

بعض قصائد میں جلال نے تشبیبی حصے یا تو مختصر رکھے ہیں یا ان کا اہتمام ہی نہیں کیا

جہاں تک مدح کے جزو کا تعلق ہے جلال ممدوح کے مرتبے کے مطابق اس کے مذہبی رجحانات، عقائد، عدل و انصاف، سخاوت، کرم نوازی، رعب و شجاعت، تلوار اور اسپ وغیرہ کو موضوع بناتے ہیں۔ اس حصے میں انہوں نے زیادہ تر روایتی لفظیات و تراکیب کا سہارا لیا ہے۔ البتہ رعایتِ لفظی اور دیگر صنعتوں کے استعمال نے اس حصے کو جاندار بنایا ہے

ع سبک روی میں ہوا و بہار کا عالم + قدم کے نقش ہوں گلہائے دامن گلچیں

والیٔ رامپور کی شان میں لکھے گئے اپنے ایک قصیدے میں انہوں نے شہر رامپور کی یوں تعریف کی ہے

ع سوادِ شہر وہ مینو سواد کہیے جسے + وہ شہر جس کا ہر اک کوچہ ہے بہشت بریں
تمام شہر ہے مشغول بزم آرائی + ہر اک بشر ہے خوش و خرم انبساط آگیں
جدھر نگاہ گئی مجمع بتاں دیکھا + جدھر کو آنکھ اٹھی پائے شاہدانِ حسیں
کہیں ہیں نغمہ ہے طبلوں کے تھاپ میں + کہیں صدا ہے مجیروں کی رنگ بزم نشیں
کسی کی بزم میں مجرے کو کچھ طوائف جمع + نکھار جن کے ہیں آفت کے قہر کی تزئیں

امام مہدی کی شان میں لکھے ہوئے اپنے قصیدے میں انہوں نے مذکورہ نوع کے عیش و نشاط کے ماحول کی یوں مذمت کی ہے، ع زہے کہ ہیں خلفِ مظہر العجائب آپ + عجیب آپ کی معجز نمائیاں دیکھیں
شراب خوروں کے عیش و نشاط ہو گئے تلخ + شراب ہو گئی سرکہ ہوئے وہ فروش سرکہ جبیں

؎ مغنیوں کے ہوئے راگ سر بسر کھٹ راگ + سر اپنا دھنتے ہیں خاموش و طرب بے دیں

رہی نہ رقص کی رقاصوں کو بھی گردش یاد + کچھ ایسے کھا کے وہ چکر گرے بروئے زمیں

ہزار چھیڑیے آواز دیتے ہیں کب ساز + بجائے طبلہ کوئی لاکھ کچھ صدا ہی نہیں

ہوا ہے نے کے گلو گیر آپ نغمۂ نے + گلے کا اس کی ہوئی درد اس کی صوت حزیں

مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جلال ممدوح کے مرتبۂ مقام اور احوال و کوائف کی مناسبت سے ہی مدحیہ مضامین بیان کرتے تھے۔ چونکہ امام مہدیؑ کی آمد منتق و مجبور کے خاتمے کا باعث بھی ہوگی اس لیئے اس حوالے سے انہوں نے اس نوع کے ماحول کے خاتمے کے مضامین قلمبند کیے ہیں۔ یہاں ان کی مذہبی ارادت اور عقیدہ کا سراغ بھی ملتا ہے۔ مذہبی حوالے سے ان یہ اشعار بھی دیکھیے ؎ آبرو دامن دولت ہے گرم گستر ابر + سایۂ رایت اقبال ہے خورشید پناہ

؎ خدیو ہر دو سرا جن و انس کا مولا + ملائکہ کا شرف فخر آسمان و زمیں

مطاع روح قدس مقتدائے خضر و مسیح + فروغ ملت بیضا سراج راہ یقیں

واسوخت نگاری کی شان میں ان کے ایک عقیدے میں تیر کی یوں تعریف ہوئی ہے

؎ کماں سے تیر ہوائی ترا اگر چھوٹے + تو پہلے مرے ہوائی وہ تیر چرخ کی کھال

صدائے تیر شہابی کو دیکھو ہو گا یہ + سمجھ کے گوشۂ قوس و قزح سے سر کو نکال

یہ کہا جا سکتا ہے کہ جلال کا پاؤں دو کشتیوں میں تھا ان پر روائتی عقیدہ نویسی کے اثرات بھی تھے اور جدید نظم نگاری کے بھی۔ اس عبوری دور کے شعرا کا اسی نوع کی شاعری سے سابقہ تھا۔

کاظم حسین شیفتہ

کاظم حسین شیفتہ کنتوری [۱۹۰۸ء میں زندہ تھے] اہم قصیدہ نگار ہیں۔ انہوں نے میر محبوب علی، دلیر الدولہ کی شان میں عمدہ قصائد لکھے ہیں۔ ان کے قصیدے قصیدے کی ہیئتی اور موضوعاتی روایت کے دائرے میں کا حصہ ہیں۔ کاظم حسین شیفتہ کے مطالع چوکس اور موثر ہیں۔ تشبیب میں باغ و راغ کا منظر یہ اور نشاطیہ ماحول کی بھرپور عکاسی ہے۔ مدحیہ حصوں میں بھی قدیم روایت کی پاسداری ہے۔ انہوں نے معنی نزاکتوں کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ شیفتہ کنتوری کو فن تاریخ گوئی پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ان کے چند قصائد کے مطالع ملاحظہ ہوں

[در مدح میر محبوب علی] ؎ کس طرف مشغول ہے توائے نگاہ قدرداں + انجمن میں گوہر مقصود انگلش ہے زباں (۱)

[در مدح دلیر الدولہ] للہ الحمد کہ پھر تازہ ہوا رنگ جہاں + ہر طرف عیش و مسرت کے ہوئے گل خنداں (۲)

اے فلک یہ طول شام ہجر یہ تا خیر صبح + ایک دن لا ریب ہوں گے ہم گریباں گیر صبح (۳)

زمانہ ظرف ہے مظروف ہے بشر کا خیال + خیال ہی سے ہے پیدا تغیر احوال (۴)

فیض پیر مغاں کا جاری ہے + خلق مشغول مے گساری ہے (۵)

شیفتہ کنتوری کی قصیدہ نما نظمیں بھی خاص مقبول تھیں۔ ان کی ایک نظم کا عنوان عہد شباب ہے اور دوسری کا زمانۂ طفلی ان کے یہ اشعار دیکھئے

؎ رخصت اے عہد جوانی رخصت اے عہد شباب + ہم رہے برسوں تری دلچسپیوں سے ہمکنار (۶) ۲۷ اشعار

اے ہمایوں فال طفلی چند روزہ میہماں + تیری بے فکری کے ہیں ممنون سب پیر و جواں (۷) ۴۰ اشعار

شیفتہ کنتوری کبھی عید الفطر کی تہنیت دینے کے لئے قصیدہ لکھا کبھی نظام دکن کی سالگرہ پر پیش کرتے رہے۔ نبیرہ نظام دکن کے صاحبزادے کی ولادت پر بھی ان کا ایک قصیدہ دستیاب ہے۔ شیفتہ کا ایک قصیدہ گلدستۂ جشن آصفیہ کی بھی زینت ہے اسکا مطلع اول ہے

؎ فریفتہ فکر سخن داں پہ ہے سخن دانی (۸)

نظام دکن کے نبیرہ کے ہاں فرزند پیدا ہونے کی خوشی میں لکھا ہوا ان کا قصیدہ فنی نزاکتوں سے معمور ہے اس پر لکھا ہے "صنعت منقوطہ یکے ہجری در مطلع قصیدہ و دوم عیسوی با آخذ حروف منقوطہ از مصارع" اس سے عیسوی تاریخ ۱۹۰۷ء برآمد ہوتی ہے اور ہجری تاریخ ۱۳۲۵ھ۔

شیفتہ کے قصائد میں نشاطیہ مناظر کی بہتات ہے کہیں عیش و مسرت کے پھول کھلے دکھائی دیتے ہیں کہیں شادیانوں کی صدا سنائی دے رہی ہے۔ تمنائیں شاداں ہیں ارمان مجسم پری بنے ہیں میکدوں میں شور قلقل ہے زمزمہ پرداز چمن نغمہ سنج ہیں۔ بلبل کی فغاں اور قمری کے نالے ختم ہو گئے ہیں۔ یہ اشعار اور ان کا نشاطیہ انداز دیکھئے

---

(۱) رسالہ جلوہ محبوب ۱۳۱۶ھ (۲) قصائد جلد اول (۳) دبدبۂ آصفی جلد عــ۱ جلد ۹ عــ۲۰
(۴) رسالہ جلوہ محبوب ۱۳۱۹ (۵) دبدبۂ آصفیہ جلد عــ۱۰ عــ۱۱ (۶) دبدبۂ آصفیہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۳
(۷) دبدبۂ آصفیہ نمبر ۳ جلد ۱۲ ۱۳۲۶ھ ص ۲۹ (۸) گلدستۂ جشن آصفیہ مرتبہ محمد عبداللہ ضیغم مطبوعہ مخزن نظامی حیدرآباد دکن ص ۲۲

آسماں بن کے بلندی پہ نظر آتا ہے + آتش گل کا ہے معدوم گلستاں سے دھواں
سبزہ گلشن میں کہیں فرقۂ زہاد ہے محو + بادہ پیما ہے کسی جا پہ گروہ رنداں
سرخ شفق اس بت مہرو کی پیشانی پہ ہے + یا فلک پر ہے درخشاں اختر تقدیر صبح
عشق میں دیکھی ہے بہ سوئے عاشق ناشاد نے + وصل میں جلدی سحر کی ہجر میں تاخیر صبح
گرم وہ غیروں سے ہیں تو لے یہ آیا ہے عرق + کیوں نہ دل ٹھنڈا ہو میرا دیکھ کر تبخیر صبح
کیا زمین و آسماں کو دینے والا تھا کوئی + خالق الاصباح نے دی ہے اسے جاگیر صبح
دلربائی تا کجا تشبیب کے اشعار سے + مدح میرا کے فکر رنگیں کھینچ دے تصویر صبح

مدحیہ حصوں میں انہوں نے ممدوح کے حکم کی تاثیر، فہم و فراست، عدل، استقلال، سلیقہ، مجالس کی رنگینیاں، کرم نوازی، سخاوت، عنایت، دبدبہ، رعب، جلال، خلق، ہمت، حلم، حیا، شوکت، جرأت و صولت، البشر و کمال، سیف زبانی، اکرام اخلاق اور شروشرارت کشی وغیرہ کی خوبیوں پر اظہار خیال کیا ہے علاوہ ازیں فارسی اور قصائد میں بیان ہونے والے مدحیہ لقورات بھی ان کے پیش نظر رہے ہیں

میر محبوب علی خاں شاہ گردوں مرتبت + صاف جس کے روئے روشن سے ہوئی تحقیر صبح
شاہ کیواں جاہ سے پھیر کے اگر منہ پیر صبح + خشم سے جلاد گردوں ہو گریباں گیر صبح
ذات والا کو نہ کیوں مجمع اوصاف کہوں + جس میں ہیں خلق و کرم حلم و حیا شوکت و شان
آپ کے دبدبہ و رعب و جلالت سے مدام + کیوں نہ ہو جسم عدو بید کی صورت لرزاں

دعا اور حسن طلب وغیرہ کے حوالے سے بھی شیفتہ کنتوری نے روایتی انداز ہی روا رکھا ہے

لطف کر راہ سخاوت سے عقیدہ کا حل + غیر کے آگے نہ پھیلاؤں کبھی تا داماں
یا خدا اس کے ممدوح کے احباب و عزیز + غنچۂ گل کی طرح سے رہیں خنداں شاداں

شیفتہ نے قصائد میں فارسیت کا حامل پیچیدہ اسلوب نہیں اپنایا۔ وہ بات کہنے کے براہ راست انداز ہی پر قناعت کرتے ہیں۔ منظر نگاری اور فطری ماحول کی عکاسی کے ضمن میں انہوں نے اپنے عہد میں بننے والی نئی روایت سے استفادہ نہیں کیا۔

شیفتہ کے نعتیہ قصائد کا تذکرہ ملتا ہے عبدالجبار ملکاپوری نے لکھا ہے:

" ایک دیوان عاشقانہ غزلوں اور صوفیانہ رباعیوں پر مشتمل تھا اس کے علاوہ دو ایک دیوان نعتیہ قصائد میں بھی تھے"۔ (۱) یہ نعتیہ دیوان مطبوعہ صورت میں دستیاب نہیں ہوئے

---

(۱) تذکرہ شعرائے دکن جلد اول ص ۵۲۶

حبیب کنتوری

محمد کاظم حبیب کنتوری [م 1909] ریاست حیدرآباد میں اسسٹنٹ کلکٹر تھے۔[1] ان کی قصیدہ نویسی کا لالہ سری رام نے بھی تذکرہ کیا ہے[2] نواب میر محبوب علی خاں کی شان میں مدح محبوب کے نام سے ایک غیر مطبوعہ مجموعہ قصائد کا سراغ ملتا ہے۔ ان کا دیوان دیوانِ حبیب کے نام سے چھپ چکا ہے[3] اس میں ایک قصیدہ میر محبوب علی کی شان میں دستیاب ہے اس کا مطلع یہ ہے

ع پسند طبع ہے اے شاہدِ خیال گرہ + کہ اپنی زلف معقد گرہ پہ ڈال گرہ [دیوانِ حبیب ص 17]

اس قصیدہ پر تقریظ لکھتے ہوئے سید مرتضیٰ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے

"نظرِ مختبر میں ابتدا جس نظم نے جناب حبیب کی شاعری کو وقیع بنایا وہ قصیدہ سالگرہ مبارک حضرت بندگانِ عالی ہے جس کی زمین ہے سالگرہ، مقالگرہ۔ یہ قصیدہ میرے خیال میں وہ درجہ رکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص عمر بھر ایک شعر نہ کہے اور صرف ایک قصیدہ ایسا کہے تو اس کی استادی کے لیے یہی کافی ہے دقتِ معانی، شوکتِ الفاظی، متانتِ ترکیب اور لطافتِ تشبیہات و استعارات کو معجب بلکہ معجزانہ انداز سے یکجا فرمایا ہے"[4]

دکن کے معتمد امور داخلہ سید عبدالحق خاں سردار دلیر جنگ دلیر الدولہ بہادر کی شان میں دکن سے ۱۳۰۳ھ میں شائع ہونے والے قصائد مدحیہ[5] میں بھی ان کے قصائد موجود ہیں۔ اس کا پہلا قصیدہ یہ عنوان رکھتا ہے "قصیدہ در تہنیت مراجعت از سفر مبارک لندن و کامیاب در معاملۂ چاندا ریلوے و خطاب سردار دلیر الدولہ بہادر"

ع نظر آیا ہے وقتِ صبح وہ منظر ضیا افگن + شعاع مہرِ تاباں جس کے در پر بن گئی چلمن

ع دکھایا لطف چاندا ریلوے کی کامیابی نے + ہوئے ہیں صورتِ برگِ خزاں پژمردہ دل دشمن

حبیب کا ایک اور قصیدہ عبدالحق دلیر الدولہ[6] کی شان میں دستیاب ہے یہ عید الفطر کی تہنیت بابت ۱۳۰۱ھ میں لکھا گیا تھا اس کا مطلع ہے

ع فصلِ گل آئی ہے اے بلبلِ خوش نغمہ نوید + ہاں صبا خط گلزار میں دے لکھ کے رسید

ان کے ایک اور سنگلاخ قصیدہ کی بابت کچھ علم ہوتا ہے یہ بھی نواب میر محبوب علی خاں کی تعریف میں ہے اس کے ۲۳ اشعار ہیں مطلع ہے

ع ابرو میں اپنے ڈال نہ اے مہ جبیں گرہ + بجلی بنے گی آئینہ میں آتشیں گرہ

حبیب کے قصائد میں تشبیب کہیں محبوب کے حسن و جمال کے تذکرے سے معمور ہیں اور کہیں گل و گلزار کے خوب صورت بیان سے۔ ان میں وہ اختصار سے کام لیتے تھے چند اشعار دیکھیے

ع جمن نقش و نگار در سے نقش خامہ مانی + عیاں آئینۂ تصویر سے محبوب کا جوبن

ع لے اٹھا ابر سیہ اور چلے سرد ہوا + بس وہ ہوا سرسبز ترا نخل امید

ع ہر طرف طائر خوش نغمہ ہیں شاخوں پہ نہال + جھوم کر کرتے ہیں فیاضِ ازل کی تمجید

مدحیہ حصوں میں حبیب کنتوری نے ممدوح کو شیر افگن، حامی ایمان، صفدرِ میدان، کشافِ دقائق، ادئی علم ذی ہنر، سخی، جواد، رشکِ جمشید وغیرہ کے الفاظ سے سراہا ہے۔ اور ان کے عہدے سے ہونے والی ترقیوں کی تعریف کی ہے

---

(1) اردوئے معلیٰ جنوری ۱۹۵۸ء ص ۲ مضمون از حسرت موہانی (2) خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۳۸۵-۳۸۸

(3) دیوان حبیب از محمد کاظم حبیب موسوی مطبع شمسی حیدرآباد دکن ۱۳۱۹ھ (4) ایضاً ص ۱۴-۱۵

(5) قصائد مدحیہ در مطبع گلزار دکن ۱۳۰۳ھ (6) دلیر الدولہ معتمد دولتِ آصفیہ تھے

مولانا محمد حسین آزاد

(رفقائے عہد غزل دہلی) ①

مولانا محمد حسین آزاد [م 1910] کے مجموعۂ کلام خمکدۂ آزاد میں تین نامکمل اور سات مکمل قصائد ملتے ہیں۔ ان کے چند قصائد مہاراجہ رندھیر سنگھ والیٔ جیند کی شان میں ہیں۔ ایک نامکمل قصیدہ ذوق کی تعریف میں ہے اور ایک میں بیٹھ کی ان کے قصائد کی ناقدری کا تذکرہ نبیرۂ آزاد طاہر نے لکھا ہے "آپ ذرا خیال تو فرمایئے خاقانی ہند کا جانشیں اپنا قصیدہ لے کر نافہموں کے مجمع میں کھڑا ہے۔ دل و جگر کو خون کیا ہے اور آنکھوں سے تیل ٹپکایا ہے اور کوشش کی کہ آسمان سے آسان قصیدہ لکھ کر سناؤں مگر سب سن کھڑے ہیں اس وقت دل خون ہو کے بہہ گیا ہوگا اور جلد جلد کہے دربار اور جلسے آنکھوں میں پھر جاتے ہوں گے۔"② آزاد خود لکھتے ہیں ؎

ہو تے مرے قصیدے تھے شاہوں کے سر کے تاج + روشن تھے جن سے جوہر پاکیزہ گوہری

میں ڈھالتا تھا رات کو جو تاج زرنگار + رکھتا تھا سر پہ صبح کو خورشید خاوری

دیتا جو طرۂ ہائے جواہر نگار میں + ہوتے تھے بہر اہل دول تاج سروری

پر ہائے کیا کروں کہ زمانہ نہیں رہا + وہ نکتہ ور ہیں اب نہ ہے وہ نکتہ پروری

مولانا محمد حسین آزاد کے قصائد کی چند زمینیں ملاحظہ ہوں

در منقبت حسین ③ ہمارے سوز نہاں سے ہو گر عیاں آتش + زبان شعلہ پکارے کہ الاماں آتش

④ صبا گزارتی ہے گل کو پرچۂ اخبار + کہ آئی فوج خزاں برسر فشون بہار

مدح مہاراجہ جیند ⑤ طرب سے ہے از بسکہ جام دل معمور + تو ذرہ ذرہ میں ہے جام آفتاب کا نور

الفیاً ⑥ کس جستجو میں گھومتا ہے یاں چرخ آسماں + دن رات پھرتا جو نہیں دم بھر آسماں

الفیاً ⑦ فروغ نور سے کس کی ہے یہ جہاں روشن + کہ ہے زمیں سے دلا تا بہ آسماں روشن

⑧ ہجوم فکر سے ہو کر نہنگ میں ناکام + فضائے وادی دل میں سحر تھا گرم خرام

⑨ نقش خرد کو دے کے نگاہ سخنوری + آزاد نے سجایا ہے دربار اکبری

آزاد نے اپنے قصائد میں احوال واقعی کا اہتمام کیا ہے اور ایک جوہری کی طرح مضامین مستند کو اپنے فکر کے وسیلے سے منتخب بھی کیا ہے۔ جگہ جگہ حوالے اور اسناد ان کے علم کو ظاہر کرتے ہیں آزاد کے قصائد میں مضامین برجستہ اور الفاظ کی بندشیں عمدہ ہیں انہوں نے تشبیب نگاری پر زیادہ زور صرف نہیں کیا۔ مدحیہ حصوں میں ان کا قلم رواں اور پر تسلسل نظر آتا ہے۔ "دم بھر آسماں" اور "الاماں آتش" والے قصائد کی مشکل زمینوں کا انداز کیجیے۔ ذوق کی طرح زمینوں میں عمدہ اشعار نکالے ہیں۔ آزاد کے قصائد میں عجمی حوالے کثرت سے ملتے ہیں

---

① خمکدۂ آزاد محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۵ ② ایضاً ص ۱۰ ③ ایضاً ص ۷۱ ④ ص ۸۱ ⑤ ایضاً ص ۸۲ ⑥ ایضاً ص ۸۹ ⑦ ایضاً ص ۹۲ ⑧ ایضاً ص ۹۲ ⑨ ص ۹۸

ان کے یہ اشعار دیکھیے سہ پڑے ہیں دیر مغاں سرد، چل دل سوزاں + برائے پیر مغاں لے کے ارمغاں آتش

چمک رہی ہے یہ کس نوجوان کی گرمی سے + کہ خاک ہو گیا زرتشت ہے جواں آتش

فراسیاب و کیومرث و نوذر و ہوشنگ + قباد و طوس سے لے تا بہ خسرو پرعنوں

ملک سپاہ و فلک بارگاہ و کیواں جاہ + کہ ہفت ہشت سے جس کا غلام ہے گردوں

براس و جیب پہنے آئین بزم پر تزئین + سکندر آئینہ جمشید ہے لیے ہوئے جام

آزاد نے حسینؑ کی مدح بیان کرتے ہوئے عقیدتمندانہ جذبات کا اظہار کیا ہے

ع وہ یوں ہے نور الٰہی سے ملحق و منضم + کہ جیسے ہو وے حرارت سے توأماں آتش

کرے جو تیر ترا کفر پر عیاں آتش + زبان شعلہ سے دینے لگے اذاں آتش

ایک قصیدے میں آزاد نے صرف و نحو، لغت، صحاح، قاموس، محاورات عرب، حدیث، اصول، فقہ، فرائض، فتاوائے ملت حنفی، قرأت، تفاسیر، فلسفہ، منطق و حکمت، ہیئت و نجوم، طب، رمل، جفر، شاستر، چار بید، ہشت پران، ژند و اوستا، طبیعی علوم، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ کا تذکرہ کر کے ان علوم سے اپنے ربط کا اظہار کیا ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں فنون حرب سے متعلق اصطلاحات و الفاظ استعمال ہوئے ہیں

ع لسان ترک فلک آیا لے کے لشکر جنگ + کہ گل سپاہ ہزارہ کا ہے سپہ سالار

کمربندی، ہتھیار، تفنگ و جزائل، سنتری، وردی، سپر، مصاف، القواب، ترنج دانار، نیزۂ خونخوار، کمند مشکیں، مورچہ، توپ، نبرد، جوان اور اس نوع کے لوازم کئی الفاظ اس قصیدہ کا حصہ بنے ہیں۔

ع کھڑا نقاسہ و سبھی آگے سنتری کی طرح + پہن کے وردی سبز اپنے پہرہ پہ بیٹھا یار

آزاد نے ممدوح کے عدل، غضب، خوف، تفنگ، خدنگ، سخا و حفظ، کرم و علم، سمند، گلگوں، شمشیر وغیرہ کی تعریف میں عمدہ اشعار لکھے ہیں

زہے عدالت و انصاف جس کے سامنے ہے + زمیں کے حلقہ سے نوشیرواں کا بٹ گیا نام

صدائے توپ تفنگ ان کے معرکہ میں سدا + برائے روح مخالف ہے موت کا پیغام

بزور تیغ مخالف شکار ہو تسخیر + دیار ہند سے تا چین و روم سے تا شام

مولانا محمد حسین آزاد نے نہ صرف اپنے قصیدوں کو بہت زیادہ مرصع و مزین کیا ہے اور نہ ہی ان میں بول چال کی زبان کو در آنے دیا ہے۔ انہوں نے قصیدوں کا وقار و شکوہ قائم رکھنے کے لیے فارسی آمیز زبان کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ آزاد کے قصائد قصائد کی تاریخ میں تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی دوامی اور مستقل حیثیت کے بارے میں یہی کیا جا سکتا ہے کہ یہ زیادہ دیر پا نہیں ہیں

سرور جہاں آبادی

درگا سہائے سرور جہاں آبادی [م 1910] عہدِ جدید کے عمدہ نظم گو ہیں ان کے شعری مجموعہ جامِ سرور کا دیباچہ نوبت رائے نظر لکھنوی نے لکھا ہے۔ اس میں سرور کے قصائد کا تذکرہ بھی کیا ہے[1] حکم چند نیر نے ان کے چودہ قصائد کی خبر دی ہے[2] مگر وہ سب قصیدے کی تکنیک میں نہیں ہیں۔ ان کی ایک نظم جو لکشمی دیوی کی مدح میں ہے قصیدے کی روح سے قریب ہے۔ لکشمی ہندوؤں کے نزدیک دولت کی دیوی ہے۔ اس قصیدہ نما نظم کے چند اشعار یہ ہیں

سہ شبِ مہورت وہ عجب تھی وہ عجب شبھ تھی لگن + کہ جب آکاش سے اترا تھا ترا سنگھاسن

اک چکا چوند کا عالم دمِ نظارہ تھا + گورا گورا تنِ نازک تھا سراپا کندن

تھی چمک کیا وہ ترے چاند سے رخسار و لب کی + کسی مندر میں تھے یا گھی کے دیئے دو روشن

ترچھی بانکی وہ کمانیں تھیں کڑی دونوں بھنویں + لیٹے لپٹے تھے جنہیں بن میں کبھی راکھ لگن

تیرے ماتھے پہ تھا چندن کا لگا یا ٹیکا + اپسراؤں نے کیا تھا ترے رخ پر ابٹن

ناز تھا شاہدِ رعنائے ازل کو جن پر + تیرے حصے میں وہ تیوریں تھے آئے الہون

رخِ تاباں پہ برستا تھا ترے نورِ ازل + بن کے ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی پھرن

بھولی بھالی سی وہ صورت وہ ادائیں پیاری + نیچی نیچی وہ نگاہیں وہ انوکھی چتون

کوکلا سی وہ تری میٹھی سریلی آواز + میٹھے میٹھے ترے ڈوبے ہوئے اترے ہیں بچن

گوری گوری تھی جبیں نرم کی صندل کوئی نار + زلف تھا یا کوئی صفرا کی سکھی شام برن

خوشنما کانوں میں کنڈل تھے تو ہاتھوں میں کنول + اوڑھنی ہلکی سی ریشم کی تھی اک زیبِ بدن

درگا سہائے سرور کے اس قصیدہ میں مقامی ہندی عناصر بھی ملتے ہیں اور اسلامی اشارے بھی۔ ان کی شاعری میں منظر کشی اور عوامی جذبات کی ترجمانی کی خوبیاں بھی ملتی ہیں۔ سرور نئے نئے موضوعات ڈھونڈنے کے رسیا تھا ان کے خیالات عمدہ اور زبان سادہ ہے۔ انگریزی نظموں کے تراجم نے بھی ان کے اسلوبِ شاعری کو متاثر کیا ان کی جن نظموں کو قصائد قرار دیا جاتا ہے وہ ہیں ’بربیڈلا کا تذکرہ‘ دنیا کی اجڑی ہوئی محفل‘ بے ثباتیٔ دنیا‘ بے ثباتیٔ زمانہ‘ مسرتِ شباب‘ شیون عروس‘ نیند مجھی‘ نیچرل شاعری‘ بدنصیب بنگال‘ اجڑی ہوئی دلی‘ پدمنی کی چتا‘ نور جہاں کا مزار اور چتوڑ کی عظمت وغیرہ[3] ان میں اگر قصیدوں کی ہیئت استعمال کی گئی ہے تو بھی انہیں قصیدہ نما نظمیں ہی کہا جائے گا کیونکہ ان میں عناصر و اجزائے قصیدہ درستیاب نہیں ہیں سرور جہاں آبادی کی شاعری میں ہندی ماحول، تاریخ اور اساطیر کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں انہوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ اور تاریخی شخصیات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے

---

(1) بحوالہ ادیب الہ آباد فروری 1911 (2) سرور جہاں آبادی از حکم چند نیر ص ۳۱۲ - ۳۱۷ (3) ایضاً

عبدالغفور ضرغام

(۱)

عبدالغفور ضرغام: ۱۹۱۵ء "محبوب نظر مدیح محبوب" نامی کتابچہ میں میر محبوب علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ طبع ہوا ہے اس میں انہوں نے نواب ممدوح کے عہد میں حیدرآباد میں ہونے والی علمی، فنی ترقی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس قصیدے سے وہاں کی ثقافتی زندگی کی کئی اور تصویریں بھی سامنے آتی ہیں۔ یہ قصیدہ مہاراجہ مدارالمہام بہادر کے ایک طرح مصرعہ پر لکھا گیا ہے طرح مصرعہ تھا

ع ہے زیب سروری و زینت جہانداری

اس قصیدہ کا مطلع ہے ؂

ہزار نغمہ تحمید حضرت باری + ہے جس کے فیض کی مخلوق کو طلبگاری

اس میں ضرغام نے علوم فقہ و احادیث کی تعلیم کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل بیت اطہار کے لیے حسن ازماں نظامی نے ان علوم کو جمع کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اے نواب تمہارے عہد میں علوم و فنون تازہ ہوئے ہیں ان میں طبابت، مساحت، فنون معماری، حدیث، فقہ، فرائض، عقائد، تفسیر، ریاضی، ہندسہ، نجوم، جفاری وغیرہ نے ترقی کی ہے

؂ تمہارے وقت میں پل ریل اور خزانۂ آب + تمہارے وقت میں سڑکیں بنیں بہت ساری

فلک نما و فلک پیٹھ اور سیف آباد + یہ وسط چوک میں گھڑیال گھر کی تیاری

تمہارے عہد میں اے حضرت حضور نظام + بروم اور فٹن گاڑیاں موٹر گاری

مشین سینے کا فوٹو و فونو اور ہیلو + لباس ریشمی اونی نئے قلمکاری

کچہریوں میں کلاک ٹیپ اور مینوگرام + نفیس ڈسک و کرسی و میز و الماری

جگہ جگہ پہ شیلیفون رشپہ کا صندوق + یہ ہر محلہ میں دوکان عطر و پنساری

علاوہ ازیں ضرغام کہتے ہیں کہ پولیس نے لوگوں کو ٹھگی اور ڈکیتی سے بچا رکھا ہے۔ حیدرآباد میں حضری، یونانی اور بیطاری طبیب جمع ہو گئے ہیں۔ مسافر خانوں کی ترمیم اور تیاری ہوئی ہے چھاپہ خانے اور سیکل دیکھنے کو ملے ہیں۔ ہزار قسم کے کپڑے، شیشہ و آلات اور ظروف بننے لگے ہیں۔ عمارات پر نقش و گلکاری ہوتی ہے کوچہ بہ کوچہ نظام کے فیض سے آب صفا کی نلکاری ہے۔ حیدرآباد میں بہت سے فرقے ہیں قادری، چشتی، شطاری، نقشبندی، سہروردی، ابوالعلائی، رفاعیہ اور احراری ہیں۔ مغل، پٹھان، شیخ زادے، سید، ہنود، پارسی، گجراتی، اجاری بھی ہیں یہ سب نظام کے لئے دعاگو ہیں۔ انگریز اور فرانسیسی بھی خلوص دل سے سرکاری کاموں میں منہمک ہیں

برہمن اور مسلمان و پارسی رجپوت + ہم ہیں دوست اسے ہیں ایک غمخواری

ضرغام یہ بتاتے ہیں کہ نظام کے عہد میں ایشیائی، اوکین، افریقی، مشرقی، مغربی، ملیباری، سیامی، اناقی، ملاتی، فرانسی، جرمنی، تبتی، تاتاری، ترک، ایرانی، بلغاری سب خوش ہیں۔ یہ قصیدہ اپنے نئے مزاج کی بنا پر اہم ہے

(۱) محبوب نظر مدیح محبوب مرتبہ ضرغام در مطبع محبوب شاہی حیدرآباد دکن ص ۹

ظہیر الدین ظہیر

ظہیر الدین ظہیر دہلوی [م ۱۹۱۱ء] پرگو شعرا میں سے ان کے چار دواوین کا ذکر ملتا ہے۔ (۱)
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ان کی بہت سی غزلیں اور قصائد تلف ہو گئے (۲) مطبع مفید عام اور مطبع کریمی بمبئی سے ان کے دواوین چھپے (۳)۔ جنگ آزادی میں تلف ہونے والے قصائد کے بارے میں انہوں نے اپنی کتاب داستان غدر میں چند اشارے کیے ہیں اس میں بہادر شاہ ظفر، ولی عہد دہلی کی مدح میں ان کے قصائد کے چند اشعار (جو انہیں یاد رہ گئے) مندرج ہیں

در مدح بادشاہ
ہوائے موسم باراں سے کچھ بعید نہیں + بنے جو خانۂ گلشن نگار خانۂ چیں
نسیم آیۂ سبحان ربی الاعلیٰ + گلوں کے کان میں کرتی ہے صبحدم تلقیں

در مدح ولی عہد
نسیم مست نکلتی ہے جوش مستی میں + لپٹ لپٹ کے جوانان باغ سے ہر بار (۴)

ظہیر دہلوی ذوق کے شاگرد تھے تاہم ذوق جیسے بلند پایہ قصائد ان کے قلم سے نہیں نکلے۔ انہوں نے مذہبی اور غیر مذہبی ہر دو نوع کے قصائد لکھے۔ حمد، نعت اور منقبت کے قصائد میں ان کی عقیدت کی جھلکیاں ملتی ہیں ظہیر دہلوی کے غیر مذہبی ممدوحین میں ملکہ وکٹوریہ، نظام دکن، والئی ٹونک اور والیہ بھوپال شامل ہیں۔ ظہیر تشبیب نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ جن قصائد میں تشبیب کا اہتمام ہے مخزیہ، بہاریہ اور تہنیتی مضامین پر مشتمل ہے۔ لیکن جس نوع کی شاعرانہ مہارت اور رنگین بیانی درکار تھی وہ ان میں موجود نہیں ہے۔ مدحیہ اشعار میں بھی انہوں نے مضمون آفرینی کی کوشش نہیں کی۔ ظہیر مختلف تقریبات پر قصیدے لکھا کرتے تھے ان میں شان و شوکت پیدا کرنے میں کوشاں ہوتے اور زیادہ تر روایات کی پابندی کرتے ملکہ وکٹوریہ کے قصیدہ میں سے یہ اشعار دیکھئے

ہر شجر بلور کا رشک نہال طور ہے + بافروزاں ہے ثریا زیر سقف آسماں
خسرو اقلیم یورپ بادشاہ انگلینڈ + مرجع اہل جہاں شاہنشہ شاہنشاہاں (۵)

ظہیر دہلوی کے قصائد کے بعض اشعار اپنے رنگ اور بنت میں فکری عنصر رکھتے ہیں البتہ ان کی متخیلہ میں تنوع نہیں ہے۔ ان کا اسلوب بھاری بھرکم بھی ہے اور فارسیت کے کھلے اثرات کا حامل بھی۔ علم و فضل کے اظہار میں بھی وہ کسی قصیدہ نگار سے کمتر نہیں ہیں۔ شاعری محض عالمانہ اسلوب کا نام نہیں ہے اس میں تخیل کی جولانی اور جذبے کا تحرک بھی ہونا لازمی ہے۔ ظہیر اس حوالے سے تخلیقی اسلوب سازی سے قاصر رہے ہیں ان کے یہ اشعار دیکھئے

حکم سنت ترا ناسخ قوانین ملل + سمت حق تری مطاع دلیل و برہاں
قول فیصل ترا ابطال دلیل و تکذیب + دعوت صدق تری رفع نزاع ادیاں
نور باطن ترا گنجینۂ رمز مخفی + دل روشن ترا آئینۂ اسرار نہاں
تیری تحقیق نظر پردہ کشائے اوہام + تیری تصدیق بیاں چہرہ نمائے ایقاں

---

(۱) اردو شاعری پر ایک نظر از محمد جمیل احمد ص ۱۹۶ غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی (۲) اردوئے معلیٰ ص ۵ جون ۱۹۱۱ مضمون ظہیر دہلوی از حسرت موہانی۔ (۳) دیوان ظہیر جلد اول مطبع مفید عام، جلد دوم، سوم مطبع کریمی بمبئی (۴) داستان غدر ص ۲ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۵۵ (۵) اس قصیدے میں انہوں نے انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں

ظہیر دہلوی نے محبوب علی خاں مختار بادشاہ دہلی کی شان میں اپنے ایک قصیدے میں حسن طلب کا یہ انداز دکھایا ہے:

سال میں ایک مہینہ رمضاں ٹھہرا + حکم کرتا ہے پئے صوم خدائے متعال
اور مجھے چار مہینے متواتر گزرے + آخری ماہ جمادی سے لگا تا شوال
روزے رکھوائے مجھے چار مہینے پیہم + لیکن آیا نہ افطار کا اب تک نہ خیال (۱)

ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب داستان غدر میں لکھا ہے کہ مہاراجہ اجیت سنگھ بہادر والئ پٹیالہ نے انہیں صلۂ قصیدہ و وجیہ میں خلعت دوشالہ زریں و سیلہ مندیل بنارسی و پارچہ قیمتی ششش صد روپیہ عطا فرمایا (۲)

انہوں نے مہاراجہ الور کی سالگرہ پر جو قصیدہ پڑھا اس کے بارے میں کہتے ہیں "ایک بار میں نے سالگرہ کا قصیدہ پڑھا جس وقت میں نذر دینے کو گیا میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر سوال کیا کہ کیا چاہتا ہے میں نے عرض کی حضور نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے اب میرے مانگنے کی حاجت ہی کیا کوئی ایک ہاتھ تھامتا تو عمر بھر اس کی دستگیری کرتا ہے حضور نے تو میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اب مجھے کیا حاجت رہی فرمایا یہ خوشی کی باتیں ہیں ۔ میں نے عرض کی کہ قصیدہ ملاحظہ ہوا لکھا ہوا کیسا ہے فرمایا بہت اچھا ہے سالگرہ بیاض کے ہاتھ میں نے عرض کی کہ قصیدہ میرا نہیں ہے اور شخص کا ہے فرمایا بہت اچھا لکھا ہے میں نے عرض کی باوجود اس کمال کے روٹی کو محتاج ہے ۔ اس قصیدہ کے صلہ میں اس غریب کی پرورش ہو جائے فرمایا کون شخص ہے میں نے عرض کی دولہ خاں پٹھان کی پلٹن کا ایک سپاہی ہے حکم ہوا سامنے بلواؤ عرض کروہ سامنے حاضر ہوا اور اس کا بیس روپیہ ماہوار مقرر کر کے کتب خانہ میں تعینات کرا دیا گیا ۔" (۳) یہ واقعہ ظہیر دہلوی کی اعلیٰ ظرفی کو بھی ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی اس دور میں قصیدہ نگاری کی معاشی اہمیت کو بھی واضح کرتا ہے ۔ "نوٹنکی میں شعر و شاعری" کے عنوان سے انہوں نے ایک اور واقعہ لکھا ہے جس سے اس عہد کے ریاستی درباروں میں حساد شعرا کی عیاریوں کا اندازہ ہوتا ہے وہ کہتے ہیں " روز اول جو میں نے قصیدہ سالگرہ کا سنایا اور جس کی نسبت یہ کہا گیا تھا کہ یہ استاد ذوق کا قصیدہ ہے میرے شاگرد صاحبزادہ احمد سعید خاں نے اس کی صبح کو یہ کام کیا کہ کہیں سے دیوان ذوق مانگ کر لائے ۔ اس کو بجائے خود میرے قصیدہ سے ملا کر دیکھا تو زمین و آسمان کا فرق اس کی تشبیب میں تھا ۔ استاد کے قصیدہ میں غسل صحت کی تشبیب تھی میرے قصیدہ میں سالگرہ کی وہ اس سے کیونکر مطابق ہو سکتا تھا علاوہ بریں مدح میں بڑا اختلاف ، وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ ذرا آپ میری خاطر سے تھوڑی سی تکلیف اور کیجیے اور ان صاحب کے مکان تک چلیے ۔ میں نے کہا میاں جانے بھی دو حساد ایسا ہی کیا کرتے ہیں وہ مصر ہو گئے کہ میں لے ہی چلوں گا غرض کہ وہ مجھے ہمراہ لے کر وہاں پہنچے اور جا کر کہا لیجئے حضرت وہ چور ڈاکو سب موجود ہیں ۔ یہ دونوں قصیدے بھی موجود ہیں اور کہنے والے بھی ۔ جو حضرات یہ فرماتے تھے کہ استاد کا قصیدہ پڑھ دیا وہ کون صاحب ہیں ایک صاحب بولے کہ ہم ہیں ہم کہتے ہیں احمد سعید خاں نے پوچھا آپ کس واسطے استاد کا قصیدہ بتاتے ہیں جواب ملا زبان استاد کی اور متانت اور مضامین پکار رہے ہیں

---

(۱) داستان غدر ص ۱۴۳ (۲) ایضاً ص ۳۵ (۳) شیو پرشاد سنگھ (۴) داستان غدر ص ۲۱۱، ۲۱۲

زمانۂ حال میں کوئی نہیں کہہ سکتا اس وقت وہ دونوں قصیدے پڑھوائے گئے اور ان حضرات کو قائل معقول کیا گیا"(۱)
اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ زبان خلق، قنانت اور مضامین وغیرہ کے حوالے سے ظہیر دہلوی اپنے استاد سے ہم آہنگ
ہوں گے حالانکہ ذوق اور ظہیر کے قصائد میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

نواب محمد امیر خاں رئیس ٹونک کے بارے میں ظہیر نے لکھا ہے "مفیدہ بلبجیر صلہ کے سننا حرام جانتے ہیں
بخلاف امرائے حیدر آباد، نواب صاحب ممدوح شاعر کی قدر و منزلت اور اعزاز فرماتے ہیں(۲) ظہیر کا تعلق ریاست
حیدر آباد سے بھی رہا وہ میر محبوب علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں " بہ نفس نفیس نہایت دانا، مدبر اور ہوشیار
روشن دماغ و روشن خیال، رحیم، رعیت نواز رعیت دوست، رعیت پرور، خلیق، وجیہ، خوش رو، خوش خو، سخن گستر،
حق پسند، بہمہ صفت موصوف ہیں فی زماننا ابراہیم بک عادل شاہ ثانی کہنا چاہیے اور نتیجہ رعایا پروری اور تالیف قلوب
کا یہ رنگ ہے کہ تقریب میں رعایا اور ملازمین اپنے پاس سے زر کثیر صرف کر کے آرائش شہر اور روشنی وغیرہ
کا سامان فراہم کرتے ہیں اور محافل رقص و سرود گرم کر کے عیش و نشاط مناتے ہیں اور دل و جان سے اپنے بادشاہ مہربان
پر نثار اور قربان ہیں"۔(۳)

ظہیر دہلوی نے داستان غدر میں اپنے طرز کلام اور اپنی شاعری کے انداز کا بھی تذکرہ کیا ہے اور استاد ذوق
مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور حافظ غلام رسول کی صحبتوں سے استفادہ کرنے کا اعتراف بھی کیا
ہے۔ انہوں نے اسد اللہ غالب کی صحبت میں بیٹھنے کی بھی بات کی ہے اور لکھا ہے مگر اصلاح سخن کسی سے نہیں لی
لیکن ان بزرگواران اور دیگر کاملین کے کلام کو دیکھ کر بنظر غور استفاضہ حاصل کیا اور اپنی طبیعت کے زور سے ان
تینوں استادان وقت ذوق، مومن، غالب کے کلام کا لب لباب اخذ کر کے اپنی طرز جداگانہ اختیار کی۔
مومن صاحب کے مضامین اور نازک خیالی و سوز و گداز کا اتباع کیا۔ مرزا غالب صاحب کی بندش و ترکیبات کی تقلید
اختیار کی(۵) وہ اپنے طرز کلام کے بارے میں مزید لکھتے ہیں " اس کے علاوہ جو کلمات کہ میری فہم ناقص میں
مذموم اور غیر فصیح ناجائز مفہوم ہوئے ان سے احتراز کیا۔ ان کو متروکات میں شامل کیا خذ ما صفا و دع ما کدر،
نان بر شیر حال با روغن تلخ گندہ الدیجاد بندہ، میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ مجدد وقت ہوں اور حضرات بھی
میری تقلید اختیار کریں۔ میں نے کوئی متروکہ لفظ اپنے کلام میں شامل نہیں کیا"(۵)
ظہیر دہلوی کے قصائد میں بندش و ترکیبات کے حوالے سے تقلید غالب کا اندازہ ملتا ہے اور یہ بھی درست
ہے کہ ان میں کوئی مذموم، غیر فصیح اور متروک لفظ نہیں آنے پایا۔

---

(۱) داستان غدر، ص ۲۹۱ (۲) ایضاً ص ۲۹۷ (۳) ایضاً ص ۳۰۵ - ۳۰۶ (۴) اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابراہیم ذوق
خاقانی ہند کا شاگرد ہوا اور وہ زمانہ جاہلیت کا تھا (۵) ایضاً ص ۳۱۱ - ۳۱۲ (۵) ایضاً ص ۳۱۲

امیر اللہ تسلیم

امیر اللہ تسلیم [م ۱۹۱۱] لکھنؤ، رامپور اور منگرول کے نوابوں کے مداح تھے۔ جب لکھنؤ کی شاہی بلیٹن بدنظمی کا شکار ہوئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریذیڈنٹ کی شکایت پر ان کی ملازمت جاتی رہی اس کے بعد انہوں نے سید علی قبول کی وساطت سے ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کیا بادشاہ نے اپنی جیب خاص سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا[1] اس قصیدہ کا مطلع تھا

کس طرح نہ دل تڑپے رگ جاں کے برابر + پردم ہے دم خنجر بر آں کے برابر

تسلیم نے تاریخ بدیع کے حوالے سے نواب کلب علی خاں (رامپور) کے آباؤ اجداد کی منظوم تاریخ بھی لکھی ہے[2]

دفتر خیال تسلیم کا تیسرا دیوان ہے[3] اس میں غزلوں سے قبل قصائد طبع ہوئے ہیں ان کے قصائد کے چند مطالع یہ ہیں

نغمہ سنجی کے نہ قابل نہ سزاوار بیاں + بلبل تصویر ہوں رکھتا نہیں گویا زباں

در مدح واجد علی شاہ

جھکے ہیں دیدۂ بے خواب سے کیا کیا گوہر + دیکھتے دیکھتے مٹ مٹ گئے صد ہا گوہر

طبع رنگیں نے کھلائے پھر نئے دو چار گل + پھر چراغ ہوش خاسد ہو گیا یکبار گل

نعتیہ قصیدہ

فقر میں لقدیر دیتی ہے لباس اغنیا + جسم عریاں پر آ تو ہوتا ہے نقش بوریا

حسرت موہانی کے بقول تسلیم "امیر سے نہیں تو داغ و جلال و ظہیر کے قصائد سے تو ضرور برابری کا دعوی کر سکتے ہیں"[4] کاملان رامپور[5] اور خمخانہ جاوید[6] کے مولفوں نے بھی ان کی قصیدہ گوئی کا تذکرہ کیا ہے۔

امیر اللہ تسلیم کے قصائد میں مضمون بلند، الفاظ رنگین و بلیغ اور فصاحت کی دلکشی دیدنی ہے ان کے رمزی اور ایمائی انداز نے ان کی بعض تشابیب کو غزلیہ بنا دیا ہے۔ زور بیاں اور روانی کے عناصر ان کے قصائد کو بلند پایہ بناتے ہیں۔ الفاظ کا موثر استعمال اور دلفریب تراکیب انہیں اپنے معاصرین سے ممیز کرتی ہیں۔ ان کے الفاظ کی شادابی اور ترکیب کی دلفریبی کے حوالے سے حسرت موہانی نے انہیں امیر مینائی پر فوقیت دی ہے[7] یہ تقابلی مطالعہ بعض حوالوں سے تو درست ہو سکتا ہے تاہم ایسی کیفیات بھی موجود ہیں جن کے حوالے سے امیر، داغ اور جلال ان پر فوقیت رکھتے ہیں مثلاً امیر مینائی کے الفاظ کی جمالیاتی نشست و برخاست اور اس کی بدولت پیدا ہونے والے زور بیاں سے تسلیم کے قصائد کا زیادہ سروکار نہیں ہے۔ ظہیر دہلوی کے قصائد تو خیر اس درجہ پر نہیں پہنچے کہ ان کا تسلیم کے قصائد سے مقابلہ کیا جائے البتہ داغ دہلوی کے قصائد میں موجود زور و قدرت، جوش و خروش اور محاورہ بندی وغیرہ کے سامنے تسلیم کا چراغ جلتا نظر نہیں آتا۔ یہی نہیں جلال کے اشعار میں موجود سادگی بھی تسلیم کے حصے میں نہیں آسکی یہ ضرور ہے کہ تسلیم رنگینیٔ بیان اور اظہار علمیت و بلاغت کے حوالے سے جلال پر کسی حد تک فوقیت رکھتے ہیں

---

(1) حیات تسلیم از ضمیر الدین احمد عرش ص ... عمخوار عالم پریس لاہور (2) تاریخ بدیع از تسلیم مطبع حسنی رامپور ۱۲۹۱ھ

(3) دفتر خیال مطبوعہ رامپور ۱۲۹۸ھ (4) امیر اللہ تسلیم از حسرت موہانی اردوئے معلیٰ اگست ۱۹۱۱ (5) تذکرہ کاملان رامپور ص ۴۳

(6) خمخانہ جاوید جلد اول ص ۸۱ (7) اردوئے معلیٰ ماہ اگست ۱۹۱۱ء

تسلیم کا ایک دیوان نظم دلفروز کے نام سے مطبع نامی لکھنؤ ۱۹۰۳ سے شائع ہوا اس میں نواب حامد علی خاں کلبہ

جلالؔ کے ہاں تسلیم کے قصائد میں موجود تصنع کی جھلکیاں بھی نہیں ملتیں۔ تسلیم شاعرانہ بیان اور اثر انگیزی کے ہنر سے واقف تھے۔ انہوں نے مبالغہ اور تصنع کے استعمال میں جلالؔ کو مات دی ہے۔ جلالؔ نے ان کے برعکس حقیقت پسندانہ تصاویر کو اپنے قصائد کا حصہ بنایا ہے۔ تسلیم کی تشابیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہر طرح پوشیدگی حاصل ہے مجھ کو غیب سے + سینے میں مانند دل ہوں دل میں مانند گماں
بسکہ ہوں فیض نسیم دہلوی سے کامیاب + گنگ ہے آگے مرے سحبان وائل کی زباں
بوئے گل ہوں گل کو بھی صحبت مری ہے ناگوار + ہوں سبک روحی سے اپنے طبع نازک پر گراں
عین پستی میں ہے خیالِ سربلندی ہے دگیا + ہوں ترقی آشنا مثلِ غبارِ ناتواں

خاک میں مل کر بھی ہے مجھ کو خیالِ خسروی + جانتا ہوں مور کے سائے کو میں ظلِ ہما
منہ نہ دیکھا میری حسرت نے کبھی امید کا + آج تک ہے صورتِ ارمانِ مفلس نارسا
کچھ تو کم ہو جوشِ محرومی خدارا اے فلک + بہر چندے انقلابِ لطفِ بخت نارسا

کوئی مے کش مجھے پہلو میں بٹھاتا کیوں کر + نہ بنا شیشۂ بادہ نہ بنا میں ساغر
صفتِ جامِ تہی بزم گہِ عالم میں + بے سبب بھی مری قسمت میں لکھی ہے ٹھوکر
وہ سیہ بخت ہوں دریا میں اگر سایہ پڑے + بے گماں قلبِ صدف میں ہو سویدا گوہر

بلبلِ موزوں فغاں ہوں شعر ہے میرا چمن + نخل ہیں مصرع رنگیں معنی بے خارِ گل
اوج پر ہے اعتبارِ جوششِ فصلِ بہار + کیا عجب بن جائے گر خارِ سرِ دیوار گل

تسلیم بسا اوقات تشابیب میں اپنے مقدر پر طعنہ زن دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی محرومیوں اور مفلسی کے شاکی نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ فخر و تعلی کی اقلیم میں بھی وارد ہوتے ہیں۔ بہاریہ مضامین میں روایتی مبالغہ آرائی انہیں مرغوب تھی۔ متصوفانہ اور فکری مضامین بھی ان کی تشابیب کا حصہ بنے ہیں۔ افسانوی اور حکایاتی نوع کی تشابیب سے انہوں نے ربط نہیں رکھا البتہ ایک تشبیب میں انہوں نے تمثیلی انداز کا سہارا لیا ہے

امیر اللہ تسلیم فن گریز میں کہیں کہیں مہارت دکھاتے ہیں۔ ایک قصیدے میں گوہر اور سخن کے تقابل کے حوالے سے کہتے ہیں

گر تامل ہے تو چل منصفِ دوراں کے حضور + نہ رہے شک سخن اچھا ہے کہ اچھا گوہر

اکثر گریزوں میں انہوں نے روایتی انداز ہی اختیار کیا ہے

ہوشیار اے خامۂ بے ہودہ پیما ہوشیار + تا کجا وقفِ زباں آئین و رسمِ شاعراں
مطلعِ مضمونِ عالی یاد آیا ہے مجھے + جس سے پیدا ہے عروجِ التماسِ قدسیاں
اوج دکھلاتا ہے حسنِ پستِ فطرت ہر زماں + بوسۂ روئے زمیں لیتا ہے کیا کیا آسماں

؎ جوشِ مستی میں جوانانِ چمن کے سامنے + چلتی ہے بادِ صبا کرتی ہوئی اٹکھیلیاں
منبرِ شاخ پر پڑھتی ہے بیٹھی عندلیب + خطبۂ مدحت واجد علی شاہِ جہاں

تسلیم نے اپنے مدحیہ مضامین میں ممدوح کی ریزشِ زر، شجاعت، عدل، دبدبہ، جمال، علم و فضل وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے

نعتیہ قصیدہ میں انہوں نے حضورؐ کو خضر پے، عیسیٰ نفس، موسیٰ سخن اور یوسف لقا کہا ہے
؎ ایک ذات پاک تھی موصوف چار اوصاف سے + خضر پے، عیسیٰ نفس، موسیٰ سخن، یوسف لقا

تسلیم نے ممدوح کے ساز و سامان، محل، اسپ اور تیغ کے حوالے سے بھی عمدہ اشعار لکھے ہیں
گھوڑا ؎ وہ سبک خیزی ہے چشمِ مور پہ رکھدے جو پاؤں + خوابِ راحت میں نہ اس کے فرق آئے زینہار
تلوار ؎ پشتِ دشمن پر اگر پڑ جائے سایہ تیغ کا + بطنِ مادر سے عدو زادہ ہو پیدا خستہ جاں
منظر ؎ کیا خاک لکھوں قصرِ معلیٰ کی میں تعریف + رفعت میں ہر اک ذرہ ہے کیواں کے برابر

تسلیم کے قصائد میں دعا اور حسنِ طلب کے حصے بھی خاصے جاندار ہیں

؎ جس کی ادنیٰ ریزشِ زر کی بدولت دہر میں + مختصر ہے طولِ داماں زمین و آسماں
اے خدا جب تک پریشاں حال ہے اہلِ سخن + اہلِ معنی اے خدا جب تک ہے رسوائے جہاں
شش جہت میں غیب سے ممدوح کو حاصل رہے + شوکت و اقبال و جاہ و دولت و نام و نشاں

عبدالحی بے خود

عبدالحی بے خود بدایونی [م ۱۹۱۲] کے دیوان مراۃ الخیال[1] میں جودھپور (مارواڑ)
کے فرمانروا سری سردار سنگھ کی شان میں ۵۳ اشعار کا قصیدہ موجود ہے۔ یہ مہاراجہ کو جی سی ایس
آئی کا خطاب ملنے پر لکھا گیا تھا اسکا مطلع ہے

؎ شب گزشتہ یہ پرستے سے تھی عیاں فرحت + بنا تھا رشک وطن میرا عالم غربت

اس میں مدحیہ اشعار میں مہاراجہ کے عہد میں ہونے والی صنعت و حرفت کی ترقی اور ظاہری خوشحالی کا تذکرہ
بھی ہے ؎ وہ کون خسرو دارا حشم فریدوں جاہ + وہ کون خسرو انجم حشم فلک شوکت
جو تیرے عہد ہمایوں میں ہے وہ کس کی تھی + ترقی ہنر و علم و صنعت و حرفت
یہ بگھیاں یہ فرس اور ایسے موٹر کار + کہ جن سے تخت سلیمان ہے غرقۂ حیرت

---

① مراۃ الخیال از بے خود بدایونی مطبع مستند هر پریس دہلی ۱۳۲۳ھ ص ۲۸، ۲۹، ۲۴، ۲۵

شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی [م ۱۹۱۴ء] محقق، نقاد، مورخ اور شاعر کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک مستقل مقام رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ بجنور سے بھی شائع ہوا تھا[1] اور اعظم گڑھ سے بھی[2]۔ انہوں نے زیادہ تعداد میں قصائد نہیں لکھے۔ ان کے اردو قصائد کو ہم روایتی قصائد کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ شبلی نے قصیدہ کی ہیئت میں کوئی جدت پیدا نہیں کی تاہم ان کے عہد میں دھیرے دھیرے رائج ہونے والی جدید نظموں کے لہجے کے اثرات ان کے قصائد کے بعض اشعار پر نمایاں ہیں۔ ان کا ایک نامکمل قصیدہ ترک سلطان عبدالحمید کی شان میں ہے اسکا مطلع ہے

؎ پھر بہار آئی ہے شاداب ہیں پھر دشت و چمن + بن گیا رشک گلستان ارم پھر گلشن

۱۸۹۳ء میں علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر انہوں نے ایک قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا

؎ بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسہ کیسا + جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا

شبلی نے ایک قصیدہ جسٹس سید محمود کی شادی کی تہنیت کے حوالے سے بھی لکھا تھا اسکا مطلع ہے

؎ پھر ہوا بادِ بہاری کا جو عالم میں عمل + چھا لیا سبزۂ نوخیز نے سب دشت و جبل

شبلی نے اپنی نثری تخلیقات میں ماضی کے علم و ادب سے جس نوع کی رغبت کا اظہار کیا تھا اور مسلم تہذیب و تمدن اور سیاست و معیشت کے جن گوشوں کو زیر مطالعہ رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے ان کے قصائد میں بھی ایک بیدار ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ قصائد کے ضمن میں وہ واقعات نویسی اور شاعرانہ تخیل کے امتزاج سے تاثیر پیدا کرنے کے قائل تھے شبلی شعر العجم میں لکھتے ہیں

"خاقانی اور معاصرین کے خلاف واقعہ نگاری پر مائل ہے۔ اس نے اکثر قصیدے خاص خاص واقعات پر لکھے ہیں اور ان قصائد میں جہاں واقعات کی تصویر کھینچی ہے شاعرانہ تخیل کا رنگ بھی چڑھایا ہے جس سے کلام میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے"[3] وہ مزید لکھتے ہیں "ترقی یافتہ قوموں میں تمام شریفانہ اخلاق کی زندہ رکھنے والی اور ابھارنے والی چیز پچھلوں کے جوش انگیز واقعات ہوتے ہیں۔ پارسیوں کا تمام لٹریچر مٹ گیا۔ ان کی اصلی زبان کی دو کتابیں بھی آج نہیں ملتیں۔ ہزار برس سے بے خانماں ہیں لیکن صرف اس بات نے کہ ان کے نام بہمن، کاؤس اور کیقباد ہوتے ہیں آج تک ان کو زندہ رکھا ہے۔ یورپ میں سینکڑوں ہزاروں اشخاص نام و نمود کے منبر پر نمایاں ہوتے ہیں اور صرف یہ بات ان کے حوصلوں اور ارادوں کو روز بڑھاتی اور تیز کر جاتی ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اخبارات اور تصنیفات کے ذریعے سے تمام عالم میں اس کی آواز پھیل جاتی ہے۔ قوموں کا بننا، ابھرنا ان کے جذبات کا تازہ اور مستقل ہوتے رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ ان کے اوصاف کی صحیح داد دی جائے۔

---

[1] کلیات شبلی مطبوعہ مدینہ بک ایجنسی بجنور ۱۹۲۸ء [2] کلیات شبلی مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۲۰ء

[3] شعر العجم حصہ پنجم ص ۱۲

ان کے کارنامے نمایاں اور اجاگر کئے جائیں۔ ان کا ہر کام تاریخی صفحات پر چمکایا جائے۔ قصیدہ دراصل اسی کام کے انجام دینے کا ایک آلہ تھا۔ (۱)

شبلی کا صنفِ قصیدہ کے ضمن میں ایک صائب نقطۂ نظر ہے۔ یہ اگرچہ مکمل طور پر خود ان کے قصائد میں استعمال نہیں ہو سکا تاہم ان کے مدحیہ اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے قصیدہ نگاری کی قدیم روش کی اندھی تقلید بھی نہیں کی۔ شبلی کی نظموں میں جو مدحیہ عناصر ملتے ہیں ان میں مسلمانوں کے شاندار کارناموں کو دہرایا بھی گیا ہے اور ماضی کے از سرِ نو جائزے کا رویہ بھی اپنایا گیا ہے۔ انہوں نے ترکوں کی بہادری اور عزم کی تعریف کی ہے اور اس ضمن میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کو بھی بہت سراہا ہے۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی شان میں شبلی کے مدحیہ اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے

؎ گرچہ مدح امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی + شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے

شبلی نعمانی نے شکرِ احسان کے حوالے سے قصیدہ لکھا ہو یا کسی کی شادی کی مبارکباد کے ضمن میں قومی درد اور قومی نقطۂ نظر ان کے سامنے رہا ہے۔ سید محمود خلف سر سید کی شادی کے موقع پر انہوں نے اپنے قصیدے میں لکھا ہے ؎ باپ کی طرح سے تو قوم کا بن پشت پناہ + جانشینی کے لئے کون ہے تجھ سے افضل

قوم کی چارہ نوازی بھی ہے تجھ پر لازم + تجھ کو خالق نے بنایا ہے جو مسعودِ ازل

اس قصیدے کی تشبیب میں شبلی نے بہاریہ ماحول کو فطری حوالوں سے پیش کیا ہے

؎ ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر بادِ بہار + جھومتے آتے ہیں پھر صحنِ چمن میں بادل

جھومتی چلتی ہے بے خود روشوں پر جو نسیم + غنچے کہتے ہیں چٹک کر یہ سنبھل دیکھ سنبھل

اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا + نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آئے نہ خلل

۱۸۷۷ میں روس اور ترکی برسرِ پیکار ہوئے۔ ترکی آزاد مسلم ریاست کے بطور مسلمانوں کا مرکزِ نگاہ تھا مولانا شبلی نے اس زمانہ میں ترکوں کے لیے چندہ جمع کر کے بھی بھیجا اور خلیفہ سلطان عبدالحمید کی شان میں ایک اردو قصیدہ کا آغاز کیا جس کے چند اشعار دستیاب ہیں۔ (۲) اس اردو قصیدہ کو انہوں نے بعد میں ایک فارسی قطعہ لکھ کر مکمل کیا۔ مولانا شبلی نے عربی میں سر سید کے حق میں اور فارسی میں وزیر پٹیالہ اور وزیر اعظم (۳) حیدر آباد کی شان میں قصائد لکھے۔ انہوں نے اپنے ایک فارسی قصیدے میں اپنے سفرِ ترکی کے احوال کی عکاسی کی ہے (۴) شبلی نے مسلمانوں کے احوال پر عید کے موقع پر ایک قصیدہ فارسی لکھا (۵)

شبلی نے عربی قصائد لکھے ہوں فارسی یا اردو قومی ہمدردی کا نقطۂ نظر ان کا غالب نقطۂ نظر تھا۔ ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کالج کے جلسہ میں پڑھا جانے والا شبلی کا قصیدہ نوجوانانِ قوم کے لئے بیداری کا پیغام رکھتا ہے۔ اس میں شبلی نے انہیں اسلاف کے کارنامے یاد دلائے اور ان کا حوصلہ بڑھایا۔ ان سے یہ تقاضا

---

(۱) شعر العجم حصہ پنجم ص ۲۰، ۲۱ (۲) ملاحظہ ہو انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء جلد ۱۶ نمبر ۸۲
(۳) حیاتِ شبلی ص ۱۵۵ (۴) کلیاتِ شبلی ص ۲۱ (۵) کلیاتِ شبلی فارسی ص ۱

بھی کہا کہ وہ اسلاف کی پیروی کریں اور اپنی قوت کو مجتمع کر کے قومی عروج کے لئے کوشاں ہوں ۔ یوں ان کے خیال میں بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں ۔ اس قصیدہ میں وہ اپنے کلام کی داد یوں لینا چاہتے ہیں

سہ اے حریفو تمہیں خالق کی قسم سچ کہنا + شبلی خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا ؟

شبلی نے قصائد کے علاوہ اپنی نظموں میں بھی مدحیہ موضوعات چھیڑے ہیں ۔ جدید شاعری جس نوع کی فطری اور حقیقی تصویر کشی کی طالب تھی شبلی نے اس سے بہت کم انحراف کیا ہے ۔ ان کا جوش ولولہ اور سچائی ان کی مدحیہ نظموں کا حصہ ہے ۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں قصیدہ زوال پذیر تھا اور اس کی جگہ مدحیہ نظمیں لکھی جانے لگی تھیں ۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی مدح میں شبلی کے اشعار شکر احسان کے بطور تھے ۔ لارڈ ریڈنگ نے ذاتی مداخلت کر کے "مسجد کانپور" کے مسئلے کا ایسا حل دریافت کر لیا تھا جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے قابل قبول تھا ۔ یہ اشعار کاسہ لیسی کے زمرے میں نہیں آتے ۔ شبلی نے جذبۂ احسانمندی کے تحت لارڈ ریڈنگ کی مدح کی ویسے وہ خوشامدی طرز کے سخت دشمن تھے

سہ مدح مقصود نہیں جوش محبت ہے یہ + میں نہیں وہ کہ لکھوں مدحت ارباب دول
مجھ کو خود حسن طبیعت پہ ہے اپنی وہ غرور + کہ لکھوں مدح تو اپنا ہی لکھوں علم و عمل

-

شبلی طبعاً حقائق لپسند تھے ۔ وہ بے جا مدح سرائی اور مبالغہ آرائی سے گریزاں تھے ۔ وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی کے روشن عہد کی یاد دلا کر انگریزی غلامی کے احساس کو شدید تر کرنے کے عمل میں مصروف رہے ان کی ترکوں سے محبت کے پس منظر میں یہی جذبہ کارفرما تھا وہ ترک قوم کو آزاد قوم اور ترکی کو آزاد ملک سمجھتے تھے ۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے شبلی کا ترکی سے اُنس ان کی آزادی پسند اور سامراج دشمن طبع کا عکاس ہے ۔

حکیم عبدالہادی وفا

حکیم عبدالہادی وفا رامپوری م ۱۹۱۵ء[1] کے کلیات میں سات دنیاوی اور ایک مذہبی (نعتیہ) قصیدہ ملتا ہے۔ دنیاوی ممدوحین میں سے ایک نام حکیم محمد اجمل خاں ہے دیگر ممدوحین کے نام نہ تو ان کے قصائد سے ظاہر ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی طرف کسی اور وسیلہ سے اشارہ ہوتا ہے۔ وفا رامپوری کے فارسی قصائد کے ممدوحین میں نواب حامد علی خاں والئ رامپور اور مصطفٰے علی خاں سابق ہوم سیکرٹری ریاست رامپور کے نام ملتے ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے اردو قصائد کے ممدوحین بھی نواب رامپور اور رامپور میں آنے والے افسران بالا ہیں۔ چونکہ چست اور موثر مطالع لکھنے میں وفا رامپوری خصوصی مہارت رکھتے ہیں[2]

؎ شکست رونق بازار ناکامی کا ہے ساماں + جہاں سے دودِ شمع کشتہ بن کر اڑ گیا حرماں (۳)

؎ حبذا داوری داور دارا آئین + جس کے نقش قدم حلم و وقار و تمکین (۴)

؎ چمن ہے فیض ہوا سے کچھ اس قدر شاداب + کہ جائے برگ گل دیکھتا ہوں موج شراب (۵)

؎ زمانہ لطف ہوا سے ہے انبساط پذیر + عجب نہیں ہے اگر چٹکے غنچۂ تصویر (۶)

؎ حبذا آے وری تقدیر تری قدر جلیل + دیتے ہیں روح امیں عرش کی تجھ سے تمثیل (۷)

در مدح حکیم اجمل خاں ؎ دم لیا تھا کہ ہوئے دونوں جہاں بے آرام + میرا آغاز مصیبت ہے قیامت انجام (۸)

نعتیہ قصیدہ ؎ ان دنوں زور پہ ہے طبع رسا یا جودت + کود جائے نہ کہیں یہ فلک الورش کی چھت (۹)

وفا رامپوری کی شاعرانہ پختگی اور استادانہ مہارت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ روایتی انداز کی قصیدہ نگاری میں انہوں نے نام پیدا کیا ہے۔ ان کی تشبیب بہاریہ بھی ہیں، مگر یہ بھی اور شکایاتی بھی کسی جگہ انہوں نے اپنی ناکامیوں کا اظہار کیا ہے اور کسی جگہ اپنی تقدیر کے بلند ہونے۔

کیا کہوں اوج شرف کیا کیوں قسمت کا عروج + کفر لوٹا ہے یہاں ضعف سے پائے تخییل

دیکھ کر آنکھ سلیماں کی جھپک جاتی ہے + فکر لقماں کو نہیں تاب تجمیل

طائر سدرہ نے بھی سینکڑوں تدبیریں کیں + پر لگانے سے نہ نکلی کوئی اڑنے کی دلیل

وفا رامپوری کے قصائد میں جذبات بلند، تخیلات نازک، زبان سلیس، محاورے چست ہیں ان پر غالب کے اثرات بھی نظر آتے ہیں انہیں انہوں نے معقول و فلسفہ، طب اور دیگر علوم سے بھی اکتساب فیض کیا ہے۔ دنیاوی ممدوحین کی تعریف میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

؎ یوں ترا حکم ہے احکام شریعت کی دلیل + جس طرح او رنبی اور خدا کی تفصیل

؎ حافظ و حاذق و یکتائے زمان اجمل خاں + فاضل و افضل و فرزانہ فہیم و فیام

---

(۲) الگ یہ شعر کیلئے کہ سہ قرطاس تاں سے آتا ہے روح تازہ کا آنا + دیا رمصطفٰے آباد تھا آگے غالب بے جاں

(۱) کلیات وفا رامپوری مطبوعہ فیض عام علی گڑھ (۳) کلیات وفا ص ۲ (۴) الفیاً ص ۳ (۵) الفیاً ص ۶ (۶) الفیاً ص ۷ (۷) الفیاً ص ۷ (۸) الفیاً ص ۷ (۹) الفیاً ص ۹ ، ۱۰، ۱۱ (۱۰) الفیاً ص ۱۲

؎ یہ تیرے عہد میں بیٹھے ہیں تھک کر اہلِ جفا + یہ تیرے وقت میں بےکار ظلم کے اسباب

؎ شہا خدا نے دیا ہے تجھے وہ صاف ضمیر + کہ ہے صحیفۂ صبحِ ازل کی اک تفسیر

؎ ترا وہ نظمِ ریاست خدا ہے جس کا کفیل + ترا وہ حسنِ عدالت قضا ہے جس کی نصیر

دنیاوی ممدوحین کی تعریف کرتے ہوئے وفا رامپوری ان کے دستِ کرم، فرمانِ عالی، فتنہ کشی، صورت و سیرت، ناخنِ احسان اور انصاف وغیرہ کے حوالے سے اشعار کہتے ہیں۔ حکیم اجمل خاں کے پیشہ کی مناسبت سے انہوں نے ان کی تشخیص، تحقیق، تعلیم، اخلاق، دستِ کرم، فیض اور شفا وغیرہ کے حوالے سے عمدہ اشعار کہے ہیں۔

نعتیہ قصیدے میں انہوں نے اپنے والہانہ جذبات کا علمی اور فکری سطح پر اظہار کیا ہے

؎ نام تیرا خطِ سرنامۂ لولاک لما + حکم تیرا ہمیں اک نقشِ نگینِ قدرت

مہرِ عنوانِ نبوت ہے ترا دینِ متین + نظمِ دیوانِ رسالت ہے تری ملت

ٹھہرے جب عرش پہ بس تیرے لئے پا انداز + قابَ قوسین کو پھر کیوں نہ ہو تجھ سے زینت

انبیا بیٹھیں ترے آگے دو زانو ہو کر + محفلِ قدس تری ذات سے والا رتبت

وفا رامپوری نے حسنِ طلب کے اشعار میں کوئی جدت پیدا نہیں کی

؎ عطا عطا کہ مجھے ہے امیدِ بخششِ خاص + کرم کرم کہ ترے در پہ لائی ہے تقدیر

نعتیہ قصیدہ میں ان کی دعا کا انداز عمدہ ہے

؎ مجھ پہ ہو تیرا کرم تجھ پہ دو عالم کا درود + مجھ پہ ہو تیری نظر تجھ پہ خدا کی رحمت

وفا رامپوری کے وہ قصائد جن میں ممدوح کے نام کا سراغ نہیں ملتا۔ کہیں کہیں ایسے اشارے رکھتے ہیں جن سے ان کے والیٔ ریاست یا ناظمِ ریاست ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ قصائد اردو قصائد میں موجود روایتی عمومیت ہی کا عکس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ممدوح کی شخصیت کے خصوصی رویے نہیں جھلکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم بہ آسانی ان کی داخلی شہادتوں کی مدد سے ممدوح شخصیات کا سراغ لگا لیتے۔ اردو قصائد کی روایتی یکسانیت سے ممدوحین کے آئیڈیل نقشے اور خاکے تو ملتے ہیں لیکن ان کی شخصی زندگی، ان کی سیرت کی انوکھی اور نادر باتیں، ان کے کردار کی تخصیصی حیثیت کے بارے میں بہت کم پتہ چلتا ہے۔ بادشاہ یا ریاستی نواب کی عمومی شخصیت کا بیان اس امکان کا رستہ بھی کھولتا ہے کہ ان قصائد کو کسی بھی بادشاہ اور ریاستی نواب کے لئے استعمال کر لیا جائے۔

منور خاں گوہر

محمد منور خاں گوہر [م ۱۹۱۲ یا ۱۹۱۳ء] خاندان برنانگ کے نائب تھے ان کا اردو دیوان گوہر آبدار کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کے قصائد کا ایک مجموعہ باغ رنگین (۱۳۲۴ھ) کے نام سے (دکن پریس حیدرآباد) طبع ہوا۔ انہوں نے سر آرتھر ویلزلی سابق گورنر مدراس کی انگریزی میں سوانح بھی لکھی۔ وہ داغ دہلوی اور ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے[۳] ان کے مذکورہ مجموعہ قصائد کا نام گوہر عثمانی (حصہ اول) بھی ہے۔ یہ نواب میر عثمان علی کی سالگرہ کی تقریب کے حوالے سے نواب موصوف کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں موجود چھ اردو قصائد گوہر کی شاعرانہ پختگی کے غماز ہیں۔ ان کے مطالع یوں ہیں

ـــ ہوا پھر عالم افروز آفتاب فضل یزدانی + دکھایا صبح عشرت نے پھر اپنا روئے نورانی

ـــ نظر میں کھب گئی مستی کسی کی چشم شہلا کی + نہیں ممکن رہے دل میں ہوس اب جام صہبا کی

ـــ میں نے دیکھے خواب میں دو منظر دلکش پر بہار + تھے فروغ عیش سے دونوں برابر نور بار

ـــ میں بھی ہوں میکدۂ عشق کے سرشاروں میں + کیف یہ کب ہے خرابات کے میخواروں میں

ـــ ہم اُنہیں مہ جبیں مہر لقا کہتے ہیں + دیکھیے شمس و قمر اب ہمیں کیا کہتے ہیں

ـــ مورد فضل خدا ہے کشور ہندوستاں + دیکھو اس جا جلوہ گر ہیں خواجۂ عرش آشیاں

اس آخری قصیدہ میں ایک شعر فارسی کا اور ایک اردو کا ہے یوں اس میں صنعت ذولسانین استعمال ہوئی ہے۔ یہ قصیدہ افتتاح مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف کی تقریب میں پڑھا گیا تھا۔

گوہر نے کسی قصیدہ میں بہاریہ کسی میں سرشاریہ و خمریہ کسی میں جمالیہ (بحوالہ سراپا نگاری) اور کسی میں عشقیہ تشبیب کا اہتمام کیا ہے۔ ایک قصیدہ جو میر عثمان علی کے فرزند کی پیدائش[۴] پر لکھا گیا تھا اس میں دو منظر دل کی تعریف کی گئی ہے اور ان میں عیش و انبساط کے مناظر کی عکاسی پر زور قلم صرف ہوا ہے۔

ـــ حسن میں بے مثل ہر ایوان رشک بوستاں + قدرت حق تھی نمایاں صنعت حق آشکار

شمع کافوری تھی روشن جس طرف دیکھا وہاں + روشنی بجلی کی تھی ہر جا کنول تھے بے شمار

مطربان خوش گلو کی نغمہ سنجی جا بجا + مہوشان خوبرو کی ہر طرف دلکش بہار

انکی قصائد کے مدحیہ حصوں میں نواب کی رفعت، شوکت، حشمت، عدالت، شجاعت، ہر دلعزیزی، حلم و حیا، دریا دلی، اسلام دوستی، رعیت پروری وغیرہ کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ اس کی علم دوستی اور ادارہ سازی کی تعریف بھی ہے

ـــ کی حمایت جو یونیورسٹی مسلم کی + جوش پیدا ہوا تعلیم کے غمخواروں میں

یا جیخ لڈکو آصف سابع نے دیا ہے چندہ + تذکرے ہوتے ہیں ہر سمت بیس یاروں میں

مدرسہ قائم کیا ہے شاہ نے اجمیر میں + جس میں دینی علم کی تعلیم ہوگی بے گماں

گوہر نے ظل خدا[۴]، جاہ قیصر، حشمت اسکندر وغیرہ کے الفاظ سے بھی نواب کی تعریف کی ہے

---

① باغ رنگین پیش لفظ ص م دکن پریس حیدرآباد ③ اس قصیدہ میں شاہزادہ نثار کرم بسم اللہ کا بھی تذکرہ ہے ④ یہ ہے اک ظل خدا اور وہ طلا ادنیٰ + سایہ شاہ کو کیوں ظل ہما کہتے ہیں

الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین حالی [م ۱۹۱۴ء] جدید اردو تنقید اور نظم کے بانیوں میں سے ہیں۔ ان کے قصائد ان کے شعری مجموعوں میں دستیاب ہیں۔ انہوں نے مذہبی قصائد بھی لکھے ہیں اور غیر مذہبی بھی۔ ان کے مذہبی قصائد نعتیہ ہیں ان کے مطالع درج ذیل ہیں

؎ بنے ہیں مدحت سلطان دوجہاں کے لیے + سخن زبان کے لیے اور زبان دہاں کے لیے ① [دیوان حالی ص ۱۵۲]

؎ میں بھی ہوں حسن طبیعت پہ مغرور + مجھ سے الجھیں گے ان کے ناز ضرور ② [ص ۱۵۵]

؎ اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے + امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے ③

غیر مذہبی ممدوحین میں نواب کلب علی خان، میر عثمان علی خان ④ نیز محسن حبیب اللہ خان اور ملکہ وکٹوریہ ⑤ شامل ہیں۔ حالی نے ایک نامکمل قصیدہ سرسید کی مدح میں بھی لکھا۔ ان قصائد میں سے چند کے مطالع ملاحظہ ہوں

؎ زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے شادمانی کا + فلک پھر کی میں دم بھرتا ہے ان روزوں جوانی کا ⑥

؎ ماہ صیام گیا اور روز عید آیا + خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا ⑦

؎ اے فلک دوسری روز دوشنبہ ترا + ہم نہ بھولیں گے کبھی تیری وہ صبح جانفزا ⑧

؎ ہے عید یہ کس جشن کی یارب کہ سراسر + ہے جوبلی ہے جوبلی اک اک کی زبان پر [در مدح ملکہ وکٹوریہ]

حالی کے قصائد کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ ہم صنف قصیدہ کے بارے میں ان کے اصلاحی اور تنقیدی خیالات پر نظر ڈالیں حالی لکھتے ہیں

"جس طرح ایک محقق حکیم کا یہ فرض ہے کہ موجودات عالم کے جس قدر خواص اور احوال اس پر منکشف ہوں ان سے دنیا کو آگاہ کرے یا ایک طبیب کا فرض ہے کہ انکشافات جدیدہ سے اہل وطن کو مطلع کرے۔ اسی طرح شاعر کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اچھوں کی خوبیوں کو چمکائے اور ان کے ہنر اور فضائل عالم میں روشن کرے اور ان کے اخلاق کی خوشبو سے موجودہ اور آئندہ دونوں نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا سامان مہیا کر جائے اور نیز برائیوں اور عیبوں پر جہاں تک ممکن ہو گرفت کرے تاکہ حال اور استقبال دونوں زمانوں کے لوگ برائی کی سزا اور اس کے نتائج سے ہوشیار اور چوکنے رہیں۔ یہ وتیرہ بالکل سنت الٰہی کے مطابق ہوگا۔ کیونکہ کلام الٰہی میں بھی ہمیشہ بروں کو برائی کے ساتھ اور بھلوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ متوکل باللہ نے ایک شاعر سے پوچھا کہ تم کس حد تک لوگوں کی ہجو کے درپے رہتے ہو اور کہاں تک مدح و ستائش

---

① ② دیوان حالی اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۰ء ③ شکوۂ ہند مقدمہ۔ افتخاریہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی

④ کلیات نظم حالی جلد دوم مرتبہ افتخار احمد صدیقی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ء ⑤ ص ۳۸۱ تا ۳۹۰

⑥ ⑦ ⑧ دیوان حالی ص ۱۶۶، ۱۶۹ ⑤ اردو کورس احمد حسن احسن قصائد اردو ورناکیولر میٹریکولیشن کورس از مولانا سید احمد علی انوار احمدی پریس الہ آباد ۱۹۰۸ء

کرتے ہو؟ اس نے کہا "ما اساؤا و احسنوا" یعنی جب تک کہ ان سے نیکی اور بدی سرزد ہوتی ہے پھر کہا "نعوذ باللہ اَنْ نکونَ کالعقربِ التی تکسب النبی والذمی" یعنی خدا نہ کرے ہمارا حال بچھو کا سا ہو جو کہ نبی اور ذمی دونوں کے ڈنگ مارتا ہے۔

جب کسی ایسے شخص کی جو مدح کا مستحق ہوتا ہے تعریف کی جاتی ہے تو اس کو مدح کا زیادہ استحقاق حاصل کرنے یا کم سے کم اپنا پہلا استحقاق قائم رکھنے کا اور دوسروں کو اس کی ریس کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ نفرین کے مستحق ہیں جب ان کے عیب کنایتہً بیان کیے جائیں گے تو امید ہے کہ وہ اس اندیشہ سے کہ مبادا آئندہ زیادہ رسوائی ہو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ یا کم سے کم اپنی برائی سے نادم یا متنبہ ہوں گے اور دوسرے ان عیبوں کو مذموم و قابل نفرین سمجھیں گے۔ اس لیے مدح ایسے انداز سے کرنی چاہیے کہ وہ من جملہ بہ خوشامد نہ ہو جائے اور مذمت ایسے عنوان سے ہونی چاہیے کہ دل سوزی کا پہلو طعن و تشنیع کی نسبت غالب تر ہو۔[1]

حالی نے قصیدہ نگاری میں مذکورہ روش ہی اپنائی ہے۔ ان کے قصائد میں ممدوحین کے انہی اوصاف کا بیان ہے جو فی الحقیقت ان کی ذات اور شخصیت کا حصہ تھے۔ انہوں نے صنفِ قصیدہ کے ضمن میں جس اصلاحی نظریہ سازی سے سروکار رکھا اس پر دورِ جدید کے بعض قصیدہ نگار عمدہ انداز سے عمل پیرا ہوئے ہیں۔[2] حالی نے جھوٹ اور مبالغے کی بے سروپا انتہاؤں سے دامن بچا کر قصیدہ نویسی کی۔ انہوں نے "خوشامد" "ادعائے بے معنی" "تعلی بے جا" "التزامِ لایعنی" اور شکوہ بے محل، وغیرہ کے رجحانات سے حتی المقدور احتراز کیا۔ جھوٹے اور نمائشی طلسم بالکل انہیں مرعوب نہیں تھا۔ حالی نے حیاتِ سعدی میں بھی ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ مدحیہ قصائد سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات کو سن کر خاص و عام کے دل میں اس کی محبت اور اس کے ساتھ حسنِ ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے کہ اگر وہ صفتیں اس میں موجود ہوں تو ان میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم ان کو اسی حال پر قائم رکھے اور اگر نہ ہوں تو ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔[3] حالی کے اس نقطۂ نظر میں یہ گنجائش موجود ہے کہ کم و ال پذیر قوم کے ناکارہ، کٹھ پتلی یا بے دست و پا حکمرانوں کی اوصاف نویسی کو روا سمجھا جائے یعنی اگر ان میں شجاعت، حلم، بردباری، انصاف، اور سخاوت وغیرہ کے اوصاف موجود نہیں بھی ہیں تو بھی ان اوصاف کا بیانِ لطیف ان کی اور قارئین کی شخصیات سدھارنے کا وسیلہ ہو سکتا ہے اور ان میں یہ انسانی اور اخلاقی قدریں پیدا ہو سکتی ہیں۔

---

① مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۶۱، ۲۶۲ ② دیکھئے اسماعیل میرٹھی کا قصیدہ "جریدہ عبرت" اور شاطر مدراسی کا "اعجازِ عشق"
③ حیاتِ سعدی ص ۱۵۶ مجلس ترقی ادب لاہور

حالی نے اپنے قصائد میں اپنے ممدوحین کی حقیقی تصویر پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مکتوباتِ حالی میں حالی کا ایک خط مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۰۵ء بنام مولوی عبدالحق بھی ملتا ہے۔ اسمیں انہوں نے مولوی عبدالحق سے چند سوالوں کے جواب مانگے ہیں تاکہ حالی کو نظام دکن کا جو قصیدہ لکھنا تھا اسمیں اظہارِ حقائق کی خوبی قائم رہے وہ لکھتے ہیں

(۱) "حضور کی جوبلی کا جشن جو ماہ آئندہ میں ہونے والا ہے یہ کتنے سال کی جوبلی کا جشن ہے؟ اور نمائش کو اس جشن سے کیا تعلق ہے؟ (۲) حضور کا پورا القاب اور جو خطابات برٹش گورنمنٹ نے ان کو دیے ہیں ان کی تفصیل؟ (۳) حضور کون سے نمبر کے نظام الملک یا آصف جاہ ہیں یعنی پانچویں چھٹے یا ساتویں وغیرہ؟ (۴) حضور نے اپنے عہدِ حکومت میں کون کون سے عمدہ کام کیے ہیں اور ریاست حیدرآباد سے ہندوستان میں کہاں کہاں نیک اور رفاہِ عام کے کاموں میں امداد دی جاتی ہے (۵) حضور کی ذات میں ایسی کون کون سی نیک اور پسندیدہ خصلتیں پائی جاتی ہیں جو ان کے تمام افعال و اعمال میں نمایاں طور پر ہر شخص کو نظر آتی ہیں (۶) بالفعل جو پرنس آف ویلز کی یادگار قائم کرنے کے لیے سات لاکھ روپیہ منظور کیا گیا ہے مجھے یاد نہیں رہا وہ کس قسم کی یادگار میں صرف ہوگا؟ [۱]

ان سوالات کا جواب حالی نے اس لیے طلب کیا تھا کہ بقول ان کے " مجھے بتوسط ایک معزز عہدہ دار کے دارالمہام کی طرف سے ایسا ایما ہوا ہے کہ مبارکباد جشن جوبلی کے موقع پر میں بھی ایک قصیدہ مدحیہ حضور کی شان میں لکھوں ...... مجھے نہایت محقق طور پر (آپ) قصیدہ لکھنے کا میٹریل بہت جلد پہنچا دیں مجھے بے سروپا مدح سرائی اور بعض کرنی بالکل نہیں آتی اس لیے میں چاہتا ہوں قصیدہ میں سرتا پا فیکٹس اور واقعات کا بیان ہو" [۲]

مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی ایک قصیدہ نما نظم "مناظرہ واعظ و شاعر" میں شاعروں اور واعظوں پر شدید چوٹیں کی ہیں۔ اس نظم کے اشعار طنز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس میں اصلاحی طرز کی ہجو بھی دکھائی دیتی ہے مناظرانہ تمہید کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

کل جو میں نے بسترِ راحت پہ جا کے دم لیا + دل کو اک وقفہ غمِ دنیا سے فرصت کا ملا
کی تصور نے وہیں اک بزمِ رنگیں آشکار + مجلسِ اربابِ معانی جس کو کہنا ہے بجا
گرم تھا واں ہر طرف ہنگامۂ بحث و نظر + سرخرو کلمہ گو نہ حجت سے تھا ہر مدعا
شمعِ استدلال سے روشن تھا فانوسِ بیاں + چار سو ہنگامہ آراتھی نعم و لا کی صدا
خود فروشی کا غرض تھا ہر طرف بازار گرم + ساز گوناگوں تھے لیکن ایک تھی سب کی صدا

ان اشعار کے بعد شاعر اور واعظ اپنی اپنی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ایک دوسرے کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں حالی نے ایسے شاعروں کی مذمت کی ہے جنہوں نے اخلاقی اور اصلاحی مقاصد کو فراموش کر دیا ہے۔ وہ ایسے واعظوں پر بھی چوٹیں کرتے ہیں جنہوں نے قوم کی گمراہی اور پستی میں اہم کردار ادا کیا ہے یعنی وہ اپنا فرض بھول کر دیگر مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ شاعر اپنے بارے میں کہتا ہے

(۱) (۲) مکتوباتِ حالی ص ۵۸-۵۹

ہے تصوف میں ہمارے عرصۂ وسعت خیال + کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا
رہبری میں ہم کو چشم و گوش پر تکیہ نہیں + ہیں ہمارے بال و پر اندیشۂ فکر رسا
الغرض گر کسی کی مدح پر آجائیں ہم + خاطرِ دشمن میں اس کا نقشِ الفت دیں بٹھا
خاک کو چرخ بریں پر دیں اگر ترجیح ہم + ماند ہو ذرے کے آگے مہرِ تاباں کی ضیا

حالی نے اس قصیدہ نما نظم میں ایسے شعرا کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ فی الاصل اگر ان کا ممدوح برگزیدہ ہو تو وہ اس میں بھی صفاتِ کبریا ثابت کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ پردۂ ہنر میں بھیک بھی مانگتے ہیں حالی سمجھتے ہیں کہ اگر یہی شاعری ہے تو اس سے گداگری بہتر ہے

پردۂ عرضِ ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو + گر یہی ہے شاعری تو تجھ سے بہتر ہے گدا

حالی نے اس میں واعظ کی حرص و آز، ریاکاری اور مکاری کو بھی موضوعِ اظہار بنایا ہے

حالی کے مدحیہ قصائد میں تشبیب میں اختصار اور جزوِ مدح میں بہت حد تک اصلیت دستیاب ہے وہ سرسید کی اصلاحی تحریک سے وابستہ تھے جس کا مطمحِ نظر انگریزی تعلیم اور ملازمت کی حصول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انگریزوں اور دیگر حکمرانوں کی تعریف میں جو قصائد لکھے ہیں ان میں ان کے حسنِ انتظام، رفاہِ عامہ کے امور، ڈکیتیوں، ٹھگوں اور کینہ رسومات (ستی وغیرہ) کے خاتمے کے اقدامات، تعلیم اور سائنسی ترقی کو بنیادی اہمیت کے موضوعات جانا ہے۔ حالی مبالغے سے مکمل طور پر دامن نہیں بچا سکے یہ اشعار دیکھیے

سچ یہ ہے کہ تاریخ کوئی تجھ سا نہیں گزرا + محمود نہ تیمور نہ دارا نہ سکندر
تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا + اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخر [قصیدہ جشن جوبلی ملکہ وکٹوریہ ۱۸۸۷]

اس قصیدہ میں حالی یہ بھی لکھتے ہیں

یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس + ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دور تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف + وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر

حالی کے اس نقطۂ نظر سے کوئی بھی آزادی دوست اور محبِ وطن متفق نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ اس دور کا مخصوص شعور ہے اس کی جھلکیاں حالی کے علاوہ ان کے بیسیوں معاصر شعرا کے ان قصائد میں دستیاب ہیں جو انگریز حکمرانوں کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی نے رامپور اور دکن کے نوابوں کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں ان کے مدحیہ حصوں میں ممدوحین کے خصائص بیان کرتے ہوئے انہوں نے بے جا لفاظی سے سروکار نہیں رکھا۔ ان کا بیان سادہ اور دلکش ہے۔ انہوں نے ممدوحین کی ان خوبیوں کو سادہ انداز سے ظاہر کیا ہے جو ان کی شخصیت کا حصہ تھے یا ہو سکتے تھے۔ ان کی علم و فن سے محبت، عوامی فلاح و بہبود کا جذبہ اور قومی ہمدردی وغیرہ کی خوبیوں کو حالی نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے

؎ وہ کالج جس نے مردہ قوم میں پھر جان ڈالی ہے + اسی منبع سے جاری ہے وہ چشمہ زندگانی کا [ممدوح نظام الدین]

سرسید کی تعریف میں وہ لکھتے ہیں

؎ تعلیم کی ہماری بنیاد اس نے ڈالی + ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

حالی کے قصائد کے مدحیہ حصوں پر جدید نظم کے رجحانات کا عکس نمایاں ہے۔ یعنی ان میں قومی اصلاحی جذبہ بھی نمایاں ہے اور اصلیت اور حقیقت نگاری کا انداز بھی۔

حالی کے مذہبی قصائد کی قومی اور اخلاقی اہمیت مسلمہ ہے۔ ان "کاموں کے لئے" ردیف والا نعتیہ قصیدہ ۱۳۳ اشعار کا ہے۔ اسمیں حضورؐ کے داخلی اوصاف کا موثر اظہار ہے۔ حضورؐ کے شمائل، قرآن کے متعلق، جبرئیل، معراج، خلق عظیم اور ذات کریم کے حوالے سے انہوں نے جو اشعار لکھے ہیں وہ ان کے اصلاحی مزاج کے عکاس ہیں ان کا ایک اور نعتیہ قصیدہ جسکا پہلا مصرعہ ہے "کہ ہیں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور" ان کے تعلی آمیز بیانات سے معمور ہے اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

"اس قصیدے کی تمہید ۱۲۸۸ھ کے ہذیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے انہی دنوں سیتارام کے بازار (دہلی) میں مشاعرہ قرار پایا مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں۔ جن لوگوں کو جا و بے جا تحسین و آفرین میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرے میں نہ آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید اتنی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعر ان لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدر دان سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدہ کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ کے خیالات کے مطابق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعے سے ہوتی ہے اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے لیکن جب تفاخر حد سے بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر متنبہ ہوا لہذا قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا ہے تاکہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے" ①

اس بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ حالی نے یہ نعتیہ قصیدہ بالارادہ نہیں لکھا بلکہ بعد میں اسمیں نعتیہ اشعار شامل کر دیئے گئے ہیں اس قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں

؎ چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد + دل خسرو میں ڈال دوں ناسور

① دیوان حالی ،

کرنے جاؤں جو حق سے عذر گناہ + لے کے آؤں نوید عفو قصور

لوں ملائک سے دادِ حسنِ کلام + گر لکھوں نعت سرورِ جمہور

وہ شہنشاہ امتی جس کا + یاں سبکسار اور واں ماجور

مژدہ اے امت ضعیف کہ یاں + سعی ہوتی ہے بے کئے مشکور

اپنی تعلّی کے ردِ عمل میں حالی نے یہ شعر لکھے ہیں

طبع غالب ہے اور میں مغلوب + نفس قاہر ہے اور میں مقہور

بحر غفلت میں ہوں سراسر غرق + نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور

چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن + ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

ان اشعار کے بعد حالی نے اپنی کم مائیگی، بے بضاعتی اور اپنی چند خرابیوں اور کوتاہیوں کا تذکرہ کیا ہے اس قصیدہ میں حضورؐ کی سیرت، اخلاق اور فیوض و برکات کا عقیدت مندانہ اظہار ہے

اے ترا پایہ فہم سے برتر + اے ترا نام عرش پر مسطور

حالی کے قصائد کی سادگی، صفائی اور روانی انہیں عہد جدید کے اہم قصیدہ نگاروں میں شامل کرتی ہے پر کیف جذبات اور قلبی واردات کے اظہار نے ان کے قصائد میں تاثیر اور صداقت پیدا کی ہے۔ حالی کے قصائد کی بے ساختگی اور سلاست ان کے موضوعات سے ہم آہنگ ہے

حالی کے نعتیہ قصائد میں عصری مسائل بھی بیان ہوئے ہیں اور حضورؐ کی سیرت و کردار کی خوبیاں بھی کمال کے احاطۂ بیان میں نمایاں ہوئی ہیں وہ مسلمانوں کو عروج پر دیکھنا چاہتے تھے اس کے لیے انہوں نے حضور کی سیرت کو بطور نمونہ پیش کیا ہے تاکہ ان کی تقلید سے نیکی سعادت اور اچھائی کی راہوں پر سفر کیا جاسکے حالی جوش و اثر پیدا کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔ وہ قوم کی شکستہ حالی اور بے راہ روی پر نالاں تھے۔ اس کی ابتری پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ قصیدہ الضیا شیہ ان کے دردمندانہ جذبات کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں انہوں نے امت محمدیؐ پر کڑا وقت آن پڑنے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ جو دین وطن سے بڑی شان سے نکلا تھا پردیس میں غریب الوطن ہو گیا ہے۔ جس دین کے کبھی قیصر و کسریٰ وہ تھے آج خود وہ مہمان سرائے فقر ا ہے۔ وہ دین جس نے دنیا کی بزم میں چراغاں کیا۔ اب اس کی مجلس خود تاریک ہے۔ اس میں نہ بتی ہے اور نہ دیا۔ اس میں فرقہ بندی اور ذاتی اغراض پسندی کی بدولت تفرقہ پڑ چکا ہے۔ حالی لکھتے ہیں

امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن + دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

کل دیکھئے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا + اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے

اے حالی گستاخ نہ بڑھ حد ادب سے + باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے

حالی کے اس قصیدہ میں مسلمانوں کی خستہ حالی کو ختم کرنے کی التجا اور دعا تاثیر سے معمور ہے

عبدالحلیم آسی

عبدالحلیم آسی [م 1916/1917] کا تعلق سکندر پور سے تھا۔ انہوں نے نواب کلب علی خاں رامپور، نظام دکن، ملکہ وکٹوریہ اور جارج پنجم کی شان میں چند قصائد لکھے ہیں۔ ان کے قصائد فکر و خیال کی گہرائیوں سے مزین ہیں۔ نواب کلب علی خاں کی مدح میں ان کے یہ اشعار دیکھیے

کہاں تراکوئی بحرِ وجود میں ثانی + حباب دیدۂ اہلِ نظر میں ہے پانی
زوالِ صورتِ اشیا ہے صورتِ ہمہ اوست + غرض کہ ہیچ مدانی ہوئی ہمہ دانی
نہ جان دے کے بھی ہم سمجھے وائے نادانی + کہ تھا وہی لبِ جاں بخش دشمنِ جانی
ہمیں نہ دل میں چلے آؤ دیکھو سنبھال + ہنسی ہے قابلِ اظہارِ درد پنہانی
سوا نہ برق نہ آندھی یہ سب مثال غلط + مری نظر میں تو گھوڑا ترا ہے لاثانی [1]

دیوانِ آسی میں میر محبوب علی خاں کی شان میں بھی ایک قصیدہ ملتا ہے [2]۔ اسکا مطلع ہے

کبھی نہ صاحبِ تمکیں کرے کسی سے کلام + سکھائے ان کو یہ تیرے ہی سامنے لبِ بام [عین المعارف (دیوان آسی) ص 97 مطبع سلیمانی بنارس 1335ھ]

محمد مبین کیفی چریاکوٹی کا کہنا ہے کہ کلام میں آسی نے ناسخ اور رشک کی تقلید کی [3] ہے۔ ان کے قصائد میں بھی ان کی شاعری ہی کی مانند بلند پروازی، بے ساختگی اور مناسب اور موزوں الفاظ کا تفحص نظر آتا ہے [4]۔ آسی عارفانہ اور صوفیانہ مضامین کی جانب جھکاؤ رکھتے تھے۔ کیفی چریاکوٹی کا خیال ہے آسی کے تغزل میں "جا بجا تصوف کا فلسفہ نظر آتا ہے" الفاظ کا اہتمام خوب کرتے ہیں۔ نعت اور مدح میں ایسے اوصاف بیان کیے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا" [5]

لالہ سری رام نے عبدالحلیم آسی کے بارے میں لکھا ہے

"ایک زمانہ میں آپ کا کلام بالکل عالمانہ اور مشکل پسند رنگ لیے ہوئے تھا۔ لیکن جب سے آپ کی توجہ تصوف کی جانب ہوئی ہے وہ رنگ ہی بدل گیا ہے [6]

عبدالحلیم آسی کے قصائد میں عارفانہ رنگ کا غلبہ ہے۔ بحرِ وجود، دیدۂ اہلِ نظر، زوالِ صورتِ اشیا اور صورتِ ہمہ اوست وغیرہ کی تراکیب و الفاظ ان کے ذہن کی عارفانہ ہیج ہی کے عکاس ہیں۔ آسی عربی اور فارسی السنہ پر قدرت رکھتے تھے۔ اردو پر بھی ان کی دسترس کا اعتراف ایک عالم نے کیا ہے [7]۔ اردو قصیدہ میں جس نوع کے فکری انگ کا آغاز مرزا غالب نے کیا تھا۔ آسی نے اس کی تقلید کی کوشش کی ہے۔ آسی غزل میں بھاری بھرکم الفاظ اور فارسی و عربی تراکیب استعمال کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں رنگِ ناسخ کا مقلد بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے قصائد میں شان و شوکت بھی ہے اور سنجیدہ فکری بھی، جدت اور تازگی جیسے اوصاف بھی ان کا حصہ ہیں یہ اشعار دوبارہ دیکھیے

سوا نہ برق نہ آندھی یہ سب مثال غلط + مری نظر میں تو گھوڑا ترا ہے لاثانی

کہاں تراکوئی بحرِ وجود میں ثانی + حباب دیدۂ اہلِ نظر میں ہے پانی

---

(1) جواہرِ سخن، جلد چہارم ص 227 (2) عین المعارف (دیوان آسی) ص 97 مطبع سلیمانی بنارس 1335ھ
(3) جواہرِ سخن ص 214 (4) ایضاً (5) ایضاً (6) خمخانۂ جاوید جلد اول ص 42 (7) ایضاً

محمد اسماعیل میرٹھی

محمد اسماعیل میرٹھی [م ۱۹۱۷ء] عہد جدید کے جدید رنگ کے حامل قصیدہ نگار ہیں انہوں نے اردو شاعری کی اقلیم میں داخل ہونے والے جدید مغربی خیالات وافکار سے بھر پور استفادہ کیا۔ اسماعیل میرٹھی کو جدید شعرائے اردو میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں موجود اصلاحی رجحانات اور فطری ماحول کی منظر نگاری انہیں قدیم اردو شاعروں کی صف سے باہر لا کھڑا کرتی ہے۔ ان کے کلیات میں ایک نامکمل اور پانچ مکمل اردو قصائد دستیاب ہیں۔ ان قصائد کی اجمالی تفصیل یہ ہے[1]

نامکمل قصیدہ — دکھاؤں شاہد مضموں کی چین پیشانی + کہ ہو ہے چشم آئینہ غرق حیرانی

مکمل قصائد کے مطالع — قید سخت اور خانہ بے در + نکلوں کیوں کر جہان سے باہر

— رنگ فریب سادگی دل میں ہے نہاں + افزائش یقیں نہیں ہے کاہش گماں

نوید مقدم شاہی — نوبہار بوستاں آنے کو ہے + خسرو گل ہمعناں آنے کو ہے

در مدح جارج پنجم — صبح صادق کا کھلا ایوان بہار + مثل ایوان سلاطین کبار

جریدۂ عبرت — میں شاعرانہ روش پر نہیں قصیدہ نگار + یہ ایک سادہ گزارش ہے یا اولی الابصار

علاوہ ازیں خدا قیصرہ ہند کو سلامت رکھے کے عنوان سے ایک نظم بھی اسماعیل میرٹھی کے کلیات کی زینت ہے ان کا ایک قصیدہ جشن جوبلی کے حوالے سے بھی ملتا ہے اسکا مطلع ہے

— ہے خداوند حقیقی کو سزاوار سپاس + جان نے تن میں کیا حکم سے جس کے اجلاس

اسماعیل میرٹھی کے کلام میں ایک قصیدہ نوائے زمستان کے نام سے بھی ملتا ہے۔ یہ نظم کے زیادہ قریب ہے اپنے قصیدہ جریدۂ عبرت میں اسماعیل میرٹھی نے دہر میں انسانوں کی غفلت اور مجبوری پر طنزیہ اور ظریفانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے قصیدہ نگاری کی قدیم روش کو پسندیدہ نہیں سمجھا۔ وہ طبعاً نظم گو تھے انہوں نے صنف قصیدہ میں نظمیہ عنصر داخل کرنے اور اسے جدید رنگ و آہنگ عطا کرنے پر توجہ دی۔ ان کے قصائد میں حقیقت پسندانہ رویہ غالب ہے

اسماعیل میرٹھی کے قصائد کو قدیم و جدید قصیدہ نگاری کا سنگم بھی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے قدیم قصیدہ کے فنی اور مواداتی مواد (شان و شکوہ، مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پروازی، آرائشی اسلوب) کا سہارا بھی لیا ہے اور جدید نظمیہ معیارات کو مشعل راہ بھی بنایا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اس صنف کو اصلاحی مقاصد کے لئے بھی استعمال کرنا چاہا اور بعض مقامات پر شاعرانہ روش کی قصیدہ نگاری کو بھی اپنا مطمح نظر بنایا۔ انگریز حکمرانوں اور ریاستی نوابوں کی شان میں کہے گئے ان کے قصیدے اسی زمرے میں رکھے جا سکتے ہیں

اپنے قصیدہ جریدۂ عبرت میں اسماعیل میرٹھی نے شاعران زماں کا خاکہ اڑایا ہے۔ ان کا یہ خیال ہے

---

(۱) کلیات اسماعیل میرٹھی

کہ ہمارے شاعر قدیم شاعرانہ ڈگر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ عشق کے خیال اور من گھڑت مضامین کو اہم جانتے ہیں۔ ان کا نیرنگِ حکمت و قدرت سے سروکار نہیں۔ ان کی شاعری میں واقعات کے نقش و نگار نہیں ابھرتے۔ ان شاعروں کے نزدیک شاعری کا پہلا موضوعی اصول جھوٹ موٹ کی عاشقانہ شاعری سے وابستگی ہے۔ یہ قدیم عہد کا پس خوردہ موضوع ہے۔ اسماعیل میرٹھی شاعروں کو منع کرتے ہیں کہ وہ اس موضوع کی جگالی نہ کریں۔ خودستائی اور تفاخر پسندی ان شعرا کے مزاج کا حصہ ہے۔ وہ اس میں ننگ، حیا یا شرم و غیرت محسوس نہیں کرتے۔ یہ شاعر اپنی خرافات کو وقار سمجھتے ہیں۔ مبالغہ آرائی میں بے ہودگی کی حدوں تک پہنچنا ان کا معمول ہے۔ دوراز کار استعارے اور بے لطف تجنیس برتنا انہیں مرغوب ہے۔ ان کے دواوین میں غلیظ اور گندے خیالات ملتے ہیں۔

اس دور میں شاعری کا معیار یہ ہو چکا ہے کہ جو بے تکی ہانک رہا ہے شاعرِ غرّا ٹھہرا ہے۔ ان شاعروں کی طبع بلند اور معانی رنگین کی حقیقت یہ ہے کہ طبع تو گدا ہے اور معانی سڑا ہوا مردار۔ معشوق کا منہ اور کمر غائب کرنا ان کے لئے مشکل نہیں ہے۔ محبوب کی زلفوں کو یہ شاعر دو اژدہوں کی پھنکار اور اس کے ابرو کو ٹاؤن ہال کی محراب بتاتے ہیں۔ اس کی مژگاں انہیں پولیس کے قطار میں کھڑے سپاہیوں کی صورت نظر آتی ہیں۔

یہ قدیم شاعر جب شبِ فراق کا دکھڑا تحریر کرتے ہیں تو البتہ دیدۂ خونبار میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے ان کی شاعری میں بلبل پر بچی ہے اور قمری لنڈوری۔ اگر انہیں قامتِ یار کی طوالت کا بیان مقصود ہوتا ہے تو وہ سرو کے ٹھنٹھ کو یاد کرتے ہیں۔ یہ شاعر اپنی نجی زندگی میں خواہ دیندار، توبہ بہ لب اور تسبیح بدست ہی کیوں نہ ہوں شاعری میں مے پرستی اور بادہ گساری ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ آسمان ان شاعروں کا پیر ہے۔ وہ اس کے مرید بھی ہیں اور اسے کوستے بھی ہیں۔ یہ شعرا شاعری میں نہ تو خدا کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ ہی انبیا کا ادب ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ ان قدیم طرز کے شعرا کی طبع دنی عنکبوت کا جالا ہے۔ ان کے مضمون کی بندش مکڑی کا شکار ہے۔ مبالغے کے بغیر ان سے لقمہ نہیں توڑا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں دروغ کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ وہ پریوں اور دیووں کے افسانوں میں الجھے ہیں۔ چڑیلوں کو حورانِ خلد سے نسبت دیتے ہیں۔ ایسے مقیدہ نگار شاعر بھی ملتے ہیں جو اگر کسی چرکٹے کی مدح سرائی کرتے ہیں تو سکندر و دارا کو بھی اس کا باجگذار بنا دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

؎

کریں جو مدح کسی چرکٹے کی وہ بالفرض + تو پھر سکندر و دارا ہیں اس کے باجگذار
بنائیں اس کے تئیں بحر و بر کا سلطان + جو فی المثل ہو کسی کوردہ کا نمبردار
لکھیں وہ دھوم کہ ہو گرد جشنِ جمشید کی + جو رقعہ شادی کا لکھوائے کوئی ساہوکار
مشاعرہ ہو تو لڑتے ہیں جیسے شیخی مرغ + لہولہان ہیں پنجے شکستہ ہے منقار
جہاں خوشامدیوں شاعروں کی تھی بھرتی + اب ایسی کالے کی الو کوئی نہیں سرکار
تو اب وہ پھرتے ہیں ناچار مانگتے کھاتے + بنا کے کاسۂ گدائی کا پرچۂ اخبار

اسماعیل میرٹھی چاہتے تھے کہ عہدِ جدید کے شعرا حسن و عشق کے موضوعات پر توجہ دینے کی بجائے اپنے عہد کے مسائل اور واقعات کو احاطۂ تحریر میں لائیں۔ روایت کی تقلید نہ کریں۔ تفاخر اور خود ستائی کو موقوف کریں۔ صرف ایسی مبالغہ آرائی کو روا رکھیں جسے حدودِ عقل میں رکھ کر پرکھا جا سکے۔ جدید عہد کے شعرا استعارے ضرور استعمال کریں تاہم ان کا پر لطف اور قابلِ فہم ہونا بھی ضروری ہے۔ بے سر و پائی پر مشتمل تشبیہوں سے بھی ان کا کوئی علاقہ نہیں ہونا چاہیے۔ جدید شعرا کے لیے اسماعیل میرٹھی نے جو لائحۂ عمل مرتب کیا اس کے چند اہم پہلوؤں کے مطابق یہ ضروری تھا کہ وہ حقیقتِ حال کی شاعری کریں، تنگ بندی اور دروغ گوئی سے پرہیز کریں۔ جدید قصیدہ نویسی کے حوالے سے ان کا نظریہ یہ تھا کہ ممدوح کے مرتبہ اور مقام سے متجاوز مدحیہ مضامین کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ کسی دیہات کے رئیس کے لیے بحر و بر کا سلطان کے الفاظ استعمال کرنا روا نہیں ہے
اسماعیل میرٹھی کا کہنا تھا کہ خوشامد پرست شعرا کا دور لد چکا ہے۔ اب کوئی سرکار کا لٹو کی الو نہیں رہی۔
اسماعیل میرٹھی نے اپنے نظریۂ قصیدہ نویسی کے مطابق قصائد لکھنے کی کوشش کی۔ ان کے قصیدے ان کے جدید نظریۂ شاعری کے حوالے سے جدید طرزِ فکر و احساس سے ہم آہنگ ہیں۔ سادہ اور سلیس انداز کے قصائد ان کے شعری نظریات کے غماز ہیں۔

اسماعیل میرٹھی نے قصیدہ جریدۂ عبرت میں صرف شاعروں کی قدامت پسندی ہی کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا فلسفی اور عالم حضرات کے لتے بھی لیے ہیں۔ ان کے خیال میں نئے عہد کے فلسفی اور عالم دسویں صدی میں رو بہ عمل ہونے والے خیالات ہی کے اظہار میں منہمک ہیں۔ وہ ایسے یونانی اصولوں اور معیاروں کے مقلد ہیں جنہیں جدید فلسفہ رد کر چکا ہے۔ وہ قدیم مفکروں کی طرح آج بھی 'چہار عناصر' کے فلسفے کے گرویدہ ہیں۔ وہ آج بھی سمجھتے ہیں کہ آسمان زمین کے گرد گرداں ہے۔ نظامِ ہیئت کے ضمن میں بھی یہ علما اور فلسفی پرانے خیالات ہی کو درست مانتے ہیں۔ مسئلہ خرق و التیام اور ثوابت و سیار کے بارے میں ان کا موقف قدیمی ہے۔ ریاضی میں وہ لکیر کا فقیر ہونے سے کیسے بچ سکتے تھے۔ ان کے خیال میں افلاطون اور بطلیموس کے مباحث حتمی ہیں۔ وہ شرح چغمنی، میبذی اور شمس بازغہ میں بیان ہونے والے مسائل کو مطلق جانتے ہیں۔ منطق کے پرانے مناہج ان کے رہنما ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کا موقف ہے کہ عاقلوں کو رائے سازی کے لیے اپنے مشاہدے اور تجربے کو بروئے کار لانا چاہیے۔ یہ سوچنا چاہیے زمین و آسمان کی پیدائش کیسی ہوئی؟ موسموں میں تغیر و تبدل کیوں ہوتا ہے؟ دن رات کا اختلاف کیا ہے؟ بری اور بحری ہواؤں کی نوعیت کیا ہے؟ بحر سے بارش کیسے برستی ہے؟ طبقاتِ زمین کی حقیقت کیا ہے؟ اسی نوع کے دیگر سوالات پر ان کی توجہ رہنی چاہیے۔ نئے زمانے میں قدامت پرست فلسفیوں کی حالت یہ ہے

ے یہ ڈھونڈتے ہیں وہی لٹکا اور وہی جھگڑا + اگرچہ ریل کی سیٹی نے کر دیا بیدار
رفل کے سامنے کچھ کام دے سکے گی بھلا + پرانی وضع کی بندوق وہ بھی توڑے دار

مقصیدہ جریدہ عبرت معلموں کی فراہم کردہ دقیانوسی تعلیم، طبیبوں کے یونانی فارمولوں، دنیا پرستوں اور دینداروں کی غداریوں، مشائخ، عوام اور انگریزی فیشن کے دلدادہ حضرات کی باطل سوچوں کے خلاف ایک موثر صدائے احتجاج بھی ہے۔ اس کے آخر میں دعائیہ اشعار یوں رقم ہوئے ہیں

؎ خدا ہر ایک مسلمان کو کرے روزی + معاش نیک و دل پاک و خوبیٔ کردار

حصول علم و رہِ مستقیم و فہم سلیم + جمالِ صورت و معنی کمالِ عزّ و وقار

حیاتِ اسماعیل کے مولف کا کہنا ہے قصیدہ جریدۂ عبرت نے "ہر پڑھنے والے کے قلب پر گہرا اثر پیدا کیا قوم کی بگڑی ہوئی حالت کا نقشہ کھینچا وہ بھی اس طرح کہ لوگ اس کی اصلاح کی طرف مائل ہوں۔ ہر اسپیس اور ہر انزمانیس۔ ہر مصور کا حوصلہ اور کام نہیں ہے۔ ان حالات و عادات پر تبصرہ کرنا یا ان طبقوں پر حرف گیر ہونا جن کے افراد پیر و مرشد یا معلم و ہادی مانے جاتے ہوں اس طرح کے سامعین اور قارئین متاثر ہوں اسی کوشش کا سحر کہتے ہیں" (۱) حیاتِ اسماعیل میں قصیدہ نوائے زمستان ۱۹۱۰ء، قصیدہ نویدِ مقدم شاہی ۱۹۱۱ء، قصیدہ تاجپوشی ۱۹۱۱ء اور قصیدہ خدائی لشکر کے عنوانات کے تحت اسماعیل میرٹھی کی قصیدہ نویسی پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ قصیدہ نوائے زمستان میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے چندہ کی اپیل کے علاوہ "مسلمانوں کی اخلاقی کمزوریوں، اقتصادی خرابیوں اور ادبی بدمذاقیوں" (۲) کا تذکرہ بھی کیا ہے اور علم کی حصول کو قومی عروج کے لئے ضروری گردانا ہے۔

؎ اگر قوم کی زندگی چاہتے ہو + تو ہے درسش چشمۂ آبِ حیواں

اطبائے حاذق کی تجویز ہے یہ + گھٹے گا اسی سے وذلت کا یرقاں

قصیدہ نویدِ مقدم شاہی میں کہ جو جارج پنجم کی آمد پر (ہندوستان میں) لکھا گیا تھا اسماعیل میرٹھی نے طرز کے انگریزی نظام حکومت اور اس سے متعلقہ اداروں کی تعریف و تحسین کی ہے اس میں نئی سائنسی اختراعات اور اشیا کے نفع رساں ہونے کو بھی موضوعِ اظہار بنایا گیا ہے۔

قصیدہ تاجپوشی کے بارے میں حیاتِ اسماعیل کے مولف لکھتے ہیں "ملک معظم قیصر ہند جارج پنجم کی تاجپوشی ۱۱ دسمبر ۱۹۱۱ء دہلی میں ہوئی ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مسٹر جے آر پیرسن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میرٹھ نے بذریعہ مراسلہ مولانا سے خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ ایک قصیدہ دربارِ تاجپوشی کے متعلق تصنیف فرما دیں۔ مولانا نے بر بنائے خرابیٔ صحت معذرت پیش کی لیکن مسٹر پیرسن کے مزید اصرار پر قصیدہ لکھا اور انہیں کی معرفت سر جان ہیوٹ کی خدمت میں ارسال فرمایا یہ قصیدہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مکمل کر کے بھیج دیا گیا تھا۔ بادشاہی میلہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں قائم ہوا۔ سنا گیا تھا کہ ایک دربارِ خاص منعقد ہوگا اور اس میں شہنشاہِ ہند کے روبرو شعرائے ہند اپنے قصائد سنائیں گے۔ بعد میں یہ رائے تبدیل ہوئی اور یہ قصیدے

(۱) حیاتِ اسماعیل از محمد اسلم سیفی ص ۵۶ مثالی پرنٹنگ پریس دہلی (۲) ایضاً ص ۶۲

ایک جلسہ میں پڑھے گئے جس کی صدارت منجانب ملکہ معظم ہند لفٹننٹ گورنر پنجاب نے فرمائی۔ مولانا کو اس جلسہ کی دعوت دی گئی تھی لیکن علالت طبع کے باعث مولانا شرکت سے معذور رہے۔ اگر شاہنشاہ ہند ۱۲ دسمبر کے دربار میں ان قصائد کو بہ نفس نفیس سنتے تو شاید مولانا حاضری کی تکلیف گوارا فرما لیتے۔ ججنگ کمیٹی نے اس قصیدہ کو نمبر تین قرار دیا تھا اس جلسہ کی کوئی روداد دیکھنے میں نہیں آئی نہ کبھی وہ قصائد نظر سے گزرے جو نمبر ایک اور نمبر دو قرار دیئے گئے اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کن بزرگوں کی تصنیف سے تھے جس کمیٹی نے ان قصائد کی جانچ کی وہ بھی پردۂ اخفا میں رہی۔ بہرحال اس قصیدہ کے صلہ میں مولانا کو ایک "سرٹیفکیٹ آف آنر" عطا ہوا اور ایک چاندی کا تمغہ بھی مرحمت ہوا" ① مولف موصوف مزید لکھتے ہیں" شاعران مشرق کے درباری روایات کی تقلید اور خلعت و خطابات کی بجائے مغرب انداز کے سرٹیفکیٹ اور تمغے ایسی انوکھی بات تھی جو غالباً مشرقی شعرا کے لئے تسکین قلب کا موجب ثابت نہ ہوئی ②۔

اپنے قصیدہ خدائی لشکر میں مولانا نے مسلم طلبا الہ آباد یونیورسٹی کو خطاب فرمایا اس قصیدے میں زبان سلیس، خیالات جدید، بندشیں چست اور تخیل بلند پایہ ہے

اسماعیل میرٹھی اصلاحی شاعری کی تحریک کے رکن تھے۔ انہوں نے اس امر کا اعلانیہ اظہار کیا کہ جدید علوم کی صرف انہی باتوں کو قبول کیا جانا چاہیے جن میں خدا اور انبیا کا انکار نہ ہو۔ ایسے انگریزی دان طبقہ کو بھی سدھرنا چاہیے جو ایشیا کی مخالفت پر کمر بستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کو گنوار اور جاہل سمجھتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اپنے اصلاحی خیالات کے باوجود قصائد کو فنی حدود سے خارج نہیں ہونے دیا۔ اسماعیل میرٹھی کو مسلمانوں کی بدحالی کا شدید احساس تھا وہ انہیں جہالت اور نافہمی کی دلدلوں سے باہر لانا چاہتے تھے۔ انہیں فرقہ بندی اور اس نوع کے دیگر قوم شکن رجحانات سے چڑ تھی۔ اپنے قصیدہ اختلاف رائے میں انہوں نے قوم سے اپیل کی کہ وہ یکجان ہو کر رہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ رمضان ایک ہو اور عیدیں دو

اب کے رویت میں آگیا ہے خلل + رمضاں ایک اور عید ڈبل

اسماعیل میرٹھی کے کلام میں درباری قصائد بھی ملتے ہیں۔ ریاستی نواب اور انگریز حکمران ہر دو ان کے ممدوح رہے ہیں۔ انگریزوں کی تعریف میں ان کے قصائد قدیم قصیدہ نگاری کے اثرات سے خالی نہیں ہیں۔ البتہ ان میں لفاظی سے زیادہ طرز اظہار کی سلاست نمایاں ہے۔ انگریزی راج کی تعریف کرتے ہوئے اور اس کے ہندوستان پر "احسانات" گنواتے ہوئے وہ یہ فراموش کر گئے کہ اس کے جبر اور غلام ساز قوانین سے ہندوستانی عوام کس قدر نالاں تھے۔ البتہ ان کے ترقیاتی کاموں اور احسانات کی تعریف میں انہوں نے مبالغہ آرائی کے عنصر سے گریز کیا ہے جارج پنجم کی شان میں لکھے ہوئے ان کے قصیدے کی تشبیب کے چند اشعار دیکھیے

---

①② حیات اسماعیل ص ۷۱-۷۲

؎ نوبہارِ بوستاں آنے کو ہے + خسروِ گل ہم عناں آنے کو ہے
بہرِ استقلالِ رایاتِ بہار + لشکرِ سروِ رواں آنے کو ہے
شاخِ گلبن پر بہ اندازِ خطیب + عندلیبِ خوش بیاں آنے کو ہے
پیشِ گل و طائرِ رنگیں نوا + تہنیت گو مدح خواں آنے کو ہے

اسماعیل میرٹھی نے اس تشبیب میں خانہ باغوں کے لیے کشمیر سے کشت زارِ زعفران کے اور سائبانوں کے لئے کاشی سے زربفت نفیس کے، ایوانوں کے دروازوں کی زینت کے لیے ٹوکیو سے پرنیاں کے اور فرش پر بچھانے کے لئے روم و فرنگ سے مخمل کے آنے کا تذکرہ بھی کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے

؎ طبلہ طبلہ مشک و تاتارِ ختن + حسبِ حکمِ میزباں آنے کو ہے
وہ میوہ بہ سے تو بہ قنوج سے + عطرِ گل اور برگِ پاں آنے کو ہے

اسماعیل میرٹھی کے قصائد پر جدید رنگ کے گہرے اثرات ہیں ۔ انہوں نے مدحیہ حصوں میں حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ۔ اس حوالے سے ان کا انداز منفرد ہے ۔ اسماعیل میرٹھی نے اپنے قصائد میں منظر کشی اور واقعہ نگاری کے حوالے سے نظم نویسی کے جدید مغربی اصولوں سے استفادہ کیا ہے ۔ ان کے مضامین اور موضوعات ان کے مشاہدوں اور تجربوں کے بطن ہی سے ابھرے ہیں ۔ اپنے ایک چھوٹی بحر میں لکھے ہوئے قصیدے میں ان کا اظہار سادہ، پر جوش اور حقیقت پسندانہ ہے ۔ ان کے اسلوب کی سادگی میں ان کے درسی کتب تحریر کرنے کا تجربہ معاون تھا[1] اسماعیل میرٹھی نے قصائد کو مدح کی حدود سے نکال کر زندگی کے دیگر متنوع احوال کی تصویر کشی کے لئے بھی استعمال کیا ۔ خشک سالی کا تذکرہ ہو یا روم اور روس کی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے قحط کا بیان، جاڑے اور گرمی کی موثر تصویر کشی ہو یا شب برات اور عید الفطر کے مناظر کا لفظی اظہار اسماعیل میرٹھی نے محاکاتی اسلوب کی نزاکتوں سے خاصا استفادہ کیا ہے

---

[1] تاریخ ادب اردو رز رام بابو سکسینہ ص ۳۲۵

اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی [م ۱۹۲۱] کے کلیات حصہ اول میں ایک قصیدہ مبارکباد جشن جوبلی ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند دستیاب ہے یہ ۱۸۷۷ء کا لکھا ہوا ہے اور اکبر نے اسے مسٹر ہاؤن صاحب جج کی فرمائش پر لکھا تھا اسکا مطلع ہے ؎ زمانے میں خوشی کا دور ہے عشرت کا ساماں ہے + ہر رنگ گل پر اک باغ جہاں میں آج خنداں ہے (۱)

خواجہ حسن نظامی اور لالہ نہال چند کی تعریف میں بھی ان کے طویل مدحیہ قطعات (با مطلع) موجود ہیں۔ انہیں بھی خطابیہ قصائد کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے ان کے مطالع دیکھیے

ممدوح خاص و عام ہیں لالہ نہال چند + دوران کے فیض کا کبھی رہتا نہیں ہے بند

حسن نظامی کو میں نے دیکھا، شریف خصلت فقیر طینت + عمل ہے اپنے ہی عنصروں میں اگرچہ دہلی کی ہے ذہانت

علاوہ ازیں ان کے کلام میں مہاراجہ کشن پرشاد، راجہ صاحب محمود آباد، سید فضل الحسن حسرت اور علامہ اقبال کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں ان کا ملکہ وکٹوریہ کی شان میں لکھا ہوا قصیدہ اس عہد میں موجود قصیدے کی روایت کے مطابق لکھا گیا ہے

---

(۱) کلیات اکبر الہ آبادی حصہ اول اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۶ء

احمد رضا بریلوی

احمد رضا خاں بریلوی [م ۱۹۲۱] کی علمیت اور ذہانت کا ایک زمانہ قائل ہے۔ انہوں نے غیر مقلدین کے خلاف بھرپور قلمی جہاد کیا۔ ان کے نعتیہ کلام میں قصائد بھی دستیاب ہیں (۱) یہ کلام حدائق بخشش میں چھپا ہے۔ عقیدت و والہانہ شیفتگی کا لفظی تاج محل بنانا ان کی قادر الکلامی کا معمول تھا۔ ان کے قصائد میں ان کا تبحر علمی کھل کر سامنے آیا ہے۔ وہ قصائد میں مشکل پسندی کے قائل تھے۔

احمد رضا بریلوی کے قصائد میں جہاں مختلف علوم و فنون کی اصطلاحیں کثرت سے نظر آتی ہیں وہاں سنگلاخ زمینوں کی جانب رغبت بھی ان کا وتیرہ تھی۔

ع صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا + صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا (۳)

ان کے قصائد کی تفہیم میں عام قاری کو مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کی مشکل پسندی ان کی شاعرانہ لطافت سے ہم آہنگ ہو کر تاثیر بھی پیدا کر دیتی ہے

ع عرش بھی فردوس بھی اس شاہ والا نور کا + یہ مثمن برج وہ مشکوئے اعلیٰ نور کا

دیکھنے والوں نے کچھ دیکھا نہ بھالا نور کا + من رآی کیسا یہ آئینہ دکھایا نور کا

اس قصیدہ کے ۵۹ اشعار میں ایسی ہی فضا کا اہتمام ہے۔

احمد رضا بریلوی زبان پر قادر تھے۔ وہ جگہ جگہ خوش اسلوبی سے محاورات استعمال کرتے ہیں۔ چھلکا کھلا دینا توڑا لینا (رقص) لہرا بجنا (موسیقی) چھینٹا پینا، اگر کی کا جھلکا لانا اور دو ورقہ تکفنا وغیرہ کی نوع کے بے شمار محاورات ان کے قصائد میں دستیاب ہیں

ع وصف رخ میں گاتی ہیں حوریں ترانہ نور کا + قدرتی بینوں میں کیا بجتا ہے لہرا نور کا۔

کنایات و اصطلاحات کا استعمال دیکھئے (۲)

ع خالق افلاک نے طرفہ کھلائے چمن + اک گل سوسن میں ہیں لاکھوں گل یاسمن (۳)

موتیے بیلے کے پھول زیب گلستان شام (۴) (۵) + جوہی چنبیلی کے گل زینت جیب یمن (۷)

دامن البرز کی کلیوں میں پھولے ہیں پھول (۸) + کوڑے کی جھولی میں ہے حاصل چندیں چمن (۹)

تخت لنسریں میں ہے گیندے کا رخ ایک پھول (۱۰) (۱۱) + ایک گل نیلوفر چار گل ناروں (۱۲) (۱۳)

ناروں ناروش ناظم بالاحصار + سرور اقلیم ترک اصغر لشکر شکن

یہ صنم تندخو آگ نہ ہو تو کہوں + پانی کے اک کیڑے سے کر نہ لیا بانکپن (۱۴)

احمد رضا خاں بریلوی کے اس قصیدے میں علم ہیئت و نجوم کی اصطلاحیں اشاروں اور کنایوں کے حوالوں سے استعمال ہوئی ہیں۔ انہوں نے استعاروں کی خوبی اور دلکشی بھی دیدنی ہے۔ اس کا مدحیہ حصہ ملاحظہ ہو

---

(۱) حدائق بخشش حصہ اول، دوم، سوم (۲) ایضاً حصہ دوم ص ۳ (۳) فلک (۴) کواکب (۵) شمال (۶) کواکب (۷) جنوب (۸) بروج (۹) منطقۃ البروج (۱۰) فلک (۱۱) عطارد (۱۲) زحل (۱۳) مریخ، قلب الاسد، قلب العقرب، عین الثور (۱۴) سرطان

پائے منور اگر بحر میں دھو لیجیے + نخل مبارک اگر شب ہو پر تو فگن
تیرے قلمرو کا چک دور سماک و سمک + حکم رواں کی سڑک وسعت زمین و زمن
نسبت کی انگشت میں خاتم پنجاہ ہے + کن کے ہیں صاحب نگیں تیرے زبان و دہن
تیرا الف قامت آج چاہے اگر بائے قلب + نون کا انشا صبا قاف کا بدلے چلن
نور سے عذرا[1] نے جب شمس نے تحویل[2] لی + دلو سے نکلے نجوم چاند کا چھوٹا گہن
شوہر عذرا ہوا ابن عروس عرب + لیلیٰ و سلمیٰ[3] ہوئیں شمع قدم کی لگن

مذکورہ بالا اشعار میں تشبیہات و استعارات اور صنائع لفظی و معنوی کا ماہرانہ استعمال شاعری اور متعلقات شاعری پر احمد رضا بریلوی کی مضبوط گرفت کا مظہر ہے۔ انہوں نے ایک طویل قصیدہ فضائل فاروق کے تاریخی نام سے بھی لکھا ہے اس میں بھی مذکورہ اوصاف عکس فگن ہیں۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے قصائد میں شگفتگی اور روانی بھی پیدا کی ہے ایک قصیدہ بہاریہ کی تمہید کے چند اشعار یوں ہیں

؂ اودی اودی بدلیاں گھرنے لگیں + ننھی ننھی بوندیاں برسا چلیں
ندیاں پھر آ گئیں دکھلانے لگیں + چھوٹی چھوٹی جھیلیں پھر لہرا چلیں
جھومتی آئیں نسیمیں نرم نرم + پتلی پتلی ڈالیاں لچکا چلیں
دل کھلے کانوں میں رس پڑنے لگے + خوشنوا چڑیاں ترانے گا چلیں
تانوں کی بینوں سے پھر لہرا بجا + گیسوؤں کی ناگنیں لہرا چلیں[4]

مولانا احمد رضا بریلوی نے وجد آفریں جذبات نگاری اور عقیدت مندی سے کام لیا ہے

؂ زمین و زماں تمہارے لیے مکین و مکاں تمہارے لیے + چنیں و چناں تمہارے لیے بنے دو جہاں تمہارے لیے
دہن میں زباں تمہارے لیے بدن میں ہے جاں تمہارے لیے + ہم آئے یہاں تمہارے لیے اٹھیں بھی وہاں تمہارے لیے
عرش پہ تیرا خطاب سید گردوں جناب + فرش میں نام جناب احمد بطحا وطن
خاتم پیغمبراں قاسم نار و جناں + ناظم کون و مکاں حاکم بر ما و من
کچھ ترے پروانے کو نام کی پرواہ نہ ہو + لاکھ جلیں سات شمع بارہ کنول نو لگن۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے بعض قصائد میں مترنم زمینیں استعمال ہوئی ہیں۔ زبان دلکش اور موثر ہے۔ تلمیحات و استعارات کا حسن سے پر سلسلہ نظر آتا ہے۔ علمی اوصاف اور محاسن شعری کے اعتبار سے ان کے قصائد کسی بھی صورت اپنے دیگر معاصرین سے کمتر درجے کے نہیں ہیں۔

---

(۱) مدینہ (۲) ہجرت (۳) کعبۂ مدینہ (۴) قرینۂ ستارہ دیکھئے باغ دل میں وجد کے جھولے پڑے + آرزوئیں پینگ بڑھا کر گا چلیں
؂ سر کے سبزہ اودی اودی بدلیاں + دن ڈھلے کیا چنریاں رنگوا چلیں
پھر نظر میں گدگدی ہونے لگی + دھانی دھانی اوڑھنیاں لہرا چلیں

آغا جان احسن

حکیم آغا جان احسن [خمخانۂ جاوید جلد اول کی تخلیق کے وقت ان کی عمر ۵۰ برس تھی][1] کا تعلق دہلی سے تھا ان کے قصائد کا ایک مجموعہ موسوم بہ قصیدہ بنوع مناجات قومی عجائب گھر کراچی کا مخزونہ ہے اس میں احسن کے چار قصائد منقبت ، ایک قصیدہ نعت اور ایک قصیدہ مناجات ہے منقبت کے قصائد خلفائے اربعہ کی شان میں ہیں ۔ ان سے جہاں آغا جان احسن کی حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے ۔ وہاں ان کے عقائد کا سراغ بھی ملتا ہے ۔ مشفق خواجہ نے بہاؤالدین لبشیر کے حوالے سے لکھا ہے (تذکرہ لبشیر مرتبہ مشفق خواجہ غیر مطبوعہ) کہ احسن نے اولاً چند غزلیں میر حسن موق کو دکھلائیں ' پھر موزونی طبع سے کہتے رہے ۔ فی الحال ایک دیوان سراپا کے طور پر تحریر فرمایا ہے[2] ۔ احسن کا انداز بیان سادہ اور پر تاثیر ہے ۔ ان کے قصائد میں ان کی عقیدت جھلکتی ہے

اردو نظم یا شاعری میں حمدیہ مضامین بیان کرنے کا رواج پرانا ہے ۔ حمد میں دعائیہ کلمات کی شمولیت مناجات پر منتج ہوتی ہے ۔ مناجاتیں فارسی اور اردو میں خاصی تعداد میں لکھی گئی ہیں احسن کا یہ قصیدہ مناجاتی ہے اس کے بارے میں مخطوطے میں یہ عبارت درج ہے

" قصیدہ بنوع مناجات بحضرت مجیب الدعوات ' قاضی الحاجات ' کاشف المہمات ' خالق کائنات و جملہ موجودات خدائے عزوجل ہو مثیں ہمہ تن شوق و ذوق اس کو دیکھو ' پڑھو ' سمجھو ' محظوظ و مسرور ہو ۔ غالباً کسی نے ایسا قصیدہ نہ لکھا ہوگا نہ پڑھا ہوگا ۔ نہ سنا ہوگا ۔ کیسے کیسے اور کتنے واسطے دیئے ہیں مجھ خاکسار ذرۂ بے مقدار ' گنہگار ہیچ و ہیچمیداں ' امیدوار فضل ایزد ذوالمنن حافظ آغا جان احسن دہلوی خلف مرزا نور اللہ بیگ کابلی کے لئے دعائے خیر کرو[3] " احسن کے عقائد کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ روشن خیال اور غیر متعصب مسلمان تھے ۔ انہوں نے خلفائے راشدین کی شخصیات کے عظیم پہلوؤں کو موضوع شعر بنایا ۔ ان کے نعتیہ اشعار عقیدت کے موتیوں کا ہار ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تذکرۂ احمد مختار انسان کو ظلمتِ دوزخ سے جنت کی طرف لے جائے گا ۔ ان کے خیال میں جو سید ابرار کی آل کا محب ہے وہ احمد مختارؐ کے چار یاروں کا بھی قدرداں ہے ۔ خدا کے حضور مناجاتی انداز سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے احسن نے خدا کی خالق کل ہونے کی صفت کا تذکرہ بھی کیا ہے اس کے رحیم و کریم ہونے کی بات بھی کی ہے ۔ خدا ان کے نزدیک کائنات کا خالق اور جملہ موجودات پر حاوی ہے ۔ وہ عزت اور جلال والا ہے ۔ گنہگاروں کی خطائیں معاف کرتا ہے اور بے مقداروں کا دستگیر ہے ۔ احسن کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

جو محب ہے دل سے آلِ سید ابرار کا
قدرداں ہے چار یارِ احمدِ مختار کا

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۱۲۸

[2] جائزہ مخطوطات اردو ص ۱۹۷ ، [3] جائزہ مخطوطات اردو ص ۱۹۶

شیر خاں چابک سوار

محمد شیر خاں چابک سوار جے پور کے طویلہ آتش کے ملازم تھے ۔ وہ سیالوزئی بھی تھے
انہوں نے اپنے ہم زلف الف خاں کی فرمائش پر قصائد لکھے (1) ۔ ان کے قصائد فنون حرب وغیرہ کے حوالے
سے ہیں بانک، بنوٹ، گتکا، سلاق، لٹھ وغیرہ کو موضوع بنا کر انہوں نے چند قصیدے لکھے ۔ علاوہ ازیں
انہوں نے حمد و نعت کے قصائد پر بھی توجہ دی۔ محمد شیر خاں چابک سوار کا دیوان قصائد کثرت کے نام سے
طبع ہوا تھا ۔ اس میں انہوں نے کثرت اور فنون حرب کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے ۔

ہوا اب حمد کا شوق رقم ہے + اور اس کے وصف میں حیراں قلم ہے
خدا کے حمد میں کب رہ گزر ہے + کہ حیراں وصف میں جن و بشر ہے
مجھے اب شوق کثرت اس قدر ہے + کہ جس کے شوق میں اڑتے سپر ہیں

قصائد کثرت میں محمد شیر خاں نے محمد عثمان عرب ساکن سرائے دہلوی ملازم راج جے پور
کا ایک قصیدہ بھی چھاپا ہے ۔ اور اس کا جواب بھی لکھا ہے محمد عثمان کے قصیدہ کا مطلع ہے

یہ حمد و نعت کی جو رہ گزر ہے + گزرنا اس سے کب کار بشر ہے

محمد شیر خاں چابک سوار کے قصائد کی اہمیت محض ریکارڈ کے حوالے سے ہے کہ انہوں نے فنون حرب
اور فن کثرت کو اس صنف میں سمیٹا ۔ یہ قصائد انہی فنون کی تعریف کے لیے رقم ہوئے ہیں
احترام الدین شاغل کے بقول وہ سلسلہ نقشبندیہ کے درویش مجاز و مرتاض تھے اور متعدد لوگ
آپ کے مرید تھے ۔ محلہ بساطیاں (جے پور) کے ایک مکان میں معتکفانہ
رہتے تھے ۔ نماز جمعہ و عیدین کے علاوہ شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتے تھے (2)
یہ احوال ان کی عمر آخر کا ہے ۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں انہوں نے رزم و بزم کے معاملات
سے پورا حظ اٹھایا ۔ ان کا مجموعہ کلام "کلیات کثرت" اپنے اندر فنون حرب کی مدح گستری کا
عمدہ سلسلہ لیے ہوئے ہے ۔ ایسا قصائد اس لیے بھی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں شخصیاتی مدح سرائی
کی بجائے اشیاتی مدح کا وتیرہ اپنایا گیا ہے ۔ بانک، بنوٹ، گتکا، ورزش کے مختلف انگ
تیر اندازی، گھوڑ سواری کیسے کیسے فنون کی تعریف رقم ہوئی ہے

اسلامی تہذیب و ثقافت میں جہاں عقائد و افکار اور ایمان و عبادات کی اہمیت مسلمہ ہے
وہاں اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں نے معاشرتی اور انتظامی علوم و فنون کو بھی
اہمیت خاص سمجھا ۔ دکنی دور کے قصائد سے لے کر دور جدید کے قصائد تک تقریباً ہر اہم قصیدہ نگار
نے فنون حرب کی اصطلاحات کثرت سے استعمال کی ہیں اسپ اور اس کے متعلقات، ہاتھی اور اس کے متعلقات اور
جنگی ساز و سامان وغیرہ ہمیشہ ہی سے قصیدہ کا موضوع بنتے رہے ہیں ۔ شیر خاں چابکسوار کہ جو شاعری میں جنون
تخلص کیا کرتے تھے ۔ کثرت اور اس کے متعلقات کے حوالے سے عمدہ قصیدے رقم کیے ہیں

---

(1) کلیات کثرت مطبوعہ منبع العلوم مستفاد س ن (2) تذکرہ شعرائے جے پور ص ۱۹۹

صفدر علی صفدر [۱۹۰۱ء میں زندہ تھے] رامپور سے متعلق تھے ان کے قصائد سبعہ سیارہ[1] مقبول و معروف ہوئے۔ انہوں نے اپنے ہر قصیدہ کا ایک عنوان مقرر کیا حمدیہ قصیدہ "انوار وحدت" نعتیہ قصیدہ "مہر نبوت" منقبت علی کا قصیدہ "نادعلی" امام حسن کا "خلق حسن" امام حسین کا "القلوب بالخزانہ" چہاردہ معصومین کا "گنج شہیداں" اور در صفت فصل بہار و صحبت پری رخسار و تذکرہ شعرائے نامدار والا "ضیغم بہار" کے نام سے موسوم ہے۔

صفدر علی صفدر کی شاعرانہ مہارت پر ان کے علم اور مشاہدے نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ انہوں نے قصائد میں جس بھی موضوع پر اظہار خیال کیا اس کے اہم متعلقات کو بھی شاعری کا روپ عطا کیا صفدر علی صفدر نے ایک تمہید میں ثنا کے موضوع کو چھیڑا ہے فخریہ تشبیب بھی لکھی ہیں اور بہاریہ بھی، ایک تشبیب میں زمانے کی ابتری کا حال بیان کیا ہے۔ قصیدہ گنج شہیداں کی تشبیب میں عشق اور اس کے لوازم کا تذکرہ ہے فخریہ اشعار دیکھئے

بزم سخن میں ہم زباں خاک ہو مجھ سے انوری + شمع صفت جلے مجھے گل ہو چراغ شاعری

خالق علم سے مجھے روز ازل سبق ملا + کس کو نصیب ہے بوا و نبرۂ سخنوری

فضل خدا سے ہر گھڑی طبع رسا کے ساتھ ہیں + پانچ حواس باطنی پانچ حواس ظاہری

منطق و معنی و بیاں سب ہیں وکی زباں پر + کندہ ہے تیر نام پر خاتم نام آوری

پھر وہ کہتے ہیں کہ میں علم حدیث میں کمال رکھتا ہوں، فقہ میں بے مثال ہوں، علم ادب میں بو علی ہوں اور علم لغت میں جوہری، وہ اپنے آپ کو خسرو خوش بیاں بھی کہتے ہیں اور سعدی، نکتہ داں بھی۔ کہیں وہ خضر رہ کلیم بنتے ہیں اور کہیں پیش رو سلیم۔ وہ فرید کہتے ہیں

میرے محیط فکر میں رودکی ایک موج ہے + میرے بیاض شعر کا جزو ہے ایک عنصری

جامی و اہلی و کمال قاسم و فطرت و ظہیر + سنتے ہیں سب ہیں سرنگوں خاک کریں گے ہمسری

عرفی، فیضی و منیر، شوکت و بیدل و حزیں + قافیہ تنگ ہو اگر مجھ سے کریں برابری

صائب و حافظ و غنی طالب و دانش و وحید + کہہ دو کہ مجھ سے سیکھ لیں رسم و رہ سخنوری

صفدر علی صفدر نے "نادعلی" میں بھی فخریہ تشبیب کا اہتمام کیا ہے

کونین میں بخشش ہے خدا نے مجھے توقیر + پستی میں ہوں سجدہ تو بلندی میں ہوں تکبیر

ثنا کے موضوع پر ان کی تشبیب میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں یہ تشبیب قصیدہ امام حسن سے ماخوذ ہے

نقش باطل ہے طلسم ہستی ناپائیدار + ہے تصرف میں خزاں کی اس گلستاں کی بہار

کیقباد و بہمن و اسکندر و دارا و جم + اٹھ گئے اس عالم فانی سے کیا کیا نامدار

کیا ہوا تخت سلیمان، کیا ہوا خسرو کا تاج + کیا ہوا چتر فریدوں کیا ہوا اسفندیار

---

[1] کلیات صفدر از صفدر علی صفدر، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۱ء
قصائد سبعہ سیارہ ص ۴۹۹ تا ۵۵۲

زمانہ کی ابتری کے حوالے سے صفدر علی صفدر نے جو قصیدہ امام حسینؑ کی تشبیب لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے علم و ہنر کی محفلوں کے اجڑ جانے اور اہلِ علم کے در بدر خاک بسر پھرنے، دم بخود، ششدر ہونے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جنہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں تھا ان کی زبان تو فر فر چلتی ہے اور اہلِ علم خاموش ہیں۔ شرم و حیا کے اٹھ جانے، بازارِ فریب کے گرم ہونے اور جنسِ ایمان کے بکنے کے موضوعات بھی اس تشبیب کا حصہ بنے ہیں وہ مزید لکھتے ہیں

آجکل حال زمانے کا ہوا ہے ابتر + کیا ہی بگڑا ہے مزاجِ فلکِ دوں پرور
اب کہاں نعرۂ تکبیر کہاں شورِ اذاں + زنگ و ناقوس کی آتی ہے صدا آٹھ پہر
ایک پیسے کے عوض کھاتے ہیں جھوٹی قسمیں + پہنیں قرآن کا جامہ تو نہ آئے باور
اب رحمت کی دعا گر کوئی دہقاں مانگے + کشتِ امید پہ افلاک سے برسیں پتھر

اس تشبیب میں صفدر علی صفدر نے یہ بھی کہا ہے کہ رات دن جو قصر و ایواں میں بسر کیا کرتے تھے ان کو اب کرایہ کا چھپر بھی میسر نہیں ہے۔ آج سب لوگوں نے "نیچری ٹوپی" پہن رکھی ہے اور "افسر" کا نام کوئی بھول کر بھی نہیں لیتا۔ کرسی اور میز کا رتبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اگر اب انہیں تختِ طاؤس بھی مل جائے تو وہ اسے ٹھوکر لگائیں۔ آج انسان بھی نئے ہیں، علم بھی نیا ہے۔ نوجوان بزرگوں کا ادب عزیزوں کا خیال نہیں کرتے۔ خود سر ہیں۔ انہوں نے دن کو بادہ کشی اور رات کو شاہد بازی کا وتیرہ اختیار رکھا ہے۔ ماں باپ کا انہیں خوف نہیں ہے۔ امرا زادے شب و روز چانڈو خانوں میں پڑے رہتے ہیں۔ قاضی اور مفتی سے اب شرم و حیا نہیں رہی

فہم برعکس ہے، تدبیر غلط، عقل خلاف + منفعت جس کو سمجھتے ہیں اسی میں ہے ضرر

نازنین بھی عشوہ و انداز بھول گئے ہیں، عشاق سے آنکھ ملتے ہی زر طلب کرتے ہیں۔ اس تشبیب میں انقلابِ میخانہ انقلاب، نازنینان کے ساتھ ساتھ انقلابِ جواہر، انقلابِ چمن اور انقلابِ وحوش کا بھی خاصا تذکرہ ہے

دن کو بد مست پھرا کرتے ہیں بازاروں میں + شب کو بے ہوش پڑے رہتے ہیں ٹکیائی کے گھر
قیمتِ لعلِ بدخشاں ہے نہ قدرِ الماس + سنگریزوں سے زبوں تر ہے عقیقِ احمر
بلبلیں بھول گئیں زمزمہ سنجی اپنی + ناز پروردۂ چمن ہو گئے حسرت پرور
ہنس آنکھوں سے نہاں ہو گیا مثلِ عنقا + زاغ کی دم میں نکل آیا ہے سرخاب کا پر
دیکھتا کوئی نہیں رقصِ حسینانِ جہاں + ناچتے پھرتے ہیں اب شہر میں گھر گھر بندر

اس تشبیب میں یاقوت، نیلم، زمرد، فیروزہ، قمری، عنادل، چیل، شپرہ، ہدہد، باز، الو، چغد اور ہما وغیرہ کے حوالوں سے بھی عمدہ شعر کہے گئے ہیں اور زمانے کی ابتری کو استعاراتی انداز میں پیش کیا گیا ہے

اپنے قصیدہ گنج شہیداں میں صفدر علی صفدر نے عشق کو موضوع بنایا ہے

؎ خدا نے روزِ ازل دل کو جب کیا پیدا + دکھایا عالمِ وحدت میں عشق کا جلوا

صفدر علی صفدر نے عشق کو دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا، وادیٔ ایمن میں خضرِ منزلِ شوق، ہدہد پیغامبر، بلقیس، مہرِ سلیمان، تختِ سبا، پردۂ ظلمت، اسکندر، دیدۂ اربابِ معرفت کا نور، روشنیٔ قلبِ اہلِ صدق و صفا، صلوٰۃ، اذان، تکبیر، رکوع، فاتحہ، سجدہ، درود و وظائف، نقش و عمل، سبحۂ خاصانِ حق، صدائے انا الحق، منصور، پیرِ طریقت اور شیخِ حرم وغیرہ کہا ہے۔

؎ کبھی ہے خانۂ کعبہ میں نعرۂ تکبیر + کبھی ہے دیر میں ناقوسِ برہمن کی صدا
اسی کا دیر و حرم ہے جا بجا مذکور + اسی کا گبر و مسلماں میں کو بہ کو چرچا

عشق کے حوالے سے انہوں نے زلیخا، یوسف کنعان، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن اور محمود ایاز کی بات کی ہے کہیں وہ انہیں دلقِ گدائی نظر آیا ہے کہیں کاسۂ فقر۔ کہیں وہ اسے افسرِ شاہی قرار دیتے ہیں اور کہیں ظلِ ہما۔ احد، بدر، خیبر وغیرہ کی جنگوں میں بھی عشق ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور یہ یوں لکھا ہے

؎ جہاں میں عشق سے پیدا ہوئی ہیں دو قسمیں + مجازی الفتِ خوباں حقیقی عشقِ خدا

صفدر علی صفدر نے اپنے قصیدہ نسیمِ بہار میں بہاریہ ماحول کی عمدہ عکاسی کی ہے یہ شعر ملاحظہ ہوں

؎ جلوہ آرا ہے جو گلشن میں سلیمانِ بہار + مثلِ ہدہد فرقِ بلبل پر ہے تاجِ افتخار
منصلِ گل میں ہر چمن ہے رشکِ گلزارِ ارم + شاہدانِ گل کی صف ہے یا کہ حوروں کی قطار

اس میں طاؤس، عندلیب، لالہ، گلنار، نافرمان، نسرین و سمن، چنار، نرگس، طوطیٔ شکر مقال، کوئل، پپیہا، سرو، سوسن، سنبل، حنا، قمری، خطِ گلزار، ژالہ باری، مطرب و ساقی کی امیجری کے ذریعے عمدہ منظر کشی کی گئی ہے

؎ نہر پر فرشِ مکلف ہو شبِ مہتاب میں + زینتِ بزمِ طرب ہوں شاہدانِ گل عذار
ساقیانِ مہ لقا ہوں سامنے ساغر بکف + بزمِ عشرت میں چلے دورِ شرابِ خوشگوار
در پہ میخانے کے جا کر پہلے یہ آواز دے + مغبچو اٹھو چلو گلشن میں آئی ہے بہار

صفدر علی صفدر نے اس تشبیب میں بزمِ نشاط و عیش کا عمدہ ترجمان کیا ہے

؎ ہر طرف محفل میں سازِ خوشنوا بجنے لگے + بربط و چنگ و رباب و بین و قانون و ستار
بانسری، الغوزہ، بیلا، تار، تقیم، جلترنگ + ارگن و تنبور و معشوق و سرود و سنگھار
تھاپ طبلوں پر پڑی سارنگیاں بجنے لگیں + پہونچی با تیس کی گمک اس گنبدِ گردوں کے پار
بزمِ عشرت میں ہوا رقصِ بتانِ مہ جبیں + کوکے کوئل کی طرح چہکے حسیں مثلِ ہزار
وہ اٹھا کر ہاتھ میں پیشواز کو چلنا کبھی + وہ بجانا پاؤں سے گھنگھرو کبھی دو تین چار
وہ حسینانِ جہاں کا تان لینا زمزمہ + وہ سریلی ان کی آوازیں کہ زہرہ ہو نثار
کس مزے سے بین میں کوئی بجاتا تھا بہاگ + دلیش کا چرچا کہیں تھا کوئی گاتا تھا ملار

صفدر علی صفدر نے اس تشبیب میں کدارا، پرچ، کلنگرہ وغیرہ کے حوالے سے بھی اشعار لکھے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ باغبانی، موسیقی اور رقص کے بارے میں وہ خاص معلومات رکھتے تھے۔

طویل تشبیبوں کے بعد صفدر علی صفدر بڑے چوکس انداز میں گریز کرتے تھے

ہے یہ عجیب ماجرا تقاضا میں کیا ں کدو ہو گیا + طبع رسا دکھائے اب شوکتِ مدح گستری

اس شہِ دیں پناہ کا وصف میں اب رقم کروں + جس پہ خدا نے ختم کی روزِ ازل پیمبری

حمدیہ قصیدہ میں انہوں نے خالقِ قدرت کی صناعی کی تفصیلات[1] دیتے ہوئے چار عناصر، عشقِ حقیقی، جسم کا فانی ہونا، مکانِ معرفت کی جستجو وغیرہ کے موضوعات کو بھی ~~سمیٹا ہے~~ چھوا ہے۔ نعتیہ قصیدہ میں حضورؐ کے لئے احمد عرش آستاں، باعثِ خلقتِ جہاں، فخرِ زمین و آسمان، افسرِ فرقِ سروری، فخرِ گروہِ انبیا، آیۂ رحمتِ خدا، شافعِ روزِ داوری وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

رب کا شریک ہے عدم آپ کا سایہ ہے عدم + غور سے دیکھو رتبہ کس سے ہوئی برابری

واہ رے اوج گنبدِ مرقدِ فخرِ انبیا + ایک کلس ہے سبز رنگ گنبدِ چرخِ اخضری

حضورؐ کے سیرت و کردار پر والہانہ عقیدت سے معمور اشعار لکھتے ہوئے صفدر علی صفدر نے انہیں شر و فساد کا مٹانے والا، ظلم ختم کرنے والا، شافعِ حشر اور سراپا خلق و کرم کہا ہے۔

حضرت علیؓ کی مدح کرتے ہوئے ان کی عدالت، شجاعت اور کرم وغیرہ کو موضوع بنایا ہے

وہ نورِ نبی ہے جو نبی نورِ خدا ہیں + پھر قوم نصیری کی عبث کرتے ہیں تکفیر

امام حسنؓ کے لئے سبطِ پیغمبر، قسیمِ کوثر و جنت، نیر دین کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس میں صفتِ اسپ اور صفتِ شمشیر بھی بیان کی گئی ہے

روزِ اول سے یہی تمغا ہے اس شمشیر کا + لافتا الا علی لا سیف الا ذوالفقار

کس زباں سے وصف ہو اسپِ سبک رفتار کا + ہے براقِ مصطفےٰؐ کی نسل سے یہ راہوار

امام حسینؓ کی منقبت بیان کرتے ہوئے صفدر علی صفدر نے امامؓ پر ٹوٹنے والے مظالم کی تفصیل بھی دی ہے اور ان کے صبر و شکر کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انہیں امامِ برحق، قرۃ العینِ نبی، حاکمِ کون و مکاں اور بادشہِ ہر دو جہاں کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ امام حسینؓ کی عبادت، عدالت، صبر و قناعت، استقلال، شجاعت، شہادت وغیرہ کی صفت بیان ہوئی ہے اس میں ان کی شہادت کا حال بھی قلمبند ہوا ہے۔ بیانِ ماتم بھی ہے اور امامؓ کے رفقا کا ذکر بھی۔ چہاردہ معصومین کی تعریف میں صفدر علی صفدر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

امامِ اول و مشکل کشائے حسن و لبشر + سخی و عادل و صاحب روائے شاہ و گدا

حسن امامِ دوم پیشوائے ہر دو جہاں + وہ سپہرِ شرف آفتابِ صدق و صفا

حسن کے بعد امام سوم جناب حسینؓ + ہوئے جو راہِ خدا میں شہید تیغِ جفا
ہوئے امام چہارم جنابِ زین عبادؓ + مسیحِ چرخِ چہارم پہ جیسے جلوہ نما
امام خلق ہیں پنجم محمد باقرؓ + فروغِ چشمِ حبیبِ خدائے ارض و سما
جنابِ جعفرِ صادقؓ ہوئے امام ششم + کہ جن کے صدق و صفا کی ہے شش جہت میں ثنا
جنابِ موسیٰ کاظمؓ امام ہفتم ہیں + کہ گرد پھرتے ہیں بہرِ ثواب سبع سما
امام ضامن ثامن ہیں رہنمائے جہاں + جو خاص و عام میں مشہور ہیں جنابِ رضاؓ
ہیں ان کے بعد محمد تقیؓ امامِ نہم + کہ نہ فلک ہیں درِ پاک پر جبیں فرسا
پناہِ خلق امامِ دہم علی نقیؓ + کہ دہ عقول بھی مستعد رہیں وقفِ مدح و ثنا
امام یازدہم عسکریؓ عالی قدر + امام سبطِ خاصانِ بارگاہِ خدا
امام مہدیٔ ہادی ہیں جو دوازدہم + اگرچہ ان کے ہیں ایامِ غیبتِ کبرا

اپنے قصیدہ نسیم بہار میں صفدر علی صفدر نے شعرا کی مدح سرائی بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ میر کے اشعار اہلِ دل کو بے اختیار رلا دیتے ہیں۔ سوز کے اشعار جگر جلا دیتے تھے درد دلوں کو بے قرار کرتے ہیں۔ صاحب فہم مصحفی کے اشعار پر وجد کرتے ہیں۔ سودا کے اشعار جوشِ جنوں پیدا کرتے ہیں۔ جرأت و انشا کو بھی صفدر علی صفدر نے اپنے وقت کے پایۂ دار شعرا کہا ہے۔ ہوس کے اشعار محفل کو عبرت دلاتے ہیں اور ہستی ناپائیدار کی ہوا کو دل سے مٹاتے ہیں۔ ذوق کے اشعار شوقِ سخن کو ابھارتے ہیں اور مومن کا کلام آبدار ہے۔ غالب کے اشعار انہیں تراشے ہوئے گوہر محسوس ہوئے۔ ناسخ و آتش بھی انہیں انتخابِ روزگار لگے۔ اسیر کی شاعری صفدر کے خیال میں قیدِ فکر سے آزاد کرتی ہے۔ ان اردو شعرا کے بعد انہوں نے فارسی شعرا کی تعریف کی ہے۔ خسرو اور سعدی پر انہیں شعر گوئی کا دارومدار معلوم ہوا۔ فردوسی کے رزمیہ نقشوں سے آنکھوں کے سامنے شکلِ کارزار ہو گئی۔ نظامی کی نظم اور جامی کی شاعری بھی پسندیدہ ٹھہری، حافظ کا کلام بھی مسرت بخش ہے۔ خاقانی اربابِ سخن میں تاجدار ہے۔ قدسی کے اشعار سب کو پاک صاف لگے۔ صائب کے اشعار شاعروں میں استوار ٹھہرے۔ عرفی و فیضی کے کلام سے فیض [?] ملتا ہے۔ انوری کے مضامین کا نور سب پر آشکار ہے۔ ان شاعروں کی تعریف کے ساتھ ساتھ صفدر علی صفدر نے اہلی، ہلالی، بیدل، ناصر، غنیمت، حزیں اور آرزو وغیرہ کی شاعری کی خاص تعریف کی ہے۔ ان شاعروں کی تعریف کے بعد صفدر علی صفدر نے فخریہ لہجہ بھی اختیار کیا ہے

شعرِ صفدر کی جو سب کے بعد نوبت آ گئی + غل ہوا اعجاز ہے یا سحر اے پروردگار

صفدر علی صفدر رامپوری کے قصائد میں بیان ہونے والی تفصیلات جہاں قصائد کی موضوعاتی وسعتوں کا ثبوت ہیں وہیں یہ شاعر کی قادر الکلامی کی بھی مظہر ہیں۔

قادر بادشاہ

قادر بادشاہ [۱۹۲۵ میں فوت ہو چکے تھے] بادشاہ مدراسی کے نام سے مشہور تھے ان کی شاعری کے تین مجموعے مدح پیغمبر اور نعت خیر البشر (۲) ملتے ہیں۔ گلزار بادشاہ (۱) مدح پیغمبر میں نعتوں اور غزلوں کے علاوہ ان کے قصائد بھی شائع ہوئے ہیں۔ "انہوں نے ۱۳۱۰ھ سے کچھ پہلے دیوان بادشاہ مرتب کیا جو ان کی غزلوں، نظموں اور قصیدوں پر مشتمل ہے" (۳)۔ حامد اللہ لکھتے ہیں انہوں نے "اپنی نظموں اور قصیدوں میں سنجیدگی اور وقار کو قائم رکھا خاص کر قصیدوں کی تشبیبیں ایسی باندھی ہیں کہ پڑھنے والے کا دل ممدوح کی تعریف سننے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے" (۴) بادشاہ مدراسی کے نعتیہ قصائد حضورؐ سے ان کی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے مرصع تشبیب نگاری کا حق بھی ادا کیا ہے اور پرزور مدح نویسی کا بھی۔ قصیدہ نعت ؎

جوش پر بحرِ سخن آج ہے دربار دربار + لفظ لفظ سے قلم کا گہر در بکتا

ہے وہی فخرِ رسل، فخرِ زماں، فخرِ زمیں + فخر کا لفظ ہے خود فخر اسی سے پایا (۵)

مذکورہ قصیدے کی تشبیب ایسی رس بھری اور تازہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ متحرک اور جھومتا نظر آتا ہے فرش بچھانے کا یہ عمل ایسا ہی لطیف ہونا چاہیے تھا اس لئے کہ ممدوحؐ کی عظیم ہستی کا تذکرہ مقصود تھا

گلزار بادشاہ کے نام سے قادر بادشاہ کی شاعری کا جو مجموعہ شائع ہوا تھا (۶)۔ اس میں مدحت رحمۃ للعالمین، (۷) دین اور دنیا کا مفہوم اور تنزل اہلِ اسلام (۸) وغیرہ کے عنوانات سے ان کی قصیدہ کی ہیئت میں لکھی گئی نظمیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کی ایک قصیدہ نما نظم حجاز ریلوے کے افتتاح کے حوالے سے ہے

قادر بادشاہ کے قصائد کے مطالعہ سے قاری پر کھل جاتا ہے کہ فن شاعری پر انہیں پورا عبور حاصل تھا ؎

ہر نفس کیوں نہ ہوا ہم نفسِ بادِ سحر + گلشن طبع سے کھلتے ہیں شگوفے کیا کیا

پست ہر چند ہوں لیکن ہے مرا عزم بلند + نارسا گرچہ ہوں رکھتا ہوں مگر ذہن رسا

اوج پر ہے مرا شہباز خیال آج کے دن + سر جھکا دیں گے نہ کیوں طائر معنی مرے

ہر سخن ور ہو نہ کیوں صورت مجنوں مجنوں + مثل محمل ہے مری فکر تو مضموں لیلا

مرے مضموں کی صفائی سے ہے حیرت مجھ کو + دل آئینہ کو بے وجہ نہیں ہے سکتہ

اس تعلی آمیز تشبیب کے بعد قادر بادشاہ یوں گریز کرتے ہیں

؎ کس کو یہ فخر نہیں میرا پسندِ خاطر + کون کہتا ہے تعلی ہے بجیری بے جا

یعنی میں اس کا تہہ دل سے ہوں محو توصیف + خالق ہر دو سرا جس کا ہے خود مدح سرا (۱۰)

بادشاہ مدراسی کے قصائد رس بھری موثر شاعری سے معمور ہیں

---

(۱) مدح پیغمبر از بادشاہ مدراسی، مطبع نامی مدراس ۱۹۱۲ء (۲) نعت خیر البشر مطبع نامی مدراس ۱۹۲۵ء

(۳) مضمون بادشاہ مدراسی از حامد اللہ افسر، رسالہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۰ء (۴) ایضاً (۵) کل ان اشعار مدح پیغمبر ص ۵۹

(۶) گلزار بادشاہ مرتبہ اسمٰعیل مظلوم مطبع نامی مدراس ۱۹۱۹ء (۷) تا (۹) ایضاً ص ۳۰، ۸۰، ۸۲ (۱۰) مدح پیغمبر ص ۵۹، ۶۰

ابوشرف مجددی

محمد ابواشرف مجددی کا ایک قصیدہ آفتاب شرف کے نام سے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔[1] یہ قصیدہ حضرت مجدد الف ثانی کی مدح میں ہے اس کا مطلع ہے

؎ مرحبا کس شان سے نکلا فلک پر آفتاب + خسرو اقلیم انجم شاہ خاور آفتاب

یہ قصیدہ موضوع اور طرز اظہار کے اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں قصیدہ نگار نے اکبر اور اس کے رفقا پر شدید تنقید کی ہے۔ عہد اکبری میں جو فضا الحاد کی فضا قائم تھی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے مجدد الف ثانی کی شخصیت کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس قصیدے میں جہاں بیربل فیضی، ابوالفضل اور ٹوڈرمل کے شر و الحاد کا تذکرہ کیا ہے[2] وہاں صدیق اکبرؓ، حضرت بایزید بسطامی، حضرت ابوعلی فارمدی، خواجہ عبدالخالق غجدوانی، خواجہ عزیزان علی، خواجہ محمد بابا، خواجہ بہاؤالدین نقشبند، علاؤالدین عطار، خواجہ عبیداللہ احرار، خواجہ محمد زاہد اور خواجہ محمد باقی باللہ کی خیر و دین دوستی کی مدح بھی کی ہے۔ ابواشرف مجددی نے اپنے تک آنے والے بزرگوں کے اسماء بھی دیئے ہیں اور توحید وشہود کے مباحث بھی مدنظر رکھے ہیں۔

؎ دونوں دریا کے جو غواص ان کی آنکھیں + تو ہی بحرین کا نایاب گوہر آفتاب

صاف کہتا ہے یہی اس کا شہود اس کا وجود + اک صلہ ہے درمیاں ماہ و اختر آفتاب

وجود و شہود کا موضوع حضرت مجدد الف ثانی کا مرغوب موضوع تھا۔ اس پر ان کے مکتوبات میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے محی الدین ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود پر بھی بحث کی ہے۔ صاحب قصیدہ نے اپنے اس قصیدہ میں مجدد الف ثانی کی دیگر تعلیمات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور قصیدہ کے بارے میں لکھا ہے

؎ کیا ہے نورانی قصیدہ مدح میں تو نے لکھا + جس کا ہر اک لفظ ہر جملہ منور آفتاب

محمد ابواشرف مجددی نے آفتاب شرف میں فنون حرب (منجنیق، گرز، کوہ پیکر، فوج) علم نجوم (مشتری، زہرہ، عطارد، قوس، اسد، حوت، عقرب، ثور، جدی) اور مذہب و تاریخ (الحاد، رفض، شہود و وجود، اکبر، جہانگیر) وغیرہ سے متعلقہ الفاظ، اصطلاحات اور نام وغیرہ کو خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے۔ قصیدے کے لیے زمین بھی سنگلاخ ہے

؎ منجنیقِ مہرِ درخشاں نور لمعاں برق ساں + چتر زر طاس طلا سونے کا چتر آفتاب

ثور کے ہیں سینگ اور عقرب کے نیش ان کے سلاح + ڈالتا ہے جن پہ نظریں مسکرا کر آفتاب

ہند میں تھا گو جلال الدین اکبر آفتاب + تھا غبار طبع سے لیکن مکدر آفتاب

زندقے کی تھی بلائے ناگہاں آئی ہوئی + رفض کے شعلوں کو دکھلاتا تھا منظر آفتاب

---

[1] آفتاب شرف از محمد ابواشرف مجددی مطبع ستارہ ہند کلکتہ ۱۹۳۲ء

[2] ؎ بیربل فیضی ابوالفضل اور ٹوڈرمل انیس + نور کی جا آگ برسائے ہے اخگر آفتاب

کاظم حسین محشر

مرزا کاظم حسین محشر [۱۹۴۸ تک زندہ تھے] لکھنؤ سے تعلق تھا عزیز لکھنوی اور صفی لکھنوی کے معاصرین میں سے تھے ۔ نعت و منقبت کے قصائد لکھا کرتے تھے شائع محشر[1] کے نام سے ان کے قصائد کا ایک مجموعہ ان کی زندگی ہی میں [غالباً ۱۹۲۲] زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ وہ قادرالکلام شاعر تھے یعنی فنونِ شاعری پر مکمل طور پر حاوی ۔ وہ مقاصدوں کی محفلوں میں قصیدے پڑھا کرتے تھے ۔ ان کے قصائد سرفراز لکھنؤ میں بھی شائع ہوتے تھے[2] ۔ مترنم بحروں کا انتخاب ' شاعرانہ انداز ' محاکاتی طرزِ بیان ' مقتضائے حال کے مطابق کوائف کی ترسیل ' فصاحت و بلاغت کا جوہر ان کے قصائد میں تخصیصی اہمیت کے عناصر ہیں ۔ خارجی کوائف اور داخلی تجربات کا اظہار ہو کر حقیقت سے قریب تر جبہ مضامین کا بیان محشر لکھنوی کا قلم ہر میدان میں یکساں پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہے

صورتِ خلوت اور ہے محفلِ ناز اور ہے ✝ تیرے حریم حسن کا شامیانہ راز اور ہے
خضر کی پیروی عبث کیوں ہو غلامِ مسیح ✝ اہلِ فنا میں صرفِ عمر دراز اور ہے
قدرتِ دیدۂ کلیم آگے بڑھے تو دیکھ لے ✝ کوئی اسی حجاب میں جلوہ طراز اور ہے

حضرت علی کی ولادت پر انہوں نے ایک معرکۃ الآرا قصیدہ لکھا ۔ اس کی تشبیب میں چاندنی رات کے کوائف خوش اسلوبی سے بیان ہوئے ہیں ۔ ان کے اندازِ بیان کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں

دن کٹ گیا ظاہر ہوئی شامِ شبِ اجلال ✝ نکلا وہی قسمت کو جگاتا مہِ تاباں

اس میں محشر نے چودھویں کے چاند کی پھیلی ہوئی تجلی ' رخسارہ مہتاب کی روشنی ' چشمۂ مہتاب کا جوش ' نور کا طوفان ' ذروں کا صفحۂ گیتی پر چراغاں ہونا ' کرمکِ شب تاب ' سنبر وغیرہ کے الفاظ سے شبِ مہتاب کا عمدہ منظر کھینچا ہے ۔ اس تشبیب میں چاند اور خوب صورت معشوقوں کا تقابل و موازنہ بھی ملتا ہے محشر نے اس میں مدح کا یہ انداز اپنایا ہے

یہ ہاتھوں پہ افضالِ الٰہی سے علی ہیں ✝ یا قلبِ رسولِ عربی کا کوئی ارماں
لو گود میں محبوبِ خدا نے لیا بڑھ کر ✝ لو بدر کی صورت نظر آیا مہِ تاباں

محشر نے دورِ جدید کے بعض قصیدہ گو شعرا کی مانند مبالغہ آرائی سے گریز کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ۔ اور ممدوح کے اپنی فضائل کو مرکزِ اظہار بنایا جن کا تعلق فی الحقیقت اس کی شخصیت سے تھا

کہتا ہے نصیری کہ خدا کہیے علی کو ✝ اور عقل یہ کہتی ہے کہ کہیے اہنس النساں

محشر حسنِ تعلیل کا عمدہ استعمال کرتے ہیں ✝ محکوم ترے اہلِ سمٰوٰت ہیں مولا ✝ ڈوبا ہوا مغرب سے پلٹا مہرِ درخشاں

روشن ہے جہاں آپ ہی کی جلوہ گری سے ✝ یہ چھٹکی ہوئی چاندنی یہ ماہِ درخشاں

---

(۱) شائع محشر از کاظم حسین محشر لکھنوی مطبوعہ ۱۹۲۲ لکھنؤ (۲) سرفراز لکھنؤ جنوری ۱۹۲۸

سورج نرائن مہر [م ۱۹۳۱] دہلی سے متعلق تھے لاہور میں سررشتہ تعلیم پنجاب سے بھی منسلک رہے ان کے مجموعہ نظم کلامِ مہر میں آٹھ قصائد ملتے ہیں ان کے نام ہیں توحید واجب الوجود(۱)، سائیں کی صدا(۲)، زنِ کامل(۳)، مردِ کامل(۴)، لطفِ موسیقی(۵)، تدریج(۶) سپاسِ نعمت(۷) اور آرزوئے دیدار(۸)۔ سورج نرائن مہر کا ایک مجموعہ قصائدِ مہر کے نام سے بھی طبع ہوا تھا اس میں ان کے حمدیہ قصائد موجود ہیں(۹)۔ مہر کے قصائد میں فلسفہ اور تصوف کی بہت سی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں عالمِ امکان، واجب، عدم، ما سوا، اہلِ باطن، وہمِ محض، وجود، ماہیت، عالمِ رویا، وحدت و کثرت، ہستیٔ مطلق، عینِ ذات، کون و مکاں وغیرہ،

[توحید واجب الوجود] ذات بینا ہے بیاں خود عالم و معلوم و علم + ذات وحدت میں ہے کثرت کا تماشا ہو رہا

قادرِ مطلق ہے تو ہر جزو اور کل پر قدیر + صانعِ بے منتِ اسباب بے چون و چرا

گر سمجھتے ہیں تجھے اے عین حسنے انا + چاہئے کر شاگردیٔ منصور اے مردِ خدا

عالمِ جبروت میں گرچہ نہیں وہم خودی + بے شباک سے مگر حصہ نہیں ہے ذات کا

لاتعین نطق ہے وہ بے تقیدِ علم ہے + راحت بے مثل و بے اندازہ و لا انتہا

[سائیں کی صدا] یہ دنیا جائے گزشتنی ہے سائیں کی ہے یہ صدا بابا + یاں جو ہے رو بہ رفتنی ہے تو اس میں دل نہ لگا بابا

مہر نے مختلف موضوعات پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے وہ چاہتے تھے کہ نئے زمانے کی عورت کے گلے میں زیورات کی جگہ عصمت و عفت کے ہار رہیں اور خدمتِ شوہر کے جوشن پہنے۔ مردِ کامل ان کے نزدیک جسمانی طور پر بھی صحت مند ہوتا ہے اور سیرت کے اعتبار سے بھی مصفا و پاکیزہ، وہ سمجھتے تھے کہ موسیقی جانِ زار کی تسکین اور دلِ فگار کی مرہم ہے۔ مہر نے ایک قصیدہ تدریج کی شان میں بھی کہا ہے اور کہا ہے کہ نا امید جب ہمت کی کمر توڑتی ہے تو تدریج اس کے لئے مومیائی کی مثال ہوتی ہے وہ چاہتے تھے کہ انسانوں کو جو حق کی جانب سے نعمتیں میسر آئی ہیں ان کا سپاس کیا جائے۔ مہر کے نزدیک وصالِ جاناں سے گزرنا ہے اور مواصلت کا نام رونا ہے۔ مہر کے قصائد موضوعاتی تنوع کے حامل ہیں

[زنِ کامل] سہ عورت کی ذات خیرِ مجسم ہے دہر میں + اس کے ادائے حق میں ہوا کون کامیاب

[مردِ کامل] نصف انسان ہے مگر صورت و صحت اور جسم + نصف دیگر ہے وہ جس کا نام ہے حسنِ سیرت

[لطفِ موسیقی] ایمن، بہمیر، شام، کدارا و کلیان + حیرت میں ہوں کہ کس کو دیا جائے افتخار(۱۰)

[تدریج] تو ہے اے تدریج وہ زینہ کہ ہر اک قدم + ہے ترقی کا قدم بے شک پہنچے اوجِ کمال

[سپاسِ نعمت] بہ شکر خدا کا ہے کہ دولت تجھے بخشی + یوں مانتے ہیں اہلِ نظر منت و احساں

---

(۱) تا (۸) کلامِ مہر بالترتیب ص ۲۵، ۳۱، ۳۴، ۳۸، ۴۴، ۵۰، ۵۳، ۵۷ مطبع رفیقِ عام لاہور ۱۹۰۸ء
(۹) قصائدِ مہر مطبوعہ سادہ لوح پریس دہلی (۱۰) اس میں میگھ ملہار، سورٹھ، دلیس، نٹ، گونڈ، بروا، پیلو، کھماچ، دلوید، پنچم، رکھب، گاندھار، کانہڑا، بہاگ وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں ان سے مہر کی موسیقی سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے دیکھئے ص ۴۱-۴۹ کلامِ مہر

علی حیدر نظم

سید علی حیدر نظم طباطبائی [م ۱۹۳۲] لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ کے عزیز تھے۔ حیدر آباد میں نظام کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ سے منسلک رہے۔ وہ بنیادی طور پر جدید نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے انگریزی نظموں کے تراجم بھی کیے۔ مجموعہ نظم (۱) ان کی نظموں کا مجموعہ ہے اس میں (۴) ان کے ساتھ نعتیہ قصائد شامل ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے دکنی نظام کی سالگرہ اور تخت نشینی کے موقع پر جو قصائد لکھے نظم طباطبائی کے ان قصائد کے نام ہیں ذکر بعثت و فتح مکہ۔ قصیدہ معراج، ہجرت و غزوہ بدر، ذکر جاہلیہ و جہاد آنحضرتؐ، قصیدہ احزاب، قصیدہ خیبر اور قصیدہ حنین۔ نظم کا ایک قصیدہ شہر آشوب بھی دستیاب ہوتا ہے اسکا عنوان ہے نظم عبرت و حسرت (۲)۔ نظم طباطبائی اپنے قصائد میں ذیلی سرخیاں بھی دیتے ہیں قصیدہ حنین میں بہار و تغزل، موعظہ، وصف حور اور نعت سرورِ عالم وغیرہ کے ذیلی عنوانات ملتے ہیں۔ نظم کے قصائد کے یہ مطالع ملاحظہ ہوں

سہ
کہاں سے کھینچ کر وارفتگی مجھ کو کہاں لائی + میں ہوں راز نہفتہ اور جہاں بازار رسوائی
ہے ابرو بوسہ بیر ستار و مست چشمگیں + خنداں رخ و گریاں مژہ روشن دل و تیرہ جبیں
ہو گیا مہر جہاں گرد نظر سے او جھل + ڈھونڈنے برق چلی ہاتھ میں لے کر مشعل
فریب ہستی موہوم پر ہے نص قرآنی + سراب دشت ہے پیاسے سمجھتے ہیں جسے پانی
زباں جب تک نہ کھولی تھی مجھے آتا نہ تھا باور + کہ ہے میرے قلم کی آستیں میں شورش محشر
ہم ہیں اور جام گردشِ قسمت + ہم ہیں اور جرعۂ غم و محنت

عبد القادر سروری لکھتے ہیں " مبالغہ اور لفاظی قدیم قصیدہ نگاری کا لازمی جز بن گئے تھے مگر نظم نے ان چیزوں کو قصیدے سے بالکل دور کر دیا ہے۔ ان کے پیش نظر قصیدے کا قدیم معیار ہونے کے باوجود بے سروپا اور بیان سے ہر جگہ اجتناب کرتے ہیں بادشاہوں اور امیروں کی مدح میں بھی جو قصیدے انہوں نے لکھے ہیں عموماً اصلیت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ صرف چند قصیدوں کی تشبیب میں قدیم طرز کے مضامین نظم کیے ہیں ان میں عرفی کا سا جوش اور خاقانی قصیدوں کی سی عظمت پوشیدہ ہے" ——
" نعتیہ قصائد میں طباطبائی کی فکر کا منتہا نظر آتا ہے ان میں بڑی علمیت ہے —— ان کی تشبیبوں میں دقیق متصوفانہ مضامین اور فلسفیانہ خیالات نظم کیے گئے ہیں —— نظم طباطبائی کی نعتیہ تشبیبوں کا ایک ممتاز وصف یہ بھی ہے کہ شاعرانہ حقائق ان کا اصل اصول نہیں بلکہ ان میں آنحضرت کی سیرت کے اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں" (۳)
نظم زمین شعر میں ہر زہ گری کو ناپسند کرتے تھے۔ تحقیق، علمی اور فنی حوالوں کو فوقیت دیتے تھے

---

(۱) مجموعہ نظم ص ۱ تا ۳۲ (۴) رسالہ الناظر لکھنؤ یکم مئی ۱۹۱۱
(۲) چونکہ یہ قصیدے قصیدے کی ہیئت میں نہیں ہیں اس لئے یہ یہاں زیر بحث نہیں آئیں گے
(۳) جدید اردو شاعری ص ۱۸۸ - ۱۸۹
نوٹ (دیوان نظم طباطبائی مطبوعہ مطبع اعظم جاہی حیدر آباد میں ان کے مذکورہ بالا قصائد دستیاب ہیں ص ۲ تا ۱۷ ان کا ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی مدح میں بھی ہے ص ۸۲ اور لیک شاہزادہ البرٹ کے ورود ہندوستان پر ص ۹۵

نظم طباطبائی نے اپنے قصائد میں تاریخی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات کو ترجیح دی۔ وہ تلقین و رہنمائی کے قائل تھے مگر شاعرانہ نزاکتوں اور لطافتوں کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے قصیدہ گوئی کے فنی لوازم کو پورے طور پر سامنے رکھا۔ نظم کی تشبیب میں دل نشیں انداز سے اسرارِ حیات کھلتے ہیں۔ اخلاقی موضوعات کی پہلو داریاں سامنے آتی ہیں۔ وہ گریز بھی بڑے چوکس انداز میں کرتے تھے

یہ حسرت تھی نثارِ مقدمِ خیر البشر کرتا + حیاتِ جاوداں افسوس ہے مجھ کو نہ ہاتھ آئی

مدحیہ مضامین میں ان کے جذبات کا والہانہ پن دیکھنے کے قابل ہے

یہ کس رستے سے تو اے رہنما ہنستا ہوا آیا + ہزاروں میں برس عالم کو تو نے راہ دکھلائی

نہ سمجھے معجزہ عقلی گر تو کیا شک تھا رسالت میں + شریعت تیری سچی فطرتی نبوت تیری آبائی'

حضورؐ کی مدح میں وہ قرآن و حدیث کے حوالے بھی دیتے ہیں اور اپنی تاریخی معلومات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

ہوا انعام من و سلویٰ آلِ طٰہٰ کے لئے نازل + بچھا تھا آلِ احمد کے لئے خوانِ مسیحائی'

یہ باعث تھا کہ جب غارِ حرا سے نورِ حق نکلا + رہی شعبِ ابی طالب میں برسوں رونق افزائی

نظم طباطبائی نے اپنے قصائد میں وسعت اور تنوع پیدا کرنے کے لئے نظمیہ موضوعات کو بھی ان کا حصہ بنایا وہ حالی کی مانند قصیدے میں سچے اور کھرے جذبات کا اظہار چاہتے تھے۔ ان کے قصائد میں تاریخ اسلام کے بعض واقعات کی حقیقی اور موثر تصویریں نظر آتی ہیں۔ نظم کی قادر الکلامی کا اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ جو موضوعات مثنوی کی ہیئت میں بیان کیے جاتے تھے انہیں انہوں نے قصیدہ کی ہیئت میں منتقل کیا۔ قصیدہ میں قوافی کی سخت پابندیوں کی وجہ سے اس نوع کی کوششیں جرأت مندانہ ہیں۔ نظم نے اپنے ممدوحین کی سیرتوں کے پہلو اجاگر کرتے ہوئے قومی تربیت کے معاملات کو فراموش نہیں کیا۔

نظم کے قصائد طویل تھے۔ ان کی طوالت کے باوجود ہم انہیں قصیدہ کی فنی پابندیوں سے گریزاں نہیں کہہ سکتے۔ تشبیب کے حسن و تنوع سے لے کر گریز کی لطافت اور مدح کے حکایاتی و اخلاقی موضوعات تک ہم حرف گیری سے قاصر رہتے ہیں۔ نظم طباطبائیؒ کے اظہار کی دل نشینی اور خلوص کے ساتھ ساتھ ان کی عالمانہ بصیرتوں کی داد بھی دی جانی چاہیے۔ انہوں نے اوصافِ نبوت کے بیان میں مذہبی علوم سے اس نوع کا استفادہ کیا ہے کہ قاری ان کی وسعتِ معلومات کا قائل ہو جاتا ہے۔ حضورؐ کے معجزات کے محاکاتی بیان میں انہوں نے خاص مہارت دکھائی ہے اس ضمن میں دیکھئے ان کا قصیدہ ذکرِ بعثت و فتحِ مکہ' نظم ایجاز و اختصار کے جوہر سے متصف تھے اور مستوی ایجاز طرازی سے رغبت رکھتے تھے۔ ان کے قصائد میں تشبیہات و استعارات کا استعمال جدید نظم کا پرتو لئے ہوئے ہے۔

نظم طباطبائی کے ایک قصیدہ میں محسن کاکوروی کے قصیدہ لامیہ ہی کی مانند ہندی تلازمات و الفاظ

کا استعمال نظر آتا ہے۔ لیکن ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ اس حوالے سے محسن کاکوروی جیسی روانی اور قدرت پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ کنول، کشن، ہریلی، گوکل، اندر، ارجن، کنھیا اور گنگا جل وغیرہ کے الفاظ نظم کے مقصیدہ کا حصہ بنے ہیں

ع کفر ہے نزع کی حالت میں دم آخر ہے + ابر تر حلق ٹپکا رہا ہے گنگا جل

نظم کے مقصیدہ احزاب کی تشبیب میں بھی ہندی تلازمات و الفاظ موجود ہیں

ع نہ کیوں ہندوستاں کی خاک میں ہو راگ رنگ ایسا + کنھیا کی بستی ہے بانسری میری غزل خوانی

نظم طباطبائی تشابیب میں موزونیت اور مناسبت کا اہتمام کرتے تھے۔ ان میں کہیں وہ زندگی کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے ہیں کہیں بہاریہ مناظر کی جانب مائل ہیں۔ مقصیدہ ذکر ہجرت اور غزوہ بدر میں انہوں نے ترک وطن کے مضامین بیان کیے ہیں۔ وہ تمہیدی اشعار کے اختصار کو ملحوظ رکھتے تھے اور ان کے بعد تاریخی واقعات کی جانب رجوع کرتے تھے البتہ قصیدہ غزوہ حنین کی تشبیب طوالت کی حامل ہے ان کے مقصیدہ خیبر کی تشبیب کے چند اشعار درج ذیل ہیں

ع زباں جب تک نہ کھولی تھی مجھے آتا نہ تھا باور + کہ ہے میرے قلم کی آستیں میں شورش محشر

قلم جب تک اٹھایا تھا نہ میں نے یہ نہ سمجھا تھا + کہ خامہ ہے خطیب بزم معنی الکلیاں منبر

شکار طائر سدرہ تھا منظور اور نہ واقف تھا + کہ مضموں ہے عقاب اور مصرع برجستہ ہے شہپر

وقار علم رو کے تھا مری زور طبیعت کو + یہ کہسار تھی آندھی نہاں آندھی میں تھا لشکر

خلیل بت شکن کا رعب مانع تھا مجھے ورنہ + سخن بت خانۂ معنی تھا اور فکر رسا آذر

لطافت طبع کی تھی مثل سیل آب آئینہ + مگر اس سیل کو روکے ہوئے تھے سد اسکندر

مری پژمردگی افسردگی دیتی تھی اک دل کو + مگر تھا آب زیر کاہ آتش زیر خاکستر

گریز یوں کرتے ہیں

ع کدورت ناشناسی سے تھی عالم کی جو میں چپ تھا + اگلتا ہوں جواہر اب طفیل نعت پیغمبر

یہ ہے جس رہنما کے فرش پا انداز کا صدقہ + کہ آیا چرخ اطلس کارگہ صنع سے باہر

مواطن ہیں بہت سے جس میں نصرت کبریائی کے + مگر یہ قافیہ کہتا ہے لکھو غزوۂ خیبر

نظم نے مقصیدہ کو اسلاف کے کارناموں کے اظہار کا وسیلہ بھی بنایا۔ ان کے طویل قصائد میں غزوات کا بیان ان میں رزمیہ خصوصیات پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں مسلم غلامی کے عہد میں اپنے قصائد کے وسیلے سے ماضی کے مجاہدین کی سرفروشی اور جانبازی کی داستانیں سنائیں اور انہیں اس حوالے سے دعوت دی کہ وہ پیروی اسلاف کریں۔ ان کے قصائد کے مدحیہ حصے سیرت نگاری اور کردار نویسی کے حوالے سے بھی اہم ہیں۔ ان میں تاریخی واقعات

اور جنگوں کا احوال اسطور رقم ہوا ہے کہ کسی نوع کی تضاد بیانی اور ثقافتی شتر گربگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے ایک قصیدہ میں لڑائی کا سماں بھی نظم ہوا ہے

لڑائی چھڑ گئی کڑکی کمانیں دونوں جانب سے + سنانوں سے سنانیں مل گئیں اڑنے لگے اخگر
قریں ڈھالوں کے ڈھالیں جیسے داغ لالۂ حمرا + بہم تیغوں سے تیغیں جس طرح برگ گل احمر
سپہ پہ تھی سپر موجوں پہ موجیں آب آہن کی + کہ تو بر تو ہوں جیسے سیل میں گلہائے نیلوفر
چکا چوند آتش شمشیر کی تھی سب کی آنکھوں میں + چکا چاک آب آہن کی گئے دینی تھی دل مضطر
سسکنے میں اگر کی سانس زخمی نے تو دم الٹا + تڑپنے میں اگر بسمل نے کروٹ لی پڑی ٹھوکر
کھلیں اس کشمکش میں کوچہ ہائے زخم کی راہیں + اڑے ناوک پھریں چھریاں کھنچیں تیغیں چلے خنجر

نظم طباطبائی کے قصائد میں بعض مقامات پر تشبیہ و استعارہ کے استعمال کی کثرت، کنایات بیان، صنائع بدائع کا وافر استعمال اور مجاز مرسل کی صورتیں ان کی تاثیر کو مجروح کرتی ہیں۔ بسا اوقات انہوں نے دور از کار استعاروں سے مبالغہ بھی کیا۔ اظہار علم کو فوقیت دینے کی وجہ سے نظم کے ہاں شاعرانہ تخیل کہیں کہیں دبتا نظر آتا ہے۔

—

ریاض خیرآبادی

ریاض خیرآبادی [م ۱۹۳۴] دورِ جدید کے مستند اور بلند پایہ شعرا میں سے ہیں۔ ان کے کلیات[1] میں کئی قصائد ملتے ہیں۔ ان میں جہاں روایتی طرز کے مدحیہ اشعار کی کثرت ہے وہاں عہدِ جدید میں رونما ہونے والے بعض واقعات کا نظمیہ تسلسل کی صورت میں بیان بھی ہوا ہے۔ ریاض کے قصائد مہاراجہ گوالیار، فرمانروائے بھوپال، شہریار رامپور، مہارانی دواس پانتی، راجہ صاحب محمود آباد اور جارج پنجم وغیرہ کی شان میں[2] ہیں۔ ان کے قصائد کے بعض مطالع ملاحظہ ہوں

درمدح مہاراجہ گوالیار ~ وہ پو پھٹی کھلا پھیلا کے کا در مبارک ہو + طلوع صبح عشرت اے شہ خاور مبارک ہو

درمدح شہریار رامپور ~ حور کو فردوس سے لائے بہار رامپور + تان سے پریوں کو کھینچے سبزہ زار رامپور

شہر کی منت سے لگے وقت پر بھاوتی مہارانی ریاست دواس پانتی کی شان میں ان کے قصیدہ کا مطلع ہے

ماہ میں مہر کی ہے تابانی + صبح سے بڑھ کے شام نورانی

مدح راجہ محمود آباد ~ بننے کو شمع بزم بنیں بے شمار چاند + ساحر کی انجمن کو لگا تا ہے چار چاند

ریاض خیرآبادی کے مقامی حکمرانوں کی شان میں لکھے گئے قصائد پر ان کے غزلیہ مزاج کی گہری چھاپ ہے۔ ریاض نے جارج پنجم کی شان میں جو قصیدہ لکھا اس میں اسلامی ممالک میں روس کی مداخلت رکوانے کے لئے ممدوح سے اپیل بھی کی ہے اور یہ تقاضا کیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی فوجی تربیت کا انتظام کروائے اور دشمنوں کے خلاف ان کی معاونت کرے۔ اس قصیدے میں دورِ جدید میں بننے والی قصیدے کی نئی روایت کا اظہار ہوا ہے۔ حالی اور اسماعیل میرٹھی کی بنائی ہوئی ڈگر پر چل کر ریاض نے حقیقت پسندانہ طرزِ بیان اپنایا ہے۔ اس قصیدے کے آغاز میں اسلامی حکمرانی کے عروج و زوال کی کہانی بھی رقم ہوئی ہے۔ مخالف قوتوں کے زور و شور کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی مندرج ہے کہ روس نے تبریز میں کس طرح آفت ڈالی اور پاک دامانوں کی پردہ دری کی وہ لکھتے ہیں

اے شہنشاہ جہاں اے شہ انگلینڈ اے جارج + حیف گر تیری رعایا کا نہ ارماں نکلا

جلد مل جائے فنِ جنگ کی تعلیم ہمیں + شور ہو ہند بھی تیرا عربستاں نکلا

مایۂ ناز ہمیں ہوگی ہماری قوت + ہمت افزا جو شہنشاہ کا فرماں نکلا

ہائے وہ وقت کہ جب تختہ گہ روس ملے + سب کہیں خوب مسلمانوں کا ارماں نکلا

ہم کہیں خاص ہے اسلام ہے برٹش دولت + سب کہیں دل سے شہنشاہ مسلماں نکلا

ریاض رضوان میں لکھا ہے کہ دربار محمود آباد نے یہ شرط لگادی تھی کہ دیوان سے وہ اشعار حذف کر دیئے جائیں جو مہاراجہ کو اچھے معلوم نہیں ہوتے[3] دیوان کی اشاعت میں تاخیر سے یہ ممکن نہ ہو سکا

---

(۱) ریاض رضوان مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن (۲) ان کا ایک قصیدہ راجہ محمد امیر خاں کی مدح میں بھی ہے

(۳) ریاض رضوان ص ۲۰۹ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء ~ مخیانہ ریاض کو بھی دیکھئے مرتبہ تسنیم عثمانی ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن ۱۹۵۲ء

یوں ریاض کی شاعری درباری اصلاح سے محفوظ رہی ۔ ریاض کے قصائد پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی[1] اور رشید احمد جعفری[2] نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے ۔ یہ بات طے ہے کہ ریاض نے دو روایتوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے نتیجے میں ان کے قصائد نہ تو مکمل طور پر جدید اردو قصائد کے اعلیٰ معیار تک پہنچ سکے اور نہ ہی رنگِ قدیم کی منزل حاصل کر سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض کے قصائد کو ہم قابلِ تقلید ماڈل نہیں کہہ سکتے ۔

ریاض نے صنفِ قصیدہ کی جانب خصوصی توجہ نہیں دی ۔ نوابوں اور رئیسوں سے اپنے تعلقات کی وجہ سے انہیں یہ ہنر آزمانا پڑا ۔ ان تعلقات کی تفصیل تسنیم ... نے میخانۂ ریاض میں فراہم کی ہے[3]

نواب حمید اللہ خاں بہادر کی شان میں ریاض کے لکھے ہوئے ایک قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ے عمر پوچھے کوئی تو گنتی کے ہیں چھبیس سال + قابلیت وہ سبق ہے جس سے بوڑھا آسماں
ہے انہی پر اے علی گڑھ ناز کالج کو ترے + پاس بی اے دوسرا کوئی رئیسوں میں کہاں
اس تعلق کا رہے سرکارِ عالی کو خیال + پیش کرتا ہے قصیدہ یہ ریاض مدح خواں

یوں تو اس دور کے قصائد میں اردو غزل میں در آنے والے اثبات و نفی، شرع و تصوف، دین و دنیا، دیر و میخانہ، جنت و دوزخ، تسبیح و زنار، کفر و اسلام اور رند و زاہد کے موضوعات قصائد کا بھی حصہ بنے ہیں تاہم ریاض خیر آبادی نے اپنے قصائد میں ان موضوعات سے زیادہ سروکار نہیں رکھا ۔ توکل، صبر، انسان پرستی، جبر و قدر، بے ثباتی دنیا، استقلال آخرت کے صوفیانہ موضوعات اگرچہ ریاض کی غزل کا حصہ نظر آتے ہیں تاہم انہوں نے ان موضوعات پر بھی اپنی مدحیہ شاعری میں زیادہ اظہارِ خیال نہیں کیا ۔ ریاض کے جذبہ و تخیل کی داد تو ہر سخن فہم نے دی ہے ۔ ان کی غزل کی رنگینی اور چاشنی کا بھی بہت تذکرہ ہوا ہے ۔ البتہ ان کے قصیدے ان کے غزلیہ مقام سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں ۔

یہ ضرور ہے کہ ریاض نے ممدوح کی تعریف میں زمین و آسماں کے قلابے نہیں ملائے وہ ممدوح کے مرتبے، مقام اور درجات کے مطابق ہی مدح کو روا جانتے تھے ۔ ان کے ہاں خوشامدانہ مبالغہ آرائی سے گریز ہی کو فوقیت ملی ہے

---

(1) لکھنو کا دبستانِ شاعری ص ۶۴۳ (2) رندِ پارسا ص ۷، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۵ء
(3) میخانۂ ریاض ص ۲۰، ۲۳، ۳۸، ۴۱، ۱۱۹، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۱

عزیز لکھنوی

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی [م ۱۹۳۵] عہد جدید میں اردو قصیدہ کی آبرو تھے۔ قصائد عزیز (۱) اور صحیفۂ ولا (۲) ان کے قصائد کے مجموعے ہیں۔ قصائد عزیز میں ان کے بیالیس (۴۲) قصائد ہیں۔ ان میں ہر قصیدے کا ایک عنوان قائم کیا گیا ہے۔ ان کے بعض قصائد مختصر ہیں (۲۰ سے ۴۲ اشعار کے درمیان) ان کا اختصار ان کی معنوی اور فنی جامعیت پر اثر انداز نہیں ہوا۔ یہ نعت و منقبت کے قصائد ہیں۔ عزیز کی مذہبی عقیدت اور جولانی طبع کی بدولت ہر قصیدہ موثر اور دل نشیں ہے۔

عزیز کے دوسرے مجموعہ صحیفۂ ولا میں "مئے کہنہ" کے حصے میں جو قصائد طبع ہوئے ہیں یہ قصائد عزیز میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تعداد ۳۶ ہے۔ یہ ذیل کے عنوانات کے حامل ہیں

حسن و عشق، بہار ربیع، معراجیہ، نوید بعثت، سرجوش حرا، نور ہدایت، شمع رسالت، مرات الصفا، شارع الاسلام، درۃ البیضا، عطر عروس، شمع حرم، آثار قیامت، برق تجلی، سرجوش غدیر، آئینۂ عبرت، چراغ کعبہ، پیمانۂ تولّا، ہلال عید، زلال غدیر، قندیل حرم، صبح نور، فتح الباب، تبلیغ رسالت، الماس ریزہ، انقلاب ہستی، سبط اکبر امام، نفس مطمئنہ، خورشید جہاں تاب، سلک گوہر، سجادیہ، آفتاب معاد، کاشف الحقائق، سر معرفت، گل نرجس، مہدویہ، بحر اخضر وغیرہ

صحیفۂ ولا کے جزو سوم کا نام مئے باقی ہے (۳) اس میں عزیز کے ذیل کے عنوانات کے حامل قصائد شامل ہیں

تاریخ کعبہ، نغمۂ ولا، لعل شب چراغ (۴)، پرچم فتح، نہال طوبیٰ، رایت ظفر، پروانۂ جنت، بہار خضرا، سر حقیقت، نرگس شہلا، خطاب بہ ساقی، تجلی اور رحیق ریحانی

صحیفۂ ولا کے جزو چہارم میں سید الشہدا کی شان میں ۱۲ قصائد دستیاب ہیں ان کے عنوانات ہیں سبحۂ مرجان، عقیق مذاب، بادۂ گل رنگ، عقد پرویں، یاقوت احمر، لعل بدخشاں، در ثمین، بادۂ شفق، اثر بعثت، موجۂ کوثر، خطاب بہ ساقی اور موج تسنیم۔ عزیز لکھنوی کے قصائد کے عنوانات سے ہی ان کے مزاج کی لسانی، فنی اور علمی جہت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں کسی قصیدہ کی تشبیب میں حسن و عشق کا مکالمہ مندرج ہے۔ کسی میں بہاریہ کوائف کا بیان ہے۔ کسی قصیدے میں پیرایۂ تغزل اختیار کیا گیا ہے۔ کسی میں علامات محشر کا تذکرہ ہے اور کوئی تاریخی واقعات کا عکاس۔ عزیز کا کوئی قصیدہ بے ثباتی دنیا کے بارے میں ہے اور کوئی موعظت و نصیحت کا انداز لیے ہوئے۔ کسی قصیدے کی تشبیب میں عزیز نے تمازت موسم گرما کا بیان کیا ہے کوئی عشق و عاشقاں کی منازل کے اسرار کا نقیب ہے۔ عزیز لکھنوی نے کسی قصیدے میں بعثت نبوی کی تفصیل بیان کی ہے اور کسی میں ولادت نبی کی۔ انہوں نے حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں اور حضرت علی کی ستائش میں بھی۔ امام حسن اور امام حسین بھی ان کے ممدوح رہے ہیں اور امام جعفر صادق بھی۔ عزیز لکھنوی اپنے دور کے نقادوں کے پسندیدہ قصیدہ نگار تھے جلیل قدوائی (۵) ڈاکٹر مسالک (۶) وغیرہ نے ان کی فنی عظمت پر اظہار خیال کیا ہے۔ صحیفۂ ولا کے قصائد میں موجود خوبیوں کو

---

(۱) قصائد عزیز مطبوعہ معیار پریس رستم نگر لکھنو (۲) صحیفۂ ولا شائع کردہ اشاعت علوم پریس لکھنو (۳) اس کا جزو دوم فارسی منظومات پر مشتمل ہے اور اس کا نام بادۂ شیراز ہے (۴) یہ حضرت علی کی شان میں مسمط مخمس کی ہیئت میں ہے

(۵) مضمون عزیز لکھنوی از جلیل احمد جلیل قدوائی رسالہ الناظر مئی ۱۹۲۶ء (۶) ادب عزیز حصہ اول مرتبہ ڈاکٹر مسالک بار اول مطبع عزیز اکادمی کراچی

اور بھی کئی احباب نے مضامین لکھے تھے (دیکھئے رسالہ تسنیم[1])۔ عزیز لکھنوی کی شہرت ان کی وفات کے بعد بھی برقرار ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی[2]، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں[3] اور کئی دوسرے نقادوں[4] نے ان کے قصائد کی فنی اور لسانی خوبیوں کو سراہا ہے

عزیز لکھنوی کے قصائد کا تعلق روایت سے بھی استوار ہے اور جدید عہد کے شعری مزاج سے بھی۔ ماضی کے عمدہ فارسی اور اردو قصیدہ نگار ان کے لئے نمونۂ تقلید تھے۔ تاہم انہوں نے موضوعاتی اور اسالیبی حوالوں سے جدت طرازی کی روش بھی اپنائی۔ ان کے قصائد کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ نہ صرف معاصر علوم پر دسترس رکھتے تھے بلکہ مذہب و تصوف کے معاملات بھی ان کے شعور میں راسخ تھے۔ انہیں اسلامی تاریخ اور دینی علوم پر مہارت کی حد تک عبور تھا۔ عزیز لکھنوی کی زبان پختہ اور بیان تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ غیر مذہبی مدح یا دنیاوی ممدوح ان کا موضوع اظہار نہ تھے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی طبیعت کا استغنا، توکل اور خودداری ہے

عزیز لکھنوی نے جب سے اردو شعرا کی مانند ماضی کے فارسی اور اردو قصیدہ نگاروں کی زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے اپنے قصائد کے علاوہ بعض غزلوں میں بھی ان زمینوں سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے میر، آتش اور غالب کی زمینوں میں عمدہ غزلیں لکھیں۔ غالب کی بعض زمینوں کو انہوں نے اپنے قصائد میں بھی استعمال کیا۔ یہ اشعار دیکھئے

؎ جب ہوائیں نشہ افزائے گلستاں ہوگئیں + چشم خواب آلود سب نرگس کی کلیاں ہوگئیں [بحر اخضر]

؎ جاتا ہوں عزم کوچۂ جاناں کیے ہوئے + دل میں ہزار طرح کے ساماں کیے ہوئے [چراغ کعبہ]

جلوۂ حسن خودنما چھپ کے کوئی دکھائے کیوں + چھپ نہ سکے تو پھر کوئی پردے میں منہ چھپائے کیوں [

عزیز لکھنوی نے انوری، عرفی اور قاآنی وغیرہ کی ایسی زمینوں میں بھی قصائد لکھے ہیں جنہیں اردو شعرا نے بکثرت سے استعمال کیا ہے مثلاً انوری کے قصیدہ ؏ اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری / کی زمین میں عزیز لکھنوی کا یہ قصیدہ ہے ؎ منتظر کب تک رہیں گے شائقِ بد اختری + اے حجاب آرائیاں تک یہ حجابِ دلبری

عرفی کی ایک زمین کا یہ مصرعہ دیکھئے ؏ مرحبا اے شاہدِ ایام را عہدِ شباب

عزیز لکھنوی کا یہ مطلع ملاحظہ ہو ؎ ہوشیار و باخبر اے سرکشِ عہدِ شباب + تا کجا نظارۂ نیرنگیِ دار الخراب

عزیز لکھنوی کی تشبیب میں ندرت، رنگارنگی اور حسن و تنوع کے عناصر موجود ہیں۔ یہ عناصر بلند سطح کے حامل شاعر کی شاعری کا حصہ ہوا کرتے ہیں۔ عزیز لکھنوی کے مطالعے اور مشاہدے کی وسعتوں نے ان کے تخیل کی فطرت پسندانہ روش کے ساتھ مل کر لطیف تشابیب کی تخلیق میں معاونت کی۔ دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے معاملات کا بیان ہو یا عشقیہ احوال اور جمالیاتی کوائف کا تذکرہ، بہاریہ مناظر کی عکاسی ہو یا دیگر موسمی اور کیفیاتی احوال کی تصویر کشی عزیز لکھنوی نے روایتی نوع کے موضوعات کو نئے رنگوں اور نئی صورتوں میں منتقل کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اردو میں در آنے والی مغربی شاعری ہے۔ عزیز لکھنوی کے عہد تک کالرج، ورڈز ورتھ، شیلے، لانگ فیلو اور دیگر کئی انگریزی شعرا کے تراجم قبول عام کی سند حاصل کر چکے تھے۔ ان شاعروں کے اثرات عزیز لکھنوی کے قصائد پر دیکھے جا سکتے ہیں

---

(۱) رسالہ تسنیم مئی/جون/جولائی/اگست/ستمبر ۱۹۴۴ (۲) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۶ تا ۵۰۲

(۳) ادبی جائزے ص ۱۸۱ تا ۱۸۷ (۴) دیکھئے اردو میں نعتیہ شاعری ص ۴۲۳

چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں ؎ مگر ہنستے ہیں نئے کچھ مغربی شاعر بھی آئے ہیں + کہ دیکھیں حسن سے ہوتا ہے دل کس طرح بے قابو

عزیز لکھنوی کی تشابیب فطرت، زندگی اور ماحول سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کا یہی رجحان ان کے قصائد کی تغزل کی راہ ہموار کرتا ہے ؎ بہار برشگال آئی کہ پھر ہے ساقی مہرو + جگا دے آج کی شب تو ذرا چلتا ہوا جادو

گھٹائیں ہر طرح امڈی ہوئی برسات کی راتیں + معاذ اللہ پھر اس پر دل اسیر حلقۂ گیسو

برستا ہے لگاتار آج پانی بھر گئے جل تھل + ستم ہے اب بھی پیمانہ ہمارا گر نہ ہو مملو

بہار آ آ کے جوش باطنی کو تیز کرتی ہے + مری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں متصل آنسو

نتیجہ دیکھیے کیا ہو نمو کے جوش کا یارب + کہ ہر ہر سانس میں بڑھتا جاتا ہے خون اب کی چلو

نوید فصل گل سے ہو گئیں روحیں طرب آگیں + رگوں میں خون تازہ دوڑنے پھر لگا ہر سو

چلے ہیں جھومتے سرور ہوا مستان مینا سے + گلابی سا خمار آنکھوں پہ ہے دل پر نہیں قابو

مرتب ہو چکا ہے ساز و برگ بادہ پیمائی + میں پیتا جاؤں اور پیمانہ دیتا جائے مجھ کو تو

نشاط روح کا اندازہ کر متوالی آنکھوں سے + کہ ہے ہر رنگ کے پھولوں سے آغوش زمیں مملو[1] [درۃ البیضا]

عزیز لکھنوی نے روایتی انداز کی تشبیب نگاری بھی بڑی مہارت سے کی ہے۔ اس نوع کی تشابیب میں وہ علوم و فنون کی مصطلحات سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ طب، نجوم اور دیگر کئی علوم کی اصطلاحیں ان کی بعض تشابیب کا حصہ بنی ہیں

؎ بہار آتے ہی ان کو ہو گیا ناز خود آرائی + لہو کچھ بڑھ گیا جب فصد دیوانوں نے کھلوائی

حمل کے نقطۂ اول پر آیا خسرو خاور + ربیع معتدل لے کر نوید نو بہار آئی

ہوئی باطل دی و بہمن کی وہ تقویم پارینہ + خزاں کے نام سے آتی ہے نوآرے کو انگڑائی

مکمل کیوں نہ ہو دورہ بروج آسمانی + ازل سے مہر ہے بارہ اماموں کا تولائی

عزیز لکھنوی کے قصیدہ شمع حرم کی تشبیب میں مذہب و فلسفہ کے بعض دعاوی زیر بحث آئے ہیں۔ انہوں نے اس میں بعض عقلی و غیر عقلی نزاعات اور مباحث کو پیش کیا ہے۔ تحقیقی مسائل میں مشغول محققین کے معاملات کا تذکرہ ہوا ہے۔ روایت، درایت، برہان لمی، ادراک، اعیان، موجودات، قدیم، کن، الوہیت، مادہ، عناصر (آتش، آب، ہوا، خاک) امر ربی، ذرہ، قطع حجت، غنا غوث، ارسطو، بطلیموس، کشش، گردش، اوہام، عشق، عقل، بدعت، مرتد و کافر اور قوت اشراق وغیرہ کے الفاظ، نام اور اصطلاحیں اس تشبیب کی نوعیت کی غماز ہیں۔ اس میں خدا کے وجود کے حوالے سے عزیز لکھنوی نے پر مغز بحث کی ہے

عزیز لکھنوی کے قصائد میں ان کے عقائد کا اظہار لطافت و نزاکت سے ہوا ہے۔ وہ تخیل کی مینا کاری اور انداز بیان کے حسن سے اپنی بات کچھ اس طور کہہ گزرتے ہیں کہ قاری کو ان کے عقائد پر ان کی شاعری غالب نظر آتی ہے

---

① صحیفۂ ولا، ص ۱۵۴

عزیز لکھنوی کے قصائد میں قرآنی آیات کی استفادہ کیا گیا ہے، احادیث بھی بیان کی گئی ہیں۔ تاریخ اسلام کے بعض واقعات نظم بند بھی ہوئے ہیں۔ انہوں نے تشابیب میں اپنے تخیل کی کرشمہ سازیوں سے رنگ پیدا کیا ہے اپنے خیالات کو نادر تشبیہات و استعارات سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ ان کے ہاں حسنِ تعلیل، مراعاۃ النظیر تضاد اور تلمیح وغیرہ کی صنعتیں فنی مہارت سے استعمال ہوئی ہیں

زوالِ بہمن و دی جوشِ موسمِ اُردی + کمالِ نامیہ و سربلندیٔ اشجار
یہ جوش ہے کہ ذرا چھیڑ دے تو خوں دے دے + زمیں پہ خود رگِ سودا ہے نشترِ خار

قمر دونیم ہوا تھا جنبشِ انگشتِ حضرت سے + اسی کے ڈر سے ہے کاہیدگی کی اس کو بیماری

جبینوں کو دمِ گل گشت ہے یہ شغلِ دلچسپی + قبائے سبز کے دامن پہ باندھے جاتے ہیں جگنو

لگا کے کحلِ مازاغ البصر چشمِ بصیرت میں + اگر ہو دیکھنا خلوت سرائے عشق کا منظر

برقِ تجلی، چراغِ کعبہ، سجادیہ، گلِ نرجس اور موجۂ تسنیم وغیرہ کے عنوانات والے ان کے قصائد میں علمی، مذہبی اور دینی اصطلاحات و مباحث کی کمی نہیں ہے۔ بسا اوقات انہوں نے تشبیبی مضامین کو مدحیہ مضامین کے مقابلے میں طوالت دے دی ہے تاہم زبان و بیان کی لطافتوں کی بدولت ان کی یہ طوالت کھٹکتی نہیں ہے۔

ان کے قصائد کے مدحیہ حصوں سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں

ابوالقاسم محمد شہسوارِ عرصۂ ایماں + کہ جن کی خاکِ پا ہے چشمِ دل کو کحلِ بینائی [نورِ ہدایت]
جب ان کے جسم کا سایہ امیرالمومنین خود تھے + زمیں پر کس طرح پھر سایہ پڑتا جسمِ والا سے [شمعِ رسالت]
مقابل نورِ احمد کے یکتائی کا دعویٰ ہو + عیاں شق القمر سے ہے یہ رازِ ایزدِ باری [مراۃ الصفا]
وہ خاتونِ معظم نقشِ صورت کھینچ کر جس کا + ہے نازاں خامۂ قدرت بھی اپنی حسنِ صنعت پر [عطرِ عروس]
یہ وہ بچہ ہے جس کے پیکرِ نازک کو چھوتی ہے + ہوا بھی روح القدس کے قلب میں خنکیٔ ایمانی [آثارِ قیامت]
اسی سے خانۂ کعبہ کو قلب الارض کہتے ہیں + کہ نفسِ پاکِ ختم المرسلیں اس میں ہوا پیدا [آئینۂ عبرت]
نجف کی راہ میں رکھا قدم زوار نے جس دم + تصدق ہو گئی صبحِ وطن شامِ غریباں پر [پیمانۂ تولا]
دبستانِ ازل میں تھے معلم آپ ہی پہلے + لیا ہے عقلِ کل نے آپ ہی سے درسِ دانائی [ہلالِ عید]
وہ سپہرِ ولایت علی عالی قدر + کہ جن کا داغِ ولا ہے چراغِ کعبۂ دل [زلالِ غدیر]
لے کے آغوش میں لیتے ہیں نبی آنکھیں کھول + بختِ خوابیدۂ اسلام جگانے والے [قندیلِ حرم]
ابتدائے عمر سے لیں جتنی سانسیں آپ نے + وہ ذخیرہ ہو گئے سب نفسِ رسالت ہو گئیں [سبحۂ نور]

صبحِ ولا کے دیباچے میں عزیز لکھتے ہیں "میں نے آج تک جتنے قصائد ذخیرہ کیے ہیں وہ بہرِ اظہارِ عقائد ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ محاسن ہی رکھتے ہوں یا تحفۂ گلزارِ گلپوش ہوں۔ اس

گلشن میں کہیں کانٹے بھی ہوں گے اور اس معدن میں کہیں خزف پارے بھی ہوں گے۔ انسان خطا کار یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے اشعار عیوب سے پاک ہوں گے مجھ سے جہاں تک ہوسکا میں نے داغوں کو دھویا ہے وہ بہ انداز مثنوی لکھتے ہیں ؎

خطا ہے دعویٰ عصمت یقینی + ہنر اس دور میں ہے عیب بینی

سمجھتا ہوں یہ ہدیہ ہے محقر + اگر پوچھے گا کوئی روز محشر

جہاں میں کیا رہا تیرا وظیفہ + کروں گا پیش گش میں یہ صحیفہ

یہ مجموعہ کہ ہے جنت در آغوش + کرم گستر عطا پاش خطا پوش

مکافات عمل کا اک ذخیرہ + حجابات گناہان کبیرہ

معنون ہے بنام پاک اسوہ + جناب قائم آل محمدؐ (۱)

عزیز لکھنوی نے مذہبی موضوعات کو شاعرانہ تخییل کی چاشنی سے مؤثر بنا کر پیش کیا۔ اپنے قصائد کے مدحیہ حصوں میں انہوں نے مذہبی شخصیات کے دنیاوی اور دینی کارناموں کو بھی موضوع اظہار بنایا۔ یہ کارنامے رمز و کنایہ اور اشارات کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔ انہوں نے تفصیل نویسی یا جزئیات نگاری سے گریز کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزلیہ شاعری کی علامتی اور استعاراتی تیکنیک سے متعلق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے توضیح و تشریح کا انداز اختیار نہیں کیا اپنے نعتیہ قصائد میں انہوں نے حضورؐ کے حالات اور معجزات کی جانب بلیغ انداز سے اشارے کیے ہیں۔ حضرت علیؑ کی منقبت لکھتے ہوئے انہوں نے ان کی شخصیت کی منفرد اور مخصوص باتوں کو موضوع بنایا ان کی بہادری، کرم نوازی اور رسولؐ سے قربت کا تذکرہ کیا۔ عزیز لکھنوی نے قاری کو باشعور سمجھ کر قصیدے لکھے یعنی ان کے ذہن میں یہ خیال رہتا ہے کہ قاری ممدوح کی شخصیت سے متعلق کارناموں اور احوال سے واقف ہے۔

عزیز لکھنوی کے نعتیہ قصائد عشق رسولؐ کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ بعض مقامات پر ان کی تڑپ، اضطراب اور بے قراری دیکھنے کے لئے لائق ہے

؎ سایہ بھی جدا جسم سے ہوتا نہیں دن رات + زور کشش حسن خداداد کی کیا بات

کیا ذکر مرا دل بھی ہے پیرے تو زباں بھی + مشتاق رہے تیرے تکلم کے جمادات

زلفوں سے تری چیں بہ جبیں کا ہے اشارہ + ہو معجزہ شق قمر آئی ہے اب رات

کہتے ہیں اسی واسطے تجھ کو ابوالارواح + تفاوت ترا مظہر ارضین و سماوات

؎ ٹپک رہی ہے اشاروں سے داور ے مستی + ہزار جام و صراحی تری نگہ پہ نثار

؎ کیا یہ عشق نہ منزل ہے میری قلب حمید رتبی + وہیں کرتا ہوں سیر عالم توحید و یکتائی

عزیز لکھنوی کے نعتیہ قصائد میں حضورؐ کے جلال و جمال کا تذکرہ بھی ہے۔ ان کی شخصیت کے عظیم اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ قرآن، حدیث اور روایات کے حوالے سے حقیقت محمدیؐ کے مختلف پہلو سامنے آئے ہیں

---

(۱) صحیفہ ولا ص ح

عزیز لکھنوی کو تصوف اور متصوفانہ مضامین کے شعری استعمال پر بھی قدرت تھی۔ وہ خالص شرعی اور مذہبی موضوعات کو بھی خوب نبھا جانتے تھے۔ صاف، شستہ اور رواں زبان کا استعمال ہو، غیر مبہم لہجوں کی آئینہ بندی ہو، تشبیہ و استعارہ کی صفائی اور عمدگی ہو، صنائع بدائع کا مناسب اور ضروری سلسلہ ہو عزیز لکھنوی نے ہر سطح پر اپنی شاعرانہ اور لسانی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

عزیز لکھنوی نئے دور کے قصیدہ نگاروں میں سے تھے ان کے سامنے جدید نظم کا منظر نامہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شاعری اور ادب کے نئے تقاضے کیا ہیں۔ شاعری کے نئے موضوعات اور مغربی لہجے ان سے مخفی نہیں تھے تاہم قصیدہ لکھتے ہوئے انہوں نے اس کی روایات کو نظر انداز نہیں کیا البتہ انہوں نے بے جا لفاظی، محض شکوہ لفظی یا خارجی گراں شان و شوکت سے سروکار نہیں رکھا۔ یہ عناصر اگر ان کے قصائد میں کسی طور در بھی آئے ہیں تو ان پر عزیز کی معانی آفرینی کا انداز غالب ہے۔

> مہ صیام ہے واعظ سنا حدیث حسن + کہ مستفیض ہوں کچھ تجھ سے بادہ نوش کہن
> سنائے اب متواتر وہ معتبر اخبار + رہے نہ حلّت صہبا میں پھر کسی کو ظن
> تجھے سمجھتا ہوں سرخیل راویان ثقات + تجھی کو جانتا ہوں عالم کتاب و سنن
> جواز بادہ پرستی کا حکم نافذ کر + صلائے عام کہ بیٹھے ہیں بادہ نوش کہن

عزیز کے مدحیہ اجزا مقصدیت سے معمور ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں جس نوع کے سیاسی، اخلاقی، معاشرتی اور ثقافتی ماحول کا نقشہ رکھتے تھے اس کا واشگاف اظہار کرنے سے نہیں چوکے۔ یہ نقشہ ان کی تخیلی پرواز کے وسیلے سے پر تاثیر ہو کر سامنے آتا ہے

> ہوں راز جلی یا کہ خفی تجھ پہ ہویدا + تو دیکھ رہا ہے عقب و لیشت کے حالات
> دوق کا نقش جو سینے پہ بٹھایا یوں تصویر میں + جھلک مہر نبوت کی قرطاعوں نے دکھلائی
> مسلماں ہو گئے اشتی یہودی دیکھ کر جس کو + یہ کیسے نور سے تھی چادر اقدس تری مملو
> بوقت ذبح اسماعیل جس نے دل دہی کی تھی + خلیل اللہ کو دے دے کے تعلیم شکیبائی

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے عزیز لکھنوی نے فارسی شعرا کی زمینوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خود فارسی شعرا نے بھی ایک دوسرے کی زمینیں کثرت سے استعمال کی ہیں۔ ایسا اکثر ہے یہ انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی زمین کس فارسی شاعر نے پہلے استعمال کی ہے۔ فارسی شعرا کے علاوہ عزیز لکھنوی عربی شعرا کے کلام پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے ذیل کے اشعار میں فارسی، عربی اور اردو شعرا کا تذکرہ ان کے ان شاعروں سے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے

> فرزدق، حمیری، حسان و اعشیٰ و عبل و سحبان + ہر اک ہوسف بہ صف بیٹھے ہوئے تلمیذ رحمانی
> کہیں دور پہ میں شیراز سے بیٹھے ہوئے خسرو + جمال الدین عرفی اور حبیب اللہ قاآنی
> نمک پروردگان ذوق معانی کا کہیں جلسہ + کہیں پر میر و غالب مست آہنگ ثنا خوانی

عزیز لکھنوی نے زین العابدین کی شان میں لکھے ہوئے اپنے قصیدے میں فرزدق کے مشہور قصیدے کا ترجمہ بھی شامل کیا ہے

عزیز لکھنوی نے اپنے قصائد کو یکسانیت سے پاک کرنے کے لیے کہیں رندانہ مضامین کا سہارا لیا کہیں حسن و عشق کے موضوعات کا۔ کہیں انہوں نے عاشقانہ تشبیب استعمال کی اور کہیں بہاریہ اور مناظرانہ خیالات پر طبع آزمائی کی۔ موسموں اور مناظروں کے بیان میں بھی ان کا قلم چوکس رہا ہے۔ عزیز لکھنوی نے علوم و ادیان کے حوالے، فکر و فلسفہ کے تصورات و نکات کچھ اس طور احاطۂ شاعری میں داخل کیے کہ ان کی قادر الکلامی اور علم و فضل کا احساس راسخ ہوتا ہے

؎ نشیلی انکھڑیاں ساقی کی زاہد سے لگی ہیں اٹھنے + یہ پہلا روز مزدور دیں کا ہے پی جام صہبائی

؎ یہ خال اک مشک دانہ اور بادام سیہ آنکھیں + رخ رنگیں ہے سیب اور شمع بینی ہے گل خوشبو

؎ ہے حسن و عشق میں اک اتحاد معنوی باہم + برآمد دونوں یہ گوہر ہوئے ہیں ایک دریا سے

؎ مجھے اس بحر عشق سرمدی کا ایک قطرہ دے + کہ جس نے انبیا کے چشمۂ دل میں جگہ پائی

؎ گھنے بال اس طرف سنبل نے کھولے بہر آرائش + گلابی مدبھری آنکھ اس طرف نرگس نے دکھلائی

؎ وہ کہتا ہے نظام عہد مینا عنوث اعلیٰ ہے + ارسطو اور بطلیموس تو ناداں تھے سر تا سر

؎ سایہ ہر شخص کا تیزی حرارت سے سیاہ + شعلہ خیزی سے ہر اک جسم میں جوش حدت

؎ بنا تصدیق مظنونات و وہمیات یہ کب تک + ہوئے ہیں تصور تیرے تسویلات شیطانی

ذنب ہے قوس میں مریخ اپنے برج میں ہے + قمر ہے اول میزاں میں آج آئینہ دار

عزیز نے قصائد میں تنوع پیدا کرنے کے لیے نئے نئے موضوعات کے رنگ برنگے پنچھی قفس الفاظ میں قید کیے ہیں۔ ان کا میدان مذہبی عقیدہ نگاری کا تھا اسمیں انہوں نے بعثت، عروسی حضرت فاطمۃ الزہراؑ، ولادت علیؑ، عقد امام عسکریؑ کے حوالے سے نئے نئے مضامین بھی قلمبند کیے۔ علاوہ ازیں اپنے قصائد کے عمدہ نام تجویز کر کے جہاں ایک سطح پر موضوعاتی نظموں سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا وہاں دوسری سطح پر قصائد کی معنویت اور حسن میں بھی اضافہ کیا۔ انہوں نے روایتی قصائد کی گھن گرج اور لفظی شان و شوکت پر معنوی اور احوالاتی کوائف کو ترجیح دی۔ ان کے قصائد کے یہ مطالع مذکورہ معروضات کی شہادت ہیں

؎ مستمت یہ عزیز اپنے کروں کیوں نہ مباہات + کس عزیز سے ہوئی ہے آج ملاقات (۱) [قصیدہ فی التغزل نعت]

عزیز ایک عمر سے ہے خانقاہ وجد میں بستر + سمجھ میں آج تک آئیں نہ باتیں شیخ کی اکثر (۲) [در مدح حضرت علیؑ]

اگر دیدار کا ہے شوق کہہ دو جا کے موسیٰ سے + لڑائیں کیوں دونوں آنکھیں کسی محو تماشا سے (۳) [قصیدہ نعت]

عہد پیری ہے نمودار کرو عزم سفر + کٹ گئی شام ہوئی صبح اٹھاؤ بستر (۴)

کہاں ہیں جنبش ابروئے ساقی کے تماشائی + ہلال عید وہ لیتا ہوا نکلا ہے انگڑائی (۵)

عزیز لکھنوی کے لیے زبان و بیان کی نزاکت، خیال کی باریکی اور جذبہ کے زور و شور کے معاملات اہم تھے علاوہ ازیں بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ان کے قصائد ان کے عقائد کے شارح بھی دکھائی دیتے ہیں (۶)

---

(۱) یہ قصیدہ دکن ریویو ۵ فروری ۱۹۰۹ میں طبع ہوا تھا (۲) دبدبۂ آصفیہ ج ۳ جلد نمبر ۹ میں چھپا (۳) الناظر نمبر ۱۲ جلد نمبر ۹
(۴) زمانہ جون ۱۹۱۵ صرف تشبیب چھپی (۵) ادیب الہ آباد مارچ ۱۹۱۲ میں اس کی تشبیب کے اشعار دیکھیے
(۶) ادبی جائزے ص ۷۷

عزیز صفی پوری

محمد ولایت علی خاں عزیز [م ۱۹۳۵] صفی پور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ایک قصیدہ نعت شہیدی کے تتبع میں لکھا۔ یہ ان کے دیوان طورِ تجلی میں شائع ہوا (۱) اسکا مطلع تھا

سہ اٹھا جب غلغلہ عشقِ ازل کی آمد آمد کا + جما آنکھوں میں ہے نقشہ بےجہت حسنِ محمد کا

اس قصیدے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ "محمداً" بے تشبیب لکھا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ تشبیب نعتیہ اشعار کو کم کرتی ہے دوسری وجہ یہ کہ شہیدی نے بھی تشبیب نہیں لکھی اور یہ اس کے تتبع میں ہے اور تیسری وجہ بقولِ شاعر یہ ہے "تشبیب میں مضامینِ مختلفہ کی اعانت سے بندش قوافی میں آسانی ہوتی ہے ہر قافیہ کو اپنے خیال کے مطابق لا سکتے ہیں اور جب اول ہی سے نعت لکھی گئی ہو تو ہر قافیہ قید کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے" (۲) اس نعتیہ قصیدے کے چھ مطالع ہیں۔ یہ ۱۶۹ اشعار پر مشتمل ہے اور بہت سے اشعار میں مختلف آیتوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں

سہ حصارِ چرخ کو اس کے حرم پر رات دن تکیہ + سہارا اس کے سنگِ در پہ ذوالقرنین کی سد کا

ختم فرمائے ہر دم نفی سے منفی کیا لا کو + رد ارد ہے یہاں مضمون بے معنی رد ارد کا

پڑھوں اشعارِ نعتیہ کو گر الحاں سے مسجد میں + بجے مزمار بن کر دائرہ آواز گنبد کا

محمدؐ آئے حق آیا ہوا سب شعبدہ باطل + منات و لات عزیٰ کا ہبل کا نسر کا ود کا

اگر خوش ہو کے بے نامِ محمدؐ سبز بختی سے + تو ہو گلزارِ ابراہیم آتش خانہ موبد کا

قصیدہ ختم ہوتا ہے لکھوں پھر مطلع تازہ + کہ حسن کر رنگ فق ہو چرخ ثانی پر عطارد کا

عزیز صفی پوری نے اپنے اس قصیدہ میں مذہبی روایات و تلمیحات کا خاصا استعمال کیا ہے۔ ان کی قوتِ متخیلہ کبھی تو انہیں عربی تمثالوں کی جانب لے گئی اور کبھی عجمی حوالوں کی جانب، کسی شعر میں انہوں نے صوفیانہ مسائل سے ربط رکھا اور کسی میں ہیئت و نجوم سے تعلق قائم کیا۔ عزیز صفی پوری کا یہ نعتیہ قصیدہ اگرچہ استادانہ پختگی کا حامل ہے تاہم جو جذبات شہیدی کے تھے وہ ان کے کلام میں نظر نہیں آتے

اس قصیدہ میں عزیز نے قرآن، حدیث، تصوف اور نجوم سے بھرپور استفادہ کیا ہے

سہ ہوا جب انجمن آرائے انجم وہ فروغ افزا + کیا زاؤش ورزآور کو نمایہ سعد و اسعد کا [طورِ تجلی ص ۱۲۲]

عزیز صفی پوری نے اس میں جگہ جگہ عربی الفاظ استعمال کیے ہیں اور تلمیحات سے بھی کام لیا ہے

سہ علا اس کی محبت سے یہ رتبہ اس کے یاروں کو + ترحم رکھا کے بعد ذکر آیا ہے سجد کا [طورِ تجلی ص ۱۲۹]

---

(۱) طورِ تجلی از عزیز صفی پوری ص ۱۳۷ مطبع اعجاز خاص محمدی لکھنو ۱۳۱۶ھ (۲) طورِ تجلی قلمی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

عبدالرحمٰن شاطر

عبدالرحمٰن شاطر مدراسی [۱۹۳۸ء میں زندہ تھے] جدید دور کے اہم قصیدہ نگار ہیں۔ قصائد پر مشتمل ان کی کئی تصانیف منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اعجازِ عشق(۱)، ضمیمہ اعجازِ عشق(۲)، گلدستۂ شاطر مدراسی، قصائدِ شاطر یا اعجازِ سخن(۳) اور قصیدہ(۴) کے نام سے بھی ان کی شاعری منظرِ عام پر آئی ہے۔ گلدستۂ(۵) شاطر مدراسی میں ایک قصیدہ نعتیہ، ایک منقبتی اور ایک بتقریب جشنِ افتتاح حجاز ریلوے کے حوالے سے ہے۔ اسمیں ایک قصیدہ نظام حیدرآباد کی شان میں بھی طبع ہوا ہے۔ شاطر مدراسی نے ایک قصیدہ بتقریب جشن پنجاہ سالہ جوبلی شمس الاخبار کے حوالے سے بھی لکھا ہے۔ کسی اخبار کی مدح میں قصیدے کی شکل میں غالباً یہ پہلی کوشش تھی۔ شاطر کا طویل قصیدہ اعجازِ عشق نئے سائنسدانوں کے نام ایک نظم بانداز قصیدہ ہے اس کے ساتھ جو ضمیمہ چھپا ہے وہ اُدبا کی مدح میں ہے ۱۹۳۸ سے قبل یہ قصیدہ اور اسکا ضمیمہ ۱۹۱۹ء میں چھپے۔ اس کا آغاز ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا ۱۹۰۵ سے ۱۹۳۸ تک اس میں جو اضافے ہوئے اس سے اس کے اشعار کی تعداد ۱۳۹۶ ہو گئی(۶) جب یہ ۱۹۰۵ میں پہلی دفعہ منظرِ عام پر آیا تو اس کے اشعار کی تعداد ۲۶۲ تھی ۱۹۱۹ء میں یہ تعداد ۹۵۸ ہو گئی اور ۱۹۳۸ میں [۱۳۹۶]۔ اس قصیدے کی اہمیت اس کے وسیع کینوس میں مضمر ہے جب یہ قصیدہ پہلی بار چھپا تھا تو اس پر سید شاہ حسین محرم (دلاپاتور) سید ضامن علی جلال، محمد ہادی عزیز، سید کاظم حسین محشر (لکھنو) سید علی محمد شاد (عظیم آباد) [وحید الدین سلیم] الطاف حسین حالی (پانی پت) علامہ محمد اقبال، امجد علی اشہری (لاہور) نذیر احمد، ذکاء اللہ (دہلی) شبلی نعمانی (اعظم گڑھ) اکبر الہ آبادی (الہ آباد) ظہیر الدین ظہیر، عزیز مرزا، مہدی علی خاں کوکب، علی حیدر نظم طباطبائی، نواب عزیز جنگ ولا، غلام قادر گرامی، عبدالحلیم شرر (حیدرآباد) مولوی نواب علی بڑودہ سید امیر علی (لندن) حکیم نور الدین (قادیاں) خوشی محمد ناظر (لداخ) عبدالغفور شہباز (بھوپال) مولوی سلطان احمد (میانوالی) اور نواب شمشیر بہادر اخگر (اجیگڑھ) وغیرہ نے عمدہ تقاریظ لکھی ہیں۔ ان کا لبِ لباب یہ ہے کہ شاطر کے اس قصیدے میں نادر مضامین، بندش کی خوبی، خوش اسلوبی، صفائی زبان، فلسفیانہ خیالات، عقلی معارف اور تازہ خیالات ملتے ہیں یہ بڑے زور کا بلیغ قصیدہ ہے۔

قصیدہ اعجازِ عشق میں شاطر مدراسی نے اپنے فکری خیالات کو کچھ اس طور قلمبند کیا ہے کہ فلسفہ، سائنس، ادب، تصوف اور اسلامی تعلیمات کی بہت سی تفصیلات الفاظ کے لبادے میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اعجازِ عشق کو ہم موضوعات کا ملغوبہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک نشست میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا اس لئے اس کے تسلسلِ بیان اور حسنِ ترتیب میں بھی خلل واقع ہوا ہے۔ یہ رائیہ قصیدہ ہے۔ اس میں خدا اور اس کے مظاہر، دنیا کی بوقلمونی، حیاتِ انسانی کی بے ثباتی، عشق کے محیط دائرے، غم و اندوہ، مایوسی و بیزاری، شکایتِ زمانہ، شعر و فلسفہ، فخریہ اظہار، فلسفہ و سائنس کی محدودیت اور اس نوع کے دیگر موضوعات ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے اور علحدہ علحدہ بھی بیان ہوئے ہیں

---

(۱) اعجازِ عشق مطبع نافع الاسلام مدراس (۲) ضمیمہ اعجازِ عشق شاہ الحمدیہ اسٹیم پریس مدراس (۳) اعجازِ سخن آصفی پریس مدراس
(۴) دکن پریس حیدرآباد (۵) گلدستۂ شاطر مطبع نافع الاسلام ۱۹۱۰ (۶) اردو میں قصیدہ نگاری ابو محمد سحر ص ۲۷۹

اعجازِ عشق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ان سے اس مقصد کے مزاج کا اندازہ ہو سکتا ہے

سہ سونے والوں کو عدم سے کھینچ کر لاتا ہے یار + طرزِ شوخی یہ ہے سر پر ان کے رکھ دیتا ہے بار
حرکتِ قسری ہے بے شک ذاتِ قاصر پر دلیل + گیند اچھالے ہیں یہاں دستِ قضا نے بے شمار
بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم + کون ہے تجھ پر سوار اے ابلقِ لیل و نہار
خانۂ ہفتم میں رقاصِ فلک کی تھی نشست + ہم کو کرنا ہی پڑا واعظ بتوں پر دل نثار
زیست سے بیزار ہیں مرنے سے گھبراتا ہے دل + تیسرا عالم کہاں سے لائیں اے پروردگار
واہ کیا کہنا ترا اے جلوۂ حسنِ ازل + ہیں ترے لاکھوں شموسِ بازغہ آئینہ دار
بدھ کہیں نادر کہیں حاتم کہیں قاروں کہیں + کیا کرشمے ہیں ودیعت تجھ میں اے مشتِ غبار
فلسفہ و سائنس شغلِ فرصت و تفریح ہے + زندگی کے درد کا درماں نہیں جز عشقِ یار
علت و معلول کا کیا خاک اندازہ کریں + امرِ واحد کے ہیں اسباب و نتائج بے شمار
زندگی کا حاصل ادراک ہے ادراکِ عجز + اس میں کیا شک ہے نیوٹن تھا حکیمِ پختہ کار
جانتے ہیں تیری کمزوری بھی اے سقراطِ ہم + تیری اخلاقِ شجاعت تو ہے سب پر آشکار
تیرے پہلو میں تھا خود لنگر گڑی کا گیلیلیو + خارجی شے پر نظر کی شرم، شرم اے خام کار
طالب کو مل جاتی ہے راہ اے ملا کشافی + آدمی گر آدمی ہو کیوں نہ ہو جویائے یار
کب اڈیسن کو خبر خود نے دی اس جال کی + مجھ پہ احساں ہے ترا اے لذتِ پیغامِ یار
نشۂ حریت کا ہو افیمیوں سے پیدا العجب + چین میں لایا ریپبلک انقلابِ روزگار
مادۂ تحقیق کی آتی ہے کچھ کچھ اس سے بو + اسپینوزا بھی تو میخانے کا ہے دردخوار
وحشیٔ مختارِ مطلق کی علامت ہے سبب + ہیوم کی تحقیق میں کچھ سچ بھی ہے اے ہوشیار
بندۂ حرص و ہوا کو علم سے کیا فائدہ + ذلت بیکن سے ہے سقراط تو کیوں شرمسار
دن کو جب دیکھا تو نظروں سے گرے اکثر جیسے + دیکھ گبن تھے یہی نام آورانِ روزگار
سرِ صادق، مطمئنہ نفس اور قلبِ حسیں + ڈارون کیا خاک کرتی ہے یہ جوہر آشکار
تجربہ پر کب ہیں مبنی خود مبادی سائنس کے + غور کر مل ظنِ السابق یہ ہے اونکا مدار
تو امیبا سے بنا ہے کیجئے گر فرض بھی + ڈارون پھر اس ترقی کا ہے کیا انجام کار
مادہ تو اب تا قیامت سر اٹھا سکتا نہیں + برکلے کی تیغِ استدلال کا الٹا ہے وار
میاکس ملر لفظ و معنی میں ہے آخر کچھ تو فرق + کر مادر زاد کو دیکھا نہیں کیا زینہار
عقل و اخلاق و جذب ضرورت ہے خدا + روحِ کانٹ اے بالغور آخر ہوئی تجھ پر نثار
ہائے تجھ کو ہے حقیقت کا گماں تغیر پر + برگسن کی عقل کا ہے حیرت انگیز انتشار
ہند کو مان اے برونشگ و شینس خیز خاک + ورنہ لاؤ تناطرسا کوئی مشاقِ حکمت شعار
کیا اثر ہے اب الزبتھ کے غرور و ناز کا + شیکسپیئر کی اداؤں کو تو سب کرتے ہیں پیار

اس مقیدے میں شاطر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر اسپنسر پر روح کا راز آشکار ہو جاتا تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے علاوہ ازیں جیمس، ہکسلے، کارلائل، عرفی، فردوسی، مینقس اور فینا غورث وغیرہ کے حوالوں سے بھی شاطر نے اپنے توحید کی اور مذہبی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بائی سکوپ نے عالم کی حقیقت کھول دی ہے اور ہپناٹزم سے ثبوت ملا ہے کہ روح ہر وقت احکام ازل آشکار کرتی ہے۔ شاطر نے چاہ بیژن، دختر افراسیاب، منصر شاہ پور و قیصر، منصور و کرشنا اور فرعون و ابلیس کے اشاروں سے بھی شاطر نے کئی توحیدی حقائق سے پردے اٹھائے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سائنس اور فلسفہ کی نئی ترقیاں بالآخر وجود الٰہی کو ثابت کریں گی۔ شاطر نے ہومر، ریڈ، بوس، ارشمیدس اور ابن سینا کے تذکرے سے بھی بہت سے نظریات کا جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں

فلسفہ سائنس شعر اور معرفت کا عطر ہے + کارنامہ نیر اے شاطر ہے بے شک شاہکار

اس مقیدے کا نقطۂ آغاز شاطر کے شعور میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ اسلامی، انگریزی، یونانی اور ہندی فلسفہ کی جانب مائل ہوئے۔ فلسفے کے مطالعے نے بھی ان کے شکوک و شبہات ختم کرنے میں مدد نہ دی۔ وہ آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ تصوف اور اسلامی روحانیت ہی انسانی شعور و فکر کے مسائل حل کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ مقیدہ اعجاز عشق شاطر مدراسی کے طویل فکری و جذباتی سفر کی حکایت سناتا ہے۔ اس میں انہوں نے فلسفہ و سائنس کے قدیم و جدید خیالات اور تحقیقی نتائج کی نفی سر انجام دی ہے۔ یہ مقیدہ تقریباً نیرہ سو اشعار کے بعد گریز کرتا ہوا منقبت حسینؓ جانب رجوع کرتا ہے اس کے حصہ مدحیہ امام حسینؓ کی تعریف میں اشعار رقم ہوئے ہیں۔ اس میں شاطر نے اپنی شاعری کے حوالے سے مفاخرت کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس مقیدے کے مطالعہ سے قاری یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ شاطر کو زبان و بیان پر مکمل قدرت ہے۔ وہ علمیت کے شاعرانہ اظہار میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن اوقات یہ بھی احساس ہوا ہے کہ وہ کسی موضوع پر ہمہ جہتی انداز سے روشنی ڈالنے سے قاصر رہے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے فکری انداز کو ان کا عقائدی فکر مجروح کرتا ہے۔

شاطر مدراسی نے اور بھی قصائد لکھے ہیں جن کے مطالع درج ذیل ہیں

مقیدہ نعتیہ — دیکھ لی ہجر میں ساقی کے مری نوحہ گری + آج گر جائے گی پہلو سے شیشہ کی پری

مدح معین الدین چشتیؒ — تاب نظارہ نہیں ہم کو کیا بجلی سے کام + یہ ہے موسیٰ اپنے آگے جلوۂ ماہ تمام

افتتاح حجاز ریلوے — ایک ملا خوبیاں گنتا تھا حج کی بر ملا + جس سے اک آزاد نے باب سخن یوں وا کیا

مدح شمس اخبار — گرم مہر شمس کیوں ہے گبر تجھ کو کیا ہوا + حسن ظاہر کی نمائش نے تجھے دکھلا دیا

مدح نظام دکن — رنگ لائی ہے بنا آج بہار گلشن + نو عروسان چمن پر ہے غضب کا جوبن

یہ تمام قصائد روایتی انداز ہی کے حامل ہیں ان پر شکوہ لفظی اور عالمانہ انداز کا غلبہ ہے

علامہ محمد اقبال

علامہ محمد اقبال [م ۱۹۳۸] کی شاعری کا عظیم الشان اسلوب اس امر کا غماز ہے کہ ان کا اردو اور فارسی قصائد کی لسانی اور اظہاری روایات سے مکمل ربط تھا۔ ان کے کلام کے ان حصوں میں قصائد دستیاب ہوتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے منتخبہ شعری مجموعوں میں شامل کرنا پسند نہ کیا۔ یہاں اقبال کے قصائد کا بطور ریکارڈ ہی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

نوادر اقبال اور باقیات اقبال میں جو قصائد طبع ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس میدان میں معرکۃ الآرا کارنامے سر انجام دے سکتے تھے۔ اقبال نے نواب بہاولپور، مہاراجہ کشن پرشاد، جارج پنجم وغیرہ کی شان میں قصائد لکھے۔ ان قصائد کے مطالع پوری روایتی تاثیر رکھتے ہیں۔

(۱)

زہے نشاط مزاواں کہ اختر تقدیر + چمک رہا ہے ابھر کر مثال مہر منیر [مدح میکور تھ ینگ گورنر پنجاب]

(۲) بزم انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اختر زمیں + آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں [محمد بہاول عباسی والئی بہاولپور]

(۳) ہو رہی ہے زیر داماں فلک سے آشکار + صبح یعنی دختر دوشیزۂ لیل و نہار [در مدح مہاراجہ کشن پرشاد]

اقبال کا ایک قصیدہ جارج پنجم کے دربار تاجپوشی کے حوالے سے بھی ہے اسکا مطلع ہے

(۴)

؎ ہمائے اوج سعادت ہو آشکار اپنا +

نواب بہاولپور کی شان میں اقبال کا قصیدہ مشکل زمین میں ہے لیکن انہوں نے اپنی شاعرانہ مہارت اور زور طبع سے اس زمین کو مشکل نہیں رہنے دیا

چند اشعار دیکھئے ؎ چاندنی کے پھول پر ہے جاہ کامل کا سماں + دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں

زینت مسند ہوا عباسیوں کا آفتاب + ہو گئی آزاد احسان شہ خاور زمیں

اس قصیدے میں اقبال ممدوح کیلئے تمنا کرتے ہیں کہ اس کا دور مسلمانوں اور قوم کے حق میں بہتر ہو

؎ محو کر دے عدل تیرا آسماں کی کجروی + کلیات دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں

بادشاہوں کی عبادت ہے رعیت پروری + ہے اسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں

حکمراں مست شراب عیش و عشرت ہو اگر + آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں

اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کا جو قصیدہ لکھا اس کے بارے میں لکھتے ہیں

"گزشتہ مارچ میں مجھے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستان وزارت پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہز ایکسی لینسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر جی سی آئی یمین السلطنت پیشکار و وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شاد کی ذات بابرکات میں باریاب ہونے کا

---

(۱) نوادر اقبال مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۲۷۰ (۲) ایضاً ص ۲۷۴ (۳) ایضاً ص ۲۸۳
(۴) زمانہ کانپور دربار شاہی نمبر دسمبر ۱۹۱۱ و مخزن جنوری ۱۹۱۲

فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسی لینسی کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش دلپذیر دل پر چھوڑا وہ
میرے لوحِ دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی
حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام
فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریہ میں دل سے زبان پر بے اختیار آگئے
ہیں انہیں زبانِ قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں۔ (1)

اس میں اقبال نے صبح کے طلوع کا منظر کھینچ کر موثر تشبیب لکھی ہے

؎ شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے + بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صبح + شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار

اس تشبیب کے بعد ایک طویل مکالماتی گریز ہے اور بلبل اور شاعر کا مکالمہ ہے

؎ اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے + کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار

اس کے بعد گیارہ اشعار گریز کے اور ہیں پھر شاعر یوں مدح کرتا ہے

؎ مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم + روشن اس کی رائے روشن سے گل روزگار
اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاہ کی + اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار
شکریہ احسان کا اقبال لازم تھا مجھے + مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

یہ درست ہے کہ اقبال نے امیروں کی مدح سرائی نہیں کی۔ تاہم انہوں نے احسان کے شکریہ کے حوالے سے
عمدہ اشعار لکھے ہیں۔

بڑھے جہان میں اقبال ان مثنویوں کا + ہماری بزم کی یکبار بڑھ گئی توقیر

اقبال کے قصائد میں خوشامد اور لعشتی نہیں ہے۔ انہوں نے ممدوحین کے مراتب کے حوالے
سے ان کی تعریف کرنے سے پہلے ان سے کچھ توقعات بھی وابستہ کیں۔ یہ توقعات نظام سلطنت
اور عوام کے حوالے سے تھیں۔ وہ ان امراء و روساء سے عدل و انصاف اور انسان دوستی
کے متقاضی تھے۔ اقبال کی شاعری میں حکمت و فکر اور اخلاقی و روحانی مقاصد کے جو تیور
موجود تھے ان قصائد میں بھی ان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تاہم انہوں نے ان کو اپنے منتخب
کردہ شعری مجموعوں میں شامل نہ کر کے یہ بھی تمنا کی ہے کہ ان قصائد کو زیادہ اہمیت
نہ دی جائے۔

---

(1) نوادراتِ اقبال ص ۲۸۳

محمد ہادی، ہادی

محمد ہادی، ہادی [م ۱۹۳۹] حسن پور میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ، انگلستان، اور اتر پردیش اور بھوپال وغیرہ میں رہے۔ ان کے کلام نعت ومنقبت کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس پر صفی لکھنوی نے مقدمہ لکھا تھا① اس میں انہوں نے ~~محقق کیا~~ محمد ہادی کے انداز بیان کی ندرت کو بالخصوص اہمیت دی۔ وہ لکھتے ہیں "سو مرتبہ سنی ہوئی باتیں سید صاحب کے قصیدے میں جب دیکھیں تو طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل نئی بات ہے"②
سید محمد ہادی نے اپنے نعتیہ قصائد میں وصف حضورؐ اور سراپائے حضورؐ کو انتہائی والہانہ عقیدت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے منقبت کے قصائد لکھتے ہوئے بھی جگہ جگہ نعتیہ اشعار رکھے ہیں۔ حضورؐ کی عبدیت، محبوبیت، اور دیگر انبیا پر فضیلت کا موضوع بھی ان کے مدِ نظر رہا۔ انہوں نے اپنے قصائد میں ممدوحین کے ماحول کے نقشے بھی کھینچے ہیں۔ ؎ فضا ہے سنسان، گو اکیلا زمیں اچھوتی جگہ نرالی + نہ گرم کمرہ نہ نرم تکیے نہ ہم نشیں ہے نہ قابلہ
ان کے ایک نعتیہ قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو ؎ چھٹا ہے اڈہ کہ حرم سے جو آج بلند غبار + خبر لیے نظر آتا ہے کوئی ناقہ سوار
ہادی کے قصائد سادہ ہیں۔ ان میں تاریخی واقعات و تلمیحات کی کثرت ہے۔ جاذبیت اور تاثیر ان کا عمومی وصف ہے۔

؎ وہ وسوسہ ہے نہ غم نہ الجھن نہ ڈر نہ کھٹکا نہ بے قراری + یقیں یہ ہے نفسِ مطمئن کو کہ قدرِ حق تو کا ملا ہے
چھپی ہوئی ہے بدن میں قبائے استبرق + بندھی ہے فرق پہ سندس کی لپیٹی دستار
قبائے نو میں وہ دلدوز حسنِ بخیہ گری + کہ پھر نہ سوزنِ ادریس سے ہوئی تیار
نہ جبرئیل جو باندھیں یہ پیچ پگڑی کے + بندھے کبھی نہ فرشتوں سے یہ چڑھاؤ اتار
کمر کے گرد وہ پٹکا دلیل پا مردی + پیمبری کی خدا داد ہمتوں کا حصار
وہ رخ کہ جلوۂ یوسف کا جل سکے نہ چراغ + وہ لب کہ عیسیٰ گردوں کے معجزے ہوں نثار

محمد ہادی ہادی کے قصیدوں میں روانی اور بہاؤ کا عمومی انداز ملتا ہے۔ یہ قصائد اپنی فکری اور خیالاتی جہت کے اعتبار سے ہادی کے ایمان و اعتقاد کی پختگی کے مظہر ہیں۔ ہمیں اسلام سے ان کی گہری وابستگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمارے اردو قصیدہ نگاروں کا عمومی وصف ہے۔ اردو قصیدہ نگاروں کا تہذیبی مزاج مذہبی ہی ہے۔ ہادی نے بھی اسی حوالے سے اسلام کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ ان کے قصیدوں میں حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی مضامین ان کے عقیدت مندانہ جذبات کے نقیب ہیں۔ ہادی نے عربی قصیدہ کی روایات سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ایک نعتیہ قصیدہ کا یہ مصرعہ ملاحظہ ہو
؎ خبر لیے نظر آتا ہے کوئی ناقہ سوار

① بحوالہ اردو میں نعتیہ شاعری ص ۵۴۰ ② ایضاً

گوری پرشاد ہمدم

گوری پرشاد ہمدم [م] کا تعلق اکبر آباد سے تھا۔ ان کے شعری مجموعہ غنچہ طرب[1] میں ایک قصیدہ حمد، پانچ قصائد جارج پنجم کی شان میں ہیں اور ایک کوئین میری کے آگرہ آنے کے حوالے سے ہے۔ ان کے مطالع ملاحظہ ہوں

قصیدہ حمد — ہو گئے جب گم تو پایا یہ پتہ + عالم فانی میں تجھ کو ہے بقا

در مدح جارج پنجم — در گلشن پہ نوبت بج رہی ہے اور شادیانے + مبارک بلبلو تم کو بہار رفتہ پھر آئی

ایضاً — آج کل ہے ہند وہ گلشن بنا + جس سے گلزار ارم شرما گیا

ایضاً — آمد قیصر سے گلشن بن گئی یہ سرزمیں + شکر کر اے ہند تیرا اب کوئی ثانی نہیں

ایضاً — واہ اے دہلی یہ تیرا کر و فر + کیوں نہ نازاں تجھ پہ ہوں شمس و قمر

جارج پنجم کا ساحل بمبئی آنا — بمبئی تو ہند کے شہروں کا فخر و ناز ہے + اور کو تجھ پر ہے بھروسہ ان کا تو دمساز ہے

کوئین میری کا آگرہ آنا — ساری دنیا میں نہیں اے آگرہ تیرا نظیر + آسمان اوج خوبی کا ہے تو مہر منیر

گوری پرشاد ہمدم عہد جدید کے قصیدہ نگار ہیں ان کے قصائد اردو شاعری میں در آنے والی جدید نظم کے اثرات سے خالی نہیں ہیں۔ ان میں فطرت نگاری، حقیقت پسندی اور سہل نویسی کا انداز منعکس ہے۔ ان قصائد کی تشابیب میں حقیقی منظر نگاری کے نمونے دستیاب ہیں

عروسان چمن بر قسع اتارے آج بیٹھے ہیں + کہاں ہے دیکھ لے آ کر کوئی نیچر کا شیدائی

نسترن جوہی چنبیلی ہے کہیں + موتیا بیلا کہیں ہے موگرا

پی کہاں کہتا پپیہا ہے کہیں + کوک کوئل کی کہیں پر خوشنوا

ہمدم نے اپنے قصائد میں نرگس، شہلا، لالہ، احمر، سورج مکھی، چاندنی، کا پھول اور سنبل وغیرہ پر بھی اشعار لکھے ہیں طوبٰی، سلیمان، اعجاز مسیحائی، رشک قاف اور بلقیس وغیرہ کے الفاظ و تراکیب کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ عجمی عربی روش اظہار سے وہ ناواقف نہیں تھے۔ مدحیہ حصوں میں بھی گوری پرشاد ہمدم نے مبالغہ آرائی سے گریز کیا ہے

ترے ممدوح یعنی جارج پنجم آئے ہیں + سواری ہم رکاب ان کے مہارانی کی ہے آئی

ستارہ ہند کا چمکا قدم جو اس جگہ آئے + نصیبہ ہند والوں کا ہوئی جو عزت افزائی

جارج پنجم کو ہمدم نے تاجدار تاجداراں بھی کہا ہے اور لکھا ہے ملکوں ملکوں اسکا حکم اور سکہ چلتا ہے۔ اس کے عدل و انصاف کے حوالے سے بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ ایک قصیدے میں رسم تاجپوشی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔ اس میں فوج کے انتظام اور پولیس کے باخبر ہونے کی بات کی ہے

تاجپوشی کی ادا جب رسم کی + ہو گئے سارے بشب ممتاز تر

فوج کا چاروں طرف اک انتظام + اور پولیس موقع پر اپنے باخبر

دعائیہ دیا ہے — مشرق سے لے غرب تک محکوم ہو عالم ترا + تا ابد قائم رہیں دنیا میں یہ تاج و نگیں

---

[1] غنچہ طرب از گوری پرشاد ہمدم مطبوعہ ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ

مہاراجہ کشن پرشاد

مہاراجہ کشن پرشاد شاد [م ۱۹۴۰ء] دکنی ریاست کے سربرآوردہ حضرات میں سے تھے۔ ان کی شان میں علامہ محمد اقبال کا ایک قصیدہ بھی دستیاب ہے۔ ان کے سپرد قلمدان وزارت تھا۔ ان کا ایک نعتیہ دیوان خمکدۂ رحمت کے نام سے اور ایک ہدیۂ شاد کے نام سے طبع ہوئے۔ ان میں نعتیہ، ومرثائیہ قصائد ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں کشن پرشاد شاد نے آصف سابع نظام دکن کی شان میں بھی قصائد لکھے۔ نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے "ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام صوفیانہ خیالات سے معمور ہے۔ انہوں نے ہندو اوتاروں کی شان میں صوفیانہ نقطۂ نظر سے نظمیں لکھیں۔"(۱) کشن پرشاد شاد نے غیر مسلم ہوتے ہوئے اپنے نعتیہ قصیدہ میں جس والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان میں دردمندانہ جذبات کی شدت موجود ہے اور حضور سے محبت کا شستہ اور پاکیزہ انداز بھی۔ یہ قصائد رنگ تغزل بھی رکھتے ہیں۔ ان میں وحدت الوجود، دیار حبیب سے وابستگی، صوفیانہ معاملات و مسائل کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ہیں خمکدۂ رحمت(۲) اور ہدیۂ شاد(۳) میں ان کے چھ عمدہ مذہبی قصائد ملتے ہیں جو نعتیہ اور مرثیہ ہیں ان کے مطالع ملاحظہ ہوں

ے مئے وحدت سے آج ہوں مخمور + بادۂ عشق کا ہے دل میں سرور

خالی اصغر سے جو جھولا رہ گیا + کانپ کر ماں کا کلیجا رہ گیا

ذکر ہے شبیر کا سجاد کا + مجرئی یہ مشغلہ ہے شاد کا

سوز خواں ہم جو ہوئے چاک گریباں ہو کر + لوگ مجلس میں گرے بے خود و گریاں ہو کر

تصور شۂ عالی جناب رہتا ہے + خیال روئے رسالت مآب رہتا ہے

اے سلامی حال اپنا زار ہے + غم میں شاہ کے چشم دریا بار ہے

شاد نے دکنی نوابوں کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں ان میں سے چند ایک کے مطالع دیکھئے

در مدح میر محبوب علی ے کر لیا آج بہاراں نے گلستاں پہ عمل + آتے ہی موج خزاں میں پڑی ایسی ہلچل (۴)

در مدح آصف جاہ سابع یہ زمانہ کیسا فرخ فال ہے + شکر کے قابل ہر اک کا حال ہے (۵)

شاد کے رثائی قصیدوں میں غم و الم کا اظہار موثر انداز سے ہوا ہے یہاں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر واقعۂ کربلا کے جگر پاش المناکیوں کو محسوس کر کے شعر لکھ رہا ہے۔ دنیاوی ممدوحین کی شان میں ان کے قصیدے زوردار نہیں ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ خود صف ممدوحین میں شامل تھے ان کے نعتیہ قصیدہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ے نعت کرنی ہے مجھ کو ان کی رقم + ہے لقب جن کا سرور جمہور

جس کو کہتے ہیں احمد بے میم + ہے اسی کے لئے جہاں کا ظہور

شاد نے اس عقیدے میں لکھا ہے کہ وہ قید مذہب کے قائل نہیں ہیں کعبہ و دیر ہر جگہ شمع وحدت کا ظہور ہے

---

(۱) دکن میں اردو ص ۵۵۵ (۲) خمکدۂ رحمت محبوب پریس دکن ۱۳۲۵ھ (۳) ہدیۂ شاد محبوب پریس حیدرآباد ۱۳۲۷ھ

(۴) دبدبۂ آصفیہ ۹ ستمبر ۱۹۰۷ (۵) روزنامہ صبح دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۳ھ

و گلدستۂ جشن آصفیہ ۱۳۱۵ھ

مرتبہ محمد عبد اللہ خان ضیغم مطبع عزیزیہ نظامیہ حیدرآباد

محمد احمد بے خود

محمد احمد بے خود موہانی [م ۱۹۴۰] شیعہ انٹر کالج لکھنؤ سے متعلق تھے۔ کلیاتِ بے خود ۱۹۴۲ میں شائع ہوا[1]۔ یہ وہ کلام ہے جو دستبردِ زمانہ سے بچا۔ اس کلام میں کچھ قصائدِ منقبت آئے ہیں اور ایک قصیدہ میر فضل علی والئ بنگن پلی کی شان میں۔ ان کے مطالع ملاحظہ ہوں

درمدح حضرت علیؑ ؎ ہے یہ قدرت کو خبر کون ہوں میں کیا ہوں میں + عالمِ حال کے اسرار کی دنیا ہوں میں

امتحاں میں شکنِ ابرو پہ نہ لانے والے + رہ معبود میں گھر اپنا لٹانے والے

درمدح امام غائبؑ ؎ ازل میں چھلکے قدح ساقی کوثر کے پیمانے + قلم کو لوحِ قدرت پر لگیں انگڑائیاں آنے

ایضاً ؎ زمیں کو شعلہ زن دیکھیں فلک کو شعلہ زا دیکھیں + ستم کی آگ کو کب تک جہنم زیر پا دیکھیں

ایضاً دیکھا اسے نہ دل نے نہ آرام پر نگاہ کی + اُف کتنی دلفریب ہے دنیا گناہ کی

درمدح امام حسینؑ جو ہر تیرے جہاں پہ کھلے ابتلا کے بعد + تھا تجھ کو انتظار بلا پر بلا کے بعد

درمدح والئ بنگن پلیؒ بادِ مراد سے چمنِ شوق ہے نہال + یہ چمن انبساط ہے یہ موسمِ وصال

مذکورہ بالا اولین قصیدے کی تشبیب میں انسان کی ہستی، وجود، نیستی اور دیگر معاملات پر واحد متکلم کو ظاہر کرنے والی ردیف کی مدد سے اظہار کیا گیا ہے اور حصہ مدحیہ میں حضرت علی (واحد متکلم میں) کی زبان سے ان کی صفات اور خوبیوں کو بیان کروایا گیا ہے۔ اس کے یہ اشعار دیکھیے

؎ آندھیوں سے ہے بنا جس کی وہ صحرا ہوں میں + جس کی فطرت میں تلاطم ہے وہ دریا ہوں میں

ابھی گھرتی ہوئی بدلی ابھی گرتی ہوئی بجلی + ابھی آندھی ہوں ابھی رعد کا نعرا ہوں میں

ایک ساعت میں دخانِ جبلِ آتش بار + ایک دم میں کرۂ نار کا شعلہ ہوں میں

نیستی میری عدم ہے مری ہستی ہے وجود + کچھ نہ ہونے پہ بھی سرمایۂ دنیا ہوں میں

انسان کی صفات بیان کرتے ہوئے بے خود موہانی نے سرِ یونس، دلِ یحییٰ، دستِ داؤدؑ، روئے یوسف، کفِ موسیٰ، لبِ عیسیٰ، گریۂ نوح، نوحۂ یعقوب، صبرِ ایوب اور سوزِ زکریا کے حوالے بھی دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ محشر میں انسان کے شورِ محشر زنانوں کے پاؤں کی دھمک ہے اور صور کو میں بربطِ ناہید سمجھتا ہوں ؎

صحِ صور ہے دل کے دھڑکنے کی صدا + صورتِ خوف ہوں دہشت کا ہیولا ہوں میں

رنگ گوہر رنگ قرمز، رنگ خارا، رنگ سنگ + رنگ لعل و رنگ یاقوت مطرا ہوں میں

پھر حضرت علی کی زبان سے یوں مدحیہ کلمات نکلے ہیں

؎ لوحِ محفوظ ہے آئینۂ علمِ علام + ایسا آئینہ ہے اور دیکھنے والا ہوں میں

رازدارِ جبروت و ملکوت و لاہوت + دیکھ اب کیا ہوں اور اب کیا ہوں اور اب کیا ہوں میں

---

[1] کلیاتِ بے خود مرتبہ سید محمد سبطین لکھنؤ ۱۹۴۲

حضرت امام حسینؓ کی شان میں بے خود موہانی کا لکھا ہوا قصیدہ جہاں فلسفہ قربانی و شہادت کے حوالے سے موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے وہاں انہوں نے معنی ذبح عظیم بھی شہادت امام حسین کے حوالے سے بیان کیے ہیں

جوش لگائے آدم و یعقوب و نوح کا + کھلتا ہے راز واقعہ نینوا کے بعد
حیران تھی خلق معنی ذبح عظیم میں + ٹوٹا طلسم قتل امام ہدا کے بعد

والئ بیگن پلی کی شان میں بے خود موہانی کا قصیدہ کی تشبیب میں نشاطیہ ماحول کی عکاسی کرنے کے بعد شاعر نے یوں گریز کیا ہے

کچھ یوں نشاط قلب نے اپنا بھرا ہے رنگ + دنیا ہے آب و رنگ سے آج جنت جمال
کیوں نہ ہو دہر عالم کیف و سرور و عیش + بدلے نہ کیوں زمیں کی طرح آسماں کی چال
ہے جشن اس کی سالگرہ کا بہ آب و تاب + حاصل ہے جس کی ذات سے دنیا کو یہ کمال

مدحیہ کلمات کا انداز دیکھیے

اے مظہر صفات الہی و احمدی + کیوں کر نہ تجھ پہ ناز کرے مصطفٰے کی آل

حسن طلب کا شعر

جوہر شناس علم و ادب اس کی قدر کر + تا جاں نثاریوں کا مری ہو کوئی مآل

دنیاوی ممدوح کے لیے صفات الہی کا مظہر یا صفات احمدی کا مظہر کے الفاظ کا جواز شاعر نے ممدوح کی دینداری اور مذہب دوستی کے حوالے سے فراہم کیا ہے۔

بے خود موہانی کے قصائد علمی اور فکری سطح کی سنجیدگی کے حامل ہیں۔ ان میں ان کے عقائد کا بھی کھل کر اظہار ہوا ہے اور ان کی مذہبی حسیت کا بھی۔ ان قصائد میں مذہبی فکر سے متعلق بہت سے موضوعات قلمبند ہوئے ہیں۔ مذہبی، تاریخی اور روائتی تلمیحات کا عمدہ استعمال ہوا ہے۔ ان کے قصائد میں مبالغہ بھی ملتا ہے اور غلو بھی۔ ان کا انداز والہانہ اور عقیدتمندانہ ہے۔ کہیں کہیں وہ حد اعتدال سے تجاوز بھی کر گئے ہیں مثلاً بیگن پلی کے والی کے قصیدے میں مذہبی لفظیات کا غیر معتدل استعمال ہے یہ ضرور ہے کہ انہوں نے مناظرانہ انداز سے گریز کیا ہے ان کے مذہبی اور غیر مذہبی قصائد کو رسمی اور روائتی انداز کے فکر انگیز قصائد کہا جا سکتا ہے۔ تبلیغ مذہب و فروغ اخلاقیات کے حوالے سے مذہبی قصائد جو کردار ادا کرتے ہیں بے خود موہانی کے قصائد اس سے متعلق ہیں۔ ان کا پرشکوہ انداز ان کے قصائد کے وزن اور وقار میں اضافہ کا باعث ہے۔

اقبال سہیل

اقبال سہیل [م ۱۹۷۵ء] (۱۹۷۴ء) کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا۔ عصرِ جدید میں نعت و منقبت کے قصائد لکھنے والوں میں ان کی تخصیصی حیثیت ہے۔ ان کے قصائد اردو شاعری کی اصلاحی تحریک سے بھی مربوط ہیں اور ان میں فطرت پسندانہ شعور کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں تاہم اپنی ساخت اور موضوعات کے اظہار کے وتیرے میں یہ قصائد رچے ہوئے کلاسیکی ذوق کے حامل ہیں۔ اردو کی نعتیہ شاعری کو وسعت آشنا کرنے اور اردو قصیدہ کی شاندار روایات سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں اقبال سہیل نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ان کے قصائد کے ذیل کے مطالع ملاحظہ ہوں ان میں فکر و فن کا پختہ انداز و آہنگ ملتا ہے

؎ مکتبِ عشق میں ہنوز طفل خرد ہے مبتدی + ورنہ ہے باجرہ فروش جلوۂ حسنِ سرمدی

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیِ امکانی + رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی

سرشتِ حسن تغافل مزاجِ عشق غیور + وہ التفات سے، ہم التجا سے ہیں معذور

اقبال سہیل کے دو مجموعے طبع ہو چکے ہیں ایک ارمغانِ حرم[1] اور دوسرا موجِ کوثر[2] ارمغانِ حرم میں چار اور موجِ کوثر میں دو نعتیہ قصائد ملتے ہیں۔ ان کے منقبت کے قصائد کی تعداد دس ہے[3]

اقبال سہیل کے قصائد کی تشبیب میں شاعرانہ خوش بیانیاں بھی دکھائی دیتی ہیں اور اظہاری قادر الکلامیاں بھی۔ ان کے مدحیہ اجزا اعانمانہ اور فکری عناصر سے مملو ہیں۔ اقبال سہیل کے فارسی اور اردو کے وسیع مطالعے نے انہیں بہت سے دیگر معاصر قصیدہ نگاروں پر فوقیت دی حضورؐ سے ان کی گہری عقیدت، خلفائے راشدین سے محبت اور خانوادۂ رسول سے النسبت ان کے قصائد کا حصہ ہے ؎ باغِ جہاں کا حارس نامی جس کے مثالی رسم غلامی + پھر سے سنوار گلشنِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم

بزمِ ملل تھی نظم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق کے لیالی + اس نے کیے سب آکے منظم صلی اللہ علیہ وسلم

بچھڑے ہوئے گلے کو ملایا، نسل و وطن کا فرق مٹایا + رہ نہ گیا کچھ تفرقہ باہم صلی اللہ علیہ وسلم

وہ سرورِ عالی نسب وہ حیدرِ صفدر لقب + وہ نیّرِ برجِ حرم وہ گوہرِ کانِ حرم

پیدا ہوئے خود اس کے گود کی جان جس کے نام پر + مولا ہے شایانِ علی مولود شایانِ حرم

ابھی تک کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ دشتِ ایمن کا + قیامت ہے قیامت جلوۂ جاناں کی عریانی

ادھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمتِ مشرق سے + ادھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبستانی

اقبال سہیل کے بعض قصائد اپنی تاثیر اور محاسن کے اعتبار سے خاصے مقبول ہوئے

---

(۱) ارمغانِ حرم مطبوعہ جہانگیر آباد پیلس لکھنو (۲) موجِ کوثر مطبوعہ نامی پریس لکھنو

(۳) میگزین محمد حسن انٹر کالج جونپور ۱۹۵۳ء مرتبہ افتخار اعظمی

جلیل مانکپوری

نواب فصاحت جنگ جلیل حسن جلیل مانکپوری [م ۱۹۴۶] امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ان کے مجموعہ کلام "سرتاج سخن" (۱) میں قصائد موجود ہیں۔ جلیل کے دیوان اول تاج سخن میں بھی ایک قصیدہ نواب میر محبوب علی کی شان میں موجود ہے (۲)۔ انہوں نے ۱۱۵ اشعار کا ایک قصیدہ شاہ ایڈورڈ کی تاجپوشی پر بھی لکھا۔ اس کا مطلع نقارہ بج رہی ہے کیا مزا آنکھوں میں نیند آئی ہوئی + واہ رے ہم بے پئے مستی سی ہے چھائی ہوئی
ان کے قصائد کے مزید مطالع ملاحظہ ہوں

تہنیت جشن جوبلی سالگرہ ~ جشن شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا + ساغر عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا [مدح نظام حیدرآباد]
در مدح میر محبوب علی ~ جو دن پھرتے ہیں تو ساماں پیدا ہوہی جاتا ہے + شب غم لو کہ طولانی ہو تڑکا ہو ہی جاتا ہے

جلیل حسن جلیل داغ کے بعد نواب محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے تھے (۳) نظام حیدرآباد کے ایک قصیدے میں انہوں نے مدح یوں کی ہے

~ ہوشمندی میں ارسطو سے فلاطوں سے سوا + فتح مندی میں سکندر سے نکلتے دیکھا
مدح آصف میں یہ رنگیں سخنی واہ جلیل + آج تو ہم نے تجھے لعل اگلتے دیکھا (۴)

جلیل نے نواب کو ظل سبحانی، خلیفۃ الرحمانی، سکندر شوکت، کیواں علم، انجم خدم، رستم دوراں اور افلاطون زماں وغیرہ بھی کہا ہے (۵) میر محبوب علی کی شان میں جلیل کے قصیدے کے یہ اشعار بھی دیکھئے

~ رہا جو شہ کی نظروں میں ترقی اس کو لازم ہے + ملا دریا سے جو قطرہ وہ دریا ہو ہی جاتا ہے
گل مضموں جو کل تک خشک تھے اس کا تعجب کیا + خزاں کے دور میں ہر پھول کا سا ہو ہی جاتا ہے
کمال شاہ پر انسان شیدا ہو ہی جاتا ہے + جمال شاہ کو دیکھو تو سکتا ہو ہی جاتا ہے
خدا رکھے شہ جم جاہ کا ہے رعب داب ایسا + کسی کا بخت شیر ہو تو سیدھا ہو ہی جاتا ہے
کرشمہ کی سخاوت مشک کی تاثیر رکھتی ہے + چھپا کر لاکھ دیں عالم میں شہرہ ہو ہی جاتا ہے
سبق دیتے ہیں لقماں کو فلاطون زماں ہو کر + ہوا جو بندۂ بے دام دانا ہو ہی جاتا ہے
زمین سخت میں بھی معانی روشن نکلتے ہیں + صدف میں در حجر میں لعل پیدا ہو ہی جاتا ہے
کوئی مانے نہ مانے میں تو ہوں اس فیض کا قائل + زمیں مشکل سے مشکل ہو قصیدہ ہو ہی جاتا ہے

جلیل کے قصائد کی تعریف ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے بھی کی ہے (۶)

جلیل کے قصائد کی تعریف ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے بھی کی ہے اور لکھا ہے "ان کی غزلوں میں بھی قصیدہ کا رنگ آ گیا ہے ابو اللیث صدیقی کا یہ بھی کہنا ہے "جلیل کی شاعری کے سلسلے میں آخری نکتہ ان کے کلام پر درباری اثر ہے۔ جان سخن یعنی دیوان دوم میں علاوہ ان تاریخوں اور خاص نظموں کے جو اعلیٰ حضرت خسرو دکن سے متعلق ہیں بالخصوص غزلوں میں قصیدہ کا رنگ آ گیا ہے (۷)

(۱) خمخانہ جاوید جلد دوم ص ۲۵۴ تا ۲۶۳ (۲) تاج سخن ص ۱ از جلیل، لکھنؤ ۱۳۲۵ھ (۳) اوراق گل مرتبہ ضمیر قریشی، رامپور ۱۹۰۰ء (۴) مطبوعہ رسالہ زمانہ فروری ۱۹۰۶ء ص ۱۲۷ (۵) تاج سخن ص ۱ (۶) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴۵۸، مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۱۹۵۵ء

نظام الدین نظامی

نظام الدین نظامی [م ۱۹۷۲ء] بدایوں کے مشہور شاعر تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام تجلیاتِ سخن (۱) میں مذہبی قصائد بھی ملتے ہیں اور غیر مذہبی بھی۔ ان کے میر عثمان علی اور ایڈورڈ ہشتم کی شان میں قصائد موجود ہیں۔ نظامی نے یہ قصائد استادانہ مہارت سے تیار کیے تھے۔ وہ جدید دور کے طرزِ احساس سے متاثر تھے۔ گل و بلبل کے فرسودہ مضامین یا غیر اخلاقی خیالات و اشارات ان کے لیے ناپسندیدہ تھے۔ وہ قومی موضوعات اور حقائقِ اصلیہ پر اظہارِ خیال کے قائل تھے۔

ان کے قصائد کے چند مطالع پیشِ خدمت ہیں۔ ان کی تاثیر کار راز نظامی کے شعور جو ہر میں مضمر ہے ؎

منقبت نعت: جسے ہم دیکھتے ہیں آج محوِ شادمانی ہے + مئے عشرت کا نشہ ہے کہ چہرہ ارغوانی ہے (۲)

ایضاً: ہم ہیں اور رات دن کی ہے آفت + ہم ہیں اور اپنی گردشِ قسمت (۳)

ایضاً: نظامی خیر تو ہے گھر سے کیوں نکلے ہو تم باہر + تمہارے پاؤں کی زنجیر بھی کیا بن گئی چکر (۴)

ایضاً: کیا ہوئی وہ شان و شوکت کیا ہوا بختِ جواں + مٹ گیا دورِ ترقی ساز و ساماں ہیں کہاں (۵)

ایضاً: یہ دہر میں ہے تقاضائے گردشِ ایام + نمودِ صبح سے ہو جلوہ ریزِ رحمتِ عام (۶)

ایضاً: پایا کبھی نہ منزلِ مقصود کا نشاں + آوارہ گردیوں میں ہوئی عمرِ رائیگاں (۷)

ایضاً: وہی محفل ہے وہی ہم ہیں وہی منظر ہے + بارک اللہ کہ پھر جشنِ نبیؐ کے گھر ہے (۸)

ایضاً: آیا ہے وہ مولد ہے جوشِ سخن دانی + عشاقِ نبی خانہ ہیں محوِ غزل خوانی (۹)

ایضاً: کیا ہے وہ موسمِ گل اور سامانِ بہار + کیا مصیبت دیکھ کر چشمِ فلک ہے اشکبار (۱۰)

ایضاً: سبب کیا ہے نبی خانے میں کیوں ہے محفل آرائی + فضائے قدس کا جلوہ بھی ہے جس کا تماشائی (۱۱)

ایضاً: ادھر ادھر ہیں جلوہ گر عرب کی ضو فشانیاں + کلیم ہے جس نہ طور ہے کہاں وہ لن ترانیاں (۱۲)

مدح ایڈورڈ ہشتم: لو مبارک دوستو پھر موسمِ گل آ گیا + ہر بیخ و فرماں کلفتِ رنج و غم کا ہنس ملتا پتا (۱۳)

در مدح میر عثمان علی خاں: اے صوفی کی ہیں سو میں صد و صبا صد آفریں + آج ہم نے خبر سے دیکھی دکن کی سرزمیں (۱۴)

ایضاً: کرشمہ ساز ہوا ہے رخِ بہار کدھر + جمالِ شاہدِ گل کیوں ہے آج پیشِ نظر (۱۵)

یہ زمیں دکھو تو ہے اور نگ کی عز و شاں + ذرے ذرے میں ترے پنہاں ہے گنجِ شائگاں (۱۶)

موسمِ گل میں بہار آ گئی ہے دامانِ دکن + برگ و بار خلد ہیں زیبِ گلستانِ دکن (۱۷)

کیا ہے وہ موسمِ گل اور سامانِ بہار + کیوں ہے خونِ آرزو گلشن فروشِ لالہ زار (۱۸)

للہ الحمد پھر ہے نخلِ مقصد بارور + پھر بہاریں جھومتی آ گئی ہیں گلشن میں نظر (۱۹)

---

(۱) تجلیاتِ سخن۔ [illegible] مطبع نظامی بدایوں ۱۳۲۸ (۲) ایضاً ص ۶۳ (۳) ایضاً ص ۶۸ (۴) الف ۷۷ (۵) ایضاً ص ۷۸ (۶) ایضاً ص ۸۰ (۷) ایضاً ص ۸۲ (۸) ص ۸۳ (۹) ص ۸۵ (۱۰) ص ۸۶ (۱۱) ص ۸۹ (۱۲) ص ۹۱ (۱۳) ص ۹۲ (۱۴) ص ۹۵ (۱۵) ص ۱۰۰ (۱۶) ص ۱۰۳ (۱۷) ص ۱۰۵ (۱۸) ص ۱۰۸ (۱۹) ص ۱۱۹

نظامی بدایونی کے نعتیہ قصائد حضورؐ سے ان کی والہانہ عقیدت کا مظہر ہیں۔ انہوں نے یہ قصائد نبی خانہ بدایوں کے سالانہ جشنِ میلاد کے حوالے سے وقتاً فوقتاً لکھے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جشنِ میلادِ نبی کے موقع پر بدایوں میں جہاں تمام شہر میں آرائش و چراغاں کا اہتمام ہوتا تھا وہاں نبی خانہ بھی زیب و زینت سے سجتا اور یوں محسوس ہوتا اس کے در و بام سے جشنِ خسروانی عیاں ہے۔ مسلمان شاد اور بشاش ہو کر آپس میں گلے ملتے۔ نئی پوشاکیں پہنی جاتیں کوئی سر پہ ملاگیری عمامہ باندھتا، کوئی بسنتی رنگ کا لباس پہنتا۔ کسی نے گیروا کرتا زیبِ تن کیا ہوتا اور کوئی دھانی رنگ کا چغہ پہنے ہوتا۔ کہیں محفلِ خاص میلاد کی منادی کی جاتی۔ چھوٹے بڑے سب آرائش و انتظامی کاموں میں منہمک ہوتے۔ ان قصائد سے جشنِ میلاد کے رسوم و رواج کی خبر بھی ہوتی ہے

پئے خدمت سبھی خورد و کلاں ہیں بزم کی خاطر + پئے مہمانیِ مولد یہ ساری میزبانی ہے
کوئی جاتا ہے تا دروازہ مہمانوں کے لینے کو + کہ استقبال ہی سے اوجِ شانِ میہمانی ہے
دکھاتا ہے ادب کے ساتھ کوئی جائے مہماں کو + یہی ہے دین کی خدمت اسی میں کامرانی ہے
کوئی کھانے سے فارغ ہو کے آیا ہے سوئے محفل + کسی کے ہاتھ میں پرچہ برائے نعت خوانی ہے

ایک نعتیہ قصیدہ کی تشبیب میں نظامی نے اپنے پریشان کن حالات کی عکاسی کی ہے۔ اس میں قوم پر ٹوٹنے والی آفت و نکبت کا تذکرہ بھی ہے اور سعیِ لاحاصل و صد ہزار مایوسی کا بھی۔ وہ بے شمار معصیت، ارمانِ وصلِ یار، ہجومِ وقت، نارسائیِ تقدیر، نامرادیِ قسمت، جہل کی تاریکی، بخت کی ظلمت، زمانے کی شورش، بے زری و محتاجی، بے نوائی و حسرت کے حوالے سے قوم کی حالت کا تذکرہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں

ہم ہی ہم تھے کبھی زمانے میں + یا ہماری ہے آج یہ حالت
چاہتے ہیں ہمیں نگل جائیں + وہ جو کل تک تھے عنکبوت صفت
روم میں اپنے بھائی ہیں مضطر + کیا یہاں زندگی میں ہو لذت
سمت طوفاں بپا ہے چاروں طرف + تیری امت کی غیر ہے حالت

نظامی نے اپنے دیگر نعتیہ قصائد میں بھی قومی طرزِ احساس کو فراموش نہیں کیا یہ اشعار دیکھیے

برا وقت ہے ناؤ منجدھار میں ہے + خدا قوم کو ڈوبنے سے بچا لے
کرم کی ہو نگاہ ان پر تمہاری اے رسول اللہ + جنہیں منصب ملا ہے قوم و ملت کی حمایت کا
المدد اے طیبہ کے والی لٹ گئی ساری بہار + بلبلِ اسلام اب ہونے کو ہے بے آشیاں
دریغ ہم نے بھلا دئے اصولِ پیغمبر + فغاں کہ ہو گئے دنیا میں جہان میں بدنام
اسلام کی مدد پہ جو غازی کمال ہیں + ان پہ کرم ہو آپ کا اور لطف بے گراں
کسی سے وہ نہ پیچھے ہوں تمدن اور تمول میں + مسلمانوں میں ہو علم و عمل کی کارفرمائی

مدحِ حضورؐ کے حوالے سے انہوں نے شانِ نبوت، عکسِ نورِ خالق، دو عالم کی حکمرانی، جمالِ نبی، رحمت و لطف و کرم،

رازدارِ حقیقت، تمدن آفرین، وحیِ الٰہی، عدلِ رسول اور اخلاق و سیرتِ نبوی وغیرہ کے معاملات و موضوعات پر موثر شاعرانہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان قصائد میں خلفائے راشدین کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

قبۂ خضرا نشانہ گولیوں کا بن گیا + ان جفاؤں سے نہ کیوں دل مومنوں کا ہو فگار

عمر اور خالد تھے جانباز جنرل + صحابہ میں تھے فوجِ حق کے رسالے

وہ فن جن پہ نازاں ہیں یورپ کی قومیں + ہمارے چبائے ہوئے ہیں نوالے

زبانِ پاک سے نکلی صدائے آزادی + رہا قفس نہ گرفتار پابہ حلقۂ دام

ڈوبتی کشتی کو اے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تو بچا + نوحِ ثانی تم کو کہتے تھے رسولِ نامدار (1)

دو کرم کا اپنے چھینٹا تم ہی عثمان غنی رضی اللہ عنہ + اے احمد پہ مال و زر تمہارا تھا نثار

المدد اے شاہِ مرداں رضی اللہ عنہ کیا صفت ہو آپ کی + لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

نظامی بدایونی کے غزلیہ ہی قصائد میں بھی حقیقت پسندانہ طرزِ بیان سے گریز نہیں ہے

فخر ہے ہم کو کہ ہم پرنس علی پاشا کے ہیں + بادشاہ ایڈورڈ ہفتم خوش نصیبی ہے صلہ

عید میں اس کے جیسی حاصل ہے اس کو عافیت + کیوں نہ اس کی عمر و دولت کے لیے مانگیں دعا

دکن کی سرزمین کے حوالے سے نظامی کا کہنا ہے کہ اس سرزمین پر عزت و اقبالِ قومی کی جھلک ملتی ہے۔ یہ خطہ معدنِ علم و ہنر ہے اسی لیے

ہیں ہم شیخ و برہمن سبزہ و گل کی طرح + ہیں وہ اک جان اور دو قالب کیا ان کا بغض و کیں

وہ لکھتے ہیں کہ سب سے پہلا چشمۂ تعلیم اسی زمین پر ابلا۔ آجکل چاروں طرف نئی سڑکیں بن رہی ہیں

بن رہی ہیں آج کل چاروں طرف سڑکیں نئی + خوش نمائی ہے کہیں آئینہ بندی ہے کہیں

نرالے ڈھنگ سے شاہراہوں کی تیاری ہو رہی ہے، پل تبدیل ہو رہے ہیں، رستوں میں پالیٹ ہو رہی ہے۔ عدالت کی جدید عمارات مرتسم پیما ہیں۔ ایک جانب کنگ کوٹھی ہے اور ایک جانب باغِ عام

پڑ گئی اس عہد میں عثمان ساگر کی بنا + یہ بنا بن جائے گی آبی ذخیرے کی اساس

عرض اس کا پندرہ فٹ طول اس کا تین میل + اور ساحل ہے بہشتی حور کی لوحِ جبیں

اب یہ ممکن ہی نہیں موسیٰ ندی کے زور سے + قیمتی جانیں تلف ہوں مال و زر ہو تہ نشیں

نل نہیں سکتے سیہ مس اوت کے دلداروں کے لیے + اب نوشوں کو ملے گا حسن سے ذوق انگیں

میر عثمان علی کی مدح کرتے ہوئے نظامی نے انہیں شوکتِ خاقان و دولتِ کسریٰ پر فوقیت دی ہے اور ان کی خوبیوں کا اظہار کرنے کے بعد کہا ہے کہ سب سے پہلے شمعِ اردو اسی جگہ روشن ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے اردو کی پذیرائی میں اضافہ ہوگا۔ سر فریدون، افسر الملک، ہمیس السلطنت، راجہ ولی دی، عماد الملک اور بہادر جنگ کی قابلیت، فہم و فراست کی تعریف کرنے کے بعد نظامی نے لکھا ہے

---

(1) اسی کا یہ شعر بھی دیکھیے: تم ہی مظلوموں کی اللہ کر دستگیری کچھ کرو + حضرت صدیق اکبر مصطفےٰ کے یارِ غار

ہے امین جنگ کا حسن تدبر بے مثال + ہے فصاحت جنگ کی جادو بیانی دل نشیں

بادۂ علمی سے ہیں سرشار مسٹر حیدری + معتمد ہیں آپ اور کارِ عدالت کے امیں

زندہ دل خوش طبع نظم جنگ کے ناظم بشیر + آ نہیں سکتا کبھی ماتھے پہ بل ابرو پہ چیں

سید مسعود سے سید کی قابل یادگار + ان کو لائق ڈھونڈ کر شہ کی نگاہ دوربیں

آصفی دربار ہے گلشن یہ سب گلشن کے پھول + آصفی دربار ہے خاتم یہ خاتم کے نگیں

اورنگ آباد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے

سہ ایک طرف نہریں رواں ہیں ایک طرف ہے سبزہ زار + ہے پھلا پھولا چمن پھولوں سے گلشن ہے زمیں

اک جگہ اک حوض ہے عہد کہن کی یادگار + کیا مصفا آب ہے کھیلتی ہیں زلف عنبریں

اس میں قدیم مقبروں، تاریخی عمارتوں اور بزرگوں کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ دولت آباد اور خلد آباد کے ماحول و مناظر کی تفصیل بھی ملتی ہے

در پہاڑوں کی سہم آغوش ہے کتنی دلربا + حوض قتلو بھی یہیں ہے اور دورہ بھی یہیں،

ایک دنیا کو ہے اللہ ارواح پاکیزہ سے فیض + زیب تربت، زین دیں ہیں رکن دیں برہان دیں

زین دیں کے قرب میں ہیں خفتہ اورنگ زیب + رونق بزم عدم ہیں چھوڑ کر تاج و نگیں

غار ایلورہ عجب شے ہے دکن کے ملک میں + جس کی صنعت پر تصدق ہے نگارستان چیں

عہد گوتم کے صنم خانے بنے ہیں زیر کوہ + دستکاری دیکھ کر حیران ہیں نظارہ بیں

ایک جانب موجزن ہے آبشار خوشنما + ہے وہ سوگز کی بلندی سے رواں سوئے زمیں

بت تراشی کے نمونے کا شیوں کی ترتیب ہیں + صنعت مغرب بھی ہے ان کے مقابل شرمگیں

کیہ رہی ہیں غار کی سنگیں عمارات عجیب + کیا ہوئی وہ شان و شوکت کیا ہوئے اپنے مکیں

اپنے ایک عقیدہ میں نظامی نے دکن میں "مجمو عات" مجلس شوریٰ کا ذکر کیا ہے

نظامی نے نظام دکن کی مدح کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آصف قوم کا قصر خلد سا الطاف نہ ہوتا تو قوم کا کارواں لٹ چکا ہوتا۔ وہ جمعہ کے دن مکہ مسجد میں باقاعدگی سے حاضری دیتا ہے۔ بیوریوں مذہبی طور پر پابند ہیں اس کے عہد میں ماہ رمضان کا ادب بڑھا۔ حج کے پیاسے دکن کی جانب جاتے ہیں کیونکہ نظام دکن اپنے خرچے پر انہیں حجاز مقدس بھجواتا ہے۔ اس کے دور میں زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات سے کئی خاندان پرورش پا رہے ہیں۔ وہ اہل علم کی قدردانی کرتا ہے۔ محدث، مورخ، مصنف وغیرہ بھی اس کے دربار میں جمع ہیں۔ مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں آصف جاہ کا سکہ رواں ہے

سہ دین کے حامی ہیں اور اسلام کے شیدا ہیں وہ + ہے محبت سرور عالم کی صورت سے عیاں

ہے محی الملۃ والدین اسم ستایاں لقب + غالب اسلام ہیں گویا وہیں روح رواں

نظامی نے ایک مدحیہ قصیدہ میں یہ بھی لکھا ہے

سہ آہ اپنے عہد میں سے سید اعظم نہیں + قبر کی آغوش میں سوتے ہیں صمدی و وقار

بخل سعد یا نغمہ ملت، آبروئے ملک و قوم + میر عثمان علی خاں ہیں دکن کے تاجدار

غم رسید ... امانت سپرد ہے ہیں ایک لڑکا + دور بیٹھا وہ ہوتا کے بیٹے ہیں غمگسار

علی نقی صفی

سید علی نقی صفی لکھنوی [م ۱۹۵۰] دورِ جدید میں اپنے تغزل کی وجہ سے معروف ہیں۔ وہ نظم اور غزل کہنے میں مہارت رکھتے تھے۔ قومی اور سماجی شاعری کی جانب بھی مائل تھے۔ زبان و ادب کے قدیم کلاسیکی معیارات پر ان کی گہری نظر تھی۔ چند بلند پایہ مذہبی قصائد بھی ان کی یادگار ہیں۔ یہ قصائد طرزِ ادا کی جدت اور خیالات و موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے اہم ہیں۔ حضرت علی کی شان میں لکھے ہوئے اپنے لامیہ قصیدے موسوم بہ رازِ ہستی کی تشبیب میں صفی لکھنوی نے فکر و فلسفہ پر مشتمل مضامین ملمبند کیے ہیں۔ اس کا آغاز اس موثر مطلع سے ہوتا ہے

ع پیچ در پیچ ہے شیرازۂ اسباب و علل + رازِ ہستی ہے عجب عقدۂ مالا ینحل

اس قصیدے میں حقیقتِ وجودِ انسانی اور متعلقاتِ انسان و کائنات کے موضوعات پر فکری حوالوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روح جسم کے بغیر عقل کے لیے ناقابلِ ادراک ہے اور جسم بغیر روح کے مہمل ہے۔ صفی نے اس قصیدے کی تشبیب میں تناسخ، تغیر، عقل، تحیر، کائنات کی بوقلمونی، سختیٔ دوراں، زندگی کا خواب ہونا، خیر و شر کی حقیقت، شادی و غم کی تمیز، عقل و جنوں، خودی، انانیت، وحدت الوجود، عارف و عامی، مخلوقات کی کثرت، حواس کے اکمال اور دنیا کی ہر شے کے کارآمد ہونے کے موضوعات پر شاعرانہ تخیل کو استعمال میں لاتے ہوئے عمدہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ع پانچ دروازے ہیں اس باغ کے پانچوں ہیں حواس + ان میں جو بند ہو پیدا ہو طبیعت میں کسل

سب ہی دنیا میں اسی کے متعلق ساماں + خواہ کثرت سے ہو خواہ بہ مقدارِ اقل

ہے اسی بات پہ اشیا کے تنوع کا مدار + اصل میں ورنہ وہی پھول ہے جو چیز ہے پھل

طلعتِ حسن نمودار ہر اک پردے سے + شورشِ عشق سے گو مجھ پہ ہے برہنہ [?] و جبل

پاؤں پکڑے ہوئے سایہ متقاضی ہے کہ رُکو + بیٹھ رہیے کسی گوشے میں بچھا کر کمبل ①

امام حسین کی شان میں لکھے ہوئے اپنے ایک قصیدے میں صفی لکھنوی نے شکایتِ زمانہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے وحدت الوجودی مسلک کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے نامساعد حالات کا تذکرہ کر کے حضرت امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر اپنے مسائل کے حل کی دعا بھی کی ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ع نیہ صلہ ہے عمر بھر کی محنتِ ناشاد کا + یا حسین ابن علی اب وقت ہے امداد کا

اپنے مذکورہ بالا قصیدہ لامیہ میں انہوں نے حیات و کائنات میں سرایت کردہ نورِ الٰہیہ کی حقیقت پر بھی غور کیا ہے ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں ع مے وہی ہے جیسے شیشے میں جو تھی منصور کے + فرق اگر کچھ ہے تو خالی ظرفِ استعداد کا

مدحیہ حصوں میں صفی لکھنوی نے ممدوحین کی شان رواںئی الفاظ و تراکیب (صاحبِ سیف و قلم، نائبِ ختم رسل وغیرہ) میں بیان کیے

---

① انتخاب قصائد اردو ص ۲۲۲ تا ۲۲۵ از ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ اس میں گریز کا انداز بھی عمدہ ہے یہ اشعار دیکھیے
ع ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے دونوں عالم + لب زمزم پہ ترانہ لب کوثر پہ غزل
فاطمہ بنت اسد دیکھ رہی ہیں تارے + گود میں چاند کا ٹکڑا ہے گلے کی ہیکل

صفی لکھنوی نے اپنے ایک اور عقیدے میں فکر و فلسفہ اور عرفان و معرفت کے موضوعات چھیڑے ہیں

؎ جستجو میں زندگی اے قید تعین سے بری + مہر تاباں ہے گرفتار پریشاں نظری
اس فضا میں کہ جو ہے سرحد امکان وجود + ہم سے پوچھے کوئی ذرات کی آشفتہ سری
دونوں یہ حلقۂ بیرون در خلوت میں ہیں + دور شمسی ہو زمانے میں کہ دور قمری

صفی منقبت میں مبسوط قصائد لکھتے تھے ۔ ان کے ایک عقیدہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

؎ ہے تغیر کا اثر مادہ و صورت تک + کیونکہ ایک حال ہے اور ایک ہے ان میں محل
روح کیا چیز ہے ؟ اس سے نہیں واقف کوئی + نفس کے علم سے بے خبری طرز عمل
مختلف وضع کے ہیں ناقص اسی پرزے + جن سے چلتی ہے یہ کل عالم ایجاد کی کل (۱)

صفی لکھنوی کے قصائد میں ۔ محاورات و تشبیہات جاذب توجہ ، تراکیب برمحل اور مصرعے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں ۔ عقیدہ نگاری میں انہوں نے زیادہ تر روایتی انداز ہی اختیار کیا ہے ۔ اپنی نظموں میں انہوں نے قومی اور معاشرتی مسائل پر کھل کر اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر عبد الوحید لکھتے ہیں۔

" مولانا صفی کی بیانیہ شاعری کے سلسلے میں وہ نظمیں قابل ذکر ہیں جن میں شہروں کے تاریخی مقامات کا بیان ہے اور معروف عمارتوں کا تذکرہ ہے ۔ اس ضمن میں الہ آباد ، بمبئی اور جونپور وغیرہ کے متعلق ان کی نظمیں شاہکار ہیں " ان نظموں میں " ان مقامات کی ہو بہو تصویر " کھینچی گئی ہے (۲) ۔ ایک آدھ عقیدہ میں صفی نے نظمیہ تسلسل کا انداز بھی اختیار کیا ہے

؎ صحن حرم میں تھے جب بیٹھے بقصد کشش + پھرنے لگا نگاہ میں میکدہ چشم یار کا
سوئے حبیب کبریا دیکھ رہا ہے کوئی یوں + آنکھوں میں خط کھنچا ہوا خمکدۂ بہار کا
چوس رہا ہے دیکھنا کوئی زبان بو الکل + ذائقہ لے رہا ہے کون طعمۂ خوشگوار کا
بنت اسد کا لاڈلا ختم رسل کی گود میں + پھینک رہا ہے ہاتھ پاؤں سن جو نہیں قرار کا
یہ جو ہمک ہمک کے آج بازو دہ رہا ہے جیبہ پاں + فتح کرے گا کل یہی معرکہ گیر و دار کا (۳)
احمد کے فرش خواب پر لیٹا ہے چادر تان کر + وہ شیر نر جس پر کہ تھا اللہ کا حفظ و اماں
شاہ نجف ماہ عرب ، زور ور و حیدر لقب + شاہنشہ عالی نسب سر دفتر کون و مکاں
وحدت کش ، خیبر کشا ، بازوئے ختم الانبیاء + زوج بتول پارسا ، نفس رسول دو جہاں
مرد میدان وغا وہ شہسوار لافتیٰ + تلوار جس کی برق دم رہوار جس کا خوش عناں
قلع در خیبر ہوا حیدر کے بائیں ہاتھ سے + یہ زور اور اس پر غذا دو خشک جو کی روٹیاں (۴)

صفی لکھنوی نے اپنے قصائد میں جدید دور کی نئی سائنسی اور علمی دریافتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے ثقافتی مظاہر کی روداد کا بھی ۔ ان کے طرز اظہار کی جدت دیدنی ہے

---

(۱) خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۳۱۸ ، ۳۱۹ (۲) جدید شعرائے اردو ص ۲۵۸
(۳) سرفراز لکھنو جون ۱۹۲۶ (۴) سرفراز لکھنو جنوری ۱۹۲۷

وحیدالدین احمد بیخود

[م ۱۹۵۵ء]

وحیدالدین احمد بیخود دہلوی کا دیوان "درِ شہوار بیخود" کے نام سے ۱۹۱۹ء (۱۹۲۰ء) میں چھپا۔ اس میں ریاست مالیر کوٹلہ کے والی احمد علی خاں کی مدح میں قصائد ملتے ہیں۔ علاوہ ان کے ڈبلیوس زلوف، والسر ٹیج اورنگ بہادری کی مدح میں قطعات بھی طبع ہوئے ہیں۔ انہوں نے "نوید فتح" کے نام سے ایک نظم بہ ہیئت مقیدہ جشن لاہور منعقدہ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء بھی تخلیق کی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس میں جرمنوں پر انگریزوں کی فتح پر اظہارِ مسرت ہے

وہ چلا بھاگ کے میدان سے قیصر دیکھا + یوں بگڑ جاتا ہے دم بھر میں مقدر دیکھا
تیرے اقبال کی کیا بات ہے اے انگلستاں + تیرے اقبال سے منہ فتح کا اکثر دیکھا
کھل کے غنچوں نے کہا سنتے ہی جرمن کی شکست + ظلم کے باغ کو پھلتے ہوئے کم تر دیکھا
ایک سے ایک الاکثر بھی یہی کہتا ہے + ہم نے اس فتح کا سہرا ترے سر پر دیکھا (۱)

احمد علی خاں کی شان میں بیخود دہلوی کے قصائد روایتی ہیں۔ یہ قصائد ممدوح کی بہادری، اہلِ کمال کی دستگیری، ملک اور شاعر پروری وغیرہ کے موضوعات کے ساتھ ساتھ توسنِ شاہ، فیلِ شاہ وغیرہ کی تعریف پر بھی مشتمل ہیں

زمینِ شعر بنے کیوں نہ آسمانِ سخن + ملے جو احمد علی خاں سا قدر دانِ سخن
اسی کے خوانِ کرم پر ہیں جمع اب شعرا + اسی کے صدقے میں پلتے ہیں شاہدانِ سخن
تجھ سے کیخسرو و جم کو کوئی نسبت نہ رہی + ترا اقبال بڑا منصب بڑا نام بڑا

توسن شاہ: اس طرح زیرِ فلک وہ نظر آیا مجھ کو + ایک اتری ہوئی شیشے میں پری ہے گویا
فیل: لوگ سمجھے کہ نکل آیا افق سے خورشید + فیل پر زرد عماری کو جو تاباں دیکھا

بیخود دہلوی کے قصائد میں کہیں کہیں بہاریہ مناظر کی عکاسی بھی مل جاتی ہے

کس مزے سے کھلی ہے یہ غنچہ نے تبسم کی ادا + لوٹی جاتی ہے جسے دیکھ کے گلشن میں صبا

بیخود دہلوی نے خطابیہ قصائد میں ممدوح کی تعریف میں قدیم عجمی تصورات سے بھی کام لیا ہے اسے فریدوں فر کہا ہے کیخسرو و جم کی نسبت سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے بیخود دہلوی نے مرصع کاری اور پر تکلف اظہار کی اقلیم سے دامن بچایا ہے۔ سیدھے براہِ راست انداز سے بات کہنے کے جدید نظمیہ شاعری کا گر آزمایا ہے۔

بیخود کا ایک دیوان "گفتارِ بیخود" (۱) کے نام سے بھی طبع ہوا تھا۔ اس میں جارج پنجم، نواب سلطان جہاں والیہ بھوپال، صاحبزادہ محمد شبیر علی خاں بہادر شبیر کی شان میں قصائد ملتے ہیں۔ جارج پنجم کی شان میں ان کا یہ شعر دیکھئے۔ اس میں عقیدتمندی کی جھلک دکھائی دیتی ہے

تو شہ والا ہمم عالی تبار + ہیں رعیت اور وہ بھی خاکسار

---

(۱) درِ شہوار بیخود ص ۱۸۷، دلی پرنٹنگ ورکس دلی ۱۳۳۸ھ

(۲) گفتار بیخود دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۴ء ص ۳۲۶ تا ۳۳۳

معشوق حسین اطہر

معشوق حسین اطہر م ۱۹۵۷ء ہاپوڑ میرٹھ کے رہنے والے تھے ان کے بارے میں تذکرہ شعرائے جے پور میں لکھا ہے کہ انہوں نے اردو قصائد کا ایک پورا مجموعہ مرتب کیا تھا[1] نقوش آپ بیتی نمبر میں بھی اس مجموعے کا تذکرہ ہے[2] تاجور نجیب آبادی نے لکھا ہے ان کے عقیدہ میں (عقیدہ نعت) شکوہ الفاظ، ندرت تخیل، عالمانہ بلند پروازی اور وہ تمام خوبیاں جو کسی قصیدے کو عام قصائد سے ممتاز کرتی ہیں موجود ہیں[3] اس عقیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

سہ حریف عیش مخلد ہے عشرت فانی + وبال دوش ہوئی ہے مجھے تن آسانی

شگفتگی نہیں دمساز آجکل سحری + خط شکستہ ہے تحریر لوح پیشانی

خیال سلسلہ جنبان وادئ غربت + حواس شانہ کش طرۂ پریشانی

مٹا ہے صفحۂ ہستی سے نام سرداری + ملی ہے خاک فنا میں بلند ایوانی

فساد آب و ہوا ہو گیا ہے عالمگیر + ہوئی ہے چشم جہاں بین مہر عرفانی

بدل گیا ہے نظام عناصر اربع + عجب نہیں جو ہوا خاک آگ ہو پانی

غریق بحر فنا ہوں ازل سے میں کہ لیے + ملی حباب کی مانند خانہ ویرانی

امیدیں دل میں امنڈتی ہیں مثل فوارہ + ڈبو نہ دے کہیں مجھ کو یہ سیل طوفانی

گریز — فلک نشینوں سے پوچھے کوئی وقار ورا + کبھی تھا سر کا رہے تکیہ دوش کیوانی

وہی ہوں میں کہ فلک پر تھا ہمرہ ملکوت + شب ولادت شہ گرم تہنیت خوانی

مدح — حضور خاتم پیغمبراں امام رسل + محمد عربی ہاشمی رعد ثانی

شفیع روز جزا قاسم نعیم جناں + مکین عرش معلیٰ حبیب سبحانی

حسن طلب — ملے صلے میں ستائش کے مجھ کو ہشت بہشت + کہ ہے یہ وزن قصیدہ بھی ہشت ارکانی[4]

اطہر ہاپوڑی کے قصائد کا مجموعہ تا حال زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ۔ تاہم ان کے نعتیہ عقیدہ کے مذکورہ اشعار سے ان کی زبان و بیان کی پختگی، فکر کی گہرائی، موضوعاتی تازہ کاری اور فنی بلندی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ فکر و فلسفہ کے قدیم تصورات عہد جدید میں بھی ہمارے شعرا کا موضوع رہے ہیں ان میں فنا، عناصر اربع، حباب، آسانزندگانی وغیرہ کے موضوعات قابل توجہ ہیں ۔ گریز اور مدح کے اجزا میں بھی اطہر ہاپوڑی نے کسی نوع کی جدت کا اظہار نہیں کیا ۔ حسن طلب کا انداز بھی روایتی سا ہے ۔

---

[1] تذکرہ شعرائے جے پور ص ۹۱ از احترام الدین احمد شاغل یونین پرنٹنگ پریس دہلی [2] نقوش آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ ص ۴۹۰
[3] مخزن ص ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ [4] الفیاض ص ۵۸

ظفر علی خاں

ظفر علی خاں [م ۱۹۵۷] کا تعلق پنجاب سے تھا انہوں نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ دکن میں بھی گزارا۔ لاہور میں بھی قیام کیا۔ ان کا قومی اور ملی شعور ان کی شاعری کی ایک ایک سطر میں جھلکتا ہے۔ ظفر علی خاں نے نعتیہ قصائد بھی لکھے ہیں۔ ان کے ہاں چند قصائد دنیاوی ممدوحین کے حوالے سے بھی نظر آتے ہیں۔ فرمانروائے بھوپال سلطان جہاں بیگم (۱)، نواب وقار الدولہ بہادر (۲) (حیدرآباد) اور نظام الملک آصف جاہ (۳) کی شان میں ان کے قصائد طبع ہوئے ہیں ان کے مجموعہ کلام "بہارستان" میں ان کے حمدیہ قصائد بھی ملتے ہیں (۴) اسلام، مٹے باقی جگر پارے، سوراج، غزل در قفس، آصف جاہ ہفتم کی بارگاہ میں، امیر المومنین ابن سعود، اسیران فرنگ، قادیان کا مقبرہ، اپنا نظم، عید رمضان اور داغ مرحوم کے نام سے ان کے کلام میں ملنے والی نظمیں قصیدے کی ہیئت میں ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں تعداد اشعار بھی پندرہ سے زیادہ ہے۔ ظفر علی خاں کے نعتیہ قصائد میں عرضداشت امت کون و مکاں بہ حضور سرور، جشن میلاد نبی اور فخر رسل ہو کے کی چیزیں ہیں ان کے قصائد کے یہ مطالع ملاحظہ ہوں :

سپیدہ دم کہ ہوا میں شریک راز انام + سنا سروش سے قلب حزیں کا میں نے پیام

عقیدہ کلمہ: زباں ہے وقف ثنائے خدائے عز و جل + خدا ہی ہے جو ہے عقدہ ہائے زور نطق سے حل

آوازۂ حق: ہم کو دیا پیغام عرب نے ایک خدا اور ایک رسول + اب نہیں کوئی ایسی دعا جو آئے ہی لب پر ہو نہ قبول

اے خاور حجاز کے رخشندہ آفتاب + صبح ازل ہے تیری تجلی سے فیض یاب

اے کہ ترا جمال ہے زینت بزم کائنات + دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکوٰۃ (۵)

فخر رسل: کھینچے کو ہوں آج میں نعت رسول کریم + میری زباں کیوں نہ ہو رشک زبان کلیم

جشن میلاد نبی: محمد مصطفیٰ گنج سعادت کے امیں تم ہو + شفیع المذنبیں ہو رحمۃ للعالمیں تم ہو

اے نشان رحمت حق مظہر شان جلیل + تو نے کی تکمیل آئین مسیحا و خلیل

نظام الملک آصف جاہ: صبحدم جب پردۂ مشرق سے نکلا آفتاب + نیند کا میں نے بھی اپنی آنکھ سے الٹا نقاب

کچھ عجب شان سے اس مرتبہ آئی ہے بہار + کہ گل و لالہ سے ہے دامن گلچیں کہسار

ظفر علی خاں کے غیر مذہبی قصائد میں روایتی قصیدہ کی ہیئتی پابندیوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے انہوں نے ان میں بہاریہ اور حکایاتی موضوعات کو عمدہ انداز سے سنبھالا ہے۔ ان کی تشابیب پر جدید دور میں بننے والی نظم کی روایت کا گہرا اثر ہے۔ مدحیہ حصوں میں بھی انہوں نے

---

(۱) بہارستان ص ۳۱۲ اردو اکیڈمی پنجاب۔ (۲) الفیا ص ۱۰۹ (۳) دکن ریویو نمبر ۱ ۱۹۰۷

(۴) بہارستان ص ۷، ۱۱، ۱۴

ممدوح کی شخصیت اور سیرت و کردار کے اوصاف سادہ اور بیانیہ انداز میں نظم کیے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے ممدوحین کو شہنشاہ آفتاب رکاب اور جہاندار آسمان درگاہ وغیرہ کے الفاظ سے بھی پکارا ہے مگر ان کا یہ انداز کہیں کہیں استعمال ہوا ہے۔ وہ ممدوحین کی مساوات پسندی، سخاوت اطوار، شریعت نوازی، غربا پروری، اسلام دوستی، آزادی وغیرہ کی خوبیوں کو اجاگر کرنے سے شغف رکھتے تھے۔

حمدیہ قصائد میں انہوں نے خدا کی کریمی و رحیمی شان کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کے خالق کون و مکاں ہونے کی شہادت بھی دی ہے۔ انہوں خدائے عزوجل کی حمد میں اپنا پورا زور قلم صرف کیا ہے۔ نعتیہ قصائد میں ظفر علی کی حضور سے محبت قلبی گہرائی کی تاثیر لیے ہوئے ہے۔ وہ انہیں شہ دو جہاں، سرور کون و مکاں، خدا کا حبیب اور خدا کا ندیم وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے حالی کی روایت میں نعتیہ قصائد میں قومی مسائل اور حوالے بھی شامل کیے ہیں

؎ بخشئے سہارے گناہ ہم پہ کرے اپنا فضل + پھر ملے اسلام کو عظمت شان قدیم

قوم میں ہو اتفاق اور ہو پیدا جوش + ہمت اولو ہو بلند عزم اولو ہو صمیم

ظفر علی خاں کے یہ اشعار دیکھئے ان میں عشق رسولؐ کا جذبہ عروج پر نظر آتا ہے

؎ دیکھ کے تجھ کو گرے لات و ہبل سر کے بل + آتے ہی تیرے فرو ہو گئی نار جحیم

کون سی ایسی ہوئی اس میں تعجب کی بات + تیرے اشارے سے ہو گر مہ کامل دو نیم

تو نے تو زندہ کیا بات میں اس جسم کو + رہ گئی تھیں اک فقط جس کی عظام رمیم

جس کی رگ و پے میں تھا شرک سمایا ہوا + چھائی ہوئی جس پہ تھی ظلمت جہل سقیم

جبکہ ہو تو ناخدا کشتیٔ اسلام کا + کیا اسے موجوں سے خوف کیا اسے طوفاں سے بیم

تیری شفاعت کا گر ہم کو سہارا نہ ہو + رحم پہ غالب رہے عدل خدائے عظیم

شافع روز جزا تو نہ ہو گر کارساز + ہم کو میسر نہ ہوں خلد بریں کے نعیم

خسرو و خاقاں کا فخر تیرے گدایان در + صاحب فوز عظیم تیری گلی کے مقیم

تو نے لگایا تھا جو گلشن قدس اسنما + لاتی ہے اب تک نسیم اس سے اڑا کر شمیم

مولانا ظفر علی خاں کے قصائد نے تہذیبی طور پر جہاں ہندو ازم کی احیا کی تحریکوں کا مقابلہ کیا وہاں ان کے وسیلے سے صنف قصیدہ کو بھی سہارا ملا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ریاستی نوابوں کی نوابیاں اس صنف کو سہارا دینے سے معذور تھیں۔ حمد، نعت، منقبت (اور) اصلاح احوال کے لیے لکھے جانے والے اصلاحی قصائد نے اردو قصیدہ کو استحکام بخشا۔ ظفر علی خاں کے نعتیہ قصائد میں ان کی زبان و بیان کی شان و شوکت نے مخصوص رنگ پیدا کیا ہے

بہارستان ص ۵۲

تمنا عمادی

علامہ تمنا عمادی کہ جو پاکستان بننے کے بعد چاٹگام میں مقیم تھے۔ اپنے طویل قصائد کی بنا پر خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے دو مشہور قصائد کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک قصیدہ صداقتہ العظمی کے نام سے چھپا یہ آٹھ سو اشعار کا قصیدہ ہے اس کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسلامی تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے لئے لکھا گیا۔ اس میں ایسی روایات پر تنقید کی گئی ہے جو وضعی ہیں۔ اس قصیدہ کا خصوصی مقصد یہ تھا کہ عبدالعزیز خالد کے قصیدے فارقلیط میں پیش کی گئی بعض روایات کی تکذیب ہو سکے[1]

تمنا عمادی کا ایک اور قصیدہ قصیدۃ الزہرا قریباً ۴۰۰۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے یہ اردو کا طویل ترین قصیدہ ہے۔ اس میں خلفائے راشدین اور مہاجرین و انصار و جملہ صحابہ کرامؓ کے دامن اخلاق حسنہ کو مورخین کذابین کوفہ و منافقین عجم کے غبار بہتانات سے پاک وصاف کرنے کی پوری کوشش درایت قرانیہ و ایمانیہ کی روشنی میں کی گئی ہے[2]

اس کے عنوانات سے اس کے موضوع کی مزید تفصیلات سامنے آ سکتی ہیں بعض عنوانات یہ ہیں غرض بعثت رسول کم کذاب۔ راوی / قاتلین عثمانؓ ملعون تھے / جنگ جمل / مکہ سے قافلہ کی روانگی / حضرت مروان پر انہام / حضرت علیؓ اور کوفہ / حضرت علیؓ کے خطبے / معرکہ صفین و تحکیم / حضرت علیؓ کی شہادت / حضرت حسن کی وفات / شہادت حضرت عثمانؓ / صلح و شرائط صلح / لغبیات منافقین عجم عبداللہ ابن زبیر کا معاملہ / وغیرہ۔ یہ قصیدہ شیعہ نقطہ نظر کی تردید کے لئے رقم ہوا۔ اسکا مطلع ہے

ہے خدا ہی سزاوار حمد و ثنا ہے + کہ وہ خالق و مالک ما سوا ہے

پورے قصیدے میں یہی زمین اور یہی ردیف اور قافیہ ہے۔ اس قصیدے کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صنف قصیدہ میں مثنوی کے موضوعات کو بھی سمیٹنے پر قدرت ہے۔ اس قسم کے قصائد سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ صنف اپنے اندر اظہار کے کیا کیا امکانات رکھتی ہے۔ تمنا عمادی نے یہ قصیدہ ان روایات کی تکذیب کے لئے لکھا جو ان کے خیال میں اسلامی تاریخ میں "فتنے" پیدا کرنے کے لئے لقبیں اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں یہ قصیدہ انتہا پسندانہ فرقہ واریت کا شاخسانہ ہے اور قصیدے کے روایتی اسلوب سے بےتعلق ہو ہے

ہے مسلمانو! ایماں اگر ہے خدا پر + اگر تم کو پاس رسول خدا ہے
تو رکھو صحابہ سے حسن عقیدت + صحابہ ہی سے دین کی نشو و نما ہے
نبیؐ کی سب اولاد سے رکھو الفت + کہ ایمان کامل کا یہ مقتضا ہے
فقط ایک سے عشق اوروں سے نفرت + نفاق مجوسی نہیں یہ تو کیا ہے

---

(1) قصیدہ الصداقتہ العظمی مطبوعہ مکتبہ محمود کراچی (2) القصیدۃ الزہراء، مکتبہ محمود کراچی ۱۹۶۹ء ص ۱۵۰ تا ۱۵۲

سرفراز احمد سہیل

[۱۹۶۸ میں ان کی عمر ستر برس تھی]

سید سرفراز احمد سہیل بنارسی عہد جدید کے اہم قصیدہ نگار شعرا میں سے ہیں ان کے قصائد کے چار مجموعے انجمن شعرائے اہل بیت پاکستان کی جانب سے ۱۹۶۷ اور ۱۹۶۸ میں شائع ہوئے تھے - ان مجموعوں کے نام ہیں نقوش عرفان(۱)، شہود عرفان(۲)، عروج عرفان(۳) اور شعور عرفان(۴) یہ قصائد نعت و منقبت پر مشتمل ہیں نقوش عرفان میں اٹھارہ قصائد ہیں ان کے ممدوحین رسول اکرمؐ، فاطمۃ الزہراؑ، حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت عباس ابن علیؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام محمد باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ، حضرت امام موسیٰ کاظمؑ، حضرت امام علیؑ رضا، حضرت امام محمد تقیؑ، حضرت امام علی نقیؑ، حضرت امام حسن عسکریؑ اور حضرت امام مہدی آخر الزماںؑ ہیں ان میں ایک قصیدہ نوروز عالم افروز کے عنوان سے ہے ایک فتح خیبر کے حوالے سے باقی تمام قصائد مذکورہ ممدوحین کی ولادت کے حوالوں سے ہیں - سہیل بنارسی کا دوسرا مجموعہ شہود عرفان کے نام سے ہے اس میں امام مہدیؑ کی منقبت میں ۲۰ قصائد ہیں اول الذکر کتاب کا طویل ترین قصیدہ ۵۹(۵) اشعار کا ہے اور موخر الذکر کا ۱۰۵ اشعار کا(۶) عروج عرفان میں سہیل بنارسی نے حضرت علی کی شان میں قصائد
شعور عرفان ۴ نعتیہ قصائد ہیں، ۸ مدح امام حسین کے ایک حضرت علی کی شان میں ایک حضرت امام حسن اور ایک حضرت عباس علمبردار کی شان میں ہے - سہیل بنارسی کے ان قصائد .. کوئی قصیدہ جشن میلاد النبی کے حوالے سے ہے کوئی جشن بعثت کے حوالے سے، ایک میں سیرت النبی کو موضوع بنایا گیا ہے، چند ولادت امام حسین کے پس منظر میں ہیں -

سہیل بنارسی نے قصائد کی روایتی شان و شوکت کو بالائے طاق رکھا۔ پرانی روایات کی بجائے جدید دور کے نظریہ معیارات کو سامنے رکھا - ان کے قصائد شدت تاثیر اور خلوص بیان کے جوہر سے مزین ہیں۔ ان کے سخن میں سوز ہے۔ وہ جگہ جگہ تاریخ اسلام کے واقعات تلمیحاً نظم کرتے ہیں۔ روح شہادت، اسوہ حسنہ، اخلاق و سنت آئمہ، تزکیہ نفس، قومی پیغام، تعلیم و تربیت، سماج ان کے خاص موضوعات ہیں، وہ ایک مشاق شاعر ہیں۔ وہ غزل گو بھی ہیں تاہم ان کی غزلوں کے دیوان تاحال غیر مطبوعہ ہیں(۷) سہیل بنارسی نے قصائد میں تلمیح سازی کو در آنے نہیں دیا۔ ان کے قصیدے علوئے نفس کا اظہار بھی ہیں اور اخلاق کی ترغیب دینے والے بھی، انہوں نے باطل کو اپنے زور ایمان سے روکنے کی کوشش کی ہے یہ قصائد جن شخصیات کے ہیں وہ انسان دوست اور معاشرہ ساز شخصیات ہیں ان کی مدح میں سہیل بنارسی نے اہتمام کیا ہے کہ ان کے کارنامے اور سیرت کے وہ پہلو سامنے آجائیں جن سے انسانی روح اور سماجی ماحول نے ترقی کی۔ وہ تصنع، جھوٹ، منفعت سے دور رہ کر والہانہ جذبات کی شاعری کرتے رہے ہیں

---

(۱) و شہ انجمن شعرائے اہل بیت پاکستان ۱۹۶۷ء (۲) ایضاً ۱۹۶۷ (۳) ایضاً ۱۹۶۸ (۴) ایضاً ۱۹۶۸
(۵) نقوش عرفان ص ۱۱۲ (۶) شہود عرفان ص (۷) ص شعور عرفان ص ۲

رسول، آلِ رسول اور آئمہ سے ان کی عقیدت اور والہانہ وابستگی ان کے قصائد کی ہر سطر میں دیکھی جا سکتی ہے۔
ان کے قصائد غزل کی رنگینیاں بھی رکھتے ہیں اور نظم کا تسلسل بھی۔

سہیل بنارسی نے تقسیمِ پاکستان سے قبل بنارس میں منعقد ہونے والی مقاصدوں کی محافل میں سو سے زائد قصائد پڑھے[1]۔ یہ قصائد ان کے عشقِ حقیقی اور محبت و خلوصِ مذہبی کے آئینہ دار ہیں۔ سادہ ہوتے ہوئے پُرکار ہونا ان کا عمومی رنگ ہے۔ سہیل بنارسی کے قصائد زندگی کی تڑپ، حرارت اور حرکت کا عکس لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کاتی(?)، لفظیاتی، فطری یا رومانوی، ترقی پسندانہ ہر نوع کی شاعری کے عناصر سے استفادہ کیا ہے۔ وہ بے جا مداحی، بے جا تعریف اور خوشامد کے قائل نہیں ہیں۔ سہیل بنارسی نے زندگی کے گیسو سنوارنے کے لئے ایک مشاطہ کا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اعلیٰ اقدار و روایات کے فروغ کے لئے اپنے قصائد میں سچے اور کھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

سہیل بنارسی کی تشبیب میں سادگی اور تغزل کی شان پائی جاتی ہے، ان کی مدح میں منقبت کے حقیقی جوہر آشکار ہوتے ہیں ان کی دعاؤں میں خلوص اور عجز کا اظہار ہے ان کے قصائد میں نئی نئی زمینیں استعمال ہوئی ہیں، نئے نئے خیالات اور نئے نئے افکار نظر آتے ہیں ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

غنچۂ ایجاد کھل کر بن گیا زردار پھول + ہو گئی ہیگوں(?) فضا ذرہ بنا گلنار پھول
جراحت گاہِ الفت میں بہار آئی تو قدر کے + مزہ جب ہے بجائے اشک آنکھوں سے لہو برسے
کیف زا صبحِ وفا کیف آور ہے شامِ وفا + ہر نفس دیتا ہے دل دنیا کو پیغامِ وفا
گردِ داغِ جگر چمکیں نہ کیوں مہرِ مبیں ہو کر + تجلی ریز ہو جذبات جب پردہ نشیں ہو کر
ہمیں ارماں ہمارے آج اگر کچھ آسرا دیں گے + تو ہم دنیائے حسن و عشق کو دنیا بنا دیں گے
کیا وہ بھی زمانہ تھا میں رہبرِ منزل تھا + پہلوئے محبت میں ارمان بھرا دل تھا
اک وجد کا عالم تھا جب شمعِ محفل تھا + دل میں کبھی حیرت تھی حیرت میں کبھی دل تھا
ہوتے نہ مکمل کیوں نقشے رخِ فطرت کے + بے مثل مصور تھا صورت گر کامل تھا
طاہرہ صدیقہ و سردارِ عوراتِ جناں + گوہرِ تاجِ شفاعت شافعِ روزِ شمار
حسین ابنِ علی عالمِ فانی میں نہ ہو نقش باقی ہے + بہت آگے ہے منزل بتیر کی ہر ہادی و رہبر سے
ہے شہر بانو کا قمر حسین کا حسیں پیکر + کہ مہر جس کو دیکھ کر فلک پہ شرمسار ہے
بچایا لفظِ قرآں کلفتے(?) سے اسحاق کندہ کو + ابھارا ڈوبتی کشتی امت عینہ کو بہ ساکر(?)
میں قصیدہ پڑھتا جاتا وہ سہیل سنتے جاتے + وہ زمانہ کیا زمانہ کہ گردگار ہوتا

---

[1] نقوش عرفان ص ۱۹ انہوں نے ہر(?) سے زاید قصائد لکھے ہیں۔ ص ۲

تجمل حسین نجم آفندی

تجمل حسین نجم آفندی [م ۱۹۷۵] اکبرآباد میں ۱۸۹۳ میں پیدا ہوئے ان کے قصائد کے چند مجموعے وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے۔ قصائد نجم[1] اور پنجتنی قصائد[2] ان کا اثاثہ ہیں۔ عرفان ابوطالب، رہبر کونین، تیرہویں رجب کی رات، ...، فروغ ملت بیضا اور امام منتظر ان کے اہم قصائد ہیں ان میں سب سے طویل قصیدہ ۲۳۵ اشعار کا ہے (امام منتظر) اور سب سے مختصر آٹھ اشعار کا (اسے نعت کہا جا سکتا ہے) بعنوان رہبر کونین ہے[3] نجم آفندی نے کثرت سے مختصر قصائد لکھے۔ وہ قصائد نجم کے دیباچے میں لکھتے ہیں

"میں نے قصیدہ کی صنف میں ایک جدید شاہراہ بنائی ہے"[4] وہ چاہتے تھے کہ شاعری سے کوئی مفید کام لیا جائے اور قوم کے سامنے وہ چیز پیش کی جائے جس سے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس کی طرف رجوع کرے۔ قصائد نجم ۲۷۲ صفحات پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اس میں فکری اور تبلیغی انداز کی شاعری طبع ہوئی ہے۔ نجم اپنی تشبیب میں بہاریہ، وصفیہ یا اسی نوع کے کسی اور منظر نامے کی پیش کش کی جگہ تاریخ اسلام کے منتخب واقعات یا مذہبی معلومات پر اکتفا کرتے تھے۔ کسی قصیدہ کی تشبیب میں انہوں نے موسیٰ و فرعون کا واقعہ بیان کیا ہے اور کسی میں ابراہیم اسمٰعیل کا، مدحیہ حصوں میں بھی وہ ممدوح کی شخصیت کے نمایاں پہلو سامنے لاتے تھے

نجم آفندی کے قصائد میں زبان سادہ اور بیان صاف اور شستہ ہے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیدنی تھی وقت کی صورت گری کل رات کو + جادہ دل میں ہو گئی تھی زندگی کل رات کو

[تیرہویں رجب کی رات] اے تعالی اللہ شان ابتلائے انتظار + اک وصی کا منتظر تھا اک نبی کل رات کو

[امام منتظر] جب توجہ آنے والے کی ادھر ہو جائے گی + دل کو دل سے راہ ہوتی ہے خبر ہو جائے گی

مدح میں ہے جن کی توحید و رسالت ہم زباں + شاعری موقوف ان کی مدح پر ہو جائے گی

تمام روشنیاں ہیں اسی کے نور سے نجم + فروغ ملت بیضا ہیں جعفر صادق

جگہ فرزدق و دعبل کی نجم کو ملتی + قریب طائر سدرہ کو آشیاں ہوتے

جہاں میں وحدت عزم و عمل نے پھر نہیں دیکھا + نمونہ جو زمین کربلا پر تھا بہتر کا

شاید ہے طلب پھر وہی شبیر کے در سے + اے جذبۂ مدحت یہ ہوا آئی کدھر سے

فطرت خدا کے راز اگر برملا کہے + غنچہ کھلے چمن میں تو یا مرتضیٰ کہے

---

① قصائد نجم آفندی بک ڈپو کٹرہ حاجی حسن آگرہ ۱۹۱۷، قصائد نجم تاج پریس یوسف بازار حیدرآباد ۱۹۳۲ء

③ النجم مرتبہ باقر زیدی ص ۳۱۷ بزم نجم آفندی کراچی ۱۹۷۷ ④ قصائد نجم حرف آغاز

— علیم ناصری [آپ 1919 لاہور سے متعلق ہیں۔ اس کا کوروس کے جواب میں انہوں نے مجموعہ نعتیہ قصیدہ لکھا اس میں انہوں نے اسلامی تلمیحات و مصطلحات کا استعمال کیا ہے]۔ انہوں نے اپنے ایک قصیدہ میں خلفائے راشدین کی مدح بھی کی ہے اسکا مطلع ہے ؎ سرورِ عالمیاں صاحبِ اکلیل و علم + تاجدارِ عرب و زینتِ اورنگِ عجم
خلفائے راشدین کی مدح میں ان کے یہ اشعار دیکھیے

عالم افروز ہوئے اس کے شبستاں کے چراغ + آج بھی ان سے ضیا گیر ہے سارا عالم
اس کا حیدرؓ ہے جو کرار تو عثمان غنیؓ + اس کا صدیقؓ ہے اکبر تو ہے فاروق اعظم (1)

ان کے قصائد میں پیغام بھی ملتا ہے

؎ ہو نہ محفوظ مساکین و یتامیٰ کے حقوق + نہ غریبوں پہ امیروں کا رہے ظلم و ستم

—

(2)

ملتان کے شاعر اصغر علی شاہ نے بھی نعتیہ قصائد لکھے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ معروف شاعر عبد العزیز خالد کی شان میں بھی ہے (3) اصغر علی شاہ کی طبع استادانہ قصائد میں طغیانی پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے ایک نعتیہ قصیدہ کی تشبیب میں شاعرانہ طبع کی روانی کا موضوع چھیڑا ہے۔ وہ کہتے ہیں

؎ خبر ہو شاعروں کو با ادب ہشیار ہو جائیں + کہ جولت میں زمینِ شعر کی سلطانہ آتی ہے
بکیس جزر و مد بحرِ ہزج ترتیب پاتے ہیں + کہیں تسنیمِ لف و نشر فلسفیانہ آتی ہے
گریز اس سے کوئی تشبیب مدحاتِ قصیدہ سے + نہیں بنتِ غزل تائب ہے عشاقانہ آتی ہے

گریز دیکھیے

مسلسل لحن داؤدی سے صید کی راہ پانے پر + ادا کرتی ہوئی توحید کا شکرانہ آتی ہے
اس قصیدہ کے مدحیہ حصے میں اصغر علی شاہ نے اسلامی تاریخ کے مختلف واقعات کی جانب اشارے کیے ہیں

؎ یہ کیوں ہے بہر اسماعیل زمزم کا ابل پڑنا + یہ کیوں ہے ہاجرہ لینے کو در ویرانہ آتی ہے
چڑھی مکہ سے وہ ندی کہ طوفانِ نوحؑ کا نادم + جو از اسپانیہ تا کشورِ فرغانہ آتی ہے
اجل آتش کدے کی اہرمن زادوں کی بربادی + کلیسا کی تباہی شامتِ بت خانہ آتی ہے

اس قصیدہ میں حضورؐ کے صبر و عفو، استقلال، آزمائش، ہجرت، حلم اور تحمل کی ثنا کی ہے

؎ اندھیروں میں جہاں بھی ہم کھٹک جائیں ہدایت کو + وہیں شمعِ نبوت صورتِ پروانہ آتی ہے

عبد العزیز خالد کی شان میں ان کے قصیدہ کی تشبیب بہاریہ ہے اسکا مطلع ہے

؎ چونکہ اے شاعر خزاں مایوس + ہو گیا اور عالم محسوس

اس قصیدہ میں اصغر علی شاہ نے عبد العزیز خالد کی مدح کرتے ہوئے انہیں سخن کی اقلیم اور لفظوں کا بحر او قیانوس کہا ہے۔ انہیں بقراط و جالینوس، بطلیموس، بدیع زماں، فردوسی وغیرہ سے متعلق کیا ہے (3)

---

(1) رسالہ تحریریں لاہور، سالنامہ 1985 ص 21 (2) نعتیہ قصیدہ از اصغر علی شاہ، رسالہ لفظ ہمارے لودھراں ... جنوری فروری 1984 ص 39 ... ص 51، 52 جون 1982

(3) ان کے یہ اشعار دیکھیے ؎ وہ علوم فرائض کا بقراط + حکمتِ نظم کا وہ جالینوس
اس کی تاریخ میں بدیع زماں + اس کی جغرافیے میں بطلیموس
دنگ فردوسی ہو اگر لکھے + رزم از اسباب و کیکاؤس
ماہنامہ تحریریں لاہور، عبد العزیز خالد نمبر، ص 71 تا 73، مارچ اپریل 1985ء

طالق ہمدانی کا تعلق لدھیانہ سے تھا ان دنوں منڈی بہاؤ الدین گجرات (پاکستان) میں مقیم ہیں ان کی نعتیہ اور قومی شاعری کا مجموعہ ۱۹۷۱ء میں طبع ہوا تھا(۱) اس کا نام افکارِ جمیل ہے ۔ اس میں نعتیہ قصائد بھی موجود ہیں ۔ ان قصائد میں خلوص، تخیل کی پاکیزگی، زبان و بیان کی خوبی اور مضامین کی جدت کا احساس ہوتا ہے

صوفی فضل الدین منڈا کھیم کرنی نے بھی نعتیہ قصائد لکھے ہیں ۔ انہوں نے ان میں حضور کی ثنا بیان کرتے ہوئے غایت درجہ کے عقیدت و احترام کی فضا پیدا کی ۔ وہ حضورؐ کو برگزیدہ، غمخوار، خدا کی صنعت تاباں کا خوبروشاہکار کہتے ہیں وہ لکھتے ہیں

؎ عزیز جس کو نہیں اسوۂ رسولِ کریم + وہ بن گیا ہے جہالت کے راستے کا غبار (۲)

سرور سیارنپوری کے نعتیہ قصائد ملتے ہیں ان میں انہوں نے سراپائے رسول اور سیرتِ رسول کو خصوصی طور پر موضوع اظہار بنایا ہے ۔ حضورؐ کا عالی نقا، عارض، آنکھیں، گوشہ دہن، زبان مبارک، گفتار کے حوالے سے عمدہ اشعار لکھنے کے ساتھ ساتھ سرور نے ان کے عزم، ضرب توحید، جمالِ آگہی، حوالۂ علم، اخلاق وغیرہ پر بھی عقیدت میں ڈوبے انداز سے روشنی ڈالی ہے

پایا نہ کوئی بجز محمدؐ + تاریخ نے خوب دیکھا بھالا (۳)

حافظ لدھیانوی کہ جو ان دنوں فیصل آباد میں مقیم ہیں ۔ انہوں نے بھی نعتیہ قصائد لکھے ہیں (۴) ان کے ایک نعتیہ قصیدہ کا مطلع ہے

؎ زباں غزل کی ہے اور نعت سرورِ عالم + کہ دل کا حسن ازل سے ہے رشتۂ محکم

اس میں انہوں نے غزل کی زبان استعمال کرنے کا اعتراف کیا ہے ۔ یہ خطابیہ قصیدہ ہے اور اس میں (۵) دعائیہ انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ انہوں نے حضور کے لیے خواجۂ کونین، رحمتِ دو جہاں، اسرارِ کائنات کا حرم، مدینے والا، محبوبِ کبریا کے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ لکھتے ہیں

؎ ہے اس کے در پہ نگوں سار نخوتِ شاہی + گدائے کوچۂ سرکار صاحبانِ حشم

بایں جلالت و سطوت بایں سریر و سپاہ + غلام شاہِ دو عالم ہیں خسروانِ عجم

---

(۱) افکارِ جمیل مطبوعہ لاہور (۲) قصیدہ نعتیہ ماہنامہ شام و سحر ص ۱۸ جولائی ۱۹۸۱
رسالہ شام و سحر نعت نمبر جنوری فروری ۱۹۸۱ ص ۹۹
(۳) سیارہ لاہور ستمبر ۱۹۸۱ ص ۲۳ نعتیہ قصیدہ از سرور سیارنپوری
(۴) دیکھیے سیارہ لاہور ستمبر ۱۹۸۱ (۵) اس قصیدہ کے آخر میں ایک دعائیہ شعر اور مطلع کی صورت ہے جس کے ردیف و قوافی الگ ہیں وہ یہ ہے ؎ حضورؐ رحمتِ باری میں التجا کیجے + حضور امت کے حق کے لیے دعا کیجے

اصغر حسین نظیر لودھیانوی نے نعتیہ قصائد میں قومی، ملکی، دینی اور سیاسی مسائل کو بھی شامل کیا ہے۔ انہوں نے بھی محسن کاکوروی کے لامیہ قصیدہ کو نمونہ بنا کر قصیدہ لکھا اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے "اس کے لکھنے کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ جناب محسن نے مذکورہ قصیدے کی تشبیب میں ہندوستان کی برسات کا سماں دکھایا ہے اس میں ہندوؤں کے مذہبی شعار اور ہندوستانی شہروں اور ہندوانہ رسوم کا تذکرہ ہے۔ یہ انداز بیان پاکستانی مسلمانوں کے لئے بے معنی ہو گیا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اسی زمین میں نعتیہ قصیدہ کہا جس کی تشبیب میں پاکستانی برسات کا سماں دکھایا گیا ہے۔ اور پاکستانی شہروں اور مسلمانوں کے دینی شعار کا تذکرہ کیا ہے"(۲)

نظیر لودھیانوی کی رائے سے جزوی اتفاق ممکن ہے تاہم محسن کاکوروی کے قصیدے کی اہمیت مسلمہ ہے نظیر نے اپنے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب میں کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، کوئٹہ، لنڈی کوتل، رود جہلم، کوہ مری، محمورہ ملتان، ستلج، مقبرہ جہانگیر اور شالامار باغ وغیرہ کا تذکرہ کر کے اس میں مقامی رنگ پیدا کیا ہے

آغا سائل کاشمیری نے نظیر لودھیانوی کی شان میں قصیدہ نما نظم لکھی ہے(۳) ۲۲ اشعار کی ہے

محمد عمر جنوں ضامن علی جلال کے شاگرد تھے ان کے دیوان میں غیر مذہبی قصائد موجود ہیں ان میں سے ایک برادر زادہ شیخ حسین میاں شیخ بدر الدین کی رسم ختنہ پر ہے ایک شیخ حسین میاں کی توصیف میں عید الفطر کے جشن کے حوالے سے ہے اور ایک شیخ بدر الدین کی سالگرہ کے حوالے سے ہے ان کے اولین مصرعے بالترتیب یوں ہیں

ہاں خامۂ شوق ذرا اسکو حیا کے تو چلن / ہو واہ کیا فصل بہار نے کھلایا گلشن / آ سے کنارِ جو میں سفر میں تھا ایک دن بیٹھا (۴)

عزیز الرحمن کا تعلق بہاولپور سے ہے ان کے قصائد ملتے ہیں (۵)

بہاولپور ہی کے عبد الحق شوق کے بارے میں لکھا گیا ہے اگر کوئی قصیدہ کہا تو وہ محض رواشتی قافیہ پیمائی ہے (۶)

ہیں خالد احمد (۷) عبد اللہ خاور، خالد برقی، عابد نظامی اور علامہ نصیر الدین نصیر کے نعتیہ قصائد بھی دستیاب ہو گئے ہیں۔ عبد العزیز خالد کے مجموعہ فارقلیط میں ۱۲۸۳ اشعار کا خوشرِ مذہبی قصیدہ ...... طبع ہوا ہے (۸) حفیظ تائب کا قصیدہ آیۂ نور بھی حمد کے کی چیز ہے یہ ان کے نعتیہ شعری مجموعہ کا حصہ ہے۔ اس میں وہ حضور ﷺ کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں

---

(۲) شام و سحر نعت نمبر ص ۹۷ لاہور (جنوری فروری ۱۹۸۱) (۳) ماہنامہ شام و سحر نومبر ۱۹۷۸ ص ۹

(۴) دیوان خیال جاناں از محمد عمر جنوں مطبع مفید عام آگرہ (۵) ریاست بہاولپور میں اردو لٹریچر کی تاریخ از مولانا عزیز الرحمن بحوالہ دبستان بہاولپور ادارہ مطبوعات آفتاب مشرق بہاولپور ۱۹۶۶ ص ۷ (۶) ایضاً

(۷) تشبیب مطبوعہ لاہور (۸) فارقلیط مطبوعہ ایوان پبلشرز کراچی ۱۹۶۸ (۹) صلو علیہ و آلہ از حفیظ تائب سیرت مشن پاکستان ۱۹۷۸

عبدالعزیز خالد کی شان میں خیال امروہوی اور قمر صدیقی وغیرہ کے قصائد بھی ملتے ہیں

؎ مخزن الافکار، ناموس لسان عبقری + مرجع الہام و چرخ ہفتم دیدہ وری [خیال امروہوی]

نیّر افق انسانیت کے اوج کا آئینہ دار + ہیں ترے اشعار تابندہ و درخشاں زرنگار [قمر صدیقی]

الیضاً ص ۳۱۲

عبدالعزیز خالد کی شان میں خیال امروہوی[1] اور قمر صدیقی[2] وغیرہ کے قصائد ملتے ہیں

؎ مخزن الافکار، قاموس لسان عبقری + مرجع الہام و چرخ ہفتم دیدہ وری [خیال امروہوی]

نیر افق انسانیت کے اوج کا آئینہ دار + ہیں ترے اشعار تابندہ و درخشاں زرنگار [قمر صدیقی]

---

(۱) ماہنامہ تحریریں عبدالعزیز خالد نمبر ص ۳۱ (۲) ایضاً ص ۳۳
مارچ اپریل ۱۹۷۵ء

ضمیمہ [چند اور قصائد نگار

محمد عبداللہ خنجر کا دیوان ۱۸۸۸/۱۸۸۹ میں کانپور سے شائع ہوا۔ خنجر اجمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کے دیوان میں ایک قصیدہ حمدیہ، ایک منقبت غوث الاعظمؒ، معین الدین چشتیؒ، خواجہ عبداللہ کو سالمی اور شاہ عبدالغنی کا ہے اور ایک شیخ لعل محمد کشمیری اور ایک اجمیر کی تعریف[1]

منشی ظہور حسن ۱۸۸۸ء میں زندہ تھے لکھنو کے رہنے والے تھے ان کا ایک قصیدہ کنور جنگ بہادر پسر درگا پرشاد مہر تعلقہ دار سندیلہ کی شان میں ہے۔ یہ ۱۷۴ اشعار کا ردیفیہ قصیدہ ہے[2]

درگا پرشاد سحر کے قصائد کا مجموعہ قصائد سحر کے نام سے ۱۸۸۸ء میں چھپا تھا اس میں ایک غزل اردو اور ایک ہندی کا قصیدہ ہے[3]
علاوہ ازیں انہوں نے بہاری لال صاحب مشتہر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا

عبداللہ بیگ سیوخش کا دیوان ۱۸۸۸/۱۸۸۹ میں چھپا اس میں قصائد ملتے ہیں[4]

میر طالب حسین خاک م [۱۸۹۰] سہارنپور کے ایک قصبہ چلکانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مہاراجہ شمشیر پرکاش والی ریاست سرمور ناہن کے مشیر خاص تھے۔ ان کے دیوان میں حمد، نعت، منقبت علی اور منقبت امام حسین کے قصائد ہیں[4]

فخر الدین حسین سخن ۱۸۲۰ء دہلی کے رہنے والے تھے ان کے دیوان میں شاہ قیام اصدق کی شان میں بھی قصیدہ ملتا ہے اور ایک حاکم ضلع لوئیس جیکسن کی شان میں۔[5] انہوں نے اپنی داستان سروش سخن کے آغاز میں بھی قیام اصدق چشتی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے[6] اس میں انہوں نے اپنے عقائد کا برملا اظہار کیا ہے وہ مسلک چشتیہ سے منسلک تھے

سلیمان خاں سلیم دہلوی نے راجہ راجندر سنگھ والی پٹیالہ کو اختیارات ملنے کی خوشی میں ایک قصیدہ کہا[7]

خدا بخش طالب ملتانی کے تین مجموعوں نیرنگ خوش بیانی ۱۸۹۱، حدائق نعت خوانی ۱۸۹۲/۱۸۹۴ اور چمن تواریخ ۱۸۹۳/۱۸۹۳ پر مشتمل کلیات میں ایک نعتیہ قصیدہ ملتا ہے[8] ۔ وہ شوق احسن نیوی کے شاگرد تھے

محمد جان حیرت الہ آبادی کا ایک قصیدہ حضرت غوث الاعظم کی شان میں ملتا ہے[9]

مینا بیگم منشی [م ۱۸۹۱] کے دیوان مطبوعہ ۱۸۹۳/۱۸۹۴ء میں ایک قصیدہ نواب مختار الملک بہادر کی مدح میں ہے[10]

منشی محمد انوار حسین تسلیم [م ۱۸۹۳] کے قصائد کا تذکرہ سید نور الحسن نے کیا ہے[11]

حمید الحق نفیس آرہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے دو قصائد ملتے ہیں ایک قصیدہ در مدح مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی اور دوسرا مذہبی قصیدہ بعنوان قصیدہ کہ بہ تعریف جلسہ مذاکرہ علمیہ آرہ در ۱۸۹۲ء ہے[12]

مرزا چھجو بیگ عاشق کا پورا نام محمد وثیق تھا وہ مرزا تسلیم کے تلامذہ میں سے تھے۔ ان کے دو قصائد کا تذکرہ حسرت موہانی نے کیا ہے پہلا قصیدہ مشتمل بر اظہار تباہی شہر و دیار و دعائے مراجعت اور دوسرا در مدح جنرل اعظم الدین خاں ہے ۱۸۸۹

حاجی منظل محمد حاتم [م ۱۸۹۶] کے کوٹری اور ٹھٹھری گاؤں کی تعریف میں اشعار ہیں[13]

سید محمد شاہ کے قصائد نعت ۱۸۹۶ء میں طبع ہوئے[14]

---

(۱) چمنستان نگہت ۱۳۰۶ھ مطبع نظامی کانپور (۲) بوستان اودھ ۱۳۰۶ھ از کنور درگا پرشاد مہر ص ۲۰ (۳) قصائد سحر مطبوعہ ۱۸۸۹ء، دیوان کرم ص ۲، ۱۷ / دیوان خنجر ص ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۱۷۱ / نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۱
(۴) دیوان مطبوعہ مطبع افسر دکن پریس حیدرآباد ۱۳۰۶ھ (۵) چراغ ایمان مطبوعہ ۱۳۰۶ھ سٹیٹ پریس ناہن ۱۸۲۷ میں ص ۱ تا ۱۸۱
خانہ کی مثنوی گل باغ ارم بھی چھپی۔ بحوالہ خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۴ (۵) دیوان سخن ۳۲-۴۵، ۴۴-۵ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۶
(۶) سروش سخن ص ۳ تا ۸ مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۷) رسالہ خیر خواہ عالم دہلی ۸ نومبر ۱۸۹۰
(۸) کلیات طالب ص ۱۹۵ نول کشور پریس لکھنؤ (۹) جواہر سخن جلد چہارم ص ۱۲۸ (۱۰) گلزار فصاحت از مینا بیگم منشی ۱۸۹۴ مطبوعہ مطبع یوسفی دہلی ۱۳۱۱ھ
(۱۱) ظہور کلیم ص ۲۱ مفید عام پریس آگرہ ۱۲۹۸ھ (۱۲) رسالہ اردو معلی نومبر ۱۹۱۰ (۱۳) سندھ میں اردو شاعری ص ۲۰۷ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ
(۱۴) قصائد اور الحکایت عشق نبی ۱۳۱۲ھ نظامی پریس حیدرآباد
مجلس ترقی ادب لاہور طبع دوم ۱۹۷۱

منشی اطہر علی اطہر [پ ۱۸۴۶ء م ۱۹۰۶ء] کا تعلق کاکوری سے تھا وہ منشی رضا حیدر کاکوروی کے شاگرد تھے۔ ان کے نعتیہ قصائد ملتے ہیں (۱)

محمد حبیب علی خاں حیدر [پ ۱۸۴۹ء] رامپور سے تعلق تھا ان کی مطبوعہ کہانی جادۂ تسخیر میں ایک قصیدہ تعلی موجود ہے (۲)

شیخ مدار بخش جنگلی کی مثنوی گلزار وارث میرٹھ سے چھپی اسمیں دو قصائد موجود ہیں ایک نعتیہ اور ایک عاشقیہ (۳)

غلام دستگیر قادری کے منقبت کے قصائد ۱۸۹۸ء میں حیدر آباد سے چھپے (۴)

گردھاری پرشاد باقی م ۱۹۰۰ء کے قصائد، قصائد باقی کا تذکرہ خمخانۂ جاوید اور تذکرہ شعرائے دکن میں ہے (۵)

نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں ان کا اردو دیوان لعابۂ باقی کے نام سے معروف ہے کلام خوب صورت سلیس شستہ اور برجستہ ہے (۶)

پنڈت سورج بھان میکش کے دیوان خرابات میکش مطبوعہ ۱۸۹۷ء/۱۸۹۸ میں تین اور جوش میکش (۷) میں چار قصائد (۸) دستیاب ہیں ان میں سے تین کے ممدوح میر امداد علی شاہ قلندری دو کے میر محبوب علی آصف جاہ ایک کے مہاراجہ کشن پرشاد اور ایک کے نواب مقبول جنگ ہیں

شاہ امین الدین تیور م ۱۹۰۰/۱۹۰۱ نے ایک قصیدہ جشن جوبلی ملکہ وکٹوریہ کے لئے لکھا۔ ان کا تعلق الہ آباد سے تھا (۹)

عبدالرشید رشید فاروقی شیفتہ حسین کاظم کے شاگرد تھے انہوں نے میر محبوب علی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا (۱۰)

منشی پیارے لال رونق راسخ دہلوی کے شاگرد تھے ان کے دیوان میں ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی اور نواب حامد علی خاں والیٔ رامپور کے حوالے سے قصائد ملتے ہیں۔ یہ دیوان ۱۹۰۲/۱۹۰۳ میں مکمل ہوا (۱۱)

مولوی محمد حبیب اللہ کا ایک قصیدہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے حوالے سے لکھا گیا ہے (۱۲)

مولوی ابوالفضل محمد کرم الدین دبیر ضلع جہلم کی تحصیل چکوال کے گاؤں بھیں سے تعلق رکھتے تھے ایڈورڈ ہفتم کی شان میں ان کا قصیدہ بعنوان "قصیدہ در تہنیت جشن تاجپوشی ملک معظم شہنشاہ ہند و انگلینڈ ایڈورڈ ہفتم دام اقبالہٗ" ملتا ہے (۱۳)

امین الدین نے شاہ اللہ بخش چشتی کی وفات پر قصیدہ لکھا (۱۴) اس کا نام قصیدہ عظمی ہے اور محمد سعید نقشبندی نے ان کی وفات پر آہنگ غم کے نام سے قصیدہ کہا یہ ۱۹۰۲ء میں چھپے (۱۵)

میر مہدی مجروح۔ غالب کے شاگرد تھے ان کا دیوان ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا اس میں ایک قصیدہ نعت و ایک منقبت ہے دو راجہ شیودان سنگھ والیٔ الور، ایک نواب حامد علی خاں اور ایک ممدوح الصدر کی شان میں ہے [مظہر معانی ص ۱۷ تا ۳۲] (۱۶)

محمد اسماعیل اسلم کھنوی م ۱۹۰۲ء کے بارے میں معلوم ہوا ہے انہوں نے دس عدد قصائد منقبت لکھے لیکن کلام ضائع ہو گیا (۱۷)

سید ظہور مہدی اثیم [م ۱۹۰۲] کا ایک نعتیہ قصیدہ صنعت ذوالسانین میں ملتا ہے ایک مصرعہ اردو کا اور دوسرا فارسی کا ہے (۱۸)

نجم الحسنین نجم [م ۱۹۰۲] مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے ان کے قصائد کا تذکرہ کیا جاتا ہے (۱۹)

---

(۱) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۳۲ (۲) انتخاب یادگار ص ۱۲۱ (۳) گلزار وارث مطبوعہ نامی پریس میرٹھ ۱۸۹۸ (۴) مطبوعہ فیض الکریم پریس حیدر آباد ۱۳۱۶ھ (۵) خمخانہ جاوید ص جلد اول ۴۳۰، تذکرہ شعرائے دکن ص ۳۱۲ جلد اول (۶) دکن میں اردو ص ۹۳ (۷) خرابات میکش مطبوعہ مطبع آصفیہ ۱۸۹۸ء ص ۲۵۱ (۸) جوش میکش مطبع معقید عام دکن ۱۸۹۹ ص ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۳ (۹) جواہر سخن جلد چہارم ص ۲۱۰ (۱۰) رسالہ جلوۂ محبوب ۱۹۰۱ حیدر آباد (ایڈیٹر غلام محمد انور) (۱۱) رونق سخن ۱۲۰ ص ۲۰۸، ۲۱۲، ۲۱۳ مطبوعہ امپریل بک ڈپو دہلی (۱۲) دبدبۂ آصفیہ نمبر ۱۱ (۱۳) رسالہ پروانہ میرٹھ جون ۱۹۰۲ء ص ۲۱ (۱۴) (۱۵) قصیدہ عظمی و آہنگ غم مطبع دارالسلام دہلی ۱۹۰۲ء (۱۶) مظہر معانی (دیوان مجروح) مطبع شوکت حمید کا دہلی ۱۸۹۹ (۱۷) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۳۷ (۱۸) روضۃ الصادقین ص ۱۰-۱۲ مطبع عین الفیوض جرول (۱۹) جانے پہچانے اور جنہیں کوئی نہیں جانتا ص ۵۹ مصنفہ انور صابری یونین پریس دہلی

اثیم نے ایک قصیدہ حضرت علی کی شان میں بھی لکھا
روضہ رضوان جلد ۳ ص ۱۰۵

بنواری لال شعلہ [م ۱۹۰۳] علی گڑھ کے رہنے والے تھے مرزا تفتہ اور بے جگر کے شاگرد تھے ان کے دیوان میں تین قصائد ملتے ہیں [1]

میر سلطان عاشق [م ۱۸۹۱ / ۱۸۹۲] غالب اور قادر بخش صابر کے شاگرد تھے - ان کے دیوان میں حسام الملک خانخاناں کی شان میں تین نواب فخر الملک کی مدح میں دو بہرام جنگ کی تعریف میں دو اور امیر اکبر آسمان جاہ کی شان میں ایک قصیدہ ہے [2]

[illegible]

مولوی محمد واصل، واصل [م ۱۹۰۵] رشک لکھنوی کے شاگرد تھے ۱۸۷۵ [4] میں حیدر آباد دکن گئے۔ ان کے قصائد اور شاعری کے لطف بیان، تخیل کی بلندی، بیان کی نزاکت اور معنی کی لطافت کی داد نصیر الدین ہاشمی نے دی ہے [5]

غلام محمد شاہ گدا [م ۱۹۰۲ / ۱۹۰۵] کا تعلق حیدر آباد سندھ سے ہے انہوں نے میر شاہنواز خاں، میر خاں جام لس بیلہ، میر بہرام خاں، میر عبد الحسین سانگی اور میر اللہ بخش کو ممدوح بنایا [6]

احمد تقی علی بہادر ثریا، ثریا قدر واجد علی شاہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے قصائد کا ذکر لالہ سری رام نے کیا ہے [7]

وقار الدین اعظم شرف [پ ۱۸۶۸] صاحبزادہ مشرف یار خاں والئی جاورہ کے عزیز تھے - ان کے قصائد ملتے ہیں [8]

محمد آثم [۱۹۰۵ میں زندہ] اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے ان کے غیر مطبوعہ دیوان میں ایک منقبت علی اور ایک ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ ہے [9]

غلام مصطفیٰ ذہین مخزن اور ادیب میں چھپتے رہے ہیں جارج پنجم کی مدح میں ان کا قصیدہ ملتا ہے [10]

بلدیو کشن خورشید لاہور میں انسپکٹر چونگی تھے ان کے ایک قصیدہ جشن کا حوالہ سری رام نے دیا ہے [11]

مرزا سلطان خاور، خاور گورگانی خاندان بہادر شاہ ظفر کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے قصائد نظام خلد آشیاں کی شان میں ہیں [12]

مولوی عنایت احمد حیرت کا بدایوں سے تعلق تھا دلاور علی مذاق بدایونی کے شاگرد تھے ان کے دو ایک قصائد کی خبر ہے [13]

محمود اختر رضوان مراد آباد کے رئیس اعظم تھے۔ ان کے قصائد کی خبر لالہ سری رام نے مہیا کی ہے [14]

منشی محب الدین احمد نو مسلم تھے لالہ سری رام نے انہیں چمن لال کا بیٹا بتایا ہے اور قصیدے میں ان کی مہارت کا ذکر کیا ہے [15]

لالہ بانکے لال داس اودھ پنچ کے ظریف نامہ نگار تھے ان کی لکھی ہوئی ایک قصیدہ چی ملتی ہے [16] یہ قصیدہ چی چندہ کی فرمائش میں ہے

سید محمود آزاد ۱۹۰۸ میں زندہ شاہزادہ ویلز کی کلکتہ آمد پر ان کے ایک زوردار قصیدے کی اطلاع ملتی ہے [17]

مرزا احمد علی کوکب بیسویں صدی کے آغاز کے لکھنوی شاعر ہیں۔ نواب سید معظم حسین [18] رئیس شائستہ آباد کی شان میں انہوں نے قصیدہ لکھا

اکبر داناپوری [م ۱۹۰۸] پورا نام سید شاہ محمد اکبر ابو العلائی - وحید اللہ آبادی کے شاگرد نواب کلب علی خاں بہادر کی شان میں ان کا قصیدہ شمع طور ملتا ہے [19]

---

(۱) بحوالہ اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ ص ۲۸۶ / ۲۹۴ از گنپت سہائے سریواستو کتابستان الہ آباد ۱۹۶۹ (۲) دیوان عاشق ص ۲۳ تا ۱۶۸ مطبع انوار الاسلام حیدر آباد دکن ۱۳۱۹ھ (۳) [illegible] کلیات شعلہ ص ۸۱ تا ۹۶ مطبع فیض عام علی گڑھ ۱۹۱۲ (۴) تذکرہ شعرائے دکن جلد دوم ص ۱۱۶۵

(۵) دکن میں اردو ص ۱۸۱ (۶) سندھ میں اردو شاعری ص ۱۸۲ تا ۱۸۸ (۷) خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۱۸۹ (۸) خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۵۴۹

(۹) بحوالہ نغمات نگاران اتر پردیش ص ۴۷ (۱۰) خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۲۹۲ / ۲۹۵ (۱۱) خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۸۷ (۱۲) خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۱۱

(۱۳) خمخانہ جاوید جلد دوم ص ۹۴ (۱۴) خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۴۵۶ (۱۵) خمخانہ جاوید جلد دوم (۱۶) تذکرہ خندہ گل ص ۱۲۰

(۱۷) خمخانہ جاوید جلد اول ص ۴۶-۴۷ (۱۸) رسالہ صبح امید اگست ۱۹۰۸ ایڈیٹر پنڈت برج نرائن چکبست (۱۹) تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ اول ص ۸۳

امداد علی عشیر [م ۱۹۰۹] لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد میں رہے۔ ان کے قصائد کمیاب ہیں یہ قصائد مرتضوی کے نام سے چھپے ان کے[1]
قصائد کی تعداد ۲۵ بتائی جاتی ہے۔ شائق الہ آبادی باندہ کے ضلع سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ان کے کلیات میں تہنیت شادی ناظر علی کے عنوان سے ایک
اردو قصیدہ ملتا ہے علاوہ ازیں فارسی قصائد جج جے لوتوش اور جی جی برٹ کی شان میں بھی دستیاب ہیں[2]

محمد حیات بخش رسا رامپور دربار کے شاعر تھے۔ داغ کے شاگرد ان کے کلام میں قصائد ملتے ہیں۔ ایک قصیدہ
نواب حامد علی والئی رامپور کی شان میں ہے[3]

عبدالحمید حمید میرٹھی کا ایک قصیدہ جارج پنجم کی شاہجہان آباد میں آمد کے خیر مقدم میں موجود ہے[4]

منشی نبی بخش نایاب میونسپل کمشنر قصبہ نکودر ضلع جالندھر پنجاب تھے ان کے دیوان میں چار نعتیہ قصائد ملتے ہیں[5]

منشی نذر محمد نذر کے کلام میں گلدستہ شکریہ لفٹیننٹ گورنر پنجاب، اعلان شاہی، الٰہی عشرہ کا اور تہنیت تاجپوشی پر اشعار ملتے ہیں[6]

منشی سید جمیل احمد جمیل [پ ۱۸۵۹] منیر شکوہ آبادی، تسلیم لکھنوی اور صبا کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بے شمار قصائد[7]
لکھے۔ ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ بھوپال میں گزرا۔ رئیسوں اور والیانِ ریاست کی مدح میں انہیں مہارت تھی

مولوی محمد فضل رب آگرہ کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور مہتمم بندوبست بھوپال بھی۔ ان کا ایک قصیدہ نواب
سلطان جہان بیگم در تہنیت عید الفطر[8] اور ایک وائسرائے لارڈ منٹو کے دورہ بھوپال کے موقع پر دستیاب ہے[9]

حافظ عالمگیر خاں کیف ٹونک کے دیوان مطبوعہ ۱۹۱۵ء میں نعتیہ قصیدہ ملتا ہے[10]

سید احمد دہلوی مصنف فرہنگِ آصفیہ نے ایڈورڈ ہفتم کی شان میں اپنے قصیدے کی قبولیت کا تذکرہ کیا ہے[11]

عرش گیاوی، تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے ان کے دوسرے دیوان نظم نونگار میں قصائد موجود ہیں[12]

اسی دور میں نواب دکن میر محبوب علی کی شان میں متعدد شعرا نے قصائد لکھے ان میں محمد قطب الدین علی تسلی (شاگرد حضرت
علوی تھانوی[13]) عبداللہ خاں جوہر (مالک اخبار البلیغ بمبئی)[14]، نواب جعفر حسین جعفر[15]، عبداللہ حسینی حریف[16]،
سلطان احمد سلطان[17]، محمد نظام الدین سلیم (شاگرد برہان الدین نگیں)[18] نظیر حسین سخا (مدرسہ فوقانیہ چادر گھاٹ حیدر
آباد کے فارسی استاد)[19] فیض الحسن سلیم سہسوانی (شاگرد امیر لکھنوی)[20] خواجہ پیر سلام (شاگرد شمشاد لکھنوی)[21] محمد
برہان الدین نگیں[22]، میر برکت علی نجیب (دو قصائد)[23] محمد وزیر الدین فیر[24]، محمد حبیب اللہ (محافظ دفتر معتمد)[25] نواب علی کامل[26]
محمد قدرت کریم (شاگرد حکیم عاشق حسین ہاتف)[27] قطب الدین قادری قطبی (شاگرد نگیں)[28] محمد عبیداللہ خاں فروغ[29]
(شاگرد معین الدین چشتی سلام) علی الدین احمد (نبیرہ حاجی محمد ابراہیم خانساماں حضور کی اتالیق تحصیلداری قصبہ ضلع ورنگل)[30]
مرزا عبدالرحمن بیگ شیدا[31] اور محمد عبداللہ خاں ضیغم (مرتب گلدستہ جشن آصفیہ)[32] کے عمدہ قصائد دستیاب ہیں

---

(۱) دلبستانِ دبیر ص ۳۷۲ (۲) کلیات شائق ص ۵۶ و ص ۱۰۰ ص بعد (۳) کلام رسا ص ۸۹ مطبوعہ الناظر پریس اگست ۱۹۲۲ء، الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۲۷ء
(۴) رسالہ تمدن دسمبر ۱۹۱۱ تمدن پریس دہلی (۵) خمخانۂ عشق (دیوان نایاب) ص ۱۶۰ تا ۱۷۷ مطبع محمد دار لتسر ۱۹۱۱ء (۶) کلام نذر حمیدیہ ص ۱۵ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۱
(۷) خمخانۂ جاوید جلد دوم از سری رام (۸) رسالہ خلاصہ مرتبہ عبدالسلام مطبع فیض عام علی گڑھ دسمبر ۱۹۰۹ جلد ۱ نمبر ۱ (۹) رسالہ خلاصہ جنوری ۱۹۱۰ء
(۱۰) وسیلہ شفاعت (دیوان کیف) ۱۳۲۸ھ مطبع انوار محمدی آگرہ ص ۲ (۱۱) رسالہ زمانہ جون ۱۹۱۰ (۱۲) مضمون شاگرد تسلیم عرش گیاوی
از حسرت موہانی اردوئے معلیٰ دسمبر ۱۹۱۱ (۱۳) تا (۳۲) ملاحظہ ہو جشن گلدستہ آصفیہ ص ۱ تا ۱۰۱ بابت ۱۳۱۵ھ
مطبع فخر یہ نظامیہ حیدرآباد دکن

ان کے علاوہ مرزا غلام عباس سعید (صیغہ دار محکمہ مال گزاری دکن) (۱)، بے کس جبل پوری [م ۱۹۲۱] (۲) مولوی محمد اقبال حسین عاشق (۳) (معتمد ریاست بیکانیر) راۓ مناکر پرشاد شوق (۴) سید قادر پاشا ارمان (۵) میر وزیر علی وزیر (۶) اور میر شبیر حسین سیا (۷) (شاگرد سخی) وغیرہ نے بھی میر محبوب علی خاں نظام دکن کی شان میں قصائد لکھے

منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی [م ۱۹۱۳] کی کتاب لمحات افق میں ان کے تین قصائد طبع ہوئے ہیں دو میر محبوب علی خاں کی شان میں ہیں اور ایک مہاراجہ کشن پرشاد (وزیر اعظم دکن) کو عطائے خطاب "راجۂ راجگان" کے حوالے سے لکھا گیا ہے (۸)۔ افق کا ایک قصیدہ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں بھی ہے۔ برہان کے اخبار نظم اخبار میں شائع ہوا

نوبت راۓ نظر لکھنوی [م ۱۹۲۲] کے تین قصائد کا تذکرہ کیا جاتا ہے ایک نظام دکن میر محبوب علی خاں کی شان میں ایک حامد علی خاں بیرسٹر کی تعریف میں اور ایک قصیدہ بہاریہ نظمیہ کوائف سے معمور ہے (۹)

منشی غلام محمد خادم ۱۸۶۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ۱۸۸۸ء میں دکن پہنچے وہاں انہوں نے نظام حیدر آباد کی شان میں قصیدہ پڑھا جس پر انہیں تین سو روپیہ کا نذرانہ پیش ہوا (۱۰)

کلیم نامی شاعر کا ایک قصیدہ جارج پنجم کی جشن تاجپوشی کے حوالے سے چھپا ہے (۱۱)

نادر علی نادر کاکوروی کا قصیدہ دربار شاہنشاہی بھی جارج پنجم ہی کے حوالے سے ہے (۱۲)

برجموہن دتاتریہ کیفی کے قصائد رسائل میں بھی چھپے۔ ایک ان کی کتاب میں بھی دستیاب ہے (۱۳)

عبدالکریم صبر دہلوی نے دربار تاجپوشی دہلی کے حالات ایک طویل قصیدے کی صورت قلمبند کیے ہیں اس میں انہوں نے جو تفصیلات مہیا کی ہیں ان کا مطالعہ شاعر کی قوت اظہار پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اس کی تشبیب میں انہوں نے مختلف اسلامی حکومتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد ہندوستان میں فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کی آمد کو موضوع بنایا ہے۔ نامور اشخاص کے حالات حاشیوں میں دیے ہیں جس سے یہ قصیدہ ایک مستقل اہمیت کی چیز بن گیا ہے (۱۴)

ڈپٹی نذیر احمد کے مجموعہ میں تین عرب قصائد ملتے ہیں — [م ۱۹۱۱] نذیر احمد نے ایک قصیدہ مدرسۃ العلوم کی تعلیمی کانفرنس کے موقعہ پر بھی پڑھا۔ اس کا نام قصیدہ املائیہ (۱۵) [رسالہ ۱۶ مارچ ۱۹۰۲] اردو میں گورنر پنجاب کے روبرو منعقد ہوا

شرف النساء بیگم متوفی ماقبل ۱۹۱۲ء ٹیپو سلطان کے سپہ سالار میر میراں سید اشرف کی پوتی تھیں ان کے کلام کا ایک مخطوطہ دیوان شرف کتب خانہ ادارہ ادبیات حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے اس میں قصائد (نعتیہ) ہیں (۱۶)

---

(۱) رسالہ جلوہ محبوب ۱۳۱۹ھ (۲) دیوان بے کس جبلپوری مطبوعہ الکتاب کراچی مرتبہ راحت مسعود (۳) افکار عاشق موسوم بہ بشارت نظام [تلاوت غالب میں عاشق کے قصیدہ مناظرہ زلف و رخ کا تذکرہ ہے، ص ۲۲۵] دیوان عاشق ص ۳۲ ، ۷ مطبوعہ رائے بہادر پرشاد دہلی (۴) رسالہ دبدبہ آصفیہ ۹ ستمبر ۱۹۰۷ء (۵) رسالہ تزک عثمانیہ عثمان نمبر جلد ۲ عدد ۱۳۳۳ھ (۶) قصیدہ تہنیت میر محبوب علی رین پریس کلکتہ ۱۹۱۱ء (۷) رسالہ جلوہ محبوب ۱۳۱۹ھ
(۸) لمحات افق مرتبہ بشیشر پرشاد منور لکھنوی ص ۷ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی (۹) اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعرا کا حصہ ص ۱۸۸ (۱۰) زمانہ کانپور اپریل ۱۹۰۹ (۱۱) کشمیر میں اردو از حبیب کیفوی ص ۲۹۷ مرکزی اردو بورڈ
(۱۱) رسالہ تمدن دسمبر ۱۹۱۱ (۱۲) ایضاً (۱۳) رسالہ ادیب الہ آباد ص ۱۰۸ جنوری ۱۹۱۲ قصیدہ دعائیہ واردات کیفی ص ۵۸ لکھنو
(۱۴) تبصرہ رفیع دربار از مولوی محمد عبدالکریم ص ۹۵ رسالہ ادیب اگست ۱۹۱۲ (۱۵) نظم بے نظیر مطبوعہ مفید عام اسٹیم پریس ۱۹۱۱
(۱۶) اردو مخطوطات ص ۳۰

عبدالکریم خاں جبر دہلوی کا قصیدہ "فرخ دربار" تاریخی اہمیت کا حامل ہے ۔ یہ مطبع نظامی دکن سے شائع ہوا تھا۔ جارج پنجم کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ اس میں ہندوستان کے تاریخی حالات بیان ہوئے ہیں یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کبھی ہوئی تھی یہیں پر حکومت غوری + یہیں پر ایبکوں کا بھی ہوا تھا گزار
پھر التمش کو ہوا دعویٔ شہنشاہی + پھر اس کے بعد ہی بلبن ہوا یہاں مختار
غیاث دین کا شہرہ تھا یہیں اے خلجی + غرض ہوا نہ کسی کو کسی طرح سے قرار
زبان خلق ہے فیروز شاہ کی مداح + بنائے مقبرہ و مسجد و پل و انہار
یہ ہند وہ ہے سکندر نے جس کو فتح کیا + یہیں پر آنے کا یونانیوں کو ہے اقرار
اسی کے حصے کا مالک ہے آج تک انگلینڈ + اسی زمین کے تھے اور بہت سے حصہ دار
یہیں کا شاہ ہوا بابر خجستہ بنیاد + یہیں پہ طالع تیموریہ ہوا بیدار

اس قصیدے میں ہمایوں، شیر شاہ سوری، اکبر، نورالدین جہانگیر، شہاب الدین، اورنگ زیب، ولنڈیزی، تھامس اسٹیونسن، ایسٹ انڈیا کمپنی، فرانس، پانڈی چری، کلائیو، ہیسٹنگز، کارنوالس، سرجان شور، ویلزلی لارڈ منٹو، لارڈ ولیم، چارلس، لارڈ آکلینڈ، لارڈ الینبرا، لارڈ ہارڈنگ، ڈلہوزی، واجد علی شاہ کیننگ، وکٹوریہ، لارنس، میو، لارڈ نارتھ بروک، لارڈ لٹن، ڈفرن، لارڈ رپن، لارڈ لینسڈون الگن اور کرزن وغیرہ کا تذکرہ اس کے کینوس کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ جبر لکھتے ہیں

؎ تھے یہیں لعل و گوہر ذوق و غالب و مومن + ظہیر و شیفتہ و داغ و منیر و بیدار

ان شاعروں کے تذکرے کے ساتھ ہی نظام دکن، والیٔ نیپال، مہاراجہ آف گائکوار، مہاراجہ میسور مہاراجہ کشمیر، والیٔ جے پور، مہاراجہ کپورتھلہ، والیٔ الور، مہاراجہ جاورا، ٹونک و جھالاوار، والیٔ فرید کوٹ، سکیت، والیٔ پٹیالہ، نواب رامپور، راجہ جیند و نابھہ اور راجواڑوں کی تعریف میں بھی اشعار لکھے گئے ہیں ۔ آخر میں جبر نے مسلم یونیورسٹی کے لیے اپیل کی ہے

پنڈت امرناتھ ساحر ۱۸۶۳ میں بریلی میں پیدا ہوئے جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے (۱)

صادق حسین عنایر کا نعتیہ مقصدہ ۱۹۱۳ میں چھپا (۲) یہ ان کے خلوص دل اور عقیدت مذہبی کا آئینہ دار ہے (۲)
ان کے قصائد نعتیہ کا مجموعہ ۱۹۱۱ میں شاہجہانپور سے چھپا

محمد عمر وفا کے مدحیہ و نعتیہ قصائد کا تفصیلی تذکرہ مجلہ عثمانیہ میں ہے (۳)

لطیف شمال احمد بلیار کا تعلق موضع ارنپور ضلع رائچور سے تھا ان کے مطبوعہ دیوان میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، جناب خاتون جنتؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ، حضورؐ، پیر دستگیرؒ خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ نصیرالدین چراغ دہلویؒ، حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ، شاہ قادر (ولی گنج ناگپور شریف)، حضرت شمس عالم حسینیؒ و پیر قابلؒ (ولی شہر رائچور)، خواجہ گوری بندہؒ (ارنپور) حضرت شاہ سبز (ولی مقام مانوی) شیخ شاہ (ولی مقام بلارک) حضرت گلشن (ولی آگرہ) حضرت دولت (ولی مقام گداول)، سید درویش علی (مقام درور) حضرت ولی اللہ (مقام آرگدا)، حضرت سید شاہ علی (مقام عالمپور) کے قصائد (۴) کے علاوہ نظام الملک دکن میر عثمان کی مدح بھی ہے۔

یہ قصائد بلیار کے عقائد و عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ انہیں انہوں نے گلدستہ تعریف اور پھولوں کا ہار بھی کہا ہے

(۵) اخگر اجیگری کا ایک مقصدہ نظم دسمبر ۱۹۱۵ میں چھپا تھا اسکا عنوان تھا میر عثمان علی خاں کی شبیہ مبارک دیکھ کر

بشن نرائن در ابر [م ۱۹۱۶] کا ایک مقصدہ لکھنو کے قومی شاعر شیو نرائن بہار کی مدح میں ملتا ہے (۶)
یہ خطابیہ مقصدہ ہے اور جدید نظم کے اصلاحی رجحانات سے مملو۔

کرامت اللہ خاں گستاخ رامپوری [م ۱۹۱۶] کے دیوان میں قصائد دستیاب ہیں (۷)

علی جعفر ذکا [م ۱۹۱۸] اعظم گڑھ سے متعلق تھے ان کا مقصدہ مدح حضرت علی اور قصیدہ غدیر (۹) خاصے مشہور ہیں۔ مقصدہ غدیر میں انہوں نے شاعرانہ زور طبیعت سے کام لے کر مشکل قوافی (تفریح، تسبیح) وغیرہ کو بہ آسانی استعمال کیا ہے۔

حکیم شاہ احتشام الدین حیدر [پ $\frac{۱۸۶۵}{۱۸۶۶}$] پٹنہ میں پیدا ہوئے ان کے اردو قصائد کا ذکر ملتا ہے (۱۰)

مولوی سعیدالدین سعید عثمانی [$\frac{۱۹۱۷}{۱۸}$ میں زندہ تھے] بنارس کے باشندے تھے فارسی اور اردو قصائد لکھتے تھے (۱۱)

(۱۲) نواب سید احمد علی خاں بہادر قیصر کا دیوان ۱۹۱۸ میں طبع ہوا اس میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے اور ایک نواب بھوپال کی شان میں
نعتیہ قصیدہ بہاریہ ہے اور نواب بھوپال کی شان میں ان کے قصیدے پر فرمائشی قصیدہ کے الفاظ درج ہیں

---

(۱) دور جدید کے چند منتخب ہندو شعرا از عبدالشکور کتب خانہ دانش محل لکھنو (۲) رسالہ نزہت عثمانیہ ۱۳۴۲ھ جلد نمبر ۱ نمبر ۳۰ ص ۲۵ تا ۳۴ و قصائد نعتیہ ص ۲۲ تا ۱۲۲ کانپور ۱۹۱۲

(۳) مجلہ عثمانیہ جلد ۱۱ شمارہ ۱، ۲ ص ۱۸۷ تا ۲۱۰ (۴) دیوان بلیار مطبوعہ رزاقی مشین پریس حیدرآباد دکن مطبوعہ غالباً ۱۳۵۱ھ (۵) رسالہ ذخیرہ دسمبر ۱۹۱۵

(۶) بحوالہ قصائد نگاران از پردیسی ص ۳۶۴ (۷) مضمون گستاخ رامپوری از حسرت موہانی اپریل ۱۹۲۵ رسالہ اردوئے معلی..

(۹) قصائد نگاران از پردیسی ص ۱۳۶ تا ۱۳۸ (۱۰) مضمون جوش منیری از رخشاں ابدالی عظیم آبادی حاشیہ قومی زبان ۲۷ ستمبر ۱۹۸۸ (۱۱) سخنوران بنارس ص $\frac{۲۹۵}{۲۹۷}$، خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۲۱م (۱۲) تاریخ سخن مطبوعہ نول کشور لکھنو ۱۹۱۸ ص ۱۰ و ۹۳
علاوہ ازیں یادگار قیصر میں ان کے دو منقبتی قصائد شامل ہیں ص ۵۹ و ۶۳
یادگار قیصر اودھ احمدی پریس لکھنو س ن

محمد شمس الدین حمزہ [م ۱۹۱۸/۱۹۱۹] قند کھار ضلع ناندیڑ میں پیدا ہوئے۔ ان کے قصائد اپنے اعمال پر نوحے بھی ہیں اور بے ثباتی دنیا کے موضوع پر لکھی ہوئی عمدہ نظمیں بھی (۱)۔ ان قصائد میں حمزہ نے نازو نیاز کے معاملات، سوز و گداز، جذبہ شوق اور بے قراری کے کوائف کو خوش اسلوبی سے سمویا ہے ان کے ہاں لفظوں کی صوتیت کا استعمال بھی عمدہ ہے۔ ان کا ایک قصیدہ بحر طویل میں بھی ہے

اثر مارہروی [م ۱۹۱۹] احسن مارہروی کے عزیز تھے۔ ان کے دیوان میں رئیس بھیکم پور کی شان میں ایک قصیدہ ملتا ہے۔ ان کا ایک اور قصیدہ سید امیر علی بلگرامی کی ۱۹۰۱ میں یوروپ سے واپسی کی تہنیت میں ہے (۲)

تلمذ علی خاں ولی [۱۹۱۹ میں حقبنگ میں پبلک پراسیکیوٹر تھے] ان کی کتاب میں جنگ عظیم اول میں برطانیہ کی فتح کے حوالے سے کچھ مدحیات ہیں (۳)

مرزا محمد اختر یار خاں شباب [۱۸۷۰ء میں گلشن آباد میں پیدا ہوئے] مرزا عبد الغنی کے شاگرد تھے ان کے ایک قصیدہ در مدح نواب سر امیر الدین خان پر جلال لکھنوی نے تعریفی کلمات لکھے ہیں (۴)

محمد اسماعیل خاں رنگیلے [م ۱۹۲۰] اپنے چچا محمد جعفر اثر کے شاگرد بھی تھے اور داغ کے بھی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنا ایک یادگار قصیدہ جو کھٹا گوا کر ایک مشاعرے میں شریک شعرا کو پیش کیا (۵)

محمد خلیل حیران ۱۸۷۰ میں پیدا ہوئے وہ قاضی عبد الجلیل جنون رئیس اعظم بریلی کے فرزند تھے انہوں نے اسماعیل منیر شکوہ آبادی کے قصیدے فریاد زندانی کی زمین میں طویل قصیدہ لکھا (۶)

جلال الدین توفیق [م ۱۹۲۰/۱۹۲۱] کے مجموعہ فانوس خیال میں قصائد ملتے ہیں (۷)

میاں محمد یوسف، یوسف علوی عرمیوں وڈل حیدری نے میر عبد الحسین خان سانگی کی تعریف کی ہے (۸)

نواب سر بلند جنگ بہادر کی بیگم سہاگن بیگم نے والئ ریاست بہادر کی تقریب صحت کے حوالے سے ایک قصیدہ پیش کیا۔ (۹)

علی عباد نیساں [م ۱۹۲۰] منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے قصائد لکھتے تھے (۱۰)

لقمان الدولہ بہادر دل [م ۱۹۲۱/۱۹۲۲] کا قصیدہ میر محبوب علی کی شان میں ملتا ہے (۱۱)

ممتاز الرحمن بدنام عبید اللہ شاہ کے نام سے معروف تھے ساکن اور سہ ضلع مراد آباد تھے ان کا دیوان ۱۹۲۱/۱۹۲۲ میں مکمل ہوا اسمیں قصائد، حمدیں بھی ہیں، نوحی قصائد بھی، انہوں نے اپنے احوال میں بھی قصیدہ لکھا ہے (۱۲) علاوہ ازیں جارج پنجم اور ہارڈنگ کی مدح کے حوالے سے سلطنت برطانیہ کی مدح بھی قصائد کی شکل میں کی ہے۔ ان کے دیوان میں ص ۲۲۹ کے بعد اور بھی قصائد موجود ہیں

---

(۱) چمنستان حمزہ (دیوان حمزہ) ص ۳۵ مطبع اعظم جاہی حیدر آباد ۱۳۴۲ھ (۲) اردو کا ایک گمنام مخزن شاعر از ابراہیم خلیل ۱۹۴۳ قومی زبان

(۳) تحفۂ دلی مطبوعہ المنیر پریس حقبنگ (۴) خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۹۶ (۵) تذکرہ خندہ گل ص ۲۳

(۶) خمخانۂ جاوید جلد دوم ص [(۷) تبصرہ رسالہ زمانہ دسمبر ۱۹۲۷ (۸) سندھ میں اردو شاعری ص ۲۲۹ (۹) رسالہ ادیب الہ آباد فروری ۱۹۱۳ء

(۱۰) محارف اعظم گڑھ ص ۲۸۲ اکتوبر ۱۹۴۶ (۱۱) دیوان دل مخطوطہ بحوالہ دکن میں اردو ص ۱۴ (۱۲) حدیقۂ محبوب (دیوان بدنام) مطبع اتحاد دہلی

دیوان از بدنام ص ۲۲۹ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۳۲۷ھ

(1)

الطاف احمد انصاری آزاد [پ $\frac{1881}{1864}$] شاگرد غالب بیدل کے شاگرد تھے انہوں نے سرکار رامپور قدر کی
اسی دور میں بلدیو پرشاد سکینہ شاطر، سید اولاد حسین سلیم اودہوی (3) منشی رام دیال لکھنوی (4) حافظ خلیل حسن خلیل (5)
ابوالحسن کراروی الہ آبادی (6) برج لال کانپوری (7) اور مقصود احمد نطق کاکوروی (8)۔ انیسویں صدی کے اواخر
میں کچھ اور قصائد نگار بھی ملتے ہیں ان میں میر سید علی محدث لکھنوی (9) حکیم ممتاز الدین بدایونی (10) مولوی فضل رب
عرشی تاجپوری (اکثر قصائد نظام اور عدار الملکا کی شان میں تھے) مسعود الدین عباس شائق (11) (مولانا عبد المقتدر کی
سجادہ نشینی پر قصیدہ) شیخ عظمت علی ناق کاکوروی (12) سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (13) حکیم میر محمد رسول خاں رضوی
موہانی (14) ابوالحسن ساکت (15) یوسف حسین طاہر مٹیابرجی (16) محمد سعید الدین سعید کامل (17) (نعتیہ قصیدہ) اہم ہیں
بیسویں صدی کے آغاز میں وفات پانے والے بعض قصیدہ نگاروں کے نام علامہ حفیظ وزیر مبارک صادق جونپوری (18)
احمد علی سیماب (19) مولانا احمد علی رامپوری (20) پنڈت رتن ناتھ سرشار (21) مرزا الطاف حسین عالم لکھنوی (22)۔
علی میاں محمد آبادی کامل (23) سید علی حسین شاہ تمیز (24) شیخ امیر علی نقش (25) آغا علی نقی عشق (26) (نواب رامپور کی مدح)
فخر الدین فخر خیالی (27) سید مجتبیٰ حسین جاشی عرشی (28) محمد عبد الجلیل نعمانی رامپوری (29)
اسی دور میں شیخ احمد حسین شیدا رامپوری (30) اور محمد نوح شہیر (31) کے قصائد بھی دستیاب ہیں یہ دونوں منیر شکوہ آبادی
کے شاگرد تھے اور عمدہ قصائد لکھتے تھے۔ اصغر حسین ناجی (32) سید محمد رزاق کلامی (33) (ٹونک)
مرزا جہاں قدر نیر (34) میر یعقوب علی اشہر (35) (در مدح میر محبوب علی خاں) سید ابو تراب (36) محمد عبد الحی بازغ (37)
اور سید شبیدہ علی ارمان (38) کے قصائد بھی دیکھنے کو ملے ہیں۔

---

(1) اوراق گل مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی ص ۱۹ از بزم سخن رامپور (2) خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۳۹
[(3) تذکرۃ الکرام ص ۴۳ (4) بہار سخن ص ۱۹۵ از بابو سیتا سندر برق ایل بی پریس سیتاپور ۱۹۲۲ (5) خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۸۴
از محبوب احمد عباسی محبوب المطابع دہلی]
(6) معارف ص ۲۹۹ اکتوبر ۱۹۶۶ اعظم گڑھ (7) آثار الشعرائے ہنود ص ۹ (8) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص $\frac{310}{411}$ (9) دبستان دبیر ص ۹۳
(9) تذکرۃ الواصلین ص ۲۷۸ (10) محبوب الزمن جلد دوم ص ۸۰۶ (11) اکمل التاریخ جلد دوم ص ۲۲۳ از محمد یعقوب ضیا بدایونی
مطبع قادری بدایوں ۱۳۳۲ھ
(12) مشاہیر کاکوری ص ۲۷۵ (13) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۹۰ (14) خمخانہ جاوید جلد پنجم ص ۱۳۵ (15) ایضاً جلد چہارم ص ۳۵
(16) معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۶۶ ص ۲۹۶ (17) تذکرۃ الواصلین ص $\frac{268}{275}$ (18) ضیائے اختر ص ۱۵ (19) خمخانہ جلد چہارم ص ۳۴۵
(20) خمخانہ پنجم ص ۴۲۵ (21) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۶۱ (22) رسالہ خدنگ نظر اکتوبر ۱۹۰۲ (23) آب بقا ص ۳۵۲
(24) انتخاب یادگار ص ۹۸ (25) انتخاب زریں ص ۲۲۱ (26) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۲۰۸ (27) گل رعنا ص ۵۲۹
(28) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۱۹ (29) تذکرہ شعرائے دکن جلد دوم ص ۱۱۱ (30) انتخاب یادگار ص ۱۸۶ (31) دبستان دبیر ص ۴۸۸، ۴۸۹
(32) تذکرہ شعرائے دکن جلد دوم ص ۱۱۹ (33) ان کے دیوان گوہر عزیزوں ص ۲۰ تا ص ۱۱۶ مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۳۲۲ھ میں پانچ قصائد حمد و نعت و منقبت کے ہیں
(34) مضمون مٹیا برج کے سبع سیارے از نظم طباطبائی اردوئے معلیٰ جلد ششم شمارہ اول (35) محبوب نظر مدح محبوب ص ۲۲ و تیرہ چراغ مطبع محبوب شاہی حیدرآباد دکن
(36) قصائد جشن جوبلی ص ۱ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۰۵ (37) ایضاً ص ۲۶ (38) ایضاً ص ۳۷

اس دور میں مذہبی قصائد کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے ۔ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی قصیدہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد مذہبی قصائد سے وابستہ نظر آتی ہے ۔ یہاں چند اور مذہبی قصیدہ نگاروں کی اجمالی فہرست پیش کی جاتی ہے ۔ محمد نعیم الدین شاہ [۱] (مرادآباد) (نعتیہ قصیدہ) ، نواب مردان علی خاں رعنا [۲] (قصیدہ نعت و قصیدہ غوثیہ) ، مفتی غلام سرور لاہوری [۳] (قصیدہ نعت حلیہ مبارک) ، مولانا عبدالحلیم حلیم [۴] اودھوی (قصیدہ منقبت در مدح مرشد سید زماں شاہ) (حلیم چھاپور میں مقیم رہے ۔ ان کے مذکورہ قصیدہ میں بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں زور بیان ہے ، تخیل کی رفعت ہے ، صوفیہ کی مصطلحات استعمال ہوئی ہیں مثلاً صفات ، ذات ، شاہد ، تنزیہ ، شیون جمال ، شہود ، وحدت ، مرکبات ، بسائط ، تفرید ، ظہور اور بطون وغیرہ) [۵] ، حاجی عبدالحق صادق و الطاف [۶] (قصائد نعت و منقبت و مدح چہار یار) ، چھجو لال خوب [۷] (مرزاپور) کاشی ، بندرابن ، ہری ہر ، کالی جی اور سیاد یوجی کی مدح میں قصائد) عاشق حسین بزم اکبرآبادی [۸] (قصیدہ حمد) ، لطف علی لطف بریلوی [۹] (قصیدہ سراپائے رسول) ، رکن الدین مکمل فورملی [۱۰] (جالندھر) (قصیدہ نعت) حسرت سہروردی [۱۱] (ترجیع بند) (مذہبی قصائد) ، مولوی عبدالصمد کلیم [۱۲] (متوطن علی گڑھ) (قصیدہ معین الدین حسن سنجری) نادر علی خاں مضطر [۱۳] (قصیدہ در مدح معین الدین چشتی ، در مدح حضرت عبداللہ سونی پتی) ، محمد امین خاں امین [۱۴] (قصائد نعت) قاری ساجد علی ساجد سلیمی [۱۵] (در مدح مولینا ثناء اللہ ، در مدح حضرت عبداللہ و فخرالدین احمد) کا دیوان سہیل یمن کے نام سے مطبع غوثیہ کلکتہ سے چھپا تھا) عبدالباقی فنا عرف محمد اسمٰعیل [۱۶] (در مدح معین الدین چشتی) ، راجہ جنگ بہادر جاہ دکنی [۱۷] (مذہبی قصائد) ، اصغر حسین ثمر [۱۸] (قصائد منقبت) پٹیالہ سے تعلق تھا) احمد حسین مائل [۱۹] (دکن) (حضرت علی کی شان میں مختصر قصائد) ، محمد شفیع ناصر [۲۰] (قصیدہ نعت) صادق حسین [۲۱] (ایڈیٹر صبح صادق اٹاوہ) (قصیدہ نعت) ، رکن الدین ابن عظیم الدین [۲۲] (بے شمار مختصر قصائد) (خاندیس سے تعلق) ، امیر حسن خاں سحر [۲۳] (قصائد در منقبت) محرم علی چشتی [۲۴] (قصیدہ الخیالیہ) و (قصیدہ داتا گنج بخش) ، الحاج شاہ لطیف قادری [۲۵] مہاجر کی مدنی ساگری کراچی محمد اسمٰعیل مخموم [۲۶] قیمن کراچی) (دونوں اصحاب مذہبی قصائد لکھتے تھے) ، امیر الدین نزہت [۲۷] (قصیدہ عبدالقادر جیلانی ؟) نواب یوسف علی ناظم رامپوری [۲۸] (قصائد منقبت) ۔ اسی دور کے ایک مجموعہ قصائد روضہ رضوان میں بہت سے شعرائے

---

[۱] ریاض نعیم مع نزہت الناظرین ، مرتبہ اختصاص الدین احمد نعیمی ، ناشر غلام معین الدین نعیمی مرادآباد ، س ن
[۲] مہر نبوت ، دیوان از رعنا مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۸۸ھ ص ۲ [۳] نعت سروری از مفتی غلام سرور ص ۹۲ ، نول کشور ۱۸۸۵ء
[۴] دیوان حلیم ص ۴ ، خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور ۱۹۱۱ [۵] تحریر و تقریر از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ص ۳۳
[۶] دیوان صادق ص ۸۸ ، ۸۹ ، ۸۴ ، نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۰ [۷] ادب نامہ از چھجو لال ص ۱۰ تا ۱۳ لکھنؤ ۱۸۷۹ء مطبوعہ
[۸] چراغ بزم از عاشق حسین بزم ص ۱۳ مطبع انوری آگرہ ۱۲۹۷ھ [۹] دیوان لطف ، ص ۴ مطبع چشمہ فیض دہلی ۱۲۹۸ھ
[۱۰] دیوان مکمل ص ۲ مرزا پریس سیالکوٹ ۱۸۸۵ء [۱۱] تذکرہ شعرائے قدیم نظیر نگر ص ۳۳ از حسرت سہروردی ، ادارک ۱۹۵۹ء
[۱۲] قصیدہ بہار چشت ص ۱۱ از عبدالصمد کلیم ، مطبع خاص رضوی دہلی ۱۳۰۵ [۱۳] سر مسلم ، دیوان مضطر ص ۱۲۰ ، ۱۲۱ ، ۱۴۱ مجریہ ۱۳۰۹ھ
[۱۴] راحت العاشقین ص ۳۰۲ مجموعہ کلام امین ، مطبع کفری سمہ اخبار لاہور ۱۸۹۳ھ [۱۵] سلسبیل یمن اردو ص ۱۰۱ ، ۱۰۲
[۱۶] گلستان خواجہ از عبدالباقی فنا ص ۳۴ ، افضل المطابع دہلی ۱۸۹۵ء [۱۷] بزم پیغمبری از جاہ ، مطبوعہ دکن ۱۳۱۳ھ
[۱۸] گلدستہ ثمر از اصغر حسین ثمر مطبع یوسفی دہلی ۱۳۱۳ھ [۱۹] تحفہ دکن از احمد حسین مائل ، قصیدہ ۱۱ پریس آگرہ ۱۸۹۷ء
[۲۰] رسالہ پروانہ میرٹھ مئی ۱۹۰۰ء ص ۷ ، ۸ و ایضاً ص ۳ دسمبر ۱۹۰۰ [۲۱] رسالہ پروانہ ص ۲۱ ، اگست ۱۹۰۰ء
[۲۲] مولد گلشن خلد ، از رکن الدین مطبوعہ ۱۳۲۵ھ [۲۳] کلیات سحر از راجہ محمد امیر حسن خاں باہتمام محمد فرز المطبع مشہد ۱۳۲۰ھ
ص ۲ تا ۴۲ و ص ۲۰۷
[۲۴] ارمغان چشتی ص ۴۲ و ص ۹ مطبع مولوی فیروز الدین ۱۹۰۷ء [۲۵] مضمون کراچی کے قدیم اردو نعت گو شعرا از بشیر محی القادری قومی زبان کراچی یکم فروری ۱۹۵۰ء [۲۶] ایضاً [۲۷] اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر [۲۸] انتخاب یادگار ص ۱۷

(۲)

مذہبی قصائد ملتے ہیں (۱) روضۂ رضواں کے مرتب حاجی محمد رضوان علی خاں مراد آبادی خود لکھ شائع کئے ۔ امین، اغلب (۴)، شیخ عبد الحق اختر (۵)، میر انیس، منشی سرور (۶)، شمیم (۷)، کلب حسین نادر (۸)، مولوی ابو محمد (۹)، ابوالقاسم فتح پوری (۱۰)، مرزا اوج (۱۱)، مرزا تعشق (۱۲)، بزم (۱۳)، لطف (۱۴)، عیش (۱۵)، میر عباس علی عالی (۱۶)، میر حمید حمیدی (۱۷)، حاجی رضوان علی خاں رضواں (۱۸)، مرزا محمد زکی (۱۹)، سید مظہر حسن مظہر (۲۰) (یہ مجموعہ چہاردہ معصومین کی شان میں قصائد پر مشتمل ہے) مرزا تعشق (۲۱) نے خانہ کعبہ اور مدینہ کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں ۔ عاشق حسین عاشق حیدر آبادی کے قصائد نعتیہ کا تذکرہ ملتا ہے (۲۲) میر غلام حسن احسن خیر پوری اور میر علی نواز خاں ناز خیر پوری کے مذہبی قصائد کا تذکرہ تاریخ خیر پور میں ہے (۲۳) عبد المجید کے کلیات میں قصائد نعت دستیاب ہیں (۲۴) ۔ اشارت حسین ذکی نے ایک منقبتی قصیدہ لکھا جس میں عرب کے تاریخی حالات بیان کیے (۲۵) ذوالفقار خاں پیش امام جامع مسجد ڈیگ تھے ان کا ایک قصیدہ دعائیہ رسالہ کمال دہلی میں طبع ہوا (۲۶) حکیم بادشاہ محمد دین شافعی کا ایک قصیدہ نعت نادر علی کی مرتبہ کتاب عقد ثریا میں چھپا تھا (۲۷) ۔ شیخ محمد خاں خادم قریشی قادری گوجرانوالہ کے دیوان میں حمد و منقبت کے قصائد ملتے ہیں (۲۸) جگناتھ پرشاد شوق (۲۹) نے سری کرشن جی مہاراج کی شان میں دو قصائد لکھے ہیں، شوق آغا شاعر قزلباش کے شاگرد تھے ، مرزا غلام احمد نے قصیدہ مناجات اور قصیدہ تبلیغ حق لکھے (۳۰) محمد عاشق بابس کے دیوان غنچہ نعت میں ایک قصیدہ جہاں آشوب ملتا ہے (۳۱) بابس کا تعلق جالندھر سے تھا ۔ وحید الدین مفتون و سلیم جالندھری کالج بہاولپور میں مدرس تھے نعتیہ قصائد لکھتے تھے ان کا قصیدہ مولود بہاریہ معروف ہے (۳۲) ۔ نورانی نامی شخص کے مرتب کردہ مجموعہ نعت و منقبت میں برہان نامی شاعر کا قصیدہ ملتا ہے یہ مجموعہ لاہور سے چھپا تھا (۳۳) شہنشاہ دوران دلی حضرت تاج الدین شاہ کے خلیفہ محمد رسول لعالی دہلوی کا قصیدہ نعت دستیاب ہے (۳۴) ۔ یہ ۲۳۲ اشعار کا ہے اس میں قرآن ، تورات ، کتاب تسبیحانہ سلیمانی وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں قصیدہ کا نام گل بہار ہے (۳۵) صوفی عبد اللہ سلیطی کے قصائد کا ذکر سلہٹ میں اردو میں ہے (۳۶) ایک اور بزرگ حاجی عبد اللہ آشفتہ سلہٹی نے نعتیہ قصائد لکھے (۳۷) ۔ شیخ گل محمد عاشق ملتانی کے قصائد ان کے شعری مجموعہ صحیفہ نورانی میں ملتے ہیں (۳۸) ۔ وہ نعت و منقبت میں قصائد لکھتے تھے ۔ محمد سردار خاں کیفی کے مرتب کردہ نعتیہ کلام نجم الضیا جدید میں عباسی (علیہ رحمت) کا نعتیہ قصیدہ طبع ہوا ہے (۳۹)

---

(۱) روضۂ رضواں حصہ سوم در مطبع اثنا عشری لکھنؤ ۱۳۱۹ھ (۲) تا (۲۰) روضۂ رضوان از ص ۱ تا ۲۹۵

(۲۱) روضۂ رضواں ص ۳۰۴ (۲۲) تزک محبوبیہ ص ۱۷۷ (۲۳) تاریخ خیر پور از نسیم امروہوی ص ۱۸۶ ، ۱۸۷ ، ۱۸۸ شعبہ تاریخ کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۵ء

(۲۴) کلیات نعتیہ مجید از عبد المجید خاں نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۰ء (۲۵) رسالہ صلائے عام دہلی ص ۵۱ ، ۵۲ جنوری ۱۹۱۱ء

(۲۶) رسالہ کمال دہلی ص ۱۳ ، اگست ۱۹۱۱ء (۲۷) عقد ثریا ص ۳ ، ۷ مرتبہ نادر علی (۲۸) قصائد از شیخ محمد خاں خادم میکل پریس گوجرانوالہ ص ۳ تا ۳۴ ۱۳۴۹ھ

(۲۹) آئینہ شوق از جگناتھ پرشاد شوق ص ۹۰ ، ۹۲ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۱ء

(۳۰) در ثمین مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ، نزہت آرٹ پریس لاہور ۱۹۶۲ء (۳۱) غنچہ نعت از محمد عاشق بابس ص ۹۰ ، مطبوعہ جالندھر ۱۹۱۳ء

(۳۲) خزینۂ نعت حصہ اول مرتبہ ملک فضل دین ص ۵۵ ، نولکشور پریس لاہور ۱۹۱۳ء (۳۳) گوہر ایمانی حصہ اول مرتبہ نورانی ص ۲۶ ، لاہور ۱۹۱۳ء

(۳۴) (۳۵) گل بہار ص ۱ از محمد رسول لعالی حمید یہ اسٹیم پریس لاہور

(۳۶) سلہٹ میں اردو ص ۶ (۳۷) ایضاً ص ۷ ، ۸ (۳۸) صحیفہ نورانی از شیخ گل محمد عاشق ملتانی ص ۲۸ ، ۳۶ ، ۴۲ مطبع دین محمدی لاہور ۱۳۳۲ھ

(۳۹) نجم الضیا جدید مرتبہ محمد سردار خاں کیفی ص ۹۵ ، ۹۶ ، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۲ھ

ان کے علاوہ ادبی حیثیت سے معروف اور غیر معروف شعرائے ریاستی نوابوں اور مہاراجاؤں کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے۔ نواب صدر محل صاحبہ کے شعری مجموعہ بادشاہ نامہ میں واجد علی شاہ کی مدح میں مختصر قصائد ملتے ہیں[1]۔ نواب علی خاں سحر نے بھی واجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا[2]

رامپور کے نواب کلب علی خاں کی مدح میں عثمان علی عثمان بلاسپوری[3]، عنایت اللہ خاں راسخ بلاسپوری[4]، سجاد علی خاں (شاگرد محمد جان اخگر)[5]، سید علی حسن تمیز[6]، محمد حسن، حسن صابری[7]، سید دلاور علی دلاور[8]، محجوب وغیرہ نے بھی قصائد لکھے ہیں۔ مولانا سید اولاد حسین لکھنوی کے مجموعہ کلام سبد گل میں ظفر نامہ کے نام سے نواب رامپور کی مدح میں ایک قصیدہ نما نظم ملتی ہے[9]۔ پیارے لال رونق دہلوی[10] اور منشی حیات بخش رسا[11] کاسنول نے نواب حامد علی خاں والیٔ رامپور کی قصیدہ خوانی کی۔

حیدرآباد کے نواب میر محبوب علی خاں کی شان میں لکھے گئے چند اور قصائد کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ان کے لکھنے والوں میں اعجاز علی شہرت حیدرآبادی[12]، میر تہنیت علی محشری حیدرآبادی[13]، غلام عباس سعید (حبخدار فکر مالگذاری دکن)[14]، محمد عبدالرشید رشید فاروقی حیدرآبادی[15]، منظور الدین مجلی صدیقی حیدرآبادی[16] اور شوق قادری (صیغہ دار نواب دکن)[17] وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ میر محبوب علی کی وفات کے بعد دکن کا تاج و تخت میر عثمان علی کے حصے آیا۔ ان کی شان میں بھی چند اور قصیدہ نگاروں کے قصائد دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں شاہ محمد ناقی[18] (مدرس مدرسہ تحتانی شاہپوری دیودوگ دکن)، ام مشتاق پروین[19] (اہلیہ میر قربان علی رئیس آگرہ)، محمد شرف الدین شرف شاگرد ظہیر دہلوی[20]، فقیر احمد فقیر (شاگرد ظہیر دہلوی)[21]، شائق حسین سفیر[22] اور مولانا محمد سعید[23] (پروفیسر علوم شرقیہ و ممتحن پنجاب یونیورسٹی) کے قصائد پر تاثیر ہیں۔

گورسرن لعل تو کلی آزاد کے شعری مجموعہ خمخانہ میں اعظم جاہ بہادر پرنس دکن، معظم جاہ بہادر اور کشن پرشاد شاد وغیرہ کی تعریف میں قصائد ملتے ہیں[24]۔ محمد حبیب اللہ عشق نے آصف نواز الدولہ، نواز الملک معتمد حرف خاص حیدرآباد دکن کی مدح میں قصیدہ لکھا[25]۔ محمد حسین محب نے قصیدہ وقاریہ نواب فضل الدین معین المہام مال سرکار عالی جاہ سکندر جنگ وقار الملک کی تعریف میں لکھا[26]۔ نواب لطف علی خاں لطف لطافت جنگ نے اپنے عم محترم نواب محمد ولی الدین ولی الدولہ کی شان میں قصائد لکھے[27]

---

(۱) بادشاہ نامہ از نواب صدر محل، ص ۱۸۷ تا ۱۸۷، مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۸۸ھ (۲) کلیات سحر ص ۹۱، مطبع اودھ پریس لکھنؤ ۱۲۹۳ھ
(۳) انتخاب یادگار ص ۱۹۷ (۴) ایضاً ص ۱۴۳ (۵) ایضاً ص ۱۴۹ (۶) ایضاً ص ۹۸ (۷) ایضاً (۸) ایضاً ص ۱۲۸
(۹) گلشن نعت ص ۲۷، مطبوعہ لاہور ۱۲۹۷ھ (۹) سبد گل، رامپور ۱۹۲۶ء (۱۰) رسالہ کمال دہلی مئی تا اگست ۱۹۱۲ء
(۱۱) کلام رسا ص ۸۱ (۱۲) تزک محبوبی دفتر ہفتم ضمیمہ ص ۲ (۱۳) ایضاً ص ۱۷ (۱۴) رسالہ جلوہ محبوب دکن ۱۳۱۹ھ
(۱۵) جلوہ محبوب دکن ۱۳۱۹ھ (۱۶) ریاض مجلی از منظور الدین مجلی ص ۲۷، ۵۸، ۴۰۵، عماد پریس حیدرآباد دکن ۱۳۳۵ھ
(۱۷) بوستان بے خار (دیوان شوق قادری) ص ۲۸۰، مطبع حسن حیدرآباد دکن ۱۳۳۲ھ
(۱۸) مجموعہ کلام ناقی حصہ اول از شاہ محمد ناقی ص ۱۵، گوجرانوالہ ۱۹۲۱ء (۱۹) دیوان پروین از ام مشتاق پروین ص ۵ مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ ۱۹۱۳ء (۲۰) عقد ثریا (موسوم بہ گلدستہ جشن سالگرہ مبارک) مرتبہ محمد نادر علی، دکن ۱۳۳۲ھ
(۲۱) ایضاً ص ۱۵، ۳۱، ۵۳ (۲۲) الناظر لکھنؤ ص ۱۵ جنوری ۱۹۱۲ء (۲۳) قصیدہ آصفیہ مرتبہ سید محمد محمود ص ۱، لاہور ۱۹۱۹ء
(۲۴) خمخانہ ص ۱۱۷، شمس المطابع حیدرآباد دکن ۱۳۲۸ھ (۲۵) پری خانۂ عشق ص ۱۹ از عشق، عزیزی پریس آگرہ ۱۳۳۳ھ
(۲۶) دیوان محب ص ۱۲۵، مطبع شمس حیدرآباد دکن ۱۹۰۳ء (۲۷) دیوان لطف از لطف علی خاں ص ۱۶۲، ۱۹۶، دکن ۱۹۱۲ء

ریاست بلرام پور کی تاریخ احسن التواریخ کے مصنف سید آغا حسن نامی نے ایک قصیدہ بلرام پور کے راجہ سر دگبجے سنگھ کی شان میں لکھا ایران کے جشن تاجپوشی کے حوالے سے تھا اس پر یہ عبارت چھپی ہے "قصیدہ مشعر کیفیت جشن بجے دسمی و سامان سواری حضور فیض دستور خداوند نعمت فیاض زماں، سمو المکان جناب مہاراجہ ہزہائی نس دی آنریبل سر دگ بجے سنگھ بہادر" (۱)

ریاست نابھہ کے والی کی شان میں احمد عبدالعزیز نایطی والا کا قصیدہ بھی دستیاب ہوتا ہے۔ اس میں الکن محل نابھہ کی تعمیر کی تاریخ بھی رقم ہوئی ہے (۲)

نواب ڈھاکہ احسن اللہ خاں کی شان میں سید محمود آزاد عرف منجھلے سید [م ۱۹۰۷ء] (۳) خواجہ محمد افضل افضل اور سید احمد حسین واقر (شاگرد داغ) [م ۱۹۰۶ء] (۵) کے قصائد ملتے ہیں (۴)

مولوی احمد بخش یکدل (قصیدہ در مدح بہاول خاں رابع نواب آف بہاولپور) (۶)، منشی عبدالحمید ورق سہارنپوری (۷) اور حسن اختر لودھیانوی (۸) وغیرہ نے (سر صادق محمد خان خامس عباسی نواب بہاولپور کی شان میں قصائد) بھی مدحیہ قصائد لکھے (۹)

ریاست گوالیار کے والی کے ہاں فرزند پیدا ہونے پر وسیم خیر آبادی نے بھی ایک عمدہ قصیدہ لکھا

نواب مہابت خاں بہادر والیٔ ریاست دارالسلام جوناگڑھ کی شان میں سیف الحق ادیب نے ایک قصیدہ لکھا۔ اس میں صنعت توشیع استعمال کی (۱۰)

سید محمد ممتاز علی خاں حافظ مولف تذکرہ آثار الشعرا کا ایک قصیدہ نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کی شان میں ملتا ہے (۱۱)

۱۸۹۳ء میں حمید حسن یکتا نے مہاراجہ سر سوائی سنگھ، مادھو سنگھ والیٔ جے پور کی شان میں دو قصائد لکھے۔ اس میں مہاراجہ کے شیر کے شکار پر ہدیۂ تہنیت پیش کیا گیا (۱۲) یکتا جے پور کے رہنے والے تھے ایک قصیدے میں صنعت تکرار استعمال کی گئی تھی۔

سہارنپور کے سراج الدین سراج ۱۸۹۷ء میں ممبر کونسل ریاست بوندی تھے انہوں نے مہاراجہ رگھبیر سنگھ (ریاست بوندی) اور مہاراجہ جسونت سنگھ بہادر (والیٔ جودھپور) کی شان میں قصائد لکھے (۱۳)

---

(۱) احسن التواریخ، جلد چہارم از آغا حسن نامی ص ۵۷۸ مطبع جنگ بہادر بلرام پور
(۲) تاریخ نوائط، مولفہ نواب عزیز جنگ بہادر ص ۱۴۲ عزیز المطابع حیدر آباد دکن
(۳) تاریخ ڈھاکہ ص ۳۲۹ (۴) تاریخ ڈھاکہ ص ۳۱۶ (۵) تاریخ ڈھاکہ ص ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴
(۶) لدھیور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات مقالہ برائے پی ایچ ڈی از مفضل میراں گوہر نوشاہی ص ۱۶۵، ۱۹۸۲ء پنجاب یونیورسٹی لاہور
(۷) جشن تاجپوشی حضور نواب فرمانروائے بہاولپور مطبوعہ ملتان سن ن (۸) تجلی از حسن اختر لودھیانوی لدھیانہ ۱۳۵۹ھ ص ۱۴۳
(۹) وسیم کا تاریخی کلام مضمون از کسریٰ منہاس ص ۳۷ صحیفہ لاہور اپریل ۱۹۶۳ء
(۱۰) شمس فیض دیوان جبیر ص ۹ (۱۱) آثار الشعرا ص ۹۶ (۱۲) ص ۵۱۹
(۱۳) کلام سراج ص ۲۹ تا ۳۲ از سراج الدین سراج صدائے ہند پریس دہلی ۱۸۹۷ء

۱۸۷۳ء میں منشی محمد حسین خاں مہتمم اخبار 'دبدبۂ سکندری' نے ولی عہد ریاست سورلہ کی شادی کی تقریب پر ایک عمدہ قصیدہ پیش کیا[1]

اودے پور کے مہارانا فتح سنگھ جی بہادر (والی ریاست) سری بھوپال سنگھ جی بہادر کی شان میں حفیظ اکبر آبادی کے قصائد کا سراغ ملتا ہے[2] ۔ حفیظ کا نام منشی محمد حفیظ اللہ تھا اور وہ چھوٹی سادڑی (ریاست اودے پور (میواڑ)) کے رہنے والے تھے

سید غلام عباس 'عباس' کا ایک قصیدہ نواب سکندر علی خاں والی عالیر کوٹلہ کی شان میں ملتا ہے عباس کا تعلق سہارنپور سے تھا ان کا دیوان ۱۸۷۵ / ۱۸۸۱ میں طبع ہوا[3]

پانی پت کے شاہ الطاف حسین جویا [م ۱۹۴۴] نے مہاراجہ جھالاواڑ کی شان میں قصیدہ لکھا[4]

مونس رام برہمن کہ جو غالب کے شاگردوں میں سے تھے انہوں نے مہاراجہ راؤ منگل سنگھ والی الور کی شان میں قصیدہ لکھا[5] گھنشام لال عاصی کے ایک[1] قصیدہ کی اطلاع بھی ملتی ہے یہ راجہ جے سنگھ والی الور کی شان میں لکھا گیا[6] ۔

شفق کرتپوری[7] نے مہاراجہ وشنٹ نگندن سین والی ریاست سکیٹ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ۔ شفق کا نام بہاری لعل تھا وہ ریاست کنڈیلہ دار السرور راج سوائی جے پور میں وکیل تھے ان کا کلام بہار شفق کے نام سے ۱۳۲۳ھ میں آگرہ سے شائع ہوا تھا ۔ اس میں منشی شب سنگھ شبیر ریاست مورنا ہن[8] ، راجہ شمشیر پرکاش والی ریاست سرمور ناہن[9] ، لچھمن داس دیوان اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر مہاراجہ رام سنگھ بہادر والئ جموں و کشمیر کی شان میں قصائد ملتے ہیں[10] ۔ شفق نے ایک قصیدہ محمد خورشید علی خاں مجسٹریٹ کی شان میں بھی لکھا[11] اور ایک در مدح و ستائش اہل برادری کالستھ سبھا کے حوالے سے ہے[12]

ریاستی نوابوں ، انگریزوں اور دیگر شخصیات کی شان میں لکھے گئے مذکورہ قصائد محض حوالے کی چیزیں ہیں ۔ ان کا ادب میں کیا مقام ہے اس پر تاریخ فیصلہ دے چکی ہے ۔ وہ شاعر جنہوں نے شاعری کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں ان کے لکھے ہوئے قصائد پر زیادہ غور و فکر ہوا ہے ۔ مذکورہ بالا قصیدہ نگاروں نے قصیدہ نگاری کی روش قدیم ہی کو سامنے رکھ کر قصیدے لکھے یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر قصیدوں میں انہوں نے تقلیدی رجحانات ہی کو اپنا شیوہ بنائے رکھا ۔

---

(۱) شمس فیض دیوان خبیر ص م (۲) دیوان حفیظ اکبر آبادی ص ۹۳ ، ۹۴ مطبوعہ عام الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۲۸ء

(۳) دیوان عباس ص ۱۰۶ از غلام عباس 'عباس' ، مطبع مطلع الانوار سہارنپور ۱۲۸۷ھ

(۴) جائزہ مخطوطات اردو ص ۱۱۶ (۵) دیوان مونس از مونس رام ص ۶۴ ، ۶۵ گیان پریس دہلی ۱۸۸۱ء

(۶) کلام عاصی ص ۲ ، ۹ (۷) بہار شفق ص م آگرہ ۱۳۲۳ھ (۸) ایضاً ص ۱۱ (۹) ایضاً ص ۹ (۱۰) ایضاً ص ۱۴

(۱۱) ایضاً ص ۱۹ (۱۲) ایضاً ص ۲۲

ملکہ وکٹوریہ، ایڈورڈ ہفتم، جارج پنجم کی شان میں بے شمار اردو قصائد لکھے گئے ان کے علاوہ انگریز گورنروں، کمشنروں، مجسٹریٹوں اور دیگر عہدوں پر مامور افسروں کی تعریف میں بھی بہت سے شاعروں نے زورِ قلم صرف کیا ہے۔ بہت سے ایسے قصیدہ نگاروں کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ چند اور نام بھی ملاحظہ ہوں۔ منظر حسن منظر (مقیم دھولانہ ضلع میرٹھ) نے ایک قصیدہ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں لکھا اس پر یہ عبارت درج ہے "قصیدہ در تہنیت انعقاد دربار رسالانہ خطاب قیصری وکٹوریہ"[۱] منظر کا ایک قصیدہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی کی تہنیت میں بھی دستیاب ہے[۲]۔ آغا حسین ناقی ۲۰ اشعار کا ایک قصیدہ صنعت توشیح میں لکھا۔ ناقی کا تعلق بلرام پور سے تھا[۳] ناہر علی خاں مضطر نے بھی ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں قصائد لکھے[۴] ناہر علی خاں مضطر نے لفٹیننٹ گورنر ممالک احاطہ پنجاب کی بھی مدح سرائی کی ہے[۵] گھنشام لال عاصی کے کلام میں مسٹر بارنس کی مدح میں ایک قصیدہ دستیاب ہے[۶] آغا حسن ناقی نے ونگفیلڈ کمشنر ملک اودھ کے بلرام پور آنے پر ایک قصیدہ لکھا[۷]

ایڈورڈ ہفتم کی شان میں قصائد لکھنے والوں میں احمد عبد العزیز ولد (نائطی)[۸]، سید محمد علی شاہ[۹] (ان کا دیوان لاہور سے چھپا) حافظ فضل حق آزاد[۱۰]، حضرت کمال خلف اکبر حکیم جلال لکھنوی[۱۱]، احسن دیوبندی[۱۲] آغا شاعر قزلباش دہلوی[۱۳] محمد صادق علی خاں[۱۴] جناب قمر[۱۵] (قصیدہ در صنعت توشیح) سید امیر حسن بدر آروی[۱۶] محمد حبیب اللہ عشق[۱۷] اور مولانا اسیری[۱۸] (مولف رقعہ "تاجپوشی") کے نام معروف ہیں

جارج پنجم کی شان میں قصائد لکھنے والے شعرا میں اجمیر شریف کے عبد العزیز برق[۱۹]، نظام الحق شاہ[۲۰] مولوی صاحبزادہ سید اعجاز علی[۲۱] محمد صدیق شوق[۲۲]، غلام علی خاں حالی[۲۳]، حافظ عبد الغفار سولنش[۲۴] سید خواجہ اکبر حسین اکبر[۲۵] منشی محمد عبد الحفیظ کاتب[۲۶] محمد محمود دعرشی[۲۷] میر شیخ محمد علی احدی[۲۸] سید محمود دل محمد الیاس[۲۹] وی جون[۳۰] مغل بیگ مغل[۳۱] محمد ایوب احسن[۳۲] اور منشی عبد الغفور خاں بیکل کا سراغ ملتا ہے

---

(۱) نطق منظر یعنی دیوان منظر از منظر حسن منظر، ص ۹۵، مطبع رحمانی، شہر انبالہ س ن، (۲) ایضاً ص ۹۶
(۳) احسن التواریخ، جلد اول ص ۱۵، مطبع جنگ بہادر بلرام پور ۱۸۹۳ء (۴) سیر مسلم ص ۱۲۶، ۱۲۸، مطبوعہ مجہر ۱۳۰۹ھ
(۵) ایضاً ص ۱۴۹ (۶) کلام عاصی ص ۹۵ مطبوعہ دہلی، (۷) احسن التواریخ ص ۱۹۶،
(۸) تاریخ نوایط مولفہ نواب عزیز جنگ بہادر ص ۲۲۵، عزیز المطابع حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ
(۹) گلزار سید از سید محمد علی شاہ سید حمد متخلق، ہندوستانی اسٹیم پریس لاہور ۱۳۲۷ھ (۱۰) مخزن دسمبر ۱۹۰۲ ص ۸۹ دربار نمبر
(۱۱) رسالہ پروانہ جنوری ۱۹۰۳ ص ۲۲، (۱۲) رسالہ ہمدرد عزیز سیارہ پور ص ۱۸، (۱۶ دسمبر ۱۹۰۸)
(۱۳) تیر و نشتر، دیوان آغا شاعر ص ۱۰۹ مخزن پریس دہلی ۱۹۰۹ء (۱۴) مخزن دربار نمبر دسمبر ۱۹۰۲ ص ۵۳
(۱۵) رسالہ پروانہ ستمبر ۱۹۰۳ ص ۵، ۶، ۷ (۱۶) خمخانۂ بدر ص ۵۵۶، شان ہند پریس کلکتہ ۱۹۲۹ء
(۱۷) پری خانۂ عشق مجموعہ کلام ص ۱۴۶ ۱۳۲۲ھ (۱۸) پروانہ - دسمبر ۱۹۰۲، ص ۶
(۱۹) تا (۳۲) مشاعرہ سلور جوبلی مرتبہ خواجہ عبد الباری معنی ص ۱ تا ۴۶، انجمن فخریہ چشتیہ خواجہ اجمیر راجپوتانہ،

خواجہ عبدالرؤف عشرت، لکھنوی،(۱) نوح ناروی،(۲) منشی عبدالغفار مفتون دہلوی،(۳) اودلعل سنگھ سردار،(۴) کلیم دہلوی،(۵) پنڈت کیفی،(۶) محمد ایوب علی خاں ایوب،(۷) شاد میرٹھی،(۸) محمد صدیق محسن صدیقی بدایونی،(۹) ساتک رام سالک،(۱۰) سید پوری، طالب بنارسی،(۱۱) دینا سنگ پرشاد طالب دہلوی،(۱۲) حافظ محمد عبدالحفیظ عرشی،(۱۳) پنڈت جواہر ناتھ کول(۱۴) معبولاناتھ جیتی،(۱۵) شیخ ابوالمنیر ضمیرالدین احمد رشک،(۱۶) امیرالدین آرام(۱۷) اور غلام مصطفیٰ رسا(۱۸) کے جارج پنجم کی شان میں قصائد رسالہ کمال دہلی دربار نمبر میں طبع ہوئے تھے۔ اقبال ورما سحر،(۱۹) محمد سیف الدین شتاب(۲۰) خلیق دہلوی(۲۱) سید غلام مصطفیٰ ذہین(۲۲) عبدالحمید حمید میرٹھی(۲۳) فرحت علی احمد،(۲۴) باسط لبوانی(۲۵) احسان علی فصیح(۲۶) میراں بخش جلوہ سیالکوٹی،(۲۷) مبارک علی مبارک سیالکوٹی،(۲۸) حکیم نیاز احمد صدیقی،(۲۹) تلونڈی موسیٰ خاں تحصیل ڈسکہ) ثناءاللہ قریشی(۳۰) (ظفروال) ستیر محمد ستیر (ظفروال)،(۳۱) محمد اسمعیل خاں رامپوری صبر(۳۲) محمد ظہیرالدین ظہیر علوی(۳۳) (علی گڑھ) محمد یعقوب اوج گیاوی(۳۴) منشی سنت لال عنبر(۳۵) اور لالہ حبید فلک(۳۶) کے جارج پنجم کی شان میں قصائد کا سراغ بھی ملتا ہے۔

بعض دیگر انگریز حکمرانوں اور شخصیات کی شان میں بھی بہت سے شعرائے قصائد لکھے ہیں۔ مرزا نسیم لکھنوی(۳۷) اور منشی طوطارام ستایاں(۳۸) نے کرنل ایبٹ کمشنر لکھنو کی شان میں قصائد لکھے۔ سید فضل حق آزاد(۳۹) نے سر چارلس ایلیٹ کی شان میں قصیدہ لکھا۔ پنڈت پریم سنگھ شاد بلند شہری کے دیوان میں مسٹر ایف۔ ایس گروس کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع بلند شہر اور مسٹر لوئس بہادر ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع بلند شہر کی شان میں رائیہ اور توصیفی قصیدے ملتے ہیں۔(۴۰) جارج پیش شور (آگرہ) نے ایک قصیدہ جان اسمتھ شور کی شان میں لکھا۔(۴۱) مونس رام برہمن نے کرنل ڈیوس فنانشل کمشنر لاہور کی شان میں ایک قصیدہ لکھا(۴۲) ناہر علی خاں مضطر کا ایک قصیدہ مسٹر میکماہن کمشنر حصار اور ایک جارج لوکس ڈپٹی کمشنر رہتک کی مدح میں ہے(۴۳)۔ محمد نوح شہیر نے ڈی سی بیلی سینئر ممبر بورڈ آف ریوینو اودھ کی مدح سرائی کی(۴۴)۔ حیرت سرودی(۴۵) نے لارڈ ڈلہوزی کی مدح میں قصیدہ لکھا(۴۶) لارڈ منٹو کی شان میں خلیل اللہ خلیل سلہٹی(۴۷) کا اور کرزن کی شان میں چکبست کے قصیدے کی خبر ملتی ہے۔ منشی برج بھوکن لال محب(۴۸) نے ۱۹۱۹ء میں لکھنو میں گورنر جنرل کی آمد پر قصیدہ لکھا

---

(۱) تا (۱۸) رسالہ کمال دہلی دسمبر ۱۹۱۲ء دربار نمبر ص ۱۲ تا ۴۴ (۱۹) ادیب، الہ آباد، دسمبر ۱۹۱۱ء ص ۲۸۷ (۲۰) ایضاً ص ۲۸۹ (۲۱) ص ۲۸۹ دسمبر ۱۹۱۱ (۲۲) الناظر لکھنو جنوری ۱۹۱۲ ص ۱۶ (۲۳) رسالہ تمدن دہلی دسمبر ۱۹۱۱ ص ۱۹، ۲۱ (۲۴) ایضاً

(۲۵) الناظر جنوری ۱۹۱۲ ص ۱۱ (۲۶) ایضاً ص ۱ (۲۷) تا (۳۰) ضلع سیالکوٹ میں جشن شاہنشاہی کے مختصر حالات مرتبہ میاں عبدالعزیز مطبوعہ ۱۹۱۲ ص ۴۴ تا ۹۰ (۳۱) سرزمین ظفروال از آتش کاشمیری ص ۲۹۴ مطبوعہ سیالکوٹ س ن

(۳۲) نذر وفا بیتہ، مطبع حامدی رامپور ۱۳۵۱ھ (۳۳) یادگار ظہیر مرتبہ سید ظہیرالدین احمد علوی ص ۶ علی گڑھ ۱۹۵۰ء

(۳۴) جذبات اوج از اوج گیاوی ص ۷۴ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور س ن، (۳۵) تتمہ کلیات عنبر، گورکھپور ۱۹۱۶ء

(۳۶) کلام فلک مطبوعہ اسٹیم پریس لاہور س ن، (۳۷) تواریخ نادر العصر ص ۴۹ (۳۸) ایضاً ص ۲۰

(۳۹) نوادرات مرتبہ سید احسن ص ۱۳۱ آزاد پریس پٹنہ ۱۹۶۱ء (۴۰) دیوان شاد از پریم سنگھ شاد ص ۲۰، ۲۷، بلند شہر ۱۸۹۳ء

(۴۱) اردو کے یورپین شعرا ص ۲۴۵ (۴۲) دیوان مونس ص ۲، ۶، مطبوعہ دہلی ۱۸۸۱ (۴۳) دیوان مضطر ص ۱۵۰، ۱۵۱

(۴۴) دیوان شہیر ص ۱۴۶ (۴۵) دیوان حیرت ص ۱۸۵ (۴۶) سلہٹ میں اردو ص ۹۵ (۴۷) صبح وطن از چکبست ص ۱۴۵ انڈین پریس، الہ آباد س ن

(۴۸) رنگ زمانہ از محب ص ۱۰۱، تعلقدار پریس، لکھنو ۱۹۲۳ء

ہر چند رائے ہر چند کا دیوان مظہر محبت ۱۸۷۷ء میں طبع ہوا تھا۔ ان کا تعلق میرٹھ سے تھا۔ ان کے قصائد کا ذکر کیا جاتا ہے (۱)
سید وزیر حسن وزیر م ۱۸۸۶ء کے بارے میں اطلاع ملتی ہے کہ وہ مرثیہ، عقیدہ اور نوحہ کسی
میں بند نہیں تھے۔ میر سید علی [م ۱۸۹۰ء، ۱۸۹۱ء] کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ وہ اکثر اپنے کہے ہوئے قصائد پڑھا کرتے (۲)
تھے۔ یہ دونوں شاعر لکھنوی تھے۔ (۳) عبدالغفور نساخ کے مجموعۂ کلام باغ فکر میں قصائد موجود ہیں (۴) تذکرہ شعرائے جےپور
میں محمد عثمان تسلیم م ۱۸۸۴ء کے مجموعۂ قصائد و قطعات کا تذکرہ ہے (۵) تزک محبوبیہ میں حاجی سید احمد حیدرآبادی، (۶)
ابوسعید افسر حیدرآبادی، میر غلام علی جوش حیدرآبادی (۷) اور غلام رسول شوکت حیدرآبادی (۸) کے قصائد پر اظہار خیال
ہے۔ خواجہ مرتضیٰ لقا کا مجموعۂ قصائد "عیشستان تبحری" سے موسوم ہے۔ لقا کا تعلق لکھنؤ سے تھا (۹)
شہید یار جنگ بہادر شہید کے قصائد کی بھی خبر ملتی ہے (۱۰) یادگار ضیغم اور دلستان دبیر میں امیر حسین فروغ لکھنوی (۱۱)
کے مدحیہ قصائد کا تذکرہ ہے۔ محمد فاضل ہمت کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی میسور میں اردو میں لکھتے ہیں "قصائد لکھتے تھے (۱۲)
منشی شیو پرشاد رئیس قصبہ کھجو ضلع فتح پور کے قصائد کا ذکر افتخار احمد خلیل نے کیا ہے (۱۳)۔ سید مرتضیٰ حسین بیان (۱۴)
یزدانی کے مجموعۂ قصائد اردو کی ڈاکٹر سید صفدر حسین مرحوم نے اطلاع دی ہے (۱۵) بارتھولومیو گارڈنر صبر اردو کے
یوروپی نژاد شاعر تھے اور قصائد بھی لکھتے تھے۔ صبر ایٹہ، قنوج، فرخ آباد، فتح گڑھ، کانپور اور الہ آباد
میں رہے اور عیسائیت کے مبلغ کے بطور زندگی گزاری۔ حافظ محمد خاں شہیر، شاگرد غالب تھے اور قصیدہ و تقریظ لکھا کرتے تھے (۱۶)
ان کا تعلق رامپور سے تھا۔ یوسف صاحب عاشق عرف دلارے صاحب فرزند کپتان مالوک فنصب فرانسیسی بھوپالی (۱۷)
کے اردو قصائد کا ذکر ملتا ہے۔ اعظم حسین سلیم سندیلوی کے قصائد کا تذکرہ بھی آثار الشعرا میں ہے (۱۸)
حبیب اللہ حبیب سلہٹی کے اردو قصائد کا ذکر "سلہٹ میں اردو" میں ہے (۱۹)۔ پیرزادہ مولوی محمد حسین خاں (۲۰)
جج ہائی کورٹ جموں و کشمیر نے قصیدہ بردہ اور بانت سعاد کا ترجمہ ۱۹۰۷/۱۹۰۸ میں قصیدہ کی ہیئت میں کیا
منشی لال بہجت کرشن کا تذکرہ (ص ۸۱ھ مقالہ نمبر ۱) پہلے ہو چکا ہے ان کے دیوان میں سری کرشن،
وزارت علی، نواب ابراہیم خاں، ڈپٹی کمشنر اجمیر رپ ٹیٹن، ہردیال، پنڈت جیوانند، کرنیل ڈگسن
سری موہن بجی مل (دیوان مارواڑ) مہاراجہ مدن سنگھ والئی کشن گڈھ) پرتاب سنگھ مہاراجہ جودھپور،
مہاراجہ شمشیر گڑھ در مدح و تہنیت ولادت مہاراجکمار جودھپور، دستیاب ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں بھی
بہجت نے ایک قصیدہ لکھا اس میں اس کے عہد میں ہونے والی ترقی (ریل، تار، شفاخانہ، سڑک) کا ذکر بھی کیا گیا ہے (۲۱)

---

(۱) مظہر محبت دیوان ہر چند رائے ہر چند میرٹھی ص ۲۱۹، مطبع دارالعلوم میرٹھ ۱۸۷۷ء
(۱) (۲) مضمون نقش و نگار ضمیر در آئینہ کمالات دبیر از افسر صدیقی امروہوی ص ۹۰، ص ۱۰۳، رسالہ اردو شمارہ نمبر ۳۰، ۱۹۷۵ء
(۳) باغ فکر از عبدالغفور نساخ مطبوعہ ۱۳۱۲ھ بحوالہ فہرست کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی ۱۳۳۲ھ مطبع اختر دکن حیدرآباد دکن [نساخ کا ایک قصیدہ در مذمت سفر ... بھی ملتا ہے (اردو شاعری کا تذکرہ ... فلسفیانہ عنصر ص ۱۲۸)]
(۴) تذکرۂ شعرائے جےپور ص ۱۷۰ (۵) تا (۸) تزک محبوبیہ ص ۲۵، ۱۱۱، ۱۲، ۵۵، ۴۴ اور ۸۷
(۹) مضمون مستند الشعرا از سخاوت مرزا اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۸ء
(۱۰) تبصرہ بر تبسیح خیال ص ۳۸ سب رس جلد ۲ ۱۹۷۲ (۱۱) یادگار ضیغم ص ۲۷۲، دلستان دبیر ص ۱۹۱
(۱۲) میسور میں اردو ص ۸۸ (۱۳) تذکرہ شعرائے برہانپور از افتخار احمد خلیل سہ ماہی اردو ۱۹۷۵ء
(۱۴) قندیل حرم مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین سنگ میل لاہور ۱۹۷۴ء
(۱۵) اردو کے یوروپین شعرا ص ۲۲ (۱۶) آثار الشعرا ص ۴۴ (۱۷) ایضاً ص ۱۵۵
(۱۸) آثار الشعرا ص ۱۲ (۱۹) سلہٹ میں اردو ص ۳۷ (۲۰) قصیدہ بردہ و بانت سعاد افضل المطابع دہلی ۱۳۲۷ھ
(۲۱) دیوان بہجت و ضمیمہ دیوان بہجت مطبع رضوی دہلی ۱۹۱۱ ص ۱۱۰ تا ۱۱۸ و ص ۵ تا ۱۲
ص ۱۱۰ تا ۱۱۸ و ص ۵ تا ۱۲

مولانا خلیل الرحمن خلیل سلہٹی کے ایک قصیدہ کی خبر ملتی ہے[1]۔ انہوں نے یہ کسی عزیز کی شادی کے موقعہ پر کہا تھا

مجلس انتظامیہ ندوۃ العلما کی جانب سے چھپنے والی ندوۃ العلما ۵ جنوری ۱۹۰۵ء کے اجلاس کی روداد میں ندوہ کی تعریف میں مولوی محمد ابراہیم خاں[2] تاجر پارچہ معسکر بنگلور، نظام الدین فاروقی[3] اور اسماعیل مخموم[4] سوداگر کے قصائد طبع ہوئے ہیں۔ ان میں ندوہ کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اسی دور میں کنج بہار[5] کی لعل شفق جے پوری کے قصائد بھی طبع ہوئے۔ بشیر حیدر آبادی[6] نے ایک قصیدہ ۱۳۲۶ھ میں موسیٰ ندی حیدر آباد میں آنے والے سیلاب کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ جگناتھ پرشاد شوق[6] کے دیوان میں حکیم محمد احمد خاں خلف حکیم عبد المجید خاں رئیس دہلی اور لالہ ہری چند اسسٹنٹ کمشنر و مجسٹریٹ دہلی کی شان میں قصائد طبع ہوئے ہیں۔ مولوی ذوالفقار خاں ذوالفقار[7] پیش امام جامع مسجد ڈیگ اور منشی عبد الرزاق لجر تیہوری[8] نے تقریب ختنہ میاں ظفر احمد عرف میاں ککھن صاحبزادہ غوث محمد غوث جاگیر دار لجر تیہور پر قصائد لکھے ہیں۔ سید ظفر احمد کے جلسہ تشریح قرآن پر واعظ[9] نے قصیدہ لکھا۔ عبد الرحمن سید[10] نے اپنے بیٹے محمد اسمعیل خاں کی رسم ختنہ پر ایک قصیدہ لکھا۔ سفیر کاکوروی نے حیدر آباد کے پبلک گارڈن کی شان میں جو قصیدہ لکھا اس کا نام باغ عام تھا[11] سنگار ڈی کے فیض اللہ گوہر[12] نے علی گڑھ یونیورسٹی کے چندہ کے لئے قصیدہ لکھا۔ اس کا عنوان نظم گہر تھا۔ طالب بنارسی[13]، ماہ عظیم آبادی[14] اور کیفی دہلوی[15] نے سوائی جے پور کی شان میں قصیدہ نما نظمیں لکھیں۔ ایم محمد الدین عزیب[16] محمد مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول امرتسر نے لالہ برکت رام ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول امرتسر کی تبدیلی کے موقعہ پر دو قصیدے لکھے ایک اپنی جانب سے پیش کیا اور دوسرا طلبائے جماعت دہم کی جانب سے۔ حفیظ الکریم حفیظ[17] کا قصیدہ دسہرہ بہت معروف ہوا تھا۔ اس میں رام و لکھن کے "معجزات" کا ذکر ہے اور رشی اور منی کو دشمنوں سے بچانے کا تذکرہ ہے۔ اور لکھا گیا ہے رام و لکھن نے تمام عمر گمتو برہمن کی رکھشا کی۔ محمد خلیل الدین حافظ پیلی بھیتی کا دیوان چہارم آئینہ پیغمبر کے نام سے ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا تھا۔ اس میں ایک قصیدہ تاریخ جلسہ دستار بندی مدرسہ اہل سنت بریلی ۱۳۲۹ھ ہے اور دوسرا صدر الدین احمد کی مدح میں یہ انجمن اتحاد کے سالانہ جلسے میں پڑھا گیا تھا[18]۔ خلیل اللہ خلیل کے شعری مجموعہ کشکول میں مسلم کانفرنس راجشاہی کے حوالے سے ایک قصیدہ طبع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں چودھری نواب علی خاں (زمیندار میمن سنگھ) کی شان میں بھی ایک قصیدہ ان کی یادگار ہے[19]

---

(۱) سلہٹ میں اردو ص ۱۶۵ (۲) تا (۴) اجلاس دہم ندوۃ العلما از مجلس انتظامیہ ص ۹۸، ۷۵، ۵۱ شاہجہانپور ۱۹۰۵ء (۵) بہار شفق مجموعہ کلام از شفق مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۳ھ (۶) دیوان بشیر ص ۵۲ (۶) دیوان شوق ص ۹۳، ۹۶ (۷) رسالہ کمال دہلی ص ۱۶ اگست ۱۹۱۱ (۸) ایضاً ص ۱۷ (۹) ایضاً ص ۱۹ (۱۰) اردو مشنویوں کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر ص مطبوعہ دہلی ۱۹۱۱ء (۱۱) رسالہ صبح بہار ص ۳۵، نومبر ۱۹۱۱ء (۱۲) ادیب فروری مارچ ۱۹۱۱ء، ص ۷۱ (۱۳) ادیب الہ آباد ۲، ۲، ۲۲۵ (۱۴) (۱۵) ایضاً (۱۶) قصیدہ جات مدحیہ از عزیب محمد ص ۲۵، ۷ مطبع ریاض ہند امرتسر ۱۹۱۲ء

(۱۷) قصیدہ دسہرہ ص ۱۹۲، رسالہ ادیب اکتوبر ۱۹۱۲ء (۱۸) آئینہ پیغمبر از حافظ مولوی خلیل الدین نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۲ء

(۱۹) سلہٹ میں اردو ص ۸۹، ۹۱

سید غلام عباس[1] سہارنپوری کے دیوان میں مرزا محمد حسن سررشتہ دار فوجداری سہارنپور کی شان میں ایک قصیدہ دستیاب ہے۔

منشی شیو پرشاد وہبی[2] مینجر اودھ اخبار کے کلیات میں جوڈیشل کمشنر لکھنؤ، کرنل فلکنر و کمشنر سیتاپور کی شان میں قصائد ملتے ہیں۔ مونس رام برہمن[3] کہ جو غالب کے تلامذہ میں سے تھے ان کے دیوان میں لالہ جگناتھ ساہو، لالہ جواہر لال ساہو اور لالہ چیناملی ساہو کی شان میں قصائد دستیاب ہیں۔ اشرف علی مست سلہٹی[4] نے ۱۸۸۱ء میں ایک قصیدہ در شان کشتی لکھا ہے۔ اس میں فن کشتی کے داؤں پیچ، تھپکیوں کی تعریف اور ڈگیشریوں کی تعریف ملتی ہے انشیاں، سواری، دلولی باٹ کے علاوہ خوشیچی اور استاد ناگا سی کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ حافظ عبدالرحمن حیرت[5] جھنجھانوی کے دیوان مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۶ء میں سید احمد خاں بہادر کی شان میں بہت سے قصائد ملتے ہیں انہوں نے حاجی محمد اسمعیل احمد خاں اور محمد اکبر کی مدح بھی کی ہے۔ لالہ چند فلک[6] کا ایک مذہبی قصیدہ رام راجا کی مدح میں ہے[7]
نواب قمر الدین حیدر خاں (روہیل کھنڈ) کا ایک قصیدہ سراج[8] کے دیوان مصباح النظم کے آخر میں چھپا تھا اس میں سراج (سراج الدولہ علی محمد خاں بہادر) کی مدح کی گئی ہے۔ میراں شاہ جالندھری[9] کا قصیدہ ریل، ریل گاڑی کی تعریف میں لودھیانہ سے چھپا تھا۔
صل علی احمد[10] سجادہ نشین حضرت شاہ ابوالمعالی سہارنپور کے مجموعہ کلام "نسخہ عشق حق" میں ڈپٹی کلکٹر وقار علی بیگ اور ذوالفقار علی ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی تالیف "تذکرۃ البلاغت" کی شان میں قصائد ملتے ہیں، انہوں نے ایک قصیدہ شہر آشوب بھی لکھا ہے
محمد اسمٰعیل سلہٹی[11] نے اپنے استاد شمس العلما مولانا ابوعلی محمد وہاب کی شان میں ایک موثر قصیدہ لکھا۔ محمد اکبر خاں اکبر[12] سہارنپوری کا ایک قصیدہ اسپیشل مجسٹریٹ میرٹھ امیر اللہ خاں کے فرزند کے بعد اپنے پر ہے اس میں انہوں نے ممدوح کی تم تم کی بھی تعریف کی ہے
امیر علی ولا[13]، منشی قادر بخش شاد[14]، درگا سہائے سرور جہان آبادی[15]، محمد شفیع ناظر[16] کے قصائد احمد حسن شوکت پروانہ مدیر رسالہ پروانہ، سخنۂ ہند و طوطی ہند میرٹھ کی شان میں ملتے ہیں۔ مولانا اشہری[17] نے "دیانت و خیانت" اور خوشامد کے موضوعات پر قصائد لکھے۔ علامہ حید رکشتہ[18] غازی پوری کی نظمیں "پھولوں کا ہار" "مزے کی رات"، محمد باقر رازی[19] کی "شگوفہ نصیحت" اور سراج الدین احمد کی "باکمال"[20] قصیدہ کی ہیئتوں میں لکھی گئی ہیں۔ قصیدہ کی ہیئت میں اس دور میں بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں۔ محولہ بالا محض ریکارڈ کے لئے ہیں۔
علی محمد شاد عظیم آبادی نے ایک قصیدہ بزرگان عظیم آباد کی شان میں لکھا ہے[21] مجیب حسین مجیب[22] سابق مدیر رسالہ معلم نسواں حیدرآباد کے دیوان میں قصیدہ قومیہ، قصیدہ تعلیمیہ بر بنائے مدرسہ آصفیہ، قصیدہ مذمت "قصیدہ در مدح اخبار"، اور قصیدہ در مدح عبدالحلیم شرر طبع ہوئے ہیں

---

(۱) دیوان عباس، از غلام عباس عباس ص ۱۰۳، مطبع مطلع الانوار ۱۲۸۷ھ (۲) مرقع ارژنگ، کلیات وہبی ص ۱۹۷ نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۷ھ
(۳) دیوان مونس از مونس رام برہمن، ص ۵۹، ۲۰، ۴۲، ۹۰، گیان پریس دہلی ۱۸۸۱ء (۴) سلہٹ میں اردو ص ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۹۰
(۵) دیوان حیرت از عبدالرحمن حیرت، ص ۱۶۱ تا ۱۸۵، نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۶ء (۶) پیام فلک از لالہ چند فلک ص ۵۵ لاہور ۱۹۲۰ء
(۸) مصباح النظم ص ۸۶۲ (قصیدہ) مطبع اثنا عشری لکھنؤ ۱۳۰۱ھ (۹) مجموعہ ریل نامہ مرتبہ خلیفہ بخت بہادر ص ۱۵ لودھیانہ سن ن
(۱۰) نسخہ عشق حق از صل علی احمد ص ۱۳، ۵۰، ۵۹، مطبع رفاہ عام سیالکوٹ سن ن (۱۱) سلہٹ میں اردو ص ۱۲۹
(۱۲) باغ کلام اکبر ص ۴۷ تا ۵۱، مطبوعہ سہارنپور ۱۳۱۷ھ (۱۳) پروانہ مئی ۱۹۰۰ء (۱۴) پروانہ میرٹھ ۲۲ مئی ۱۹۰۰ء
(۱۵) پروانہ ص ۱۲، ۱۵ مارچ ۱۹۰۰ء (۱۶) پروانہ ص ۱۳ میرٹھ مارچ ۱۹۰۰ء (۱۷) پروانہ فروری ۱۹۰۱ء، جنوری، فروری ۱۹۰۱ ص ۳
(۱۸) پروانہ ستمبر ۱۹۰۲ ص ۳ و جون ۱۹۰۲ ص ۱۹ (۱۹) رسالہ فصیح الملک مارہرہ ص ۴ (۲۰) مخزن ص ۴ ستمبر ۱۹۰۲
(۲۱) مخزن ص ۹، ۱۴، دسمبر ۱۹۰۲ء (۲۲) دیوان مجیب از مجیب حسین مجیب ص ۱۲۵، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۴۷، ۱۰۱، ۱۵۱ دکن ۱۹۵۳ء

جالندھر کے محمد عاشق یاس نے جو قصیدہ شہر آشوب لکھا ہے اس میں لکھا گیا ہے کہ زمانے کی زبوں حالی سے صاحب دیہیم و سریر لبِ خاک پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ اہل سخاوت خوار و حقیر ہیں۔ بے مثال لوگوں پر زمانہ انگلیاں اٹھا رہا ہے۔ صاحب اقبال ضعیف القسمت ہیں، اور ان کے مقابلے میں بد بخت جلیل القدر ہیں۔ ننگ کی تصویر کھینچ کر بیچنے والے آج مانی و بہزاد کی صنعت پر طعنہ زن ہیں اور مزید یہ کہ

عالم و اہل قلم، فاضل و عامل ہوئے گم + روستا زادے ہوئے صاحب علم اور دبیر (۱)

جواہر ناتھ ساقی نے کرشن کی مدح میں قصائد لکھے۔ ان میں ہندی دیومالا سے استفادہ کیا گیا ہے (۲)

ناظم علی ناظم خیر پوری نے شیخ نوشاد علی خاں تعلقہ دار خیر پور کا قصیدہ لکھا (۳)

منشی محمد رضا، رضا کے شعری مجموعہ "منظور عالم" (مطبوعہ کلکتہ) میں (قصائد شاہانہ) حضرت سید شاہ غازی مبارک کی شان میں قصائد موجود ہیں ان میں کلس و کمہار ن و توصیف عنسل غازی کے عنوانات بھی ہیں (۴)

مبشر حسین مبشر قدوائی وارثی (لکھنؤ بارہ بنکی اودھ) کا قصیدہ در مدح ہند ان کی وطن دوستی کے جذبات کا مظہر ہے (۵)

ماتا پرشاد ساغر دریا بادی نے رائے نرائن بلی تعلقہ دار دریا باد کی شان میں قصیدہ لکھا (۶)۔

اختر النبی اختر کے قصائد کا ذکر سلہٹ میں اردو کے مؤلف نے کیا ہے (۷)۔

ملجو بیگم لکھنوی [م ۱۹۲۳] کے مجموعہ کلام شمع خاموش میں ایک قصیدہ نصیحت ملتا ہے اور گروشیہ کی مدح میں (۸) یہ قصائد عورتوں کی منی اور تعلیمی تربیت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔

منشی حفیظ اللہ حفیظ اکبر آبادی کے دیوان میں کنور رچپکن سنگھ (خلف مہنت شاردل سنگھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چھوٹی شاہدری اودھ پوار) کی پیدائش پر ایک قصیدہ دستیاب ہے (۹)

سید رضی الدین رضی نے دارالعلوم حیدر آباد دکن کی شصت سالہ جوبلی کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا (۱۰)

امرتسر کے سردار اندر سنگھ (وائس پریذیڈنٹ سبھا پرکاشک سوسائٹی اور ٹرسٹی خالصہ کالج) نے گوبند سنگھ کی تعریف میں قصیدہ لکھا (۱۱)۔ اس میں اورنگ زیب اور سکھوں کی چپقلش کا بھی ذکر ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کرپان، کنگھا، کچھ، کڑا، کیس سکھوں سے جدا نہیں ہونے چاہییں

---

(۱) غنچہ نعت از محمد عاشق یاس ص ۷۰، آریہ مشین پریس جالندھر ۱۹۱۳ء (۲) دیوان ساقی از جواہر ناتھ ساقی ص ۲۵۷، ۲۵۹ دہلی ۱۹۲۵ء
(۳) تاریخ دریا باد ص ۸۲ (۴) منظور عالم از منشی محمد رضا ص ۵۶، ۵۷ کلیمی کلکتہ ۱۹۲۱ء (۵) دیوان مبشر ص ۱۶۱ مطبع جامعہ ملیہ علی گڑھ ۱۹۲۴ء
(۶) تاریخ دریا باد ص ۸۷ (۷) سلہٹ میں اردو ص ۸۰ (۸) شمع خاموش از ملجو بیگم لکھنوی، عصمت بکڈپو دہلی س ن
(۹) دیوان حفیظ اکبر آبادی ص ۱۱۵، منظور عام الیکٹرک پریس لدھیانہ ۱۹۲۱ء (۱۰) کیف سخن انتخاب کلام رضی ص ۱۰ دکن ۱۹۳۵ء
(۱۱) تحفۂ نادر از اندر سنگھ سردار، مطبع وزیر ہند امرتسر س ن ص ۱۲، ۱۳

انتخاب اشعار [حوالوں کے لیے دیکھیے ۵۸۴ ص ۶۷۵ تا ۵۱۴۲

تہنیت کنور جنگ بہادر ـــ خواب راحت سے ابھی میں نہ ہوا تھا بیدار + کسی مسجد میں موذن نے اذاں دی یکبار [منشی ظہور حسن]

مدح نول کشور پرس سخن ـــ مژدہ اے دل کہ شگفتہ ہوا صحن گلزار + رخصت اب باد خزاں ہو گئی اور آئی بہار [دیبی پرشاد سحر]

مدح شاہ متین احمد ق ـــ گیا جو ایک چمن میں میں سیر کو تنہا + تو نکہت گل و غنچہ سے لطف خلد ملا [فخر الدین حسین سخن]

راجہ راجندر سنگھ والیٔ پٹیالہ ـــ طلوع مہر روشن گر مبارک ہو + کہ صبح عید ہوئی جلوہ گر مبارک ہو [سلیمان خاں سلیم]

قصیدہ نعت ـــ ازل کے روز سے میرا وہ برگشتہ مقدر ہے + نہیں آرام اک ساعت بہ رنگ چرخ چکر ہے [طالب ملتانی]

در مدح غوث الاعظم ـــ غوث پاک اپنی دکھا دیجئے وہ شان مجھے + جس سے مل جائے چمکتا ہوا ایمان مجھے [محمد جان حیرت]

در مدح مختار الملک ـــ قدم مہر سے روشن جو ہوا برج حمل + چمنستاں میں پھنکی لالہ و گل کی مشعل [مستا بیگ مستا]

قصیدہ تحل ـــ اللہ نے بخشی ہے زباں کو مری تاثیر + الہام کے مضموں ہیں اعجاز کی تقریر [محمد حیدر علی حیدر]

در مدح منشی امیر اللہ علی ـــ آج ہے مرغ تفکر میں مرے وہ کس بل + چھان ڈالے ابھی اک آن میں سب دشت و جبل [پنڈت سورج لعل بیکش]

ملکہ وکٹوریہ ـــ جو بخت خواب میں جاگا تو آ گیا یہ خیال + کہ لکھ قصیدہ وہ جس کی جہاں میں ہو نہ مثال [شاہ امین الدین قیصر]

در مدح میر محبوب علی ـــ فصل بہار آئی عجب دھوم دھام ہے + مصروف سیر باغ میں ہر خاص و عام ہے [عبد الرشید رشید]

ایڈورڈ ہفتم ـــ گر عروس فکر رنگیں منہ سے سرکائے نقاب + آسماں سے اشرفی کر دے نچھاور آفتاب [پیارے لال رونق]

ایڈورڈ ہفتم ـــ ہے رخ دور زمانہ اب سوئے راہ صواب + کجروی سے آسماں کو ان دنوں ہے اجتناب [محمد مجیب اللہ]

ایڈورڈ ہفتم ـــ عیش کا جلوہ نظر آنے لگا آثار سے + کیا سعادت سے نمایاں طالع بیدار ہے [محمد کرام الدین دبیر]

مدح شیو چرن جگر ـــ یہ توبہ لب پہ کیا آنے کے دن ہیں + خوشی سے مست ہو جانے کے دن ہیں [میر مہدی مجروح]

قصیدہ نعت ـــ نہیں ممکن کہ تیرا مثل ہو پھر دہر میں پیدا + اگر صد بار بندد نقش تو ایں دار امکانی [ظفر مہدی اثیم]

قومی قصیدہ ـــ ہاں وہ ہے نیند کہ محشر میں بھی اٹھا کیا + کان میں صور کو پھونکا ہی کرے اسرافیل [بنواری لال شعلہ]

حسام الملک خانخاناں ـــ کیا ہوا میں ہے عطر افشانی + ہے معطر دماغ روحانی [میر محمد سلطان عاقل]

ملکہ وکٹوریہ ـــ آج کس بات کی شادی ہے تہ چرخ کہن + تہنیت کی جو صدا ہند سے پہنچی لندن [سید محمد آثم]

قصیدہ جشن ـــ خیاباں کھل گئے فصل چمن میں آ بہار آئی + شمیم انگیز اس کی ہر نوید جانفزا آئی [بلدیو کشن خورشید]

قصیدہ حج ـــ ہم نے دیکھے تھے گدایان مسلمانے چند + چشم دل سے جو نگہ کی تو بہ مردانے چند [لالہ پاگل داس]

نواب کلب علی خاں ـــ دور ایام سعادت یہ ہوا عالم گیر + ہر ستارہ نگراں ہے طرف سعد کبیر [اکبر دانا پوری]

نواب حامد علی خاں ـــ اک دن دل نے کہا مجھ سے یہ ہو کر بے قرار + بخت خفتہ کی طرح سوتا ہے کیا غفلت شعار [حیات بخش رسا]

جارج پنجم ـــ ہے طلوع شفق صبح سے ظلمت کافور + ید قدرت نے رخ شب پہ ملا غازۂ نور [حمید میرٹھی]

لارڈ منٹو ـــ جو آئے لارڈ منٹو تین دن مہماں ہو کر + بحمد اللہ گئے واپس نہایت شادماں ہو کر [محمد فضل رب]

در مدح میر محبوب علی ؎ ہے فیض بہاراں سے چمن طارم اخضر + نسرین ہے یاں نور فشاں چرخ پہ اختر [نظیر حسین سخا]
دربار شہنشاہی ؎ پھر کھلا صبحدم دریچۂ نور + ظلمت شام گم ہوئی کافور [نادر کاکوروی]
شیو نرائن بہادر کی مدح ؎ ذرا کسی سے نہ تھا یہ رفاہ عام ایسا + کبھی نہ لوگوں کے غصے سے یہ ہوا ناچار [بشن نرائن دلبر]

قصیدہ غدیریہ ؎ گرچہ دنیائے دنی روز ازل سے ہے قبیح + باغ عالم ہے مگر آج مقام تفریح [علی جعفر ذکا]
قصیدہ نعت ؎ گل نقش قدم شاہ پہ تھی دل سے نثار + آئی تھی دیکھنے کو گلشن جنت کی بہار [امجد علی نیر]
بحر طویل ؎ للہ الحمد یہ وہ روز ہے فیروز کہ نوروز سے بڑھ کر طرب اندوز ز دل افروز ہے سامان بہار [شمس الدین حمزہ]
عشرت انگیز بصد گونہ دلآویز ہے نوخیز ہے گلریز ہے ہر شاخ گلستان بہار
در مدح وائسرائے ؎ یہیں نغمہ ہے پرشور عندلیبان خوش الحاں کا + کہ عالم ہر شجر پر ہند کے ہے باغ رضواں کا [سہاگن بیگم]
میر محبوب علی ؎ کس گل کی مہک چمن چمن ہے + کس نافہ کی بو ختن ختن ہے [لقمان الدولہ دانا]

نعتیہ قصیدہ ؎ اللہ رے کیا مرتبہ کیا شان و حشم ہے + جو عرش علی فاخر تلمیس قدم ہے [ممتاز الدین ممتاز]
مدح عبد المقتدر ؎ بادہ عرفاں سے کیا لبریز ہے پیمانہ آج + مے کشی سے مست ہے خود ساقی میخانہ آج [سعید الدین شائق]
قصیدہ نعت ؎ آج پھر طبع رسا کا وہی امڈا بادل + دیکھیں برساتا ہے کیا کیا در یکتا بادل [محمد سعید الدین کامل]
قومی قصیدہ ؎ پھیلیں گے پھولیں گے گلزار قوم کے اشجار + اٹھا ہمالیہ پربت سے ابر گہر بار [رتن ناتھ سرشار]
قصیدہ ؎ بدل ہوئی ہے فراخی سے تنگی عالم + ہوا ہے دامن چشم بخیل دست کریم [علی حسین تمیز]
ایضاً نواب رامپور ؎ سجدہ جو کر گیا دل دولت پر آفتاب + مشہور ہو گیا ہے شہ خاور آفتاب [علی نقی غنی]
قصیدہ ؎ آ گیا سامنے وہ بت دل و دیں کا دشمن + رخصت اے شیخ حرم کفر ہوا توبہ شکن [فخر الدین فخر خیالی]
قصیدہ نعت ؎ حسن ملیحان ہند ہے نمک خوان دل + ہے دہن زخم دل صاف نمکدان دل [محمد نوح ہشیر]
محبوب علی خاں ؎ صبا نسیم سے کہتی ہے سالو چل پیاری + کہ دیکھ آئیں گے باغ دکن کی تیاری [یعقوب علی اشہر]
نعتیہ قصیدہ ؎ فصل گل آئی ہے سرسبز ہوئے ہیں گلشن [محمد رزاق کلاقی]
میر محبوب علی ؎ ہے صبح طرب خیز مسرت کی ہے شام آج + زینت دہ محفل ہیں خواص اور عوام آج [ابو تراب]
ایضاً ؎ کبھی عروج پہ تھا ماہ آسمان کمال + کبھی فلک سے بھی اونچی تھی نردبان کمال [عبد الحی بازغ]
ایضاً ؎ یہ کس کے جشن کی یارب ہوئی ہے آج تیاری + کہ مخلوق خدا ہشاش اور بشاش ہے ساری [بندہ علی ارمان]

قصیدہ نعت ۔ اے سید دوسرا اے خواجہ دنیا و دیں + اے تاجدار اہل آل اے صدرِ ۔ [محمد نعیم الدین شاہ]

قصیدہ نعت ۔ کہ دل کو ہے نکہت روح روانِ پیغمبر + غذائے روح و دل و دیں شمیم جاں پرور [نواب مردان علی خاں رعنا]

ایضاً ۔ مجتبیٰ خیر الوریٰ نور الہدیٰ صلِ علیٰ + احمد مرسل محمد مصطفےٰ صلِ علیٰ [مفتی غلام سرور لاہوری]

قصیدہ در مدح مرشد ۔ بھرا ہوا ہے گل شوق سے مرا داماں + مئے نشاط سے چہرہ ہے مثل خور تاباں [مولانا عبد الحلیم حلیم]

قصیدہ نعت ۔ شافع روز جزا ہادی ہر خاص و عام + معدن جود و سخا دافع کفر و ظلام [حاجی عبد الحق صادق]

قصیدہ در مدح کالی دیوی ۔ لکھتا ہوں میں وصف شان کالی + اب دل میں مرے ہے دھیان کالی [چھوٹو لعل خوب]

قصیدہ نعت ۔ مری وہ فکر رسا ہے وہ ہوں طبیعت دار + ازل کے روز سے لکھتا ہوں نعت کے اشعار [لطف علی خاں لطف]

ایضاً ۔ مرے سر پر ہے سایہ چتر داغ سینہ پرور کا + نہیں کچھ غم تموز آفتاب روز محشر کا [رکن الدین مکمس]

قصیدہ مدح معین الدین سنجری ۔ ہے جلوہ گر مرے دل میں وہ شاہد پنہاں + کہ جس سے دل ہے رخ مہر وحدہ پہ نور افشاں [عبد الصمد کلیم]

قصیدہ مدح عبد القدوس گنگوہی ۔ فکر مدح شاہ میں اے خامہ تیز اسر جھکا + یہ سعادت چشم بد دور آفریں صد مرحبا [ناہر علی خاں مضطر]

قصیدہ نعت ۔ ثناخواں جو کوئی ہو یا الٰہی ذات احمد کا + صلہ اس کو ملے باغ جناں صدقہ محمد کا [محمد امین خاں امین]

قصیدہ در مدح ثناء اللہ ۔ دلا ارماں ہے کچھ ولولہ اپنا بیاں کر دے + کہ مولینا ثناء اللہ کا شمہ بیاں کر دے [ساجد علی ساجد]

قصیدہ مدح معین الدین چشتی ۔ کہ شور مچا ہے حمد خدا کا، دھوم مچی ہے نعت نبی کی + ذکر ہے خوب اصحاب ہدا کا، مدح و ثنا ہے ہندولی کی [عبد الباقی فنا]

قصیدہ منقبت علی ۔ بہار آئی ہے ساقی جوش ہے پھر مدح حیدر کا + محل میں بھی ہوں اک جام شراب حوض کوثر کا [اصغر حسین ثمر]

قصیدہ نعت ۔ ہوئی ہے بسکہ مری جاں پہ غم کی طغیانی + مثال آئینہ ہوں مبتلائے حیرانی [محمد شفیع ناصر]

قصیدہ نعت ۔ نظر آیا جسے جلوہ کلام پاک ایزد کا + وہ سودائی ہوا گیسوئے پیچان محمد کا [صادق حسین]

قصیدہ در مدح داتا گنج بخش ۔ حضرت داتا سے ہے یہ التجا + ہو نظر مجھ پر بھی یا حضرت ذرا [محرم علی چشتی]

قصیدہ منقبت ۔ خالق نے بنایا ہے تجھے علم مجسم + قرآں ہے مرا دل تو مرا سینہ ہے تفسیر [یوسف علی ناظم]

قصیدہ نعت ۔ ساقی پلا وہ بادہ تسنیم بید رنگ + ہے مدح مصطفےٰ کی مرے دل کو اب امنگ [محمد رضوان علی رضوان]

قصیدہ منقبت ۔ لامکاں تک گیا رسا ہے اقتدار مرتضےٰ + مرحبا اے دل زہے عز و وقار مرتضےٰ [امین]

ایضاً ۔ اہل نخوت سے جھکے کب خاکسار مرتضےٰ + کیا دیا اس چرخ اخضر نے غبار مرتضےٰ [اغلب]

ایضاً ۔ بعد مردن جب نظر آئی بہار مرتضےٰ + بلبل دل ہو گیا میرا نثار مرتضےٰ [شیخ عبد الحق اختر]

ایضاً ۔ دل سیر ہے گدائے جناب امیر کا + خالی کبھی رہا نہیں کاسہ فقیر کا [میر انیس]

قصیدہ منقبت حسین ۔ سبب کیا ہے صبا کیوں خاک بر سر ہے گلستاں میں + سبب کیا ہے جو ہیں لخت جگر ہر گل کے داماں میں [منشی ہنر ور]

قصیدہ منقبت ۔ بیاں گر وصف ہو ہم سے علی کے روئے انور کا + دبے ذرے سے پہلو حشر میں خورشید خاور کا [شمیم]

صنعت غیر منقوطہ مدح امام آخر ۔ اہل ہمہم امام محمد علم ہوا + اور اس کا مدام دل کو ملال و الم ہوا [کلب حسین نادر]

در صنعت ذو بحرین ۔ مدح میں دل زمزمہ پرداز ہے + طائر قدس آج ہم آواز ہے [ایضاً]

در منقبت علی ۔ آمد موسم عشرت کے بندھے ہیں سب ڈھنگ + خود بخود ہے طرب عیش کا دل کو آہنگ [مولوی ابو محمد]

ایضاً ۔ عاشق فصل بہاری ہوں میں وہ زیر فلک + سال بھر شوق میں جس کے ہنسی تکتی ہے پلک [ابو القاسم فتح پوری]

مقیدہ منقبت سہ سب کچھ اے داد گر دیا تو نے + کہ دل باخبر دیا تو نے [مرزا اوج]

مقیدہ مدح کعبہ سہ دل تڑپتا ہے شب و روز برائے کعبہ + پھر وہ دن ہو کہ خدا ہم کو دکھائے کعبہ [مرزا العشق]

مقیدہ منقبت علی سہ لکھتا ہوں جو ہم شکل پیمبر کا بیاں آج + اشعار بھی خامہ سے نکلتے ہیں جواں آج [بزم]

ایضاً سہ ازل میں جوش پر آیا جو دریا حق کی رحمت کا + سر احمد پہ رکھا تاج عالم کی شفاعت کا [لطف]

مقیدہ مدح امام آخر زماں سہ فصل گل آئی ہے بدلی ہے ہوائے گلشن + محو آرائش و زینت ہیں عروسان چمن [عیش]

مقیدہ نعت سہ مدینہ میں نہ کیوں کر ہو مزہ عشق مخلد کا + ریاض خلد کی دیتا ہے بو روضہ محمد کا [میر عباس علی عالی]

مقیدہ منقبت سہ بدلتا ہے ہمیشہ رنگ اپنا گنبد خضرا + کبھی گلگوں کبھی میگوں کبھی نیلا کبھی پیلا [میر حمید رشیدی]

ایضاً سہ مدح خواں ہوں میں ازل سے شاہ خیبر گیر کا + قدسیوں میں وصف ہوتا ہے مری تقریر کا [مرزا محمد زکی]

ایضاً فلک پہ چشمۂ حیواں ہے یا ہے ابر مطیر + زمیں بہ بارش باراں کی ہے عجب تاثیر [سید مظہر حسین مظہر]

ایضاً سہ وہ خط گو کہ سبقت لے گیا جو ہفت کشور سے + وہ طبقہ جس کا ذرہ کم نہیں مہر منور سے [اشارت حسین ذکی]

مقیدہ نعت سہ تزلزل قصر کسری میں ہے کیسا شور محشر ہے + ہر اک بت آج کیوں اللہ کے گھر میں نگوں سر ہے [بادشاہ محی الدین شافعی]

مقیدہ حمد سہ ہمسا قیا اک جام وحدت کا پلایا جا ہیے + بے خودی کا رنگ عاشق کو دکھایا چاہیے [شیخ محمد خاں خادم]

مقیدہ سری کرشن سہ کرشن کون ؟ گرایا جنہوں نے کنس کا سر + وہ آئے شام کنہیا ہے جن کے ہر دے پر [جگنا تو پرشاد شوق]

مقیدہ مناجات سہ اے خدا کارساز و عیب پوش و کردگار + اے مرے پیارے مرے محسن ، مرے پروردگار [مرزا غلام احمد]

مقیدہ جہاں آشوب سہ گردش چرخ کا احوال کروں کیا تحریر + صفحۂ ارض و سما نہیں ممکن تفسیر [محمد عاشق یاس]

مقیدہ نعت سہ اے ہمدم شیریں سخن ، ہے نور حق پر تو فگن ، ہر نخل گل کی ہے پھبن ، طور جمال ذو المنن

بن ٹھن عروسان چمن ، شیریں ادا نسریں بدن ، رنگیں قبا گل پیرہن ہیں کس طرح خندہ زن [وحید الدین مفتون و سلیم]

مقیدہ نعت سہ بردلم زنور محمدی جو دیا خدا نے جلا دیا + کروں شکر اوس کا نہ کیوں ادا یہ تن بدن کو جلا دیا [برہان]

مقیدہ نعت سہ نہایت جوش پر عشق قدم ہے جبر و جدال میں + بحمد اللہ فلک پرواز ہے دل ذوق عرفاں میں [محمد رسول لعانی]

ایضاً سہ یارب ہو صلوٰۃ اس پر جو سلطان امم ہے + ختم رسل و صاحب اکلیل و حشم ہے [حاجی عبد اللہ آشفتہ]

مقیدہ منقبت سہ جہاں میں پاسبان دیں علی مرتضیٰ دیکھو + جہاں زاہد عاصی کے یہ ہیں ناخدا دیکھو [عاشق ملتانی]

زاہدہ خاتون شروانیہ [م ۱۹۲۲ء] بھیکم پور کے شروانی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ان کے دو نعتیہ مجموعے آئینۂ حرم اور فردوس حرم شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مذہبی قصائد کا ذکر کیا جاتا ہے (۱)

امام الدین راقب [پ ۱۸۲۳ - ۱۸۹۴ء] میں فرید کوٹ پوری کے شاگرد ہوئے مہاراجہ فرید کوٹ کے دربار میں کئی سال قصیدے پیش کیے (۲)

علی نواز تصور امانت خانی نے میر عثمان علی نظام دکن کی شان میں ایک عمدہ قصیدہ لکھا (۳) تصور کا کلام مضمون آفرینی، بندش کی چستی، کلام کی صفائی اور روانی کے اعتبار سے بلند پایہ تھا (۴)

محمود دہلوی ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے ان کے دیوان میں نواب میر عثمان علی خاں بہادر (ہو غیرتِ قیصر جناب ہے صدر ایوان حضور) (ہو قابل نظارہ ہے نقش و نگار بوستاں ۔ تشکر اضافۂ تنخواہ) نواب محمد عبد الجبار (ہو ساقیا بادۂ گل رنگ سے لبریز مجلس نقل ۔ اظہار شادمانی حج و زیارت و تولد فرزند) نواب یوسف علی خاں عرف دادر خاں رئیس شہر مدراس (ہو ہوا ہے ایک جہاں رتبہ دان دادر خاں) نواب محمد ولی داد خاں (ہو لایا ہے جشن سالگرہ کا پیام عیش ۔ تہنیت سالگرہ) (ہو بام گردوں سے چمک کر آفتاب و ماہتاب ۔ تہنیت تسمیہ خوانی دختر) غلام احمد خاں (ہو نغمہ خوانی طبع موزوں پہ قدرتی ہے گراں ۔ اظہار غم وفات) اور صوفی شاہ احمد چشتی بیجاپوری کی مدح میں بلند پایہ قصائد موجود ہیں۔ ان میں قصیدے کی روایتی تکنیک اور مواد کا استعمال ہے (۵)

شاہ علی خاں امجد کا قصیدہ ساز خوشی مشتمل بر مبارکباد میر عثمان علی خاں ۱۹۲۳ء میں طبع ہوا تھا (۶)

میر عبد الحسین سانگی [م ۱۹۲۴ - ۱۹۲۶ء] سندھی کے والد قید فرنگ سے تھے وہ کلکتہ میں پیدا ہوئے ۱۸۸۴ء دکن ان کا دیوان سندھی اور اردو حصوں پر مشتمل شائع ہوا تھا۔ ان کے کلام میں قصائد ملتے ہیں انہیں شاہ عبد اللطیف بھٹائی سے بڑی عقیدت تھی (۷)

مشرقی منیری [م ۱۹۲۵ء] بہار کے قصبہ منیر شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کے اردو اور فارسی دواوین میں قصائد ملتے ہیں انہوں نے ایک قصیدہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبد الحمید خاں سلطان ترکی کا قصیدہ بھی لکھا (۸)

انصار حسین زلالی [م ۱۹۲۵ء] کے قصائد اجتہادی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ انہوں نے قصیدہ نویسی کے ضمن میں اس نقطۂ نظر سے کام لیا جسے حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں درج کیا ہے۔ زلالی کے سات مدحیہ اور پانچ نعتیہ قصائد ملتے ہیں (۹)۔ ان میں حقیقت و واقعیت کے علاوہ محاکات منظر کشی سے بھی کام لیا گیا ہے

---

(۱) اردو میں نعتیہ شاعری ص ۵۱۶ (۲) خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۳۵۲ (۳) رسالہ لسان الملک ص ۲ اگست ۱۹۲۳ء
(۴) دکن میں اردو ص ۷۰ ۴ (۵) دیوان محمود دہلوی ص ۱۸ تا ۱۹۷ دہلی ۱۹۲۳ء (۶) رسالہ لسان الملک ص ۹ اگست ۱۹۲۳ء
(۷) میر عبد الحسین سانگی کی اردو شاعری مضمون مختار استوری اردو نامہ جنوری ۱۹۷۱ء (۸) مضمون کلام مشرقی منیری از درخشاں ابدالی قومی زبان جون ۱۹۷۴ء
(۹) مضمون حالی کا ایک گمنام شاگرد از نیاز احمد بدایونی اردو نامہ ستمبر ۱۹۷۱ء

(۱)
حاجی محمد عمر سیمابؔ، آگرہ کے سوداگر تھے ۱۹۲۵ میں ان کا دیوان شائع ہوا اس میں قصیدہ حمد موجود ہے

لکھنؤ کے لچھمن پرشاد صدر ۱۹۲۶ میں زندہ تھے ان کے مجموعہ قصائد کی خبر ملتی ہے ۱۹۱۱ میں جارج پنجم کے جشن تاجپوشی پر اور ۱۹۲۶ میں نواب بھوپال کی تقریب تخت نشینی پر ان کے قصائد ملتے ہیں۔ نواب بھوپال کے قصیدہ کے ہر مصرعے سے تاریخ تخت نشینی برآمد ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے دربار دلی قصیدہ بھجوایا اور سند پائی (۲)

بشیر الدین احمد بشیر دہلوی کا جب دیوان شائع ہوا تو وہ نظام حیدر آباد کی سرکار کے تعلقدار پنشنر تھے۔ یہ ۱۹۲۶ کی بات ہے۔ ان کے دیوان میں رئیس دلی فیض احمد خاں اور قصبہ کرت پور ضلع بجنور کے رئیس پنشنر ڈپٹی کلکٹر خان بہادر منشی سید احمد حسن کی شان میں قصائد موجود ہیں اولاً کا پہلا مصرعہ ہے (ہو نواب فیض احمد ذی ہوش و ذی وقار) (۳)

افتخار حسین مضطر م ۱۹۲۷ کا تعلق خیر آباد سے تھا۔ وہ مشہور شاعر جاں نثار اختر کے والد تھے ان کے کلام میں سے گوالیار اور رامپور کے حکمرانوں کے قصائد ملتے ہیں۔ (۴) ان کا تذکرہ تذکروں کی زینت ہے (۵)

محمد عسکری وسیم م ۱۹۲۶ (۱۹۲۷) کا تعلق بھی خیر آباد سے تھا۔ عشرت کے کہنے کے مطابق وسیم کو قصیدہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ انہوں نے بہت سے قصائد (آسان اور مشکل زمینوں میں) لکھے۔ مہاراجہ گوالیار کے فرزند کی پیدائش پر قصیدہ گو شعرا کو اس طرح مصرعہ پر طرح مجھے اے موتیوں والے نیا گوہر مبارک ہو' قصائد لکھنے کے لئے کہا گیا۔ یہ طرح قصیدے کے لئے نہیں تھی تاہم وسیم نے ایک معرکۃ الآرا قصیدہ لکھا ہے اور فرزند کی ولادت کی تاریخیں بھی بہت سی صنعتوں سے نکالیں (۶)

(۷)
عبد الجبار خاں آصفی [م ۱۹۲۵ (۱۹۲۶)] کے کلیات میں نظم آصفی میں امرا کی مدح میں قصائد ملتے ہیں

اسد علی خاں آصفی [م ۱۹۲۶ (۱۹۲۷)] دربار آصفی کے امرا میں سے تھے۔ انہوں نے خاص تعداد میں قصائد لکھے (۸)

سعد اللہ شاد عظیم آبادی [م ۱۹۲۷] کے قصائد کا تذکرہ اپنے ایک مضمون میں قاضی عبد الودود نے کیا ہے (۹)

منتخب الدین تجلی [م ۱۹۲۷ (۱۹۲۸)] غزل اور قصیدہ میں مہارت رکھتے تھے (۱۰)

(۱۱)
دین محمد حسین محوی [۱۹۲۸ میں زندہ تھے] کا ایک قصیدہ نعت ۱۹۱۲ میں طبع ہوا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی اورنگ آباد کالج میں تشریف آوری پر بھی انہوں نے ایک قصیدہ لکھا (۱۲)

(۱۳)
غلام علی طبیب [۱۹۲۸ میں اورنگ آباد کالج کے مددگار تھے] مہاراجہ کشن پرشاد کی مدح میں ان کا قصیدہ ملتا ہے

عبد الخالق گرامی کہ جو اورنگ آباد کالج سے متعلق تھے انہوں نے بھی کشن پرشاد کی شان میں قصیدہ لکھا (۱۴)

---

(۱) جو کیا الہیں یہ زمانے کا گیا رنگ بدل / دیوان بہار صرفت (مبشرات عرفانی ۱۳۴۴ھ ص ۲۰۷) از حاجی عمر سیماب مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ ۱۹۲۵ء

(۲) مضمون مرزا غالب کے معاصر کی تاریخ گوئی رسالہ زمانہ جون ۱۹۳۴ / زمانہ نومبر ۱۹۳ - بہار سخن ص ۲۴۴ خمخانہ جاوید جلد پنجم ص ۲۷۸

(۳) دیوان بشیر مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس ۱۹۲۴ ص ۱۳۷ (۴) رسالہ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ (۵) انتخاب زریں ص ۲۴۲ / آب بقا ص ۱۱۱

(۶) آب بقا ص ۱۳۲ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء (۷) تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۹۳ (۸) دکن میں اردو ص ۳۷۵

(۹) مضمون بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا از قاضی عبد الودود نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۶ (۱۰) سخنوران دکن ص ۱۳۵ دکن میں اردو ص ۳۴۵ (۱۱) رسالہ تمدن اپریل ۱۹۱۲ ص ۵۵ تا ۳۷ (۱۲) بزم مشاعرہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ (۱۳) ایضاً (۱۴) ایضاً

خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۳۵۹ و دیکھئے الہامات شاد مرتبہ عبد المالک آروی سلسلہ مطبوعات طاق لبنہ آرہ

بشارت حسین احقر بہاری [م ۱۹۲۹] ازل لکھنوی کے شاگرد تھے۔ بہار کے موضع بڑا ڈیہہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے قصائد (غیر مطبوعہ) کا تذکرہ دستیاب ہے (۱)

مرزا قلیچ بیگ قلیچ سندیلوی [م ۱۹۲۹/۱۹۳۰] کے بارے میں کہا جاتا ہے انہوں نے تمام اصناف سخن میں شاعری کی (۲)

نذیر حسین نقشہ عباسی سندیلوی نے ایک قصیدہ ۵ دسمبر ۱۹۳۰ کو لالہ سری رام کی سالگرہ پر پڑھا (۳)

رحمت علی ذکا م ۱۹۳۰ سے قبل فوت ہو چکے تھے ان کے ایک قصیدہ نعت کے شائع ہونے کا ذکر نظامی نے کیا ہے (۴)

مہدی حسین ناصری م ۱۹۳۱ لکھنوی تھے۔ انہوں نے قصائد ناصری کے نام سے مجموعہ مرتب کیا تھا (۵)

عظمت اللہ خاں سرود کا ایک قصیدہ آصف جاہ سابع دکن کی مدح میں ۱۹۳۲ میں شائع ہوا تھا (۶)

نواب مرتضیٰ خاں شمیم [پ ۱۸۸۱/۱۸۸۲] بھوپال نواب صدیق حسن خاں کے نبیرہ تھے۔ اردو میں داغ کے شاگرد تھے دیوان میں قصائد کا سراغ ملتا ہے (۷)

معشوق علی جوہر [م ۱۹۲۸] غالب کے تلامذہ میں تھے (۸) ان کی قادر الکلامی اور زود گوئی کی تعریف کی جاتی ہے انہوں نے نواب بھوپال، نظام حیدر آباد اور مہاراجہ کشن پرشاد کی شان میں قصائد لکھے

محمد احسن خاور [۱۹۲۹ میں زندہ] نجیب آباد کے رہنے والے تھے حضرت علی کی مدح میں ان کے قصائد کا سراغ ملتا ہے (۹)

محمد یوسف رامپوری [۱۹۲۹ میں زندہ] کے قصیدہ عرفان کا تذکرہ ملتا ہے (۱۰)۔ انہوں نے میر عثمان خاں کی مدح میں بھی قصیدہ لکھا (۱۱)

بے نظیر شاہ بے نظیر [م ۱۹۲۹ یا ۱۹۳۲] جدید دور کے عمدہ نظم نگار تھے ان کے ایک قصیدہ نعت (میمیہ) اور ایک قصیدہ مدح نظام حیدر آباد کا تذکرہ ملتا ہے (۱۲)

واجد علی فرخ بنارسی [۱۹۳۲ میں زندہ] نے حضرت علی کا طویل قصیدہ لکھا (۱۳)

بنواری لال شوخ [۱۹۳۲ میں زندہ] بنارس سے متعلق تھے ۱۹۳۲ میں افغانستان کے شاہ کا قصیدہ لکھا اور صلہ پایا ان کے مہاراجہ بنارس کی شان میں قصائد کا پتہ چلتا ہے (۱۴)

نظیر حسین سخا [م ۱۹۳۲] داغ کے شاگرد تھے ان کے کلیات کے انتخاب میں ان کے چند منقبتی قصائد طبع ہوئے ہیں انہوں نے میر محبوب علی کی شان میں بھی عمدہ قصائد لکھے (۱۵)

---

(۱) مضمون جوش میری از رخشاں ابدالی فنوق زبان پشتو ۱۹۷۴ء کراچی و تذکرہ مسلم شعرائے بہار مولفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی ص ۱۸ مطبوعہ کراچی

(۲) سندیلہ میں اردو شاعری ص ۲۳۲ طبع سوم (۳) خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۷۴ (۴) تجلیات سخن مع مستند تذکرہ شعرائے بدایوں ص ۱۹ از نظام الدین نظامی نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۵ء (۵) مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۲۹/۲۳۴ از سید اعجاز حسین یونین پرنٹنگ پریس دہلی

(۶) روزنامہ صبح دکن سالگرہ نمبر ۳۰ ۱۳۵۱ ص ۵۸ ۱۹۳۲/۱۹۳۵ (۷) خمخانہ جاوید جلد پنجم ص ۵۳ (۸) تلامذہ غالب ص ۸۰-۸۱

(۹) سرفراز لکھنو جنوری ۱۹۲۹ (۱۰) انتخاب یادگار ص ۳۰۲ (۱۱) تذکرہ کاملان رامپور ص ۴۲۸

(۱۲) انتخاب زریں ص ۲۴۴ (۱۳) تجلیات فرخ دیوان ص ۲۱ (۱۴) خمخانہ جاوید جلد پنجم ص ۶۳

(۱۵) انتخاب کلیات نظیر حسین سخا مرتبہ سید ضیاء الحسن نقوی، اوریکن بک کمپنی راولپنڈی ۱۹۷۷ء ص ۵۰ تا ۲۷

دورِ عثمانی حیدرآباد کے احمد حسین امجد [پ ۱۸۸۵/۱۸۸۶] رباعیات میں شہرت رکھتے ہیں۔ نظمیں بھی عمدہ لکھتے تھے ان کی قصیدہ گوئی کے بارے میں بھی اطلاع ہیں ہوئی ہے (۱) نصیر الدین ہاشمی نے امجد کے کلام کی سادگی نازک خیالی اور تاثر کو سراہا ہے (۲)

ارتضیٰ حسین ناطق [پ ۱۸۸۶] کے مجموعہ قصائد کا تذکرہ رسالہ بزمِ ادب اردو میں ہے (۳)

علی احمد خاں اسیر [م ۱۹۱۲] بدایوں سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے اپنے مرشد مولانا فضل ایوں کا قصیدہ لکھا (۴)

مرزا ہادی رسوا [م ۱۹۳۲] ڈاکٹر میمونہ انصاری نے ان کے قصائد کا تذکرہ کیا ہے (۵)۔ مرزا ہادی رسوا کے قصائد پر ایک نوٹ رسالہ زمانہ جنوری مارچ ۱۹۳۳ میں چھپا تھا۔ مرزا رسوا لکھنؤ میں انجمن امامیہ لکھنؤ کی جانب سے نواب اکرام اللہ کے امام باڑے میں ہر امام کی پیدائش پر ہونے والی محفلِ مقاصدہ میں قصائد پڑھا کرتے تھے (۶)

ان کے قصائد فکر و فلسفہ کا عنصر لیے ہوئے ہیں۔ ان کے ایک قصیدہ کی تشبیب میں انسان کے بارے میں فکری سطح پر اظہارِ خیال ہے۔ اسے فخریہ تشبیب بھی کہا گیا ہے (اس کے اشعار آئندہ صفحات پر حصہ انتخاب میں دیے جائیں گے)

عبد الرحیم مذاق [م ۱۹۳۵] جبل پور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مجموعہ کلام میں زیادہ تر نعتیہ قصائد ہیں (۷)۔ یہ قصائد بریلوی عقائد کے آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کا خیال ہے "نظیری کی طرح ان کے نعتیہ قصیدوں، غزلوں اور نظموں میں اکثر ایک ہی مضمون مسلسل کا بیان ہے۔ وہ آیاتِ قرآنی، احادیث اور مذہبی تلمیحات کا استعمال بڑے شوق سے کرتے تھے۔ تکرارِ الفاظ، محاورہ بندی سے وہ اشعار کے صوتی حسن اور چاشنی میں اضافہ کرتے تھے۔ (۸)

احمد علی احمد، ابوذر [پ ۱۸۸۶] لکھنؤ کے رہنے والے تھے ان کے غیر مطبوعہ قصائد ملتے ہیں (۹)

نواب اسد اللہ خاں شوق بنارسی [م ۱۹۱۲] قصائد لکھ کر سخاوت سے تقسیم کر دیتے تھے (۱۰)۔ ان کے قصائد میں ریاضت اور فنی مہارت سے تاثیر پیدا ہوئی ہے۔ ایک تشبیب میں انہوں نے قبرستان کا عبرت انگیز منظر رقم کیا ہے۔ بہاریہ تشبیب لکھنے میں ان کا قلم رواں اور پُر تپلا تھا۔ ان کا ایک معروف قصیدہ زمزمہ خلافت ہے۔ یہ منقبتِ علی میں لکھا گیا ہے

فیروز الدین احمد فیروز طغرائی کے کلیات میں ایک حمدیہ اور ایک نعتیہ قصیدہ موجود ہے (۱۱)۔ طغرائی کا تعلق امرتسر پنجاب سے تھا

مولوی محمد سعید کے دو قصائد نعتِ نبوی اور آہنگِ غم دستیاب ہیں (۱۲) یہ انگریز حکمراں کی شان میں ہیں

ابن حسن تنہا کا ایک رسالہ شمشیرِ یزداں کے نام سے شائع ہوا تھا اس میں ۱۱ خطابیہ مذہبی قصائد ہیں۔ یہ قصائد مختصر ہیں (۱۳)

ظہور الحسن ناظم [۱۹۳۸ میں زندہ] کے بارے میں تسکین عابد نے لکھا ہے "لمبے لمبے قصائد ایسے کہتے ہیں جن کے مصرعوں میں کئی کئی تاریخیں نکلتی ہیں" (۱۴)

---

(۱) سخنورانِ دکن ص ۱۰۷ از تسکین عابد برقی پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۷ھ (۲) دکن میں اردو ص ۳۲۳ (۳) فرمانِ ناطق بحوالہ رسالہ بزمِ ادب اردو ص ۳۱ (۴) اکمل التاریخ جلد دوم ص ۲۳۷ (۵) مضمون مرزا ہادی رسوا کی ایک بیاض ڈاکٹر میمونہ انصاری نقوش شمارہ ۱۰۵ ہندو یونیورسٹی بنارس ۱۹۷۰/۱۹۷۱

(۶) قصائد نگارانِ اتر پردیش ص ۱۲۲ (۷) ریاضِ نورانی از مذاق جبلپوری مطبوعہ انجمن اسلامیہ جبلپور ۱۳۲۸ھ

(۸) ادبی جائزے ص ۳۳۲ تا ۳۳۳ از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اکتاب آرام باغ روڈ کراچی ۱۹۶۵ (۹) قصائد نگارانِ اتر پردیش ص ۴۹

(۱۰) سخنورانِ بنارس ص ۳۴۳ تا ۳۴۴ از اوّل عشرت اکرام حسین لیتھو پریس بنارس ۱۹۴۸ (۱۱) کلیات طغرائی ص ۹، ۱۵ (۱۲) یادگار دہلی از مولوی سید احمد (۱۳) شمشیرِ یزداں از مرزا ابن حسن تنہا آزاد پریس بردوئی مطبوعہ مسلم پریس لاہور ۱۹۳۲ (۱۴) سخنورانِ دکن ص ۲۵۰

زمزمہ خلافت از اسد اللہ خاں شوق بنارسی، رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء

المعی حیدر آبادی [پ ۱۸۸۲/۱۸۸۳] ضامن کنتوری کے معاصر تھے ہر صنف پر عبور رکھتے تھے قصیدہ بھی لکھا ہے (۹)

امداد امام اثر [م ۱۹۳۴] کا دیوان ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا اس میں دو قصائد منقبت ہیں دونوں کے اولیں مصرعے ہیں ع مژدہ باد اے شب ہوا رلا فتیٰ پیدا ہوا ع کیوں کعبہ دل میں نہ رکھیں تجھ سے صنم کو (۱۰)

حیدر آباد کے نواب مہدی علی شہید [پ ۱۸۸۵/۱۸۸۶] کے مجموعہ کلام تسبیح خیال میں قصائد موجود ہیں (۱۱)

حافظ محمد ولایت اللہ کے مجموعہ سوز و گداز میں نواب حامد علی خاں (رامپور) اور فرمانروائے دکن نظام کی سلور جوبلی (۱۹۳۶) کے حوالے سے قصائد دستیاب ہیں (۱۲)

- احمد اللہ قادری کے مجموعہ کلام میں آدھی نظمیں اور آدھے قصائد ہیں۔ جارج پنجم نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال اور شبلی نعمانی ان کے ممدوحین میں سے تھے (۱۳)

منشی احسان علی خاں احسان [م ۱۹۳۲] اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ ضامن علی جلال کے شاگرد تھے۔ انہی کے کہنے پر نواب منگرول کی شان میں قصیدہ لکھا اس کی تشبیب میں مناظرہ حسن و عشق کا بیان تھا (۱۴)

خمکدہ خیال کے نام سے ان کا دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ نفیس اور تاثیر سے معمور قصائد لکھتے تھے (۱۵)

ان کا ایک قصیدہ قومی بھی ملتا ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے ع غفلت پڑی تو دور ہوا سب وقار قوم (۱۶)

اکبر حسین اختر کے نعتیہ اور منقبتی قصائد کی اطلاع احتشام حسین نے دی ہے۔ اختر ۱۹۳۳ میں فوت ہوئے (۱۷)

صابر سنامی [م ۱۹۳۴] سنام کے وکیل تھے انہوں نے نواب بہاولپور اور نواب رامپور کی شان میں قصائد لکھے (۱۸)

علی اطہر مرغوب [۱۹۳۷ میں زندہ] چاندپور سے تعلق تھا۔ قصیدے لکھتے تھے (۱۹)

جانکی پرشاد بیکس [م ۱۹۳۶/۱۹۳۷] تاریخ گوئی اور قصیدہ گوئی میں مہارت رکھتے تھے (۲۰)

عبدالرؤف عشرت لکھنوی [م ۱۹۴۰] کے زیب تاریخ قصیدے بھی کہے ہیں (۲۱)

ریاض علی ریاض بنارسی [م ۱۹۴۲] قصائد میں خوب صورت تشابیب کا اہتمام کرتے تھے (۲۲)

نانک چند نانک [چند سال قبل فوت] لکھنؤ سے متعلق تھے ان کے قصیدہ غدیر کی خبر ملتی ہے (۲۳)

---

(۹) تنویر تخییل از المعی حیدر آبادی عہد آفریں پریس حیدر آباد (۱۵) دیوان اثر ص ۱۰۴ تا ۱۲۸ مطبع منشی ظہور الحق آرہ

(۱۱) سب رس اپریل ۱۹۳۲ء دکن میں اردو ص ۵۵۹ (۱۲) سوز و گداز از حافظ محمد ولایت اللہ مطبوعہ ۱۹۴۱ ص ۲۳، ۲۹، ۳۱

(۱۳) عرش اعظم از احمد اللہ قادری مطبوعہ اعظم سٹیم پریس حیدر آباد دکن ۱۹۳۲ (۱۴) خمخانہ جاوید جلد اول ص ۱۴۰ - ۱۴۱ (۱۵) خمکدہ خیال مطبوعہ

(۱۶) ترکیب بند ص ۹۸ از مطبع مفید عام آگرہ (۱۷) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۶۹ ناقص الدولہ

(۱۹) شاعر آگرہ سکول نمبر ۱۹۳۷ ص ۸۵ (۱۸) ان کے بیٹے عاد سنامی نے نمونہ بھجوایا ہے

(۲۰) سخنوران بنارس ص ۲۵۳ - ۲۱۲ (۲۰) بہار سخن ص ۳۵۶ (۲۱) آب بقا ص ۱۸۹

(۲۳) بزم سعید ص ۵۶ تا ۵۹

نجم الدین احمد ثاقب [۱۸۹۸ پیدائش] بدایوں میں پیدا ہوئے ان کے قصائد کا تذکرہ لالہ سری رام نے کیا ہے۔[1] ان کا ایک قصیدہ "تہنیت سالگرہ مبارک آصف جاہ سابع" کے عنوان سے[2] اور دوسرا "در تہنیت بسم اللہ خوانی جناب نواب خواجہ نصر اللہ خاں بہادر بہ پیش گاہ آفاق ولی نعمت عالی جناب مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر"[3] کے عنوان سے رسائل کی زینت بنے ہیں۔

ڈاکٹر میر مہدی حسین الم شاگرد داغ کے حملہ اضافت پر حاوی ہونے کی خبر ملتی ہے[4]

حکیم محمد واصف ردولوی ۱۸۹۴ میں پیدا ہوئے ان کے قصائد کے مجموعہ سرمایہ نجات کے حصہ اول میں متعدد قصائد (نعت و منقبت) ملتے ہیں[5]

افضل حسین ثابت لکھنوی [م ۱۹۲۱] کو مرزا اوج لکھنوی کا شاگرد لکھا گیا ہے ان کے قصائد میں ان کے عموق مزاج (بات سے بات پیدا کرنے کا) سلیقہ موجود ہے[6]

غلام مصطفیٰ رسا [م ۱۹۲۳] داغ کے شاگرد تھے۔ ان کا قصیدہ تاجدار ہند [انگریز حکمران] کی مدح میں ہے[7]

اسد درانی ۱۹۲۷ سے قبل محمود نگر لکھنو کے ایک بوسیدہ مکان میں رہتے تھے۔ انہوں نے قصیدے بھی لکھے[8]

خوشی محمد ناظر [م ۱۹۴۴] مشہور نظم گو شاعر کے مجموعہ کلام کے حصہ اول و دوم میں تہنیات درباری (قصیدہ نما) موجود ہیں یعنی تہنیت سالگرہ مہاراجہ کشمیر، سہرا مہاراجہ، تہنیت دربار لبنت، نذر عقیدت جلوس مہاراجہ جموں و کشمیر، زمزمہ قیصری اور تہنیت جوبلی شاہ جارج پنجم کے عنوانات سے مدحیہ منظومات دستیاب ہیں[9]

شفق عماد پوری [م ۱۹۴۴] ظہیر احسن شوق نیموی کے شاگرد تھے ان کے قصائد کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔[10] ان کا ایک قصیدہ جنوری ۱۹۱۲ء کے ادیب دربار نمبر میں جارج پنجم کی شان میں چھپا اس پر لکھا ہے قصیدہ دربار و تشبیب بہار[11]

منشی محمد دین فوق [م ۱۹۴۵] مشہور شاعر، مورخ، ادیب، کشمیریات کے ماہر تھے ان کے مجموعوں کلام فوق اور نغمہ گلزار میں قصائد دستیاب ہیں[12]

اشتیاق احمد مشتاق [م ۱۹۴۵] کا تعلق سلون ضلع رائے بریلی سے تھا ان کا دیوان انتخاب الکلام کے نام سے چھپا تھا۔ اس میں قصائد دستیاب ہیں[13] حمد و نعت و منقبت کے لئے وہ مدحیہ قصائد بھی لکھتے تھے۔ ان کا ایک قصیدہ ریاست ریواں کے ولی عہد کی پیدائش (۱۹۰۳) کے حوالے سے بھی ہے محسن کاکوروی کے لامیہ قصیدہ کے تتبع میں انہوں نے بھی ایک قصیدہ لکھا مگر اس میں اسلامی تلمیحات و اصطلاحات کا استعمال

---

(۱) خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۲،۱ (۲) رسالہ تزک عثمانیہ جلد نمبر ۲ نمبر ۱ ۱۳۴۴ (۳) ایضاً جلد نمبر ۲ نمبر ۲

(۴) نواب فصیح الملک بہادر داغ از نور اللہ محمد نوری اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن ص ۱۸۲ (۵) سرمایہ نجات واصف ردولوی سرفراز پریس لکھنو ۱۳۵۵ھ

(۶) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۱۴ (۷) خمخانہ جاوید جلد سوم ص ۴۰۱-۴۰۲ ، دھلی میں اردو ص ۵۵۳ تا ۵۵۵ (۸) جانے پہچانے اور جنہیں کوئی نہیں جانتا از انور صابری یونین پرنٹنگ پریس دہلی (۹) نغمہ فردوس کلام خوشی محمد ناظر مرتبہ محسن کامل ناظم انجمن ذوق لائلپور ۱۹۲۸ حصہ دوم ص ۱۱۶ تا ۱۳۸

(۱۰) نقوش ضمیمہ شخصیات نمبر ۱/۹۱ ص ۲۲۶ (۱۱) رسالہ ادیب دربار نمبر جنوری ۱۹۱۲ ص ۴۷ (۱۲) دیکھئے نقوش شخصیات نمبر جلد دوم

(۱۳) تذکرہ خندہ گل ص ۲۸۴ [تاریخ ریاست ہائے پنجاب کشمیر مرتبہ محمد دین فوق مطبوعہ پنجہ فولاد پریس نولکھا لاہور ۱۹۰۵ و کلام فوق از محمد دین فوق بار دوم با اضافہ نظیر برادرس لاہور ۱۹۳۳]

(۱) مصحف حسین مشتاق [م ۱۹۲۵] کا تعلق مصطفیٰ آباد سے تھا ان کے قصائد کی خبر ہے

(۲) نجابت حسین عیش [م ۱۹۶۷] بنارس سے متعلق تھے عمدہ قصائد لکھتے تھے

(۳) عباس بیگ محشر [م ۱۹۵۵] کا تعلق بھی بنارس سے تھا۔ ان کا قصیدہ سرفراز لکھنؤ میں طبع ہوا تھا

(۴) حکیم محمد محسن، محسن [۱۹۵۲ کے بعد وفات] ان کا قصیدہ ساقی نامہ طبع ہوا تھا

(۵) محمود علی خاں محمود الہ آبادی [چند سال قبل فوت ہوئے] نعت و منقبت کے قصائد لکھتے تھے

(۶) سید محمد قاسم، قاسم عرف صاحب عالم لکھنوی کے نعت و منقبت کے قصائد دستیاب ہیں

(۷) علی رضا، رضا [م ۱۹۵۸] اخبار کانپور کے ایڈیٹر تھے۔ پاکستان آگئے تھے۔ قصیدہ لکھتے تھے

(۸) شبیر حسین کلیم [پ ۱۹۰۹] بنگال سے متعلق تھے قصیدہ لکھتے تھے

(۹) علی حسنین زیبا [م ۱۹۶۸ کراچی] کے قصائد کی بھی خبر ہے۔ نسیم امروہوی نے (ابوالمحسن توکل) ان کے قصائد کی منظوم تعریف کی ہے (۱۰)

(۱۱) محمد ضمیر الحق منیس کے دو قصائد ملتے ہیں وہ شمشاد لکھنوی کے شاگرد تھے
ان کا ایک قصیدہ مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی کی شان میں بھی ہے

---

(۱) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۲۳۲ (۲) میگزین بزم اردو ص ۲۸ (۳) سرفراز لکھنؤ ۷ مئی ۱۹۵۲ (۴) ایضاً ۱۹ اپریل ۱۹۵۲
(۵) [illegible] ۹ اپریل ۱۹۵۲ (۶) سرفراز لکھنؤ ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ (۷) میگزین اردو ادب ص ۳۵
(۸) بیسویں صدی میں غزل بنگال کے اردو شعرا ص ۹۶/۷۵ (۹) معارف اکتوبر ۱۹۶۶ ص ۲۹۹
(۱۰) اردو نامہ کراچی ۳۲ نمبر ۹، (۱۱) جذبات قیس، اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر ص ۸۱۶۲

اس دور میں ادبی ہیئت سے قصیدہ نگاروں نے مذہبی قصائد لکھے۔ ان کی ایک اجمالی فہرست پیش خدمت ہے

اسد علی خاں آصفی (حیدرآبادی) (م ۱۹۲۶) (سلام اور قصیدے)[1] مولانا محمد خاں عزیب سہارنپوری (م ۱۹۲۹) (حمد و قصائد)[2]

ابراہیم تشنہ (سلہٹ) م ۱۹۳۱ (قصیدۂ نعت)[3] مولوی حکیم محمد یوسف خاں (انہوں نے قصیدۃ الوخان کے نام سے طویل قصیدہ لکھا جس میں[4]

معرفت کی تعریف اس کی طلب اور مختلف مقامات کا ذکر ہے) شمشیر علی شمشیر (قصیدہ در مدح سید جماعت علی شاہ علی پوری) انہوں نے[5]

حضرت علی، حضرت حسن، حسین اور علی پوری کی شان میں بھی قصیدے لکھے)[6] مفتی محمود علی محمود بنکی (در مدح جماعت علی شاہ ۲۰ کے قریب ممتو قصائد)[7]

حاجی خلیل الدین حسن حافظ (پیلی بھیت) (قصیدہ در مدح جماعت علی شاہ)[8] محمد عبدالعزیز محمد ولی (امرتسر) (در مدح جماعت علی شاہ)[9]

حکیم اللہ یار خاں جوگی (لاہور)[10] (قصیدہ گورو گوبند سنگھ کی تعریف میں) علامہ رسول علام (کراچی)[11] (قصائد حمد و نعت) شاہ فرید الدین۔

عبدالشکور رمانگیوری[12] (قصائد نعت و منقبت وہ قصیدوں کے نام بھی رکھتے تھے سبحان الذی اسریٰ، خطبۂ وحدت، استجاع نور، تاج سعادت،

مصحف ناطق، اورنگ کن فکاں، اور سراج عقل کل وغیرہ) مشیر حسین مشیر قدوائی[13] (بارہ بنکی) (نعتیہ قصیدہ) آثم[14]، نور[15]، مقصد[16]،

متین[17]، کوثر[18]، طرب[19]، عنصر[20]، عبدہ[21]، بندہ[22]، طالب[23]، شاغل[24]، تجمل[25] (قصائد نعت و منقبت) میر غلام محمد شاہ۔

راحت سرہدی[26] (حمد، نعت، منقبت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، امام حسینؓ، غوث الاعظمؒ پر قصیدے) شیخ اسماعیل عرف شیخ لعل حافظ[27]

(نعتیہ قصائد، انہیں صنعت مقلوب، تجنیس مکرر، بحر طویل وغیرہ کے استعمال کا شوق تھا) باقر علی خاں سفیر (حیدرآباد دکن)[28] (مختصر نعتیہ قصائد

و قصیدہ در مدح بابا تاج الدین) (موضع استرآباد تی (در نظم سفیر دیوان دوم ۱۳۴۱ھ)) ایم یو خلیل (کراچی)[29] (رئیس گنڈرہ) (قصیدہ معراج شریف) صوفی خواجہ محمد اکبر وارثی میرٹھی[30]

(مختصر نعتیہ قصائد) (نہال روضۂ اکبران کا ایک اور مجموعہ ہے اس میں سید وارث علی شاہ عرف مٹھن میاں اور سید محمد شاہ وارثی کی شان

میں قصائد طبع ہوئے ہیں)[31] مرزا عزیز فیضانی (لاہور)[32] (قصیدہ نعت) محمد نوح شہیر[33] (قصیدہ نعت و منقبت)

محمد اسمعیل اسم سلیمی[34] (قصائد منقبت) حکیم ناطق لکھنوی[35] (نعت و منقبت غوث الاعظم قصائد)، نواب غضنفر دانش[36]

(قصیدہ شرح اسرار (نعتیہ) معیار وفا (مدح حسین) آئینۂ غیب (مدح علی) ولیسب دلکشاد (مدح حسین))، اجتبیٰ رضوی جعفری[37]

قصائد نعت و منقبت امامت فقر، باب میخانہ، شمع کا افسانہ)، محمد یحییٰ تنہا[38] (قصیدہ حمد و نعت)۔

---

(۱) ص ۴۲۵، ماہنامہ معلومات لاہور جنوری ۱۹۸۲ء (۲) بزم ادب جلد، مرتبہ سہو دلہ ساق و کوثر تسنیمی ص ۱۵ بزم ادب سہارنپور ۱۹۸۱ء

(۳) سلہٹ میں اردو ص ۱۴۶ (۴) اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر ص ۴۶۶ (۵) سوز الفت، قصائد شمشیر، گیلانی الیکٹرک پریس لاہور،

(۶) قصائد شمشیر حصہ اول ص ۲۶، ۲۷، مرکنٹائل پریس لاہور (۷) نالۂ دل یعنی قصائد محمود ص ۳۰ مطالعہ بارہ بنکی پریس رنگ س ن

(۸) (۹) گلزار علی پور مرتبہ مولوی عبدالحق خادم ص ۷۰ روز بازار اسٹیم پریس امرتسر (۱۰) صدا بہار حصہ اول مرتبہ جھنڈا سنگھ ص ۵ وزیر ہند پریس امرتسر

(۱۱) افضال سرمدی و اجلال محمدی ص ۱ و ۵ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور س ن (۱۲) مناقب علی موسوم بہ فضائل حیدری ص ۱ تا ۴، انڈین پریس لکھنؤ

(۱۳) مجموعۂ کلام ص ۱۸۲ مطبع جامعہ ملیہ علی گڑھ ۱۹۲۲ (۱۴) تا (۲۵) حافظ الاشعار، مرتبہ شیخ اسماعیل عرف شیخ لعل حافظ ص ۳ تا ۳۵، بمبئی ۱۳۴۳ھ

(۲۶) قصائد راحت ص ۳ تا ۱۰، آفتاب برقی پریس امرتسر ۱۹۲۶ء (۲۷) جدید حافظ الاسلام (حصہ سوم) ص ۱۵ تا ۶۸ و مخزن القصائد ص ۱۰۲ تا

۲۳۶، مطبع مجیدی کانپور ۱۹۲۶ء (۲۸) تاج تحفہ مع چند منتخب قصائد ص ۱۱، ۱۵ مدراس ۱۳۴۸ھ (۲۹) قصیدہ معراج شریف

ص ۲، ۷، عباسی آرٹ پریس کراچی ۱۹۶۲ء (۳۰) میلاد شریف اکبر ص ۱۰ تا ۴۷، محمدی اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۲۳ء

(۳۱) نہال روضۂ اکبر ص ۱۰ و ۴۳، فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور ۱۹۳۳ء (۳۲) قصیدہ عزیزیہ جزو رسالہ حقیقت اسلام مطبوعہ لاہور س ن

(۳۳) خیابان ترنم ص ۱، ۵، اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۶ء (۳۴) سلہٹ میں اردو ص ۱۲۴۔ انہوں نے فضل الرحمن گنج مراد آبادی

کی شان میں بھی قصائد لکھے ہیں (۳۵) دیوان ناطق ص ۱۸۷، ۱۹۳، تعمیر ادب جالندھر ۱۹۵۷ء (۳۶) پرواز، مرتبہ ہوش عظیم آبادی

ص ۵ تا ۷، پٹنہ ۱۹۵۲ء (۳۷) شعلۂ ندا از اجتبیٰ رضوی ص ۲۲۲، ۱۹۳، ۲۵۳، پٹنہ ۱۹۵۲ء

(۳۸) تب و تاب از تنہا ص ۱۱، ۲۵، مرکنٹائل پریس لاہور ۱۹۵۲ء

محمد شفیق الحق شفیق مسلیشی (۱) (در مدح مفتی محمود و یوسف بنوری) دلبر (۲) (قصیدہ نیمہ شعبان) سپال لکھنوی (۳) (قصیدہ در مدح حسن) وصیت ڈبیروی (۴) (در منقبت علیؓ قصیدہ و در شان فاطمۃ الزہراؓ) محمد عادل رضوی (۵) (در منقبت علیؓ)

روشن لکھنوی (۶)، حمید پال پتی (۷)، نشتر (۸) (منقبت علیؓ) حسن عباس (در مدح علیؓ) کوثر جعفری (۹) (قصیدہ مدح حسن)

نگمیں رضوی (۱۰) (قصیدہ در مدح امام حسینؓ)، گوہر جعفری (۱۱) (نعتیہ قصیدہ، قصائد منقبت در مدح علیؓ حسینؓ)، مصطفیٰ حسین۔

ہمدم فیض آبادی (۱۲) (قصائد چہاردہ معصومین) ابوتراب سوفی پتی (۱۳) (قصائد منقبت) وصیت پا بجاں (۱۴) (قصیدہ مدح غوث الاعظم)

ضیاء الحسن موسوی (۱۵) (قصیدہ نعت و قصیدہ در مدح سید الشہداؓ) جعفر طاہر (۱۶) (قصائد نعت و در مدح ابو طالبؓ)

محمد علی ظہوری (۱۷) (مجموعہ قصائد شہید کربلاؓ، نذر عقیدت و رشد کامل میاں ظہور الدین) نیر سلطان پوری (۱۸) (قصائد نعت و منقبت)

نعتیہ قصائد عنوانات اعلان حق، حسن یقین، پیام سروش، ہادی برحق، انوار سحابی، شب معراج، سردار دو عالمؐ، نور نبی و عنوانات

قصائد منقبت انوار عصمت، حدیقۂ کونین، جان نبوت (در مدح حضرت فاطمہؓ) سردار اولیا، نقش اعتبار، قبلہ نما، فکر و نظر

آمد حیدر (در مدح حضرت علیؓ)، آیت حق (مدح حسنؓ) نور صداقت، جگر گوشۂ رسول (در مدح حضرت امام حسین) و شمع ہدایت

صاحب امر، یقین فردا و تلاش حق (در مدح امام آخر زماں) نیر سلطان پوری نے ان قصائد میں تشبیب سے دانستہ

گریز کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ مقدس درباروں میں فضول باتیں احترام دربار کے منافی سمجھتے ہیں) افضل الرحمٰن افضل پوڑی (۱۹)

(قصیدہ معراج) محمد غوث شاہ صاحب سیالکوٹی (۲۰) (قصیدہ نعت، منقبت امام مہدی و قصیدہ در مدح عبد القادر جیلانیؒ)

ظفر ترمذی (۲۱) (جمنگ) غالب کے قصائد کی زمینوں میں نعت و منقبت کے قصائد) ابو ظفر نازش رضوی (۲۲) (آئمہ کی شان میں قصائد

اور منقبتیں) سسرو سیار نپوری (۲۳) (قصیدہ نعت) عطا حسین کلیم (۲۴) (مجموعہ نعتیہ غزلوں کو اپنے مجموعے میں انہوں نے قصائد کہا ہے)

ظفر شارب (۲۵) (قصیدہ برجشن ولادت حسین) جابر علی سید (۲۶) (قصیدہ در مدح حضرت امام حسینؓ) عابد نظامی (۲۷) (قصیدہ نعتیہ)

اس دور میں قادیانیت کے فروغ کے لئے بھی بہت سے قصیدہ نگاروں نے قصائد لکھے۔ بشیر الدین محمود (۲۸) (قصیدہ در شان مسیح موعود)

میر محمد اسماعیل (۲۹) (قصائد در مدح احمدیت)۔

---

(۱) سلہٹ میں اردو ص ۲۳۴ (۲) جشن مومنین مرتبہ سید شریف حسین حیدر پانی پتی ص ۱۶۷، تبلیغ عزا ایجنسی لاہور،

(۳) تا (۱۰) جشن مومنین صفحات بالترتیب ۹۲، ۶۵، ۶۱، ۵۷، ۴۱، ۳۳، ۸۱، ۱۲۰، ۷۰، ۸۰۔ (۱۱) گوہر ریزے از گوہر جعفری ص ۱۰ تا ۴۰، ادارہ تحقیقات حیدری سیالکوٹ ۱۹۶۵ء (۱۲) جام ولا ص ۶ تا ۱۷ از مصطفیٰ حسین ہمدم کراچی ۱۹۷۰ء،

(۱۳) شان حیدر از ابوتراب، ملت پبلشرز لاہور ۱۹۶۸ء (۱۴) آیات شریعت از وصیت یا بجاں وصیت ص ۳۵ راولپنڈی ۱۹۷۲ء

(۱۵) ضیاء الحسن موسوی کے مضامین و مقالات ص ۲۵، نفیس اکیڈمی کراچی (۱۶) جھنگ کے اردو شعرا از ظفر علی خاں سیال مقالہ ایم اے ۱۹۷۵ء ص ۳۰۸ (پنجاب)

(۱۷) نوائے ظہوری ص از محمد علی ظہوری، مجلس حسان ۱۹۷۵ء (۱۸) انوار عرفاں از نیر سلطان پوری ص ۲۶ تا ۱۶۹ اسرار کریمی پریس الہ آباد

(۱۹) دیوان افضل ص ۲۷ ابو المعالی پرنٹرز لاہور ۱۹۷۷ء (۲۰) مراد العاشقین دیوان محمد غوث شاہ مطبع اردو ڈائجسٹ لاہور س ن ۱۹۷۵ء

(۲۱) پیکر تصویر از ظفر ترمذی ص ۲۵۶ تا ۲۶۱، عظیم پبلشرز جھنگ صدر ۱۹۸۰ء (۲۲) یاران نو ص ۱۲۰

(۲۳) پاکستانی ادب جلد سوم ص ۵۹، راولپنڈی سر سید کالج (۲۴) محراب از عطا حسین کلیم، حنیف برادرز راولپنڈی ۱۹۸۰ء

(۲۵) ماہ نو لاہور جون ۱۹۸۴ء ص ۱۲ (۲۶) ماہ نو لاہور جون ۱۹۸۴ء ص ۱۵ (۲۷) ماہ نو لاہور دسمبر ۱۹۸۵ء ص ۱۷

(۲۸) کلام محمود دو حصے از بشیر الدین محمود تاجر ربوہ ۱۹۶۹ء (۲۹) بخار دل از میر محمد اسمٰعیل ص ۱۰۷ محمد احمد اکادمی لاہور ۱۹۷۰ء،

محمد جعفر قدسی جائسی [م ۱۹۲۷] کے قصائد کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ قصائد قدسی، ارشادِ قدسی اور انفاسِ قدسی ان کے بیشتر قصائد نعت و منقبت کے ہیں[1]

پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن نے ہندو سوامیوں، برہمنوں اور دیوی دیوتاؤں کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں یہ قصائد بطرز مسدس ہیں انہوں نے اسے قصیدہ ہی کہا ہے[2]

انور حسین آرزو [م ۱۹۵۱] لکھنؤ سے تعلق تھا ان کے پانچویں دیوان میں قصائد طبع ہوئے ہیں۔ یہ قصائد نعت و منقبت کے ہیں۔ آرزو لکھنوی کے قصائد جدید و قدیم روایات کا آمیزہ ہیں۔ زبان پر ان کا عبور مسلمہ ہے۔ وہ اپنے دیگر ہمعصر قصیدہ گو معاصرین کے ساتھ ساتھ اردو قصیدے کو تبدیلیوں سے ہمکنار کرنے میں کوشاں رہے[3]

اسد اللہ اسد [م ۱۹۵۳] لکھنؤ کے رہنے والے تھے ان کے قصائد لکھنؤ کے روزناموں اسفت روزوں وغیرہ میں شائع ہوتے[4]

محمد باور باور خیرآباد کے رہنے والے تھے نظم طباطبائی کے شاگرد تھے حقیقت اور واقعیت پر مبنی قصائد لکھتے[5]

بشیر النساء بشیر کا تعلق دکن سے تھا ان کی قصائد نما و حمدیہ نظمیں ان کے کلام کی زینت ہیں[6]

نصیر الدین ہاشمی نے ان کا تعلق دورِ عثمانی سے بتایا ہے[7]

لالہ امر چند قیس کے مجموعہ رسول ورشن کے حوالے سے عبد الشکور نے لکھا ہے انہیں ہر صنف پر عبور حاصل ہے[8]

ثاقب حسین ثاقب امروہوی [پ ۱۹۰۱] کے بارے میں کہا گیا ہے کہ قصیدہ ان کی مرغوب صنف ہے[9]

صبا اکبر آبادی نے اپنے دوسرے دور میں جو ۱۹۳۱ سے ۱۹۴۷ پر ختم ہوتا ہے رباعیاں اور قصیدے کہے[10]

عاشق حسین بزم آفندی [م ۱۹۵۳] نے راجا صاحب محمود آباد امیر احمد خان کی شان میں قصائد لکھے ان کا نمونہ علی جواد زیدی نے مہیا کیا ہے[11] ان کے دیوان چراغِ بزم میں ایک حمدیہ قصیدہ طبع ہوا ہے

اولاد اصغر اصغر [پ ۱۹۱۵] عیش کے فرزند تھے۔ ۴۰ قصائد کہے نقوشِ تولا نامی مجموعہ غیر مطبوعہ ہے[12]

اعظم حسین اعظم [م ۱۹۵۶] اعظم گڑھ سے متعلق تھے ان کے مذہبی قصائد غیر مطبوعہ ہیں[13]

جگر بسوانی [م ۱۹۵۸] کا سیتا پور سے تعلق تھا قصائد بھی لکھے ہیں ان کا ایک تذکرۃ الشعرا رسالہ فصاحت حیدرآباد میں چھپتا رہا ہے[14]

طاہرہ بیگم طاہرہ [۱۹۵۹ء میں زندہ] سلام اور قصیدے لکھنے کا اہتمام کیا ان کے مجموعہ کلام میں ۲۷ مختصر قصائد شامل ہیں[15]

---

(۱) انفاسِ قدسی مطبع اسرار کریمی الہ آباد ۱۹۳۵ / ارشادِ قدسی بر مکاتب اکبر پریس الہ آباد ۱۹۳۵

(۲) باغِ نشاط از رادھے ناتھ کول ص ۱۵۸ ص ۳۵۳ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۸ (۳) نشانِ آرزو از آرزو لکھنوی الواعظ صفدر پریس لکھنؤ

(۴) سرفراز لکھنؤ رجب نمبر ۱۰ جنوری ۱۹۲۹ میں ولادتِ علی پر ان کا ایک قصیدہ دستیاب ہوا ہے (۵) جذباتِ باور از محمد باور باور مطبوعہ خورشید کمپنی

(۶) آبگینۂ شعر از بشیر النساء بیگم سب رس کتاب گھر حیدرآباد دکن ۱۹۴۸ ص ۱۱۱ تا ۱۲۷ (۷) خواتینِ دکن کی اردو خدمات ص از نصیر الدین ہاشمی وزارت مشین پریس حیدرآباد

(۸) دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعرا از عبد الشکور کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ ۱۹۴۳ (۹) قصائد نگاران اترپردیش ص ۱۱۲

(۱۰) مضمون صبا اکبر آبادی از ابو ظفر صبا نئی قدریں شاعر نمبر حیدرآباد سندھ (۱۱) دبستانِ دبیر ص ۶۶۳ مجموعہ قصائد نگاران اترپردیش ص ۹۵، ۹۶ — چراغِ بزم ص ۱۳، مطبع انوری ۱۹۴۰

(۱۲) الضیاء ص ۹۰ (۱۳) الضیاء ص ۸۲ (۱۴) نقوش آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ ص ۶۸۸ (۱۵) گوہرِ کعبہ ناظم پریس رامپور

تلوک چند محروم [م ۱۹۶۶] مشہور نظم گو شاعر ہیں ان کے کلام میں انگریز حکمران کا قصیدہ ملتا ہے[1]

اس قصیدے کا عنوان ہے دربار دہلی کی آمد آمد یہ دسمبر ۱۹۱۱ء کے رسالہ زمانہ کانپور میں بھی طبع ہوا تھا

جعفر مہدی رزم [۱۹۵۵] کو خلیل الرحمن اعظمی نے نعت قصیدہ نگار کہا ہے[2]۔ ان کا تعلق قصبہ ردولی دادوں سے تھا

رضا علی وحشت [م] کے دیوان میں نواب مرشد آباد کے کلکتہ آنے پر استقبالیہ قصیدہ[3]

موجود ہے۔ انہوں نے ثنائے خدا کے ساتھ ساتھ آل رسول و آل رسول کی شان میں مسلسل قصیدے لکھے ہیں[4]۔ ضمیمہ ترانہ وحشت میں ان کا ایک قصیدہ نواب رامپور کی مدح میں بھی ہے

عبد الحمید تحسین بدایونی امجد حیدر آبادی کے شاگرد تھے انہوں نے قصائد لکھے ہیں[5]

ابوالحسن خاں جرم [پ ۱۹۰۳] محمد آباد اور اعظم گڑھ سے متعلق رہے۔ ان کا دیوان ۱۹۶۲ء

میں فردوس سخن کے نام سے چھپا۔ یہ نعت و منقبت کے قصائد پر مشتمل ہے۔ وہ ایک بزم مقاصدہ (لندن) بھی ترتیب دیتے تھے[6]

سبط حسن خیال [پ ۱۹۱۰] کا تعلق ماہل سے تھا آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے ان کے تیس چالیس قصائد کا

ذکر ملتا ہے[7]

کلب احمد مانی [م ۱۹۶۳] مانی جائسی کے نام سے مشہور ہیں ان کے قصائد کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے[8]

اس میں ۲۷ قصائد اور مدحیہ نظمیں نعت و منقبت پر مشتمل ہیں۔ نقوش مانی اور نگارستان مانی ان کے اور شعری مجموعے ہیں[9]

محمد کاظم، کاظم [پ ۱۹۱۲] بنارس سے تعلق تھا ان کے قصائد کا مجموعہ نقش دوام کے نام

سے شائع ہو چکا ہے[10]

ولی الدین شفق [م ۱۹۶۳] جونپور سے متعلق تھے ان کے مجموعے میں چار قصائد ملتے ہیں[11]

ان کے قصائد میں مدحیہ موضوعات جدید دور کے خیالات و افکار سے متاثر ہیں وہ سرمایہ داری اور زر پرستی کے خلاف تھے

اظہار حسین اظہار [م ۱۹۶۲] کے قصائد کی تعریف کی جاتی ہے اور انہیں استاد شاعر تسلیم کیا جاتا ہے[12]

محمد رضا بیدل [م ۱۹۶۵] کے بارے میں علی جواد لکھتے ہیں "عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے

ان کے ۵۸ قصائد میری نظر سے گزرے ہیں ان میں تین تین نعت اور منقبت علی میں ہیں اور مابقی دوسرے

اماموں کی منقبت میں۔ کئی قصیدوں کی تشبیب میں یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی مستقل موضوع نظم ہو مثلاً

قیامت، گور غریباں، کربلا، جنگل، طوفان، شادی و غم، زلزلہ اور وحدانیت وغیرہ سب سے زیادہ یعنی

۱۹ قصائد امام حسین کی منقبت میں ہیں۔ اس کے بعد تعداد کے اعتبار سے امام مہدی کی شان میں لکھے قصائد

آتے ہیں۔ کچھ واقعہ غدیر خم کے بارے میں اور ایک قصیدہ ابوالفضل العباس کی شان میں بھی ہے"[13]

---

(1) کلام محروم حصہ اول از منشی تلوک چند محروم آریہ اسٹیم پریس لاہور (2) مضمون مشہور شاعر گمنام غزل گو از خلیل الرحمن اعظمی نگار اکتوبر ۱۹۶۹

(3) دیوان وحشت کلکتوی ص ۹۶ مطبع ستارہ ہند کلکتہ (4) حیات وحشت از وفا راشدی ص ۸۱/۹۵ مطبوعہ ضمیمہ ترانہ وحشت ص ۲۰۳، ڈھاکہ ۱۹۵۵ء

(5) بہار بوستان شعرا ص ۷۰ (6) بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا ص ۲۲/۲۸ از مشتاق احمد ستارہ ہند پریس کلکتہ

(7) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۳ (8) وادی ایمن مانی جائسی سرفراز قومی پریس لکھنؤ (9) دیکھئے مضمون از سید کاتب مصطفیٰ نقوش ۱۹۶۲ ص ۳۳۳ (10) نقش دوام از حکیم محمد کاظم بنارسی مطبوعہ

(11) خرمن از شفق جونپوری ص ۸۱ تا ۹۲ مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۶۲ (12) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۸۱

(13) ایضاً ص ۱۰۰

اسرار حسین اثر بلگرامی [م ۱۹۴۷] کے قصائد کا مجموعہ صحیفۂ وفا[1] ابھی تک طبع نہیں ہوا
ان کے قصائد اور نظمیں خاصی تعداد میں ہیں۔ وہ جدید دور کے نظمیہ لہجے سے متاثر تھے

نواب جعفر علی اثر [م ۱۹۴۷] لکھنؤ کے باشندے تھے ان کے نعت و منقبت کے قصائد اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کے سولہ قصائد لکھنؤ میں ان کے داماد کے پاس محفوظ ہیں[2] جعفر علی اثر کا دیوان اثرستان کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔[3]

دلاور حسین مرزا جعفر علی خاں اثر کے چچا تھے اور نعتیہ قصائد لکھتے تھے[4]

جگر مراد آبادی [م ۱۹۶۰ء] کا غیر مطبوعہ اور تلف کلام یادگار جگر کے نام سے چھپا ہے
اس میں نواب رشید الظفر خاں کی صحت یابی پر مبارکباد دی گئی ہے کہ للفضل خدا غسل صحت مبارک[5]
جگر کے تعنیتی قصائد بھی ملتے ہیں

محمد ناوک [پ ۱۸۸۸] قصائد کا مجموعہ[6] ۱۹۴۸ء میں چھپا وہ لکھنؤ اور کلکتہ میں گزر بسر کرتے رہے

بدر الحسن عابدی فیض آبادی کے قصائد کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے[7]۔ انہوں نے زیادہ تر منقبتی قصائد لکھے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے انہیں قصیدہ کی روایات و قیود پر قدرت حاصل ہے

حفیظ جالندھری [م] شاہنامہ اسلام کے مصنف اور پاکستانی ترانہ کے خالق ۱۹۲۵ء میں ریاست خیر پور میر کے فرمانروا کے دربار سے بطور شاعر دربار منسلک رہے۔ ریاست ٹونک سے انہیں ملک الشعرا کا خطاب ملا اور ریاست حیدر آباد سے نواب حسان الملک بہادر کا۔[8] حفیظ جالندھری کا ایک قصیدہ شہر لاہور کی شان میں بھی ہے[9]

قاسم شبیر قاسم [پ ۱۹۲۳] کے شعری مجموعہ[10] میں تیس قصائد شامل ہیں۔ یہ مذہبی رو کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ قاسم کا تعلق نصیر آباد اور رائے بریلی سے تھا۔

شبیر حسین جوش کا ایک خطابیہ قصیدہ ملتا ہے۔ اسمیں اگرچہ جوش نے نظمیہ انداز اختیار کیا ہے تاہم اس میں استعمال ہونے والی زبان کا شکوہ اسے قصائد کے زمرے میں شامل کرواتا ہے
اسکا مطلع ہے ؎ اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری + رعشۂ خوف بن گیا رقص بتان آذری[11]

الہ آباد کے محب الحسن ثمر [پ ۱۹۲۰] کے بارے میں علی جواد زیدی[12] نے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے اب تک ساڑھے چار سو قصائد لکھے ہیں۔ ان کا مجموعہ سامنے نہیں آیا۔ اگر ان کے یہ قصائد چھپ جائیں تو انہیں ہم اردو میں سب سے زیادہ قصائد رکھنے والا قصیدہ گو کہہ سکتے ہیں۔ ابھی ان کی طوالت اور مزاج پر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا

---

(1) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۹۶ (2) ایضاً ص ۶۵/۶۶ (3) اثرستان دیوان مرزا جعفر علی خاں اثر نظامی پریس لکھنؤ
(4) اثرستان ص ۱۸ (5) یادگار جگر مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۰ء ص ۱۵ (6) زاد آخرت نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۸
(7) تجلیات بدر از بدر الحسن عابدی اکرام لیتھو پریس بنارس ۱۹۴۹ (8) حفیظ کا جشن پنجاہ سالگی مجموعہ مضامین حفیظ گولڈن جوبلی کمیٹی راولپنڈی (9) نقوش نمبر ۹۵ ص ۱۱۲۲ (10) کارنامۂ ولا از قاسم شبیر قاسم مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۵
(11) رسالہ شام و سحر لاہور [illegible] جنوری فروری ۱۹۸۱ (12) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۱۶
تذکرہ عندلیبان رسول از اعجاز حسین [illegible]

بادشاہ حسین تمکین [پ ۱۹۲۰] خبیر لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ قصائد بھی لکھے ہیں۔ ان کا رنگ مذہبی ہے (۱)

حسن الکمال لکھنوی [م ۱۹۷۴] کے سو سے زائد قصائد پر مشتمل ایک دیوان کے چھپنے کی اطلاع ہے (۲)

الم مظفر نگری کے مجموعہ حملۂ گل میں سعودی عرب اور ایران کے حکمرانوں کی شان میں مدحیہ اشعار ملتے ہیں (۳)

ایم حسن اختر لودھیانوی کے دیوان تجلی (۴) میں ایک حمدیہ قصیدہ اور ایک قصیدہ تہنیت بعنوان "بحضور فیض گنجور سرکار دولتمدار بہاولپور بتقریب سالگرہ ۱۹۲۹ دستیاب ہے۔ نواب احمد یار خاں دولتانہ کی مدح کے ساتھ حاشیہ نظم بھی ہے

اسعد شاہجہانپوری کے کلیات میں تین قصائد منقبت ملتے ہیں ان کے اولین مصرعے ہیں

؎ کعبہ ہے آج منتظر لمحہ سازگار کا / ؎ نہیں ہے شانِ گدا شانِ تاجدار سے کم / [در منقبت علی رض]

؎ کس نے بدلا صنم کدوں کا نظام / [قصیدہ در تہنیت ولادت حسین رض] (۵)

شہاب دہلوی بہاولپور کے شاعر ہیں ان کے مجموعہ کلام میں دو نعتیہ قصیدے ملتے ہیں (۶)

ابو ظفر نازش رضوی کے کلام میں ایوب خاں فیلڈ مارشل کی مدح کی گئی ہے پہلا مصرعہ دیکھئے

؎ پتنگے محو تھے جس کی لگن میں / (۷)

قمر جلالوی [۱۹۶۸ سے پہلے انتقال] کے بارے میں ظفر معین بلیازی نے لکھا ہے "استاد مرحوم نے بیس ہزار سے زائد غزلیات، ایک ہزار قطعات و رباعیات، گیارہ طویل مرثیے، دو سو کے قریب سلام، سوز منقبت، سہرے اور قصیدے لکھے لیکن بدقسمتی سے ان کا دیوان ان کی زندگی میں نہیں چھپ سکا" (۸)

ضامن علی ضامن [۱۹۷۹ سے قبل] الہ آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دیوان میں ایک قصیدہ موجود ہے
یہ قصیدہ ان کی شاعرانہ کتاب ہے کہ جو یف کا لکھا ہوا ہے (۹)
وہ اس صنف میں سودا کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کی تشبیب میں نیا پن، تخیل کی گہرائی اور معنی آفرینی کا احساس ہوتا ہے

علی اختر، اختر [م ۱۹۷۱] کا تعلق جونپور سے تھا ان کے قصائد کی تمہید میں اردگرد کے سماجی حالات کی عکاسی ہے (۱۰)

علی آشفتہ [م ۶۰ کی دہائی میں] لکھنؤ اور حیدر آباد کے مقاصدوں میں قصائد پڑھتے تھے (۱۱)

محمد مرتضیٰ اسیر [۱۹۷۸ میں زندہ تھے] کے قصائد رسمی اور روایتی ہیں پختگی اور روانی کے بھی حامل ہیں (۱۲)

دبیر سیتاپوری [پ ۱۹۳۴] ان کے تقریباً ڈیڑھ سو قصائد (مدحیہ نظمیں، مخمس اور مسدس) کا تذکرہ ملتا ہے (۱۳)

فیض آباد کے رفیق حسین رفیق [۱۹۷۸ میں زندہ تھے] ان کے قصائد نعت و منقبت [۱۷ قصائد] کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے (۱۴)

سراج الحق قمر کا مراد آباد سے تعلق ہے ان کے کلیات میں قصائد ملتے ہیں (۱۵)

---

(۱) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۱۲ (۲) تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ بحوالہ قصائد نگاران اتر پردیش ص ۸۵
(۳) حملۂ گل الم مظفر نگری جمال پرنٹنگ پریس دہلی (۴) دیوان تجلی ۱۳۵۹ھ ص ۱۶۸ تا ۱۷۷ رائل الیکٹرک پریس لدھیانہ
(۵) وجدان سلیم مکتبہ دواوین کراچی ۱۹۶۳ ص ۳۳۸ تا ۳۴۳ (۶) موج نور مکتبہ الہام بہاولپور ۱۹۶۵ء (۷) نوائے فروز مطبوعہ ناشرین لاہور ۱۹۶۱
(۸) مضمون استاد قمر جلالوی از ظفر معین بلیازی قومی زبان جنوری ۱۹۷۱ء (۹) دیوان ضامن ضامن علی ضامن مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۹ء
(۱۰) ضیائے اختر مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۶ (۱۱) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۷۹ (۱۲) ایضاً ص ۷۶-۷۷
(۱۳) ایضاً ص ۱۳۴ (۱۴) گلزار عقیدت سرفراز قومی پریس لکھنؤ (۱۵) کلیات قمر دیکھئے عقیدہ ادبیہ ص ۳۰۲ تا ۳۰۳ مطبوعہ لکھنؤ

مہدی نظمی [پ ۱۹۲۲] لکھنؤ کے رہنے والے ہیں ان کے مجموعہ ایمان و عرفان میں قصائد ہیں ان کا ایک طویل قصیدہ رحل نظر کے نام سے بھی شائع ہوا تھا (۱)

لطیف حسن ادیب کا قصیدہ خزینۃ البرکات بھی دستیاب ہوتا ہے (۲)
تابش دہلوی کا ایک قصیدہ غالب کی شان میں ملتا ہے (۳)
حامد حسن قادری حامد نے غزل، قصیدہ، بیت، رباعی، قطعہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ان کے قصیدہ عطارد کا خصوصیت سے تذکرہ کیا جاتا ہے (۴)

نوح ناروی کے قصائد کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ نوح ناروی کا تعلق بھی فی الوقت لکھنؤ ہی سے ہے
نہال رضوی لکھنؤ میں رہتے ہیں ان کے قصائد کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں "اب شکوہ الفاظ کی بجائے زبان کی سادگی میں وزن پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اب علمی اصطلاحوں کی طومار اور مغلوب بندش کے گورکھ دھندوں کی جگہ صحت مند خیالات کے ساتھ فن کا بھی حق ادا کرنا پڑتا ہے" (۵) نہال نے نعت و منقبت کے قصائد لکھے
تفضل حسین بنارسی مفضل نے اپنے ایک قصیدہ میں بنارس کے شعرا کا تذکرہ کیا ہے اس میں شوق، فائز، شیدا، ہلال، فیض، کمال، کامل، عرشی، بسمل، گوہر، فخر، ذبیح، حامد، اعظم، محسن، جعفر، ناظر، انوار، زوار، فرخ، نافذ، اقبال اور ریاض یہ سب قصیدہ گو شعرا ہیں (۶)

---

(۱) قصائد نگاران از پردیس ص ۲۴۲-۲۴۵ (۲) قومی زبان نومبر ۱۹۶۲
(۳) رسالہ اردو نامہ کراچی جون ۱۹۷۱ (۴) اردو نامہ کراچی جنوری تا مارچ ۱۹۶۵
(۵) جہان نو ص ۹ سرفراز پریس لکھنؤ (۶) میگزین اردو ادب ۲۲ - ۲۵

انور علی شاد (۱۹۲۵ میں زندہ تھے) سانبھری ثم جے پوری کے بارے میں تذکرہ شعرائے جے پور میں مرقوم ہے "کوئی قصیدہ، غزل، قطعہ وغیرہ بلا تاریخی اشعار نہ کہتے تھے"^(۱) مشرقی بنگال میں اردو سے اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ عتیق اللہ شیدا قصیدہ نویس تھے^(۲) نثار حسین شیدا رامپوری المعروف بہ شیدا الہ آبادی کے دیوان ریختی موسوم بہ "آرسی" میں قصیدے بھی شائع ہوئے ہیں۔ شفیق جونپوری^(۴) کے مجموعہ کلام خرمن عشق میں قصائد طبع ہوئے ہیں۔ بنے خاں سرخوش رامپوری^(۵) کے قصائد کا تذکرہ محمد علی خاں رامپوری نے کیا ہے یکتا امروہوی بھی قصائد لکھتے تھے^(۶) کریم بخش نے تاریخ خیر پور کے تعارف میں اس کے مولف نسیم امروہوی کے قصائد کا ذکر کیا ہے^(۷) سید شرف الدین منائی حسن پوری (پھلواری) ضلع عظیم آباد پٹنہ کے قصائد کا بھی سراغ ملتا ہے^(۸)۔ تذکرہ یاران نویس صاحبزادہ محمد امیر حمزہ^(۹) [۱۹۰۹ء] منظور احسن عباسی^(۱۰) [پیدائش ۱۸۹۸] کے قصائد کا ذکر ہے۔ اس دور میں گوری شنکر احقر کا قصیدہ شہر آشوب بھی ملتا ہے۔ یہ رسالہ رئیس ہند دہلی میں طبع ہوا تھا۔^(۱۱) ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا ایک قصیدہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے بانی کی شان میں لکھا گیا تھا۔^(۱۲) قمر الدین قدرت کا ایک طویل قصیدہ ۱۱۱ اشعار پر مشتمل آئینۂ اسلام^(۱۳) اہلیہ جمیلہ بیگم کے نام سے دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں گزشتہ زمانے کے اسلام کی تصویر، مسلمانان حال کی حالت، پھوٹ کے نتائج، اتفاق کی خوبیاں، اسراف بے جا کے نقائص کے موضوعات پر اظہار خیال ہے اور تجارت کی ترغیب دی گئی ہے۔ امرتسر کے شاعر میر غلام محمد شاہ راحت سرمدی^(۱۴) نے جہاں حمد، نعت اور منقبت پنجتن پاک و چہار یار کے قصائد لکھے ہیں وہاں اپنے استاد فیروز الدین فیروز طغرائی کی شان میں صنعت توشیح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اسد اللہ خاں غالب، آغا حشر کاشمیری، فضل الحسن حسرت، ڈاکٹر محمد اقبال، ظفر علی خاں، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور عبد الحلیم شرر کی مدح میں بھی عمدہ قصائد لکھے۔ میر شائق حسین سفیر^(۱۵) کا ایک قصیدہ در مدح یکے از سرداران لشکر دکن میں ہے اور ایک در ستائش یکے از خواتین مجلہ میں۔ سفیر کا تعلق دکن سے تھا۔ مولانا محمد ابراہیم فنا^(۱۶) [م ۱۹۳۸] نے ایک قصیدہ جسٹس عبد السبحان (کلکتہ ہائی کورٹ) کی مدح میں لکھا۔ جسٹس موصوف مدرسہ جھینگا باڑی دیکھنے آئے تھے۔ محمود اسرائیلی^(۱۷) نے ایک قصیدہ در تہنیت غسل صحت سلطانہ بیگم صاحبہ لکھا۔ سید اختر اقبال^(۱۸) کا ایک قصیدہ ولی اورنگ آبادی کی شان میں سب رس حیدر آباد (دسمبر ۱۹۴۲ء) طبع ہوا تھا۔

---

(۱) تذکرہ شعرائے جے پور ص ۱۷۲ (۲) مشرقی بنگال میں اردو ص ۹۱ (۳) آرسی، تبصرہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۴۳ء
(۴) افکار سہیل و تتمہ شوکت سلطانی مقدمہ خرمن عشق از مولانا محمد اقبال سہیل ص ۱۵۵ شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء
(۵) مضمون سرخوش رامپوری از محمد علی خاں رامپوری قومی زبان کراچی یکم جنوری ۱۹۵۹ء (۶) تاریخ خیر پور ص ۱۸
(۷) تاریخ خیر پور ص ۱۹۶ (۸) مسلم شعرائے بہار حصہ دوم ص ۲۴۸ (۹) (۱۰) یاران ٹو ص ۱۶۲، ۱۰۴
(۱۱) قصیدہ شہر آشوب از گوری شنکر احقر ص ۳۳ رسالہ رئیس ہند دہلی ستمبر تا دسمبر ۱۹۲۵ء
(۱۲) نادر مخطوطات ایوان اردو معاصر پٹنہ ۱ (۱۳) آئینۂ اسلام از قمر الدین قدرت ص ۱ دلی پرنٹنگ ورکس دلی ۱۳۳۲ھ
(۱۴) قصائد راحت از میر غلام محمد شاہ سرمدی راحت ص ۳ تا ۱۸۱ آفتاب برقی پریس امرتسر ۱۹۲۶ء
(۱۵) نظم سفیر / دیوان دوم سفیر ص ۱۱ و ۹ رزاقی پریس حیدر آباد دکن ۱۳۲۰ھ (۱۶) سلہٹ میں اردو ص ۱۶۲
(۱۷) خیابان مجموعہ کلام از محمود اسرائیلی ص ۱۹۳ مکتبہ محمدی بمبئی ۱۹۳۷ء (۱۸) ص ۳۹ سب رس حیدر آباد اگست ۱۹۴۲ء

سید آل نبی سالک، اجمیری کا قصیدہ "تصویر انقلاب" سرگودھا سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اگست ۱۹۷۱ء کے واقعات اور احوال کی منظوم کہانی رقم ہوئی ہے۔ اس پر لکھا ہے "واقعات انقلاب بصورت نظم حسب ذیل سرخیوں میں، فریاد بہ حضور خداوندی، ندائے غیبی، وعدۂ نصرت، انتقام ایزدی کا لمحہ، حکومت قرآنی اور اس کی برکتیں، دعا اور تمنا" (۱)۔

یحییٰ اعظمی (۲) کے مجموعۂ کلام "نوائے حیات" میں مولانا ابوالکلام کی مدح میں ایک ضمیمہ قصیدہ چھپا ہے۔
مسعود حسین ادیب (۳) کا ایک قصیدہ جدید ان کے مجموعہ "دو نیم" میں شائع ہوا ہے۔ اسے آزاد کتاب گھر دہلی نے چھاپا تھا۔
اسرار احمد سہاوری (۴) نے ایک قصیدہ در مدح پروین لکھا ہے یہ ان کے مجموعۂ کلام اعجاز بیان مطبوعہ گوجرانوالہ میں چھپا ہے۔ پروین کے بارے میں لکھا گیا ہے "پروین کو ایک یہودی فوجی افسر نے فلسطینی کیمپ میں اس خطا میں گولی مار دی تھی کہ اس نے سرعام گانا سنانے سے انکار کر دیا تھا"

---

(۱) تصویر انقلاب قصیدہ از سید آل نبی سالک، پیر زادہ پرنٹنگ پریس سرگودھا طبع ۱۹۷۲ء
(۲) نوائے حیات۔ یحییٰ اعظمی ص ۱۵۳ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۲۹ء (۳) دو نیم از مسعود حسین، آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۶ء
(۴) اعجاز بیان از پروفیسر اسرار احمد سہاوری ص ۲۰۶، آئینہ ایام گوجرانوالہ ۱۹۸۲ء

جونپوری شعرائے تذکرے ضیائے اختر میں علی ضامن، ضامن (۱) [۱۹۳۵/۱۹۳۶]، حسن وقار (۲) [م ۱۹۴۰]
ابو محمد ضبط (۳) [م ۱۹۶۰ کے قریب] ثروت حسین ثروت، ناز (۴) [م ۱۹۶۳ کے قریب] رمضان علی رمز (۵) [م ۱۹۶۶]، وزیر حسن نظمی (۶)
[م ۱۹۶۶] عبدالمجید دماغ (۷) [م ۱۹۷۷] علی محمد ناطق (۸)، مظفر حسین مظفر (۹)، عبدالرحمن محشر (۱۰)، التفات حسین گوہر (۱۱)،
جگناتھ کیسری (۱۲)، اولاد حسین ظفر (۱۳)، زوار حسین طرار (۱۴)، احمد سعید (۱۵)، محمد حسن سیف (۱۶) سوار لعل (۱۷)، زوار حسین زوار (۱۸)
رضا حسین رضا (۱۹)، اظہر حسین پرتو (۲۰)، اور غفار خاں اثر (۲۱) کی قصیدہ نگاری کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے زیادہ تر مذہبی
قصائد لکھے ہیں۔ یہ سب جونپور سے متعلق ہیں۔

سہارنپوری شعرائے تذکرے نقوش جاوید میں ثنا احمد صبر (۲۲) [پ ۱۸۸۶] حمید بیگ حمید (۲۳) [پ ۱۹۰۰]
ظہور احمد خاموش (۲۴) [پ ۱۹۰۲] ارشاد حسین ارشاد (۲۵) [پ ۱۹۰۹] عبدالغفور غفور (۲۶) [پ ۱۹۱۲] محبوب الٰہی رضوی (۲۷)
اخلاق حسین واصف (۲۸) [پ ۱۹۲۲] اور محمد ہارون صابر (۲۹) [پ ۱۹۵۰] (مصنف تذکرہ) وغیرہ کے نعت و منقبت
کے قصائد کا تذکرہ ہے۔

دبستان دبیر میں ذاکر حسین فاروقی نے مبشر حسین سخنور (۳۰) (زیدپور) [م ۱۹۴۰] ذاکر حسین ذاکر (۳۱)
(شمس آباد) [م ۱۹۴۲] طالب حسین طالب (۳۲) (فیض آباد) [م ۱۹۴۴] اکبر مہدی سلیم (۳۳) (جرول) [م ۱۹۴۷]
نظیر الحسن فوق (۳۴) (متھرا) [م ۱۹۴۸] محمد عارج، عارج (۳۵) (زیدپور) [م ۱۹۵۲] مفضل مہدی نسیم (۳۶) (جرول)
[م ۱۹۶۰] ممتاز حسین ممتاز (۳۷) (جونپور) [م ۱۹۶۲]، لائق علی ہنر (۳۸) (لکھنؤ) [پ ۱۹۱۲] مفتخر حسین منتظر (۳۹)
(زیدپور) [پ ۱۹۱۹]، ناصر حسین ناصر (۴۰) (لکھنؤ) [پ ۱۹۲۷]، ممتاز حسین بشیر (۴۱) (لکھنؤ) اصغر علی بقا (۴۲) (علی گڑھ) [illegible] (۴۳) [پ ۱۹۲۸]
غلام عباس (۴۴) نام اور فراست حسین فراست (۴۵) کی قصیدہ نویسی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان شعرا نے نعت و منقبت کے میدان کو اپنایا۔

سید محمد حیدر نے بزم سعید میں جعفر حسین منظر (۴۶) (لکھنؤ) [م ۱۹۶۵] علی عباد قیس (۴۷) (زنگی پور) [م ۱۹۷۱]
محمد اصغر جعفر (۴۸) (لکھنؤ)، مجاور حسین تمنا (۴۹) (لکھنؤ) محمد مہذب (۵۰) (لکھنؤ) اور محمد حسن سالک (۵۱) (لکھنؤ) کی قصیدہ گوئی کی اطلاع دی ہے۔
انہوں نے بھی نعت و منقبت کے میدان میں طبع آزمائی کی۔

سید بدر الحسن عابدی نے تجلیات بدر میں فیض آباد سے متعلق اور بھی کئی شعرا کی قصیدہ نگاری
کی اطلاع دی ہے۔ ان کے مطابق بیسویں صدی میں افضل علی پیارے صاحب (۵۲)، محمد حسن حسن (۵۳)، علی محمد اعجاز (۵۴) اعجاز احمد معجز (۵۵)
ہادی محمد ہادی (۵۶) اور صبا فیض آبادی (۵۷) نے بھی نعت و منقبت کے قصائد لکھے ہیں۔

اس دور کے اور بہت سے شعرا کا تذکرہ بھی ملتا ہے: یہاں درج کیے جاتے ہیں

---

(۱) تا (۲۱) ملاحظہ ہو ضیائے اختر ص ۶ تا ۱۸ (۲۲) تا (۲۹) نقوش جاوید بالترتیب ص ۲۱/ ۵۱/ ۲۲/ ۲۷/ ۳۶/ ۶۹/ ۹۱
(۳۰) قصائد نگاران اتر پردیش ص ۱۸۵ (۳۱) تا (۴۵) دبستان دبیر ص ۶۲۰/۶۲۱/ ۶۱۷/ ۶۴۷/ ۶۹۶/ ۵۸۵/۵۸۶/ ۵۶۱/۵۶۲/ ۶۲۲/
۵۶۹/ ۶۹۰/۶۹۱/ ۶۲۸/ ۶۵۵/ ۶۵۰/ ۶۲۹/ ۶۲۲/ ۶۵/ ۶۵ک ۵۲۸ (۴۶) تا (۵۱) بزم سعید ص ۱۳/ ۳۵/۳۶/ ۴۷/
۳۹/۴۰/ ۵۲/۵۳/ ۵۰/۵۱ ۔ (۵۲) تا (۵۷) تجلیات بدر ص ۶۱ تا ۶۳

محمد حسن فائز(۱) (بنارس) [م ۱۹۲۹] سعید خاں ہنر(۲) (جونپور) [م ۱۹۲۰] محمد ذکا، ذکا(۳) (محمد آباد) [م ۱۹۲۰ کے بعد انتقال]
سندر لال شیام برق(۴) (سیتاپور) [م ۱۹۳۲] نے جارج پنجم کی شان میں ۱۹۱۲ میں خیرآباد کے میلے میں قصیدہ پڑھا۔ ان کے دیوان جلوۂ برق
میں موجود ہے۔ التجا حسین التجا(۵) کاظم حسین محشر(۶) (لکھنؤ) ننھو صاحب شفیق(۷) (لکھنؤ) [م ۱۹۲۰] مصحف حسین مشتاق(۸) (مصطفیٰ آباد)
[م ۱۹۵۴] فرزند علی محشر(۹) (مرزاپور) [پ ۱۸۹۸] گوپی ناتھ امن(۱۰) (لکھنؤ) [پ ۱۸۹۹] [نعت و منقبت کے قصائد لکھے
ان کی تشبیب میں عالمانہ تبحر اور تغزل انداز جھلکتا ہے] ذاکر حسین ثاقب(۱۱) (لکھنؤ) [م ۱۹۶۹] ذوالفقار حسین ذوالفقار(۱۲) (جونپور)
[م ۱۹۵۵] علی حماد حماد(۱۳) (جونپور) [م ۱۹۵۲] محمد مبین کیف(۱۴) (چڑیاکوٹ) [م ۱۹۵۶] نذیر احمد نذیر(۱۵) (بنارس) [پ ۱۹۰۸]
محمد عبادت کلیم(۱۶) (امروہہ) [پ ۱۹۱۱] فضل نقوی(۱۷) (لکھنؤ) [پ ۱۹۱۳] صبغتہ اللہ انصاری شہید(۱۸) (لکھنؤ) [م ۱۹۶۴]
ابو محمد عیش(۱۹) (ماہل) [م ۱۹۶۲] سرفراز حسین خبیر(۲۰) (لکھنؤ) [م ۱۹۶۵] شمس الدین حیدر شمیم(۲۱) (اعظم گڑھ) [پ ۱۹۱۴]
محمد اطہر زائر(۲۲) (سیتاپور) [م ۱۹۶۲] رضی الدین نجم(۲۳) (مصطفیٰ آباد) [م ۱۹۶۶] [سوا ۳ غیر مطبوعہ نعتیہ و منقبتیہ قصائد]
امتیاز حسین بیش(۲۴) (غازی پور) [پ ۱۹۱۰] محمد عسکری سروش(۲۵) (لکھنؤ) [م ۱۹۶۷] تصدق حسین صدق(۲۶) (جائس) [م ۱۹۶۷]
علی ماہی جوہر(۲۷) (رسڑا) [پ ۱۹۱۸] مرتضیٰ حسین موسوی(۲۸) (لکھنؤ) [م ۱۹۶۸] تعبر علی ببو(۲۹) (بارہ بنکی) [پ ۱۹۱۹]
سید صفی صفی(۳۰) (امروہہ) [م ۱۹۶۹] ریاض حسین ریاض(۳۱) (جرول) [پ ۱۹۲۰] روشن علی روشن(۳۲) (بنارس) [پ ۱۹۲۰]
علی جواد زیدی(۳۳) (لکھنؤ) [پ ۱۹۲۰] بشیشر پرشاد منور(۳۴) (لکھنؤ) [م ۱۹۷۰] شریف الحسن راز(۳۵) (بلگرام) [م ۱۹۷۱]
ذکی رضا رضا(۳۶) (رائے بریلی) [پ ۱۹۲۲] شبیہ حسن شبیہ(۳۷) (صفی پور) [پ ۱۹۳۱] پیام اعظمی(۳۸) (اعظم گڑھ) [پ ۱۹۳۴ کے قریب]
امداد اصغر امداد(۳۹) (ماہل) اشتیاق حیدر(۴۰) (محمد آباد) معصوم علی بیدل(۴۱) (اندور) تقی شبر تقی(۴۲) (لکھنؤ) علی نقاد ثمر(۴۳)
(محمد آباد) محمد صادق شبر(۴۴) (لندن) جون ایلیا(۴۵) (کراچی) رام بہادر جو یا(۴۶) عبد الحفیظ حفیظ(۴۷) (جونپور) منے آغا کی(۴۸) (لکھنؤ)
ابرار حسین رضوی(۴۹) (الہ آباد) اختر حسین سروش(۵۰) (مچھلی شہر) سلطان حیدر شارب(۵۱) (لکھنؤ) شعبان علی شعبان(۵۲) (جونپور)
مومن حسین شعلہ(۵۳) (الہ آباد) ظہور احمد ظہور(۵۴) (الہ آباد) فخر(۵۵) (جونپور) فیاض علی فیاض(۵۶) (ماہل) محمد نعیم الدین قدسی(۵۷) (خیرآباد)
کامل شفیق(۵۸) (جونپور) ظفر مہدی گہر(۵۹) (لکھنؤ) معین الدین منیف(۶۰) (اعظم گڑھ) محمد علی موقر(۶۱) (جونپور) وزیر حسن وزیر عابدی(۶۲) (غازی پور)
نسیم حسین ہلال(۶۳) (امروہہ) (دربار رامپور سے بھی وابستہ) اطہر حسین اطہر(۶۴) (محمد آباد) ظفر الحسن عاقل(۶۵) (اعظم گڑھ) محسن کاظم عروج(۶۶) (الہ آباد)
اظہر علی اظہر(۶۷) (فیض آباد) اور مہدی تسکین(۶۸) (فیض آباد)۔ ان قصیدہ نگاروں میں ایک آدھ ہندو شاعر کو چھوڑ کر باقی
سب نے نعت و منقبت کے قصائد میں طبع آزمائی کی۔ چند ایک نے درباری قصائد بھی لکھے

بحوالہ قصیدہ نگاران اتر پردیش (۱) تا (۶۸) علی الترتیب ص ۲۰۹/ ۲۸۳/ ۱۳۹/ ۹۲/ ۹۶/ ۲۳۲/ ۱۲۶/ ۲۳۷/ ۲۳۲/ ۸۷/ ۱۱۵/
۱۲۰/ ۱۲۷/ ۲۲۵/ ۲۴۷/ ۲۲۳/ ۲۱۳/ ۱۸۰/۱۸۱/ ۲۰۷/ ۱۳۱/ ۱۷۷/ ۱۵۲/ ۲۴۶/ ۲۰۲/ ۱۹۴/ ۱۸۶/ ۱۲۲/ ۲۲۵/ ۲۶۱/
۱۸۸/ ۱۵۲/۱۵۳/ ۱۵۰/ ۱۵۷/ ۲۵۱/ ۱۲۰/ ۱۲۳/ ۱۷۹/ ۱۰۷/ ۸۶/ ۹۵/ ۱۰۱/ ۱۱۱/۱۱۳/ ۱۱۲/ ۱۱۶/۱۱۷/ ۱۲۱/۱۲۴/ ۱۲۳/ ۱۲۷/
۱۳۹/ ۱۴۶/ ۱۴۳/ ۱۷۳/ ۱۷۴/ ۱۷۷/ ۱۹۵/ ۲۰۹/ ۲۱۲/ ۲۱۷/ ۲۲۱/ ۲۴۷/ ۲۵۲/ ۲۵۵/ ۲۸۰/ ۲۸۳/ ۸۲/ ۱۹۵/۱۹۶/ ۱۹۸/
۹۲/

حاشیہ نمبر ۱۱ ذاکر حسین ثاقب کی بیاضوں پر مشفق خواجہ کے مضمون مطبوعہ مجلہ تحقیق اورینٹل کالج لاہور جلد ۔۔ شمارہ ۔۔
میں ان کا ایک غیر مطبوعہ منقبتی قصیدہ بھی طبع ہوا ہے ص ۲۹ اسکا مطلع ہے
سہ بلا نہ ٹھکا اوج سے نیچے چرخ بریں کا + کچھ خاک کے پتلوں سے بڑھا وزن زمیں کا ص ۴۰۲

صفا جونپوری کے قصائد وحید الحسن ہاشمی نے مرتب کیے تھے (۱) ۔
قیس زنگی پوری (۲) ارزم ردولوی (۳) مولانا محسن اعظم گڑھی (۴) (کراچی میں ہیں) موجد سرسوی (۵) خاور نوری (۶) فیض محمد گوہر (۷) اور باقر علی افسر (۸) کے قصائد کا تذکرہ بھی ملتا ہے
قاضی عبد الحق کے دیوان میں نعتیہ قصائد موجود ہیں (۹)

اظہر حسین مبکش (۱۰) اور حافظ محمد حسن ضیا کے دیوان کے آخر میں قصیدہ گراں اور جریدہ نامی شائع ہوئے ہیں (۱۱) یہ قصیدہ سید محمد محمود گراں میرٹھی ہیڈ مولوی گورنمنٹ سکول صدر میرٹھ کا لکھا ہوا ہے
غفار خاں اثر جونپوری (۱۲) محمد علی جوہر حیاتی (۱۳) ارشاد حسین ارشاد الہ آبادی (۱۴) ،
منظور حسین سرمد (حفیظ میرٹھ) (۱۵) محی الدین شہباز (۱۶) (شاگرد غلام حیدر شہوار) اثر لکھنوی (۱۷)
جعفر رضا عامر مسائی لاہوری (گرو شیکار نواور ایوب خاں کی مدح) (۱۸) اور عزیز حاصل پوری (۱۹) وغیرہ کے مذہبی قصائد ملتے ہیں

بشیر احمد دہلوی کے دیوان میں دو قصائد ملتے ہیں ایک قصیدہ میں دلی کے رئیس نواب فیض احمد خاں مخاطب ہیں اور دوسرے کے ممدوح خان بہادر سید احمد حسن ڈپٹی کلکٹر پنشنر ضلع کرنت پور ہیں ۔ اول الذکر کو قصیدہ فوقیہ بھی کہا گیا ہے۔ اس قصیدہ میں انہوں نے شاہی خاندان (مغلیہ) کے باقیماندہ افراد کی حالت زار کا رونا رویا ہے یہ مرثیہ نما قصیدہ ہے اس میں کہا گیا ہے کہ مغلوں کی حویلیاں، مکانات اور محل موجود ہیں لیکن ان میں مکیں نہیں ہیں نامور بادشاہوں کا اب نام نہیں رہا ان کے نام لیوا بے عزو بے وقار ہیں اور بقول بشیر دہلوی

ان کے ہی باپ دادا کا تھا تاج و تخت بھی + مانگیں اگر کسی سے تو ملتا نہیں ادھار
برٹش گورنمنٹ کے الطاف کی نظیر + پائے نہ خلق ہیں ورق الٹے کوئی ہزار
ان کا ہی صدقہ ملتا ہے نسل اور خون کو + ہے بس اسی وظیفہ پہ جینے کا انحصار
تعداد ان وظیفوں کی بالکل قلیل ہے + جس کے بیان سے ہمیں آتی ہے شرم و عار

بشیر دہلوی نے اسی قصیدے میں یہ بھی کہا ہے کہ ان شاہزادوں سے تو مزدور ہی بھلے ہیں۔ انہیں تو وہ بھی نہیں ملتا جو ایک کمہار کماتا ہے ۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے ماحول پر بھی چوٹیں کی ہیں اور لکھا ہے

اشراف گردش کا یہی دورہ ہے دیکھئے + انگلی اٹھاتا ہے شرفا پر بھی اک چمار (۲۰)

---

(۱) نقوش عرفان ص ۱۶ (۲) ص ۳۴ (۳) ایضاً ص ۳۳ (۴) ص ایضاً ۳۴ (۵) ص ۳۳ (۶) ص ایضاً ۳۳ (۷) ایضاً ص ۳۴ (۸) ایضاً ص ۳۳ (۹) قاضی محمد عبد الحق دیوان طبع الہی آگرہ (۱۰) میگزین امداد ادب ص ۳۸ (۱۱) شان ظہور مطبع نور الاسلام پریس میرٹھ ۱۹۰۵ء ص ۲۹۲ (۱۲) ضیائے اختر ص ۱۶ (۱۳) آتش کدہ ص ۲۵۵ (۱۴) معارف اعظم گڑھ ۱۹۸۵ء (۱۵) گلزار سعود حصہ اول (۱۶) مخطوطہ میں قصائد کلیات شہباز (۱۷) صحیفہ لاہور اپریل ۱۹۸۲ء (۱۸) ذاتی تعلق اشعار دستیاب ہیں (۱۹) مجموعہ حیات نور مطبعہ آئینہ بک پولا ۱ (۲۰) دیوان بشیر دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۲۳ء ص ۱۳۷

لکھنؤ کے رسالہ المنتظر شمارہ نمبر ۱ جلد نمبر ۱ میں سید محمد اصغر، اصغر (۱)
عباس حسین لجید (۲)، مرزا حامد حسین حامد (۳)، باقر مرزا احمد (۴)، مصطفی مرزا رشید (۵)، احمد آغا سلیم (۶)
سجاد حسین شدید (۷)، فضل حسین فضل (۸)، مرزا احمد عنایت نسیم (۹) کے قصائد نعت و منقبت طبع ہوئے
ہیں۔ ذاکر حسین ثاقب لکھنوی (۱۰)، ریاض الدین احمد (۱۱) (اکبرآباد) پنڈت پرکھو دیال مضطر اور عاشق لکھنوی (۱۲)
اور ظفر علی پاشیخ حیدرآباد (۱۳) کے قصائد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بیخود بدایونی کے قصائد بھی ملتے ہیں (۱۴)

اسی دور میں بادشاہ علی ضیا (۱۵)، ارسطو (۱۶)، رحمت اللہ بیگ شاد (۱۷)، احمد (۱۸)
ابراہیم عفو (۱۹)، محمد حسین خان عارف (۲۰)، محمد یونس مائل (۲۱)، جعفر قدسی جائسی (۲۲)، عبداللہ بلال صدیقی (۲۳)
تمنا عمادی (۲۴)، حضرت شاہ صوفی (۲۵)، شیخ عبدالحی (۲۶)، قاضی شیخ محمد (۲۷)، محمد حنیف صدیقی (۲۸)
شمس الدین (۲۹)، غازی الدین خان ناجی (۳۰)، سید محمد شاہ، شاہ (۳۱) مداح (۳۲)، محمود شاہ محمود (۳۳) وغیرہ کے مرتبہ
قصائد بھی ملتے ہیں۔ نہال احمد علوی کے نعتیہ قصائد کی خبر بھی ملتی ہے (۳۴)
عبدالقدوس قدسی، مولوی محمد حسین خان (۳۵)، سید غلام بھیک شاہ مسافر (۳۶)، منشی منیع الدین (۳۷)
عبدالقدوس (۳۸)، میر ناصر حسین عنقا کے قصائد نواب بہاولپور صادق محمد خاں کی مدح میں ملتے ہیں۔ نواب بہاولپور
کی شان میں اور بھی بہت سے شعرا نے قصائد لکھے تھے لیکن جو رسالہ جشن جمشیدی مرتبہ عبدالقدوس قدوس
میں اس لیے شامل نہیں ہو سکے کہ "ان عالی دماغ مصنفوں نے بعد سماعت سرکار عالی بجنسہ انہیں
واپس لے کر مراجعت کی اور باوجود طلب مطبع رجوع نہ فرمایا"۔

---

(۱) المنتظر لکھنؤ تاریخی نام دین المنتظر، شمارہ نمبر ۱ جلد نمبر ۱ ص ۱ ۱۹/۱۸ (۲) ایضاً ص ۲ (۳) ص ۳
(۴) ص ۴، ۵ (۵) ص ۵ (۶) ص ۵ (۷) ص ۶، ۷ (۸) ص ۷ (۹) ص ۸
(۱۰) تجلیات شباب۔ ثاقب دارالتصنیف و تالیف ریاست محمود آباد ۱۹۲۶ء
(۱۱) رسالہ شاعر آگرہ نمبر جون جولائی ۱۹۳۶ء (۱۲) رسالہ زمانہ کانپور، مہاراجہ کمار و ولی عہد گوالیار کا قصیدہ جون ۱۹۱۶ء (۱۳) مجموعہ کلام توشہ آخرت مطبوعہ ۱۸۸۸ء (۱۴) دیوان، مرآۃ الخیال مستنصر پریس دہلی ۱۳۲۳ھ
(۱۵) قصیدہ استمداد کانفرنس نادری پریس حیدرآباد ۱۳۲۹ھ (۱۶) قصیدہ در بیان شہادت امام حسین مخدومی پریس،
(۱۷) کلام شوق و ذوق، نظامی پریس کانپور ۱۲۹۲ھ (۱۸) گلدستۂ احمد، شمس الاسلام پریس حیدرآباد
(۱۹) اعجاز سخن، سلطانی پریس حیدرآباد ۱۳۰۱ھ (۲۰) قصیدہ بردہ و بانت سعاد منظوم ترجمہ، افضل المطابع دہلی ۱۳۲۶ھ
(۲۱) تباہی و تلافی طغیانی موسی ندی انبیکا پریس حیدرآباد ۱۹۱۲ء (۲۲) ارشاد قدسی برکات اکبر پریس الہ آباد ۱۳۲۸ھ
(۲۳) قصیدہ بردہ منظوم ترجمہ باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی ۱۹۶۹ء (۲۴) قصیدہ الحظے الصدا فتہ مرتبہ محمود عباسی مکتبہ محمود کراچی
(۲۵) لسنظم شاد، نائن آرٹ پریس حیدرآباد (۲۶) قصیدہ راشیہ، مطبع المجری اکبرآباد (۲۷) حافظ الاسلام
مخزن القصائد مطبع ناجی کریمی بمبئی ۱۳۲۰ھ (۲۸) الارمغان، سنٹرل جیل پریس اورنگ آباد ۱۳۲۳ھ
(۲۹) جلوہ احمدی، حسن پریس حیدرآباد (۳۰) سوغات ناجی و جلال آصفی قومی پریس حیدرآباد ۱۳۱۶ھ
(۳۱) قصائد دولی الحکایت عشق النبی نظامی پریس حیدرآباد ۱۳۱۱ھ (۳۲) قصائد پر فوائد در مدح حضرت سید احمد فردوس پریس بنگلور
(۳۳) قصائد محمود، فیض الکریم پریس ۱۳۱۱ھ (۳۴) نظم روح افزا فی ذکر خیر الوریٰ مطبع انوار احمدی الہ آباد
(۳۵) تا (۳۸) جشن جمشید مطبع صادق الانوار بہاولپور بالترتیب ص ۱۱، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۱۰

قصیدہ جارج پنجم ـ قسمت پہ اپنی ناز کرے سبزہ زار ہند + آتا ہے پائے تخت میں پھر تاجدار ہند [علاء مصطفیٰ رسا]

ایضاً ۔ کس آن سے گلستاں میں مچی ہے ہلچل + اور ہی کچھ ہیں جوانانِ چمن کے کس بل [شفق عماد پوری]

قصیدہ منقبت حضرت علی ـ حال و مستقبل و ماضی کا خبیرِ عالم + ماہرِ رازِ ابد واقفِ اسرارِ ازل [اشتیاق احمد مشتاق]

" منقبت ـ آسمان درگاہ والا شان فضیلت انتساب + عرش ایوان قبلۂ خاندان ولی ذوالجلال [جعفر قدسی جائسی]

" منقبت ـ مصحفِ روئے پیمبر کی تلاوت میں ہے محو + منصفیاں باندھے ہوئے رازِ عقیدت کا امیں [آرزو لکھنوی]

" منقبت ـ ہے بتکدے کو جلوۂ نورِ خدا نصیب + کعبہ پکارتا ہے کہ میرے خوشا نصیب [اسد اللہ اسد لکھنوی]

" نعت ـ ہلکی ہلکی پڑتی ہیں بوندیں چھائی گھٹا کالی کالی + ہاں رے ساقی صدقے تیرے چھلکا دے بھر دے متوالی [ثاقب حسین اودھوی]

مدح راجا محمود آباد ـ ان کے دم سے سلم آور سب زمانے میں ہوئے + آج تک مشہور ہیں جو شیر افگن سورما [عاشق حسین بزم آفندی]

" قصیدہ منقبت ـ لسان اللہ عین اللہ وجہ اللہ اذن اللہ + خدائی متحد ہے کس قدر نفسِ پیمبر سے [اولاد اصغر اصغر]

" امام آخر الزماں منقبت ـ بشر پہ سرِ وجودِ عالم اسی جہت سے عیاں نہیں ہے + کہ ابنِ آدم علیہ السلام ہستی کا راز ہے راز داں نہیں ہے [اعظم حسین اعظم کرانی]

" امام رضا ـ پلادے بادۂ انگور اے ساقی ایرانی + ہو دکھانی رنگ سے فیروزی جامِ خراسانی [طاہرہ بیگم طاہرہ]

جارج پنجم ـ مژدہ اے دہلی کہ پھر جشن کے ساماں ہوں گے + جلوہ افروز یہاں قیصرِ ذی شاں ہوں گے [تلوک چند محروم]

منقبت علی ـ ہر نفس تحلیل میں تسبیح میں ڈوبا ہوا + ذکرِ حق میں ایک ہے فجر و عشائے بوتراب [جعفر مہدی رزم]

مدح نواب مرشد آباد ـ اے زیارت گاہ اہلِ بینش اے صاحبِ وقار + اک زمانے سے زمانے کو ترا انتظار [رضا علی وحشت]

قصیدہ منقبت ـ وہ آب و تاب حاصل ہو نہیں سکتی کبھی ان کو + خزف تا حشر صحبت میں رہیں گر لعل و گوہر کی [خیال امالی سبط حسن]

" منقبت ـ سرخئی رنگِ شفق ہے ترجمانِ اہلِ درد + خون سے لکھی گئی ہے داستانِ اہلِ درد [محمد کاظم کاظم سبزکی]

" نعت ـ ترے دربار میں الفقر و فخری کا ترانہ ہے + تری سرکار میں پامال ہے پندارِ شاہانہ [ولی الدین شفق]

منقبت ـ امتحاں گاہ محبت ہے سنبھل کر آئیں + عاشقی کھیل نہیں کوئی نہ سمجھے آساں [محمد رضا بیدل]

منقبت عباس ـ سنبھل سنبھل کر سمجھ سمجھ کر حق ایک منزل پہ آ رہا ہے + جو سازِ کثرت پہ مرتعش نقاوہ گیتِ وحدت کے گا رہا ہے [اسرار حسین اثر]

منقبت فاطمہ ـ نہ تلازم فلک میں نہیں کوئی دوسرا + تطہیر کے صدف میں وہ گوہر ہیں فاطمہ [جعفر علی خاں اثر]

" منقبت ـ ذوق تجسس لے کے چلا جب فکرِ رسا کو جولاں جولاں + وادی وادی صحرا صحرا ساحل ساحل میداں میداں [بدر الحسن عابدی]

" ـــــ ـ ہے جو اعجازِ محبت سازگار اپنی جگہ + آج دیوانے ہیں کتنے ہوشیار اپنی جگہ [قاسم شبیر نقوی]

" نعت ـ اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری + رعشۂ خوف بن گیا رشکِ تبانِ آذری [جوش شبیر حسین]

" نعت ـ کھلتا ہے بابِ مدحِ نبی احترام سے + آغاز کر رہا ہوں کیے خالق کے نام سے [محب الحسن ثمر]

" منقبت امام حسین ـ میں بیٹھا دامنِ دل کو جو سینے + تو مجھ کو ہنس کے دیکھا ہر کلی نے [بادشاہ حسین تکمیل]

منقبت زین العابدین ـ میری چشمِ تر میں ہر آنسو کا قطرہ قید ہے + دیکھیں اربابِ نظر کوزے میں دریا قید ہے [حسن الکمال]

" نواب بہاولپور مرحوم ـ یہ سرکار حبیب سے نگہباں تیرے ہیں ـــــ [ایم حسن اختر لودھیانوی]

منقبت ـ پہلے دل میں تو کرو قوتِ ایماں پیدا + پھر تو ہر گام پہ ہے گلشنِ رضواں پیدا [علی اختر اختر]

" نعت ـ شاہد مرے دعوے پہ ہے قرآں لبِ خیر لبی + بے شک یہ بشر دہ ہے جو ہے خیر البشر لبی [رفیق حسین رفیق]

مذہبی قصیدہ ؂ اللہ کے بت خانے سے کعبے کو چلا ہے بادل + اتحاد حرم و دیر ہی منشائے عمل [سراج الحق قمر]

مدح امام مہدی ؂ حریم حرم سے در سامرہ تک نقوش قدم رہ گذر ڈھونڈتی ہے
کہیں تو ہو پوری نماز محبت جبین وفا سنگ در ڈھونڈتی ہے] [مہدی نظمی]

قصیدہ نعت ؂ الّلہ الّلہ یہ اعزاز ربیع الاول + جس میں انعام خداوند کا برسا بادل [علیم ناصری]

؂ + بڑھ گئی ان کی طرف میری نظر دزدیدہ دزدیدہ [نہال رضوی]

تفضل حسین بنارسی کا ایک قصیدہ بنارسی قصیدہ گو شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

؂ اصرار ہے یہ شوق کا فائز سے آج صدر + فائز یہ بولے عذر کا پہلو نکال کے
شیدا کو آج بزم سخن کا بناؤ صدر + ہے میرا انتخاب بہت دیکھ بھال کے
جوہر نے آکے عیش سے اٹھنے ہی یہ کہا + سنتے ہیں شعر بزم میں چمکے ہلال کے
اخاہ بولے فیض سے فائز کہ دیکھنا + جوہر نکلیں گے آج ہمارے کمال کے
دیکھا کلیم عقل نے کامل کو بھی وہاں + پڑھتے ہوئے کلام اچھوتے خیال کے
عرشی بھی فرش خاک پہ تبسم کے ساتھ ہیں + نقشے دکھا رہے ہیں عروج و زوال کے
گوہر بھی ایک چھوٹا ثنا خواں ہے شاہ کا + بیٹھا ہوا ہے اپنا قصیدہ نکال کے
پڑھتے ہیں فخر بزم میں جو ع یہ فخر سے حیرت فزا ہیں جلوے یہ کس مہ جمال کے
حامد کے پاس بزم میں دیکھا ذبیح کو + کچھ لکھ رہے ہیں اپنا قصیدہ نکال کے
اعظم کا عزم یہ ہے کہ محسن کے واسطے + لیتے چلیں شراب محبت کو ڈھال کے
محسن علی اور حضرت جعفر بھی ہیں وہاں + ہیں منتظر وہ جیسے کسی نونہال کے
ناظر کے ساتھ حضرت انور ہیں بزم میں + بیٹھے ہیں اپنا اپنا قصیدہ نکال کے
زوار کربلا سے ابھی ہو کے آئے ہیں + فرخ سے کہہ رہے ہیں قصیدہ نکال کے
نافذ الگ تھے سب سے مگر تھے وہاں ضرور + مداح دل سے تھے یہ پیمبر کی آل کے
اقبال اور ریاض کا ہر شعر خوب تھا + فائز یہ بولے سب کا نتیجہ نکال کے

قصیدہ نعت ؂ جب کیا میں نے قصد نعت حضور + ہوئے یکجا شعور و تخت و شعور [حفیظ]
[illegible] + شامل حال تھا لطف رب غفور

مذہبی قصیدہ سے اللہ کے بت خانے سے کعبے کو چلا ہے یا دل + اتحاد حرم و دیر ہی منشا ہے عمل [سراج الحق قمر]

مدح امام مہدی سے حریم حرم سے در ساوہ تک نقوش قدم رہ گذر ڈھونڈتی ہے
کہیں تو ہو پوری نماز محبت جبین وفا سنگ در ڈھونڈتی ہے]] [مہدی نظمی]

قصیدہ نعت سے الحمد للہ بہ اعزاز ربیع الاول + جس میں انعام خداوند کا برسا یا دل [علیم ناصری

+ بڑھ گئی ان کی طرف میری نظر دزدیدہ دزدیدہ [نہال رضوی]
تفضل حسین سنارسی کا ایک قصیدہ سنارسی قصیدہ گو شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

سے اصرار ہے یہ شوق کا فائز ہو آج صدر + فائز یہ بولے عذر کا پہلو نکال کے
شیدا کو آج بزم سخن کا بناؤ صدر + ہے میرا انتخاب بہت دیکھ بھال کے
جوہر نے آکے عیش سے اتنے میں یہ کہا + سنتے ہیں شعر بزم میں چمکے ہلال کے
اخاہ بولے فیض سے فائز کہ دیکھنا + جوہر کھلیں گے آج ہمارے کمال کے
دیکھا کلیم عقل نے کامل کو بھی وہاں + پڑھتے ہوئے کلام اچھوتے خیال کے
عرش بھی فرش خاک پہ بسمل کے ساتھ ہیں + نقشے دکھا رہے ہیں عروج و زوال کے
گوہر بھی ایک چھوٹا ثنا خواں ہے شاہ کا + بیٹھا ہوا ہے اپنا قصیدہ نکال کے
پڑھتے ہیں فخر بزم میں جو ہے یہ فخر سے حیرت فزا ہیں جلوے یہ کس خوش جمال کے
حامد کے پاس بزم میں دیکھا ذبیح کو + کچھ لکھ رہے ہیں اپنا قصیدہ نکال کے
اعظم کا عزم ہے کہ محسن کے واسطے + لیتے چلیں شراب محبت کو ڈھال کے
محسن علی اور حضرت جعفر بھی ہیں وہاں + ہیں منتظر وہ جیسے کسی نونہال کے
ناظر کے ساتھ حضرت انور ہیں بزم میں + بیٹھے ہیں اپنا اپنا قصیدہ نکال کے
زوار کربلا سے ابھی ہو کے آئے ہیں + فرخ سے کہہ رہے ہیں قصیدہ نکال کے
نافذ الگ تھے سب سے مگر تھے وہاں ضرور + ورد زباں تھے یہ پیغمبر کی آل کے
اقبال اور ریاض کا ہر شعر خوب تھا + فائز یہ بولے سب کا نتیجہ نکال کے

مقیدہ نعت سے جب کیا میں نے قصد نعت حضور + ہوئے یکجا شعور و تحت و شعور [حفیظ تائب
روح ممدوح دستگیر ہوئی + شامل حال تھا لطف رب غفور]

مقیدہ نعت سے جو طغیانی پہ جوئے طبع استادانہ آتی ہے + تو بے باکانہ، پرکارانہ، مشتاقانہ آتی ہے [اصغر علی شاد]

ایضاً مطلع چراغ محفل دارین احمد مختار + ضیائے سینۂ کونین سید ابرار [فضل الدین فضا کلیم کرنالی]

ایضاً سمت کعبہ سے چلا سوئے کراچی یا دل + برق ہے خنداں زناں رعد بجاتی ہے بگل [نظیر لودھیانوی]

ایضاً سے میں نے انگلی چوس ہے + میں کیا جانوں قند و نبات
لمحہ لمحہ تھا کرے ہے + تن من کر دے گا خیرات [خالد احمد]

نعتیہ منقبت ــ آمد آمد کی خبر سن کر ہے سردار کی + زرد رنگت ہو گئی ہے خوف سے کفار کی [محمد اصغر اصغر]

ایضاً ــ پائی ہے تم نے خلافت احمدِ مختار کی + تیغ ورثے میں ملی ہے حیدرِ کرار کی [عباس حسین لبید]

ایضاً ــ عارفیہ جو تجھے اے صاحبِ اعجاز دیتا ہے + روا حاجت ہوئی تیرا کرم آواز دیتا ہے [باقر مرزا حمید]

ایضاً ــ رہیں ہم بحرِ عالم میں نہیں یہ بات امکاں میں + ٹھہر سکتے نہیں ہیں آ کے آنسو چشمِ گریاں میں [مصطفیٰ مرزا رشید]

ایضاً ــ وصی ہیں مرتضیٰ ہم نے سنا ہے دوست دشمن سے + ملا ہے رسولِ کبریا کے آپ بچپن سے [احمد آغا سلیم]

ایضاً ــ ساقیا کس وقت حیدر دل کو آرام آئے گا + کون سا دن ہوگا جب لب تک مرے جام آئے گا [سجاد حسین شدید]

ایضاً ــ دل میں عیسیٰ کے جگہ لی عشق کے آزار کی + اب وہی حالت بعینہ ہے ترے بیمار کی [فضل حسین فضل]

ایضاً نغمہ سنجی ہے خوشی میں بلبلِ گلزار کی + آمد آمد ہے وصی احمدِ مختار کی [محمد عنایت نسیم]

[مدح سردار سنگھ جی جودھپور] شب گزشتہ یہ ہر شے سے تھی عیاں فرحت + بنا نقار شک وطن میرا عالمِ غربت [بے خود بدایونی]

نعتیہ مفیدہ ــ ذرا سچ بتا دے تو ہی آسماں + تجھے یاد یا نہیں وہ سماں [منیار احمد علوی]

مدح نواب بہاولپور ــ ہے چشمِ نرگس پر فتن، ہر غنچہ ہے غنچہ دہن گل بن گیا کانِ سخن ہے طرفہ سامانِ چمن
دیکھو تو گلشن کا چلن، ہر ہر روش میں ہے پھبن ہے ہر شجر سایہ فگن تازہ ہوا نخلِ کہن [از عبدالقدوس قدوسی]

مدح نواب بہاولپور ــ اے شہنشاہ آسمان وقار + وصف تیرا ہو مجھ سے کب اظہار [مولوی محمد حسین خاں]

ترے اقبال پر وصف ہمارا صادق نہیں آتا + سکندر تیرے وصفوں کی اگر ہوتا قسم کھاتا [علاء الملک شاہ مساز]

ایضاً اے گلچیں گلشن مسرت مبارک + تجھے باغِ عالم نظارت مبارک [منشی منیح الدین]

ایضاً ترا سینہ ہے گنجینہ متاعِ لطفِ یزداں کا + ترا دل اک خزینہ ہے صفاتِ جود و احساں کا [ناصر حسین عنقا]

اجمالی جائزہ

جدید دور میں ہمیں ریاستی نوابوں، انگریزوں، امیروں، رئیسوں، مجسٹریٹوں
اور زندگی کے دیگر شعبوں سے وابستہ اہم افراد کی شان میں لکھے ہوئے قصیدوں کی ایک بڑی
تعداد سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس دور میں خوشامد اور بعضیت کے آثار خاصے نمایاں ہیں۔ ریاستی نواب
ہوں یا انگریز، اپنے اپنے اعمال کی بنیاد پر وہ اس مدح کے مستحق نہیں تھے جو پھولوں کی طرح سے
ان پر نچھاور کی گئی۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے بقول خوشامد اور مبالغے کے رنگ گہرے

"خاص طور پر ان قصیدوں کو دیکھیے جو انگریز حاکموں کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ اس کی ابتدائی
مثالیں فورٹ ولیم کالج کے شاعروں اور نثاروں کی تصانیف کی تمہیدی تحریروں اور انشاء اللہ انشا کے قصیدے
میں نظر آتی ہیں، شروع میں یہ کام شاعروں اور نثاروں نے احتیاج سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ مفاہمت
احتیاج کی رفیق بن گئی اور دونوں نے مل کر انگریز حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک نیا رستہ کھول دیا جس
پر لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ اور رامپور کے نواب کلب علی خاں اور نواب یوسف علی خاں جو اردو شاعروں کے ممدوح ہیں
"فرزندان سلطنت انگلیشیہ کی حیثیت سے چلتے نظر آتے ہیں۔"[1] فرزند سلطنت انگلیشیہ ہونے کے باوجود ہمارے
قصیدہ گو شعرائے ان نوابوں کو ناصر دین، محافظ دین، مبلغ دین اور ظل اللہ وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے
اس کے پیچھے ان شاعروں کی کونسی نفسیات کارفرما تھی۔ اس پر اس مقالے کے کسی حصے میں روشنی ڈالی
جاچکی ہے۔ تاہم بات انگریز حکمرانوں کے قصیدوں کی ہو رہی تھی۔ بقول، الف د نسیم

"حاکم و محکوم میں مفاہمت کی اس فضا کو سرسید تحریک نے بڑی تقویت دی ہے۔ انہوں نے اسباب بغاوت ہند
لکھ کر بھی مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب کرنے کی کوشش کی ہے ______ اتنی بات بالکل واضح ہے کہ
انگریزی اور مغربیت سے محبت نے اسلام اور مشرقیت سے بیزاری یا کم از کم بے خبری کا جذبہ پیدا کر کے مسلمانوں
میں احساس زیاں کو اس حد تک ضرور ختم کر دیا ہے کہ لٹیرے ہمدرد اور گرگے دوست نظر آنے لگے ہیں۔
ذرا وحید الدین احمد بے خود کا وہ قصیدہ دیکھیے جو انہوں نے شہنشاہ انگلستان جارج پنجم کی شان میں لکھا
ہے۔ اس میں انہوں نے حاکم (غیر مذہبی و غیر ملکی) کو خدا کے فضل سے مستفیض کیا ہے۔"[2] انگریزوں کی
شان میں لکھے ہوئے قصائد (جن کی تفصیل گزشتہ ابواب اور ضمائم میں موجود ہے) اپنی بنت میں خوشامدانہ
انداز لیے ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان ہندی شاعروں میں احساس حریت مرچکا ہے۔[3]

انگریزوں کی شان میں لکھے ہوئے قصائد کے علاوہ اس دور میں ہندوؤں، سکھوں اور
قادیانیوں کے قصائد بھی نظر آتے ہیں جو انہوں نے اپنے اپنے مذاہب اور مذہبی شخصیتوں کے حوالے سے
لکھے ہیں۔ ہندوستان میں مغلوں کا عہد زوال دیگر کئی مذاہب کی بیداری کا عہد بھی ہے۔
ہندوؤں نے خصوصاً اس موقع سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بہت سے علمی معرکے سر کیے
سرکاری ملازمتوں سے لے کر تاریخ، ادب، شعر، لغت اور تذکروں کی کتابوں کی تصنیف تک

---

(1) اردو شاعری کا مذہبی و فلسفیانہ عنصر (2) ایضاً
(3) اس کے یہ اشعار دیکھیے

اجمالی جائزہ

جدید دور میں ہمیں ریاستی نوابوں، انگریزوں، امیروں، رشیوں، مجسٹریٹوں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے وابستہ اہم افراد کی شان میں لکھے ہوئے قصیدے کی ایک بڑی تعداد سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس دور میں خوشامد اور بعض کے آثار خاصے نمایاں ہیں۔ ریاستی نواب ہوں یا انگریز، اپنے اپنے اعمال کی بنیاد پر وہ اس مدح کے مستحق نہیں تھے جو پھولوں کی طرح سے ان پر نچھاور کی گئی۔ ڈاکٹر الف۔ دنسیم کے بقول خوشامد اور مبالغے کے رنگ کے لیے

"خاص طور پر ان قصیدوں کو دیکھیے جو انگریز حاکموں کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ اس کی ابتدائی مثالیں فورٹ ولیم کالج کے شاعروں اور نثاروں کی تصانیف کی تمہیدی تحریروں اور انشاء اللہ انشا کے قصیدے میں نظر آتی ہیں، شروع میں یہ کام شاعروں اور نثاروں نے احتیاج سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ مفاہمت احتیاج کی رفیق بن گئی اور دونوں نے مل کر انگریز حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک نیا رستہ کھول دیا جس پر لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ اور رامپور کے نواب کلب علی خاں اور نواب یوسف علی خاں جو اردو شاعروں کے ممدوح ہیں "فرزندان سلطنت انگلیشیہ" کی حیثیت سے چلتے نظر آتے ہیں۔"(۱) فرزند سلطنت انگلیشیہ ہونے کے باوجود ہمارے قصیدہ گو شعرائے ان نوابوں کو ناصر دین، محافظ دین، مبلغ دین اور ظل اللہ وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے اس کے پیچھے ان شاعروں کی کونسی نفسیات کارفرما تھی۔ اس پر اس مقالے کے کس حصے میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ تاہم بات انگریز حکمرانوں کے قصیدوں کی ہو رہی تھی۔ بقول الف دنسیم

"حاکم و محکوم میں مفاہمت کی اس فضا کو سرسید تحریک نے بڑی تقویت دی ہے۔ انہوں نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر بھی مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب کرنے کی کوشش کی ہے ———— اتنی بات بالکل واضح ہے کہ انگریزی اور مغربیت سے محبت نے اسلام اور مشرقیت سے بیزاری یا کم از کم بے خبری کا جذبہ پیدا کر کے مسلمانوں میں احساس زیاں کو اس حد تک ضرور ختم کر دیا ہے کہ لیڈر نے ہمدرد اور گرگے دوست نظر آنے لگے ہیں۔ ذرا وحید الدین احمد بے خود کا وہ قصیدہ دیکھیے جو انہوں نے شہنشاہ انگلستان جارج پنجم کی شان میں لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے حاکم (غیر مذہبی و غیر ملکی) کو خدا کے فضل سے مستفیض کیا ہے۔ انگریزوں کی شان میں لکھے ہوئے قصائد (جن کی تفصیل گزشتہ ابواب اور ضمائم میں موجود ہے) اپنی بنت میں خوشامدانہ انداز لیے ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان ہندی شاعروں میں احساس حریت مرچکا ہے"(۲)

انگریزوں کی شان میں لکھے ہوئے قصائد کے علاوہ اس دور میں ہندوؤں، سکھوں اور قادیانیوں کے قصائد بھی نظر آتے ہیں جو انہوں نے اپنے اپنے مذاہب اور مذہبی شخصیتوں کے حوالے سے لکھے ہیں۔ ہندوستان میں مغلوں کا عہد زوال دیگر کئی مذاہب کی بیداری کا عہد بھی ہے۔ ہندوؤں نے خصوصاً اس موقعے سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بہت سے علمی محرکے سر کیے سرکاری ملازمتوں سے لے کر تاریخ، ادب، شعر، لغت اور تذکروں کی کتابوں کی تصنیف تک

---

(۱) اردو شاعری کا مذہبی و فلسفیانہ عنصر (۲) ایضاً
(۳) اس کے لیے استفار دیکھیے

انہوں نے کئی میدانوں میں اپنا لوہا منوایا۔ ظہیر الدین علوی نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندی" میں نیز ڈاکٹر اعظم کریوی
نے ہندی شاعری میں اور ڈاکٹر محمد حسن نے تاریخ ادب ہندی میں تفصیلاً لکھا ہے کہ خلجیوں کے بعد فارسی کے ساتھ ساتھ
ہندی زبان کی نشو و نما میں کیا کیا محرکات کارفرما رہے۔ جدید دور میں ہندوازم کی ترویج و ترقی ہندوؤں کا خصوصی
مقصد رہا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی ہر زبان کو اپنے مذہبی و غیر مذہبی خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی
اردو میں بھی انہوں نے ایسے قصائد لکھے جن کے ذریعے ہندو قوم کی مذہبی و سیاسی بیداری ہوئی،
ایسے کئی ہندو شعرا کے نام اور حوالے ضمیموں اور خصوصی مطالعوں میں آچکے ہیں۔ رام، لچھمن، سیتا،
راماین، مہابھارت، بھاگوت گیتا اور وشنوازم کے حوالے بھی اردو قصائد کی موضوعاتی اقلیم کا حصہ بنے
ہندوازم سے متاثرہ عقیدوں کی وجہ سے اردو شاعری میں نئے موضوعات تو در آئے ہی تھے۔ نئے اسالیب
بھی دکھائی دینے لگے۔ ہندو اساطیر کے کئی نام اردو نظم و نثر کا حصہ بنے، ہندو تاریخ و تہذیب
کے بعض معاملات بھی شاعرانہ اظہار کی گرفت میں آئے سیتا، گوکل، بندرابن، راون، شام (اری)
کرشن، رادھا، گوپی، کاشی اور متھرا جیسے الفاظ ہماری شاعری کا حصہ بننے لگے۔ ہندوانہ
عقائد اور معاشرت کے بعض پہلو بھی اردو قارئین کے شعور میں موجزن ہوئے، کئی مسلمان
شاعروں نے بھی اس لفظیات کا استعمال کیا۔ (دیکھیے محسن کاکوروی کا قصیدہ لامیہ)

اس دور میں اگر ہندوازم کے احیا کی کوشش ہو رہی تھی تو مسلمان بھی اپنے فرائض سے
غافل نہ تھے۔ انہوں نے اپنے نعتیہ، حمدیہ، منقبتی اور اخلاقی قصائد کے ذریعے مسلم تہذیبی
و ثقافتی روایات کو اردو زبان کا حصہ بنانے کا اہتمام کیا۔ مسلم اردو قصیدہ گو شعرا نے نعتیہ قصائد
میں حضورؐ کی صفات پر والہانہ شیفتگی کے انداز سے اظہار خیال کیا۔ انہوں نے حضور کی زندگی،
سیرت اور واقعات کے حوالے سے اہم انسانی اور نبوی معاملات کی نشاندہی کی۔ ان کے مطابق
پیغمبر اسلام ہر قسم کی مخلوق سے برتر و افضل ہیں۔ وہ دیگر تمام انبیا پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ان
کی حکومت بحر و بر پر ہے۔ قضا و قدر پر بھی ان کی قدرت ہے۔ وہ دستگیری اور مولائی کے
خصائص سے متصف ہیں۔ حضورؐ اسرار و رموز کے جاننے والے بھی ہیں اور رحمت اللعالمین
بھی۔ ان کے پیغام پر پوری توجہ دی گئی۔ یوں اردو قصائد (نعتیہ) کے وسیلے سے اسلامی
عقاید و روایات کے استحکام کے لئے بھرپور کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ ایسے قصائد کی
بھی کمی نہیں ہے جن میں معرفت کی اصلیت، اس کی ضرورت، طلب اور واقعات کا تفصیلی تذکرہ ہے
یا جو غوث الاعظم کی شان میں لکھے گئے ہیں یا جن کے ممدوح خواجہ معین الدین چشتی ہیں یا
جو پیروں اور فقیروں کی شان میں ہیں علاوہ ازیں خلفا، اصحابہ، آئمہ، دوازدہ امام
چہاردہ معصومین کی شان میں لکھے گئے جدید اردو قصائد میں بھی احیائے عقائد اسلامی
کی روح نظر آتی ہے۔ اس دور میں مذہبی قصائد جس کثرت سے لکھے گئے ہیں ان کا تذکرہ
ضمیموں میں ہو چکا ہے

شاطر مدراسی جیسے قصیدہ نگاروں نے جدید دور میں اردو قصیدہ کو فلسفے کے وسیع میدان سے آشنا کیا۔ ان کے قصیدہ اعجازِ عشق میں فنا و بقا، علت و معلول، ہستی و نیستی، وحدت و کثرت، وجود و عدم، استدلال و اعتقاد، نفی و اثبات کے ساتھ ساتھ مادہ اور روح کے مسائل پر بھی گہرے انداز سے غور و فکر کیا گیا ہے۔ ضمیمہ اعجازِ عشق میں شاطر نے یوروپی مفکرین کے نظریات پر بحث کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے خیالات کا کون سا حصہ اسلامی خیالات سے متصادم ہے۔

جدید دور کے (بعض خطابیہ قصائد کو چھوڑ کر) قصائد شان و شوکت اور جلال کی حامل زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں آیات و احادیث، قرآنی الفاظ و تراکیب کے علاوہ جدید علوم و فنون کی اصطلاحیں بھی بکثرت استعمال ہوئی ہیں۔ بعض قصائد کی تشبیب میں عارفانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ معاملات و مسائل نظم ہوئے ہیں۔ فلسفیانہ اور صوفیانہ اسرار و رموز کا تذکرہ اس دور کے اکثر قصیدہ نگاروں کا شیوہ رہا ہے۔

اس دور میں ریاستی نوابوں کی شان میں لکھے گئے قصائد میں تقریباً وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو اس سے پہلے ادوار کے قصیدہ گو شعرا کو مرغوب تھا۔ نواب مرزا داغ نے نظام الملک آصف جاہ کی مدح سرائی کرتے ہوئے السلطان کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے ①
بعض شاعروں نے اپنے ممدوحوں کو خدائی صفات سے متصف بھی دکھایا ہے۔ نواب قمر الدین حیدر خان سردار کے ایک قصیدہ (نواب عثمان علی خان کی مدح) کے یہ اشعار دیکھئے

سراج خانۂ ایمان، مزین اسلام + فروغ دین ورضا جوئے داور داور
ملک خصال، عدیم المثال، فخر کمال + خدا شناس و خدا ترس و مومن دیندار
فدائے نامِ خدا عاشق نبی و علی + محب خاص و غلام آئمۂ اطہار

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں

"مولانا شبلی کا کہنا تھا کہ سلاطین کے ناہموار طرزِ حکومت کی وجہ سے شعرا مجبور تھے کہ بادشاہ اگر دن کو رات کہے تو تم کہو کہ واقعی تارے نظر آرہے ہیں۔ مثلاً بنو امیہ کی ظالمانہ حکومت نے آزادی اور حریت کے جذبات کو بالکل پامال کر دیا تھا اور مذہبی لوگوں کو رشوتیں ملیں تو انہوں نے قضا و قدر کا مسئلہ پھیلایا گو کہ معتزلہ نے اس کی مخالفت کی لیکن بعد میں مشاعرہ کی وجہ سے بادشاہ کی عزت خدا کی عزت سمجھی گئی اور اس کی توہین کو خدا کی توہین کہا گیا، اسکا نتیجہ یہ ہوا اخلاقی شاعری میں احسان، تواضع، حلم، عفو، سخاوت اور توبہ وغیرہ کے متعلق سینکڑوں اشعار نظر آنے لگے۔ لیکن دلیری اور آزادی کے مضامین خال خال رہے بلکہ ناپید سی ہوگئے" ———— غرض ایسے تاریخی حالات پر نظر رکھتے ہوئے ہمارے شعرا کا کلام دیکھا جائے تو قصیدہ نگاروں کی دروغ گوئی، خوشامد اور تذلیل نفس کی باتیں بڑی حد تک حق بجانب سمجھی جائیں گی ①

---

① ادبی جائزے ص ۵۸، ۵۹

۱۹۴۷ء کے بعد اردو قصیدہ کا رواج کم ہو گیا۔ نہ وہ ریاستیں نواب رہے نہ وہ دربار، نہ وہ ماہر فنون رسمی شاعر رہے اور نہ ہی جدید قارئین قصائد کی طوالت کے متحمل۔ جدید انگریزی شاعری کے زیر اثر پیدا ہونے والی جدید شاعری نے تصنع، تکلف اور مبالغے کی قدیم صورتوں کو قابلِ اعتنا نہ جانا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں

"آج مغربی استادوں میں ایک بھی ایسا نہ ملے گا جو اس قسم کی شاعری کو سمجھ سکے جو لوگ قصیدے کو خوشامد اور دروغ سمجھتے ہیں، وہ کیا جانیں کہ کس ماحول کی وجہ سے یہ باتیں اس صنف میں داخل ہوئیں" ①

جہاں تک جدید دور میں لکھے جانے والے قصائد کی زبان کا تعلق ہے شاعروں نے اسے زیادہ سے زیادہ موثر اور اظہاری خوبیوں سے مالا مال بھی بنایا ہے۔ بعض قصیدہ نگاروں نے روایتی قصائد کے اسلوب کو اپنا مطمح نظر بنایا اور بعض نے جدید دور میں بننے والے نظمیہ لہجوں کی سادگی اور سلاست کو اس صنف کے لئے منتخب کیا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اردو قصیدے کے لئے منیر شکوہ آبادی نے جس زبان کا انتخاب کیا۔ اسے مقبولیت بھی ملی اور پذیرائی بھی۔ ان قصیدہ نگاروں کی تشابیب میں نئے منظروں کی عکاسیاں بھی ہوئی ہیں اور جدید شاعری میں در آنے والے موضوعات کی آئینہ بندیاں بھی، مدحیہ حصوں میں ممدوحین کی روایتی مدح کا انداز بھی ملتا ہے اور جدید مدحیہ جذبات کا انگ بھی (جس کے مطابق ممدوح کی اصل ذاتی وصفاتی حوالوں پر مبنی مدح کی جاتی ہے)۔ غالب کے قصائد کے تتبع میں بعض قصیدہ نگاروں نے وجود اور ہستی کے مسائل کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دی۔ زیادہ تر شعراء نے کائنات کے وجودِ لبسیط میں ہستی مطلق کو کارفرما دیکھا۔ وہ کثرت میں وحدت دیکھ کر دیدہ بینا سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ خیر و شر، فنا و بقا اور جبر و قدر کے موضوعات بھی جدید قصیدہ نگاروں کے قصائد کا حصہ بنے۔ تاہم انہوں نے اس حوالے سے کچھ ایسا اہتمام کیا کہ ان کے قصائد ثقیل و بوجھل نہیں ہوئے۔ ان میں شگفتگی اور تاثیر قائم رہی۔

---

① ادبی جائزے ص ۸۸

اختتامیہ

گزشتہ صفحات میں اردو قصیدہ کے مجموعی منظر نامہ کو پیش کیا گیا
اردو شاعروں نے اگرچہ اس صنف کو فارسی شاعری سے اخذ کیا۔ تاہم ان کی تخلیقی
اور شاعرانہ قوتوں نے اس میں مخصوص رنگ بھرے۔ دکنی دور سے لے کر عزیز لکھنوی
تک ہر دور کے قصیدہ نگاروں نے اپنے مخصوص تہذیبی ماحول کو اپنے سامنے
رکھا۔ علاوہ ازیں یہ صنف از خود مسلم تہذیب کی نزاکتوں اور آرائشوں کا
نمونہ بنی۔ اردو شعرا نے اپنے پسند اور ناپسند کے جذبات کا اظہار بھی کیا اور ماحول
اور معاشرے کے حالات پر بھی نظر رکھی۔ قصیدہ مخصوص شاہی اور درباری
ماحول میں پروان چڑھا۔ اس کی شان وشوکت اس کا شکوہ لفظی اسی
ماحول کی یادگار ہے۔ مابعد الطبیعاتی، سیاسی،
معاشرتی اور معاشی محرکات نے ہمارے شاعروں سے قصیدے لکھوائے، وہ اپنے
سے برتر ہستیوں کی مدح کرنے میں خوشی بھی محسوس کرتے تھے (جہاں وہ حق دار
کے لئے قصیدہ لکھتے تھے) اور مجبوری بھی، خدا، رسولؐ، خلفاءؓ، آئمہ اور
بزرگوں کی منقبت میں لکھے گئے اردو قصائد ہمارے شاعروں کی مذہبی عقیدتوں
کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے ہندوستان میں مسلم بادشاہوں اور نوابوں کو مسلم ملی
زندگی کے محافظ کے طور قبول کیا۔ ہندو شعرا نے بھی اسلامی تہذیبی زندگی
کے خاصے اثرات قبول کیے۔

اردو شعرا کے قصائد میں مقامی بادشاہوں کی طاقت، شان وشوکت
عظمت اور برتری کے تصورات بھی رقم ہوئے ہیں ان میں نوابوں اور مذہبی ہستیوں کے
وقار، تعظیم، افتخار اور شکوہ اور تقدس پر بھی عمدہ اشعار ملتے ہیں۔ قومی سربلندی،
ریاستی مذاہب کی ترویج کے لیے یہ مدحیہ قصیدے موثر ہتھیار بھی تھے۔ افراد اور
قوم کو مخصوص نظاموں سے آگاہ کرنے کے لیے ان کے رول کو نظر انداز نہیں
کیا جاسکتا۔ دکنی دور میں قصیدے رزمیہ مقاصد کے لئے بھی استعمال ہوئے
ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی ہند یا دکنی حکومتوں سے ان کے کیا کیا
تضادات تھے ان میں ہندوستانی حکمرانوں کا تاریخی، سیاسی اور احوالاتی
ریکارڈ بھی درج ہے۔ ان کی مدحیہ شاعری حکمرانوں کے نظری اور عملی مقاصد

کی تعبیر تھی۔ سلطنت کو ہمارے عوام اور قصیدہ نگار ایک مقدس ادارہ سمجھتے تھے اور سلطان
انہیں اس کا نمائندہ نظر آتا تھا۔ وہ بادشاہوں کے عدل و انصاف، رعایا کی حفاظت،
شجاعت اور دلبری کی تعریف کیا کرتے تھے یہ قصائد شاہی اداروں کو مضبوط و مستحکم
کرنے کے لئے بھی تھے اور درباری زندگی کی عکاسی بھی تھے۔ دربار کو ایک ثقافتی مرکز
کہا گیا ہے۔ شاعر اس ثقافتی مرکز سے متعلقہ تفصیلات مہیا کرتے تھے یوں ان
کے قصائد مخصوص شاہی نظام کے پراپیگنڈہ کا کام بھی دیتے تھے۔

ہمارے اکثر شاعروں نے شعر کو پردہ سخن بنا کر بادشاہوں کی رہنمائی کا
فریضہ بھی ادا کیا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور عدل و انصاف کی یاد دلا کر وہ
فرعون نما شاہوں اور جابر حکمرانوں کے دلوں میں نرمیاں بھی پیدا کرتے تھے

اردو قصیدہ اگرچہ آج اپنی افادیت کھو چکا ہے تاہم جب
ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اس پر ہندی، ایرانی اور عربی
تہذیبی اثرات موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس صنف میں یکسانیت
کے باوجود تہذیبی رویوں کا تنوع بھی نظر آتا ہے۔۔ آج ہمارے پاس
اکا دکا نعتیہ اور منقبتی قصائد کے خزانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔
اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مذہبی ہستیوں سے ہمارے شعرا گہرے
طور پر وابستہ ہیں۔

نیا اردو شاعر قدیم اظہاریاتی وسائل سے کام لینے سے گریزاں ہے۔ قصیدہ
ہر مصرعہ کی پختگی کا طالب ہے۔ اس میں ردیف و قوافی اور اوزان و آہنگ کی قیود
کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ شعرا صنائع بدائع کی پرخار وادیوں میں قدم رکھنے
کو نئے شعور کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ہم قصیدہ کے شاندار
ماضی اور اس کی عظیم شعری روایات کو یاد کر کے ماضی کے شاعرانہ معیارات
کی بازگشت کر سکتے ہیں۔ آج اردو قصیدہ کو ہم صناعی اور تخلیقیت کے
عظیم نمونوں کی حیثیت سے پرکھ سکتے ہیں

اردو قصیدہ نگاروں نے علم و آگہی، شعور و عرفان اور بصیرت و ایمان
رکھنے والے اعلیٰ اقداری معیارات قصائد میں قلمبند کیے ہیں نعتیہ اور منقبتی
قصائد ان کے دلوں میں موجود عشق و شعور کے دائمی جذبات کے عکاس ہیں
اردو قصیدہ نگاروں نے جھوٹ، منافقت، ریاکاری کے رویوں کی مذمت کی

کی ہے اور اعلیٰ اور ارفع اقدار کی ترسیل کر کے تہذیبی شعور کی بالیدگی کا کام کیا ہے

جہاں تک صنف قصیدہ کے عصری تنقیدی معیارات کا تعلق ہے تو نئی مغربی تنقید اور اس سے متاثر ہونے والی نئی مشرقی تنقید قصیدے کی صنف کو غلامانہ ذہنیت کی پیداوار قرار دیتی ہے اور اس صنف سے مکمل چھٹکارا حاصل کرنے کے حق میں ہے ۔ افراط و تفریط کے رویوں کی بدولت یہ صنف دو پاٹوں کے بیچ ہے ۔ قصیدہ اگر نئی زندگی اور نئے ماحول کے قریب تر ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنی تکنیکی اور ہیئتی پابندیوں کو ممکنہ حد تک نرم کرنا ہوگا ۔ علاوہ ازیں نئے تنقیدی معیارات کو بھی اس نفسیاتی نکتے سے اکتساب کرنا ہوگا کہ تعریف و ستائش اور ہجو و طعن و تشنیع کے رویوں کو فطرت انسانی کی حدود سے خارج نہیں کیا جا سکتا ۔ محبوب کے حسن و جمال اور سیرت و کردار کی تعریف کرنا ، کسی دوست کی کامیابیوں اور کامرانیوں کو سراہنا ، وطن دوستی کے جذبات سے متصف ہونا ، مظلوموں کو پسند اور ظالموں کو ناپسند کرنا ، بے اصولوں کا دشمن اور عادلوں کا حامی ہونا ، جدید و قدیم علماء شعرا اور دانشوروں کی کتابوں اور تخلیقات سے متاثر ہو کر دلوں میں ان کے لئے واہ واہ اور تحسین و آفرین کے رجحانات محسوس کرنا وغیرہ وغیرہ کیا ان جذبوں اور رجحانات پر قدغن لگ سکتی ہے ؟ کسی کی بہادری پر عش عش کر اٹھنا ، جوانمردی اور سخاوت کی داد دینا ، مہمان نوازی اور انسان دوستی کو سراہنا ، کسی متقی نیک اور پرہیزگار آدمی کے اوصاف بیان کرنا ، گزشتہ تاریخی ہیروز اور مذہبی شخصیات کے کارناموں کی تعریف سے عہدہ برآ ہونا اور اپنے سے برتر ہستیوں کی برتری کو تسلیم کرنا اگر معیوب ہے تو معاصر دنیا کے جدید ادب کو بھی قابل مذمت جاننا چاہیے کہ ویت نام سے لے کر امریکہ تک ہر ملک کے ادب میں تعریف و تحسین کی یہ صورتیں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں ۔ سو صرف قصیدہ ہی معتوب کیوں ٹھہرے ؟ کیا جھوٹی مداحی صرف قصائد ہی میں ہوتی ہے ؟ دیگر اصناف اور کئی دوسری صورتوں میں بھی تو اسکا اظہار ہوتا ہے جھوٹی مداحی جہاں کہیں بھی ہے قابل مذمت ہے مگر بعض محققوں نے مبالغہ اور صنعت حسن تعلیل کے استعمال کو بھی جھوٹی مداحی کا محرک قرار دیا ہے اس ضمن میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی تنقیدی کوتاہ نظری ہے ورنہ یہ دونوں صنعتیں تو تاثیر آفریں ہیں ۔

۱۹۴۷ کے بعد قصیدہ گوئی کے رجحان میں کمی واقع ہوئی ، اردو شعرا جدید شعریات کے تقاضوں کے تابع ہو کر اختصار کی جانب مائل ہوئے ، یہی وجہ ہے کہ حمد و نعت کے ذخائر تو مل جاتے ہیں لیکن حمدیہ اور نعتیہ قصائد کی تعداد بہت ہی کم ہے ۔ اس حوالے سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان میں نئے طرز کے سیاسی نظاموں کے قائم ہونے کی وجہ سے "طرز قدیم کے قصائد" کی جانب شعرا کی توجہ نہ رہی اور یہ بھی کہ نظم نگاری کے نئے رجحانات کی طرف شاعروں کے جھکاؤ نے اس صنف کو تقریباً تقریباً اس خاتمے تک پہنچا دیا ہے ۔ جہاں تک قصیدے کے امکان کا معاملہ ہے ۔ تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہمارے شعرا اس صنف میں قومی واقعات اور قومی شخصیات کے بارے میں نظمیہ تقاضوں کے تابع رہ کر اظہار خیال کریں تو اس صنف میں زندگی کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں ۔

کتابیات

مصنف	نام کتاب	ادارہ ومقام وسنہ
آثم ظہور احمد خاں	منظورِ حق	مطبع نظامی کانپور ۱۳۰۵ھ
آرزو سراج الدین خاں	دادِ سخن	مطبوعہ مرکز تحقیقات ایران و پاکستان، ۱۹۷۴ء
آرزو، لکھنوی	نشانِ آرزو	الواعظ صفدر پریس لکھنؤ ۱۹۵۱ء
آزاد محمد حسین	آبِ حیات	شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور، س ن
	خمکدہ آزاد	محبوب المطابع، دہلی، ۱۹۳۰ء
	نگارستان فارس	استقلال پریس لاہور ۱۹۲۲ء
آزردہ صدر الدین	تذکرہ آزردہ مرتبہ مختار الدین احمد	دہلی ۱۹۷۱ء
آسی عبد الباری	تذکرہ خندۂ گل	نگار مشین پریس، لکھنؤ ۱۹۲۲ء
	دو نایاب زمانہ بیاضیں	ہندوستانی اکادمی الہ آباد، ۱۹۴۲ء
آفتاب احمد صدیقی	صہبائے مینائی	عارفین پریس، ڈھاکہ، س ن
ابن بطوطہ	سفرنامہ ابن بطوطہ، ترجمہ رئیس احمد جعفری	مطبوعہ کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۸ء
ابن طوخان	تذکرہ، مرتبہ قاضی عبد الودود	پٹنہ، ۱۹۵۸ء
ابن بی بی	سلجوق نامہ، ترجمہ محمد زکریا مائل	مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۵۷ء
ابن حنیف	دنیا کا قدیم ترین ادب	کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۴ء
ابن رشیق	العمدہ (عربی)	مصر ۱۳۵۳ھ
ابن طباطبا	الفخری، ترجمہ جعفر شاہ پھلواری	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۶۲ء
ابن قتیبہ	الشعر والشعراء (عربی)	بریل، لندن، ۱۹۰۲ء
ابو اسحق محمد شجاع الدین	بداغ ہجراں	مطبوعہ لاہور، ۱۸۸۶ء
ابو شرف مجددی	آفتاب شرف	مطبع ستارہ ہند، کلکتہ ۱۹۳۲ء
ابو الفضل	آئین اکبری مترجم محمد فدا علی طالب	جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۸ء
ابو الحسن امیر الدین احمد اللہ	تذکرہ مسرت افزا، مرتبہ ڈاکٹر حبیب قریشی	مجلس کتب خانہ دہلی ۱۹۶۸ء

ابواللیث صدیقی	مصحفی اور ان کا کلام	مبارک علی لاہور، ۱۹۵۰ء
	جرأت ان کا عہد اور عشقیہ شاعری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۲ء
	لکھنو کا دبستان شاعری	اردو مرکز لاہور، ۱۹۵۵ء
ابونواس	دیوان مرتبہ احمد عبدالمجید الغزالی [عربی]	بیروت، ۱۹۵۳
اثر امداد امام	کاشف الحقائق دو حصے	مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۶ء
	دیوان اثر	مطبع منشی ظہور الحق آرہ، ۱۸۹۷ء
اثر جعفر علی خاں:	اثرستان	نظامی پریس لکھنو ۱۹۲۸ء
اثر، محمد علی خاں	مسدس تہنیت جشن	مطبوعہ اسٹیٹ پریس رامپور ۱۹۵۰ء
احسان علی احسان	خمکدۂ خیال	مطبوعہ ناقص الاول و ناقص الآخر
احسان اللہ	ہاشمی بیجاپوری	مطبوعہ لاہور کینٹ ۱۹۸۲ء
احسان اللہ خان احسان	قصیدہ قوفی	مطبع مفید عام آگرہ، س ن
احمد اللہ قادری	مزامیر	احمدیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۲۴ء
احمد اللہ ندوی	تذکرہ مسلم شعرائے بہار	مطبوعہ کراچی انٹرنیشنل پریس ۱۹۵۶ء
احمد رضا بریلوی	حدائق بخشش	نظامی پریس بدایوں س ن
اخطل	دیوان اخطل (عربی)	مطبوعہ بیروت ۱۸۹۲ء
اختر اورینوی	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا	لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۷ء
ادیب مسعود حسن رضوی	فائز دہلوی اور ان کا کلام	انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۶ء
ارمان جنم جیا منتر	نسخۂ دلکشا	کلکتہ ۱۸۷۵
اسعد شاہجہانپوری	وجدان سلیم	مکتبہ دواوین کراچی ۱۹۶۲ء
اسیر مظفر علی	مجمع البحرین	مطبوعہ نولکشور ۱۹۰۶ء
اسماعیل میرٹھی	کلیات	مطبوعہ میرٹھ ۱۹۱۰ء
اشتیاق حسین قریشی	برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ	کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء
اشرف علی	دیوان اشرف الاشعار	مطبع حیدر ۱۲۶۹/۱۸۴۹
اشفاق سید رفیع الدین	اردو میں نعتیہ شاعری	اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۶ء
اعجاز حسین ڈاکٹر	مذہب و شاعری	اردو اکیڈمی سندھ لاہور ۱۹۶۵ء
	مختصر تاریخ ادب اردو	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۶ء
اعظم الدولہ سرور	عمدہ منتخبہ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی	دہلی یونیورسٹی دہلی ۱۹۶۱ء
افسوس میر شیر علی	کلیات مرتبہ سید ظہیر احسن	مطبوعہ پٹنہ ——
افق دوارکا پرشاد	مجموعہ قصائد	افق میموریل کمیٹی دہلی ۱۹۴۸ء
	لمحات افق	آدرش کتاب گھر دہلی ۱۹۴۸ء
اسماعیل دہلوی	سلک نور	مطبوعہ سیالکوٹ ۱۲۹۵ھ

افسر صدیقی امروہوی، سردار علی، مخطوطات انجمن چار جلدیں، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۵ تا ۱۹۷۱

اکبر الہ آبادی — کلیات حصہ اول — اسرار کریمی پریس الہ آباد، ۱۹۴۰ء

اکبر امرناتھ — دیوان اکبری — کوہ نور پریس لاہور، ۱۸۷۲

الم مظفر نگری — جملہ گل — جمال پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۶۳

المعی حیدرآبادی — تنویر تخییل — عہد آفریں پریس حیدرآباد ۱۳۵۵ھ

امجد حسین — گلدستہ سخن — مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۵ء

امداد صابری — تلامذۂ میر — فقرا اکیڈمی راولپنڈی، ۱۹۶۵

امیر مینائی — انتخاب یادگار — تاج المطابع رامپور ۱۲۹۷ھ

مراۃ الغیب — نولکشور پریس لکھنؤ ۱۲۹۹ھ

قصائد امیر مینائی — مکتبہ سلطانی ابراہیم بمبئی ۱۹۴۹

انشاء اللہ خاں انشا — کلام انشا، مرتبہ محمد عسکری — مطبوعہ ہندوستانی اکادمی الہ آباد ۱۹۵۲

کلیات — نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۶ء

دریائے لطافت، مترجمہ مولوی عبدالحق، مطبوعہ کراچی (انجمن اکادمی) ۱۹۶۲ء

انوری — دیوان، مرتبہ سعید نفیسی [فارسی] چاپخانہ پیروز ۱۳۳۷ ش

انور دہلوی — نظم دل افروز — مطبع رفاہ عام لاہور ۱۸۹۹

انور صابری — جانے پہچانے اور جنہیں کوئی نہیں جانتا، صابری بک ڈپو دیوبند، س ن

انیس فاروقی ڈاکٹر — ہندوستانی مصوری ایک خاکہ — ترقی اردو بیورو ۱۹۸۱ء

ابو — قادری — ادبا — فضل و کمال بریلی — کراچی، ۱۹۷۰

باطن قطب الدین — گلستان بے خزاں — نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۵ء

باقر زیدی — انجم — بزم انجم آفندی کراچی ۱۹۷۴

بحر امداد علی — ریاض البحر — مطبع مصطفائی ۱۲۸۲ھ

بحری قاضی محمود — کلیات، مرتبہ حفیظ سید — نولکشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۸ء

بدر، بدر الحسن بدر عباسی — تجلیات بدر — لیتھو پریس بنارس ۱۹۶۹ء

بدر چاچ — دیوان قصائد، مرتبہ شفیق علی — مطبع محب ہند دہلی ۱۸۸۶ء

بدنام ممتاز الرحمن — حدیقۂ محبوب — مطبع اتحاد دہلی ۱۳۴۰ھ

برق شیام سندر — بہار سخن — ایل کے پریس مینا پور ۱۹۳۲ء

برنی ضیاء الدین — تاریخ فیروز شاہی ترجمہ — اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۳ء

بسمل رضی الدین فرشوری — تذکرۃ الواصلین — نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۵ء

بشار بن برد — المختار من شعر بشار، مرتبہ خالدیان — قاہرہ ۱۹۳۵ء

بشاش دیبی پرشاد — آثار شعرائے ہنود — دہلی، ۱۸۸۵ء

بشیر دہلوی	دیوان	دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۲ء
بشیر النساء بیگم بشیر	آبگینۂ شعر	سب رس کتاب گھر حیدرآباد ۱۹۶۸ء
بینی نرائن جہاں	دیوان جہاں مرتبہ کلیم الدین احمد	خاص سمینار گزینٹ سٹڈیز پٹنہ ۱۹۵۹ء
بقاء اللہ بقا	دیوان مرتبہ خواجہ احمد فاروقی	مطبوعہ دلی یونیورسٹی دہلی ۱۹۷۷ء
بلیار / لطیف فتنا احمد	دیوان بلیار	رازق مشین پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۱ھ
بہشتی، نجیب محمد	تاریخ الشعراء (عرب)	مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۱ء
بیان احسن الدین	دیوان بیان مرتبہ ثاقب رضوی	مجلس اشاعت ادب دہلی ۱۹۷۸ء
بیخود عبد الحی	مرات الخیالی	مشتہر پریس دہلی ۱۳۱۳ھ
بیخود محمد احمد	کلیات بیخود مرتبہ سید سبطین	لکھنؤ ۱۹۶۲
بیخود وحید الدین	درشہوار بیخود	دلی پرنٹنگ پریس ۱۳۳۸ھ
بیدار میر محمدی	دیوان، مرتبہ جلیل قدوائی	مطبوعہ الہ آباد (ہندوستانی اکاڈمی) ۱۹۳۶ء
بیدل عبد القادر	کلیات بیدل (فارسی)	مطبع صفدری بمبئی ۱۳۰۲ھ
بیکس جبلپوری	دیوان مرتبہ راحت مسعود	الکتاب کراچی س ن
بہار گوپراگ نرائن	صحیفۂ زریں	نولکشور پریس ۱۹۰۲
تاباں عبد الحی	دیوان مرتبہ سید بادشاہ حسین	خورشید پریس حیدرآباد س ن
تاسف سید حسین علی	دیوان صد غزل مرتبہ سید شبیہ الحسن	نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۲ء
تجلی میر محسن	دیوان قلمی مخطوطہ نمبر ۸۹۹۱	پنجاب یونیورسٹی لاہور
تمکین عابد	سخنوران دکن	عابد برقی پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۰ھ
تسلیم امیر اللہ	دفتر خیال	مطبوعہ رامپور ۱۲۹۸ھ
	تاریخ بدیع	مطبع حسنی رامپور ۱۲۹۸ھ
تمنا محمد حسن	شہید ایمان	مطبع گلزار احمد دکن ۱۸۹۷ء
تنویر احمد علوی	ذوق سوانح و انتقاد	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
تنہا ابن حسن	شبیر یزداں	آزاد پریس سردھنہ ۱۸۹۷ء
تنہا محمد یحییٰ	مراۃ الشعرا دو جلدیں	مطبوعہ مبارک علی لاہور ۱۹۲۰ء
جارج فریزر	شاخ زریں ترجمہ دو جلدیں	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
جان صاحب	دیوان مرتبہ سید محمد مبین نقوی	مطبع انوار احمدی الہ آباد س ن
جرأت قلندر بخش	دیوان مرتبہ اقتدا حسن	اورینٹل انسٹی ٹیوٹ اٹلی ۱۹۷۱ء
جریر	دیوان مرتبہ کرام البستانی [عربی]	بیروت ۱۹۶۵ء

مصنف	کتاب	مطبع / ناشر
جلال ضامن علی	نظم نگاریں	تصویر عالم پریس لکھنؤ ۱۳۲۱ھ
	کرشمہ گاہ سخن	مطبع فیض محمدی لکھنؤ ۱۳۰۱ھ
جلیل مانکپوری	تاج سخن	قطاسی پریس لکھنؤ ۱۳۵۰ھ
جمیل احمد	اردو شاعری پر ایک نظر	غضنفر اکیڈمی کراچی —
جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو جلد اول، دوم	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ / ۱۹۸۲
	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۳ء
جنگلی پدار بخش	گلزار ارادت	مطبوعہ نامی پریس میسور ۱۹۸۵ء
جوشش محمد روشن	دیوان مرتبہ قاضی عبد الودود	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۲۱
	ایضاً مرتبہ کلیم الدین احمد	پٹنہ ۱۹۷۱ء
چاند شیخ	سودا	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء
حافظ شیرازی	دیوان (فارسی)	مطبع نامی لکھنؤ ۱۹۰۷ء
حالی الطاف حسین	مقدمہ شعر و شاعری	نیا ادارہ لاہور ۱۹۵۳ء
	دیوان	اردو اکیڈمی سندھ، س ن
	حیات سعدی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء
	کلیات نظم حالی مرتبہ افتخار احمد صدیقی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۹ء
حبیب کیفوی	کشمیر میں اردو	مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۹ء
حبیب محمد کاظم	دیوان حبیب	مطبع شمسی حیدرآباد دکن، س ن
حسان بن ثابت	دیوان حسان (عربی)	مطبعہ محمدیہ مصر ۱۹۱۰ء
حسن اختر لدھیانوی	دیوان تجلی	رائل الیکٹرک پریس لدھیانہ، س ن
حسرت جعفر علی	کلیات مرتبہ نور الحسن ہاشمی	سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۶۶ء
حسن ڈاکٹر محمد	جلال لکھنوی	مطبع انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۸ء
حسن عمید	فرہنگ نو (فارسی)	انتشارات جاودان تہران —
حفیظ تائب	صلو علیہ و آلہ	مطبوعہ لاہور (سیرت منزل) ۱۹۷۸ء
حمزہ شمس الدین	چمنستان حمزہ	مطبع اعظم جاہی حیدرآباد ۱۳۲۲ھ
حیدر بخش حیدری	دیوان مرتبہ عبادت بریلوی	اردو دنیا کراچی، س ن
حیدر سعید محمد	بزم سعید	صادق پریس لکھنؤ، س ن

مصنف	کتاب	مطبع / سنہ
خافی خاں	منتخب اللباب جلد اول و دوم (فارسی)	ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ ۱۹۲۵
خاقانی شیرازی	دیوان مرتبہ علی عبد الرسولی	چاپخانہ سعادت تہران ۱۳۱۶ ھ ش
خاک میر طالب حسین	دیوان	مطبوعہ گلزار دکن ۱۳۵۶
خاکی نصیر الدین	چراغ ایمان	اسٹیٹ پریس ناہن ۱۳۵۶ ھ
خالد احمد	تشبیب	مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء
خالد عبد العزیز	خار مغیلاں	مطبوعہ ایوان پبلشرز کراچی ۱۹۶۲ء
خنجر محمد عبد اللہ	چمنستان گفتار	مطبع نظامی کانپور ۱۳۰۶ء
خورشید سید مصطفیٰ رضوی	جنگ آزادی ۱۸۵۷	مطبوعہ دہلی ۱۹۵۹
خویشگی نصر اللہ	ہمیشہ بہار مرتبہ اسلم فرخی ڈاکٹر	انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۷ء
داغ نواب مرزا	مہتاب داغ مرتبہ کلب علی فائق	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء
	یادگار داغ مرتبہ احسن مارہروی	اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ء
درگاہ قلی خاں	مرقع دہلی	تاج پریس حیدر آباد دکن بس ن
دقیقی طوسی	دیوان (فارسی)	مطبوعہ تہران بس ن
ذاکر حسین فاروقی	دلبستان دبیر	الواعظ صفدر پریس دہلی ۱۹۵۴
ذکی مہدی علی	دیوان قلمی پنجاب یونیورسٹی نمبر ۵۵۰۶ و کلیات	مطبوعہ نولکشور لکھنؤ بس ن
ذوق ابراہیم	کلیات جلد دوم مرتبہ تنویر احمد علوی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء
	قصائد ذوق سرشاہ سلیمان	نظامی پریس بدایوں ۱۹۶۲
ذکاء خوب چند	عیار الشعرا مائیکروفلم فرزند پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۳۲۹	۹۲۱۳
رازی شمس قیس	المعجم فی معاییر اشعار العجم (فارسی)	تہران ۱۹۰۹
راسخ غلام علی	کلیات	مطبوعہ خیر المطابع عظیم آباد ۱۳۱۱ھ
	مرأۃ الخیال ارمغان جدید	افضل المطابع دہلی ۱۸۹۶ء
راضی بہاری لعل جی	منتخب قصائد و غزلیات	دربار ریاست پونچھ ۱۲۷۷ھ
رسا حیات بخش	کلام رسا	مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۷
رسوا احمد حسن	دیوان رسوا	مطبع صادق الانوار بہاولپور ۱۲۹۹ھ
رشید حسن خاں	انتخاب سودا	مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۲
رفعت علی احمد	غزل ادب	مطبوعہ بہاولپور اردو اکادمی ۱۹۶۲ء
رفیق حسن رفیق	گلزار عقیدت	سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۱ء
رنج فصیح الدین	بہارستان ناز مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵

مصنف	کتاب	ناشر
رند محمد خاں	دیوان	مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۶۵ء
رئیس احمد جعفری	رند پارسا	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۲۵ء
ریاض خیرآبادی	ریاض رضواں مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱	اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن س ن
	میخانہ ریاض مرتبہ تسنیم مینائی	ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن ۱۹۵۷ء
زکریا خواجہ محمد	اردو میں قطعہ نگاری	ضیائے ادب لاہور ۱۹۷۷ء
	اردو کی قدیم اصناف شعر	لاہور اکیڈمی لاہور، س ن
زور محی الدین قادری	تذکرہ اردو مخطوطات پانچ جلدیں ۱۹۴۳ء، ۵۱ء، ۵۷ء، ۵۸ء، ۵۹ء	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ تا ۱۹۵۹ء
	اردو شہ پارے	مکتبہ ابراہیمیہ دکن ۱۹۲۹
	دکنی ادب کی تاریخ	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۰ء
	مرقع سخن چار جلدیں	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۳۴ تا ۱۹۳۹
زیات احمد حسن	تاریخ ادب عربی ترجمہ عبدالرحمن سورتی	غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۱ء
سالک ڈاکٹر	ادب عزیز	مطبع عزیز الملک کراچی ۱۹۶۶ء
سالک قربان علی	کلیات	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
سحر ابو محمد	اردو میں قصیدہ نگاری چوتھا ایڈیشن نسیم بکڈپو لکھنؤ	اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۷۹ء
سحر امان علی	ریاض سحر	مطبع کارنامہ لکھنؤ ۱۸۷۲ء
سحر احمد حسین	بہار بے خزاں مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد	دہلی ۱۹۶۸ء
سحر نواب علی	قصائد سحر	مطبع عمدۃ الاخبار پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء
سخن فخر الدین	سروش سخن مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
سراج اورنگ آبادی	کلیات مرتبہ عبدالقادر سروری، مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدرآباد دکن ۱۳۵۷	
سراج الحق فہم	کلیات فہم	مطبوعہ لکھنؤ، س ن
سرخوش محمد افضل	کلمات الشعرا مرتبہ صادق علی دلاوری	لاہور ۱۹۴۲ء
سرکار جادو ناتھ	تاریخ عالمگیر ثانی ترجمہ	مطبوعہ کلکتہ س ن
سروری عبدالقادر	جدید اردو شاعری	کتب خانہ عزیزیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۹
سری رام لالہ	خمخانۂ جاوید پانچ جلدیں	(لاہور) ۱۹۰۸ تا (دہلی) ۱۹۴۰
سلیمان حسن	لکھنؤ کے چند نامور شعرا	قومی پریس لکھنؤ س ن
سلیم وحیدالدین	افادات سلیم	کتب خانہ اعظم لاہور، س ن
سنائی غزنوی	دیوان (فارسی)	کتابخانہ ابن سینا تہران ۱۳۴۱ش

سہائے تمنا (راؔ)	یادگار ریاست الور	مطبع تمنائی لکھنؤ ۱۸۷۷ء
سہیل اقبال	ارمغان حرم مرتبہ افتخار اعظم	جہانگیر آباد پیلس لکھنؤ ۱۹۶۰ء
	موج کوثر	نامی پریس لکھنؤ س ن
سہیل احمد سرفراز بنارسی	نقوش عرفان	انجمن شعرائے اہلبیت لاہور ۱۹۶۷ء
	شہود عرفان	ایضاً ۱۹۶۷ء
	عروج عرفان	ایضاً ۱۹۶۸ء
	شعور عرفان	ایضاً ۱۹۶۸ء
سودا، مرزا رفیع	کلیات جلد اول و دوم	نول کشور لکھنؤ ۱۹۳۲ء
	کلیات سودا جلد دوم مرتبہ شمس الدین صدیقی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء
سید احمد دہلوی	فرہنگ آصفیہ چار جلدیں	مکتبہ حسن سہیل لاہور ۱۹۸۰ء
سیفی محمد اسلم	حیات اسماعیل	دیال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۳۹ء
سکسینہ رام بابو	تاریخ ادب اردو	علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور ۱۹۸۰ء
شاد کشن پرشاد	خمکدۂ رحمت	محبوب پریس دکن ۱۳۲۵ھ
	ہدیہ شاد	ایضاً ۱۳۱۷ھ
شاد محمد جان	دیوان شاد	علمی پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۷۰ء
شاطر، عبدالرحمن	اعجاز عشق	مطبع نافع الاسلام مدراس ۱۳۲۲ھ
	ضمیمہ اعجاز عشق	شاہ الحمدیہ سٹیم پریس مدراس ۱۹۰۸ء
	اعجاز سخن	آصفی پریس مدراس س ن
	قصیدہ	دکن پریس حیدرآباد س ن
	گلدستہ شاطر	مطبع نافع الاسلام ۱۹۱۰
شاغل احترام الدین احمد	تذکرہ شعرائے جے پور	یونین پرنٹنگ پریس دہلی س ن
شاکی الہ آبادی	کلیات شاکی	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس الہ آباد ۱۹۶۷ء
شاہ حاتم	دیوان زادہ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار	لاہور ۱۹۷۵ء
شاہ نصیر	کلیات مرتبہ تنویر احمد علوی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۱ء
شاہی علی عادل شاہ	کلیات شاہی مرتبہ مبارز الدین رفعت	انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۶۲ء
	کلیات شاہی مرتبہ زینت ساجدہ	اردو اکادمی حیدرآباد ۱۹۶۲ء

شبلی نعمانی	کلیات نظم شبلی	مدینہ بک ایجنسی بجنور ۱۹۲۸ء
شرر عبدالحلیم	مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یا گزشتہ لکھنؤ	ورلڈ اردو سنٹر کراچی ۱۹۵۶ء
شفق رضا زادہ	تاریخ ادبیات ایران ترجمہ مبارز الدین رفعت	ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۵ء
شفق ولی الدین	خرمن	شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۶۴ء
شفیق لچھمی نرائن	چمنستان الشعرا مرتبہ مولوی عبدالحق	اورنگ آباد ۱۹۲۸ء
شکیل عبدالغفار	نوادر اقبال	سر سید بکڈپو علی گڑھ ۱۹۷۷ء
شمشاد عبدالاحد	خزینہ شمشاد، نظم دلفروز	مطبع انوار محمدی لکھنؤ ۱۳۱۷ھ
شمیم احمد	اصناف سخن اور شعری ہیئتیں	مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۸۳ء
شہاب دہلوی	موج نور	مکتبہ الہام بہاولپور ۱۹۷۹ء
شہرت ہیرا لال خورجوی	ارمغان احبا	مطبع نظامی کانپور ۱۸۷۶ء
شہید غلام امام	قصائد نعتیہ	اسلامی پریس آگرہ ۱۳۱۱ھ
	قصائد نعتیہ	نظامی پریس کانپور ۱۳۱۱ھ
شہیدی کرامت علی	دیوان	مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۱ء
شورش	دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد	بیبل بیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء
شوق قدرت اللہ	طبقات الشعراء مرتبہ نثار احمد فاروقی	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء
شوق احمد علی خاں	تذکرہ کاملان رامپور	ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء
شہر خاں چابک سوار	کلیات کثرت	مطبوعہ منبع العلوم مظفر س ن
شیفتہ مصطفیٰ خاں	گلشن بے خار مرتبہ کلب علی فائق	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء
صابر علی خاں	سعادت یار خاں رنگین	مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی
صابر قادر بخش	گلستان سخن مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی	مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
	ریاض صابر	مطبع اخبار آصفی حیدرآباد س ن
صارم عبدالصمد	ترجمہ ستر القلوب از ابن تیمیہ	مطبوعہ لاہور (ادارہ علمیہ) ۱۹۶۲ء
صفا ذبیح اللہ	تاریخ ادبیات ایران جلد اول (فارسی)	تہران ۱۳۳۹ ہ ش
صفدر حسین سید	لکھنؤ کی تہذیبی میراث	بارگاہ ادب لاہور ۱۹۷۵
صفدر علی صفدر	کلیات صفدر	نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۱ء
صغیر امداد حسین	مخزن نجات	مطبوعہ نور الانوار آرہ س ن
	جلوہ خضر	مطبوعہ نور الانوار آرہ ۱۸۸۵ء
ضامن علی ضامن	دیوان ضامن	نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۹ء
ضرغام عبدالغفور	مجموعہ نظم بے نظیر	مطبع محبوب شاہی حیدرآباد دکن ۱۳۴۰

مصنف	کتاب	مطبع / سنہ
ضیغم محمد عبداللہ	گلدستہ جشن آصفیہ	مطبوعہ مخزن نظامی حیدرآباد ۱۸۹۸ء
طالب ملتانی	کلیات	قومی پریس لکھنؤ ۱۸۹۳ء
طالق ہمدانی	افکار جمیل	مطبوعہ لاہور، س ن
طباطبائی غلام حسین	سیر المتاخرین تین جلدیں	نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۶ء
طپش مرزا جان	بہار دانش	مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
طاہرہ بیگم طاہرہ	گوہر کعبہ	ناظم پریس رامپور، س ن
ظفر، بہادر شاہ	کلیات	مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۶۸ء
ظفر علی خاں مولانا	بہارستان	اردو اکیڈمی پنجاب لاہور ۱۹۳۷
ظہیر دہلوی	داستان غدر	مطبوعہ اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۵
	دیوان ظہیر جلد اول	مطبع مفید عام آگرہ، س ن
	جلد دوم، سوم	مطبع کریمی بمبئی، س ن
عابد علی عابد	اصول انتقاد ادبیات	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء
عاشق اقبال حسین	دیوان عاشق	مطبع رائے لبوالی پرشاد دہلی ۱۳۵۱ھ
عاقل، میر سلطان	دیوان	مطبع انوار الاسلام حیدرآباد دکن ۱۳۰۹ھ
عبدالجبار ملکاپوری	تذکرہ شعرائے دکن یا محبوب الزمن	حیدرآباد دکن ۱۳۲۹ھ
عبدالرحمن، شمس العلما	مراۃ الشعر	کتابخانہ نورس لاہور ۱۹۵۵
عبدالرحمن صباح الدین	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے	معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۶۳
	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے	ایضاً طبع دوم ۱۹۸۰
عبدالرشید خواجہ	تذکرہ طالب آملی	مطبوعہ کراچی ۱۹۶۵
عبدالسلام مولانا	شعر الہند دو حصے	مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۶
عبدالشکور	نظام رامپوری	ہند کمرشل پریس رامپور، س ن
عبدالحق مولوی	قدیم اردو	انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۱
	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ	انجمن ترقی اردو کراچی طبع سوم ۱۹۶۸
	مقدمات عبدالحق مرتبہ عبادت بریلوی	۱۹۶۱
	لغت ترقی	انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۱ء
عبدالحلیم ندوی	عربی ادب کی تاریخ	ترقی اردو بیورو نئی دہلی طبع دوم ۱۹۸۲
عبدالحی	گل رعنا	دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۵ء
عبدالحی صفا	شمیم سخن	حصہ اول مرادآباد حصہ دوم نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۱ء
عبدالرؤف عروج	بزم غالب	ادارہ یادگار غالب کراچی ۱۹۶۹ء

عبداللہ قطب شاہ	کلیات مرتبہ سید محمد	سلسلہ یوسفیہ شمارہ ۹، حیدرآباد دکن
عبداللہ چغتائی	اسلامی مصوری	فیروز سنز پرنٹنگ ورکس لاہور، ۱۹۳۶ء
عبداللہ، سید ڈاکٹر	مباحث	مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء
عبدالمالک آروی	مضامین	طاق لبیبۂ آرہ، ۱۹۴۲ء
عبدالمجید قریشی	عظیم علما کے نفسیات	ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۶۱ء
عبدالمجید صدیقی	تاریخ گولکنڈہ	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد ۱۹۳۹ء
عرشی ضمیرالدین احمد	حیات تسلیم	مخمور ارمغان پریس لاہور، س ن
عرفی شیرازی	قصائد عرفی (فارسی)	نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۷۱ء
عزام عبدالوہاب	ذکری ابی الطیب (عربی)	مطبوعہ بغداد، ۱۹۳۶ء
عزیز صفی پوری	طور تجلی	مطبع اعجاز خاص محمدی لکھنو ۱۲۹۶ھ
عزیز محمد ہادی	قصائد عزیز	معیار پریس رستم نگر لکھنو، ۱۹۱۲ء
	صحیفۂ ولا	اشاعت علوم پریس لکھنو، س ن
عشرت امرت لال	سخنوران بنارس	اکرام لیتھو پریس بنارس ۱۹۴۸ء
عشرت عبدالرؤف	آب بقا	نامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء
عشقی وجیہہ الدین	دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد	لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء
عطار نیشاپوری	قصائد و غزلیات (فارسی)	چاپخانۂ اقبال تہران ۱۳۱۹ش
عتیق، شمس سراج	تاریخ فیروز شاہی	نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۲ء
عقیل معین الدین	تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۶ء
علی احمد زیدی	سندھ میں اردو مخطوطات	مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۶۹ء
علی جواد زیدی	قصائد نگاران اتر پردیش	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۸ء
① عنصری	دیوان قصائد	مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۳۲۰ھ
غالب، اسداللہ خاں	اردوئے معلی دو جلدیں	مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء
	عود ہندی	ایضاً ۱۹۶۷ء
	دیوان غالب نسخہ عرشی	انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۵۸ء
غلام دستگیر قادری	قصائد منقبت	مطبوعہ فیض الکریم پریس حیدرآباد، س ن
غلام مصطفی خاں	ادبی جائزے	الکتاب، آرام باغ روڈ کراچی ۱۹۶۷ء
غواصی	کلیات مرتبہ محمد بن عمر	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن ۱۹۵۹ء
① عیش فدا علی	شعلۂ جوالہ	مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۵ھ

فائق قاضی نورالدین	مخزن الشعرا مرتبہ مولوی عبدالحق	اورنگ آباد ۱۹۳۳ء
فدا حسین فدا	دیوان فدا	مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۱ء
فرخ واحد علی	تجلیات فرخ	مطبوعہ بنارس، سن ن
فرخی سیستانی	دیوان فارسی مرتبہ محمد دبیر	مطبوعہ تہران ۱۳۳۵ھ ش
فرزدق	دیوان عربی	مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۶ء
فیض الدین	بزم آخر	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء
فریور حسین	تاریخ ادبیات ایران (فارسی)	مطبوعات امیر کبیر تہران ۱۳۴۲ھ ش
فغاں، اشرف علی	دیوان مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن	انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۰ء
فوق محمد دین	تاریخ ریاستہائے بکمپل گنڈ	مطبوعہ پنجۂ فولاد پریس لاہور ۱۹۰۵ء
فیض شمس الدین	فیض سخن	مطبوعہ مشین پریس حیدرآباد ۱۹۱۷ء
فرشتہ ابوالقاسم	تاریخ فرشتہ جلد اول و دوم	نولکشور لکھنؤ —
قادر بادشاہ مدراسی	مدح پیغمبر ۱۹۲۴ء، نعت خیر البشر ۱۹۲۵ء	نامی پریس مدراس ۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء
قاسم شبیر قاسم	کارنامہ دولا	مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۴۳ء
قانع میر شیر علی	تحفۃ الکرام جلد اول	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد —
قاآنی شیرازی	دیوان مرتبہ محمد جعفر محجوب فارسی	انتشارات امیر کبیر تہران ۱۳۳۶ھ ش
قائم، قیام الدین چاندپوری	مخزن نکات مرتبہ اقتدا احسن	مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء
	کلیات قائم مرتبہ اقتدا احسن	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء
قتیل مرزا	ہفت تماشہ ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر	مکتبہ برہان اردو بازار دہلی —
قدر غلام حسنین بلگرامی	کلیات	مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۱ء
قلق ارشد علی	مظہر عشق	مطبوعہ منشی نولکشور کانپور ۱۹۱۱ء
قلق غلام مولی	کلیات قلق مرتبہ کلب علی فائق	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
قلی قطب شاہ	کلیات مرتبہ سید محی الدین قادری زور	مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء
قیصر امجد علی خاں	تاج سخن	مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۸ء
کریم الدین، ایف، فیلن	طبقات شعرائے ہند مرتبہ محمود الہی	اردو اکادمی اترپردیش ۱۹۸۳ء
کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر	مطبوعہ لکھنؤ (نامی پریس)
کول رادھے ناتھ	باغ نشاط	مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۸ء
کیف عالمگیر خاں	دیوان کیف	مطبع انوار محمدی آگرہ ۱۳۲۸ھ

گب ایچ آر — مقدمہ تاریخ ادبیات عرب ترجمہ — مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء

گردیزی فتح علی — تذکرہ ریختہ گویاں — انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء

گنپت سہائے سرور بواسنو — اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ — کتابستان الہ آباد ۱۹۴۹

گوری پرشاد سہام — غنچہ طرب — الوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ، س ن

گوہر منور خاں — باغ رنگین — مطبوعہ دکن پریس حیدرآباد ۱۳۳۳ھ

گویا غضنفر محمد — دیوان — مطبع نظامی کانپور، ۱۲۸۰ھ

لطف مرزا علی — گلشن ہند — دارالاشاعت پنجاب لاہور، ۱۹۰۶ء

مانی کلب احمد جائسی — وادی ایمن — سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۵۰ء

مبشر حسن — شاہراہ انقلاب — مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲

محبوب احمد عباسی — تذکرۃ الکرام — محبوب المطابع دہلی، ۱۹۳۲ء

محروم تلوک چند — کلام محروم حصہ اول — آریہ اسٹیم پریس لاہور، ۱۹۱۵ء

محسن کاکوروی — گلدستہ محسن مطبع نولکشور، کلیات نعت مرتبہ نور الحسن — الناظر پریس لکھنؤ، ۱۲۹۹ھ

مبتلا کاظم مردان علی — گلشن سخن مرتبہ مسعود رضوی — انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۶۵ء

محسن علی محسن میر — تذکرہ سراپا سخن — لکھنؤ، ۱۸۷۵

محمود شکر آلوسی — بلوغ الارب چار جلدیں ترجمہ — مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۶۷ء ۱۹۶۸ء

محمود شیرانی حافظ — مقالات پانچ جلدیں — مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء

محمود دہلوی — دیوان — مطبوعہ دہلی، ۱۳۴۳ھ

محمد اسلام ڈاکٹر — یادگار جگر — آئینہ ادب لاہور، ۱۹۷۰ء

محمد عبدالحکیم — دیوان امیری — برقی پرنٹنگ پریس پٹنہ، س ن

محمد علی حیدر کاکوروی — تذکرہ مشاہیر کاکوری — اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷

محمد علی مراد آبادی — سرود غیبی — مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۲

محمد عمر جنوں — دیوان خیال جاناں — مطبع مفید عام آگرہ، ۱۳۱۱ھ

محمد عوفی — لباب الالباب — مطبوعہ کیمبرج ۱۹۰۲ء

محمد اللہ مولانا — موید الفضلا جلد دوم — نولکشور پریس لکھنؤ —

محمد ولایت اللہ — سوز و گداز — مطبوعہ دکن ۱۹۶۱ء

متنبی — دیوان مرتبہ عبدالوہاب عزام — مطبوعہ قاہرہ ۱۹۴۴ء

ر

محمد مہدی استر آبادی	تاریخ جہاں کشائے نادری	مطبع حیدری بمبئی ۱۲۹۳ھ
محمد یعقوب ضیا بدایونی	اکمل التاریخ دو جلدیں	مطبع قادری بدایوں ۱۳۳۳ھ
محمود الٰہی	اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ✓	اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۹۳
مینا بیگ مینا	کار فصاحت	مطبع یوسفی دہلی ۱۳۱۱ھ
مرتضیٰ حسین فاضل	نسیم اللغات	شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی ۱۹۸۱ء
مذاق جبلپوری	ریاض نورانی	مطبوعہ انجمن اسلامیہ جبلپور ۱۳۳۸
مذاق دلدار علی	کلام دلدار	مطبوعہ عزیزیہ آرٹ پریس ڈھاکہ ۱۹۶۲ء
مشفق خواجہ	جائزہ مخطوطات اردو جلد اول	مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۹
محشر کاظم حسین	شافع محشر	مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲ د
مصحفی غلام ہمدانی	تذکرہ ہندی گویاں مرتبہ عبدالحق	اورنگ آباد ۱۹۳۳
	ریاض الفصحا الیضاً	اورنگ آباد ۱۹۳۳
	قصائد کے تین غیر مطبوعہ دیوان	مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۲۲۲۶
مضطر کنور سین	ریاض الشہدا	مطبع ثمر ہند ۱۲۳۶ھ
مطیر بلجیت سنگھ	حکیم آغا جان عیش اور ان کے معاصر کا ایک پبلی کیشنز بہادر گڑھ ہریانہ ۱۹۸۳	
معظم بیجاپوری	کلام معظم مرتبہ ابو نصر محمد خالدی	مطبوعہ قدیم اردو حصہ اول
معین الدین دردائی	بہار اور اردو شاعری	اسلامیہ بلڈنگ آرہ ۱۹۷۷ء
مقبول بیگ بدخشانی	تاریخ ایران دو جلدیں	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۱ء
ممنون نظام الدین	کلیات جلد اول مرتبہ اکبر الدین صدیقی	فائن آرٹ پریس حیدرآباد ۱۹۷۲ء
منتظر شیو ناتھ پنڈت	دیوان منتظر	مطبع صحافی لاہور ۱۸۹۹ د
منہاج سراج	طبقات ناصری ترجمہ دو جلدیں	مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۵ء
منیر شکوہ آبادی	منتخب العالم	مطبوعہ مطبع سعیدی ۱۲۶۲ھ
	تنویر الاشعار	الیضاً ۱۲۷۵ھ
	نظم منیر	۱۲۹۵ھ
مہجور محمد بخش	نور تن	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲
منوچہری	دیوان مرتبہ بیبرسٹین کازمنسکی (فارسی) پیرس ۱۸۸۷	
منیر مسعود	رجب علی بیگ سرور	مطبوعہ الہ آباد ۱۹۶۸ء

میر سوز ؒ نراین — قصائد میر چار جلدیں — ساد لفو پریس دہلی ۱۹۱۲ء
کلامِ میر — مطبع مفید عام لاہور ۱۹۰۷ء
موتمن زین العابدین — تحول شعر فارسی (فارسی) — شوق تہران
مومن خاں مومن — کلیات — مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء
قصائد مومن مرتبہ ضیاء الدین بدایونی — الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۵ء
میرا جی — مشرق و مغرب کے نغمے — اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۸ء
میر تقی میر — نکات الشعرا تذکرہ — انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء
کلیات میر — مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۵ء
میر حسن — تذکرہ شعرائے ہندی مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری — اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ ۱۹۷۹ء
میکش سوز ؒ کال — خرابات میکش — مطبع آصفیہ حیدرآباد ۱۳۱۷ھ
جوش میکش — مفید عام دکن ۱۳۱۷ھ
میر عالم — حدیقۃ العالم — مطبع سعیدی حیدرآباد، س ن
ناجی شاکر — دیوان ناجی مرتبہ ڈاکٹر افضل الحق — ادارہ صبح ادب دہلی ۱۹۶۸ء
(۱) نازش رضوی — نوائے امروز — مطبوعہ ناشرین لاہور ۱۹۶۱ء
ناصر خسرو — دیوان اشعار ناصر خسرو مرتبہ نصر اللہ تقوی — تہران ۱۳۴۸ ہجری شمسی
ناصر سعادت خاں — تذکرہ خوش معرکہ زیبا مرتبہ مشفق خواجہ (فارسی) — مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰/۱۹۷۲ء
ناظر حسن محمد — نغمہ فردوس مرتبہ عبداللہ کافل — ملک عبدالحق لاہور ۱۹۳۷ء
نایاب منشی نبی بخش — خمخانہ عشق — مطبع مجدد امرتسر ۱۹۱۱
نثار احمد فاروقی — تین تذکرے — مکتبہ برہان دلی ۱۹۶۸
نجف علی خاں — احسن القواعد — مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۸ء
نجم آفندی — قصائد نجم — آفندی بک ڈپو حاجی حسن آگرہ س ن
قصائد نجم — تاج پریس یوسف بازار حیدرآباد ۱۳۷۳
نجم الغنی — تاریخ اودھ جلد اول تا پنجم — نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۹ء
تاریخ راجگان ہند — سیدم پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء
نساخ، عبدالغفور — سخن شعرا — نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۴ء
نسیم الف۔ د — اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر مقالہ پی ایچ ڈی پنجاب محفوظ
نصیر الدین ہاشمی — خواتین دکن کی اردو خدمات — وزارت فشسن پریس حیدرآباد
(۱) نادر کلب حسن — تذکرہ نادر مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ ۱۹۵۷

نصیر الدین ہاشمی — دکن میں اردو — سویرا آرٹ پریس لاہور ۱۹۵۲ء

دکنی کلچر — مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

نصرتی — دیوان مرتبہ جمیل جالبی — قوسین لاہور ۱۹۷۲

علی نامہ مرتبہ مولوی عبد المجید صدیقی — مطبوعات سالار جنگ کمیٹی ۱۹۵۹

گلشن عشق مرتبہ مولوی عبد الحق — انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۲

نظم طباطبائی — مجموعہ نظم و دیوان — مطبوعہ کلفو مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد ۱۹۳۳ء

نظام شاہ نظام رامپوری — کلیات — مطبوعہ شمس المطابع مراد آباد ۱۳۱۷ھ

کلیات مرتبہ کلب علی فائق — مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء

نظام الدین نظامی — قاموس المشاہیر دو جلدیں — مطبع نظامی بدایوں ۱۹۲۴، ۱۹۲۶ء

تجلیات سخن — مطبع نظامی بدایوں ۱۳۴۴ھ

نظامی عروضی سمرقندی — چہار مقالہ فارسی مرتبہ محمد قزوینی — مطبوعہ تہران ۱۳۳۳ھ ش

نظیر اکبر آبادی — کلیات — مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۵۲ء

نعمت اللہ ہروی — تاریخ خانجہانی و مخزن افغانی (ترجمہ) — مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۸ء

نعیم احمد ڈاکٹر — شہر آشوب — مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۶۸

نور الحسن خاں — طور کلیم — آگرہ ۱۲۹۸ھ

نور اللہ نوری — نواب فصیح الملک بہادر داغ — اعظم اسٹیم پریس دکن ۱۹۳۶

وزیر آغا — اردو شاعری کا مزاج — ناشرین لاہور ۱۹۶۵ء

وزیر خواجہ وزیر — دفتر فصاحت — مطبوعہ ۱۲۷۱ھ

وزیر علی وزیر — قصیدہ تہنیت میر محبوب علی — رپن پریس کلکتہ ۱۹۱۱

وحید قریشی ڈاکٹر — مرتبہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند چھٹی جلد پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۱

علاوہ ازیں تاریخ ادبیات کی اردو سے متعلقہ تمام جلدیں ملاحظہ کی گئی ہیں

وفا عبد الہادی — کلیات — مطبوعہ فیض عام علی گڑھ ۱۳۲۲ھ

ولی دکنی — کلیات مرتبہ نور الحسن ہاشمی — انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۰ء

ولی قلندر علی خاں — تحفۂ ولی — المنیر پریس جھنگ ۱۹۱۹ء

وفا راشدی — حیات وحشت — مطبوعہ مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۸۲ء

واجد علی شاہ — قصائد مبارک — نولکشور ۱۹۲۲ء

واسطی فضل رسول خاں — دیوان واسطی — مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۰ء

وطواط رشید الدین — حدائق السحر فی دقائق الشعر — مجلس کتابخانہ تہران ۱۳۲۹ھ ش

مراحیت (?) اردو لوی — سرمایہ نجات — سرفراز پریس لکھنؤ س ن

وحشت رضا علی — دیوان — مطبع ستارۂ ہند کلکتہ ۱۳۲۸ھ

ہاشمی بیجاپوری — دیوان مرتبہ حفیظ قتیل — ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن ۱۹۶۱ء

ہاشمی فرید آبادی — تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد اول — مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۱ء

ہاشمی نورالحسن — دہلی کا دبستان شاعری — مطبوعہ دہلی ۱۹۴۹ء

ہمائی جلال الدین اصفہانی — تاریخ ادبیات ایران فارسی — تبریز ۱۳۴۵ کوشش

ہمدم گلاب چند — دیوان — مطبع نواب شمس الدولہ حیدرآباد دکن ۱۲۸۱ھ

ہوش عبداللہ بیگ — دیوان — گلزار دکن پریس حیدرآباد ۱۳۰۶ھ

ہوش نیاز احمد — مثنوی ترانہ ہوش — مطبع نظامی بانس بریلی ۱۳۰۶ھ

کلیات مرتبہ نواز نثار احمد مطبع گلشن فیض لکھنو س ن

یاور محمد یاور — جذبات یاور — مطبوعہ خورشید کمپنی س ن

یزدانی سید و لطف حسین — قندیل حرم مرتبہ سید صفدر حسین — سنگ میل [illegible] ۱۹۷۰ء

کتابیات بز آ

۱۲ صفحے ملاحظہ ہوں

کتابیات (۲) II

آتش کاشمیری: سرزمین ظفروال، اعجاز آرٹ پریس، سیالکوٹ، س ن

آسی، عبدالعلیم: عین المعارف (دیوان)، مطبع سلیمانی، بنارس، ۱۳۳۵ھ

آغا شاعر قزلباش دہلوی: تیر و نشتر (دیوان)، مخزن پریس، دہلی ۱۹۰۹ء

آمنہ خاتون: ریاست میسور میں اردو جلد اول حصہ اول و دوم، آمنہ خاتون، میسور ۱۹۶۰ء

ابن طوفان: تذکرہ ابن طوفان، مرتبہ قاضی عبدالودود، پٹنہ ۱۹۲۴ء

ابوالفتح محمد محمد اللہ قاضی: صولت عثمانیہ، عثمان پریس، حیدرآباد دکن

ابواللیث صدیقی: مصحفی اور ان کا کلام، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور

ابوتراب، سونی پتی: شان حیدر (کلام)، ملت پبلشرز، لاہور ۱۹۶۸ء

احسن مارہروی: جلوۂ داغ، مطبع شمسی، حیدرآباد دکن، ۱۹۰۲ء

احقر، گردھاری لال: تاریخ ظفرہ، حکیم برہم پریس، گورکھپور، ۱۹۲۷ء

احمد اللہ ندوی: تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ اول (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء) حصہ دوم، حصہ سوم (۱۹۶۸) حصہ چہارم ۱۹۶۸، حصہ پنجم ۱۹۶۹، انٹرنیشنل پریس کراچی،

اختر، علی اختر جونپوری: ضیائے اختر، مرتبہ: سید احمد مہدی واسطی، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۶ء

اختر، مولانا محمد مرغوب: امام نعت گویاں (فاضل بریلوی)، مکتبہ فریدیہ، ساہیوال ۱۹۷۷ء

اختر، واجد علی شاہ: مجموعہ سلام و قصائد، مطبع سلطانی لکھنؤ ۱۲۹۶ھ

اخلاص، کشن چند: ہمیشہ بہار (تذکرہ)، مشمولہ رسالہ سہ ماہی اردو کراچی ۱۹۶۷، ۱۹۶۸ء

ادیب، اویس احمد: تنقیدی مطالعے، الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد ۱۹۵۵ء

ارسطو: قصیدہ در بیان شہادت امام حسینؑ، مخدومی پریس، حیدرآباد دکن

اسرار احمد سہاوری: اعجاز بیاں، آئینہ ایام گوجرانوالہ، ۱۹۶۴ء

اسرار حسین: قدیم سخنوران اودھ، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۳۶ء

اسلم پرویز: انشاء اللہ خاں انشا (عہد اور فن)، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۶۱ء

اسماعیل، میر محمد: بخار دل (مجموعہ کلام)، محمد احمد اکادمی، لاہور ۱۹۷۰ء

اسیر، منظفر علی: دیوان (قلمی)، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۴۲۵

اشپرنگر: یادگار شعرا، ترجمہ طفیل احمد علیگ، ہندوستانی اکادمی الہ آباد ۱۹۴۵ء

اشرف، رفیع: نظم طباطبائی (م)، نیشنل فائن پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء

اشہر لکھنوی: حضرت رشید پیارے صاحب، اصح المطابع، لکھنؤ ۱۹۲۲ء

اشہر، سید منظر علی: منظر الکرام، مطبوعہ ۱۹۲۲ء

(اصفہانی) جمال الدین: دیوان، مرتبہ: حسن وحید (فارسی)، تہران ۱۳۲۰ ہجری شمسی

افتخار حسین آغا: مخطوطات پیرس، ترقی اردو بورڈ، کراچی ۱۹۶۷ء

افسر، حامد اللہ: کتابوں کی جنگ، بھارگو اسکول، لکھنؤ، س ن

نقد الادب، نول کشور، لکھنؤ ۱۹۳۳ء

افسر صدیقی امروہوی: مصحفی، حیات و کلام، مکتبہ نیا دور، کراچی ۱۹۶۵ء

افضل پوری، افضل الرحمن: دیوان افضل، ابوالمعالی پرنٹرز، لاہور ۱۹۷۷ء

اقبال عظیم: مشرقی بنگال میں اردو، ڈھاکہ ۱۹۵۴ء

اکبر، اکبر خاں، سہارنپوری: باغ کلام اکبر (مداح پیغمبر)، سہارنپور ۱۲۷۶ھ

اکبر وارثی، صوفی خواجہ محمد اکبر: میلاد شریف اکبر، محمدی سٹیم پریس لاہور ۱۹۲۳ء

نہال روضۂ اکبر، فیروز پرنٹنگ ورکس، لاہور ۱۹۳۳ء

اکمال لکھنوی: میکدۂ ولا، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۲ء

الم، مولینا ابوالخیر محمد اسماعیل: دیوان الم، مطبع قیومی، کانپور ۱۹۱۰ء

امامی، حکیم محمد امام: نقوش و تاثرات حصہ اول، انجمن ترقی اردو بنگلور ۱۹۵۸ء

امراء القیس: دیوان (عربی)، دار المعارف، قاہرہ ۱۹۵۸ء

امجد حسین، ضیاء الدین: تاریخ منظوم سلاطین، انجمن ترقی اردو پریس، دہلی ۱۹۲۱ء

امجد علی، مولانا سید : اردو ورناکیولر میٹریکولیشن کورس، انوار احمدی پریس، الہ آباد، ۱۹۰۸ء
امیر مینائی : محامد خاتم النبیین، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۵ء
امین، امین الدین : قصیدہ عظمیٰ، مطبع دار العلوم، دہلی ۱۹۰۲ء
امین، محمد امین خاں : راحت العاشقین، (مجموعہ کلام) مطبع گفترک سماچار، لاہور ۱۸۹۳ء
انور علی : انتخاب قصائد سودا و ذوق، عظمی پبلیکیشنز، حیدرآباد سندھ ۱۹۶۸ء
اوج گیاوی، محمد یعقوب : جذبات اوج، (کلام) اسلامیہ اسٹیم پریس، لاہور، س ن
اولاد علی گیلانی : مرقع ملتان (یادگار تاجپوشی ایڈورڈ ہفتم) فیروز پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۳۸ء
ایمان، شبیر محمد خاں : ایمان سخن (انتخاب کلام)، مرتبہ مولوی سید محمد، شمس المطابع، حیدرآباد دکن ۱۹۳۷ء
باقی، گردھاری پرشاد : بقائے باقی، (مجموعہ کلام) مطبوعہ، ۱۳۰۷ھ
بحتری : دیوان، مرتبہ حسن کمال، دار المعارف، قاہرہ ۱۹۶۳ء
بختاور سنگھ : دیوان بختاور، لکھنؤ ۱۸۸۳ء
بدر آروی، امیر حسن : خمخانۂ بدر، (مجموعہ کلام) شان ہند پریس، کلکتہ ۱۹۲۹ء
برج کشن کول، وجگموہن ناتھ شوق : بہار گلشن کشمیر (تذکرہ) دو جلدیں الہ آباد ۱۹۳۱ء
بزم، عاشق حسین : چراغ بزم (مجموعہ کلام) مطبع النور، آگرہ ۱۲۹۷ء
بسمل میر بخش، غلام بسمل : نالۂ بسمل، (مجموعہ کلام) مطبوعہ ۱۸۹۶ء
بسمل، محمد عبد الجلیل : سلہٹ میں اردو، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۸۰-۸۱ء
بوصیری : قصیدہ بردہ، مدرسہ حنفیہ رضویہ، گوجرانوالہ س ن
بہجت، تنھن لال : دیوان بہجت و ضمیمہ دیوان بہجت، مطبع رضویہ، دہلی ۱۹۱۱ء
بے خود، وحید الدین احمد : گفتار بے خود، دلی پرنٹنگ ورکس، دلی ۱۹۱۴ء
بینی پرشاد : ہندوستان کا قدیم تمدن، ہندوستانی اکیڈمی ۱۹۵۰ء
پاسخ، منظر علی : توشۂ آخرت، مطبوعہ ۱۸۸۸ء
پروین، ام مشتاق : دیوان پروین، عزیز پریس، آگرہ، ۱۹۱۳ء
تاج، تاج الدین : آفتاب تاج (کلام) مرتبہ فدا حسین فدا ملاپ پریس، لاہور ۱۹۵۰ء
تاجور نجیب آبادی : روح نظم (جلد دوم) شمشیر سنگھ کمپنی، لاہور، س ن
تارا چند، ڈاکٹر : تمدن ہند پر اسلامی اثرات (ترجمہ) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۴ء
تارک محمد علی : تاریخ شعرائے سندھ، عزیز المطابع، بہاولپور، س ن
تپش، منشی غلام محمد خاں (مرتب) قصائد مدحیہ نظام مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۱ء
تراب، شاہ تراب علی بیجاپوری : دیوان تراب (مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۸۲ء
تسلیم، امیر اللہ : نظم دل افروز (کلام) مطبع نامی، لکھنؤ ۱۹۰۳ء
تمنا، اسعد علی : گل عجائب (تذکرہ)، مرتبہ: مولوی عبد الحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء
تمنا، رام سہائے : یادگار ریاست بھوپال لکھنؤ ۱۸۷۷ء
تنہا : تب و تاب (مجموعہ کلام) مرکنٹائل پریس، لاہور، ۱۹۵۵ء
انجمن ترقی اردو، پٹنہ، ۱۹۲۹ء

ثاقب عظیم آبادی : یادگار ملتش (؟) دار التصنیف و تالیف ریاست محمود آباد ۱۹[illegible]ء
ثاقب لکھنوی، ذاکر حسین : دیوان ثاقب (تجلائے شہاب ثاقب) مطبع یوسفی، دہلی ۱۳۱۳ھ
ثمر، اصغر حسین : گلدستۂ ثمر مطبوعہ برہان پور، ۱۹۲۸
جاوید از ہاری : سنگ گہر (صوبہ متوسط اور برار کے قدیم اہل زبان شعرا کا تذکرہ) کلکتہ ۱۹۶۹ء
جاوید نہال : بنگال کا اردو ادب
جاہ، راجہ جنگ بہادر : بزم پیمبری (مجموعہ کلام) مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۳۱۳ھ
جرار، حسین بیگ : دیوان جرار، مطبوعہ، لکھنؤ، ۱۸۸۶ء
جریر : دیوان، مرتبہ: کرام البستانی، (عربی) مطبوعہ بیروت، ۱۹۶۰ء
جعفر، محمد قدسی جائسی : ارشاد قدسی، برکات اکبر پریس، الہ آباد، ۱۹۳۰ء
انفاس قدسی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۳۵ء
جگر بریلوی : یاد رفتگاں (تذکرہ) مطبع انوار احمدی، الہ آباد، ۱۹۲۳ء
جمیل جالبی : ادب کلچر اور مسائل، مرتبہ خاور جمیل رائل بک کمپنی کراچی، ۱۹۸۶ء
جمیل نقوی : تنقید و تفہیم ادب نما، کراچی، ۱۹۸۲ء
جنوں، مولوی محمد عمر : دیوان خیال جاناں : مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۱۱ھ

چشتی، محرم علی : ارمغان چشتی، (مجموعہ کلام) مطبع مولوی فیروزالدین، لاہور، ۱۹۰۷ء

چکبست، پنڈت برج نرائن : صبح وطن، (ایضاً) ہندوستانی پریس نظیرآباد، لکھنؤ، س ن

حافظ شیرازی : دیوان، مرتبہ: حسین پژمان (فارسی) تہران ۱۳۱۸ ہجری شمسی

حافظ، : مخزن القصائد، مطبع مجیدی، کانپور، ۱۹۲۶ء

حافظ، شیخ اسمٰعیل توضیح حل: حافظ الاشعار مع حافظ الایمان (حصہ سوم) مطبع ناقی کریمی، بمبئی، ۱۳۲۳ھ

حافظ، مولوی خلیل الدین پیل بیتی: آئینہ پیغمبر (دیوان چہارم) نظامی پریس بدایوں، ۱۳۳۰ھ

حامد اللہ ندوی: کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں اردو مخطوطات، مطبوعہ، بمبئی، ۱۹۵۶ء

حامد حسن قادری : تاریخ و تنقید ادبیات اردو، مطبوعہ آگرہ، ۱۹۳۹ء

حبیب النساء بیگم: ریاست میسور میں اردو کی نشوونما، بنگلور، ۱۹۶۲ء

حسرت سہروردی : تذکرہ شعرائے قدیم نظیرنگر (ترچناپلی) مدینہ برق پریس، مدراس، ۱۹۵۹ء

حسرت موہانی : ارباب سخن، مطبوعہ، کانپور، ۱۹۲۹ء

حسن، خان محمد : ریاض الفردوس، مرتبہ: مرتضیٰ حسین فاضل، مطبوعہ، لاہور، ۱۹۶۸ء

حفیظ اکبرآبادی : دیوان حفیظ، منظور عام الیکٹرک پریس، لاہور، ۱۹۲۸ء

حفیظ، حافظ محمد علی : دیوان حفیظ، آصفی پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۴ء

حفیظ ہوشیارپوری: مشرقی پاکستان کے اردو ادیب، پاکستان پبلیکیشنز، کراچی، س ن

حلیم، مولانا شاہ عبدالحلیم: دیوان حلیم، خادم التعلیم اسٹیم پریس، [illegible] ۱۹۰۸ء

حمید اورنگ آبادی: گلشن گفتار، مرتبہ: سید محمد، مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۲۹ھ

حمید اللہ پشینوی : ہندوستان میں مخطوطات، بلوچستان بک ڈپو، کوئٹہ، ۱۹۷۵ء

حیات میرٹھی : بہاولپور کا شعری ادب، اردو اکیڈمی، بہاولپور ۱۹۷۱ء

حیدر کاکوروی، حافظ محمد علی: تذکرہ مشاہیر کاکوری، مطبع اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء

حیرت جنجھانوی، حافظ عبدالرحمن: دیوان حیرت، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۸۶ء

حیرت دہلوی، مرزا : چراغ دہلی، کرزن پریس، دہلی، ۱۹۰۳ء

حیرت، قیام الدین : مقالات الشعرا، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مطبوعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء

خادم، شیخ محمد خاں قریشی : دیوان، میکی پریس، گوجرانوالہ، ۱۹۱۱ء

خاور رضوی، سید : مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ایک مطالعہ، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۳ء

خبیر، غلام محمد خاں: شمس فیض، (مجموعہ کلام) مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۹۰ھ

خلیق انجم، ڈاکٹر: مرزا محمد رفیع سودا، مطبوعہ، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء

خلیل، ایم یو : مقصود معراج شریف، عباسی آرٹ پریس، کراچی، ۱۳۵۲ھ

خلیل، خلیل اللہ : کشکول (مجموعہ کلام) مطبوعہ ڈھاکہ، ۱۹۱۳ء

خنساء : دیوان (عربی) مطبوعہ بیروت، ۱۹۶۰ء

خوب، چھوٹو لعل : اودھ نامہ (مجموعہ کلام) مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۶۹ء

خیال، نصیر حسین : مغل اور اردو، عصر جدید پریس، کلکتہ، ۱۹۳۳ء

دانش، صفی حیدر : تصوف اور اردو شاعری، سیندھ ساگر اکادمی، کراچی ۱۹۶۸ء

دانش عظیم آبادی، نواب چھنو: پرواز (مجموعہ کلام) مرتبہ: ہوش عظیم آبادی، مکتبۂ ادب، پٹنہ ۱۹۵۴ء

درد نکودری: تاریخ ادب اردو، سلور لیتھو پریس، دہلی، س ن

درد رانی، معین الدین : صوفیائے بہار اور اردو، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

درگا پرشاد کفری نادر: خزینۃ العلوم فی متعلقات منظوم، مطبع معتبد عام، لاہور ۱۸۹۷ء

بوستان اودھ، لکھنؤ ۱۸۹۴ء

دولت شاہ : تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، مرتبہ براؤن (فارسی) لیدن ۱۹۰۱ء

دولہ، نواب جہانگیر محمد خاں: دیوان دولہ، مطبع نظامی، کانپور ۱۲۸۸ھ

دیوانہ، موہن سنگھ: منتخبات نظم اردو، لاہور آرٹ پریس لاہور ۱۹۳۱ء

ذوالفقار، غلام حسین! اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، مطبع جامعہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۶ء

راس مسعود، سر : انتخاب زریں، نظامی پریس، بدایوں،

راز، سید عزیزالدین احمد: تاریخ شعرائے بہار، قومی پریس، پٹنہ، ۱۹۳۱ء

رضا، کالی داس گپتا: سہو و سراغ، ادارہ فن و شخصیت، بمبئی ۱۹۸۰ء

رضا، منشی محمد رضا : منظور عالم (مجموعہ کلام) مطبع کلیمی، کلکتہ ۱۹۲۱ء

رضوان، رضوان علی خاں مرادآبادی: روضۂ رضوان (جلد سوم) مطبع اثنا عشری لکھنؤ ۱۳۱۹ھ

رازی، امین الدین : ہفت اقلیم (فارسی) مرتبہ جواد فاضل، مکتبۂ علمیہ فروشی علی اکبر، تہران

رضوی، اجتبیٰ رضوی: شعلۂ ندا (مجموعۂ کلام) — مکتبۂ ادب، پٹنہ، ۱۹۵۸ء
رضی، سید رضی الدین: کیفِ سخن (انتخاب کلام) — اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن، ۱۹۳۵ء
رعنا، نواب مردان علی خاں: مہرِ نبوت (مجموعۂ کلام) — مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۸۸ھ
رفیق الٰہی بخش: دیوانِ رفیق، — مطبوعہ لاہور، —
رفیق حسین: گلزارِ عقیدت، مرتبہ: نواب احمد علی خاں رضا لکھنوی، — سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۴ء
رفیع الدین ہاشمی (ڈاکٹر): اصنافِ ادب، — سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء
رکن الدین: مولد گلشنِ جلال رکن، — مطبوعہ خاندیس، ۱۳۲۰ھ
رودکی (بجواد سعید نفیسی): احوال و اشعار رودکی مختلف جلدیں (فارسی) — تہران، ۱۳۱۹ ہجری شمسی
رونق، پیارے لال: کلام رونق، — کاشانۂ اردو معلی، دہلی، ۱۹۳۹ء
ریاست علی ندوی: عہدِ اسلامی کا ہندوستان، — ادارۃ المصنفین، پٹنہ، ۱۹۵۰ء
زور، محی الدین قادری: داستانِ ادب حیدرآباد، — سب رس کتاب گھر حیدرآباد دکن، ۱۹۵۱ء
متاعِ سخن (انتخابِ کلام نواب عزیز جنگ بہادر) — اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن، ۱۹۳۵ء
میر محمد مومن، — ادارہ ادبیات حیدرآباد دکن، ۱۹۵۷ء
زہیر بن آلِ سلمہ: دیوان (مرتبہ کرام) بسطالی (عربی) — بیروت، ۱۹۵۳ء
زینبی، جلال الدین: تاریخ قصائدِ اردو، — انوار احمدی پریس، الٰہ آباد، س ن
ساجد، ساجد علی: سہیل یمن (کلام)، — مطبع غوثیہ، کلکتہ، ۱۸۹۲ء
ساقی، جواہر ناتھ: دیوانِ ساقی، — مہتاب پریس، دہلی، ۱۹۳۵ء
سالک، آل نبی (اجیری): تصویرِ انقلاب (قصیدہ)، — اختر پرنٹنگ پریس سرگودھا، س ن
سالک، عبدالمجید: مسلم ثقافت ہندوستان میں، — ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۷ء
سالک، قربان علی بیگ: کلیاتِ سالک، — اکمل المطابع، دہلی، ۱۲۹۷ھ
سبحانی شبنم: ہندوستانی تہذیب اور اردو، — کمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۶۷ء
سبو (ساقی و کوثر تسنیمی): بزمِ ادب مجلہ — بزمِ ادب، سہارنپور، ۱۹۸۱ء
سجاد دہلوی، مرزا سجاد بیگ: الفہرست، — مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۳ء
سجزی، حسن سجزی: دیوان (فارسی) مرتبہ: محمود علی محوی، — مشین پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۲ھ
سحر، ابو محمد: تنقید و تجزیہ، — کتابستان، الٰہ آباد، ۱۹۶۱ء
سحر، احمد حسین: بہارِ بے خزاں، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، — مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۸ء
سحر، دبیبی پرشاد: دیوانِ سحر (سحر ساحری) — مطبع نامی نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۸۱ء
سحر، نواب علی خاں بہادر: قصائدِ سحر، — اودھ پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۳ھ
سحر، محمد امیر حسن خاں: کلیاتِ سحر، — "در مطبع باہتمام مرزا محمد طبع شد"، ۱۳۲۰ھ
سخا، نظیر حسین: محبوب الشعرا، — سخا پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۰۰ء
نسخۂ اکسیر، — نور المطابع، لکھنؤ، س ن
سراج، سراج الدین سہارنپوری: کلامِ سراج، — صدائے ہند پریس، دہلی، ۱۸۹۷ء
سردار علی محمد: تذکرہ یورپین شعرائے اردو، — ادارہ اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء
سرخوش، شیر علی خاں: تذکرہ اعجازِ سخن، — لوتھرز پرنٹنگ ورکس، لاہور، س ن
(سعدی) راحت: قصائدِ راحت، — مطبوعہ راحت بک ایجنسی امرتسر، ۱۹۲۴ء
سرور، غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیا (جلد دوم) — مطبع نول کشور، کانپور، ۱۹۱۲ء
نعتِ سروری، — مطبع نامی نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۸۵ء
سروری، عبدالقادر: فہرستِ اردو مخطوطات کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، — مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء
سعدی شیرازی: قصائد و دیوانِ سعدی، (فارسی) — مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۸۵ء
دیوان، مرتبہ: وصفا، (فارسی) — تہران، ۱۳۴۰ ہجری شمسی
سعید، مولانا محمد سعید: قصیدۂ آصفیہ — کپور آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۱۹ء
سعید نفیسی: احوال و اشعار رودکی، (فارسی) — تہران، ۱۳۱۹ ہجری شمسی
سفیر، باقر علی خاں: تاریخ تحفہ مع چند منتخب قصائد — یاسین پریس، مدراس، ۱۳۲۸ھ
سفیر، میر شائق حسین خاں: نظمِ سفیر (دیوان دوم) — رزاقی پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۰ھ
سکندر، ابن محمد: مراثیِ سکندری، — مطبع فتح الکریم، بمبئی، ۱۳۰۸ھ

سکینہ، راما بابو: مرقع شعرا، مطبوعہ، دہلی، ۱۹۵۶ء

سلام سندیلوی، ڈاکٹر: ادبی اشارے، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء

سلمان، مسعود سعد: دیوان (فارسی) مرتبہ: ناصر ہیری، چاپخانہ فرامین، تہران، ۱۳۴۲ ہجری شمسی

سلیم، حامد رضوی: اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، مطبوعہ، بھوپال، ۱۹۶۷ء

سلیم، علی حسن خاں: بزم سخن، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۸۱ء

سلیمان اریب: حیدرآباد کے شاعر (دو جلدیں) آندھرا پردیش اکیڈمی حیدرآباد دکن ۱۹۶۲ء

سلیمان حسین سید: لکھنؤ کے چند نامور شعرا، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء

سوزانل بیوروج: بابر نامہ (انگریزی) جلد اول، مطبوعہ، لندن، ۱۹۲۱ء

سید، سید محمد علی شاہ: گلزار سید، ہندوستانی اسٹیم پریس، لاہور، ۱۳۲۷ھ

سیمابی، محمد عمر: دیوان (مبشرات عرفانی)، آگرہ پریس، آگرہ، ۱۳۴۴ھ

شاد بلند شہری، پریم سنگھ: دیوان شاد، مطبع برن پرکاش، بلند شہر، ۱۸۹۳ء

شاد، رحمت اللہ بیگ: کلام ذوق و شوق، نظامی پریس، کانپور، ۱۲۹۲ھ

شاد، صوفی شاد: نظم شاد، خاتون آرٹ لیتھو پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن —

شاد عظیم آبادی، علی محمد: تذکرہ شعرا، مرتبہ عطا کاکوی، پٹنہ، ۱۹۶۷ء

شاد کی کہانی شاد کی زبانی، مرتبہ محمد مسلم عظیم آبادی، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۱ء

حیات فریاد (الفت حسین فریاد) مطبع حرارت، اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء

شارب لکھنوی: میخانہ محبت، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء

شاطر، منشی دین دیال سنگھ: کلام شاطر (غنچہ خاطر)، مطبوعہ، دہلی، ۱۹۳۱ء

شاعر، اولاد حسین: سبد گل (مجموعہ کلام)، مطبوعہ، رامپور، ۱۹۲۴ء

شانتی رنجن بھٹاچاریہ: اردو اور بنگال، مطبوعہ، کلکتہ، ۱۹۶۸ء

بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات، مطبعہ، کلکتہ، ۱۹۶۳ء

شاہ، سید محمد: قصائد و الحکایت عشق نبیؐ، نظامی پریس حیدرآباد، ۱۳۱۴ھ

شاہ عالم ثانی: نادرات شاہی (کلام) مرتبہ: امتیاز علی عرشی، ہندوستانی پریس رامپور، ۱۹۴۴ء

شاہ کمال الدین: مجموعہ الانتخاب، مرتبہ: نثار احمد فاروقی، مطبوعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء

شاہنواز خاں: مآثر الامرا (ترجمہ) تین جلدیں، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء

شاہجہاں بیگم: تاج الاقبال (تاریخ ریاست بھوپال) (یوسف علی) مطبع نظامی، کانپور، ۱۲۹۰ھ

شاہدہ بیگم: سندھ میں اردو، اردو اکادمی حیدرآباد سندھ —

شجاعت علی سندیلوی ڈاکٹر: حالی بحیثیت شاعر، سرفراز پریس، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۰

شرر نعمانی: تائید و تردید، غنی سنز پرنٹرز، پشاور، ۱۹۶۷ء

شعلہ، سنواری لال: کلیات شعلہ، مطبع فیض عام، علی گڑھ، ۱۹۱۴ء

شفق کرتپوری، کنج بہاری لعل: بہار شفق (مجموعہ کلام)، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۳۲۳ھ

شفقت رضوی: اردو کے یورپین شعرا، ماڈرن پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۱ء

سراج اورنگ آبادی، شخصیت اور فن، ادارہ تصنیف و تحقیق، کراچی، ۱۹۸۴ء

شفیع، عبدالغفور خاں: دیوان شفیع، دہلی پنجاب پریس، لاہور، ۱۳۱۰ھ

شفیق بریلوی: تذکرہ شاعرات پاکستان، مکتبہ خاتون، کراچی، ۱۹۶۱ء

شفیق صدیقی جونپوری: خرمن عشق (مجموعہ کلام)، مطبع نورانی، بنارس، ۱۹۴۱ء

شکیل الرحمن: ادب اور نفسیات، اشاعت گھر، پٹنہ، ۱۹۶۱ء

شمس اللہ قادری: اردوئے قدیم، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء

شمشیر، سید شمشیر علی: قصائد شمشیر (حصہ اول)، مرکنٹائل پریس، لاہور —

شنکر داس: کارونیشن دربار دہلی کی سیر (ایڈورڈ ہفتم کا دربار تاجپوشی) مطبع مفید عام، لاہور، ۱۹۰۳ء

شوق (قدوائی) احمد علی: دیوان شوق، مطبوعہ، گونڈہ، ۱۹۲۹ء

شوق بنارسی، اسد اللہ خاں: زمزمۂ خلافت (قصیدہ)، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور، ۱۹۱۴ء

شوق جگناتھ پرشاد: آئینہ شوق (مجموعہ کلام)، دلی پرنٹنگ ورکس، دلی، ۱۹۱۱ء

شوق قادری: بوستان بے خار (مجموعہ کلام)، مطبع حسن، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۲ھ

شوق نیموی، محمد ظہیر احسن: دیوان شوق (نظم سحر ساز)، مطبع سعیدی، پٹنہ، ۱۹۰۸ء

شوکت سلطان: افکار سہیل، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء

شہاب، مسعود حسن: بہاولپور میں اردو، اردو اکیڈمی بہاولپور ۱۹۸۳ء

شبیر، محمد نوح: خیابان ترنم، مرتبہ سید اختر حسین نقوی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد ۱۹۳۶ء

شیدا، حکیم اجمل خاں: دیوان شیدا، مطبوعہ برلن، ۱۹۲۶ء

شیدا، نثار حسین: آرسی (دیوان ریختی) تبصرہ جو اس رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۳ء

شیفتہ، سید احسن: نوادر (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی فہرست کا ملحق) آزاد پریس پٹنہ، ۱۹۶۱ء

صابر سہارنپوری (حافظ محمد ہارون) نقوش جاوید، برقی پرنٹنگ پریس، سہارنپور، ۱۹۷۰ء

صادق، حاجی عبدالحق، دیوان صادق، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۸۰ء

صائب تبریزی: کلیات صائب، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۰۶ء

صبا، محمود علی: یاران میکدہ (تذکرہ) لیبل لیتھو پریس پٹنہ، ۱۹۵۷ء

صبر، عبدالکریم خاں (دہلوی) مرقع دربار (قصیدہ بہ تقریب جشن تاجپوشی جارج پنجم) مطبع نظام دکن، حیدرآباد، ——

صبر، محمد اسمعیل خاں: نذر وفا پیشہ (قصیدہ جارج پنجم) مطبع حامدی، رامپور، ۱۳۶۴ھ

صدر محل، نواب، بادشاہ نامہ، مطبع سلطانی، کلکتہ، ۱۲۸۸ھ

صفا، عبدالحی بدایونی: شمیم سخن، مطبع اعداد الہند، مرادآباد، ۱۸۸۸ء

صفدر، صفدر علی مرزاپوری: مرقع ادب، لکھنؤ پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۰ء

صل علی احمد: نسخہ عشق حق (کلام) مطبع رفاہ عام سیالکوٹ، س ن

صمیم، عروج سخن (مجموعہ کلام) مطبع منشی پرشاد، بلند شہر، ۱۹۰۶ء

ضیا احمد، مولانا (مرتب) مجموعہ قصائد، الناظر پریس، لکھنؤ ۱۹۲۲ء

ضیا، بادشاہ علی: قصیدہ استمداد کانفرنس، قادری پریس حیدرآباد دکن س ن

طالب آملی: کلیات اشعار، (فارسی) مرتبہ: طاہری شہاب، تہران ۱۳۴۶ ہجری شمسی

طالب، ستیش چندر سکسینہ: یادگار برق، دیال پرنٹنگ پریس، دہلی ۱۹۳۵ء

طاہرہ، طاہرہ بیگم: گوہر کعبہ (مجموعہ کلام) ناظم پریس، رامپور ۱۹۵۹ء

طغرائی، فیروز الدین: کلیات، مسلم پریس، لاہور، ۱۹۳۳ء

طپش، منشی رحمن علی: تاریخ ڈھاکہ، مطبع ستار آف انڈیا آرہ، ۱۹۱۰ء

ظفر ترمذی: پیکر تصویر (مجموعہ کلام) عظیم پبلشرز، جھنگ صدر ۱۹۸۵ء

ظفر علی خاں سیال: جھنگ کے اردو شعرا، مقالہ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۵ء

ظہوری ترشیزی: قصائد ظہوری (قلمی) فارسی، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی مخطوطہ ۲۵۱۰

ظہوری، محمد علی: نوائے ظہوری (مجموعہ کلام) مرکزی مجلس حسان پاکستان ۱۹۷۵ء

ظہیر احمد صدیقی: تحقیقی مطالعہ حالی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۵۶ء

ظہیر الدین مدنی (مرتب): میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام، مطبوعہ ادارہ ادبیات، دکن ۱۹۵۷ء

عابد امام زیدی: فہرست مخطوطات خدا بخش پبلک لائبریری بانکی پور، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۶۲ء

عارف، ابوالحلال: نواب فصاحت جنگ جلیل، مکتبہ عنبرینیہ، حیدرآباد دکن س ن

عارف حسین: قصائد چہاردہ معصومین، نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۲ء

عارف، محمد حسین خاں: قصیدہ بردہ و بانت سعاد (منظوم ترجمہ) افضل المطابع، دہلی، ۱۳۲۵ھ

عاشق ملتانی، شیخ گل محمد: صحیفہ نورانی (مجموعہ کلام) مطبع دین محمدی، لاہور، ۱۳۳۳ھ

عاصی، گھنشام لال: کلام عاصی، مرتبہ جن موہن لال ماتھر، کائستھ اردو سبھا، دہلی، س ن

عالی رضوی، محمد رفیع: اختر اقبال (تاریخ بھوپال) مکتبہ مخزن العلوم علی گڑھ، ——

عباس، سید غلام عباس: دیوان عباس، مطبع مطلع الانوار، سہارنپور ۱۲۸۷ھ

عبدالحق خادم (مرتب): گلزار علی پور (در مدح محمد جماعت علی شاہ) روز بازار اسٹیم پریس، امرتسر ——

عبدالرحیم خاں، مولوی: مرقع کرناٹک، دار الطبع سنٹرل جیل، گلبرگہ ۱۳۲۲ھ

عبدالشکور، دور جدید کے چند منتخب ہندو شعرا، دانش محل لکھنؤ ۱۹۴۳ء

نظام رامپوری، ہند کمرشل پریس رامپور، ——

عبدالحلیم، ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی درس و تدریس، علی گڑھ ۱۹۵۶ء

عبدالقدوس، قدوسی، جشن جمشید (جشن تاجپوشی) مطبع صادق الانوار بہاولپور ۱۲۹۷ھ

عبدالقیوم (مرتب) تاریخ ادب اردو (۱۲۰۷ تا ۱۸۵۷) پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز کراچی ۱۹۶۲ء

عبدالقیوم دلیسنوی: ایک اور مشرقی کتب خانہ، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۱ء
عبدالکریم، قاضی: فہرست کتب کریمی لائبریری متعلق انجمن اسلام بمبئی
[اس فہرست میں خیابان فردوس از کافی (مجموعۂ قصائد)، گلبن نعت از محجوب، ریاض الفردوس (قصائد) از محمد حسین شاہجہانپوری، سرور المشتاقین (نعتیہ قصائد) از محمد عبداللہ کا تذکرہ ملتا ہے] بمبئی، ۱۹۵۳ء
عبدالمجید خاں: کلیات نعت مجیدیہ، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۵ء
عبدالمجید صدیقی: تاریخ دکن (عہد وسطیٰ) طارق برقی پریس، حیدرآباد دکن ۱۹۵۲ء
عبدالواسع جبلی: دیوان، مرتبہ ذبیح اللہ صفا (فارسی) تہران ۱۳۳۹ ہجری شمسی
عبداللہ بلال صدیقی: قصیدہ بردہ (منظوم ترجمہ) باب الاسلام پریس، کراچی ۱۹۷۰ء
عبداللہ یوسف علی: ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی معاشرتی حالت، ہندوستانی اکادمی الہ آباد ۱۹۳۹ء
عبدالمحفوظ ضیا بدایونی: اکمل التاریخ، مطبع قادری، بدایوں ۱۳۳۳ھ
عرش، احمد سلیم: قلعہ معلی کی جھلکیاں محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۷ء
عرشی، ضمیر الدین احمد: حیات مومن، ناشر سید اشتیاق حسین، دہلی ۱۳۴۷ھ
عرشی، امتیاز علی: فہرست مخطوطات اردو رضا لائبریری رامپور جلد اول رامپور ۱۹۶۷ء
عزیز الرحمن، مولانا: قصائد نعتیہ مدرسہ امداد العلوم، ایبٹ آباد ۱۹۷۵ء
عزیز جنگ بہادر: تاریخ النوائط، عزیز المطابع حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ
عزیز مینائی: قصیدہ عزیزیہ، مطبوعہ لاہور، قبل ۱۹۳۶ء

عشرت، عبدالرؤف: ہندوستان، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۱ء
عشق، محمد حبیب اللہ: پری خانۂ عشق (مجموعۂ کلام) عزیزی پریس، آگرہ، ۱۳۲۲ھ
عطو، سید ابراہیم: اعجاز سخن سلطانی پریس، حیدرآباد، ۱۳۰۲ھ
علی شیر نوائی: مجالس النفائس، مرتبہ علی اصغر حکمت (فارسی) تہران ۱۳۲۳ ہجری شمسی
عمر بن ابی ربیعہ: دیوان (عربی) مرتبہ عبدالمجید قاہرہ ۱۹۵۲ء
عنبر، منشی سنت لال: تتمہ کلیات عنبر، مطبوعہ، گورکھپور، ۱۹۱۶ء
عنترہ بن شداد: دیوان (عربی) مرتبہ: کرام البستانی بیروت، ۱۹۵۸ء
عنصری، ابوالقاسم: دیوان (فارسی) مرتبہ: دکتر یحییٰ قریب تہران، ۱۳۴۱ ہجری شمسی
عوفی، نورالدین محمد: لباب الالباب، مطبوعہ کیمبرج، ۱۹۰۲ء
غبار، صادق حسین: قصائد نعتیہ نامی پریس کانپور، ۱۹۱۶ء
غریب، ایم محمد دین: قصیدہ جات مدحیہ (در مدح جارج پنجم) روز بازار اسٹیم پریس امرتسر، ۱۹۱۱ء
قصیدہ جات مدحیہ، مطبع ریاض ہند، امرتسر، ۱۹۱۲ء
غلام حسین، خواجہ: تاریخ گلزار آصفیہ، مطبوعہ ۱۳۰۸ھ
غلام، غلام رسول: افضال سرمدی و اجلال احمدی (کلام) مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور، س ن
غلام عباس: ریاض سخن (دیوان عباس) سہارنپور، ۱۸۷۰ء
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر: ادبی جائزے، الکتاب، کراچی، ۱۹۶۵
حالی کا ذہنی ارتقا، مکتبہ کارواں، لاہور ۱۹۶۶ء
علمی نقوش، علمی کتب خانہ، کراچی ۱۹۵۷ء
غلام نبی، منشی: تاریخ جھجھر، مطبوعہ جھجھر، ۱۸۸۲ء
فاروقی، نثار احمد: دید و دریافت، آزاد کتاب گھر، دہلی ۱۹۶۹ء
فاضل، مرتضیٰ حسین: ناسخ، مطبوعہ علمی پریس، لاہور، س ن
فراق، ناصر نذیر: لال قلعہ کی ایک جھلک، محبوب المطابع، دہلی ۱۹۴۴ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: اردو کی نعتیہ شاعری، آئینہ ادب، لاہور،
فرید، شاہ فریدالدین عبدالشکور: مناقب علی، موسوم بہ فضائل حیدری، انڈین پریس، لکھنؤ، س ن
فریدی، مغیث الدین: انتخاب قصائد اردو سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۰ء
فضل دین، ملک، مرتب: خزینۂ نعت حصہ اول مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۱۳
فغانی شیرازی: دیوان (فارسی) مرتبہ: سہیل خوانساری، چاپخانہ گودرزی، تہران ۱۳۱۶ ہجری شمسی
فقیر، حافظ افضل: جان جہاں (نعتیہ کلام)، مکتبہ کارواں، انارکلی لاہور،

فلک، لالہ چند : پیامِ فلک (کلام) ، وباس پت کمالیہ ، لاہور ، ۱۹۲۰ء
کلامِ فلک ، لاہور ، ۱۹۱۲ء
فنا، عبدالباقی : گلستانِ خواجہ (معین الدین چشتی) کلام ، افضل المطابع ، دہلی ، ۱۸۹۵ء
فوق، محمد دین : مشاہیرِ کشمیر (تذکرہ) ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۱۱ء
نغمہ و گلزار (کلام) ، ظفر برادرز تاجران کتب ، لاہور ، ۱۹۲۱ء
فیاض الدین، بندہ : قصائد ، آفتاب دکن چشتیہ پریس حیدرآباد دکن —
فیروز الدین، مولوی : یادگارِ دربار ، صدائے ہند پریس ، لاہور ، ۱۹۰۳ء
فیضی فیاضی : کلیات ، مخطوطہ ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱ / عب ۲۴۷
قادری، حامد حسن : تاریخ و تنقید ادبیاتِ اردو ، قادری اکادمی ، کراچی ، ۱۹۶۶ء
قاسم، قدرت اللہ : مجموعۂ نغز ، مرتبہ : حافظ محمود شیرانی ، مطبوعہ ، لاہور ، ۱۹۳۳ء
قاضی شیخ محمد : مخزن القصائد ، مطبع کریمی ، بمبئی ، ۱۳۲۰ھ
قتیل، حفیظ قتیل، ڈاکٹر : راہ رو اور کارواں ، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن ، ۱۹۵۵ء
قدرت، قمر الدین : آئینۂ اسلام (کلام) ، دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ، ۱۳۴۴ھ
قدسی، حاجی جان محمد : کلیات قدسی مخطوطہ ف ۱۵۶۷ ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ف ۱۵۶۷
قطب، حکیم میر قطب الدین : نغمۂ عندلیب معروف بہ گلستانِ خزاں ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۷۵ء
قمر، پنڈی داس : مبارکباد یعنی چشمۂ آبِ بقا (بر ولادت یوم گورو نانک) لکشمی آرٹ اسٹیم پریس ، راولپنڈی ، ۱۹۲۳ء
قیس، امراء القیس : دیوان (عربی) ، دار المعارف قاہرہ ، ۱۹۵۸ء
قیصر، امجد علی خاں : یادگارِ قیصر (مرتبہ) ، دبدبۂ احمدی پریس ، لکھنؤ ، طبع دوم ، ۱۳۲۲ھ
کافی کفایت اللہ : دیوانِ کافی ،
کرنل ایبٹ : تواریخ نادر العصر (ترجمہ) ، مطبع نولکشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۳ء
کریم الدین احمد : امیر مینائی اور ان کے تلامذہ ، آئینۂ ادب ، لاہور ، ۱۹۸۲ء
کاظمی، عبدالرزاق، گوہر مخزون، آگرہ ۱۳۲۷ھ
کلیم، ابوطالب : دیوان (فارسی) مرتبہ پرتو بیضائی ، تہران ، ۱۳۳۰ ہجری شمسی
کلیم، مولوی عبدالصمد : قصیدہ بہارِ چشت (در مدح معین الدین حسن سنجری) مطبع خاص رضوی دہلی ۱۳۰۵ھ
کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی : کلیات (فارسی) ، مطبوعہ بمبئی ، ۱۳۰۷ھ
کمال خاں عمر : نواب مظفر خاں اور اس کا عہد ، فاروق کتب خانہ ملتان ،
کول بخش پرشاد : ادبی اور قومی تذکرے ، انجمن ترقی اردو ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۵ء
کیفی دہلوی : تحفۂ دربار تاجپوشی (یعنی تزکِ قیصری) ، مطبوعہ جالندھر ، ۱۹۱۱ء
کیفی، برجموہن دتاتریہ : کیفیہ ، مکتبہ معین الادب ، لاہور ، ۱۹۵۰ء
کیفی چریاکوٹی، جواہر سخن، مختلف جلدیں، الہ آباد ۱۹۳۲ء ۱۹۴۲ء
کیفی، محمد سردار خاں : نجم الضیا جدید (کلام) ، مطبع مجتبائی ، دہلی ، ۱۳۱۲ھ
گوہر جعفری : گوہر ریزے (کلام) ، ادارہ تحقیقات حیدری سیالکوٹ ، ۱۹۶۵ء
گوہر، غلام صمدانی : تزکِ محبوبیہ (جلد دوم) ، نظام المطابع پریس حیدرآباد دکن ، ۱۳۲۱ھ
گوہر نوشاہی : لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی ، ۱۹۸۳ء
لطف، لطف علی خاں بریلوی : دیوانِ لطف ، مطبع چشمۂ فیض ، دہلی ، ۱۲۹۸ھ
لطف، لطف علی خاں لطافت جنگ : دیوان ، مطبوعہ حیدرآباد دکن ، ۱۹۲۱ء
ماجد قریشی : دبستانِ بہاولپور ، ادارہ مطبوعات آفتابِ مشرق ، بہاولپور ، ۱۹۶۹ء
مالک رام : تلامذۂ غالب ، مرکز تصنیف و تالیف نکودر ، ۱۹۵۷ء

مائل، احمد حسین : دیوان (تحفۂ دکن) ، مطبع مفید عام آگرہ ، ۱۸۹۷ء
مائل، محمد یونس : شناسی و تلاقی طغیانی رود موسیٰ ، انتیکا پریس ، حیدرآباد دکن ، ۱۹۱۲ء
متین، امیر الدین : کلامِ متین ، مطبوعہ سلسبار ل ندر آک اس ل
محب، برج بھوکن لال : تاریخ دریاباد ، نامی پریس ، لکھنؤ ، ۱۹۲۵ء
رنگِ زمانہ (مجموعۂ کلام) ، دریاباد ، ۱۹۲۷ء
محب، محب حسین : دیوانِ محب ، مطبع شمسی ، حیدرآباد دکن ، ۱۹۰۳ء
محجوب : گلشنِ نعت ، مطبع ملشی محزالدین ، لاہور ، ۱۲۹۷ھ
محمد اکرام عالم : حقیقت رامپور ، نظامی پریس ، بدایوں ، ۱۹۲۰ء

محمد حسن بجنوری : ضیائے اختر ، مطبع نولکشور ، لکھنؤ ، ۱۸۷۸ء
محمد حسین خاں : تذکرہ ریاض الفردوس ترتیب و حواشی: مرتضیٰ حسین فاضل ، مبارک علی لاہور ، ۱۹۶۸ء
محمد حسین خاں ، پیرزادہ : (مترجم) قصیدہ بردہ و بانت سعاد ، افضل المطابع دہلی ، ۱۳۲۵ھ
محمد حنیف صدیقی : الارمغان (مرتبہ) ، سنٹرل جیل پریس اورنگ آباد ، ۱۳۲۳ھ
محمد رسول بعباق : گل بہار (قصیدہ) ، حمیدیہ اسٹیم پریس لاہور ، ۱۹۱۲ء
محمد سعید عبد الخالق : میسور میں اردو ، مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ، دخیبور ۱۹۲۵ء
محمد سعید نقش بندی : آہنگ غم (کلام) ، مطبع دارالعلوم دہلی ، ۱۹۵۲ء
محمد شفیع الخطیب اوکاڑوی : نغمہ حبیب (کلام) ، نورانی کتب خانہ ، کراچی ، ۱۹۶۲ء
محمد صدر الحق ، ڈاکٹر : ناسخ ۔ حیات و تصانیف ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۷۷/۱۹۶۹ء
محمد عبد الحی ، شیخ : قصیدہ رائیہ ، مطبع المعزی ، اکبرآباد ،
محمد غوث شاہ : مراد العاشقین (کلام) ، اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور ، س ن
محمد مظفر حسین : ارژنگ ادب حصہ اول ، ضیا پبلشنگ ہاؤس ، لکھنؤ س ن
محمود اسرائیلی : خیابان ، مکتبہ محمدی بمبئی ، ۱۹۳۷ء
محمود ، بشیر الدین محمود : کلام محمود دو حصہ مکمل ، ربوہ ، مالحد ۱۹۶۸ء
محمود بنگلوری : فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان ، گوشہ ادب لاہور ، ۱۹۵۹ء
محمود خاور : اثر لکھنوی ، حیات اور کارنامے ، شاہ ابہار پبلی کیشنز حیدرآباد ، —
محمود شاہ محمود : قصائد محمود ، فیض الکریم پریس حیدرآباد ، ۱۳۱۲ھ
محمود شیرانی ، حافظ : پنجاب میں اردو ، مکتبہ معین الادب لاہور طبع چہارم
محمود عباسی : (مرتب) قصیدۃ الخطبۃ الصداقۃ از علامہ تمنا عمادی ، مکتبہ محمود ، کراچی —
محمود رتنگی ، محمود علی محمود : نالہ دل (مجموعہ قصائد) ، پریانہ پریس ، رہتک س ن
محمود فاروقی : میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا ، پنجاب اینڈ فرنٹیئر مکلڈ بو راولپنڈی ،
مداح : قصائد پر فوائد در مدح سید احمد ، فردوس پریس بنگلور ، س ن ،
مردان علی خاں ، نواب : مہر نبوت ، مطبوعہ نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۲۸۸ھ
مرزا غلام احمد : درثمین ، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ، زرین آرٹ پریس ، لاہور ، ۱۹۶۲ء
مست ، ذوالفقار علی : تذکرہ ریاض الوفاق مرتبہ ، سید حسن ، عطا کاکوی ، دائرہ ادب پٹنہ ، ۱۹۶۷ء
مسعود حسین : دو نیم (کلام) ، آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۱۹۵۶ء
مسعود حسین خاں : قدیم اردو ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۵ء
مشیر ، مشیر حسین قدوائی : دیوان ، مطبع جامعہ علیہ ، علی گڑھ ، ۱۹۲۲
مصلح ، مولوی ابو محمد : تاریخ سہسرام ، عالم گنج ضلع آرہ سہسرام ۱۹۲۰ء

مضطر ، ناصر علی خاں : سر مسلم (دیوان) ، مسلم پریس ، جھجھر ، ۱۳۰۹ھ
منظر ، منظر حسن : دیوان منظر ، مطبع رحمانی ، انبالہ ، س ن
معزی ، امیر معزی : دیوان مرتبہ عباس اقبال (فارسی) ، تہران ، ۱۳۱۸ ہجری شمسی
محلی ، ظفر الدین صدیقی : ریاض محلی (کلام) مرتبہ : محمد ریاض الدین ریاض ، عماد پریس حیدرآباد دکن س ن
محسن ، خواجہ عبد الباری : سلور جوبلی مشاعرہ ، انجمن فخریہ چشتیہ خواجہ اجمیر ، راجپوتانہ ۱۹۳۵ء
محی الدین احمد ندوی : ادبی نقوش ، سرفراز قومی پریس ، لکھنؤ ، ۱۹۶۰ء
مکمل ، رکن الدین : دیوان مکمل ، مرزا پریس ، سیالکوٹ ۱۸۸۵ء
ملا ، آنند نرائن : یاد چکبست ، انڈین پریس ، الہ آباد ، س ن
ممتاز علی بھوپالی : آثار الشعرا ، مطبع شاہجہانی ، بھوپال ، ۱۳۰۴ھ
متنبی ، مسینا بیگ : کارستان فصاحت (کلام) ، مطبع یوسفی ، دہلی ، ۱۳۱۱ھ
ملچھو بیگم ، لکھنوی : شمع خاموش (کلام) ، عصمت بک ڈپو دہلی ، س ن
منوچہری دامغانی : قصائد و مسمطات منوچہری (فارسی) ، مطبوعہ مشہد ۱۲۸۵ رجب
موتمن ، زین العابدین : شعر و ادب فارسی ، (فارسی) تہران ، ۱۳۳۲ ہجری شمسی
موسوی ، ضیاء الحسن : مجموعہ مضامین و تخلیقات ، نفیس اکیڈمی کراچی
مومن خاں مومن : قصائد مرتبہ ظہیر احمد صدیقی ، ادارہ فروغ اردو ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء

مونس رام، برہمن : دیوان مونس ، گیان پریس ، دہلی ، ۱۸۸۱ء

مولانا جامی : دیوان کامل جامی (مرتبہ ہاشمی رضی) تہران ، ہجری شمسی ۱۳۴۱

مہر آغا علی : دیوان ، لکھنؤ ، ۱۲۶۳ ھ

مہجور عنایت حسین : مدائح الشعرا ، مرتبہ مشفق خواجہ ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، کراچی ،

میراں شاہ جالندھری : مجموعہ ریل نامہ (کلام) ، نرنکاری پریس ، لدھیانہ ، س ن ،

میکش ، سجاد علی شاہ : یادگار امیر مینائی ، مطبع رحمانی ، دہلی ، ۱۹۰۳ ،

نادر ، درگا پرشاد : تذکرۃ النسائے نادری (مرات خیال) (گلشن ناز) (چمن انداز) مطبع خوف کاشی ، دہلی ۱۸۷۶ ،

نادر علی : عقد ثریا (موسوم بہ گلدستہ جشن سالگرہ) ، مفید دکن پریس ، دکن ، ۱۳۳۲ ھ

نادر ، کلب حسین : نظم نادر ، مطبع دلکشا ، رامپور ، ۱۸۶۲ ،

ناطق ، حکیم ناطق لکھنوی : دیوان ناطق ، تعمیر ادب ، جائس ، ۱۹۵۷ ،

ناظم سیوہاروی ، ظہور الحسن : اردو زبان اور ہندو ، کتاب منزل ، لاہور ، س ن ،

نامی ، آغا حسن : احسن التواریخ ، مطبع جنگ بہادر ، بلرام پور ، ۱۹۳۳ ،

نامی ، شاہ محمد : کلام نامی (حصہ اول) ، حمیدیہ بک ایجنسی ، سوہدرہ ، گوجرانوالہ ، ۱۹۲۱ ،

نامی ، محمد غازی الدین خاں : سوغات نامی (جلال آصفی) ، قومی پریس ، حیدر آباد دکن ، ۱۳۱۶ء

ناوک ، محمد ناوک لکھنوی : زاد آخرت (کلام) ، نظامی پریس ، لکھنؤ ، ۱۹۶۸ ،

نبی بخش بلوچ : سندھ میں اردو شاعری ، مطبوعہ ، مہران آرٹس کونسل ، حیدر آباد ،

نجم الغنی ، محمد : اخبار الصنادید (رامپور کی تاریخ) (دو جلدیں) ، مطبوعہ نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۹۱۸ ،

تاریخ راجگان ہند ، برقی پریس ، لکھنؤ ،

ندوی ، عبد السلام : مقالات عبد السلام ، مطبع معارف ، اعظم گڑھ ، ۱۹۶۸ ،

نسیم ، اصغر علی : کلیات ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۶ ،

نسیم امروہوی : تاریخ خیرپور ، شعبہ تاریخ کراچی یونیورسٹی کراچی ۱۹۵۵ ،

نسیم ، عنایت اللہ سوہدروی : ظفر علی خاں اور ان کا عہد ، اسلامک پبلشنگ ہاؤس ، لاہور ، ۱۹۸۱ ،

نصیر خاں : انتخاب کلیات قصائد ، آگرہ ، ۱۸۶۰ ،

نصیر ، محمد نصیر الدین علوی : یادگار نصیر (انتخاب کلام) مرتبہ ظہیر الدین احمد علوی ، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ ۱۹۶۲ ،

نظامی ، نظام الدین نظامی بدایونی : لمحات نظامی (مجموعہ کلام) نظامی پریس ، بدایوں ، ۱۹۵۵ ،

نظم طباطبائی : دیوان نظم ، مطبع اعظم جاہی ، حیدر آباد ،

نظیر حسنین زیدی : مولانا ظفر علی خاں بحیثیت شاعر ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، کراچی ، ۱۹۶۹ ،

نعمان تاثیر و مظہر صدیقی : شورستان (تذکرہ شعرائے پاکستان) ۱۹۵۲ ،

نعیم ، محمد نعیم الدین شاہ : ریاض نعیم مع نزہت الناظرین ، مرتبہ اختصاص الدین نعیمی ، ناشر معین الدین نعیمی ، س ن ،

نواب ، کلب علی خاں بہادر : منشیہ خسروانی ، تاج المطابع ، رامپور ، ۱۲۹۳ ھ

نورانی : گوہر ایمانی (مرتبہ نورانی) (حصہ اول) راجپوت پریس ، لاہور ، ۱۹۱۳ء

نہال رضوی : جہان مودت ، سرفراز پریس ، لکھنؤ ، ۱۹۷۱ ،

نیاز فتح پوری : انتقادیات (حصہ اول) ادارہ ادب عالیہ ، کراچی ، ۱۹۵۹ ،

نیر سلطان پوری : انوار عرفان ، اسرار کریمی پریس ، الہ آباد ۱۹۷۵ ،

نیرنگ ، غلام بھیک : کلام نیرنگ ، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل ، مکتبہ اسلوب ، کراچی ، ۱۹۸۳ ،

واسطی ، فضل رسول خاں : دیوان واسطی ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۲۹۱ ھ

واصف ، حکیم مرزا محمد : سرمایہ نجات ، سرفراز پریس ، لکھنؤ ، ۱۹۶۹ ،

وحشت ، رضا علی بہادر : نقوش و آثار (ضمیمہ ترانۂ وحشت) قرآن منزل ، ڈھاکہ ، ۱۹۵۵ ،

وحید قریشی (ڈاکٹر) : کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ، مکتبہ ادب جدید ، لاہور ، ۱۹۶۵ ،

میر حسن اور ان کا زمانہ ، مطبوعہ ، لاہور ، ۱۹۵۷ ،

وزیر حسن : دہلی کا آخری دیدار ، دہلی ، ۱۹۳۵ ،

وصیف ، محمد بن وصیف : تاریخ سیستان (فارسی) ، تہران ، ۱۳۱۴ ہجری شمسی

وفا راشدی : بنگال میں اردو ، مکتبہ اشاعت اردو ، حیدر آباد سندھ ۱۹۵۵ ،

ولا ، عزیز جنگ بہادر : تاریخ النوائط ، عزیز المطابع حیدر آباد دکن ، ۱۳۲۲ ھ

سینت سنگھ منشی : سرود ابرار (حصہ اول) ، دو دیپ پرنٹرز ، امرتسر ، س ن

ولی اللہ فرخ آبادی: عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ (ترجمہ شریف الزماں)، مطبوعہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی، ۱۹۶۶ء

ولی، منشی عبد الحمید سہارنپوری: جشن تاجپوشی (بحضور نواب فرمانروائے بہاولپور) مطبوعہ ملتان س ن

ولیم آرون: تاریخ فرخ آباد (اردو ترجمہ) مطبع حسنی، فتح گڑھ، ۱۸۸۷ء

وہبی، منشی شیو پرشاد: کلیات وہبی (مسمّٰی بہ مرقع ارژنگ) مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۹۷ھ

وہیلر اسٹیفن: دربار تاجپوشی (ترجمہ از ڈپٹی نذیر احمد) نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۳ء

ہارون الرشید: اردو ادب اور اسلام، حصہ اول حصہ نظم اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۶۸ء

ہاشمی، نصیر الدین: دکھنی قدیم اردو کے چند تحقیقی مضامین، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۳ء

مدراس میں اردو ابراہیمیہ مشین پریس، دکن، ۱۹۳۸ء

مقالات ہاشمی، جلد اول تاج کمپنی، لاہور، س ن

ہاشمی نور الحسن: ادب کا مقصد سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۵۶ء

ہدایت، رضا قلی: ریاض العارفین (فارسی) تہران، ۱۳۱۶ تیرماه

ہرچند، ہرچند رائے: مظہر محبت، (کلام) مطبع دار العلوم قیصر گڑھ، ۱۸۷۷ء

ہمدم، مصطفٰے حسین: جام ولا (کلام) مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۷ء

ہندی، بھگوان داس: سفینہ ہندی، مرتبہ: عطا کاکوی، پٹنہ، ۱۹۵۸

یاس، محمد عاشق: غنچہ نعت، آریہ مشین پریس، جالندھر، ۱۹۱۳ء

یحییٰ اعظمی: نوائے حیات (کلام) حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۴۹ء

یزدانی، بیان سید وتھ حسین: قندیل حرم (کلام) مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۰ء

یکتا، احد علی: دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی عرشی، رامپور، ۱۹۴۳ء
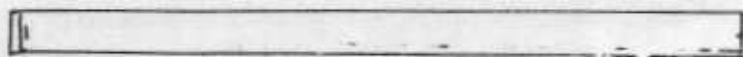
— بزم مشاعرہ اورنگ آباد کالج اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

— فہرست کتب خانہ محبوب علی حیدر آباد دکن ۱۳۲۸ھ

— فہرست کتب موجودہ کتب خانہ اہل اسلام مدراس ۱۹۱۶ء

— مخطوطات کتبخانہ گیلانی اوچ اردو اکیڈمی بہاولپور

مجموعہ — بیجل رسالہ مفید عام لاہور

— تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند تمام جلدیں پنجاب یونیورسٹی لاہور

— اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی مطبوعہ تمام جلدیں، ایضاً

فہرست مضامین

آرزو لکھنوی،	حیاتِ جلال،	ہندوستانی، جنوری ۱۹۳۲ء
آسی، عبدالباری،	دو نایاب زمانہ بیاضیں اور ان کا انتخاب،	۱۹۴۲ء
آفتاب اختر،	غالب کے اردو قصیدے،	نیا دور، لکھنؤ، جون ۱۹۵۶ء
ابراہیم خلیل،	اردو کا ایک گمنام شاعر، اثر مارہروی،	قومی زبان، کراچی فروری ۱۹۷۳ء
ابواللیث صدیقی،	اردو قصیدہ اور مثنوی کی تنقید پر ایک نظر،	نگار، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء
	لٹن لائبریری کے بعض نادر اردو مخطوطات،	مصنف، اگست ۱۹۴۳ء
اثر، محمد علی خاں رامپوری،	اخگر رامپوری،	معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۵۶ء
	سرخوش رامپوری،	قومی زبان یکم جنوری ۱۹۵۹
	علی بخش بیمار اور ان کا کلام،	اردو ادب، علی گڑھ جولائی ستمبر ۱۹۵۲ء
	کرم خاں رامپوری اور ان کا کلام،	معارف جولائی اگست ۱۹۵۱، اپریل ۱۹۵۳ء
	قائم چاندپوری کا غیر مطبوعہ کلام،	معارف، مئی جون ۱۹۵۲ء
	ملک الشعرا غواصی اور اس کا غیر مطبوعہ کلام،	سب رس، حیدرآباد دکن نومبر دسمبر ۱۹۸۱ء
احسن، مارہروی	عیش مارہروی،	اردوئے معلی علی گڑھ، اپریل ۱۹۱۳ء
احمد اللہ قادری،	شیخ ولی اللہ محب،	زمانہ، جولائی ۱۹۲۹ء
احمد فاروقی، خواجہ (ڈاکٹر)،	عہد مصحفی کے ادبی رجحانات،	برہان، دہلی دسمبر ۱۹۵۴ء
احمر رفاعی،	ذوق کی قصیدہ نگاری،	قومی زبان، جنوری ۱۹۶۷ء
اختر، بشیر محمود،	قصیدہ ایک داستانِ پارینہ،	قندیل لاہور ۲۵ دسمبر ۱۹۶۰ء
اختر، قاضی احمد میاں جوناگڑھی،	میر فخرالدین حسین خاں سخن دہلوی،	اردو، کراچی جولائی ۱۹۶۵ء
اختر، مظہر حسین بریلوی،	میاں ہدہد کا قصیدہ،	زمانہ، اپریل ۱۹۳۳ء
ادیب، لطیف حسین،	قصیدہ خزینۃ البرکات،	قومی زبان، نومبر ۱۹۶۶ء
	میر غلام علی عشرت بریلوی،	قومی زبان، مئی ۱۹۶۵ء
	نیاز احمد ہوش اور ان کا کلام،	قومی زبان، ۱۹۶۵ء
ادیب، محمد حسین،	اردو شاعری پر درباری تعلقات کا اثر،	ہمایوں، اکتوبر ۱۹۳۰ء
ارشاد، سید نقی احمد،	نواب اشرف علی خاں،	صحیفہ لاہور جولائی ۱۹۶۶ء
اسمعیل حسن خاں، ملک،	غالب کے اردو قصائد،	حریر خامہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء (قصیدہ نمبر)
	منقبر محمد گویا،	اردو نامہ کراچی اپریل تا جون ۱۹۶۵ء
اشہر، منظور علی سید،	حدیقۂ عثمانی،	لسان الملک، دکن، اگست ستمبر ۱۹۴۳، جنوری، فروری، مئی جون ۱۹۴۴
اشرف، نجیب ندوی،	اردو زبان کی ترقی میں صوبہ بہار کا حصہ،	اردو، جلد ۱۹۲۳ء
اظہر حسین زیدی،	فورٹ ولیم کالج کی ایک عظیم شخصیت،	نوائے ادب، بمبئی اکتوبر ۱۹۶۵ء

اعظمی کانپوری،	عزیز لکھنوی،	زمانہ، جنوری ۱۹۲۶ء
امیر صدیقی، امروہوی،	تاریخ مسعود (ایک تنقید)	قومی زبان، جنوری ۱۹۶۱ کے بعد،
	سندھ کے اردو شاعر،	اردو، جولائی ۱۹۳۷ء
	نقش و نگار ضمیر در آئینہ کمالات دبیر،	اردو شمارہ نمبر ۳ ۱۹۷۵ء
افضل حسین،	حضور نظام دکن،	دکن ریویو، مارچ ۱۹۰۴ء
اکبر حیدر کاشمیری،	ڈاکٹر اشپرنگر اور اودھ کیٹلاگ،	صحیفہ، ۱۹۶۸ء
اکرام چغتائی،	دیوان ولی کے قلمی نسخے،	اردو، جولائی ۱۹۶۶ء
امتیاز احمد سعید،	حکیم مومن خاں مومن کی شاعری،	نگار، مومن نمبر،
	قصیدہ اور مومن،	حریر خامہ قصیدہ نمبر ۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء
امداد صابری،	تلامذۂ ذوق،	شاہراہ، دہلی مئی جون ۱۹۵۹ء
امین فاروق،	قصیدہ اور غزل کا تعلق،	حریر خامہ قصیدہ نمبر
انور علی سید،	سودا، ذوق اور انشا کے قصائد کا موازنہ،	ایضاً
انوار احمد یوسف زئی،	قصیدہ ماضی کی راکھ میں دبی چنگاری،	ایضاً
بابر حسین آغا،	کتب خانہ ارسطو جاہ کی بعض نادر کتابیں،	ہمایوں، جولائی ۱۹۲۸ء
بادشاہ حسین،	پٹنہ لائبریری،	ادبی دنیا، فروری اپریل ۱۹۳۴ء
باقر، آغا محمد،	ایک تاریخی تاریخ گو "محمد محسن متین"	ادبی دنیا دور پنجم، شمارہ ششم
بدر، عبدالوہاب بستوی،	وشوا بھارتی یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات،	برہان، مئی ۱۹۸۱ء
برکاتی، محمد احمد،	کتب خانہ وزیر الدولہ ٹونک کے چند نوادر،	بصائر، کراچی جولائی ۱۹۶۲ء
بسم اللہ بیگ، کرنل،	منشی امیر اللہ تسلیم،	نوائے ادب، جنوری ۱۹۵۲ء
بشیر احمد، برہانپوری،	سراج اورنگ آبادی،	معارف، مارچ مئی ۱۹۲۹ء
بشیر بدر،	غالب کی اردو قصیدہ نگاری،	اردو ادب علی گڑھ غالب نمبر ۱۹۶۹ء
بشیر، مخفی نادری،	کراچی کے قدیم اردو نعت گو شعرا،	قومی زبان، یکم فروری ۱۹۵۰ء
بقا، خواجہ مرتضیٰ لکھنوی،	مستند الشعرا،	اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۸ء
بیتاب، سید علی عظیم آبادی،	محمد سعید حیرت،	اردوئے معلی علی گڑھ ستمبر ۱۹۰۶ء
تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،	دیوان قصائد مصحفی،	صحیفہ، جنوری ۱۹۷۰ء
	مصحفی اور سودا کا معرکہ	نقوش ادبی معرکہ، جلد دوم،
تحسین سروری،	دیوان گلدستۃ الشعرا،	قومی زبان، اکتوبر ۱۹۷۰ء
تسکین عابدی،	ملک الشعرا حفیظ دہلوی،	ادبی دنیا، سالنامہ ۱۹۴۱ء
تصدق حسین،	دربار واجدی کے نامور شاعر،	نیا دور لکھنؤ اگست ۱۹۵۹ء
تمکین کاظمی،	بالک جی نایک ذرہ (ایک گمنام حیدرآبادی شاعر)،	معارف، جولائی تا دسمبر ۱۹۳۱ء

تمکین کاظمی،	صاحب اورنگ آبادی،	معارف، اکتوبر ۱۹۲۹ء
	ہندوستان کا ایک گمنام شاعر قلق	نگار لکھنؤ، مئی ۱۹۵۳ء
ثمینہ شوکت، ڈاکٹر،	جنگ آزادی کا اولین مجاہد،	نوائے ادب، اکتوبر ۱۹۶۰ء
جام نوائی،	ظہور اللہ نوا،	قومی زبان، اکتوبر ۱۹۶۳ء
جعفر، رضا زیدی،	ذخیرہ بادی بلگرامی کے چند مخطوطات،	معارف، فروری ۱۹۶۵ء
جلیل آغا،	قصیدے کا نفسیاتی تجزیہ،	صریر خامہ قصیدہ نمبر
جلیلی، علی احمد،	جلیل مانکپوری،	صبا حیدرآباد دکن، اپریل ۱۹۶۱ء
جوش ملسیانی،	داغ کے نامور شاگرد،	آجکل دہلی، ستمبر ۱۹۶۹ء
چغتائی، محمد عبداللہ،	مخطوطات عجائب خانہ بیجاپور کی مختصر فہرست،	برہان، ستمبر ۱۹۶۱ء
چیزن گوڑ بچن،	منشی دوارکا پرشاد افق،	اردو ادب علی گڑھ نمبر ۱ ۱۹۶۵ء
حامد اللہ،	بادشاہ مدراسی،	نوائے ادب، جولائی ۱۹۶۰ء
حامد علی خاں،	نظام شاہ نظام،	مخزن، اکتوبر ۱۹۱۰ء
حامی، لبھن نرائن،	منیر شکوہ آبادی	زمانہ مارچ ۱۹۲۹ء
حبیب اللہ رشدی،	اردو قصائد،	مجلہ عثمانیہ جلد اول شمارہ اول، ۱۳۳۶ء
حبیب کیفوی،	جموں اور کشمیر میں اردو کی ترویج و ترقی،	قومی زبان ۱۶ جولائی و یکم اگست ۱۹۵۷ء
حسرت موہانی،	آباد عظیم آبادی	اردوئے معلی کانپور جنوری ۱۹۲۱ء
	انور دہلوی،	اردوئے معلی، مارچ ۱۹۱۰ء
	تسلیم لکھنوی — [حبیب کنتوری، اردوئے معلی، مارچ ۱۹۰۸]	اردوئے معلی اگست ۱۹۱۱
	حکیم غلام مولی قلق	اردوئے معلی، جنوری ۱۹۱۱ء
	شاگردان تسلیم،	اردوئے معلی، اکتوبر ۱۹۱۱ء
	شاگردان سودا،	اردوئے معلی مارچ ۱۹۱۱ء
	شعلہ بنواری،	اردوئے معلی علی گڑھ ستمبر ۱۹۱۲ء
	شگفتہ خیراتی لال	اردوئے معلی علی گڑھ ۱۹۰۲ء
	طالب علی خاں عیشی	مخزن لاہور، جنوری ۱۹۰۷ء
	ظہور اللہ نوا،	اردوئے معلی، اپریل ۱۹۱۰ء
	ظہیر دہلوی،	اردوئے معلی، جون ۱۹۱۱ء
	عیش گیاوی	اردوئے معلی، دسمبر ۱۹۱۱ء
	غلام علی راسخ	اردوئے معلی مئی ۱۹۱۷ء
	گستاخ رامپوری،	اردوئے معلی اپریل ۱۹۲۵ء

حسرت موہانی، مذاق بدایونی، اردوئے معلیٰ مارچ ۱۹۱۰ء

مرزا علی لطف، اردوئے معلیٰ اگست ۱۹۱۰ء

مرزا محبوب بیگ، عاشق لکھنوی، اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۱۰ء

وقار امپوری، اردوئے معلیٰ مارچ ۱۹۲۵ء

حسن رضا، مولوی سید، شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی، معارف مئی ۱۹۲۹ء

حفیظ، حفیظ الرحمن مولوی، تاریخ شعرائے بہاولپور، العزیز بہاولپور، دسمبر ۱۹۴۲ء

حمید احمد خاں، غالب کا قصیدہ شمس الامرا، ہمایوں، مارچ ۱۹۲۹ء

حمیدہ سلطانہ بیگم، نواب زین العابدین خاں عارف کے شاگرد، ادیب دہلی فروری ۱۹۶۱ء

حنیف نقوی، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی، نگار پاکستان مارچ ۱۹۶۷ء

خالدہ یوسف، اورنگ آباد کے شعرا اور ادیب، سب رس حیدرآباد اپریل ۱۹۶۷ء

خلیق انجم، سودا کی قصیدہ نگاری، نوائے ادب، اپریل ۱۹۶۷ء

مرزا اشرف علی فغاں، صحیفہ، جنوری ۱۹۶۷ء

خلیل الرحمن اعظمی، تذکرہ شعرائے علی گڑھ، ستمبر دسمبر ۱۹۶۰ء

خلیل، افتخار احمد برہانپوری، تذکرہ شعرائے برہانپور، رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۳۱ء

خیال، فیض الحسن، چندولال شاداں، علاقہ حیدرآباد دکن نومبر ۱۹۴۲ء

دانش، صفی حیدر، عزیز لکھنوی کی قصیدہ نگاری، شاعر آگرہ، دسمبر ۱۹۶۲ء

دردائی، معین الدین، اردو قصیدہ نگاری کا سرسری جائزہ، ہمایوں، اپریل ۱۹۴۰ء

علامہ اقبال کے ایک ہم عصر عظیم آبادی شاعر، علامہ فضل حق آزاد، قومی زبان نومبر ۱۹۶۷ء

میران تالپور کے عہد میں اردو شعر و ادب کی ترقی، اردو نامہ، اپریل ۱۹۶۷ء

دیبی پرشاد، مغل بادشاہوں کی تخت نشینی کی رسمیں، زمانہ، دسمبر ۱۹۱۱ء

ذاکر ٹونکی، سندھ کے بعض قدیم اردو شاعر، اردو نامہ دسمبر ۱۹۶۵ء

راحت محمود، دربار رامپور اور امیر مینائی، صحیفہ اپریل ۱۹۶۱ء

راز یزدانی، میر احمد علی رسا رامپوری، معارف، ستمبر ۱۹۵۸ء

راشد، ن م، اردو شاعری پر معاشرتی اثرات (ترجمہ)، نصرت لاہور، ۱۹۶۲ء

راشدی، حبیب اللہ، اردو قصائد، مجلہ عثمانیہ جلد اول شمارہ اول،

رخشاں ابدالی، رشحات صوفی منیری، اردو، جنوری ۱۹۵۲ء

کلام مشرقی منیری، قومی زبان، جون ۱۹۵۳ء

رشید احمد صدیقی، علی گڑھ کے مخطوطے، آجکل دہلی، جون ۱۹۵۳ء

رضوی، سید مسعود حسن، اردو زبان کے لغت، ہندوستانی جنوری ۱۹۳۱ء

ریاست علی ندوی، اردو قصیدہ پر ایک نظر، قندیل، لاہور، ۱۷ مارچ ۱۹۶۳ء

زور، محی الدین قادری، بہمنی ادب، نوائے ادب، اکتوبر، ۱۹۵۰ء

دکن کا اثر شمالی ہندوستان پر، اردو، اکتوبر، ۱۹۲۹ء

سحر، ابو محمد، ڈاکٹر، قصیدہ نگاری کا دورِ آخر اور عزیز لکھنوی، نگار، مارچ، ۱۹۵۸ء

سخاوت مرزا، اردوئے قدیم کی ایک بیاض، اردو، اکتوبر، ۱۹۵۰ء

اولیائے ویلور کی دکھنی تصنیفات، اردو، جولائی ۱۹۵۴ء

بالاجی ترمبک خرد، اردو نامہ، مئی، ۱۹۷۱ء

رائے گلاب چند ہمدم حیدرآبادی، صحیفہ لاہور، ۱۹۶۸ء

شاہ نصیر، اردو، اکتوبر، ۱۹۵۵ء

شیخ محمد شاد لکھنوی، پیرو میر کے نایاب دواوین، صحیفہ، جنوری، ۱۹۷۱ء

قدیم اردو کی دو نایاب بیاضیں، اردو، اپریل، ۱۹۵۴ء

کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا، اردو، جنوری تا اپریل، ۱۹۵۹ء

محمد زین العابدین خاں، اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۵۹ء

مستند الشعراء، خواجہ مرتضیٰ، لقا لکھنوی، اردو ادب، علی گڑھ، جون ۱۹۵۸ء

ملک الشعراء غواصی اور ان کا کلام، اردو، اکتوبر ۱۹۵۴ء

میر ذوالفقار علی، صفا، قومی زبان، کراچی ۱۹۶۸ء

میر غلام مصطفیٰ، سخن، اورنگ آبادی، اردو نامہ، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۸ء

سرور، اکبر آبادی، عارف سنبھلی، انجمن، کراچی، اپریل ۱۹۷۷ء

سروری، عبدالقادر، اردو کے ہندو شعرا، علی گڑھ میگزین مارچ ۱۹۲۱ء

باقر آگاہ، حیات، تصنیفات اور دیوان، اردو، اپریل ۱۹۲۹ء

شاہ تجلی اور ان کا کلام، ہندوستانی، ۱۹۳۶ء

شاہ سراج کی اردو شاعری، ہندوستانی، جولائی ۱۹۳۹ء

سعید انصاری، ابوظفر، امراؤ مرزا، انور دہلوی، نوائے ادب جنوری ۱۹۶۶ء

سعیدی، ابو المنعم، قائم چاندپوری، نگار ستمبر ۱۹۲۸ء

سفیر کاکوروی، حضرت نادر مرحوم، زمانہ، اکتوبر ۱۹۱۲ء

سکسینہ، جگدیش سہائے، سرور جہاں آبادی، زمانہ، ستمبر ۱۹۳۶ء

سلام سندیلوی، سودا اور ذوق بحیثیت قصیدہ نگار، نگار، نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء

سلیم جعفر، دیوان جانی بہاری لال، زمانہ، دسمبر ۱۹۳۷ء

سلیمان ندوی، انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ، معارف، جون ۱۹۲۰ء

سید عالم، سخن دہلوی، قومی زبان، اکتوبر ۱۹۷۵ء

سیماب، اکبرآبادی، انعام اللہ خاں یقین، ادیب دہلی، فروری ۱۹۲۲ء

شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بنگال کی اردو تصانیف، قومی زبان، مارچ ۱۹۶۲ء

شرق بن شائق، قصیدہ ناقابل فراموش نقش، قندیل، ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۰ء

شروانی، مولانا حبیب الرحمن، شاہی کتاب خانوں کی کتابیں، کتابخانہ حبیب گنج میں، معارف، اگست ۱۹۳۷ء

کلیات میر حسن، ہندوستانی، اکتوبر ۱۹۳۱ء

میرے کتب خانے کے پرانے چھپے اردو دیوان، ہندوستانی، جنوری ۱۹۳۹ء

شمس اللہ قادری، دکن کی علمی ترقیاں، تاریخ، حیدرآباد، اپریل تا جون ۱۹۲۹ء

شمیم زاہدی، بہار کے شعرائے اردو، ساقی، کراچی ۱۹۴۳ء

شوق قدوائی، مظہر جلیل، تاریخ مبتلا گاہی (ذکر حامد حسن قادری) اردو نامہ، جنوری تا مارچ ۱۹۶۵ء

شوکت، احمد حسن، حکیم مومن خاں مومن، مخزن، یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء

شوکت، سبزواری، شعرائے رامپور کا ایک قلمی تذکرہ، معارف، جنوری ۱۹۴۶ء

شہابی، انتظام اللہ، شعرائے گوپامئو، قومی زبان، مارچ ۱۹۶۲ء

شہرت، میر نثار علی، ضامن علی ضامن، مخزن، ۴ جنوری ۱۹۱۶ء

صدیق جائسی، پرنس معظم جاہ کے دربار کا مشاعرہ، انجمن، کراچی، فروری ۱۹۴۳ء

صہبا، ابو ظفر، صبا اکبرآبادی، نئی قدریں، حیدرآباد، شاعر نمبر

ضامن علی، قصیدے کی ابتدا، صریر خامہ، قصیدہ نمبر

ضیا، احمد بدایونی، ایوان قصیدہ کے ارکان اربعہ، نگار پاکستان، نومبر، دسمبر ۱۹۶۷ء

طاہر فاروقی (ڈاکٹر)، اردو قصیدہ، اردو نامہ، اپریل تا جون ۱۹۶۷ء و فروری ۱۹۶۸ء

ظفر حسین خاں، مہدی علی خاں ذکی، ملک الشعرا، آجکل، دہلی، نومبر ۱۹۵۲ء

ظفیر الحسن، محمد، دل عظیم آبادی اور ان کا مجموعہ کلام، مہر نیمروز، کراچی، اپریل ۱۹۷۱ء

ظہیر احسن، سید، خورشید علیم کالج کی ایک عظیم شخصیت (مظہر علی خاں ولا) نوائے ادب، اکتوبر ۱۹۶۵ء

عاشق حسین بٹالوی، چودھری خوشی محمد ناظر، چٹان، لاہور، جون ۱۹۷۱ء

عاشق ہرگانوی (ڈاکٹر)، غالب کا ایک گمنام شاگرد، ادب لطیف، غالب نمبر

عباسی، محمود احمد، اردو کا ایک سندھی شاعر، اردو، اپریل ۱۹۲۹ء

عبد الحق، مولوی، احسن اللہ بیاں، اردوئے معلی، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۵ء

عبد الحمید خاں، چند نادر الوجود مخطوطات، کتب خانہ سلطان جہاں، ادبی دنیا، اگست ۱۹۲۶ء

عبدالرحمن، صباح الدین،	تیموری شہزادوں کا علمی ذوق،	معارف اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۱ء، مئی جون ۱۹۶۲ء
	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تہوار،	معارف، نومبر دسمبر ۱۹۶۰ء
عبدالرزاق، ڈاکٹر	شاداں اور ان کی شاعری،	قومی زبان، جولائی ۱۹۷۵ء
عبدالسلام ندوی،	اشرف علی فغاں،	معارف، اپریل ۱۹۲۶ء
	قصائد میں منظر نگاری،	حریم خاور، قصیدہ نمبر
	قصیدے پر ایک نظر	ایضاً
	قصیدہ کیا ہے،	ایضاً
	قصیدے میں فخریہ پہلو،	ایضاً
عبدالقادر، سر،	جشن تاجپوشی پر رپورتاژ،	مخزن ۱۳ جنوری ۱۹۰۳ء
عبدالقوی دسنوی،	غالب کا ایک شاگرد، یار محمد خاں شوکت،	ادب لطیف، غالب نمبر،
عبداللہ، سید محمد، ڈاکٹر،	اردو کا جرمن شاعر فراسو اور اس کی تصنیفات،	اورینٹل کالج میگزین جلد ۱۹۲۶ء
	کتب خانہ شیرانی کے نوادر،	اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۲۷ء
عبدالماجد دریابادی،	مرزا غالب کا ایک فرنگی شاگرد، ہیڈرلی آزاد،	معارف جنوری ۱۹۲۲ء
عبدالمجید سندھی میمن،	میر صدر الدین کامل کی اردو شاعری،	اردو نامہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء
عبدالمجید صدیقی،	ملا نصرتی کے دکھنی قصائد،	حریم خاور قصیدہ نمبر
عبدالودود، قاضی،	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا،	نوائے ادب جنوری ۱۹۵۹ء
	دیوان امنر،	نگار رامپور مارچ ۱۹۶۳ء
	دیوان مصحفی، رضا لائبریری کا نسخہ،	شاعر بمبئی فروری ۱۹۶۱ء
	غمگین دہلوی،	برہان، اکتوبر ۱۹۶۰ء
عزیز، محمد ہادی لکھنوی،	مرزا ہادی رسوا کے قصائد	زمانہ جنوری ۱۹۳۳ء
عشرت، خواجہ عبدالرؤف، لکھنوی،	دربار رامپور،	زمانہ، جولائی ۱۹۱۳ء
	دربار نواب محسن الدولہ	زمانہ اپریل ۱۹۳۰ء
	شاہی دربار اودھ،	زمانہ دسمبر ۱۹۱۱ء
	نواب محمد تقی ہوس،	زمانہ جنوری ۱۹۲۹ء
علوی، امیر احمد،	حیات منیر (محسن کاکوروی) قسط وار	الناظر لکھنؤ فروری تا جون ۱۹۱۴ء
	سید محمد خاں رند	اردوئے معلی، نومبر ۱۹۰۶ء
علی امام رضوی،	پیارے صاحب رشید،	قومی زبان، نومبر ۱۹۷۸ء
علی سید، نواب،	بمبئی یونیورسٹی کی فہرست مخطوطات	معارف جولائی ۱۹۲۶ء
عمر حیات خاں،	غالب بحیثیت قصیدہ نگار،	الشجاع کراچی نمبر ۹ ۱۹۷۸ء

عندلیب حسن نجفی، نواب انعام اللہ خاں یقین، — اردو، فروری مارچ ۱۹۳۲ء

عیش، محمد اسمٰعیل غلام اکبر، شمشاد لکھنوی، — مخزن، مارچ ۱۹۱۶ء

غلام مصطفیٰ خاں (ڈاکٹر) امیر مینائی کے قصائد، — صریر خامہ قصیدہ نمبر ۱۹۶۷/۱۹۶۸

سودا کے قصیدے — ایضاً

(مرتب) صریر خامہ شعبہ اردو جامعہ سندھ حیدرآباد — صریر خامہ قصیدہ نمبر ۱۹۶۷/۱۹۶۸

کلیم جبلپوری، — اردو، جنوری ۱۹۲۷ء

فدا، فدا حسین لکھنوی، شیخ فدا علی عیش، — اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، مارچ ۱۹۰۵ء

فرحت اللہ بیگ، حافظ عبدالرحمن خاں احسان، — اردو اکتوبر ۱۹۲۹ء

حکیم آغا جان عیش دہلوی، — اردو، جنوری ۱۹۲۸ء

فرمان فتح پوری (ڈاکٹر) ارمغان گوکل پرشاد دو تشبیب — اردو، جلد ۵۱ شمارہ نمبر ۱-۲ ۱۹۷۵ء

فضل الحق (ڈاکٹر) دیوان شاکر ناجی، — دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کا رسالہ اردوئے معلیٰ قدیم اردو نمبر

فضل حسین، منیر شکوہ آبادی، — مخزن، ۳۱ جون ۱۹۰۳ء

فاروقی، اطہر علی، مولانا حالی بحیثیت قصیدہ نگار، — فروغ اردو، لکھنؤ، حالی نمبر، فروری ۱۹۵۹ء

فاروقی، نثار احمد، دیوان مصحفی کا نسخہ اورسیہ، — نقوش، مئی ۱۹۶۱ء

فارسی اور اردو کی چند کمیاب کتابیں کتابخانہ دانش گاہ دہلی میں، — برہان، دہلی، اگست ۱۹۶۹ء

فائق، کلب علی، بہادر شاہ ظفر اور ذوق، — صحیفہ، جولائی ۱۹۶۲ء

تاباں، — صحیفہ، اکتوبر ۱۹۶۲ء

جرأت اور اس کی شاعری، — صحیفہ، جنوری ۱۹۶۲ء

جعفر علی حسرت، — صحیفہ، جنوری ۱۹۶۷ء

حافظ اللہ داد طالب، — نیرنگ خیال، فروری ۱۹۶۱ء (امانت لکھنوی)

رامپور کا اسکول شاعری، — معارف، اکتوبر ۱۹۶۵ء

شاہ جولان، ایک تعارف، — صحیفہ، نومبر ۱۹۶۹ء

ممنون، حیات اور شاعری، — صحیفہ، جولائی ۱۹۶۴ء

میر قمر الدین منت، — تہذیب الاخلاق لاہور، اگست ۱۹۶۶ء

میر مہدی مجروح، — صحیفہ، اگست ۱۹۶۹ء

نظام رامپوری و داغ دہلوی، — صحیفہ، اکتوبر ۱۹۶۳ء

قمقام حسین جعفری، اثر لکھنوی کا ایک نعتیہ قصیدہ، — صحیفہ، اپریل ۱۹۸۱ء

شیخ فدا علی عیش، — صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء

کرار حسین، امیر خسرو اور ان کا عہد، — "[illegible]" اورینٹل کالج لاہور ۱۹۵۳ء

کشتہ، عبداللطیف قادری،	مت رام ایک ہندی رتن،	ہندوستانی، جون ۱۹۳۲ء
کلیم الدین احمد،	سودا اور ذوق کے قصائد،	حریر خامہ قصیدہ نمبر
	قصیدہ اور قصیدہ گو شعرا،	ایضاً
کلیم، محبوب الرحمن،	علامہ شبلی اور ان کی شاعری،	معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۱۸ء
لطیف الدین احمد،	اردو کی شستگی اور لفاست میں آگرے کا حصہ،	ادبی دنیا، اکتوبر ۱۹۳۷ء
ماجد قریشی،	بہاولپور میں شعری ادب،	سخنور، جنوری ۱۹۶۰ء
مائل ندرانی مرزا،	شاہان اودھ،	صبح امید لکھنؤ، مئی ۱۹۲۰ء
ماہر القادری،	علامہ تمنا عمادی پھلواری،	فاران، کراچی، فروری ۱۹۶۳ء
م، ح، سید (ڈاکٹر)	ابراہیم عادل شاہ،	الناظر، اگست ۱۹۳۵ء
م، ن، احسان الہی رانا،	خزائن مخطوطات،	اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۶۲ء
محمد اسماعیل خاں،	غالب کے اردو قصائد،	نگار، پاکستان ستمبر ۱۹۶۲ء
محمد اکبرالدین صدیقی،	میر نظام الدین ممنون کے قصائد،	حریر خامہ، قصیدہ نمبر
محمد ایوب قادری،	غالب اور روہیل کھنڈ	قومی زبان، فروری ۱۹۶۷ء
	غالب کے چند شاگرد،	ادب لطیف، غالب نمبر، جلد ۶۹ شمارہ ۱۱/۱۲
محمد خاں،	میسور میں اردو،	اردو، اکتوبر ۱۹۳۲ء
محمد شفیع، مولوی،	رامپور کے دو کتاب خانے،	اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۲۶ء
	عہد واجد علی شاہ کے نامور شعرا،	تمدن دہلی، جون ۱۹۱۲ء
محمد عرفان، ڈاکٹر،	قائم چاندپوری اور مرزا رفیع کا تقابلی مطالعہ،	معارف، اکتوبر ۱۹۶۳ء
محمد نعیم ندوی،	قصائد سودا،	حریر خامہ، قصیدہ نمبر
محمود حسن سید	طالب علی خاں عیشی،	معارف، اپریل مئی ۱۹۶۰ء
مختار الدین احمد،	فہرست مخطوطات عربی، فارسی، اردو احسن مارہروی	اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۵ء
	کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،	آجکل دہلی، ستمبر ۱۹۵۷ء
مدنی، ظہیرالدین،	سیاح (منشی سیف الحق)	اردو، جولائی ۱۹۳۲ء
مشفق خواجہ،	ثاقب لکھنوی کی بیاضیں،	مجلہ تحقیق، اورینٹل کالج پنجاب جلد ۳ شمارہ ۲
	جسونت سنگھ پروانہ،	غالب، کراچی، شمارہ اول ۱۹۷۵ء
	مرزا جعفر علی حسرت،	اردو نامہ، مارچ ۱۹۶۵ء
معین الدین،	اردو قصیدہ گوئی کا سرسری جائزہ،	ہمایوں، اپریل ۱۹۴۰ء
مفتون کوٹوی،	ثاقب لکھنوی اپنے کلام کے آئینے میں	پگڈنڈی، مئی ۱۹۶۷ء

منظور الحسن، ٹونک کے دو قدیم کتب خانے، معارف، اگست ۱۹۵۹ء

منور البشیشر پرشاد، حضرت صدر لکھنوی کی تاریخ گوئی، زمانہ، نومبر ۱۹۳۲ء

مودودی، ابو الاعلیٰ، نظام الملک آصف جاہ اول کی وزارت ہند اور اس عہد کا ماحول، روزنامہ صبح دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۳ف

مہر، محمد خاں شباب، بھوپالی قصیدہ گوئی، ادبی دنیا، جولائی ۱۹۳۲ء

مینا زبیری، ظریف جبلپوری، قومی زبان، اپریل ۱۹۶۷ء

نادم سیتاپوری، سیتاپور کے کتب خانے اور ان کے بعض نوادر، معارف، جون ۱۹۶۲ء

محشر لکھنوی، طلوع افکار کراچی، مارچ ۱۹۷۱ء

مرزا تقی ہوس اور خواجہ عشرت لکھنوی، ہماری زبان علی گڑھ یکم جولائی ۱۹۶۲ء

نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے کتب خانوں میں اردو مخطوطات، اردو ادب علی گڑھ شمارہ ۲، ۱۹۶۸ء

ناظم، ظہور الحسن سیتاپوری، کلام الملوک (ہندوستان کے مختلف شاہزادوں اور والیان ریاست کا تذکرہ) فروز ۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء

نجفی، عبد الجلیل، سودا کے قصائد و ہجویات، نگار پاکستان، جولائی ۱۹۶۲ء

نجم الاسلام، (ڈاکٹر) بھوپال کے قصیدہ گو شعرا، تحریر خامہ قصیدہ نمبر

دکھنی اردو میں مدحیہ شاعری ابتدائی دور، ایضاً

بیاض مرزا جان طپش، نقوش لاہور، ستمبر ۱۹۶۷ء

نجم، مشکور احمد، جوشش عظیم آبادی کے اردو قصائد، تحریر خامہ قصیدہ نمبر

نجیب اشرف، انڈیا آفس لائبریری کی فہرست مخطوطات اردو پر تنقید، معارف، اپریل ۱۹۲۷ء

کتاب خانہ خدا بخش کی چند نادر کتابیں، معارف، مارچ ۱۹۲۳ء

نسیم، الف۔ د، (ڈاکٹر) خاندان شاہ ولی اللہ کا اردو کی ترویج میں حصہ، اردو، جولائی ۱۹۵۳ء

دہلی بارہویں صدی ہجری کا شاعرانہ ماحول (کچھ اضافے)، اورینٹل کالج میگزین فروری مئی ۱۹۶۱ تا فروری ۱۹۶۲ء

چندا، اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۶۱ء

نصرت قریشی، قصائد اقبال، ادبی دنیا دور ششم شمارہ ۱۹۶۷ء

نظر، نوبت رائے، دیباچہ جام سرور، ادیب الہ آباد فروری ۱۹۱۱ء

نظم طباطبائی، علی حیدر، روشنان فلک، ذخیرہ، دسمبر ۱۹۱۵ء

مشتبا برج کے سبع سیارے، مجلہ عثمانیہ جلد ششم شمارہ اول

نظیر، اصغر حسین، لدھیانوی، قصائد ذوق، ادبی دنیا، جولائی ۱۹۳۶ء

قصائد ذوق کی تشبیہیں، ادبی دنیا مئی ۱۹۳۶ء

نقاد، امیر علام امیر بدایونی، رباعیات ظفر پر ناقدانہ نظر، تسنیم مئی ۱۹۳۲ء

نیاز بدایونی، حالی کا ایک گمنام شاگرد: انصار حسین زلالی، اردو نامہ ستمبر ۱۹۷۱ء

نیاز فتح پوری، قصائد مومن کے بعض مشکل اشعار کی تشریح، حریر خامہ قصیدہ نمبر

مومن کے قصائد، نگار، لکھنؤ ۱۹۵۱ء

مومن کے قصائد میں تغزل، حریر خامہ قصیدہ نمبر

نیازی، ظفر محسن، استاد قمر جلالوی، قومی زبان، جنوری ۱۹۷۱ء

وحشت، رضا علی، عبدالغفور نساخ، اردوئے معلیٰ علی گڑھ اکتوبر نومبر ۱۹۰۶ء

وحید الحسن ہاشمی، قصیدہ، قندیل، ۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ء

وحید قریشی (ڈاکٹر) عہد ابوظفر بہادر شاہ، اوراق، شمارہ خاص نمبر ۲ ۱۹۶۷ء

وجاہت صدیقی، مجروح، مخزن، مئی ۱۹۰۷ء

وصل بلگرامی، قدر بلگرامی، اردوئے معلیٰ علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۶ء

وقار اشدی، محمد صادق رانی پوری، قومی زبان، اپریل ۱۹۸۱ء

میر عبدالحسین ساتگی کی اردو شاعری، اردو نامہ، مئی ۱۹۷۱ء

ہاشمی، نصیر الدین، اہل نوایط کی اردو خدمات کا جائزہ، نقوش نمبر ۱۰۲

جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے اردو قلمی دواوین، قومی زبان جنوری ۱۹۶۸ء

دفتر دیوانی و مال کے ہندوستانی مخطوطات، ہندوستانی، ۱۹۳۶ء

دکن میں اردو کے ہندو شعرا، نوائے ادب اپریل ۱۹۵۲ء

سلطان عبداللہ قطب شاہ کی اردو شاعری، اردو، جلد، ۱۹۵۱ء

شاہان دکن کی اردو شاعری، نوائے ادب جنوری ۱۹۶۵ء

کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کا ایک جائزہ، اردو، جولائی ۱۹۵۵ء

کتب خانہ سالار جنگ کے بعض نایاب اردو قلمی دیوان، آجکل دہلی، جولائی ۱۹۵۸ء

کلیات امتیاز، قومی زبان، یکم جنوری ۱۹۵۷ء

مجمع المدایح، سب رس، مئی ۱۹۵۲ء

مخطوطات کتب خانہ آصفیہ و سالار جنگ، اردو، جولائی ۱۹۵۵ء

یکتا جودھپوری، رضا حسین بیدل بدایونی، اردو نامہ، ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء

یوسف ظفر، اردو شاعری اور بہار، ہمایوں، جولائی ۱۹۶۷ء

[فہرستیں] بحوالہ رسائل ،

ابرار حسین فاروقی ڈاکٹر / فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو ہند / سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ ۵۲-۱۹۵۳ء

——— / ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ فہرست مخطوطات / ہماری زبان علی گڑھ ۱۹۶۹ء

عبدالودود قاضی - / فہرست کتب خانہ گارسیں دتاسی / نوائے ادب بمبئی ۱۹۵۱ء

مختار الدین احمد ڈاکٹر - / کتابخانہ ہائے جرمنی / رسالہ معاصر پٹنہ

نارنگ ڈاکٹر گوپی چند - / ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں اردو مخطوطات / اردو ادب علی گڑھ ۱۹۶۹ء

نصیر الدین ہاشمی / (۱) سنٹرل ریکارڈ آفس حیدر آباد کی اردو قلمی کتابیں / نوائے ادب بمبئی ۱۹۵۵ء

/ (۲) حیدر آباد دکن کے عجائب خانے کی اردو قلمی کتابیں / نوائے ادب ۱۹۵۵ء

نور الحسن ہاشمی / (۱) اردو مخطوطات ذاتی کتب خانہ ایم عرفان صدر انجمن ترقی اردو بھوپال / ہماری زبان ۱۹۶۹

/ (۲) اردو مخطوطات مولانا آزاد سنٹرل لائبریری سابقہ حمیدیہ بھوپال / ہماری زبان ۱۹۶۹

/ (۳) نیشنل لائبریری آف انڈیا کلکتہ کے اردو مخطوطات / ہماری زبان ۱۹۶۹

رسائل جن سے مدد لی گئی

آجکل، دہلی / ادب لطیف لاہور / ادبی دنیا لاہور / ادیب دہلی علی گڑھ کراچی /
اردو کراچی، دہلی / اردو ادب علی گڑھ / اردو نامہ کراچی / اردوئے معلی کانپور، علی گڑھ / اردوئے معلی /
دہلی یونیورسٹی / اقبال ریویو لاہور / الزبیر بہاولپور / الناظر لکھنؤ / اورینٹل کالج میگزین لاہور / المختار لکھنؤ /
اوراق گم گشتہ دنیا / انٹر کالج میگزین جونپور / برہان دہلی / پاک جمہوریت لاہور / پروانہ میرٹھ /
پگڈنڈی / تخلیق لاہور / تزک عثمانیہ حیدر آباد / تسنیم لکھنؤ / تمدن دہلی / تہذیب پٹنہ /
جلوہ محبوب حیدر آباد / خلاصہ علی گڑھ / دبدبہ آصفیہ حیدر آباد / دکن ریویو / ذخیرہ دکن /
زمانہ کانپور / ساتواں رنگ کراچی / ساقی کراچی / سب رس حیدر آباد دکن / سہیل مسلم یونیورسٹی /
شاعر بمبئی / شاہراہ دہلی / شباب اردو / صحیفہ لاہور / صبح / روزنامہ دکن / صلائے عام دہلی /
علی گڑھ میگزین / فروغ اردو لکھنؤ / فنون لاہور / مجلہ سیفیہ بھوپال / ماہ نو کراچی / معارف اعظم گڑھ /
معاصر پٹنہ / لسان الملک ——— / نقوش لاہور / نگار لکھنؤ، کراچی / نوائے ادب بمبئی / نیا دور کراچی /
نیرنگ خیال / ہم قلم / ہماری زبان علی گڑھ / ہمایوں / ہندوستانی لکھنؤ / العزیز بہاولپور ،
اور بھی بہت سے رسائل سے مدد لی ان کے حوالے مقالے کے اندرونی صفحات پر موجود ہیں

[لغات]

نام لغت	مرتب	ادارہ
اصطلاحات پیشہ وراں	-	انجمن ترقی اردو ہند
امیر اللغات	امیر احمد مینائی	مطبع مفید عام آگرہ
جامع اللغات	مفتی غلام سرور لاہوری	نولکشور ۱۸۹۳ء
غیاث اللغات	مولف مصباح	مطبع حیدری بمبئی
فرہنگ آصفیہ	مولوی سید احمد دہلوی	مرکزی اردو بورڈ لاہور
فرہنگ اثر	اثر لکھنوی	نول پریس لکھنو
فرہنگ غفاری	امیر جلال الدین غفاری	تہران
فرہنگ فارسی	دکتر محمد معین	تہران
قدیم اردو کی لغت	جمیل جالبی ڈاکٹر	مرکزی اردو بورڈ لاہور
لغت آزاد	آغا محمد طاہر	کریمی پریس لاہور
لغات اردو	سید احمد دہلوی	مجتبائی دہلی
لغات اردو	عبدالرؤف عشرت	الناظر برقی ایجنسی لکھنو
لغات جدیدہ	سلیمان	آسی پریس لکھنو
لغات فرس	اسدی طوسی	تہران
مدار الافاضل	الہ داد فیض	دانشگاہ پنجاب لاہور
منتخب النفائس	اوحد الدین	مطبع نظامی کانپور
نور اللغات	نور الحسن نیر	نیر پریس لکھنو

انگریزی کتابیں

Catalogue of Hindustani Manuscripts in British Museum London 1926 and Catalogue of Hindustani Manuscripts in the Library of India Office
By J. F. Blumhardt London. 1900

History of Urdu literature
By Dr Mohd Sadiq Oxford University Press. London 1964

A Story of Persian literature — Vol I-II London
By C. A Storey. 1894

Painting during the Sultnate Period
By Abdullah Chugtai Lahore 1963

Glimpses of Persian Poetry
By Ali Asghar Hikmat — Calcutta 1956

A Literary History of Persia
By Brown E.G London 1902

The influence of Arabic Poetry on the developement of Persian Poetry
By Mohd Umer Daud Potor. London 1934

Sumerian epics and Myths
By Edward Chiera, Chicago 1964.

Dissertions on the Rhetoric, Prosody and the Rhymes of the Persians.
By Francis Gladwin Calcutta 1801

A classical dictionary of Hindu Mythology and Religion, Geography, History and literature
By Jhon Dowson London 1961

Myths and legend in early Greek Art
By Karl Schefold 1966
Thomas and Hudson London

Joseph Shipley, Dictionary of literary Terms.
London 1979

Seksena Ram Babu, Indo European Poets of Urdu and Persian
Lucknow 1941

The Hymns of Rigveda Varanasi Bharat
By R Griffith
London 1889, 91

The Aeneid Translation By T. H Delaber
A Bantham Classic.

History of Urdu literature
By Dr Mahd Sadiq
Oxford Press London

History of ottoman Poetry v VI
By W. Gibb
London 1965

A New classical Dictionary of Greek and Roman
By william smith
New york 1881

Early Persian Poetry
By william Jackson
New york 1920

A Literary History of the Arabs
By Nicholson
oxford Press
London 1907

oriental Biographical Dictionary
T. W. Beale
Revised By HG Keene
London 1894

Later Mughals (II vols)
By H Irvine
Calcutta 1922

Urdu classical. Hindi and English Dictionary
By Jhon Platts
Lucknow 1984

Epics Myths and legends of India
By P Thomas
Bombay 1961

— Ghani Abdul, History of Persian Language and literature at Mughal Court ——————> Allahabad 1930
— G Lane Poole, Muslim Dynasties, 1894
— Paul Radin, Primitive Man as Philosopher
New York 1957

—

— S.v Venkateswar, Indian culture Through ages
Two v London
1925

—

— Catalogues and References.

—

— A. Fyzee: A Descriptive list of Arabic, Persian, Urdu
MSS. in the Bombay Branch of Royal
asiatic Society ———
— Beale Thomas william; An oriental Bibliographical
Dictionary calcutta 1881
— Edwards; A Descriptive of Ghama library
Bombay 1873.
— Ethe. H, (1) Catalogue of Persian, Turkish, Hindustani
and Pashto MSS in Bodleian library oxford 1889.
(2) catalogue of Persian MSS in library of India office.
— Garcin-de-Tassy:; catalogues (3 vol) Paris 1879

— James. F Blumhardt; catalogue of Hindustani Printed
Books in the library of British.
Musem. London 1889

— James F Blumhardt: catalogue of Hindi, PunJabi and
Hindustani MSS. in the library of
British Musem. London 1889.

—— -Do- A Supplimentry catalogue of Hindustani
Books in the library of British Musem.
London 1909

—— M. Siddiq Khan: A Descriptive catalogue of MSS.
in the Dacca university library 1968

— Sprenger, A: catalogue of oriental MSS. of the
library of the king of Oudh V I
calcutta 1854.